گیت

برہا ... خلیل الرحمٰن اعظمی ۴۸
گیت ... نگار صہبائی ۴۹

کہانیاں

رات کی بات (آسٹریلوی کہانی) مترجمہ قرۃ العین حیدر ۶۰
دیپ جلتا رہا (بنگالی کہانی) مترجمہ شجر نقوی ۷۷

منظومات

پت جھڑ ... ظہور نظر ۸۵
جب کبھی ... مبارک مہدی ۸۶
قطعات ... محبوب خزاں ۸۷
فریب ... اعجاز الحق اعجاز ۸۸

کہانیاں

پاکر نظر کہاں ... شبیر الدین احمد ۸۹
خودکشی ... حمید کاشمیری ۹۶
میرا گھر کہاں ہے؟ ... نازی صلاح الدین ۱۰۱

غزلیں

غزل ... آل احمد سرور ۱۰۸
غزل ... تابش دہلوی ۱۰۹
غزل ... طفیل احمد جمالی ۱۱۰
غزل ... احسن احمد اشک ۱۱۱

ثقافتی ورثہ

پنگھٹ ... شاہد احمد دہلوی ۱۱۲
جھوا ... یونس احمر
خبرنامہ ... نامہ نگار

اداریہ

ادارۂ مصنفین پاکستان (پاکستان رائٹرز گلڈ) کراچی ریجن کو یہ فخر حاصل ہے
کہ اس نے ادارے کے تعمیری مقاصد کی طرف سے پہلے ایک عملی قدم اٹھایا ہے۔
"ھم قلم" کراچی ریجن کا پہلا ادبی پرچہ ہے۔ (اس سے پہلے ہم قلم نیوز بلیٹن
کی صورت میں شائع کیا گیا تھا) اگر یہ صحیح ہے کہ رسالے ادب کی خدمت کرتے ہیں
اور ادب کے نئے اور جاندار میلانات رسائل ہی سے ظہور میں آتے ہیں تو ہم قلم
یقیناً ایک روز ادب مختلف النوع میلانات کا ایک دھارا بن جانے کے پورے
امکانات رکھتا ہے۔ کیوں کہ اس کو صرف پاکستان کے تمام مصنفین کا تخلیقی تعاون
ہی حاصل نہیں ہے۔ بلکہ اُردو میں لکھنے والے اُن تمام فن کاروں کی ہمدردی بھی میسّر
ہے۔ جو پاکستان کے باہر بھی لسانی پیچیدگیوں اور نامساعد حالات کے باوجود
اپنے جذبۂ تخلیق کی عکاسی اسی نرم و نازک زبان میں کرتے رہتے ہیں۔ لہذا
"ھم قلم" کو مختلف جگہوں اور مقاموں، مختلف نظریات اور خیالات، مختلف
مزاج اور ماحول کے ادیبوں کی نگارشات کا ایسا مرقع بننا ہے۔ جس سے رنگا رنگ
خیالات اور احساسات کے سوتے پھوٹ سکیں اور ایک نئے ادبی افق کی تعمیر ہو سکے

اس کے علاوہ کراچی ریجن کی مجلس عاملہ کی یہ کوشش اور فیصلہ
قابلِ ستائش ہے کہ اس نے "ھم قلم" میں چھپنے والی ہر تحریر کا معاوضہ دینا
اصولی طور پہ طے کر لیا ہے۔ اب تک خالص ادبی پرچے اصولی طور پر معاوضہ
نہیں دیتے تھے۔ بلکہ ادیب کی حیثیت کے مطابق اس کا فیصلہ کرتے تھے۔ لیکن
"ھم قلم" نے مالی مجبوریوں اور ادب کی کساد بازاری کے باوجود ہر لکھنے والے
کو معاوضہ پیش کرنا اپنا اوّلین اصول بنا لیا ہے۔ گویا اس طرح اس نے ادیبوں کے
حقوق کی حفاظت کی طرف پہلا قدم اٹھایا ہے۔ جن کے ساتھ اب تک ہر زیادتی
روا رکھنا پبلشروں کا فیشن بن چکا تھا ــــــ گو کہ ہمیں اس کا شدید احساس ہے
کہ ہمارا یہ حقیر معاوضہ بعض جلیل القدر فن کاروں کی نگارشات کے شایانِ شا
نہیں ہے۔ لیکن ہم ایسے تمام محترم فنکاروں سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہمارے
اس فیصلے کو سراہیں گے۔ کیوں کہ یہ معاوضہ دراصل ایک علامتی معاوضہ
خدا کرے وہ دن جلد آئے جب ہم فخر کے ساتھ آپ کی تحریروں کے شایانِ شا
حق المحنت پیش کر سکیں۔

کراچی ریجن کوئی ذاتی منفعت حاصل کرنے والا ادارہ تو ہے نہ
جو رسالے کو کسی آمدنی کا ذریعہ بناتے۔ اس کی کوشش یہ ہوگی کہ وہ بہتر سے بہتر

اور اعلیٰ سے اعلیٰ طباعت کی منزل کی طرف بڑھتا جائے اور ادیبوں کا عملی تعاون اسی طرح اس کو حاصل رہا تو وہ دن زیادہ دور نہیں جب وہ اپنی منزل پالے گا اور اس کے بعد معاوضے کی شرح میں آمدنی کے لحاظ سے اضافہ ہوتا رہے گا۔

"ھم قلم" اُن تمام نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کے لئے پیش پیش رہے گا۔ جن کی تخلیق کے گلاب ناقدری یا اغماضِ مدیران سے مُرجھا رہے ہیں۔ "ھم قلم" جہاں پاکستان کے مایہ ناز فن کاروں کو اپنے صفحات پر چھاپ کر سربلند کرے گا وہاں وہ مستقبل کے بہترین ادیبوں کی نئی اُمنگوں اور خیالات کو بھی زیادہ سے زیادہ بڑے پیمانے پر پیش کرتا رہے گا۔ اسی طرح "ھم قلم" مشرقی پاکستان کے ان لکھنے والوں کو خاص طور سے آپ کے سامنے پیش کرتا رہے گا۔ جن کو چھپنے کی سہولتیں حاصل نہیں ہیں۔ حالاں کہ وہ رسائل کی بے پرواہی کے باوجود اُردو میں اپنی تخلیقات پیش کرتے رہے ہیں "ھم قلم" اس غفلت کی تلافی کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا ان کی تخلیقات میں بنگال کی سنہری مٹی کی خوشبو ہے۔ اس کے دریاؤں کی روانی ہے اور سرسبزی و شادابی کی ٹھنڈک ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ "ھم قلم" کی تخلیقات کے گلدستے میں مشرقی پاکستان کی شعری کاوشیں ایک نئے پھول کی مہک اور رنگ کا اضافہ کریں گی۔ ہمارا ایک خاص مقصد ترجمے شائع کرنا بھی ہے۔ خصوصاً پاکستان کے مختلف علاقوں میں بولی جانے والی زبانوں کے ادب کے تراجم۔ جن سے ادب میں اور قومی زندگی میں یک جہتی۔ یگانگت اور ہم آہنگی کی فضا پیدا ہو۔ اور ہم ایک دوسرے کی روح کو اپنے قریب محسوس کر سکیں۔ اس سلسلے میں ہم پاکستان کی مختلف علاقائی زبانوں کے ادیبوں کو خاص طور سے متوجہ کرانا چاہتے ہیں۔ اور ان سے عملی تعاون کے خواہشمند ہیں ــــ غرض کہ اسی قسم کے بہت سے آدرش ہیں جن کے لئے "ھم قلم" کا اجرا کیا گیا ہے ــــ

"ھمارا" پہلا پرچہ آپ کے سامنے ہے یہ دو ماہ کا مشترکہ شمارہ ہے یعنی اگست اور ستمبر کا۔ انشاءاللہ اکتوبر سے ہر ماہ پابندی کے یہ آپ کے ہاتھوں میں پہنچتا رہے گا۔ یہ پرچہ دیکھ کر آپ کو اندازہ ہو جائے گا۔ کہ صرف ایک ماہ کی مدت میں ہم نے اس کو معیاری بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔ اس کی فہرست میں آپ کو ملک کے مشہور اور نمایاں ترین ادیبوں کے نام بھی نظر آئیں گے۔ اور نئے اُبھرتے ہوئے فن کاروں کی کاوشیں بھی آپ کی توجہ کا دامن اپنی طرف کھینچیں گی۔ اس میں جہاں پاکستان کے ایسے ادیبوں کے نام شامل ہیں جو ادب کی آبرو ہیں۔ وہیں ہمسایہ ملک کے چند نام بھی اس بے مثال جذبۂ تخلیق کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ جس کو امن و دوستی کا بہترین سفیر کہا جا سکتا ہے۔ اس

ہیں اگر مشرقی پاکستان سے آنے والی ہوائیں سرگوشیاں کر رہی ہیں تو ہمارے ثقافتی
اور پاکستان کے علاقائی ادب کی وہ لازوال کہانیاں اور علامتیں بھی شامل ہیں جو
ہماری زندگی کو ہمیشہ حرارت اور رنگ حاصل ہوتے رہے ہیں۔ "ثقافتی ورثہ" ھم ق
کا ایک ایسا حصہ ہے۔ جس کو آپ یقیناً پسند کریں گے۔ یہ سلسلہ اسی طرح جاری
کی کوشش کی جائے گی۔ "خبرنامہ" تو آپ کی دلچسپی کا مرکز بنے گا ہی۔ اور ان
چیزوں کے پیش کرنے کے بعد ہم آپ سے پوچھتے ہیں کہ آپ کو پرچہ کیسا لگا؟ —— آ
معلوم ہے کہ ہمارے پاس وقت کم تھا۔ روپیہ بالکل نہیں تھا۔ اور دیگر حالات ناسا
تھے۔ لیکن ہم نے اس کے باوجود یہ جرأت کی ہے۔ اور آپ کے بھروسے پر کی ہے۔ یہ
ہماری منزل نہیں ہے۔ ہم کو آہستہ آہستہ اس کو ایک مثالی معیار تک لانا ہے۔ تخل
کے معیار کو ایک ایسی سطح تک لانا ہے۔ جس کے بعد ہم بجا طور پر یہ کہہ سکیں کہ یہ دانہ
کا صحیفۂ ادب ہے۔ ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اس کو رائٹرز گلڈ کا زیادہ سے زیادہ نمائندہ
بنائیں۔ لیکن یہ سب کچھ آپ کے عملی تعاون اور ہمدردی کے بغیر کیسے ظہور میں آسکتا
اس کے لئے روپیہ کی ضرورت ہے۔ ذرائع آمدنی کی تلاش کا مسئلہ ہے اور پرچہ کو پرہ
پابندی کے ساتھ بہتر سے بہتر بنانا ہے ان سب کاموں میں آپ کے عملی تعاون کی ضرو
ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ ہماری ان خواہشوں میں شریک ہوں گے —— اور اگر
سے رسالے کی بہتری کے سلسلے میں کوئی فروگذاشت بھی ہو جائے تو آپ سے یہ تو
ہے کہ ہمیں فراخدلی سے معاف کر دیں گے۔

"ھم قلم" کے سلسلے میں کراچی ریجن کی مجلس عاملہ کے علاوہ ہمیں چند
مخلص کارکنوں کا ایسا تعاون حاصل رہا ہے جس کے بغیر ہم اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہو
سکتے تھے۔ ادارہ ان کا تہہ دل سے شکر گذار ہے۔ اور آپ سے بھی یہ توقع رکھتا ہے کہ ہم
کے سلسلے میں ان کی مساعیٔ جمیلہ کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس پرچے کو زندہ رکھنے کی کوشش کر

ایک بات پالیسی کے بارے میں:۔

ھماری پالیسی ادب ہے اور ادب جو زندگی ہے جو ماضی ہے جو حال ہے جو مستقبل
ہے۔ ہم کسی ایک مکتبۂ خیال کے پابند نہیں ہیں نہ مخالف۔ مختصراً "ھم ق
کی پالیسی وہی ہے جو گلڈ کی پالیسی ہے اور ہر قلم کار اپنے خیالات کا خود ذمہ دار ہے۔ ہم کو
کچھ کہنا ہوگا ادارے کے ذریعے عرض کر دیا کریں گے۔

یہ خبر ہندوستان و پاکستان کے علمی و ادبی حلقوں میں نہایت رنج و الم کے ساتھ سنی گئی کہ ۲ اور ۳ جولائی کی درمیانی شب کو اردو
مشہور و معروف ادیب جناب سلیم جعفر میرپور خاص میں رحلت فرما گئے۔ موصوف علم و فضل کے اعتبار سے ہمارے چنیدہ اہلِ قلم میں سے تھے۔
ادارہ "ھم قلم" کو مرحوم کے پس ماندگان سے دلی ہمدردی ہے۔ خدا انھیں صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

مجھے یہ جان کر بڑی مسرت ہوئی کہ شاخ کراچی نے "ہم قلم" کو خبری حیثیت سے آگے لے جاکر "ادبی" بنا دیا ہے۔ مرکزی گلڈ کی پوری ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں۔

گلڈ کی تحریک کراچی سے ہی چلی تھی۔ آپ لوگوں نے ہزارہا روپے جمع کئے رضاکار بہم پہنچائے کنونشن بلایا اور ——— اور

سارے کر دی

آدم جی ادبی انعام بھی کراچی سے ہی جاری ہوا ہے اور گلڈ کی سب سے زیادہ ادبی نشستیں بھی کراچی میں ہی منعقد ہوتی ہیں۔ آپ لوگ جس طرح اپنے ادارے میں دل چسپی لیتے ہیں وہ ملک بھر کے لئے اور میرے لئے بڑے فخر کی بات ہے۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا باک نہیں کہ میں ڈھاکے اور لاہور میں آپ کے بل پر سر اونچا کرکے چلتا ہوں۔ اور اس تحریک کے اثرات جس طرح پھیل رہے ہیں انہیں محسوس کرکے اطمینان کا سانس لیتا ہوں۔

ہوائے دشت سے بوئے رفاقت آتی ہے

کاش کہ میں ایک افسانہ یا ایک مضمون آپ کو بھیج سکتا لیکن اس وقت میرے پاس آپ کے لائق کچھ نہیں ہے۔ بہرحال "ہم قلم" آپ کا ہی نہیں میرا اپنا پرچہ بھی ہے اور میری تمام تخلیقات پر پہلا حق اسی کا ہوگا ——— انتخاب بہرحال آپ کی ذمہ داری ہوگی۔

اس وقت مجھے آپ سے ایک بات کہنی ہے۔ یہ بات میں ایک قاری ایک ادیب اور گلڈ کا رکن ہونے کی تینوں حیثیتوں میں ایک ساتھ کہنی چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ آپ یہ پرچہ نہ نکالئے۔

ادبی پرچہ جاری کرنا بڑی مشکل بات ہے اور اسے جاری رکھنا اس سے بھی زیادہ مشکل خاص طور پر جب اس کا انتظام انتخابی طریق کار کا محتاج ہو اور جہاں کام کرنے والوں کو نہ ستائش کی تمنا ہو نہ صلے کی پروا وہاں انہیں بڑی انتظامی جذباتی پیچیدگیوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ "ہم قلم" کے مختلف پہلوؤں پر آپ کی کمیٹی میں بحث ہوتی ہوگی۔ بحث میں ناگواری بھی ہو جاتی ہے۔ کچھ ناقد ملے کچھ طنز و تشنیع کچھ الزام تراشی بھی اس کے ساتھ ساتھ جب پرچہ بازار میں آئے گا تو کچھ معاصرین چشمہ ورانہ چشمک سے کام لیں گے کچھ ایماندارانہ

موٹر کردی تنقید کریں گے کچھ بالکل سرد مہری دکھائیں گے اور شاید کچھ پیشہ ور ماہرین رسائل کے ایجنٹوں کو بھی آپ کے خلاف بھڑکائیں کہ پرچہ نہ بکنے پائے۔ ادھر بہت سے مضمون نگار اور افسانہ نگار حضرات اور ان شاء اللہ بہت شعراء آپ سے وعدے کریں گے اور انہیں ایفا نہیں کریں گے اور آپ کے تاکیدی خطوط کو شکایتی خطوط قرار دے کر آپ سے خفا بھی ہوا کریں گے۔ پھر یہ بھی ہو گا کہ کچھ دوسرے عناصر بھی آپ کے خلاف حرکت میں آتے رہا کریں گے۔ اور آپ کے تحفظ کی مصیبت آپ پر ادارے پر اور خود مجھ پر پڑے گی اور ایک وقت شاید میں بھی کڑھنے لگوں گا کہ بھئی یہ کیا ادب اور کیا ادیب روگ جان کو لگ گیا ہے۔

نتیجتاً آپ یا آپ کے کارکن بہت جلد بددل ہو جائیں گے اور پھر پرچہ بند ہو جائیگا اور گلڈ بدنام۔

چنانچہ میرا پہلا مشورہ یہ ہے کہ آپ پرچہ نہ نکالئے۔ بس ڈھول کا ڈھول ہی رہنے دیجئے پول کھولنے سے گریز ہی کیجئے۔ باتیں بنایئے قراردادیں منظور کیجئے۔ اخباروں میں خطوط شائع کرایئے اور وقت ٹالئے بلکہ آپ کے بعد جو لوگ برسرکار آئیں گے ان پر اعتراضات کا مواد ابھی سے جمع کرنے میں مصروف ہو جایئے رہا میرے اس "پیغام" کا معاملہ تو اسے آپ مجھے واپس بھیج سکتے ہیں —— سالم یا چاک شدہ —— یا ایک "اطلاعیہ" صرف اس خط کا چھاپ کر اراکین میں تقسیم کر سکتے ہیں تاکہ میں فوری طور پر غیر مقبول ہو جاؤں یا اسے پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال سکتے ہیں۔ بہرحال میرا ضمیر مطمئن رہے گا۔

لیکن شاید آپ میری بات نہیں مانیں گے اور اسے اپنے ایک سنجیدہ اور اہم فیصلے کے وقار کے منافی سمجھیں گے۔ اگر بات یوں ہوئی تو میں آپ سے معافی مانگ لوں گا اور میرے پیغام کی شکل ایک آرزو میں بدل جائے گی جو یوں ظاہر ہو گی۔

مجھے فخر ہے کہ آپ نے تمام دقتوں کے باوجود "ہم قلم" کا اجرا کیا۔ ہمارے ملک میں ادب کو کئی ایسے پرچوں کی شدید ضرورت ہے جو کسی ایک مکتبۂ خیال کسی ایک ناشر کسی ایک فرد کی ملکیت نہ ہوں بلکہ جو سب کے لئے ہوں۔ اور اب کہ آپ نے پہل کی ہے آپ کے فرائض میں سب سے اہم فرض یہ ہے کہ آپ "ہم قلم" کو زندہ رکھیں۔

یاد رکھئے کہ "ہم قلم" پر اچھے وقتوں کے ساتھ برے وقت بھی آئیں گے مالی اعتبار کے علاوہ دوسرے اعتبارات سے بھی۔ اچھے وقتوں میں آپ کی تعریف بہت ہو گی لیکن شاید برے وقتوں کے ساتھی بہت کم ملیں۔ ممکن ہے میں اس وقت ادارے سے اس طرح متعلق نہ ہوں جیسے آج ہوں ممکن ہے اس وقت آپ کی جماعت کا رنگ روپ کچھ اور ہو چکا ہو مگر میں آپ سے اور آپ کے اور اپنے جانشینوں سے آج ہی ایک اپیل کرنی چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ "ہم قلم" کو ایک مقدس امانت کی طرح سمجھئے اور اسے ہر حال میں جاری رکھئے۔ روایت قائم رکھنا روایت قائم کرنے سے زیادہ شاندار اور اہم بات ہے "ہم قلم" یکجہتی اجتماعیت، بلند خیالی اور شرافت کی پہلی علامت ہے اور پاکستان کے سب ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ اسے زندہ رکھیں خواہ بدلتے ہوئے ناموں میں اس کی زندگی کسی نہج پر ہو خواہ کسی زمانے میں اس کی ضخامت ایک صفحے کی رہ جائے خواہ اس کا خریدار ایک بھی نہ ملے اور اسے مفت ہی تقسیم کرنا پڑے۔ جونہی آپ یہ پرچہ نکالیں گے یہ نشان مستقبل بن جائیگا۔ مستقبل جو ابد ہے مستقبل جو آپ کے اختیار میں ہے

قدرت اللہ شہاب — سکریٹری جنرل پاکستان رائٹرز گلڈ

ناول کا فکری پہلو

قصہ گوئی کی وہ صورت جس کو ناول کا نام دیا گیا۔ ایسے دور میں ظہور میں آئی جبکہ ہر مصنف درس اخلاق کو اپنا پہلا فرض سمجھتا تھا۔ اس کے موجد نے اسے "کامک ایپک" کہا اور اسی امر پر زور دیا کہ اس میں قصہ اسی طرح ڈھالا جائیگا کہ ایپک کی طرح اس میں بھی عظیم طریقہ پر درس اخلاق ہو سکے۔ اس کے بعد انگریزی ناول زیادہ سے زیادہ کامک اور کم سے کم ایپک ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ انگلستان کے بہترین ناول نگار ڈکنس اور تھیکرے مزاح نگاری ہی کے کمال ہیں۔ مگر ان کے بعد ہی تمام یورپ کے ناول نگاروں نے اپنے قصوں کے ذریعہ فلسفی اور نقاد ہونے کی کوشش کی۔ اس سلسلہ میں فرانسیسی ناول نگار فلابیر سب سے اہم حیثیت رکھتا ہے اس کی بہترین ناول "میڈم بواری" انسانی نفسیات پر زمانے اور ماحول کے اثرات پر ایک مکمل علمی مقالہ بھی ہے جو واقعات اور کردار کے ذریعہ ہمارے سامنے لایا گیا ہے، اس کے بعد انگریزی ناول نگار جارج ایلیٹ نے مسئلہ ارتقاء پر مبنی کر کے ایک مکمل فلسفہ حیات بنایا جو اس کی تمام ناولوں کو اہم فکری اہمیت دیتا ہے۔ اسی وقت روسی ناول نگار ترجنیف۔ ٹالسٹائے اور دوستوفسکی نے قصہ کے فکری پہلو کو اس اعلیٰ درجہ پر پہنچا دیا جس تک پہونچیں وہ بڑا ادبی ناول نگار اپنا اصلی فرض سمجھتا ہے۔ ناول نگار کے لئے محض دلچسپ قصہ بیان کرنا ہی کافی نہیں رہا۔ بلکہ ہر قسم کے فلسفیوں کے ہم دوش کھڑے ہو کر خیالات اور حالات کی تعمیر اور تشکیل میں برابر کا حصہ لینا پڑا۔ دنیا کا سب سے بڑا ناول نگار ٹالسٹائے دنیا کے عظیم ترین مفکرین میں سے بھی ہے

ہمارے یہاں زیادہ تر لوگ جن میں منشیان تنقید بھی شامل ہیں یہ نہیں سمجھتے کہ کونسی ناول میں فکری پہلو ہے اور کہاں پر ہے اور کیسے فن کے ساتھ پیوست ہے۔ قصوں کے ساتھ فکر کو لانے کے سلسلے میں یوں تو کچھ موٹی موٹی باتیں ہیں جو ہر شخص سمجھ لیتا ہے۔ تمثیلی قصوں میں فکر اور مقصد بالکل سطح پر آجاتے ہیں۔ جیسے کہ مولوی نذیر احمد کی تمثیلوں میں۔ "توبۃ النصوح" کا خواب صاف صاف وعظ ہے۔ جسے تخیلی صورت دے دی گئی ہے۔ کلیم کے مصائب پرانی تہذیب کے پہلو کو کھولتے ہیں۔ پوری تمثیل سے ہر جگہ اسلام پر عمل اور نماز پڑھنے کی اہمیت واضح ہوتی چلی جاتی ہے۔ شرر کی نام نہاد ناولوں میں ہر جگہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ اسلام بڑا اہم مذہب ہے۔ اور "فلورا فلورنڈا" تو صاف طور پر اسلام کے حق میں اور عیسائیت کے خلاف پروپیگنڈہ ہے۔ سرشار نے بھی اپنی بے تکان فسانہ آزاد میں بہت جگہ پر وعظ کو لازمی سمجھ کر باوجود تھکا دینے کے یہ واضح ضرور کرتے ہیں کہ انہوں نے بھی مقصد اور فکر کی طرف جھانک کر ہی سہی پہونچنا ضروری سمجھا۔ مرزا رسوا قومی اخلاق کی تشکیل کو اپنا اہم فرض سمجھتے تھے۔ اور ان کی "شریف زادہ" اسی حد تک اخلاقی ہے کہ اس میں زندگی کے عناصر بالکل دب کر رہ گئے ہیں۔ "امراؤ جان ادا" زندگی کا نقشہ ہے۔ مگر اس میں ہر جگہ امراؤ جان کے پیشے کے مخرب اخلاق پہلو کو ضرور سامنے لایا گیا۔ ناول کا آخری حصہ جس میں رسوا امراؤ جان سے نیکی اور بدی پر بات چیت کرتے ہیں صاف طور پر فکری ہے اور پھر امراؤ جان کا خط جو قصے سے پہلے رقم کیا گیا ہے۔ رسوا کے مقصد حیات کا پورا جائزہ ہے۔ مگر ان تمام ناولوں میں فکر کو لانے کے موٹے موٹے طریقے ہی استعمال ہوئے ہیں۔ سیدھے وعظ۔ مکالمہ میں فکری معاملات پر بحث کسی جگہ پر خواب یا خط کے ذریعہ سب نکتوں کو یکجا کر دینا۔ ان طریقوں سے ہمارے قصے گو آگے نہیں بڑھ سکے ہیں اور ہمارے ناظرین ادب بھی انہیں طریقوں کو بس سمجھتے ہیں۔ اگر کسی ناول میں فکر واقعات و کردار میں مکمل طریقہ پر

پیوست ہو تو وہ ناول ہو گے پلے نہیں پڑتی۔

ناول میں فکر کسی طرح واقعات سے ہمکنار ہوتی ہے؟ اس کی بہترین مثالیں ہمیں فرانسیسی ناول نگار فلابیر انگریزی ناول نگارہ جارج ایلیٹ اور روسی ناول نگار ٹولسٹوئے اور دوستوفسکی کے یہاں ملتی ہیں۔ فلابیر کی میڈم بواری ایک عورت کے رومانی واقعات کا قصہ ہے اسکو محض قصہ کی حیثیت سے بھی پڑھا جاسکتا ہے۔ مگر ہر واقعہ میڈم بواری کی ذہنی کش مکش کا بھی نقشہ ہے اور زندگی کی حقیقت اور رومان کے متضاد نقشے بھی اس طرح سامنے لاتا ہے کہ قاری فکر میں ڈوبے بغیر نہیں رہ سکتا فلسفی بھی آخر زندگی کے مطالعہ ہی سے اصول اخذ کرتا ہے۔ یہاں اصول کا سوال نہیں ہے۔ تخیل کی دنیا کو تعمیر کرنے کا سوال ہے۔ مگر یہ دنیا اسی گہرائی کے ساتھ سامنے آتی ہے کہ زندگی کے وہ اصول جن تک فلسفی بحث اور فکر کے ذریعہ پہونچتا ہے تصورات کے ذریعہ ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ ناول نگار ادیب ہوتا ہے اور اس کی سب سے اہم قوت تخیل ہے۔ جبکہ فلسفی کی اہم قوت بحث و اسباب پر قابو ہے۔ ناول نگار کی تصنیف فلسفی کی گہرائی کو ایک مکمل تصویر پیدا کرتی ہے۔ فابیر اس سلسلے میں پہلی اہم مثال ہے اسلئے اسے جدید ناول نگاری کا موجد کہا جاتا ہے۔ جارج ایلیٹ کی ناول۔ مڈل مارچ میں انگلستان کے ایک دیہات کی زندگی کو ایک فلسفہ کا اشارہ کرکے پیش کیا گیا ہے مسئلہ ارتقاء اور اس پر مبنی کرکے ایک نئے نظام اخلاق کی تعمیر پورے قصے کا اہم مقصد ہے۔ مرکزی قصہ ایک لڑکی ڈروتھیا کا ہے۔ جو علمی دنیا کے خواب دیکھتے دیکھتے ایک خشک رسیدہ عالم سے شادی کرلیتی ہے مگر فوراً ہی محسوس کرنے لگتی ہے کہ اس کے شوہر میں علمی خشکی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ شوہر مرجاتا ہے اور پھر وہ ایک کمسن آزاد طبع زندہ دل لڑکے سے شادی کرلیتی ہے۔ پہلے واقعہ سے آخری واقعہ تک ڈروتھیا کا ذہن واقعات اور حالات کے ساتھ جو منازل ارتقاء طے کرتا ہے وہ ناول کے فکری پہلو کی جان ہے ڈروتھیا کی فطرت میں رفتہ رفتہ تبدیلیاں پیدا ہونا اور ان کی وضاحت اس ناول کو اعلیٰ ترین فکری ناولوں میں جگہ دیتی ہے۔ جارج الیٹ نے فکر کی وسعت میں اضافہ کیا کیونکہ مڈل مارچ میں ایک نہیں بلکہ متعدد قصے اس طرح ساتھ چلتے ہیں کہ ایک پورے دیہاتی ماحول کی حقیقتیں سامنے آتی چلی جاتی ہے۔ جارج ایلیٹ اسی معنے میں فلابیر سے آگے ہے کہ وہ محض ایک فرد ہی کے نہیں بلکہ ایک ماحول کے تمام افراد کی زندگی کی گہرائیوں میں لے جاتی ہے۔ افراد زندہ ہستیوں کے علاوہ ایک ماحول کے نمائندے بھی ہوجاتے ہیں۔ اخلاق ایک فرد پر محدود ہوجانے کے بجائے ایک پوری سوسائٹی کے نظام کی بنیاد ہوجاتا ہے۔ اسی فکری وسعت کو روسی ناول نگار دوستوفسکی اور ٹولسٹوئے کمال پر پہونچاتے ہیں۔ دوستوفسکی نظر کی گہرائی میں اور ٹولسٹوئے نظر کی وسعت میں دنیا کے تمام ناول نگاروں سے آگے نکل جاتے ہیں۔ اول الذکر کی "برادر کرامازوف" تین بھائیوں کا قصہ ہے جسکے واقعات نہایت دلچسپ اور سنسنی خیز ہیں۔ مگر غور سے دیکھیے پر خدا شیطان اور انسان کے نمائندے ہیں۔ ناول ایک خاص روسی ماحول میں ان تین اہم ترین عناصر زندگی کے درمیان ایک گہری کش مکش کا ایک دقیق نقشہ ہے جیسا آج تک پیش نہ ہوسکا۔ سنسنی خیز قصہ گوئی اہم ترین آفاقی فکر کے ساتھ اس خوبی سے ہم آہنگ ہوئی کہ یہ ناول دنیائے ادب کے معجزوں میں سے گنی جاتی رہے گی۔ ٹولسٹوئے کی "وار اینڈ پیس" پورے یورپ کو گھیر لیتی ہے۔ یورپ کے تمام فلسفے کا نچوڑ اسکے واقعات میں ہر جگہ نظر آتا ہے۔ ناول میں لاتعداد لوگ ہیں اور ان کے واقعات اور کردار مکمل طور پر ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ ناول کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ خدا دنیا کو کیسے چلا رہا ہے۔ سوشل زندگی کی کیا بنیادیں ہیں۔ ترقی اور ارتقاء کدھر لئے جارہے ہیں۔ اخلاق و مذہب کا کیا مقام ہے۔ ناول کا مرکزی واقعہ نپولین کی ماسکو پر فوج کشی ہے۔ نپولین اپنی پوری طاقت کے ساتھ ایک سیل رواں کی طرح چلا آرہا ہے۔ روس کا زار اپنے سپہ سالار کوٹوزاف کو بلاکر نپولین کو روکنے کی ہدایت کرتا ہے۔ کوٹوزاف احمق اور آرام طلب ہے۔ وہ کہتا ہے "نپولین ایسے لوگ اپنے غرور میں خود ڈھے جاتے ہیں۔ مجھے خدا سے امید ہے کہ وہ ہمیں بچائے گا۔ موسکو کو اس کے باشندے خود بچالیں گے۔ فوج کو میدان میں لانے کی ضرورت نہیں؟ یہ بات بڑی حماقت زدہ ہے۔ کوٹوزاف حکم جاری کرتا ہے کہ ماسکو کے رہنے والے شہر کو آلام خالی کردیں۔ اسکا حکم ہر فرد مان لیتا ہے۔ نپولین جب ماسکو پہونچتا ہے تو اسے پورا شہر خالی ملتا ہے۔ اضطراب کے عالم میں اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرے۔ لڑنے والا سپاہی محض ہوا کو لڑنے کے لئے پاکر اپنی بوٹیاں نوچنے لگتا ہے۔ ماسکو کو جلادیتا ہے۔ اپنی فوج کو واپسی کا حکم دیتا ہے۔ اب روس کا جاڑہ اپنے زور پر آنے لگا ہے۔ برفباری نپولین کی منتشر ہوئی فوج کے لئے بڑی تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے۔ اس کی توپیں زمین میں دھنسنے لگتی ہیں۔ اس کے گھوڑے اور سپاہی مرنے لگتے ہیں۔ کوٹوزاف کی فوج اب اس پر حملہ کرتی ہے۔ نپولین کی زیادہ تر فوج برباد ہوجاتی ہے اور نپولین اپنی جان بچاکر بھاگ جاتا ہے۔ یہ شکست قدرت کی طرف سے ہے اور اس کے بعد نپولین یورپ میں بھی ایک طاقت کی حیثیت سے ختم ہوجاتا ہے۔ یہ واقعہ سوشل

بہ قلم کریمی

فلسفے کے اس اہم سوال کا جواب ہے کہ زندگی میں لیڈر اہم ہے یا عوام؟ ۔ واقعہ کا ہر جزو اور پوری نوعیت اس سوال کا جواب یہ دیتی ہے کہ خدا اور عوام اہم ہیں ۔ ملائم اور انفرادیت وقتی چیزیں اور شیطانی چیزیں ہیں۔ الٰہ کو نوزاد کا سا ناکارہ گردہ ہے، عوام کا نمائندہ ۔ اور خدا کا عقیدہ مند ہو تو وہ نپولین کے لیے انسان کو ختم کر دیتا ہے ۔ ٹولسٹوئے نے ناول کے آخری باب میں اپنے پورے فلسفۂ حیات کا خلاصہ پیش کر دیا ہے ۔ مگر اس کی کوئی ضرورت نہ تھی ۔ جو لوگ اس ناول کو پڑھ چکے ہیں وہ جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ کس طرح پر اس میں پوری کائنات اپنی پوری وسعت اور پوری گہرائی اور پوری تاریخ کے ساتھ موجود ہے : "وار اینڈ پیس" قصہ گوئی اور کردار نگاری ہی کا شاہکار نہیں ہے ۔ بلکہ ان عناصر میں تمام تاریخ اور تمام فلسفہ کو سمیٹ کر زندہ کر دینے کی اہم ترین مثال ہے ۔ اگر اسے یورپ کے ادب کا عظیم ترین شاہکار کہا جائے تو شاید شیکسپیئر کا "کنگ لیر" ہی اس سے ٹکر لے سکے ۔

ناول میں فکر کس طرح آتی ہے ۔ اس امر کو واضح کرنے کے لئے ان تصانیف کا طویل اور گہرا مطالعہ ضروری ہے ۔ یہاں جو ذرا ذرا سے اشارے دیئے گئے ہیں وہ کسی طرح کافی نہیں ہو سکتے ۔ انجمن ترقی اردو کے رسالے میں جو مضامین "دنیا کی عظیم ترین ناولوں" کے عنوان کے تحت میں شائع کر رہا ہوں، ان کے مطالعے سے میں امید کرتا ہوں کہ اردو داں طبقہ ناول کی فکری عظمت سے واقف ہو جائیگا ۔ زیر قلم مضمون میں ناول نگار کی فکری قدروں پر اظہار خیال کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے ۔ اس سلسلہ میں ایک رجحان کا ذکر کر دینا سب سے پہلے ضروری ہے جو فکر کو لانے کے سلسلے میں فن کا قاطع ہوتا ہوا نظر آتا ہے ۔ ناول نگار کے مفکر ہونے کے معنے یہ ہو گئے ہیں کہ وہ کسی سیاسی نظریہ کا پروپیگنڈہ کرے یا کسی نفسیاتی نظریہ کو زندگی پر عائد کر کے دکھائے ۔ آخر الذکر طریقہ کی مثال یورپ میں ڈی ایچ لارنس کی ناولیں لی جا سکتی ہیں ۔ ان میں فرائڈ کے نظریہ کے مطابق جنسی محرک ہی کو سب کچھ سمجھ کر ناول کو مختلف لوگوں کے جنسی محرک کے کشمکش کا کھیل دکھایا جاتا ہے ۔ قاری کو جنسیاتی سنسنی ضرور محسوس ہوتی ہے ۔ اور اس سلسلہ میں وہ فکری منازل کی حدود تک بھی ضرور پہنچتا ہے ۔ مگر کچھ ہی عرصہ بعد ناول نگار کی فکر بالکل یکطرفہ نظر آتی ہے اور تخیلی کے بجائے ذہنی ہو جاتی ہے ۔ اس طریقہ کے پیروکاروں میں ہمارے یہاں عصمت شاہد لطیف ہیں ۔ ان کی واحد ناول "ٹیڑھی لکیر" کے آخری حصہ میں خاص طور پر فکر کی یہ بدعنوانی تکلیف دہ حد تک نمایاں ہو جاتی ہے ۔ پھر ناول پر جنسیاتی نظریہ کو عائد کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ "شعور کی دھار" کے حساب سے ناول لکھی جائے ۔ اس طریقہ کو انگریزی ناول نگار ڈوروتھی رچارڈسن نے پہلے برتا ۔ اور پھر ہنری جیمس، جیمس جوائس اور ورجینیا وولف نے اسے کمال تک پہنچایا ۔ یہ سب مر گئے اور اب انکا کوئی خاص پیرو نظر نہیں آتا ۔ ہمارے یہاں قرۃ العین حیدر نے اسی راہ پر چلنے کی ٹھانی ہے ۔ "آگ کا دریا" ان کی کامیابی کی بہترین مثال ہے ۔ انہوں نے ایک جگہ لکھا کہ اس سے پہلے جو کچھ انہوں نے لکھا وہ سب بکواس ہے ۔ اگر ان کی تصانیف کے لئے لفظ بکواس موزوں سمجھا جا تو "آگ کا دریا" سب سے بڑی بکواس ٹھیرتی ہے ۔ اس میں ہندوستان کی تمام تاریخ اور اس میں مختلف قوموں کے تعلقات کے تاثرات اس طرح دئے گئے ہیں کہ جن سے ملک ایک عظیم فکری ناول تعمیر ہوتی ۔ مگر ناول نگار نے ہندو مسلم تعلقات پر کافی فکر نہیں کی کچھ سطحی جذباتی تعلقات کو پیش کر کے اسی کو فلسفہ اور فکر قرار دینے کی کوشش کی اور ناول فکر کا کارنامہ ہونے کے بجائے سچ مچ بکواس ہو گئی ۔ نفسیاتی دھارا کے طریقہ کو برتنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اس ناول کے کردار انفرادیت کھو بیٹھے ہیں ۔ اس طریقہ پر لکھی ہوئی ہر ناول کی طرح یہ ناول بھی زندگی کی سطحی اور بگڑی ہوئی تصویر ہی ہو کر رہ جاتی ہے ، ان فکری بدعنوانیوں کے علاوہ ایک اور بدعنوانی ہے ۔ جو اشتراکی ناولوں میں نظر آتی ہے ۔ یہاں ایک سیاسی نظریہ کو زندگی پر اس طرح عائد کیا جاتا ہے کہ نہ زندگی ہی رہتی ہے نہ نظریہ ۔ ہمارے یہاں پریم چند کی "گئودان" اس کی نمائندہ مثال لی جا سکتی ہے ۔ یا پھر کرشن چندر کے طویل افسانے جنکو کبھی ناول کہا جاتا ہے ان سب مثالوں سے مراد یہ ہے کہ ناول میں فکر کو برتنے کی جو غلط مثالیں عام ہیں وہ بھی سامنے آجائیں تاکہ ان سے گریز کیا جائے ۔

بڑے ناول نگار کا بڑے شاعر کی طرح مفکر ہونا بھی ضروری ہے ۔ مگر اس کے فکر کی الگ نوعیت ہے جو سیاستداں ۔ سائنسداں اور نفسیات داں کی فکر سے بالکل مختلف ہے ۔ ناول نگار کا کام انسانی فطرت کے اس تجربہ کا اظہار ہے جو اسے ذاتی طور پر ہوا ۔ تجربہ ہر شخص کو ہوتا ہے ۔ مگر ہر شخص چشم بینا لے کر نہیں آتا ۔ مولانا روم نے خوب کہا ۔

چشم بینا از لقائے حق شود   حق کجا ہمراز ہر احمق شود

ایک حد تک مولانا روم کی نظر بھی ناول نگار کی نظر تھی اور جب وہ یہ کہتے ہیں کہ

آمیزش کو گہر پاک او کجا — از تاک بادہ گیرم و در ساغر افگنم

یا یہ کہتے ہیں کہ ـــ

چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم — نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم

تو وہ ناول نگار کی فکر کی مخصوص نوعیت کی پوری تعریف کر دیتے ہیں۔ آفتاب سب پر برابر چمکتا ہے اور سب کی حقیقت کو پورے طور پر کھول کر رکھ دیتا ہے اس کی روشنی سب ستاروں سے زیادہ تیز بھی ہے اور عام بھی لہٰذا اسکا نام اس چیز کو مشعل راہ بناتا ہے جسکو عام فہم COMMON - SENSE کہا جاتا ہے یہ قوت یوں تو بڑی عام سمجھی جاتی ہے۔ مگر اصل میں اس سے زیادہ غیر عام شاید ہی کوئی قوت ہو۔ اسکا سچا مالک وسعت نظر۔ رواداری۔ توازن اور صحیح دماغی کا حامل ہوتا ہے۔ وہ آمیزش کو گوارا نہیں کرتا۔ وہ انسانوں کی روح میں اتر جاتا ہے اور اس روح کے نقشے جو باتوں کے ذریعہ ظاہر ہوتی ہے پیش کرتا ہے۔ جو روحیں عظیم ہیں ان کی عظمت کو جو حسین ہیں۔ ان کے حسن کو جو درد بھری ہیں ان کے درد کو اور جو مزاحیہ ہیں ان کے مضحک پہلو کو نمایاں کرتا ہے۔ سب کے آہنگ سے جو سوسائٹی یا کائنات کی روح نمایاں ہوتی ہے اس کو بھی سامنے لاتا ہے اسکا مقصد کسی فرد یا کسی چیز کو رد کرنا نہیں ہوتا۔ وہ دائمی قدروں پر نظر رکھتا ہے اور اسے صاف دکھائی دیتا ہے کہ زندگی کی برائیاں بھی ایک بڑی اچھائی کی طرف جا رہی ہیں جیسے کہ صاف نہریں اور گندے نالے دونوں بڑے دریا میں آکر آخر کو دریا کا جزو ہو جاتے ہیں۔ وہ علم کی مختلف شاخوں سے واقف ضرور ہوتا ہے۔ جدید ناول نگار کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ تمام علوم سے پوری طرح واقف ہو اور واقف ہوتا رہے۔ مگر اسکا مسلک یہ نہیں ہے کہ وہ کسی ایک شاخ میں الجھ کر رہ جائے۔ وہ کسی اونچائی پر ہوتا ہے، جہاں تمام علوم اور فلسفے اپنی اپنی حدود میں مکمل بھی دکھائی دیتے ہیں اور ناکافی بھی۔ اسے خالص انسانی قدروں سے سروکار ہوتا ہے جس کی شاخیں تو مختلف علوم ضرور ہیں۔ مگر جس کا تناسب علوم سے الگ ہے اصل میں مختلف علوم کے جاننے والوں کو یوں سمجھئے کہ ایک پیڑ کی مختلف شاخوں پر بیٹھے ہیں۔ ان کے برخلاف ناول نگار تنے سے لپٹا ہوا ہے۔ وہ کسی مذہب کسی سیاسی نظریہ کسی علم کا پیرو نہیں ہوتا۔ وہ ان سب سے ہمدردی رکھتا ہے۔ مگر وہ ان سے بالاتر ضرور ہوتا ہے۔ اسے انسان سے سروکار ہے کسی ایک انسان کے لئے وہ جان دے سکتا ہے کسی نظریہ کے لئے نہیں۔ وہ غلط عقائد میں نہیں پڑتا۔ زندگی اس کے لئے کوئی کلیہ نہیں ہوتی۔ بلکہ افراد کا ایک دائرہ ہوتی ہے اگر وہ کسی ذہنی چیز کا خیال کرتا ہے تو وہ انصاف ہے۔ مگر وہ انصاف جس کی بابت شیکسپیر نے کہا ہے۔

MERCY SEASONS JUSTICE

اسکا یہ مطلب نہیں کہ وہ فن برائے فن کا قائل ہوتا ہے۔ فن برائے فن اور فن برائے زندگی کے دو مختلف متضاد دائرے اس کے لئے حماقت ہیں زندگی اپنا مقصد رکھتی ہے اور فن میں آکر اسکا مقصد زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ ناول نگار جس طرح ان سب کلیوں سے بالاتر نکل جاتا ہے اس کی مثال ہمیں میتھو آرنلڈ کے مضمون ٹولسٹوئے کی "انا کارینینا" میں ملتی ہیں۔ میتھو آرنلڈ کا یہ نظریہ تھا کہ ادب زندگی پر تنقید ہے۔ مگر انا کارینینا میں ورونسکی اور انا کے واقعات میں سے ورونسکی کو اپنے تئیں گولی مار لینے کے واقعہ کو بیان کر کے وہ کہتا ہے کہ یہ تنقید حیات نہیں بلکہ حیات ہی ہے۔ ٹولسٹوئے خود درس اخلاق کا قائل تھا اور اس نے شیکسپیر کو اسی بنا پر مطعون کیا ہے۔ کہ اسکے یہاں اخلاقی سبق نہیں ہے۔ مگر ٹولسٹوئے کی ناولوں کا کمال یہی ہے کہ وہ تنقید حیات سے بالاتر جا کر حیات ہی ہو جاتی ہیں۔ ناول نگار کے لئے فکر کا صحیح مقام یہی ہے ـــ

جس ناول کے فکر یا فلسفے کو چند الفاظ یا جملوں میں ادا کر دیا جائے۔ وہ محض یکطرفہ نظریہ کی حامل ہوتی ہے، اسلئے ناول کی حیثیت سے ناکامیاب ہوتی ہے اصل میں پوری ناول ایک مکمل فکر ایک مکمل فلسفہ ہوتی ہے جس میں سے کسی چیز کو اخذ کرنے سے پورے فلسفے کی سطح ٹوٹ جاتی ہے۔ اصل میں ناول میں جو فکر ہوتا ہے اس کو فلسفہ کہنا ہی غلط ہے۔ وہ ایک خاص قسم کی بصیرت ہوتی ہے جو ہر لفظ ہر واقعہ اور ہر کردار سے محسوس ہوتی ہے۔ قاری کو بھی پہلے ہی سے کچھ نہ کچھ بصیرت کا مالک ہونا ضروری ہے۔ ورنہ اس کے لئے ناول محض قصہ اور کردار کی دلچسپی سے آگے نہ بڑھے گی۔ مگر ناول نگاری کی بصیرت ہر قاری کی بصیرت سے مختلف ہی نہیں۔ بلکہ بہت زیادہ ہوتی ہے۔ قاری جب ناول پڑھتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک نئے عالم میں آگیا جس میں زندگی کی حقیقتیں صاف نمایاں ہیں جو اس کی آنکھوں سے پوشیدہ تھیں

لیپی تھیں۔ اور جب کوس کی آنکھیں ڈھونڈ رہی تھیں۔ یہ حقیقتیں ظاہری سطح بھی رکھتی ہیں۔ مگر تحت الثریٰ سے ایک طرف اور آسمان سے دوسری طرف ملحق ہو جاتی ہیں۔ یہ کائنات کی اس انجانی کے جزو میں جو تنوع بھی نمایاں ہوتا ہے۔ یہاں مختلف فطرتوں کی آپس میں جنگ اور سیجر حالات سے جنگ کے عجیب عجیب کرشمے نظر آتے ہیں عشق و محبت، نفرت اور دشمنی، خیر و شر عجیب عجیب طریقوں پر آہنگ میں آتے اور تصادم میں جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ قدرت ایک عقلمند ماں کی طرح اپنے بچوں پر تنبیہ کرتی ہوئی اور اس طرح ان کو سلیقہ سکھاتی ہوئی نظر آتی ہے ان بچوں میں زیادہ تر تو عام ہی نظر آتے ہیں مگر کچھ مخصوص انفرادیت کے مالک ہوتے ہیں اور معمار جہاں بنا تے ہیں ناول میں زیادہ تر صنف نازک کے عجیب لطیفے دکھائی دیتے ہیں۔ اور اسی صنف کے افراد عجیب عجیب حالات میں آکر زندگی کو خاص نوعیت سے نمایاں کرتے ہیں۔ ناول پڑھنے کے بعد قاری کی نظر بھی بدل جاتی ہے اور تمام زندگی ایک نئے رنگ میں رنگی نظر آتی ہے۔ قاری بھی ایک طرح کا مفکر ہو جاتا ہے۔

ناول نگار ایک فرد اور ذی وقار انفرادیت والا فرد ہوتا ہے اسلئے اس کی نظر بھی انفرادی ضرور ہوتی ہے اور اس کی فکر بہت کچھ اپنی ہوتی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ قاری اس سے پورا اتفاق کرلے۔ مگر فکر کی خوبی یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے اتفاق کریں۔ اسی میں ناول کی مقبولیت اور اس کی دائمی قیمت کا راز مضمر ہے۔ جن ناولوں کی فکر اپنے دور ہی کے لوگوں میں مقبول ہو جاتی ہے وہ اپنے دور سے آگے نہیں جاتیں۔ مگر دائمی اہمیت وہ ناولیں رکھتی ہیں جن کی فکر زمان و مکان سے آگے بڑھ کر آفاقی ہو جاتی ہے۔ عام طور پر ناول نگار اپنے مانوس ماحول کا نقشہ کھینچتا ہے۔ اور اپنے ذاتی تجربہ کو واضح کرتا ہے اسلئے ناول کے بابت یہ کہا جاتا ہے کہ وہ فلاں مقام کی فلاں زمانے میں تصویر ہے۔ مگر ناول عظیم دائرے میں جب ہی آتی ہے جبکہ وہ ایک زمانہ اور مقام کی تصویر ہر زمانے اور ہر مقام والوں کے لئے ہو جائے یہ قطرے میں دجلہ دکھائے۔ اور جزو میں کل۔ ناول نگار کا ظرف خود ستائی، خود نمائی سے بالاتر نظر آئے۔ اسکا تصور زندگی کا ایسا صاف اور مکمل چہرہ ہو جائے کہ وہ مکمل زندگی ہی نظر آئے وہ انسانیت کو ایک خاص نظر سے دیکھتی ہو۔ اور انسانیت ہی کی حامی ہو وہ اس سطح پر پہونچی ہوئی ہو جہاں سے اس دنیا کے خالق کا نقطہ نظر خاص طور پر واضح ہو جائے اس تک پہونچنے میں عام قاری کو کچھ دقت ضرور ہو مگر ایکدفعہ پہونچ جانے کے بعد وہ اس کی سطح سے ہی دنیا کو دیکھنے میں دلچسپی لینے لگے۔ ناول کا فکر کا ایسا مظاہرہ ہو کہ اپنے پڑھنے والوں کو مفکر بنا دے۔

عموماً ناول نگار اپنی فکر کو بیانات کے ذریعہ واضح کرتے ہیں انیسویں صدی میں یہ قاعدہ عام تھا مگر فکری مباحثوں اور شرحوں کو قصہ کی دلچسپی میں حائل ہو کر ناول کا اثر بگاڑتے دیکھا گیا اسلئے مکالمے میں معاملات پر بحثیں لائی گئیں۔ جو کچھ زیادہ دلچسپ ثابت ہوئیں مگر یہ دونوں طریقے بہت ہی کھلے اور ابتدائی تھے۔ اکثر ناول نگاروں نے ان کے استعمال میں ایک کیف پیدا کیا ہے۔ مگر ان سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ ناول کے واقعات اور کردار ات راتی ہو جائیں۔ عام واقعہ دیکھنے میں روز مرہ کی واقعاتی زندگی کی چیز ہو مگر وہ آفاقی زندگی کی ہمگیری اور گہرائی اپنے اندر لئے ہو۔ مثلاً ایما بواری ایک دیہات کی لڑکی ہے جسکا ذہن رومانی ہے اور وہ متلذذ رومانی واقعات سے ہمکنار رہتی ہے جو سب فرانس کے دیہات سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر اسکا ہر واقعہ رومانیت اور واقعیت کی اس کشمکش کا اشارہ بھی ہے جو جدید دور میں ہر پڑھی لکھی لڑکی کے حصے میں آتی ہے۔ فلابیر پر جب عورتوں کی توہین کا مقدمہ چلایا گیا تھا تو اس نے کچہری میں کھڑے ہو کر یہ بات کہی تھی کہ وہ عورت جو یہاں موجود ہے ایما ہے۔ اصل میں ایما ہر عورت کا چہرہ ہے اور اس کی حرکات معمولی سی آفاقی چیز تک لیجاتی ہیں۔ جو نسائیت کہلاتی ہے اعتبار زیادہ ہم اس کے قصے کو پڑھتے ہیں اتنا ہی زیادہ ہم نسائیت سے واقف ہوتے جاتے ہیں۔ نسائیت کے راز کی گہرائیوں میں اترتے جاتے ہیں۔ فلابیر کہیں توضیح نہیں کرتا۔ اور کسی مکالمے میں بحث نہیں لاتا مگر اسکا ہر بیان اور ہر مکالمہ ہماری توجہ کو ایما کی زندگی کی گہرائیوں ہی پر جماتا ہے اور جمائے رکھتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ناول نگار کا ذہن ایک کیمرے کی طرح کام ہے جو خاص طور پر ان جزو وعبث پر فوکس کر دیا گیا ہے جو معمولی چیزوں میں چھپے ہیں مگر آفاق سے ہمکنار ہیں۔ ظاہرہ چیزیں نہایت معمولی ہیں۔ مگر تصویر میں اسکا وہ پہلو سامنے ہے جو قطرہ میں دجلہ اور جزو میں کل دکھاتا ہے۔ فلسفہ تو خشک طریقہ پر حقائق کے کلیے بناتا ہے۔ ناول نگار کلیوں سے دور رہتا ہے اور ان حالات کا نقشہ کھینچتا ہے جو کلیوں کی بنیاد ہوتے ہیں۔

ادیب اور حب الوطنی

"اگر ہم نے لکھنے کا پیشہ اختیار کیا ہے تو ہم میں سے
ہر شخص ادب کے سامنے جوابدہ ہے۔"
ژاں پال سارتر

کچھ دن سے مجھ میں یہ عیب پیدا ہو گیا ہے کہ لکھنے سے پہلے جب تک کسی استاد قسم کے آدمی کا کوئی فقرہ نہ سوجھے تو کاغذ قلم لے کر اگر دس دن بھی میں اونگھتا رہوں تو کیا مجال کہ دماغ ذرا سا ساتھ دے لے اور میں ایک لفظ بھی لکھ سکوں۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم لوگوں کو بچپن سے ہر کاغذ کے شروع میں بسم اللہ لکھنے کی عادت رہی ہے اور اب چونکہ اس کا رواج اٹھ گیا ہے اس لئے میں نے اس کا بدل یہ تلاش کر لیا ہے کہ شروع ہی میں بسم اللہ کے بجائے کسی استاد قسم کے آدمی کا فقرہ لکھ دیتا ہوں۔ دوسری وجہ اس کی یہ بھی ہے کہ اس فقرہ سے نفس مضمون کے طرز احساس کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور پڑھنے والا شروع ہی سے اس طرز احساس کو غیر شعوری طور پر قبول کر لیتا ہے اور میرے لئے یہ سہولت پیدا ہو جاتی ہے کہ مجھے اونٹ کو کسی نہ کسی کروٹ بٹھانے میں دشواری نہیں ہوتی۔

اس مضمون کے شروع میں جو میں نے سارتر کا ایک فقرہ نقل کیا ہے اس سے میری ذاتی سہولت کے علاوہ دو باتیں اور بھی پیدا ہوتی ہیں۔ ایک تو ادب کے پیشہ کا مسئلہ اور دوسرا ادب کے سامنے جواب دہ ہونے کی ذمہ داری۔ اس فقرہ کے لہجے سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ گویا ادب خدا ہے۔ اور بحیثیت ادیب ہماری ساری ذمہ داری ادب سے وابستہ ہے۔ رہے باقی مسائل تو وہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ اور اب جو ہمارے ہاں ادب میں خزاؤں کا دور دورہ ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ہم ادب کے سامنے جاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک طرف تو ہم نئے خیالات سے اور اپنے تجربات کی سچائی سے خوف کھانے لگے ہیں اور دوسری طرف ہماری تخلیقی شخصیت بھی سکڑ کر چھوٹی ہو گئی ہے۔ اس بوکھلاہٹ میں ہمیں اب کوئی چیز بھی صاف نظر نہیں آ رہی ہے یار لوگ اس حالت سے یہ فائدہ اٹھا رہے ہیں کہ ہمیں سائے سے ڈرا کر اور دہشت زدہ کئے دے رہے ہیں تاکہ ہمارے زمانے کا ادیب نہایت ہی ایمانداری کے ساتھ دھوبی کا کتا بن کر رہ جائے۔ بہرحال آپ کو یہ حالت منظور ہو تو ہو مجھے تو اس کے تصور ہی سے تے آتی ہے آپ نے وہ قصہ تو سنا ہی ہوگا کہ ایک پری کسی انسان پر عاشق ہو گئی مگر اپنی ساری کوششوں کے باوجود اسے رام نہ کر سکی اور ناراض ہو کر اسے یہ سزا دی کہ جب بھی وہ منہ کھولے گا اس کے منہ سے مینڈک جھڑیں گے۔ لیجئے اس بے چارہ کا تو کام ہی تمام ہو گیا۔ اگر منہ کھولتا ہے تو مینڈک جھڑتے ہیں اور اگر نہیں کھولتا تو یہی مینڈک پیٹ میں ہنڈکلیا پکاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ جو مسئلہ اس انسان کے سامنے پیدا ہو گیا تھا وہی مسئلہ اب ہمارے ادیبوں کے سامنے پیدا ہو گیا ہے۔ ——— منہ کھولے یا نہ کھولے میں اسی کشمکش و پیچ میں تھا کہ ایک نئی بات شروع ہو گئی اور ادیبوں سے ادیبوں نے کہا کہ اس وقت حب الوطنی کا مسئلہ سب سے بڑا مسئلہ ہے اور اس ضمن میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ مستقبل کے تاریخ کو یہ کہنے کا موقع نہ دیجئے کہ آج کا مصنف اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ نہ ہو سکا۔ لیجئے اب تک تو ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ ادیبوں کے مسائل کچھ اور ہیں لیکن اب یہ معلوم ہوا کہ دوسرے مسائل کچھ نہیں ہیں۔ وقت کا سب سے بڑا مسئلہ حب الوطنی کا مسئلہ ہے۔ ہمیں بحیثیت ادیب اور

ہزاروں انسانوں کے خیال آئے لیکن حب الوطنی کو تو ہم نے ہمیشہ اپنے مزاج، اپنے نفس میں رچا بسا پایا۔ ایک ایسی بھینی بھینی خوشبو جس سے ہر دم دماغ معطر و مشام معطر رہتے، یہ سرزمین، یہ ملک، یہ لوگ، یہ آندھیاں۔ اسی لئے میں نے بھی سوچا کہ پیٹ میں ہنڈکلیا پالنے سے کیا حاصل بہتر ہے کہ مینڈک منہ سے ہی پھٹرنے لگیں۔

حب الوطنی سے عام طور پر یہ بات مراد لی جاتی ہے کہ ادیب اپنی تحریروں اور اپنے خیالات کے ذریعہ کوئی ایسی بات پیش نہیں کریں گے جس سے مملکت کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔ جیسے نقصان کی تعریف کئے بغیر یہ بات قابل قبول لیکن جب ایک ہی سانس میں یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ مملکت کو اس سے بھی نقصان پہنچ سکتا ہے اگر ہم نے ان خیالات کو قبول نہ کیا جنہیں ہمیں قبول کرنے کے۔ لئے کہا جائے تو بات مینڈک جھڑنے تک پہنچ جاتی ہے۔ اس سے مطلب نکلا کہ حب الوطنی کے مسئلہ کو جھنڈے پر چڑھا کر ادیب کو سوچنے سے روکنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور اس سے بار بار یہ کہا جا رہا ہے کہ اسے ادب کے سامنے جواب دہ نہیں ہوتا ہے بلکہ .... (معاف کیجئے یہ جملہ ہزار کوشش کے باوجود مجھ سے مکمل نہ ہو سکا۔ براہ کرم اسے میری کم علمی پر محمول فرمائیے)۔

تخلیقی و فکری اعتبار سے حب الوطنی ہمارے وجود، ہماری شخصیت اور ہمارے مزاج سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ تو ہمارے شعور اور ہمارے تخلیقی جوہروں کا ایک جزو لاینفک ہے۔ ظاہر ہے کوئی بھی حقیقی ادیب اسی شاخ کو ہرگز نہیں کاٹے گا جس پر وہ بیٹھا ہے۔ وطن دشمنی کوئی حقیقی ادیب اگر کرنا بھی چاہے تو نہیں کر سکتا۔ وہ ایک وقت میں صرف ایک ہی کام کر سکتا ہے یا تو تخلیق کرے یا وطن دشمنی۔ مملکت سے ادیب کا تعلق ان لوگوں سے کہیں زیادہ گہرا ہے۔ جو نظم و نسق چلانے پر معمور ہیں لیکن حکومت سے ادیب کا وہ تعلق نہیں ہے جو ان لوگوں کا ہے۔ دراصل ساری غلطی اسی بات سے پیدا ہوتی ہے کہ یہ لوگ مملکت اور حکومت میں کوئی فرق نہیں کرتے حب الوطنی کے مسئلہ پر غور کرتے وقت اس امتیاز کو خاص طور پر ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم نے حب الوطنی کو صرف حکم الوطنی کے ساتھ وابستہ کر دیا تو ہمارے ہاں خیال اور الفاظ کا رشتہ ناطہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے معدوم ہو جائے گا اور ہمارے وطن عزیز میں کلچر کی پیدائش کا مسئلہ دشوار ہو کر رہ جائے گا۔ ویسے تہذیب و فکر کے علمبرداروں کے لئے یہ کوئی نئے طعنے نہیں ہیں۔ سقراط سے لے کر سرسید تک سب نے ان طعنوں کو اٹھایا ہے اور آج ہم انھیں اپنے سروں پر بٹھاتے ہیں اور آنکھوں میں جگہ دیتے ہیں۔

جنہوں نے زندگی کے کسی شعبے میں سوچنے اور تخلیق کرنے کا کام کیا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ وہ شخص جسے اپنے ملک، اپنی سرزمین سے محبت نہ ہو وہ کوئی تخلیقی یا فکری کام کر ہی نہیں سکتا۔ ادیب کے مزاج میں تو ہمیشہ اس کا ملک، اس کے لوگ اور ان کی اقدار محبت کا جذبہ غیر شعوری طور پر موجود ہوتا ہے۔ یہ بات کوئی بتانے کی نہیں ہے کہ ادیب اپنے لوگوں اور اپنے معاشرہ کے لئے لکھتا ہے اور اگر لکھتے وقت اس کے لوگ اور اس کا معاشرہ اس کے شعور میں براہ راست موجود نہ ہوں تو ممکن ہے وہ باہر دار کا کام کرے تو کرلے وہ کم از کم کچھ لکھ کر دکھا نہیں سکتا۔ یہ بات بھی ظاہر ہے کہ ادیب کو اس زبان سے جس میں وہ لکھتا ہے ایک گہرا لگاؤ ہوتا ہے۔ اس زبان سے اس کی زندگی کے سارے رشتے ناطے وابستہ ہوتے ہیں۔ پھر اس زبان کے بولنے، پڑھنے اور سمجھنے والے زیادہ تر اس کے اپنے ملک کے جغرافیائی حدود میں ہوتے ہیں۔ اس کے خیالات و احساسات کا عمل اور ردعمل اسی معاشرہ کے اندر رہ کر پیدا ہوتا ہے جن پر وہ اپنی تخلیق کی بنیاد رکھتا ہے۔ اس کے پڑھنے والے بھی اسی معاشرہ میں ہوتے ہیں جن سے وہ ملتا ہے۔ جن میں وہ اٹھتا بیٹھتا ہے اور بات چیت کرتا ہے۔ اتنے بہت سارے بنیادی رشتوں کے بعد ظاہر ہے کہ ادیب اس درخت کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے کا تصور بھی ذہن میں نہیں لا سکتا جس پر اس کا آشیانہ قائم ہے۔ آپ اپنی زبان کے ایک ادیب کی مثال پیش نہیں کر سکتے جو اپنے ملک و معاشرہ سے باہر رہ کر کچھ لکھ پڑھ بھی سکا ہو اور اس کی وجہ یہی ہے کہ تخلیقی محرکات ایک طرف تو خود اس معاشرہ کے اندر رہ کر پیدا ہوتے ہیں جس میں ادیب رہتا ہے اور جو اس کا اپنا وطن ہے اور دوسرے سامعین کے رشتے کا براہ راست تصور اس میں تخلیق کی آگ بھڑکاتا رہتا ہے۔ اور یہ دونوں باتیں ادیب کو اپنے وطن سے باہر رہ کر حاصل نہیں ہو سکتیں۔ ادیب تو اس طرح محب وطن ہوتا ہی ہے۔ اس پر کسی قسم کا شبہ کرنا اس بات کی علامت ہے کہ ہم نے صحافت اور سیاست کو ادب کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہے اور ان کی گندگی اب ادب میں تلاش کرنے لگے ہیں۔ اگر یہی ہوتا تو بورس پیسٹرنک اسٹالن کے جور و ظلم کے بعد یا پھر ڈاکٹر ژواگو کی اشاعت اور ہنگامہ کے بعد ماسکو سے بھاگ کر پیرس یا نیویارک میں پناہ ڈھونڈ لیتا۔

مگر اسے وطن چاہئے اس کا رشتہ اس کی اپنی سرزمین سے ہے۔ اس کے تخلیقی جوہروں کا ارتقا اس کے اپنے ملک کی معاشی اقتصادی اور سماجی حالات پر ہے۔ اسی لئے معاشرہ، اپنے معاملات اور تاریخ سے ہے ـــــ یہی وجہ ہے کہ دور حکومت میں جو ادیب جرمنی چھوڑ کر مختلف ملکوں میں پناہ گزین ہو گئے تھے ان کے تخلیقی سوتے خشک ہو کر رہ گئے جا سکتے ہیں کہ اپنے ملک اور اپنی زبان بولنے والوں کے ساتھ اگر تخلیق کیا ہے کیا ہو جاتی ہے یہی رشتہ جب دور ہو جاتا ہے تو تخلیقی جوہروں کی چمک کسی حد تک ماند پڑ جاتی ہے۔ لکھنے کے کام میں صرف ادیب کی ذات ہی شریک نہیں ہوتی۔ بلکہ سارا معاشرہ اور اس کے لوگ برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ ہر حقیقی ادیب کا شعوری اور غیر شعوری طور پر اپنے وطن کے ساتھ گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ خداوندان اقتدار کو کسی ادبی تحریر کا جائزہ لیتے وقت اس بات کو ضرور ملحوظ رکھنا چاہئے اگر ادیب کی تحریروں کے طرز احساس کو سمجھے بغیر ہم نے اس پر وطن دشمنی کا الزام تراشنا شروع کر دیا تو ادب اور کھلے جائے سارے تہذیبی رشتے بوسیدہ ہو کر منتشر ہو جائیں گے اور وہ یکجہتی جس کی آرزو لے کر ہم نے ایک قوم ایک زبان ایک تہذیب کے خواب دیکھے تھے ہماری ساری کوششوں کے باوجود شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گی اور یہ ہمارا سب سے زیادہ دردناک المیہ ہوگا۔ تنگ نظری۔ اور اس کی بیسیوں شکلیں ہیں ـــــ ہماری سب سے بڑی دشمن ہے۔

ہمیں حب الوطنی کے مسئلہ کو مروجہ نظریات و عقائد کی تنگی کے ساتھ وابستہ نہیں کرنا چاہئے۔ ادیب کو ایک سچے محب وطن کی حیثیت سے اس بات کی آزادی ہونی چاہئے کہ وہ اپنے خیالات کا اپنے طور پر آزادی کے ساتھ اظہار کر سکے۔ آج تک ایک مثال نہیں پیش کی جا سکتی کہ کسی سچے ادیب نے کسی لالچ یا حرص زر وجاہ میں وطن دشمنی کی ہو، ہاں خود غرض سیاست دانوں کی مثالوں سے تاریخ انسانیت آج بھی خون کے آنسو رو رہی ہے۔ مروجہ نظریات سے اختلاف اور نئے خیالات و احساسات کے اظہار کو وطن دشمنی کا نام دینا کوئی دانشمندی کی بات نہیں ہے۔ ادیب تو اس لئے لکھتا ہے کہ اس نے یہ فرض سنبھال لیا ہے کہ اس دنیا میں جہاں آزادی کو ہر دم کھٹکا لگا رہتا ہے آزادی کے نام اور آزادی سے مخاطب ہونے کی سرگرمی کو جاودان بنا دیا جائے۔ اس سلسلے میں اب ایک بہت ہی واضح قسم کی مثال لیجئے۔ الجزائر کے مسئلہ پر فرانس کے ادیبوں میں بڑی گرما گرم بحث ہوتی رہتی ہے۔ وہاں کے ادیبوں کا ایک گروہ ایسا ہے جو الجزائر کی آزادی کا حامی اور طرفدار ہے اور اسے خود فرانس کے مستقبل کیلئے ایک نیک شگون سمجھتا ہے۔ ژاں پال سارتر نے اس سلسلہ میں نہ صرف بہت سے مضامین لکھے ہیں بلکہ جلسہ جلوسوں میں پیش پیش رہ کر الجزائر کی آزادی کی کھلے بندوں حمایت کی ہے فرض کیجئے اگر ہمارا ادیب حکومت وقت کی پالیسی کے خلاف یہ سمجھ کر کہ یہ رویہ اس کے اپنے ملک کے لئے مضر ہے یہی اقدام کرتا جو فرانس میں سارتر نے کیا تو کیا ہم اس ادیب پر وطن دشمن کا الزام نہ لگا دیتے؟ لیکن فرانس میں سارتر کے مخالفین نے جو کچھ بھی کہا وہ اپنی جگہ لیکن ان کے ذہن میں وطن دشمنی کا تصور تک نہ آیا۔ ہم پاکستان میں بیٹھ کر الجزائر کے مسئلہ پر زیادہ غیر جانبداری اور آزادی کے ساتھ سوچ سکتے ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ الجزائر کی آزادی خود فرانس کی آزادی کے لئے ضروری ہے مسلسل جنگ کی وجہ سے جو مالی نقصان اور معاشی افراتفری اس وقت فرانس میں پھیلی ہوئی ہے اس سے خود فرانس کی آزادی خطرہ میں پڑ رہی ہے لیکن وہاں کی حکومت نے انڈوچین کی تلخ یادوں کو پھر ذہن سے فراموش کر دیا ہے لیکن ادیب کے لئے تو یہ تلخ یادیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں اسی لئے اس کا رویہ زیادہ حقیقت پسندانہ اور منصفانہ ہوتا ہے۔

اب ایک مثال اور لیجئے۔ فرض کیجئے ہندوستان کے ادیبوں کا ایک گروہ یہ نقطۂ نظر پیش کرے کہ کشمیر کے مسئلہ کو اس طرح الجھائے رکھنے سے ہندوستان کا نقصان ہے اور اس کے منصفانہ فیصلے سے ہمارے بہت سے بنیادی مسائل حل ہو سکتے ہیں تو ظاہر ہے کہ وہاں کی حکومت وقت اسے وطن دشمنی کا نام دے گی لیکن درحقیقت یہ ایسی حقیقت پسندانہ بات ہے کہ خود ہندوستان کی ہمہ گیر ترقی اور وسیع آزادی کے لئے ضروری ہے۔ ادیب کے رویہ کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہئے لیکن خود ادیب کے ہاں یہ رویہ اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب وہ آزادی کی ہوا محسوس کرتا ہے لہٰذا یہ ہم یہ خیال بھی ستاتا ہے کہ اسے صرف ادب کے سامنے جواب دہ ہونا ہے۔

یہاں اسی سلسلہ میں ایک اور بات کا بھی ذکر کرتا چلوں۔ اکثر اوقات ادیبوں کو اس بات کا بھی مشورہ دیا جاتا ہے کہ ابھی انھیں آزادی سے پہلے کے جذباتی و نفسیاتی ماضی سے نکلنا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے ناول "آگ کا دریا" پر جو بحث چھڑی تھی اس میں بھی اسی قسم کی بے معنی باتوں کو سیاسی انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ ن۔م۔ راشد نے اس ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یو۔پی کے مسلمانوں کے المیہ کی وجہ وہ کشمکش ہے جس میں ہندوستان کی تقسیم نے اسے مبتلا کر دیا ہے

کشمکش کا باعث ایک طرف وہ آئیڈیلزم ہے جو اسے اپنی الگ قومیت کے خواب دکھاتی ہے۔ دوسری طرف متحدہ ہندوستان کے قصبوں کی کشش ہے جو اس کا دامن کھینچتی ہے ان بنیادی کشمکشوں میں مقامی وابستگیوں اور تاریخی یادوں کے عناصر اور پاکستان کے ابتدائی برسوں کی آبادیاتی اور مقامی نفرتیں مل کر کشمکش کو سنگین تر بنا دیتی ہیں۔ یہ المیہ اس انسان کا ہے جسے کچھ اس کی مرضی سے اور کچھ اس کی مرضی کے بغیر وہ دور ایسے پر لا کر کھڑا کر دیا ہے اور اسے ایک طرف الاؤ نظر آتا ہے اور دوسری طرف طوفان"

الاؤ اور طوفان کی بات کے ماسوا یہ بات دلچسپ ہے کہ ان مسلمانوں کو آپ الگ کر کے اب بھی اتنے سارے سال گزر جانے کے بعد پاکستان کے مسلمانوں کے زمرہ میں شامل نہیں کر رہے ہیں۔ حالانکہ وہ لوگ نہ اب یوپی سے کوئی جذباتی لگاؤ رکھتے ہیں اور نہ اس سرزمین سے ان کا حب الوطنی کا کوئی تعلق باقی رہا ہے۔ یہ بات لیتے وقت یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ وہ لوگ جو الگ قومیت، الگ تہذیب اور ایک زبان کا آدرش لے کر اس ملک میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بسنے آئے تھے ان میں ان لوگوں کے مقابلہ میں جن پر نہ اتنے ظلم ٹوٹے اور نہ آفتیں آئیں زیادہ آئیڈیلزم اور سرزمین پاکستان سے زیادہ جذباتی و روحانی لگاؤ تھا۔ وہ اپنے ساتھ کچھ اقدار لائے تھے۔ تہذیب کے کچھ عناصر لائے تھے۔ ایک ستھری نکھری عوامی زبان لائے تھے۔ وہ اپنے ساتھ عظیم روایات کی ایک عظیم داستان لائے تھے۔ تاج محل اور لال قلعہ کی تاریخ اور اس کی اقدار لائے تھے اور جب انہوں نے اس سرزمین پر قدم رکھا تو اپنے جہاز جلا دیئے اور لنگر توڑ دیئے اور اسی آدرش کے پیش نظر اپنی تہذیب کے صحت مند عناصر کے بیج اس سرزمین میں ڈالنا شروع کئے تاکہ اس طور پر وہ اس آدرش کو حاصل کر سکیں جس کی آرزو میں انہوں نے الگ قومیت کا نعرہ بلند کیا تھا۔ الگ تہذیب اور ایک زبان کا علم بلند کیا تھا۔ انہیں نہ اس سرزمین سے جہاں سے وہ آئے تھے کوئی جذباتی و نفسیاتی لگاؤ باقی نہ تھا۔ اور نہ وہ مڑ کر آنکھ اٹھا کر دیکھنا چاہتے تھے۔ البتہ انہیں اپنی زندگیوں کے وہ لمحے اور وہ دن یاد تھے جو انہوں نے وہاں گزارے تھے۔ پرسکون دن، خوشگوار فضا اور حسین یادیں۔ وہ یادیں جو ان کے بچپن، لڑکپن اور نوجوانی کے خوشگوار ماضی سے وابستہ تھیں۔ جن میں گلی کوچوں، اسکول کالجوں کی سحر آفریں فضاؤں کا تصور تھا۔ ظاہر ہے کہ ماضی کی حسین یادوں کو کون بھلا سکتا ہے؟ کم از کم ادیب تو یہ کام نہیں کر سکتا۔ وہ تو ان یادوں کو ادب و فن کی تخلیق کے لئے ایک اہم و قیمتی سرمایہ سمجھتا ہے۔ ایسے میں اگر ان ادیبوں سے یہ کہا جائے کہ وہ ان یادوں کا ذکر نہ کریں تو اس کے معنی صرف یہ ہوئے کہ وہ ادیب اپنا تخلیقی کام بند کر دیں اور بار برداری کا پیشہ اختیار کر لیں۔ اگر یہ ادیب سچائی کے ساتھ اپنی یادوں کو دہراتے ہیں جن کے ضمن میں ہندوستان کے قصے بھی آ جاتے ہیں۔ اور ان میں کچھ تلخی بھی محسوس ہوتی ہے (اور حقیقت سے زیادہ تلخ چیز اور کیا ہوگی) اس کی وجہ سرزمین ہندوستان کو وطن کے طور پر یاد کرنے کا جذبہ نہیں ہوتا بلکہ یہ تلخی اس آدرش کے ٹوٹنے سے پیدا ہوتی ہے۔ ہمارے معاشرہ میں جہاں ایک قوم کے تصور سے زیادہ قبیلہ پرستی کی ہوا چل رہی ہے اور جہاں آدرش پاش پاش ہو رہا ہے ایک وسیع النظر اور کھلے دماغ کا محب وطن ادیب کیسے سراہا سکتا ہے؟

اس سلسلہ میں ایک بات اور پیدا ہوتی ہے جسے ہمیں بحیثیت ادیب فوراً طے کر لینا چاہئے تاکہ ہم کلچر کے ذریعہ مختلف قبیلوں میں یک جہتی پیدا کر کے ایک جاندار مہذب قوم کو جنم دے سکیں۔ کیا وہ اقدار جن کا نمائندہ تاج محل ہے ہمارے لئے کوئی اہمیت رکھتی ہیں؟ کیا لال قلعہ ہمارے لئے تہذیبی روایت کی حیثیت رکھتا ہے؟ کیا میر، غالب، سرسید، حالی ہمارے ادیب و شاعر ہیں؟ کیا امیر خسرو، میر امن، فسانۂ آزاد اور طلسم ہوشربا ہماری تہذیبی روایات کی نمائندگی نہیں کرتے؟ اور کیا موہنجوداڑو اور ہڑپا کی تہذیبی روایات ہماری روایات ہیں؟ پاکستانی تہذیب کی پیدائش کیلئے یہ باتیں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔ اسی مسئلہ کے جواب اور صحیح حل کے ذریعہ ہم تنگ نظری کے عفریت سے آزادی حاصل کر سکیں گے اور ایک صحت مند تہذیب کو جنم دے سکیں گے۔ ایک ایسی تہذیب جس میں سب انسان برابر ہوں گے جس کے ذریعہ قومی یک جہتی پیدا ہو سکے گی اور جس کی کوکھ سے سچے محب وطن پیدا ہو کر جاندار اور تنومند پاکستانی قوم کو جنم دے سکیں گے۔ ہمارے عزیز ملک کا مستقبل اسی مسئلہ کے حل پر قائم ہے۔

— ⁘ —

اعجاز الحق قدوسی ★

شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ

سندھ کے عظیم صوفی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی یاد میں یہ مضمون خاص طور سے شائع کیا جارہا ہے۔ جن کا عرس اسی ماہ بھٹ شاہ میں منایا جا رہا ہے ــــــــ (ادارہ)

سندھ کی سرزمین سے یوں تو ہر دور میں جلیل القدر علما، عظیم المرتبت صوفیا اور نامور شعرا اٹھے، لیکن جو شہرت و مقبولیت بحیثیت ایک صوفی اور شاعر ہونے کے شاہ عبداللطیف کو حاصل ہوئی وہ دوسروں کا مقدر نہ بن سکی، سندھی ادب و شعر کو جن بزرگوں نے آب و رنگ بخشا، ان میں شاہ کریم، سچل سرمست، میاں عیسیٰ، روحل، بیدل، بیکس، سب ہی ہیں، لیکن زمانہ جوں جوں آگے بڑھتا جاتا ہے، شاہ کی شاعری کی عظمت اہل نظر پر اسی قدر واضح ہوتی جاتی ہے، ایک طرف ان کی ذات روحانی برکات کا سرچشمہ ہے، دوسری طرف ان کی شاعری اثر و تاثیر، سوز و گداز، فلسفہ و حکمت کا وہ خزینہ ہے کہ ان کے اشعار کو آج دوسو برس گزرنے کے بعد بھی اہل نظر حرز جاں بنائے ہیں، وہ جہاں اپنی شاعری سے روحانی اور جمالیاتی ذوق کو بلند کرتے ہیں، وہیں ان کے نغموں میں ایک ایسی روحانی دنیا کی تعمیر کی خواہش پائی جاتی ہے جو زندگی کے حقائق کو سمجھے اور معرفت الٰہی کو اپنا مقصد بنائے، ان کے پرکیف اشعار میں تخیل کی بلند پروازی افکار کی رعنائی، نرم و نازک احساسات کی فراوانی، عوام کی زندگی کے ترجمانی کے وہ حسین عناصر موجود ہیں کہ پڑھنے والا جب ان اشعار کو پڑھتا ہے تو بے اختیار سر دھنتا ہے۔

عارف بھٹائیؒ ۱۶۸۹ء میں ہالا حویلی میں پیدا ہوئے جو پرگنہ ہالا کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ ان کے والد کا نام سید حبیب شاہ تھا جو کاظمی سادات سے تھے۔

مشہور ہے کہ شاہ عبداللطیف نے کسی سے تعلیم حاصل نہیں کی، صاحب مقالات الشعرا میر علی شیر قانع ٹھٹوی نے ان کے محامد و فضائل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

آنجناب لطیف اگرچہ اُمی بود، اما علم عالم بتمام بر لوح دل شاں مثبت بودہ

میر علی شیر قانع کے اس بیان کے بعد سندھ کے ادیبوں اور دانشوروں میں یہ مسئلہ مستقل طور پر ایک موضوع بحث بنا ہوا ہے، مرزا قلیچ بیگ، مولانا دین محمد وفائی مرحوم، ڈاکٹر گربخشانی، پروفیسر کلیان اڈوانی اور ڈاکٹر سورلے وغیرہ نے کافی چھان بین کر کے اس مسئلے پر اپنے اپنے خیال کے مطابق روشنی ڈالی ہے، لیکن ہماری رائے میں ان کو امی قرار دینا صحیح نہیں، ان کے کلام کے مطالعے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے دور کے بہت بڑے عالم تھے، عربی، فارسی اور ہندی پر ان کی نظر کافی وسیع تھی، قرآن و حدیث کی حکمتوں، تصوف کی دقیق اصطلاحوں کو انہوں نے اپنے اشعار میں جس طرح سمویا ہے، انھیں دیکھ کر یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ وہ امی تھے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ عرفان و معرفت کا نور بچپن ہی سے

ان کے چہرے پر ہویدا تھا، ذکروفکر میں مصروف رہتے تھے، اور اپنے وقت کا بڑا حصہ اہلِ دل اور صوفیا کے ساتھ گزارتے تھے گفتگو میں ایک شیرینی اور رس تھا، محبت، ہمدردی، رحم وکرم ان کی فطرت تھی، استغنا و بے نیازی کا یہ عالم کہ دولت دنیاوی کو چھوڑ کر دولت ایمانی کو اپنا مطمح نظر بنائے ہوئے تھے قدرت نے دلِ ہمدردی کی نعمت سے ان کو نوازا تھا، کسی کو تکلیف میں دیکھتے تو تڑپ اٹھتے، جوانی میں ان پر کچھ دنوں عشق مجازی کا غلبہ رہا، اس عالم میں جوگیوں اور سنیاسیوں کے ساتھ صحرانوردی کرتے رہے، آخر مجاز نے حقیقت کے جلوے دکھائے، اور حقیقت کے جمال نے مجازی چنگاریوں کو اس طرح ٹھنڈا کیا کہ شاہ "بھٹ" میں مقیم ہو کر یادِ الٰہی میں مصروف ہو گئے۔ شاہ کی برکتوں نے اس ویرانے کو وہ رونقیں بخشیں کہ یہ ریت کا ٹیلہ "شاہ بھٹ" کے نام سے مشہور ہوا، یہیں انھوں نے عرفان وہدایت کی شمع روشن کی، اسی سرزمین میں ان کی شاعری کے دیئے روشن ہوئے، جن کی روشنی اور تابانی نے عالم کو منور کر دیا۔

شاہ کو سترہویں اور اٹھارویں صدی کے انقلابات نے بیحد متاثر کیا تھا، اورنگ زیب کی وفات کے وقت ان کی عمر اٹھارہ سال کی تھی یہ وہ وقت تھا کہ سلطنت مغلیہ کی بنیادیں متزلزل ہو رہی تھیں، اورنگ زیب کے جانشینوں کی بے راہ روی یہاں سلطنت مغلیہ کے آفتاب کو تیزی سے غروب کی طرف لا رہی تھی وہیں اس کا اثر عوام کی زندگی پر بھی پڑ رہا تھا۔ صوبے مرکز سے منقطع ہو کر اپنی خود مختاری کی طرف تیزی سے قدم بڑھا رہے تھے، خود ان کے وطن سندھ میں کلھوڑا خاندان کی حکومت خود مختاری کے خواب دیکھ رہی تھی، انھیں کے زمانے میں نادر شاہ کی مصیبت سندھ پر نازل ہوئی انھیں کے زمانے میں احمد شاہ ابدالی نے سندھ کو کابل کی حکومت کا جزو بنایا، ایک طرف سیاسی نظام کی چولیں ہل چکی تھیں، دوسری طرف عوام کی مذہبی اور اخلاقی حالت اس درجہ گر چکی تھی کہ سماجی نظام کا سارا ڈھانچہ منہدم ہو رہا تھا، طبقاتی برتری نے غریبوں کی زندگی کو سوہانِ روح بنا دیا تھا، دولت مند عیش وعشرت کی زندگی میں غرق تھے غریب ایک روٹی، بسورتی اور سسکتی ہوئی زندگی بسر کر رہے تھے، علماء سو بادشاہوں اور امرا سے منسلک ہو کر اس سیاست میں حصہ لے رہے تھے، جس کی بنیاد عوام کی خدمت اور فلاح وبہبود پر نہ تھی، بلکہ اپنے لئے اس ذریعہ سے جاہ ومنزلت کی راہیں فراہم کرنا تھا، صوفیائے خام کی زندگی کا سرمایہ غیر اسلامی فکر وکردار بنا ہوا تھا، انھوں نے اسلامی تصوف کے سرچشموں کو خشک کر کے اپنی معاشی چراگاہوں کو سرسبز رکھنے کے لئے ویدانت اور اپنشد کو اپنایا تھا، ان کی بدولت عوام کی گمراہی اس درجہ بڑھ چکی تھی کہ عوام ان کی غیر شرعی حرکات کو حجت سمجھتے تھے۔

یہ بھیانک ماحول شاہ عبداللطیف کی زندگی پر غیر معمولی طور پر اثر انداز ہوا، انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ سے مظلوم انسانیت کو پریم اور محبت کا پیغام دیا ان کی ساری زندگی کی جدوجہد یہ تھی کہ عالم انسانیت کو سربلند کیا جائے۔ اور بندوں کے رشتے کو خدا سے اس طرح جوڑا جائے کہ دنیا حسن اخلاق اور پاکیزگی کردار سے جگمگا اٹھے، چالیس سال تک وہ مسلسل اپنی شاعری کے ذریعہ سے شریعت طریقت، حقیقت اور معرفت کا پیغام دیتے رہے، انھوں نے سندھ کی رومانی داستانوں کو اپنی شاعری کی بنیاد بنا کر عوام کے دکھوں اور غموں کی ترجمانی کی، انہوں نے عوام کی قنوطیت کو رجائیت سے بدل کر ان میں زندگی کی ایک نئی امنگ اور ولولہ پیدا کیا، انہوں نے سندھی ادب کو ان عناصر سے وہ روایات بخشیں کہ اس کا شمار ادب عالیہ میں ہونے لگا۔

ہم یہاں ان کے چند اشعار کا ترجمہ نقل کرتے ہیں، جو ان کے شاعرانہ کمالات کے آئینہ دار ہیں، اور جن سے ان کی فکر رسا کے جوہر سامنے آتے ہیں، ایک بیت میں وہ اپنی شاعری کے مطمح نظر کو بیان کرتے ہوئے یوں نغمہ سرا ہوتے ہیں۔

اس کلام کو معمولی اشعار نہ سمجھو، یہ آیات ربانی ہیں۔
یہ آیات، اپنے پڑھنے والوں کو محبوب حقیقی کی طرف لے جاتی ہیں

وحدت الوجود صوفی شعرا کا خاص موضوع رہا ہے، شاہ کے اپنے مجموعۂ کلام "شاہ جو رسالو" میں اس موضوع پر کثرت سے اظہار خیال کیا ہے لیکن اس طور پر کہ احتیاط اور اعتدال کا دامن کہیں ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا، دیکھئے وہ کس دل آویزی سے اس نظریہ کو پیش کرتے ہیں۔

جنگل اور صحرا میں تو کیوں جاتا ہے، کیوں اپنے محبوب کو ادہر ادہر ڈھونڈتا ہے۔
اے لطیف! محبوب حقیقی کسی دوسری جگہ نہیں چھپا آنکھیں نیچی کرکے دیکھ تجھ میں ہی
دوست مکین ہے

ایک جگہ وہ ساری کائنات کو تجلیاتِ الٰہی کا مظہر دیکھ کر نظریۂ وحدت الوجود کو تمثیلی رنگ میں اس طرح بیان کرتے ہیں۔

معرفت حقیقی حاصل کرنے کے لئے بہت سے راستے ہیں، ہر ایک راہ
اس کا مشاہدہ کرا سکتی ہے، ایک قصر ہے جس کے لاکھوں دروازے
ہیں اور ہزاروں کھڑکیاں ہیں، جس طرف نظر پھیرتا ہوں اوہر خدا
کا جلوہ ہے،

ایک اور جگہ وہ نظریۂ وحدت الوجود کی وضاحت کرتے ہوئے، اس مسئلے کی عقدہ کشائی یوں کرتے ہیں۔

وحدت کثرت کے رنگ میں جلوہ گر ہوئی، پھر کثرت و وحدت ایک ہوئی
حقیقی حق ایک ہی ہے، کسی دوسری بات کی بھول میں مت آ، یہ
ہنگامہ یہ غوغا واللہ محبوب ہی کا ہے، یہ ہا و ہو، یہ ہل چل واللہ
محبوب ہی کی ہے

شاہ کے بیاں جو رچاؤ، لذت اور کیفیت، دل نشینی اور سادگی ہمیں ملتی ہے، اس کی مثالیں ہمیں شعری ادب میں مشکل سے ملیں گی جس کا اندازہ ان تین شعروں سے ہو سکتا ہے۔

اے چاند تو میرے محبوب کا مقابلہ کرتا ہے، میں تجھے للکارتا ہوں
تو چودہویں رات کا جو سنگار چاہے کر، ساری کائنات کا
حسن اکٹھا کرے، لیکن میرے محبوب کے ایک جلوے کی بھی
برابری نہیں کر سکتا۔

تم اور تمھارے جیسے ایک سو سورج بھی نکل آئیں، پھر بھی
محبوب کے بغیر میرے لئے اندھیرا رہے گا، جاؤ نیچے
اتر جاؤ، میں تمہاری روشنی میں محبوب سے ملنا نہیں
چاہتا۔

چاند تو میرے محبوب کی ہمسری کیسے کر سکتا ہے

تو رات میں روشن ہوتا ہے، اور میرا پیار ہمیشہ روشن ہے

اس دور کے استبدادی فراعنہ کو جنہوں نے عوام کی زندگی کو رولر مشین کی طرح کچل کر رکھ دیا تھا شاہ عوام کے نئے جذبے اور شعور سے آشنا کرتے ہوئے انھیں اس طرح متنبہ کرتے ہیں

بحر و بر میں بہاؤ کی تیزی عیاں ہوتی جا رہی ہے ، درختوں کی
گونج سے بھی اس کا پتہ چلتا ہے، ہر ایک سولی کا سزاوار بن
چکا ہے، ہزاروں منصور پیدا ہو چکے ہیں، کس کس کو سولی پر
چڑھاؤ گے ۔

ہر جگہ محبوب کا ذکر ہے، ہر جگہ محبوب موجود ہے ، پورا ملک
منصور ہے، کس کس کو سولی پر چڑھاؤ گے

وہ عوام میں ذہنی شعور کو بیدار کرتے ہوئے، اس راہ کی صعوبتوں اور کٹھنائیوں کو بے نقاب کرتے ہوئے ایک نئے رنگ میں اس انقلاب کی دعوت دیتے ہیں ۔

دار اور سولی پر چڑھنے کی دعوت دی جا رہی ہے
میرے ساتھ اگر کسی کو چلنا ہے تو چلے ، دار پر جانا
تو ان لوگوں کا کام ہے جو محبت کا نام لیتے ہیں !
سولی عاشقوں کو اپنی طرف بلا رہی ہے ، اگر تم
عشق و محبت کے طالب ہو تو پیچھے مت ہٹو، پہلے
سر تن سے الگ رکھ لو، سولی اور دار تو درحقیقت
عاشقوں کے لئے باعث زیب و زینت اور ہار ہے
ہچکچانا یا پیچھے ہٹنا تو ان کے لئے باعث عتاب ہے، وہ تو
بے جھجک دار پر آتے ہیں، محبت کی راہ و رسم میں قربان ہونا
اور سر کا تن سے جدا ہونا تو عاشقوں کا (شیوہ) اور ان
کی زندگی کا جزو لاینفک ہے

شاہ کے یہاں اپنے وطن سے محبت ، اس کی وادیوں اور سبزہ زاروں سے بے پناہ عشق کا جذبہ ملتا ہے وہ اپنے اس جذبے کو جب شعر کی صورت میں ڈھالتے ہیں تو اپنے پڑھنے والوں کو ایک نئی کیفیت عطا کرتے ہیں، ایک جگہ فرماتے ہیں۔

میرے مولیٰ ہمیشہ سندھ کو ارزانی سے نواز
میرے محبوب پورے عالم کو آباد رکھ

ماروی کی داستان کے پردے میں جہاں انھوں نے رمزیہ انداز میں حب الوطنی کے چراغوں کو روشن کیا ہے ، یہ اشعار ایک قاری کو بے حد متاثر کرتے ہیں

اگر میں پردیس میں مرجاؤں تو میری مٹی بیابانوں میں جھیے ہوئے
غریب رشتے داروں کے ساتھ ملانا، اور میری میت کو آبائی وطن
کی باڑوں سے دیوار دینا

میری خواہش ہے کہ اپنے وطن کو دیکھتے دیکھتے جان دے دوں
میرے جسم کو قید نہ کرنا
پردیسن کو اپنے محبوب سے جدا نہ کرنا
میرا جی چاہتا ہے کہ اپنے وطن تھر کی ٹھنڈی ٹھنڈی مٹی اپنے سر
پر ڈال لوں
اگر میں پردیس میں مرجاؤں تو میری نعش کو ملیر میں دفن کرنا۔

شاہ لطیف اہلِ وطن کے جمود، بے عملی اور ماحول کی ناسازگاری کو دیکھ کر مایوس نہیں ہوتے، بلکہ وہ قنوطیت سے دور اور رجائیت سے سرشار ہوکر ان کو عمل کی تلقین، جدوجہد کی تربیت اور زندگی کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کی دعوت نت نئے انداز میں دیتے ہیں، اس موقع پر پیرائے کی رمزیت اور تمثیلیت نے ان کے اشعار کو ایک نیا روپ بخشا ہے جس عمل کے موضوع کو پیش کرنے میں انھوں نے جن نئے پیمانوں اور اسلوب کو اختیار کیا ہے، وہ دوسروں کو میسر نہیں، فرماتے ہیں۔

تو کاتنے کی فکر نہیں کرتی، صرف لیٹ کر وقت گزار رہی ہے
یکایک عید آئے گی لوگ نئے کپڑوں سے محروم رہیں گے، خود
تمہارے پاس بھی کپڑے نہ ہوں گے، اس وقت سہیلیاں
تجھے پکاریں گی، اور تو حسرت سے بناؤ سنگھار کی تمنا کرتی ہوگی

بجلی چمک رہی ہے اور تجھ کو بدبختی کی نیند نے آلیا ہے
جو لوگ فکر نہیں کرتے پانی انہیں کو دبے بس بنا کر بہالے جاتا ہے

گرمی سردی میں چلتے رہو، بیٹھنے کا وقت نہیں، کہیں ایسا نہ ہو
کہ اندھیرا ہوجائے اور محبوب کے قدموں کا شرف حاصل نہ ہوسکے

وہ سندھ کی اقتصادی بدحالی کو دیکھ کر عمل سے محروم انسانوں میں ایک نئے ڈھنگ سے ولولۂ عمل کو ابھارتے ہوئے کہتے ہیں

آج نہ کپاس کے پودوں میں دوڈوڈے ہیں، نہ وہ کاتنے والی
عورتیں ہیں، بازاروں کو دیکھ کر میرا دل رو رہا ہے ــــــ

سُر سویراگ میں وہ اپنی قوم کو خوش حالی کا راز بتاتے ہوئے یوں نغمہ سرا ہوتے ہیں

اگر تجھ کو تجارت کی طاقت معلوم ہو جائے تو پھر تو اور کوئی کام نہ کرو
حقیقت ان بیوپاریوں سے معلوم کر جن کے ہاتھ سے تو نے بڑے
ادب کے ساتھ موتی لئے ہیں۔

شاہ، عوام میں گراوٹ اور اخلاقی پستی کو دیکھ کر ایک درد محسوس کرتے ہیں، اور اس درد کو جب اپنے نغموں میں سموتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود ہماری روح کی پکار ہے، فرماتے ہیں

لوگوں نے اخلاص و نیکی کی شمع کو ملیا میٹ کر کے معدوم کر دیا
اب آدمی آدمی کو کھائے جاتا ہے
اے میرے محبوب اس دنیا میں سب چیزیں فنا ہو جائیں گی صرف
سیرت و کردار کی خوشبو باقی رہ جائے گی

شاہ کے کلام کا ایک حصہ منظر نگاری اور بیانیہ کیفیتوں پر مشتمل ہے، ان کے یہ اشعار جہاں منظر نگاری اور جذبات کی عکاسی کے شاہکار ہیں، وہیں ہمیں ان میں اس دور کے دیہاتی تہذیب و معاشرت اور رسم و رواج کی جھلکیاں نظر آتی ہیں، جن پر شاہ کے مخصوص انداز کی چھاپ ہے، اس موضوع پر ان کی شاعری نے جو نیا رنگ و آہنگ اختیار کیا ہے، اس کا اندازہ ذیل کے اشعار سے ہوتا ہے

وہ موسم آگیا جب لوگ خوش ہو کر باتیں کرتے ہیں، اور موسیقی کی آوازیں
سنائی دیتی ہیں، کسان اپنے "ہل" درست کر رہے ہیں، گلہ بان خوش ہیں
اور میرے محبوب نے بارش کی خوشی میں اچھے سے اچھے کپڑے پہنے ہیں

دیکھ لطیف گھنے بادل نیچے اتر رہے ہیں، اور پانی کی بڑی بڑی بوندیں
برسنے لگیں، اپنے بیلوں کو باہر نکالو، اور میدانوں کا رخ کرو، یہ وقت
مایوس اور غمگین بیٹھنے کا نہیں۔ لو دیکھو پھوار پڑنے لگی ...

ساون کی رت آئی، قہقہے اور چہچہے بلند ہوئے ہیں
کوئل کی تیکھی کوک فضا کو چیرتی ہے
ہاریوں نے ہل جوت لئے، گویئے خوش ہیں
برکھا کی رت آگئی، خوشی کے چہچہے اور میٹھے زمزمے
بلند ہوئے، مٹکے مکھن سے بھرپور ہو گئے

شاہ کی شاعری میں ہمیں مشرقی خواتین کے لئے بھی بہت سے درس عمل ملتے ہیں جس میں انھوں نے مشرقی خواتین کو عفت و حیا، سادگی، اور حب الوطنی کی طرف خصوصیت سے توجہ دلائی ہے، وہ ایک جگہ ماروی کی زبان سے جب کہ وہ عمر سومرا کی قید میں ہے اور وہ اسے نفیس لباس اور بہترین پوشاکوں کی پیشکش کرتا ہے اپنے جذبات کی ترجمانی اس طرح کراتے ہیں۔

یہ ریشمی دوپٹے ہم صحرا کے رہنے والے ہرگز نہیں پہنتے، ہماری
جو لاکھی رنگ میں رنگی ہوئی چندریاں ہیں، وہ ان ریشمی دوپٹوں
سے کہیں زیادہ زیب دیتی ہیں، یہ چندریاں اپنے وطن کے دھاگے
سے بنی ہوئی ہیں، اس لئے تمہارے ریشم اور مخمل سے کہیں زیادہ
بہتر ہیں۔

میں تو اے سومرا اپنے وطن کی بنی ہوئی لوئی تمہارے گلبدن
کے کپڑے سے کہیں زیادہ بہتر سمجھتی ہوں
وہ لوئی جو میرے بزرگوں نے پہنائی ہے، وہ اتارنے سے پہلے
میں غیرت سے مر کیوں نہ جاؤں

بھدی اور کم قیمت چوڑیاں کلائیوں میں پہنا جن سے اور
لوگ شرماتے ہیں انھیں میں ہماری شان ہے

اے عمر " تھر" کے چھوٹے چھوٹے گاؤں میں بھی میرے عزیز رہتے ہیں
ان میں سے ہر ایک نے عفت وعصمت کی چادر اوڑھ کر اس پر مُہر
لگالی،
اے عمر! ان کے فرمان کی بنا پر میں بھی وہی چادر اوڑھے ہوئے ہوں

سندھی ادب کی تاریخ شاہ کے اس احسان کو فراموش نہیں کرسکتی کہ عین اس زمانے میں جب کہ سندھ میں فارسی کا سکّہ رواں دواں تھا، اور سندھ کی سرکاری زبان فارسی تھی، سندھ کے ادیبوں اور شعرا کے قافلے اپنی زبان سے منہ موڑ کر اپنی مصالح اور درباری تقرّب کے لئے فارسی کو اپنے اظہارِ خیال کا ذریعہ بنائے ہوئے تھے، شاہ نے تمام روایات اور مصالح کو پس پشت ڈال کر سندھی زبان کو اپنی شاعری کا ذریعہ بنایا، دیکھئے کس لطیف انداز میں انھوں نے ان فنکاروں پر جنھوں نے اپنی زبان سے بے اعتنائی برتی ہے" ابن الوقت" ہونے کا ایک بھرپور طنز کیا ہے، ان کا یہ طنز آج بھی ہمارے ادیبوں اور فنکاروں کے لئے نشانِ راہ ہے، فرماتے ہیں۔

اگر تم فارسی سیکھتے ہو تو تم غلام ہو غلام
ایسا آدمی اگر پیاسا ہوگا تو بجائے پانی کے "آب" مانگے گا
اور بھوکا ہوگا تو بجائے کھانے کے " طعام" کہے گا
لطیف کہتا ہے کہ ایسا آدمی ابن الوقت ہے وہ خواص میں
سے نہیں

شاہ کے مجموعہ کلام کا نام "شاہ جو رسالو" ہے، یہ کلام ان کے مریدوں اور فقیروں نے جمع کیا تھا ان کے مجموعہ کلام کو سب سے پہلے ایک جرمنی مستشرق ڈاکٹر ٹرمپ نے جرمنی سے طبع کیا تھا، پھر اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے، اس کا ایک ایڈیشن ڈاکٹر گربخشانی نے بھی شائع کیا، جو تصحیح کے اعتبار سے سب سے اچھا سمجھا جاتا ہے، اب سندھی ادبی بورڈ نہایت تحقیق و کاوش سے "شاہ جو رسالو" کا ایک مستند متن شائع کر رہا ہے۔ مرکزی حکومت کی امداد سے سندھ یونیورسٹی اس کا ایک منظوم اردو ترجمہ بھی شائع کر رہی ہے جسے سندھ کے مشہور نوجوان شاعر شیخ ایاز نے اردو نظم میں منتقل کیا ہے۔

شاہ عبداللطیف نے ۱۴ صفر ۱۱۶۵ھ میں وفات پائی، اور بھٹ شاہ مدفون ہوئے، آپ کا روضہ مبارک خاندان کلہوڑا کے فرمانروا میاں غلام شاہ نے ۱۱۶۷ھ میں تعمیر کرایا۔ ہر سال صفر کے مہینے میں آپ کا عرس نہایت شاندار طریقے پر منایا جاتا ہے۔

ایک اعلان

ادارۂ مصنفین پاکستان کے جو اراکین کسی عنوان پر کوئی کتاب تصنیف کر رہے ہوں وہ اپنے زیر تصنیف مسودوں کے متعلق ایک تعارفی نوٹ ادارۂ ہم قلم کو ارسال کریں۔ تاکہ انھیں متعارف کرایا جا سکے۔ اس طرح جہاں پاکستان رائٹرز گلڈ کے علم میں یہ بات رہے گی کہ اراکین کن کن موضوعات پر کام کر رہے ہیں۔ وہاں ملک کے ناشرین کے علم میں بھی وہ مسودات آجائیں گے۔ یہ طریقہ اراکین کی کتابوں کی نشر و اشاعت کے لئے ایک مناسب طریقہ ہوگا اور ان کی تصانیف کے لئے راہ ہموار ہو سکے گی۔

جوش ملیح آبادی

میرے اجزائے فکر

(جوش صاحب نے ازراہِ نوازش اپنی یہ نظم ہم قلم کیلئے عنایت فرمائی ہے اور اس کا کوئی مطلع منقول نہیں کیا ہے۔ ہم جوش صاحب کے شکریئے کیساتھ یہ نظم شائع کرتے ہیں۔ ادارہ)

میرا جو نام ہے یہ ذرا سا، اس امر میں
شامل فقط زمیں ہی نہیں آسماں بھی ہے

اس منزلت میں مرحمتِ ملحداں کے ساتھ
کچھ عنصرِ نوازشِ روحانیاں بھی ہے

طبعِ رسا کی زلفِ دوتا میں گندھا ہوا
میرا تسلسلِ ادبِ خانداں بھی ہے

کچھ میرزائیاں بھی ہیں طرزِ سخن کے ساتھ
اور کچھ ستیزہ کاریِ افغانیاں بھی ہے

گو سر کلاہ بند ہے مگر پھر بھی اے ندیم!
زیرِ کلاہ طرۂ تاجِ کیاں بھی ہے

مجھ میں جو یہ نیاز گدایاں ہے اے ندیم
اس پردۂ نیاز میں نازِ شہاں بھی ہے

در پر لوائے خیلِ امیراں نہیں فقط
سر میں ہوائے خدمتِ محنت کشاں بھی ہے

اقوال خفتہ پا کے تھکے قافلے کے ساتھ
افکارِ نو قدم کا جواں کارواں بھی ہے

کچھ سود مندیاں بھی ہیں آئینِ عقل کی
اور کچھ جنونِ ہوش رُبا کا زیاں بھی ہے

لب پر نہیں ہے صرف حکایاتِ رفتگاں
نوکِ زباں فسانۂ آیندگاں بھی ہے

آغاز کائنات کے نغموں کے ساتھ ساتھ
انجامِ زندگی کا غمِ جاوداں بھی ہے

تندیلِ نسلِ نو کی جھلک بھی ہے ذہن میں
یاروں کی شمعِ کشتہ کا دل میں دھواں بھی ہے

دہلی کے نغمہ بار معانی کے ساتھ ساتھ
فردوس لکھنؤ کی کھنکتی زباں بھی ہے

طرزِ بیاں میں صولتِ کہسار ہی نہیں
موجِ زباں میں شوخیِ آبِ رواں بھی ہے

اس کارگاہ آہن و بازارِ سنگ میں
کانِ بلور، کارگہِ پرنیاں بھی ہے

خالی نہیں ہے صرف تب و تاب خاکیاں
پشتِ سخن وری پہ صفِ نوریاں بھی ہے

اس اعتدال نغمہ و آہنگ میں ندیم
ناقوسِ برہمن ہی نہیں ہے اذاں بھی ہے

تنہا نہیں ہے پرتوِ روحانیاں کی بات
فیضانِ اشتراکِ خراباتیاں بھی ہے

سر میں نقوشِ حکمت پیراں نہیں فقط
سینے میں تابِ سیم برانِ جواں بھی ہے

لب پر نشیدِ نامِ خدا ہی نہیں یہاں
گلبانگِ دل نوازِ حدیثِ بتاں بھی ہے

وہ حادثوں کے ابر جو برسا رہے ہیں تیر
اُن میں، کچھ ابروؤں کی لچکتی کماں بھی ہے

کچھ شاعرانِ پختہ کی بھی ہیں نوازشیں
کچھ التفاتِ خامِ برانِ جہاں بھی ہے

کچھ میرے فکر نے بھی سنواری ہے زلفِ شعر
کچھ موجِ فیضِ گیسوئے عنبر فشاں بھی ہے

کچھ میرے ظرف نے بھی دیا ہے سبو کو رنگ
اور کچھ گدا نوازیِ پیرِ مغاں بھی ہے

اس نقطۂ عروج میں نجمِ سحر کے ساتھ
کچھ آب و رنگ خالِ رخِ مہ وشاں بھی ہے

جس دل میں جوشش کفر ہے مدت سے خمہ زن

احمد ندیم قاسمی

اے مشیّت تری قوّت کو سلام!

تیری مٹھی میں ہے مہر و مہ و انجم کا نظام
کائنات ایک ترے دم سے ہے گردش میں مدام
مجھ سے کافر کو بھی کب ہے تری عظمت میں کلام
اے مشیّت، تری قوّت کو سلام

نہ ازل ہے کوئی نقطہ، نہ ابد کوئی لکیر
لمحہ لمحہ ترے پیکانِ بقا کا نخچیر
ان حصاروں سے ہے اونچا ترا معیارِ دوام
اے مشیّت، تری قوّت کو سلام

کتنے قرنوں سے خلا میں ہے زمیں آوارہ
وقت کی دھول سے آزاد ہے یہ سیّارہ
وہی خوابیدہ لیالی، وہی بیدار ایام
اے مشیّت، تری قوّت کو سلام

پھول کھلتے ہیں اسی طرح گلستانوں میں
اسی نرمی سے ہوا چلتی ہے میدانوں میں
سرِ ساحل ہے وہی موج کا اندازِ خرام
اے مشیّت، تری قوّت کو سلام

وہی جذبات کے بندھن، وہی رشتے، وہی جال
وہی معمولِ محبّت، وہی کردارِ جمال
وہی امڈی ہوئی آنکھیں، وہی حسنِ سرِ بام
اے مشیّت، تری قوّت کو سلام

اب بھی انسان ہے اسباب و نتائج کا اسیر
قصر کے سائے میں اب تک ہے وہی بزمِ تغفیر
وہی جینا ہے مصیبت، وہی مرنا ہے حرام
اے مشیّت، تری قوّت کو سلام

مصطفےٰ زیدی

دُنیا

اِک ہم ہی نہیں کشتۂ رفتارِ زمانہ!
یہ تُندیٔ رَخشِ گزراں سب کے لئے ہے

یہ سچ ہے کہ ہر اک کو شہادت نہیں ملتی
اک تشنگیٔ آبِ رواں سب کے لئے ہے

ہر شخص کی قسمت میں نہیں خضر کا رُتبہ
بھٹکے ہوئے راہی کی فغاں سب کے لئے ہے

اک ہات میں زیور ہے تو اک ہات میں زنجیر
اے ہم نفسو رَطلِ گراں سب کے لئے ہے

رقّاصۂ طنّاز ہو یا بسملِ بے تاب
اسبابِ دل آویزیٔ جاں سب کے لئے ہے
اِک طرزِ تفکّر ہے ارسطو ہو کہ خیّام
دنیائے اسالیب و بیاں سب کے لئے ہے

دل راکھ ہوا ہو کہ بدن ٹوٹ رہا ہو
بجھتی ہوئی محفل کا دھواں سب کے لئے ہے

خاموشیٔ محبت ہو کہ میدان کی للکار
محرومیٔ گفتار و زباں سب کے لئے ہے

دریوزہ گرِ شہر ہو یا شہر کا معمار
پندارِ فلاں ابنِ فلاں سب کے لئے ہے

ساقی فاروقی

کوئی ابر اُڑے

اے دل ترے درد ہیں کس کے لئے اے دل ترے اشک ہیں کس کے لئے
ہر درد ترا بے مصرف ہے بے قیمت ہیں ترے سارے دیئے

اسی وحشت میں اسی حسرت میں برسوں اُمید کرا ہی بھی
میں تھک گیا ہوں کوئی کرتا نہیں ہو زحمتِ چشم براہی بھی

کوئی ابر اُڑے کسی قلزم سے رس برسے مرے ویرانے پر
کوئی جاگتا ہو کوئی کڑھتا ہو مرے دیر سے واپس آنے پر
کوئی سانس بھرے مرے پہلو میں کوئی ہاتھ دھرے مرے شانے پر

اور دبے دبے لہجے میں کہے تم نے اب تک بڑے درد سہے
تم تنہا تنہا جلتے رہے، تم تنہا تنہا چلتے رہے

سُنو تنہا چلنا کھیل نہیں چلو آؤ میرے ہمراہ چلو
چلو نئے سفر پر چلتے ہیں چلو مجھے بنا کے گواہ چلو

غلام عباس

★
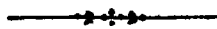
مرزا رجب قدر کو میں ایک عرصے سے جانتا تھا۔ ہرچند ہماری طبیعتوں اور ہماری سماجی حیثیتوں میں بڑا فرق تھا۔ پھر بھی ہم دونوں دوست تھے۔ مرزا کا تعلق ایک ایسے گھرانے سے تھا جو کسی زمانے میں بہت معزز اور متمول سمجھا جاتا تھا۔ مگر اب اس کی حالت اس پرانے تناور درخت کی سی ہو گئی تھی جو اندر ہی اندر کھوکھلا ہوتا چلا جاتا ہے اور آخر ایک دن اچانک زمین پر آ رہتا ہے۔

مرزا کو اپنے خاندان کے اس زوال کا پورا احساس تھا۔ مگر اس کو روکنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ البتہ جہاں تک ظاہری رکھ رکھاؤ کا تعلق تھا مرزا اس میں ذرا سی کوتاہی بھی نہ ہونے دیتا تھا۔ اس کے دل میں نہ جانے کیوں یہ خیال بیٹھ گیا تھا کہ خاندان کا وقار قائم رکھنے کے لئے درشت مزاجی اور تحکم لازمی ہیں۔ اس خیال نے اسے سخت دل بنا دیا تھا۔ مگر یہ درشتی اور سختی اوپر ہی اوپر تھی۔ اندر سے مرزا بڑا نرم تھا۔ اور یہی ہماری دوستی کی بنا تھی۔

ایک دن سہ پہر کو میں اور مرزا رجب قدر انارکلی میں اس کی شاندار موٹر میں بیٹھے ایک مشہور جوتے والے کی دکان سے سلیم شاہی جوتا خرید رہے تھے۔ مرزا نے اپنا ٹھاٹھ دکھانے کے لئے یہ ضرور سمجھا تھا۔ کہ وہ موٹر میں بیٹھے بیٹھے دکان کے مالک کو پکارے اور جوتے اپنی موٹر ہی میں ملاحظہ کرے۔ شہر میں ابھی مرزا کی ساکھ قائم تھی۔ اور دوکاندار عام طور پر اس کی ان اداؤں کو سہنے کے عادی تھے۔ چنانچہ جوتے والے نے اپنے دو کارندے مرزا کی خدمت پر مامور کر دیئے۔

مگر مرزا کو کوئی جوتا پسند نہیں آ رہا تھا۔ اور وہ بار بار ناک بھوں چڑھا کر ان کارندوں کو سخت و سست کہہ رہا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے مرزا کو دراصل جوتے کی ضرورت ہی نہیں۔ اور یہ جھوٹ موٹ کی خریداری محض بھرم رکھنے کے لئے ہے۔

عین اس وقت ایک بڈھا بھکاری ایک پانچ سالہ لڑکی کے کندھے پر ہاتھ رکھے مرزا کی موٹر کے پاس آ کھڑا ہوا۔ یہ بڈھا اندھا تھا۔ لڑکی کے بالوں میں تنکے الجھے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا مدت سے کنگھی نہیں کی گئی۔ دونوں کے تن پر چیتھڑے لگے تھے۔

"اندھے پر ترس کھاؤ بے بابا!" بڈھے نے ہانک لگائی۔

"بابو جی میں بھوکی ہوں۔ پیسہ دو۔" لڑکی نے لجاجت سے کہا۔

مرزا نے ان لوگوں کی طرف توجہ نہ کی۔ وہ بدستور جوتوں پر تنقید کرتا رہا۔

اندھے فقیر اور لڑکی نے اپنا سوال دہرایا۔ اس پر مرزا نے ایک نگاہ غلط انداز ان پر ڈالی۔ اور کہا:

معاف کرو۔ معاف کرو۔"

بھکاری اب بھی نہ ٹلے۔

" بابوجی رات سے کچھ نہیں کھایا ہے" اندھے نے کہا

" بابوجی بڑی بھوک لگ رہی ہے۔ پیٹ میں کچھ نہیں ہے۔ لو دیکھو" بچی نے کہا۔ اور جھٹ میلا کچیلا کرتا اٹھا کر اپنا پیٹ دکھانے لگی۔ لاغری سے بچی کی پسلیاں باہر نکلی ہوئی تھیں اور گنی جا سکتی تھیں "بس ایک پیسے کے چنے بابوجی"

مرزا کو اس لڑکی کا میلا میلا پیٹ دیکھ کر گھن سی آئی۔

" توبہ توبہ" امر نے بیزاری کے لہجہ میں کہا۔ "بھیک مانگنے کے لئے کیا کیا ڈھونگ رچائے جاتے ہیں۔ جاؤ جاؤ بابا خدا کے لئے معاف کرو"

مگر فقیر اب بھی نہ گئے۔ قریب تھا کہ مرزا غصے سے بھنا جاتا۔ مگر یہ تماشہ اس طرح ختم ہو گیا۔ کہ مرزا کو اس دکاندار کا کوئی جوتا پسند نہ آیا۔ اور وہ اپنی موٹر کو وہاں سے بڑھا لے گیا۔

اس واقعہ کے چند روز بعد میں اور مرزا بر جیس قدر شہر کے ایک بڑے سینما میں ایک دیسی فلم دیکھ رہے تھے۔ فلم بہت گھٹیا تھی اس میں بڑے نقص تھے مگر ہیروئن میں بڑی چینک منک تھی اور وہ گاتی بھی خوب تھی۔ اس نے فلم کے بہت سے عیوب پر پردہ ڈال دیا تھا۔ کہانی بڑی دقیانوسی تھی۔ اس میں ایک واقعہ یہ بھی تھا۔ کہ بنک کے ایک چپراسی کو اس الزام میں کہ اس نے بنک لوٹنے میں چوروں کی مدد کی، پانچ سال قید کی سزا ہو جاتی ہے۔ اس چپراسی کی بیوی مر چکی ہے مگر اس کا ایک چار سالہ بیٹا ہے جو اپنی بوڑھی دادی کے پاس رہتا ہے۔ چپراسی کے قید ہو جانے پر یہ دادی پوتا بھوکوں مرنے لگتے ہیں۔ ادھر کوٹھڑی کا کرایہ نہ ملنے پر مالک مکان انھیں گھر سے نکال دیتا ہے۔ بڑھیا پوتے کا ہاتھ پکڑ کر بازار میں بھیک مانگنے لگتی ہے۔ وہ ہر راہ گیر سے کہتی ہے:

" بابوجی ہم بھوکے ہیں"

" ایک پیسے کے چنے لے دو بابوجی" لڑکا کہتا ہے۔

جب فلم اس مقام پر پہنچی۔ تو مرزا برجیس قدر نے اندھیرے میں مجھ سے کہا:

" بھیا ذرا اپنا رومال تو دینا۔ نجانے میرا کہاں گر گیا"

میں نے اپنا رومال دے دیا۔ جب تک تماشہ ہوتا رہا۔ میں نے مرزا کو سخت بے چین دیکھا۔ وہ بار بار کرسی پر پہلو بدلتا۔ اور ہاتھ چہرے تک لے جاتا۔ خدا خدا کر کے فلم ختم ہوئی تو میں نے دیکھا کہ وہ جلدی جلدی اپنی آنکھیں پونچھ رہا ہے۔

" ایں! مرزا صاحب" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "آپ رو رہے تھے؟"

"نہیں تو۔" مرزا نے بھرائی ہوئی آواز میں جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ "آنکھوں کو زرا سگریٹ کا دھواں لگ گیا تھا۔ . . . . اور بھئی میں یہ سوچ رہا ہوں۔ کہ سرکار ایسے دردناک فلم دکھانے کی اجازت کیوں دیتی ہے۔"

* * *

حجاب امتیاز

★

بارش طوفان کی بارش تھی۔ اور طوفان ساحلوں کا طوفان تھا۔

کالے بادل زمین و آسمان کے درمیان جانے کہاں سے سر نکالکر ساری کائنات پر چھائے جا رہے تھے، یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے آج بارش کی وجہ سے دنیا کا کوئی کام نہ ہو سکیگا۔ لیکن آج ہی مجھے اپنی کہانی کا مسودہ ایک رسالے کے ایڈیٹر کو وی۔ پی کرنا تھا۔ پوسٹ آفس یہاں سے چھ میل کے فاصلہ پر تھا۔ آج وعدے کا آخری دن تھا۔ اور مجھ میں نقص یہ ہے کہ میں وعدے جان ہتھیلی پر رکھ کر پورے کرنے کے خبط میں مبتلا ہوں ——
چنانچہ، جبراً و قہراً کار لے کر طوفان باد و باراں سے مقابلہ کرنے کو خود نکل پڑی۔

یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب میں اپنی ایک کتاب کا آخری باب مکمل کرنے کے لئے شہری ہنگاموں سے دامن چھڑا کر ساحل سمندر کے ایک سنسان سے حصے میں آئی ہوئی تھی اور ہفتہ بھر کے لئے سمندر کے رخ کا ایک کمرہ کرایہ پر لے کر اپنے ناول کا آخری حصہ دن رات لکھ رہی تھی۔

صبح سے موسلا دھار مینہ برس رہا تھا۔ سڑکیں سنسان اور گلیاں ویران پڑی تھیں۔ کسی راہ گیر کا پتہ نہ تھا۔ بارش یوں ہو رہی تھی۔ جیسے بادلوں نے آسمان میں شگاف کر رکھا ہو۔

ہوا کے تھپیڑوں اور بارش کے زور کا مقابلہ کرتی ہوئی جب میں کار چلاتی بمشکل گاؤں کے قبرستان تک پہونچی۔ تو اچانک سڑک کے موڑ پر ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے سامنے آکر راستہ روک لیا چونکہ کار کے شیشے چڑھے ہوئے تھے اور ان پر پانی بہہ رہا تھا۔ اس لئے میں اس کے متحرک ہونٹوں سے نکلنے والے الفاظ نہ سن سکتی تھی۔ مگر اس کے ہاتھوں کے اضطراری اشاروں سے یہی سمجھ میں آتا تھا کہ وہ کسی ضروری کام پر شہر جانا چاہتا ہے لیکن بارش نے اسکے ہاتھ پاؤں باندھ رکھے ہیں۔

میں طبعاً ایک بزدل اور وہمی عورت ہوں خالی وقتوں میں عجیب و غریب مضحکہ انگیز اور خوفناک خیالات میرے ذہن میں چکر لگاتے رہتے ہیں۔ لہذا اس وقت بھی اس آدمی کو دیکھ کر انواع و اقسام کے شبہات نے مجھے گھیر لیا۔ پاگل؟ چور؟ کوئی بدمعاش؟ —— میں نے جلدی سے ایک بھرپور نظر اس پر ڈالی، اس کی داڑھی پر بارش کے قطرے جگمگا رہے تھے۔ اور اس کی شکل قابل رحم معلوم ہو رہی تھی۔

میں نے کار روک لی۔ دروازہ کھولکر پوچھا "کیا بات ہے؟"

"مجھے شہر تک پہنچا دیجئے۔ عمر بھر احسان نہ بھولوں گا!"

وہ مجسم التجا بنا میری طرف دیکھ رہا تھا۔

میں انکار نہ کر سکی۔ میں نے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ لپک کر اندر گھس آیا اور پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

کار پھر روانہ ہوگئی۔ بارش پھر زور زور سے برسنے لگی۔ ہوا کے جھکڑ پھر دیوانہ وار چیخنے چلانے لگے۔
کار کے سامنے کے آئینے میں نظر آرہا تھا۔ کہ وہ گھبرا گھبرا کر راستے کو دیکھ رہا تھا جیسے فاصلہ اسے ڈرا رہا ہے اور وہ اڑ کر منزل مقصود پہ پہنچنا چاہتا ہے۔ میں کار چلاتے چلاتے کن انکھیوں سے اسے دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی اور سخت سہمی ہوئی تھی۔ کیونکہ سچی بات ہے اجنبیوں سے مجھے بڑا ڈر لگتا ہے۔
تھوڑی دیر بعد وہ بولا۔ "مجھے اور کوئی صورت نظر نہ آتی تھی اسلئے آپ کو تکلیف دی ۔"
میں نے سر ذرا سا پیچھے موڑتے ہوئے کہا " بہت ضروری کام ہوگا جو اس طوفان بادوباراں کے باوجود گھر سے نکلنا پڑا۔ ؟ "
"جی ہاں۔ یہ زندگی کا ایک موقع ہے" اسنے جلدی سے کہا۔
"اوہو ـــــــ تو جانا کہاں ہے ؟ "
" ریلوے اسٹیشن "
" کہیں باہر جارہے ہو ؟ "
نہیں ـــــــ ایک عزیز سے لمحہ بھر کو ملنے جارہا ہوں۔ پھر جانے اسے دیکھنا کبھی نصیب بھی ہو یا نہ ہو۔
" لیکن یہ تو ایک چھوٹا سا اسٹیشن ہے۔ ریل یہاں ٹھیرتی نہیں "
وہ بولا "لیکن مجھے تو اپنے عزیز کی محض ایک جھلک دیکھنی ہے اس سے ملنا نہیں ہے "
یہ بات مجھے بے حد پر اسرار معلوم ہوئی۔ لیکن میں چپ ہوگئی۔ یہی میری فطرت ہے۔
یکایک تڑپ کر بجلی چمکی۔ بادل زور سے گرجا اور پھر دھواں دار بارش ہونے لگی۔ ہوا کا جھکڑ اس غضب کا تھا کہ رہ رہ کر درختوں کی ٹہنیاں ٹوٹ رہی تھیں۔ مجھے اندیشہ تھا کہ ہوائیں کار کو اڑا نہ لے جائیں۔
تھوڑی دیر بعد یکلخت میری نظر سامنے کے اونچے پل پر پڑی۔ میری ہمت ٹوٹ گئی اس پر چڑھنا جوئے شیر لانا تھا۔ اتنی خوفناک چڑھائی تھی کہ ہوا کے زور اور بارش کی تھپیڑ میں کار کے الٹ جانے کا خدشہ تھا۔ میں نے اپنے دل میں کہا یہ میں چراغ نے کے کہاں سامنے ہوکے جلی۔ اس لئے میں نے کار پل کے نیچے ٹھیرا دی۔
" کیا ہوا ؟ ـــــــ رک کیوں گئے ہم۔ ؟ " پیچھے سے ایک گھبرائی ہوئی آواز آئی۔
" میں نے کہا " سامنے پل ہے۔ طوفان کے مقابلے میں اس کی چڑھائی پر چڑھنا ناممکن معلوم ہوتا ہے "
" تو پھر اب کیا ہوگا " اسنے شدید اضطرابی لہجے میں پوچھا۔
" بارش کے تھمنے کا انتظار " ہے ۔ میں نے کہا۔
" یہ تو میں تمام عمر کرتا رہا ہوں "
" بارش کے تھمنے کا انتظار ؟ " میں نے حیران ہوکر پوچھا۔
" لیکن وہ وقت پر کبھی نہیں تھمی۔ میری زندگی کے سارے منصوبوں کو ہمیشہ اپنے تسلسل اور شدت میں بہالے گئی "
میں نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ پھر وہ دیوانوں کی طرح کہنے لگا " نہیں نہیں۔ میں نہیں رک سکتا۔ میں پیدل چلا جاؤنگا "
اسے کار کا دروازہ کھولتے دیکھ کر میں نے کہا " جاؤ گے کیسے ؟ ۔ درمیان میں ندی ہے "
[illegible]

اس کی اس ضرورت کا خیال کر کے مجھے طوفان سے لڑنا ضروری معلوم ہوا۔ چنانچہ میں نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا "چلو میں لے چلتی ہوں جب ہم زندگی کی آندھیوں سے مقابلہ کرتے ہیں۔ تو موسمی طوفانوں کے آگے سینہ سپر ہونا کیا بڑی بات ہے۔ بیٹھے رہو!" یہ کہکر میں نے کار دوانہ کی ——

اس کی باتیں مجھے بے حد پراسرار معلوم ہو رہی تھیں۔ دوسروں کے معاملات میں دخل دینا میری عادت کے خلاف ہے۔ تاہم میں اس کی موجودہ اضطراب و اضطرار کی وجہ جاننے کے لئے بے چین تھی لیکن صرف قیاس آرائیاں کر رہی تھی۔ اس سے کچھ پوچھنا مجھے خلاف شائستگی معلوم ہو رہا تھا۔ دوسروں کے قلب کے پردے اٹھا کر جھانکنے کی عادی نہیں ہوں۔

پل کی چڑھائی پر چڑھنا آسان نہ تھا۔ یہ میری ہی ہمت تھی کہ ٹاپ گیر اور ایڑی چوٹی کا زور لگا کر پل کی چڑھائی کا مرحلہ طے کیا اور آخر اوپر پہنچ ہی گئی۔ دم لینے کو میں نے لمحہ بھر کے لیے کار ٹھیرا دی۔ دفعتاً میری نظر شیشے میں سے سامنے آسمان پر پڑی تو دل دہل گیا۔ آسمان پر بادلوں کے غلاف پر غلاف چڑھ رہے تھے۔ بجلی لرز گئی۔ اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ آج یہ خوفناک کالی گھٹا اچک کر مجھے رستے ہی میں سے اٹھا لے گی۔ اور جانے کسی سندباد جہازی کے جزیرے میں لے جا کر برسا دیگی۔! —— اسی وقت ایک دھماکے نے میرے ہوش اڑا دیئے اور میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ میں نے سمجھا بجلی کے شعلے نے لپک کر ہم دونوں کو اپنے پنجے میں دبوچ لیا ہے لیکن نہیں —— جب آنکھیں کھلیں تو معلوم ہوا کہ دیودار کی ایک بہت بڑی ٹہنی دیو کی لاش کی طرح ہمارے راستے میں آگری ہے۔!

اب تو میرے لئے ایک قدم بھی آگے بڑھنا ناممکن ہو گیا تھا۔ میرے منہ سے نکلا۔

حسرت پہ اس مسافر بیکس کے روئیے ۔۔۔ جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے

ابھی میں کچھ سوچ ہی رہی تھی کہ مسافر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "راستہ بند ہو گیا —! بہتر ہے کہ میں ندی میں کود کر خودکشی کر لوں۔"

میں پریشان ہو کر بولی "کیا کروں۔ مجبور ہوں۔ میں تمہیں اسٹیشن نہیں پہنچا سکتی۔"

وہ بے چین ہو کر ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ پھر یکلخت بولا۔ "وہ دیکھیے ایک رستہ دائیں ہاتھ کو مڑتا ہے۔"

"لیکن وہاں تو گھٹنوں گھٹنوں پانی ہوگا۔ البتہ بارش اگر تھمے اس رستے ضرور جا سکتے ہیں۔"

وہ اپنی پیشانی پر ہاتھ مار کر بولا۔ "بارش اگر تھمے! ——؟ وہ کبھی نہیں تھمے گی۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ میں حسب معمول اپنے اس ازلی دشمن کے آگے ہتھیار ڈال دوں۔ ہمیشہ کی طرح ہاں!"

اسکے یہ الفاظ اپنے پیچھے ایک لمبی داستان کا اشارہ کر رہے تھے۔ لیکن میں نے اس سے کوئی تفصیل نہ پوچھی۔ صرف اسے تسلی دیتے ہوئے کہا "ابھی ڈھائی بجے ہیں۔ ریل کے وقت میں پون گھنٹہ اور باقی ہے۔ اس وقفہ میں بارش اگر تھم جائے تو میں تمہیں ضرور اسٹیشن پہنچا دوں گی —" بہت مایوس

وہ انتہائی مایوس اور اضطراری لہجے میں بولا۔ "میں تمام عمر یونہی سوچتا رہا کہ یہ بارش۔ یہ آسمان سے برسنے والا ظالم مینہ۔ جسے لوگ رحمت الہی کہتے ہیں۔ اور جو میرے لئے قہر خداوندی سے کم نہیں۔

—— اب تھمے گی اور اب رکے گی —— مگر! وہ کبھی نہیں تھمی۔ میرے لئے وہ ایک لمحہ کے لئے نہیں رکی۔ اسکا تسلسل اس وقت ٹوٹا، جب میری ساری امیدیں اور سارے سہارے ٹوٹ چکے!"

میں حیران ہو کر بولی "یعنی؟"

وہ کار کے شیشوں پر بہتے ہوئے پانی کو غمناک نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ بارش اور اس کے سلسلے میری زندگی کے تسلسل میں ہمیشہ فتنے اٹھاتے رہے۔ بچپن گذر گیا۔ لڑکپن ختم ہو گیا۔ جوانی بیت گئی۔ اب بڑھاپا ہے۔ اور یہ شاید اپنا آخری وار کرنا چاہتی ہے۔"

یہ کہتے کہتے آواز اس کے گلے میں پھنس گئی۔ اور وہ حسرتناک نظروں سے رستے کو دیکھنے لگا۔ جو اسٹیشن کی طرف جاتا تھا۔

میں اسے مترحم نظروں سے دیکھ کر بولی "کاش میں تمہیں کسی طرح منزلِ مقصود پہ پہونچا سکتی۔ بڑے میاں"

"نہیں۔ نیک بانو۔ یہ بارش آج ہرگز نہ رکے گی۔ نہ میں ہی منزل پہ پہنچ سکونگا یہ اس کی پرانی عادت ہے۔ اسنے میری زندگی تباہ کر ڈالی ہے"

میں مشتاق لہجے میں پوچھنے لگی "مگر میں یہ نہیں سمجھ سکی کہ بارش کس طرح ایک آدمی کو زندگی میں ناکام بنا سکتی ہے اور کیونکر اسے تباہ و برباد کر سکتی ہے"

وہ برسنے والے مینہ کو غمگین نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر بولا "مجھے دیکھ لو تو تمہیں یقین آجائے گا۔ سب سے پہلا وار اس نے میرے بچپن میں مجھ پہ کیا تھا۔ مجھے یاد ہے جس گاؤں میں میں پیدا ہوا تھا۔ وہ ایک ایسے ویران ساحل پر آباد تھا۔ جہاں سال میں کئی دفعہ طوفان آتے اور قیامت بپا کر جاتے تھے۔ تمام سال طوفانوں سے محفوظ رہنے کے بندوبست میں گذر جاتا تھا۔ سال میں صرف ایک ہی دفعہ ہم گاؤں والوں کی زندگی میں رونق پیدا ہوتی تھی۔ بارہ مہینوں میں ایکدفعہ وہاں میلہ لگتا تھا۔ بڑے چھوٹے جوان بوڑھے سب اس میں شریک ہوتے تھے۔ اور دل کھول کر لطف اٹھاتے تھے۔ اس میلہ کے لئے خاص تیاریاں کیجاتی تھیں۔ نئے کپڑے سلوائے جاتے تھے۔ سال بھر کی آمدنی میں سے کچھ نہ کچھ پس انداز کر کے اس موقعہ کے لئے رکھا جاتا تھا۔ میں تمام بچپن اپنی ماں سے میلے کے ہنگاموں کا صرف ذکر سنتا رہا لیکن کسی نہ کسی وجہ سے اس میں کبھی شریک نہ ہو سکا تھا۔ جب میری عمر ۹ سال کی ہوئی تو میری ماں نے وعدہ کیا کہ اس سال وہ مجھے میلے میں لیجائے گی اس خوشخبری کے سننے کے بعد ہفتوں مجھے راتوں کو نیند نہ آئی۔ تمام تمام دن اور رات رات بھر میں خیالی پلاؤ پکاتا رہتا کس طرح میلہ میں شریک ہونگا۔ بازی گروں کے کھیل اور جادوگروں کے شعبدے دیکھونگا۔ رنگا رنگی مٹھائیاں کھاؤنگا۔ اور انواع اقسام کے کھلونے خریدونگا۔

خدا خدا کر کے میلے کا دن آیا: مجھے ابتک اچھی طرح یاد ہے اس رات جسکی صبح مجھے میلے میں شریک ہونا تھا۔ فرطِ انبساط و فورِ شوق سے میں لمحہ بھر کو نہ سو سکا تھا۔ آدھی رات گذرنے کے بعد تھوڑی دیر کے لئے بمشکل میری آنکھ لگی تھی کہ یک لخت ایک خوفناک کڑک نے مجھے چونکا دیا۔

میں اپنے بستر پر اٹھ بیٹھا۔ گھر کے لوگ بے خبر پڑے سو رہے تھے۔ میں دبے پاؤں اٹھا۔ کھڑکی کھول کر دیکھا۔ تو صحن میں صرف ریوتری کا درخت دیوانہ وار جھوم رہا تھا جیسے کوئی شرابی مدہوشی کے عالم میں لڑکھڑاتا پاؤں چلا رہا ہو۔ تھوڑی ہی دیر میں برق و باراں کے ایک تباہ کن طوفان نے سارے گاؤں کی بنیادیں ہلا ڈالیں۔ صبح ہوئی تو طوفان نوح کا سماں تھا۔ سب کی جانوں کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ کہاں کی سیر۔ اور کیسا میلا۔ وہ پہلا موقعہ تھا جب بارش نے میری آرزوؤں کی کھیتی تہ آب کر دی

پھر سال پر سال گذرنے لگے۔ زندگی کی ندی بہتی رہی۔ اب میں نے بچپن سے نکلکر لڑکپن میں قدم رکھا تھا۔ اسدفعہ بارش نے مجھ پر وہ ظلم کیا کہ میری زندگی کی کشتی کا رخ ہی ہمیشہ کے لئے بدل ڈالا۔ میرے لاوارث چچا نے اپنا مرگ بستر سے مجھے تار دے کر بلا لیا۔ انہیں مجھ سے بے حد محبت تھی۔ اگر میں وقت پر پہونچ جاتا تو وہ اپنی املاک کا کچھ حصہ میرے نام ضرور کر دیتے۔ مگر ہوا یہ کہ بارشوں کی وجہ سے یہ تار مجھے انکی موت کے بعد پہونچا۔ ہفتہ بھر بعد جب بارش نے مجھے مہلت دی اور میں اپنے چچا کے ہاں پہونچا تو دیکھا کہ وہ عدم آباد سدھار چکے ہیں۔ اور میرے بعض عیار رشتہ داروں نے وہاں ڈیرا ڈال رکھا ہے۔ اس طرح بارش نے میری زندگی کا رخ گلزاروں کی طرف سے موڑ کر ویرانوں کی طرف کر دیا۔

پھر سال پر سال گذرنے لگے۔ زندگی کی ندی بہتی رہی اور واقعات کے طوفان چلتے رہے۔ میں ایک مفلس والدین کے جھونپڑے کا اجالا بنا ہوا تھا۔ ہماری آمدنی بہت قلیل تھی۔ اس واقعہ کے بعد ہمارے سارے سہارے ٹوٹ گئے تھے مفلوج باپ اور غمزدہ ماں نے اپنا پیٹ کاٹ کر میری تعلیم کے لئے کچھ روپیہ پس انداز کیا تھا۔ کیونکہ میں ہی ان کی شکستہ امیدوں کا سہارا تھا۔ میرے باپ کا خیال تھا کہ اگر میں نے میٹرک بھی پاس کر لیا تو مجھے کوئی چھوٹی موٹی ملازمت مل جائے گی۔ اور اس طرح ہماری تاریک جھونپڑی میں دئے کی بجائے شمع جھلملانے لگے گی۔ سال بھر میں نے دن کو دن اور رات کو رات نہ سمجھا۔ چوبیس گھنٹوں میں سے بلا مبالغہ بائیس گھنٹے میں کتابوں کی دنیا میں غرق رہتا تھا۔۔۔۔۔ سال کے آخر میں امید کا ایک ننھا سا تارا میری زندگی کی تاریک گھٹاؤں میں ضیا پاشیاں کرنے لگا۔ مجھے اور میرے والدین کو یقین ہو گیا تھا کہ میری محنت ٹھکانے لگے گی۔ میرے

تادوں کا بھی یہی خیال تھا کہ میں اعلیٰ نمبروں کے ساتھ کامیابی کا سہرا اپنے سر سے باندھونگا اور اس کے بعد مجھے وظیفہ ملیگا۔ اور میں اپنی تعلیم ی رکھ سکونگا۔ قریب تھا کہ مسرت و شادمانی کے چھلکتے جام کو اٹھا کر میں اپنے ہونٹوں سے لگا ؤں کہ پھر اسی کمبخت دشمن جاں بارش نے میرے بانوں کے طلوع ہوتے ہوتے آفتاب کو ہمیشہ کے لئے اپنی کالی مہیب گھٹاؤں میں غروب کر دیا۔ شاید آپ کو یقین نہ آئے کہ ایک انسان کے ساتھ ر ایک ہی قسم کا حادثہ کس طرح پیش آ سکتا ہے۔ یوں تو کہانیوں میں بھی نہیں ہوتا ـــــ مگر حقیقت کی دنیا میں یہ واقعہ یوں رونما ہوا کہ امتحان ہفتہ پھر پہلے پانی کا سیلاب سیلاب بلا بنکر آیا اور میرے گھر کو لے ڈوبا۔ اس حادثہ کے بعد میں ایک خطرناک قسم کے زہریلے بخار میں چھ مہینے مبتلا رہا۔ امتحان۔ کامیابی اور روشنیاں سب کچھ میرے لئے دیوانہ کا خواب بنکر رہ گئیں۔

پھر سال پر سال گذرنے لگے اور وقت کی ندی حسب معمول بڑی تیزی و تندی سے بہنے لگی۔ اب میں جوان تھا مجھے اپنی ماموں زاد سے عشق تھا۔ ہم دونوں بچپن کے منسوب تھے۔ ہمارے کھیل ہماری آئندہ زندگی کے عکس ہوا کرتے تھے۔ میرے ماموں کو یہ امید تھی کہ میں اپنے جائداد کا وارث بنونگا۔ مگر جب بدقسمتی نے مجھے اس نعمت سے محروم رکھا تو میرے ماموں کو مجھ سے نفرت ہو گئی۔ میری مفلسی کی وجہ سے انہوں نے دل اور میرا رشتہ توڑ دیا۔ اور اپنی لڑکی کا نکاح ایک امیر نوجوان سے کرنے لگے۔ میری منسوبہ نے مجھے ایک لمبا چوڑا محبت نامہ لکھا اور اس بات پر امند کر لیا کہ شادی کی رات میں اسے گرداب بلا سے چھڑا کر ساحل تمنا پر لے چلوں اور وہاں ہم دونوں ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے ہو جائیں چنانچہ میں نے ایک کشتی کرایہ پر لی اور رات کی تاریکی میں کشتی پر سوار ہو کر دوسرے کنارے سے پر پہونچنے اور وہاں شادی رچانے کا مکمل بندوبست کر لیا۔

شام کو آسمان پر تارے جھلملا رہے تھے۔ لیکن تاروں کی آنکھوں میں آنسو جھلمل کر رہے تھے۔ کیونکہ بڑھتی ہوئی رات کے ساتھ آسمان کے کناروں اروں طرف سے خوفناک گھٹائیں اٹھنے اور آگے بڑھنے لگی تھیں۔ یہ دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے۔ میری حرکت قلب بند ہوتے ہوتے رہ گئی۔ کیونکہ میں جانتا ہ قدرت کو میرے منصوبوں سے ازل کی دشمنی ہے۔ بجلی ہمیشہ میرے ہی خرمن آرزو پہ گرنے کی عادی ہے۔

وہی ہوا ـــــ وقت سے ایک گھنٹہ پہلے اس شدت کا مینہ برسنے اور ہوا کا جھکڑ چلنے لگا کہ الاماں الحفیظ! اس طرح میری کشتی ہمیشہ کے غرق ہو گئی۔

وہ وقت بھی گذر گیا۔ پھر سال پر سال گذرنے لگے اور وقت کا دریا طوفان حوادث سے مقابلہ کرتا ہوا حسب معمول بڑی روانی سے بہتا رہا اس سمندر میں ایک تنکے کی حیثیت رکھتا تھا۔ وقت کا تیز دھارا جانے مجھے کہاں کہاں بہا کر لے گیا۔ نوکریاں کیں۔ ملازمتیں چھوٹیں۔ دھکے کھ تے۔ شادی کی۔ غم اٹھائے۔ صدمے سہے۔ اولاد پیدا ہوئی۔ کچھ مر گئی۔ کچھ زندہ رہی جو زندہ رہے وہ مجھے زندہ درگور کر گئے۔ ایک بیٹے نے جذبات الم خیزی میں غوطہ زنی کی اس پر قتل کا الزام عائد ہو گیا۔ آج اسے ایک جیل سے دوسرے جیل میں منتقل کرنے کے سلسلے میں یہاں کے اسٹیشن پر سے گذرتا مجھے معلوم ہے کہ میں اسٹیشن پہونچ بھی جاتا تو مجھے اس کی شکل دیکھنی نصیب نہ ہوتی وہ قیدیوں کے ڈبے میں بند ہوتا۔ مگر امید آدمی کو خوشخیال بنا دیتی ہے کہ بھی گل کی نکہت ہی سہی اس کی صورت نہ دیکھ سکونگا تو کیا ہوا۔ وہ ڈبا وہ بند ڈبا تو دیکھ لونگا جس میں مرا لخت جگر بیٹھا ہوگا ـــ! مگر ہائے بارش نے ہی یہ آخری آرزو بھی پوری نہ ہونے دی۔

بچپن جاتا رہا۔ لڑکپن گذر گیا۔ جوانی بیت گئی۔ بڑھاپا سر پر مسلط ہے اور بارش ہوئے جا رہی ہے برسے جا رہی ہے۔ زندگی کے آخری موڑ پر بھی کی شدت نے مجھے مرنے نہ دیا ـــ"

میں بت کی طرح خاموش اور تصویر کی طرح حیران اسے تکے جا رہی تھی۔

سامنے آسمان جگمگا رہا تھا۔ بادل چھٹ چکے تھے بارش تھم چکی تھی اور سورج نکل آیا تھا۔ مگر کب؟ ـــ جبکہ زندگی کا آخری سنہرا موقع ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اطراف دھوپ ہی دھوپ تھی مگر اس کی امید پھر یاس و حرماں کے گھٹا ٹوپ بادلوں میں ڈوب چکی تھی۔

دیویندر ستیارتھی

★

سقراط

لوز محل بھی خوب گاؤں تھا، جس کے سانجھ سویرے ایک نرالی سرگم میں ڈھلے ہوئے تھے، جیسے رُتوں کے قافلے کا ایک مسافر تنہا کھڑا مسکرا رہا ہو۔ طنز و مزاح کے سنگم پر کھڑے ہو کر اکثر کہا جاتا تھا۔ فلاں بات نہ ہوتی تو لوز محل کی سرائے ہوتی! محل کے سرگم کا یہ سر سارے علاقہ میں مشہور تھا۔

لوز محل جرنیلی سڑک پر واقع نہ ہوتا تو اس کے ساتھ "لوز محل کی سرائے" والا محاورہ اور کیسے یہ اڑان بھر سکتا تھا۔ وہ سرائے شیر شاہ سوری کے زمانے میں بنی ہوگی لیکن اب تو کھنڈر تھی لیکن ادھر لوز محل کی شہرت کے کارن تھے میاں لقراط۔

بوڑھے میاں لقراط کو یہ بات بالکل ناپسند تھی کہ کوئی مذاق کی پھلجھڑی چھوڑتے ہوئے کہے۔ جلاہے کی عقل ٹخنے میں ہوتی ہے۔ وہ خود جلاہے نہ بھی ہوتے تو بھی وہ اس پھبتی پر ہزار لعنت بھیجتے۔

لوز محل کے جلاہوں کی پنچایت کے ہی نہیں، میاں لقراط تو آس پاس کے علاقے کے جلاہوں کی بڑی پنچایت کے بھی روح رواں تھے۔ ان کا فیصلہ حرفِ آخر کا درجہ رکھتا تھا۔ وہ کسی کی کھوکھلی نگاہوں میں بھی کوئی نہ کوئی مطلب ڈھونڈ نکالتے۔ اناپ شناپ بے تُکی اور بے مفہوم گپ شپ انھیں تھوہر کے کانٹوں کی طرح چبھتی رہتی۔ اس سے بچ نکلنے کا یہ اُپائے تھا کہ میاں لقراط دائیں ہاتھ سے گلا ملنے لگیں اور لوز محل کے لوگ یہی سمجھ کر رہ جائیں کہ میاں لقراط کے گلے میں بلغم پھنس گیا۔ شاید اسی وجہ سے کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ کرگھے پر کام کرتے ہوئے گرمی سردی کا خیال نہیں رکھتے میاں لقراط اور ان کے جسم میں بلغم کا زور بڑھ گیا ہے۔ لوز محل والوں کی باتوں میں کبھی معمولی بگولے یا جھکڑ کا رنگ ہوتا تو بھی ان کا انداز کافی بڑی آندھی کا روپ دھار لیتا۔ اور اس فضا کو صاف کرنے کے لئے میاں لقراط کے منہ سے نکلی ہوئی دو باتیں ہی کافی سمجھ لی جاتیں۔ جیسے لوز محل کا سرگم کا دُلار وقت کے ساتھ ساتھ بدلنے کے باوجود لوز کی سیج پر جاگتے رہنے کی قسم کھا چکا ہو۔

میاں لقراط سے اس علاقے کی کوئی بات چھپی ہوئی نہ تھی، وہ ہر کسی کو آنے والی آفت سے پہلے ہی خبردار کر دیتے تھے، سچ مچ وہ ایک حساس اور پختہ کار انسان تھے اور ان کی بات بات سے اعتماد ٹپکتا تھا۔ کیونکہ دلیل ہمیشہ ان کا ساتھ دیتی تھی، بدتمیزی اور بے ہودگی سے تو وہ کوسوں بھاگتے تھے، وہ ہمیشہ یہی کہتے "بے ہودگی میں تو دین و دنیا دونوں غرق ہو جائیں گے۔"

یوں میاں لقراط لوز محل کے سرگم کو تخلیق کی حد میں سنبھال کے آگے لے چلنے کی پوری کوشش کرتے رہتے۔ لیکن ادھر کچھ دنوں سے میاں لقراط کا چہرہ غمگین سا نظر آنے لگا تھا۔ جیسے انھوں نے پہلے سے ہی کسی آنے والی بڑی آفت کا اندازہ لگا لیا ہو۔ اب تو لوگ ان کے

منہ سے یہ بھی سننے کو ترس گئے تھے کہ بغیر محبت کے تو نور محل زندہ نہیں رہ سکتا۔ گاؤں کی آپس داری بڑی بات ہے۔ یہ تو وہ بہت بار سمجھا چکے تھے۔ پڑوسی کے دکھ پر ہمارا دل نہ پگھلے تو ہم کہاں کے انسان ہوئے؟ یہ بول کئی بار ان کی زبان سے پھول کی طرح جھڑ چکا تھا۔

لوگوں کے ہنسی مذاق میں پٹاخے چھوٹتے رہتے۔ کل تک میاں لقراط انھیں پسند کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح بیچ بیچ انسانیت کی ترویج ہو رہی ہے اگرچہ وہ کہا کرتے تھے کہ کہیں بچوں کے اخلاق کو اونچا اٹھانے کے لئے کوئی کچی اور بے ہودہ بات منہ سے نکالنی چاہئے پھر بھی وہ یہ ملتے تھے کہ ہنسنا بھی بے حد ضروری ہے لیکن اب تو جیسے میاں لقراط نے لوگوں کے ہنسی مذاق میں بھی آنے والے دور کی کوئی گھن گرج پہلے سے ہی سن لی ہو۔

" خدا کی رضا کے سامنے نور محل کو ہر صورت میں سر جھکانا ہی ہوگا ——" اکثر میاں لقراط یہ بات لے بیٹھتے " بہت برا زمانہ آ رہا ہے خدا ہی روک سکے تو روکے۔"

" تو اس کا کوئی اپائے نہیں۔ میاں لقراط ——؟ " کوئی پوچھ بیٹھتا۔

" اس کا اور کوئی اپائے نہیں —، میاں لقراط آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہتے " میں تو سوچتا ہوں کہ نور محل والوں کو نیند کیسے آتی ہے —؟ " اور میاں لقراط کچھ اس طرح آنکھیں پھیلا کر سامنے والے کی طرف دیکھتے جیسے انھوں نے آنے والے دور کی آفت کا پورا حساب لگا لیا ہو۔

واقعی نور محل کی آپس داری بہت کم ہو گئی تھی۔ جیسے لوگ جمع اور ضرب تفریق اور تقسیم کے سوالات ہی زیادہ حل کرنے لگے ہوں۔

" لوگوں کا دماغ بیہودگیوں کی گلیوں میں گھوم رہا ہے۔" میاں لقراط اکثر اپنے ملنے والوں سے شکایت کرتے " لوگوں کی باتوں میں پیار کی خوشبو نہیں رہی، چہروں پر نرمی کی بجائے سختی جھلکتی ہے۔ خداوند کریم کا لاکھ لاکھ شکر کہ میری تو بہت کٹ گئی اور جتنی رہتی ہے وہ بھی کٹ جائے گی۔ لیکن نور محل کا کیا بنے گا —؟ ہم نے اخراجات تو بڑھا لئے آمدنی اتنی نہیں۔ بدی بڑھ رہی ہے۔ نیکی کا حساب کم ہو رہا ہے اللہ پاک روشنی دکھائیں تو کیسے ——؟"

لفظوں کی نشست و برخاست کا خاص خیال رکھتے تھے میاں لقراط۔

" لوگو! اپنے اوپر رحم کھاؤ، آپس داری سے بڑا کوئی مذہب نہیں۔ جمع اور ضرب اچھی ہے، تفریق اور تقسیم نہیں۔ اللہ پاک کے غصّے سے ڈرو۔ محبت کی آستین پکڑ کر اتنا نہ جھٹکو کہ وہ غصّے سے لال پیلی ہو جائے۔ بدزبانی سے بچو، کہیں زبان کو نفرت کا کیڑا نہ کھا جائے۔ محبت سے خالی دل ایسے ہے جیسے مکان سے خالی صحن " اور کبھی کبھی ایسی باتیں اب بھی میاں لقراط کی زبان پر آ جاتی تھیں۔ اگرچہ وہ خاموش رہنا ہی زیادہ پسند کرتے تھے۔

نور محل کی روح بڑی تیزی سے خالی، خشک اور تلخ ہوتی جا رہی ہے۔ اور یہ بات میاں لقراط اپنے کرگھے پر کام کرتے ہوئے کیسے نہ سوچتے —؟ کرگھے کی ٹھک ٹھک کے ساتھ ساتھ جیسے آنے والے دور کا خدشہ بھی ٹھک ٹھک کرتا رہتا۔

حقہ پیتے وقت پرانے وقتوں کی یاد بہار کے پھولوں کی خوشبو کی طرح آتی اور میاں لقراط جیسے اپنے حقے ——سے باتیں کرنے لگتے۔

" ہاں میاں " حقے " تب یہ نفرت کہاں تھی —؟"

لوگوں میں بڑھتی ہوئی نفرت کا احساس جیسے انھیں بلندی سے اٹھا کر پستی میں پٹک دیتا۔ اور میاں لقراط ہاتھ اوپر اٹھا کر کہتے " یا تو نور محل آگے جانے کی بجائے پیچھے کی طرف پلٹ جائے یا پھر مجھے اس دنیا سے اٹھا لے، اللہ پاک —"

لیکن سوال ایک نور محل کا نہیں تھا۔ نفرت کی آگ تو سارے علاقے میں بھڑک اٹھنے کو تیار تھی۔ لمحے، دن، مہینے،

ـال جیسے سب کو نفرت چڑ جائے گی ـ میاں بقراط کی سمجھ میں یہی بات آ رہی تھی ـ ہر روز نفرت ہی نور محل کے ہر ایک دروازے پر دستک دیتی ـ اُس پر یقین کئے بنا چارہ نہ تھا ـــ ۔

نور محل کے اسکول میں پڑھنے والے بچے اب بھی اپنی کتاب میں یہ بات پڑھتے تھے کہ جزیرہ زمین کا وہ ٹکڑا ہے جو چاروں طرف پانی سے گھرا ہو ـ لیکن میاں بقراط اسے بدل کر یہ کہنے پر آمادہ ہو گئے تھے کہ نور محل ہی نہیں یہ سارا علاقہ زمین کا وہ ٹکڑا ہے جس کے چاروں طرف ہی نہیں بلکہ اندر بھی نفرت کا پانی ٹھاٹھیں مار رہا ہے ـ اسی نفرت کی پیش کش تھی، چڑچڑا پن حقہ پیتے پیتے میاں بقراط پاس بیٹھے شخص کو سنانے کے لئے اپنے حقے سے یوں مخاطب ہوئے، "میاں حقے، میں تو جاہل ہوں بالکل انپڑھ آدمی پھر بھی اتنا تو جانتا ہوں کہ محبت کا جزیرہ زمین کا وہ ٹکڑا ہے جو چاروں طرف آپسی داری کے سمندر سے گھرا ہوا ہو ـ"

پاس سے گزرتا ہوا کوئی شخص کبھی یہ بول اچھالتا

سٹ نلی سٹ تار ـ کب بیوں کب جاؤں بازار ۔

یہ تھا پورب کی طرف کا بول، جسے دودھ ملائی کی برف بیچنے والا ہیت رام اپنے ساتھ لایا تھا ـ ہیت رام سے سن کر جلاہوں کا مذاق اڑانے والا یہ بول اسکول کے تین چار استادوں نے بھی یاد کر لیا تھا ـ لڑکے ہیت رام کے سر پر کشتی نما ٹوپی دیکھ کر اس کا مذاق اڑانے سے باز نہ آتے ـ

ہندوستانی ئے بڑے شیطانی

ٹیڑھی ٹوپی رکھتے ہیں!

ویسے تو میاں بقراط بھی کبھی کبھی کہتے تھے کہ ہیت رام کی ملائی کی برف نہ ہوتی نور محل کی سرائے ہوتی، لیکن اکثر وہ اپنے دل کو سمجھاتے رہتے کہ یہ طعنہ تو ٹھیک نہیں ـ اور وہ کرگھے پر کام کرتے کرتے یا حقے کے کش لگاتے وقت اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے کہتے، "کسی کے پیٹ پر لات مارنا تو سب سے بڑا گناہ ہے ـ کسی اور سے برائی ہو جائے بھلے ہی، مگر اپنے سے نہ ہو ـ ہاں میاں بہت اچھی ہے ہیت رام کی ملائی کی برف ـ بے چارہ اتنی دور سے یہاں اس گاؤں میں اپنا روزگار چلانے آتا ہے ـ ٹھیک ہے اسے بھی تو روٹی ملنی چاہیئے ۔"

ہیت رام کی اور بات تھی، اسے غزل کا یہ شعر اپنا بہت پسند تھا، جسے وہ اکثر ٹھنڈی ٹھار ملائی کی برف کی ٹھنڈی ٹھار آواز لگانے کے بعد بھی کبھی کبھی لڑکوں کی کوئی ٹولی اپنی طرف لپکتی ہوئی نہ دیکھ کر گانے لگتا تھا ؎

وفاداری بشرطِ استواری، اصل ایماں ہے

میرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

اس نے بہت اچھا گلا پایا تھا اگرچہ اس کا تلفظ اتنا اچھا نہ تھا پہلے تو وہ کبھی کبھی میاں بقراط کے پاس بیٹھ کر وہ پوری غزل اپنے سیدھے تلفظ کے ساتھ لیکن بڑے سُر میں گا کر سناتا تھا اور کعبے میں برہمن کو گاڑنے والے شعر کا مطلب بیان کرتے ہوئے لمبی تقریر کرنے کے بعد اس بات پر تان توڑتا کہ وفاداری اور صدق دل ہی سچا ایمان ہے ـ لیکن ادھر بہت دنوں سے ہیت رام نے میاں بقراط کی سنگت چھوڑ رکھی تھی اور نہ جانے کیوں جلاہوں سے اسے خدا واسطے کا بیر ہو گیا تھا ۔

لوگوں نے میاں بقراط اور نوجوان پنڈت ہیت رام کی ان بن کے کئی مطلب نکالے کچھ لوگ کہتے تھے کہ میاں بقراط نے پنڈت ہیت رام کو اپنے گھر کے سو پھیرے لگوائے لیکن اس کے لئے دھوتی قمیض کا کپڑا اور دو تین تولیے بن کر دینے کا وعدہ پورا نہ کیا اور جوش میں آ کر ہیت رام اپنا سوت اٹھا لایا ـ وہ سوت اسے سستے داموں بیچنا پڑا اور مہنگے بھاؤ کا کپڑا بازار سے خریدا جس

ا ہیت رام کو دس بارہ روپے کی چپت لگ گئی۔

کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ ان بن میاں لقراط کی پوتی رلیشماں کے کارن ہوئی۔ کہتے ہیں کہ ہیت رام۔ رلیشماں کو مفت ملائی برف دے ڈالتا تھا اور میاں لقراط نے کئی بار منع بھی کیا لیکن ہیت رام نہ مانا، آخر میاں لقراط نے صاف صاف کہدیا" ہیت رام تم ہماری گلی میں یا کرو" جواب میں ہیت رام کہہ بیٹھا" یہ گلی آپ کے باپ کی ہے میاں جی؟" بس اسی سے بات بڑھ گئی اور ہیت رام نے خوب، نمک مرچ لگا کر یہ بات اسکول کے لڑکوں کو سنائی پھر یہ بات بازار تک جا پہونچی۔ پھر تو یہ بات جیسے دوسری باتوں کا ہاتھ پکڑے گھومنے لگی۔

لوگ ہیت رام سے پوچھتے "کپڑا نہ بننے والی بات صحیح ہے یا مفت میں ملائی کی برف دینے والی بات ۔"

ہیت رام جواب دیتا" دونوں ۔۔"

میاں لقراط نے تو ان باتوں کی طرف سے کان بند کر کے چپ کا روزہ رکھ لیا تھا۔

لیکن ہیت رام نے جیسے قسم کھائی تھی کہ میاں لقراط کا چپ کا روزہ تڑوا کر ہی چھوڑے گا۔

ں ایک حصہ انک۔ ملائی تلوا کر اوپر سے پھانک مفت میں لے کر بھی خوش نہ ہوتا تو ہیت رام کہتا" بڑے لقراط بنے ہو جی ۔۔" اور جب سامنے اکا یک گرم ہونے لگتا تو ہیت رام کہتا "کیوں لمبی چوڑی باتیں کرتے ہو جی، جاؤ جا کر کہہ دو میاں لقراط سے وہ آئیں تو مفت برف حاضر ہے ن پھر کپڑا بننے کے بھی پیسے نہ لیں ۔"

نہ جانیں اس میں ہیت رام کو کیا مزہ آتا تھا۔ وہ اکثر فرصت کے لمحوں میں پورب دلیس کی بات لے بیٹھتا تھا اور بتاتا کہ وہاں چلا ہے ہ آپ کو انصاری کہنے لگے ہیں ۔"

" اجی ماسٹر جی، کیا بتاؤں ۔" وہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر نور الہیٰ سے کہا" آپ تو ادھر کے ہیں نا آپ کیا جانیں ہماری طرف کا قصہ ری طرف کہتے ہیں۔ سٹ کلی، سٹ تار۔ کب بنوں کب جاؤں بازار۔ اور سنئے ماسٹر جی جب سے جلاہے انصاری بن گئے، اصلی ماری دب کے رہ گئے۔ ہمارے گاؤں کے ایک اصلی انصاری کہا کرتے ہیں۔ یہ جلاہے انصاری نہیں ہیں، ہم تو ضرور انصاری ہیں جو رسول ز کے زمانے میں مدینے میں مقیم تھے ۔ اور سنئیے ماسٹر جی اس کے جواب میں یک جلاہے نے پوچھا کیا مدینے والے اب تک زندہ ہیں؟ مانو بھا ایسا ہے ماسٹر جی ۔ ہمارے یہاں لوگوں کو پرانی نسبتیں ثابت کرنے یا سمبندھ جوڑنے کا بڑا شوق ہے۔

اب وہ کہانی بھی تو ہیت رام نے سارے علاقے میں مشہور کر رکھی تھی کہ ایک جلاہا مچھلی خریدنے گیا وہاں لالہ جی پہلے ہی سے موجود تھے، برے نے سوچا کہ ایک ہی مچھلی ہے لالہ کو دوں، وہی تو زیادہ دام دے سکے گا۔ اب جناب جلاہے نے بھی دل میں ٹھان لی کہ یہی مچھلی خرید دم لے گا۔ بولی پڑنے لگی، معاملہ کئی ہزار تک جا پہونچا تو لالہ بھاگ گیا اور جلاہا وہ قیمتی مچھلی خرید کر گھر لایا تو کہتے ہیں کہ اس ایک مچھلی کا شوربہ بنایا گیا ہ پوری انصاری برادری نے کھایا جس نے بھی کھایا اس نے چندہ دیا اور قیمت پوری کر دی اور یوں انصاری برادری نے اپنی عزت برقرار رکھی۔

" اجی ماسٹر جی کیا بتائیں ۔؟ ہیت رام نے جھکتے پلڑے سے ملائی کی برف ماسٹر الہی بخش کے لئے تول کر دیتے ہوئے کہا" یہاں پ کے علاقے میں تو جلاہوں کی برادری اتنی مضبوط نہیں ہے، ہمارے پورب میں دوسرا نقشہ ہے ماسٹر جی۔ جناب ایک بار کسی رئیس نے اہوں کی ہتک کر دی اور جلاہوں نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ ہم انصاری ہیں مقدمہ لڑا اور جناب اس مقدمہ میں جلاہوں نے پانی کی طرح دپیہ بہا یا۔ انصاری برادری کا معاملہ ٹھہرا انصاری جیت گئے اور اس جیت کی خوشی میں انصاریوں کے ایک اخبار نے اپنا ایک خاص نمبر ائع کیا۔ جناب اس اخبار کا ایڈیٹر بھی تو کوئی انصاری ہی تھا ۔"

ماسٹر نور الہی ہنس کر کہتے" اور تم نے وہ بات بھی تو سنائی تھی کہ ایک بار انصاریوں اور ساہستریوں میں جھگڑا ہو گیا تھا کہ کن کا تعزیہ لمبا ہو

"جی ہاں ماسٹر جی ـــــ" ہیت رام نے آنکھیں جھپکا کر کہا " ایک بار تو انصاریوں اور راج مستریوں کی طرف سے اتنے لمبے تعزیے نکالے گئے کہ انھیں کندھوں پر اٹھائے چلنا تو ناممکن تھا انھیں بلّیوں پر ڈھکیل کے چلنے کی ترکیب نکالی گئی۔ ان کی ڈوریاں پکڑ کر چھتوں پر چلنا ہوتا تھا اور ماسٹر جی ایک جگہ تو جھگڑا ہوتے ہوتے بچا کیونکہ ایک جگہ چھت پر ایک ٹھاکر صاحب نے ڈوری پکڑ کر چلنے والوں کو روک دیا۔ بڑی مشکل سے ٹھاکر صاحب کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ یہ تو راج مستریوں کے مقابلے پر انصاری برادری کی عزت کا سوال ہے۔ اور انصاری برادری کو ناراض کر دیتے ٹھاکر صاحب تو پھر کون ان کے گھر والوں کے لئے کھدر بنتا"

"اچھا ہیت رام! ہماری سمجھ میں ایک بات آئی" ایک دن ماسٹر نور الٰہی بولے "ہم اب اپنے میاں لقراط کو میاں لقراط انصاری کہیں گے۔

"یہی تو میں بھی چاہتا ہوں ـــــ" ہیت رام نے کشتی نما ٹوپی اتار کر ہاتھوں پر اچھالتے ہوئے کہا "لیکن ماسٹر جی نہ میاں لقراط کو انصاریوں والے سب قصّے آپ ہی سنائیں اپنی زبان سے، میں سناؤں گا تو وہ ناراض ہو جائیں گے"

"اچھا میں ہی سناؤں گا وہ قصّے۔ اور اگر میاں لقراط نے خود اپنی زبان سے یہ نہ کہا کہ ماسٹر جی کیا تو ہم بھی انصاری ہیں تو ہیت رام تو میرا نام بدل دینا۔

اور وہی بات ہوئی۔ ماسٹر نور الٰہی نے جہاں میاں لقراط کو ڈھاکے کی ململ بننے والوں کا قصہ سنایا وہاں یہ بھی بتایا کہ کانپور کی طرف جلاہوں کے پورے کے پورے گاؤں آباد ہیں۔ ہیت رام نے بات بدل کر کہا "ان سے پوچھ لو ماسٹر جی! میرے تو یہ دادا کے برابر ہوئے نا ــــ میں نے کبھی ان کی عزت کرنے سے انکار کیا ہے ہاں ایک بار ضرور ذرا لال مرچ کا اثر ہو گیا تھا جس کے لئے میں اپنے انصاری دادا سے معافی مانگتا ہوں"

"یہ انصاری دادا کی بات تو سمجھ میں نہیں آئی۔ میاں لقراط نے داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "یہ کوئی پورب کی بات ہو تو ہو"

ماسٹر نور الٰہی بولے "اب جلاہوں کی تو ایک ہی برادری ہونی چاہیئے، چاچا لقراط! یا کیا تم انھیں الگ الگ مانتے ہو۔ ہیت رام سے پوچھ لو۔ یہ تصدیق کرے گا۔ پورب میں تو سبھی جلاہے انصاری کہلاتے ہیں۔ اور یہ نام اتنا برا بھی نہیں۔ پورب میں جیسی مضبوط برادری انصاریوں کی ہے اور کسی کی نہیں۔ وہ لوگ وہاں بہت محنتی بھی تو ہیں۔ گردس آدمی ہیں۔ اور دسوں آٹھ آٹھ آنے کا کام بھی کریں تو پانچ روپے روز کی آمدنی ہو گئی۔ انھیں اور کیا چاہیئے۔ اور ہاں چاچا لقراط پورب کے انصاریوں کی کیا بات ہے۔ وہ ہمیشہ پنچوں کا فیصلہ مانتے ہیں۔ سرکار کا نہیں"۔ ہیت رام نے بار بار سر پر کشتی کی ٹوپی رکھتے ہوئے کہا "پورب کی کیا بات ہے وہ یہاں نور محل میں کیسے ہو گی۔ ایک تو یہاں جلاہے اتنی تعداد میں نہیں ہیں۔ دوسرے وہ اتنے محنتی اور کاریگر بھی تو نہیں ہیں۔ دادا لقراط کی اور بات ہے۔ کیونکہ ان کا تو پنچوں میں ہی نہیں کاریگروں میں بھی شمار ہے۔

"وہ کہانی بھی تو سناؤ نا ہیت رام جس میں ایک گریجویٹ کے بالمقابل ایک دوسری جماعت پاس انصاری جیت گیا ووٹ لینے میں" ماسٹر نور الٰہی نے اپنی کرسی میاں لقراط کے قریب سرکاتے ہوئے۔ ہیت رام بینچ پر بیٹھا تھا۔ وہ ہنس کر بولا "لو وہ کہانی بھی سن لو ماسٹر جی۔ شاید دادا لقراط کو پسند آ جائے۔ ہاں تو ایک بار بجنور کے علاقہ سے حافظ ابراہیم کھڑے ہوئے جو بی اے پاس تھے۔ لیکن ان کا اتنا قصور تھا کہ وہ نیشنل پارٹی کے نہیں تھے ماسٹر جی نیشنل پارٹی کی طرف سے بابو بشیر احمد انصاری جو صرف دوسری جماعت پاس تھے۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ سو میں سے پچانوے ووٹ تو بشیر احمد انصاری کو ملے۔ سارے علاقہ میں برادری کے فیصلے کی دھوم پڑ گئی۔ انصاری برادری کے پنچ فیصلے کی کیا بات ہے۔ ماسٹر جی ان کے سامنے تو دھوبی بھی نہیں ٹھیرتے"

ماسٹر نور الٰہی بولے "میرا بھی یہی خیال ہے کہ انصاری پنچایت کے بعد ہی دھوبیوں کی پنچایت کی بات آ گئی ہے" کہتے کہتے ماسٹر نور الٰہی ہنس پڑے "دیسے دلّی کے گھٹ بنوں کی بھی پنچایت ہوتی ہے۔ وہ اپنا فیصلہ کر کے پولیس کو دے دیتے ہیں اور چاچا لقراط اور پولیس بھی ان ہی کے فیصلہ پر

ہر لگا دیتی ہے۔ پھر چاہے قتل کا معاملہ بھی کیوں نہ ہو۔ پھانسی کی سزا ہونے تک کٹ ہنوں کی شہادت قائم رہتی ہے۔"

میاں لقراط بولے: "اسی پنچایت کا سپاد یکھتے دیکھتے تو میری عمر بیت چلی۔ میں بھی بہت گھوما پھرا ہوں پورب میں میں نے بھی وہ پنچایت دیکھی ہیں۔ گاؤں میں فیصلے دیتے دیکھے ہیں۔"

ہاں ہاں دادا لقراط!" ہیت رام نے باگ ڈور سنبھالتے ہوئے کہا: "میں بھی تو یہی کہہ رہا تھا کہ پنچ پرمیشور پنچایت میں اللہ میاں کی طرف سے ہی سچا پچ ہوتا ہے۔ جس کو پنچ کہدے۔ تو بیٹھ جائے۔ وہ پھر کیا مجال کہ کھڑا ہو کر بات کرے۔"

ماسٹر نور الٰہی بولے: "لیکن دہوبیوں کی اور بات ہے۔ دلی میں ایکبار میں نے دیکھا کہ کسی بات کو لے کر دہوبیوں کی پنچایت نے فیصلہ دیا کہ فلاں آدمی کا جرم تب معاف ہو سکتا ہے جب وہ ساری برادری کو دارو پلائے۔ اب صاحب مجرم بولا منظور ہے۔ انھوں نے چاندنی چوک میں فوارے پر جاکر ایک جگہ شراب ٹھیکے سے ایک ادہا خریدا اور کہتے ہیں اسی میں سب نے اپنی اپنی مونچھیں ڈبو کر کہہ دیا کہ اس نے ساری برادری کو دارو پلا دی۔ لیکن پورب کے انصاریوں کے یہاں اس قسم کی حماقت نہیں ہوتی"

میاں لقراط جیسے کسی سوچ میں ڈوب گئے۔ ماسٹر نور الٰہی بولے: "کیا سوچ رہے ہو چاچا؟"

کیا بتاؤں؟" میاں لقراط بولے: "آپ لوگ ہنسیں گے"۔

"کہو کہو، چاچا!" ماسٹر نور الٰہی بولے "ہم اپنے چاچا پر ہنسنے والے کون ہوتے ہیں؟"

"اچھا تو سنو" میاں لقراط بولے۔ "ایک بار" انصاریوں والی بات میں نے اپنی پوتی ریشماں کو سنائی۔ وہ بولی۔ تب تو ہم بھی انصاری ہوئے۔ بابا! اور پھر اس نے بڑا سنجیدہ منہ بنا کر کہا۔ ہیت رام ملائی والا بھی ایک دن یہی کہہ رہا تھا کہ پورب میں سب جلا ہے انصاری ہی ہوتے ہیں اچھا تو آج سے ہم بھی اپنے کو انصاری ہی کہا کریں گے، ماسٹر جی! ہیت رام کو اعتراض نہ ہو۔"

کیوں مجھے کیا اعتراض ہوگا، دادا لقراط ہیت رام نے بیچ سے اٹھ کر لقراط کے پیر پکڑ لیے اور پھر منت سماجت کرتے ہوئے کہا۔ "میرا اس دن والا پاپ کھما کر دو، دادا وہ تو مجھولال مرچ کا ہی اثر تھا۔ نہیں تو کیا ہیت رام کی یہ مجال ہو سکتی ہے کہ دادا لقراط کے سامنے آنکھیں اونچی کرے۔ اور چاچا ایک بات کہوں" کہ ریشماں کی شکل میری بہن سے ملتی جلتی ہے اس لئے میں نے اس سے ملائی کے پیسے نہیں لئے تھے۔ تم ہی بتاؤ کیا کوئی اپنی بہن سے بھی سودے کے پیسے لیتا اچھا لگتا ہے؟"

"بس ٹھیک ہے میاں ہیت رام!" میاں لقراط ہنس کر بولے: "آج سے نور محل کا میاں لقراط ہو گیا میاں لقراط انصاری اور ہیت رام ہو گیا ریشماں کا بھائی برادر۔ کیوں منظور ہے؟ ایک بات یاد رکھو جب کبھی بھی بہن پر مصیبت آئے گی تو بھائی کو اس کی مدد بھی کرنی ہوگی وہ ایک راجپوت رانی ہوئی ناجس نے ہمایوں کے راکھی باندھی تھی۔ میں ریشماں سے کہوں گا کہ وہ تمہارے ہاتھ میں راکھی باندھے۔ کیوں منظور ہے؟"

"ہاں منظور ہے؟" ہیت رام نے دوبارہ میاں لقراط کے پاؤں چھو کر کہا۔

وہی بات ہوئی۔ راکھی کا دن آیا تو ریشماں نے اپنے بابا کی بات رکھنے کے لئے ہیت رام کے راکھی باندھ دی۔ اور ہیت رام نے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر بہن کے ہاتھ میں تھما دیا۔

یہ بات نور محل کے سرگرم میں ہی نہیں، سارے علاقہ کی زندگی میں ایک نیا سر جوڑنے والی ثابت ہوئی۔ اور نور محل میں تو ہر کسی کی زبان پر یہی بات تھی کہ اب میاں لقراط ہمیشہ کے لئے میاں لقراط انصاری بن گئے۔ ہیت رام ان کی پوتی ریشماں کا بھائی بن گیا۔

"حقہ پیتے پیتے میاں لقراط انصاری اب اپنے حقہ سے بات کرنے لگتے۔" میاں حقہ اب تو ہم انصاری ہیں کیونکہ میاں حقہ یہ تو سو بات کی ایک بات ہے کہ ہم سب وقت کے ساتھ بدل رہے ہیں۔ پھر بھی ایک بات تو نہیں بدلنی چاہیئے۔ میرا خیال ہے اس کی کمی نہیں ہونی چاہیئے۔ وہ

،کی سچائی سُر بھی سہانے ہو تو راگ مزا نہیں دیتا۔"

پاس بیٹھا ہیت رام کہتا "دادا لقراط دل کی سچائی سے سچا دھرم ہے۔ دل کا پھول نہ کھلے تو پھر کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ اور دادا ہم تو ایک بات نتے ہیں۔ دل کی سچائی کا مطلب ہے کوئی اصول کی بات۔ اب ہماری ملائی کو ہی لو، اسے جمانے کے لئے بھی تو برف اور نمک چاہئے۔ ورنہ دودھ ملائی کیسے جمے گی۔؟"

نور محل کے علاقہ میں ہیت رام کی ملائی اب پہلے سے زیادہ بکنے لگی۔ دور دور تک جاتا ہے۔ برف کے ساتھ ساتھ اس کی کہانیاں پھیلتی گئیں۔ اور پھر ایک دن پورب کے دروازے سے منہ نکال کر نور محل کو ہر روز صبح کی نئی خبر سنانے والے سورج نے کہا کہ آزادی آرہی ہے

لیکن آزادی کے ساتھ ساتھ نور محل کے سرگم میں کچھ درد بھرے سُر بھی ملتے گئے۔

آس پاس کے علاقے کے بہت سے جلاہے پنچایت کے فیصلے کا انتظار کئے بنا ہی اپنا اپنا سامان لاد کر چلے گئے۔

ں لقراط بولے "اگر میں لقراط انصاری ہوں تو نور محل چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔"

اب ہیت رام تھا کہ ہر روز میاں لقراط کے پاس بیٹھا یہی رٹ لگانے لگتا دادا بہت برا زمانہ آرہا ہے۔ آپ لوگوں کا یہاں سے جانا ہی ٹھیک ہے گا۔"

ڈر نہیں ہے کہ تجھے؟" میاں لقراط کہتے "ہیت رام تو ہی ہمیں ڈرائے گا تو کیسے کام چلے گا۔ ارے میاں ہمیں تو اپنے ہی اندر نڈر رہنے بات سوچنی ہے۔ باپ دادا کا گاؤں ہے نور محل ۔ اسے چھوڑ کر چلے جائیں۔ یہ سوچتا ہوں تو میرے اندر ایک آگ سلگنے لگتی ہے۔"

"یہ باتیں تو ٹھیک ہیں اپنی جگہ" ہیت رام کہتا۔ "لیکن میرا بھی کوئی فرض ہے۔" پھر ہیت رام آواز دیکر رشیماں کو بلاتا۔" اور آؤ رشیماں ں! بابا کو سمجھا دینا کہ نور محل سے جانا ہی اچھا ہے۔"

"رسی بھلے ہی جل جائے!" میاں لقراط بولے۔ "بل تو باقی رہیں گے۔ اور ایسے ہی ہمارے خیالات ہیں جو نور محل کے ساتھ ہمیشہ جڑے ہیں گے۔"

اب مصیبت بھی تو یہی کہ میاں لقراط نہ ماسٹر نور الہی کی بات مانتے تھے نہ ہیت رام کی۔ وہ یہی رٹ لگا رہے تھے کہ چاہے پورا علاقہ جلاہوں ے خالی ہو جائے، ہمارا کنبہ یہیں نور محل میں رہے گا۔

ہیت رام کے دل کو ایک خوف محسوس ہوتا تھا۔ وہ بار بار میاں لقراط کے گھر جاکر رشیماں کو سمجھاتا دیکھو بہن مجھے تو راکھی کی لاج رکھنی ہوگی نا۔ ں لئے میں چاہتا ہوں کہ تم بابا کو سمجھاؤ کہ اس سے پہلے کوئی مصیبت آئے میرا مطلب ہے آزادی آنے سے بہت پہلے ہی تم لوگوں کو فیروز پور کے ں پار میرا مطلب ہے ستلج کے پیچھے بہاول پور کی طرف چلے جانا چاہئے۔"

ماسٹر نور الہی نے بھی یہ ہی صلاح دی۔ لیکن میاں لقراط تو اپنی ہی بات پر اڑ گئے تھے۔" ہم مرتے دم تک یہیں رہیں گے"

ہیت رام جھنجھلا کر بولا۔" وہی بات ہوئی۔ پانڈے جی پچھتائیں گے اور پھر چنے کی کھائیں گے۔"

جب کسی طرح نور الہی اور ہیت رام کی بات میاں لقراط کے پلے نہ پڑی تو دونوں نے سازش کر کے میاں لقراط کے گھر والوں کو ر محل سے چلے جانے کے لئے راضی کر لیا۔ اور ایک دن جبکہ میاں لقراط دو تین دن کے لئے کسی کام سے جالندھر گئے تو میاں لقراط کے گھر والے اپنا کچھ ضروری سامان لے کر بہاول پور چلے گئے۔ ہیت رام کو ساتھ جانے سے گھر والوں نے بہت روکا بھی ایسی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ لیکن وہ بہاولپور ک ان کے ساتھ گیا۔

میاں لقراط نے واپس آکر دیکھا کہ گھر والے چلے گئے تو بہت جھنجلائے اور ساری بات کا پتہ چلنے پر انہوں نے ماسٹر نور الہی اور ہیت رام سے

قطع تعلق کر لیا۔

پورب کے دروازے سے ہر روز سامنہ نکال کر سورج نورمحل والوں کو نئی خبریں سناتا۔ اور بہاولپور سے بار بار چٹھی آتی جس میں میاں بقراط کو یہ ہی تاکید ہوتی کہ وہ فوراً نورمحل چھوڑ کر وہاں چلا آئے۔

سارے علاقہ میں بری خبریں پھیل رہی تھیں۔ میاں بقراط دن بھر کام کرنے اور دن بھر کے تھکے رات کو حقّے سے باتیں کرتے کرتے سو رہتے ان کے منع کرنے پر بھی ماسٹر الٰہی بخش اور پنڈت ہیت رام آکر میاں بقراط کو جگا کر بھی سمجھاتے کہ بہت برا زمانہ آرہا ہے اور میاں بقراط کے لئے کہ یہ ہی مناسب ہو تاکہ وہ اپنے گھر والوں کے پاس صحیح سلامت پہنچ جائے۔

میاں بقراط نے کہدیا کہ وہ جیئیںگے تو نورمحل میں اور مریں گے تو نورمحل میں۔ انہوں نے تو یہاں تک طعنہ دے ڈالا۔ ڈر نہ ہوا نورمحل کی سرائے ہوئی۔ میاں بقراط کھلے بندوں گھومتے۔ کئی بار جاکر نورمحل کی پرانی سرائے کا جائزہ لیتے اور پرانے وقتوں کی باتیں یاد کرتے ہوئے وہ شعر گنگناتے جو انہوں نے پنڈت ہیت رام کو کئی بار گاتے ہوئے سن کر یاد کر لیا تھا۔ وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے۔ مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو۔ . . . . . . نورمحل کی سرائے کے کھنڈر انھیں کیوں اتنے پسند تھے۔ یہ بات آج تک انکی سمجھ میں نہ آئی تھی۔ ملائی کی برف بیچنے کا کام نگٹا کر کبھی پنڈت ہیت رام بھی ادھر آنکلتا تو نورمحل کی سرائے کے بارے میں وہ طرح طرح کی کہانیاں لے بیٹھتا وہ کہتا "شیر شاہ سوری بھی کتنا سیانا تھا جس نے جرنیلی سڑک بنوائی۔ اور اس سڑک کے کنارے ایسی ایسی کتنی سرائیں بنوائیں۔"

میاں بقراط کہتے۔ ہیت رام، وہ بات بھی تو سناؤ ــ تختی پہ تختی، مولوی صاحب کی آئی کمبختی اور وہ بات کا رخ بدل کر بات بات کرتے کرتے ہنس پڑے۔

ہیت رام موقع دیکھ کر کہتا "اب تو دادا بقراط کی ہی کمبختی کا سوال ہے جو نورمحل چھوڑ کر جاتے ہی نہیں۔ حالانکہ ہر روز پورب کے دروازے سے منہ نکال کر سورج یہ ہی صلاح دیتا ہے۔

ایک دن نورپور کی سرائے کے کھنڈر کے پاس کھڑے کھڑے میاں بقراط نے صاف صاف کہدیا "دیکھو بیٹا ہیت رام! خبردار جو کبھی دوبارہ مجھے نورمحل چھوڑنے کو کہا"

موت آرہی ہے موت ہیت رام نے بھی جیسے جھنجھلا کر کہا" آزادی کے ساتھ ساتھ موت آرہی ہے منہ کھولے۔ کیا تم موت کے منہ میں جانے کو تیار ہو دادا؟ میاں بقراط نے قہقہہ لگا کر کہا آنے دو موت کو۔ اس کی بھوک مجھے کھا کر ہی مٹ سکتی ہے تو آئے اور مجھے کھالے"

بہت دن تو نہیں بیتے تھے آزادی میں۔ اور پھر وہ ہی بات ہوئی جس سے ہیت رام ڈرتا تھا۔ ماسٹر نورالٰہی کبھی کے جا چکے تھے۔ اب وہ اکیلا تھا۔ نورمحل کے بعد بھی کئی لوگوں نے میاں بقراط کو سمجھایا۔ یہاں تک کہ ایک بار تو انھیں زبردستی پکڑ کر اسٹیشن تک لے گئے اور بہاولپور کا ٹکٹ بھی خرید کر ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ لیکن انھوں نے جانے سے انکار کر دیا۔

اب حالات بدل گئے تھے۔ باہر کے بہت سے لوگ نورمحل میں آگئے تھے۔ اور ایک دن فسادات کی آگ نورمحل تک آپہنچی۔ باہر کے کچھ لوگ جو میاں بقراط کی اہمیت سے ناواقف تھے اس بات پر بضد ہو گئے کہ یا تو وہ سکھ بن جائے یا پھر موت کے گھاٹ اترنے کے لئے تیار ہونے میں اسے کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہیئے۔

ہیت رام نے کئی بار ان متعصب لوگوں کے پاؤں چھو کر میاں بقراط کو اپنے حال پر چھوڑنے کی تلقین کی لیکن وہ نہ مانے۔
آخر میاں بقراط کے لئے آخری فیصلہ کی گھڑی آن پہنچی۔
اب تو دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو وہ سکھ بنے یا پھر موت کے گھات اتر جائے۔

میاں لقراط نے دوسرا راستہ ہی بہتر سمجھا۔
بڑی مشکل درپیش تھی۔ لوز محل کے سرگم میں بس موت کا سر ملا کر ہی رہوں گا۔"

میاں لقراط نے سنجیدہ ہو کر کہا" بس ایک بات ہے۔ موت کے حضور بھی میرا ایمان نبا رہے۔ اللہ پاک میرا ساتھ دیں۔
اس پر ہیت رام نے گاؤں میں باہر سے آئے متعصب لوگوں کو بہت سمجھایا کہ بھگوان۔ داگھو رو۔ اور اللہ پاک تو ایک ہی ہیں۔ تو پھر یہ قتل عام کیوں
لیکن متعصب لوگوں کی نگاہ میں جیسے قتل عام ہی صحیح راستہ ہو۔

ہیت رام خوش تھا کہ کم از کم میاں لقراط کے گھر والے ریشماں سمیت بہاول پور جا پہنچے۔ وہ بہت پچھتا رہا تھا کہ میاں لقراط کو وہ کیوں
جانے کے لئے رضامند نہ کر سکا۔

" چنگاری جب بھڑکتی ہے تو آگ بن کر پھیلے بنا نہیں رہتی۔ میاں لقراط نے کہا ایک بات تو ہے جو مرنے سے پہلے ضروری ہے۔
" وہ کیا؟" متعصب حملہ آوروں میں سے ایک نے پوچھا۔
دیکھو بھائی میری عافیت تو گندی نہ ہو کم سے کم!" میاں لقراط نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا" یہ تو آپ لوگ بھی پسند کریں گے۔"
" ضرور۔"
" اچھا تو مجھے لوگوں کی امانتیں لوٹانے دو"
" مطلب؟"
" یعنی جس جس کا کپڑا یا سوت پڑا ہے گھر میں، وہ تو میں لوٹا دوں۔ ان کے مالکوں کو۔ اس میں تو آپ لوگوں کو کوئی نقصان نہیں"۔
متعصب لوگوں نے اجازت تو دے دی۔ لیکن وہ یہ نہ جانتے تھے کہ اس کام میں کئی گھنٹے تک لگ جائیں گے۔
میاں لقراط گھر گھر گئے اور لوگوں کا سوت یا کپڑا لوٹاتے ہوئے بار بار یہ بات دوہرائی کہ خدا آپ لوگوں کو لاکھ برس تک زندہ رکھے وہ
ذرمحل کے لئے اپنے منہ سے دعاؤں کی جھڑی لگاتے رہے۔ اور ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہتے رہے۔ اچھا وہاں درگاہ میں ملاقات ہوگی! خوش رہو نور
محل والو ہم تو چلے۔"

جب وہ سب کی امانتیں لوٹا چکے تو میاں لقراط نے ایک گھر سے ایک گنڈاسا مانگا اور اسے پتھر پر اپنے ہاتھ سے تیز کرتے ہوئے وہ کہتے رہے
چچا میاں گنڈاسے! اب تم ہی چلوگے نا ہماری گردن پہ۔ دیکھو بھئی ذرا آرام سے سب کام کرنا بڑے اطمینان سے ہماری سانس نکلنے دینا میاں!
یک بات تو ہے نا کہ ہم میاں لقراط ہیں۔ اور ہم کوئی میاں سقراط تو نہیں ہیں"
اس سے ہیت رام نے یہ بات سنی تو متعصب حملہ آوروں سے آنکھ بچاتے ہوئے پوچھا" اس کا کیا مطلب ہے چچا لقراط کہ تم میاں لقراط
ہو نہ کہ میاں سقراط۔"

" تم اتنا بھی نہیں سمجھے' ہیت رام؟ میاں لقراط نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔" ارے بیٹا جب میاں سقراط نے زہر پیا تو انہوں نے
اس سے پہلے لوگوں کا قرض چکانے کی بات نہیں سوچی تھی۔ اور میاں سقراط تو آخری دم تک اپنے چیلوں چانٹوں سے یہی کہتے ہوئے اس دنیا
سے رخصت ہوئے کہ ان کو فلاں آدمی کا ایک مرغ واپس کرنا ہے اور فلاں شخص کے چند پیسے دینے ہیں اور وہ تم ضرور دے ڈالنا۔
ر بیٹا ہیت رام یہاں تمہارے میاں لقراط نے تو جس کا جو بھی دینا تھا سب اپنے ہاتھوں سے ہی دے ڈالا اور اب عافیت خراب ہونے کا تو بالکل
ڈر نہیں رہا۔"

ایک حملہ آور نے کہا" اچھا تو میاں لقراط اب مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ بہت جی لئے۔ ہم تو چاہتے تھے کہ تم ہماری شرط مان لیتے اور ہمیں بھی اپنے

خون سے ہاتھ رنگنے سے بچا لیتے۔ لیکن جب تم ہماری بات مانتے ہی نہیں تو پھر ہم بھی اپنی جگہ مجبور ہیں"۔

دوسرے حملہ آور نے کہا "پہلے یہ بتاؤ میاں لقراط کہ اب تو تمہاری کوئی خواہش نہیں رہ گئی۔

"ایک بات ہے"

"وہ کیا؟"

"چار پیسے کی ملائی کی برف منگا دو مرنے سے پہلے" وہ دونوں انٹی کھول کر پیسے دینے لگے۔

ہیت رام بولا میں برف کے پیسے بالکل نہیں لوں گا۔ دادا جاتے بار کی برف کھا لو مفت ہی"

"نہیں ایسا نہیں ہو سکتا" میاں لقراط نے جوش میں آکر کہا۔ "تمہارا مطلب ہے میری عاقبت گندی ہو جائے"

آخر ہیت رام نے برف تول کر پیسے لینے منظور کر لیا۔

برف کھا چکنے کے بعد لقراط نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر کہا۔ "موت نہ ہوئی لوز محل کی سرائے ہوئی۔ آؤ میرے اپنے ہاتھوں سے تیز کئے ہوئے گنڈاسے۔ اب چل کر دکھاؤ ہماری گردن پر۔ نہیں تو یہی کہا جائے گا کہ میاں لقراط کی عقل بھی گٹے میں ہے۔

اور اس نے مرنے کے لئے سر جھکا دیا۔

حفیظ ہوشیارپوری

خود اُن کی آنکھوں سے آنسو ہوئے رواں کیا کیا
ملے ہیں رازِ محبت کو پاسباں کیا کیا

نہ پوچھ مجھ سے کہ نازک مقام آتے ہیں
غمِ دل و غمِ دُنیا کے درمیاں کیا کیا

اسیر اپنے ہی غم میں ہے جس کو بھی دیکھا
کسے خبر کہ ہے گذری کہاں کہاں کیا کیا

کرو نہ ضبط پہ ناز اس قدر خُدا جانے
ابھی ہیں عشق میں درپیش امتحاں کیا کیا

کبھی تو اُن سے ملیں گے جُدا نہ ہونے کو
یہ بات سوچ کے ہوتے ہیں شادماں کیا کیا

ستم برنگِ کرم دیکھئے کہ وہ مجھ پر
ہوئے خلافِ توقع بھی مہرباں کیا کیا

وفا بھی کی تو جفا ہی اُسے کہا ہم نے
روایتاً بھی ہوئے اُن سے بدگماں کیا کیا

کچل کچل کے گراں بار رہ نشینوں کو
اُڑے ہیں گرد کی مانند کارواں کیا کیا

حفیظ عشرتِ اربابِ گلستاں کے لئے
لٹے ہیں جوشِ بہاراں میں گلستاں کیا کیا

ظہیر کاشمیری

وہ اُن کا مضمونِ وفا پر باتیں کرتے جانا بھی
اور پھر اک شرمیلے پن سے گردن کو نیہوڑانا بھی

بھول سکو تو بھول بھی جانا، ہجر سے یاری کریں گے
لیکن تم کو اپنا وعدہ یاد رہے تو آنا بھی

راتوں کی لمبی تنہائی اور تذبذب کا عالم،
کچھ اُن پر الزام تراشی، کچھ دل کو سمجھانا بھی

اک آشفتہ، اک آوارہ، یہ سب کچھ منظور مگر
او حیرت سے تکنے والے تو نے مجھے پہچانا بھی

امیدوں کی ہر محفل میں ہنسنا رونا ساتھ رہا
وقتِ شگفتنِ گُل جب آیا، ٹوٹ گیا پیمانا بھی

وصل کی ایک گریزاں شب میں، ہم نے سب کچھ دیکھ لیا
تنگ قباؤں کا کُھل جانا، زلفوں کا لہرانا بھی

کون ظہیر اب دیر و حرم کے انسانوں سے پیار کرے
سر نے اب تو دیکھ لیا ہے سنگِ در جانانہ بھی،

عزیز حامد مدنی

زفرق تابہ قدم، خوابِ آشنا کہیئے　　فسونِ خال وخطِ دوست اور کیا کہیئے

کبھی تو ذکرِ حریفانِ خوش نظر کیجئے　　کہیں تو قصۂ یارانِ بے ریا کہیئے

ہزار زاویہ ہائے نظر تھی۔ منزلِ دید　　سمجھ کے کچھ رُخِ جاناں کا ماجرا۔ کہیئے

کسی کے سلسلۂ غم کی لاگ رہ جائے　　حدیث سروِ لبِ جو۔ غمِ صبا کہیئے

اسی کی رہگذر پیچ پیچ آتی ہے　　کہیں سے قصۂ عمرِ گریز پا کہیئے

کچھ ایسے سوگ میں ڈوبا ہوا تھا پیکرِ دوست　　کہ اسکے بعد غمِ ہجر و وصل کیا کہیئے

کھلا یہ تجھ پہ کہ مجبورِ مدعا ہوں میں　　اس آگہی پہ مجھے جان سے ذرا کہیئے

نظر تھی سلسلۂ خواب صد ہزار اوراق　　کہاں کہاں سے گذرنا پڑا ہے کیا کہیئے

نوائے شوق کو زنجیرِ درگاہ لکھئے　　سخن کو طائرِ مجروح کی صدا کہیئے

یہ تیرے دَور کا اِک عہدِ خوشنوائی تھا
مگر سکوت ہے ایسا کہ مرحبا کہیئے!

محشر بدایونی

شوخیِ دستِ گلعذار پھر مجھے یاد آگئی
پھر مرے زخم زخم کو چھوتی ہوئی صبا گئی

بزمِ سرود و رقص میں اتنا سکوت آج کیوں
میری کوئی فغاں سنی، میری کوئی صدا گئی

کس کی رمق اُڑائیں ہم کیسے بٹائیں جی کا غم
اب تو خیال سے بھی وہ صورتِ آشنا گئی

سایہ طلب گئے جدھر بول اُٹھے وہیں شجر
آئے ہو اب مسافرو جب ہمیں دھوپ کھا گئی

ٹھوکریں کھا کے راہ راہ ہم کو بڑا شرف ملا
اپنے ہی پاؤں کی خاک اپنے ہی سر پہ آگئی

اور اُبھر گئی حیات اور زمیں ہوئی بلند
اِتنی کہ آسماں کی آگ اور قریب آگئی

راہوں میں کیسے کیسے پھول چن گئی بادِ نوبہار
آئی اِدھر تو خاک و خس میری طرف بڑھا گئی

دشنۂ خار خار پر ہاتھ لہو ہوئے مگر
میری جسارتِ ہنر اور فروغ پا گئی

محشر اب ایسی چپ بھی کیا کچھ تو کسی سے بات کر
تیری یہ خامشی تو یار اپنا بھی جی بجھا گئی

سامنے بیٹھے ہیں۔ چچا جان نے ایک لمحے توقف کیا پھر انھوں نے جھک کر قاب میں سے مٹھائی کی ڈلی اٹھائی گویا اب مجھے کھلانے والے ہیں۔

"یوں کر دو" انھوں نے فرمایا۔

مدتوں کا مرا ہمسایہ جدا ہوتا ہے

بھئی میں مضمون نہیں بدلا کرتا پہلے زبان دیکھتا ہوں۔ یوں یہ کا تنافر دور ہو جاتا ہے۔ شاگردوں نے واہ واہ کا ڈونگرا برسا دیا۔ انھوں نے ہاتھ بڑھا کر مٹھائی کی ڈلی مجھے عنایت فرمائی اور دعا کو ہاتھ اٹھائے۔ (پتہ نہیں سورہ فاتحہ پڑھی جاتی تھی یا کچھ اور مگر پڑھا جاتا تھا) مگر میں جیسے بپھر گیا۔

"ہمیں" میں نے ایک دم کہا۔ ان کے ملے ہوئے ہاتھ کھل گئے۔

"ہم تو نہیں بدلتے نہیں" اٹھلایا۔ "بے دیے کیا ہوتا ہے۔ اتنا اچھا تو مطلع کہا ہے ہم نے۔ کچھ اور طرح ٹھیک کیجئے۔ ہم زبان وبان نہیں مانتے چچا جان۔"

شاگرد سن ہو گئے۔ دو چار نے قہر بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔ نیم استاد لوگ سخت متنفر نظر آئے۔ یہ ہال سیہ ہارہ دی ہی کر سننے میں گھبرا لگا تھا کہ چچی جان کی ایک دار آواز گونجی

"آئے مرزا سراج الدین۔ یہ فرخ مرزا کی اولاد ہے۔ ہے نا امین الدین خانی۔" پھر وہ آہستہ سے ہم ہم کر کے ہنسیں۔ شاید وہ چلمن کے پاس آ کر میرا تماشا دیکھ رہی تھیں۔

چچا جان مسکرائے۔ انھوں نے عینک اتار کر رکھ دی اور نیم دراز ہو گئے۔

"بیگم یہ مٹھائی اٹھوا لو۔ گھر ہی میں بٹے گی۔ یہاں نہیں بٹے گی۔ جمیل میاں ہمارے شاگرد نہیں ہوں گے۔ انہیں زبان سے کوئی علاقہ نہیں ہمیں کچھ اور نہیں آتا۔"

شاگردوں نے میری طرف سے منھ پھیر لیا دو چار کو مجھ پر رحم بھی آیا وہ بدمزگی کے منتظر تھے مگر چچا جان خوش خوش باتیں کرنے لگے۔

"اچھا تو اب صاحبزادہ صاحب پوری غزل تو سنا دیجئے" وہ نرمی سے بولے۔

"نہیں ہم تو پہلے شاگرد ہوں گے۔" میں اترایا۔ میں روہانسا ہو رہا تھا۔ میری عمر اس وقت کتنی ہوگی۔ کوئی تیرہ برس۔

"اچھا پھر شاگرد ہو جانا۔" انھوں نے تسلی دی۔ "آج تو قصہ ختم ہوئے سخن۔ تمہاری مٹھائی بٹ گئی اب ہم محفل جمائیں گے۔ پھر سوچیں گے تم آیا جایا کرو باقاعدہ۔ اچھا تو سناؤ کیا مطلع تھا۔"

"اچھا تو ہم استاد بیخود کے پاس جا رہے ہیں" میں نے دھمکی دی۔ مجھے معلوم تھا کہ استاد بیخود سے چچا جان کی چشمک ہے مگر پھر میں استاد بیخود کا مزاج یاد کر کے ڈر گیا۔ "اچھا ہم پنڈت جی کے ہاں جائیں گے۔ آپ ابھی رقعہ لکھیئے ہم ان سے فارسی بھی پڑھیں گے۔"

وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ عینک صاف کر کے آنکھ پر لگائی قلم اٹھایا اور رقعہ لکھ دیا۔

"برادر بجان برابر۔ یہ لڑکا بھائی سراج الدین خاں مرحوم کا ہے۔ ماں اس کی بزرگ زادی سیدانی خواجہ میر درد رحمۃ اللہ علیہ کی ذریات سے ہے۔ شاگردی اس کو مطلوب ہے۔ امید ہے کہ بڑا ہو کر شعرا چھے نکالے گا کہ پوتا علائی کا اور نواسا درد کا ہے۔ چونکہ طبیعت کا تندی اور شوخی ہے اور ماں کی مرضی ہے آپ اسے سنبھالیے اور اپنا لخت جگر جان کر اس کی پرورش کیجئے۔ کل سہ پہر حسب دستور آستانے پر حاضری دینے آؤں گا۔ تو آپ کے سامنے اس کے کان کھینچوں گا کہ آپ کو تکلیف دی اور خدمات مناسب طور سے بجا لائے۔ آثم

ابوالمعظم سائل

پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی ایک صوفی منش استاد تھے کچھ افسر وغیرہ رہے تھے اب پنشن پر تھے فارسی کے بڑے جید عالم اور ہزاروں شاگرد

استاد تھے۔ لمبی سفید داڑھی تھی جس کو آگے سے چوٹی کی طرح گوندھ لیتے تھے۔ یہ اپنے گھر کے سامنے والے دھرم شالہ میں سالانہ طرحی مشاعرہ کرتے تھے جو دو تین دن چلتا تھا۔ اور اس میں جملہ اساتذۂ فن اطراف ہندوستان سے شریک ہونے آتے تھے۔ ہمارے حیدر دہلوی مرحوم بھی ان ہی کے شاگرد تھے۔ اور گو بادی ہو کر استاد ہو گئے تھے مگر پنڈت جی کے سامنے غزل پڑھتے وقت احتراماً گردن جھکا لیا کرتے تھے۔

پتہ نہیں چچا جان سے ان کی دوستی کب شروع ہوئی تھی۔ میں نے تو صرف دونوں کی موت پر اسے ختم ہوتے دیکھا ہے۔ چچا جان دفتر سے ہر رکشا میں کرسی پر لاد کر بٹھائے جاتے اور ہوا خوری شروع ہوتی۔ سب سے پہلے وہ بازار سیتا رام سے گزرتے ہوئے ایک تنگ گلی کے ایک شاندار مکان کے سامنے ٹھہر جاتے رکشا والا آواز لگاتا۔

"نواب صاحب آگئے ہیں۔"

اور پیچھے پر پنڈت امرناتھ ساحر اپنی داڑھی میں کنگھی کرتے ہوئے نمودار ہوتے۔ کئی برس تک وہ نیچے چبوترے تک اتر کر آتے رہے مگر بعد میں جب وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تو صرف چھجے تک کھسک کر آتے اور بڑی نقاہت سے سلام کا جواب دیتے۔ آخر میں یہ بھی ہوتا تھا کہ دونوں بڈھے مجبوراً ایک دوسرے کو چپ چاپ دیکھ رہے ہیں نہ سر سے کھیلتے ہیں نہ منہ سے بولتے ہیں بس ٹک ٹک دیکھے جاتے ہیں اور آنکھیں رومال سے پاک کرتے جاتے ہیں۔

میں نے خط لے کر آداب کیا اور بھنایا ہوا ملک نسیم الظفر کے ہاں پہنچا۔

یہ ملک نسیم الظفر وہ ہیں جو ابھی مغربی پاکستان رائٹرز گلڈ کی صوبائی عاملہ کا الیکشن میرے کہنے پر لڑے اور میری ہی وجہ سے ہار گئے۔ یہ حضرت اس وقت بھی ایسے ہی کیسے کسمسائے بنے چپنے رہتے تھے۔ اس وقت یہ اینگلو عربک ہائی اسکول دریا گنج کی فٹ بال ٹیم کے ایک مشہور کھلاڑی تھے مجھ سے عمر میں ایک برس چھوٹے یا ایک برس بڑے ہیں مگر ہمیشہ سے بڑے وضع دار اور رکھ رکھاؤ کے بزرگ ہیں۔ یہ میرے ادبی ایڈوائزر تھے۔

"بھئی تم شاگرد کیوں ہو کسی کے۔ غالب کس کا شاگرد تھا۔ بڑے آدمی کسی کے شاگرد نہیں ہوتے۔" انھوں نے فیصلہ سنا دیا۔

میں پنڈت جی کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا۔

۱۹۴۵ء میں میری شادی ہو چکی تھی میں کالج چھوڑ چکا تھا۔ اس وقت تک میں نے بہت سے شعر کہے اور پڑھے تھے۔ میرے اردو مطالعہ میں فیض۔ میرا جی۔ اور راشد رہتے تھے۔ اور دوستوں میں اختر الایمان مختار صدیقی اور خورشید الاسلام جیسے بانکے لوگ شامل تھے (گو وہ سب سینیئر تھے) میں نے اچھے اچھے مشاعروں میں شرکت کی تھی اور بڑے بڑوں سے ٹکریں لے چکا تھا سائل صاحب کا آخری زمانہ تھا میں ان کی بینائی سلب ہو جانے کے بعد دو تین برس ان کا کاتب بھی رہ چکا تھا (وہ شعر کہتے تھے اور میں لکھتا تھا) اور ہفتے میں دو تین بار حاضری کا معمول جاری تھا۔ ایک دن میری بیوی چچا جان کے رومال تہہ کر رہی تھیں میں ان کے ماہانہ وظیفہ کے متعلق حکومت کو ایک احتجاجی یادداشت لکھ رہا تھا اور بھق بھق سگریٹ بھی پی رہا تھا۔ چچی جان حسب دستور ان کی بدپرہیزی پر خفا ہو رہی تھیں۔ میری بیوی سخت سعادت مندی کے موڈ میں تھیں۔

"دادا جان آپ انھیں شاگرد کر لیجئے نا۔ اب تو ان کی امیدواری کو اتنے دن ہوئے۔" وہ بولیں۔ وہ ان کی پوتی ہوتی تھیں۔ برادری میں رشتے ایسے ہی ہوتے ہیں۔

"اے لڑکی تجھ پہ۔" چچی جان دھاڑیں۔ "ہمارا بچہ اچھا خاصا چل نکلا ہے اب عمر ہوئے تو مقابلہ کا امتحان دلوا یہ شاگردی استادی کے چکر میں نہ ڈال دیجو اسے ہر آدمی تو نواب مرزا خان نہیں ہوتا نا۔" وہ داغ کی بیٹی ہیں۔

"ہوں۔" چچا جان بیٹھے بیٹھے مسکرائے۔ ان کا چہرہ دودھ کی طرح ہو گیا تھا۔ اور ہڈیاں رخساروں کو چیر کر ابھر آئی تھیں۔ "اب سفارش پر اتر آئے ہیں مرزا صاحب۔ نا بیٹی ہم ان کے قابل نہیں ہیں۔"

میرا جی چاہا کہ رو دوں۔ میں نے عمر میں پہلی بار سنجیدگی سے سوچا کہ کاش میں ان کا شاگرد ہو جاتا۔ جانے کیوں مجھ میں نے اس احساس میں بہت محسوس کی۔

"چچا جان سیریس لی آپ مجھے شاگرد کر لیجئے یعنی اب میں سچ مچ کہتا ہوں" میں گڑگڑا رہا تھا۔

"نا بیٹا ہمیں زبان سے لگاؤ ہے اور تمہیں۔ تمہیں شاید کسی چیز سے بھی لگاؤ نہیں ہے۔"

انھوں نے منہ پہ مکھیوں سے بچنے کے لئے ململ کا ٹکڑا ڈال لیا اور آہ بھر کر غافل سے ہو گئے۔

وہ اسی مہینہ انتقال کر گئے۔

وہ ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے تھے ان کا نام مرزا غالب نے رکھا تھا۔ مرزا سراج الدین۔ ان کے والد تھے مرزا شہاب الدین ثاقب۔ جو نواب نیر درخشاں کے صاحبزادے تھے۔ ثاقب جوان عمر رخصت ہوئے اور سائل صاحب نے دادا کی آغوش میں پرورش پائی۔ مجھے ان کی جوانی کے حالات کا زیادہ علم نہیں ہے بس کچھ سنا ہے کہ وہ بہت اچھے تیر انداز اور شہسوار تھے۔ اس وقت آسودہ حال لوگ اور بہت سے بھی کیا۔ خراب ہوئے رنڈی بازی کی۔ جوا کھیلا۔ تکلیفیں اور ڈگریاں کرا کے بیٹھ گئے۔ اچھی صحبت پائی تو عالم ہو گئے یا شاطر۔ شہسوار اور شاعر۔ چچا جان گنجفہ اچھا کھیلتے تھے۔ مگر ایسا نہیں کہ لوگ کان پکڑیں۔ شطرنج ان کی بہت اعلیٰ تھی۔ میرے زمانہ میں بھی جگر صاحب گھنٹوں ساتھ بیٹھتے تب کہیں مہرے ادھر سے ادھر کرتے تھے۔ اور جگر صاحب کو سب جانتے ہیں کہ وہ اچھے کھیلنے والے ہیں۔ کئی سال کلکتہ جا کر بلیرڈ کے مقابلوں میں شریک ہوتے رہے۔ اور انڈیا چیمپین بھی ہوئے۔ شاعر نہ جانے وہ کیسے تھے۔ میں نے مشاعروں میں بھی کلام پڑھا بلکہ بہت کچھ تو خود اپنے ہاتھ ہی سے لکھا کیوں کہ وہ عام طور پر مجھ ہی سے اور اپنے ایک چہیتے شاگرد انوار دہلوی سے ہی لکھوایا کرتے تھے دونوں کے اوقات مقرر تھے۔ لیکن میں نے کبھی ان کے شعر کی طرف توجہ نہ دی۔ کہنے کو وہ دلی کے آخری استادوں میں سے تھے۔ (یہ استاد آغا شاعر قزلباش۔ سید وحید الدین بیخود۔ پنڈت امرناتھ ساحر اور پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی تھے) اور ان کی زبان سے پورے ہندوستان کے "زبان نویس" سند لیتے تھے۔ وہ جانشین داغ بھی کہلاتے تھے۔ کیوں کہ وہ داغ کے چہیتے شاگرد ہونے کے علاوہ ان کے داماد بھی تھے۔ (یوں جانشین داغ بہت سے اور لوگ بھی کہلاتے تھے) مدتوں وقت کی دلی اور لکھنؤ اور حیدرآباد میں سائل دہلوی ایک خوش گو قادر الکلام اور مستند شاعر کی حیثیت سے مشہور رہے لیکن میری نظر کبھی ان کی شاعری کی طرف نہ گئی میں بیٹھا گھنٹوں ان کی کرتوں اور ان کی بیلوں اور چوگوشی ٹوپیوں پر بیلوں کے ڈوروں سے زنجیرے کا کام دیکھا کرتا ان کے قلم کا گلدستہ بنا تا اور ان کی بیاضوں سے کاغذ کی جلدیں اور ان کے بے مثال خط میں لکھی ہوئی وصلیاں اور قرآن پاک پڑھا کرتا۔

ایک بار میں نے ان کے قرابادین میں ذہانت کا کوئی نسخہ پڑھا اس میں مشک کا ذکر آتا تھا۔ مشک ان کے پاس ہمیشہ رہتا تھا اور ان کی بیاضوں سے لیکر ان کے دالانوں اور آنگن تک میں مہکیں آتیں۔ آخر میں نے وہ نسخہ پڑھ کر تھوڑا سا مشک چرایا اور بے نسخہ بنائے صرف چائے میں ڈال کر پی گیا۔ جب طبیعت خراب ہوئی اور تفتیش کی گئی تو راز کھلا۔ چچا جان کو خبر ہوئی تو پورا نافہ لے کر رکشا پر آئے اور عنایت کر گئے۔ وہ مشک آج بھی میرے پاس ہے مگر اس میں پہلی سی مہک نہیں رہی۔ وہ مہک شاید مشک والے کی اپنی تھی۔ جو اس کے کمروں، دالانوں اور دالانوں کے آگے پڑے ہوئے موٹے روئی کے پردوں میں رچی ہوئی تھی۔ جن پر لوگوں کی چادریں چڑھی رہتی تھیں۔ وہ مہک شاید صدیوں کی مہک تھی۔ ان اقدار کی جنھوں نے سائل دہلوی کو جنم دیا تھا اب بھی کبھی میں کسی ملنے والے کو وہ نافہ اپنے ڈرائنگ روم میں لگی ہوئی شیشے کی الماری سے نکال کر دکھاتا ہوں۔ اس کمرے میں میرے والد کی تصویر بھی لگی ہوئی ہے۔

"یہ مشک نافہ ہے ہمارے ان مدتوں سے" میں اسے بن کہے اپیریس کرتا ہوں کہ بھئی ہم بڑے پرانے خاندانی لوگ ہیں۔ میں انکسار سے آنکھیں نیچی کر لیتا ہوں۔

"خوب خوب۔ کیا ہے یہ" پوچھنے والا پوچھتا ہے۔

"مشک نافہ"

"اچھا۔ یہ بو سی کیوں آتی ہے اس میں سے یار۔ مشک نافہ ایسا ہوتا ہے۔ کیوں فنٹی بازی کر رہے ہو یار۔" ہی ہی ہی ہی ہی ہی اختر الایمان بھی کرتا تھا
نک کہا گیا تھا تو اور وہ بھی سائل دہلوی کے پاس رکھا ہوا۔ "تو شاعر کیسے ہو سکتا ہے" وہ میرا مذاق اڑاتا۔ وہ سائل دہلوی کے خلاف نہیں تھا مگر وہ
بکا مصنف تھا۔

شاید اس نے سچ کہا تھا شاید یہ بھی سچ ہو کہ سائل دہلوی بڑے شاعر نہیں تھے مگر یہ سچ میرا موضوع نہیں ہے۔ میں شاعری کا ناقد نہیں ہوں
نے ان کو شاعر کی حیثیت سے پرکھا۔ اصل میں وہ اتنے خوبصورت اور اچھے انسان تھے۔ کہ ان کے بارہ میں کوئی گھٹیا یا چھوٹی بات سوچی بھی نہیں جا
وہ اچھا پڑھتے تھے اچھا سنتے تھے اور اچھا سوچتے تھے۔ میں نے تو ان کا بڑھاپا دیکھا تھا مگر آج تک اس قد و قامت اور ناک نقشے کا آدمی نظر
یا۔ گورا بھبوکا رنگ تھا۔ جو جوانی میں گلاب مائل ہوگا۔ بڑی بڑی غلافی آنکھیں چوڑی گھنی داڑھی۔ کمایا ہوا بدن انگرکھا تو پہنتے ہی تھے۔ مگر اپنی وضع
ن بھی ایجاد کی تھی۔ جس کے گریبان پر ایک چوڑی سی پٹی ناف تک آتی تھی۔ چوگوشیہ ٹوپی ان سے مرتے دم تک نہ چھوٹی۔ وہ ہندوستان بھر کے خوش لباسوں
ر کئے جاتے تھے۔

شاید ۱۹۱۵ء میں یہ ہوا کہ میرے والد اور وہ کسی دربار میں شامل ہوئے۔ وہ میرے والد کے چچا زاد بھائی اور ان کی پہلی بیگم کے چھوٹے بھائی بھی تھے عمر
برس چھوٹے مگر جگری دوست تھے۔ اس دربار میں دونوں ہی ایک رنگ اور ایک ہی کپڑے کا لباس پہن کر گئے۔ واپس میں میرے والد نے گویا ان سے
ہوگا۔

"بھئی سراج الدین خان۔ کپڑے قیمت سے ہی نہیں بنتے۔ سلائی بھی اچھی ہونی ضروری ہے۔"

"بھائی سرکار آپ والیٔ ریاست ہیں میرا آپ کا کیا مقابلہ"

"تو پھر مقابلہ نہ کرو اور کرو تو مقابلے کی طرح" یہ کہہ کر میرے والد نے اپنی چست پوشاک کو دیکھا ہوگا۔ مخملیں انگرکھا ہوگا۔ جس میں سے ان کا سینہ ان
اور کلائیاں پھٹے پڑتے ہوں گے۔ اور آستینوں کی سلوٹیں چک چک کر چمکتی ہوں گی اور چوگوشیہ ٹوپی پر جیغہ جھلملا رہا ہوگا۔

چچا جان آداب کر کے فٹن سے اتر گئے اور اپنے بہنوئی اور پیارے دوست سے کئی برس بعد ملے۔ جن میں انھوں نے ریکن کا آدمی بلا کر چار
ور محنت کر کے کپڑے قطع کرنا اور سینا سیکھ لیا تھا۔

ایک دن انھوں نے مجھے ۲۳ - ۱۹۲۴ء کا ایک خط دکھایا۔

"بھائی سراج الدین سلمہ۔
ہر گاہ کہ برسوں سے تمہارا انتظار شام و پگاہ کیا مگر تم نہ آئے کس واسطے کہ دو ماہ میں ہمارا لندن جانا مقرر ہے۔ اور فراک کوٹ اور ڈنر سوٹ
قطع کرنے ہیں۔ نہ معلوم تم وعدہ کر کے کیوں مکرتے ہو یہ کام تو ان کا ہے جن کے لئے تم نے اپنی بیاض سیاہ کی ہے۔ آثم

امیر الدین۔ فقط

اب مجھے یاد نہیں شاید معمولی کرتے پاجامے تو ملازمائیں سی دیتی ہوں مگر اتنا مجھے یاد ہے کہ آنکھیں ہوتے انھوں نے باہر کا لباس کسی اور
لع کرا کے نہیں پہنا۔ کیا مجال جو کسی کی قینچی ان کے کپڑوں کو لگ جائے۔ تراش ٹیڑھی ہو جائے یا سلائی موٹی ہو تو سائل دہلوی کو لوگ کیا کہیں گے
رمیں آنکھوں نے جواب دے دیا تھا تو تاگوں کو ٹیکوں پر سے انگلیوں پر لپیٹ لپیٹ کر بیچارے پیارے سمجھے جاتے رہتے۔ عزیزوں اور دوستوں
لگھروں کے لئے تحفے بھی اپنے ہاتھ کے بنے ہوئے بھیجتے۔ کسی کو کڑھا ہوا رومال کسی کو اپنے ہاتھ کے قطع کئے ہوئے قلم۔ آج شاید بہت سے لوگ

نہیں جانتے کہ اچھا قط لگانا کیا ہوتا تھا اور اچھے قلم کیسے ہوتے تھے۔ یہ شیفر جس سے میں لکھ رہا ہوں جس میں سے سیاہی آپ ہی آپ ہزاروں لفظ بے ڈوبائے لکھ جاتا ہے اس وقت جیسے میری ہنسی اڑا رہا ہے۔ کہ میں سائل دہلوی کے قط لگائے ہوئے قلموں کو یاد کروں اور لاکھوں میل پرے زن زن کرتے ہوئے لیونک اور مونک اور سپوتنک میری یادوں کی فٹین اور پالکیاں اور ڈولیاں روند لئے جاتے ہیں میرا قلم پھر بھی ہی کرنے لگتا ہے۔ اختر الایمان والی ہی ہی جس میں بیسویں صدی کی ٹوٹتی ہوئی زنجیروں کے چھناکے مزور تھے۔ مگر جو انیسویں کے نذورتہ غلافوں کی خوشبو نہیں سونگھ سکتا تھا اور یہ قلم جس پر قط نہیں ہے اور جو کونک سے بھرا ہوا ہے چلے جاتا ہے اور میرے سامنے ہوئے قلم ناچنے لگتے ہیں۔ سائل دہلوی کے قلم جو اپنے قلموں کے نیزے ہفتوں اور مہینوں کی چھان بین کے بعد منتخب کرتے تھے استاد جلیل مانک پوری دوست انہیں پتہ نہیں کہاں کہاں کے جنگلات سے نیزے بھیجتے۔ جنھیں ہفتوں خوشبودار پانی میں بھگویا جاتا اور پھر ان کے سروں پر کیکری کٹا ؤ دانت کی مہریں وصل کی جاتیں جنھیں عجیب عجیب مصالحوں سے پاش کیا جاتا۔ اب ایک دن مقرر ہوتا اور شاگردوں اور شوقینوں اور مصاحبوں میں مچ جاتی کہ آج نواب صاحب قلموں پر قط لگائیں گے شوقین خوشنویس ترشے ہوئے نیزے لے کر آتے کہ شاید فرصت مل جائے اور ہم بھی دو چار قط اب مقررہ دن کو لوگ حلقہ باندھے بیٹھے ہیں عطریات سے تو افع ہو رہی ہے اور چچا جان ہاتھی دانت سے مزین چاقو لئے چاندی کی تھوڑی اور صندل سی تپائی سامنے رکھے قط لگا رہے ہیں۔ سامنے موٹے موٹے سنابی رنگ کے بے لائن کے کاغذ رکھے ہیں اور کتھئی رنگ کی سیاہی سیپیوں میں بھی جس سے وہ لکھائی کی پڑتال کرتے جاتے ہیں۔ کوئی بڑا منھ چڑھا لاڈلا شاگرد ہوا تو منھ پھوڑ کر دیتیں قلم مانگ بیٹھا ورنہ سب چپ چاپ منتظر رہتے رہتے کہ آج کس پر عنایت ہوتی ہے۔ (میرے نے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۴۸ء تک ان کے پرانے سرمائے میں سے اٹھارہ قلم چرا کر نا اہلوں کو صرف دھونس جمانے کے لئے بانٹ دیئے)

قلموں پر قط لگانے میں وہ ایسی ہی احتیاط برتتے تھے جیسی زبان کے معاملے میں۔ زبان انھیں بہت عزیز تھی۔ "نقش فریادی" دلی پہنچی تو ایک تہلکہ مچ گیا۔ میں نے تمام رات بیٹھ کر وہ روشن اور شاندار کتاب پڑھی اور صبح ہی بھناتا ہوا چچا جان کی خدمت میں حاضر ہوا۔

"جناب دیکھئے یہ ہے نیا ادب یہ ہے نئی شاعری۔ آپ زبان لئے پھرتے ہیں" میں نے ایک دم وہ سب دہرا دیا جو مجھے اختر الایمان نے بتایا تھا۔ انھوں نے پوری کتاب پڑھوا کر سنی۔ اس دوران میں وہ کہیں کہیں داد بھی دیتے رہے۔ پھر خاموش ہو گئے۔

"یہ لڑکا اچھی زبان لکھ سکتا ہے۔ خوبصورت اور جدید زبان۔ مگر ابھی جدید زیادہ ہے" یہ انھوں نے فیض صاحب کے بارے میں فرمایا۔

"اور شاعر کیسے ہیں یہ۔ یہ بتایئے جناب تو" میں انھیں کریک کرنے پر تلا ہوا تھا۔

"بہت اچھا ہے۔ ہونہار ہے۔ جگر کی طرح اپنے انداز رکھتا ہے۔ جگر بھی ایسے ہی چلا تھا بڑا ہونہار لڑکا تھا" اپنے جگر صاحب کو ۱۹۴۱ء میں والے کی آواز میں کتنا اطمینان۔ کتنی گمبھیرتا تھی کتنا پیار تھا۔ جگر اور فیض ان کے لئے دونوں لڑکے تھے۔

مگر شاید لوگ اس کا برا مان جائیں گے۔

"چچا جان زبان کس کی درست ہے۔"

"بہتوں کی۔ کیفی ہیں۔ ثاقب ہیں۔ بیخود ہیں۔ نوح ہے" نوح ہے" کا مزا یہ تھا کہ نوح صاحب بہترے بہترے ہاتھ باندھے سامنے کھڑے ہیں اور چچا جان گھرک رہے ہیں "تم بیٹھتے کیوں نہیں ہو جی" بیٹھ جایا کرو۔ تلافی بعد میں ہو لے گی۔"

"میں حضور سے معافی نہیں بیٹھوں گا۔ تقصیر ہوئی ہے ندامت کیسے نہ ہو"

معلوم ہوا کہ نوح ناروی صاحب جو یہیں ٹھہرے ہوئے ہیں صبح چچا جان کو سلام کرنے سے پہلے کسی ملاقاتی سے ملنے بیٹھ گئے تھے۔ داغ کے آخری شاگردوں میں سے ہیں اور چچا جان کے بڑے چہیتے خواجہ تاش دوست اور محبوب

ہم قلم کراچی

"اچھا اور نثر کون درست لکھتا ہے یعنی سب سے زیادہ درست۔ سچی اُردو۔"

بہت کم۔ مثلاً شیخ عبدالقادر اور خواجہ حسن نظامی۔ مگر خواجہ صاحب سادہ بہت ہیں۔"

"شیخ عبدالقادر۔ وہ تو لاہور کے ہیں۔"

ہاں وہ پنجاب کے رہنے والے ہیں اور وہ بہترین اردو لکھتے ہیں۔ بیٹا پہلے پڑھو لکھو اور پھر لوگوں کے وطن تلاش کر و سمجھے۔ یہ میں کہہ رہا ہوں۔ میرا شعر یاد ہے تمہیں۔ میں کون ہوں۔

تاج ارشد جام غالب ماہ داغ

سائل اندر کاسہ دارد چراغ

غالب تو خیر غالب تھے اور داغ بھی داغ تھے۔ ارشد تھے مرزا ارشد گورگانی۔ دلی دربار کی آوازوں کا ارتعاش ہوں گے۔ میں نے انھیں نہیں دیکھا ان سے چچا جان کو خاندانی نسبت کے علاوہ شاگردانہ عقیدت بھی۔ ویسے وہ سلاطین زادہ تھے مگر برے زمانے بھی آسودگی سے گزار گئے تھے۔

"یاد ہے تمہیں میں کون ہوں"———!

اب مجھے دو شعر یاد آتے ہیں۔ کارڈن روڈ پر میرے گھر کے سامنے سے دھڑا دھڑ موٹر رکشائیں اور ٹیکسیاں اور بسیں گزر رہی ہیں ٹیلیفون کی گھنٹی بج رہی ہے۔ کوئی صاحب سامنے کا دروازہ نہایت بدتمیزی سے دھڑا دھڑ کر رہے ہیں۔ مگر سائل صاحب کی مترنم آواز آہستہ آہستہ پھیلتی جاتی ہے۔

سائل تجھ کو کہتے ہیں شاد میں اس سے ہوتا ہوں

دُنیا مجھ پر ہنستی ہے دُنیا پر میں روتا ہوں

منگتا ہوں یا ہوں بھکیا بول نہ ہوگا کیوں بالا

غالب میرے دادا تھے غالب کا میں پوتا ہوں

"اچھا بھئی یہ غالب اُن کے دادا کیسے تھے اور تھے تو کیا کمال تھا۔" کافی ہاؤس میں کوئی تمسخر بھری آواز اُبھرتی ہے۔ کافی ہاؤس سے مجھے بڑی محبت ہے۔ کافی ہاؤس میرے لئے بیسویں صدی کے نمائندے ہیں۔ نہ میں ان سے لڑ سکتا ہوں نہ ان سے بھاگ سکتا ہوں نہ انھیں منگتا اور بھکیا کی خوبصورتی دکھا سکتا ہوں۔

دادا تو ایسے تھے کہ ایک تو ان سے الٰہی بخش خان صاحب معروف کی بیٹی امراؤ بیگم بیاہی تھیں اور الٰہی بخش خان احمد بخش خان کے چھوٹے بھائی تھے۔ جو سائل صاحب کے دادا کے باپ تھے۔ (اور میرے پردادا کے باپ) اور یوں بھی تھے کہ نیر رخشاں غالب کے شاگرد تھے اور سائل رخشاں کے پوتے اور یوں بھی تھے کہ غالب کے جدا مجد کوئی بیگ ہوں گے جو ہمارے جدا مجد کسی خان کے بھائی ہوں گے۔ اور بقول تاثیر مرحوم اسی زمانے میں سبھی ماوراالنہر سے آئے تھے۔

یوں خاندانیت پر ناز سبھی پرانے لوگ کرتے تھے کیا دلی کیا لکھنؤ کیا لاہور یہ لوگ تھے بہت پور بڑی بوگس باتیں کرتے تھے۔ میں بری صحبت میں خراب ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی چچا جان تجھے سمجھاتے۔

"بیٹا لوگ داؤ لگاتے وقت گھوڑے کی نسل بھی دیکھتے ہیں۔ کتے خریدتے وقت بھی تمام سلسلے نکال کر پرکھتے ہیں ہم تو انساں ہیں۔ ہائے آل دردا ولاد علائی اور نسبے خیالات"

انہی کے اور بھائی بند حیوانوں سے بدتر بھی ثابت ہوتے تھے۔ مگر وہ خود خاندانیت کے سبب یا تربیت یا افتاد طبع کی وجہ سے ایک بہترین انسان ضرور تھے۔ سات برس میں میں نے ان سے کسی کی برائی نہیں سنی۔ وہ کبھی کسی کی برائی نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ

بیخود صاحب کی بھی۔

بیخود صاحب ایک الگ مضمون کے مستحق ہیں مگر سائل دہلوی کے سلسلے میں ان کا نام ضرور آئے گا۔

بیخود صاحب بھی "جانشین داغ" تھے۔ وہ سخت تیز مزاج اور تیز زبان تھے۔ کھرے سیّد۔ جلالی۔ قہری۔ بامحبت۔ وہ سائل صاحب کو بالکل خاطر میں نہ لاتے۔ دلی میں ان کے شاگرد کافی تھے۔ اور ہندو امراء خاص طور پہ انہی کی سرپرستی کرتے۔ مدتوں دونوں نے ایک مشاعرہ نہ پڑھا۔ جب کھلے تو جس مشاعرے میں سائل و بیخود پہنچ جائیں خلقِ خدا ٹوٹ پڑتی تھی۔

بیخود صاحب کھلے بندوں سائل صاحب کو برا کہتے مگر سائل صاحب کے بڑے صاحبزادے قطب الدین فصیح بیخود صاحب کے شاگرد تھے وہ چپ بیٹھے باپ کی بُرائی سنتے رہتے۔ باپ ہی نے تو ان کا شاگرد کرایا تھا۔ ایک بار دونوں کے فارغ الاصلاح شاگردوں کے شاگردوں میں جنگ ہوگئی جھگڑا سائلیوں کو داد ملنے اور بیخودیوں کو داد نہ ملنے پر بڑھا (داد یہ لوگ پہلے باندھ کر خود ہی دیتے تھے) اور خوب جوتم پیزار ہوئی۔ قاعدے کے مطابق دونوں استادوں نے اپنے اپنے پوت شاگردوں کی برأت کی کوشش کی اور نتیجتاً خود الگ ہوگئے۔ بیخود صاحب نے طعن و تشنیع سے گزر کر دشنام طرازی پر کمر باندھی مگر سائل صاحب معتکف ہوگئے۔

"چچا جان بیخود صاحب بڑے بوکس آدمی ہیں" ایک دن میں نے جل کر کہا۔

"بس خبردار جو تم نے ایک حرف اور بولا۔ تمہارا یہ درجہ نہیں جو بھائی کے لئے ایسی بات کہو" وہ بگڑ گئے۔

"پھر وہ بھی تو سوچیں نا۔ یہ کیا بات ہے صاحب" میں واقعی ان کی بات نہیں سمجھ سکا۔

"بھئی وہ جہاں استاد کے شاگرد ہیں۔ دلی والے ہیں۔ میرے دوست رہے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ سیدزادے ہیں۔ ہم تم مغل بچے ہم انہیں کیا کہہ سکتے ہیں"۔

مغل بچہ پھر بھی نہ سمجھا اور آج تک نہیں سمجھ سکا کہ سیدزادے کیا چیز ہوتے تھے۔

ایک بار ایک شہدے صاحب عید کا سلام کرنے آئے۔ دور سے ہی انھوں نے آداب عرض کیا اور دھاڑیں مار مار کر دعائیں دینا شروع کیں چچا جان پلنگڑی پہ بیٹھے تھے۔ ہاتھ پٹی پہ جما کر گویا کھڑے ہونے لگے اور آگے جھک کر تعظیم دی۔ میں حیران پریشان دیکھتا رہا۔ انھوں نے شہدے صاحب سے ایک آدھی بات کی اور اسے رخصت کر دیا۔

"ارے چچا جان آپ اسے تعظیم دیتے ہیں"

"ہاں"

"تو کیوں۔ یہ کیا آداب ہیں صاحب" میں بدتمیز تو تھا ہی۔

"تم سے کیا"

"اچھا تو اب میں بھی یہی کروں گا" ڈومنیاں آئیں تو ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاؤں گا۔ اور جھک جھک کر آداب کروں گا اور قوال آئیں گے تو۔

"ارے۔ ارے لڑکے کیا بیہودہ باتیں کرتا ہے۔ اچھا تو سن"

انھوں نے تو بڑا لمبا واقعہ بیان کیا۔ مگر ہوا یوں تھا کہ جب دلی میں بجلی نہیں تھی اور گھروں میں قندیلیں جھاڑ اور فانوس جلتے تھے۔ یعنی اب سے ساٹھ سال پہلے تو ایک شام یہ شہدا سلام کرنے آیا۔ مغعلچی نے دہلیز دکھائی اور وہ آگے بڑھا۔ چچا جان صحن میں دور بیٹھے تھے۔ گرمی کا زمانہ تھا شمعیں چھوٹی تھیں اور دور رکھ دی گئی تھیں۔ اسے آتا دیکھ کر قد سے گمان ہوا کہ حکیم اجمل خان آئے ہیں۔ فوراً تعظیم کو کھڑے ہوگئے۔ اب جو دیکھا تو

بدے خاں۔ مگر لمحہ بھر میں انھوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور اسے بٹھا کر خود بھی بیٹھ گئے۔ اس واقعہ پر چالیس برس گزر گئے تھے۔ مگر جب بھی آیا انھوں نے
ظیم دی۔

بھئی وہ یہ سوچتا۔ نہ معلوم کیا سوچتا۔ خیال تو آتا ہی کہ نواب صاحب ایک بار تعظیم دے گئے اور اب اپنی وضع کو بھول گئے ہیں۔ انھوں نے آخر
بں کہا۔

یہ کیا چکر تھا۔ یہ کیا وضع داری تھی۔ اس وضع داری میں کیا عوامل برسرکار تھے۔ وہ چالیس برس ایک نیچ قوم کو اسے نیچ سمجھتے ہوئے بھی کیوں تعظیم
یتے رہے۔

شاید اس لیے کہ میں ۱۹۴۵ء میں یہ بات دیکھ کر کم از کم ۱۹۶۰ء تک یاد رکھوں گا یا اس لیے کہ ——— واللہ اعلم

شہدے تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے نا۔ اب بھی خال خال پرانے شہروں میں نظر آتے ہیں۔ یہ نہ ڈوم ہوتے ہیں نہ میراثی نہ قوال۔ گاتے بجاتے نہیں
لکھنؤ میں نے نہیں دیکھا لاہور میں شاید یہی طبقہ کسی اور نام سے جانا جاتا ہوگا۔ دلی میں یہ لوگ پیشہ ور تہنیت دینے والے ہوتے تھے انہیں
ام خاندانوں کے شجرے سات سات پشت تک یاد ہوتے تھے۔ جہاں نکاح کے بول ختم ہوئے اور ایک دم مجلس کے کسی کونے سے دھاڑیں مارنے کی آواز
تی تھی۔

اللہ کی امان۔ رسول کا صدقہ۔ اسلم بن مسلم بن اکمل بن اجمل بن ———

یہ اللہ رکھے پٹودی والے ہیں۔ وہ جانے والے ہیں۔ سید ہیں۔ ان کا باپ فلاں ان کا دادا فلاں۔ اللہ کی امان ——"

شہدے نقلیں بھی کرتے تھے۔ چچا جان کبھی کبھی نقال شہدوں کو بلاتے۔ مرے گرے نانت لوٹے۔ نقال۔ میرے وقت میں نقال رہے نہیں تھے
انہی میں سے ایک آدمی تھا جسے انھوں نے اپنے ایک سہو کی بنا پر چالیس سال تک تعظیم دی۔ اس دلی میں جہاں کفو غیر کفو کے چکر میں کنواریوں کے سر سفید
ون تک پک جاتے تھے۔

وہ اپنے سہو کی قیمت خود مقرر کرتے اور ایمانداری سے ادا کرتے۔

جنگ کے زمانے میں دلی میں ایک مائیکروفون اسٹیشن بن گیا تھا۔ جہاں سے سیرگاہوں میں نصب لاؤڈ اسپیکر تک طرح طرح کے پروگرام پہنچائے جاتے۔ ان میں مشاعرے بھی ہوتے۔ یہ اسٹیشن ہارڈنگ لائبریری میں بنایا گیا تھا۔ جو کمپنی باغ میں واقع تھی۔ چچا جان معمولاً ہوا خوری کو ادھر جاتے تو کبھی کبھار اسٹیشن بھی پہنچ جاتے۔ ان کے لئے مائیکروفون باہر لایا جاتا اور مہتمم صاحب بڑے فخر و اہتمام سے دو چار شعر اہالیانِ دلی کو سنوا دیتے۔ ایک مرتبہ جو ادھر پہنچے تو میری عمر کے ایک صاحب لمبے لمبے بال جمائے پان چباتے ہوئے کچھ مترنم چال میں برآمد ہوئے۔

"آپ ہیں نواب سراج الدین سائل" مہتمم صاحب نے تعارف کرایا۔

ان صاحب نے بے نیازی سے ہاتھ بڑھا دیا۔ ہم لوگ بزرگوں سے اول تو ہاتھ ہی نہیں ملاتے تھے اور ملاتے بھی تو دونوں ہاتھوں سے۔

چچا جان نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ملایا۔ رکشا قاعدے سے گھڑی کرائی اور ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ ایک ڈگس سے شاعر نکلے۔ کسی ضلع کے تھے۔

چچا جان نے نمونہ کلام کی فرمائش کی۔

"بھئی میں کیا سناؤں۔ نواب صاحب تم ہی سناؤ۔ میں صرف بڑے بڑے مشاعروں میں جاتا ہوں آج یہ بختیاری صاحب کھینچ لائے" یہ کہہ کر نہایت بھونڈی آواز میں ہنسے اور ہم سب لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھا۔

وہ بیکار تھے۔ چچا جان نے ایک روپیہ روز ان کا وظیفہ مقرر کیا تھا۔ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۸ء تک ان کا مقرر کردہ ایک دکان داران کو ایک

روپیہ روز دیتا رہا اور وہ سائل صاحب سے جب ملتے بھئی نواب صاحب تم کیسے ہو کہہ کر مخاطب کرتے ۔

میں ان کا نام نہیں بتا سکتا۔ کیونکہ وہ بھارت میں رہتے ہیں یہاں ہوتے اور انھیں صفائی کا موقع ہوتا تو میں نام لیتے ذرا نہ جھجکتا۔ ویسے وہ آج بھی بوگس آدمی ہیں۔ بے چارے شہرت بھی نہ پا سکے۔ شاعر تو خیر کیا تھے ۔

"بھائی نظام الدین مر گئے" ۔

"اناللہ۔ کیا تار آیا ہے" ۔

"جی ہاں۔ فوجی حکام نے ایران سے بھیجا ہے" ۔

یہ غالباً ۱۹۴۲ء کا واقعہ ہے۔ نظام الدین ان کے چھوٹے بیٹے تھے۔ اور فوج میں افسر تھے شاید لیفٹیننٹ تھے۔ وہ ایران پہنچے اور نمونیہ میں مبتلا ہو کر انتقال کر گئے ۔

"اناللہ۔ بیگم کو خبر ہوئی" ۔

"جی ہاں"

"رکشا منگاؤ" ۔ جیسے وہ اپنے معمولات پورے کرنے چلے گئے ۔

پہلے انھوں نے ساحر صاحب کو خبر دی۔ پھر اردو بازار میں اپنے شاگرد کی دوکان پہ آتے رک کر چائے پی اور پھر کمپنی باغ کی طرف چلے گئے ۔

اس روز کوئی اور ان کے ساتھ نہ جا سکا۔

اس دن وہ چپ چپ رہے۔ میرا خیال ہے کہ اس واقعے کے بعد وہ روز روتے تھے۔ اور ہم لوگوں کے پہنچتے ہی آنسو خشک کرنے بیٹھ جاتے تھے ۔

ان کے مزاج داں بھائی نظام کا تذکرہ نہیں کرتے تھے مگر میں تقریباً ہر روز اپنے شعور پہ ان کا غم غلط کرنے کے لئے مرحوم کا ذکر کرتا۔

"چچا جان آپ کو ان سے بہت محبت تھی نا" ۔

"ہاں بیٹا" معظم کے بعد قلب کمزور ہو گیا تھا۔ وہ منھ پھیر لیتے تھے اور شاگرد مجھے گھورنے لگتے ۔

معظم الدین بہت پہلے ہی مر چکے تھے ۔

پھر ایک دن ۔

"ہائے قدسیہ ہائے جوان مرگ ہو گئی" ۔

گھر میں سے ماتم کی آوازیں آ رہی تھیں۔ قدسیہ بیگم ان کی اکلوتی صاحبزادی تھیں۔ لاہور میں بیاہی تھیں۔ دق علاج کے لئے آئیں اور انتقال کر گئیں۔ ایک بچہ چھوڑا۔ وہ گھبرایا گھبرایا سب کو دیکھتا تھا ۔

چچا جان نے اس کے بعد بھی دامن صبر نہ چھوڑا۔ مگر وہ اندر ہی اندر گھلنے لگے۔ وہ آہیں بھرتے اور مسکراتے ۔

"چچا جان کیا آپ کو یہ زندگی کا سب سے تلخ تجربہ ہے" میں ان کی تحلیل نفسی کرتا۔ میں نے فرائڈ جھوٹوں پڑھ لیا تھا۔ اور ان کے علاج پر تلا ہوا تھا ۔

"تلخ نہ کہو۔ تجربہ نہ کہو۔ اللہ کی مرضی ہے" وہ مسکیاں روک لیتے۔ پچھتر برس کا بوڑھا اپنے پیاروں کی موت سے بڑی ملنساری کے ساتھ پیش آتا تھا ۔

یوم داغ منایا گیا۔ داغ کے سارے شاگرد ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے پہنچے۔ مصرع طرح بھی داغ کا رکھا گیا۔

کہ آتی ہے اردو زبان آتے آتے

لوگ سائل صاحب کو لے جانے پر مصر تھے۔ یہ ۱۹۴۴ء یا ۱۹۴۵ء کی بات ہے ان کا بالکل آخری زمانہ تھا۔

ارے بھائی مجھے کیا لے جاؤ گے۔ انھوں نے مصر مدعوئین کو ٹالا۔ بیخود کو لے جاؤ بس استاد کا نام تازہ ہو جائے گا۔

میں خدائی فوجدار بن کر بیچ میں کود پڑا۔

"تو چچا جان بیخود صاحب ہی کیوں۔ ان کے سب سے بڑے شاگرد کو صدر بنوائیے۔"

"وہ مر چکا ہے۔"

"کون صاحب تھے وہ۔ آغا شاعر یا........" ہم سب نے پوچھا۔ ہم نے سوچا کوئی اپنے سے دس برس بڑا خواجہ تاش بتائیں گے۔

"وہ تھا شیخ محمد اقبال"۔ وہ ہمارے استاد کا سب سے بڑا شاگرد تھا۔ بعد کا تھا مگر تھا سب سے بڑا۔

تو صاحب یہ علامہ اقبال کو ابھی تک داغ کے شاگردوں میں شمار کر رہے ہیں۔ ارے صاحب مر گئے دونوں۔ کاہے کی شاگردی کس کی شاگردی اس زمانہ میں داغ کا شاگرد ہونا فیشن اور اعزاز بھی تھا مگر علامہ اقبال تو جاوید نامہ اور بال جبریل کے مصنف تھے۔ میں جل بھن کر رہ گیا۔

"علامہ اقبال کو داغ کی شاگردی سے کیا فائدہ پہنچا وہ تو اور اسکول کے آدمی تھے۔"

"بھئی یہ بات تم انھیں سے پوچھتے تو بہتر تھا۔ میں کیا جانوں کس کو کس سے کیا فائدہ پہنچا۔ تمہارے علامہ صاحب تو جانتے ہوں گے"

"اچھا تو داغ ان کی غزلوں پر اصلاح بھی دیتے تھے" میں نے بات بڑھائی۔

"چند غزلیں تو میرے سامنے بنائیں بلکہ اس وقت میں کاتب تھا پھر لکھ دیا کہ بس جو کہہ بھیج دیا کرو تم اور شئے ہو ہم صرف تم پر فخر کیا کریں گے۔"

"تو علامہ کا کیا رویہ ہوا پھر۔"

"کیا رویہ ہوتا۔ وہی جو شاگردوں کا ہوتا ہے۔ وہ تم جیسا عالی دماغ تھوڑا ہی تھا ادیب تھا اور فاضل تھا اور بزرگوں کو بزرگ جانتا تھا۔ وہ جو کچھ کہے گیا۔ بھیجے گیا۔ استاد خوش ہو ہو کر سب کو دکھاتے تھے۔"

"آپ لوگ تو جلتے ہوں گے۔" میں نے داؤں مارا۔

انھوں نے جواب نہیں دیا۔

"تو آپ لوگوں نے انھیں جانشین داغ کیوں نہ مانا۔ آپ سب لوگ اپنے آپ کو جانشین داغ جو لکھتے ہیں تو انھیں بھی لکھا کرتے۔" یہ اس وقت ہندوستان میں ایک الگ ریکٹ تھا اور میں اس میں سخت دلچسپی لیتا تھا۔

جانشین داغ تو کوئی بھی نہیں ہوا۔ کوئی سلطنت تھی جس کی جانشینی طے ہوتی سب اپنی اپنی نسبت پہ مفتخر ہوتے ہیں اور بس۔ اور تم نے داغ کا مرثیہ پڑھا ہے جو اقبال نے لکھا تھا۔

"ہاں"

"پہلا دیوان رکھا ہے ان کا۔ نکالنا ذرا یہ کونسا ایڈیشن ہے۔

وہ دیوان بانگ درا تھی۔

"اس میں وہ مرثیہ شامل ہے۔ ہے نا۔

"جی ہاں"

"بزرگوں کے بارے میں محتاط رہا کرو"

"جی اچھا"

اقبال ہمارے دوست تھے وہ بہت اچھے انسان اور بہت بڑے شاعر تھے۔ انھوں نے کئی عالم میں دوست گاہ بہم پہنچائی تھیں میاں ذوالفقار خاں کے ہاں ایسی ایسی صحبتیں رہتی تھیں کہ تم لوگ کیا یہ پوری صدی نہ دیکھ پائے گی سمجھے!

"جی"

"چچا جان آپ ان کے شعر اسیطرح سمجھتے ہیں جیسے ہم سمجھتے ہیں۔"

"یعنی"

"یعنی ہم لوگ تو ان کا فلسفۂ خودی پڑھتے ہیں انھیں مسلم نشاۃ ثانیہ کا مبلغ جانتے ہیں نا"

"ہم" یہ بیزاری کا اعلان ہوتا تھا۔

"تو آپ بھی ایسے ہی جانتے ہیں انھیں"

"ہم"

"کچھ فرمایئے نا"

"بھئی ہم تو انھیں شاعر جانتے ہیں۔ وہ ایک بے مثال شاعر ہے۔ بانکا اور صاحب فکر اور صاحب طرز شاعر۔ فلسفہ ہم نے بھی پڑھا ہے مگر فلسفیوں کا مقام اور ہے وہ تو شاعر تھا"

"اور یہ صوفی نے تو ڈری پہ ہیز کیا ہے۔"

"یہ زبان کی غلطی ہے"

"تو پھر"

"تو پھر کیا بس یہ ایک غلطی ہے۔ اس کی وجہ یہ کہ استاد کی صحبت میسر نہ ہوئی۔ خط و کتابت ہی رہی۔ چار دن ساتھ بیٹھتے تو عمر بھر چوک نہ ہوتی"

"اور عمر بھر شاعر بھی نہ ہوتے"

"استغفر اللہ"

ایک دن وہ بھی آیا کہ میں میرا جی مرحوم کو لے کر ان کی خدمت میں پہنچ گیا میرا جی پہلے تو بھڑکے۔ پھر فوراً گھل مل گئے۔ اب ڈی۔ ایچ لارنس و میرا جی نواب سائل دہلوی سے صرف و نحو کی باتیں کر رہے ہیں۔ میرا جی اور نواب سائل خاصا عجیب مضمون ہے (مگر افسوس کہ میں دونوں میں سے کوئی نہ پڑھ سکا)

جب میرا جی سے وہ تھوڑے سے کھل گئے تو باتوں میں اور بھی مزا آنے لگا۔ وہ انھیں شاعر نا موزوں کہتے تھے۔ مگر وہ ان کی نظمیں سنتے تھے

"بھئی تم یہ گورکھ دھندے مت بنایا کرو میرا جی"

"جی بہتر مگر یہ تو قافیہ ردیف ہیں نواب صاحب۔ میں تو قافیے اور ردیفیں بناتا ہوں۔"

"استغفر اللہ"

ان سے میرا جی زیادہ نہیں ملے مگر جب ملے خوب ملے۔

جب میں نے انھیں جانا وہ پچھتر برس کے تھے۔ دو چار برس بعد میں نے سوچا کہ بڑے میاں جہاندیدہ آدمی ہیں کیا کیا زمانے دیکھے ہیں ان سے ان کی خود نوشت سوانح عمری لکھواؤ چلو پرانے واقعات ہی لکھ دیں گے۔ زبان فرسٹ کلاس ہوگی پرانی شخصیتوں کا ذکر آئے گا۔ ادبی معرکوں کی باتیں ہوں گی۔ چنانچہ ان سے رجوع کیا گیا۔

'میں نے خود کیا کیا ہے۔ جو میں سوانح عمری لکھوں' انھوں نے فرمایا۔ عمر تو بے شک گزار دی ہے مگر سوانح کہاں سے لاؤں۔

یعنی کیا ان کی زندگی میں کوئی سانحہ نہیں گزرا تھا (یوں چلئے) اب وہ بزرگ کہاں ڈھونڈیئے جو ان کے ہم عمر بھی ہوں دوست بھی ہوں اور ہمیں بھی گھاس ڈالیں۔

دے دے کے وہی بیخود صاحب

بیخود صاحب گویا مارنے دوڑے

ابے اس بڈھے کھوسٹ کے کارنامے مجھ نوجوان بانکے چھبیلے سے پوچھنے آیا ہے میں کیا جانوں کل یہ کیا کرتا تھا۔ میں تو آج کا آدمی ہوں۔"

"سبحان اللہ۔ حضور کیا بات فرمائی ہے۔" ایک خوشامدی شاگرد بولا۔

'ہائیں' بات فرمائی ہے کیا چیز ہوتی ہے جی۔' وہ گرجے وہ مجھے بھول گئے۔

'تقصیر ہوئی حضور'

خیال رکھا کیجئے'

بہتر حضور"

مجھ سے رہا گیا میں نے پوچھا استاد صحیح بولا جاتا تو کیا بولا جاتا۔

جا کے اپنے چچا جان سے پوچھو' وہ پھر بھنا گئے "ہاں تو آپ ان کی زندگی کے حالات پوچھ رہے تھے"۔

سائل صاحب خوش رو تو کمال کے تھے۔ نوعمری میں ایک طوائف پر (حسب دستور) عاشق ہو گئے۔ وہ شطرنج بے مثال کھیلتی تھی اور انھیں پرند اور ہرن کا گوشت بھی پسند تھا۔ چنانچہ ہوئی صبح اور گھر سے نکلے دوپہر سے پہلے چند پرند اور ایک چکارا یا کالا ان کی خدمت میں پیش کر دیتے سہ پہر کو شطرنج کھیلتے اور شام کو شہسواری کے لئے جاتے۔ ایک روایت یہ ہے کہ ان سے اولاد بھی ہوئی۔

اس زمانے میں دلی کے شرفا رات کو مجرے سننے نہیں جاتے تھے۔ بلکہ گھر پر یا باغوں میں محفلیں جماتے۔ بہت ہی عاشق زار ہوئے تو دن میں ملاقات فرمالی۔

گنجفہ اور چوسر کھیلتے میں نے انھیں صرف ایک بار دیکھا وہ میرے سامنے حکیم حسین احمد عباسی سے بھی کھیلتے تھے۔ رمی داؤ لگا کر ہوتی۔ ۵۰ ہزار روپیہ فی پوائنٹ کھیلتے تھے۔ سیکڑوں پوائنٹ کی ہار جیت پر کروڑوں کے حسابات نکلتے اور اعداد و شمار اس غضب کے ہوتے کہ پسینے آجاتے۔ میں نے بہت کہا کہ لاکھوں میں یا صفر والے اعداد سے کھیلا کیجئے کہ شمار میں سہولت رہے مگر وہ نہ مانے۔ انہیں مشکل حساب اور پیچیدہ رقموں میں مزہ آتا تھا۔

"آدمی رئیس ہو تو رئیسوں کی طرح رہے" وہ سوچتے ہوں گے۔ رمی کی محفل روز جمتی۔ جس دن نہ جمتی حکیم صاحب کا ہرکارہ قرض واپس مانگنے آتا "جی سوا دو کروڑ روپے منگاتے ہیں کہا ہے باقی پھر بھجوا دیجئے گا۔" آج ذرا ضرورت پڑ گئی ہے" وہ مسکراتے اور کن انکھیوں سے ہم لوگوں کو دیکھتے "بھئی بیمار ہونے والے بڑے ظالم ہوتے ہیں افسوس طبیبوں میں لالچ آگیا ہے"۔

طبیبوں سے ان کی دوستی بڑی پرانی تھی۔ حکیم اجمل خاں سے انھیں خاص تعلق تھا۔ بار بار اصرار پر بھی ان کا تذکرہ نہیں کرتے تھے۔ بس آبدیدہ ہو جاتے تھے۔

"موت اس پر عاشق تھی، اس کی سفارش پر ہزاروں لاکھوں کو چھوڑ دیا مگر خود اسے لے گئی۔" ایک بار انھوں نے کہا شاید یہ حکیم اجمل خاں کی پوری داستان ہے۔

موت کا ذکر ان سے بار بار رہا۔ ان کا تصور بہت واضح تھا۔ اس میں پیری وغیرہ کا کچھ ایسا دخل نہیں تھا بلکہ ان کی صاف دماغی کسی کیفیت زدگی کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔

"بس میں مر جاؤں گا اور کیا۔ میرے باپ مر گئے دادا گئے والدہ مر گئیں دادی مر گئیں بیٹا گیا بیٹی گئی میں بھی جاؤں گا مجھے بھی جانا ہے۔

"دو نمبر بھی جانا ہے۔" یہ جواب تھا میرے پیچیدہ سوالات کا جو میں فلسفۂ مرگ پر کرتا۔ اور ایک دن وہ مر گئے۔ ان کا شاندار خوبصورت چہرہ زردی سے سفید ہو گیا۔ ان کی سفید پلکیں آنکھوں کے نیچے گویا ان کہیں چھپے ہوئے گالوں سے چپک گئیں اور ان کی چوڑی ہڈیاں سیدھی سیدھی لیٹ گئیں میں دیر تک انھیں دیکھتا رہا۔ تو یہ ہیں تیج بہادر۔ ایک شاندار آدمی۔ انھوں نے ریاستی وظیفوں کے لئے ایجنٹ اور گورنر جنرل تک محضر پہنچائے مگر کبھی کسی رئیس کے آگے سر نہ جھکایا۔ عشق کیا۔ شطرنج کھیلی شکار کھیلا بلیرڈ کے چمپین رہے دو لاکھ شعر کہے اور کسی کو پہچانا نہ کہا کسی نے سنئے بڑا نہ سنا اور وضع کے پابند رہے اور مر گئے۔ کیا یہ کوئی بڑے آدمی تھے۔ معلوم نہیں بڑے آدمی کیسے ہوتے ہیں اچھے آدمی اور بڑے آدمی میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔

جب انھیں دفن کیا جا رہا تھا۔ تو کنور مہندر سنگھ سحر پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے اور بیخود صاحب اپنے آپ کو گالیاں دے رہے تھے۔ ان کے حواس معطل ہو گئے تھے۔ وہ جنازہ پر نہیں آتے تھے مگر زبردستی لائے گئے۔

"مر گیا سالا ہمیشہ کا جھوٹا دغاباز تھا۔ مجھے چھوڑ گیا خود چل دیا۔ خود چل دیا۔ خود چل دیا۔" وہ کہے جاتے تھے۔

ایک نوجوان نے جو مغموم و منتظر پریشان نظر آتا تھا کنور مہندر سنگھ کے ہاتھ میں ایک رقعہ دیا۔

عزیز المناقب کنور صاحب

بعد دعا واضح ہو کہ حامل رقعہ ہذا میرے بھائی کا بچہ ہے۔ شریف زادہ اور صاحب علم ہے۔ اس سے مجھے بہر مفرط ہے۔ آپ اس کے لئے روزگار کی سبیل مہیا کریں گے تو سائل ممنون ہو گا۔

"جھوٹا" کسی نے کہا کنور صاحب سخت جذباتی ہو رہے تھے۔ انھوں نے کہا اگر یہ خط نواب صاحب نے لکھوایا تھا تو میں اپنی نوکری چھوڑ دوں گا۔ مگر اسے نوکری دلواؤں گا۔ سفارش کرنا ان کی عادت تو تھی ہی۔

میں نے کہا میں نے نہیں لکھا۔

"جھوٹا ہے جی" ایک اور فاضل شاگرد نے کہا۔

"سچا ہے۔ حرام زادہ یہ سچا ہے۔ یہ سراج الدین کا ہی خط ہے۔" بے خود صاحب بے اختیار گرجے

"وہ کیسے استاد" کنور نے آنسو پونچھے۔

"ہائے اب یہ بھی بتاؤں" (بیخود صاحب پھر چیخے) "ارے اب دلی میں کون رہ گیا ہے جو بہر مفرط کی ترکیب یوں روانی سے استعمال کر جائے" کانی ہاؤس والے پھر قہر بھری نظر سے دیکھتے ہیں۔ "دلی کا بچہ" ان کی آنکھیں کھنچتی ہیں۔

دلی کا بچہ سہم کر گردن جھکا لیتا ہے۔ ۱۹۶۰ء کے کراچی میں دلی کا ذکر بلکہ نام تک عجیب معلوم ہوتا ہے۔ (میں نے ۱۹۴۷ء سے اب تک دلی کا نہیں کیا۔ دلی میرے لئے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو مر گئی تھی جب میں نے کراچی کا رخ کیا تھا)

دی دی۔ سانے رہان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ کانی ہاؤس والے اور جیم خانے والے شاید میری بات نہیں سمجھیں گے۔ اس سے نہیں کہ میں نے کوئی بڑا تیر مار دیا ہے۔ بلکہ اس لئے کہ انھیں اپنے اندھیروں سے محبت ہو گئی ہے۔ اندھیرے اور انتشار اور ہنگامی جہاں اقدار کی روشنی نہیں ہے۔ انہیں دلی کوئی ایسی جگہ معلوم ہوتی ہے جہاں خلق خدا گروہ در گروہ محاوروں کی سڑتی ہوئی لاشیں اٹھائے گھوم رہی ہو۔ جن کے تعفن سے ان کے دماغ پھٹے جاتے ہوں۔ محاورے جو قدروں کے نمائندے ہیں تقدیریں جو جاگیردانہ نظام کی پیداوار ہوں یا ایک طویل تہذیبی عمل کی ان میں سکون تھا۔ ٹھہراؤ اور تسلسل لاہور میں چند نہایت سمجھ دار اور مشہور ادیب باتیں کر رہے تھے۔

"اویار تو بھی عبداللہ کے پیچھے کیوں پڑا ہوا ہے۔ تجھے بزرگ ہستیوں میں کیا مزا آتا ہے تو ہماری نسل کا ادمی ہے اپنی طرف آ"

شاید وہ سچ کہتے تھے۔ مجھے بزرگ پرستی میں مزا آتا ہے۔ میں ڈاکٹر سید عبداللہ کو صرف بزرگی کی بنا پر بے وقوف نہیں سمجھتا۔ مجھے ان کی آنکھیں گدلی گدلی نہیں لگتیں، وہ آنکھیں روشن اور صاف ہیں۔ شاید انھوں نے اسٹڈیز ان ڈائنگ کلچر نہیں پڑھی اور میں نے فرد اسٹڈیز بھی پڑھی ہے۔ مگر میری آنکھیں دھندلی اور تاریک ہیں ان بنتی اور مٹتی ہوئی قدروں کے پاٹوں میں ایک پوری نسل کس طرح پس گئی ہے۔ یہ نسل جو بہت خوش قسمت ہے اور بہت بدقسمت۔ یہ نسل جس نے ایک عظیم جنگ دیکھی اور قوموں کو آزاد ہوتے اور نئے سرے سے غلام ہوتے دیکھ رہی ہے۔ جو اشتراکیت اور سرمایہ داری کی ٹکریں کھا رہی ہے۔ جو ملکی اور نسلی اور جغرافیائی قومیتوں کی کش مکش سے دوچار ہے۔ جس کے سامنے مذہبوں کی کھیتیاں ایک ایک کر کے مرجھا رہی ہیں اور جس کے لئے سچ اور جھوٹ اور اچھائی اور برائی کے جامد اصول مننگ آف میننگ کی آنچ میں تپ تپ کر پگھلتے جاتے ہیں اور یہ نسل نہیں جانتی کہ ڈاکٹر عبداللہ سے یا مولوی عبدالحق یا مولانا مہر سے محبت کیوں کی جائے اور نہ یہ جانے گی کہ سائل دہلوی کے کردار نے انھیں کتنا سکون اور اطمینان بخش رکھا تھا اور انھوں نے زندگی اور موت سے کیسے پیارے آرام وہ سمجھوتے کر رکھے تھے۔ سائل دہلوی جو عمر بھر کسی سے نفرت نہ کر سکے اور جو میٹھا سوچتے تھے اور میٹھا بولتے تھے اور جن کا عطا کردہ مشک نافہ اب بھی میرے پاس رکھا ہے مگر جس سے میرے ملنے والوں کے خیال میں خوشبو کی بجائے بو آتی ہے۔

برہا
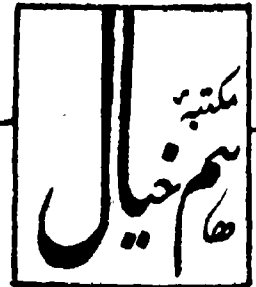
پھیکی لاگے دھوپ آنگن کی   دن سنسان، اُجاڑ
سانجھ سویرے سوچ سوچ کے   توہے روئیں کواڑ
جیون جیسے پہاڑ
تکتے تکتے باٹ تہاری   کاٹے اک اک پاکھ
جانے کب کا ساون آیا   اور بیتا بیساکھ
ہردے جیسے راکھ
گرد جمی ہے آئینے پر   روٹھا پڑا سنگھار
تجھ بن گھر کا کونا کونا   جیوں دُکھیا سنسار
مَسلا مَسلا ہار
کاجل جیسی رین اندھیاری   پات پات بَل کھائے
اپنے ہی سپنوں کی مالا   ناگن سی لہرائے
سونی سیج ڈرائے

نگار صہبائی

گیت

سکھی پدما کے پار کون بنسی بجائے
کوئی بھولا ہوا یاد آئے موہے
کوئی بھولا ہوا یاد آئے

جیون کی پدما کنول سے سجائے
بیتی جوانی کا پنگھٹ بلائے
کہدے یہ دھارے سے کھوئے سمے کے
دیکھے ہو کیسے سپنے پرائے

یادوں کے اندھیارے مندر میں میرے
پریم لگن کے بھجن کوئی گائے
دیپک اُجالوں تو ابھمان ہوگا
کیوں نین میں جوت اسون جگائے

دوجے کی اگنی میں کیسے جلے من
مجھکو بھری مانگ کا دھیان آئے
روکے کوئی جاکے بنسی کو روکے
مانو بیاہتا کا وشواس جائے

میتا عبداللہ کشمیری
مترجمہ: قرۃ العین حیدر

آسٹریلین کہانی

رات کی بات

اس زمانے میں دنیا کی ہر چیز اس قدر کی خوبصورت معلوم ہوتی تھی کہ جس کی حد نہیں۔ دراصل ہمارا فارم ہی ہمارے لئے ساری دنیا تھی۔ ہمیں اپنے فارم سے عشق تھا۔ رشیدی اور لالی اور میں اور بابا اور اماں۔ ہم سب ایک دوسرے کو چاہتے تھے اور زندگی مکمل تھی۔

خزاں کے موسم میں ہم ندی کے کنارے خشک پتوں کے الاؤ جلاتے اور اماں ہمیں کرشن کنہیا اور ان کی مرلی اور ان کے پہاڑ اٹھا دینے کے قصے سناتیں۔ جب آگ بجھنے لگتی ہم اس میں گیہوں کے دانے بھون کر کھایا کرتے۔ رشیدی اور لالی اور میں اور ابا اور اماں۔

جاڑوں میں برفانی ہوائیں چلتیں اور کہرہ گرتا۔ رات کو آتش دان کے پاس بیٹھے ہوتے ہمیں باہر جنگلی کتوں کے چلانے کی آوازیں سنائی دیتیں۔ بہار میں رس کا توجیون ہوتا۔ اور چنبیلی کی بیلیں پھولوں سے لد جاتیں۔

ایک مرتبہ پھولوں کے موسم میں جب مور ناچنے کا زمانہ آیا میں نے ایک نیا لفظ سیکھا — "راز" — اور اس وقت سے میں بڑی ہونا شروع ہو گئی۔ اس کے بعد سے ہر چیز مختلف معلوم ہونے لگی۔ میں اب چھوٹی بچی نہیں تھی۔ اور ہمارے یہاں منّی بہن پیدا ہو چکی تھی۔

میں نے نئی نئی گنتی سیکھی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میں سب کچھ گن سکتی ہوں۔ ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیاں سیڑھیاں کھڑکیاں پہاڑیاں لیکن اس موسم بہار میں پہاڑیاں گڑبڑ ہو گئیں۔

میرے حساب سے پہاڑیاں پانچ ہونا چاہئیں تھیں۔ میں نے ان کو کئی بار گنا۔ ایک۔ دو۔ تین۔ پانچ۔ لیکن ایک پہاڑی ہمیشہ زیادہ نکل آتی جو فالتو ایسی۔ میں اس پہاڑی سے واقف تھی مگر حساب پانچ سے زیادہ ہو جاتا تھا۔ اور اس کی مجھے بڑی پریشانی تھی۔ مجھے سری کرشن کا خیال آتا جنہوں نے گوالوں کی رکشا کے لئے پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹا دیئے تھے۔ جن کی وجہ سے مسافر اپنا راستہ بھول جاتے تھے۔ مجھے بڑا ڈر لگتا کیونکہ مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے ہماری پہاڑیاں بھی اپنی جگہ سے سرک گئی ہیں۔

میں اماں کے پاس بھاگی بھاگی گئی تاکہ انہیں بتاؤں کہ کرشن جی نے کیا حرکت کی ہے۔ اور ہمیں ان کو خوش کرنے کے لئے اب کیا کرنا چاہئے۔ لیکن اماں کو دیکھتے ہی اپنی ساری پریشانی بھول کر میں خوشی کے مارے اچھلنے لگی۔

اماں باغ میں ہاتھ جوڑے کھڑی تھیں اور ان کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ کشمیری گلاب کی جھاڑیوں کے سامنے انار کے درختوں کے نیچے انہوں نے دودھ کے پیالے بھر کر رکھ دیئے تھے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ میں سارے وقت کیوں انگلیوں کو گنتی رہتی تھی۔ گننا چاہتی تھی اور دنیا کی ساری چیزوں کو گن ڈالنے کی متمنی تھی۔

"بہار آ گئی" میں نے چلا کر اماں سے کہا۔ "بھیا اب آ رہا ہے۔ جلدی بتاؤ۔"

"آ جائے گا۔ بے صبری مت بنو۔"

میں خوب ہنسی اور خوب تالیاں بجائیں۔ میں اتنی بڑی ہوں۔ میں نے سر کے اوپر ہاتھ لے جا کر کہا: میں جو چاہوں کر سکتی ہوں۔ پھر میں ایک ٹانگ پر کودتی کودتی باغ کے اس کونے کی طرف چلی گئی جہاں مور رہتا تھا۔

"شاہ جہاں ۔۔۔!" میں نے اس سے کہا۔ یہ اس کا نام تھا: "بہار آ گئی اور بھیا بھی آ رہا ہے شاہ جہاں!" وہ کافی بے تعلق معلوم ہوتا تھا۔ ارے بے وقوف۔ تمہیں اتنا بھی نہیں معلوم کہ میں دس تک گن سکتی ہوں؟"

وہ اپنی سنہری آنکھوں سے مجھے تکتا رہا۔ وہ واقعی سخت بے وقوف قسم کا مور تھا۔ سارا دن باغ میں پڑا رہتا تھا۔ میری طرح نہ بھاگتا نہ کچھ کرتا تھا۔

"اپنے پر پھیلاؤ ۔۔۔ چلو جلدی ۔۔۔ پھیلاؤ اپنے پر ۔۔۔" میں نے اس سے کہا۔

ہم ایک دوسرے کو دیکھا کیے۔ اور میں بہت رنجیدہ ہو گئی۔

"رشیدہ ٹھیک کہتی ہے۔" میں نے اس سے کہا: "تم اس پنکھے والے مور کی طرح اپنے پر کبھی نہ پھیلاؤ گے۔ لیکن کوشش کیوں نہیں کرتے شاہ جہاں؟"

لیکن وہ مجھے ٹک ٹک دیکھا کیا۔

شاہ جہاں اب باغ میں ٹہل ٹہل کر گاتا یا کرتا تھا۔ کہ مجھے[1] وقت بھی یاد تھا جب لسکر اسے ہمارے یہاں لایا تھا۔ لسکر نے اسے اپنے تھیلے میں گوبھی کی طرح بند کر رکھا تھا اس کے پروں کی حالت خستہ تھی اور اس کی پونچھ میلی ہو رہی تھی۔

لسکر جب فارم پر آیا تو سمندروں کا باسی زمین پر چلتے ہوئے عجیب سا لگتا ۔۔۔ سفید ملک میں سانولا آدمی ۔۔۔ مجھے اور رشیدہ کو بچانک پر جھولتے دیکھ کر وہ کتنی خوشی سے مسکرایا تھا۔ اماں سے اس نے کتنی باتیں کیں۔ اس کی باتوں پر اماں ہنسیں بھی اور ان کی آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے۔ اماں نے اسے قورمہ کھانے کو دیا تو وہ کتنا مسرور ہوا۔

اور جب اس کے چلنے کا وقت آیا تو اس نے اماں کے دیئے ہوئے سامان کی دونوں پلیاں اسی تھیلے میں باندھ لیں اور مور اماں کو دے دیا اس نے مور اماں کو دے دیا اور اماں کچھ نہ بولیں۔ شکریہ بھی ادا نہ کیا۔ بس وہ لسکر کو دیکھتی رہیں۔

"یہ کون چیز ہے ۔۔۔" اسے جاتے ہی ہم نے اماں سے سوال کیا "کس قسم کی چڑیا ہے اماں؟"

"یہ مور ہے۔" اماں نے آہستہ سے کہا: "یہ ہمارے پاس دیس سے آیا ہے۔"

"تمہارے کشمیری پنکھے پر جو مور بنا ہے یہ اس کا ایسا تو بالکل نہیں یہ تو سفید ایسا ہے" میں نے کہا۔

"پنکھے والا مور ہرا اور نیلا اور سنہرا ہے اور اس کی پونچھ پنکھے کی ایسی ہے۔" رشیدہ نے کہا۔ "یہ والا تو مور ہے ہی نہیں صاف ظاہر ہے۔"

"رشیدہ" اماں نے کہا: "یہ سفید مور ہے۔ ابھی بہت چھوٹا ہے۔ اس لئے اپنی پونچھ نہیں پھیلا سکتا ہے۔ یہ ہمارے پاس دیس سے آیا ہے۔"

"اماں۔ اس سے کہو اپنی پونچھ پھیلائے۔"

"نہیں۔" انھوں نے جواب دیا۔ "میں سمجھتی ہوں اس ملک میں یہ اپنی پونچھ کبھی نہیں پھیلائے گا۔"

---

[1] ایسٹ انڈین ملاح

"نہیں۔" دات کو اقبال نے کہا۔ "یہ آسٹریلیا میں اپنی پونچھ کبھی نہیں پھیلاتے گا۔"

"نہیں۔" صبح کو سعید چچا نے کہا۔ "مور فی بنا یہ بے چارہ بھلا کس کے لئے ناچے گا؟"

لیکن رشیدہ اور لال اور میں اسے کئی روز تک بڑے غور سے دیکھتے رہے دیکھتے رہے یہاں تک کہ ہم اسے دیکھتے دیکھتے تھک گئے۔ اور چکیلا خوب صورت ہو گیا اور باغ میں رہنے لگا۔

"بہار آ گئی —— تم اب بھی اپنے پر نہ پھیلاؤ گے ——؟" میں نے اس سے پھر پوچھا آخر اکتا کر کسی اور سے باتیں کرنے کی خاطر اس سے ٹل گئی۔

نرس لیڈی باورچی خانے میں تھی۔

"بہار آ گئی اور بھیا بھی آنے والا ہے۔" میں نے اسے اطلاع دی۔

"بھاگ جاؤ یہاں سے۔" اس نے ہنس کر کہا۔

میں بھاگ گئی اور ایک جگہ رشیدہ کو کھڑکی میں بیٹھا پایا وہ نرس لیڈی کی کتاب "بے بی بک" پڑھ رہی تھی۔

"کیا کر رہی ہو —— ؟"

"پڑھ رہی ہوں۔ یہ بے بی بک ہے۔ میں پڑھ رہی ہوں کہ بچے کی دیکھ بھال کس طرح کی جاتی ہے۔"

"تم کو پڑھنا نہیں آتا۔ تمہیں معلوم ہے کہ تم کو پڑھنا نہیں آتا۔"

رشیدہ نے جواب نہیں دیا۔ اور کتاب کو تکنے اور ورق الٹنے میں جٹی رہی۔

"لیکن تمہیں پڑھنا نہیں آتا۔" میں دھاڑی۔

اس نے ایک صفحہ "ختم" کیا۔

"میں الفاظ تھوڑی ہی پڑھ رہی ہوں۔ مجھے پتہ ہے کتاب میں کیا لکھا ہے میں چیزیں پڑھ رہی ہوں۔"

"مگر تم کو معلوم ہے تم پڑھنا نہیں جانتیں۔"

میں غصے میں وہاں سے بھی ٹل گئی اور باغ میں پہنچی جہاں لال کھرپی لئے کچھ کھود رہا تھا۔

"تم کیا کر رہے ہو؟" میں نے ذرا ترشی سے پوچھا۔

"ترائی۔ میں بھیا کے لئے نیا باغ لگا رہا ہوں۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟ تم سب کو کیسے معلوم ہو گیا؟ تمہیں تو میں بتانے والی تھی۔ میں نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔ "خیر بہر حال ضروری نہیں کہ بھیا ہی ہو۔"

"بالکل بھیا ہو گا۔ لال نے قطعیت کے ساتھ جواب دیا۔ ہمارے پاس لڑکیاں کافی موجود ہیں۔"

"میں بھی کھودوں گی کیاری —— " میں نے یک لخت خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "ہم دونوں مل کر خوب بڑا سارا باغ لگائیں گے۔"

"ترائی مردوں کا کام ہے۔ میں مرد ہوں۔ تم لڑکی ہو۔"

"تم بچے ہو۔" میں نے کہا۔ "تم صرف چار سال کے ہو ——" میں نے تھوڑی سی مٹی اٹھا کر اس پر پھینکی اور چلی آئی۔

ابا آنوجے کی ٹہنیوں کی ٹوکری بن رہے تھے۔ وہ فرش پر دو ٹہنیوں کا کر اس ایسا بچھا کر اس پر آلتی پالتی مار کے بیٹھ جاتے تھے اور دوسری ٹہنیوں سے اپنے چاروں طرف ٹوکری کا گھیر بنتے چلے جاتے تھے۔ اس وقت مجھے ٹہنیوں کے اندر صورت ان کی

اور کندھے نظر آ رہے تھے۔ میں دبے پاؤں ان کے پیچھے پہنچی تاکہ ان کو ڈرا دوں۔

لیکن ابا کو ذرا تعجب نہ ہوا۔ "مجھے معلوم تھا کہ تم ہو۔" میں نے انہیں دیکھ کر منہ بنا دیا مگر وہ ہمیشہ کی طرح خوب ہنسے۔

"ابا" میں نے اپنی سوال پوچھنے والی آواز میں کہا (مجھے ابھی سے آسٹریلین کھوجی کہا جانے لگا تھا) "ابا۔ مور کی دُم اتنی خوب صورت ہوتی ہے؟"

انھوں نے اپنی داڑھی کریدی۔ اس کے پاؤں بدنما ہوتے ہیں اس لئے اللہ نے اسے خوب صورت پر دے دیئے ہیں تاکہ اس کے چھُپ جائیں۔

"لیکن شاہ جہاں ——— ہر ایک اس کے پاؤں دیکھتا ہے اس کے پر کبھی نہیں پھیلتے۔"

"ہاں" ابا نے اس طرح کہا گویا کسی کی بات کی تشریح کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میں رونے لگی۔ وہ اسی قسم کا دن تھا ہنسی آنسو۔ شاید وہ بہار کا پہلا روز تھا۔"

"کیا بات ہے؟ کیا ہوا ——؟" ابا نے پوچھا۔

"سبھی کچھ ——— شاہ جہاں پر نہیں پھیلاتا۔ رشیدہ ظاہر کرتی ہے جیسے اسے پڑھنا آتا ہے۔ لال مجھے کیاری نہیں کھودنے دیتا بدھی نہیں ہوں۔ اور بہار آگئی ہے اماں نے سانپوں کے لئے دودھ باہر رکھ دیا ہے۔ اور میں نے گناہ کہ ——" لیکن ابا اتنے یدہ لگ رہے تھے میں نے ان کو یہ نہ بتایا کہ میں نے کیا گناہ ہے۔

"سنو" ابا نے کہا۔ "تم اب بڑی ہو گئی ہو نہیں میں تم کو ایک راز کی بات بتاتا ہوں۔"

"راز کیا ہوتا ہے ابا؟"

"وہ چپکے ہو گئے۔" وہ چیز جو خالص ہماری ہو جو صرف ہم جانتے ہوں اور ساری دنیا میں صرف ایک شخص کے علاوہ کسی دوسرے بتائیں۔"

"مجھے بتایئے ——" میں نے گڑگڑا کر کہا

"ہاں۔ میں تمہیں بتاؤں گا۔ لیکن رونا نہیں۔ اور یہ بھی نہ کہنا کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ اب تمہیں پتا ہونا ہے۔"

"ہاں۔ ہاں ایک ——— پلیز ——— پلیز۔" ابا مجھے اتنے پیارے معلوم ہوتے کہ مل جاتا لوکری کی تیلیاں توڑ کر ان سے لپٹ جاتی۔

"ہم لوگ مسلمان ہیں۔" انھوں نے کہا۔ "لیکن تمہاری اماں کے ماتھے پر ایک نشان ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک زمانے میں وہ مسلمان نہیں تھیں۔ وہ برہمن تھیں اور کرشن اور شیو کی ساری کہانیوں پر ایمان رکھتی تھیں۔

"مجھے معلوم ہے۔ اور پہاڑیاں ———"

"چپ تو رہ بندریا ——— مگر اب اماں بھی مسلمان ہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ انہیں اپنے پرانے طور طریقے یاد ہیں جو برسات کے موسم میں وہ دودھ کے پیالے باہر رکھ دیتی ہیں۔"

"سانپوں کے لئے" میں نے کہا۔ "تاکہ وہ ہم سے محبت کریں اور ہمیں نقصان نہ پہنچائیں۔"

"لیکن ہمارے باغ میں سانپ نہیں ہیں۔" ابا نے کہا۔

"ہاں مگر وہ رات کو آکر سارا دودھ تو پی جاتے ہیں اماں کہتی ہیں ——"

"اگر دودھ رات کو باغ میں چھوڑ دیا جائے تو سانپ ضرور آجائیں۔ لیکن سانپوں کو ہمارے باغ میں ہرگز نہ آنا چاہیئے۔

سانپوں میں کبھی ادب لحاظ نہیں۔ اگران کو موقع ملے تو وہ تمہیں یا رشیدہ کو یا لال کو یا اماں کو جس کو چاہیں کاٹ کھائیں جیا!
اور یہی وہ راز ہے جس میں صرف تم اور میں شریک ہوں گے ——— میں رات کو باغ میں جاکر دودھ کے سارے برتن خالی کر دیتا ہوں
اس طرح مجھے کوئی فکر نہیں رہتی۔ تم لوگ بھی سانپوں سے محفوظ ہو اور اماں کے عقیدے کو بھی ٹھیس نہیں لگتی ——— لیکن اس کا ہرگز کسو
ذکر نہ کرنا۔"

"ہرگز ہرگز نہیں۔" میں نے ابا کو یقین دلایا۔

اس روز میں دن بھر لال کے ساتھ بڑی نرمی سے پیش آئی۔ کیوں کہ وہ محض بچہ تھا اور بڑا نہیں ہوا تھا۔ میں رشیدہ کے سا
بھی بڑے فخر سے سر اونچا کئے رہی کیوں کہ وہ ذہین ضرور تھی مگر کسی راز کی مالک نہ تھی۔ دن بھر میں اپنی راز کی سطوت سے معمور
ادھر ادھر گھوما کی۔ میں نے خود کو اماں سے بھی زیادہ عقل مند سمجھا۔ کیوں کہ گو اماں کو دنیا بھر کی باتیں معلوم تھیں مگر ان کو ہرگز یہ
نہیں معلوم ہونا چاہیئے۔

سہ پہر کو وہ لحاف پہ کروشیا کے پھول بنا بنا کر ٹانک رہی تھیں۔

"یہ گل لالہ ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ اور یہ ———"

"یہ شاہ جہاں ہے۔ پر پھیلائے۔"

"ہاں۔ اور یہ بھیا کے لئے گلاب کا پھول ہے۔"

"بھیا کب آئے گا اماں؟"

"آج رات۔ کل رات۔ پرسوں رات۔"

"بچے ہمیشہ رات کو آتے ہیں؟"

"میرے بچے ہمیشہ رات کو آتے ہیں۔ اندھیارا ——— اور انتظار ——— اور پھر سورج کا اجالا ——— اور چنبیلی کی مہک ——— یہاں
اس ملک تک میں ———" میں نے اپنے باغ کو دیکھا۔

"لیکن اماں ———"

"بس نمی ——— اپنے سوال بند کرو۔ میرا سر چکرا رہا ہے۔"

اس رات میں نے ایک عجیب سے شور اور تند چیخ کی آواز سنی۔ میں پلنگ سے کود کر دریچے میں پہنچی اور کرسی پر
کر باغ میں جھانکنے لگی۔

باہر چاندنی رات تھی۔ چاند اتنا بڑا تھا اور اتنا نیچے اتر آیا تھا کہ مجھے لگا کہ ذرا سا ہاتھ بڑھا کر اسے چھو سکتی ہوں۔ اور ا
روشنی میں اداس، اور کہرے کی مانند سفید، شاہ جہاں کھڑا تھا۔

شاہ جہاں ——— میرے منے بھائی ——— میں نے اس سے کہا۔ اپنے پاؤں کا رنج نہ کرو۔ اپنے خوب صورت پر کے متعلق
اور رجب میں یہ کہہ رہی تھی۔ اس نے اپنا سر اٹھایا اور آہستہ بہت آہستہ، پنکھے کی طرح۔ چاند ایسی سفید لیس کے
کی طرح اس نے اپنے پر پھیلا دیئے۔

شاہ جہاں اس وقت چاند پر سے اتر کر آیا تھا۔

میرا حلق دکھنے سا لگا۔ میرا سانس رک گئی۔ اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ جب میں نے آنکھیں کھولیں تو وہ سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ چاند محض چاند تھا۔ اور شاہ جہاں محض ایک سفید مورجس کے پر جھکے ہوئے تھے اور جو مرنگوں کھڑا تھا۔

صبح کو نرس لیڈی نے ہمیں جگا دیا۔ "منی بہن مات کو آگئی — اٹھو جلدی —"

"بھیا نہیں آیا — ؟" لال نے پوچھا۔

رشید اور میں اس پر خوب ہنسے اور اماں کے پاس پہنچے۔ اماں بہت خاموش اور بہت چھوٹی سی بڑے سے پلنگ پر لیٹی تھیں۔ ان کی لمبی سیاہ چوٹی برف کے ایسے سفید تکیے پر بکھری ہوئی تھی۔ بچی پرانے پنگوڑے میں پڑی ہوا میں اپنے ننھے ننھے گلابی مکے چلا رہی تھی۔ میں اور رشیدہ اس پر جھک گئے۔ لال نے اس کو نہیں دیکھا۔ وہ پلنگ پر چڑھ کر رینگتا اماں کے پاس پہنچا — "بھیا نہیں آیا —" اس نے اداسی سے کہا۔

اماں نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔

"اماں ہم اسے بدل کر لڑکا نہیں منگوا سکتے ؟"

"یہ اللہ کا تحفہ ہے۔ تحفہ کیسے بدلا جا سکتا ہے بیٹے ؟"

ابا ڈیری سے آئے۔ وہ بے حد خوش نظر آرہے تھے۔ پنگوڑے پر جھکنے کے بعد وہ پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئے اور اپنا ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں (جسے سن کر نرس لیڈی ہمیشہ ہنستی تھی) اماں سے کہا —

"مسز — دس وَن لٹل فیلو — ایہہ — ؟"

"بگ — نائن پاؤنڈز —" اماں نے کہا۔ اور نرس لیڈی نے فخر سے سر ہلایا۔

"واٹ راٹنگ دو دِس فیلو —؟" ابا نے اپنی عجیب و غریب انگریزی میں گفتگو جاری رکھتے ہوئے لال کو گود میں اٹھا لیا۔ "واٹ راٹنگ وِد یُو — ایہہ — ؟"

"لڑکا نہیں آیا۔ جس سے میں بات کر سکوں۔"

"اِی — اِی — ؟ ابا نے اپنی مخصوص انگریزی میں جواب دیا — "بس لڑکیاں ہی لڑکیاں ہیں ہمارے یہاں۔ چلو ایک کو دریا میں ڈبو دیں۔ کون سی والی کو ڈبوئیں ننھے میاں لال ؟"

رشیدہ اور میں کھلکھلا کر ہنستے ہوئے ابا سے لپٹ گئے۔ نرس لیڈی نے ہمیں خاموش کرنے کی کوشش کی۔ "آپ تو بچوں ما بھی گئے گزرے ہیں۔" اس نے ابا سے کہا۔ لیکن خود بھی ہنسنے لگی۔ سب خوب ہنسے۔ بچی تک نے کچھ غوں غاں کی۔

لیکن اس کا نام کیا رکھا جائے ؟ سعید چچا بھی اندر آکر اس بحث میں شریک ہو گئے۔

آخر ابا نے بچی کو گود میں اٹھا کر اس کی بڑی بڑی کالی آنکھوں کو غور سے دیکھا۔ "تمہاری بہن کا کیا نام تھا ؟" انھوں نے سعید چچا سے پوچھا۔ "وہی جو ہر جگہ ہمارے پیچھے پیچھے لگی رہتی تھی۔ وہ ننھی سی بچی جس کی بڑی خوب صورت آنکھیں تھیں۔"

"جمیلہ — اس کا نام جمیلہ تھا۔" سعید چچا نے آہستہ سے کہا۔

چناں چہ بچی کا پہلا نام جمیلہ طے پایا۔ اس لڑکی کے نام پر جو ایک زمانے میں ہندوستان میں زندہ تھی اور جب ابا اور سعید چچا بھائیوں جیسی دوستی کے ایک دوسرے سے عہد و پیمان کرتے تھے۔ اور اس کا دوسرا نام شہناز رکھا گیا۔

پھر مجھے یاد آیا۔

"شاہ جہاں" میں نے کہا۔ "اپنے پر پھیلا سکتا ہے۔ رات جب سب سو رہے تھے تو میں نے خود دیکھا۔"

"تم نے خواب دیکھا ہوگا بی بی۔" رشیدہ نے بڑی بیزارگی سے کہا۔

"بالکل نہیں۔ اتنی تیز چاندنی تھی۔"

"تم نے خواب دیکھا ہوگا بچی۔" ابا نے کہا۔ "مور اس ملک میں اپنے پر کبھی نہیں پھیلائے گا۔"

"میں نے خواب نہیں دیکھا۔" میں نے ذرا پژمردگی سے کہا۔ کیونکہ ابا کی بات ہمیشہ صحیح ہوتی تھی۔

"میں جمیلہ کی انگلیاں گنوں گی۔" اس سے پہلے کہ رشیدہ مور کے متعلق کچھ اور کہے میں نے اعلان کیا۔ "ایک دو تین پانچ۔"

"چار چھوڑ گئیں۔" ابا نے کہا۔

"ہاں۔ ایک دو تین چار پانچ۔ جمیلہ کی پانچ انگلیاں ہیں۔" میں نے گنا۔

"سب کی پانچ انگلیاں ہوتی ہیں۔" رشیدہ نے کہا۔

"مجھے دکھاؤ۔" لالی نے کہا۔

جب ابا اور اماں منی بچی کی انگلیاں دکھا کر لالی کو گنتی سکھلا رہے تھے میں چپکے سے برآمدے میں نکل آئی۔ جہاں پہاڑیاں نظر آتی تھیں۔

میں نے ان کو جلدی سے گنا۔ ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ پانچ۔ پانچوں پہاڑیاں موجود تھیں۔ ایک بھی کم نہ تھی۔ میں اس قدر خوش ہوئی کہ ایک بار پھر مجھے اپنا دم گھٹتا سا معلوم ہوا۔

میں نے خواب نہیں دیکھا۔ میں نے کہا۔ میں خواب میں تکلیف کس طرح دیکھ سکتی تھی۔ میں نے مور ناچتے دیکھا ہے۔ اور ایک رانا ورہے۔ اور پہاڑیاں صرف پانچ ہیں۔ ایک دو تین چار پانچ۔

پہاڑیاں اس کے بعد پھر کبھی نہیں بدلیں۔ میں بڑی ہو چکی تھی۔

اراکین سے درخواست

"ہم قلم" کے ذریعہ جملہ اراکین سے درخواست کی جاتی ہے کہ اگر وہ کسی علمی یا ادبی نیم سرکاری اداروں سے متعلق ہیں تو وہ اپنے فرائض اور حالات کار کے متعلق تفصیلی طور پر ریجنل سیکریٹری کو مطلع کریں تاکہ ان کی تکالیف اور حقوق کی نگہداشت کے لئے اگر ضروری ہو تو جدوجہد کی جا سکے۔

"ہم قلم" کو بھیجی جانے والی تمام تخلیقات غیر مطبوعہ اور صاف لکھی ہوئی چاہئیں

موقلم کراچی

بنگالی کہانی:

مخلص الدین احمد

شعبر نقوی

دیپ جلتا رہا

اگرچہ مجھے شہر کچن پور چھوڑے ہوئے ایک زمانہ گزر گیا مگر معلوم ہوتا ہے جیسے کل ہی کی تو بات ہے کہ میں ایک پریس رپورٹر کی حیثیت سے شہر میں ریوا ندی کے کنارے مقیم تھا جس سڑک پر شہر کے بڑے زمیندار "کرنک چودھری" کا دفتر تھا اس سے لگے ہاتھ کو ریوا ندی کے گھاٹ کیطرف جانے والی گلی تھی۔ اس گلی پر چلو تو سیدھے ہاتھ کو کالے کالے تنوں اور ہلدی جیسے پیلے پتوں والے ببول کے آسیب آسا پیڑ نظر آتے تھے۔ ان سے گزر کر بعد "جناب نندی کا مندر" تھا۔ جس کے سامنے گھنیری چھاؤں والے بڑ کے درخت کے سایہ میں عابد پنساری کی دکان تھی۔ ٹھیک اس کے مقابل کے کنارے پر نظر آنے والا میرا آشیانہ تھا۔

باہر سے آنے والے ملاقاتی کیلئے میرے پاس پہنچنے کا ایک ہی آسان طریقہ تھا وہ یہ کہ اسٹیشن کی پشت پر آکر منگا مگا (مبارک یکہ والے کی) پکارے۔ آپ کی آواز پر آپ کی رہنمائی اور خدمت کیلئے حاضر ہونے والا چھریرے بدن کا دبلا پتلا سا یکہ والا آپ کو یکہ پر سوار کرا کے تھوڑی ہی چار گلیوں کے ہیر پھیر کے بعد میرے پاس پہنچا دیتا۔

شاید اب تو منگا گزر چکا ہوگا کیونکہ یہ تو گزرے دنوں کی بات ہے۔

جن دنوں میں کچن پور میں رہتا تھا اس پورے شہر میں کل تین سواریاں تھیں جن میں ایک مسٹر منٹو حاکم ضلع کی جیپ۔ دوسری شو مر موجدار پوا کی موٹر سائیکل اور تیسری غیر سرکاری واحد کرایہ پر چلنے والی سواری منگا کا یکہ تھا۔ چنانچہ اکثر سواری کی قلت سے تنگ آکر شہر کچن پور چھوڑ دینے کو جی چاہتا تھا لیکن اس قلت کے باوجود ستم ظریفی یہ تھی کہ شہر کی واحد غیر سرکاری سواری کو بھی روزگار میسر نہ تھا کیونکہ اسکا مالک یکہ والا منگا مسلمان تھا۔ وہ شام کو پکار پکار کر تھک جاتا تھا لیکن کوئی سواری اسکی طرف نہ آتی۔ تو پھر اسکی امید مجھ سے وابستہ ہوتی اور وہ مجھے سواری کیلئے بلاتا۔

کچن پور میں جب میں ایک اجنبی کی حیثیت سے وارد ہوا تو پورے شہر کو دیکھنے کا شوق دل میں موجزن تھا چنانچہ ایک روز میں نے منگا کو کیلئے بلایا۔ میرے بلانے پر منگا فوراً تیار ہوگیا جیسے وہ اسی انتظار میں تھا۔ میں منگا کے یکہ پر سوار ہوا اور چل پڑا ہمیں آج گھاٹ کے اس پار جانا تھا لہٰذا ہم یکہ "بزرا" (بڑی کشتی) پر سوار ہوگیا۔

ریوا کو عبور کرتے ہوئے ریوا کی بار بار آنے والی موجیں زبان حال سے برابر یہ صدائیں دیئے جا رہی تھیں کہ کچن پور کے دل میں موجیں ریوا اپنے اس پیارے شہر کو نہ چھوڑنے پر اسی طرح بضد ہے جیسے ایک دیہاتی دلہن اپنا گاؤں نہ چھوڑنے پر مصر ہوتی ہے۔

دیکھئے وہ ندی کا موتی جیسا صاف پانی شرمیلی دلہنوں کی سی سبک رفتاری کے ساتھ ایک نگر سے دوسرے نگر اور پھر تیسرے کیطرف اور داخل ہو جاتا۔

ندی کے اس پار کاشت یوں نوں ہے (ایک قسم کی جھاڑیاں) اور دھان کے لہلہاتے ہرے بھرے کھیت اور آسمان سے باتیں کرتے درختوں کے جھنڈوں کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں شیورا (وہ پیڑ جو پھول کی شکل کا اور سنایا جاتا ہے) کے پیڑ بھی دکھائی دیتے ہیں ندی کے اس جانب ندی کا شفاف پانی کنارے کے جھنڈ ہے۔ آم کے لمبے پیڑوں اور بوڑھے زلفوں والے مہیب جہاندیدہ برگد کے درختوں کی تصویر لئے رہا تھا۔ اور بھی وہ دلکش اور دلفریب مقام تھا جہاں پر صف بستہ تاڑ کے پیڑ اور سپاری کے درختوں کی جلو میں خاموش موجیں مارتی ریوا بہا کرتی تھی۔ بس ریوا کے انہیں جانب نظر کناروں پر پھیلا ہوا خوش قسمت خوبصورت سا شہر کچن پور آباد ہے۔ اس شہر کے دوسرے کنارے پر واقع اسٹیشن سے آنے والی ریلوے لائن ریوا ندی کو پل کے ذریعہ پار کرتی ہے۔ اس پٹری کے پل پر سے ہر گزرنے والی گاڑی سے ملنے والی گڑگڑ کی بلند آواز ندی پر ایسا گمان ہوتا تھا جیسے زمیندار کی خواہش پر سرکار کی طرف سے قرق کرنے والا عملہ کسی مزارع کی زمین کی قرقی کا ڈھول پیٹ پیٹ کر اعلان کر رہا ہو۔

ایک کچن پور پر ہی کیا منحصر ہے ہندوستان کی ہی کہانی صدیوں پرانی ہے آج سے کوئی چار سو قبل ۱۶۰۰ء میں برطانیہ میں ملکہ کی توثیق سے ایک رجسٹرڈ تجارتی ادارہ قائم ہوا اسوقت ہماری تجارت بھی آزاد تھی۔ اس چھوٹی سی پرانی بستی میں نہ کوئی حاکم تھا نہ کوئی زمیندار تمام لوگ بھائی بھائی تھے اور کسی کو کسی پر فضیلت نہ تھی۔ دلی ہماری راجدھانی تھی شاید اسی لئے ریوا کی دھڑکن جمنا کی دھڑکنوں کی تصویر ہوا کرتی تھیں۔ لیکن آج سے کوئی تین سو سال پہلے ۱۶۱۲ء میں پہلی بار جہانگیر کے عہد میں اس برطانوی کمپنی کا پہلا نمائندہ ہندوستان آیا دربار میں باریاب ہوا اور تجارتی مراعات سے نوازا گیا۔ یہاں تک کہ آہستہ آہستہ یہی تجارتی مراعات مزاج کی شاہی ترجیحات میں بدلتی چلی گئیں۔

ایک وقت وہ آیا کہ بیرونی تاجروں کی سرمایہ کاری اور عیاری نے سامراجی ملوکیت کی لوٹ کھسوٹ کیلئے ہمارے سونے کی چڑیا کا تاجدار بنا دیا ۔۔۔ ان حیلہ ساز نو مولود دولت مندوں نے کرنی اور نہ کرنی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ بلکہ ان کی ہوس ملک گیری اور تجارتی مراعات یعنی شاہی ترجیحات کیلئے امی چند جگت سیٹھ اندر بورا رائے اور درلب ملک کے ممتاز تاجروں کی غداری اور مفاد پرستی نیز قوم فروش جاہ پرست میر جعفر کی ایک ٹولی نے فرنگیوں سے سازش کر کے جنگ "پلاسی" کی شکست کا باعث بنے۔ ۱۸۵۷ء کی انقلابی تحریک کو غدر کا نام دیکر غیر مسلم سکھوں کی مدد سے تاخت و تاراج کیا۔ جلیانوالا باغ کے حریت پسندوں کا قتل عام کیا۔ نثار علی کی جانباز قلعہ بندی اور سید اسمعیل شہید کی تحریک جہاد کا عبرت ناک انجام ہوا۔ اور پھر چلتے چلتے خلافت جیسی انقلابی تحریک کو ہندو قوم کے نیتاؤں اور آزادی کے علمبرداروں کی سازش سے پیس کر رکھ دیا۔ لیکن ان تمام تحریکوں کے مضمرات کا بھرپور ردعمل کچن پور میں عود کر آیا۔ کچن پور دلی راجدھانی سے بچھڑ گیا۔ اب اس میں "کرتک چودھری" زمیندار اور حکام ضلع میں مسٹر ہنٹر حاکم ضلع۔ بارن رائے ایس ڈی او۔ شیو موجمدار پولیس سپرنٹنڈنٹ دین ملر جج اور کو یش گھوش وکیل دکھائی دینے لگے۔ ان کے علاوہ ہرن نبرجی تھانیدار۔ رتن کا در بیر دتا سپاہی اور شری ناتھ موچی چوکیدار بن گئے۔ ان سب غیر مسلموں کی نظر میں یہاں کی کل مسلم آبادی نچلے درجہ کے پیشہ ور۔ کاشتکار مزدور قلی اور کوچوان یا پھر ان کی اکثریت جرائم پیشہ چور اچکے ڈکیتوں تھی۔

ہم لوگ ریوا ندی کے راستے پار جا پہنچے۔ اب کچن پور میں میرے تقریباً ۶ ماہ بیت گئے لیکن اب تک ندی کے اس پار کا علاقہ میں نے نہیں دیکھا تھا۔ آج اس نئی سیر کی خوشی میں بار بار مگا سے سوال کرنے کو جی چاہتا رہا۔ اور میں پوچھتا بھی رہا کہ یہ گھر کس کا ہے اور کبھی معلوم کرتا کہ یہ سامنے والا حوض ہے ؟۔ کبھی کہتا یہ درخت بڑے سندر اور دلکش ہیں۔ کیا کہا۔ شیو جی کا مندر۔ میں نے بے ساختہ کہا ۔۔۔ اور وہ کارخانہ کی چمنی کے مانند نظر آنے والی چیز کیا ہے۔ شیو جی کا مندر ۔۔۔ میں نے بے ساختہ کہا ۔۔۔ اور وہ کارخانہ کی چمنی کے مانند نظر آنے والی چیز کیا ہے کچی اور سیدھی نیچی ڈھلانوں والی سڑک سے گزرتے ہوئے یکے کی چرچر کی صدائیں اور گھوڑے کے سموں کی ٹاپ سے پیدا ہونے والی آوازوں نے مل کر ایک عجیب سا ترنم پیدا کر دیا مگا نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ وہ چمنی نہیں۔ جی وہ تو مسجد کا ایک ٹوٹا ہوا مینار ہے۔

کیا کہا مسجد کا ٹوٹا ہوا مینار۔ میں نے اس سے پوچھا اسکی مرمت کیوں نہیں کی گئی۔ کچن پور میں کیا مسلمان نہیں رہتے۔

ایک نسانہ سا مگا نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ یہاں سب کے سب مسلمان ہی ہیں۔ لیکن یہاں کے لوگوں میں وہ چار سیاسی احساس سب بند ہیں۔ پھر کس میں اتنی ہمت ہے کہ جو اسکی مرمت کرا سکے۔

کیوں ۔ چندہ تو لیا جا سکتا ہے میں نے پھر ملنگ سے پوچھا ۔

آپ کیا کہتے ہیں " ملنگ نے گھٹی گھٹی سی اور یاس میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا ۔ " کرتک چودھری " کی زمینداری و عملداری میں رہ کر مسلمان چندہ کر سکتا ؟

کیوں کیا بات ہے ؟ بتاؤ ——— میں نے پوچھا

لیکن کچھ زمانہ بعد خراسان سے ایک مولانا صاحب کچن پور تشریف لائے اور مسلم عوام کو چندہ کی تلقین فرمائی ۔ ان کی اس ہدایت کو شہر کی مسلم آبادی نے قبول کیا ۔ لیکن " کرتک چودھری " اور اسکے حواری و عملداری والوں نے اس واقعہ کی اطلاع پولیس سپرنٹنڈنٹ کو دی ۔ اور یہ باور کرایا کہ بستی کے مسلمان متفقہ طور پر حکومت کے خلاف متحد ہو رہے ہیں اور مقابلہ کیلئے ناجائز اسلحہ کی فراہمی کیلئے چندہ کیا جا رہا ہے ۔ اس واقعہ کے چند روز بعد شہر کچن پور کے گرد گھیرا اس طرح ڈالا گیا کہ بستی کے اندر اور باہر جگہ جگہ پر فوجی جوان متعین تھے لیکن خراسانی مولانا تو کسی نہ کسی صورت اس گھیرے سے نکل جانے میں کامیاب ہو گئے مگر وہاں کی مسلم آبادی پر جبر و استبداد کی کوئی انتہا نہ رہی ۔

او یہ بات ۔۔ ہاں کہو ۔ چلتے چلتے جب ایک کنول کے انگارہ جیسے کھلے حوض کے پاس سے گزرا تو بے اختیار میرا جی تڑپ اٹھا ۔ بے اختیاری کو بہانہ بنا اور بیساختہ ملنگ سے یکہ رکوا لیا ۔ ادھر یکہ رکا ادھر رسی ٹوٹی ۔ بنگالی بابا صاحب آپ وہاں ہو آئیں اور میں تنے رسی جوڑ لوں ۔ سیڑھی پر دیکھتے ہوئے کنول کے پھول ہاتھ کی لمبائی سے ذرا پرے تیر رہے تھے ۔ ناچار ملنگ کے ہنٹر کا سہارا لیا ۔ ناگاہ کسی نے ٹوکا ۔ بے اختیار دوڑتی ہوئی نظر ایک اجنبی خوبرو دوشیزہ پر ٹک گئی میرے تعارف کیلئے آپ کا سوال تشنہ ہے ۔ لمحہ بھر کیلئے اجنبی نظروں نے انگڑائی لی اور میری طرف گھورتے ہوئے پوچھا ۔ ہاں آپ کا تعارف ۔

" کیوں ۔ اگر کوئی اپنا مکمل تعارف نہ کرائے تو کیا اسکو پھول نہیں دیا جا سکتا " میں نے پوچھا ۔

" معاف کیجئے ۔ مکمل تعارف کے باوجود یہ پھول نہیں دیا جا سکتا " اس نے معذرت چاہتے ہوئے کہا لڑکی کا یہ آخری فیصلہ تھا ۔

" کیوں یہ کون سے ملک کا قانون ہے " میں نے پھر پوچھا ۔ بے خیالی میں بڑھا ہوا ہنٹر لپیٹ چکا تھا ۔ اور میں جھک کر دو قدم آگے اجنبی لڑکی کی طرف بڑھ گیا " اس ملک کا جس ملک کی دھرتی پر آپ ہم کھڑے ہیں اس نے دو قدم میری طرف بڑھتے ہوئے کہا ۔ کیا آپ نہیں جانتے "

" نہیں ۔ میں نہیں جانتا " میں نے جواب دیا " یہ تو شہر کچن پور کا ہر آدمی جانتا ہے " اجنبی لڑکی نے کہا " لیکن میں تو کچن پور کا رہنے والا نہیں " اور یہ بات کتنے روز سے آپ یہاں ہیں " اس نے پوچھا " یہی کوئی چھ ماہ سے " میں نے کہا ۔

" آپ کا اس شہر میں آنے کا مقصد " ۔ اس نے پوچھا ۔

پریس رپورٹر کی حیثیت سے ۔ میں نے جواب دیا ۔

دو اجنبیوں کی نظریں چار ہوئیں تو پتھرا گئیں ۔ لیکن اب نظروں سے وہ حیرانی دور ہو گئی جو بھر گیا تھا ۔ دو مانوس چہرے مسکرا اٹھے ——— یہ تو آپ کو پہلے بتانا تھا ۔ اجنبی میزبان نے کہا ۔ آئیے ادھر آئیے ۔

بے اختیار میں آگے بڑھا ۔ ہاتھ کی خاموش جنبش نے حوض کے کنارے بنچ پر بیٹھنے کی فرمائش کی ۔ نہیں بیٹھنے سے میرے بدن میں سنسنی پھیلتی ہے میں نے کہا ۔

کیوں ۔ اس نے پوچھا ۔

آپ کے اس پہاڑ کھانے ویران گھر سے مجھے لرزہ چڑھتا ہے ۔ آپ کا الیا گندہ پلاسٹر اترا ٹوٹے پھوٹے دیوار اور کونوں والا گھر ہے ۔ جس میں اندرون خانہ جگہ جگہ مکڑی کا بنا یا ہوا جالا اور جگہ دڑوں کے لٹکے ہوئے فانوس اور باہر دیواروں پر اگا ہوا سبزہ آثار قدیمہ کا پتہ دیتا ہے ۔ لیکن یہ دیرا انسانوں کا مسکن نہیں ۔

کیوں میں انسان نہیں ۔ میرے اجنبی میزبان نے پھر پوچھا ۔

بیشک ــــ لیکن اسکا یقین مشکل ہے ۔

کیوں اجنبی میزبان نے پھر پوچھا ــ ہم نے پرانی کہانیوں میں بڑوں سے ایسا سنا ہے کہ کہیں کسی شہر سے دور دراز ویرانوں کیطرف اگر کسی کا گزر ہوا تو ان
ریں میں انسان نما جن یا بھوت پریت دکھائی دیتے ہیں ــ میں نے کہا ۔

میزبان نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا واہ واہ آپ بھی خوب ہیں ۔ آپ نے دیوی دیوتاؤں کے قصے بھی تو سنے ہونگے ۔

میری ہنسی بھی بکھر گئی ــ میں نے کہا ہاں ۔ لیکن وہ دیوی دیوتا ایسی سواری پہ بیٹھ کر کبھی نہیں آیا کرتے ۔ وہ آتے تو ہونگے لیکن کسی طرح کسی کہانی میں ان
ری نہیں بتائی گئی ۔

کامیاب چوٹوں پر بلند قہقہے فضا میں پھیل گئے ۔ اب میں مہمان نہیں تھا ۔ اور پھول کا طلب گار بھی اسلئے پھر دو قدم پیچھے ہٹ کر ہاتھوں کو کنول کے ہوا سے
تے اور پانی پر تیرتے ہوئے پھولوں کی طرف دراز کر دیا ۔ پیچھے مڑ کر بولا اس پھول کے پیچھے کیا کہانی ہے ۔ جاننے کیلئے میرا دل بے چین ہے ۔

اجنبی میزبان نے میرے نزدیک آتے ہوئے کہا ایسا کوئی بڑا راز نہیں ہے ۔ صرف یہ شرط ہے کہ اس پھول کو وہی شخص لے سکے گا جو اس پھول کی شادی کی کہانی
یہ بات خود ایک پہیلی ہے ۔ یا پھر پرستان کی پریوں کی کہانی ــ میں نے اجنبی کو جواب دیتے ہوئے کہا ۔

ہو سکتا ہے لیکن ہماری یہی شرط ہے اجنبی میزبان نے کہا

اجنبی میزبان کے چہرہ پر نظریں جمائے ہوئے میں نے پوچھا آخر کیوں ــ

کچھ دیر بعد خواب الم سے بیدار ہونیوالی میزبان نے کہا ــ وہ ایک طویل کہانی ہے میں آپ کو کچھ کچھ بتا سکونگی ۔ میرے پردادا ایک مرتبہ سفر پہ گئے
رستے جانے کے کوئی ڈیڑھ سال بعد کاغذ پر بنا ہوا پھول گھر بھیجا اور ہدایت کی کہ اس تصویر کو اسطرح سمجھا جائے کہ رہتی دنیا تک پھول کھلا ہی رہے ــ
ں ہدایت کی تعمیل میں میری پردادی کے حکم پر یہ حوض تعمیر کیا گیا ۔ پھر اس تصویر والے پھول کے بیج لاکر حوض میں ڈالدئے گئے ۔ اسوقت بھی کتنے ہی لوگ
ں پھول کو لینے آیا کرتے تھے اور دیا بھی جاتا تھا ــ لیکن کچھ زمانہ بعد یہ شرط لگا دی گئی کہ جو شخص اس پھول کی کہانی بیان کرے وہ یجا سکتا ہے ــــ میری
دادی گزر گئیں ۔ لیکن ان کی لگائی ہوئی شرط آجتک قائم ہے ۔ اجنبی اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ بھول کے کانٹوں کیطرح میرے دل میں سوالات پھوٹ نکلے ۔
ر میں نے پوچھا لیکن کیوں ــ

اجنبی میزبان نے فوراً بات بدلتے ہوئے کہا آپ نے تو صرف پھول مانگا تھا ۔ اتنے کچھ سوالوں کا مطلب ــ

وجہ یہ ہے کہ میں کوئی انقلابی نہیں ــ میں تو صرف ایک پریس رپورٹر ہوں ۔ لہٰذا پھول اور انقلاب میں دبی ہوئی چنگاری کی کہانی معلوم کرنا چاہتا
ہوں ۔ میں نے جواب دیا ۔

مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی امداد سے قاصر ہوں البتہ اس سلسلہ میں آپ کو میری دادی کے پاس چلنا ہوگا ۔ انھیں کی یادوں کا ٹھنڈا پانی
آپ کی پیاس بجھا سکے گا ۔ اجنبی میزبان نے کہا ۔

لیکن مجھے طلب پھول نے پھر گدگدایا ۔ میں نے ہنٹر ہاتھ میں اٹھالیا اور حوض کے سینہ پر سوار ہوگیا ۔ اجنبی میزبان سے سوال کیا کہ کیا آج
ہی میں آپ کی دادی سے مل سکتا ہوں ۔

نہیں میرے اجنبی میزبان نے جواب دیا ــــ آج ان کا یوم عبادت ہے ۔ آج وہ فجر سے عشاء تک پورے دن ایصال ثواب کیلئے تلاوت
کلام پاک اور وظیفوں کے ورد میں مصروف رہیں گی ۔ آج کے دن وہ کسی سے نہیں ملتیں ۔ کیونکہ آج ہمارے دادا کی برسی کا دن ہے ۔ پھر کسی دن پر رکھیے ۔

لمحے کے لمحہ شگفتہ چہرے پر ٹھنڈا پسینہ پھوٹ نکلا ۔ دادا پردادا کی الم انگیز داستانوں کا نقش ابھر کر اجنبی میزبان کی نظروں میں پھر گیا ۔ اس
معصوم چہرہ کو ملول دیکھکر میرا دل بھی بھر آیا ۔ ہنٹر کو ہاتھوں میں بل دیتا ہوا گھوگیر تیز قدموں سے یکہ پر آکر سوار ہوگیا ۔

دفعتاً خیال نے یاوری کی۔ چلتے چلتے میں نے اجنبی میزبان سے پوچھا آپ کا نام۔ منونہ۔ اجنبی میزبان نے دھیمی آواز میں کہا۔

واپسی پر اثنائے راہ میں مگا نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ پہلے ہم بھی اس مکان پر بہت آتے جاتے تھے۔ میں ناغہ کرتا ہے تو حضور خود بلوا لیتے تھے۔ اور کہا کرتے تھے۔ ارے بھائی مبارک یہ کیلے۔ یہ بیگن۔ اور یہ ڈھاپ وغیرہ پہنچا دیا کرو۔ جیسے کسی خواب سے چونک کر مبارک نے مجھ سے سوال کیا۔ آپ نے نیامت گنج کا ہاٹ دیکھا ہے نیامت گنج ہاٹ کے ایک بازو میں ۲ میناروں والی مسجد ہے۔ اس مسجد کے امام ایک جید بزرگ تھے۔ حضور سے پھول وغیرہ لیکر انہیں کو پہنچایا کرتا تھا۔ بزرگ کی شان بتلاتے ہوئے مگا کے چہرہ پر سراسیمگی دوڑ گئی۔ کیا شان والے امام تھے۔ جیسے کوئی سلطان اولیا ہوا کرتا ہے جن کا حلقہ شاہی دربار کیطرح وسیع تھا۔

ایک رونگی بات ہے کہ میں صبح سویرے ایک جوڑ گول ناریل اور کچھ کیلے لیکر نیامت گنج ہاٹ کیطرف جا رہا تھا۔ راستہ میں کشور رائے کے مکان سے نزدیک جنوب کی طرف سے گزرتے ہوئے پولیس نے مجھے چوری کے الزام میں گرفتار کر لیا اور تھانہ لیگئی۔ میرے پاس پھل اور میوہ چوری کا مال سمجھ کر کیلے تو بڑے داروغہ جی نے لیلئے اور پولیس کے جوان ناریل اور داؤ (ناریل کاٹنے کا آلہ) لیکر کچھ دور جا بیٹھے۔ میں ایک بے زبان پرندہ کیطرح تنگ و تاریک حوالات کے پنجرہ میں بیٹھا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ ان ظالموں نے اس پر بس نہ کی۔ بلکہ پہلے تو بڑے داروغہ نے مجھ پر برسنے کی حد نہ رکھی۔ خدا پناہ میں رکھے ان درِ سلطنت کے جوانوں ان کے بعد پولیس نے اپنی اپنی بدکالی کے آزمودہ وہ جوہر دکھلائے کہ اللہ دے رہا تھا اور بندے لے رہا تھا۔ اس آزمائش کے بعد حاضر عدالت ہونا پڑا عدالت نے تین سال کی سزا کا حکم سناتے ہوئے مجھ پر الزام لگایا کہ میں تاج برطانیہ کے خلاف سازشی چٹھی لیجا رہا تھا۔

مگا سے یہ سنکر میں حیران رہ گیا۔ اور پوچھا میاں کیا کہہ رہے ہو۔

ہاں صاحب جو میں بول رہا ہوں۔ ٹھیک ہی بول رہا ہوں۔ مگا بولا۔ تین سال بعد جب میں جیل سے نکلا تو دیکھا کہ میرا مکان نیلام کر دیا گیا جس میں اب جناب نندی کا مندر بنا دیا گیا ہے۔ فی الحال میرا ذریعہ معاش یکہ چلانا ہے اور ہفتہ بھر میں پیر کے دن تھانہ میں حاضری دینی پڑتی ہے۔ سو میرے اس روزگار کا بھی یہ حال ہے کہ کوئی سواری نہیں ملتی۔ کیونکہ کسی کی نظر میں تو میں چور ہوں اور کسی کی نظر میں ایک مجرم قیدی اور شومر موجدار وغیرہ کی نظروں میں خطرناک انقلابی مسلمان ہوں۔

کیلنڈر کے چند صفحے پلٹ گئے۔ اس عرصہ میں مجھے چند مرتبہ صدر دفتر حاضر ہونا پڑا لیکن اس اثنا میں مگا مختلف اوقات میں مجھے منونہ کے گھر چلنے کی یاد دہانی کراتا رہا۔ لیکن اسکے باوجود میں وہاں جانے کی فرصت نہ نکال سکا۔

ایک موقع پر اطلاع ملی کہ کرتک چودھری کی زمینداری کے علاقہ نیامت گنج سے لگان ادا نہ کرنے والے دو سو کاشتکاروں نے اپنی زیر کاشت زمینوں کی بیدخلی کرنے جانے والے عملہ کے دو تحصیلداروں اور ایک چوکیدار کو قتل کر ڈالا۔ اس ہنگامہ آرائی کے نتیجہ میں شومر موجدار کی سرکردگی میں مسلح پولیس کے ایک دستہ نے نیامت گنج کے علاقہ سے تقریباً ۱۰۰ مردوں اور عورتوں کو حراست میں لیکر جیل بھیج دیا۔ اور ان ملزموں پر فرد جرم لگا دیں۔ مگر جی جج کی عدالت میں مقدمہ کا چالان پیش کر دیا۔ اسکے بعد طے پایا کہ مسٹر نہٹر حاکم ضلع اور شومر موجدار بہ نفس نفیس نیامت گنج پہونچکر موقع واردات سے ان ملزموں کے خلاف شہادت قلمبند کریں گے۔ شہادت کی اس کاروائی کو دیکھنے جاتے میں نے مگا کو بلایا۔ مگا فوراً یکہ لیکر حاضر ہو گیا اور باہر میرا منتظر رہا۔

ابھی شہادت ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ آسمان پر بادل گھمنڈ کر آگئے۔ بارش کے خوف سے شہادت لینا ملتوی کر دیا گیا۔ مسٹر نہٹر اور شومر موجدار شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ مگا نے بھی اپنے لاغر و ناتوان گھوڑے کی راسیں کھینچیں اور بار بار چابک مارنا شروع کر دیا۔ لیکن ابھی ہم کشور رائے کے مکان تک پہنچنے پائے تھے کہ قیامت خیز طوفان نے ہمیں گھیر لیا۔ ایک طرف تو شام کی تاریکی پھیل چکی تھی اس پر گرد و غبار اور ہوا کی شدت نے ہماری آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ پھر ہوا کی مسلسل سائیں سائیں اور گرتے درختوں کی گڑگڑاہٹ آسمان پر بادلوں کی گرج سے ہمارا دل ڈوب رہا تھا۔ کئی مرتبہ بجلی کی چمک اور بادل کی گرج بڑھ چلی گئی۔ اچانک ہمارا یکہ ایک دیوار سے ٹکرا گیا۔ ہم لوگ بھی یکہ سے اچھل کر دور جا پڑے۔ اٹھے اور ٹکرانے والی چیز کو ٹٹول ہی رہے تھے کہ بجلی کی چمک سے

ایک دروازہ نظر آیا۔ بڑی دیر تک دروازہ پر دستک دیتے رہے آخر کار دروازہ کھلا اندر پہنچے تو غیر متوقع طور پر نمونہ کو دیکھکر بڑی حیرت ہوئی۔ اور ا
معلوم ہوا کہ یہی نمونہ کا گھر ہے دل ہی دل میں پھولے نہ سمائے۔

ان حالات میں نمونہ سے ملاقات ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھی فوراً بھیگے ہوئے کپڑے تبدیل کئے پھر گرم گرم دودھ پینے کے بعد ذرا
ٹھکانے آئے۔ دیکھا کہ نمونہ زیر لب مسکرا رہی ہے۔ نمونہ نے کہا۔ ٹھیک ہی ہوا۔ نہ طوفان آتا نہ آپ آتے۔

ادھر رات گئے تک بارش نے تھمنے کا نام نہ لیا اسکا تانتا بندھا ہی رہا۔ آخر نمونہ نے ہمیں روشنی دکھانے کیلئے لالٹین ہاتھ میں اٹھالی اور
کے برآمدہ سے بارش کی بوچھار سے بچاتی ہوئی جنوبی برآمدہ میں لے آئی یہاں سے ہم ایک کمرے میں داخل ہوئے کمرے میں داخل ہوتے ہی سامنے
کھڑکی کے نیچے بچھی ہوئی چارپائی پر کافی پرانی لیکن بہت قیمتی چادر لگی ہوئی نظر آئی۔ کمرہ کی دیواروں پر کونس چڑھ چکی تھی۔ البتہ صفائی ستھرائی بدستور
چارپائی کے بائیں جانب دیوار سے ملحق ایک بڑے سے صندوق کے ٹھیک مرکز پر دیوار پر مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کا نقشہ ٹنگا ہوا تھا۔ اس نقشہ کے
مقابل دو الماریاں کھڑی ہوئی تھیں ایک الماری کے بازو میں ایک میز رکھی تھی میز کیساتھ ایک بوسیدہ کرسی رکھی تھی۔ میز کے برابر رکھے ہوئے اسٹول پر
رکھی تھی۔ کمرہ کے وسط میں رکھے ہوئے دوسرے چھوٹے سے اسٹول پر پانی سے لبالب کنول نما برتن میں گھی کے روشن چراغ تیر رہے تھے۔ اسی اسٹول کے
نزدیک بچھے ہوئے مصلے پر رکھی ہوئی عجائب گھر کی سنگ مرمر کی جیتی جاگتی مورتی نمونہ کی دادی نظر پڑیں۔

کمرہ میں داخل ہوتے ہی کمرہ میں بسی ہوئی لوبان کی بھینی بھینی خوشبو نے دماغ معطر کر دیا دادی کی نظر اٹھی اور فرمایا کہ آؤ میاں بیٹھو۔
میں آداب بجا لایا اور وسطی اسٹول سے نزدیک دوسری بچھی ہوئی سٹیل پائی پر بیٹھ گیا۔ انہوں نے مجھ سے دریافت کیا۔ میاں اس قیامت خیز
طوفانی باد و باران میں تمکو تکلیف تو نہیں ہوئی۔ میں ٹکٹکی باندھے اسٹول پر رکھی ہوئی کنول کی شبیہہ کو دیکھا کیا۔ دادی کی آواز پر چونک کر عرض کیا
مجھے آپ کی دعا سے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔

محترمہ نے اپنے ہاتھ کی تسبیح پر بوسہ دیا اور فرمایا میاں میں خوب سمجھتی ہوں کہ ایسے طوفانی حادثوں میں تمہیں کبھی تکلیف نہیں ہوگی۔
میں اس انٹرویو میں کھو گیا اور ان کے ارشاد پر کیا عرض کروں میری سمجھ میں نہ آیا اور بے ساختہ نمونہ کیطرف ملتجی نظروں سے دیکھنے
ابھی میں کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ انہوں نے پھر فرمایا آج جیسے قیامت خیز باد و باراں میں میرے خسر اور نمونہ کے دادا (محترمہ کے شوہر) ا
کرتے تھے۔ اور کسی کے استفسار پر تکلیف سے بے نیازی کا اظہار کیا کرتے تھے۔

انھوں نے ہاتھ سے تسبیح جانماز پر رکھدی اور سامنے رکھے ہوئے برتن میں پانی پر تیرتے ہوئے گھی کے روشن چراغوں کو دیکھنا شروع
میں نے بڑی عاجزی سے عرض کیا۔ یقین کیجئے مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔

مجھے یقین ہے بیٹا۔ اس مجسم سنجیدگی نے میرے جواب میں کہا۔ سنو۔ میرے خسر خود ایک طوفان تھے۔ میں نے اپنی شادی سے سلت
لعبتک مسلسل ان کی طوفانی زندگی دیکھی آج تنگی نگر۔ کل آگرہ پرسوں دلی نہیں تو کہیں اور یہی ان کا معمول تھا۔ ایک مرتبہ حج کیلئے دعوت نامہ
دیوار پر آویزاں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے نقشے کیطرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا حج کا دعوت نامہ ملتے ہی فوراً روانہ ہو گئے۔ اس کے بعد پو
دس سال تک ان کی کسی قسم کی اطلاع یا خط و پتہ کچھ بھی نہیں ملا۔ گیارھویں سال صرف دو خط ملے۔ پہلے خط میں کاغذ پر منقش کنول کے پھول کی تصو
ہدایت کیساتھ ملی کہ یہ یادگار رہتی دنیا تک محفوظ رہے۔ دوسرے خط میں تحریر تھا کہ کرتک چودھری کے دادا گو بردھن کی غداری کے نتیجہ میں میں ہکو
کی قید و بند میں ہوں اور بحر ہند کے جلاوطن قیدیوں کے جزیرہ انڈمان سے یہ خط بھیج رہا ہوں۔ مجھے کچھ تکلیف نہیں ہے۔ یہ خط ملنے کے بعد نمونہ کے
گھر سے نامعلوم سفر پر روانہ ہو گئے۔

ہم سب پہلے ہی سے حیران و پریشان تھے کہ نمونہ کے دادا کی تازہ جدائی کا داغ سہنا پڑا۔ ان کی بھی خیر و خبر سے محروم ہو گئے۔ میری ساس

ہوگئیں ایک رات کو انہوں نے موت و زیست کی فال نکالنے کا انتظام کیا تاکہ معلوم ہو سکے کہ ہمارے دونوں غائب مرد زندہ ہیں یا مر چکے۔ سامنے ؤا
برتن کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ اس دن یہ یادگار نہیں تھی۔ یہ منونہ کی دادی کی فال اور پر دادا کی وصیت کی ملی جلی
ہے۔ کنول کا پھول منونہ کے دادا... کی آزادی کا یادگاری نشان ہے۔ اور اسمیں پانی میں تیرتا ہوا گھی کا چراغ عمر نے جیسے کی فال ہے۔ جسکی بڑی شکل
کہ ہماری ساس نے ایک کڑھاؤ منگوایا اسمیں پاک و صاف پانی بھروایا پھر نفل نماز ادا کر کے درازئی عمر کی دعائیہ مناجات پڑھی۔ اسکے بعد باپ و بیٹے کی
کے نام سے گھی کے روشن چراغ اس کڑھاؤ میں ڈالے گئے۔ لیکن ڈالتے ہی یہ دونوں چراغ ڈوب گئے۔ ہم سب لوگ خوشی کیساتھ دست بدعا ہوئے اور خ
ادا کیا۔ اس طرح تھوڑے تھوڑے وقفہ سے فال نکالی جاتی رہی۔ کوئی دو سال بعد قید سے مفرور ایک قیدی ہمارے پاس آیا اور یہ خبر سنائی کہ
کہ ایک جیل میں منونہ کے دادا قید ہیں اور انھیں کوئی تکلیف نہیں ہے۔ اس واقعہ کے ایک سال بعد پھر ایک اطلاع ملی کہ ان دونوں باپ اور بیٹے
انڈمان میں پھانسی دیدی گئی۔ اس اطلاع کی تاب نہ لا کر میری ساس بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں خدا انہیں جنت نصیب کرے آمین۔

دادی کی آپ بیتی میرے کانوں میں بادل کی گرج کیطرح گراں گزر رہی تھی میں حیران رہ گیا میری پھیلی ہوئی آنکھیں ان پر جھپک کر رہ گئیں۔
بار بار گھور کر اس حلم اور شجاعت کو پہچاننا چاہتا تھا جو عورت ذات میں دیکھ رہا تھا۔ ان کا یہ سن اور یہ بلا کی سنجیدگی و تحمل پوری کہانی بیان کرتے وقت
رہا۔ ان کا یہ بیان آزادی کی لگن سے متعلق ایک مرد مومن کی زبان سے ایمان و الیقان کی تفسیر تھی۔ مومن کی شان بھی شاید یہی ہو کہ رضائے ا
آزادی کی لگن میں آنکھ میں آنسو نہیں چھلکتا۔ منونہ کی دادی اسکی سچی تصویر تھیں۔

اسوقت بھی بارش ہو رہی تھی اور شائیں شائیں کی صدائیں اب بھی بلند ہو رہی تھیں منونہ اور میں بے جان مورتیوں کیطرح ساکت
تھے۔ پانی سے لبالب کنول نما برتن میں گھی کے روشن چراغ جلے چلے جا رہے تھے۔ دادی کی ذات ماضی و حال کا وہ سنگ میل تھی جو آنیوالی صدی کو
صدی کا کوئی پیغام دے رہی ہو۔

منونہ کا باپ تعلیم سے فارغ ہو کر دلی سے واپس لوٹا۔ دادی نے دھیمی آواز میں کہا میرا خیال تھا کہ اکبر اپنے بزرگوں سے جدائی اور اپنی
مصروفیتوں کے باعث اپنی آبائی فکر کو بھول چکا ہوگا۔ اسکی نظر میں گھر کی اس درجہ تباہی کے بعد ذات پر جماعت کو فوقیت نہ ہوگی اور وہ اپنے باپ
کیطرح زندگی نہیں گزاریگا۔ اگر خدا کے فضل سے شادی شدہ اور ایک بچی منونہ کا باپ ہے۔ اسکے علاوہ میں اسکی بوڑھی ماں ہوں وہ ہم تینوں کا
ذمہ دار ہے وہ ہم سے کبھی منہ نہ موڑے گا۔ لیکن اسکی فطرت میں آزادی کی لگن اور انقلاب کی خلش بیدار ہوئے بغیر نہ رہی اس نے بھی اپنے باپ دادا
کو اپنایا۔ وہ اہل دل تھا اسکا سینہ ایثار و قربانی سے سرشار تھا۔ اس لئے اسکے ذہن پر قوم و وطن کے اجتماعی مفاد کا
ذات اپنی بیوی و بچی اور مجھ بوڑھی ماں کی محبت سے زیادہ افضل اور موثر تھا۔

ایک روز اکبر نے کہا اماں۔ سامراجی ملوکیت نے ہماری آزادی و خود مختاری کو چھین لیا۔ ہمارے نوابوں۔ رجواڑوں اور ان کے شہ
کو تہہ تیغ کر دیا۔ میرے باپ اور دادا جان جو کہوں کے باوجود ان سامراجی درندوں کے مقابلہ کو نکلے اور انجام کار تختہ دار پر لٹکا دئیے گئے۔ ابا
چشم بینا کو نوہے کی تپتی ہوئی سلاخوں سے بھون دیا گیا اور ابدی نیند سلا دیا گیا۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس غدار کتے کرتک چودھری کی اتنی بڑی
اور اسکے دادا کو مردھن کی ملک سے غداری اور ان سامراجیوں سے دوستی و وفاداری کا معاوضہ ہے۔

اکبر نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ اماں آپ جانتی ہیں دادا جان نے جس پھول کی تصویر کھینچی تھی اسکا کیا مطلب ہے۔ یہ پھول
کی آزادی کا نشان تھا اور اسکا پیغام تھا۔ "انقلاب زندہ باد" اور سامراج مردہ باد" اس پھول کا نعرہ ہے۔

انہوں نے کنول جیسے برتن کیطرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اکبر نے دادی کے فال نکالنے والے کڑھاؤ اور موت و زیست کے چ
کو باہر پھینکدیا۔ اور یہ نما برتن لا کر رکھا۔ اسنے دادی کی فال کے نیک شگون اور دادا جان کی یادگار وصیت کے نشان آزادی کو باہم مربوط کیا

میں نے دادی کے کڑھاؤ کی جگہ دادا کے نقش نما برتن تیار کر دیا اس میں پاک پانی کی آزاد موجوں کو بھر دیا۔ اس پانی سے دیا لب کنول نما گلدان میں قوم و ملک کی آزادی کا دیپ جلا دیا۔ اور بولا اماں جس طرح قطرہ کے وجود سے سمندر کا وجود زیادہ پائدار مفید اور فیضان عام رکھتا ہے۔ اسی طرح کسی ذات حیات مستعار سے آزادی کا وجود زیادہ پائدار زیادہ مفید اور فیضان عام بن سکتا ہے۔ اب میں تو ان لاکھوں مغموم زندگیوں کی خدمت اپنا فرض سمجھتا ہوں اور اس کے لئے قربانی دیتا رہونگا اور آپ آزادی کی فال نکالتی اور میرے حق میں دعا کرتی رہیں۔

دادی نے سامنے رکھی ہوئی تسبیح اٹھا لی اور لمحہ بھر کیلئے ان کی متحیر نظر کسی بھولی ہوئی چیز کی یاد میں محو ہو گئی۔ بعد میں دونوں ہاتھوں میں تسبیح کو بھینچتے ہوئے فرمایا۔ آج سے ۲۰ سال پہلے اکبر کو حبس دوام کی سزا ہو گئی۔

ظہور نظر

پت جھڑ

پھر پت جھڑ کی رُت آئی ہے
پھر ہنستے پھولوں کی آنکھیں بھرنے لگی ہیں
نیم برہنہ شاخوں کی باہوں میں سمٹ کر
سرد ہوائیں سائیں سائیں کرنے لگی ہیں
نازک نازک،
رنگ برنگی،
تیتریاں گرتے پتوں کی آوازوں سے ڈرنے لگی ہیں
تڑپ تڑپ کر مرنے لگی ہیں
ان دیکھی انجانی تنہائی کی گھڑیاں
دھیان کی اترائی سے دل میں اُترنے لگی ہیں

شاموں پر
آسیبی سناٹوں کے سائے چھانے لگے ہیں
راتیں
گہرے، گھنے اندھیرے کا احساس دلانے لگی ہیں
صبحیں
دن بھر افسردہ رہنے کے سندیسے لانے لگی ہیں

گئے دنوں کے ویرانوں سے
خوشیوں کے قبرستانوں سے
مُردہ روحوں کے رونے کی
پُراسرار اُداس صدائیں آنے لگی ہیں

جانے والے موسمِ گل کے سپنو آؤ!
آؤ، مجھے میرے احساس کی شدت کے پنجے سے چھڑاؤ!!

باقر مہدی

جب کبھی

ہم نے غیروں سے محبت میں نبھانا چاہا
ہر نئے زخم کو سینے میں چھپانا چاہا
مصلحت کہتی رہی، خوف ہے رسوائی کا
کچھ بھی ہو ہم نے تو الزام اُٹھانا چاہا
حادثہ کوئی ہوا، یاد تری آہی گئی
جب کبھی ہم نے تجھے دل سے بھلانا چاہا
ہائے وہ بات جو رہ رہ کے الجھتی ہی گئی
اُف وہ لمحے کہ تجھے جب بھی منانا چاہا
روک لیتا تھا کوئی، پاؤں میں زنجیر نہ تھی
جب کبھی ہم نے تری بزم سے جانا چاہا
کون بتلائے یہ گلشن میں کہ ہم لوگوں نے
ہر نئے دَور کو نغموں سے سجانا چاہا
جب کبھی موسمِ گل رقص کناں آیا ہے
ہم کو تاریخ نے مجبور و حزیں پایا ہے

محبوب خزاں

قطعات

ہجر پر شعر لکھیں وصل کے خواب آئندہ
یعنی اس وقت خمار اور شراب آئندہ
بھولے بھالے ہیں بہت حضرتِ محبوب خزاںؔ
جاں فروش آج ابھی۔ اور حساب آئندہ

نہ الجھو مرے اجنبی، اس طرح
بدلتی نہیں زندگی، اس طرح
دو عالم سے بہلا تیے دل خزاںؔ
محبت نہیں مانتی، اس طرح

ہجرت ہے شہر شہر وطن کی تلاش میں
بادِ صبا چلی ہے، چمن کی تلاش میں
اپنی تلاش کون کرے، دور کون جائے
اہلِ سخن ہیں اہلِ سخن کی تلاش میں

اعجاز الحق اعجاز

فریب

حُسنِ دلسوز تھا رقصاں بہ ہمہ رعنائی
دل میں احساسِ تمنّا نے جو لی انگڑائی
عشق کی خوابگیں آنکھوں میں چمک سی آئی
دلِ بیتاب نے اِک تازہ خلش پائی تھی

دلِ پُر درد کے ویران شبستانوں میں
جگرِ سوختہ کے آتشیں ایوانوں میں
مرے احساس و تصوّر کے صنم خانوں میں
زندگی رقص کناں میرے قریب آئی تھی

تیرگی میں کہیں آئی تھی نظر ایک کرن
گلشنِ زیست پہ وہ حسن و جوانی کی پھبن
رنگ و رعنائی میں ڈوبی ہوئی فطرت کی دُلہن
اپنی آنکھوں میں کوئی خواب بسا لائی تھی

آہ لیکن وہ مرے خواب و تصور کا جہاں
کھو گیا جانے خمِ گیسوئے ہستی میں کہاں
اب تو ویرانیٔ دل پر کبھی ہوتا ہے گماں
بزمِ انجم بھی فریبِ شبِ تنہائی تھی

جانے کیا ہو گئے میرے وہ خیالوں کے محل
گرمیٔ یاس سے مرجھا سا گیا دل کا کنول
شدتِ غم میں نہ اب اے دلِ بیتاب مچل

ضمیر الدین احمد

....جا کر نظر کہاں!

رسوا کے منہ سے فہمیدہ کا نام سن کر میری یادوں کے نہاں خانے میں ایک کھلبلی سی مچ گئی اور اپنے چہروں پر سے گرد جھاڑتی ہوئی کئی یادیں سر اٹھا کر میرے ذہن کے سامنے آن کھڑی ہوئیں۔

ان میں سے ایک بیس سال پرانی تھی۔

کھانے کے بعد فہمیدہ کی کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں رقص کا دور شروع ہو چکا تھا۔ آتشدان میں کوئلے چٹک رہے تھے۔ تیز روشنی والے بلب بجھائے جا چکے تھے۔ نیلے اور ہرے بلبوں کی روشنی میں جوڑے تیرتے پھر رہے تھے۔ دھویں، سانسوں اور جسموں کی لو سے بوجھل فضا ریڈیوگرام کی موسیقی کو اپنے سینے میں جذب کر رہی تھی۔ جسموں کے خطوط لہرا رہے تھے۔ اور لہرا لہرا کر نظروں کو دعوت تعاقب دے رہے تھے۔ ریشمی کپڑوں کی سرسراہٹ لکڑی کے فرش پر چھکتے ہوئے جوتوں کی کسکساہٹ۔ اور ایک دوسرے سے لگے ہوئے اجسام کی گنگناہٹ ذہنوں کے آئینے میں جھلک رہی تھی کہ میں اچانک ڈرائنگ روم میں سے نکل کر باغ میں آ گیا۔ باغ میں چاندنی کا کفن پڑا ہوا تھا۔ اور سسکتی ہوئی ٹھنڈی ہوا میں شبنم کے آنسوؤں کی نمی تھی۔

جس وقت میں ڈرائنگ روم سے نکلا تھا اس وقت فہمیدہ فراز کے ساتھ ڈانس کر رہی تھی۔ یہ اس رات کا پانچواں ڈانس تھا مگر ان پانچ ڈانسوں میں سے فہمیدہ نے میرے ساتھ ایک ڈانس بھی نہیں کیا تھا حالانکہ پانچویں ڈانس کے علاوہ میں نے اس سے ہر ڈانس کی درخواست کی تھی۔ لیکن اس نے ہر دفعہ مجھے کسی نہ کسی بہانے ٹال دیا تھا اور ہر دفعہ فراز کو مجھ پر ترجیح دی تھی۔

"تمہارے ساتھ تو روز کرتی ہوں۔ ڈارلنگ!"

اس کی آواز ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اور میرے کان ابھی تک ان آوازوں پر لگے ہوئے تھے جو ڈرائنگ روم سے بھاگ کر میری سمت آ رہی تھیں اور مجھ کو چلا چلا کر کہہ رہی تھیں کہ محفل ابھی گرم ہے۔ رقص کا دور چل رہا ہے۔ اور فہمیدہ کی کمر کے گرد اپنا ہاتھ ڈالے فراز ابھی تک اس کے ساتھ ڈانس کر رہا ہے۔ فراز جو سٹی مجسٹریٹ ہو کر یہاں آیا ہے۔ جو اپنے کو بڑا حسین تصور کرتا ہے۔ جسے اپنے لندن کے سلے ہوئے سوٹوں پر بڑا ناز ہے۔

کئی شامیں اور کئی راتوں کے ابتدائی دور ہم نے۔ میں نے اور فہمیدہ نے ___ اس باغ میں اکٹھے گزارے تھے۔ بے معنی باتیں کر کے۔ بلا وجہ ہنس کے۔ ٹہل ٹہل کے۔ رات کی رانی کے ایک گھنے کنج میں سنگ مرمر کی بنچ پر بیٹھ کے۔ ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں سن کے۔ مگر آج رات میں اس باغ میں اکیلا تھا۔ اور چالیس منٹ سے فہمیدہ کا انتظار کر رہا تھا جس نے مجھے ڈرائنگ روم سے نکلتے دیکھ لیا تھا۔

میرے ذہن پر ایک قسم کا کہر سا چھا گیا تھا۔ میرے دماغ میں کچھ خدشات۔ کچھ وسوسے۔ کچھ شبہات کھسر پھسر کر رہے تھے۔ حالانکہ میرا دل بار بار کہہ رہا تھا کہ فہمیدہ ایسی لڑکی نہیں۔ تم اسے غلط سمجھ رہے ہو۔ تمہاری محبت تمہیں حاسد بنا رہی ہے۔ یہ تمہارا واہمہ ہے کہ وہ بدل گئی ہے

اور اب تمہاری طرف اس کا وہ پہلا سا التفات نہیں۔ وہ بدلی نہیں۔ وہ بدل نہیں سکتی۔ مگر میرا تصور مجھے عجیب عجیب مناظر دکھا رہا تھا۔ امنگوں اور ارمانوں کی تصویروں کے رنگ اڑ رہے تھے۔ جذبات نے جو راگ چھیڑے تھے وہ بے سرے ہوئے جا رہے تھے اور خواہشات نے جو محفل سجائی تھی وہ اجڑ رہی تھی۔

جب فراز کو اکیلا چھوڑ کر فہمیدہ باغ میں آئی تو نہ جانے کتنے جگ بیت چکے تھے۔

"کیا بات ہے؟" اس نے کنج میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

اور بجھتے ہوئے چراغ کی لو ایک بار پھر تیز ہو گئی۔ میں نے اس کی کھنکتی ہوئی آواز میں وہی اپنائیت ۔ وہی خلوص اور وہی نرمی محسوس کی جو میں سمجھتا تھا میرے لئے وقف ہے۔ ایک ... خیال آیا کہ اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دوں۔ تاکہ وہ میرے وسوسوں۔ میرے خدشات اور میرے شبہات کو پڑھ لے اور مجھ سے کہے کہ یہ سب تمہارا وہم ہے۔ میں تمہاری ہوں اور تمہاری رہوں گی۔ مگر میں ابھی تک ڈوبا نہیں تھا اور فہمیدہ کا جو سوال تنکا بن کر لہروں کے سر پر سوار میری طرف ناچتا ہوا آیا تھا میں نے فوراً اس کا سہارا لے لیا۔

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے ابھرتے ہوئے کہا۔

"کمرے میں بڑی گھٹن تھی۔ اس لئے یہاں چلا آیا۔ اپنے کنج میں۔"

وہ بنچ پر میرے پاس بیٹھتے ہوئے ہنسی اور ہر طرف چاندنی برسنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں کئی چاند جگ مگ کرنے لگے۔ اس کے چکنے۔ دمکتے رخساروں پر پھول کھل گئے۔ اور اس کے پتلے پتلے۔ رسیلے ہونٹوں پر رعنائی کی ایک دنیا بس گئی۔

" ناراض ہو گئے؟" اس نے مجھے شرارت سے لبریز مسکراتی ہوئی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

جواب میں میں ہنسا۔ ایک کھوکھلی ہنسی۔" یہ تاب۔ یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے۔"

"یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔" اس نے محض سلسلۂ کلام جاری رکھنے کے لئے کہا۔

کیا تو وہی خلوص سراپا ہے آج بھی؟ میرے ذہن نے فہمیدہ سے پوچھا مگر میرے نطق کو مصرع اٹھانے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس لئے میں نے موضوع بدل دیا۔

"کتنی حسین رات ہے!"

"اور کتنی اداس!" اس نے آسمان۔ چاند۔ اور ستاروں کے بجائے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور تمہارے قرب نے اس رات کے حسن کو دو بالا کر دیا ہے!"

"ہاں! میرا قرب بھی اس رات کی اداسی کو گھٹا نہیں پایا۔"

میں نے فہمیدہ کی کمر کے گرد ہاتھ ڈالتے ہوئے اقرار کر لیا۔" تم ٹھیک کہتی ہو۔ یہ رات بہت اداس ہے۔ اس لئے کہ میں اداس ہوں۔"

"کیوں؟"

"کیوں۔۔۔" میں لمحے بھر سچ اور جھوٹ کے درمیان معلق رہا۔ مگر فیصلہ سچ کے حق میں ہوا۔ "کیونکہ تم بدل گئی ہو۔"

" وہ کیسے؟"

ایک دم اتنے بہت سے شکوؤں اور اتنی بہت سی شکایتوں نے میرے ذہن پر ہلہ بول دیا کہ میں چپ ہو گیا۔

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔" وہ کھسک کر میرے اتنے قریب آ گئی کہ اس کے بدن کی گرمی ایک برقی رو کی مانند میرے سارے بدن میں دوڑ گئی اور میرا جی چاہا کہ اسے اپنے سینے سے لگا کر بے بسی کے آنسو بہانے لگوں۔

ہم تم کہاں

" فہمیدہ! مجھ پر تمہارا اب وہ اگلا سا التفات نہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے تم مجھ سے دور ہوتی جا رہی ہو۔ جیسے میں تمہاری نظروں سے گر گیا ہوں۔ جیسے تمہارے دل میں میری جگہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

" تم جذباتی ہوتے جا رہے ہو۔" اس نے انتہائی بے دردی سے میری بات کاٹ دی۔ مگر اس کا گرم جسم ابھی تک میرے جسم کے قریب تھا

" تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں جذباتی ہوا جا رہا ہوں۔ مگر محبت جذبات کا نام نہیں تو پھر کس چیز کا نام ہے۔"

" محبت!" اس نے ایسے کہا گویا اس کے کان اسے دھوکہ دے رہے تھے۔

" ہاں! محبت!"

" تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تمہیں محبت ہو گئی ہے۔"

پتہ نہیں کسے تعجب زیادہ تھا۔ اسے یا مجھے۔ پتہ نہیں کس کا تعجب اصلی تھا اور کس کا بناوٹی۔ میرا یا اس کا۔

" یہ میری بد قسمتی ہے کہ تمہیں آج تک میرے جذبات کا صحیح علم نہیں ہوا۔ حالانکہ میں سمجھتا۔ ہا کہ ہم اتنے قریب آ چکے ہیں کہ اب جذبات کو الفاظ کے سہارے کی ضرورت نہیں۔"

اس نے " میری بد قسمتی " پر اظہار خیال کئے بغیر کہا۔ " ذرا سی دیر میں تم یہ کہو گے کہ میں تمہیں اپنا شریک حیات بنا لوں۔"

" نہیں فہمیدہ! میں تھوڑی دیر پہلے ایسی درخواست کر سکتا تھا۔ بلکہ کرنے والا تھا۔ مگر اب یہ جرات نہیں کروں گا۔"

میرا جواب سن کر وہ ہنسی۔ پھر اس نے اپنی کمر کو میرے ہاتھ کے حلقوں سے نکالا۔ اور کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

" چلو اندر چلیں۔ فراز صاحب میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

اور ان میں سے ایک یاد دس بارہ سال پرانی تھی ———

جوہو کا ساحل قریب قریب سنسان پڑا تھا۔ ایک جوڑا ایک سن شیڈ کے نیچے لیٹا ہوا تھا۔ دور ایک کشتی کا بادبان نظر آ رہا تھا۔ کچھ لوگ نہا رہے تھے۔ کچھ تیر رہے تھے۔ اور ہم۔ میں اور پٹیل۔ ناریل کے ایک جھنڈ کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے جو ساحل سے بمشکل دو سو گز کے فاصلے پر تھا۔

میں ان دنوں کاروبار کے سلسلے میں بمبئی آیا ہوا تھا اور پٹیل کے ساتھ شبیر اے صاحب سے میرے کاروباری تعلقات تھے۔ مجھے بمبئی آئے ہوئے آٹھ دس روز ہو چکے تھے۔ میرا کام ختم ہو چکا تھا۔ اور دو ایک روز میں کراچی واپس جانے والا تھا۔ پٹیل نے طے کیا تھا کہ یہ دو ایک دن سیر و تفریح میں گزارے جائیں گے۔ اور اسی سلسلہ میں اس وقت میں اور پٹیل جوہو کے ساحل پر موجود تھے۔

تھوڑی دیر ناریل کے جھنڈ کے نیچے سے ساحل اور سمندر کا نظارہ کرنے کے بعد ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور ساحل کے کنارے ٹہلنے لگے۔ آہستہ آہستہ ہمارے قدم ہم کو ساحل کے اس حصے کی طرف لے گئے۔ جہاں بالکل سناٹا تھا اور جہاں چھوٹے بڑے بنگلوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

اچانک سمندر کی سمت سے قہقہوں کی آواز آئی۔ ہمارے قدم خود بخود رک گئے اور ہم نے سمندر کی طرف دیکھا کوئی دو سو گز کے فاصلے پر ایک مرد اور ایک عورت ہنسی کے فوارے چھوڑ چھوڑ کر ایک دوسرے پر پانی کے چھینٹے مار رہے تھے۔ مرد ایک لال جانگیا پہنے ہوئے تھا اور عورت کا سڈول بدن ایک ہلکے نیلے رنگ کے بیدنگ کاسٹیوم میں ملبوس تھا۔ اس کے شانوں اور اس کی رانوں کے بالائی حصے سورج کی تیز روشنی میں چمک رہے تھے۔ اچانک مرد عورت کی طرف جھپٹا۔ عورت نے غوطہ لگایا اور ہماری نظروں سے غائب ہو گئی۔ اور ہم لوگ ٹہلتے ہوئے آگے نکل گئے۔

کوئی چالیس منٹ بعد جب ہم اس مقام سے گزر رہے تھے جہاں رک کر ہم نے اس مرد اور اس عورت کے قہقہوں کی آواز سنی تھی۔ تو پھر وہی آواز ہمیں سنائی دی۔ آواز اس بار قریب سے آ رہی تھی۔ اس دفعہ ہم رکے نہیں مگر ہم نے اس سمت ضرور دیکھا جدھر سے آواز آ رہی تھی۔ وہ مرد اور عورت ساحل کی طرف واپس آ رہے تھے اور ہمارے اتنے قریب تھے کہ ہم ان کے چہروں کے خطوط کو پڑھ سکتے تھے۔

اور جب میں نے ان خطوط کو۔۔۔ بلکہ اس عورت کے چہرے کے خطوط کو پڑھ لیا تو میرے قدم خود بخود رک گئے۔ ایک لمحے کے لئے میں نے انجان بن کر آگے نکل جاؤں۔ مگر میرے پیروں نے گویا جنبش کرنے سے انکار کر دیا۔

"کراری چھوکری ہے"، پٹیل نے گویا میرے رک جانے کی توجیہہ کی۔

اس کی توجیہہ غلط تھی۔ مگر قبل اس کے کہ میں اس کی بات کا جواب دوں وہ جوڑا ہمارے اتنے قریب آچکا تھا۔ کہ ہمارے درمیان چار پانچ گز کا فیصلہ رہ گیا تھا۔ عورت نے ہماری طرف اس طرح دیکھا گویا اسے پہلی بار ہماری موجودگی کا احساس ہوا ہے۔

"ارے تم!"

میرا خیال غلط نکلا۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ مجھے پہچاننے سے انکار کر دیگی یا اگر اس کی آنکھیں اسکے انکار کو جھٹلا دیں گی تو وہ بغیر رکے۔ بغیر کچھ کہے چلی جائے گی۔

"اتفاقات میں زمانے کے!" میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

وہ ہنسنے لگی۔ "ہاں بھئی! یہ تو بہت بڑا اتفاق ہے۔ اتنے عرصہ بعد اور اچانک اس طرح۔ اس جگہ۔"

پٹیل دزدیدہ نظروں سے اس کی چکنی بھری بھری رانوں کو دیکھ رہا تھا جو بیدنگ کا سٹیوم کے نچلے حصے میں پھنسی ہوئی تھیں۔ نظریں بھی اس کے جسم کے اس حصے کی طرف بھٹک رہی تھیں جسے میں نے آج تک عریاں نہیں دیکھا تھا۔ مگر اس کے چہرے پر ہماری ان نظروں کے احساس کی کوئی جھلک بھی نہیں تھی۔ یا تو اسے ہماری چوری کا علم نہیں ہوا تھا۔ اور اگر ہوا تھا تو اسے اس کی پرواہ نہیں تھی۔

اس نے بالوں کو ایک جھٹکا دیکر کہا۔ "ان سے ملو۔ یہ ہیں مسٹر حسین بھائی۔ امام حسین بھائی۔ کاٹن کنگ۔"

جب اس نے تعارف شروع کیا تھا تو میں نے سوچا تھا کہ وہ کہہ گی کہ یہ ہیں میرے۔۔۔۔ "مگر میرا خیال پھر غلط نکلا۔

میں نے مسٹر حسین بھائی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا کہ مجھے ان سے مل کر واقعی بہت خوشی ہوئی ہے۔ انھوں نے میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ کی گرفت میں لیتے ہوئے انگریزی میں وہی بات کہی جو میں اردو میں کہہ چکا تھا۔ پھر میں نے انھیں اپنا نام بتایا۔ اور حسین بھائی نے ایک بار پھر میرے ہاتھ کو ہلایا۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم بھی بمبئی میں رہتے ہو۔" اس نے پٹیل کی طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے کہا۔

میں نے پٹیل کا تعارف کرانے کے بعد کہا کہ میں بمبئی میں نہیں۔ کراچی میں رہتا ہوں اور یہاں محض کاروبار کے سلسلے میں آیا ہوں۔" لیکن تم بمبئی میں کیا کر رہی ہو؟"

"ڈیڈی نے یہاں بزنس شروع کر دیا ہے۔ بس اسی سلسلے میں۔"

حسین بھائی نے اچانک کہا۔" آپ لوگ یہاں کب تک کھڑے رہیں گے۔ آیئے گھر چلیں۔ وہاں آرام سے باتیں کریں گے۔"

میں نے دیکھا کہ پٹیل تیار ہے مگر میں حسین بھائی کی دعوت سے پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا کہ اگر دعوت دی گئی تو میرا جواب کیا ہوگا۔

"بہت بہت شکریہ۔ ہم ضرور چلتے آپ کے ساتھ۔ مگر ہمیں اس وقت ایک بہت ضروری کام ہے۔"

"دور نہیں جانا ہے۔" حسین بھائی نے ایک بہت بڑے سے بنگلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔" یہ رہی میری کاٹیج۔"

بات یہ ہے کہ ساڑھے بارہ بجے میرا ایک اپوائنٹمنٹ ہے۔" میں نے گھڑی دیکھی" بارہ بج رہے ہیں۔ شہر پہنچتے پہنچتے آدھ گھنٹہ تو لگ ہی جائیگا۔"

وہ بولی۔ "مجبوری ہے!"

میں نے کہا۔ "جی۔"

دو ایک باتیں اور ہوئیں۔ پھر ہم نے اجازت چاہی اور وہ اس بڑے سے بنگلے کی طرف چل دیئے۔ اور ہم پٹیل کی موٹر کی طرف۔

موٹر میں بیٹھ کر میں نے کہا۔ "اس سے ایک بہت ضروری بات پوچھنا بھول گیا۔"

"کیا؟" پٹیل نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

"فراز آج کل کہاں ہے؟"

اور پٹیل حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا گویا میں نے بہت ہی مہمل بات کہدی ہو۔

×

اور آج اتنے عرصہ بعد میں رسوا کے منہ سے فہمیدہ کا نام سن رہا ہوں۔

رسوا میرا دوست ہے۔ نہایت خوبصورت اور وجیہ۔ نشیلی کھنچی ہوئی آنکھیں لمبے بال۔ صاف رنگت۔ چہرہ ایسا کہ ہر وقت مسکراتا ہوتا ہے۔ وہ ایک ادبی رسالہ کا ایڈیٹر ہے۔ اس کی عمر کوئی تیس بتیس برس ہوگی۔

اس سے سات آٹھ سال بعد ملاقات ہوئی ہے۔ میں اپنے علیل باپ سے ملنے ہندوستان آیا ہوں۔ اور ان کے پاس دس دن رہ کر پاکستان واپس ں۔ راستے میں رسوا سے ملنے کے لئے دہلی میں صرف چوبیس گھنٹے کے لئے رک گیا ہوں۔ شام کا وقت ہے۔ رسوا مصر ہے کہ اتنے دنوں کے ی خوشی میں ایک جشن ہو جائے۔ یعنی دور چلے۔ مگر دقت یہ آن پڑی ہے کہ اس کے پاس اس وقت اتنے پیسے نہیں کہ ایک اسکاچ کی بوتل کا انتظام ہ۔" بہ الفاظ دیگر۔ باوجود ایک ادبی رسالے کا ایڈیٹر ہونے کے اس کے پاس کبھی کبھی اتنے فاضل پیسے نہیں ہوتے کہ وہ ایک اسکاچ کی بوتل کا سکے جس کے دام ان دنوں ساٹھ روپے ہیں۔ اس سے بڑی دقت یہ آن پڑی ہے کہ میری جیب میں اس وقت صرف دس روپے ہیں زر مبادلہ حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ دوڑ دھوپ کر کے جو کچھ تھوڑا بہت حاصل کیا تھا وہ سفر میں خرچ ہو گیا۔ اگر "جشن" کا خیال باوجود کماؤ پوت ہونے کے چلتے وقت والد صاحب سے کچھ رقم ادھار لے لیتا۔ مگر اس وقت تو میری جیب میں صرف دس روپے ہیں اور جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ اور پھر بھی رسوا مصر ہے کہ "جشن" ضرور منایا جائے۔ کیسے؟ قرض لے کر؟ میں نہیں چاہتا کہ میرا ادیب ت میری خاطر قرض لے۔ گو میں یہ جانتا ہوں کہ میری آمد محض ایک بہانہ ہے ورنہ شراب پینے کو اس کا جی کب نہیں چاہتا۔ اگر دہلی میں میرا کوئی اور ت یا ملاقاتی ہوتا تو میں بلا جھجک اس سے رسوا کی خاطر قرض لے لیتا۔ مگر اس شہر میں رسوا کے علاوہ میرا کوئی اور دوست یا ملاقاتی نہیں۔ تو پھر جائے؟ ۔ کیا کیا جائے؟

رسوا سوچ رہا ہے۔ سوچ رہا ہے۔ اور بہت دیر سوچنے کے بعد کہتا ہے۔ "ایک ترکیب ہو سکتی ہے۔"

میری خاموشی پوچھتی ہے۔ کیا؟

"ایک صاحبہ ہیں۔ بڑی ادب دوست۔ اور مجھ پر خاص طور سے مہربان۔ ان سے کام نکل سکتا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے تم قرض لو گے۔"

"یہی تو دقت ہے کہ وہ قرض نہیں دیتیں۔ میرا مطلب ہے اگر میں مانگوں گا تو فوراً ساٹھ روپے دیدیں گی لیکن واپس ہرگز نہیں لیں گی۔"

"بہت خوب۔ اس سے بہتر انتظام کیا ہو سکتا ہے۔"

"نہیں یار۔ تو نہیں جانتا۔ اس قسم کی عنایت بھی بار گزرتی ہے۔"

"سو تو ہے۔ مگر وہ تو ادب کی خدمت کے سلسلے میں کرتی ہیں یہ عنایت۔ اور تم ٹھیرے ادیب۔ لہٰذا تم اس عنایت کے مستحق ہو۔"

"بات دراصل یہ ہے کہ ان کے مجھ پر بہت احسان ہیں۔ اور احسان اٹھانے کو اب جی نہیں چاہتا۔"

"سوچ لو۔ میں یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ تم میری خاطر۔ ۔ ۔ ۔"

رسوا ناراض ہو جاتا ہے۔ "کیسی باتیں کرتا ہے یار۔ تو اور میں کیا غیر ہیں۔"

پھر وہ جاکر آئینے کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور بال سنوارنے لگتا ہے۔ اور بال سنوار کر مجھے اپنا فیصلہ سناتا ہے۔ "اچھا میں چلا۔ قسمت نے یاوری کی تو آدھ گھنٹے بعد بوتل تیرے سامنے ہوگی۔"

میں نعرہ لگاتا ہوں "ہمارا ادیب زندہ باد" اور وہ مسکراتا ہوا کمرے سے باہر چلا جاتا ہے۔

قسمت یاوری کرتی ہے اور آدھ گھنٹے بعد رسوا اخباری کاغذ میں لپٹی ہوئی "کوئین اینی" کی ایک بوتل بغل میں دبائے واپس آتا ہے۔ گلاس نکالے جاتے ہیں۔ سوڈے کی بوتلیں منگوائی جاتی ہیں۔ کاگ اڑتے ہیں۔ قلقلِ مینا سنائی دیتی ہے۔ اور میں گلاس اٹھا کر کہتا ہوں کہ آؤ اس ادب دوست خاتون کا جامِ صحت پئیں جس کی عنایت سے یہ جشن ممکن ہو سکا۔

رسوا کہتا ہے۔ "چلو۔ یونہی سہی۔"

"مگر اس کے لئے تو ضروری ہے کہ اس خاتون کا نام بتایا جائے۔"

رسوا کہتا ہے۔ "فہمیدہ اختر" اور میں ہڑبڑا کر بغیر ٹوسٹ کئے ہوئے فہمیدہ کا جامِ صحت پی جاتا ہوں اور مجھے احساس ہوتا ہے کہ وہ کی ایک خاصیت کڑواہٹ بھی ہے۔

رسوا کہتا ہے۔ "عجیب مسخرے ہو۔ خود ہی تجویز کی اور خود ہی بغیر ٹوسٹ کئے انڈیلنے لگے۔" پھر وہ نہ جانے کیوں مسکراتا ہے اور کہتا ہے " یونہی سہی۔"

میں بھی کہتا ہوں۔ "چلو یونہی سہی۔"

اور جب بوتل نصف کے قریب ختم ہو چکی ہوتی ہے تو میں رسوا سے پوچھتا ہوں: "ہیں کون یہ فہمیدہ اختر؟"

وہ جواب دیتا ہے۔ "آگرے کے خان بہادر اختر حسین کی صاحبزادی ہیں۔ چار پانچ سال ہوئے ان کے انتقال کو۔ آخری عمر میں بمبئی بزنس شروع کی تھی۔"

"شادی شدہ ہیں؟"

"نہیں۔"

"یہاں کیا کرتی ہیں؟"

"کچھ بھی نہیں۔ خان بہادر ان کے لئے کافی جائداد چھوڑ گئے ہیں جس سے اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی ہے۔"

بوتل اب تین چوتھائی سے زیادہ ختم ہو چکی ہے۔ کمرے میں سگرٹوں کا دھواں بھرا ہوا ہے۔ ہم دونوں چپ ہیں۔ میں بھی کچھ سوچ رہا اور میرا دوست رسوا بھی کچھ سوچ رہا ہے۔ یکایک رسوا کے خیال بولنے لگتے ہیں۔

"تمہیں ایک بات بتاؤں!"

میرے خیالات چپ رہتے ہیں اور میں صرف "ہوں" کہتا ہوں۔

"یہ فہمیدہ بیگم جو ہیں یہ مجھ پر عنایات کی بارش اس لئے نہیں کرتیں کہ انھیں ادب سے لگاؤ ہے۔ بلکہ اس لئے کہ انھیں مجھ سے لگاؤ ہے

میں کہتا ہوں۔ "یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔"

"اور اگر میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ مجھے ان عنایات کی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے تو کیا تب بھی تم اسے اچھی بات کہو گے؟"

"کیسی قیمت؟"

"مثلاً آدھی بوتل کی قیمت بوس و کنار۔"

"اور پوری کی؟"

"اس سے ایک قدم آگے۔"

ان دااموں خریدی ہوئی وہسکی کا گھونٹ میرے گلے میں پھنسنے لگتا ہے۔ مگر میں پھر بھی کہتا ہوں۔ "تم اسے قیمت کہتے ہو۔ یہ تو دوہنا التفات ہوا۔"

"مگر جب ڈھلتی ہوئی عمر کی عورت ایسے التفات کرے تو اسے قیمت ادا کرنا کہتے ہیں۔ اور میں اس التفات سے اب تنگ آگیا ہوں۔ اسی لئے ان دنوں میں نے اپنے محسن سے قطع تعلق کر لیا ہے۔ آج تو تمہاری خاطر۔۔۔۔"

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر اچانک کھڑا ہو جاتا ہے۔

"تم تھوڑی دیر میرا انتظار کرو۔ میں ابھی آیا۔"

میری آنکھیں پوچھتی ہیں۔ کہاں چلے؟

اور رستوار کہتا ہے۔ "پوری بوتل کی قیمت ادا کرنے۔ وعدہ کر کے آیا تھا۔"

——— * ———

ر کاشمیری

★

خودکشی

اس دن کے ذلت آمیز واقعے کے بعد اس نے پورا یقین کر لیا کہ آج کا دن اس کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔ اس نے ایک بار پھر جھجک حسرت کو دل سے کہہ کر باہر نکال پھینکا اور موت کے بھیانک بھوت کو گلے لگانے کیلئے آمادہ ہوگیا۔ اور اسی ارادے کے ساتھ وہ ریلوے لائن کے ایک تنہا علاقے میں پہونچ گیا اور پٹری کے قریب بیٹھ کر کسی ریل گاڑی کی آمد انتہائی بے دلی سے انتظار کرنے لگا۔ یہاں اُسے پروفیسر کی مداخلت کا کوئی خطرہ نہیں تھا جس سے وہ مطمئن بھی تھا اور خوفزدہ بھی۔ اس سے پیشتر بھی اس نے خودکشی کے بارے میں کئی مرتبہ سنجیدگی سے سوچا اور دو مرتبہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے کودنے کی کوشش بھی کی تاکہ مرنے کے ارادے کو عملی جامہ پہنا سکے۔ لیکن دونوں مرتبہ اس کے دوست اور محسن پروفیسر نے مداخلت کر کے اسے ناکام بنا دیا۔ اور صرف ناکام ہی نہیں بنایا بلکہ اپنی موثر تقریروں سے کسی حد تک جینے کی تمنا بھی پیدا کر دی۔ وہ ایک ہی سانس میں اُسے سقراط بقراط ارسطو و افلاطون کا سارا فلسفہ سنا دیتا۔ کارل مارکس کا نظریہ حیات بتاتا۔ تاریخی ہیروؤں کے کردار پیش کرتا اور جب کبھی کوئی پیش نہ چلتی تو اپنی ہی زندگی کا کوئی دردناک واقعہ سنا دیتا اور اس طرح پروفیسر نے جو کئی سال سے ایک ہی کمرے میں اس کے ساتھ رہ رہا تھا ایک ایک کر کے اپنی زندگی کے کتنے ہی دردناک واقعات اُسے سنا دئے تھے جس سے اسکو اندازہ ہوگیا تھا کہ پروفیسر کی زندگی اس سے بھی زیادہ دکھی اور مجروح ہے۔ مگر وہ خودکشی کے بارے میں کبھی نہیں سوچتا اور زندگی کے بارے میں دن رات سوچتا ہے۔ اور پروفیسر کے اسی انداز فکر نے اُسے ہر ذلت اور رسوائی کے باوجود بھی جینے پر مجبور کئے رکھا۔ اور اب جبکہ وہ خودکشی کے ارادے سے ریل کی پٹری کے پاس بیٹھا کسی ریل گاڑی کی آمد کا انتظار کر رہا ہے تو اُسے پروفیسر کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی ہے جو اس ارادے سے اُسے باز رکھے مگر وہ اس کے پاس نہیں ہے۔

پروفیسر کئی سال سے فاطمہ بلڈنگ میں اس کے ساتھ رہ رہا ہے۔ وہ اُسی کی طرح حالات کی ناسازگاری کے باعث غیر شادی شدہ ہے۔ پروفیسر نے اپنی ساری زندگی کا سرمایہ اپنی اکلوتی بہن کیلئے جمع کر رکھا تھا اپنی تمام خوشیاں اس نے بہن کی خوشی کیلئے وقف کر دی تھیں اس کے اندر مسرت حاصل کرنے کی خواہش جوانی کی منزل سے گزر کر نحیف ہو چکی تھی۔ اور اس کی تمام حسرتوں اور امنگوں پر گرد کی دبیز تہیں جم گئی تھیں۔ گرد کی ان تہوں کو اٹھا کر وہ حسرتوں اور امنگوں کو پھر سے بیدار کر لیتا مگر اُسے بہن کی مچلتی اور کدکتی ہوئی حسرتیں اور امنگیں نظر آئیں جن پر گرد کی تہہ تو کیا میل کا ذرہ تک بھی ابھی نہیں جما تھا۔ وہ بہن کی اس چمک دمک کے تحفظ کی خاطر اس کیلئے کسی بہترین محافظ کی تلاش میں مصروف ہوگیا اور پیشتر اس کے کہ پروفیسر کسی محافظ کو ڈھونڈتا وہ ایک لٹیرے سے اپنی چمک دمک لٹوا چکی تھی کوئی چور اس کی معصومیت گداز رنگ روپ اور چمک دمک کی گٹھڑی باندھ کر لے گیا اور اپنی غلاظت سے بھری گٹھڑی وہیں پھینک گیا تھا۔ اس نے اس غلاظت کو پروفیسر سے چھپانا چاہا مگر تعفن پھیلتا گیا اور پھیلتے پھیلتے جب پروفیسر تک پہنچا تو وہ گوارا نہ کر سکی اور تمام تعفن سمیٹ کر ایک کنوئیں میں کود گئی۔ جب سے پروفیسر اس شہر میں آکر اس کے ساتھ رہنے لگا ہے۔ لیکن مرنے پر زندگی کو ہر حال میں ترجیح دی۔ دونوں بیکار ہیں لیکن پروفیسر کو کاروبار کی خواہش بھی نہیں ہے۔ اور نہ ہی وہ کمرے سے باہر نکلتا ہے۔ کسی اخبار رسالے کیلئے مہینے میں ایک دو مضمون لکھ لیتا ہے اور ان کے معاوضے سے کمرے کا کرایہ وغیرہ ادا کر دیتا ہے۔ اس کا تمام دن کتابیں پڑھنے میں گزر جاتا ہے۔ اور جب کبھی ہوا کے تیز جھونکے سے دروازہ تھوڑی دیر کیلئے کھلتا ہے تو سامنے والے فلیٹ کی کھلی ہوئی کھڑکی کے پیچھے اسے کریمن کی جفاکش صحت مند اور سلیقہ شعار لڑکی آرام سے [illegible]

آجاتی ہے۔ پروفیسر اپنے مطالعے کا تسلسل توڑ کر کتاب کے اوپر سے اُسے دیکھنے لگتا ہے۔ اور اس وقت تک اُسے دیکھتا رہتا ہے جب تک ہوا کا دباؤ کم ہو کر دروازہ دوبارہ نہ بند ہو جائے۔ نامعلوم وقت کے ہاتھ منٹوں میں گھنٹے اس کمرے کی سیڑھی مشین پر جیتی امبر انڈیلی کرتی رہتی ہے۔ اسکی نگاہیں اپنے انہماک سے مشین کو بھی تکتی رہتی ہیں کہ جیسے پوری کائنات کا دار و مدار اسی ایک سوئی پر ہو جو ذرا اپنے راستے سے ہٹی تو جیسے کائنات ہی الٹ جائے گی۔ مگر جب ہوا کے کسی لطیف جھونکے سے پھر کمرے کا دروازہ تھوڑی دیر کیلئے کھل جاتا ہے تو وہ کائنات کے الٹ جانے کی پرواہ کئے بغیر اپنی نگاہ کے کچھ حصے کو ہوا کے جھونکے کے ساتھ دروازے کی جھری سے پرے پہنچا دیتی ہے۔ اور پروفیسر کے دل کے خاموش اور گہرے سمندر میں اندر ہی اندر ایک ہلچل سی مچ جاتی ہے۔ اور اس کے مطالعے کا تسلسل اپنے آپ ٹوٹ جاتا ہے دروازہ بند ہوتے ہی نامعلوم کائنات کی بقا کیلئے امبر انڈیلنے کا مشین ہی مصروف ہو جاتی ہے اور پروفیسر مطالعے میں۔

وہ کافی دیر تک سنسان پٹری کے پاس بیٹھا رہا مگر کوئی ریل گاڑی نہیں آئی اور جوں جوں وقت گذرتا گیا اُسے پروفیسر کی تقریریں یاد آتی گئیں اور اسکی قوت کمزور پڑتی گئی اُسے ڈر محسوس ہوا کہیں اسکا ارادہ تبدیل نہ ہو جائے لہذا کوشش کر کے اس نے اپنی زندگی کے تلخ ترین واقعات اور حادثات کو مجتمع کیا اور پھر آرام طلب ملازمت حاصل کرنے کی خواہش میں جو ذلت آمیز واقعہ اس کے ساتھ پیش آیا اس کے متعلق سنجیدگی سے سوچنے لگا اور وہ جیسے جیسے سوچتا گیا زندگی سے نفرت کا جذبہ شدید ہوتا گیا اور خودکشی کی طرف دھکیلنے والی قوت ارادی کو اس نے پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا۔ عین اسی وقت کچھ فاصلے سے ایک ریل گاڑی نے سیٹی بجا کر اپنی آمد کا اعلان کیا۔ یہ چونکا اور اس کی نبضوں نے تیزی سے چلنا شروع کیا اور دل کی حرکت بھی اسی رفتار سے تیز ہو گئی مگر وہ ایکدم اٹھا اور منہ آسمان کی طرف کر کے پٹری پر آڑا لیٹ گیا۔ گاڑی اگرچہ کافی دور معلوم ہوتی تھی مگر بہت تیزی سے اسکو کچلنے کیلئے اسکی طرف بڑھ رہی تھی۔ جسکی ایک ایک حرکت کو وہ نہایت شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ گاڑی بے ہنگم شور کے ساتھ سیٹیاں بجاتی قریب آ گئی اور اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور زمین کے سینے میں اُسے آتش فشاں پہاڑ پھٹتے ہوئے معلوم ہونے لگے سنسناتی ہوئی سر پر آ گئی اور عین ایک لمحہ پہلے ایک دردناک چیخ مار کر بھاگ کھڑا ہوا اور کھلے میدانوں میں پیچھے دیکھے بغیر دہشت زدہ ہو کر سرپٹ بھاگتا رہا اور لائن سے کافی دور نکل گیا لیکن اُسے ابھی تک موت کے منہ سے بچ نکلنے کا یقین نہیں آیا تھا جیسے گاڑی موت کے پنجے بھاڑے مسلسل اس کا تعاقب کر رہی ہو اور آخر ایک جگہ وہ ٹھوکر کھا کر منہ کے بل گرا تو اُسے یقین آیا کہ وہ موت کے پنجے سے کافی دور نکل آیا ہے۔ اب اسے اپنے آپ سے ندامت ہونے لگی اور سوچنے لگا وہ دنیا کا بزدل ترین آدمی ہے۔ اور خودکشی تو ایک نہایت بہادرانہ فعل ہے جو اس کے بس کا نہیں اور جو لوگ اسے بزدلانہ فعل کہتے ہیں وہ خود بزدل ہوتے ہیں۔ غیر حساس ہوتے ہیں ان میں موت کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہوتی اور وہ پروفیسر کی طرح زندگی کی ذلتوں اور رسوائیوں کو برداشت کر لیتے ہیں اور اس کے جواز میں اپنا نظریہ حیات قائم کر لیتے ہیں جو موت سے نفرت دلاتا ہے اور زندگی کو چھوٹی غلطتوں سے محبت کرنا سکھاتا ہے ۔۔۔ وہ اسی طرح منفی اور مثبت انداز سے سوچ کر خود کو حق بجانب قرار دیتا کبھی موردِ الزام ٹھہراتا آبادی کے قریب پہنچ گیا۔ اور نقاہت کی وجہ سے اب مزید چلنے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔ قریب ہی ایک نہایت عمدہ پارک تھا جو اس گنجان آبادی کے شہر میں بھی کسی قبرستان کی طرح ویران اور سنسان تھا۔ یہ بے دھیانی میں اندر داخل ہو گیا اور ذرا تھکان دور کرنے کی خاطر ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ وہ ابھی مشکل سے بیٹھ ہی پایا تھا کہ اس نے ایک لحیم شحیم پٹھان کو اپنی بڑی سی لٹھ کے ساتھ اپنی جانب آتے دیکھا اس نے سوچا کہ شاید وہ بھی ستانے کیلئے بینچ کا رخ کر رہا ہے۔ مگر قریب آکر وہ چوکیدار نکلا۔ اس نے آتے ہی رعب دار آواز میں کہا

" او خوایدھر بیٹھنا منع ہے "

" کس کے واسطے بنا رکھا ہے پھر اگر بیٹھنا منع ہے تو " اس نے جل بھن کر جواب دیا

" اوئے تم کو کیا پوچھتا ہے۔ " چوکیدار نے لہجے میں تلخی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ " ام گدھا نہیں ہے ام بھی جانتا ہے کہ یہ بیٹھنے کا چیز ہے۔ مگر ام کچھ بات سمجھا لیتا ہے کہ کوئی اس پہ بیٹھے نہیں جاتی بات پوچھتا ہے تو اُدھر سے پوچھو جیدھر کا آرڈر ہے۔ ابھی خالی کرو ایدھر سے "

" اچھا اچھا تم جاؤ ہم تھوڑی دیر بیٹھیں گے پھر اٹھ جائیں گے " اس نے بے رخی سے چوکیدار کو جواب دیا۔ اور ٹانگیں دراز کر دیں اور ایک طویل جماہی لیتے ہوئے بینچ کے آرام سے پیچھے ٹکائی اور ذرا سکون لینے کی خاطر آنکھیں میچ لیں۔ مگر سکون شروع ہونے سے پہلے ہی چوکیدار کے فولاد کی طرح سخت ہاتھ کی انگلیوں

اس کے کان کو اپنی گرفت میں لے کر کھینچنا شروع کیا وہ درد سے چلا اٹھا اُس نے زور لگا کر چوکیدار کا ہاتھ جھٹکنا چاہا مگر اُسے کامیابی نہ ہوئی چوکیدار نہایت سخت دل سے اُسے کان سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا پارک سے باہر نکال رہا تھا اور ساتھ ہی کہتا جا رہا تھا۔

"کیا بولا ام چلے تم ادھر بیٹھے گا؟ تم ادھر بیٹھے گا تو پھر تم مونگ میں نہیں بیٹھے گا۔ ام کو ادھر چوکیدار کس لیے رکھا ہے۔ ام کو بولا نہیں کہ ام سب جانتا ہے ام گدھا نہیں ہے۔ مگر پھر اس بات کا خیال ہے کہ کوئی ادھر نہ بیٹھے نہیں۔ مگر تم ابھی آکر سے دادا گیری کرتا ہے۔" چوکیدار نے جسم سے اُسے یوں پارک سے باہر پھینکا جیسے وہ کوڑا کرکٹ ہو۔ وہ کھڑا سہلاتا ہوا اٹھا عجیب ناک طریقے سے ایک نگاہ چوکیدار کو دیکھا اور پھر کنارے کنارے چل پڑا۔ تھوڑی دور جا کر وہ چوکیدار والے واقعے کو قطعی بھول گیا اس قسم کی رسوائیاں تو اسے ہزار مرتبہ پیش آ چکی تھیں۔ مگر صبح والا واقعہ مسلسل اس کے دل میں کچوکے لگا رہا تھا اور وہ کچھ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ اُسے کہاں جانا ہے۔ اس شہر کی ایک انچ زمین کے اوپر سے وہ گزرا تھا مگر ہر انچ زمین کو اس نے اجنبیت کا اظہار کیا جس دروازے پر اس نے ایک بار دستک دی وہ دروازہ ہمیشہ کیلئے اس پر بند ہو گیا اب اس کیلئے زندگی میں رتی بھر بھی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی اور وہ مزید ایک لمحہ بھی زندہ رہنے کا خواہشمند نہیں تھا مگر زندگی سے چھٹکارا حاصل کرنا اُسے زندہ رہنے سے زیادہ مشکل معلوم ہونے لگا ہر طریقہ جو اس نے خودکشی کیلئے اختیار کرنا چاہا وہ سخت اذیت ناک معلوم ہوا۔ لہٰذا اس نے آخری بار فیصلہ کر لیا کہ وہ جا کر اپنے کمرے کی کھڑکی سے کود جائے گا اور یہی طریقہ اُسے سب سے زیادہ سہل معلوم ہوا اور اس نے اس طریقے پر عمل کرنے کی قسم کھائی اور ارادہ کر لیا کہ چاہے پروفیسر اپنی منطقی پہیلیوں کے سمندر میں کیوں نہ دھکیل دے وہ قسم توڑے گا نہیں اور یہ دن بہرصورت اسکی زندگی کا آخری دن ہوگا اور وہ کل کے سورج کو کسی طور پر طلوع نہیں ہونے دے گا۔ وہ مصمم ارادہ کر کے دھیرے دھیرے لڑکھڑانے کے سے انداز سے گھر کی طرف چلنے لگا اور جب وہ مقامی تھانے کے سامنے سے گزر رہا تھا تو اس نے زاہدہ کی بوڑھی ماں کریمن کو تھانے کے پھاٹک سے باہر نکلتے دیکھا وہ بہت مضمحل اور نڈھال دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں اور سر کے معدودے چند سفید بال گریہ و زاری کرتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔

"کیا بات ہے اماں" اس نے کریمن کے قریب پہونچ کر ازراہ ہمدردی پوچھا۔ اور جواب میں کریمن نے پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے کہا۔

"میں لٹ گئی برباد ہو گئی بیٹا ——— ہمارا سارا خانہ ویران ہو گیا۔ زاہدہ چلی گئی۔ وہ کلموا جوانی مرگا جو ایمرانڈری کرنے آیا کرتا تھا بھگا لے گیا۔ اب میں بدنصیب جلی کیا کروں۔ کدھر جاؤں۔ میرا کون رہ گیا ہے۔ میری مدد کرو بیٹا۔ میری مدد کرو۔ تم شریف ذات ہو میں نے تم سے کہا ہے۔ بلڈنگ میں اور کسی کو معلوم نہیں ہے۔ میری عزت رکھنا" کریمن کی آواز بیٹھ گئی اور اس سے مزید کچھ نہ کہا گیا۔ وہ کچھ دیر تک ایک لفظ کہے بغیر گم سم کھڑا رہا پھر کریمن کو تسلی دی اور تیز تیز قدم اٹھا کے چلنے کی کوشش کرنے لگا۔ زاہدہ کے بھاگ جانے کی خبر سن کر اُسے بے انتہا تکلیف ہوئی اور اُسے پورے کنبے کی موت کا خیال ستانے لگا جن کی زندگی کا دارومدار ایک ایمرانڈری کی مشین پر تھا اور جو زاہدہ کے بغیر ویران پڑی ہوگی۔ پھر اُسے پروفیسر کا خیال آنے لگا جیسے زاہدہ نے محبت کا ایک ایسا مجسمہ بنا دیا تھا جس نے ایک لفظ کہے بغیر ہزار مرتبہ اظہار عشق کیا تھا وہ چلتے چلتے کتنی دیر تک زاہدہ کے متعلق سوچتا رہا اور اس کا دل ہمدردی کے جذبے سے بھرپور ہو گیا۔ مگر صبح کے اذیت ناک اور تضحیک آمیز واقعے نے اُسے اتنی تکلیف پہنچائی تھی اور دنیا سے اسقدر اچاٹ کر دیا تھا کہ وہ کچھ آگے چل کر زاہدہ کے واقعہ کو بھی بھول گیا اور صبح والے واقعے نے اس کے ذہن کو دوبارہ جکڑ لیا اور اس کے خودکشی کے ارادے کو اور زیادہ تقویت پہنچی گئی وہ اس دھن میں ناظمہ کے پاس پہونچ گیا۔

نیچے بازار میں ناظمہ بلڈنگ کے صدر دروازے کے عین سامنے کھڑے ہو کر اس نے ایک نگاہ اوپر پانچویں منزل میں اپنے کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی کو دیکھا جہاں سے وہ تھوڑی دیر کے بعد کود کے نیچے آنے والا تھا عین اسی جگہ جہاں وہ کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں اور وہ مزید اس بارے میں کچھ نہ سوچ سکا۔ اُسے اس بلندی سے انتہا خوف آنے لگا اور اگر وہ مزید سوچتا تو شاید خودکشی کا ارادہ ہی تبدیل کر دیتا۔ اس نے دل پر اپنی قوت ارادی کی گرفت کو جہاں تک کر سکتا تھا مضبوط کیا اور بھاگ کے اندر داخل ہو کر بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اس کے جوتے کا اوپر کا حصہ ابھی تک سلامت تھا مگر تلوے غائب ہو چکے تھے اور وہ پاؤں سے کسی قسم کی آواز پیدا کئے بغیر سیڑھیاں چڑھتا رہا اگرچہ وہ نہایت سست رفتاری سے چڑھ رہا تھا مگر اس کی سانس پھولی ہوئی تھی جیسے وہ ابھی ابھی ریس کے گھوڑوں کے ساتھ دوڑ رہا ہو

ہاجرہ مسرور (ہاتھ کی لکھائی غیر واضح)

تھا۔ پانچویں منزل میں رہنے والے فیضی کو یہ پہنچ کر وہ لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ ایک چھلتی ہوئی نگاہ کمرے کے فلیٹ کے کمرے کی بند کھڑکی پر ڈالی جس کے پیچھے شاید پتلی نہایت
نکھار انداز میں بیٹھا ہوا تھا جو ہمیشہ کھلی رہتی تھی اور کبھی کبھی اس کے بالوں کی ایک حسین وحشی لٹ ہوا کے تیز جھونکے سے بڑے پاگل پن کے عالم میں اس کے رخساروں پہ آکر رقص کرتی تھی
مگر آج خلاف معمول پہلی دفعہ کھڑکی بند تھی اور کمرے کی کیفیت ایک اجاڑ اور سنسان کھنڈر معلوم ہوتی تھی۔ مگر اس نے اس بات کو پھر نظرانداز کر دیا۔ "یہ تو پروفیسر
کا کام ہے" اس نے سوچا اور دروازے کو آہستہ سے دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔ پروفیسر حسب معمول کرسی پر بڑے آرام سے بیٹھا کسی کتاب کے مطالعے میں غرق تھا
اور اس کی کھڑکی کی طرف اس کی پیٹھ تھی جہاں سے تھوڑی دیر بعد وہ نیچے کودنے والا تھا۔ پروفیسر نے اسے دیکھتے ہی مطالعہ کا تسلسل توڑا اور بھنوؤں کو پیشانی کی لکیروں
کا سہارا دے کر آنکھوں کو پوری طرح کھولا اور چشمے کے فریم کے اوپر سے اُسے دیکھنے لگا جیسے اس سے کسی نہایت ہی پراسرار سوال کے جواب کا منتظر ہو۔ اور یہ خاموش
سوال تو پروفیسر ہر روز ہی اُسے کرتا تھا۔ جس کا جواب وہ اسی خاموشی سے دیوار پر کوئلے کی ایک لکیر کھینچ کر دے دیتا۔ مگر یہ دونوں خاموشیاں جب ایک وقت ٹکراتیں
تو فاطمہ بلڈنگ میں دفعتاً ایک دھماکہ ہوتا جس کی آواز زیادہ سے زیادہ وہ سن سکتا تھا یا پروفیسر۔ بات صرف اتنی ہوتی کہ دن بھر کی غیر حاضری کے بعد شام کو یہ جیسے ہی اندر داخل ہوتا
تو پروفیسر کی پتلیاں چشمے کے فریم کے اوپر سے جھانک کر خاموشی سے پوچھتیں۔

"نوکری ملی" اور وہ جواب میں کھڑکی پر رکھا ہوا کوئلہ اٹھاتا اور سامنے والی دیوار پر ان گنت کھنچی ہوئی لکیروں میں ایک لکیر کا اور اضافہ کر دیتا۔ اس نے آج بھی
حسب معمول کوئلہ اٹھایا اور دیوار پر پھیلے ہوئے سیاہ دنوں، ہفتوں اور مہینوں میں ایک اور بدبخت اور تاریک دن کا اضافہ کر دیا۔ پروفیسر کے چہرے پر پریشانی کی اور
لکیریں کھنچ گئیں اس نے بے تابی کے عالم میں آنکھوں کو چشمے کے فریم کے ارد گرد دو چار مرتبہ گھمایا اور پھر مطالعے میں مصروف ہو گیا۔ اس نے پروفیسر کو جب اس طرح منہمک ہوتے
دیکھا تو اُسے قدرے تسلی ہوئی کہ اب وہ مداخلت نہیں کرے گا۔ وہ کھڑے کھڑے کچھ دیر تک ٹکٹکی باندھے کھلی ہوئی کھڑکی کی طرف دیکھتا رہا اور جوں جوں دیکھتا
گیا اس کی آنکھوں میں پھر وحشت سی پھیلتی گئی اور دل کی دھڑکن تیز ہوتی گئی اور اُسے ایک بار پھر ناکامی کا خطرہ محسوس ہوا مگر ناکام ہونے سے پہلے ہی اس نے
ایک دلدوز چیخ ماری اور تیر کی طرح کھڑکی کی طرف بھاگا لیکن راستے میں کوئی چیز اس کے پاؤں میں الجھی اور وہ دھم سے منہ کے بل فرش پر گر پڑا۔ یہ پروفیسر کی ٹانگ تھی
جو اس نے اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان اڑا دی تھی۔

"تم نے آج پھر پاگل پن شروع کر دیا ہے" پروفیسر نے کتاب بند کر دی اور شکوہ آمیز انداز میں بولا۔ "تم نے ایک زندگی میرے ساتھ بتا دی لیکن
ابھی تک زندگی کا مفہوم نہیں سمجھ سکے۔ زندگی سے پیار کرنا تمہیں نہ آیا۔" وہ گھٹنے سہلاتے ہوئے اٹھا اور تقریباً بھونکنے کے سے انداز میں بولا۔

"لعنت ہے ایسی زندگی پر پروفیسر۔ تم تو پتھر کے بنے ہوئے ہو۔ تم پر تو کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا لیکن میں ایک لمحہ اب زندہ نہیں رہ سکتا۔ میرے
ساتھ صبح جو واقعہ پیش آیا ہے سنو گے تو میرا خیال ہے تم بھی زندہ رہنے کا مشورہ نہیں دو گے"

"کوئی واقعہ اتنا سنگین نہیں ہوتا کہ جو خودکشی پر آمادہ کرے" پروفیسر نے اس کی بات کاٹ کر انتہائی اعتماد سے کہا "زندگی صرف مسرت ہی نہیں ہے مسرت حاصل
کرنے کی جدوجہد کا نام بھی زندگی ہے۔" خودکشی کرکے نامردی کا ثبوت نہ دو بلکہ زندہ رہ کر اپنا وجود منوانے کی کوشش کرو۔ سرگرم عمل رہو۔ جدوجہد جاری رکھو
جینا ایک مسلسل کوشش کا دوسرا نام ہے۔ پیٹھ دکھاؤ گے تو ذلت کی کھائیوں میں گر جاؤ گے۔"

"پہلے ہی کون سے عزت کے میناروں پر چڑھے ہوئے ہیں پروفیسر" وہ قدرے درشت لہجے میں بولا "تم ہمیشہ عین موقع پر میرا ارادہ بدل دیتے ہو
لیکن آج میں تمہیں کامیاب نہ ہونے دوں گا۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ اور اب میں مزید ذلت گوارا نہیں کر سکتا اور نہ اب مجھ میں ہمت ہے۔"

"تم تو لڑکیوں سے بھی گئے گذرے ہو۔ تم سے زیادہ ہمت تو زاہدہ میں ہے۔ جو اپنے ان نحیف کندھوں پر جو صرف زلفوں کا بوجھ سہہ سکتے ہیں پورے کنبے کا
بوجھ اٹھائے ہوئے ہے۔" زاہدہ کی مثال دیتے ہی پروفیسر کی آنکھوں میں بڑی پر وقار چمک پیدا ہو گئی۔

"اس کی ہمت تو مجھ سے پہلے ہی جواب دے چکی ہے پروفیسر" اس نے پروفیسر کی طرف فاتحانہ طریقے سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟" پروفیسر کرسی پہ سیدھا بیٹھ گیا۔

"مطلب یہ کہ....." اس نے آگے بڑھ کر تھوڑا سا دروازہ کھولا اور ناہید کی بند کھڑکی کی طرف دیکھ کر طنز آمیز لہجے میں کہنے لگا۔ "مطلب یہ کہ چڑیا تھی ابھی ابھی اس کی ماں سے معلوم ہوا کہ وہ جو ڈاکٹر ایبرانڈری کہنے آیا کرتا تھا رات اسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے اور یہ کھڑکی اب ہمیشہ کیلئے بند ہو گئی ہے یقین نہیں آتا تو یہ دیکھ لو" اس نے پروفیسر کے زخموں پر نمک چھڑکنے کیلئے پورا دروازہ کھول دیا۔ اور پھر پروفیسر کا ردعمل دیکھنے کیلئے پیچھے مڑا اور پیچھے مڑتے ہی اس کا منہ کھلا اور جیسے وہ بت بن گیا۔ پروفیسر کمرے میں نہیں تھا۔ اسکی کرسی خالی تھی۔ کتاب نیچے فرش پر پڑی ہوئی تھی اور نیچے بازار میں کچھ بے ہنگم شور بلند ہو رہا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے کھلی ہوئی کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا اور باوجود انتہائی کوشش کے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکا جیسے اس کے پاؤں میں کیلیں گڑ گئی ہوں بازار کا شور لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔

ہم قلم کراچی

غازی صلاح الدین

★

میرا گھر کہاں ہے؟

میں ایک کیفے میں بیٹھا ہوں۔ میز پر بیرا میرے لئے کافی اور سینڈوچز کی پلیٹ لاکر رکھ گیا ہے۔ سامنے کی میز پر ایک نوجوان جوڑا کرسیاں ایک دوسرے کے قریب کئے بیٹھا ہے۔ دوسری طرف بڑی گول میز کے گرد پانچ چھ خوش پوش نوجوان جمع ہیں اور ان کی باتوں اور قہقہوں کی آواز مجھ تک آ رہی ہے۔ میں نوجوان جوڑے کو دلچسپی سے دیکھ رہا ہوں۔ وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہوں گے۔ شاید ان کی شادی نہیں ہوئی ہے جبھی تو انہوں نے ایک بار بھی ایک دوسرے پر سے نظر نہیں ہٹائی۔ سامنے رکھی ہوئی پیالیاں یوں ہی پڑی ہیں۔ لڑکی کچھ شرما رہی ہے۔ وہ نیچے دیکھتے ہوئے میز کی شیشے کی سطح پر انگلی سے ڈیزائن بنا رہی ہے اور نوجوان گہری سانس لے کر مسکرا رہا ہے۔ وہ جو چھڑے کنوارے الگ بیٹھے ہیں وہ چور نظروں سے انہیں دیکھتے جا رہے ہیں اور شاید اس نوجوان کی خوش قسمتی پر رشک کر رہے ہیں جسے اتنی اچھی خوش پوش اور حسین لڑکی کی رفاقت نصیب ہے۔ لیکن آج میں اپنے آپ کو ان جذبوں سے دور محسوس کر رہا ہوں۔ میں اپنے آپ کو اس نوجوان کی جگہ تصور کر کے بھی خوش نہیں ہو سکتا۔ میں سوچتا ہوں کہ محبت کیسے اپنے خوابوں سے ہار جاتی ہے۔ پھر اس سے زیادہ کٹیلا احساس کوئی نہیں۔ رگوں میں درد سے چلتے ہیں۔ پوری کائنات دل میں دھڑکتی ہے پھر بھی ہر جانی پہچانی چیز اجنبی لگتی ہے۔

اس نوجوان جوڑے کو دیکھ کر مجھے اپنے پیار کی تفصیلات یاد آرہی ہیں۔ اس کا نام نفیسہ تھا اور مجھے وہ سرد سہ پہر کبھی نہیں بھولے گی جب وہ گورنمنٹ کالج کے ہاکی کے سبز میدان میں ایک اکیلی بنچ پر میرے سامنے بیٹھی تھی اور میں ذرا دور، اس کے سامنے گھاس پر تھا۔

"نفیسہ ـــ" میں نے کہا تھا "تم مجھے اتنی عزیز ہو کہ تمہیں کھو دینا تک بہت کچھ پالینے سے زیادہ ہوگا ـــ"

وہ کتنی اداس تھی۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلیاں رکھ لی تھیں اور سر جھکا کر ٹوٹے انداز میں کہا تھا ـــ "مجھے ڈر لگتا ہے"

میں کیا کرتا۔؟ مجھے اس پر اتنا پیار آ رہا تھا کہ میں اسے اٹھا کر دل میں رکھ لیتا۔ میں اسے سینے سے لگا لیتا کہ پھر کبھی اس کے رخسار میرے لبوں سے دور نہ جائیں۔ میں اسے دنیا کی ساری آسائشیں مہیا کر دیتا لیکن ـــ لیکن ہم اپنے چہیتوں کیلئے کیا کر سکتے ہیں؟ کوئی اپنے محبوب کیلئے کیسے تارے توڑ لائے۔؟ کوئی اپنے محبوب کیلئے کیا کرے۔؟

اور یہ نوجوان ـــ یہ جو میز پر آگے جھکا دھڑکتے بے چین دل کی کتھا کہہ رہا ہوگا ـــ یہ اپنی محبوب کیلئے کیا کر سکتا ہے ـــ؟

اس دور کے کیفے میں میں صرف اسلئے آتا ہوں کہ اکیلا بیٹھ سکوں۔ شہر کے ہر چائے خانے میں جاننے والوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ یہاں مشکل ہی کوئی آشنا ملتا ہے۔ وہ کنوارے سب اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور اس نوجوان جوڑے کے قریب سے گزر رہے ہیں۔ کچھ غیر ملکی آکر بیٹھ چکے ہیں۔ ان میں دو خواتین ہیں وہ دونوں اپنے تین مرد ساتھیوں کے لئے بڑے پیشہ ورانہ انداز میں مسکرا رہی ہیں۔

مجھے غیر ملکی عورتیں بالکل پسند نہیں۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا کہ میں کبھی باہر جا کر بھی کسی مغربی لڑکی سے محبت کر سکوں گا۔ مجھے اپنے ملک کی مشرقی لڑکیاں بہت پسند ہیں۔ انہیں جاننے کیلئے انہیں قریب سے دیکھنا پڑتا ہے ان کی ساری خصوصیات چھپی رہتی ہیں۔ پھر وہ جو پڑھی لکھی اور ذہین ہوں وہ کتنی پیاری ہوا کرتی ہیں۔

دونوں محبت کرنے والے اب تک بیٹھے ہیں۔ سینڈوچز کی پلیٹ میں نے چھوئی بھی نہیں ہے اور کافی بغیر دودھ کے پی رہا ہوں۔ میرا جی چاہ رہا ہے کہ میں ان دونوں کے پاس جا بیٹھوں۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ انہیں جانے بغیر میں ان کا دوست ہوں۔ میں اس نوجوان سے کہوں۔ دوست — جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ کبھی میرے پاس بھی تھا۔ لیکن میری تمنا ہے کہ تمہارے پاس وہ سب کچھ ہو جو اب میرے پاس نہیں ہے — اور پھر میں اس لڑکی سے ملوں۔ میں تمہیں جانتا ہوں — میں اس سے کہوں — شاید نفیسہ نے مجھے تمہارے متعلق بتایا ہو۔ تم نفیسہ کو نہیں جانتیں — ؟ تم یقیناً جانتی ہوگی۔ تمہیں اس وقت خیال نہیں آ رہا ہوگا۔ اور تب میں ان دونوں کا ہمسر پرست بن جاؤں۔ میں ان سے کہوں محبت انتہا نہیں ہوتی۔ محبت ابتدا ہوتی ہے۔ یہاں سے ہار جیت اور جدوجہد کی زندگی شروع ہوتی ہے۔ دنیا میں ملنوں کا چھوٹا سا سفید پردہ نہیں جس پر محبت وعدوں۔ اداس گیتوں اور قربانی کے سنگ میل چھو کر ملاپ یا جدائی پر ختم ہو جاتی ہے۔ محبت کو اپنی شخصیت کا جزو بنا لو اور عظمت و کامرانی کے مالک بنو۔ — مجھے دیکھو۔ اگر مجھے محبت مل جاتی — اگر —

وہ لڑکی مجھے حیرت سے دیکھے گی۔ میں اس سے کہونگا۔ ہاں۔ مجھے محبت نہیں ملی — اسی لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنے اندر بے پناہ خود اعتمادی پیدا کرو۔ مضبوط قدموں سے کھڑی رہو اور ہر قدم پر سان سے سوچ سمجھ کر اٹھاؤ — کبھی جذباتی بن کر ہچکیاں نہ لو۔ کبھی ہار نہ مانو۔ لڑو — اور صرف جینے کیلئے —

"نفیسہ —" میں اس دن گھاس پر بیٹھے بیٹھے اس سے کہا تھا جب وہ اپنا چہرہ ہاتھوں سے چھپائے تھی اور دبی دبی سسکیاں لے رہی تھی۔ "نفیسہ میں تم سے کچھ نہیں چاہتا۔ میں صرف یہی چاہتا ہوں کہ جب بھی تم کوئی فیصلہ کرو تو یہ سوچ لو کہ کہیں تم چھوٹی چیزوں کیلئے بڑی چیزیں تو قربان نہیں کر رہی ہو — اس خیال کے بعد چاہے تم مجھے بھی ترازو پر رکھ دو۔ لیکن ایسا فیصلہ کرو کہ بعد میں کوئی کسک نہ رہے —"

اور اب کہیں نفیسہ مجھے ملے — اب کہیں میں اسے دیکھوں تو میں اس سے کہونگا — نفیسہ — میری محبوب — تم نے مہنگا سودا کیا —

کچھ اور لوگ کیفے میں آئے ہیں۔ چھ بج رہے ہیں۔ وقت کا مجھے اس لئے خیال آیا کہ ابھی اس لڑکی نے اپنے ہاتھ پر وقت دیکھا تھا۔ اسے شاید دیر ہو رہی ہے۔

"مجھے جانے دیجئے۔ خدا کیلئے —" نفیسہ کہا کرتی تھی۔

آدمی کچھ کھو سکتا ہے — ؟ کتنی چیزوں کی تمنا کر سکتا ہے —؟ جب سے میں کراچی آیا ہوں میری آمدنی خاصی ہے اور نفیسہ کو کھو کر — تین تاریک مہینوں کے بعد میرے جسم اور جذبات کی ساری ضروریات لوٹ آئی تھیں اور اکیلی بے خواب راتوں میں نفیسہ کی باتوں کے بعد اجنبی اور قریب سے گذر جانے والے جسموں کی یاد آتی تھی۔

لیکن اب میں کبھی محبت نہیں کر سکونگا۔ میں اس قابل نہیں رہا۔ محبت میرے لئے نہیں ہے اسلئے کہ میں بہت کچھ جانتا ہوں اور سیکھ چکا ہوں۔ میں کسی دل میں اپنا گھر نہیں بنا سکتا۔ میں چاروں طرف سے اٹھی ہوئی دیواروں کی کسی محفوظ جگہ اپنا اثاثہ نہیں جمع کر سکتا۔ میں کسی بھی چیز کو اپنا نہیں سکتا۔ کرسیاں کتابیں کپڑے — بے شمار چیزیں جنہیں میں جیب سے پیسے دے کر خریدتا ہوں مجھے اپنی نہیں لگتیں۔

وہ جگہ کہاں ہے جہاں میری شخصیت کی جڑیں سیراب ہوں — ؟

وہ دونوں اٹھ گئے ہیں — نوجوان نے بڑے پیار سے لڑکی کیلئے کرسی پیچھے ہٹائی۔ اسکا پرس اٹھانے کیلئے ہاتھ بڑھایا اور اسے آگے بڑھنے کا موقعہ دے کر پیچھے ہٹا۔ وہ دونوں جا رہے ہیں — وہ چلے گئے ہیں۔

خدا حافظ — جو باتیں تم نہیں جانتے ہو خدا کرے تم کبھی نہ جانو — خدا حافظ۔

وہ جو دو غیر ملکی عورتیں ہیں ان میں سے ایک مجھے کچھ اچھی لگ رہی ہے۔ اس انداز میں اچھی نہیں کہ میں اس سے ملوں — اس لئے اچھی لگ رہی ہے

کہ ہم ایک دوسرے کو جانے بغیر کچھ دیر ساتھ رہیں اور پھر میں اس سے کہوں کہ مجھے تم جیسی عورتوں سے نفرت ہے اور تم نے دیکھا کہ نفرت کی انتہا بھی وہی ہے جو محبت کی ہوتی ۔

ہم ۔۔ اس جذباتی اور آسمانی محبت کے علاوہ ۔ کیا کبھی بھی ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں ؟

کیفے میں ایک پورا خاندان آیا ہے ۔ بچے ۔۔ معمر خاتون اور دو تین مرد ۔۔ سب بہت خوش ہیں ۔ ایک چھوٹی سی بچی ہے ۔ ایک لڑکا ہے جو بڑی خود اعتمادی کے ساتھ سب سے آگے آگے آیا تھا ۔ ماں کے چہرے پر کتنی شفقت ہے ۔ مامتا ہے ۔ اگر کسی کو بھی کچھ مل جائے تو وہ نفع میں رہے گا ۔۔ لیکن یہ مسرت ۔ یہ کسی کا ہونے کسی کو اپنانے اور چیزوں کی ملکیت کا احساس ۔ کیا یہ دیرپا اور حقیقی ہے ۔ ؟ میری ماں ۔ ابا ۔ چھوٹا بھائی اور دو چھوٹی بہنیں ۔ ہم بھی تو ایک ساتھ رہتے تھے اور ایک میز پر بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے ۔ ہم برسوں ساتھ رہے تھے پھر بھی میں وہاں اجنبی تھا ۔ وہ سب یہ متعلق ہی تو جانتے تھے کہ میں میٹھی چیزیں پسند نہیں کرتا اور بستر پر بغیر منہ دھوئے ناشتہ کرنے کا عادی ہوں اور یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی میری ذرا سی چیز کو بھی چھوئے ۔

وہ میرا گھر نہیں تھا ۔۔ میرا گھر کہاں ہے ۔۔ ؟

بیرے نے بل لاکر رکھا ہے ۔ ماں نے اس پیاری سی بچی کو کسی بات پر ڈانٹ دیا ہے اور وہ کرسی میں دھنسی روٹھی بیٹھی ہے ۔ غیر ملکی جوڑا یا وسطِ یورپ کے کسی ملک کے ہیں کچھ زیادہ آواز سے ہنسنے لگے ہیں اور میری پسند کی عورت کا ہاتھ اپنے ساتھ کے مرد کے ہاتھ میں ہے ۔ میں جانتا ہوں یہ الفی ہے ۔ شام کے دھندلکے میں نیون روشنیاں جگمگا رہی ہیں ۔ لوگ بنے سنورے اپنے دوستوں کے ساتھ بے مقصد ٹہل رہے ہیں ۔ لڑکیاں ، عورتیں اور بیویاں اپنے دیکھنے والوں کی نگاہوں کا احساس لئے انجان چل رہی ہیں

میں کہاں جاؤں ۔۔ ؟ پہلے میں نے سوچا تھا کہ میں کوئی فلم دیکھوں گا لیکن اس وقت میں کسی اور کی باتیں نہیں سن سکتا ۔ اسی لئے میں کیفے بھی نہیں جاؤں گا جہاں میرے بیشتر واقف بیٹھے ہیں ۔ وہ سب بیکار ہیں ۔ بیکار باتیں کرتے ہیں ۔ اتنے زیادہ جاننے والوں کے باوجود میرا کوئی دوست نہیں ہے ۔ یہ شکایت مجھے لاہور میں بھی تھی لیکن وہاں کچھ تقریباً دوست تو تھے اور جب ان کے بچھڑنے کا اتنا قلق ہے تو کہیں کوئی سچ مچ کا دوست بن جاتا تو اسے کیسے چھوڑا جاتا ۔

آخر دوست سے شادی کیوں نہیں کی جا سکتی ۔۔ ؟

شاید کسی لڑکی سے محبت اسی لئے بہتر ہوتی ہے کہ ایسا سماجی رشتہ ہے کہ ہم عمر بھر ساتھ بھی رہ سکتے ہیں ۔ ایک دوسرے کیلئے جی سکتے ہیں وہ حد کہاں ہے جہاں جسم اور روح جدا ہوتے ہیں ؟ وہ غیر ملکی عورت ۔۔ میں کوئی دن اس کے ساتھ نہیں گذار سکتا ۔۔ اور پھر ماں ، بہنیں ۔۔ دوسری عورتیں ۔۔ دوست ۔ ان سے ملکر بھی پیاس باقی رہ جاتی ہے ۔

نفیسہ ۔ صرف نفیسہ اسکا علاج تھی ۔

" اگر تم مجھے نہیں ملیں ۔۔ " میں نے اس سے کہا تھا ۔۔ " تو پھر مجھے محبت پر یقین نہیں رہے گا ۔ میں زندہ تو رہونگا لیکن زندگی کا مقصد کوئی نہ ہوگا ۔ میں پھر کسی کو اپنانے کی کوشش نہیں کرونگا ۔ میں ایک بھکاری کی طرح کسی کونے پر دھرنا دے کر بیٹھ جاؤنگا ۔ جو جس کا جی چاہے میری کشکول میں ڈال جائے ۔۔ جو چاہے اس میں سے مٹھی بھر کے اٹھالے ۔۔ "

" آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں ۔۔ ؟ "

وہ خالص مشرقی لڑکی تھی ۔ اس کی ذہانت متانت اور وسیع النظری ۔۔ اس کے خواب اور ساری تمنائیں ، خاندان کی عزت کی کسی بوسیدہ پوٹلی میں بندھی تھیں ۔ لیکن وہ مجھ سے بے پناہ محبت کرتی تھی ۔

یہ تمام لوگ — جو ہنس ہنس کر خوش ہو رہے ہیں اور معمولی لڑکیوں کو دور دور سے دیکھ کر اپنا دل بہلا رہے ہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ — نفیسہ — مجھ سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔

"آپ کو عمر بھر بھی دیکھتی رہوں تو دل نہ بھرے —" نفیسہ نے مجھ سے کہا تھا۔

"آپ بہت شریر ہیں اور ہر وقت مجھے یاد آتے رہتے ہیں۔ اگر دو تین دن آپ کو نہ دیکھوں تو ایسا لگتا ہے جیسے ہر چیز بیکار ہے"۔ اس نے مجھے لکھا۔ ہر چیز بیکار ہے — نفیسہ نے ٹھیک کہا تھا — ہر چیز بیکار ہے۔ نیون روشنیاں۔ اندھیرے کی روشنی کی کانیں — سرخ کے سوٹ — گم سرخ کپڑے پہننے والی نئی نویلی دلہن۔ امریکہ کے نمبر پلیٹ والی دو رنگی کار — یہ تمام لوگ۔ یہ خنک شام۔ یہ بے رحم قاتل شہر — یہ ساری دنیا — ساری زندگی — سب بیکار ہے۔

"نفیسہ — ہم نہیں جانتے کہ حقیقی سچائیاں کیا ہیں۔ کوئی نہیں جانتا — سب نے اپنے لئے کچھ اعتقادات اور نظریے چن لیتے ہیں۔ اس لئے تو میں ہوں کہ زندہ رہنے کیلئے اپنے آپ کو کچھ سچائیوں کا دھوکہ دینا بہت ضروری ہے۔ لیکن ایک بار جس چیز کو فرض کر لیا جائے اس پر صرف جان ہی دی جا سکتی ہے۔ ہم جا سکتی۔ لوگوں نے بہت معمولی معمولی باتوں کیلئے جان کی بازی لگا دی لیکن اپنے مقصد پر مرنے والوں نے ہمیشہ خوشی خوشی موت قبول کر لی۔ وہ ہارے نہیں۔

میں ہار گیا اور زندہ ہوں اور یہ المیہ ہے اور میں بے مقصد بے منزل آگے بڑھ رہا ہوں۔ میں کہاں جاؤں؟ گیسٹ ہاؤس کا چھوٹا سا کمرہ میرے پاس ہے اس میں اکیلے مجھے خوف آتا ہے۔ تنہائی مجھے کاٹتی ہے۔ میں کسی سے ملنا بھی نہیں چاہتا اور اس شور میں مجھے سکون نہیں مل رہا۔ یہ تمام لوگ یہ بہت خوش قسمت ہیں کہ جیب میں کچھ نوٹ رکھ کر اور سوٹ پہن کر اور دوستوں کے ساتھ قہقہے لگا کر اور اپنے محلے کی کسی لڑکی کو مسکرا کر دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں۔ میں ان جیسا کیوں نہیں ہوں؟

ایک جاننے والے سامنے سے آ رہے ہیں۔ "ہیلو"

"کیا حال چال ہیں —"

سب سے ہنس کر ملنا پڑتا ہے۔ کرکٹ کے اسکور، بلیئر کی سلائی، بے پی ٹیکسیوں کی قلت، ہچکاک کی فلموں اور بے نام لڑکیوں پہ بات کرنی ہے۔ کسی سے کوئی شکایت نہیں کی جا سکتی کیونکہ سب مجھے بہت خوش قسمت سمجھتے ہیں۔ اچھی نوکری ہے۔ بہت سی تنخواہ ملتی ہے۔ اکیلے رہتا ہوں (گویا یہ قابل رشک بات ہوئی۔)

"اگر تم مجھے نہیں ملیں —" میں نے نفیسہ سے گورنمنٹ کالج والی ملاقات میں کہا تھا "اگر تم مجھے نہیں ملیں تو پھر میرے لئے دنیا کی ہر چیز ہے — خدا۔ مذہب۔ میں کسی پر بھروسہ نہیں کروں گا۔ محبت تک پر نہیں —"

میں اپنے عہد پر سچا نکلا اور اب اپنے آپ کو کسی مزید محبت کیلئے ناقابل پاتا ہوں۔ مجھے تو ابا کے دوست ریاض چچا کی اس چودہ سالہ معصوم بیوقوف لڑکی پر بھی رحم نہیں آتا جو نئی نئی جوانی کی پوری شدت کے ساتھ مجھ سے محبت کرنے لگی ہے۔

اب اگر میں نفیسہ سے ملوں اور ہم بہت دیر تک باتیں کریں تو میں اسے ریاض چچا کی لڑکی شروت کے بارے میں بھی ضرور بتاؤں اور شاید نفیسہ التجا کرے کہ میں اس سے بے رخی برتنے کے بجائے اسے سمجھاؤں — ابھی تو وہ بچی ہے — لیکن اگر وہ بچی ہے تو اس سے محبت کرنے کیلئے کس نے کہا ہے کیا جانے محبت کیا ہوتی ہے — ویسے اس کے چودہ سال اس کے چست لباس سے باہر نکلے پڑتے ہیں اور اسے دوپٹہ اوڑھنا نہیں آتا اور کئی بار تو میرا جی چاہا ہے کہ میں اسے اسکول سے اپنے کمرے لے جاؤں اور بتاؤں کہ وہ کیسی محبت چاہتی ہے

میں نے نفیسہ سے کہا تھا کہ حالانکہ میں محبت کی قیمت روح کی عصمت سمجھتا ہوں لیکن میں جسم کی عصمت کا بھی قائل ہوں۔ میں نے کہا تھا — "میں تمہاری امانت ہوں کسی اور کو کیا حق ہے کہ وہ مجھ سے کسی بھی قسم کا فائدہ یا لطف اٹھائے —"

ہم قلم کراچی

نفیسہ شرمائی تھی لیکن یہ سچ تھا کہ میں نے اپنے آپ کو اس کے لئے بچا کر رکھا تھا۔ میں محبت میں ساری اخلاقی پابندیوں کا احترام کرتا تھا مگر جب اس کی شادی ہو گئی اور تین مہینوں بعد میں اس صدمے سے جانبر ہو گیا تو میں نے اپنے ایک دوست کا فلیٹ ایک رات کیلئے لیا اور اس لڑکی سے کہا جسے میں نے پھر کبھی نہیں دیکھا —
اگر نفیسہ کو معلوم ہوتا کہ اس کا حق تم جیسی لڑکی چھین لے گی تو وہ پتہ نہیں کیا کر گذرتی —"

اور اس دن کے بعد میں نے ہر چیز سے اپنے رشتے توڑ لئے۔ میں نے انگاروں پہ راکھ ڈال دی۔ میں بے گھر تو ہو گیا پر ٹھوکر لگنے سے راکھ میں دبی چنگاریاں اب بھی جلا دیتی ہیں۔ میں اب محبت نہیں کر سکتا لیکن جو محبت گذر چکی ہے اس کا کچلا دل ابھی میرے سینے میں ہے۔

میں ایک چوراہے پر کھڑے ہو کر سوچتا ہوں کہاں جاؤں — ایک سڑک پر سے میں آیا ہوں۔ ان تین سمتوں میں سے میں کسی بھی طرف مڑ سکتا ہوں ہو سکتا ہے میں دائیں طرف مڑوں اور کوئی ایسا شخص مجھے ملے جو میری زندگی بدل دے۔ ہو سکتا ہے میں بائیں طرف جاؤں اور کسی موٹر سے ٹکرا کر مر جاؤں۔ ہو سکتا ہے میں سیدھا جاؤں تو مجھے نفیسہ نظر آ جائے

اتفاقات — محض اتفاقات —

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی — یہ شعر مجھے بہت پسند تھا اور نفیسہ کو بھی — زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی۔ لیکن زندگی تو اب بھی گزر رہی ہے۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ ہم سب کھونے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں — ہمیں زندہ رہنا پڑتا ہے۔ چوسی ہوئی گنڈیریوں جیسے یہ زندگی جو تھوکوں میں اور قالینوں پر ایک ہی جیسی ہے جو اپنے اندر کی ساری قوت کھو چکی ہے اور اب کھڑے ہوئے تنے کی طرح وقت کے بہاؤ میں بہی جا رہی ہے۔

کیا اب یہ ممکن نہیں کہ کوئی مجھے روکے۔ کوئی رنگ و نور کا ماخذ بن کر میری زندگی میں آئے اور مجھ سے کہے — اٹھو اور اپنا گھر بساؤ — تم آنکھیں بند کئے کہاں جا رہے ہو۔ رکو اور مجھے دیکھو۔ اور پھر ہم اپنا گھر بنائیں — میں کسی کی گود میں سر رکھ کر کہوں — یہ میری منزل ہے — یہ میرا گھر ہے۔ اب ان بنیادوں کو کوئی نہیں ہلا سکتا۔

مگر نہیں — ایسا نہیں ہو سکتا — کبھی نہیں — ہوائیں بہت تیز چلتی ہیں اور لہریں میرا استقلال بہا لے جاتی ہیں — ہر ترتیب بگڑ جاتی ہے۔ ہر تصویر کا رنگ اڑ جاتا ہے۔ جب محبت ان ہواؤں سے ہار گئی تو کوئی چہرہ ان کے سامنے اپنی آنکھیں نہیں کھول سکتا۔

میں ہمیشہ بے گھر رہونگا — میں کمروں اور برآمدوں میں رہونگا اور کرسیوں اور بستروں میں آرام کرونگا لیکن بے گھر رہونگا —

یہ وہ کمرہ ہے جہاں میں رہتا ہوں۔ میں یہیں آنے سے بچ رہا تھا اور یہیں رات گذارنے آیا ہوں۔ اس گیسٹ ہاؤس میں یوں تو صرف کھانا اور سونا چاہیئے تھا لیکن اس منزل پر میرے کمرے کے علاوہ جو دو دو کمرے والے فلیٹ ہیں ان میں گھرانے آباد ہیں۔ میں نیچے گیسٹ ہاؤس کے کھانے کے کمرے میں کھانا کھاتا ہوں مگر آج مجھے بھوک نہیں —

تو یہ میرا کمرہ ہے۔ پلنگ۔ میز۔ دو کرسیاں۔ الماری۔ کتابیں۔ چیزیں جو عموماً اپنے مالک کی شخصیت کا حصہ بن جاتی ہیں میرے لئے دوکانوں میں رکھی ہوئی اشیاء کی سی ہیں۔ میں یہاں رات کو دیر سے آتا ہوں اور صبح ہوتے ہی دفتر چلا جاتا ہوں۔ اس کمرے میں مجھ سے کچھ نہیں ہوتا جو کتابیں پڑھنے کیلئے خریدتا ہوں وہ الماری میں ادھوری پڑھی پڑی رہتی ہیں۔ میں رات کو اندھیرا کر کے لیٹ جاتا ہوں اور کھلی کھڑکی سے نیچے کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ لمبی لمبی موٹریں گزرتی ہیں۔ کوئی بھاری قدموں سے چلتا ہے اور میں جاگتا رہتا ہوں —

میں اس ساری دنیا میں اکیلا ہوں اور کوئی مجھے نہیں جانتا۔

نفیسہ کی شادی کو دو سال ہونے آئے ہیں اور میں نے جان بوجھ کر اپنے آپ کو اس سے بے خبر رکھا ہے۔ شاید اب اس نے میرے بغیر زندہ رہنا سیکھ لیا ہوگا اور ممکن ہے وہ مجھے کسی شام اپنے شوہر کے ساتھ کار سے اترتی دکھائی دے اور وہ بہت خوش ہو۔

مجھے شادی کر لینا چاہیئے۔ امی بھی کئی بار یہ لکھ چکی ہیں۔ میں نفیسہ سے کہا کرتا تھا کہ تم اس دنیا کی سب سے خوش قسمت لڑکی ہو کیونکہ میں تم

سے محبت کرتا ہوں ۔ مجھے ہمیشہ سے اپنی محبت پر ناز تھا اور اب جب میں کسی سے محبت نہیں کر سکتا تو شادی کیوں کروں ۔۔۔ ؟ یہ بات میں امی کو نہیں لکھ سکتا اندر وہ اسے سمجھیں گی بھی نہیں ۔۔ محبت کیا ہوتی ہے جی ۔۔۔ آدمی صرف اسی لئے تو شادی کرتا ہے کہ کوئی لڑکی اس کے بھائی بہنوں کی بھابی اور والدین کی بہو بن کر آئے اور سب کے ارمان پورے ہوں اور ایک خوبصورت لڑکی ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر مہمانوں کی خاطر کرے ۔ یہ شادی تو دوسروں کیلئے ہوگی کہ سب دیکھیں اور فرحت پائیں

میں شادی نہیں کرونگا ۔ میں نے امی کو یہی لکھ دیا تھا ۔ وہ مجھ سے ناراض ہو گئیں تھیں ان کا خیال ہے کہ اب جب میں کام دھندے سے لگ گیا ہوں تو مجھے اپنا گھر بسا لینا چاہیئے ۔ گھر ۔۔۔

ان دنوں جب میں اور نفیسہ ساتھ تھے اور میں خواب دیکھا کرتا تھا تو میں نے فارنس میں ایک شام اپنا گھر بسایا تھا ۔

"مجھے بڑے گھروں سے سخت نفرت ہے ۔ مجھے ایک چھوٹا سا گھر چاہیئے ۔"

نفیسہ خاموش رہی تھی ۔ وہ مستقبل کی باتیں کرتے ہوئے ڈرا کرتی تھی ۔

"چھوٹا سا ۔۔۔ دو تین کمروں کا گھر ۔ مجھے نوکر سخت ناپسند ہیں ۔ کوئی غیر کیوں ہمارے راز جانے ۔ ہمارے گھر میں ایک چھوٹی سی کیاری ہوگی ۔ میں صبح صبح پودوں میں پانی دیا کرونگا اور تمہارے بالوں کے موتیا کے پھول چنا کرونگا ۔ ہم اپنے گھر کو بہت اچھی طرح سجائیں گے اس میں ہماری ضرورت کی ہر چیز ہوگی اور ہم دونوں باہر ہی نہ نکلا کریں گے ۔۔"

تو نفیسہ ڈیر ۔۔۔ دیکھو کہ خواب کیسے پسپا ہوئے اور میں دیواروں اور بند دروازوں کی اس دنیا میں بے گھر رہ گیا اور آج جب تم بے طرح یاد آ رہی ہو اور میرا اکیلا پن مجھے زیر کئے میرے سینے پر بیٹھا ہے تو میں سوچ رہا ہوں ۔ کیا میں کبھی کسی عمارت کو اپنا گھر کہہ سکونگا ۔۔۔ گھر ۔۔۔ اس کے ساتھ تو بہت سے جذبے منسلک ہوتے ہیں اور سارے خوبصورت جذبے یا تو اپنا آپ کھو کر بازی ہار چکے یا اندر ہی اندر بہت ہار کر مرجھا گئے اب صرف قربت کی چاہت ہے ۔ کسی رشتے کی تمنا نہیں ۔ اب میں چاہتا ہوں کہ میرے کمرے کے دروازے کھلے رہیں تاکہ لوگ آئیں تو واپس بھی جا سکیں ۔ اس طرح شاید میں نفیسہ کو بھی بھول سکوں اور محبت کے نقش قدم بھی آنے والے کی ٹھوکروں سے مٹ جائیں ۔

بہت جلد سیاں جی کی لڑکی ثروت یہاں آئے گی ۔ میرے دفتر کا جو اسٹینو مجھے اپنے تھرماس کی چائے پلاتا ہے وہ بھی یہاں آئے گا ۔ برابر کے انجینئر صاحب کی بیگم بھی میرے گذرنے پر اپنا دروازہ ذرا سا کھولتی ہیں ۔ میں انہیں بھی بلاؤنگا ۔ یہاں آؤ ۔۔۔ اس کمرے میں آؤ ۔۔۔ یہاں محبت نہیں ہے یہاں زنجیریں نہیں ہیں ۔ تازہ ہوا کی طرح آؤ اور میرے بال بکھرا کر چلی جاؤ ۔۔

میں زخمی ہوں اور اس کمرے میں یوں پڑا ہوں جیسے رہگذر پہ ہوں ۔

میں مسافر ہوں اور اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بج چکے ہیں اور مجھے نیند نہیں آ رہی ۔ سارے کام ادھورے پڑے ہیں ۔ چھوٹے غیر اہم کام ڈرائی کلینر کے یہاں سے سوٹ لانا ہے ۔ دفتر کے کلب کی پچھلی میٹنگ کی رپورٹ لکھنا ہے پاسپورٹ کے لئے جنرل منیجر کی ضمانت لینی ہے ۔

میں مسافر ہوں اور بہت دور چلا جانا چاہتا ہوں ۔ ہم جب ہر چیز ، ہر لمحہ کھو دیتے ہیں تو کھو دینا ہی تقدیر ہے ۔ ایک چیز کھو دی تو کھونے کیلئے ایک چیز کم ہو گئی ۔

نفیسہ کو کھو دیا اور وہ کام جو ساری زندگی میں آہستہ آہستہ ہوتا ایک لخت ہو گیا ۔ یہ بہت بڑا معرکہ ہوا ۔ نفیسہ کو کھو دیا ۔ سب کچھ کھو دیا ۔ زندگی کی ہر ٹھہری ہوئی حقیقت کھو دی ۔ گھر کھو دیا ۔ وہ زمین کھو دی جس سے کونپلیں پھوٹتیں ۔

لیکن ایسا کیوں ہے کہ ہم صرف انہیں ڈھونڈتے ہیں جنہیں ہم کھو چکتے ہیں اور جانتے ہیں کہ ہم انہیں کبھی نہیں پائیں گے ۔۔ ! دل چھوٹے چھوٹے اور نا سمجھ بچوں کی طرح کیوں ہوتا ہے جو صرف اپنی چاہت کی پکار سمجھے ۔۔ ؟

ہم قلم کراچی

کہاں ہے — ؟ میرا گھر کہاں ہے — ؟

میں کل صبح سے ایک عملی غیر جذباتی زندگی شروع کروں گا — میں کل صبح سے ایک عملی غیر جذباتی زندگی شروع کروں گا — میں ناول کا رنگین کتاب

ان ہونا چھوڑ دیئے — زندہ رہنا شروع کیجئے۔ خرید لونگا۔ میں افادیت پسند بن جاؤنگا۔ میں کل صبح سے ایک عملی غیر جذباتی زندگی شروع کرونگا۔

مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔ میں اکیلا ہوں۔ میری روح بھی اکیلی ہے اور میرا جسم بھی اکیلا ہے۔

امی کو خط لکھنا ہے۔ میں لکھونگا۔ امی جان — آداب — میں یہاں خیریت سے ہوں۔ امید ہے رجو کی طبیعت ٹھیک ہو گئی ہوگی۔

جس دوا کیلئے لکھا تھا وہ بہت جلد بھیج دوں گا۔ آج کل مل نہیں رہی۔ سب کو سلام کہیئے گا — بچوں کو دعا — آپ کا برخوردار —

ابا کی دوا تو میں بھول ہی گیا تھا۔ کل لیٹے لیٹے نیند کی گولیاں بھی لے لینا ہیں۔ زندگی چھوٹی چھوٹی باتوں میں بٹ کر کھو گئی ہے اور بکھر گئی ہے اور سیڑھیاں چھوٹتی جا رہی ہیں۔ پہلے تمنائیں تھیں۔ خواب تھے۔ وہ چاندی کی جگمگاتی سرزمین نظر آتی تھی۔ اب صرف خلا ہے۔ میں نیچے گر رہا ہوں۔

میں نیچے گر رہا ہوں میں تمام دن اس گہری کھائی کے اوپری کنارے پر چلتا ہوں اور اطراف کے نظاروں سے لطف اندوز ہونے کے بہانے ڈھونڈ

رات آتی ہے تو کوئی مجھے اندھیرے میں دفعتاً دیکھ کر پیچھے ڈھکیل دیتا ہے۔

میں گر رہا ہوں اور ہاتھ کی گرفت سہاروں پر سے پھسلتی جا رہی ہے۔

…احمد سرور

…و گُل کے سائے میں تم نے دھوم مچائی جشن منائے
…رانوں میں ہم نے کیا کیا اپنے لہو سے پھول کھلائے

اپنی نظریں اب بھی لیے ہیں خوابوں کا آئینہ خانہ
یہ میلی مٹیالی دنیا آئے ہم سے آنکھ ملائے

…ز ہوا سے گھبرانا، طوفانوں سے ڈر جانا کیا
…جوں میں جب شورش دیکھی ہم نے خود طوفان اُٹھائے

سائے سائے چلنے والے، دن کی دھوپ کو جھیلیں کیسے
شوق کی رکھیں لاج کہاں تک، جو شعلوں سے کھیل نہ پائے

…بسی ہے تصویرِ تمنا جب بھی ادھوری اب بھی ادھوری
…بے تابی نے دل کی لاکھوں نقش بنائے نقش مٹائے

برف جہاں صدیوں سے جمی ہو دل کی آنچ کی بات نہ کیجئے
یوں تو ہمالہ کی چوٹی پر کتنے ہی جھنڈے لہرائے

…خواب مرا تعبیر کسی کی یہ بھی ظلم نہ دیکھا ہوگا
…ک چنگاری سے یاروں نے راکھ کے کتنے ڈھیر بنائے

ان کی اداؤں کے جادو کو دُنیا والے بھول ہی جاتے
کتنے پیار سے ہم نے اپنے دل میں سارے نقش بسائے

…پنی نظر کی مستی، سب کچھ ساقی کا انعام فسانہ
جو سرشار تھے چھک کر نکلے، پیاسے لیکن پیاسے آئے

کس نے کلی کو پھول بنایا، بادِ سحر کی موج سے پوچھو
میری نظر نے سادہ رخوں کو حسن کے کیا کیا رمز سکھائے

شمع کی لو ہے مدھم اب تک شعلۂ شوق کہاں سے آتا
پروانوں کے بدلے ہم نے دیکھے جلتے پھرتے سائے

تابش دہلوی

شعورِ جلوہ ہے دشوار چشمِ تر کے لئے
ہزار آنکھ سے روتا ہوں اک نظر کے لئے

غمِ فراق ہوا جا رہا ہے راحتِ جاں
ہوئے ہوں تجھ سے جدا جیسے عمر بھر کے لئے

غمِ حیات سے سر پھوڑ کر ملے گی نجات
نصیب بھی تو ہو دیوار کوئی در کے لئے

ترے حجاب و تجلی کے درمیاں اے دوست
بہت مقامِ نظر ہیں مری نظر کے لئے

ہوئے ہیں چشم براہ تیرے شام سے یعنی
چراغ ہم نے جلایا ہے رہ گزر کے لئے

یہ راستے کی کڑی دھوپ اور یہ تنہائی
کہ سائے کے ہوں تعقب میں ہمسفر کے لئے

اجل شفا تھی مگر اہلِ درد نے کیا کیا
دوا کے نام سے احسان چارہ گر کے لئے

فروغِ جاں کو ہے درکار سوزِ جاں تابش
اک آفتابِ ضروری ہے ہر سحر کے لئے

طفیل احمد جمالی

پھر ہوئے بدنام، کہلانے لگے فرزانہ ہم
پھر کسی بستی میں آ نکلے دلِ دیوانہ ہم

ایک تنہا دل، بھٹکتی روح، اک پیاسی نظر
اے جنوں تیرے لئے لائے ہیں کیا ویرانہ ہم

تیشۂ فرہاد سے لیکر بہر دورِ فلک
آج تک دہرا رہے ہیں ایک ہی افسانہ ہم

انقلابِ میکدہ کی بات یوں کرتے ہیں لوگ
جیسے ہوں نا آشنائے ساقیٔ میخانہ ہم

اُس جہان دوش و فردا و بلند و پست سے
کتنی دور اور آ گئے اے لغزشِ مستانہ ہم

منظرِ دار و رسن میں ہم اُلجھ کر رہ گئے
ورنہ نکلے تھے بعزم کوچۂ جانانہ ہم

چاند تاروں کے کھلونے مانگتے ہیں چرخ سے
اے جمالی لائے ہیں کیا فطرتِ طفلانہ ہم

احسن احمد اشک

بجا کہ کچھ شکایتیں ہیں ان کو میری ذات سے
مگر یہ لوگ کس لئے خفا ہیں کائنات سے

عزیز ہوں کہ دوست ہوں یہ سب ہی کرتے آئے ہیں
ہوا کے رُخ کو دیکھکر پلٹ گئے ہیں بات سے

رہے اگر حدود میں تو دوستی بُری نہیں!
ہیں رنجشیں تمام تر غلط توقعات سے

بلا رہے تھے راستے قدم مگر نہ اُٹھ سکے
تمام عمر کھیلتے رہے تصوّرات سے

وہی کہیں گے اور کچھ جو کہہ رہے ہیں برملا
اس انجمن میں روشنی ہے آپ ہی کی ذات سے

سنور گئی تو دھوپ ہے بکھر گئی تو چھاؤں ہے
غلط کہ تیری زلف کو مناسبت ہے رات سے

تھکے ہوا اشک سو رہو اب آندھیوں کی راہ میں
لگاؤ بھی ہے لاگ بھی تہیں تو حادثات سے

شاھد احمد دھلوی

★

دور دور ہرے بھرے شاداب درختوں کے جھنڈ میں ایک بستی ہے، زمینداروں اور کسانوں کی آبادی کھلی فضا اور لہلہاتے سرسبز کھیتوں نے یہاں کی زندگی کو تازگی سے ہم آغوش کر رکھا ہے۔ عمرِ رواں یہاں سبک پائی سے چلتی ہے۔ دیہاتوں کے بسنے والوں کی زندگی میں گرانی اور گراں باری کا دخل نہیں ہے۔ انہیں کوئی الجھاؤ نہیں ہے۔ ان لوگوں کی آرزوئیں اور تمنائیں بھی سیدھی سادی ہوتی ہیں۔ ان کی فطری سادگی ہی ان کی تسکینِ قلب کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ محنت و جفاکشی سے ان کے دل کی کلی کھلتی ہے۔ عناصرِ فطرت سے نبرد آزما ہو کر انہیں راحت ملتی ہے۔ بنجر زمین کے سینے کو دیپے ہل سے چیر کر ہرے بھرے کھیتوں اور سنہرے خوشوں کی سرزمین میں تبدیل کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ دہقان کے یہ کڑیل سپوت اپنا چوٹی کا پسینہ ایڑی تک بہاتے ہیں، اور جب اپنی فصل کو جھومتے دیکھتے ہیں تو ان کے دل باغ باغ ہو جاتے ہیں اور فضا میں مسرت کے نغمے گونجنے لگتے ہیں۔

اس سرسبز بستی کا سب سے شاداب مقام وہ پنگھٹ ہے جہاں صبح شام بڑی رونق اور چہل پہل رہتی ہے۔ یہ ایک پرانا کنواں ہے جو صدیوں سے بستی والوں کو اپنا ٹھنڈا میٹھا پانی پلا رہا ہے۔ یہ پانی نہیں آبِ حیات ہے جو بستی کی زندگی کا ضامن ہے۔ یہ بستی کا دل ہے، مرکزِ حیات ہے۔ صبح کے دھندلکے سے شام کے جھٹ پٹے تک پنگھٹ پر رونق رہتی ہے۔ گاؤں کی البیلی ناریاں کلسے اور گاگریں سنبھالے ٹولیاں بنا بنا کر آتی ہیں، اپنی باری آنے پر چھپا چھپ پانی بھرتی ہیں اور ہنستی کھلکھلاتی گھروں کو لوٹ جاتی ہیں۔ انہیں دیکھ کر ایک منچلا ہمک اٹھتا ہے

پانی بھرے ری کون البیلے کی نار جھما جھم
سر پر گھڑا، گھڑے پہ مٹکی
لچکت جائے کون البیلے کی نار جھما جھم

پنگھٹ کی گہما گہمی میں دنیا زمانے کی باتیں ہو جاتی ہیں۔ گھر یا بستی کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہوتا جس پر اظہارِ خیال نہ کیا جاتا ہو۔ پنگھٹ ہی پر مشورے بھی ہو جاتے ہیں اور الجھاوے سلجھ جاتے ہیں۔ ایک بڑی بی کہہ رہی ہیں۔

کریمن :۔ اے رحیمن بوا! ماشاءاللہ تمہاری بچی سیانی ہونے کو آئی۔ اس کے رشتے کا کوئی فکر نہیں کرتیں؟

رحیمن :۔ اے بہن فکر سا فکر ہے؟ راتوں کی نیند اڑ گئی ہے۔ ذرا کوئی ڈھنگ کا رشتہ مل جائے تو میں تو آج ہی اس کے ہاتھ پیلے کر دوں۔ بہن کریمن تم ہی کوئی بات بتاؤ

کریمن :۔ لو بوا تم نے مجھ سے پہلے ہی کیوں نہ کہا؟ تمہاری بیٹی سو میری بیٹی۔ تم کوئی غیر تھوڑی ہو۔ اے دیکھنا بوا رحیمن، ماموں شبراتی کو تو تم جانتی ہونا — اے وہی جن کی محمود نگر میں زمینداری ہے۔ ان کا لڑکا ہے زینو۔ بڑا نیک اور کماؤ پوت ہے۔ بھئی میں تو آنکھ بند کر کے اپنی صغو کی اس سے کر دیتی مگر میری بچی کی

ابھی بہت چھوٹی ہے۔ تم ہوتو یہ رشتہ تمہارے ہاں بھی کرادوں۔

رحیمن :۔ اے بہن نیکی اور پوچھ پوچھ ۔ اللہ کیا چاہے دو آنکھیں۔

اور پنگھٹ پر دو قسمتوں کا فیصلہ ہو گیا۔ دو ستارے مل گئے اور دو زندگیاں ایک ہو گئیں۔ دیہات کی الہڑ دوشیزہ دلہن بن گئی اور پنگھٹ پر اُسکا آنا جانا موقوف ہو گیا۔ اپنی سہیلیوں سے ملنے کو اُسکا جی تڑپتا اور وہ خیال ہی خیال میں دیکھتی کہ اسکی ہم عمر سہیلیاں ہنستی بولتی پنگھٹ کی طرف چلی جا رہی ہیں۔ اُسکا جی چاہتا کہیں بھی اس ہنسی کے جھرمٹ میں شریک ہو جاؤں، مگر بیاہ نے اسپر نئی نئی پابندیاں لگا دی تھیں۔ اب ساس نندوں، دیورانیوں جٹھانیوں، سُسر اور جیٹھ اور سب سے بڑھکر خود بالم کا اُسے خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اگر ذرا سی بھی اُونچ نیچ ہو گئی تو جان غضب میں آ جائے گی۔ اس نئی زندگی میں اُسے پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑے گا۔ میکے کا آرام ختم ہوا اب سُسرال کی کڑی منزل ہے۔ پنگھٹ کا ایک سہانا گیت اُسے یاد آ رہا ہے اور دل کو برما رہا ہے :۔

موری جھانجن جھناجن باج رہی رے — موری جھانجن
سُن پنگھٹ نہ جیّو دُلھنیا رے — دیکھ ڈیوڑھی پہ سُسرا بیٹھا
اے جی دِس سُسرے کی کیڑی نجریا رے — ہائے گھونگٹ پہ لہریں لے
موری جھانجن

سُن پنگھٹ نہ جیّو دُلھنیا رے — دیکھ جیٹا پہ جیٹھ بیٹھا
اے جی دِس جیٹھے کی کیڑی نجریا رے — ہائے گھونگٹ پہ لہریں لے
موری جھانجن

سن پنگھٹ نہ جیّو دُلھنیا رے — دیکھ کنوئیں پہ بلما بیٹھا
اے جی دِس بالم کی ترچھی نجریا رے — ہائے گھونگٹ پہ لہریں لے
موری جھانجن

پنگھٹ پر بڑی بھیڑ ہے۔ گرمیوں کا دہکتا سورج ابھی مشرق سے جھانکا ہی ہے کہ بستی کی سب ناریاں کنوئیں پر پہونچ گئیں۔ کوئی دم میں سورج اُبھر کر آگ برسانے لگیگا۔ کلسے تپنے لگیں گے۔ ٹھنڈے ٹھنڈے پانی بھر کر رخصت ہو جانا چاہیئے، ورنہ گرم ریت ہے، راہ دُو بھر ہو جائیگی۔ مگر یہاں سے جلدی چھُٹّی کیسے ملے۔ کہنے کو تو کنوئیں پر چار چرخیاں لگی ہیں اور چار ڈول کھنچ رہے ہیں مگر سب کو دو دو تین تین گھڑے بھرنے ہیں اور سب اس فکر میں ہیں کہ پہلے میں بھر لوں۔ یہاں پہلے ہی ریل پیل ہو رہی ہے۔ لو وہ لڑکیوں کا ایک اور ریلا آ پہونچا۔ تھوڑی دیر کھڑی پنگھٹ کی بہاریں دیکھتی رہیں پھر ان میں سے جو سب سے شریر تھی کہنے لگی :۔

چھمّو :۔ ارری بنجیا، آج تو اللہ رہے جو بارک آئے نے [illegible]

بنجیا :۔ اے بہن تو کیا دیکھتی ہیں جو سب بیٹھی ہیں؟

چھمّو :۔ اے مریں تیرے دُشمن بدنگاہ، اب آئے ہیں تو پانی لیکر ہی چلیں گے۔

بنجیا :۔ چھمّو بہن تم یہاں کھڑی کھڑی کیا سوچ رہی ہو؟ یہاں تو ابھی بڑی دیر لگیگی۔ چلو اُدھر گھاس کے تختے میں چل بیٹھیں۔

عیدن :۔ تو بیٹھ کر کیا ہوگا؟ کوئی یہاں بیٹھنے آئے ہیں؟

بنجیا :۔ اے ہاں پیچ تو ہے۔ چلکر بیٹھ جائیں۔ جب ذرا چھیڑ ہو جائیگی تو دیکھا جائے گا۔ بہن عیدن سے آج تو ہم وہ گیت سنینگے۔ وہ پنگھٹ پہ جو تم سکھی، وہ اچھی وہ گیت سُنا دو۔

عیدن :۔ گیت سنانے سے تو مجھے انکار نہیں مگر گیت میں میرا ساتھ کون دیگا؟

نیپا :- بھئی ہمیں تو یاد نہیں ورنہ ہم گا لیتے۔ ہاں ہاں چھمّو کو یاد ہے۔ آؤ چھمّو، تم اور عیدن مل کر گاؤ۔

چھمّو :- اچھا بہن، گائے دیتی ہوں۔ ایسا کرو کہ تم سب بھی آواز ملاتی رہو۔ اور بی نیپا، ڈھولک تو یہاں ہے نہیں، تم گھڑے ہی پر کہروا بجا لو۔

بھیگی آوازوں میں سب نے مل کر یہ گیت ایسا گایا کہ مزہ آگیا۔

پنگھٹ پہ بیٹھ سکھی۔ پنیا بھروں میں کیسے۔ پنگھٹ پہ بیٹھ سکھی

صبح سے شام ہوئی۔ گھر کی بھی سُدھ نہ رہی

آیا نہ پھر بھی کوئی ۔ راہ میں تکتی رہی

پنگھٹ پہ بیٹھ سکھی۔ پنیا بھروں میں کیسے۔ پنگھٹ پہ بیٹھ سکھی

کسی کی تو راہ تکے کاہے سُدھ بھولی ہے

پنیا کاہے نہ بھرے تو تو اُٹھ ہی رہی

پنگھٹ پہ بیٹھ سکھی۔ پنیا بھروں میں کیسے۔ پنگھٹ پہ بیٹھ سکھی

میں جو پنگھٹ کو چلی آنکھ پھڑکی تھی میری

سانوری سورتیا کوئی من کو لبھائے گئی

پنگھٹ پہ بیٹھ سکھی۔ پنیا بھروں میں کیسے۔ پنگھٹ پہ بیٹھ سکھی

اور ذرا یہ سماں بھی دیکھئے۔ پنگھٹ کی چہل پہل، رونق، چھیڑ چھاڑ کے حسین ماحول میں غم کی پرچھائیاں بھی نظر آجاتی ہیں۔ کیف و سرور میں ڈوبے ہوئے نغموں کے ساتھ ساتھ ایک ہوک سی بھی دل میں تیر کی طرح اُترتی چلی جاتی ہے۔ یہ ماری برہن کا بھیس بھرے، کیس بکھیرے، سب سے الگ تھلگ، سہیلیوں سے بیزار، ساری کائنات سے بے نیاز، سیندور اور چوڑیوں سے بے پروا، اپنے من کا الگ الاپ رہی ہے۔ اسے کسی سے غرض نہیں، کسی سے کوئی مطلب نہیں، اس کا سارا وجود بیتے ہوئے دنوں کی یاد کا مجسمہ ہے۔ سوزِ فراق نے اس کی زندگی کو سراپا الم بنا دیا ہے۔ ذرا سنیئے تو اس سوزِ فراق کی آگ میں جلی شمع کے ہونٹوں پر کون سا نغمہ دہک رہا ہے؟

لکڑی جل کوئلہ بھئی اور کوئلہ جل بھئی راکھ

میں پاپن ایسی جلی نہ کوئلہ بھئی نہ راکھ

دن زیادہ چڑھ آیا۔ اب پنگھٹ پر بھیڑ نہیں ہے۔ ایک البیلی نار سر پر اینڈوی اور اینڈوی پر گگرا رکھے ہاتھ میں ڈول اور رسی تھامے جلدی جلدی کنوئیں کی طرف چلی آرہی ہے۔ لباس سے کسی اونچے گھر کی لڑکی معلوم ہوتی ہے۔ چال میں بھی ایک طرح کی تمکنت ہے۔ بڑی بڑی ہرنی جیسی آنکھیں اِدھر اُدھر دیکھتی بھالتی آگے بڑھ رہی ہیں۔ پنگھٹ خالی دکھائی دیتا ہے تو جھٹ سے گگرا اتار کر ڈول کنوئیں میں ڈال دیتی ہے اور پانی کھینچنے لگتی ہے۔ ابھی اس نے دو ایک ہی ڈول بھرے ہوں گے کہ اتنے میں دیکھا کہ نازک سی نیلی گھوڑی پر ایک بانکا سوار بیٹھا کنوئیں کی طرف چلا آرہا ہے۔ البیلی نار نے ہاتھ روک کر اپنا گھونگٹ کاڑھا اور پھر اپنا ڈول کھینچنے لگی۔ وہ سوار آکر کنوئیں کی مینڈ کے پاس کھڑا ہو گیا۔ حسین لڑکی کو پانی بھرتے دیکھ کر بولا :-

"گوری مجھے بڑے زور کی پیاس لگ رہی ہے۔ تھوڑا سا پانی پلا دے تو مسافر اپنی راہ لے" اور پھر ان دونوں میں ایک دلچسپ بحث شروع ہو گئی :-

عورت :- اے جی نیلی سی گھوڑی پاتلی اور پاتلیا ہے سوار، اے سانوریا ہے سوار۔

مرد :- پیاسے کو پانی پلا موری گوری تو راہ مسافر جائے۔

عورت :- اے جی بھر پیو چھیلا بھر پیو، اور بھر پیو ڈول پچاس

جب دے سیاں کی میں بانی ہو دیا تو تم سے ہیں راج ضرور

یوسف احمر

★

مہوا

لوک کہانیوں میں ہر قوم کی اپنی تہذیب کا پرتو ہوتا ہے۔ ان میں صدیوں پرانی وہ روایات ہوتی ہیں جو رفتہ رفتہ قوموں کا اپنا مزاج بن جاتی ہیں۔ ان کہانیوں کا خالق کوئی بہت بڑا ادیب یا شاعر نہیں ہوتا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو اپنے محسوسات کو نطق کا جامہ پہنا دیتے تھے۔ ان میں نہ فضا کا خیال رکھا جاتا تھا نہ زبان کی طرف توجہ دی جاتی تھی۔ البتہ کہانی کا تسلسل ٹوٹتا نہیں تھا اور جذبات آفرینی پر ان کو قدرت کاملہ تھی۔

مشرقی پاکستان کی لوک کہانیاں بھی دنیا کی دیگر قوموں کی لوک کہانیوں کی طرح صدیوں پرانی ہیں۔ چھ سات سو سال میں ان گنت انقلابات آئے۔ کتنی حکومتوں کو عروج و زوال ہوا۔ معاشرہ میں کیسی کیسی تبدیلیاں نمودار ہوئیں۔ خود بنگالی ادب مختلف ادوار سے گزرا۔ مگر یہ لوک کہانیاں زمانہ کے دست برد سے محفوظ رہیں۔ ان کو محفوظ رہنا ہی چاہیئے تھا کیونکہ ان میں بنگال کی پرانی تہذیب کی روح پوشیدہ ہے۔ ان میں ہمارے قدیم معاشرے کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ان کے اندر ہمارے جذبات و احساسات کی وہ چنگاریاں ہیں جو آج گلہائے رنگا رنگ بن کر ہمیں دعوت نظارہ دے رہی ہیں اور ہم ان کی مہک سے اپنے دلوں میں طمانیت محسوس کر رہے ہیں۔

بنگال کی لوک کہانیاں جو آج کتابوں میں محفوظ کی گئی ہیں بہت قدیم ہیں لیکن ان کی دریافت کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ ان کی دریافت میں پیہم کوششوں اور مسلسل تگ و دو کو دخل ہے۔ ادب کے دیوانوں نے گاؤں گاؤں جا کر ان کا کھوج لگایا۔ برسوں تحقیقات کی گئیں۔ ان تحقیقات میں محققین کا خون جگر شامل ہے۔ اگر وہ اپنی تحقیقات میں خون جگر شامل نہ کرتے تو مہوا، ملوا، دیوان مدینہ، فیروز خاں، چندراوتی، کاجل ریکھا کنک چمپا وغیرہ جیسی معرکہ آرا کہانیاں کہاں سے ملتیں۔ ان کہانیوں کو پڑھ کر ہمیں اپنی پرانی تہذیب کا علم ہوتا ہے۔ ہمیں اپنے گاؤں کے اس معاشرہ کا علم ہوتا ہے جو حسن و عشق، محبت و نفرت، دکھ سکھ اور آہ و فریاد سے عبارت ہے۔ ان کہانیوں میں بنگال کی نرم نرم اور سوندھی سوندھی مٹی کا وہ جادو ہے جس نے ہر دور میں اور ہر موسم میں دلوں کو موہ لیا۔ ان میں وہ نغمہ سانس لے رہا ہے جس کی ہر لے رگ جاں کو کاٹ جاتی ہے۔ ان میں گاؤں کی ان کنواری ناریوں کا بانکپن ہے جو شام ڈھلے پنگھٹ پر اپنے دلوں کی دھڑکنیں گنتی تھیں۔ ان میں ان کے نینوں کے وہ تیر ہیں جو محبوب سنگ دلوں کے پار ہو جاتے تھے۔ ان میں ان کا وہ نطق ہے جو سادہ ہونے کے باوجود اپنا اثر چھوڑ جاتا ہے۔ ان میں ان کا وہ جذبۂ دروں ہے جو حدّتِ عشق سے معمور ہے۔

بنگالی لوک کہانیوں کی کثیر تعداد ضلع میمن سنگھ سے دریافت ہوئی ہے۔ ان کہانیوں کو گاؤں کے ان پڑھ شاعروں نے سنا۔ یہ کہانیاں ان کے دلوں پہ نقش کر گئیں اور پھر انہوں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی مگر جذبات آفریں زبان میں ان کو بیان کیا۔ وہ گو رسم الخط سے نابلد تھے لیکن

ان کے دلوں میں احساسات وجذبات کے جو چراغ جل رہے تھے انکی لَو نے کہانیوں کو گرمی دے دی۔ بنگال کے مشہور نقاد ڈاکٹر دنیش چندر سین
لکھتے ہیں کہ بنگال کے جن شاعروں نے ان کہانیوں کو نظم کیا ہے ان کے آنسوؤں کے سوتے خشک ہو گئے لیکن سامعین کے آنسو کبھی خشک نہیں
ہو سکتے۔ مشرقی میمن سنگھ کے دریا اور جھیل، جنگل اور کھیت فضاؤں میں چہچہاتے ہوئے رنگ برنگ کے طیور، شام کے جھٹپٹے کا منظر۔
یہ وہ مناظر ہیں جن کو دیکھ کر ہم دریائے ٹیمس، ایمسٹرڈیم اور روم کے وینس کو بھول جاتے ہیں۔ ہمارے دلوں میں انڈرومیکی، ایسیلینڈا، ڈلیجنڈ
اور لورا جو جذبے پیدا نہیں کر سکتیں وہ ہماری لوک کہانیوں کی ہیروئن مہوا اور ملوا جگا سکتی ہیں۔

ڈاکٹر دنیش چندر سین کے مذکورہ الفاظ میں بڑی حد تک صداقت ہے۔ آپ آج بھی میمن سنگھ جائیں تو وہاں کی ہواؤں میں ان
کہانیوں کی عطر بیز خوشبو ملے گی۔ برہم پترا کی تیز خرام لہریں شاہد ہیں کہ اسی کے کنارے آج سے سینکڑوں سال پہلے گاؤں کی کنواریاں اپنے دلوں
محبت کے دیپ جلا کر اپنے من موہن سے چوری چھپے ملاقاتیں کرتی تھیں۔ اس کی لہروں میں نہ جانے ان کے آنسوؤں کے کتنے ان گنت قطرے
شامل ہیں۔ یہاں کی شفق میں ان کے ہونٹوں کی سرخیاں جذب ہو گئی ہیں۔ یہاں کی فضاؤں میں ان کے وہ گیت آج بھی بال کھولے ہیں جو کبھی دلوں
دھڑکن پیدا کر دیتے تھے۔

ان کہانیوں کو پڑھ کر ہم پرانے بنگال کی اس دلہن کو دیکھ سکتے ہیں جو سدا سہاگن تھی ــــ جو کھیتوں میں ہرنیوں کی طرح چوکڑی بھرتی
قمریوں کی مانند چہکتی اور بلبلوں کی طرح گاتی تھی۔ جس کے کھیتوں میں کبھی کال نہیں پڑتا تھا۔ جس کے گاؤں میں کبھی سیلاب نے تباہی نہیں مچائی۔ جس کے
دریا کبھی نہیں ابلے۔ جس کے آسمان نے کبھی غضب نازل نہیں کیا۔ جس کے ہونٹ کبھی بھوک سے نہیں تڑپے۔ جس کی آنکھوں نے رونا نہیں سیکھا۔
یہ سدا سہاگن ــــ بنگال کی یہ دلہن بڑی ہی شرمیلی تھی۔ اس کے من میں برہم پترا، پدما، میگنا، دھلیشوری، اور جمنا کا منظر ہے۔ تو
اس کے لبوں میں بلبل ہزار داستاں کی مٹھاس تھی۔ اس کی آنکھوں میں نرگس کا خمار تھا۔ اس کے جذبات میں میگھ ملہار کی حدت تھی۔ وہ محبت کے لئے
زندہ رہتی اور اس کے لئے جان دیتی تھی۔ وہ کاگا کی کائیں کائیں سن کر یکدم سے چونک پڑتی اور خوش ہوتی تھی کہ اس کے من کا ساجن آج آنے والا ہے۔

"مہوا" مشرقی پاکستان کی نمائندہ عوامی کہانی ہے ــــ ساڑھے تین سو سال پرانی!

کہانی اس طرح شروع ہوتی ہے۔

عہد قدیم میں گارو پہاڑ کے شمال اور ہمالیہ پربت کے دامن میں بنجاروں کا ایک قبیلہ آباد تھا۔ اس قبیلے کا سردار تھا ایک نہایت کریہہ منظر
دیو ہیکل انسان ــــ ہومرا ــ ایک رات کا واقعہ ہے کہ ہومرا نے اپنے ساتھیوں کو لے کر ایک گاؤں پر ڈاکہ ڈالا۔ یہیں ہومرا کو چھ ماہ کی ایک
بچی ملی۔ اس بچی کو وہ اپنے ساتھ اٹھا لایا۔ اس کی پرورش بڑے ہی ناز و نعم سے ہوئی۔ دن گزرتے گئے۔ اب وہ سولہ سال کی ہو گئی تھی۔ اس کا حسن
پہلے سے زیادہ نکھر آیا تھا۔ قبیلہ کے لوگ اسے للچائی آنکھوں سے دیکھتے۔ اس کا نام مہوا رکھا گیا۔ اس کے حسن کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

وہ چلتی تو اس کے لمبے لمبے بال اس کے پاؤں چومتے
بولتی تو چمپا کے پھول کھل اٹھتے تھے۔
آنکھیں یوں چمکتی تھیں جیسے آسمان پر تارے جگمگ کر رہے ہوں۔

بنجاروں کا یہ قافلہ کہیں ایک جگہ قیام نہیں کرتا تھا۔ تھوڑے تھوڑے دنوں کے وقفہ کے بعد مختلف گاؤں دیہات میں ڈیرا جاتا۔ اسی طرح
گھومتے پھرتے یہ قافلہ ندیا ضلع پہنچا۔ وہاں کے قریبی گاؤں میں ایک نوجوان نودیر چاند زمیندار کا بیٹا رہا کرتا تھا۔ خوش شکل ہونے کے ساتھ ساتھ
اس کے پاس دولت بھی لا انتہا تھی۔ وہ مہوا کو دیکھ کر ایسا گھائل ہوا کہ مہوا کو دل دے بیٹھا۔ اس نے مہوا کو ڈیرا ڈالنے کے لئے زمین دی۔ دراصل وہ
مہوا کی خاطر سب کچھ قربان کرنا چاہتا تھا۔

اب لودیر چاند کی کیفیت دگرگوں ہوتی گئی۔ مہوا کے حسن نے اسے پاگل بنا دیا تھا اور وہ دیوانہ سا ہو گیا تھا۔

ایک دن مہوا کو تب دیکھ کر غسل کرنے پنگھٹ گئی اور جا رہی تھی کہ لودیر چاند نے اسے روک لیا اور اس طرح اپنے جذبات کا اظہار کیا:

لڑکی ذرا میرے قریب آ — آ کہ میں تجھ سے اپنے دل کی کیفیت بیان کرنا چاہتا ہوں۔

دیکھ سورج ڈھل چکا ہے، چاندنی چھٹکنے والی ہے،

ایسے میں تو پنگھٹ کے اندر جا رہی ہے۔

میرا دل گوارا نہیں کرتا کہ تو یوں اکیلی جائے۔

میں بھی جاؤں گا تیرے ساتھ، اور گاگر بھر کر تیری کمر پہ رکھوں گا۔

ذرا یاد کر وہ باتیں جو میں نے کل تجھ سے کی تھیں۔

مہوا۔ تم مرد ہو اجنبی، میں ہوں غیر لڑکی۔ تم سے کچھ کہتے ہوئے لاج آتی ہے مجھے۔

لودیر چاند:۔ لڑکی تو پانی بھرتی جا اور مجھ سے باتیں بھی کر کہ ہمارے درمیان اور کوئی نہیں ہے۔ اچھا یہ تو بتا کہ اس گاؤں میں آنے سے پہلے

تو کہاں تھی — تیرے ماں باپ کون ہیں؟

مہوا:۔ میں لڑکی ہوں بن ماں باپ کی۔ میرا کام دریا کی لہروں کی طرح بہنا ہے۔ قسمت میں بنجاروں کے ساتھ گھومنا لکھا تھا۔ اپنی ہی آگ

میں جل کر راکھ ہو رہی ہوں۔ یہاں میرا کوئی ہمدرد نہیں کہ اس کو من کی بپتا سناؤں — اور پھر کون ہے جو میرے محسوسات

کو سمجھ سکے۔ تم سکھی ہو کہ آباد ہے تمہارا گھر۔

لودیر چاند:۔ لڑکی اب تک میں کنوارا ہوں۔ دل تو تیری اور کھنچ رہا ہے۔

مہوا:۔ کتنے سنگدل ہیں تمہارے ماں باپ کہ ایسی چڑھتی جوانی برباد ہو رہی ہے۔

لودیر چاند:۔ ہاں سنگدل ہیں میرے ماں باپ اور کٹھور ہے میرا دل۔ پر تجھ جیسی لڑکی مل جائے تو میں اپنا گھر بسا لوں۔

مہوا:۔ شرم نہیں آتی تمہیں ایسے کہتے ہوئے۔ ڈوب مرو گلے میں گاگر لٹکا کر۔

لودیر چاند:۔ لڑکی کہاں سے پاؤں گا میں گاگر اور کہاں ملے گی ڈور۔ تو گنگا بن جا تو ڈوب جاؤں اس میں۔

رفتہ رفتہ دونوں کی ملاقاتیں بڑھتی گئیں۔ دونوں کے دلوں میں محبت کی آگ لگ چکی تھی۔ لیکن ہو تمرا کے ہوتے ہوئے ان کی امیدیں بر

آتی نظر نہ آتی تھیں۔ بالآخر دونوں نے بھاگ نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔

پھاگن کا مہینہ ختم ہو چکا تھا۔ چیت کے ابتدائی دن تھے۔

درختوں کی شاخوں پر کوئلیں کوہو کوہو کر رہی تھیں،

ستائی ہوئی دھان سورج کی تمازت میں پک کر تیار ہو گئے تھے۔

ایسے میں آدھی رات کو لودیر چاند نیند سے بیدار ہوا۔ بانسری لی اور بجانے لگا۔

بانسری کی جادو بھری لے سن کر مہوا کا من ایک دم سے پاگل ہو گیا۔ وہ بھی نیند سے بیدار ہو گئی۔ وہ اٹھی اور چلتے چلتے پنگھٹ کے

پاس آئی۔ پنگھٹ کے پاس لودیر چاند موجود تھا۔ اس نے مہوا کو دیکھتے ہی کہا۔

لڑکی تیری خاطر میں سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں ـــــ ماں باپ، دھن دولت۔

مہوا:۔ پیارے میں ہوں ناری بیچاری، اور تم ہو میرے گلے کی مالا۔ پھول ہوتے تو میں اپنے بالوں سے تمہیں ڈھانک کر رکھتی۔

یہ کہہ کر دونوں چپ چاپ وہاں سے بہت دور نکل آئے۔ راستے میں ایک ندی دکھائی دی۔ اس کے چاروں اور ہرے بھرے جنگل تھے۔ دونوں کو یہ جگہ پسند آئی۔ وہیں انہوں نے ایک جھونپڑا ڈال لیا ـــ بڑے سکون اور اطمینان سے زندگی کے دن گزرنے لگے۔

ہومرا سو کر اٹھا تو مہوا لاپتہ تھی۔ اور جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ نودیر چاند بھی غائب ہے تو حقیقت آشکار ہو گئی۔ غصے کے مارے اس کا برا حال تھا۔ اس نے دونوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ مدت تک وہ دونوں کی تلاش و جستجو میں گاؤں گاؤں کی خاک چھانتا پھرا اور ایک دن اتفاقاً اس جگہ اس نے اپنا ڈیرا ڈال لیا جہاں دونوں موجود تھے۔

گہری اندھیری رات تھی۔!

آسمان پر چند تارے ٹمٹما رہے تھے۔ اس سمے ہومرا ندی کنارے جا رہا تھا۔ یکایک اس نے مہوا کو دیکھا اور اس کے قریب آیا وہ سوئی ہوئی تھی۔ ہومرا نے کہا!

"بیدار ہو جاؤ مہوا، دیکھ میں ہوں تیرا باپ۔ سولہ سال تک میں نے تجھ کو پال پوس کر بڑا کیا اور اس کا صلہ یہ دیا تو نے۔"

مہوا چونک اٹھی۔ یہ تو سچ مچ اس کے باپ کی آواز تھی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ہومرا نے پھر کہا:۔

"لے یہ خنجر اور جا اتار دے اس کے سینے میں۔"

مہوا کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ تارے بھی بادل میں چھپ گئے۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے خنجر لے لیا اور نودیر چاند کی طرف بڑھی۔ اس کے سر کے بال پاؤں کو چوم رہے تھے اور آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ بالآخر دل پر پتھر رکھ کر وہ نودیر چاند کے پاس آئی اور بولی

"بیدار بھی ہو جاؤ اب خواب سے۔ دیکھو تمہارے سامنے بھاگ جلی مہوا کھڑی ہے اور اس وقت میرے ہاتھ میں خنجر بھی ہے سنگدل باپ کا حکم ہے کہ یہ خنجر تمہارے سینے میں اتار دوں۔ ہاں سنگدل ہیں میرے ماں باپ اور کٹھور ہے میرا دل لیکن بتاؤ تو سہی تمہیں مار کر میں تنہا گھر کیسے جا سکوں گی۔ جو چراغ میں نے گھی سے جلایا تھا اب اس کو کیسے بجھا دوں؟"

نودیر چاند نیند سے بیدار ہو گیا۔ اس پر سکتے کا عالم طاری تھا۔ مہوا پھر بولی:۔

"پیارے کیسے اتار سکتی ہوں یہ خنجر تمہارے سینے میں یہ تو میرے لئے ہے۔ بھاگ جاؤ یہاں سے اور اپنے گاؤں پہنچ کر کسی حسین لڑکی سے شادی رچاؤ۔ شہزادے کا گھر تباہ نہیں کر سکتی میں۔ میں تو خانہ بدوش ہوں۔ مجھے یہیں چھوڑ دو۔"

نودیر چاند! میں بھی اپنے ماں باپ کو خداحافظ کہہ کر آیا ہوں۔ کیسے جا سکتا ہوں تجھے چھوڑ کر۔ تو تو میری کلی ہے اور میں ہوں تیرا بھونرا۔ لے اتار دے خنجر میرے سینے میں۔

مہوا:۔ پیارے چلو جہاں ہماری یہ دو آنکھیں لے جائیں۔ ندی کنارے، وہ دیکھو ادھر، باپ کا تازی گھوڑا بندھا ہے اس کی پشت پر سوار ہو کر ہم فرار ہو جائیں یہاں سے۔ کسی کو خبر تک نہ ہوگی۔ چاند سورج ہمارے گواہ رہیں گے۔

اور اس کے بعد دونوں گھوڑے پر سوار ہوا سے باتیں کرتے ہوئے بہت دور نکل گئے۔ راستے میں کتنے جنگل آئے کتنی ندیاں آئیں مگر دونوں نے ہمت نہ ہاری۔ یہاں تک کہ ایک چڑھتا ہوا دریا سامنے آ گیا۔ (نو)دیر چاند نے لگام کھینچ لی۔ گھوڑا رک گیا۔ دور سے ایک کشتی آتی ہوئی دکھائی دی۔ ان کے دلوں کو اطمینان ہوا۔ دونوں نے اس پر بیٹھ جانے کی ٹھانی۔ کشتی نزدیک آئی تو دونوں نے مانجھی کی منت سماجت کی۔ مانجھی نے مہوا کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ اس نے دونوں کو اپنی کشتی پہ بٹھا لیا لیکن مانجھی کی نیت خراب تھی اس نے نودیر چاند

لوہروں کے حوالے کر دیا۔ مہتو اکے ہوش و حواس معطل ہو گئے۔ نور پر چاند کی آواز اس کے کانوں میں آ رہی تھی!

"نہ باپ سے ملاقات ہوئی، نہ ماں سے مل سکا،
دشمن کے ہاتھوں پھنس کر آخر موت آ ہی گئی۔
لڑکی الوداع! الوداع اب ملاقات نہیں ہو سکتی؟
مہتوا:۔ جو لہریں میرے نور پر چاند کو بہا کر لے گئیں،
میں بھی ان ہی لہروں میں مرجانا چاہتی ہوں"

یہ کہہ کر مہتوا دریا میں چھلانگ لگانے ہی والی ہی تھی کہ مانجھی نے اسے پکڑ لیا اور اس کے حسن کی تعریف اس طرح کرنے لگا۔

مانجھی:۔ تیری آنکھیں ہیں کرسنگترے کے پھانک اور تیرے یہ بال ۔ کہ جیسے بادلوں کے قافلے۔
لڑکی دیکھ میری اور آنکھیں اٹھا کر، اس کہ تیری جوانی سدا بہار رہیں۔
میں تجھے نیلے آسمان جیسی ساری لاکر دوں گا اور ناک کے لئے سونے کا پھول۔
لاؤں گا تیرے سیاہ اور لمبے بالوں کے لئے خوشبودار تیل۔
میرے گھر میں غلام اور باندیوں کی کمی نہیں۔ تجھ کو ذرا بھی تکلیف نہیں ہوگی۔ وہ تیرے پاؤں دھلائیں گی۔ سنہرے پلنگ پر تیرا بستر ہوگا۔
برف آلود جاڑے کی فکر نہ کر۔ تیرے لئے لحاف تیار ہے کنیزیں ہر دم دست بستہ تیرے حضور میں کھڑی رہیں گی۔ میرے گھر میں ہاتھی گھوڑے اور لاؤ لشکر ہیں۔ تو تو ملکہ بن کر رہے گی۔
اندر محل کے پھولوں کا حسین باغ ہے۔ ہم دونوں صبح و شام اس باغ میں جا کر پھول توڑیں گے۔
تو پان کے بیڑے مجھے کھلائے گی اور میں تجھے کھلاؤں گا۔
ایسی ساری لاکر دوں گا جس کی قیمت لاکھ روپے سے کم نہ ہوگی اور تیرے بالوں کے جوڑے میں موتی یوں بھردوں گا جیسے درخت پھل سے لدے ہوتے ہیں۔
گلے کے لئے چندر ہار بناؤں گا اور ناک کے لئے نتھ اور پاؤں کے لئے گھنگھرو کہ جب تو چلے تو راگ پیدا ہوں۔"

مانجھی کی ان باتوں کو سن کر مہتوا نے پان بنایا اور چونے کے بیچ میں اس نے زہر ملا دیا۔ مانجھی پان کھا کر خوشی سے جھوم اٹھا۔ اس نے کہا:

"لڑکی تو نے ایسا پان کھلایا ہے کہ تعریف نہیں کر سکتا۔
جی چاہتا ہے تیرے بازو پر اپنا سر رکھ دوں اور سکون کی نیند سو جاؤں۔"

مہتوا نے جب مانجھی کی یہ کیفیت دیکھی تو مارے ہنسی کے اس کا برا حال ہو گیا۔ اور جب اس کے ہوش و حواس ایک دم سے غائب ہو گئے تو مہتوا نے اس کو دریا برد کر دیا۔

دریا پار کر کے مہتوا جب خشکی پر آئی تو اس نے نور پر چاند کو تلاش کرنا شروع کر دیا ۔۔۔ وہ تلاش کرتی اور کہتی جاتی تھی!

"کس جنگل بن میں میرے سپنوں کا راجہ گم ہو گیا ہے،
میں دکھی ابھاگن چلی کہاں کہاں اس کو ڈھونڈتی پھروں!
میں بنجارے کی لڑکی ہوں آپ سے بیگانہ ہو کر بھٹک رہی ہوں ــــــ کہاں سے یہ پردیسی آیا کہ میں سب کو چھوڑ کر بھاگ گئی۔"
اس طرح مہوا لودیر چاند کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے بہت دور نکل گئی۔ یہاں تک کہ وہ ایک مندر کے پاس آئی۔ سنیاسی نے اسے دیکھا اور وہ بھی سب کچھ بھول کر اسی کے گن گانے لگا:۔

"لڑکی آخر تو کس دیس سے بھٹک کر یہاں آئی ہے،
کس راجہ نے بن باس کر دیا تجھے،
اس کسنی میں تجھ سے کیا پاپ سرزد ہو گیا تھا،
کتنے سنگدل ہیں تیرے ماں باپ کہ تیری خبر تک نہیں لیتے۔"

مہوا سنیاسی کے پاؤں پکڑ کر رونے لگی اور اس نے رو رو کر اپنا سارا دکھڑا بیان کیا۔ سنیاسی نے سن کر کہا: ۔
جنگل کے یہ پتے توڑ کر جمع کر دو ں گا۔ ان پتوں ہی میں تیرے پتی کی جان ہے۔ تیرا پتی مرا نہیں زندہ ہے ۔ وہیں ہے ۔ اسی جنگل میں۔
مہوا جنگل کے پتے لے کر اس کی تلاش میں نکلی۔ سچ مچ وہ اس جنگل میں تھا۔ وہ مل گیا۔ لیکن بھوک پیاس سے نیم جان اور نڈھال ہو رہا تھا۔ مہوا کو دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھا۔ اس نے اشارے سے کچھ کھانے کے لئے مانگا۔

چھ ماہ بعد!
مہوا نے جھرنا کا پانی پلا کر اور ان درختوں کے پھل کھلا کر لودیر چاند کو نئی زندگی دی۔ دونوں نے پہاڑوں کے دامن میں جھونپڑا ڈالا اور وہیں رہنے لگے۔
ایک دن کا ذکر ہے،
مہوا کے کانوں میں شکاری کتوں کے بھونکنے کی آواز آئی۔ اس نے غور سے دیکھا تو ہومرا اپنے قافلہ کے ساتھ آتا دکھائی دیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں خنجر تھا اور غصہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اور جب ہومرا قریب آیا تو اس نے مہوا سے کہا:۔
"لڑکی تو زندہ رہنا چاہتی ہے تو لے یہ خنجر اور اس کے سینے میں اتار دے۔ اس بار تو مجھے دھوکا دے کر بھاگ نہیں سکتی۔ میں اپنے لڑکے سے تیری شادی رچانا چاہتا ہوں۔ چل جلدی اس کا خاتمہ کر کے۔"
مہوا۔ لودیر چاند تو میرا پتی ہے۔ کیسے اتار سکتی ہوں اس کے سینے میں خنجر۔ یہ خنجر تو میرے سینے میں اترنے کے لئے ہے۔ پہلے میں اپنا خاتمہ کر دوں۔
ہومرا۔ احمق لڑکی تجھے کیا ہو گیا اس کی داسی بنکر۔ چل میرے ساتھ۔ وہ تیرا انتظار کر رہا ہے۔ کتنی مشکل سے میں تجھے ڈھونڈنے میں کامیاب ہوا ہوں۔
مہوا۔ اپنے پتی کو ہلاک کر کے کیسے جاؤں دیس۔ میں اس کے ساتھ بیاہ نہیں کر سکتی۔
اور یکبارگی کالا دیو ہومرا گرجنے لگا۔ مہوا نے خنجر اس کے ہاتھ سے لے لیا اور اپنے پتی سے کہنے لگی۔

میوا۔ میرے سہاگ مجھے الوداع کہو ـــــ آخری بار!

ہوترا کی محبت غالب آگئی اور اس نے کہا:

"چھ ماہ کی بچی تھی تو جب میں تجھے اٹھا کر لایا تھا۔ اب میں تجھے چھوڑ کر اپنے گاؤں کیسے جا سکتا ہوں۔ آنکھیں کھول! دیکھ مجھے! میں واپس نہیں جاؤں گا۔"

اتنا کہنے کے بعد ہوترا نے اپنے قبیلہ کے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا ـــــ "تم لوگ مل کر ایک قبر تیار کرو اور اس میں دونوں کو دفن کر دو۔" فوراً ہوترا کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ دونوں کو زندہ در گور کر دیا گیا۔

بہت دن گزر جانے کے بعد یہ آواز فضا میں گونجنے لگی:

"کب تک سوتی رہو گی، اٹھو بھی جاؤ۔ بنجارے جا چکے ہیں۔ اب یہاں کوئی نہیں۔ اٹھ جاؤ اور لو دیر چاند! اپنے محبوب کے ساتھ گھر باؤ۔ دیکھو میں نے تم دونوں کے لئے پھولوں کے ہار گوندھے ہیں اٹھ جاؤ . . . . اٹھ جاؤ۔"

خبرنامہ

اطراف عالم

فرانسیسی ادیب روایتی طور پر اپنے ملک کے سماجی و سیاسی معاملات میں پرجوش حصہ لیتے رہے ہیں۔ نصف صدی پہلے زولا نے جس زور شور سے ڈریفس کیس میں دلچسپی لی تھی کچھ اسی طرح آج کے فرانس کے زندہ ادیب الجزائر کے سلسلے میں اپنی ملکی قیادت کی خدمت کرتے رہے ہیں۔ پچھلے دنوں سولہ ادیبوں اور دوسری قابل قدر ہستیوں نے ایک مشترکہ بیان میں فرانس کی حکومت سے الجزائر کے مسئلے کو پرامن طور پر حل کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ فرانسیسی ادیبوں کے ان بیانات اور مظاہروں کو ساری دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے اور پچھلے ماہ جب فرانسواز ساگاں نے ایک الجزائری لڑکی جمیلہ بوپاچہ پر فرانسیسی فوج کے مظالم کی داستان لکھی تو اسے دنیا کے سارے اخبارات نے نمایاں سرخیوں کے ساتھ چھاپا۔ تبصرے کئے، اداریے لکھے مظلوم جمیلہ کی رہائی کے لئے — جس پر الجزائری قوم پرستوں کی حمایت کا الزام لگایا گیا تھا۔ خاطر خواہ کوششیں کی گئیں۔ بائیس سالہ ساگاں شاید اس وقت ملک کے مشہور ترین نوجوان ادیبوں میں ہے۔ اس نے اپنے صحافتی مضمون میں پوری تفصیل سے جمیلہ کی کہانی لکھی ہے کہ کس طرح اسے دوران حراست فرانسیسی ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا اور اس سے جابرانہ طریقے سے ایک کیفے میں بم رکھنے کا اقرار لے لیا گیا۔ ساگاں کے اس مضمون کا اثر فوری ہوا اور دنیا بھر کی شدید مذمت کے بعد فرانسیسی فوج کو بھی یہ ماننا پڑا کہ جمیلہ پر بے جا دباؤ ڈالا گیا تھا لیکن جمیلہ اب بھی قید میں ہے اور اس پر ملک کے خلاف سازش کرنے کے الزام کا مقدمہ ابھی اختتام تک نہیں پہنچا ہے

لندن ائیرپورٹ پر عالمی شہرت کے ... ٹیکسوں کی ادائیگی کیلئے جو تقریباً ۵۵ ہزار ڈالر تھا پچھلے ماہ کے پہلے ہفتے میں کچھ قیمتی دستی سودے کا

نیلام کیا گیا۔ اس نیلام میں سب سے زیادہ دام ای۔ ایم۔ فارسٹر کے اس صدی کے اہم ترین ناولوں میں سے ایک ــ "اے پیسج ٹو انڈیا" کو ملے۔ فارسٹر کے اپنے قلم سے سنہری روشنائی میں لکھا ہوا اس ناول کا اصل مسودہ اٹھارہ ہزار دو سو ڈالر میں فروخت ہوا۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی عظیم تخلیق "دی ویسٹ لینڈ" کا مسودہ دس ہزار چھ سو چالیس ڈالر میں بکا ــ یہ مسودہ لائبریری کیلئے ایلیٹ نے بڑی محنت سے دوبارہ اپنے ہاتھ سے لکھا تھا کیونکہ ۱۹۳۳ء میں کہیں گم ہو گئی اس نظم کا اصل مسودہ کہیں کھو چکا ہے۔ پورے نیلام میں اکہتر ہزار ڈالر سے زیادہ کے قلمی نسخے بک گئے۔ فارسٹر کے ناول کیلئے جو رقم ادا کی گئی ہے وہ اب تک کسی بھی حیات ادیب کے مسودے کی قیمت سے زیادہ ہے۔ "اے پیسج ٹو انڈیا" ۱۹۲۴ء میں پہلی بار چھپا تھا۔ مشرق اور مغرب کی کشمکش کی یہ داستان آج بھی نیا پن رکھتی ہے اور ابھی پچھلے دنوں ایک ہندوستانی خاتون مسز راؤ نے اسے ڈرامہ کی شکل دی ہے۔ یہ ڈرامہ آج کل لندن کے اسٹیج پر کھیلا جا رہا ہے اور اس میں پاکستان کے ضیاء محی الدین مرکزی کردار ادا کر رہے ہیں۔

● امریکہ کا ایک چہیتا ادیب جون۔ پی۔ مارکوئنڈ ۱۶ جولائی کی رات کو ۶۶ سال کی عمر پاکر اپنی نیند کے دوران فوت ہو گیا۔ مارکوئنڈ اس دور کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے امریکی ناول نگاروں میں سے ایک تھا اور اسکی بیشتر کتابیں سب سے زیادہ چھپنے والی کتابوں کی فہرست میں اونچا مقام پا چکی ہیں۔ مارکوئنڈ اپنے ملک کے اونچے متوسط طبقے کی عکاسی میں ماہر تھا اور اسکے تخلیق کردہ کچھ کردار امریکی یادداشت کا حصہ بن چکے ہیں۔

مارکوئنڈ نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۱۵ء میں اپنی تعلیم کے اختتام پر کیا۔ پہلے اس نے مشہور صحیفے "سیٹرڈے ایوننگ" میں کہانیاں لکھیں اور جلد اپنے لئے ایک مقام پیدا کر لیا۔ ۱۹۳۷ء مارکوئنڈ نے "دی لیٹ جارج ایپلے" لکھا اور اس ناول پر اسے "پلٹزر پرائز" ملا اس کے بعد مارکوئنڈ نے اور کئی ناول لکھے جو کافی شہرت پاتے رہے۔ مارکوئنڈ بڑے ریاض سے لکھا کرتا تھا اور اپنی فطری نرم دلی کے باعث اس نے اپنے ناولوں تک میں زندگی کو اسی روپ قبول کیا جو اس کے سامنے تھا۔ بہت آخر میں اپنے ناول "پائنٹ آف نورٹرن" میں اس نے مغرور دنیا کی بڑھتی ہوئی حماقتوں پر نکتہ چینی کی مگر اس سے پہلے وہ ہمیشہ صرف تصویریں بناتا رہا۔

● ادیبوں اور صحافیوں کی بین الاقوامی جماعت پی۔ ای۔ این نے ریو ڈی جنیرو میں پچھلے ماہ کے آخری ہفتہ میں اپنے سالانہ اجلاس کے دوران ایک ریزولیشن کے ذریعے جنوبی افریقہ میں ادیبوں کے حالات پر تشویش کا اظہار کیا۔ یہ ریزولیشن آسٹریلوی وفد کے ایک نمائندہ نے پیش کیا تھا جس میں ساری دنیا کے ادیبوں کیلئے آزادیٔ اظہار کا مطالبہ کیا گیا۔ جنوبی افریقہ کے ادیب لوئی سوڈن نے قرارداد کی تائید کی

● لندن ۱۸ جولائی میتھاڈسٹ چرچ کانفرنس نے اپنے سالانہ اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعے ایسی کتابوں کی اشاعت کی مذمت کی ہے جو جنس اور سادیت کے موضوعات سے متعلق ہیں۔ قرارداد میں کہا گیا ہے کہ ایسی کتابوں سے برطانیہ کی اخلاقی اور روحانی صحت کو سخت نقصان پہونچا ہے۔

● لائبنز ([illegible]) فلسفی کی تین سو چودھویں سالگرہ پہلی جولائی کو منائی گئی۔ یہ فلسفی جرمن مشاہیر کی اولین صف میں شامل ہے۔

● ماسکو۔ روسی ادیب مائکل شولوخوف کو امسال ادب کیلئے لینن پرائز دیا گیا ہے اطلاع مظہر ہے کہ شولوخوف نے اپنا انعام ڈیان پر واقع ایک اسکول کی تعمیر کیلئے بطور عطیہ دے دیا ہے۔

• لندن۔ یہاں ایک عالمی ٹیلی ویژن کمپنی کی طرف سے گجراتی زبان کے افسانہ نگار ظہری اے گھٹکو سپلنڈ کا انعام دیا گیا ہے ایشیائی اور افریقی زبانوں کے ڈیڑھ ہزار افسانوں میں ان کا افسانہ سب سے اچھا سمجھا گیا۔

• تقسیم انڈیا آفس لائبریری کے تنازعہ کو ختم کرنے کے سلسلے میں لائبریری کو برطانیہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان تقسیم کر دینے کا تنازعہ بہت طویل عرصے سے چل رہا ہے۔ ہندوستان کے وزیر سائنسی امور و ثقافت جناب ہمایوں کبیر نے برطانیہ کے کامن ویلتھ امور کے وزیر مملکت سے ملاقات کی۔ بات چیت اس تبادلۂ خیال کی روشنی میں ہوئی جو مسٹر نہرو اور برطانوی نیشنلز کے درمیان لندن میں پچھلے دنوں ہوا تھا۔ معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان لائبریری کی تقسیم کے سوال پر ایک سمجھوتے پر پہونچ گئے ہیں۔

• اطلاع ملی ہے کہ ٹوکیو یونیورسٹی (جاپان) نے علامہ اقبال کو بعد از وفات ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری دی ہے۔ علامہ اقبال کی ۲۳ ویں برسی کے سلسلے میں پاکستان اور جاپان کی ثقافتی انجمن کے زیر اہتمام پچھلے دنوں ایک جلسہ منعقد کیا گیا جس میں یہ ڈگری دی گئی۔ یہ پہلا موقع ہے کہ ٹوکیو یونیورسٹی نے اس قسم کی ڈگری دی ہے۔

• قاہرہ۔ عرب دنیا کے مشہور مصنف عباس محمود العقاد نے ایک مضمون میں سر سید احمد خاں کی ان گراں مایہ خدمات کو سراہا ہے جو انہوں نے پاک و ہند کے مسلمانوں کو بیدار کرنے کے سلسلے میں سرانجام دی ہیں آپ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ پاک و ہند کی آزادی دراصل سر سید احمد خاں کی مساعی کا نتیجہ ہے

• ویانا (آسٹریا) کے ایک مشہور پبلشنگ ہاؤس نے جو تقریباً سوا سو سال پرانا ہے عصر حاضر کے بہترین مزاح نگاروں کی منتخبہ تخلیقات کا ایک مجموعہ شائع کیا ہے جس میں ۳۷ ملکوں کے مزاح نویس شامل ہیں۔ اس مجموعہ میں پاک و ہند کے مشہور ادیب شفیق الرحمٰن کی مزاحیہ تخلیق "ریلوے" بھی شامل ہے۔ اس مجموعہ میں بین الاقوامی شہرت رکھنے والے ادیبوں کی بہترین تخلیقات شامل ہیں۔

"آئینہ اردو"

• نئی دہلی۔ ۱۵ر جون۔ انجمن ترقی اردو ہند کی پنجابی شاخ نے صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد سے درخواست کی ہے کہ آئین کی دفعہ ۳۴۷ کے تحت اپنے خصوصی اختیارات کو عمل میں لاکر اردو کو پنجاب کی ایک علاقائی زبان قرار دے دیں۔ اپنے مطالبے میں انجمن ترقی اردو ہند نے مزید کہا ہے کہ اردو ابھی تک پنجاب کی سرکاری زبان ہے اور صوبے کے ۳۳ فیصد لوگ اسکو بولتے ہیں

• علیگڑھ۔ اردو ادب کی جامع تاریخ جو چار جلدوں پر مشتمل ہوگی علیگڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے زیر اہتمام تیار کی جا رہی ہے اس عظیم تاریخی پروجکٹ کیلئے یونیورسٹی گرانٹ کمیشن بارہ لاکھ سے زائد گرانٹ دے چکا ہے۔ اس پروجکٹ کے نگراں اردو کے مشہور نقاد صاحب طرز انشاپرداز مجنوں گورکھپوری ہیں۔ توقع ہے کہ یہ غیر فانی تاریخ مارچ ۱۹۶۱ء کے آخیر تک اشاعت کے مراحل طے کرے گی۔

● میسور یونیورسٹی نے سیدہ ملک بانو ایم اے کو "ابوالفضل صوفی اصفیاست دانی پر" بہترین مقالہ لکھنے پر تین سو روپیہ کا انعام دیا

● لاہور... نادر مطبوعات کی ایک نمائش انجمن عربی و فارسی اسلامیہ کالج سول لائنز کی طرف سے کالج میں منعقد کی گئی۔ اسمیں اردو اور فارسی کے بعض انتہائی قدیم اخبارات اور چغتائی کی تصویریں رکھی گئی ہیں

● حکومت پاکستان کے مقرر کردہ بورڈ نے "مسلمانوں کی تحریک آزادی" کی دوسری جلد شائع کر دی ہے جسمیں ۱۸۳۱ء سے لیکر ۱۹۰۵ء تک کے حالات درج ہیں۔

● لاہور۔ کتابوں سے متعلق مشاورتی بورڈ نے اسکول کے طلبار کیلئے اردو میں سائنس کی مقبول کتابوں کی اشاعت کیلئے بیس ہزار روپیہ کی رقم منظور کی ہے۔ بورڈ نے اساتذہ کیلئے ایک سفری لائبریری تیار کرنے کا بھی فیصلہ کیا ہے۔

● کراچی۔ پچھلے دنوں نذرل اکیڈیمی کے زیر اہتمام ادیبوں کے ایک نمائندہ اجتماع میں کراچی یونیورسٹی کے پروفیسر سید علی احسن نے بنگلہ ادب پر ایک جامع مضمون پڑھا جسمیں بتایا گیا کہ جدید بنگلہ ادب اردو شاعری سے کافی متاثر ہوا ہے بطور خاص حالی اور اقبال کے کلام نے بنگلہ ادب پر گہرے اثرات ڈالے ہیں جلسے کی صدارت ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کر رہے تھے۔

● اس مہینے مرکزی گلڈ نے جملہ اراکین کو ایک مراسلہ بھیجا ہے۔ جس میں اُن کی مختصر سوانح حیات اور تخلیقی کارناموں کی تفصیل مانگی ہے تاکہ ایک ادبی ڈائرکٹری ترتیب دی جائے۔ ارادہ یہ ہے کہ یہ ڈائرکٹری اس سال کے آخر تک چھاپ دی جائے۔ اس طرح ــــ زبانوں اور علاقوں کے ادیب ایک دوسرے سے اچھی طرح روشناس ہو جائینگے اور یہ کتاب دیگر ادب دوستوں کے لئے بھی افادی اہمیت کی حامل ہوگی۔

● مرکزی گلڈ نے مشرق وسطےٰ کے چند مترجمین اور ناشرین سے طے کیا ہے کہ منتخبہ پاکستانی ادب کے عربی تراجم شائع کئے جائیں۔ ایک سہ رکنی کمیٹی انتخاب کا کام کر رہی ہے۔ فی الحال نثری انتخابات کئے جائینگے۔ جنکا انگریزی ترجمہ ہوگا اور پھر انگریزی ترجمے سے عرب مترجمین عربی میں ترجمہ کرینگے۔ توقع ہے کہ سال رواں کے آخر تک ایک عربی ترجمہ بازار میں آجائیگا

● ۱۲ اور ۳ جولائی کی درمیانی شب میں اردو کے مشہور ادیب سلیم جعفر میرپور خاص میں رحلت فرماگئے۔ رائٹرز گلڈ نے مرحوم کی بیوہ کو ایک ہزار روپیہ دینے کا اعلان کیا ہے۔

اطلاعات

رائٹرز گلڈ ہال (ملتان)

● رائٹرز کالونی میں ایک ہال تعمیر کرنے کیلئے بھی پلاٹ حاصل کر لیا گیا ہے جو رائٹرز گیسٹ ہاؤس سے ملحق ہوگا۔ ملتان میں کوئی پبلک

ہال نہیں ہے یہ پہلا ہال ہوگا جو علمی ادبی اور ثقافتی اغراض کیلئے زیر تعمیر ہوگا تعمیر کے اخراجات کے لئے ایک ایگزیکٹو نوجوان نے وعدہ کیا ہے۔ ہال اور گیسٹ ہاؤس کے سامنے ایک وسیع اور شاندار پارک ہوگا جو "حمیدیہ پارک" کہلائیگا۔

- کراچی۔ ۲۲ر جولائی۔ ادارہ مصنفین پاکستان شاخ کراچی کی ایک ادبی نشست بتاریخ ۲۴ر جولائی ۱۹۶۰ء ہوٹل ایکسلسیر کے بڑے ہال میں منعقد ہوئی۔ اس اجلاس میں منظر ایوبی صاحب نے ایک مقالہ پڑھا۔ اور سلیم احمد اور فضل احمد جمال صاحبان نے غزلیں پیش کیں

"ویسٹ پاک ونگ کے عہدہ داروں کا انتخاب

- لاہور۔ ۳۱ر جولائی کو ویسٹ پاک کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا جس میں سید وقار عظیم صاحب اور احسان دانش صاحب بالترتیب ریجنل سکریٹری اور خازن اتفاق رائے سے منتخب ہوئے۔

"یوم لطیف"

- سکھر۔ اگست کے تیسرے ہفتے میں گلڈ کی مقامی شاخ کے زیر اہتمام وسیع پیمانہ پر "یوم لطیف" منایا جا رہا ہے۔ اس موقع پر ایک کتاب بھی منظر عام پر لائی جا رہی ہے جو شاہ لطیف بھٹائی کی منظوم سندھی کہانیوں کو اردو نثر میں پیش کرے گی۔ کتاب زیر طبع ہے اور اسکی طباعت کا انتظام مقامی شاخ نے اپنے طور پر کیا ہے۔
- کراچی۔ بتاریخ ۲ر اگست ۱۹۶۰ء کو جناب ریحان شریف صاحب کے تبادلہ کے سلسلہ میں ادارہ مصنفین پاکستان شاخ کراچی کی جانب سے ایک الوداعی ضیافت کا انتظام کیا گیا۔ اس موقع پر سیکرٹری جنرل جناب قدرت اللہ شہاب بھی تشریف فرما تھے۔

اس تقریب میں طارق الخیری صاحب کی صدارت میں افتتاحیہ تقریر ریجنل سیکرٹری نے کی۔

ریحان شریف کے علاوہ جناب قدرت اللہ صاحب شہاب نے بھی اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔

- منٹگمری۔ اگست کے پہلے پندھرواڑے میں مقامی گلڈ کی شاخ ایک عظیم الشان ادبی اجتماع کا اہتمام کر رہی ہے جس میں ہر صنف ادب کے مشاہیر کو مدعو کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ گلڈ کے پروگرام میں ٹھاسیر ایک سیمینار منعقد کرنا بھی ہے۔

یوم اقبال پر گلڈ کے زیر اہتمام ایک عظیم مشاعرہ بھی منعقد ہو چکا ہے۔

"گلڈ ہاؤس"

- ملتان۔ رائٹرز گلڈ ہاؤس گلڈ کے ممبران کیلئے باقاعدہ کھول دیا گیا ہے جہاں ممبران اپنے ہم قلم دوستوں کے ساتھ روزانہ شام کو بیٹھ کر گپ شپ کرتے ہیں اور مختلف موضوعات زیر بحث رہتے ہیں۔

"گلڈ ہاؤس لائبریری"

- رائٹرز گلڈ ہاؤس ملتان میں ایک ریفرنس لائبریری جاری کی گئی ہے اس میں عوامی ضروریات کو بھی ملحوظ رکھا گیا۔ یہ لائبریری شام کے چھ بجے سے نو بجے تک کھلی رہتی ہے اور کسی سے چندہ وغیرہ نہیں لیا جاتا۔

"رائٹرز کالونی"

- منشی عبدالرحمن خان صاحب سیکرٹری رائٹرز گلڈ نے اپنی ذاتی کوشش سے معصوم شاہ روڈ پر ایک رائٹرز کالونی قائم کی ہے جس میں رائٹرز

[illegible] کے ضرورت مند اہل قلم شاعروں، ادیبوں، صحافیوں، پروفیسروں، محققوں اور علمی ادبی ذوق رکھنے والے حضرات کو ستے داموں دو سو پلاٹ الاٹ کئے گئے ہیں۔ اس کالونی کا سنگ بنیاد رکھنے کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔

"رائٹرز گیسٹ ہاؤس"

● اس کالونی میں ایک راحت کدہ کی تعمیر کی تجویز زیر غور ہے جس کے لئے رقبہ حاصل کر لیا گیا ہے۔ یہ دس کمروں پر مشتمل ہوگا اور ہر کمرہ کے ساتھ الگ الگ غسل خانہ اور جائے ضرورت وغیرہ ہوگا۔ بیرونجات سے ملتان جانے والے رائٹرز گلڈ کے ممبران یا دوسرے ادیب ایک ہفتہ تک مفت رہائش رکھ سکیں گے۔ جو حضرات یہ کمرے اپنے خرچ پر اپنے کسی عزیز یا بزرگ کی یادگار کے طور پر بنوانا چاہیں گے ان کمروں پر ان کے نام کندہ کرائے جائیں گے

"ادیبوں کے نام پر"

● اس کالونی کے چار بلاک ہونگے۔ اقبال بلاک، غالب بلاک، اور اسد ملتانی بلاک، حالی بلاک، اس کی دو سڑکوں میں سے ایک سڑک سرسید روڈ کہلائے گی، اور دوسری سنگ بنیاد رکھنے والی شخصیت کے نام سے پکاری جائے گی اسکی گلیاں بھی جانے پہچانے ادیبوں اور شاعروں کے نام سے منسوب کی جائینگی۔ اسی طرح گیسٹ ہاؤس کے ہر کمرہ کا نام بھی ادیبوں اور شاعروں، نام پر رکھا جائے گا۔ اس سلسلہ میں تیس نام مطلوب ہیں۔ ملتان سب ریجن کی مجلس منتظمہ چاہتی ہے کہ گلڈ کے ممبران ایسے نام تجویز کرکے بھیجیں۔

● ملتان۔ ۲۰ جولائی۔ وزارت داخلہ نے یونیسکو کی درخواست پر تعلیم یافتہ خواتین کے ادبی ذوق کا سروے شروع کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک سوالنامہ جاری کیا گیا تھا جس میں وضاحت کر دی گئی تھی کہ جواب دیتے وقت اخباروں اور رسالوں کا ذکر نہ کیا جائے بلکہ صرف پسندیدہ کتابوں کا ذکر کیا جائے۔ جواب میں خواتین نے اپنی سماجی پوزیشن نہایت اچھی قرار دی ہے ان سب نے گرمی کی دوپہر اور سردیوں کی رات کو اپنے مطالعہ کا وقت بتایا ہے اور ہر ایک نے ہفتے میں چار ناول یا تاریخی کتب پڑھنے کا دعویٰ کیا ہے۔ ان جوابات کے مطابق بعض خواتین ہفتے میں دس کتابوں کا بھی مطالعہ کرتی ہیں۔ ان خواتین میں چالیس فیصد رومانی پرجوش عشق و محبت کی داستانیں پڑھتی ہیں۔ چالیس فیصد ڈاکہ چوری جاسوسی اور سنسنی خیز قتل کے افسانے پسند کرتی ہیں دس فیصد ادبی نوعیت کی قسم کا لٹریچر پڑھتی ہیں اور باقی ماندہ دس فیصد ہی تاریخی اور سائنس کی دقیق علمی اور تحقیقاتی کتب کی دلدادہ ہیں خواتین نے اپنے جواب میں بتایا ہے کہ وہ مطالعہ کیلئے کتابیں زیادہ تر کرائے پر لیتی ہیں۔ ۲۵ فیصد کتابیں خریدتی ہیں۔ اعلیٰ عہدوں پر فائز خواتین عمرانیات، تاریخ فلسفہ اور انگریزی ادب کو پسند کرتی ہیں

وقت کی [illegible] اور اپنی تہی دامنی کے باعث خبرنامہ ہم جتنا جامع دینا چاہتے تھے نہ دے سکے۔ آئندہ خبرنامہ گوناگوں دلچسپیوں اور جامعیت کا مرقع ہوگا ——— (ادارہ)

باہتمام عبدالصمد عارف مطبع سعدی۔ قرآن محل، کراچی، طبع شد

آدم جی کے پارچہ جات
دیرپا ہوتے ہیں
ACM
ADAMJEE COTTON MILLS LIMITED
THE SEAL OF QUALITY
زیرنگرانی آدم جی انڈسٹریز لمیٹڈ کراچی

Cover Printed at The International Press, McLeod Road, Karachi

برطانوی کارٹونسٹ 'وکی' کا ایک تاثر

الجزائر ساتواں سال

ارضِ انسانیت کی حدیں سرحدیں ہیں کہاں سے کہاں
جدا اسپین بھی تو بہت دور تھی اے ضمیرِ جہاں
کوریا بھی تو اک اجنبی دیس تھا۔ میں ہوں الجیریا

چیخ اُٹھتے ہو فریاد، فریاد، وحشت سے مغلوب ہو
کوئی ہنگامہ دھرتی کی چھت پہ، سرِ رودِ ڈینیوب ہو
میں مسلماں ہوں، اور میری خطا! میں ہوں الجیریا

آج افواجِ قاہر کا سیلِ ہزاراں بھی موجود ہے
ساز و ساماں نہیں، پر صفِ دلفگاراں بھی موجود ہے
ایک نقشہ ہے تازہ کرو سیڈ کا، میں ہوں الجیریا

(مغرب کی اذان — ابنِ انشا)

اگلے شمارے میں ہم الجزائر کے شہیدوں اور مجاہدوں کو خراجِ عقیدت پیش کریں گے۔ تفصیلی اعلان ابتدائیے میں ملاحظہ فرمائیے

آدم جی ادبی انعام کے نئے قواعد

پاکستان رائٹرز گلڈ کے مرکزی دفتر نے آدم جی ادبی انعامات کے لئے نئے قواعد کا اعلان کر دیا ہے۔ آئندہ یہ ضروری نہیں ہوگا کہ مصنف اپنی کتابیں خود داخل کرے بلکہ مصنف یا اس کا ناشر یا کوئی بھی شخص کتابیں داخل کر سکتا ہے لیکن اس امر کا ذمہ لینا ہوگا کہ مصنف مذکور کو انعام دیا گیا تو وہ اسے قبول کرے گا۔

نئے قواعد کے تحت فیس کی شرط بھی اُڑا دی گئی ہے۔ اب کتابوں کے ساتھ کوئی رقم داخل کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی اگر دس ہزار کا انعام ایک کی بجائے دو کتابوں کو دینے کا فیصلہ کیا گیا تو لازماً ایک کتاب نثر کی اور ایک نظم کی ہوگی۔ انعام نثر کی دو کتابوں یا شاعری کے دو مجموعوں میں تقسیم نہیں کیا جائے گا۔

باقی شرائط مختصراً حسب ذیل ہیں :۔

- انعام کے لئے صرف طبعزاد کتابوں پر غور کیا جائے گا۔ اگر کوئی کتاب کسی زبان کے کسی اور فن پارے سے ترجمہ یا ماخوذ ہے تو انعام کے لئے زیر غور نہیں آئے گی۔ طبع زاد کتابوں میں ناول، مختصر افسانہ، ڈرامہ، شاعری، ادبی تنقید، سفرنامے اور سوانح سب سے شامل ہیں،
- کتاب کے مصنف کا پاکستانی شہریت کے قانون کی رو سے پاکستان کا شہری ہونا ضروری ہے۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کا ممبر ہونے کی شرط نہیں ہے۔
- انعام کا اعلان ۲۷ر اکتوبر کو کیا جائے گا۔ اور کتاب کا پہلا ایڈیشن اس سال کی ۳۱ر جولائی کو ختم ہونے والے سال میں شائع ہونا چاہیئے۔ اور کتاب کی پانچ جلدیں بذریعہ رجسٹری یا ذاتی طور پر گلڈ کے مرکزی دفتر (۲۰۔ ہوٹل ایکسلیسر۔ صدر۔ کراچی) میں پہنچانی ضروری ہیں ان کے ساتھ مقررہ فارم بھی بھر کے دینا چاہیے یہ فارم مرکزی دفتر سے بلا قیمت طلب کیا جا سکتا ہے۔
- مرحوم مصنفین کی کتابیں بھی شامل کی جا سکتی ہیں بشرطیکہ سال متعلقہ میں پہلی بار شائع ہوئی ہوں۔

ماہنامہ

اِدارہ مُصنّفینِ پاکستان، حلقہ کراچی
(پاکستان رائٹرز گلڈ) کا ترجمان

جلد ـــــ شمارہ ۴

دسمبر ۱۹۶۰ء

فی پرچہ	دس آنے
سالانہ	چھ روپے

(جس میں خاص نمبر بھی شامل ہیں)

پتہ
۲۰ ہوٹل ایکسلیر، صدر، کراچی ۳
فون ۵۳۰۵۵/۲۰

ہمارا منشور

"ہم پاکستان کی جملہ زبانوں کے ادیب خود کو ملک اور وطن کی ترقی، عظمت، بین الاقوامی امن کے آدرش اور انسانیت کی ترقی کے لئے وقف کرتے ہیں، ہم ان حقوق انسانی پر ایمان رکھتے ہیں۔ جن کی تشریح اقوام متحدہ کے منشور میں کی گئی ہے۔ بہ حیثیت ادیب کے ہم اپنے خیالات کے اظہار اور ترسیل کی آزادی کے لئے بنیادی حقوق کے حامی ہیں جس کے بغیر تخلیقی ادب بے مقصد ہوتا ہے۔ ہمیں اپنی ان عظیم روایات پر جو ہمیں ماضی سے ملی ہیں پورا فخر ہے۔ ہم ان کے تحفظ اور ان کو مزید فروغ دینے کا عہد کرتے ہیں۔ ہم اپنے مقدس فرض سے جو صداقت کی عکاسی، حب وطن کی قدروں کی نشو و نما، بین الاقوامی اُخوت اور تعاون کے فروغ اور انسانی تعلقات کے قیام سے متعلق ہے، کما حقہ آگاہ ہیں تاکہ انسانیت زیادہ سے زیادہ راحت، طمانیت اور وقار کے ساتھ اپنا وجود باقی رکھ سکے۔

ادیب ہونے کی حیثیت سے فرداً فرداً اور اجتماعی طور پر ہم ایک ایسے خوشحال اور صحت مند معاشرے کی ترقی کے لئے اپنی ذمہ داری کو قبول کرتے ہیں جس میں سبھی کے لئے آزادانہ اور مساوی مواقع فراہم ہوں اور جہاں دولت و اقتدار، انسانی قدروں اور رُوحانی تصورات کے تابع ہوں۔ اسی لئے علم و سائنس کی ترقی کو دنیا میں امن اور خوش حالی کے فروغ کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔"

(پاکستان رائٹرز گلڈ کے تاسیسی اجلاس میں
بروز ۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء منظور ہوا)

ترتیب

	ابتدائیہ		۶
مضامین	جگر کا فنِ غزل	ظہیر کاشمیری	۹
	اصغر گونڈوی	سجاد باقر رضوی	۱۳
	کاپی رائٹ	مرکز	۲۰
	کرشن چندر کی تجویز پر	محمد عتیق صدیقی	۲۳
نظمیں	جگر مراد آبادی	حفیظ ہوشیارپوری	۲۶
	فنکار سے	ڈاکٹر وزیر آغا	۲۷
	پھول سے دھول تک	جلیل حشمی	۲۸
	بہلاوا	انور فرہاد	〃
غزلیں	مجید امجد	قتیل شفائی	۲۹
	وامق جونپوری	شیخ ایاز	۳۰
	شہریار	احمد سعدی	۳۱
	سحر انصاری	شفیق عشرت	۳۲
افسانے، خاکے	سونے مندر	جمیلہ ہاشمی	۳۳
	بازگشت	آمنہ ابوالحسن	۴۰
	نئے اُفق	انور خواجہ	۴۶
	شیریں کلا (آغائی میر محمد حجازی)	حسنین کاظمی	۵۶
ثقافتی ورثہ	قصیدہ بہاریہ (میر عبدالحسین سانگی)	خاور نگرامی	۶۶
	سچل سرمست کی اُردو شاعری	[illegible]	۶۷

خبرنامہ — اطرافِ عالم، حلقہ کراچی، اور مغربی پاکستان کی ادبی خبریں — ۱

اعلانات — آدم جی ادبی انعام کے نئے قواعد — ۱

گلڈ کے انعامات سالگرہ — ۵

ترجموں کا پروگرام — ۳

طبع زاد افسانہ پر انعام — ۴

گلڈ کے انعاماتِ سالگرہ

پاکستان رائٹرز گلڈ (مرکز) نے سال آئندہ سے ہر ۳۱ جنوری کو دس ادبی انعامات دینے کا اعلان کیا ہے ہر انعام کی رقم ایک ہزار روپیہ ہوگی۔ یہ انعامات اردو اور بنگلہ کی حسب ذیل اصنافِ ادب کی بہترین تخلیقات پر دئیے جائینگے

(۱) شاعری (۲) افسانہ۔ طویل افسانہ۔ رپورتاژ۔ (۳) یک بابی ڈرامہ

(۴) تنقیدی مضمون (۵) مزاح (نظم یا نثر)

پہلے، اس کے انعام کے لئے دسمبر ۶۰ء سے نومبر ۶۱ء تک کی مدت میں شائع شدہ تخلیقات پر غور کیا جائے گا اور انعام کا اعلان ۳۱۔ جنوری ۶۲ء کو ہوگا۔

یہ انعامات گلڈ کے سالانہ انعاماتِ سالگرہ کہلائیں گے۔

زبانوں کے ادب کی ترویج اور حوصلہ افزائی کے لئے گلڈ کی طرف سے انعامات کا سلسلہ جاری کرنے کا اعلان عنقریب کیا جائیگا

اِبتدائیہ

اس مہینہ کی اہم ترین خبروں میں حکومت مغربی پاکستان کی وہ کارروائی ہے جو گلڈ کی تحریک پر کرشن چندر کی کتابوں کی جعلی اشاعت کے سلسلے میں لاہور کے ایک ناشر کے خلاف عمل میں آئی ہے۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ کرشن چندر نے گلڈ کے سکرٹری جنرل کے نام ایک مراسلہ بھیجا تھا جس کا ایک حصہ 'ہم قلم' کے شمارہ اکتوبر ۱۹۶۰ء میں "ایک تازہ دھاندلی" کے زیرِ عنوان شائع ہوا ہے۔ ملخص اس شکایت کا یہ ہے کہ لاہور کے ایک ناشر مون لائٹ پبلشرز نے دو ناول 'جوان چھوکری' اور 'لکی نمبر' کے نام سے شائع کئے جن پر بطور مصنف کرشن چندر کا نام تھا۔ اوّل تو ان کتابوں کا نام اور مضمون ہی چغلی کھاتے تھے کہ یہ کرشن چندر کی تصانیف نہیں پھر خود کرشن چندر نے بالوضاحت اعلان کر دیا کہ میں نے اس نام کی کوئی کتابیں لکھیں ہیں، نہ اس پبلشر سے کبھی کوئی خط وکتابت کی ہے نہ اسے کسی طور پر اپنا نام استعمال کرنے کی اجازت دی۔ مرکزی گلڈ نے اس معاملے پر بھی اعلیٰ سطح پر سلسلہ جنبانی کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مغربی پاکستان کی کرائمز پولیس برانچ نے مذکورہ ادارے پر چھاپہ مارا اور کتابیں برآمد کر کے مذکورہ اشاعتی ادارے، ایک مطبع اور بعض دوسرے متعلقہ افراد کے خلاف فریب دہی کے الزام میں کارروائی شروع کر دی۔ ادبی ذوق رکھنے والے لوگوں نے ان کتابوں کو کرشن چندر کی کتابیں سمجھ کر خریدا اور نقصان اُٹھایا۔ اُدھر مصنف کی ساکھ زد میں آگئی۔ گویا یہ تلبیس دوگونہ کام کر گئی۔

اسی ادارے نے کرشن چندر کی کتاب 'مسکرانے والیاں' (افسانوں کا مجموعہ) بھی بلا اجازت چھاپ رکھی تھی۔ اصل کتاب دہلی سے شائع ہوئی ہے اور کرشن چندر نے پاکستان کے ایک ادارے سے پاکستان میں اس کی اشاعت کا معاملہ طے بھی کر لیا تھا۔ لیکن مون لائٹ والوں نے اسے پہلے چھاپ کر فروخت کرنا شروع کر دیا تھا۔

حکومت مغربی پاکستان کی یہ بر وقت اور مستحسن کارروائی ان ناشروں کے لئے سرمہ نورِ بصر ثابت ہونی چاہیئے جو چوری اور سینہ زوری کا یہ کاروبار اب بھی جاری رکھنے کی فکر میں ہیں اور ایماندار ناشروں کی برادری کو رسوا کر رہے ہیں۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کا مقصد ناشروں کو ختم کرنا نہیں بلکہ ان کا تعاون حاصل کرنا ہے اور ان سے مصنفین کے حقوق تسلیم کرانا ہے۔ باہمی قرارداد کے ذریعے مصنفین اور ناشرین کے درمیان جو اُمور طے پائیں گے وہ بالآخر ناشرین کے لئے بھی مفید ہوں گے کیوں کہ سیدھی صاف معاملت کے بعد کسی قانونی کارروائی یا شکوے شکایت کا خرخشہ نہیں رہتا۔ حکومت یا گلڈ 'کالی بھیڑ' پبلشروں کے سلسلے جو کارروائی کرے، اس سے قطع نظر باعزت ناشروں کی مسلمہ جماعت کو بھی ان دھاندلیوں کے سدِّ باب کے لئے مؤثر اقدام کرنا چاہیئے۔

گزشتہ شمارے میں ایک اعلان کی رو سے ان ناشرین کو جن کے خلاف گلڈ کے مرکزی دفتر میں شکایتیں موصول ہوئی ہیں، مصالحت کے لئے ایک مہینے کی مہلت دی گئی تھی جو دسمبر میں ختم ہو رہی ہے۔ بعض ناشرین کے متعلق مغربی پاکستان کے علاقائی سکرٹری وقار عظیم صاحب نے یہ ذمہ لیا ہے کہ وہ اپنے ذاتی مراسم کے بل پر انہیں افہام وتفہیم پر راضی کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ بد معاملگی کا ایک آدھ معاملہ کسی اچھے پبلشر کے لئے باعث رسوائی یا پریشانی نہ بن جائے۔ یہ بڑی اچھی بات ہے لیکن اگر ان کی کوششیں بار آور نہ ہوئیں اور متعلقہ ناشر حضرات نے مصنفین سے مصالحت کے بجائے ضد اور خود رائی کی روش اختیار کی تو گلڈ اپنے ذرائع اور وسائل استعمال کرنے پر مجبور ہوگا۔

گلڈ کے پبلشنگ ہاؤس کا کام پوری سرگرمی سے شروع ہو گیا ہے۔ اردو کے لئے اشاعت کا مرکز فی الحال لاہور تجویز ہوا ہے جہاں کتابت، طباعت وغیرہ کی آسانیاں زیادہ ہیں۔ اس پبلشنگ ہاؤس کا اہتمام بھی ایک قابل ادیب کے سپرد کیا گیا ہے جسے طباعت واشاعت کے فن کا وسیع تجربہ ہے اور جس نے بیرون ملک بھی اس فن کا مطالعہ کیا ہے پروڈکشن میں بھی ہر طرح سے معیاری ہوں گی۔ امید ہے اس انتظام کے تحت جو کتابیں شائع ہوں گی وہ

آدم جی ادبی انعام کتابوں کے لئے وقف ہے۔ پاکستان رائٹرز گلڈ نے ملک میں ادبی تخلیق کی حوصلہ افزائی کے لئے ایک ایک ہزار روپے کے دس سالانہ انعامات دینے کا اعلان کیا ہے جو "سالگرہ انعامات" کہلائیں گے، ان کا تفصیلی اعلان آپ اس شمارے میں پائیں گے۔ ماہنامہ "ہم قلم" بھی اپنے وسائل کے مطابق، بعض خاص قسم کی تحریروں پر جن کی طرف ہمارے ادیبوں کی توجہ کم ہے "اعزازیے" فرش کرنے کی تجویز پر غور کر رہا ہے۔ ان کی رقوم اور موضوعات کے اعلان کے لئے سالگرہ نمبر کا انتظار کیجئے۔

ہم نومبر کے شمارے کا ایک حصہ یاد جگر کے لئے وقف کرنا چاہتے تھے لیکن اس سلسلے میں ہمیں بروقت مضامین موصول نہ ہوئے۔ اس وقت بھی یہ مضامین جس رفتار سے آرہے ہیں اس کے پیش نظر یہ مناسب خیال کیا گیا ہے کہ ان کو سالگرہ نمبر میں شائع کر دیا جائے۔ البتہ جناب ظہیر کاشمیری کا مضمون جس میں مرحوم کے فن کا نئے زاویے سے جائزہ لیا گیا ہے اور جو ظہیر صاحب نے ہمیں بہت پہلے عنایت فرما دیا تھا، اس شمارے میں شامل کر لیا گیا ہے

جیسا کہ ہم اعلان کر چکے ہیں۔ ہمارا شمارہ فروری ۱۹۶۱ سالگرہ نمبر ہوگا۔ جسے ہم اس تقریب سعید کے شایان شان بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ گلڈ اس کے عزائم اور پروگراموں اور اراکین کی سرگرمیوں کے متعلق معلومات کا مخزن بھی ہوگا اور ہمارے بلند پایہ مصنفین کی تصانیف لطیف کا شیرازہ بھی۔ اس سے پہلے جنوری نمبر کا ایک حصہ ہم ایک ایسے کاز کے لئے وقف کرنا چاہتے ہیں جو مقدس بھی ہے جاں سوز بھی۔ وہ ہے مجاہدین الجیریا کا کاز جو سات سال سے ایک مستبد استعمار کے خلاف آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ یہ لڑائی اسپین کی لڑائی سے

کہیں زیادہ سنگین اور اہم ہے لیکن اس کے لئے اُدیبوں کا کوئی بین الاقوامی دستہ لڑنے نہیں گیا۔ ہاں فرانس سے لے کر پاکستان تک سبھی جگہ انفرادی طور پر صاحب ضمیر ادیبوں نے صدائے درد بلند کی ہے اور اپنے کو اس مقدس کاز سے وابستہ کیا ہے! ہم قلم اگلے شمارے میں الجزائر کے شہیدوں اور مجاہدوں کو خراج عقیدت پیش کر رہا ہے۔ اس کے لئے ہم جناب انتظار حسین کے ممنون ہیں جن کی کوششوں سے لاہور میں یوم الجزائر بھی منایا گیا۔

اس شمارے کا ایک اہم مضمون کاپی رائٹ ہے۔ یہ مختلف مأخذ کی مدد سے تالیف دیا گیا ہے۔ اس سے اس مسئلے کے بہت سے پہلو ہمارے اُدیبوں پر روشن ہو جائیں گے

پاکستان رائٹرز گلڈ نے اپنے کنونشن اور گزشتہ سالانہ اجلاس میں مطالبہ کیا تھا کہ ریڈیو پاکستان کو ان ادیبوں کی تخلیقات کے اعزازیوں پر نظر ثانی کرنی چاہیئے جو سرکاری ملازمت میں ہیں۔ مقام شکر ہے کہ ریڈیو پاکستان نے اس طرف توجہ کی ہے اور نئی شرحیں مقرر کر دی ہیں۔ گلڈ کے نزدیک یہ اضافے کافی نہیں اور توقع کرنی چاہیئے کہ محکمہ ریڈیو پھر ان پر نظر ثانی کرے گا۔ تاہم موجودہ صورت حال یہ ہے۔

	اعزازیوں کی پہلی شرح	نئی شرح
تقریر (ٹاک)	۲۵/-	۳۰/-
ڈراما	۲۵/-	۴۰/-
مقرر کے سرکاری فرائض سے متعلق تقریر	۱۰/-	۱۵/-

عرب مصنفین پاکستان آئیں گے

راولپنڈی ۲۷ نومبر رائٹرز گلڈ کے سکرٹری جنرل مسٹر قدرت اللہ شہاب نے بتایا ہے کہ متحدہ عرب جمہوریہ کے ممتاز ادیبوں کا ایک وفد آئندہ فروری یا مارچ میں پاکستان آئے گا۔ مسٹر قدرت اللہ شہاب نے آج ایک نشری انٹرویو میں بتایا کہ متحدہ عرب جمہوریہ کی فنون لطیفہ اور ثقافت کی کونسل سے مشورہ کر لیا گیا ہے اور رائٹرز گلڈ کو امید ہے کہ متحدہ عرب جمہوریہ کے ادیبوں اور مصنفوں کو آئندہ سال کے آغاز میں پاکستان آنے کے دعوت نامے بھیج دیئے جائیں گے۔

پاکستان اور متحدہ عرب جمہوریہ کے درمیان قریبی ثقافتی تعلقات کے امکان۔ کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ متحدہ عرب جمہوریہ کی بعض ثقافتی انجمنیں اس بات کی خواہاں ہیں کہ دونوں ملکوں کے ممتاز مصنفوں اور شاعروں کی تصنیفات کے تراجم کا تبادلہ کیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ عرب جمہوریہ میں مصنفوں کو معقول تنخواہیں ملتی ہیں اور وہاں کے اخبارات کی اشاعت لاکھوں سے پہیر میں ہے۔

ظہیر کاشمیری

جگر کا فن غزل

جگر یوں تو فصیح الملک داغ کے شاگرد تھے۔ لیکن اپنے
اور اسلوب کے لحاظ سے ان سے بالکل مختلف تھے۔
رغزل جو میر کے دور سے غالب کے دور تک ہزار عشوہ طرازیاں
مانے کے باوجود اپنی روایتی مسند وقار پر جلوہ افروز تھا، امیر
ائی اور داغ کے زمانے میں حریم ناز سے نکل کر اور رسمِ
بکلاہی چھوڑ کر بازار میں چلا آیا تھا۔ نہ پہلا سا حجاب، نہ شیوۂ
ین، نہ تبسم خفی، عامیانہ طرزِ زندگی اختیار کر چکا تھا، رہائش
کی تھی مگر لکھنؤ کی بھٹیار نوں کی طرح زبان دو گز کی تھی،
یوں، تمبولیوں سے آنکھ مٹکا، احساسات بازاری اور خیالات
ح ہو گئے تھے۔ کوئی مبتذل انداز نہ تھا جس سے یہ بچ سکا
۔ ایسے حسن شکن دور میں جن متغزلین نے نگار غزل کی نوک
ب پھر سے درست کی، اسے نظیری و عرفی کی نظر سے دیکھا،
ے اس کا کھویا ہوا وقار حسن بخشا، ان میں رئیس المتغزلین جگر
ادآبادی کا نام سرفہرست ہے۔

جگر نے فکر سخن کے اولین ایام میں بھی جبکہ شاعر میں
م طور پر فکر اور تجربہ کی گہرائی کا فقدان ہوتا ہے، داغ
ول کے محبوب کو مرکز خیال نہیں بنایا، اس وقت بھی ان
غزل کا جمالیاتی نظام، اپنے عناصر، اپنی تفصیلوں اور اپنے
زمات کے لحاظ سے اپنے استاد کے تصورِ غنا سے مختلف ہی
بلند تر اور شائستہ تر ہے۔

جگر شروع ہی سے محجوب جلوؤں کے شیدائی ہیں۔ ان
کی نظر میں محبوب کی پردہ داری، شستگی اور کم آمیزی ہی حاصل
نظارہ ہے، اور اگر جلوؤں کی آوارگی کا احتمال ہو تو وہ اپنے
حجاب فن سے خود حسن کے پردہ دار بن جاتے ہیں۔

— گو سراپا حجاب ہیں ہم لوگ
تیرے رخ کی نقاب ہیں ہم لوگ

کہاں جمالِ حقیقت کہاں مجاز ہے
جو تیرے رخ پہ نہ حائل حجابِ ناز ہے

شاعر کی بصیرت کے ساتھ شاعر کا محبوب بھی ارتقا کے
دوروں سے گزرتا ہے۔ جگر کا محبوبِ غزل بھی اس لحاظ سے
بڑھتا، پھیلتا سلسلۂ جمالیات ہے۔ شعلۂ طور کی اکثر غزلوں
میں یہ محبوب ہماری زندگی کا ایک حصہ ہے محض تصوراتی
ہیولیٰ نہیں۔ اس کے اور شاعر کے درمیان عشقیہ واردا تیں
زندہ، جاندار اور متحرک ہیں، ہجر و وصال کے قصے جفا اور
وفا کی داستانیں، شہرت و رسوائی کے افسانے بالکل ایسے
ہیں، جیسے گوشت پوست کے انسانوں کے ہونے چاہئیں۔
یہاں جگر کے ہاں، حسین آنکھوں کی شبنم آلودگی، محبوب کا تبسم
ناز، عذرِ جفا، اضطراب نظر اور وہ سبھی کچھ موجود ہے جس کا
تعلق عشق کے حسی پہلوؤں سے ہوتا ہے۔ لیکن جگر حسن و جمال
کی ان تمام وارداتوں پر اپنے فن کا منقش اور باریک

نقاب اس طرح پہناتے ہیں کہ اُن کا محبوب حسرت موہانی کے محبوب کے تصور سے مختلف ہو جاتا ہے۔ حسرت کا تصورِ حسن سادہ و پرکار ہے۔ مگر جگر کا تصورِ حسن محبوب و سرمست ....

ملاحظہ ہو

شبنم آلود وہ حسیں آنکھیں رُخ پہ اُڑتی ہوائیاں توبہ
اپنے مطلب سے عشق کی جھڑپیں پھر وہی بے وفائیاں توبہ
نظروں نظروں میں سرگزشت فراق دونوں جانب دہائیاں توبہ

اب کہاں زمانے میں دوسرا جواب اُن کا
فصلِ حسن ہے ان کی، موسمِ شباب اُن کا

پھول مسکراتے ہیں، دل پہ چوٹ پڑتی ہے
ہائے وہ رُخِ خنداں، اُف رے وہ شباب اُن کا

عرضِ غم نہ کرلے دل، دیکھ ہم نہ کہتے تھے
وہ گئے وہ اُدھر کر کے سُن لیا جواب اُن کا

تو ہزار عذر کرے اگر، ہمیں شک ہے اور ہی کچھ مگر
تجھے اضطرابِ نگاہ سے، ترے احتیاطِ کلام سے

تمام حرف و حکایت، تمام دیدہ و دل
اس اہتمام پہ بھی شرحِ عاشقی نہ ہوئی

اُن کی وہ آمد آمد، اپنا یہاں یہ عالم
اک رنگ آ رہا ہے، اک رنگ جا رہا ہے

انکار اور اس پر اصرار وہ بھی پیہم
تم مجھ کو چاہتے ہو ثابت ہوا یہیں سے

ہائے کیا چیز ہے یہ تکملۂ حسن و شباب
اپنی صورت سے بھی اب ان کو حیا آتی ہے

وغیرہم
____

جگر کے ہاں لب و رُخ، قد و گیسو اور شعلۂ انفاس کی حسیات کافی متنوع اور بوقلموں ہیں۔ ان میں وہ تمام مضامین شامل ہیں جو سینکڑوں برس ہماری تاریخ غزل کا طرۂ امتیاز رہے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ جگر کے منفرد فن نے انھیں نئی تہذیب اور نیا قالب بخشا ہے، وہ جس خیال، جذبہ یا احساس کی فنی ترسیل کرتے ہیں وہ دماغ پر ضرب لگانے سے پہلے دل پر ضرب لگاتا ہے۔ اور قاری پر براہ راست آشفتگی سرمستی اور حزینہ کا ہلکا سا تاثر چھوڑ جاتا ہے۔

'شعلۂ طور' کے آخری حصوں میں جگر عشق کے ابتدائی تصورات کی حدیں توڑ دیتے ہیں، فکری اور احساسی طور پر وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ کہ مجاز کی وارداتِ قلب نظرِ اعتباری اور گریز پا ہے۔ فراق و وعدہ زمانی قدروں کے پابند ہیں اور وصالِ محبوب ہوس کی تسکینِ یک لحظہ کا دوسرا نام ہے، اور پھر اس حقیقت کا عرفان بھی ہوتا ہے۔ کہ رفتنی حسن اور تغیر پذیر جلوہ طبعِ شاعر کا اضطراب دُور نہیں کر سکتا۔ یہاں اُن کا تصورِ جمال شخصی اور زمانی قیود سے آزاد ہو جاتا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ شعورِ حسن اور وارداتِ عشق کے وقتی تجربوں سے استخراج کرتے ہوئے فنی عمومیت (Artistic Universality) کے مقام پر پہنچ جاتے ہیں۔ اور ان کی غنائیت کے کینوس پر کئی نئے موضوع اُبھر آتے ہیں خمریات بھی، فلسفۂ کائنات بھی، غمِ زمانہ بھی اور تصورِ محبوب کی ترقی یافتہ صورت بھی۔

ریاض کی طرح خمریات جگر کی غزلوں کا مرکزی موضوع نہیں۔ ریاض کے ہاں ایسے مضامین کا لامتناہی پھیلاؤ پایا جاتا ہے۔ وہ بادہ و جام سے متعلق استعاروں کو مختلف اوزان اور مختلف سطحوں سے استعمال کرتے ہیں۔ اس کے برعکس جگر کے ہاں ایسے مضامین مجازی رنگ لئے ہوئے ہیں۔ لیکن بعض اوقات پر نکا دینے والے، مثلاً

کدھر سے برق چمکتی ہے دیکھنا واعظ
میں اپنا جام اُٹھاتا ہوں تو کتاب اُٹھا

فلسفۂ کائنات کی شعری تشریحوں کے مرحلہ پر جگر ایک لحظہ بھی اپنی روائتی سرمستی کا ساتھ نہیں چھوڑتے، وہ پیچیدہ اور مشکل فکری مسئلے نہایت شگفتہ اور حسین انداز میں برجستگی سے ادا کر جاتے ہیں۔ اور یہی شگفتگی اور برجستگی

...کا ذوق انھیں اپنے معبود غم۔ مگر معاصر مرنا یاس یگانہ نہ
...زی سے ممیز کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

رہائی ہو نہیں سکتی کبھی قیدِ تعلق سے
جو اک زنجیر ٹوٹی دوسری زنجیر دیکھیں گے

قفس کے سامنے بجلی کچھ اس طرح چمکی
نظر میں پھر گئی تصویر آشیانے کی

تعینات کے ہیں وصل و ہجر دو پہلو
حیات و موت ہیں دو کروٹیں زمانے کی

دید کے قابل ہے یہ رنگِ شبک روحی مرا
ڈھونڈھتی ہے برق مجھ کو میں نشیمن میں نہیں

مطمئن ہو کے کریں سیرِ چمن کیا وحشی
اک قدم باغ میں اک حلقۂ زنجیر میں ہے

جب کوئی حادثۂ کون و مکاں ہوتا ہے
ذرہ ذرہ مری جانب نگراں ہوتا ہے

مسرت زندگی کا دوسرا نام
مسرت کی تمنا مستقل غم

بات سادہ ہی سہی لیکن حکیمانہ بھی ہے
یعنی ہر انساں بقدرِ ہوش دیوانہ بھی ہے

جگرؔ جمالِ کائنات کے تجسس میں معاشرہ پر بھی نگاہ
...تے ہیں، اور جہاں کہیں آدمی انھیں جمالِ کائنات اور
...ی مسرت کا دشمن نظر آتا ہے، وہ نعرۂ احتجاج بلند کر دیتے
...، آدمی اپنی حرص و ہوس کی تکمیل کے لئے مردم آزار
... جاتا ہے، تو دنیا میں قحط، جنگ، وبائیں نمودار ہو
...تی ہیں، اور معاشرتی ناآسودگی آخر کار انسان کے علم و
...ان اور حکمت و بصیرت کے سوتے خشک کر دیتی ہے۔
جگرؔ کا تصورِ جمال، ناگزیر طور پر انہیں انسان دوست
...تا ہے۔ وہ 'جمال ہی جمال' کی بقا کے لئے لازوال انسانی
...رت کے نقیب بن جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ جگرؔ کا فن

محض صوفیت نہیں کہ غیر مرئی اذکار کو ہی مرکزِ سخن سمجھ لے، بلکہ
ان کا فن بیرونی محرکات سے بھی مواد کشید کرتا ہے، اور فکر و
عمل کا ایک متوازن جمالیاتی نظریہ پیش کرتا ہے۔ یہ ایک
طویل سلسلۂ احساس ہے۔ جو پاتال سے ابھر کر ستاروں کے
اس پار چلا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو

آج کل میخانے میں تقسیم ہوتے ہیں جگرؔ
زہر کے ساغر شرابِ زندگی کے نام پر

کہاں کے لالہ و گل کیا بہار توبہ شکن
کھلے ہوئے ہیں دلوں کی جراحتوں کے چمن

یہ مرحلہ بھی مری حیرتوں نے دیکھ لیا
بہار میکدے لئے اور میں تہی دامن

آہ مذاقِ آگہی ہائے رے پستیٔ بشر
سارے جہاں کا جائزہ اپنے جہاں سے بے خبر

کیا قیامت ہے کہ دورِ ترقی میں جگرؔ
آدمی سے آدمی کا حق ادا ہوتا نہیں

جہلِ خرد نے دن یہ دکھائے
گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

اور "فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آج کل" —— والی
پوری غزل —— وغیرہم
فکر و حکمت ہو یا غمِ دنیا، جگرؔ کے ہاں سب موضوع فنی
بنت کے اعتبار سے ایک ہیں۔ وہی مخصوص ترکیبیں، وہی
والہانہ اندازِ بیان اور وہی شوخ باریکیاں، یہی وجہ
ہے، کہ ان کا کلام خواہ کسی دور سے متعلق ہو بنیادی طور پر
ایک ہی زنجیرِ اسلوب کی کڑی معلوم ہوتا ہے۔
ان تمام محاسن کے باوجود جگرؔ کی شاعری کا نکتۂ عروج
وہ ہے۔ جہاں ان کا عشق مہجوری و رسوائی کے ہزار مرحلوں
سے گزر کر خود حسنِ مجسم بن گیا ہے، جہاں قلبی واردات میں
گہرائی اور احساس و وجدان میں بلندی پیدا ہو گئی ہے،
جہاں شعورِ ذات، حسنِ ذات، اسرارِ تخلیق، اور سلوک کی

منزلوں کی مجرد حقیقتوں سے آگاہ ہے جہاں سرمستی ہی سرمستی ہے جمال ہی جمال ہے، اور جہاں مجمل سے مجمل اظہارِ دل بھی اپنے اندر کیفیات کا جہان سموئے ہوئے ہے۔

فنی عمومیت چونکہ کسی وقتی مشاہدہ کی پابند نہیں ہوتی۔ اس لئے بعض لوگ اسے شاعر کا غیر استدلالی رجحان قرار دیتے ہیں۔ شاید یہ درست ہو مگر میرے خیال میں یوں کہنا چاہیئے، کہ عقل جب پختہ ہو جاتی ہے تو وجدان کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اور محدود استدلال سے اُبھر کر ایک عظیم اور خاموش استدلال کا حصہ بن جاتی ہے۔ مجاز کے تار و پود بکھیر کر حقیقت سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ اور شاعر کی شخصیت ہمہ گیر ہو کر شخصیتِ زمانہ بن جاتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

ہوسنا کی خیالِ غیریت ہی کا نتیجہ ہے
جو یہ پردہ بھی اُٹھ جائے تو سب اپنا ہی اپنا ہے

خلوتیانِ راز کا خاص یہ اک پیام ہے
کیفِ وصالِ یار بھی منزلِ ناتمام ہے

یہ سبب ہے کہ تڑپ سینۂ ہر ساز میں ہے
میری آواز بھی شامل تری آواز میں ہے

اب دیدہ و دل سب ختم ہوئے اب دیدۂ و دل کا کام نہیں
اب عشق ہے خود پیغام اپنا، اب عشق کا کچھ پیغام نہیں

کچھ روشنی سی آج ہر اک دشت و در میں ہے
کیا میرے ساتھ خود مری منزل سفر میں ہے

سوچا تھا تجھ سے دور نکل جاؤں گا کہیں
دیکھا تو ہر مقام تری راہ گزر میں ہے

مانوں اعترافِ کرم کیوں کیا مجھے
اب ہر خطائے شوق اسی کا جواب ہے

مجرم بنا ہوا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں
میں وہ ہوں تو نے ظالم خود جس کی آرزو کی

بھری ہوئی ہیں فضا میں جمالِ غم سے تمام
گناہگار نظر لذتِ عذاب اُٹھا

وغیرہم

اصولِ تنقید کی رُو سے جگر کا مطالعہ اس وقت مکمل ہوتا ہے۔ جب ان کے کلام کا ان کے ہمعصروں کے کلام سے تقابل کیا جائے، اس کے لئے گزشتہ پچاس برس کی تاریخ غزل کی تفصیلوں سے گزرنا ضروری ہے ......

...... اور اس ضرورت کو کسی مختصر مضمون سے نہیں کسی جامع تصنیف سے ہی پورا کیا جا سکتا ہے۔

مختصر یہ کہ اگر سادگیٔ فکر اور سلاستِ بیان کو روحِ تغزل سمجھ لیا جائے تو حسرت موہانی پیش پیش ہیں۔ اگر جزبہ کے شدید تاثر کو حاصل کلام کہا جائے تو فانی سے آگے کوئی نہیں، اگر تغزل سے مراد شاعر کا Personality cult ہے۔ تو مرزا یاس یگانہ سے بڑا کوئی نہیں۔ اور اظہارِ سوز و ساز کے ساتھ آرٹسٹ کے کینوس کی وسعت کا بھی خیال رکھا جائے تو فراق و جگر مضمونِ واحد ہیں۔

—— اور شاید مقطع میں یہ بات سخن گسترانہ معلوم ہو۔ کہ جو اسلوبِ سخن جگر کے لئے فخر و مباہات کا باعث بنا، اس کے اولین نقوش اگر کسی شاعر میں پہلے سے موجود ہیں تو وہ اصغر گونڈوی ہیں۔

سجاد باقر رضوی

اصغر گونڈوی

سرسید احمد خاں کی تحریک صرف اصلاحی تحریک نہ تھی اس کی حیثیت اصلاح سے کچھ زیادہ تھی۔ یوں کہئے کہ تاریخ سرسید اور ان کے رفقا سے اپنے تقاضے پورے کرا رہی تھی۔ یہ تقاضے پوری زندگی میں موضوع اور ہیئت کی کمی سے متعلق تھے۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں نئے موضوعات کی ضرورت تھی اور ان کے اظہار کے لئے نئے پیکر اور نئی ہیئتوں کی بھی ضرورت تھی سیاسی، سماجی، مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی تقاضے یہ چاہتے تھے کہ نئے موضوعات کی تخلیق ہو، نئی ہیئتیں تراشی جائیں اور اس طرح زندگی کی رنگا رنگی میں اضافے ممکن ہو سکیں۔ یہ کام بڑا مشکل تھا، اس لئے کہ ایسا کرنے میں پرانے طرز فکر، پرانے موضوعات زندگی سے بغاوت لابدی تھی، اور اس کے ساتھ ساتھ پرانے پیکروں کو توڑنا اور پرانی ہیئتوں سے گریز یقینی تھا۔ سرسید اور ان کے رفقا کی انتھک کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر کار مسلمانان ہند کی سیاسی، سماجی اور معاشی زندگی میں ایک انقلاب آیا اور ساتھ ہی ان کی تمدنی اور ثقافتی زندگی بھی متاثر ہوئی۔

ادب میں اس تحریک کا ردعمل یہ ہوا کہ رنگ لکھنؤ کی پستی اور داغ و امیر کی نقالی سے ایک عام بغاوت شروع ہوئی۔ زندگی میں نئے موضوعات داخل ہونے لگے اور نئے پیکر تراشے جانے لگے۔ ادب میں بھی یہی ہوا نئے موضوعات کی تلاش ہوئی جو بدلتی ہوئی زندگی سے میل کھائیں، اور ان کے اظہار کے لئے نئے پیکر ڈھونڈے جانے لگے۔ حالی اور آزاد نے ایک نیا موڑ اردو شاعری کو دیا اور ان کی طرز فکر سے جو انقلاب رونما ہوا، اقبال کے ہاتھوں کمال کو پہنچا۔

جہاں تک اردو غزل کا تعلق ہے اس میں نہ ہیئت کے تجربے ممکن تھے اور نہ ایسے موضوعات جن کے اظہار کے لئے تفصیل کی ضرورت ہو۔ غزل میں تجربے کی تفصیل نہیں ہوتی، اس میں تجربے کی روح ہوتی ہے۔ ہر تجربہ چاہے وہ محبت کا ہو یا ناکامی کا، خلوص و مروت کا ہو یا دنیا کی بے ثباتی کا، اس کی ایک بنیادی شکل (Pattern) ہوتی ہے۔ یہ بنیادی شکل یا نمونہ ہر تجربہ کے پیچھے موجود ہوتا ہے۔ اور شاید غزل کی ہیئت کی کامیابی کا یہی راز ہے کہ ایک شعر پڑھا گیا اور تمام سننے والوں نے اسے اپنے تجربے کے مطابق پایا اس لئے کہ ہر قاری اور ہر سامع اپنے ذاتی تجربے کی تفصیل اس بنیادی شکل میں اپنی طرف سے بھر دیتا ہے اور اسے اپنا لیتا ہے۔ اسی باعث غزل میں ہیئت و موضوع دونوں میں کوئی بڑی انقلابی تبدیلی ممکن نہ ہو سکی تاہم غزل میں ایک اصلاحی تحریک شروع ہوئی۔ جو لوگ اس سے آگے بڑھے انہوں نے نظموں کا سہارا لیا اور حتی المقدور نئے نئے موضوعات کی تلاش اور نئی ہیئتوں کی تراش خراش میں مصروف ہو گئے۔ غزل کہنے

والے اصلاح غزل کی طرف مائل ہوئے، کچھ تو نئے موضوعات اور حقیقت کی مختلف سطح کی تلاش میں لگ گئے ساتھ ہی غزل جیسے کلاسیکی فارم میں اپنی شخصیت کا بھرپور اظہار کرنے لگے جیسے فانی اور یگانہ، کچھ لکھنؤ کی کچی اور چھچھلی شاعری اور پست ذہنیت کے خلاف اساتذہ کی طرف مائل ہوئے اور اُردو غزل کی صحیح روایات کی چھان بین میں لگ گئے جیسے حسرتؔ اور کچھ ایک اخلاقی میلان کے ساتھ اصلاح غزل کی طرف مائل ہوئے جیسے اصغرؔ۔ غزل کی اصلاح کے لئے انھوں نے شاید یہ بہتر سمجھا کہ موضوعات انسانی جسم سے متعلق ہونے کے بجائے رُوح کی بالیدگی سے متعلق ہونے چاہئیں اور اس کے لئے سیدھا راستہ تصوّف کا تھا۔

مولوی اصغر حسین اصغرؔ گونڈہ کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے اور اس حساب سے یگانہ کے ہمسن اور حسرتؔ و فانیؔ کے ہمعصر تھے۔ اصغرؔ کا سارا کلام دو چھوٹے چھوٹے مجموعوں پر مشتمل ہے "نشاطِ رُوح" اور "سرودِ زندگی" ان میں نظمیں بھی ہیں مگر بہت کم۔ کچھ متفرقات ہیں اور کچھ فارسی کی غزلیں۔ یوں کہیئے کہ دونوں مجموعوں میں تقریباً سو مکمل غزلوں کا مواد ہے۔ اس طرح دیکھئے تو ان کے کلام کی پہلی خصوصیت یہ ہوئی کہ وہ مختصر ہے، منتخب ہے۔ ان کی دوسری خصوصیت میرے نزدیک یہ ہے کہ اس میں بلند و پست نہیں ایک ہموار سطح ہے تیسری خصوصیت جو پہلی اور دوسری خصوصیتوں کا لازمی نتیجہ ہے، یہ ہے کہ ان کے پورے کلام میں ایک رکھ رکھاؤ ہے اور اگر ہم گنگھی چوٹی، کرتی، انگیا کی شاعری کو پست قرار دیں تو اصغرؔ کی شاعری بلند ہے۔ (میں نے یہاں "اگر" کا استعمال کیا ہے اور وہ یوں کہ میں موضوع کی اخلاقی برتری کے باعث شاعری کو برتر نہیں سمجھتا۔ اچھی شاعری صرف موضوعات کی بلندی سے نہیں بنتی، اچھی شاعری تو پست موضوعات کو بلند کر دیتی ہے) ہاں تو بات یہ تھی کہ اصغرؔ کی شاعری بلند ہے اور وہ بلند ان معنی میں ہے کہ وہ موضوعات میں تمیز کرتے ہیں

کچھ موضوعات کو بلند و عظیم اور کچھ کو کمتر درجے کا سمجھتے ہیں ظاہر ہے کہ خدائے بزرگ و برتر کی ذات سب سے زیادہ عظمت کی مظہر ہے اور اسی لحاظ سے بندہ و خدا کے تعلقات شاعری کے لئے زیادہ برتر و مؤثر موضوعات فراہم کریں گے۔ اس مابعد الطبیعاتی تعلق کی بنا پر شاعری میں فکری عنصر اور ایک قسم کی عمق بھی پیدا ہوگی جو یقیناً عام سطح سے بلند تر ہوگی اس لئے کہ عام آدمی ان خاص موضوعات و تجربات کو سمجھ ہی نہیں سکتا اور اسی لئے شاعری کی سطح بلند بھی ہوگی اور خواص کے لئے بھی ہوگی۔ عام آدمی کے لئے شعر کہنے کے تو اصغرؔ خود بھی قائل نہ تھے اسی لئے ان کی شاعری نے مولانا ابوالکلام آزاد جیسے آدمی کے ذہن رسا تک رسائی حاصل کی اور مولانا اصغرؔ پر اپنی تقریظ میں لکھتے ہیں کہ "میں معیار کی پستی پر کسی طرح اپنے آپ کو راضی نہیں کر سکتا" اصغرؔ کی شاعری کے موضوعات کی بات ہو رہی ہے تو اسی سلسلے میں اصغرؔ پر تنقید کا ایک نمونہ دیکھتے چلئے۔ ہمارے ناقد کہیں کہیں بات پتے کی کہتے ہیں مگر بھلے مانس اتنے ہیں کہ کسی کی اچھائی بُرائی میں نہیں پڑتے وہ تو ہر ایک کا گُن گاتے ہیں اور اسی طرح اپنی عزت آبرو کا بھرم رکھتے ہیں:-

"اصغرؔ کی غزلوں میں مجازی کیفیاتِ عشق کی ترجمانی نام کو نہیں، وہ تو عشقِ حقیقی کے شاعر ہیں لیکن اس عشق حقیقی کی متنوع کیفیات کو جس انداز سے اُنھوں نے محسوس کیا ہے اور پھر جس طرح اس کی ترجمانی کی ہے وہ اُردو غزل کی روح میں ایک بہت بڑا اضافہ ہے۔ اصغرؔ تصوف کے شاعر ہیں اور تصوّف کے مسائل کو پیش کرتے ہوئے وہ زندگی کی فضا میں اتنا اُونچا اُڑے ہیں کہ اپنے آپ کو کہیں کہیں نظروں سے اوجھل کر دیا ہے۔ اسی لئے ایک قسم کی ماورائیت بھی ان کے یہاں پیدا ہو گئی ہے لیکن ان کے اس انداز میں ایک رفعت اور بلندی کا احساس ضرور ہوتا ہے"۔

اس اقتباس سے پہلی بات تو یہ ظاہر ہوتی کہ اصغرؔ

تی کے شاعر ہیں اور اس عشق کی متنوع کیفیات کی ترجمانی جس
ح انھوں نے کی ہے وہ اُردو غزل کی روایت میں ایک
ت بڑا اضافہ ہے۔ دراصل غور کیجئے تو عشق کی کیفیات چاہے
قیقی عشق کی ہوں یا مجازی کی دونوں کا مثالی نمونہ .....
Pattern) ایک ہی قسم کا ہوتا ہے۔ وہی درد و ہجر
وہی لذتِ وصال، اور اس درد اور اس لذت کا اظہار
ب شعر میں ہوتا ہے تو دو شاعروں میں فرق صرف طرزِ بیان
انفرادی ردعمل کا ہوتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اصغر کے
بیان اور دوسرے شاعروں کے طرزِ بیان میں فرق ہے
ظاہر ہے اس لئے کہ اگر ان کا طرزِ بیان ویسا ہی ہو جیسا
سروں کا ہے تو اصغر شاعر نہ ہوں گے صرف نقال ہوں گے
ں تک عشق کے موضوعات کے سلسلے میں اُردو غزل کی
ایت میں اضافہ کا تعلق ہے تو وہ یوں غلط ہے کہ اصغر نے
ل ناقد مجازی عشق کو بالائے طاق رکھ دیا تھا اور صرف
ن حقیقی تک محدود تھے اور ظاہر ہے کہ اس عشق کی کیفیات
اظہار صرف اسی طرح ہوگا جس طرح عشقِ مجازی کا تو پھر
ں میں نہ تنوع کا سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ روایات میں
افہ کا۔ میں یہاں اپنی بات اصغر کے شعر کی مثال سے واضح
تا ہوں:۔

زاہد نے مرا حاصلِ ایماں نہیں دیکھا
رُخ پر تری زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا

عام مذہبی رجحان سے گریز، زاہد کو جو اس رجحان کا
ئندہ ہے خاطر میں نہ لانا، دنیا میں حسن و جمال کی تلاش
ان کی ہر حسین شے میں خدائے برتر کا جلوہ دیکھنا، یہ سب
دو غزل کیا فارسی غزل کی روایات ہیں جو اُردو غزل میں
ا ہمیشہ سے جاری و ساری ہیں۔ اصغر کا اس روایت میں
افہ کیا معنی رکھتا ہے۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ اصغر
دو ہجر" اور "لذتِ وصل" کے موضوع سے گھبرائے ہوئے
[illegible]

یا شاید وہ غزل کو دھو کر پاک کرنا چاہتے تھے اور اسی لئے
وصل و ہجر سے پریشان تھے یا پھر وہ اس مروجہ طریقۂ اظہار
کو پسند نہ کرتے تھے جو ان کے زمانے کے شاعروں میں عام
تھا اور اس طرح اپنے لئے ایک علٰحدہ راہ تلاش کر رہے تھے
خود کہتے ہیں:۔

کیا درد، ہجر اور یہ کیا لذتِ وصال
اس سے بھی کچھ بلند ملی ہے نظر مجھے

اور اس بلند نظری کا اثر ان کی شاعری پر یہ ہوا کہ وہ
انسان، اس کے جذبات و احساسات، حیات و کائنات
سے اس کا رشتہ، یہ سب کچھ بھول گئے، ان کی نظر بلند تو
ہوئی مگر خلاؤں سے شاعری کے موضوعات نہیں آتے وہ تو
زندگی سے پیدا ہوتے ہیں اسی لئے اُردو شاعری کی روایت
کی ایک "بعد" (Dimension) اور کم ہو گئی۔ یہ
"بعد" انسان پرستی (Humanism) کے نظریہ پر
مبنی تھی۔ ہمارے ناقد آگے چل کر یہ کہتے ہیں کہ اصغر تصوف
کے شاعر ہیں اور تصوف کے مسائل پیش کرتے ہیں۔ اس
طرح ان میں ماورائیت پیدا ہو گئی ہے لیکن اس میں رفعت
اور بلندی ضرور ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی بات تو یہ
کہ تصوف کا شاعر یا کوئی اور شاعر کسی قسم کے مسائل کو پیش کر کے
شاعر نہیں بنتا۔

شعر میں مسائل پیش نہیں کئے جاتے، مسائل کی حیثیت تو
شاعری میں ویسی ہی ہو گی جیسے کہ کوئی حکیم اپنا نسخہ نظم کی
صورت میں لکھ دے۔ جہاں تک ماورائیت کا تعلق ہے وہ
بات مانی جا سکتی ہے اور جیسا کہ اُوپر کہا گیا ہے اصغر زندگی
سے الگ تھلگ نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری کی رفعت اور
بلندی کے قائل بھی ہو جائیے اس لئے کہ جو چیز زندگی سے
ماورا ہے وہ کہیں بھی ہو، ہم سے کیا مطلب۔

ہمارے ناقد آگے چل کر کہتے ہیں کہ اصغر کی غزلوں میں
سارا کھیل تخیل کا ہے اور تخیل کی بلند پروازی نے ان [illegible]

غزلوں کی رنگین فضا پیدا کی ہے۔ ان کے یہاں روحانی اور وجدانی خیالات ہیں۔ اصغر کے یہاں موضوعات کا تنوع نہیں ہے صرف تصوف کی کیفیات ہیں جو کہیں کہیں فلسفہ کے حدود میں داخل ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں لیکن ان کی تخیئل پرستی اور رُوحانیت انھیں فلسفی نہیں بننے دیتی۔ اسی لئے ان کے یہاں موضوع کی یکسانیت ضرورت ہے وغیرہ وغیرہ۔

ذرا غور کیجئے، تخیئل کا کھیل تو دنیا بھر کی شاعری میں ہے پھر اصغر کی غزلوں کی یہ خصوصیت کیا ہوئی۔ روحانی اور وجدانی خیالات بھی تخلیقی اُدب کی خصوصیت ہیں، اصغر کے یہاں موضوعات کا تنوع نہیں یہ بالکل سچی بات ہے اور یہ بات کہ ان کی شاعری میں تصوف کی کیفیات فلسفہ کے حدود میں داخل ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں بالکل رہی ہے کہ وہ تصوف کے مسائل نظم کرتے ہیں۔ ان دونوں باتوں میں کوئی فرق نہیں "تخیئل پرستی" کیا چیز ہے یہ میں نہیں جانتا، آپ کا جو جی چاہے سمجھ لیجئے البتہ ناقد ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ اسی کے باعث اصغر فلسفی نہیں بن سکے۔

چلو اچھا ہی ہوا کہ یہ مرض انھیں لاحق نہ ہوا۔

ابھی ہم اصغر کی شاعری کے موضوعات کی بات کر رہے تھے۔ ایک نظر ان کی زبان پر بھی ڈالئے۔

اس طرح زمانہ کبھی ہوتا نہ پر آشوب
فتنوں نے ترا گوشۂ داماں نہیں دیکھا
رُوداد چمن سنتا ہوں اس طرح قفس میں
جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا
ہے آرزو کہ آئے قیامت ہزار بار
فتنہ طرازیٔ قد رعنا لئے ہوئے
جوشِ جنوں میں چھوٹ گیا آستانِ یار
روتے ہیں منہ پہ دامن صحرا لئے ہوئے
اس عارضِ رنگیں پہ عالم وہ بکھا ہوں کا
معلوم یہ ہوتا ہے پھولوں میں صبا آئی

الفاظ کے چناؤ میں وہ بہت زیادہ منہمک نظر آتے ہیں اور موضوع کی مناسبت سے الفاظ بھی بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ چنے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ دراصل جس طرح موضوعات کے سلسلے میں اصغر امتیازات کے قائل ہیں الفاظ کے سلسلے میں بھی وہ کچھ کو شاعرانہ، عظیم، بلند تر اور کچھ کو کمتر درجہ کا سمجھتے ہیں۔

موضوعات اور الفاظ کے ساتھ اصغر کا یہ رویہ کیوں تھا؟ ان کی شاعری نے یہ نہج کیوں اختیار کی؟ ظاہر ہے کہ وہ غزل کو ایک معیار دینا چاہتے تھے۔ اصغر کے اس خیال کے پیچھے کچھ ادبی و سماجی اور کچھ ان کے اپنے نفسیاتی عوامل کارفرما تھے۔ بہتر ہوگا کہ ہم ایک نظر ان اثرات پر ڈالتے چلیں جو اصغر کی شخصیت اور ان کی شاعری کی تشکیل کر رہے تھے۔

اس سلسلے میں پہلا اثر تو اس سماجی تحریک کا تھا جو سر سید سے شروع ہوئی۔ جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے اس تحریک کی نوعیت اصلاحی تھی۔ شاعری میں حالی اور آزاد نے اصلاحی قدم اُٹھایا۔ موضوعات اور ہیئت کی تلاش کے ساتھ اصلاح کا اخلاقی پہلو بھی شاعری میں داخل ہوا۔ شاعری اور اخلاقیات کی چشمک پرانی ہے اور ہر اصلاحی دور میں یہ خیال ہمیشہ جنم لیتا ہے کہ شاعری جتنی اخلاق سے قریب ہوگی اتنی ہی معیاری ہوگی۔ اسی لئے حب الوطنی، قومیت، پچھلے اسلامی کارناموں اور روایات، اسی قسم کے بہت سے موضوعات داخل ہوئے اصغر نے اس تحریک کی روایات سے تربیت حاصل کی اور اُردو غزل کو صاف، ستھرا، معیاری دیکھنے کے لئے موضوعات کی بلندی اور الفاظ کا حسن دونوں کو اپنا شعار بنایا۔

ان پر دوسرا ادبی اثر اقبال کا تھا۔ ہر بڑا شاعر جو اپنے زمانے میں مقبول ہو چکا ہو (جیسا کہ اقبال تھے، اور جو مقبولیت غالب کو نہیں ملی تھی) اپنے ہمعصروں کو ضرور متاثر کرتا ہے

اقبال کی آواز اُردو شاعری میں نہ صرف منفرد تھی بلکہ اثر انگیز بھی تھی ایک اُٹھتی اور اُبھرتی ہوئی قوم کو ان کی شاعری کی ضرورت تھی اقبال کے یہاں شاعرانہ بلندیوں کے ساتھ اصلاح قوم کے جذبات اور اخلاقی پیغام کی کمی نہ تھی۔ اصغر پر اقبال کا اثر خاطر خواہ ہوا مگر ایک فرق کے ساتھ۔ اقبال کے پاس اپنے خیالات کی وسعت کے مکمل اظہار کے لئے مختلف ذرائع اظہار تھے۔ وہ ان تمام اصناف پر جو مروجہ تھیں حاوی تھے اور ایسی اصناف جو مروجہ نہیں تھیں ان کو بھی پیرایۂ اظہار بنانے کی صلاحیت و استطاعت رکھتے تھے۔ اقبال کے قارئین بچے اور بوڑھے دونوں تھے، اسی حساب سے ان کے موضوعات میں بھی تنوع پیدا ہوا اور زبان میں بھی۔ اصغر کے یہاں یہ سب کچھ نہ ہو سکا، وہ ایک مخصوص طبع، مخصوص رنگ اور مخصوص قارئین کے شاعر تھے۔ مولانا سراج الحق مچھلی شہری لکھتے ہیں کہ میں نے اصغر سے کہا کہ وہ بھی مومن کی طرح حضرات خلفائے راشدین کی شان میں قصیدے کہیں ورنہ کہیں "اہل راز" انھیں ان کے نام کی وجہ سے اپنوں میں سے نہ گرداننے لگیں۔ اصغر نے قصیدہ شروع کیا جو تشبیب سے آگے نہ بڑھ سکا اور بالآخر ان کے مجموعہ کلام میں غزل کی حیثیت سے داخل ہو گیا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اصغر غزلیں کہتے رہے "مخصوص لوگوں کے لئے، مخصوص زبان میں" اور مخصوص موضوعات کے ساتھ اب ان کی شاعری کی حدود کا اندازہ لگائیے۔

موضوعات کے سلسلہ میں بات آنکلی ہے تو اصغر کی زندگی اور ان کی شاعری پر ایک نمایاں اثر کو اور ذہن میں رکھئے اور وہ اثر ان کے صوفیانہ مسلک کا تھا۔ قاضی عبدالغنی منگلوری ان کے پیر تھے۔ ظاہر ہے کہ اصغر کے کلام پر پیر صاحب کی تعلیم کا اثر ہوا اور ان کی شاعری میں تصوف کی ایک نئی لہر بھی پیدا ہوئی۔ مگر ایک بات اور قابل غور ہے اور وہ یہ کہ اُردو غزل کی سطحیت کو عمق دینے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ اس میں فکر کی گہرائی پیدا کی جائے، یہ راستہ بھی اصغر کو تصوف کے موضوعات کی طرف لے گیا۔ ذیل کے شعر میں اقبال اور تصوف دونوں کے اثرات نمایاں :-

شمیم گلشن، نسیم صحرا، شعاع خورشید و موج دریا
ہر ایک گرم سفر ہے ان میں کوئی مرا ہمسفر نہیں ہے

عکس کس چیز کا آئینۂ حیرت میں نہیں
تیری صورت میں ہے کیا جو مری صورت میں نہیں

خود آپ اپنی آگ میں جلنے کا لطف ہے
اہل تپش کو آتش سینا نہ چاہیئے

اقبال اور قاضی عبدالغنی منگلوری کے اثرات تو بعد کے اثرات تھے۔ اصغر ماضی کے دو شاعروں کے اثرات کے خود قائل ہیں۔ ان کا قول تھا کہ "میری شاعری خواجہ میر دردؔ کے معانی اور میرزا غالبؔ کے الفاظ کا مجموعہ ہے" خواجہ میر دردؔ سے ہم آہنگی کا دعویٰ صرف تصوف کی پیروی پر مبنی ہے حالانکہ اصغر کی شاعری میں تصوف کا وہ گھلاؤ نہیں جو دردؔ کے یہاں ہے، اگر اس دعوے کو تھوڑی دیر کے لئے مان بھی لیا جائے تو غالبؔ کے الفاظ والے دعوے کو کس طرح مانئے۔ غالبؔ کے یہاں زبان کے بڑے تجربے ہیں۔ ان کی زبان میں اتنا ہی تنوع ہے جتنا موضوعات میں۔ غالبؔ کی زبان :-

ع دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے ...... سے لے کر
ع شب خمارِ بادہ ساقی رستخیز اندازہ تھا ... تک ہے،
جب کہ اصغر کی زبان میں صرف پُر تکلف رکھ رکھاؤ ہے۔ زندگی میں بھی اصغر اسی تصنع اور رکھ رکھاؤ کے قائل تھے مولانا سراج الحق مچھلی شہری کے قول کے مطابق اصغر سواری کے لئے اکہ میں بیٹھتے تو یہ دیکھتے کہ وہ خوبصورت اور دیدہ زیب ہے یا نہیں۔ شاعری میں بھی وہ نہ ہر مضمون کو منہ لگاتے اور نہ ہر لفظ کو پیرایۂ بیان بناتے۔ شاید اسی تکلف اور تصنع کا یہ بھی تقاضہ تھا کہ انھوں نے دزد و غم کے موضوعات کو بھی

بتانے سے انکار کر دیا اور اس کے لئے ایک رجائی فلسفہ کی
تشکیل دی۔

مجھ کو اصغر کم ہے عادت نالہ و فریاد کی

ان کی شاعری میں معاملہ بندی نہیں۔ عشق کے وہ تجربے
نہیں جو جسمانی سطح کے ہوں۔ ان کے رکھ رکھاؤ اور پُر تصنع
معاملاتِ زندگی نے انھیں شاید اس بات کی اجازت ہی نہ
دی۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ اصغر موضوعات، زبان، موڈ اور پیرایۂ
بیان کے اعتبار سے بالکل محدود ہو گئے۔ اتنا ہی نہیں، یہ
بھی ہوا کہ اصغر کے دو مجموعہ کلام میں اشعار کی تعداد بھی بہت
کم رہ گئی، یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تعداد سے کیا ہوتا ہے
شاعری میں تعداد نہیں بلکہ خوبی و کمال کو دیکھنا چاہیئے۔ مگر جوہر
کی تلاش بھی عرض ہی میں ہی ہوتی ہے۔ جوہر و کمال ہوا میں نہیں
ہوتے۔ بڑی شاعری میں صرف یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کیا کہا ہے
وہاں تو یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ کتنا کہا ہے۔ اصغر نے شاعری
کو فکر کی عمق تو دی مگر وسعت کھو بیٹھے یوں سمجھئے کہ اقبال کی
عمق سمندر کی عمق ہے اور اصغر کی عمق کنویں کی۔

ذرا اصغر کو ان کے ہمعصر شعرا کی صف میں بھی رکھ کر
دیکھتے چلیے۔ حسرت سے اصغر کا اختلاف ذہنی اور شاعری
کی قدر کا اختلاف ہے۔ شعر کے بارے میں حسرت کا رجحانِ
طبع ان سے مختلف تھا۔ وہ کہتے ہیں:۔

شعر دراصل ہیں وہی حسرت
سنتے ہی دل میں جو اُتر جائیں

اس کے برخلاف اصغر شعر کے سلسلے میں عوام الناس
کے ذوق کو تو مانتے ہی نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مشاعروں
میں شاعر کو داد لینے کے لئے عوام کی سطح پر اُترنا پڑتا ہے۔
اسی لئے وہ مشاعروں کے زیادہ قائل نہ تھے یہاں یہ بات
ظاہر ہوتی ہے کہ عوام ان کے شعروں کے بلند آہنگ و
معانی کو سمجھ ہی نہ سکتے تھے پس اگر حسرت شعر کی سادگی اور
دل میں اُترنے کے قائل تھے تو اصغر فکر کی گہرائی و گیرائی

کے۔ تاہم فکر کی گہرائی کا احساس صرف الفاظ کی نشست
بست سے ہی ہوتا ہے۔ ان کے یہاں زندگی سے متعلق ک
فکر کا احساس نہیں ملتا۔ ان کا ایک ایک شعر دیکھئے تو و
ایک بلند آہنگ کا حامل اور ایک گہری فکر کا حاصل نظ
آتا ہے مگر سچ پوچھئے تو ان کے پورے کلام میں کسی ایک
رُوح کا پتہ نہیں چلتا۔ آپ یہ نہیں جان سکتے کہ حیات
و کائنات کے بارے میں اصغر کا اپنا نظریہ کیا ہے۔ مثلاً
آپ یہ پوچھیں کہ غالب کے نزدیک یہ کائنات کیا ہے
میرا جواب یہ ہوگا کہ یہ ایک حسین مرقع ہے جس کی رنگا
انسان کی فکر سے ہے۔ اقبال کے نزدیک کائنات کوئی
اور ٹھوس حقیقت نہیں بلکہ ایک رواں دواں متحرک اُصو
ہے، جس میں عمل ثواب اور بے عملی گناہ ہے۔ فانی کے یہ
کائنات کا سب سے بڑا اصول غم ہے، یگانہ کے یہاں انسا
عظمت، فکر اور عمل کی بلندی اُصول کائنات ہے۔ ایک تڑ
ایک کشش، اور حرکت کائنات کے ذرّے ذرّے میں پوشید
ہے، جمود موت ہے اور حرکت زندگی، مگر اصغر کے یہاں اس
قسم کی کوئی بات نہیں۔ ایک ایک شعر میں تو کچھ نہ کچھ مل جا
گا مگر پورے کلام میں زندگی کا کوئی ایسا رجحان نہیں ملتا
جس سے حیات و کائنات کے کسی مسئلہ پر روشنی پڑتی ہو
حیات و کائنات کے مسئلوں کو تو چھوڑیئے اپنے کلام میں اصغر خو
نمایاں طور پر ظاہر نہیں ہوتے، وہ اپنے تصنع اور تکلف کے پردے پر
جانے کیا کچھ چھپائے ہوئے بیٹھے ہیں، ان کے چہرے پر ایک ریشمی نقاب
پڑی ہوئی ہے جس کے پیچھے کچھ نظر نہیں آتا۔

اصغر سے ملے لیکن اصغر کو نہیں دیکھا
اشعار میں سنتے ہیں کچھ کچھ وہ نمایاں ہے

حالانکہ اشعار میں وہ بالکل نمایاں نہیں ہیں۔ ان کے
منفرد اشعار سے کچھ اندازہ لگائیے حقائق و معارف سے قطع
نظر وہ ایک ایسے معاشرہ کی پیداوار معلوم ہوتے ہیں جو جر
ہو۔ خود وہ نئے زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکتے اور پُرانے تو ٹ

کے ساتھ مکمل طور پر وابستہ نظر آتے ہیں جو کچھ ہے وہ کسی کھوئی ہوئی چیز کا احساس ہے اور بس۔ حالانکہ یہی باتیں ان کے دیگر ہمعصروں مثلاً فانی اور یگانہ میں بھی ملتی ہیں مگر اصغر اس الائش کو بھی حسین پیرایۂ بیان کے لبادے میں چھپائے ہوئے ملتے ہیں جبکہ فانی اور یگانہ ان کا بھرپور اظہار کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اصغر نہ تو خود اپنے جذبات کا تزکیہ کر سکتے ہیں اور نہ قارئین کے جذبات کا۔

رُوداد چمن سُنتا ہوں اس طرح قفس میں
جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا
قید قفس میں طاقت پرواز اب کہاں
رعشہ سا کچھ ضرور ابھی بال و پر میں ہے
قفس کی یاد میں یہ اضطراب دل معاذ اللہ
کہ میں نے توڑ کر ایک ایک شاخ آشیاں رکھدی

تیسرے شعر پر غور کیجئے تو وہ ایذا طلبی کی ایک بہت اچھی مثال ہے ساتھ ہی ایسے اضطراب کی جو یقینی تباہی سے تسکین پاتا ہے۔

بظاہر اصغر حسرت سے نکتہ رسی و سرمستی میں بلند نظر آتے ہیں لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے تو ان کا کینوس حسرت سے بہت چھوٹا ہے۔ فانی اپنے ہمہ گیر رجحان طبع کے باوجود اصغر سے وسعت میں کہیں زیادہ ہیں اور یگانہ تو اپنے تمام ہمعصروں میں موضوعات اور پیرائیہ بیان کے اعتبار سے سب سے پیش پیش ہیں۔

زبان کے اعتبار سے اصغر ایک صنعت کار ہیں فانی کی طرح انھیں بھی الفاظ کے استعمال، ان کی نشست و برخواست میں کمال حاصل ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے ان کے الفاظ دُھلے دُھلے نکھرے نکھرے معلوم ہوتے ہیں مگر موضوعات میں تنوع نہ ہونے کی وجہ سے الفاظ کے ساتھ ان کا یہ لگاؤ بھی تصنع پر مبنی ہے۔ ان کے یہاں الفاظ کے ساتھ تجربہ آزمائی کا احساس نہیں ملتا جو ہمیشہ ہر بڑے شاعر کی خصوصیت ہوتی ہے۔ فرانس کے ایک شاعر والٹیر نے مصور دیگا سے یہ بات کہی تھی کہ شاعری خیالات سے نہیں الفاظ سے ہوتی ہے مگر اصغر کے استعمالِ الفاظ میں نکھار کے باوجود تازگی کا احساس نہیں ملتا۔ ساتھ ہی وہ روزمرہ کی زبان سے اتنا ہی دُور ہیں جتنا کہ وہ ہو سکتے تھے۔ بڑی شاعری کی زبان عام بول چال کی زبان سے قریب ہونی چاہیئے آپ کہیں گے کہ اصغر کی زبان ان کے موضوع سے ہم آہنگ تھی اور اسی لئے عام بول چال کی زبان سے الگ تھلگ بھی میں بھی یہی کہتا ہوں۔ اصغر کی شاعرانہ روایت زندہ روایت نہ تھی۔ وارث شاہ کا تصوف یا عبداللطیف بھٹائی کا یا پھر کسی قدر میر درد کا، عام زندگی کی پیداوار تھا، اصغر کے زمانے میں تصوف کا یہ رشتہ عام زندگی سے کٹ چکا تھا۔

محدود موضوعات، زبان اور ان کے کلام کی یک رنگی اور ایک ہموار سطح ہمیں ان کے کلام سے بہت جلد اُچاٹ کر دیتی ہے البتہ کبھی کبھی، کہیں کہیں سے پڑھنے کے لئے، یا پر تصنع کلچر کا درک لینے کے لئے یا پھر تصوف کی نام نہاد رندی و سرمستی کو پرکھنے کے لئے ہم اصغر کو اب بھی کامیاب پاتے ہیں۔

انگریزی ادب کے ایک ناقد میتھیو آرنلڈ (Mathew Arnold) نے انگریزی شاعر چاسر اور اسکاٹ لینڈ کے شاعر برنس (Burns) کو اچھے شعرا کے زمرے سے خارج کر دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ چاسر اور برنس میں اعلیٰ سنجیدگی (High Seriousness) نہیں ہے اس کے برخلاف گرے (Gray) بڑا شاعر تھا اس لئے کہ وہ متانت اور سنجیدگی سے بھرپور تھا۔ آج ہمیں میتھیو آرنلڈ کی اس بات سے اختلاف کرتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی اس لئے کہ ادب کی تاریخ کا فیصلہ ناقد کے ہاتھ میں نہیں ہوتا اگر اُردو میں اسی اصول کو اپنایئے تو نظیر اکبرآبادی اور انشا کو بیک جنبش قلم قلمزد کرنا ہوگا اور پھر اعلیٰ سنجیدگی والے شعرا

کاپی رائٹ

کاپی رائٹ کا ابتدائی اور اہم ترین مقصد یہ ہے کہ مصنف کی علمی یا فنی تخلیق کا تحفظ ہو۔ اس سے قطع نظر کہ کاپی رائٹ سے انسان کے دماغی کارناموں کی کما حقہ تشہیر بھی ہوتی ہے اور اس طرح یہ وسیلہ کتابوں کی بین الاقوامی پیمانے پر نشر و اشاعت میں نہایت سود مند ثابت ہوتا ہے زیادہ واضح الفاظ میں کاپی رائٹ کا مقصد یہ ہے کہ اہلِ قلم اور دیگر فنکاروں کو قانونی طور پہ یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنے تخلیقی شاہکاروں کو متعدد بار چھاپ کر فروخت یا مشتہر کریں۔

اکثر یہ بات کہی جاتی ہے کہ فرد کی انفرادیت یا شخص کی ذاتی ملکیت میں کوئی شے عزیز ترین محسوس ہوتی ہے تو وہ اُس کے دماغ کی اختراع یا تخلیق ہوتی ہے مگر کاپی رائٹ کے سلسلے میں جو جدید ترین تصورات پیدا ہو چکے ہیں وہ کچھ زیادہ پرانے نہیں بلکہ حال ہی کے تقاضوں اور حالات کا نتیجہ ہیں۔

تاریخ: کلاسیکی، یونانی و رومی تہذیبوں کے ادب میں کاپی رائٹ کے جدید تصورات کو تلاش کرنا بے سود ہوگا۔ اس زمانے میں (بلکہ یورپ کے عہدِ ما بعد میں بھی) مصنف کا سب سے بڑا صلہ داد و تحسین یا شہرت ہی تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ادب کی بھی ایک مارکیٹ ضرور تھی۔ مثلاً یہ کہ شعری ادب کو نقل کرنے کا کام تھا اور یہ زیادہ تر غلام کیا کرتے تھے جو ناشرین کے ملازم ہوتے تھے مگر مصنف مسودہ بالکلیہ فروخت کر ڈالتا تھا۔ اسے نقول یا ان کی تعداد سے کوئی سروکار نہیں رہتا تھا اور نہ اُن کی خرید و فروخت سے کچھ مطلب۔ اغلب یہ ہے کہ بے اجازت نقول کو بری نظر سے دیکھا جاتا تھا مگر یہ بھی زیادہ تر محض ایک رسمی سی بات تھی۔ یعنی یہ ممکن کہ اگر بلا اجازت کسی تاجرِ کتب نے نقول تیار کر لیں تو دوسرے بیوپاری اس کی اس حرکت کو بہت برا سمجھیں گے اور وہ کاروباری لحاظ سے نامعقول آدمی سمجھا جائے گا، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

عیسویت کے ابتدائی دور میں ادب کا بڑا حصہ صرف ان طبقوں تک پہنچ جاتا تھا جو زیادہ تر عیسوی خانقاہوں کے پڑھے لکھے علما و فقرا کا گروہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بعض بعض (عیسائی) خانقاہوں کی لائبریریوں کی شہرت دُور دُور تک پہنچ جاتی تھی۔ اب جن خانقاہوں میں زخیرۂ علم و ادب معقول نہ ہوتا تو وہ نقول کی جد و جہد کرنے لگتے اور دوسری خانقاہوں کے خزائن سے استفادہ کی کوشش ہوتی رہتی تھی۔ کچھ فیس لے دے کر یا بطریق تبادلہ غرض ایسی ہی کوئی سہولت پیدا کر کے بعض بعض رسائل و صحائف کے نقل کرنے کی اجازت حاصل کر لی جاتی تھی۔ اس لحاظ سے بھی اس کا حق مصنف کے مسئلے سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ صرف مسودہ یا مخطوطے کی مادّی و محسوس ملکیت کی بحث تھی اور جس کسی کے بھی پاس ہوتا تھا وہ اس سے نفع حاصل کرتا تھا۔ مگر اسی عہد میں ہم کو اس اصول (حقِ تصنیف) کے سلسلے میں دائرہ کچھ وسیع ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ ہوتا یہ تھا کہ نقل نویسی میں کئی کئی اسلوب ملتے تھے اور اکثر اغلاط و اسقام ان مسودات میں در آتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ان کی تالیف و ترتیب اور حاشیہ نگاری وغیرہ کا کام بہت گنجلک یا غلط سلط ہو جایا کرتا تھا۔ اکثر مخطوطات میں صحت ندارد ہوتی تھی۔ نقول کے ان نقائص کو دور کرنے کے لیے تحشیہ اور تصحیح و

الیف کا کام اسی وجہ سے جاری رہتا تھا اور تطبیق و تصحیح کا کام بہت مفید
سمجھا جاتا تھا۔ "الفیں" ایڈیشن "اسی وجہ سے کہا جاتا تھا کہ یہ "ایڈٹ شدہ"
مخطوطہ ہوتا تھا۔ چونکہ اس کام کی خاص قدر ہوتی تھی اور یہ کاوش کا نتیجہ
ہوتا تھا اس لئے "کاپی رائٹ" کے تصور نے بھی جنم لیا۔ گو وہ اس وقت
کتنا ہی خفیف و مبہم سا ہی کیوں نہ ہو اور اس کا دائرہ کتنا ہی محدود کیوں
نہ ہو بہر حال اس سے یہ ضرور ہوا کہ اگر تصنیف کے ساتھ حق تصنیف نہ تھے
ہیں، تو کم از کم حق تالیف و ترتیب کے تصور نے تو ضرور ایک شکل اختیار
کرنی شروع کر دی تھی۔ یہ تالیفات زیادہ تر کلاسیکی خزائن علم تھے
ان کو مرتب کرنے والے کبھی کے مر کھپ چکے تھے اور رہے سہے جو حقوق
ملکیت ان تالیفات کے سلسلے میں باقی تھے بعض وہ پبلشروں کے پاس
تھے اور وہی کتب فروش بھی ہوا کرتے تھے۔

۱۴۵۰ء عیسوی کے لگ بھگ مشینی طباعت وجود میں آئی جس کی
بدولت کتابوں کا زیادہ تعداد میں چھپنا اور نفع حاصل کرنا ممکن ہو گیا اور
ان کاپی رائٹ کا تصور پیدا ہوا۔ مصنف کی بجائے ناشر اور تاجر کو خصوصی
مراعات حاصل تھیں۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ناشر، مصنف کو پہلے ہی اس
حق تصنیف یکمشت ادا کر دیتا تھا اور اس طرح ناشر یا کتب فروش کی
حوصلہ افزائی کی جاتی تھی کہ وہ کتاب کی نشر و اشاعت میں اپنا ایک معقول
سرمایہ لگائے۔ اندریں حالات بغیر کاپی رائٹ کے تحفظ کے ناشر کو
اس کاروبار میں لگائی ہوئی رقم کا عوض یا منافع ملنا ممکن نہ تھا۔

۱۴۶۹ء عیسوی میں سب سے پہلے جس شخص کو کلیتاً یہ حق اشاعت
حاصل ہوا وہ جمہوریہ وینس (REPUBLIC OF VENICE) کا ایک ناشر تھا۔
اس جمہوریہ کی جانب سے اُس کو یہ حق صرف پانچ سال کے لئے مرحمت ہوا
تھا۔ بعد ازاں مختلف اوقات میں اسی قسم کی مراعات اور ناشروں کو دوسرے
ملکوں میں دی گئیں۔

ان مراعات کو کاپی رائٹ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ ہم
آج تصور کرتے ہیں بلکہ اس کو اگر تجارتی اجارہ داری کہا جائے تو زیادہ
موزوں ہوگا۔ دور حاضر کے کاپی رائٹ کے مفہوم سے ملتی جلتی مراعات
۱۴۸۰ء عیسوی میں جمہوریہ وینس میں ایک شخص مسمی انٹونیو سیبلیکو
(ANTONIO SABELLICO) کو اُس کی تصنیف کردہ تاریخ
موسومہ DECADES RARUM VENTORIUM پہلا کی
گئیں جن تصنیف کا کسی مصنف کے حق میں محفوظ ہونا یا شبہ ایک غیر معمولی
امر تھا کیونکہ مصنفوں کو عام طور پر دو سو سال تک اس وجہ سے ولی
کا مستحق نہیں سمجھا گیا۔

انگلستان میں کاپی رائٹ کا سب سے پہلا قانون ۱۷۰۹ء میں
پاس ہوا جس کے دیباچے سے ایکٹ کے اغراض و مقاصد پر روشنی
پڑتی ہے۔

"ہرگاہ کہ طابع اور تاجر کتب اور دیگر افراد نے آج کل آزادانہ
طور پر کتابوں کی طباعت، نقل اور اشاعت کا سلسلہ بلا حصول
اجازت مصنفین یا مالکان کتب جاری کر رکھا ہے جس کی وجہ
سے ان کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے اور اس نقصان کے
نتیجے میں وہ اور ان کے اہل و عیال تباہ و برباد ہو جاتے ہیں
لہٰذا اس بدعنوانی کا سدباب کرنے کے لئے قانون نافذ کیا جاتا
ہے کہ ۱۰ اپریل ۱۷۱۰ء سے ۲۱ سال تک ہر مصنف کو اپنی
کوئی کتاب یا تمام کتابوں کے چھاپنے کا کلیتاً حق حاصل ہوگا۔"

اس قانون کے پاس ہوتے ہی دوسرے ممالک نے بھی
مصنفوں اور فنکاروں کی تخلیقات کو ناجائز طباعت و اشاعت سے
محفوظ رکھنے کے لئے اسی قسم کے قانون نافذ کئے۔ ۱۷۴۱ء میں ڈنمارک
میں بھی کاپی رائٹ کا قانون رائج ہوا۔ اور اس کے بعد ۱۷۹۰ء میں
نوآزاد ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں نافذ ہوا۔ ۱۷۸۹ء کے انقلاب
کے فوراً بعد فرانس میں بھی مصنفوں کو کاپی رائٹ کا حق دیا گیا۔ رفتہ رفتہ
کم و بیش ۶۰ سال کی مدت میں یورپ کے دوسرے ملکوں میں بھی
اسی قسم کے قانون وضع کئے گئے۔

جوں جوں بین الاقوامی تعلقات میں اضافہ ہوا مختلف ممالک میں
بھی کاپی رائٹ کے تحفظ کی اہمیت کا احساس بڑھتا گیا۔ چنانچہ
۱۸۵۱ء میں پہلے فرانس، برطانیہ اور پرتگال کے مابین کاپی رائٹ
کے متعلق اہم معاہدات ہوئے۔ پھر ان کی تقلید میں دوسرے
معاہدے بھی جلد از جلد ظہور میں آئے، یہاں تک کہ مغربی ممالک میں
روز افزوں علمی ذاکرانی کے نتیجے میں کوشش کی گئی کہ فرانس،

برطانیہ اور پرتگال کے مابین ایک مشترکہ معاہدہ ہو جائے۔ یہ کنونیشن انٹرنیشنل لٹریری آرٹسٹک ایسوسی ایشن کی سربراہی میں منعقد ہوا جس کی داغ بیل وکٹر ہیگو (VICTOR HUGO) نے ڈالی تھی۔ رفتہ رفتہ مختلف حکومتوں کو بھی اس ضرورت کا شدت کے ساتھ احساس ہونے لگا۔ انجام کار اس شدت احساس کی بنا پر ۱۸۸۵ء میں ایک معاہدہ ہوا جو برن یا انٹرنیشنل کنونشن برائے تحفظ حقوق تخلیقات علم وفن کے نام سے موسوم ہوا۔ یہ برن کنونیشن جس پر تین مرتبہ نظر ثانی ہوئی اور دو مرتبہ عدالتی سربراہ نے اس میں تکملہ اور اضافہ کیا بین الاقوامی کاپی رائٹ کے تحفظ کے لئے بہت موثر آلۂ کار ثابت ہوا۔

میثاق برن ۱۸۸۵ء کا بنیادی اصول یہ تھا کہ کسی رکن ملک کے جو اہل قلم ہوں گے ان کو دوسرے ملک میں بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو وہ ملک اپنی رعایا کو دیتا ہوگا اور یہ کہ جملہ حقوق بلا رسمی تکلفات عطا ہوں گے، ماسوا ان رسمی باتوں کے جو اشاعت اول والے ملک میں کسی مصنف پر قانوناً عائد ہوتی ہیں۔ ایک ضروری شرط یہ بھی تھی کہ کسی ملک میں کاپی رائٹ کی اس مقررہ میعاد میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا تھا جو مدت اصل ملک میں طے پا چکی ہے۔ یہ شرط لازم تھی۔ مگر بعض ممالک دوسروں کی بہ نسبت اس باب میں زیادہ فیاض ثابت نہیں ہوئے۔ اس کے علاوہ اور بھی کچھ اصول طے کئے گئے۔ جو بڑی حد تک کامیاب ہی ثابت ہوئے جن کا مقصد ایک بین الاقوامی ضابطہ کا رطے کرنا تھا۔ بعد ازاں ترمیمات اور اضافہ وحذف ضروری سمجھا گیا۔ چنانچہ وہ ہوتا رہا اور اب تک عمل میں آرہا ہے۔ اس میثاق پر کئی بار نظر ثانی کی گئی (ایک اضافی قانون پیرس ۱۸۹۶ء، میثاق برلن ۱۹۰۸ء، میثاق روم ۱۹۲۸ء اور آخر کار میثاق برسلیز ۱۹۴۸ء) اس لئے نئے ممالک اس میثاق کے رکن بنتے جا رہے ہیں اور یہ بھی ہوا ہے کہ بہت سے نئے اور پرانے رکن ممالک نے بعض ترمیمہ تجاویز کو تسلیم ہی نہیں کیا ہے بایں ہمہ وہ میثاق کے دستخط کنندہ ہیں۔

میثاق برن میں یہ طے کیا گیا تھا کہ یونین کے ممالک میں حقوق ترجمہ صرف دس سال تک جائز رہیں گے اور یہ مدت اس [illegible] سے شمار ہوگی جس تاریخ سے کہ اشاعت کے اصل ملک میں چیز شائع ہوئی ہو۔ اس میں " اضافی قانون پیرس " کے ذریعہ [illegible] کر دی گئی۔ ترمیم یہ کی گئی کہ اگر کسی دوسرے ملک میں کوئی مصنف اپنی تخلیق کے حق ترجمہ کی حفاظت چاہتا ہے اور وہاں کوئی [illegible] اصل زبان میں اشاعت کے دس سال کے اندر اندر چھپ گیا تو حق ترجمہ کاپی رائٹ کی پوری مدت کے لئے جائز اور جاری سمجھا جائے گا۔ اور جن ملکوں میں ترجمہ شائع نہ ہوا ہو اور مذکورہ دس [illegible] کی مدت ختم ہو چکی ہو تو یہ حق ساقط سمجھا جائے گا۔

آخر الامر میثاق روم میں یہ طے کیا گیا کہ حق ترجمہ بھی کاپی رائٹ کی پوری مدت پر محیط اور جاری سمجھا جائے گا خواہ اس حق کا استعمال کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو۔ لہٰذا اگر کوئی مصنف یہ چاہتا ہے کہ یونین [illegible] کسی مخصوص ملک میں اس کے حقوق تراجم کیا ہیں اور کیا نہیں تو اسے چاہیئے کہ پہلے وہ اس بات کی تصدیق وتوثیق کر لے کہ اس ملک نے ان تینوں قوانین میں سے کس قانون کو تسلیم ومنظور کر رکھا ہے اور کس کو نہیں۔

حالیہ آخری کنونیشن ۱۹۴۶ء میں واشنگٹن میں ہوا تھا۔ اور ابھی ماضی قریب میں یعنی ۱۹۵۲ء میں یونیسکو کنونشن نے اس بات کا بیڑا اٹھایا کہ ماضی قریب وبعید میں برن کنونیشن کے علاوہ مختلف بین الامریکی کانفرنسوں میں کاپی رائٹ کے تحفظ کے لئے جو قانون منظور ہوئے تھے وہ سب ایک عالمگیر کاپی رائٹ قانون کے تابع ہو جائیں۔ اس قانون کا احترام ان ممالک پر بھی لازم آتا ہے جن کو ان گزشتہ معاہدوں پر دستخط کرنے کی نوبت نہیں آئی۔

بین الاقوامی سطح پر یکسانیت عمل ابھی تک پیدا نہیں ہو سکی ہے مگر تمام ممالک اس کے لئے کوشاں ضرور ہیں۔ روس تو اس سلسلے میں کسی تعاون کا رجحان ظاہر ہی نہیں کرتا مگر یونین کے باہر دوسرا بڑا ملک امریکہ ہے۔ واشنگٹن میں یونیسکو کی جو کانفرنس ۱۹۵۰ء میں منعقد ہوئی تھی ایک ریزولیشن منظور کر چکی ہے۔ اگر امریکی کانگریس نے اس سلسلے میں ضروری قانون پاس کر دیا تو یک

ین الاقوامی یونین وجود میں آ جائے گی ہیں کے اصول کافی
رہ ہوں گے اور قریب قریب ساری مہذب دنیا اس
رے میں سمٹ آئے گی۔

برطانیہ:- یہاں ۱۹۱۱ء میں کاپی رائٹ ایکٹ منظور
یا اور اس پر نظر ثانی زیر غور ہے اس میں برطانیہ کے لئے
بطۂ حقوقِ مصنفین درج ہے۔ اس کی دفعہ نمبر (۱) میں صاف
لیا ہے کہ اس مملکت میں اور کسی نوع کا کاپی رائٹ نہیں پایا جاتا
نبرا کی عبارت یوں ہے۔

" اس ایکٹ کے ضوابط کے تحت کاپی رائٹ کا اطلاق
معظم کی جملہ مستعمرات پر ہوگا اور یہ قانون اُن سب پر حاوی
ا جائے گا اور ان شرائط کے مطابق جو یہاں مندرج ہیں،
کا اطلاق ہر ایک تخلیق، تخلیقِ ادب، ڈرامہ، موسیقی یا آرٹ
دسنے پر ہوگا۔ اگر

(۱) مطبوعہ تخلیق پہلی مرتبہ ملک معظم کی متعمرات میں چھپی ہو
(۲) غیر مطبوعہ تخلیق کی صورت میں مصنف ملک معظم کی رعایا ہو
ورہ مستعمرات میں سے کسی میں رہتا بستا ہو جب کہ وہ تخلیق
اری تھی۔ اس کا اطلاق مذکورہ بالا قواعد کے ماتحت ہی ہوگا
کے سوا اور تخلیقات پر نہیں۔ ماسوا اس کے کہ اس ایکٹ کا نفاذ
بھی حاوی کرے اور قانون تحفظ مہیا کر دے جس کے لئے احکام
اس کونسل جاری ہونے ضروری ہیں یعنی خود مختار مستعمرات
الک غیر میں اس قانون کا نفاذ نہیں ہوگا۔"

تو بات یہ طے ہوئی کہ کسی تخلیق کا طبع زاد ہونا ضروری ہے
مہاں (یوں سمجھئے کہ یہ برطانوی سلطنت کے دائرے میں
ہونا چاہئیے اور اگر غیر مطبوعہ ہو تو اسے برطانوی رعایا کے
نے "بنایا" ہو یا اگر وہ برطانوی رعایا نہیں ہے تو "بناتے"
وہ علاقۂ سلطنتِ برطانیہ میں مقیم ضرور ہو۔ لفظ "بنانا" کا
ا کچھ عجیب سا ہے لیکن اس سے اصل حقیقت پر روشنی ضرور
ہے یعنی کسی تخلیق کو "دائمی شکل میں لے آنا" مراد ہوتا ہے
یہ اصل منشا ہے کہ محض مجرد خیالات و تصورات کو کاپی رائٹ

کے لئے ضروری دکانی مواد نہیں سمجھا جا سکتا جب تک یہ تخیلات
و تصورات ضبطِ تحریر میں نہ لائے جائیں یا کسی اور مستقل شکل میں
انھیں پیش نہ کیا جائے اُس وقت تک کاپی رائٹ کا سوال ہی
پیدا نہیں ہوتا۔ اور پھر بھی قانونی تحفظ خیالات کو نہیں دیا جاتا بلکہ
ان مخصوص اور معین الفاظ اور اسلوب یا "فارم" کو دیا جاتا ہے
جس میں ان خیالات و اسلوب نے شرح کا قالب پایا ہے۔

چونکہ اسٹیج، سنیما، گراموفون اور نشریات کی ترقی نے کاپی
رائٹ کے دائرے کو وسیع تر بنانا لازم کر دیا تھا اس لئے قانون
کی دفعہ (۱) شق (۲) میں یہ توسیعی مفہوم اس طرح شامل کی گئی کہ
کاپی رائٹ سے مراد وہ حق بھی ہے جو کسی تخلیق کو کلیتہً یا
جزواً کسی مادی شکل میں خواہ کوئی بھی ہو پیش کیا جائے یا تکرارِ
اشاعت و اظہار ہو یا اُسے سامعین و ناظرین کے سننے یا دیکھنے
یا دونوں کے لئے پیش کیا جائے یا اگر لیکچر ہو تو اسے کلیتہً یا جزواً
مجمع عام میں ادا کیا جائے۔

اس ضمن میں اور اس مفہوم میں ترجمے کا حق بھی شامل کیا گیا
ہے۔ نیز ناول کو ڈرامے کی شکل دینا یا ان دونوں کی متبادل صورت
اختیار کرنا، ریکارڈ بنانا، فلم بنانا یا کسی اور مشینی و آلاتی وسیلے
سے اس تخلیق کو پیش کرنا یا ادا کرنا بھی اس دفعہ کے دائرے میں
تسلیم کیا جا چکا ہے۔

لیکن ریسرچ یعنی علمی و فنی تحقیق اور جستجوئے فکر و خیال کی
خاطر عالمانہ تحقیق و تدقیق کی راہوں کو کاپی رائٹ کے ذریعہ مسدود
نہیں کیا گیا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص (بموجب دفعہ ۲ (۱) اپنے
تخلیقی کام میں کسی اور تخلیقی کام کا معتدبہ حصہ شامل کر لے تو اس کو
قابل درگزر سمجھا جائے گا بشرطیکہ صاحبِ تخلیق اس بات کو واضح
کرے کہ اُس نے کیا اور کس غرض سے کیا ہے اور یہ کہ اُس کی نیت
صاف ہے۔ یعنی شخصی مطالعہ و تحقیق، ریسرچ، تبصرہ و نقد، جائزہ
یا اخباری خلاصہ نویسی کی خاطر کیا گیا ہے۔ بعض اور استثنیات
بھی ہیں جیسا کہ ذیل میں درج ہے اور دفعہ ۲ (۲) میں اس کا
ذکر [illegible]

"کسی مجموعہ میں کسی تخلیق کا شامل کرکے شائع کیا جانا جس میں زیادہ تر غیر کاپی رائٹ شدہ مواد ہو اور جائز طور پر محض مدرسوں میں استعمال کے لئے اسے مرتب کیا گیا ہو۔ ۔ ۔ یا مختصر ٹکڑے، بند، پیرے وغیرہ ایسی تخلیقات سے جو چھپ چکی ہیں مگر مدرسوں کے لئے فی الحقیقت شائع نہیں کی گئی تھیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ پانچ سال کی مدت میں کوئی ایک ناشر کسی ایک مصنف کی تخلیقات سے صرف دو پارے ہی اخذ کرسکتا ہے۔ اس سے زیادہ نہیں اور یہ کہ ہر پارے کا جو شامل کیا گیا ہے اصل ماخذ بتایا جائیگا اور اس کا حوالہ ضبط تحریر میں لایا جائے گا"۔

برطانیہ میں (اور یورپ کے اکثر ملکوں میں) کاپی رائٹ کی مدت، مصنف کی عمر مع پچاس سال بعد وفات تسلیم کی گئی ہے لیکن اگر مصنف کو متوفی ہوئے ۲۵ سال گزر چکے ہوں تو اس کی تخلیق کو کوئی بھی شخص فروخت کے لئے شائع کرسکتا ہے بشرطیکہ وہ قانون کی بعض پابندیوں کو پورا کرے۔ (دفعہ ۳) اور کاپی رائٹ کے مالک کو دس فیصد رائیلٹی بھی ادا کردے (یہ لازمی لائسنس یا اجازت صرف اس تخلیق کے لئے ہے جس کو فروخت کے لئے دوبارہ منظر عام پر لایا جانا تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ اداکاری کی کسی بھی شکل یا پیشکش یا اسی طرح کی کسی ضرورت کے لئے نہیں مانا گیا ہے۔ اگر کوئی تخلیق مشترکہ کام کی حیثیت رکھتی ہو تو کاپی رائٹ کا حق اس مصنف کی مدت حیات اور پچاس سال بعد وفات مانی جائے گی جس کا پہلے انتقال ہوا ہوگا یا اس مصنف کی جو آخر میں فوت ہوا ہوگا ان میں سے جو بھی مدت طویل تر ہو (دفعہ ۱۶)۔ جو تخلیق کسی کی وفات کے بعد شائع ہو تو حق تصنیف کا شمار پہلی اشاعت گویا کہ مصنف کا اس وقت انتقال ہوا تھا جب کہ اس کی یہ پہلی تخلیق پہلی بار طبع ہوئی (دفعہ ۱۷)۔

قانون میں کاپی رائٹ کا اصل مالک خود مصنف کو سمجھا جانا ماسوا ان مخصوص مستثنیات کے جن کی تفصیل دفعہ (۵) میں شامل کی گئی ہے۔ لیکن اسے بھی یہ اختیار نہیں ہے کہ اس حق کو جیسا بھی چاہے جس طرح استعمال کرے کیونکہ دفعہ (۲) ۵ میں یہ بات رکھی گئی ہے کہ کاپی رائٹ کی کوئی تفویض یا اس کے مفاد کو جو وہ کسی کے حق میں جاری کرنا چاہے اس کی مدت عمر اور ۲۵ سال مابعد کی مدت سے زیادہ کے لئے جائز نہیں مانا جائے گا (بشرطیکہ اس نے اپنی وصیت میں اس کو شامل کرلیا ہو۔ لہٰذا اس مدت کے آخری ۲۵ برس اس کے ترکے کی طرف منتقل ہو جائیں گے۔ یہ عجیب شرط شاید اس لئے وضع کی گئی ہوگی کہ کسی مصنف کے انتقال کے بعد اس کے پیچھے کے لوگ بالکل مفلس اور قلاش نہ ہو جائیں مگر اس شرط کی عملی کامیابی کچھ مشکوک ہی ہے۔

امریکی مصنفین برطانیہ میں کس طرح کاپی رائٹ کا حق حاصل کرسکتے ہیں اور اس کا ذکر دفعہ ۳۲ (۲) میں کردیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی تصنیف (وغیرہ) کا برطانوی علاقے میں پہلی بار شائع ہونا اس حالت میں مراد لیا جا سکتا ہے جب کہ اس کی اشاعت کہیں اور ہوئی ہو مگر برطانیہ میں اس تاریخ اشاعت کے ۱۴ دن کے اندر اندر شائع کردیا گیا ہو۔ لہٰذا اگر کوئی امریکی مصنف نیویارک میں کوئی کتاب چھپواتا ہے اور مثلاً لندن میں بھی اس کتاب کی اشاعت امریکی اشاعت کے ۱۴ دن کے اندر اندر ہو جاتی ہے تو یہ تسلیم کرلیا جائیگا کہ برطانیہ میں بھی اس کتاب کی اشاعت بیک وقت رونما ہوئی ہے۔ اور اس طرح اسے برطانوی قانون کے تحت حق تصنیف کے فوائد حاصل ہو جاتے ہیں۔

امریکہ کا قاعدہ یہ ہے کہ کاپی رائٹ کے حصول کے لئے واشنگٹن میں ایک جلد نسخہ کتاب کی حسب قواعد رجسٹری کرائی جائے اگر یہ رجسٹری نہ کرائی گئی تو کاپی رائٹ نافذ العمل نہیں ہوگا۔ ۱۸۴۹ سے قبل تک اگر کسی برطانوی مصنف کو امریکہ میں حق تصنیف کی حفاظت کرانی مقصود ہوتی تھی تو پہلے اسے ایک عارضی تحفظ کے لئے عرضی دینی پڑتی تھی۔ اس کے واسطے اسے تاریخ اشاعت سے ۶۰ دن کے اندر ایک نسخہ کتاب واشنگٹن میں داخل اور رجسٹر کرانا پڑتا تھا اور یہ درخواست کرنی پڑتی تھی کہ مجھے حق تصنیف کا تحفظ عنایت کیا جائے کتاب کے داخل ہونے کی تاریخ سے صرف چار ماہ کے لئے یہ عارضی کاپی رائٹ ملا کرتا تھا۔ اس دوران میں کتاب کی امریکی ایڈیشن کی

کاپی امریکہ میں فروخت نہیں ہو سکتی تھی اور اس سے پہلے کوالفی
کاپی رائٹ یعنی "ٹائپ سٹ اپ" کے طریقۂ طباعت سے
کا تیار ہونا اور حدود ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں تیار ہونا
اور طریقۂ طباعت سے اس کا تیار ہونا مگر اس طریقے کا تمام
حصہ امریکہ ہی میں تیار و مرتب و مکمل ہوتا۔"

اگر کتاب اس طرح اندرونِ میعاد "ساخت" ہو گئی تو
اس دوران ہی میں عارضی کاپی رائٹ کو بڑھا کر اسے پوری
حقِ تصنیف تک محیط کر دینے کی علیحدہ درخواست داخل کرنی
تھی۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو کاپی رائٹ ساقط و کالعدم ہو جاتا تھا۔

۱۹۴۹ء میں امریکہ میں جو ایکٹ پاس کیا گیا اس نے اس
صورتِ حال کی بہت کچھ اصلاح کر دی ہے۔ اب مذکورہ طریقے پر
حاصل شدہ کاپی رائٹ کی رُو سے برطانوی مصنف کو پہلی اشاعت
کے بعد ہ سال تک کے لئے تحفظ حاصل ہو جاتا ہے اور ان پانچ سال
میں مجموعاً صرف پندرہ سو کاپیاں فروخت کی جا سکتی ہیں، مگر اس
پر "کاپی رائٹ" کے الفاظ اور اس کے بعد مالک کاپی رائٹ کا نام اور
تاریخ رجسٹری کا درج ہونا ضروری ہے، لیکن اگر اس مدت کے بعد
"ساختۂ امریکہ" کتاب نہیں چھاپی گئی تو پھر کاپی رائٹ بھی کالعدم قرار
دے دیا جائے گا۔

یہاں حقِ تصنیف کی مدت ۲۸ سال مقرر ہے، اس کے بعد مزید
۲۸ سال کے لئے یہ حق مل سکتا ہے اور اس مدت کو "مدتِ تجدید" کہا گیا ہے
مگر دراصل یہ تجدید ہوتی ہی نہیں بلکہ ایک بالکل نئے حقِ تصنیف کی
منظوری ہوتی ہے۔ اگر پہلے ۲۸ سال کے اختتام پر مصنف حیات
ہے تو وہ نئی مدت کے اجرا کے لئے درخواست دے سکتا ہے لیکن
ان ۲۸ سال کے اندر اندر اگر مصنف نے دوسری مدت کے واسطے
حقِ تصنیف کا فائدہ اُٹھانا چاہا تو وہ ناجائز متصور ہوگا۔ اگر وہ اس
مدت سے قبل انتقال کر گیا تو اس حق کا پہلا وارث اس کی بیوہ کو
سمجھا جائے گا اگر وہ فوت ہو چکی ہو تو مصنف کے بچوں کی طرف یہ حق
منتقل ہو جائے گا اور اگر وہ بھی فوت ہو گئے ہوں تو مصنف نے جس کے
نام حق ہبہ کر دیا ہے۔ یعنی اس کے ادبی وصی کو، تو وہ اس سے

مستفید ہوں گے اور اگر وہ بھی موجود نہ ہوں تو پھر اس مصنف کے قریب
ترین رشتے داروں کو یہ حق تفویض ہو جائے گا۔

خاتمۂ کلام:- اس تذکرے سے یہ معلوم ہو گیا ہوگا کہ حقِ تصنیف کے
ضمن میں تین مرحلے پیدا ہوئے ہیں۔ پہلی منزل تو وہ تھی کہ کسی
تخلیق کی محسوس و مادی ملکیت کو جیسے کسی لوح، یا تصویر کے
کینوس وغیرہ ہی "کاپی رائٹ" مانا جاتا تھا اور اس میں مصنف
تحریر یا مصور تصویر کا کہیں سوال ہی نہ تھا۔ جس کے پاس وہ شے ہوتی
تھی وہی اُس تحریر یا تصویر کا اصل مالک گردانا جاتا تھا۔ اگرچہ دماغی
و ذہنی تخلیق کسی کی بھی ہو۔ دوسری منزل وہ آئی جب طباعت کا فن
رائج ہوا۔ اس عہد میں فی الجملہ کیفیت یہ رہی کہ حقِ تصنیف کتب فروشوں اور
ناشروں کی ملکیت کے سوا اور کچھ نہ تھا کیونکہ کسی شے کو چھاپنے کی اجارہ داریاں
اور مراعاتِ طباعت انہیں دونوں کو ملا کرتی تھیں اور کسی کو نہیں۔
پھر آخر میں یہ دور آیا کہ اجارہ داریوں اور مراعات کے خلاف سخت
آواز اُٹھی اور مصنفوں کے حق کا بھی چرچا ہوا اور ساری مہذب دنیا
نے یہ اصول طے اور تسلیم کر لیا کہ مصنف کو بھی اپنی دماغی کاوش کے
نتیجے میں شیریں پھل کھانے کا حق حاصل ہے۔

اگرچہ یہ تمام مراحل ہر ہر ملک میں بیک وقت پیدا نہیں ہوئے
مگر اکثر ممالک کی تاریخ میں ان کی نمود ضرور ملتی چلی جائے گی۔ لیکن
یہ بھی واقعہ ہے کہ یہ حقوق پہلے قومی و ملکی بنیاد پر ہی تسلیم ہوئے۔
بین الاقوامی طور پر نہیں۔ "کاپی رائٹ یونین" کے قیام نے صورتِ
حال کی اصلاح، یورپ اور دولتِ متحدہ برطانیہ میں بڑی حد تک
کر دی ہے اور یونیسکو کانفرنس نے بھی بڑی حد تک ایسی بنیاد رکھ دی
ہے کہ بہتر توقعات کی جا سکتی ہیں کہ کبھی نہ کسی وقت میں ایک
"عالمی کاپی رائٹ یونین" بھی ضرور وجود میں آ جائے گی۔ اگر یہ
امید بر آئی تو یہ نہایت اہم باشان کارنامہ ہوگا کہ عملاً ایک
"ہمہ گیر" یا بڑی حد تک ہمہ گیر ضابطۂ بین الاقوامی قانون وجود
میں آ جائے گا اور وہ آرٹ و ادب کی دنیا کا ہوگا — وہ دنیا جو
اکثر بین الاقوامی حد بندیوں کو پار کرتی رہتی ہے۔

ماخذ
COPINGER ON THE LAW OF COPY — (1)
(۹ ایڈ، صفحہ ۴۳)

جگر مرادآبادی

خلوصِ عشق کی دولت جگرؔ کے ساتھ گئی — جگر کی وسعتِ قلب و نظر کے ساتھ گئی

بساطِ محفلِ دوشیں کی یادگار تھی جو — وہ مشتِ خاک بھی بادِ سحر کے ساتھ گئی

گیا تو غمزدگوں کی دعائے صبح گہی — اثر سے دامنِ اُمید بھر کے ساتھ گئی

جو شغلِ مے سے مٹی اور نہ ترکِ مے سے گھٹی — وہ تلخیٔ غمِ دوراں جگرؔ کے ساتھ گئی

فضا میں گونج رہی ہے سُنی ہوئی آواز — اگرچہ نغمہ گری نغمہ گر کے ساتھ گئی

شکستہ سازِ غزل میں ہے جس سے پھر لرزش — وہ شانِ زخمہ وری زخمہ ور کے ساتھ گئی

کہاں وہ عرضِ ہنر خود ہنر کہیں جس کو — یہ بات بھی ترے عرضِ ہنر کے ساتھ گئی

نہ حسن میں وہ کشش ہے نہ عشق میں وہ طلب — ہر اک ادا ترے حسنِ نظر کے ساتھ گئی

تری نگاہ پہ تھا انتظارِ حسن گراں — صبا کے ساتھ کبھی نامہ بر کے ساتھ گئی

تری تلاش میں یہ تیری یاد کا عالم — کہ دُور دُور دلِ نوحہ گر کے ساتھ گئی

ہزار شعلہ نوا ہوں جگرؔ کا سوز کہاں — جگر کی شعلہ نوائی جگرؔ کے ساتھ گئی

رہِ درازِ سفر ہے شبِ فراق حفیظؔ — اُمیدِ صبح رفیقِ سفر کے ساتھ گئی

فنکار سے!

کیوں تم ہر ویران گلی میں پھرا کئے نادان!
کیوں تم ہر دہلیز سے لگ کر کھڑے رہے حیران؟

تم جو پھرے اِن سُونی سُونی گلیوں میں دن رین
کہو کسی نے ڈالا بھی دل کے کشکول میں دان؟

تم تنہا تھے، تم تنہا ہو، یہاں تمھارا کون
کون ایسا ہے اِس جگ میں تم کرو گے جس پر مان!

شہر کے باہر اُلھڑ جھونکے، خوشبوئیں اور رنگ
شہر کے اندر گھُپ اندھیارا اور رستے سُنسان

جل جاؤ تم آگ میں لیکن بجھے نہ من کی آگ
اِس قندیل سے مل جائے سب کو نُور کا دان!!

جمیل حشمی

پھول سے دھول تک

چاند کی چاندنی ایسی میلی
جیسے کسی فرعون کا ماتھا، جیسے بھک منگے کی تھیلی

سارے تارے سسک رہے ہیں
رات کی کوکھ میں اُمبر کے سُلگے ہوئے آنسو ٹپک رہے ہیں

پیڑ کھڑے ہیں غم کے مارے
کسی کھنڈر میں اُجلے وقتوں کے ٹوٹے پھوٹے مینارے

میں ہوں، اندھیرے کا جنگل ہے
کہنا اور نہ سُننا سر ہی پٹکنا جیسے ہوا پاگل ہے

جھیل میں اک کنکر ہی پھینکوں
بادر! تو بھی چُپ ہے، اُونچے پیڑ کی شاخ ہلا کر پُوچھوں

ان پھولوں پر رکھ دوں پلکیں
کچھ نہ کہوں اور جا بیٹھوں چپکے سے ٹوٹے ہوئے پتّوں میں

کوئی بات بھی ہو کہنے کی
میں تو رنگ بدلتی شام کو گھر سے نکل آیا تھا یونہی!

انور شہزاد

بہلاوا

رات کے واسطے یہ ماہِ مبیں
ایک کمزور سہارے کے سوا کچھ بھی نہیں
دیکھتے دیکھتے جل جاتا ہے
شمع کی طرح پگھل جاتا ہے
کون کہتا ہے کہ انمول ہے چاند
رات کے ہاتھ میں کشکول ہے چاند

کیسے ہو رات کا اندھیارا دُور
چاند کے پاس نہیں چاند کا نُور

ہم جنوں کاروں کا، آشفتہ سروں کا یہ سفر
جاری و ساری رہے گا یونہی
اپنی منزل ہے سحر ——————
ہم کو تم چاند سے بہلاتے ہو
چاند کے پاس نہیں چاند کا نور
کیسے ہو رات کا اندھیارا دُور

○

ے سرودوں میں عرضِ نوائے حیات کر
ہ پہ ایک درد کی سِل رکھ کے بات کر

یہ دُوریوں کا سیلِ رواں، برگِ نامہ بھیج
یہ فاصلوں کے بندِ گراں، کوئی بات کر

دیار، رات ہے، مری بانسری کی لَے
خوابِ دل نشیں کو مری کائنات کر

میرے غموں کو اپنے خیالوں میں بار دے
اِن اُلجھنوں کو سلسلۂ واقعات کر

یک [illegible] میرے دلِ ویراں میں بیٹھ کر
دشت کے سکوتِ سخن جُو سے بات کر

امجد، نشاطِ زیست اسی کشمکش میں ہے
مرنے کا قصد، جینے کا عزم ایک سات کر

○

رقص میں یہ تیرے جسم کے زاویئے
جیسے طُوفان میں جل رہے ہوں دیئے

یہ کھنکتی ہنسی، یہ چھلکتی نظر
اَب چمن میں بہار آئے گی کس لئے

محفلیں اُس کی ہیں، میکدے اُسکے ہیں
جس نے تیری نگاہوں کے ساغر پیئے

مر چلے ہم تو پہلو میں پاکر تمہیں
جس کی ہمت ہے وہ آج کی شب جیئے

بہہ گئی اپنی توبہ جو برسات میں
ہم نے کالی گھٹاؤں کو سجدے کئے

فصلِ گُل تو قتیلؔ آئے گی ہر برس
کیوں کوئی اپنا چاکِ گریباں سیئے

عاشق جونپوری

جنوں مشرب جنوں ساماں جنوں پندار دیوانے
مگر یاروں کی محفل میں سراپا یار دیوانے
بہ وقتِ انکسار آغوش کی تصویر بن جائیں
بحالِ سرکشی چلتی ہوئی تلوار دیوانے
بہ قدرِ شوق ان پر ناوکِ دشنام کی بارش
بہ فیضِ عاشقی رسوا سرِ بازار دیوانے
بہ رنگِ خونِ دل خالق ہیں یہ اپنی بہاروں کے
بہ طرزِ نو بہ نو رامش گر و فنکار دیوانے
یہ سیلِ غم یہ طوفانِ حوادث اور یہ ناکامی
مگر کب مانتے ہیں زندگی سے ہار دیوانے
خرد والوں نے اندازِ جنوں جس دن سے اپنایا
سنبھل کر ہو گئے کچھ اور بھی ہشیار دیوانے
ابھی کیا ہے بہار آنے تو دو پھر دیکھنا ان کو
کہ اب کانٹوں سے بھی کرنے لگے ہیں پیار دیوانے
ہیں تو ان میں سے کچھ لوگ دیوانے نہیں لیکن
کہ فکرِ مصلحت کرتے نہیں زنہار دیوانے
بڑی باتیں بناتا پھر رہا ہے شہر میں ناصح
مزا آئے جو مل جائیں کہیں دو چار دیوانے

شیخ ایاز

ترجمہ تصنیف

رات کروٹ بدل رہی ہے دیکھ
تیری زلفوں میں ڈھل رہی ہے دیکھ
اور اک ساغرِ خمار آگیں
زندگانی سنبھل رہی ہے دیکھ
یہ صراحی بادہ ہی اکثر
تیرا نعم البدل رہی ہے دیکھ
حسنِ گل میں کمی نہیں لیکن
زندگی خوں اگل رہی ہے دیکھ
ظلمتِ زیست سے الجھتا رہ
شمعِ تقدیر جل رہی ہے دیکھ
اک سحر کی تلاشِ پیہم میں
زندگی آنکھ مل رہی ہے دیکھ
رنگ لائے گی کیا یہ روحِ عصر
کشت دقوں میں جو پل رہی ہے دیکھ
جادۂ کوہکن میں روحِ جہد
اک نئی چال چل رہی ہے دیکھ
پرچمِ عزم کو بلند کر اور
وہ مشیت سی ٹل رہی ہے دیکھ

○

یں دَر سے اُٹھا دے نہ کہیں
ہ پیمان بھلا دے نہ کہیں

زندگی رُوٹھ کے بیٹھی ہے کہاں
مَوت پھر ہم کو صدا دے نہ کہیں

کے داغ چمکتے ہیں کوئی
لو آگ لگا دے نہ کہیں

بادۂ تند زمانے کی طرح
یاد بھی تیری بھلا دے نہ کہیں

ہ دے کے صبا ہم کو ترا
ا گرد بنا دے نہ کہیں

نیند کے ڈر سے کوئی وحشت میں
اشک پلکوں سے گرا دے نہ کہیں

احمد سعدی

○

سُوکھے چہرے، بال بھی اُلجھے، چلیں تو جن کا پاؤں بھی بہکے
ہنس ہنس کر جیتے ہیں پھر بھی، وہ جیون کا سب دُکھ سہہ کے

یاد تری یوں من میں آئی جیسے رات میں بجلی چمکے
جیسے پُروائی کا جھونکا پھول کا منہ چُومے رہ رہ کے

رُوپ تری میٹھی بانی کا دھیان کے کانوں میں رس گھولے
جب بھی کوئی کوئل کوکے، جب بھی کوئی پنچھی چہکے

اپنی آشاؤں کے خوں سے اس کو سینچا ہے مالی نے
جبھی تو سندر ہے پھلواری، تبھی تو پھول ہیں دہکے دہکے

ہونٹوں میں ہے امرت اس کے، نینوں میں مدھ کے پیالے
تن ہے جیسے پگھلا سونا، روپ ہے جیسے شعلہ لہکے

بھولے من ملے آج تجھی سے کچھ دُکھ سُکھ کی باتیں کرلیں
تیرے من کا بوجھ بھی ہلکا ہوگا، اپنا دُکھ سُکھ کہہ کے

سچ دیکھ کر آئی ہے سعدی اک البیلی دھیان نگر میں
جس پتھ سے بھی گزرے، وہ پتھ اسکے تن کی باس سے مہکے

سحر انصاری

○

گھر سے نکل پڑے تھے ارادہ کئے بغیر
چلتے رہے تعینِ جادہ کئے بغیر

صد حیف بزمِ ساغر و مینا اُجڑ گئی
دل کو خرابِ لذتِ بادہ کئے بغیر

دل کو تری نگہ نظر انداز کر گئی
تیرِ ستم سے زخم کُشادہ کئے بغیر

مت پُوچھ حالِ عشرتِ رفتہ، کہ اہلِ دل
جیتے ہیں زندگی کا اعادہ کئے بغیر

گزُرے ہیں بُوئے گُل کی طرح خار زار سے
فکرِ قمیص و جیب و لبادہ کئے بغیر

رنگینیٔ کلام نہ آئی کبھی سحر
مدحت طرازیٔ بُتِ سادہ کئے بغیر

شفیق عشرت

○

ترے خیال سے محفل سجی ہوئی ہے ابھی
نگاہ راہ گزُر پر جمی ہوئی ہے ابھی

دہک رہے ہیں مرے اشک آنچ سے جس کی
وہ آگ سینے میں میرے دبی ہوئی ہے ابھی

مشامِ جاں کی مہک سے فضا معطر ہے
ترے بدن کی وہ خوشبو بسی ہوئی ہے ابھی

نہ اتنی جلد بھلا دو کہ میری چاہت کی
تمہارے ہاتھ میں مہندی رچی ہوئی ہے ابھی

مرے خیال سے گزرو مثالِ عکسِ لطیف
کہ نبضِ عالمِ عشرت تھمی ہوئی ہے ابھی

جمیلہ ہاشمی

سونے مندر

کیسی ماتامئی رات ہے سُندر سپنوں جیسی۔ دھرتی آکاش کی طرح تاروں سے بھری لگتی ہے کیسی روشنیاں ہیں دیپ کیسے ٹمٹاتے ہیں مانو تارے اندھیکار سے آنکھ مچولی کھیلنے جا رہے ہوں اور ایسے میں تم مندر کے پیچھے چپ چاپ بیٹھی ہو کس سے چھپ کر اور کیوں گومتی بٹیا آگے آؤ تمہیں ایسی رات میں کیا ہو گیا ہے اُداس کیوں ہو؟

تم کو تو دکھائی بھی نہیں دیتا دادا تم نے کیسے جانا کہ کوئی مندر کے پچھواڑے چپ چاپ اور اُداس بیٹھا ہے اور پھر میں گومتی نہیں ہوں دادا رادھے ہوں۔

پگلی رادھے ہو یا گومتی میرے لئے تو سب برابر ہے اور پھر دیکھنے کے لئے آنکھوں کا ہونا کوئی ضروری ہے دیکھ مجھے پتہ چل گیا کہ تو اُداس ہے اور یہ بھی کہ تو سب سے چھپ کر بیٹھی ہے بول میں نے ٹھیک کہا ہے کہ نہیں۔ بتا تیرے پاس کیا ہے؟ آرتی اُتارنے آئی ہو گی؟

ہاں! دادا گھر سے تو آرتی اُتارنے ہی چلی تھی پر اب میرے پاس تھال میں بجھے ہوئے دیپ ہیں اور من میں مندر کے اندر جانے کی کوئی آشا نہیں۔

رام رام کر پگلی مندر کے اندر جانے کی آشا جب من میں نہیں رہتی تو من مر جاتا ہے ہر شے میں جب کوئی لگن نہیں رہتی تو ہر وسے جیسے پتھر کا ٹکڑا ہوتا ہے یہی لگن تو ہے جس سے تو اور میں اور سارا سنسار زندہ ہیں بھلا بھگوان سے بھی کبھی کوئی رُوٹھتا ہے؟ اور پھر دیپ بجھا کر تو اُن کے پاس بیٹھی ہے اور وہ بھی دیوالی کی رات کو تیرے لئے دیوالی کوئی سندیش نہیں لائی تجھے بھگوان سے کچھ نہیں مانگنا؟

وہ رات مجھے کبھی نہیں بھولے گی اتنے زمانوں کے بعد بھی مجھے وہ رات یاد ہے۔ میں اُس شام اپنی ماں سے پیسوں کے لئے رو دھو گیا تھا اور گھر سے باہر نکل آیا تھا میری بہن کملا دوار میں کھڑی بہت دیر تک مجھے پکارتی رہی تھی اور پھر رونے لگی تھی اور ماں نے چوکھٹ پر کھڑے ہو کر کہا تھا چندن جو دیوالی کی رات کو دیپ جلنے سے پہلے روٹھ کر گھر سے باہر چلا جاتا ہے اُسے کبھی چین نصیب نہیں ہوتا بھگوان اس پر کبھی دیا نہیں کرتے تو لوٹ آ۔ مگر مجھے یونہی ضد ہو گئی تھی اور پھر ماں کی بات مجھے آج کی طرح ان دنوں سچ نہیں لگتی تھی۔ میں نے گلی کے نکڑ پے پیپل تلے مڑتے ہوئے سوچا تھا ماں کیسی باتیں کرتی ہے دیپ جلنے سے پہلے اور پیچھے بھلا چین کو اس سے کیا واسطہ ہے دیکھتا ہوں مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ دوار دوار پر پھرنے اور در در کی ٹھوکریں کھانے کے بعد مجھے کبھی کبھار وہ بیتے دن چبھتے ہیں اور سنسان گلی کے ایک اونچے چبوترے پر کھڑی ماں کی آواز مجھے اب بھی اپنے پیچھے گونجتی سنائی دیتی ہے گو وقت بیت چکا ہے سال نکل گئے ہیں وہ آوازیں بہت دور کہیں

جھوم رہی ہیں۔ شب لگی ہیں جیسے اداس کی رات کو کاٹتے قہقہے ہوں کبھیوں میں آوارہ کتوں کے شور اور سوکھے پتوں کے ہوا کے ساتھ اُڑنے کی آوازیں ہیں اور آج اس مندر کے پچھواڑے بیٹھے پر مجھے کسی نے نہیں کہا کہ ایسی رات میں تم اُداس کیوں ہو چپ کیوں ہو کیا تجھے بھگوان سے کچھ نہیں مانگنا کیونکہ میں رادھے نہیں ہوں اور دادا نہیں ہے وہ وقت نہیں ہے وہ زمانہ نہیں ہے کچھ بھی تو وہ نہیں ہے۔ میرے بجھے بجھے سینے میں یادوں کی لو ہولے ہولے بھڑک رہی ہے کیا پتہ یہ بھی بجھنے والی ہو۔ رادھے ذرا روشنی میں آؤ۔ دادا کے ساتھ تم بھی تو مجھ سے دو باتیں کرو نا۔ اکیلا پن اور سونی زندگی کیسے پاس کیا ہے؛ کلپنا مجھ سے یہی دو چار سال چھوٹی ہوگی پر ماں اس کا بہت دلار کرتی تھی جب دیکھو بیٹی اس کی گڑیا کے لئے کپڑے سی رہی ہے اس کے لئے میٹھا پکا رہی ہے چرخہ کاتتے میں سے اُٹھ کر وہ اسے پانی پلا دیتی چوکے میں آکر کلپنا بنا پاؤں دھوئے چلی آتی تو بھی اسے کچھ نہ کہتی۔ نہانے سے پہلے ماں کو چھو لیتی تب بھی اُسے ڈانٹ نہ پڑتی پوجا کے سمے وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ جوڑے ماں کے ساتھ بیٹھی آنکھیں بند کئے جاپ کرتی اور صندل کا ٹیکا اس کے ماتھے پر ایک دیئے کی طرح ہولے ہولے جلتا اور چمکتا لگتا۔

کلپنا اور رادھے دونوں کی یاد دو مورتیوں کی طرح میرے سامنے کھڑی ہے ایک جو میری بہن تھی اور جسے کُتی نہ مل سکی جس نے بچپن سے بڑے ہونے تک کے دن دو دھوا ماں کے ساتھ مندر تک آنے اور مندر کی سیڑھیاں دھونے بھگوان کے چرنوں میں پھول چڑھانے میں لگا دیئے اور جس کا اپنا بلیدان بھی بھگوان کو منا نہ سکا اور دوسری رادھے جس نے دادا کے سامنے کہا تھا "میرے من میں کوئی آشا نہیں مجھے بھگوان سے کچھ نہیں لینا؟"

دادا نے کہا تھا "رادھے من میلا ہو تو مورتی میں بھی کچھ دکھائی نہیں دیتا اور پھر تمہارا تو تن بھی میلا ہے۔"

رادھے نے اپنا تھال جس میں بجھے ہوئے دیپ تھے اور مرجھائے ہوئے پھول تھے اُٹھا کر زور سے دادا کے پاؤں میں مارا تھا اور کہا تھا "میرا من بھی میلا ہے اور تن بھی پر تمہیں اس سے کیا اور تمہارے بھگوان کو اس سے کیا یہ میرا شریر جس کو تم میلا سمجھتے ہو یہ بھی ایک مندر ہے میں روز آنکھوں میں کاجل لگاتی ہوں ناک میں نتھلی کر گھماتی ہوں سوگندھ سے اس کو بساتی ہوں میرے انگ انگ میں مستی ہوتی ہے اور میری نس نس میں روشنی میرے گرد مہکار رہتی ہے اور میرے بالوں میں موتی ہوتے ہیں میری سیج پر روز اصلی گلابوں کی باس ہوتی ہے اور پریم ہوتا ہے میرے آس پاس کبھی اندھیکار نہیں پھٹکتا میں تو آپ مندر ہوں تیرا بھگوان بھی دھندا کرتا ہے اور میں بھی دھندا کرتی ہوں اس میں اور مجھ میں کیا فرق ہے؟"

مجھے یاد ہے دادا نے کانوں کی لوؤں کو چھوا تھا رادھے کی بات کا کوئی جواب نہ دیا تھا اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا جیسے آکاش پر رہنے والی شکتیوں سے اس لڑکی کے لئے پرارتھنا کر رہا ہو بھیک مانگ رہا ہو۔

رادھے نے کچھ دیر رُک کر کہا تھا "میں نے سوچا آج کے دن لکشمی بھی اپنا دھندا کر لے اور میں ذرا اُس مندر میں ہو آؤں جہاں تمہارا بھگوان براجمان ہے؟"

دادا نے کہا تھا "یوں نراش ہو کر تمہارا تو اور بھی کچھ نہیں بنے گا۔ تم یونہی بولتی ہو صرف تم نراش ہو اور کچھ نہیں تمہیں بھی بھگوان پر اتنا ہی وشواس ہے جتنا مجھے یا پجاری جی کو بس تمہیں ذرا اس پر مان ہے اور وہ ٹھہرا نٹ کھٹ...... کھلونے بنانے والا اور انھیں بگاڑنے والا......"

پر دادا کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی رادھے نے کہا "کیا مجھے کہیں بھی آرام نہیں مل سکتا میں کہیں دو گھڑی سکھ سے نہیں بیٹھ سکتی۔ یہ تمہارے مندر کا پچھواڑا ہے یہاں تو کسی کے آنے سے تمہارا بھگوان میلا نہیں ہو جاتا۔ میرا تو سایہ بھی اس پر

رہا ہے تم میری بو سونگھتے ہوئے یہاں پر بھی آن پہنچے ہو سارے
ی کتوں کی طرح باس پر آ جاتے ہو یہاں سے چلے جاؤ۔"

اُن دنوں میں بہت چھوٹا تھا اور ریے مجھے رادھے کو ماں
ڑا کہا کرتی تھی اور رہیں تو اس کے سائے سے بھی بچ کر رہتے
، جب وہ گلی میں سے گزرتی (جو کہ وہ بہت کبھی کبھار کرتی ا
یں کواڑ بند کر لیتیں منہ پھیر لیتیں اور اس کے سائے سے
یں۔ زور زور سے کہتیں "ڈائن ہے ڈائن" دادی ماں
ا نیاں سنتے ہوئے مجھے پتہ تھا کہ ڈائن بہت کالی ہوتی ہے
ا بہت بڑی بڑی اور باہر کو نکلی ہوئی آنکھیں ہوتی ہیں۔
پچھلی طرف مڑے ہوئے ہوتے ہیں اور بال بہت کالے
ور زمین پر گھسٹتے ہوئے پر رادھے تو یوں تھی جیسے تازہ
ہو کھلا ہوا جس پر سے ابھی اوس کی بوندیں بھی نہ سوکھی
. مہکتا مہکتا اور ریشمی پھول۔ اس کی آواز ایسی ملائم تھی
گلے میں ریشم ہو اور گیت اس پر سے ہنستی تو یوں جیسے
ں پر گھنگرو پہنے کوئی ناچ رہا ہو اور اس کے کپڑے بھگوان
کس شے کے ہوتے تھے جو رنگوں اور لہریوں اور باس کا
اندا ہوتے۔ چلتے میں اس کے بچھوے بجتے تھے اور
ی کی گلابی ایڑیاں ساڑھی میں سے یوں جھانکتیں جیسے
رنگوں کا سپنا پردوں میں لپٹا لپٹا ذرا سا کپڑا کھول کر باہر
. میں نے اسے کبھی اس سے پہلے مندر کی طرف آتے
دیکھا تھا۔

دادا نے کہا "بھگوان کا دوار تو کسی پر بند نہیں ہے
ب کوئی تمہارے پاس بھی آتا ہے تو بالوں میں تیل رچا کر تن
ں سے صاف کر کے اور یہ دوار تو مندر کا ہے تم اپنے تن
کرو پوجا کرنے کے لئے دھیان چاہیئے اور بھگوان کو چھونے
لئے صاف ہاتھ۔"

رادھے کو میں نے دیکھا تھا ہنستے ہوئے مسکرا دی اور
پھر اور بھی کہو تمہارے بھگوان کا مندر اونچا ہے اور اس
[illegible] زور زور سے

ہنسنے لگی۔ میں دیوں کی قطاروں کو دیکھ رہا تھا اس کے ہنسنے
سے مجھے یوں لگا جیسے روشنی ایک بار ہی بڑھ گئی ہو دیے بھی
اس کے ساتھ ہی ہنسنے لگے ہوں۔ دادا رام رام کرتے مندر
کی طرف راہ ٹٹولتے ہوئے چلے گئے اور چاندی کا تھال اس
جگہ پر اوندھا پڑا رہا جہاں وہ کھڑے تھے پھولوں کی باس
جیسے آنکھیں نیچی کئے دبے پاؤں چل رہی ہو اور آگے بڑھ
رہی ہو چاروں طرف پھیل گئی۔

پھر مجھے ماں کی آواز سنائی دی مجھے پکارتی ہوئی اور
اندھیارے کے ریشم پر سے میری طرف بہتی ہوئی اور کلپنا کی دھما
آواز جس میں آنسوؤں کا نمک ہو اور ایک بھیگا ہوا سا دبا دبا
دکھ ہو۔ گاؤں کی طرف شور تھا لوگ تالاب کے کنارے جمع
ہوئے تھے اور ناچ رہے تھے گا رہے تھے اور تاڑی پی رہے
تھے۔ عورتیں سہاگ کے بھاری بھاری لہنگے پہنے اٹھلا اٹھلا کر
ایک دوسری کے گھر آ جا رہی تھیں اور رچنا بھجنوں کے گیت
درختوں کے اندھیرے میں اکٹھے ہو رہے تھے اچھے پکوانوں
اور مٹھائیوں کی مہک شریر بچے کی ضد بنی ہر طرف دوڑ
بھاگ کر رہی تھی۔

ماں نے زور سے کہا چندن چپکے سے لے لے اور لوٹ آ
اور میں جو شام سے مندر کے پچھواڑے بیٹھا تھا رادھے کے
قریب تھا اور بہت اکیلا تھا اور لوٹ کر جانا نہیں چاہتا تھا جانا
آگے پیچھے دیکھے بھاگ کر ماں کی گود میں جا چھپا تھا۔ مجھے یاد
ہے رادھے نے مجھے مڑ کر یوں دیکھا تھا جیسے میں اس کے دل
کا کوئی شریر سپنا ہوں جو اس کے کہے بنا اُسے چھوڑ کر جا رہا
ہوں۔

ہلکی سانس کے ساتھ جب میں نے رادھے اور دادا
کا قصہ سنایا تو ماں نے کہا
"یہ سب پجاری جی کی کمزوری ہے اگر وہ چاہیں تو رادھے
وہ گھڑی میں گاؤں کو چھوڑ سکتی ہے مگر اس کے مندر کے اندر
پجاری جی اپنی آنکھیں بند کر کے بیٹھے ہیں [illegible]

ایک بہت بڑی آفت سے بچا لیا ہے۔ اُس پر مندر کے دوار بند کر کے
انھوں نے مندر کو تو پوتر کر لیا ہے پر کون جانتا ہے وہ کبھی رات کو وہاں
آجاتی ہو اور وہ اپنے لئے بھگوان سے کچھ مانگتی ہو۔"

پھر ہمارے جھگڑے میں ماں رادھے کو بھول گئی۔ کلپنا
اور میں میلے میں سے لی گئی ایک بانسری پر جھگڑنے لگے تھے۔
اُس شام مجھے پہلی بار پتہ چلا تھا کہ جگ کی طرح چیزیں بھی میری
تمھاری ہو سکتی ہیں اور جسے چاہیں جہاں سے جی چاہے نکالا
جا سکتا ہے۔ یہی کہ کلپنا کو بانسری لینے سے روکا جا سکتا ہے
اور اگر میں چاہوں تو اُسے ماں کے پاس نہ آنے دوں جیسے رادھے
کو پجاری جی مندر میں نہیں آنے دیتے۔ رات ہو گئی اور دادی
ہمیں لکشمی میا کی کہانی سُنانے لگی۔ تارے آکاش میں زیادہ روشن
ہو گئے تھے اور دودھیا راہ جس پر سے چل کر سنا ہے بھگوان
دھرتی پر آتے جاتے ہیں بہت ہی چمک رہا تھا اور ہولے ہولے
اِدھر سے اُدھر کھسک رہا تھا۔ چھتوں پر کے دیوٹ بجھتے جا رہے
تھے اور باہر تالاب کے کنارے سے شور درختوں کے جھنڈوں
میں تھمتا لگتا تھا۔ میں نے پوچھا تھا "دادی دیوی ہمارے گھر میں
بھی نہیں آئی ہوگی۔"

کلپنا دادی کے ساتھ زور سے لگ گئی اور رونے لگی۔
دادی نے مجھے پھٹکارا اور کلپنا سے بولی "کیوں نہیں آئی ہوگی
دیوی ضرور آئے گی دیکھ تجھے آج سپنا دکھے گا اس میں دیوی کے
درشن ہوں گے' دیوی کا مکھ بھور کی طرح چمکیلا ہوگا اور اس کے
کئی ہاتھ ہوں گے' اس کی آنکھیں بہت چمکتی ہوں گی' پھر مجھ سے
کہنے لگی "ایسی بُری باتیں منہ سے کیوں نکالتا ہے' دیوی کو بچوں
سے بہت پیار ہے اور جن کا من میلا نہ ہو انھیں دیوی کے درشن
ہوتے ہیں۔"

مجھے دادا کی بات یاد آگئی۔ میں نے من ہی من کہا تھا
مجھے یاد ہے اس رات سونے سے پہلے میں نے کہا تھا رادھے
بے چاری کا تو من بھی میلا ہے اور تن بھی اسے دیوی کے درشن
نہیں ہو سکتے پر اُس کا مکھ تو بھور کا سا ہے اور آنکھیں بھی بڑی
بڑی ہیں۔ کہیں وہ تو دیوی نہیں ہے۔ یہ خیال بھی طوفان کی لہروں
کی طرح بڑے زور سے من میں آتے ہیں جیسے کسی دریا کا بند
ٹوٹ جائے اور پانی بنا رُکے بہتے پر سے نکلتا چلا جائے۔
کلپنا اس رات دادی سے لپٹ کے سو گئی اور میں۔ میں نے
تو شام ماں سے پیسوں کے لئے ضد کی تھی مجھے تو کسی شے کی
آشا نہیں تھی کم از کم دیوی تو مجھے درشن نہیں دے سکتی تھی۔

کلپنا اور ماں آج مجھے سُندر سپنے کی پرچھائیں سی
لگتی ہیں۔ کبھی سوچتا ہوں وہ نہیں تھیں اور نہ میری وہ کچھ
تھیں۔ کلپنا میری بہن نہ تھی کوئی اور تھی جس نے ساری عمر
مندر کی سیڑھیاں دھونے اور گشت اُٹھانے میں گزار دی
جس کے حصے میں نہ کوئی رنگ آیا تھا اور نہ ہی کوئی خوشی
اتنے سالوں کے بعد بھی یہ سوچتے ہوئے مجھے ڈر لگتا ہے کہ
جس بھگوان کے آگے ماتھا ٹیک کر اُنھوں نے اپنے ماتھے
گھسا دئے جس چوکھٹ پر انھوں نے اپنا دھیان اور تن لگا
وہاں سے اُنھیں کچھ نہ مل سکا پھر اگر یوں ہے تو انسان کو
شکتیوں سے پرارتھنا کیا کرتا ہے؟

کلپنا کو میں نے دُکھ سے گھلتے دیکھا ہے اپنے سامنے
ہولے ہولے دیوالی کی رات میں دیوٹ کا جلنا تو چند گھنٹوں
کا ہوتا ہے اور وہ ساری عمر جلتی رہی۔ جب پریم سے اس
نے بھگوان کے آگے اپنا تن من لگایا اسی لگن سے بھگوان
نے اُسے کچھ نہ دیا۔ جب کوئی آس نہیں رہتی تو پھر بھی کون
شے ہے جو کلپنا کو پھر بھی مندر میں گھسیٹ کر لے جاتی رہی
اور اس نے رادھے کی طرح مرجھائی ہوئی پتیاں بھگوان
کے منہ پر مار کر اس سے سدا کے لئے ناتا نہ توڑ لیا

دادا کو بھی رادھے سے جیسے بیر تھا۔ وہ بھی
دیوالی کو مندر کے پچھواڑے تالاب سے کر آتی اور وہ
اس کی پاس پہنچ جاتے۔ دیوالی کی شام کو باہر میلے
میں ابھی کبھی نہ گئی اور میں بھی دیپک اٹھا سی کو چھپانے
کے پچھواڑے کرشن جی [illegible]

ج میں پاؤں رکھ کر چلنے کے لئے وہاں پہنچ جاتا۔ رادھے کہتی
ن کا کا تمہارے من میں کیا ہے۔ میلہ تو ہوتا ہی بچوں کے لئے
اور تم ابھی وہ ھوا ماں کو دکھ دے کر یہاں چلے آتے ہو۔ جہاں
ی ہوا اندھیرا ہو وہاں بچوں کو نہیں آنا چاہئے تمہاری ماں کو
ل گیا کہ تم مجھ سے بات کرتے ہو تو تمہیں بہت ڈانٹ پڑے
،ون کو چھوڑ کر کیوں یہاں آ جاتے ہو؟

پر نہ رادھے نے اپنے من کا میل دُور کیا اور نہ پجاری
نے اُسے مندر میں آنے دیا مجھے ماں کی بات اب ہر وقت
ی کیا ہوا اگر وہ مندر کے اندر جا کر بھگوان سے اپنے لئے
تھا کر لیتی ہو پوری چھُپے جیسے کوئی اپنے چاہنے والے کو ملنے
، اور اندھیری رات میں اس کے سینے سے لگی آنند میں
ہوا ور ستاروں کے ہنڈولے میں جھول رہی ہو اس کے
، انگ میں اتنی مٹھاس ہو اور نس نس میں خوشی اس گھڑی
ے دکھ اُسے بھول جائیں اور راہ کی تھکنی اور دھول کی
ح اس نے اُنھیں جھٹک دیا ہو۔ رادھے کا آخر بھگوان سے
ناتا تھا؛

جس رات میں نے رادھے کو مندر میں دیکھا مجھے اپنی
ں پر بہت وشواس ہو گیا۔ میں نے کہا نا جب ماں تھی تب میں
، اس کے کہنے کو کبھی سچ نہیں جانا اب ماں نہیں ہے تو میں
ا ہوں اس نے کبھی کوئی بات یونہی نہیں کہی تھی۔ بنا سوچے
ھ اور بنا کسی مطلب کے۔

وہ رات بھونرے کی طرح کالی تھی اور بڑی ہی اُداس
ر من بوجھ تلے دبے ہوئے پتنگے کی طرح ذرا ذرا تڑپ رہا تھا
ے اسے معلوم تھا کہ اب اس بوجھ کے تلے سے نکلنا اس کے
یب میں نہیں ہے۔ کیا اپنے سسرال تھی اور دادی ماں
ے پھول میں گنگا میں بہا کر آیا تھا۔ میری نانا ٹوٹ چکی تھی اور
ریا کا سندور بہا [illegible] سے نکل کر آس پاس بسیرا تھا
اج کی باس میں [illegible] اور [illegible] کی آواز دل
ور [illegible] کے ساتھ بچوں اور شور کی گھنٹیں بھی

تھیں جیسے میلے گرد ایک گیت پھیلا ہو۔ لوگ اپنے اپنے بچاؤ
کی فکر کر رہے تھے اور میں مندر کی سیڑھیوں پر بیٹھا سوچ رہا
تھا ماں نہیں ہے دادی نہیں ہے کوئی بھی نہیں ہے تو یہ تگ
بیکار ہے آخر مجھے کسی کے لئے کرنا کیا ہے؛ دادا کب کے مرچکے
تھے اور پجاری جی اپنے چھوٹے سے گھر میں بہت سے بال
بچوں کے ساتھ کہیں اور جانے کی فکر میں تھے۔ طوفان کا شور
بڑھتا جا رہا تھا اور پانی تیزی سے مندر کی سیڑھیوں پر بھی
آ گیا تھا۔

مندر کے پچھواڑے سے سوکھے پتوں پر کسی کے قدموں کی
چاپ سن کر میں ڈر گیا۔ قدم تیز نہیں تھے اور نہ ہی چلنے والے
کو جلدی تھی۔ ٹھہر ٹھہر کر رک رک کر جیسے کوئی سوچ میں ڈوبا
ہوا ہو اور رک کر اپنے ماتھے کو انگلی سے بجانے لگے اور سوچے
کہ اس نے ایک لمحہ پہلے کیا سوچا تھا۔ پھر پھولوں کی باس کا
ایک جھونکا سا آیا اور سوکھے پتوں کی باس کے ساتھ مل کر میرے
پاس سے نکل گیا۔ مجھے لگا دھرتی میں سے ایک جھنکار چلی آتی
ہے جیسے کسی سہاگن کے بچھوے کسی کنواری کے گیتوں کے ساتھ
بج اُٹھے ہوں کوئی اَن سُنے دل سے چلتا ہوا سامنے کی طرف آیا۔

مندر کے احاطے میں کرشن چورا کے پیڑوں پر بھیگی ہوئی
ہوا آن کر لگتی تھی اور خالی گاؤں کی اُداسی لہروں کے ساتھ ساتھ
جیسے بڑھ رہی تھی۔ آج کسی نے مندر میں دیا بھی نہیں جلایا تھا
اور آنے والی پھر بھی یوں آگے بڑھ رہی تھی جیسے چور کا چور کی
اپنے پرانے گھر کو دیکھنے کوئی آتما زمانوں کے بعد چلی آئی ہو اور
اب دکھ سے اُجڑے ہوئے گھر کو دیکھ کر سوچے یہ کبھی اس کا تھا
بھی کہ نہیں۔

میں نے کہا رادھے آخر آج آئی ہے نا۔ یہ بھگوان کے
نام پر باتیں کرتی اور دھندا کرنے کا کہا کرتی تھی اسے بھی تو آج
بھگوان سے کچھ مانگنا ہے۔ میں اوٹ میں ہو گیا۔ ویسے اندھیرا
بھی گہرا ہو گیا تھا وہ چوکھٹ کے باہر رک گئی۔ آس پاس کوئی
بھی تو نہ تھا۔

میں نے سوچا اندر چھوٹے بڑے دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں آج پڑی ہیں اور برہما سے لے کر، پاربتی تک سارے چپ ہیں۔ آج آپ سے آپ روشنی ہو جائے گی اور کرنوں کی چھوٹ رادھے پر پڑے گی وہ سب اُسے کہیں گے تم تو ہم سے ناتا توڑ چکی ہو تم کیوں آئی ہو کیا کرنے کیا کہنے۔

مگر اندر سے کوئی بھی تو نہ بولا۔ پھر میں نے سنا رادھے ہولے ہولے سسک رہی ہے اس کی آواز میں گھٹن تھی اور دُکھ تھا اور تنہائی کا جان کو روگ کی طرح لگ جانے والا گھُن تھا۔

میں اوٹ سے نکل آیا اور چوکھٹ کے پرلی طرف کھلے پٹ کے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ مجھے حیرت تھی رادھے آج یہاں کیوں آئی ہے۔

اس نے کہا "تم سارے یہاں اکٹھے ہو پر تم بھی اندھیرے میں ہو جیسے میں ہوں تم کسی کے نصیب کو نہ جگا سکتے ہو اور نہ کسی کو ڈھنڈا سکتے ہو۔ میں تم سے اپنے لئے کوئی پرارتھنا نہیں کرنے آئی صرف یہ پوچھنے آئی ہوں کہ تمہارے سامنے ہی تو بانکے بہاری نے مجھے پھول دیا تھا اور کہا تھا اس کے بدلے میں اپنی آتما مجھے دے دو۔ میں نے اس چوکھٹ کے باہر کھڑے ہو کر نہیں اندر تمہارے چرنوں میں بیٹھ کر یہ سب سویکار کیا تھا اور تمہارے سامنے اپنی آتما کو اسے دے دیا تھا۔ پھر زمانے گزر گئے ہیں اب سوائے اس پھول کے جس کی پتیاں اب سوکھ کر جھڑنے لگی ہیں میرے پاس اور کچھ بھی نہ رہا۔ تم بھگوان ہو اور دھنیہ ہو کیا تم مجھے بتا نہیں سکتے کہ میں اس پھول کو لئے لئے کب تک انتظار کروں میں کب تک بانکے بہاری کی راہ دیکھوں؟" اس کی آواز اُونچی ہوتی جاتی تھی جیسے دیوتاؤں کی اس خاموشی سے ماکا ڈر اس کے دل سے اُٹھ گیا ہو۔

"تم بھگوان ہو اور یہ کھیل بناتے ہو تم آتی بہت آشائیں پیدا کرتے ہو اور جی کو دکھ سے من کو چین سے اور ہر دوسے کو پیڑا سے بھر دیتے ہو۔ تم سارے رستے بند کر دیتے ہو۔ بتاؤ اگر تمہیں معلوم ہے تو مجھے بتاؤ میرے نصیب میں کیا ہے میں کب تک اس سوکھے پھول کی بکھری ہوئی پتیوں کو سینے سے لگا کر سکھ کا انتظار کروں۔ دیوتاؤ مجھے بتاؤ میرے نصیب میں کیا ہے۔ میری آتما کے بدلے میں مجھے شانتی نہیں ملے گی؟"

مندر میں سے کوئی آواز نہ آئی۔ سارے دیوی دیوتا اس اوتھی مانگنے والی کی باتیں سن کر چپ چاپ ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانک رہے ہوں گے۔ پاربتی نے بڑی بے چینی سے پہلو بدل کر شو کی طرف دیکھا ہوگا۔ ناگ دیوتا نے اپنا پھن سمیٹ لیا ہوگا۔ اور سارے دریاؤں کا پانی جن پر شو اور پاربتی تیرتے پھرتے تھے مندر کی چوکھٹ سے ٹکرا گیا۔

رادھے نے کہا "میں نے جب جب بھی چاہا ہے ان کی پتیوں میں باس ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے اور ان کی پُرانی ملائمت میں اپنی آتما کی تلاش کی ہے۔ دیوتاؤ مجھے بتاؤ اگر وہ پریم نہ تھا صرف گہرے گھاؤ کی پیڑا تھی تو میں نے اپنی آتما کس شے کے بدلے بلیدان کی ہے۔ میں نے ہر دیوالی پر مندر کے پچھواڑے بیٹھ کر بانکے بہاری کا انتظار کیا ہے۔ میں نے سدا اپنے من میں جانا تھا کبھی کسی دیوالی کو وہ میری آتما لوٹانے لوٹ کر آئے گا۔ کیا میرا بلیدان ایسا ہی تھا اور تم سب اپنے چرنوں میں بٹھا کر بھی میری کوئی بات نہ سن سکے تم کیسے بھگوان ہو؟"

"میرا من میلا تھا میرا تن بھی میلا تھا اور میں نے کبھی بھی تم سب سے اپنے سوالوں کا جواب نہیں مانگا۔ اب میں کس شے کا انتظار کروں۔ مجھے جواب دو مجھے بتاؤ؟"

رادھے چوکھٹ کے سامنے بیٹھی رہنا ما تھا ٹیکے بیچ بیچ کر بھگوان سے اپنی آتما کا پوچھ رہی تھی وہی آتما جو اس نے ایک پھول کے بدلے بانکے بہاری کو دے دی تھی۔ رات دور گہری ہو گئی اندھیارے نے لہروں کی طرح مجھے بھی اور رادھے کو بھی اپنے اندر سمیٹ لیا۔ اندھیکارمیں چہروں [illegible] کو اپنے اندر چھپانے کی [illegible]

ہوتا ہے

رادھے نے پھر کہا "جواب دو ورنہ تمہارا دھرم اور تمہارے آسن سارے بھرشٹ ہو جائیں گے میں نے آج سولہ سنگار کیا ہے اور تمہیں بھی اپنے دَھندے کے لئے بُلانے آئی ہوں۔ میری آنکھوں میں دیپ جل رہے ہیں اور میرے انگ انگ میں سوگندھ ہے میری سُندرتا سے تو تم بھی مات کھا جاؤ گے جواب دو نہیں تو میں تمہیں بھرشٹ کر دوں گی"

رادھے کی پکار کا جواب بڑھتے ہوئے پانی نے دیا جیسے تب ہی سانپ کی پھنکار سنائی دی اور مندر کے باہر درخت پانی پر گر گئے بہت سی آوازوں اور شور سے ہمارے آس پاس دُنیا سی جاگ گئی۔ رادھے کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی "جواب نہیں دیتے تو میں چوکھٹ کے اندر آتی ہوں" اور اس سے پہلے کہ میں اُسے روک سکتا وہ تیز قدموں سے چلتی ہوئی اندر چلی گئی۔ پھر مجھے مورتیوں کے ٹوٹنے کی اور چیزوں کے گرنے کی آوازیں آئیں اور ساتھ میں رادھے کہہ رہی تھی "اس چُٹکی بھر مسلی ہوئی پتیوں کے بدلے میں نے اپنی آتما بیچی تھی اور تم نے کچھ نہیں کہا تھا۔ تم سب چُپ چاپ میری تباہی دیکھتے رہے کتے اور ہنستے رہے تھے۔ دھندا میں نے نہیں تم نے کیا ہے یہاں سے باہر نکل جاؤ تم کہاں پُوجا کے قابل ہو تم یہاں سے سارا کچھ لے کر بھی اس کے نہیں بنتے۔ نکل جاؤ یہاں سے نکل جاؤ"

میں نے اندھیرے میں جب ہاتھ بڑھا کر اُسے باہر کی طرف کھینچا وہ گر گئی اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور اس سے بات نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے کہا "رادھے یہ میں ہوں چندن۔ تم نے ساری مورتیاں توڑ دی ہیں اب گاؤں تک نہیں سکتے چلو یہاں سے نکل چلیں"

رادھے نے ہنس کر کہا "بھگوان کی جگہ میں نے لے لی ہے گاؤں کو اب کچھ نہیں ہو سکتا چندن تم اپنے بچاؤ کی فکر کرو میرا کوئی خیال نہ کرو۔ تم کیوں نہیں چلے جاتے مجھے یہاں چین سے مرنے دو۔ میرے پاس تو اب وہ سوکھی پتیاں بھی نہیں ہیں جن کے سہارے میں جی سکوں۔ چلے جاؤ یہاں سے نکل جاؤ" میں سر جھکا کر چلا آیا

آج کتنے سالوں کے بعد میں سر جھکائے ہوئے ویران مندر کے پاس سے گزر رہا ہوں۔ سارے آسن خالی ہیں اندھیرا ہے سیڑھیوں کی ٹوٹی پھوٹی جگہ پر گھاس ہے جس میں سے ہوا چاہے کتنا بھی سمٹ کر چلے پر ریشمی آنچلوں کو سنبھال نہیں سکتی اور سرسر کر کے بہتی ہے تارے ڈوبے ہوئے ہیں اور دُودھیا راستہ جس کو میں نے اور کلپنا نے ماں کے ساتھ مل کر آنگن میں لیٹے لیٹے کئی بار دیکھا تھا آج کہیں دکھائی نہیں دیتا۔

میں چوکھٹ کے باہر کھڑا ہوں اور سوچتا ہوں اندر جا کر بھلا بھرشٹ کرنے کی مجھ میں طاقت کہاں ہے مورتیاں اوندھی پڑی تھیں۔ دیوتاؤں کے ٹوٹے ہوئے انگوں سے میرا راہ بند ہے ساری پدویاں بچی تھیں، ورنہ اونچے تخت پر بیٹھی ایک پھول کے بدلے بکی آتما کون جانے میری طرف دیکھے بھی کہ نہیں؛

پتہ نہیں کہ جیت کس کی ہوئی آتما کی کہ پھول کی!

سچل سرمست (بقیہ [illegible])

سیکھے گا عشق جو بھی، جھیلے گا وہ مصیبت
سرجان صنم پہ صدقے سچل یہ جسم سارا

غرضکہ سچل سرمست کی اُردو شاعری اپنے اندر خاصا [illegible] کا سامان رکھتی ہے ان کی اُردو شاعری میں خاصا سُتھراؤ ملتا ہے اُردو کے ابتدائی شاعروں کی طرح ان کی اُردو شاعری ناموزوں اور اجنبی نہیں معلوم ہوتی سچل کی یہ خصوصیت اُردو کے بہت سے قدیم اُردو شعراء پر سبقت رکھتی ہے۔

بازگشت

"تم جا رہے ہو" نشاما نے گلوگیر آواز میں پوچھا

"ہاں بہت دور۔ پھر واپس آنے کے لئے" ڈوبی ڈوبی ہوئی آنکھوں والے ریاض نے جواب دیا

مگر ایک موہوم سا خدشہ نشاما کے دل میں رینگنے لگا۔

نہ جاؤ۔ رک جاؤ۔ اس نے تڑپ کر کہنا چاہا مگر نہ کہہ سکی۔ وہ اچانک زندگی کے ایسے موڑ پر آکھڑی ہوئی تھی جہاں سے زندگی کا اُجالا آہستہ آہستہ دل کی گھاٹیوں میں رینگنے لگا تھا حالانکہ اب تک وہ ان گھاٹیوں کو اندھیرے سے پُر سمجھتی آئی تھی بہت سے جگنو لا تعداد ہی فضا میں اڑنے لگے اور ان کی ننھی ننھی جھلملاتی ہوئی روشنیوں کے پیچھے ریاض کی طویل پرچھائیں گم ہوتی چلی گئی۔ ہنستے ہوئے جگنو اور روتی ہوئی شبنم——

نشاما خلاؤں میں تکتی رہ گئی سب کچھ کتنا دھندلا اور بے کیف تھا جیسے بہار کے بعد خزاں اور اُجالے کے پیچھے اندھیرا بھوری زمین حسب دستور پیروں کے نیچے تھی نیلا آسمان سینہ تانے سروں کے اوپر اور ان دونوں کے درمیان شفاف ندیاں نالے سمندر جھرنے اور گنجان صحرا ہرے بھرے گلستان نوخیز نودر ندخوش رنگ پھول مگر اتنی ساری پرکشش چیزیں بھی نشاما کی توجہ اپنی طرف نہ کھینچ سکیں اور وہ چپ چاپ ہتھیلی کے پیالے میں اپنا اداس چہرہ چھپائے اپنی بیخواب آنکھوں کو بند کر کے سوچتی رہ گئی۔ یہ دنیا کیسی عجیب جگہ ہے یہاں لوگ اس لئے ملتے ہیں کہ مل کر بچھڑ جائیں۔ قہقہے اس لئے لگائے جاتے ہیں کہ پس منظر کی خاموشی کو واضح کر سکیں اور سب کچھ بالکل اس چراغ کی مانند ہے جو خاموشی سے جلے جا رہا ہے۔ حوادث کے تند اور گہرے طوفانوں میں، جاڑوں کی خنک برفیلی ہواؤں میں اور اندھیرے کے دبیز خوفناک سیہ خانوں میں۔۔ جس کی جوت   جس کی چمک جس کا اُجالا ہی دنیا کا واحد راہبر ہے پھر بھی انسان ٹھوکر کھاتا ہے۔

ایک پتھر سے دوبارہ ٹھوکر کھانے والا بے وقوف ہے؟ ہو سکتا ہے مگر نشاما نے اپنی پیشانی ان زخموں کے لئے وقف کر دی ہے۔ وہ بھول رہی ہے کہ دنیا کی اس پر رونق محفل میں اس کا وجود روئی کے گالے کی طرح نرم اور مخمل کی تہوں کی طرح قائم ہے۔ اسے پتھروں سے ٹکرانے کی بجائے نرم صوفوں پر آرام سے زندگی کا مزہ لوٹنا چاہیے مگر نشاما بے کل ہے وہ نہیں جانتی وہ کیا چاہتی ہے۔۔۔ کیا۔؟

اور ریاض کی پرچھائیں ابتک اس کے شفاف دل کی سطح پر کانپ رہی ہے حالانکہ وہ خود کبھی کا جا چکا۔۔۔

زہرا کی شادی میں نجمہ نے بتایا کہ ریاض آچکا۔ تو وہ سب کام بھول کر دوڑی۔۔۔ "کیسی ہو۔؟" ریاض نے اسے دیکھ کر پوچھا مگر نشاما بغیر جواب دیئے اسے ایک ٹک دیکھتی رہی۔ کس قدر بدل گیا تھا ریاض۔ سرد خنک کی [illegible] ہواؤں نے اس کا رنگ سنولا دیا تھا اور دنیا بھر کی

اس کے نقوش میں کچھ ایسی عجیب اور پرکشش ہم آہنگی پیدا
ہو گئی تھی کہ نشاط مبہوت رہ گئی۔ یہ وہی ریاض ہے....
جو بلا وجہ اس کے طمانچے لگا لگا کر خوش ہوا کرتا تھا اس
کے بھرے بھرے گالوں میں چٹکیاں بھر بھر کے قہقہے لگایا کرتا
جو اس کی چرائی ہوئی ساری املیوں کا پتہ اماں کو صاف
صاف بتا دیا کرتا تھا اور ماسٹر صاحب کے سامنے غلط سلط
باتیں کر کے اسے پٹوایا کرتا تھا۔
اور جب ایک دن وہ اسکول سے واپس آئی تو معلوم ہوا
کہ ریاض جا رہا ہے — کہاں۔ کہاں۔ کہاں — وہ
ایک سے پوچھتی رہ گئی لیکن کسی نے اسے نہیں بتایا اور
وہ چلا گیا۔
اب اس کی شرارتوں پر شکایتیں کر کر کے اسے پٹوانے
والا کوئی نہ رہا۔ اس کے بھرے بھرے گالوں پر اپنی سخت اور
گرم انگلیوں کے نشانات چھوڑنے والا کوئی نہ رہا۔ چھپائی
ہوئی املیوں کی گٹھلیاں یک بیک جاتی رہیں اور
ماسٹر صاحب کا دیا ہوا ہوم ورک وہ خود بڑی پابندی سے
کرنے لگی۔
زندگی کتنی خالی اور پھیکی ہو کر رہ گئی تھی — وقت
بے رحم پرند اپنے مہیب سیاہ پر پھیلائے اس کے سر پر اڑتا رہا اور
ایک ہی جست میں اتنا اونچا اتنا بلند کہ وہ اپنا سارا بچپن
بھول گئی۔ اس سیاہ سائے کے نیچے، اس مبہم دھند کے پیچھے
اس کی ساری شرارت اور کھلنڈرا پن سہم کے رہ گئے۔ بے مقصد
باتوں میں چپ چاپ بیٹھی وہ جوں کھایا کرتی اور بے پناہ
سائے میں اپنے آپ کو سب سے الگ تھلگ دور محسوس
کرتی جیسے وہ اس دنیا کی فرد نہ رہی ہو —
اور آج جب مجھ نے بتایا کہ ریاض آ چکا ہے تو وہ سب
کچھ بھلا کر زندگی کے ہنگاموں میں حصہ لینے کی جان سے
تیار ہو گئی۔ فضائیں مسکرا رہی تھیں لوگوں کا ہجوم اس کے
ارد گرد پھیلا ہوا تھا اور ٹھنڈی ہوائیں اس کے کانوں میں
سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ وہ آ گیا — وہ آ گیا۔
رات کو جب سب مہمان اپنے گھر جا چکے اور دلہن رخصت
ہو گئی تو وہ تھکی ہاری اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔ قد آدم
شیشے میں سر سے پیر تک جائزہ لے کر وہ کرسی پر آ بیٹھی —
"یہ اڑی اڑی سی رنگت یہ کھلے کھلے سے گیسو" لیکن رات
اور صبح کا فسانہ ابھی نامکمل تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور
ریاض بے آواز چلتا اندر چلا آیا — وہ ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی
"ناراض ہو —؟" ریاض نے جھک کر سگریٹ سلگایا
اور ہتھیلیوں کے درمیان کانپتی ہوئی ننھی سی روشنی میں نشاط
نے دیکھا ریاض کی آنکھیں زیادہ باتونی اور شریر ہو گئی ہیں
گہری اور گھبرا دینے والی۔
وہ ساکت کھڑی رہی —
"چلا جاؤں —؟" وہ مڑا اور جانے کیسے نشاط نے کہا،
"نہیں —" اس ایک "نہیں" میں اس کے دل کے سارے
جذبات سارے احساسات سمٹ آئے۔ تیز سُروں کا آہنگ
نرم موسیقی کی حلاوت اور تند ہواؤں کی شدت — ریاض
مسکرایا۔

"ذرا بھی نہیں بدلیں تم —" اور وہ اس کے قریب
بالکل قریب آ کر بیٹھ گیا۔ "سناؤ کچھ" سگریٹ کا لمبا سا کش
لے کر اس نے فرمائش کی اور نشاط نے سوچا۔ کوئی بھی تو بات
اس قابل نہیں۔ اتنے بہت سے دنوں میں سوائے اس کے
کوئی بھی تو بات قابل ذکر نہیں کہ وہ اپنی ساری شرارت بھول
کر ازحد سنجیدہ ہو گئی ہے مگر وہ نہیں چاہتی کہ اپنی بے وقت
سنجیدگی کے بارے میں ریاض کو کچھ بتائے سو وہ چپ رہی۔
"نہیں بتاؤ گی —؟" ریاض نے پھر پوچھا۔
"کوئی بھی تو بات نہیں —" اس نے ٹھہری گہری
سانسیں اپنے سینے میں دبا کے جلدی سے کہا
"اس لمبے عرصے میں کوئی بات ایسی نہیں ہوئی جو تم
مجھے سنا سکو۔ میں نے تو سنا ہے یہاں میرے پیچھے بڑے بڑے

طوفان گزر گئے ——؟"

بے شک طوفان آئے اور اپنی لپیٹ میں بے سہارا
تنکوں کو لے کر کہیں دور چلے گئے۔ ہوائیں سرسرائیں اور
مدھم سرگوشیوں کو اپنے جلو میں لئے بدیس چلی گئیں ——
فاطمہ کی شادی اس کی مرضی کے خلاف ایک سشن جج سے
کر دی گئی۔ فاطمہ — جس نے زندگی بھر انصاف کے لئے
کشمکش کی خود ہی ناانصافی کی نذر ہو گئی۔ بیس برس کی بالی
فاطمہ پچاس برس کے ایک امیر بوڑھے سے بیاہ دی گئی۔

نسیمہ پردیس چلی گئی۔ ریاض کی پسندیدہ نسیمہ۔ جس
کی آنکھیں گہری کالی تھیں جس کے بال گھنگھروالے تھے جس
کے لب اتنے شگفتہ اتنے نازک تھے کہ انھیں دیکھ کر ہمیشہ
گلاب کی پنکھڑیوں کا خیال آجاتا اور جس کے جذبات اتنے
..... اچھوتے تھے کہ وہ زندگی بھر ایک تجارت پیشہ شوہر کا
تصور نہ کر سکی۔ جس نے اپنے قلم کی جنبش سے ہزاروں
تصویریں بنائیں ان میں ہمیشہ شوخ اور گہرے رنگ بھرے
بے شمار کہانیاں لکھیں اور ان کے کردار ہمیشہ بہادر اور
جوشیلے رکھے۔ وہی بیباک نسیمہ پھول کی ایک مسلی ہوئی
روندی ہوئی ٹوٹی ہوئی پامال پنکھڑی کی طرح سب کے
درمیان سے ہزاروں میل دور چلی گئی۔ اپنے بنائے ہوئے
کرداروں کو جیتے جاگتے انسانوں میں رواں دواں دیکھنے
کی بجائے بے جان اشیاء کے انبار تلے لین دین کا سودا
کرنے اور فضا سسکتی رہ گئی۔ کوئی بھی تو کچھ نہ کر سکا اور کچھ
کرنے والا ریاض اب اتنا بعد آیا ہے کہ کچھ کیا بھی نہیں
جا سکتا۔ وہی تو اکیلا فرد تھا جو خاندان کے ہر بزرگ سے ٹکر
لیا کرتا تھا۔ وہی تو بہن بھائیوں کا چہیتا دلارا بھائی تھا جو
ان کی خواہشوں کے لئے اپنی جان لڑا دیا کرتا تھا۔ اب نشاط
اسے کس طرح بتائے کہ فاطمہ —— اس کی بہن فاطمہ اپنی
بے نور خالی خالی آنکھوں میں زندگی کی مٹتی ہوئی پرچھائیاں
لئے اسے یاد کرتی ہوئی زندگی کی وہ رنگین سرحد چپ چاپ
اور روتے ہوئے عبور کر گئی جس کے پار صرف کھوکھلی تنہا
ئیاں اور خشک بے جان بوڑھے چوپٹے ——

نشاط کی زبان سوکھ رہی تھی اور اس کی آنکھیں
آئی تھیں۔ اسے یقین تھا ریاض اس سے ضرور فاطمہ
نسیمہ کے بارے میں پوچھے گا لیکن ریاض نے ان دونو
نام نہیں لیا تو پھر ہنگاموں اور طوفانوں سے اس کی
تھی —— کہیں وہ —— وہ کسی اور کو تو نہیں پوچھ رہا
خود اس کے اپنے بارے میں تو کچھ نہیں دریافت کر ر
اسی لمحے اُسی منٹ نشاط کی جھکی ہوئی آنکھیں کسی بے
جذبے کے تحت اُوپر اٹھیں اور ریاض کی مسکراتی
آنکھوں سے ٹکرا گئیں۔

"نشاط ——" ریاض بڑبڑایا۔ اس نے اپنی
سخت انگلی نشاط کے نرم بالوں میں اُلجھا دی اور د
ان برہم زلفوں سے کھیلتا رہا۔

نشاط —— ! نشاط —— !! نشاط —— !!! یہ کون
زندگی کے دوراہے پر کھڑا اسے آواز دے رہا تھا۔
رہا تھا بڑے مانوس اور دل خوش کن لہجے میں ——

"مجھے پتہ ہے تم مجھ سے خفا ہو۔ اور ہونا بھی چ
اتنے دن بعد جو آیا ہوں۔ لیکن نشاط یقین کرو ملکوں
گھومتے ہوئے میں نے تمہیں کبھی نہیں فراموش کیا۔
سگریٹ ریاض کی انگلیوں میں کانپ رہا تھا اور نشا
رہی تھی یہ کیا چیز ہے جو اس کے حلق میں اٹک رہی
کی آنکھوں میں چمک رہی تھی۔

"نسیمہ بڑی بزدل نکلی۔ اس نے ذرا بھی جد
کی۔ مجھے ایسی لڑکیاں مطلق پسند نہیں جو ساری
ایڈیلیز کے پیچھے دوڑتے ہوئے گذاریں اور
وقت چپ چاپ نے فیل ہو جائیں" نشاط کا روندھ
یکایک صاف ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں دہکتے
شرارے اپنی تپش بھول کر مسکرانے لگے۔

انسان میں جرات ہونی چاہیئے — قوت فیصلہ —
کہ جدھر ہواؤں کا رُخ دیکھا پلٹ گئے منزل کا نشان ہر
اسے پر نہیں مل سکتا اس کے لئے تو پہلے ہی ایک اٹل متعین
کرنی پڑتی ہے۔" اور ریاض کی انگلیاں اس کے بکھرے ہوئے
بالوں سے کھیلتی کھیلتی اس کے نرم گالوں پر اُتر آئیں
پن پھوٹ رہا تھا۔ لڑکپن مسکرا رہا تھا — کتنی پیاری
نرم اور ملائم۔ لطیف جیسے اَبر جیسے پھول جیسے صبح کی
شبنم "

وہ زیادہ دیر ریاض کی آنکھوں میں نہ دیکھ سکی۔
"بے چاری فاطمہ۔ ابا نے اس کی زندگی تباہ کر
دی۔ جانے ان بوڑھے لوگوں کو لڑکیوں کے بیاہ کی اتنی
جلدی کیوں ہوا کرتی ہے اور نشاط پیاری۔ فاطمہ تھی بھی
بے زبان۔ اس نے کبھی بلند آواز سے بات نہ کی
کسی کو برا بھلا نہ کہا کبھی کسی کے ساتھ ناانصافی نہ کی۔
درد اور رحم دل فاطمہ خود قربان ہو گئی اگر وہ ہندوستان
سے باہر پیدا ہوتی تو شاید اس طرح چپ چاپ اپنی زندگی
کی قربانی نہ دیتی۔ میں نے اسے کتنا سمجھایا تھا پاگل لڑکی پھر
اس نے زبان نہ کھولی اور میں کتنا بعد از وقت پہنچا"
ریاض کو اپنے سیاحت کے خبط پر پہلی مرتبہ کوفت ہو رہی تھی
"مجھے تم بہت پسند ہو۔ بہت ..." فاطمہ کے ذکر سے
ریاض یکایک اس کی طرف لوٹ آیا۔

"میں نے تمہیں بہت ستایا ہے بہت بڑا یا ہے۔
یاد ہے جب تم بالکل ننھی سی تھیں تو مجھے تمہیں رُلا کر
لطف ملتا تھا۔ تمہارے بھرے گالوں میں تمہاری چھلکتی ہوئی
آنکھیں بالکل ان پہاڑی چشموں کی طرح لگتی تھیں
کسی گمنام صحرا میں آ نکلے پڑے ہوں — ان کی شدت
کی جلن۔ جیسے انگارے پڑے تمتا رہے ہوں اور تمہارے
رخساروں پر آنسوؤں کے وہ قطرے جو میری
شکایتوں کے جواب میں تمہارے پلکوں کے نیچے بہا کرتے
جیسے پھول کی کومل پنکھڑیوں پر شبنم مسکرا رہی ہو —" اور
اور ریاض نے اسے تھام لیا — "میں تمہیں ان ناانصافی
کا شکار نہ ہونے دوں گا۔ میں فاطمہ کا بدلہ اور نسیمہ کا
انتقام لوں گا۔" اور وہ لڑکھڑاتا ہوا دروازے سے باہر
نکل گیا۔

بہت سی روشنیاں جھلملا کے رہ گئیں۔ بہت سے
اندھیرے آپ ہی آپ چھٹ گئے اور نشاط وہ سارے دکھ
درد بھول گئی جو پچھلے بارہ سالوں میں اس نے محسوس کئے
تھے —

زہرا دلہن بن کر بابل کی دہلیز سے رخصت ہو چکی تھی
اور سناٹے کے باوجود گھر میں عجیب سی خوشیوں کا راج
تھا جیسے یہ خوشیاں اب تک نشاط کی آنکھوں سے اچھل
رہی تھیں اور ابھی ابھی اسی لمحہ انگڑائی لے کر جاگ رہی تھیں
اپنے گلابی پرتو کا رنگین سہانا عکس گھر بھر پر پھیلا رہی تھیں
جیسے خاموشی سے کہہ رہی تھیں۔ زندگی کا رنگ شوخ
نہیں ہلکا اور متوازن ہے مسرور آمیز۔ نسیمہ نے ہمیشہ شوخ
رنگوں کے استعمال سے دھوکا کھایا اور فاطمہ بھی رنگ کے
بارے میں ہمیشہ انتہا پسند رہی مگر تم — اور نشاط نے —
کھڑکیوں کے سارے پردے بازو ہٹا دیئے — ٹھنڈی ہواؤں
کا ایک ریلا سا کمرے میں گھس آیا۔ آدھی رات بیت چکی تھی
ہر طرف خاموشی کا راج تھا لوگ تھکے ہارے بڑے اپنی اپنی
جگہ سو رہے تھے مگر نشاط دیکھ رہی تھی کہ ایک نیا اُجالا
لامتناہی وسعتوں سے نکل کر اس کے مختصر سے کمرے میں رنگ
رہا ہے اور اس خاموشی میں بھی نہ جانے کہاں سے کس طرف
سے ہلکی ہلکی مترنم آواز اس کے کانوں میں گونج رہی ہے بالکل
اسی طرح پر کیف اور پرکشش آواز جو ابھی کچھ دیر پہلے زہرا
کے وداع کے وقت اس گھر کی چار دیواری میں گونج رہی تھی
اور لوگ تھکے ہارے ہونے کے باوجود اپنی حیران آنکھیں
کھولے اسے دیکھ رہے ہیں اس سے پوچھ رہے ہیں۔ یہ سب

کچھ گیا ہے۔ کیا یہ کہیں یہ ایک خواب تو نہیں۔ ایک طلسم تو
نہیں — ایک ڈرامہ تو نہیں — ؟؟؟
اور وہ ہنس پڑی — کتنے بے وقوف ہیں یہ لوگ۔
دُنیا بھر پر اپنی آنکھیں جمائے رکھتے ہیں ہر ایک کے بارے
میں اپنی زبان قینچی کی طرح چلایا کرتے ہیں اور اس کے آگے
میں یوں مبہوت و لرزاں ہیں جیسے گنگ ہو گئے ہوں جیسے
اندھے بہرے ہو گئے ہوں یا جیسے بالکل ہی خلاف توقع پیش آنے
والے واقعے کی سخت کشمکش سے باہر نہ نکل سکے ہوں —
جو کچھ بھی ہو۔ اپنی ساری پچھلی اُداسیوں کا ثمر وہ اب پا رہی
تھی بغیر کچھ کہے بغیر زبان ہلائے اس نے خود ایک بڑا کارنامہ
انجام دیا تھا — جس ریاض کو جیتنے خاندان بھر کے لوگوں
نے اپنی ساری امکانی کوششیں صرف کر دیں وہ اسے پل
بھر میں اپنی خاموش تپسیا سے جیت لائی اور نرم بستر کی
سلوٹوں میں آہستہ آہستہ ڈوب کر وہ سوچنے لگی — ریاض
کتنا خوبصورت ہے — کتنا نڈر — کتنا بے باک — اُونچا
پورا قد اور ریاض اپنی آنکھوں اور اپنی باتوں میں کتنی بہت
سی مخمور کیفیات کا طوفان چھپائے رکھتا ہے — اور اسے
نیند آ گئی

زہرا کی شادی کو ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس عرصے میں
زہرا صرف دو بار گھر آئی پھر جیسے ہی اس نے زمین پر قدم
رکھ کر ہندوستان کی سرحد کو پار کیا مہمانوں کا ریلا بھی آہستہ
آہستہ ختم ہو گیا — گہما گہمی اور شور شین — چیخ و پکار اور مہمان
نوازی کے فرائض سارے کے سارے ایک مجسم سکوت
اور ایک تسکین آمیز خاموشی میں ڈوب گئے اب ہر چیز ابتدا
کی طرح اپنی جگہ پر قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔ بچوں کا شور تھا
نہ بوڑھوں کی کھنکاریں — جوان قہقہوں کی یورش تھی نہ
براتیوں کا ہنگامہ صرف وہ تھی اور ریاض اور اس بڑے گھر
میں چچا چچی اور اماں باوا کے سوا کوئی اور متنفس نہ تھا۔
صبح ناشتے پر ابا نے پوچھا — کیوں بھئی چھوٹے میاں

ریاض اب مستقل یہاں آ گیا نا — اور چچا گھبرا ک
.... کچھ پتہ نہیں بھائی جان میں نے پوچھا نہیں ت
— لاحول ولا قوۃ — ابا کھنکارے — مجھے ا
کا اس طرح ہمیشہ سفر میں رہنا دیس بدیس گھومتے ر
پسند نہیں آخر انسان کبھی تو اپنوں میں رہے۔ اپنے ا
ہندوستان میں — آخر یہاں کس چیز کی کمی ہے کہ صا
ٹکنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ اتنا تو سوچا ہوتا کہ ہم اب
ہو چلے ہماری پیری کو ایک عصا کی سخت ضرورت۔
نے مجھے صرف ایک لڑکی دی اور تمہیں کل دو اولاد
فاطمہ پرائی ہو گئی اب اس کی گنتی نہیں رہ گئے نشا
ریاض میاں سو ہنسی خوشی رہیں کھائیں پئیں گھومیں
کون انہیں روکتا اور ٹوکتا ہے۔ ہمارے تو اب آنکھ
کے دن آئے اور یہ ہیں کہ عقاب کے منہ کا شکرہ۔
ہیں — چھپے چھپے دور دور پھرتے ہیں۔ بھئی ان
کہ اب سیاحت کا ارادہ ختم کریں بہت دُنیا گھوم
کچھ ہم لوگوں کے بھی بارے میں سوچیں —
حقے کی نے منہ میں لے لی ان کی بوڑھی پیشانی پر
غبار سمٹ آیا اور چہرے کی ساری جھریاں تن کے
چھوٹے چچا نے بڑے فرماں بردار بچے کی
کی ہاں میں ہاں ملائی اور اُٹھ کھڑے ہوئے جیسے
لمحہ وہ ریاض کو اس اہم حقیقت سے اس حیران ک
سے واقف کرانے والے ہیں جو دو گھڑی پہلے بڑے
کی زبانی رُونما ہوا۔
شام کی تفریح سے واپس آ کر کھانے کے بعد
اپنے کمرے میں داخل ہوا تو چھوٹے چچا بھی جلدی س
اس کے پیچھے داخل ہوئے۔ نشاط نے باپ بیٹے کی
سننا چاہی لیکن کمرہ دالان کے اس پار تھا اور ا
ابا کی بیٹھک عبور کرنا نہایت ضروری —
آوازوں کی گرج سے وہ ڈر جاتی پھر اسے ریا

ساری باتیں یاد آجاتیں جو اس نے زہرا کی شادی کے روز نشاط
سے کی تھیں۔ امتحان کی گھڑی سر پر کھڑی تھی اور وہ سوچ رہی
تھی کہ وہ آج تک کسی امتحان میں فیل نہیں ہوئی آج آخری
امتحان میں بھی اس اعزاز کو باقی رکھے گی اور ـــ اس رات
کی بھی صبح ہو گئی۔

ناشتے پر ابا کے بار بار بلاوے کے باوجود چھوٹے
چچا نہیں آئے اور چچی اماں کے سامنے اس طرح سکڑی سمٹی
سہمی ہوئی بیٹھی رہیں جیسے ازل کی قرضدار ہوں۔ نگاہ نہ
اٹھا سکتی ہوں دامن نہ سمیٹ سکتی ہوں ـــ

وہ دل ہی دل میں ہنستی رہی۔ جب لوگ بوڑھے ہو جاتے
ہیں تو ایک بار پھر بچپن کی طرف واپس لوٹتے ہیں ویسی ہی
بے مقصد اور الجھی ہوئی حرکتیں ویسے ہی دل جلانے والے
چونچلے اور بے زار کرنے والے انداز ـــ شاید پھر چچا چچی
میں لڑائی ہو گئی اور اب اماں ابا حسب دستور فیصلہ کریں
گے۔ سزا تجویز ہو گی ایک معافی مانگے گا دوسرا ذرا ناز دکھائے
گا پھر صلح ہو جائے گی ـــ یہ ڈرامہ وہ بچپن سے اب تک
سینکڑوں مرتبہ دیکھ چکی تھی۔ وہ دسترخوان سے اُٹھ کر بے تحاشہ
اندر بھاگی۔ ہنسی جو چھپانا تھی کم بخت رک ہی نہیں رہی
تھی۔

دوپہر سعیدہ کے ساتھ گزار کر شام میں جب وہ گھر
واپس آئی تو اس نے دیکھا برآمدے میں سفر کا سامان کسا
کسایا تیار رکھا ہے۔ بھونچکی ہو کے وہ دو قدم پیچھے ہٹ
گئی۔

بیٹھک کے دروازے سے ریاض باہر نکلا تو وہ دوڑتی
ہوئی اس کے پاس چلی گئی

"تم جا رہے ہو ـــ" اس نے گھبرا کر پوچھا

"ہاں۔ پھر واپس آنے کے لئے ـــ" یہ جملہ ریاض
سینکڑوں مرتبہ کہہ چکا تھا

"مگر تم نے تو کہا تھا۔۔۔۔۔"

"پگلی میں جلد لوٹ آؤں گا۔ تیرے لئے اچھا سا دو
ڈھونڈنے۔ مجھے نسیمہ اور فاطمہ کی سماج کی قربان گاہ پ
بھینٹ نہیں چڑھنے دوں گا۔ میں نے تجھے ہمیشہ پیار کی
ہے اس وقت سے جب تو اتنی ننھی منی بچی سی تھی ـــ"
ریاض آگے بڑھ گیا ـــ اس کے بزرگانہ انداز اور
لہجہ۔۔۔۔۔۔

گہرا کہرہ دبیز دھند نشاط کی آنکھوں کے آگے پھی
گئی۔ اس دھند میں ابا چلا چلا کے چھوٹے چچا پر خفا ہو
تھے اور چچی ـــ اماں کے سامنے اس طرح سکڑی سمٹی س
ہوئی خاموش تھیں جیسے ازل سے قرضدار ہوں ـــ

بہت سے جگنو لاتعداد ہی فضاؤں میں اڑنے ل
اور ان کی ننھی منی جھلملاتی ہوئی مدھم مدھم روشنیوں
پیچھے ریاض کا لمبا تڑنگا اونچا پورا ہیولا رفتہ رفتہ غائب
ہو گیا ـــ

وہ ذرا بھی تو نہ کہہ سکی۔ نہ جاؤ ریاض ـــ ٹھک جا
رکو کہ دل کی گھاٹیوں میں چھایا رہنے والا اندھیرا چھٹ
ہے وہاں سورج کا چھپتا اجالا دھیرے دھیرے پھیل
ہے۔ جنگلی پھولوں پر شبنم مسکرا رہی ہے اور خوش رنگ
پرندے آنے والی بہار کا گیت گا رہے ہیں ـــ میرا بچ
میرا لڑکپن میری جوانی اس ایک گیت کی تلاش میں کھ
ہے نامکمل اور ادھوری ہے۔ میں نے ہر امتحان پا
کیا ہے لیکن تم جیسا سخت ممتحن کہیں نہیں دیکھا ـــ لو
آؤ پھر بہار آرہی ہے ـــ لوٹ آؤ ـــ

اور اس نے تڑپ کر اپنا سر نرم تکیوں کی او
میں دے دیا ـــ بہت سی ہچکیوں کو اپنے گلے میں گھونٹ
اس نے سوچا

اس صدا کا فائدہ ہی کیا جو بازگشت بن کر پھر
کانوں میں واپس لوٹ آئے ـــ!!!

آفتاب

نئے اُفق

اچانک دروازہ کھلا

ایک اُونچا لمبا چوڑی چکلی چھاتی والا پٹھان جوان لمبے لمبے ڈگ بھرتا ان دونوں بہنوں کے سر پر آکھڑا ہوا جبین جھٹ پٹ سمٹ سمٹا کر گٹھڑی بن گئی اور جُھنے ہوئے دوپٹے سے اپنے سڈول جسم کے خطوط کو چھپانے لگی۔ لیکن دوپٹہ کم بخت بے ایمان ہوگیا تھا۔ جسم کے خطوط کی پیچ وخم میں اضافہ کیے دیتا تھا۔ مارے گھبراہٹ کے اس کا رنگ زرد پڑگیا۔

"پخیر۔ پخیر — اسلم جانا" باجی نووارد سے پشتو میں مخاطب ہوئی۔

مرد نے مسکرا کر باجی کی طرف دیکھا اور پھر ایک بھرپور نظر جبین پر ڈالی اور لمبا برآمدہ عبور کرکے ہاتھوں میں تھامے ہوئے دونوں تھیلے ایک بڑی سی بان کی چارپائی پر رکھ دیئے باجی نے جلدی سے اُٹھ کر گھڑونجی پر رکھے ہوئے کورے گھڑے میں سے لوٹے میں پانی انڈیلا اور اس کی جانب بڑھی۔ جبین نے کنکھیوں سے اس کی جانب دیکھا اس کا قد چنار کے درخت کی طرح نکلتا تھا رنگ انار کی طرح سرخ وسپید۔ موٹے موٹے سُرخ ہونٹ — نچلا ہونٹ ساری ٹھوڑی پر پھیلا ہوا تھا۔ اس نے لمبی سی بادامی رنگ کی جھلمل کرتی بوسکی کی قمیص پہن رکھی تھی اس کے گریبان سے سُرخ ریشمی رومال جھانک رہا تھا۔ اور پاؤں میں زرتار چپلی چمک رہی تھی۔ جب اُس نے جبین پر نظر ڈالی تو اس میں ایک حریصانہ جذبہ ایک ملکیت احساس اور ایک خریدار کی سُوجھ بُوجھ تھی۔ اس کے چہرے درشتی اور اُجڈ پن صاف جھلک رہا تھا۔

اس نے فاختئی رنگ کی قراقلی ٹوپی اُتار کر ایک کھ پر لٹکا دی۔ پستول گلے سے اُتار کر چارپائی پر رکھ دیا اور چڑھا کر چوبکے پر جا بیٹھا۔ باجی نے پانی ڈالا اس نے ہات دھویا۔ نوکرانی نے لپک کر تولیہ دیا۔ باجی جبین کے پاس آبیٹھی۔ اس نے تولیئے سے منہ پونچھ کر اُسے چارپائی پر اچھ دیا اور کرسی گھسیٹ کر دونوں بہنوں کے پاس ہو بیٹھا۔

جبین نے سر جھکایا ہوا تھا شرم کے مارے اس کا لال بھبوکا ہوگیا تھا

"ہائے جبین تم شرما کیوں رہی ہو۔ یہ تو میرا دیور ا خان ہے" باجی نے اسے ٹھوکا مارا۔ "ماشاءاللہ اب تو یہ بڑی ہوگئی ہیں" اسلم نے پُر ہوس لالچی نگاہوں سے اس سراپا کا جائزہ لیا۔ جبین کی ہمت نہ ہوئی کہ ان ننگی ننگی آ سے آنکھیں چار کرے جو اس کے جسم کے آر پار ہوتی جا ہیں اور زہریلے تیروں کی طرح اس کے حساس حصوں کھبتی جا رہی تھیں۔

"اب کے جبین نے بی۔ اے کا امتحان دیا ہے" نے کہا۔

"خوب ۔۔۔ لیکن اب مزید پڑھنا وڑھنا ان کو بند کر دینا
ہے" اسلم خان نے کہا
"نہیں جی یہ تو کہتی ہے کہ ایم ۔ اے کر کے دم لوں گی"
"ایم ۔ اے کر کے بھی یہ کیا کر لیں گی ۔۔۔ شادی کے بعد
لڑکیوں کی پڑھائی نکل جاتی ہے"
اسلم خان ٹھٹھا مار کر ہنسا باجی بھی مسکرا دی ۔ جبین
ی کی طرح زرد پڑ گئی، اس کا جی چاہا کہ چارپائی سے پستول
کر اسلم خان کی چوڑی چکلی چھاتی کو گولیوں سے چھلنی کر دے
وہ پھر اس کا مذاق نہ اُڑا سکے ۔
نوکرانی دو پلیٹوں میں سرخ سرخ آم لے کر آئی ۔ اسلم
ن نے میز جبین کے سامنے رکھ دی وہ سر جھکائے بھن چکی
کی طرح اپنی اس تذلیل پر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتی
اُسے اپنے آپ پر غصہ آرہا تھا کہ وہ کئی سالوں کی مسلسل جدو
کے باوجود اپنی اس غصیلی حس کو دبانے میں ناکام رہی تھی
بھی اس کی خوداری اور نسوانی وقار پر ذرا بھی حرف آتا
بچوں والی شیرنی کی طرح غضبناک ہو جاتی ۔ کالج میں آنے
پہلے وہ اپنے ان طوفانی جذبات کے تحت روزانہ لڑائی
بنائی کرتی اپنے دشمن کی جلد کو اپنے تیز پالتو ناخنوں سے
ڈالتی ۔ لیکن کالج کے سلجھے ہوئے اور اجنبی ماحول نے اُسے
بے لگام جذبات پر قابو پانے کے لئے مجبور کر دیا تھا ۔ اب
صرف اندر ہی اندر کھولتی اور اپنے آپ سے انتقام لیتی ۔
"بھابی یہ تو کچھ ناراض ہو گئی ہیں"
"کیوں جبین کیا بات ہے"
جبین چارپائی سے اُٹھ کھڑی ہوئی ۔
"میں ابھی آتی ہوں"
غسل خانے میں جا کر اس نے چہرے پر ٹھنڈے پانی
کے چھینٹے مارے ۔ کچھ دیر رُک کر اپنے آپ کو سنبھالا اور واپس
آ بیٹھ گئی ۔ اسلم بغیر کسی قسم کا تاثر لئے نہایت انہماک سے آم
کی قاشیں منہ میں ڈال رہا تھا ۔ شام کے سائے گہرے ہو رہے
تھے اور گرمی کا زور ٹوٹ رہا تھا ۔
تھوڑی دیر بعد اسلم خان اٹھ کر حجرے میں چلا گیا ۔ جبین نے باجی سے
گھر واپس جانے کی اجازت چاہی باجی خفا ہونے لگی لیکن وہ واپس جانے
پر مصر رہی ۔ اسے اس گھر سے وحشت ہو رہی تھی اسلم خان اُسے اپنی کار میں
چھوڑنے گیا ۔ اس کا گھر قصبے کے دوسرے سرے پر دریا کے کنارے واقع تھا ۔ بجلی
کے کارخانے کی چمنی اندھیرے میں ایک خوفناک دیو کی طرح معلوم ہو رہی تھی
دریا کے کنارے بجلی کی روشنیوں کی قطار پانی میں منعکس ہو کر بڑی بھلی لگ
رہی تھی ۔ اسلم خان آہستہ آہستہ کار چلا رہا تھا ۔ جبین کار کی پچھلی نشست
پر اکڑی ہوئی بیٹھی تھی ۔ اُس نے برقعے کو اپنے جسم کے گرد اچھی
طرح لپیٹ رکھا تھا ۔ ایک نامعلوم خوف سے اس کا دل تیزی
سے دھڑک رہا تھا ۔ وہ اُسے سامنے کے آئینے میں اپنی موٹی
موٹی چمکدار آنکھوں سے گھور رہا تھا ، وہ ایک خونخوار ڈاکو
معلوم ہوتا تھا جو اُسے اغوا کئے لئے جا رہا ہو ۔ کار میں چلم کے
جلے ہوئے تمباکو اور نسوار کی سڑاند آرہی تھی ۔ فرش پر نسوار
کی پیکوں کے داغ پڑے ہوئے تھے ۔ جبین نے سوچا کہ دولت
کی فراوانی انسان کو ایک دم مہذب نہیں بنا سکتی ۔ اس کا
اُجڈپن دور کرنے میں ایک نسل کی عمر صرف کرنی پڑتی ہے
جب باہر کی روشنی کار کے اندر پڑتی تو جبین کو اسلم خان کے
ہونٹ کانپتے ہوئے نظر آتے ۔ نچلا ہونٹ عجیب خوفناک اور
مضحکہ خیز حرکتیں کرتا ۔ بالکل جاپانی پتلے کی طرح ۔ جبین کو
ایسا لگتا کہ شاید وہ کچھ کہنا چاہتا تھا ۔
"آپ کو کیسے کپڑے پسند ہیں" آخر اس کے منہ سے الفاظ
نکل ہی آئے
جبین خاموش رہی اُسے غصہ آنے لگا ۔ کمبخت کو بات
کرنے کی تمیز بھی نہیں ہے ۔
"بتائیے" وہ اصرار کرنے لگا
"سادہ"
"اچھا ۔۔۔ میں نے تو نیلون (نائلون) اور لیڈی ہملٹن
(لیڈی ہملٹن) کے رنگ برنگ کپڑے جمع کر رکھے ہیں"

"کس کے لئے"

"آپ کے لئے"

"میرے لئے۔ ہائے وہ کیوں"

"اسلم خان قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔"

جبین نے سوچا کیا گنوار آدمی ہے۔

رات بے حد گرم تھی۔ اس کے جسم کا ذرّہ ذرّہ آگ اُگلنے لگا تھا۔ پاؤں کے تلووں سے یوں لگتا تھا کہ شعلے نکل رہے ہیں۔ دریا کے ٹھنڈے پانی سے اس نے کئی بار پاؤں دھوئے لیکن ان کی جلن اور سوزش بدستور تھی۔ اُس کی بغلیں بھی دُکھنے لگی تھیں۔ حدت و تپش سے ان میں چھوٹی چھوٹی لال پھنسیاں نکل آئی تھیں۔ جبین کا جسم گرمی کے حق میں بے حد نازک اور کمزور واقع ہوا تھا۔ موسم گرما کے شروع ہوتے ہی جینے کا سارا مزا کرکرا ہو جاتا۔ ہر چیز میں یوں لگتا کہ پسینے اور خاک کا ذائقہ ملا ہوا ہے۔ اس وقت دریائی سمت سے ہوا کا ایک جھونکا بھی نہیں آ رہا تھا۔ دریا کا پانی خاموش مغموم اور بنا کسی آواز کے بہہ رہا تھا۔ سناٹے کا جادو ہر چیز پر چل چکا تھا رات جاڑے کی راتوں کی طرح گہری سیاہ نہ تھی بلکہ دُھول میں لپٹی دُھندلی سی تھی۔ ستارے بجھے بجھے اور مضمحل تھے۔ جبین اپنے لمبے چوڑے آنگن کے ایک گوشہ میں چارپائی پر کروٹیں لے رہی تھی۔ اس کی بے خواب آنکھوں میں درد ہو رہا تھا۔ ذہن پر ایک غبار چھایا ہوا تھا۔ یادیں تجربے اور مستقبل کے رنگین خواب سب گڈمڈ ہو گئے تھے۔ رفتہ رفتہ اس نے ان اُلجھے ہوئے تاروں کو الگ کرنا شروع کیا۔

آج شام کے واقعات نے اس کے خدشات پھر تازہ کر دئے تھے اسلم خان ایک مدت سے اُسے حاصل کرنے کی تگ و دو کر رہا تھا اس نے جبین کو پہلی دفعہ ایک خریدار کی نظر سے باجی کے گھر ہی میں دیکھا تھا۔ وہ ایف۔ اے کا امتحان دے کر آئی تھی۔ اس کا افغانی حسن پورے شباب پر تھا۔ وہ سفیدے کے درخت کی طرح اُونچی اور بید کے درخت کی طرح لچکیلے جسم کی لڑکی تھی۔ اس کے بدن میں کسی ٹہنی کا لوچ۔ کساؤ اور بانکپن تھا۔ اس کی آنکھیں لانبی لانبی تھیں — ان کا رنگ سنواری تھا۔ نہ سیاہ بلکہ ان دو رنگوں کے امتزاج سے ایک نیا رنگ تخلیق ہوا تھا۔ جب وہ جوش و خروش سے باتیں کرتی تو اس کی مخروطی انگلیوں کی حرکت کے ساتھ اس کی آنکھوں پر کالے اور سنوازی بادلوں کے بجرے تیرتے ہوئے نظر آتے اس کی آنکھوں سے اضطراب و کرب کی ملی جلی کیفیات ہر وقت جھلکتی رہتیں جو کسی اندرونی محرومی کی غمازی کرتیں۔

اسلم خان نے جبین کو پہلی دفعہ دیکھ کر دل ہی پکڑ لیا اور اسے حاصل کرنے کے لئے ہر طرح کے جتن کرنے لگا لیکن جبین کے ماں باپ نے بہانہ بنا دیا کہ وہ ابھی پڑھ رہی ہے جبین کی تعلیم کا مسئلہ بھی ایک سیاسی و سماجی انقلاب کی کڑی تھا۔ وہ آسانی سے کالج نہ پہنچی تھی بلکہ اس کے پیچھے پوری ایک تحریک تھی۔ یہ تحریک بڑی ہمہ گیر اور گہری تھی۔ اس کی جڑیں چینی اور تمباکو کے کارخانوں اور مردان و چارسدہ کی تجارتی منڈیوں میں گڑی ہوئی تھیں۔ یہ سرزمین جو کبھی علم و ادب کا گہوارہ تھی اور گندھارا تہذیب کا سب سے بڑا مرکز تھی اپنے کی روشنی، اہنسا کے فلسفے کا سرچشمہ تھی آج پھر صدیوں کی جہالت اور پسماندگی کے بعد آنکھیں مل کر بیدار ہو رہی تھی۔

تقسیم سے قبل اس دریاؤں اور نہروں کے بے حد زرخیز علاقے کی تجارت اور دولت بنیوں نے سنبھالی ہوئی تھی مسلمانوں میں خوش حال طبقہ صرف چند گنے چنے زمینداروں تک محدود تھا جو کسی قسم کی تجارت یا زراعت کو اختیار کرنا اپنی توہین سمجھتے تھے ان میں اکثریت ان بنیوں کی مقروض تھی تقسیم کے بعد بنیوں کی ہجرت سے ان لوگوں نے قصبائی منڈیوں کی تجارت سنبھال لی جو بنیوں کی منشی گیری کرتے تھے۔ ان لوگوں نے بنیوں کے فن تجارت کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ان کے بہی کھاتوں کے شاطرانہ قواعد و ضوابط کا

ہوشیاری سے سیکھا تھا۔ اُنھوں نے عسرت اور تنگ دستی کا
ایک طویل اور اذیت ناک جہنم دیکھا تھا۔ اب جو دولت کی
برسات ہونے لگی تو حرص نے ان کے ہاتھ پاؤں میں زنجیریں
ڈال دیں۔ کچھ مدت تک ان کی زندگی میں کوئی خوشگوار تبدیلی
نہ ہوئی۔ ان کی تجوریاں بھری جاتی رہیں۔ جب ان کو اطمینان
ہوگیا کہ یہ ساری دولت ان کی ہے، یہ ساری تجارت اُن
کے ہاتھ میں ہے اور وہ اس بازار کے مالک ہیں تو خود اعتمادی
کا احساس قوی ہونے لگا اور وہ روپے سے فراہم کی جانے
والی آسائشوں اور سہولتوں کی طرف متوجہ ہونے لگے۔ اس
نئے اہلِ ثروت طبقہ کے اکثر افراد نے چھچھورے پن کا بھی
مظاہرہ کیا۔ گھروں میں ایسی الائیں بلائیں بھر لیں جن کے
استعمال سے وہ قطعاً نابلد تھے لیکن اس چھچھورے پن کے
باوجود ان لوگوں کا رویہ زندگی کی طرف پرانے جاگیردار طبقہ
کے مقابلے میں کافی عملی اور ترقی پسندانہ ہے۔ انھوں نے دھڑا
دھڑ کاریں خریدنی شروع کر دیں۔ لمبی لمبی چمکتی کاریں گڑھ
کی غلیظ اور متعفن منڈیوں میں کھڑی ہوئی بڑی
عجیب معلوم ہوتی تھیں جیسے گودڑی کو مخمل کا پیوند لگ گیا ہو۔
کاریں اس نئے طبقے کے وقار اور اعتماد کا ایک مضبوط سمبل
بن گئی تھیں۔

جبین کا بہنوئی اکرم خان اسی انقلاب کی کوکھ سے نکلا
تھا وہ تقسیم سے قبل ایک ہندو بیوپاری کے پاس منشی تھا۔
اس بیوپاری کے چلے جانے کے بعد اکرم خان نے اپنی تجارتی
بصیرت اور تجربے سے کام لے کر آڑھت کے کاروبار کو سنبھال
لیا اور اس حسن انتظام سے پھیلایا کہ چند ہی سالوں میں لاکھوں
کے وارے نیارے ہونے لگے۔ اور ہر کاروباری حلقہ میں
اس کی مضبوط ساکھ بن گئی۔ اکرم خان کا چھوٹا بھائی تقسیم
کے وقت دس بارہ سال کا لڑکا تھا وہ جب بالغ ہوا تو زندگی
کی بہت ساری سہولتیں اس کے گھر میں موجود تھیں۔ اس
نے اپنے بھائی کی طرح تنگدستی اور کڑی محنت کا تلخ تجربہ حاصل

کیا تھا۔ اس لئے اس میں اپنے بھائی جیسی تیز حرص او[ر]
مفقود تھی وہ اپنے بھائی کی نظر میں فضول خرچ واقع [تھا]
اس نے بھائی پر زور دے کر نیا مکان بنوایا۔ کار خرید[ی]
اور بھائی کو شادی کر لینے پر مجبور کیا۔

جبین کے پڑوس میں یہ دونوں بھائی رہتے تھے
انھوں نے جبین کی باجی یاسمین کے رشتے کے لئے کہ[ا]
تو مسعود خان نے کسی حیل و حجت کے بغیر رشتہ قبول کر لیا [...]
کو نئے سماج میں دولت کی طاقت و تیور کا احساس تھا۔
وہ خود بھی تجارت کے میدان میں کودنے کے لئے پر تول [رہا]
تھا۔ اس کی تھوڑی بہت زمین تھی لیکن سال میں چا[ر]
ہوتی تھیں۔ جب سے مردان اور چارسدہ کے علاقے میں [...]
تمباکو اور دوسری چیزوں کے کارخانے قائم ہوئے [...]
ان کی فصلیں سونے کے بھاؤ اٹھنے لگی تھیں۔

جبین میٹرک میں تعلیم پا رہی تھی کہ اس کی باجی یا[سمین]
کی اکرم خاں سے شادی ہوئی اکرم خان چالیس سال کا
خشک مزاج سنکی تاجر تھا جو شباب کے گلزار سے گزر کر [...]
کے خارزار پر کھڑا تھا۔ یاسمین بہار جوانی کا ایک نو شگفتہ
پھول تھی جس کی رعنائی اور حسن اپنے اندر رنگ و بو کا
خزانہ سمیٹے ہوئے تھے لذت و انبساط کی ایک قیامت
کہ اس کے جسم میں انگڑائیاں لے رہی تھی اس کی عمر اٹھ[ارہ]
سال کے لگ بھگ تھی وہ اکرم خان کی بیٹیوں کی جگہ تھ[ی]
لیکن اس علاقے میں اسے ماں باپ کے خلاف ایک حر[ف]
بھی زبان پر لانے کا حکم نہ تھا۔ وہ تو ایک لحاظ سے خوش [قسمت]
تھی کہ کھاتے پیتے گھرانے میں پیدا ہوئی تھی ورنہ ہزار
ہزار میں اس کے ماں باپ اسے کسی کے ہاتھ بیچ دیتے
اس طرح کی اکثر فروخت شدہ لڑکیوں کا ٹھکانہ کسی چکلے [...]
کوئی غیر صحت مند تنگ کوٹھڑی ہوتی ہے۔

جبین کو اس ان میل شادی سے سخت صدمہ [ہوا]
اس واقعہ کے بعد اسے اپنا انجام بھی ایسا ہی خراب [...]

ہوا تھا۔ یاسمین نے چپ چاپ عمر بھر کی یہ پھانسی قبول کر لی۔ ان دو بہنوں کا اکلوتا بھائی نسیم اسلامیہ کالج میں تعلیم حاصل کر رہا تھا وہ یاسمین سے تین چار سال چھوٹا تھا اس نے اس شادی کی شدید مخالفت کی لیکن اس کا کوئی بس نہ چلا۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد جبین نے ماں باپ کو مجبور کیا کہ وہ اسے پشاور کالج میں داخل کرا دیں اس طرح وہ اپنی شادی کے خطرے کو مزید چند سالوں کے لئے ٹال سکتی ہے ورنہ اسے بھی کسی پختہ عمر کے بیوپاری یا تاجر سے باندھ دیا جائے گا جس کی جوانی کا سارا رس بنیوں کے بہی کھاتوں کی سیاہی بن چکا ہو گا۔ لیکن صمد خان کو یہ ہرگز منظور نہیں تھا کہ وہ اپنی جوان بیٹی کو پشاور میں اکیلا چھوڑ دیں اگر خدا نخواستہ کچھ ہو جائے تو باپ دادا کی صدیوں کی عزت ناموس خاک میں مل جائے گی مگر اسے جلد ہی احساس ہو گیا کہ حالات کا دھارا اس کی مخالف سمت بہہ رہا ہے اس سارے انقلاب کے پیچھے ایک غیر مرئی طاقت تھی جس کو اس کا جاگیردارانہ سماج میں ڈھلا ہوا ٹھس نپختہ اور منجمد دماغ نہیں سمجھ سکتا تھا۔ بیٹی بیٹے اور بیوی نے متحدہ محاذ بنا لیا تھا اس نے فتح مندانہ انداز سے شکست قبول کر لی بیٹی کو رخصت کرتے وقت شرافت و ناموس کے بڑے آدرش اس کے سامنے رکھے

جبین چھٹیوں میں گھر آتی تو باجی کے بار بار پیغام بھیجنے پر بھی اس کے گھر جانے کو اس کا جی بالکل نہ کرتا یہ بات نہیں تھی کہ اسے باجی سے محبت نہ تھی بلکہ اسے باجی کی اجاڑ صورت دیکھ کر بے حد دکھ ہوتا تھا اسے اپنے بہنوئی سے عجیب کراہت انگیز خوف محسوس ہوتا۔ ان کے گھر میں عجیب اور نئی چیزوں کا طومار لگا رہتا تھا جو باجی کا دیور اسلم خان پشاور سے خرید کر لاتا تھا۔ بجلی کی کئی استریاں صندوقوں اور الماریوں میں زنگ کھا رہی تھیں لیکن باجی کوئلوں کی استری سے جان کھپاتی۔ بجلی اور تیل کے چولہے گودام میں بھرے پڑے تھے لیکن باجی لکڑیاں پھونک پھونک کر آنکھیں دکھاتی رہتی۔ ریشمی چادروں اور مخمل کے لحافوں پر بچوں کے پیشاب کے داغ باجی کی بدسلیقی اور پھوہڑپن کی چغلی کھاتے تھے۔ ہر طرف گندگی کا میلہ لگا ہوا تھا۔ تو دو ولتوں کے اوچھے پن کی بہترین نمائش دن گھر میں ہو رہی تھی اسے باجی پر بڑا ترس آتا وہ بھولی بھالی ناتجربہ کار لڑکی زندگی کے جال میں پھنس کر کیسی بے بس لاچار اور ناتواں ہو گئی تھی۔ ہر سال اوپر نیچے بچوں کی بارش چلی آتی تھی ابھی ایک پاؤں پاؤں چلنا بھی نہ سیکھتا کہ دوسرا نازل ہو جاتا۔ چند ہی سالوں میں آدھ درجن پلوں نے گھر کا سارا انتظام درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا۔ باجی کا صحت مند جسم چھکڑا ہو گیا۔ رخسار پچک گئے آنکھیں اندر دھنس گئیں اور چہرے پر چھائیاں پڑ گئیں باجی ایک پرانی جراب کی طرح معلوم ہوتی تھی جس کا ہر حصہ لٹک گیا تھا۔

کالج میں داخل ہو کر جبین کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں اب تک وہ ایک غلیظ انڈے میں بند تھی۔ جب حالات نے اس کا چھلکا چکا دیا تو اسے معلوم ہوا کہ زندگی کتنی لمبی کتنی حسین اور کتنی رنگین تھی، جینے کا لطف تو اب آیا زندگی یہاں کچھ اتنی تیز تھی، جیسے وہ بس سے اتر کر ہوائی جہاز میں سوار ہو گئی ہو چارسدہ میں تو وقت لٹکتا رہتا تھا لیکن یہاں تو اڑا چلا جا رہا تھا۔ ہر طرف ہنگامے۔ غل غپاڑا اور زندگی کا سیلاب امڈا آتا تھا۔ جلسے۔ محفلیں۔ مباحثے۔ پکنک اور قیامت خیز عشق بازیاں —— عشق کی متاع بے بہا کی یہ ارزانی دیکھ کر جبین کی افلاطونی محبت کے تصور کو سخت صدمہ پہنچا تھا یہاں ہر لڑکی کسی نہ کسی پر مر رہی تھی۔ نہیں اپنی پرستش ہو رہی تھی۔ اپنے بت بنا کر ان کے سامنے سجدے ہو رہے تھے۔ اس پردہ دار سماج میں لڑکیوں کے عشق کی ابتدا ممیرے چچیرے اور خلیرے بھائیوں سے ہوتی اور پھر ان کے دوستوں سے دوستوں اور جلسوں سیناؤں اور تقریبوں پر آنکھیں چار ہونے والے لڑکوں تک پھیل جاتی۔ جب لڑکوں کے کالج میں کوئی مباحثہ جلسہ تقریب ہوتی تو قریب

ڑکیاں گھائل واپس آتیں دوسری صبح عشق کا بھوت
ہوجاتا۔ ان لڑکیوں کے یہ سطحی گھٹیا اور تھیٹ جسمانی عشق
بین کو سخت کراہت و نفرت ہوجاتی۔

سکول اور کالج کے ماحول میں زمین و آسمان کا فرق
ں کسی مرد کا سایہ دیکھ کر لڑکیوں کو شرم کے مارے غش
تے اور کہاں یہ حال کہ چوبیس میں سے بیس گھنٹے اس
کا تذکرہ رہتا۔ جبین اس فضا سے جلد ہی گھبرا گئی اس
اہتا کہ گھر واپس چلی جائے کم از کم وہاں سکون تو ہے۔
ذہن میں اچ اچ پر گناہ و ثواب کے دروازے
جو کسی واہیات چیز کو اندر آنے کی اجازت نہ دیتے
ین کی شرمیلی طبیعت۔ اس کے قصباتی اطوار اور لہجے اور
سے فائدہ اٹھا کر لڑکیوں نے اس کی خوب گت بنائی
ب دستور ایک چوہے جیسی لمبے منہ۔ سپاٹ چھاتیوں
ت و نزار جسم کی کالی بھجنگ لڑکی اس پر بے طرح عاشق
جب یہ خبر جبین نے سنی تو اس نے اس لڑکی کی وہ
کی کہ اسے چھٹی کا دودھ یاد آگیا۔ آن کی آن میں جبین
کالج میں مشہور ہوگئی کمزور جسم کی عاشق مزاج لڑکیاں
خائف رہنے لگیں لڑکیوں کے ایک طبقے میں اسے
ی نگاہ سے بھی دیکھا جانے لگا۔

پہلا سال تو نئے ماحول کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے۔
پ کے خراب کئے دماغ کو ٹھیک کرنے اور پرانے
سے جان چھڑانے اور کمتری کے احساسات کو کچلنے میں
وگیا اس نے اپنے کہنہ سماج کی ثقالت گھٹن اور فرقہ
عصب کو نئی زندگی کے بحر ذخار میں کھول دیا اب اس
رگی کو ایک نئے زاویے سے دیکھنا شروع کیا لیکن
عقائد و تصورات سے وہ مکمل طور پر گلو خاصی نہ کر سکی
ر پرانے معتقدات کے تصادم نے اس کا سکون قلب
لیا وہ پل صراط کی تیز دھار پر کھڑی تھی اسے معلوم نہیں
س طرف قدم اٹھائے۔ شروع میں شہری لڑکیوں کے
لئے اس کے دل میں جو نفرت کی ایک سل تھی وہ اب کھسکنے لگی۔
دوسرے سال وہ اپنی ایک ہم جماعت لڑکی کی طرف بے محابا
کھچتی چلی گئی جیسے اسے بھی سچ مچ عشق ہوگیا تھا۔ یہ عشق معمولی
نہیں تھا۔ ایک وارفتگی تھی جو والہانہ تھی۔ ایک جنون تھا
جو ناپیدا کنار تھا۔

اس کا نام نجمہ تھا۔ وہ بڑی منہ پھٹ، زبان دراز اور بیحد
حسین لڑکی تھی —— بوٹا سا قد۔ بھرا بھرا جسم۔ بانکی بانکی ادائیں۔
جب وہ چلتی تو بہت گھوڑی کی طرح پاؤں جھٹکتی اور سانپ
کی طرح بل کھاتی۔ باریک نقاب میں سے چھنتا ہوا گلابی
چہرہ کھنچی ہوئی بھنویں، بڑی بڑی سیاہ بے باک آنکھیں تازہ
زخم لئے سرخ ہونٹ —— جادو کئے دیتے تھے۔

اس کی دلکش، دلفریب اور دلدار مسکراہٹ جبین کے جسم
میں نامعلوم، بے نام خواہشیں بیدار کرتی وہ سوچتی کہ اس مسکراہٹ
کے لئے کونسا اسم صفت استعمال کرے۔ ہر طرف اس کی خاصیت
اور اثر بدلا ہوتا ہے اس مسکراہٹ میں ترغیب کا عنصر نمایاں
ہوتا اور کچھ حقیقت پسند لڑکیاں اسے "ٹھیٹ جنسی ترغیب"
کی اصطلاح سے یاد کرتی تھیں لیکن جبین کو ان کی کور ذوقی
پر افسوس ہوتا تھا۔ اس اصطلاح سے اسے کراہت ہوتی۔ جبین
ویسے اس مسکراہٹ میں ایک کشش ضرور محسوس کرتی تھی۔ وہ
گلاب گلاب نازک ہونٹ جب خمیدہ ہوتے تو ان کے حساس
کناروں پر دبی ہوئی خواہشیں کسمساتی محسوس ہوتیں اور نجمہ
کے بدن میں تھرتھری پیدا ہو جاتی۔

جبین کو نجمہ کے نظریات سے سخت اختلاف تھا وہ ایسے
ننگے الفاظ میں شاید تمام عمر اپنا تجزیہ نہ کر سکتی جیسے نجمہ اپنا
اور اپنی ہم جلیسوں کا کر کے رکھ دیتی تھی۔ نجمہ کا سب سے دلچسپ
مشغلہ دوسروں کی رسوائی تھی۔ کھود کھود اور کرید کرید کر
لڑکیوں کی عشق بازی کے متعلق معلومات فراہم کر کے رفاہ عام
کے لئے کسی بھری محفل میں بتا دی جاتی تھیں، وہ شرمیلی بھیلی
اور بزدل لڑکیوں سے سخت نفرت کرتی تھی اس کا خیال تھا کہ

جب تک ایک فطری جذبے کو ہم لڑکیاں صحیح طریقے سے نہ سمجھیں گی وقت تک مردوں کی غلامی سے چھٹکارا نہیں مل سکتا۔ اُسے راتوں کو چھپ چھپ کر خط لکھنا۔ آنسو بہانا۔ ہائے واتے کرنا۔ اختر شیرانی۔ نیاز فتح پوری۔ حجاب۔ بائرن۔ کیٹس اور شیلے کی کتابیں ڈھونڈ کر پڑھنا بہت بُرا لگتا تھا جب تصور کے یہ رنگین خواب ٹوٹ جاتے ہیں اور حقیقت ننگی اور بے حیا ہو کر سامنے آجاتی ہے تو کمرے بند کر کے کورس کی کتابوں میں فحش جنس ناول رکھ کر پڑھے جاتے ہیں۔ یہ آخر شرافت کی کونسی قدر ہے۔ ایک انتہا کے بعد یہ دوسری انتہا ہے۔

لڑکیاں اس تاک میں رہتی تھیں کہ نجمہ بہ ذات کسی کے تیر نظر کا شکار ہو تو وہ اس کے عشق کے قصے کو بانس پر چڑھا کر انتقام لیں لیکن توبہ کیجئے اُسے سارے پشاور میں کوئی لڑکا پسند ہی نہیں آتا تھا۔ اس کا قول تھا۔ "اس کمبخت شہر میں ایک سمارٹ لڑکا بھی نہیں جس سے دل بہلایا جا سکے ___ سارے کم بخت بے ہودہ ہیں اگر کوئی ناک نقشے کا اچھا ہے تو عقل کا کورا ہے اور اگر کوئی باذوق ہے تو بال بکھرائے۔ سگریٹ ہونٹوں میں دبائے ٹائی کی گرہ کھولے ہیرو بنا پھرتا ہے بخدا مجھے آج کوئی اپنے معیار کا لڑکا مل جائے تو ظالم کو ابھی لے اُڑوں سب ہاتھ ملتے رہ جائیں"

جبین نجمہ کی حد سے بڑھی بیباکی اور مردانہ قسم کی بے حیائی کو دیکھ کر حیران ہوتی اور اسے خوف بھی آتا۔ بعض دفعہ اسے یوں محسوس ہوتا کہ نجمہ کی مونچھیں نکل آئی ہوں اور اُس کا قد بڑھ گیا ہو اور وہ ایک مرد کی قوت اور اعتماد کے ساتھ اسے اپنے آہنی بازوؤں میں بھینچ رہی ہو۔ سکول میں اس نے دو ایک لڑکیوں کی طرف کشش محسوس کی تھی لیکن اب وہ اس مرحلے سے گزر آئی تھی۔ نجمہ کی بیباکی میں ایک مرد کے تیور صاف نمایاں تھے۔ اب اسے محسوس ہوتا تھا کہ اس کے ذہن کے خانے میں مرد چھپ کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اسے لڑکیوں کی آپس کی عشق بازیاں ایک مضحکہ بھاتی تھیں پھر اُسے لڑکیوں کی مجبوری اور بے بسی کا احساس ہوتا تو وہ انہیں معاف کر دیتی۔ اگر ان کو لڑکوں کی صحبت نصیب ہو تو وہ کیوں ایسی کمزوریوں میں مبتلا ہوں۔ وہ آئے دن اخباروں میں مردوں عورتوں کی جنسی تبدیلی کی خبریں پڑھتی اور اس کے دل میں خیال آتا کہ کاش نجمہ جنس تبدیل کر کے مرد بن جائے۔

نجمہ نے لائبریری سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر جبین کے کمرے میں کتابوں کا ڈھیر لگا دیا جبین نے وہ ساری کتابیں اُلٹ پلٹ کر دیکھیں لیکن اس کی سمجھ میں خاک نہ آیا اگر کچھ پلے پڑا بھی تو متوسط طبقے کی ذہنیت نے اسے قبول نہ کیا دیا۔ نجمہ کو جبین کی کُند ذہنی پر سخت افسوس ہوا لیکن وہ جبین کو چھوڑ نہیں سکتی وہ خود بھی اس کا سایہ بن کر رہ گئی تھی۔

ایک دن اس نے جبین سے کہا

"جبین بخدا اگر ایک مہینے کے اندر اندر مجھے کسی لڑکے سے عشق نہ ہوا تو بس یاد رکھو تم تختہ مشق بن جاؤ گی"

"توبہ ہے نجمہ خدا تمہیں غارت کرے بے غیرتی کی حد ہو گئی ہے"

نجمہ قہقہہ مار کر ہنسی اور نجمہ غصے سے لال پیلی ہو گئی اُس کے ذہن میں ایک غبار سا اُٹھا اور نجمہ کی مونچھیں نکل آئیں سبز سبز بال رخساروں کے گرد چمکنے لگے۔

جمعرات کی شام یا جمعہ کے دن جبین کا بھائی نسیم اس سے ملنے یونیورسٹی سے شہر آتا تھا اور اکثر جبین کو سینما وغیرہ لے جاتا تھا۔ وہ اپنے بھائی کی پر سحر شخصیت سے بہت متاثر تھی وہ کتنا بانکا سجیلا اور روشن خیال نوجوان تھا وہ بلا کا نٹ کھٹ تھا اور اگر نجمہ سے ایک دفعہ مل لے تو اس کا مزاج درست کر دے اس کے غرور کی گردن توڑ دے۔

نجمہ سے اس نے ایک دن اپنے بھائی کا ذکر کیا۔ وہ حسب معمول قہقہہ مار کر ہنسی پھر اس کے بارے میں کرید کرید کر پوچھنے لگی اور جبین کی ناک میں دم کر دیا۔ آخر اپنے کئی

وں اور طنزیہ نشتروں سے اس کے بھائی کی جادو بھری
فت کے چھلکے اُتار کر رکھ دیئے۔ جبین کو سخت صدمہ ہوا
کہ کم از کم اس کے بھائی کے بارے میں ایسی رائے قائم
یں کرنی چاہیئے تھی۔ اس کم بخت نے دوستی کا بھی کوئی پاس
کیا۔

جمعہ کے دن دسمبر کی صبح کو سورج کی چمکیلی کرنیں جب
ور کی وادی پر پھیلیں تو شہر میں زندگی دوڑ گئی۔ گرم گرم
یاں دریچوں سے نکل کر سکڑے ٹھٹھرے اجسام کو سہلانے
یں جبین آٹھ بجے تک لحاف میں دبکی رہی کہ نجمہ اپنے دامن
ں رعنائیوں اور دلکشیوں کے گلزار سمیٹے نازل ہوئی آج
ں نے سبز ساڑھی اور گلابی بلاؤز پہنا ہوا تھا۔ اس کا نازک
ک جسم اس چست لباس میں اُبل آیا تھا۔ قیامت ہو گیا
ساڑھی نے اس کے قد کو لمبا کر دیا تھا، اس نے سیدھی
نکال کر جوڑا بنا رکھا تھا اور اس میں سرخ گلاب کا
ل اُڑسا ہوا تھا۔ کانوں میں لمبے لمبے آویزے جھلملا رہے
اور ہنس جیسی سپید گردن میں سنہری لاکٹ جھول رہا تھا
ں کے چہرے پر شیریں ہمدرد اور خود سپردہ سی ملاحت چھلک
ہی تھی۔ آنکھوں کے چمکدار دریچوں سے پیار کی پھوار نکل
ہی تھی۔

جبین کے دل سے نجمہ کو دیکھتے ہی ساری میل دُھل
ئی۔

"تم مجھ سے خفا ہو گئی تھیں پیاری معاف کر دو" نجمہ
کے پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئی اور اس کی گردن پر ہاتھ
نے لگی۔ جبین اسے ایسی نگاہوں سے دیکھنے لگی جن میں
ر غصے کا عجیب امتزاج تھا۔
"اصل میں پیاری کچھ عادت ایسی بُری ہو گئی ہے
نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے دوسروں کو بُرا بھلا کہنے میں مزا
ہے"
"لیکن اپنے پرائے کا خیال تو کیا کرو"
"اسی بات کی تلافی کرنے تو آئی ہوں اور تمہارا حکم
مان لیا"
"وہ کیسے"
"تمہارے بھائی سے ملوں گی"
"اچھا جی ——اسی لئے مسلح ہو کر آئی ہو ——لیکن یاد
رکھو شکست فاش ہو گی۔ غنیم بڑا جابر اور قہار ہے"
"وقت آنے پر دیکھا جائے گا"
"اچھا دیکھ لینا"

جبین جیسی سادہ اور کم سخن لڑکی کا بھائی تو بلا کا ذہین ثابت
ہوا۔ جملہ باز ایسا کہ نجمہ کی سٹی گم ہو گئی اور ہتھ چھٹ ایسا کہ دو تین
دفعہ نجمہ کی چوٹی پکڑ کر کھینچا۔ اس نے نجمہ پر ایسی چوٹیں کیں کہ وہ
تلملا کر رہ گئی۔ نجمہ نے پہلو بدل بدل کر پینترے سوچ سوچ کر
وار کئے اس نے اپنی صنف کی روائتی کج بحثی کے سارے حربے
استعمال کر دئے لیکن توبہ کیجئے دشمن بڑا چوکس نکلا۔ ہر وار اس نے
خطا دیا اور ہر تیر کو چابک دستی سے واپس کر دیا۔ نجمہ نسیم کے وسیع
مطالعے سے سخت جھنجھلائی جو کتابیں کم بخت نے نہیں پڑھی تھیں
اُن کے مواد کے بارے میں بھی اُسے پورا علم تھا۔ ان دونوں نے
ہر موضوع اور مسئلے پر وہ دھواں دھار بحث کی وہ جھگڑے کہ
جبین نے سوچا کہ ابھی ایک دوسرے کو گریبان سے پکڑ لیں گے۔

ایک ہی ملاقات میں اس نٹ کھٹ لڑکی کی تنابیا
بندہ گئیں وہ نسیم پر بے طرح عاشق ہو گئی دوسری طرف
نسیم بھی گھائل تھا۔ اب دونوں جبین سے حال دل کہتے اور
ملاقات کی التجا کرتے جبین ان کے لئے ایک مسیحا سے کم
نہیں تھی۔

کہتے ہیں عشق اور مشک چھپاتے نہیں چھپتے لیکن
ان لوگوں نے عشق کو چھپایا ہی کب تھا نجمہ تو خود ایک چلتا
پھرتا پوسٹر تھی اس ہنگامہ خیز عشق کی خوشبو دشمن کالج
سے یونیورسٹی تک پھیل گئی۔

رفتہ رفتہ جبین کے دل میں نفرت و حسد کا جذبہ

پرورش پانے لگا ایک طرف تو اُس نے نہایت عزیز از جان سہیلی کھو دی تھی اور دوسری طرف بھائی کی محبت سے محروم ہو گئی تھی وہ دونوں اپنی تمام انفرادیت کھو کر پگھل گئے تھے اور ایک دوسرے کی شخصیتوں میں ضم ہو گئے تھے۔ اُنھیں کسی بدنامی سماجی بندھن اور محتسب کے عتاب کا ڈر نہ رہا تھا وہ جبین کو بھی بالکل بھول گئے تھے جیسے وہ ان کے لئے مر چکی تھی۔

جبین کو اب تنہائی کا شدید احساس ہونے لگا تھا وہ اُکتائی اُکتائی اور نڈھال سی رہتی۔ ایک مسلسل انتظار، ایک بے زار کن تھکن، ایک مجہول سی جھنجھلاہٹ اس کی رُوح پر ایک غبار کی طرح چھائی رہتی۔ نہ جانے اسے کس غیر مرئی وجود کس بے نام ہستی اور کس شخص کا انتظار تھا۔

گرمی کی رُت آ رہی تھی۔ امتحانوں کے ہنگامے بیدار ہو رہے تھے لیکن اس کا دل کتابوں سے اُچاٹ ہو گیا تھا۔ ایک لامتناہی سُستی اس کے بدن پر مسلط تھی۔ اس کے جسم کا بند بند تڑپتا اور چٹختا اُس کے اعصاب ایک مسلسل تناؤ سے دوچار رہتے۔ تشنگی کے جراثیم اس کے اعصاب چاٹ رہے تھے اُن کی تنابیں پتلی ہو کر بے حد نازک ہو گئی تھیں ذرا سی غیر معمولی بات اس کے سارے نظاموں کو تہ و بالا کر دیتی۔

جبین نے اپنے بھائی کو واپس لانے کی ہر ممکن کوشش کی اس نے کالج کی خوبصورت ترین لڑکیوں سے دوستی کر کے انھیں بھائی سے ملایا لیکن اس کا بھائی نجمہ کے عشق میں سراپا ڈوب چکا تھا۔ غرق ہو گیا تھا۔ جبین نے جل کر سوچا کہ اپنے ماں باپ کو بتا دے تاکہ سارا ٹنٹا ہی ختم ہو جائے لیکن پھر اسے خیال آیا کہ اس کا سخت گیر خوفناک پٹھان باپ پتہ نہیں اس کے بھائی کے ساتھ کیا سلوک کرے خرچہ بند کر دے اور اس کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو جائے اور خود جبین کو بھی اپنی تعلیم اُدھوری چھوڑ کر قید خانے میں واپس جانا پڑے اس کے بھائی کی منگنی بچپن ہی میں اس کے ماموں کی لڑکی سے ہو چکی تھی ادھر نسیم اور نجمہ شادی کا وعدہ و پیمان کر چکے تھے وہ اس

بات پر حیران تھی کہ آخر ایک پٹھان کس طرح اپنی منگیتر کو چھ
سکتا ہے کیا اس کی غیرت مر گئی۔

ایک دن اس نے بھائی کو غیرت دلائی۔ اسے پختو
دلی کی عزت کا واسطہ دیا تو اس کے بھائی نے کیسا سخت جو
دیا تھا۔

"تم نے پڑھ لکھ کر سب غارت کیا۔ یہ غیرت یہ شرا
سارے ڈھکوسلے ہیں یہ جاگیرداری دور کی قدریں ہیں۔ ز
جٹ طیاروں کی رفتار سے آگے بڑھ رہا ہے"۔

یہ الفاظ سُن کر وہ سُن ہو گئی تھی۔

ایک دن نسیم اور نجمہ نے عدالت میں جا کر شادی
جبین کو اس واقعہ سے بے حد صدمہ ہوا۔ اس کے ذہن
اپنے ماں باپ کے ہیولے اُبھرنے لگے اس خبر سے ان
کتنا شدید رنج و غم ہو گا۔ بھیا نے تمام خاندان کی اُمید
پر پانی پھیر دیا ایک حرافہ اور بدمعاش لڑکی سے شادی
تمام خاندان کی عزت کو خاک میں ملا دیا۔ دھیرے دھیر
صدمہ دَب گیا اور اپنی محرومی و مجبوری کا اذیت ناک زہر
احساس اُبھر کر اس کی شخصیت پر چھا گیا۔ وہ پرائے غم
نہیں اپنے غم سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کی
کہاں تھی وہ کدھر جا رہی تھی۔ اس بھری دنیا میں اس کا
مونس و غمخوار نہیں تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس کے
بغاوت کا جذبہ پرورش پانے لگا تو وہ سوچنے لگی اسے کا
وہ بھی نجمہ کی طرح کسی کو اپنا سکتی۔

دریائے سوات کی سبز سبز لہروں کے سینوں پر بو
دے کر آئی ہوئی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے جبین کو بیدا
کر دیا۔ جبین کا جسم چور چور تھا۔ اور ذہن میں ایک پُراسرا
شخصیت کا ہیولا اُبھر کر ناچ رہا تھا۔ اس نے بہت کوش
کی کہ اس ولا سا شخصیت کو اپنے ذہن سے نکال دے لیکن
ناکام رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ پشاور میں گزارے ہوئے لمحا
کو وہیں دفن کر دے لیکن یادیں تو کم بخت جونکوں کی مانند

ہیں انسان کے ذہن کو چوستی ہی رہتی ہیں اسے معلوم تھا کہ اب وہ پشاور اکیلی کبھی نہیں جاسکتی اگر گئی بھی تو پردہ دار کار میں شہر کے باہر سے گھوم کر واپس آنا ہوگا۔

باجی کے ہاں سے چار پانچ دفعہ اسلم خان کا پیغام آچکا تھا لیکن اس کے ماں باپ نے صاف انکار کر دیا آخر اکرم خان نے بیوپاریوں اور قصبہ کے معززین کا جرگہ بھیجا لیکن اس پر بھی جبین کا باپ اپنی بیٹی کا ہاتھ اسلم خان کے ہاتھ میں دینے کے لئے تیار نہ ہوا۔ چند دنوں بعد باجی یاسمین اپنے آدھ درجن بچوں سمیت روتی دھوتی آئی۔ باجی کے شوہر نے اسے گھر سے نکال دیا تھا کہ جب تک اپنی بہن کا رشتہ اس کے بھائی کے لئے طے نہیں کروگی اس وقت تک اس گھر میں قدم نہیں رکھو گی اس سنجیدہ صورت حال نے سب کو بیحد متاثر کیا۔ باجی تو یوں زار قطار رو رہی تھی جیسے سچ مچ اس کا سہاگ اُجڑ گیا تھا۔

جبین دو تین راتوں سے بالکل نہیں سوئی تھی باہر سورج نے زمین کو جلا کر تانبہ بنا دیا تھا اور اندر اس کے دل و دماغ میں آتش فشاں کھول رہا تھا۔

چند دن ہوئے ایک سہیلی کے توسط سے اسے پشاور کی اس دلدار شخصیت کا خط موصول ہوا تھا اس نے خط پڑھ کر رات کو پھاڑ کر دریا کے ٹھنڈے پانی میں بہا دیا لیکن خط کا مضمون اس کے ذہن کے پردے پر منقش ہو کر رہ گیا تھا۔

"تمہارے جانے پر اندھیرا تو نہیں ہوا لیکن روشنی دُھندلا ضرور گئی۔ مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ کبھی بھی اپنے دل کا حال تم سے بیان نہ کر سکا۔ میں اپنی پیشکش کو پھر دوہراتا ہوں میرا دل اور گھر کے دروازے تمہارے لئے ہر وقت کھلے ہیں ہمارے حالات ایسے ہیں کہ اب تمہیں کسی جھوٹی شرافت اور مصنوعی بدنامی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں"

جبین کو اس کی ایک ایک بات یاد آنے لگی۔ وہ کتنا نرم طبع کتنا روشن ضمیر اور کم سخن تھا اس کی باتیں آج لفظ بہ لفظ صحیح ثابت ہو رہی تھیں۔

چند دن اور اسی بے زاری اور کشمکش میں گزر گئے۔ گھر کی فضا میں عجیب کھچاؤ تھا۔ خاندان کے تمام افراد ایک دوسرے سے آنکھیں چرائے پھرتے۔ ایک دن آدھی رات کو جبین کی آنکھ کھل گئی اس کی امی ابا اور باجی برآمدے کے دوسرے سرے پر کھسر پھسر کر رہے تھے اس کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا تھا۔ آخر ابا نے ایک لمبی سانس کھینچی اور باجی کی بات مان لی۔

جبین کانپ اٹھی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی آخر ان لوگوں کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ دوسروں کی زندگی کا فیصلہ کریں۔ اب اسے کیا کرنا چاہیئے۔ خودکشی کر لے گھر سے بھاگ جائے لیکن پھر اس کا باپ اور چچے اپنی بندوقوں کو تیل دے کر ان میں گولیاں بھر کر اس دلدار شخصیت کا پیچھا کریں۔ گولیوں سے اس کے سینے کو چھلنی کر کے اپنی غیرت و عزت کو واپس لائیں گے نہیں نہیں وہ ایسا نہیں ہونے دے گی۔ اسے نجمہ کے خط کے الفاظ یاد آنے لگے نجمہ اُسے ہفتے دو ہفتے کے وقفے کے بعد باقاعدگی سے خط لکھ رہی تھی لیکن جبین نے اس کے ایک خط کا بھی جواب نہیں دیا تھا اب اسے جب جبین پر بنی ہوئی مصیبت کا حال معلوم ہوا تو اس نے پھر خط لکھا۔

"جبین پیاری!

اے کاش میرے خلوص کی گہرائی کا تم اندازہ کر سکو مجھے اس بات کا بے حد افسوس ہے کہ میں اپنی لگن میں اتنی خود غرض ہو گئی تھی کہ تمہیں اپنے ذہن کا ایک حصہ بھی نہ دے سکی تمہاری زندگی کی تاریک راہوں کے لئے کوئی چراغ مہیا نہ کر سکی"

یہ الفاظ یاد کر کے جبین چیخ اُٹھی۔

"بھابی ــــ پیاری بھابی! تمہارے ذہن کا ایک حصہ نہیں سب کچھ میرے ذہن میں منتقل ہو چکا ہے اے کاش

آقائی میر محمد حجازی
ایرانی جدید کا مشہور افسانہ نگار
ترجمہ: حسین کاظمی (علیگ)

شیریں کلا

"زندگی کا سب سے زیادہ مضبوط اور محکم ترین جذبہ، وطن کی محبت ہے"
(افلاطون)

میرا ایک دوست ہے۔ کچھ دن ہوئے اس نے ماژندران میں کچھ جائداد خرید لی ہے۔ میرے پیچھے پڑا ہوا تھا کہ دو تین دن کے لئے گاؤں چلیں اور وہاں جا کر ذرا دنیا کی فکروں سے آزاد ہوں تاکہ سکون و آرام میسر ہو۔ کہنے لگا۔ تڑکے ہی یہاں سے چل پڑیں گے۔ دوپہر تک شیریں کلا پہنچ جائیں گے۔ باقی دن کل اور پرسوں وہاں رہ کر تفریح کریں گے اور جب چاہو گے واپس چلے آئیں گے۔ شیریں کلا کی جتنی بھی تعریف وہ کر سکتا تھا اس نے کی۔ بے حد حسین اور خوبصورت جگہ ہے۔ مفرح اور روح پرور آب و ہوا اور دلفریب مناظر۔ علاوہ بریں اس نے بالائی اور قرقاول کھلانے کا وعدہ بھی کیا۔ میں ان دنوں سفر کے نام سے بھی کوسوں بھاگتا ہوں اور کسی جگہ کو بھی اپنے گھر کے گوشۂ عزلت سے بہتر نہیں سمجھتا۔ لیکن کیا کروں۔ دوست کے کہنے کو بھی تو نہیں ٹال سکتا تھا اور واقعی اُسے حق بھی پہنچتا تھا چونکہ میں بھی تو اکثر و بیشتر اُسے اپنی لکھی ہوئی کہانیاں سنایا کرتا ہوں اور وہ میری خاطر بڑے انہماک سے سُنتا رہتا ہے۔

چلے۔ لیکن گاڑی راستہ میں بگڑ گئی اور دن چھپے شیریں کلا پہونچے۔ کافی تھک چکے تھے گھوڑے بیچ کر سوئے۔ دوسرے دن صبح، ابھی سورج نکلا بھی نہ تھا کہ ہم ایک دریا کے کنار کھڑے تھے۔ نیند سے بوجھل آنکھیں اور ذوق نظارہ میں ہوئے۔ آسمان میں ایک سیاہ چادر آہستہ آہستہ سمٹ رہی ستارے جشمکیں کر رہے تھے۔ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے ٹمٹما ٹمٹما کر کہیں چھپ جاتے تھے۔ پہاڑی چوٹیاں چمکنے تھیں۔ نور کی سفید چادر بچھی جا رہی تھی، سیاہ پردے پر پڑے ہوئے تھے اور پانی کے شور کو اور بھی ڈراؤنا بنا ہوئے تھے۔ آہستہ آہستہ دُھندلے ہوتے چلے گئے اور گئے۔ ماژندران کے دیو اور بھوت پریت جن کے شاہنامہ میں پڑھا تھا سب کے سب گرانڈیل پہاڑوں درختوں اور گہری وادیوں کی صورت میں تبدیل ہو گئے جی نہیں چاہتا تھا کہ پلک بھی ماروں۔ پھٹی پھ آنکھوں سے مستقل دیکھتا رہا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا مصوری کی کوئی جھلک دیکھنے سے رہ جائے۔ رنگ بکھ پڑے تھے اور ان رنگوں میں عجیب و غریب نقش و نگا رہے تھے۔ میں دیکھ رہا تھا اور حیران و مبہوت کھڑا تھا کسی طوفان میں گھر گیا ہوں۔

اور جب سورج چمکا اور دنیا پر روشن و منور ہو گ

نے دیکھا کہ پہاڑی چوٹیوں پر دھوپ چھاؤں کا کھیل ہو رہا
سرسبز چوٹیاں سبز مخمل کی طرح نسیم صبح کے ہلکے ہلکے جھونکوں
پک رہی ہیں۔ کبھی روشن ہو جاتی ہیں اور کبھی ماند پڑ جاتی
پہاڑی درختوں پر جھومتے ہوئے درخت اس طرح ایک
ے سے چمٹے کھڑے ہیں جیسے آپس میں راز و نیاز اور
شیاں کر رہے ہوں کہ رات کے بھیدوں کو نہ کھولیں گے
کے دونوں طرف اور جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی زمین
تیوں اور بلندیوں پر رنگا رنگ پھولوں کے فرش
ئے تھے۔ سُرخ پھولوں کے درمیان، جو ہوا کے تیز
وں سے سہم کر ایک دوسرے سے ہم آغوش ہو رہے
ایک نیا گل کھلا تھا۔ ایک بڑا سا "گل آتشیں"۔ ایک بڑا
جس میں سے آگ کے شعلے نکل رہے ہوں، بدن چرائے،
سمیٹے اِدھر اُدھر لپکتا پھر رہا تھا، کبھی اس پھول پر اور
اس پھول پر۔ اور رہ رہ کر ایک ہاتھ سے اپنے لمبے
کو جو ہوا سے اُڑ اُڑ جاتا تھا اپنی پنڈلیوں تک لے جاتا

وہ ڈھیلے ڈھالے سُرخ لباس والی لڑکی چونکہ بہت
ی اچھی طرح نہ دیکھ سکا کہ صبح سویرے سبزہ و گل کے
ن کیا کر رہی ہے۔

میرے دوست نے بھی زبان کھولی اور چراگاہوں،
ن کے کھیتوں اور ریشم کے کیڑوں کی پرورش گاہوں کی
چیت کرنے لگا۔ وہ بولے چلا جا رہا تھا اور مجھے کچھ پوچھنے
ی مہلت نہ دیتا تھا۔ میں نے بھی اس کی ان باتوں پر
نہ دھرا اور محو نظارہ اپنے خیالات میں کھویا رہا اور
ی دل میں کڑھتا رہا کاش میرے ساتھ کوئی صاحب
بھی ہوتا جو میرے دل کی باتیں سُنتا سمجھتا اور میں
دل کا حال سُنا سکتا۔ میرا دل شعر و نغمہ کے لئے تڑپ رہا
ایک ایک گانے کی نمکین اور رُندھی ہوئی آواز بلند ہو کر
ڑیوں سے [illegible]

گونج اٹھیں اور فضا ایک ایسے سُرور سے معمور ہو گئی جیسے آسمان
کے معبدوں میں ناقوس بج رہے ہوں۔
دل مچلنے لگا۔ آنکھیں بند کر لیں تاکہ دوبارہ اسی دلکش
نغمہ کو سُن سکوں۔ اس مرتبہ ایک مخصوص آہنگ اور اونچے
سُروں میں ایک ایسی ہی آواز دوسری طرف سے آئی جیسے
پہلی آواز کا جواب آیا ہو۔ پھر تو دونوں طرف سے نالے بلند
ہونے لگے۔
بے اختیار ہو کر میں نے اپنے دوست سے پوچھا "کیا کہہ
رہے ہیں یہ؟"
اس نے متعجب ہو کر کہا "سچ مچ نہیں جانتے کیا؟ تم تو
اہل دل ہو!"
میں نے جواب دیا "ممکن ہے یہ صحیح ہو لیکن میں چاہتا
ہوں کہ حقیقت معلوم کروں"
دوست نے منہ کھولا ہی تھا کہ کچھ کہے لیکن ابھی کچھ کہنے
بھی نہ پایا تھا کہ اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا "خاموشی
سے سنو!"
ایک لطیف اور دلکش نغمہ سنا، جس کی لے ہوا کے چلنے
سے پنچم اور مدھم سُروں کے درمیان بھٹک رہی تھی۔ میں اس
نغمہ کے بول تو نہ سمجھ سکا لیکن دوست کی مسکراہٹ اور سر کے
اشاروں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ شعر و نغمہ کو خوب سمجھتا ہے۔
وہ نغمات سُن سُن کر مسکراتا جاتا تھا اور ان کی تانوں پر سر دھن
رہا تھا۔ آہستہ سے اس نے ڈھیلے ڈھالے سُرخ لباس والی
لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ "لیلے ایک عاشقانہ گیت گا رہی
ہے۔ گاؤں کے شاعرانہ اور غنائیہ سوال و جواب سُن کر اسے
بھی محبت کی کسی بھولی بسری یاد نے تڑپا دیا ہے۔ یہ گیت
مجھے اچھی طرح آتا ہے"
جونہی کہ لیلے کا گیت ختم ہوا۔ ایک نرم اور رسیلی آواز
فضا میں گونجی۔ دوست نے مجھے بتایا کہ یہ جو جواب دے رہا ہے
[illegible] فرحت سے۔

میں نے کہا "بات نہ کر۔ ذرا سُننے دے"

مراد گا رہا تھا اور گائیں بھی کبھی باری باری اور کبھی ایک ساتھ اپنے نغمے الاپ رہی تھیں۔ پہاڑیاں، وادیاں اور شاید پھول۔ پتے، سب کے سب اُن نغمات کا جواب دے رہے تھے اور لیلیٰ بھی خاموش نہ تھی....

میں آرکسٹرا اور سازوں کی نوک جھونک کے معنے اس روز سمجھا اور میرے عقل و ہوش اور چشم و گوش نے جوش محبت اور سوز عشق کو خوب اچھی طرح سُنا اور سمجھا۔ میں نے عہد کیا کہ اب سے آرکسٹرا کے ہر ساز کو علیحدہ علیحدہ خوب غور سے سنوں گا اور ان کے نالہ و فریاد اور ان کی زبان کو سمجھنے کی کوشش کروں گا اور سازوں کی بات چیت کو بغیر سمجھے نہ چھوڑوں گا۔

جب یہ داستان ختم ہوئی تو میں نے کہا "اب ذرا تفصیل سے مراد اور لیلےٰ کے عشق و محبت کی کہانی سُنا"۔

کہنے لگا "یہ دونوں ایک دوسرے پر عاشق ہیں اور جان چھڑکتے ہیں"

میں نے کہا "تجھے خدا کی قسم سچ سچ بتا کہ ان کی محبت کے راستے میں کون حائل ہے۔ اگر کوئی رکاوٹ ان کے درمیان ہو تو آج ہی اُسے دُور کرا اور ان کی شادی کرا دے۔ محبت کے ماروں کو زندگی بخش"۔

کہنے لگا "افسوس ان کی محبت کا مرحلہ اتنا آسان نہیں۔ ایک تیسرا عاشق اور بھی ہے"

"یعنی کیا مطلب؟"

"مراد اور رستم چچا زاد بھائی ہیں جو دونوں لیلےٰ پر مرتے ہیں۔ لیلیٰ بھی دونوں پر عاشق ہے اور ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دے سکتی۔ آج تک کوئی بھی اس گتھی کو نہ سلجھا سکا۔ تین آدمی ہیں جو عشق کی آگ میں سلگ رہے ہیں، جل رہے ہیں۔ دونوں چچیرے بھائی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔ ایک دوسرے کو مار ڈالنے کے لئے کئی مرتبہ کشتی لڑ چکے ہیں اور ایک دوسرے کو زخمی کر چکے ہیں۔ دو مہینے ہونے کو آئے کہ ان دونوں اور ان کے والدین نے آپس میں عہد کیا تھا کہ یہ دونوں کبھی کشتی نہ لڑیں گے۔ یہ لڑکی اور دونوں لڑکے دراصل کرُد قبیلہ سے ہیں جو ماژندران میں آبسے ہیں"

میں نے کہا "ذرا لیلیٰ کو بلاؤ۔ میں اس سے بات چیت کروں گا۔ بلکہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ اپنے عاشقوں میں سے کس پر زیادہ مرتی ہے۔ یا کم از کم یہ معلوم کروں کہ وہ کس کو زیادہ پسند کرتی ہے۔ اس صورت میں جس کو وہ زیادہ چاہتی ہے اس کے ساتھ اس کا بندھن باندھ دیا جائے اور اس طرح ان تینوں جوانوں کو اس آگ میں جلنے سے بچا جائے۔

لیلیٰ آئی اور بڑے متین، سنجیدہ اور متکبرانہ انداز میں میرے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ لمبا قد۔ گردن، سینہ، بازو، پنڈلیاں اور اس کے سارے اعضا ایسے، جیسے کہ وہ برابر سے ورزش کرتی ہو۔ گول مٹول ہو رہی تھی۔ بیضاوی چہرہ موٹی اور سیاہ آنکھیں، ستواں ناک، موٹے ہونٹ اور گالوں کی سُرخی میں، اس کے بدن کے صاف شفاف اور زیادہ خون کی جھلکیاں تھیں۔ لمبے، چھتنار اور گھنیرے بالوں کی ایک لٹ کو اس نے زرد ریشمی رومال سے باندھ کر گردن میں لپیٹ رکھا تھا اور ہلکے نیلے رنگ کا تنگ کرتہ پہنے ہوئے تھی۔

میں نے اس سے کہا "میں نے اسی نواح میں ایک گاؤں خریدا ہے۔ چاہتا ہوں کہ رستم اور مراد میں سے کسی ایک کو اس گاؤں کی دیکھ بھال کے لئے کارندہ کی حیثیت سے منتخب کروں۔ تیری نظر میں اس کام کے لئے کون زیادہ اچھا رہے گا؟"

جیسے وہ میری چال کو سمجھ گئی ہو مسکرائی اور کہنے لگی "میں دونوں کو ایک ہی جیسا سمجھتی ہوں"

"اچھا ان میں سے کون زیادہ طاقتور ہے؟"

"دونوں"

"ان میں سے کون زیادہ مہربان اور اچھا ہے؟"

"دونوں"

"کون زیادہ حسین اور خوبرو ہے؟"

"تمہارے خود آنکھیں ہیں۔ دیکھ لو۔ میرے لئے دونوں
کوئی فرق نہیں"

"اچھا یہ بتا کہ ان دونوں میں سے تجھے کون زیادہ
تا ہے؟"

"میں کیا جانوں۔ میں کوئی ان کے دلوں میں تھوڑا
بیٹھی ہوں۔ میں دونوں کو ایک نظر سے دیکھتی ہوں۔ برابر
ی ہوں۔ ہم تینوں بچپن ہی سے ایک ساتھ پلے بڑھے۔
یری خالہ کے لڑکے ہیں۔ دونوں میرے ساتھ ہی بڑے
ے۔ میں دونوں میں سے کسی کو بھی نہیں چھوڑ سکتی اور
نوں میں سے کسی کی بربادی بھی نہیں دیکھ سکتی۔"

"آخر کیا مطلب ہے۔ جوانوں کو شادی کرنا ہی چاہیئے
ں میں سے ایک کو اپنے لئے پسند کر لے۔ اس کے علاوہ کوئی
رہ ہی نہیں۔"

"وہ اپنی شادیاں کر لیں۔ میں شادی نہیں کروں گی۔
ں ہی کنواری مروں گی۔"

بغیر اس کے کہ چہرے کا رنگ بدلے، اس کے رخساروں
موتی ڈھلکنے لگے۔ خون دل تھا جو آنکھوں سے ٹپک رہا تھا۔

میں نے کہا "میں تو یونہی چھیڑ رہا تھا۔ وہ دونوں
ی شادی نہیں کریں گے۔۔۔۔"

لیکن میری حالت اتنی دگرگوں ہو رہی تھی کہ سلسلۂ
لام جاری نہ رکھ سکا اور گھر لوٹ آیا۔

قبیلہ کا سردار آیا اور کہنے لگا "آج ہم خان مالک
کی تشریف آوری کی خوشی میں سانڈوں کی لڑائی کا تماشا
کریں گے۔"

میں اس سے جھگڑنے لگا "آخر یہ کیا واہیات ہے۔
زمانۂ جاہلیت کی ان وحشیانہ حرکتوں اور بے رحمانہ تفریحوں
کو اب تو ختم کر دینا ہی چاہیئے۔ کتنی افسوسناک بات ہے
کہ بے گناہ اور بے زبان جانوروں کو بیدردی سے مارا
جائے۔ یہ انسان نہیں ہیں کہ ان کے دل طمع، حسد اور بغض
و کینہ سے بھرے ہوں اور اپنے وہم و گمان پر بے سبب
اور بے کار ایک دوسرے کی جان لے لیں۔ یہ جانور ہم سے
کہیں زیادہ عقلمند ہیں وہ جانتے ہیں کہ سب کو دانہ پانی میسر
ہے۔ کھاتے پیتے ہیں خدا کا شکر ادا کرتے ہیں اور محبت و
آشتی سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ شیطانی روح جو ہم میں
ہے آخر ان میں کیوں پھونکی جائے۔ میں یہ تماشا نہیں
ہونے دوں گا۔ دیکھتا ہوں انھیں کون لڑاتا ہے۔"

قبیلہ کے چودھری نے ہنستے ہوئے کہا "جناب معلوم
ہوتا ہے آپ لڑائی سے ڈرتے ہیں۔ لیکن ہمارا خان بڑا
بہادر اور دلیر ہے۔ ان چیزوں سے ذرا بھی نہیں ڈرتا۔"

"خان نے کہا "چودھری یہ یونہی مذاق کر رہے ہیں۔
سانڈوں کو ضرور لڑاؤ۔ سب تماشا دیکھیں گے۔ مجھے ان
کی لڑائی میں بہت لطف آتا ہے۔"

پھر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کمرے میں لے گیا اور کہا
"میرے بھائی۔ میں خود اس بے رحمی کے تماشہ سے
نفرت کرتا ہوں لیکن کوئی چارہ ہی نہیں۔ مجھے یہ تماشا دیکھنا
ہی پڑے گا اور اگر میں نے ایسا نہ کیا تو گاؤں والے اور
یہ سردار مجھے بزدل اور بودا سمجھے گا۔ ان پر سے میرا رعب
اٹھ جائے گا اور پھر میرا یہاں رہنا دوبھر ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "اچھا تو پھر ذرا مراد اور رستم کو بلواؤ۔
انھیں بھی تو دیکھوں" تھوڑی دیر بعد رستم آیا۔ شاہنامہ والے
رستم کی سی داڑھی اور سینگوں والی ٹوپی تو نظر نہ آئی لیکن
یہ وہی جوان رستم تھا جس نے مرکھنے ہاتھی کو مار کر قلعہ سفید
پر قبضہ کر لیا تھا۔ لمبا قد، چوڑا سینہ اور تنگ کمر۔ عین مین

مزن تھایس کی تعریف میں گیت گائے گئے ہیں لیکن یہ معلوم
نہیں کہ وہ رستم بھی ایسا ہی گبرو تھا۔ کیا اس کے چشم و ابرو
اور لب و دنداں بھی ایسے ہی حسین تھے؟ کیا وہ بھی ایسا
ہی بانکا اور سلونا تھا؟

رستم کی مسیں بھیگ رہی تھیں اور پورے بیس سال
بھر کر اکیسویں میں پڑ چکا تھا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے میں
نے پوچھا "ہاں تو شادی کرنے کا کب ارادہ ہے۔ عمر بیتی
جا رہی ہے آخر جلدی کیوں نہیں کرتے۔"

"اگر میرے بس میں ہوتا تو دو برس پہلے ہی لیلیٰ سے
شادی کر لیتا لیکن کیا کروں وہ مراد پر مرتی ہے۔"

"نہیں۔ یہ بات غلط ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ میں جانتا
ہوں کہ اگر وہ تجھے مُراد سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں چاہتی۔
اسے دونوں سے برابر کی محبت ہے۔"

کہنے لگا "آج سب پتہ چل جائے گا۔ آخری فیصلہ
ہے آج۔"

"خدا نہ کرے۔ آخر کیا ارادہ ہے؟"

"آج میں اور مراد دونوں اپنے سانڈوں کو لڑا رہے
ہیں۔ ہم نے شرط کر لی ہے کہ اگر میرے سانڈ نے اس کے
سانڈ کو مار دیا تو لیلیٰ میری اور اگر اس کے سانڈ نے میرے
سانڈ کو پچھاڑ دیا تو لیلیٰ اس کی۔ لیکن مجھے یقین کامل ہے کہ
میرا سانڈ اس کے سانڈ کو ضرور مار لے گا۔"

خبر آئی کہ مراد آ گیا ہے۔ رستم کو رخصت کیا اور مراد کو
اندر آنے کے لئے کہا۔ وہ آیا لیکن ایسا معلوم ہوا جیسے رستم ہی
ذرا صورت اور لباس بدل کر واپس آ گیا ہو۔ ہاں سچ سچ
مُراد اور رستم میں کوئی فرق ہی نہ تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ اس
سے دو مہینہ قبل پیدا ہوا ہو۔ دونوں کی مائیں سگی بہنیں تھیں
اور دونوں کے باپ سگے بھائی۔ وہ دونوں اتنے ہم شبیہ
اور اتنے اچھے تھے کہ ہزار میں نے چاہا کہ لیلیٰ کی نگاہ سے
ان میں کوئی فرق دیکھوں اور ایک کو منتخب کر لوں لیکن نہ
کر سکا۔

مراد کو بھی یہی امید تھی کہ اس کا سانڈ اس
کے سانڈ کو مار لے گا اور اس طرح وہ اپنی مراد
گا۔ میں نے جو اپنے دوست سے کہا تھا کہ سانڈ
نہیں دیکھوں گا۔ اب اصرار کر رہا تھا کہ جتنی جلدی
لڑائی شروع کرائی جائے۔

میں جانتا تھا چونکہ سانڈوں کو معلوم
عشق و محبت کی راہ میں جانبازی کرنی ہے، انھیں
وخطر نہ ہوگا۔

دو بجے کے بعد خبر آئی کہ مقابلہ کے لئے
کر لیا گیا ہے۔ چودھری کے مکان کے قریب ہی
گز زمین کا ایک ہموار قطعہ تھا۔ ایک سمت دریا
اور دوسری سمت ایک چھوٹا سا سبز پوش ٹیلا
کی لمبائی جہاں تک زمین ڈھلواں ہو جاتی تھی
قریب ہوگی۔ گاؤں والے ٹیلے کے اُوپر اور میدان
چاروں طرف۔۔ جمع ہو گئے تھے

ہم ایک ایسے ٹیلے پر کھڑے تھے جو زمین
اُونچا تھا۔ کچھ ہی لمحے گزرے تھے کہ شور و غلغلہ بلند
ایک قوی ہیکل سانڈ کے آگے آگے میدان میں دار
گایوں کا ایک گلہ ان کے پیچھے پیچھے آیا۔ رستم میدان
ایک تہائی حصہ تک بڑھ کر کھڑا ہو گیا اور تھوڑی
سانڈ کے کان اور سر کو تھپکیاں دیتا رہا۔ سانڈ
اور گائیں بھی ایک ایک کر کے زمین پر بیٹھ گئیں
گاؤں والے گردنیں اُٹھا اُٹھا کر دیکھ رہے

مراد کا سانڈ مخالف سمت سے میدان میں آتا ہے
ہو گئی لیکن مراد کا پتہ تک نہ تھا۔ آہستہ آہستہ چہ
شروع ہو گئیں وہ اپنی زبان میں باتیں کر رہے
میں نہ سمجھ سکا۔ صرف ایک لفظ "وطن" سمجھ میں آ
بار بار وہ اپنے مخصوص مازندرانی لہجہ میں دہرا

چونکہ اس وقت لفظ وطن کے استعمال کا کوئی موقع نہیں تھا اور میرے ہوش و حواس بھی گم تھے اور نگاہیں لیلیٰ پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ گردن اُٹھائے ایک حسین مرمریں مجسمہ کی طرح عورتوں کے درمیان کھڑی تھی اور پوری طاقت کے ساتھ اپنی قلبی کیفیات کو چھپا رہی تھی اور چہرے بشرے سے ظاہر نہ ہونے دیتی تھی، میں کسی سے نہ پوچھ سکا کہ اس وقت گفتگو کا کیا موضوع ہے اور وطن کے کیا معنے ہیں۔

ناگہاں مراد کا سر، سینہ اور تمام جسم میدان کے ڈھلوان حصّہ کی طرف سے اُبھرا۔ سانڈ اور گایوں کا گلّہ اس کے پیچھے تھا۔ رستم کا سانڈ آہستہ سے اُٹھا اور دہاڑا۔ گائیں بھی سب کی سب کھڑی ہو گئیں۔

مراد کے سانڈ نے ایک نعرہ لگایا۔ چند قدم آگے بڑھا اور کھڑا ہو گیا۔ پیروں کو دائیں بائیں جمایا اور سر کو ایک طرف جھکا لیا۔ رستم کے سانڈ نے حملہ کیا اور اپنے حریف تک پہنچ گیا۔ دونوں کے سر پیر ٹکرائے لیکن اس مرتبہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہوئے۔ زور آزمائی شروع ہو گئی۔ کبھی ایک قدم آگے اور کبھی ایک قدم پیچھے۔ تماشائی، عورت مرد بچے، سب پر ایک جوش طاری تھا۔ ان کے ہاتھ پیر متشنج بھی کبھی جھک جھاتے تھے اور کبھی سیدھے ہو جاتے تھے۔ لیکن لیلےٰ پر کوئی اثر نہ تھا۔ مجسمہ کی طرح کھڑی تھی۔ نہ تو حرکت کرتی تھی اور نہ اس کے چہرے سے کوئی اضطراب ظاہر ہوتا تھا سانڈ سر ٹکرا رہے تھے اور ایک دوسرے کو پیچھے ڈھکیل رہے تھے۔ ایک مرتبہ جو ریلا آیا رستم کا سانڈ پیچھے کی طرف دبتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ میدان کے سرے تک پہنچ گیا پھر اس نے ایک زبردست حملہ کیا اور مراد کے سانڈ کو ڈھلوان تک ریلتا لے گیا۔ میں مشکل نہ سمجھ سکا کہ کس طرح مُراد کا سانڈ زمین پر منہ کے بل گرا اور پھر چت ہو گیا اور اس کے پیٹ سے خون کا ایک فوارہ نکلا۔ تماشائیوں میں ایک ہلڑ مچ گیا شور و غوغا چیخ پکار اور پھر وہی وطن۔ وطن کی آوازیں آنے لگیں۔

مراد آہستہ آہستہ میدان میں آیا، ماں کی طرف پشت اور لیلیٰ کی طرف منہ۔ بلند آواز میں دیر تک کچھ بولتا رہا، اور چند مرتبہ وطن کے لفظ کو بھی دہرایا۔ پھر آہستہ سے لوٹا اور چلا گیا۔

ایک عورت اور ایک مرد جو اس کے ماں باپ تھے اس کی طرف دوڑے اور اس سے لپٹ گئے اس نے دونوں کو جھٹک دیا اور آگے بڑھ گیا۔ تماشائیوں میں پھر ایک شور بلند ہوا۔ وہی جملے اور باتیں جن میں ہر مرتبہ وطن وطن کی صدائیں گونج رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی سب کے سب جانا چاہتے ہیں تاکہ مراد کو واپس لائیں۔ لیکن انہیں اس کام میں کوئی کامیابی نظر نہیں آتی تھی۔ مراد نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ گاؤں، گھر اور ماں باپ کو چھوڑ کر مازندران سے کہیں دُور چلا جائے۔

ایکا یکی۔ پیارے مراد۔ پیارے مراد کی آوازیں فضا میں تڑپیں۔ رُندھے ہوئے گلے اور رونے کی ملی جلی آواز کے ساتھ کوئی پکار رہا تھا "پیارے مراد۔ پیارے مراد" لیلےٰ دوڑی اور مراد کی گردن میں اپنے بازو حمائل کر کے اس سے لپٹ گئی۔ اس کے جسم کے ارتعاش سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ رو رہی ہے اور تڑپ رہی ہے۔ چند لمحے اسی طرح گذرے اور پھر لیلیٰ اور مراد واپس ہوئے۔ اور بالکل ہمارے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔ مراد نے قبیلہ کے سردار سے کچھ کہا اور سردار نے بھی اس کا جواب دیا۔ اور پھر ہمیں سمجھانے کے لئے فارسی میں کہنے لگا۔

"تو حق پر ہے۔ تیرے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ لیکن اس کے بدلے میں خدا نے تجھے تیری لیلیٰ سے ملا دیا ہے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے وہ تیری ہو گئی ہے۔ لیلیٰ ایسے سو سانڈوں کی قیمت سے بھی کہیں زیادہ قیمتی ہے۔"

چاروں طرف سے خوشی کے نعرے بلند ہونے لگے۔

میں نے کہا "سردار۔ خدا کے لئے جلدی کر۔ ساری داستان سُنا۔ آخر کیا ہوا۔ ہم بھی تو سنیں"

سردار نے کہا "رستم نے دانستہ یا نادانستہ مراد کے ساتھ دھوکا کیا۔ اُصول یہ ہے کہ لڑانے والے سانڈوں کو اپنی گایوں سمیت ایک ساتھ دونوں طرف سے میدان میں آنا چاہیئے۔ لیکن رستم کا سانڈ آدھا گھنٹہ قبل میدان میں آگیا تھا اور اس طرح اس نے زمین پر "وطن" کر لیا تھا۔ سانڈ جہاں بیٹھ جاتا ہے وہاں وطن کر لیتا ہے۔ لڑائی کے وقت وطن کی حفاظت کے لئے اس میں دس گنا طاقت آجاتی ہے اور پھر کسی سانڈ کی طاقت نہیں کہ اسے شکست دے سکے۔ تماشائیوں کی چیخ پکار اسی لئے تھی اور چونکہ مُراد کے ساتھ فریب کیا گیا تھا وہ مازندران کو چھوڑ کر کہیں اور چلا جانا چاہتا تھا۔ اگر رستم کا سانڈ وطن نہ کرتا تو مراد کا سانڈ پہلے ہی حملہ میں اس کا پیٹ پھاڑ چکا ہوتا۔ رستم نے بے ایمانی کی۔ خدا نے مراد اور لیلےٰ کے دلوں کو ملا دیا۔"

میرے اصرار پر اسی رات جشن عروسی برپا کیا گیا۔ صبح تک رقص و سرود کی محفل جمی رہی اور سب خوشیاں مناتے رہے۔ اور میں بھی سرور و شادمانی سے سرشار ہو رہا تھا۔

اس عیش و کامرانی کی حالت میں' میں نے سنا اور دیکھا کہ دنیا کی ساری مخلوق، چاند، ستارے، فرشتے اور دنیا کا ذرہ ذرہ وطن کی محبت میں تالیاں بجا بجا کر محوِ رقص ہے تاریک زندگی جگمگا اُٹھی تھی۔

میرے سارے شبہات دور ہو چکے ہیں۔ اب میں سمجھ چکا ہوں کہ مجھے اپنے وطن سے اتنی محبت کیوں ہے۔ اب میں جان گیا ہوں کہ مادرِ کائنات نے اس محبت کو اپنے دودھ میں گھول دیا ہے۔ اگرچہ میں پڑھ چکا تھا لیکن آج اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ حُبِّ وطن وہی جذبہ اور علاقہ ہے جو کسی کو اپنے آشیانہ اور مسکن سے ہوتا ہے۔ جو ساری دنیا پر چھایا ہوا ہے اور کوچہ، محلہ، شہر اور ملک کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اب میری سمجھ میں خوب اچھی طرح آچکا ہے کہ افلاطون نے کیوں کہا تھا کہ "زندگی کا سب سے زیادہ مضبوط اور محکم ترین جذبہ، وطن کی محبت ہے" یا آج کل دنیا والے اپنے اپنے وطن پر کیوں جان دیتے ہیں۔

اصغر گونڈوی (بقیہ ص ۱۹)

ڈھونڈیئے تو ایک اصغر اور دوسرے شاید مولانا اسمٰعیل میرٹھی ہی ملیں گے۔ میں یہ بات طنزاً نہیں کہہ رہا ہوں، آپ اصغر کے مجموعہ کلام "نشاطِ روح" میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریظ دیکھ لیں، وہ لکھتے ہیں:۔

"میں نے یہ مجموعہ بیدلی کے ساتھ اٹھایا تھا
لیکن جب رکھا تو اس اعتراف کے ساتھ کہ
اُردو میں ایک شاعر موجود ہے جس کی موجودگی
سے میں اس وقت تک بے خبر تھا۔ میری نگاہ
نکتہ چینی میں کوتاہی نہیں کرتی، میں معیار کی
پستی پر کسی طرح اپنے آپ کو راضی نہیں کر سکتا"

وغیرہ ——

اب آپ اپنا آخری فیصلہ دینے سے پہلے ایک بات خیال رکھیں اور وہ یہ کہ ایک طرف تو معیار کی بلندی اور سنجیدگی ہے جس میں شخصیت کا پتہ نہیں چلتا، دوسری طرف شخصیت کا وہ لااُبالی اظہار ہے جو اکثر رومانی شعرا کی خصوصیت ہے اور شعری حقیقت بین بین ہے۔

کرشن چندر کی تجویز پر

محترمی تسلیم!

ایک پاکستانی کرم فرما کی عنایت سے 'ہم قلم' کا دوسرا شمارہ دیکھا، اور دیکھ کر خوشی ہوئی۔ 'ہم قلم' نام بھی اچھا ہے پہلا شمارہ تو دیکھا نہیں، لیکن یہ تو خاصا کامیاب ہے۔ یقین ہے کہ رسالے کے موجودہ معیار ہی پر آپ قناعت نہ کریں گے، اور 'ہم قلم' کے آئندہ شمارے، صوری و معنوی اعتبار سے، اور بھی بہتر ہوں گے۔

پیش نظر شمارے میں کرشن چندر کا خط، اور اس خط کے متعلق آپ کے تاثرات پر ہندوستان و پاکستان کے ادیبوں اور مصنفوں کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے۔ اس باب میں اختصار کے ساتھ اپنے خیالات پیش کر رہا ہوں۔

(۱) کرشن چندر نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ

"اُردو ادب کے لئے ایک بین الاقوامی انعام ہر سال دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام بوجوہ پاکستان ہی کر سکتا ہے"

یہ ایک مبارک اور نیک خیال ہے۔ کسی کو بھی اس سے اختلاف نہیں ہو سکتا کہ "اُردو کی بہترین کتاب" کے مصنف کو، بلا تفریق قومیت، ہر سال ایک بین الملکتی انعام دیا جائے۔ اُدب کی ترقی اور ادیب کی فلاح کے لئے اس طرح کی ہمت افزائی ضروری ہے۔ لیکن یہ کام صرف پاکستان ہی کیوں کر سکتا ہے؟ اور ہندستان کیوں نہیں کر سکتا؟ — جہاں کی چودہ قومی زبانوں میں اُردو کو بھی تسلیم کیا گیا ہے، اور جہاں تیرہ قومی زبانوں کے ساتھ ساتھ اُردو کی "بہترین کتاب" کو بھی ہر سال پانچ ہزار روپے کا انعام دیا جاتا ہے۔

یہ تجویز اس طرح اگر پیش کی جائے تو مناسب ہے کہ برصغیر کے ادیب و مصنف اجتماعی طور پر دونوں ملکوں سے مطالبہ کریں کہ "اُردو کی بہترین کتاب" کو ہر سال، بلا تفریق قومیت، ایک بین الملکتی انعام دیا جائے۔ انعاموں کی تعداد اگر بڑھا دی جائے، اور کئی کتابوں کو درجہ بدرجہ انعامات دئے جائیں تو بہتر ہے۔ انعاموں کی مجموعی رقم اور اس سلسلے کے اخراجات دونوں ملکوں کی حکومتیں مساوی طور پر برداشت کریں۔ بنگلہ، پنجابی، اور سندھی کے متعلق بھی یہی مطالبہ کرنا چاہیئے۔

گلڈ کی مجوزہ انعامی اسکیم کا اجمالی ذکر میں نے پاکستان ہی کے کسی رسالے میں دیکھا تھا۔ تفصیلات سے

میں واقف نہیں ہوں۔ لیکن موجودہ حالات میں اس کو صرف پاکستانی مصنفوں تک محدود رہنا چاہیئے۔ اس کو وسعت دے کر ہندستانی مصنفوں کو بھی اس میں شریک کرنا، ناممکن العمل ہی نہیں بلکہ نامناسب بھی ہے۔

(۴) بین المملکتی اردو کانفرنس کا خیال یقیناً مستحسن ہے۔ یہ کانفرنس وقت کے بہت بڑے تقاضہ کو پورا کرے گی۔ اس کا اہتمام ضرور کیجئے۔ مجھے یقین ہے کہ اُردو کا ہر ہندستانی ادیب، اور مصنف بھی اس کو خوش آمدید کہے گا۔ تجربہ یہ ہے کہ مل بیٹھنا کبھی بھی رائیگاں نہیں جاتا۔ اس سال کے اوائل میں ہندستان و پاکستان کے ادیبوں کی چھوٹی سی کانفرنس جو لاہور میں ہوئی تھی، اس سے کم از کم مجھے تو بے حد فائدہ ہوا۔ بہت سے شکوک رفع ہوئے، بہت سی نئی باتیں معلوم ہوئیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پاکستان کے علمی و ادبی رجحانات سے بھی بہت کچھ شناسائی ہوئی۔

اس کانفرنس سے لوٹنے کے بعد، میں نے کوشش کی کہ اسی نوعیت کی ایک کانفرنس، لیکن وسیع تر پیمانے پر، یہاں منعقد کی جائے، جس میں اُردو کے علاوہ بنگلہ، پنجابی، سندھی، اور انگریزی کے مصنفین کو بھی شرکت کی دعوت دی جاسکے۔ اس کے لئے ایک کمیٹی بھی بن گئی ہے، جس کے صدر ڈاکٹر تاراچند ہیں۔ اُمید ہے کہ اواخر مارچ یا اوائل اپریل ۱۹۶۱ء تک یہ کانفرنس منعقد ہو سکے گی۔ ہمیں یقین ہے کہ اس سلسلے میں پاکستانی مصنفین کا گروہ عموماً اور آپ کا گلڈ خصوصاً ہم سے بیش از بیش تعاون کرے گا۔

اس طرح کی کانفرنسیں، جیسی کہ ہمارے اور آپ کے پیش نظر ہیں، اس حالت میں زیادہ مفید ثابت ہوسکتی ہیں، جب کہ زیادہ سے زیادہ ادیبوں اور مصنفوں کو شریک ہونے کا موقع دیا جائے۔ اس سلسلہ میں حسب ذیل سہولتوں کا مہیا کرنا ضروری ہے:۔

الف ۔ دونوں ملکوں کی حکومتیں پاس پورٹ اور ویزا آسانی، بلکہ فیاضی سے دیں۔

ب ۔ دونوں ملکوں کی حکومتیں ریل کے سفر کی وہ رعایت دیں، جس کے مطابق ایک طرف کے کرائے میں دونوں طرف کا سفر ممکن ہو سکے۔

ج ۔ زرمبادلہ کی مقررہ تعداد میں کچھ اضافہ کیا جائے، تاکہ سفر بہ آسانی کیا جاسکے۔

د ۔ زرمبادلہ کی قلت کے پیش نظر میزبان ملک غیر ملکی ڈیلی گیٹوں کے قیام و طعام کے انتظام کی ذمہ داری لے۔

ہ ۔ جن لوگوں کو مدعو کیا جائے، ان کے علاوہ جو ادیب یا مصنف کانفرنس میں شرکت کا خواہش مند ہو، اس کو ڈیلی گیٹ تسلیم کیا جائے۔ بہتر تو یہ ہے کہ پہلی کانفرنس میں مدعو کسی کو بھی نہ کیا جائے، بلکہ "یاران نکتہ داں" کے لئے "صلائے عام" ہو، اخبار و رسائل میں ایک عام دعوت نامہ شائع کیا جائے۔ جو صاحب کانفرنس میں شرکت کے خواہشمند ہوں وہ اپنے ارادے سے اپنے ملک کی کمیٹی کو مطلع کریں، اور ساتھ ہی مقررہ ڈیلی گیشن فی بھیجدیں۔

و ۔ ہر وہ ادیب جو کم از کم ایک کتاب کا مصنف یا مؤلف ہو، کانفرنس میں شریک

ہونے کا مستحق سمجھا جائے۔

آپ کی مجوزہ اُردو کانفرنس کا جہاں تک تعلق ہے، ہندستان میں اس کا کام دو طریقوں سے انجام پاسکتا ہے۔ ایک صورت تو یہ ہوسکتی ہے کہ ایک بڑی سی کمیٹی بنا دی جائے جس میں ہر مکتب خیال کے نمائندے ہوں۔ دوسری شکل، جو مناسب اور عملی بھی ہے، یہ ہوسکتی ہے کہ ساہتیہ اکیڈیمی، یا کونسل فار کلچرل ریلیشن کو اس کام کا ذمہ دار قرار دیا جائے۔ ان دونوں اداروں کو ملک کے تمام سربرآوردہ ادیبوں کے ساتھ ساتھ حکومت کا نیز انجمن ترقی اردو کا تعاون حاصل ہے، اور چوں کہ ان کے دفاتر دہلی ہی میں ہیں، اس لئے ان کی وساطت سے کام آسانی و سہولت سے ہوسکتا ہے۔

(۳) ایک اور معاملے کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں، جسے ہندستان و پاکستان کی علمی و ادبی زندگی کا سب سے بڑا المیہ کہنا غلط نہ ہوگا۔ اور وہ یہ ہے کہ علمی و ادبی ہم سفر ہونے کے باوجود ایک دوسرے کی علمی و ادبی سرگرمیوں اور ادبی تحریکوں سے ہم بڑی حد تک بے خبر رہتے ہیں۔ جو علمی، ادبی، تاریخی اور فنی کتابیں پاکستان میں چھپتی ہیں، عموماً ہم کو ان کا حال نہیں معلوم ہوتا، اور اگر کبھی کسی کتاب کا حال معلوم بھی ہوتا ہے، تو اس وقت جب کہ وہ باسی ہو چکی ہوتی ہیں۔ پاکستانی دوستوں کا بھی یہی حال ہے، زرمبادلہ کے قیود اگر نہ ہوں تو صورت حال یقیناً بہتر ہوسکتی ہے۔ لیکن موجودہ حالت میں ہندستان و پاکستان کے وہ علمی ادارے، جو "صاحب رسالہ" بھی ہیں، اس تاریکی کو، کم از کم، دُھندلکے میں تبدیل کرسکتے ہیں۔ میری تجویز ہے کہ ہر تیسرے مہینے "ہم قلم" میں، کم از کم، اہم اور قابل ذکر پاکستانی مطبوعات کی فہرست شائع کی جائے۔ اسی طرح انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالہ "اُردو ادب" میں ہندوستانی مطبوعات کی فہرست چھاپی جائے۔ اس فہرست میں حسب ذیل تفصیلات درج کی جائیں۔

نام کتاب نام مصنف موضوع حجم قیمت پتہ

اسی طرح سے، ایک دوسرے کی ادبی و علمی کتابوں سے اگر ہم "صورت آشنا" نہ بھی ہوسکیں، تو بھی ان کے ناموں سے تو "گوش آشنا" ہو ہی جائیں گے۔ اس کے بعد ممکن ہے کہ کچھ خوش نصیب حضرات اپنے اپنے ذوق کی کتابیں حاصل کرنے کا کوئی جتن کرلیں۔ پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ "مصنفین کی سطح" پر کتابوں کے ایک ایک نسخے کا تبادلہ ہوجائے۔

عدم تعارف کے باوجود، "ہم قلم" ہونے کے رشتے سے، اس طویل خط کے لئے معذرت خواہی کرنا میں غیر ضروری ہی نہیں بلکہ نامناسب اور بے موقع سمجھتا ہوں۔ فقط

ایک ہم قلم
محمد عتیق صدیقی

اس سلسلے پر اظہار خیال کی صلائے عام ہے۔ امید ہے "سالگرہ نمبر" میں ایک مربوط پالیسی طے کر کے اعلان کر دیا جائے گا۔ (ایڈیٹر)

میر عبدالحسین سانگی
مترجم۔ خاور نگرامی

قصیدہ بہاریہ

کر عطا ساقی شراب ارغوانی خوشگوار
گلشنِ اُمید میں ہے آمدِ فصلِ بہا

دے شراب پُرتگالی کا مجھے لبریز جام
میکدے میں آجکل حاصل ہے تجھ کو اقتدا

بُلبلوں کے دم سے ہیں یہ چہچہے گُلزار میں
شاخساروں پر شگفتہ پھول ہیں مثلِ نگا

ہے معطّر یاسمین و نسترن سے گُلستاں
کر دیا دستِ صبا نے جامۂ گل تار تا

عکسِ نیلوفر سے ہے صحنِ چمن بھی نیلگوں
زعفران و ارغواں پر دیدۂ نرگس نث

ہے نظر سورج مکھی کی آج سورج کی طرف
ہے ابھی سے سوسن و ریحاں کو شب کا انتظ

آبروئے باغباں افزوں ہو یا رب دن بدن
سبزہ زاروں میں ٹہے یوں ہی خراماں جوئبا

گلشنِ تقدیر میں بُلبُل کا سکّہ ہے رواں
فوج ہے پھولوں کی گلشن میں قطار اندر قط

باغ میں مہکی ہوئی ہے آج بُوئے بید مشک
فیضِ داؤدی سے ہیں نادار بھی دینار دا

ہو گیا رنگینیٔ لالہ سے گلشن سُرخ سُرخ
آم کے پھولوں کے سر باندھے گا سہرا کو کنا

ہے تری بُوئے عرق صد غیرت آب گلاب
پڑ گیا پیلا گلِ احمر کا رنگ اسے گُلعذ

آج ہے گلشن کا گلشن وَجد میں آیا ہُوا
سرو پر کرتی ہیں کو کو قمریاں بے اختیا

ساز اب اپنا اُٹھائیں مُطربانِ خوش گلو
آ گئی لے کر عروسِ گُلستاں چنگ و دت

مجھ کو اے ساقی ترے رخسارِ احمر کی قسم
باعثِ رنگینیٔ گلشن ہوا رنگِ ا

گرمیٔ محفل کا ہے اَب یہ تقاضہ دَم بدم
شاعرانِ سندھ کی غزلیں سُنائیں بار

سب سے پہلے چھیڑیئے حضرت گدآ کی اک غزل
جو کہ ہیں اس وقت اقلیمِ سخن کے تاجد

جن کی ہے ذاتِ گرامی ابرِ نیسانِ سخن
ہیں بھرے چشمِ غزل میں گوہرانِ آبدا

قادری دعوٰی و میمن و دل شور میں
جانِ بزمِ شاعری شاعر ہیں کُل تین چا

شاعرِ عالی نظر اُستاد ہیں مرزا قلیچ
سر زمینِ شعر پر حاصل ہے جن کو اختیا

حیدری کی نظم کو گائیں بہ اندازِ غزل
شاعری کی بزم میں یہ شخص ہے یاروں کا یار

سچل سرمست کی اردو شاعری

سندھ کا علاقہ اپنی قدامت کے اعتبار سے تاریخ میں
تقل مقام رکھتا ہے اس علاقے میں بیسیوں انقلابی
انوں نے جنم لیا ہے۔ سندھی زبان دنیا کی قدیم ترین
ں میں سے ایک ایسی زبان ہے کہ جو نو سو سال سے اپنی
علمدہ دنیا آباد کئے ہوئے ہے۔ سندھی زبان کی تاریخ
ہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس زبان کے ابتدائی تین چار سو
صرف 'بولی' کی صورت میں گزارے یعنی یہ کہ تحریر میں
ن باقاعدہ طور پر ادھر چار، پانچ سو سال میں آئی۔ اس
پہلے سندھی اپنے بولنے والوں کے سہارے چلتی رہی اس
پر یہ اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ سندھی میں حلاوت
ی اور کشش اس درجہ ہے کہ لوگ اس کو اپناتے چلے
اور اتنا اپنایا، کہ یہ بولی ایک زندہ زبان کی صورت
پنی ایک مستقل حیثیت بنا کر رہی۔ شاہ عبداللطیف
ی کے دور حیات سے ایک سو سال قبل سندھی زبان
شیدائیوں نے کچھ مذہبی کتابیں تصنیف کیں۔ سندھ میں
ب کا غلبہ ہمیشہ رہا ہے یہی سبب ہے کہ عربی اور فارسی
کو پچھلے دور میں تقریباً دو سو سال تک سندھی سے
مقبولیت حاصل رہی۔ سابق سندھ کے علما کی لاتعداد
نیف عربی اور فارسی زبان میں موجود ہیں۔ ایک دور ایسا
آیا کہ علما کو اپنی علاقائی زبان سے کہیں زیادہ عربی اور

فارسی سے شغف تھا خود شاہ عبداللطیف بھٹائی کو ابتدائی
زمانے میں عربی اور فارسی کے مطالعہ سے بہت دلچسپی رہی ہے۔
شاہ صاحب کو کیوں کہ اپنے علاقے اور اپنے علاقے کے
غریبوں سے غیر معمولی لگاؤ تھا اور وہ سب سندھی زبان ہی
سے آشنا تھے اس سندھی زبان سے جو دیہاتوں اور قصبوں
میں ایک بولی کی حیثیت سے رائج تھی اور جس میں شاعری
نیز ادب کی زبان کی کیفیت قطعاً نہیں تھی۔ شاہ کے دردمند
دل سے جو نغمے پیدا ہوئے انھوں نے اس زبان کو ایک
سحر انگیز کیفیت کی لذت سے آشنا کیا۔ پھر یہ زبان آہستہ
آہستہ شاہ کے سحر آفرین نغمات کے سہارے دلوں میں گھر
کرتی چلی گئی اور سندھی زبان ہر کس و ناکس اور ہر خاص
و عام میں مقبول ہو کر رہی۔ عربی اور فارسی کا غلبہ کم ہوتا
گیا اپنے دیس کی زبان بتدریج رواج پانے لگے۔ شاہ کے
کلام کی خصوصیات پر تبصرہ فی الوقت ہمارا موضوع نہیں ورنہ
اس کے اثرات اور محاسن پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن
یہ حقیقت ہے کہ سندھی شاعری کو زبان و بیان کی کیفیات
سے شاہ صاحب ہی نے آشنا کیا ہے۔ شاہ کا دور یکسر
مذہبی اور اسلامی دور کہا جا سکتا ہے۔ حمد و ثنا، تصوف
کے مسائل، عبادت یہی موضوعات ہمیشہ گفتگو کا موضوع
رہے ہیں یہی سبب ہے کہ پیری مریدی کا سلسلہ اب تک

وادیٔ مہران میں دوسرے علاقوں کی بہ نسبت کچھ زیادہ عام ہے ہر شہر میں پیروں کے مزارات موجود ہیں کوئی نہ کوئی عرس ہوتا رہتا ہے۔ سچل سرمست نے بھی اسی دور میں آنکھ کھولی اور پرورش پائی۔ شاہ صاحب کے نغمات کا فیض سندھ کے گوشہ گوشہ میں پہنچ چکا تھا۔ سچل بھی ایک طور پر شاہ کے عقیدت گزار ہی کی حیثیت سے سامنے آئے سچل کے دماغ کی ابتدائی نشوونما میں شاہ کے افکار کا تاثر شامل ہے بلکہ ابتدا میں مسلک اور عقیدہ بھی وہی رہا کہ جس کی ترویج و اشاعت شاہ نے اپنے کلام کے ذریعہ کی تھی۔ سچل سرمست درویش صفت طبیعت لے کر آئے تھے لیکن کسب علم، جستجو اور تلاش کا جذبہ چین لینے نہیں دیتا تھا۔ مختلف علم کے حصول کا بے پناہ شوق تھا۔ سچل کی شاعری کے بالاستعیاب مطالعہ سے یہ اندازہ بآسانی کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی شاعری کو ایک علحدہ ڈگر پر ڈالنا چاہتے تھے۔ شاہ کے پیش رو اور مقلدین کے افکار کی ایک ہی سطح تھی اور ایک ہی وضع، تصوف اور معرفت الٰہی اس دور کی پوری شاعری کا محور تھی۔ سچل بھی اس مخصوص روش سے علیحدہ نہیں رہ سکے۔ مگر انداز فکر، میں کچھ تبدیلی ضرور پیدا کرنے کی کوشش کی۔

سچل سرمست کو بعض تنگ نظر سندھی اہل قلم ابن الوقت اور 'فراڈ' جیسے خطابات سے یاد کرتے ہیں یہ وہ اہل قلم ہیں کہ جو سندھی زبان کے علاوہ کسی دوسری زبان کو سیکھنے، سمجھنے کو کفر کے مترادف تصور کرتے ہیں۔ سچل سرمست کیونکہ سندھی اور سرائکی کے علاوہ اُردو اور فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے ان کی یہی خوبیاں چشم اغیار کے لئے سرمہ بنتی جا رہی تھیں۔ سندھ میں اب تو خیر اُردو سے غیر معمولی لگاؤ اور دلچسپی پیدا ہو گئی ہے سندھی اہل قلم اُردو میں بھی کافی مہارت حاصل کر چکے ہیں۔ جن میں شیخ ایاز۔ شیخ عبدالرزاق راز۔ بشیر مورریانی۔ ڈاکٹر ابراہیم خلیق۔ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ پیر حسام الدین راشدی۔ رشید لاشاری۔ اور لطف اللہ بدوی کا شمار اُردو کے معیاری ادیبوں اور شاعروں جا سکتا ہے لیکن جس زمانے میں سچل سرمست نے میں شاعری کی اس کو سچل کا معجزہ سمجھنا چاہیئے اور یہ اس دَور کی بات ہے کہ جب وادیٔ مہران میں اُردو بولنے یا سمجھنے والوں کی تعداد غالبًا پانچ فیصد زائد نہ ہوگی۔

اُردو کے ابتدائی شاعروں میں عمومیت سے، خسرو، بحری اور ولی دکنی کا نام لیا جاتا ہے حالانکہ اُردو کی ایسی ابتدائی صورت تھی کہ جس کے نکھرنے سنورنے میں تقریبًا پچاس سال کا فاصلہ طے کرنا پڑا کے بعد 'اُردو، شاعری' کی کوئی دلآویز شکل بن سکی یہی ہے کہ خسرو، بحری، اور ولی دکنی کی شاعری اُردو میں ہوئے بھی کچھ اجنبی اجنبی سے معلوم ہوتی ہے مگر حیرت کی ہے کہ سچل سرمست کی اُردو شاعری، بے ساختہ اور ہے' ان کے اشعار کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انتہائی بے تکلفی کے ساتھ اپنی باتیں اشعار کے سانچے میں ڈھالتے چلے جاتے ہیں مثلاً

اے دوست میرے دل کو تیر نظر لگا ہے
میری یہی صدا ہے اک جانتا خدا ہے

حق پاک ہے حق پاک ہے حق خالق افلاک ہے
گہ خورم و بیباک ہے گہ خود بخود غمناک ہے

اُردو شاعری میں میرؔ صاحب کے عطار کے لونڈے نے اپنی ایک جگہ بنالی ہے بلکہ یوں کہیے کہ اُردو غزل میں عورت سے کچھ ساز باز کی باتیں ہونی چاہیئے تھیں ایک خاص قسم کے 'مردانہ عشق' کی نذر ہو گئی چنانچہ میرؔ کا چھوڑا ہوا 'شوشا'، مستقل محبوب کی صورت اختیار کر سچل سرمست کا محبوب بھی سندھ کا سانولا سلونا لڑکا ہے

لیے ارباب سندھ کے ذوق میں ڈھلے، کو اب تک ایک خاص درجہ حاصل ہے۔ بیکل نے اپنے دلبر کی شان میں لاتعداد شعر کہے ہیں یہاں مثال کے طور پر چند شعر درج کئے جاتے ہیں ؎

دلبر کے در پہ میں تو دیوانہ ہو رہا ہوں
یارو، میں دو جہاں سے بیگانہ ہو رہا ہوں

کس کو میں یہ سُناؤں وہ یار ہے خیالی
پُوچھے نہ حال میرا، کیوں دوست لااُبالی
آنکھوں میں اس کی کاجل ہاتھوں پہ اُسکے لالی
پیتا ہے خوب بھر بھر وہ جام پُر پیالی
کرکے وہ ناز و عشوہ عشاق میں ہے آیا
مدہوش ہو رہا ہوں دیکھو یہ چشت چالی

ہاتھ پر لالی لگائی آج کیا اسرار ہے
عاشقوں کا قتل ہوگا خوں بھری تلوار ہے

شمشیر تیری عریاں خوں ریز ہے اے دلبر
تیرا لم کے آگے عاشق ہوا فنا ہے

ملنے کو تیرے دلبر، میں منتظر ہوا ہوں
بے زر غلام تیرا، میں سر بسر ہوا ہوں

مندرجہ بالا اشعار میں بیکل سرمست اپنے محبوب مختلف خصوصیات کے مرقع نگار کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں ان کے یہاں شاعری کا محور صرف ان کا دلبر ہے یا پھر کہیں کہیں ایسے اشعار غزلوں ہی میں آجاتے ہیں جنہیں حمد یا نعت کا عنوان دینا چاہیئے۔ دراصل وہ اپنے خیالات کو اُردو شعر کے سانچے میں ڈھالنے پر

تو قادر تھے مگر خیالات کی علٰحدہ علٰحدہ ترتیب و تہذیب پر دسترس حاصل نہ تھی یہی وجہ ہے کہ ایک ہی غزل میں دلبر کا قصیدہ بھی ہے اور نبی کی مدح بھی۔ ایک غزل حمد کے مطلع سے شروع ہوتی ہے درمیان میں دلبر صاحب تشریف لے آتے ہیں اور پھر ایک شعر، صاحب لولاک، کے وصف میں بھی بیان ہو جاتا ہے ؎

گر وحی کو فرمان ہوا مرے دوست پیارے کو بلا
صد ناز و عزت سے چلا وہ صاحب لولاک ہے

اس آوارہ خیالی کا ایک خاص سبب یہ بھی ہے کہ بیکل کی تعلیم میں تصوف کے اسباق زیادہ شامل رہے تصوف کیونکہ ذہن و دماغ پر اپنا تسلط قائم کر چکا تھا تو وہ ہمیشہ ان کے خالص عشقیہ افکار میں بھی اپنا رنگ دکھاتا رہا اس طور پر بیکل اپنے فکر کی راہیں تبدیل کرنے کی عمداً کوشش میں ناکام رہے۔

بیکل نے جس دور میں اُردو شعر گوئی کا آغاز کیا اس زمانے میں غزل اور نظم میں کوئی امتیاز نہ تھا یہی سبب ہے، کہ ایک موضوع اور ایک عنوان کے تحت جو اشعار قلمبند ہو جاتے وہ بھی غزل کی مد میں ہی شمار کئے جاتے چنانچہ وہ چند اشعار کہ جن کا عنوان 'عندلیب' ہونا چاہیئے تھا غزل ہی کی فہرست میں شامل کر لئے گئے۔ حالانکہ یہ اشعار خود مطالبہ کرتے ہیں کہ ان کو 'عندلیب' کے زیرِ عنوان آنا چاہیئے ؎

بازار میں یہ دیکھا، میں نے عجب نظارا
بچوں کے ہاتھ میں تھا بلبل پھنسا بچارا
رشتے سے اس کے قابو تھے بال و پر تمامی
چھوٹا نہ تڑپنے سے لاکھوں اگر پکارا
میں نے یہ اس سے پوچھا بلبل بتا یہ مجھکو
چھوٹا ہے تجھ سے آخر کیوں کر چمن ہزارا
ہنس کر ہوا وہ گویا تجھ کو خبر نہیں ہے
عاشق کا حال وہ ہے جو حال ہے ہمارا

(بقیہ برصفحہ ۳۹)

خبرنامہ

اطرافِ عالم

مشرقی مطالعوں کا ادارہ

جمہوریہ جورجیا (روس) میں سائنس اکیڈمی کے زیر اہتمام ایک ادارے کا قیام عمل میں آیا ہے جہاں مشرق وسطیٰ اور مشرق قریب کی زبان، ادب، تہذیب، تمدن، معاشیات اور تاریخ کا مطالعہ کیا جائے گا۔

آسٹریلیا میں ایشائی مطالعوں کا مرکز

۱۹۶۱ء میں کینبیرا (آسٹریلیا) میں مشرقی مطالعات کے دو مراکز قومی یونیورسٹی اور کینبیرا یونیورسٹی کالج کو ملا کر ایک اسکول کی حیثیت حاصل ہو جائے گی۔ اس ادارہ کو چھ شعبوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ جاپان، چین، ملایا اور انڈونیشیا، ایشیائی تاریخ کا شعبہ اور برصغیر پاک و ہند اور جنوب مشرقی ایشیا کے لئے زبانوں کے پانچ شعبے۔

عربی کتب کا اُردو ترجمہ

خبر ملی ہے کہ مستقبل قریب میں جامعہ ازہر کے ریکٹر شیخ محمود کی بہت سی عربی کتابوں کا ترجمہ انگریزی، بنگالی اور اُردو زبانوں میں ہونے والا ہے۔ شیخ صاحب کی عربی کتابیں تقریباً تمام عربی ممالک کے نصاب تعلیم میں شامل ہیں۔

امریکہ میں پاکستانی ادیب کی ایک کتاب

میکملن کمپنی، نیویارک نے مشرقی پاکستان کے ایک نامور ادیب اشرف صدیقی صاحب کی ایک کتاب (Bhomdaldan the uncle of Lion) شائع کی ہے۔ یہ کتاب بچوں کے لئے عوامی کہانی پر مشتمل ہے اور اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جو کسی پاکستانی نے تصنیف کی ہے اور امریکہ میں چھپی ہے۔ امریکہ کے ایک اخبار نیویارک ٹائمز نے اس کتاب کو موسم رواں کی ایک بہترین کتاب اور شاہکار گردانا ہے۔ علاوہ ازیں Childrens Digest of the World نے اس کو اپنے آئندہ شمارے میں چھاپنے کا اعلان کیا ہے۔

شیکسپیر کا ڈیتھ ماسک

شیکسپیر کا ڈیتھ ماسک جو تقریباً گزشتہ سو سال سے ایک بہترین سائنسدان کی تحویل میں تھا جیسی اسٹیٹ لائبریری نے تقریباً ۹۵۵ پونڈ میں ہینڈ برگ کے نیلام سے خریدا ہے۔

لیڈی چیٹرلیز لور

لندن کی ایک عدالت نے مشہور ادیب اور ناول نگار ڈی۔ ایچ۔ لارنس

کا شہرہ آفاق ناول "لیڈی چیٹرلیز لور" کو عریاں قرار دینے سے انکار کر دیا۔ واضح ہے کہ انگلستان میں اس سے پہلے اس ناول کو عریاں اور فحش سمجھا جاتا رہا ہے۔

رنارڈ نیومین اور برصغیر پاک و ہند

انگلستان کے مشہور مصنف لیکچرار مسٹر برنارڈ نیومین جنہوں نے مختلف ملکوں کی سیاحی کے حالات آٹھ سفرناموں کی شکل میں لکھے ہیں اب اپنے نویں سفرنامہ میں ہندا پاک کی سیاحت کے حالات قلمبند کر رہے ہیں۔

روس میں کتابوں کی اشاعت

روس میں کتابوں کی اشاعت کا روزانہ اوسط ۳۰ لاکھ کا پیاں ہے۔

اُردو یونیورسٹی

خبر ملی ہے کہ مغربی جرمنی کے علاقہ ملشن سے الیف یزدانی نام کے ایک شخص نے بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے نام دو پونڈ کا ایک چیک اُردو یونیورسٹی فنڈ کے لئے ارسال کیا ہے۔ یہ چیک بزم امروز کراچی کی معرفت موصول ہوا ہے۔

اقبال کے ایک مداح

خبر ملی ہے کہ ایران کے مشہور و معروف قومی شاعر صادق سرمد رحلت فرما گئے۔ مرحوم علامہ اقبال کے بڑے مداح تھے۔ حال میں علامہ اقبال پر ان کی نظم ایران کے ہفتہ وار تہران مصور میں شائع ہوئی تھی۔

ہندوستانی ادیب اور مصنف

تیلگو کی مصنفین کی سالانہ کانفرنس میں تیلگو کے ایک مشہور ادیب اور مدراس ہائیکورٹ کے چیف جسٹس مسٹر پی۔ وی راجہ نے ہندوستانی ادیبوں اور مصنفین کے مشترکہ مفاد پر روشنی ڈالتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ وہ اپنی زبانوں کے علاوہ ہندوستان کی دوسری زبانوں سے بھی واقفیت حاصل کریں اور ایک دوسری زبان میں اظہار خیال کرنے کی کوشش کریں۔

بلور مرکزی صد سالہ تقاریب کمیٹی

خبر ملی ہے کہ نظام چیریٹی ٹرسٹ، ڈاکٹر پی گوپال ریڈی اور رام داس سبھا چتو رنے ٹیگور مرکزی صد سالہ تقاریب کمیٹی کو علی الترتیب ۵ لاکھ، دو لاکھ، ایک ہزار اور ایک سو سولہ روپیوں کا عطیہ دیا ہے۔

ریڈیو پٹنہ اور اُردو

ریاستی انجمن ترقی اردو کی مسلسل جدوجہد کے بعد مرکزی حکومت ہند نے پٹنہ ریڈیو اسٹیشن میں اُردو کا ایک علٰحدہ شعبہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ جناب سہیل عظیم آبادی اس شعبہ کے پروڈیوسر مقرر کئے گئے ہیں۔

مشرقی پنجاب اور اُردو

صوبائی حکومت نے اُردو کی ترویج و ترقی کے لئے تیسری پنج سالہ اسکیم کے تحت تقریباً سوا لاکھ روپیہ خرچ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ پنجابی اور ہندی کتب کے انعامی مقابلوں میں اُردو کی بہترین کتابیں بھی شامل کی جائیں گی۔

دیسنہ لائبریری کی منتقلی

دیسنہ ضلع پٹنہ کا کتب خانہ جسے قیام پاکستان کے وقت نقل آبادی کے سبب کافی نقصان پہنچا تھا، اب پٹنہ شہر میں منتقل ہو گیا ہے۔ اس کتب خانہ میں اردو کی تقریباً بیس ہزار نادر کتابیں موجود ہیں۔

داغؔ کے ایک ساتھی کو وظیفہ

گورنر آندھرا پردیش شری بھیم سین سچر کی جانب سے حضرت داغؔ مرحوم کے دوست او شاعر محبوب علی خاں محجوب کو جن کی عمر اس وقت تقریباً ۹۰ سال ہے، ایک سو روپیہ نقدا مبلغ پچیس روپے ماہنامہ وظیفہ مقرر کیا گیا ہے۔

یوم سیماب

خبر ملی ہے کہ دسمبر ۶۰ء کے دوسرے ہفتے میں بمبئی میں "یوم سیماب" منایا جار ہے اس تقریب میں دیگر پروگراموں کے علاوہ اردو کے قدیم و جدید رسالوں کی نمائش اور مقالات کی ایک نشست بھی ہوگی۔

بھارت کی زبانیں اور بولیاں

۱۹۵۶ء کے اعداد و شمار کے مطابق ہندوستان میں تقریباً ۱۷۹ زبانیں اور ۵۴۴ بولیاں بولی جاتی ہیں۔ لیکن ہندی اور انگریزی ہندوستان کی سرکاری زبانیں ہیں

بھارت میں اُردو اخبارات

بھارت میں اُردو اخباروں کی تعداد کا اندازہ ان اعداد و شمار سے لگایا جاسکتا ہے آندھرا میں ۴۵۔ بمبئی میں ۴۹۔ دہلی میں ۱۳۹۔ پنجاب میں ۱۶۵۔ اور یوپی میں ۲۰۰

حلقہ کراچی

ہفتہ سرسید

علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن دسمبر میں ہفتۂ سرسید نہایت دھوم دھام سے منانے کی تیاریاں کر رہی ہے۔

یوم سرسید

۱۷۔ اکتوبر کو کل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے زیر انتظام سرسید گرلس کالج میں یوم سرسید منایا گیا۔ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اس کا افتتاح کرتے ہوئے سرسید کی شخصیت، ان کی مذہبی سیاسی اور علمی خدمات پر روشنی ڈالی۔

مولانا عرشی کراچی میں

۳؍اکتوبر ۶۰ء اُردو کالج کراچی میں ہندوستان کے مشہور محقق مولانا امتیاز علی عرشی کو جو پچھلے دنوں کراچی تشریف لائے تھے ایک عصرانہ دیا گیا۔ اس خصوصی نشست میں کراچی کے مقتدر ادبا و شعرا کے علاوہ پاکستان رائٹرز گلڈ کے نمائندوں نے بھی شرکت کی۔ مولانا عرشی اُردو کے مشہور محقق ہیں اور انھوں نے کلام غالب پر کافی تحقیقی کام کیا ہے۔

گلڈ کی طرف سے حیات اللہ انصاری اور مولانا عرشی کو عصرانہ

۳؍اکتوبر کو رائٹرز گلڈ (حلقہ کراچی) کی جانب سے اُردو کے دو مشہور اُدیبوں جناب حیات اللہ انصاری ایڈیٹر "قومی آواز" لکھنو اور مولانا عرشی کو شیزان ہوٹل میں عصرانہ دیا گیا۔ اس عصرانہ میں گلڈ کے اراکین کے علاوہ کراچی کے چند دیگر ادبا، بھی موجود تھے۔ دونوں مہمانوں نے گلڈ کی اُدبی و علمی خدمات اور اس کی سرگرمیوں کو سراہا۔

اُردو میں تاریخ تمدن انڈونیشیا

سفارت خانہ جمہوریہ انڈونیشیا نے حال ہی میں ایک کتاب تاریخ تمدن انڈونیشیا شائع کی ہے۔ اپنی نوعیت کی یہ پہلی کتاب ہے جو پاکستانی مصنف جناب نور احمد قادری نے

مغربی پاکستان

ادبی اجلاس

۱۳۔ اکتوبر کو ملتان گلڈ کے زیر اہتمام شام کے سات بجے گلڈ ہاؤس میں جگر مرحوم کی یاد میں ایک ادبی اجلاس منعقد ہوا۔ اکرام الحق صاحب سکرٹری ملتان گلڈ نے جگر کے کلام، زندگی اور فن پر روشنی ڈالی۔ اجلاس میں متعدد مقامی ادبا و شعرا نے شرکت کی۔

اردو ٹیلیفون ڈائرکٹری

اس سال محکمہ ڈاک و تار نے ملتان ڈویژن کی جو ٹیلی فون ڈائرکٹری شائع کی ہے اس کی زبان اردو ہے۔ پاکستان میں شائع ہونے والی یہ پہلی اردو ٹیلی فون ڈائرکٹری ہے۔

کاپی رائٹ (بقیہ ص ۲۵)

RIGHT 8TH ED. BY F. E. SKONE JA
(1948)'

ای، سکون جیمز۔ کوپنگر آن دی لاء آف کاپی رائٹ
(۱

S. R LADAS, THE INTERNATIONAL PROTECTION OF LITERARY AND ARTISTIC COPYRIGHT (1938).

ایس۔ پی۔ لاداز۔ دی انٹرنیشنل پروٹیکشن آف لٹریری اینڈ آرٹسٹک کاپی رائٹ (۱۹۳۸)

(۳) M. NICHOLSON, A MANUAL OF AMERICAN COPYRIGHT PRACTICE (1946).

ایم نکلسن۔ اے مینول آف امریکن کاپی رائٹ پریکٹس (۱۹۴۶)

(۴) R.R. BOWKER, COPYRIGHT, ITS HISTORY AND LAW (1912)

آر۔ آر۔ باؤکر۔ کاپی رائٹ اِٹس ہسٹری اینڈ لاء (۱۹۱۲)

نئے افق (بقیہ ص ۵۵)

...ے قریب ہوتیں اور میری کچھ مدد کر سکتیں"

چند دنوں بعد ایک صبح جب سب سو کر بیدار ہوئے تو جبین کا بستر خالی تھا سفید چادر پر ایک شکن بھی نہیں پڑی تھی۔

پاکستان رائٹرز گلڈ (حلقہ کراچی) کی پندرہ روزہ

اَدبی نشستیں

۱- ۹ر دسمبر ۱۹۶۰ء (جمعہ)

صدر - جمیل الدین عالی

افسانے کے تقاضے — غلام عباس

ناول اور افسانہ (میرے تجربے میں) — شوکت صدیقی

صاحب صدر روس میں "اُردو" کے موضوع پر اپنے حالیہ دورے کے تاثرات بیان فرمائیں گے۔

۲- ۲۳ر دسمبر ۱۹۶۰ء (جمعہ)

صدر — ممتاز حسین

غزل — حفیظ ہوشیارپوری

نظم — عبدالعزیز خالد

افسانہ — ابوالفضل صدیقی

۳- ۷ر جنوری ۱۹۶۱ء (جمعہ)

صدر — ڈاکٹر شوکت سبزواری

افسانہ — انور

نظم — ابن انشا

غزل — شان الحق حقی

ان اُدبی نشستوں کا پروگرام "ہم قلم" میں ہر ماہ شائع ہوا کرے گا۔ شرکت کی عام اجازت ہوگی۔ مقام ہوٹل ایکسلیر، صدر (چھت پر)، وقت: ۴½ بجے شام

پاکستان رائٹرز گلڈ (حلقہ کراچی) کی اُدبی نشستیں چند وقفوں کے استثنا سے ہر پندرھویں روز یعنی مہینہ کے پہلے اور تیسرے جمعہ کو منعقد ہوتی رہی ہیں۔ بعض نشستوں میں اُردو اور پاکستان کی دوسری زبانوں، بنگالی، گجراتی وغیرہ کا مشترکہ پروگرام بھی پیش کیا گیا۔ دسمبر ۱۹۶۰ء سے ان پروگراموں کو مزید دلچسپ بنانے اور بعض خصوصیات کا اضافہ کرنے کی کوشش کی جائے گی اس سلسلے کی پہلی کڑی ۹ دسمبر ۶۰ء کا پروگرام ہے جس میں ۱۹۶۰ء کے آدم جی ادبی انعام یافتہ اُردو مصنفین جناب شوکت صدیقی اور جناب غلام عباس افسانے اور ناول کے فن پر اپنے خیالات کا اظہار کریں گے اور ضمناً اپنے ادبی تجربوں کا بھی ذکر کریں گے۔ حاضرین بھی اس بحث میں حصہ لیں گے۔

گزشتہ ماہ کے اُدبی خبرنامے میں جن نشستوں کا ذکر آچکا ہے ان کے بعد پہلی نشست ۲۸ر اکتوبر ۶۰ء کو مشہور افسانہ نگار "انور" کی صدارت میں ہوئی۔ پروفیسر سجاد باقر رضوی نے جو لاہور سے تشریف لائے ہوئے تھے اصغر گونڈوی کی شاعری پر مقالہ پڑھا جو "ہم قلم" کے اس شمارے میں شریک اشاعت ہے اس مقالہ میں اصغر کا ادبی مقام پیش کرنے کی پہلی بار ایک معروضی کوشش کی گئی ہے۔ اس مضمون کی بحث میں دورِ جدید کے دیگر رجحانات اور اصغر کے ہمعصروں کا فن بھی زیرِ غور آیا۔ مقالہ کے بعد جناب سحر انصاری نے غزل پڑھی جس پر تفصیلی بحث ہوئی۔ ۲۵ر نومبر ۶۰ء کی نشست میں صدر جناب تابش صدیقی تھے اس میں ڈاکٹر مس شمیم ارشاد نے اپنا افسانہ 'جب درِ زنداں کھلتا ہے' پڑھا اور طاہر احمر صاحب نے اپنی غزل۔ دونوں مضامین کی بحث میں جدید افسانے کی تکنیک، تقاضوں اور جدید ترین غزل کے فنی رجحانات پر بھی بحث ہوئی

مصنفین کی تخلیقی سرگرمیاں

جدید ادب

(اس صفحہ پر مصنفین کے بھیجے ہوئے اشتہارات کتب بلا معاوضہ شائع کئے جاتے ہیں)

(ا) کتابیں جو چھپ چکی ہیں :

کتاب	مصنف		ناشر	قیمت
بے زبان دوست	انور عنایت اللہ	بچوں کے لئے ناول	ناشر۔ کاشانۂ اردو۔ اکبر روڈ۔ کراچی ۱	۱/۸
لیل خاں فاختہ	میر باقر علی داستان گو	داستان	ادارۂ داستان۔ آر بی۔ ۱/۳۹۔ مقابل اردو کالج رنچھوڑ لائن۔ کراچی	۲/-
لی پرچھائیاں	اقبال متین	افسانوں کا مجموعہ	مکتبۂ "صبا"۔ حیدر آباد۔ آندھرا پردیش (بھارت)	۲/-
ندیا	سلیم بانڈے	افسانوں کا مجموعہ	ناشر۔ کردار۔ پاکستان چوک۔ کراچی	۳/-
یر شیخ الاسلام بہاؤالدین ذکریا	نور احمد خاں فریدی	حضرت ذکریا ملتانی کی تبلیغی سرگرمیوں کا جائزہ	قصر الادب۔ جگو والا۔ براہ لودھراں۔ ملتان	۴/-
یر صدر الدین عارف	"	حضرت ذکریا ملتانی کے فرزند کا تفصیلی تذکرہ	" "	۱۱/-
سلامی افسانے جلد اول و دوم	"	تاریخی حقائق افسانوی رنگ میں	" "	۶/-
اریخ انقلاب پاک	مولینا سعید امین شیرکوٹی / رحیم بخش طارق	تاریخ پاکستان	ناشر۔ کتب خانہ انصاریہ پشاور	۵/۸
....		....		
لیات جامی	مولانا عبدالرحمٰن جامی	(مجموعہ کلام)	" شعاع ادب۔ لاہور ۱	—
لب علم کی ڈائری	سید الطاف بریلوی	(ڈائری)	" ایجوکیشنل اکیڈمی آف پاکستان کراچی	۲/-

(ب) کتابیں جو زیر طبع ہیں :

کتاب	مصنف		ناشر	قیمت
پھول کھلتے ہیں	سلیم بانڈے	ناول	-	-
یر شیخ الاسلام شاہ رکن عالم ملتانی	نور احمد خاں فریدی	شیخ کی سیاسی اور تبلیغی خدمات کا جائزہ	قصر الادب۔ جگو والا۔ براہ لودھراں۔ ملتان	×
زود رماں	عدم	شعری مجموعہ	شعاع ادب۔ لاہور ۱	

(ج) کتابیں جو زیر تصنیف ہیں :

کتاب	مصنف		ناشر	قیمت
رسوا کے ناولوں کا تنقیدی تحقیقی مطالعہ	ظہیر فتحپوری	تنقید و تحقیق	×	×
یم چند	"	پریم چند کے فن پر محققانہ تنقید	×	×
ہولوں کے قافلے	انور عنایت اللہ	ناول	×	×
اریک جھیلیں	سلیم بانڈے	ناول	×	×

(مصنفین اپنی تصانیف کے اعلانات مذکورہ بالا نقشے کی صورت میں بھیجیں)

ایڈیٹر، پرنٹر پبلشر: طفیل احمد جمالی .... مطبع انٹرنیشنل پریس کراچی

سال میں چار مرتبہ
یکم جنوری
یکم اپریل
یکم جولائی
یکم اکتوبر
ایک زرّیں موقع
آپ کو
پکارتا ہے...
قومی انعامی بونڈ نقد ادائیگی پر اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے دفاتر
اور اُس کے مقرر کردہ بینکوں سے خریدے جا سکتے ہیں۔ بونڈوں کی
فروخت سے حاصل شدہ سرمائے کو حکومت سماجی
فلاح و بہبود کے کاموں پر صرف کرے گی۔ آپ کی رقم بہر حال
محفوظ رہے گی اور جب چاہیں واپس مل سکتی ہے۔
انعامات کے لئے قرعہ اندازی ہر تین ماہ بعد
یکم جنوری، یکم اپریل، یکم جولائی
اور یکم اکتوبر کو ہوگی۔ پہلی قرعہ اندازی
سرکاری نگرانی میں یکم جولائی
کو ہونے والی ہے۔ ہر ایک بونڈ تمام
قرعہ اندازیوں میں انعام کا مستحق ہوگا،
بشرطیکہ وہ تاریخ قرعہ اندازی سے
چھ ماہ قبل خریدا گیا ہو اور بھنایا نہ جائے۔
یہ انعامات انکم ٹیکس اور سپر ٹیکس
سے مستثنٰی ہوں گے۔
پانچ لاکھ بونڈ کے ہر سلسلے پر
ہزار روپے کے نقد انعامات
ایک انعام ۲۰۰۰۰ روپے کا
ایک انعام روپے کا
ایک انعام ۲۵۰۰ روپے کا
تین انعامات ۱۰۰۰ روپے کا فی انعام
دس انعامات ۵۰۰ روپے کا فی انعام
ایک سو بیس انعامات ۱۰۰ روپے کا فی انعام
قومی انعامی بونڈ میں امید اور اطمینان کے ساتھ روپیہ لگائیے
آپ جب چاہیں اپنی رقم واپس لے سکتے ہیں
UNITED
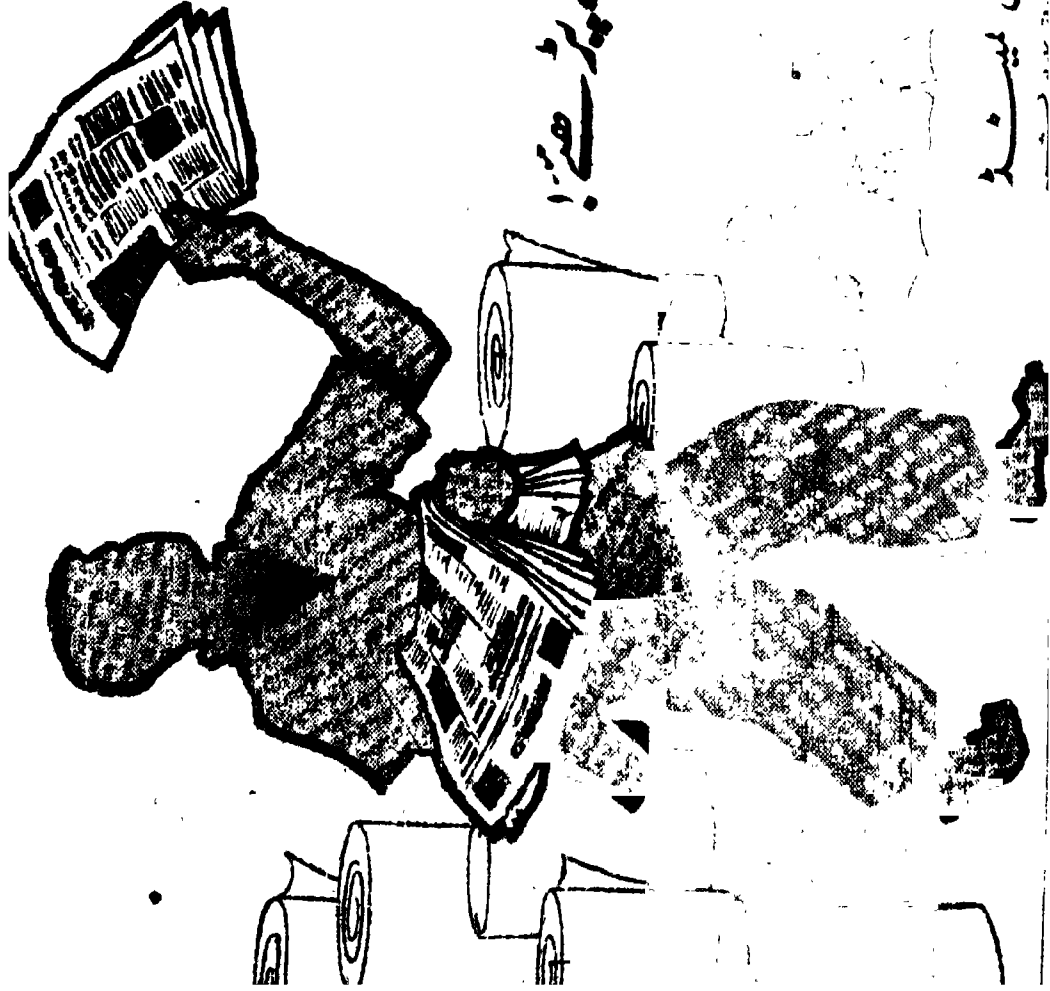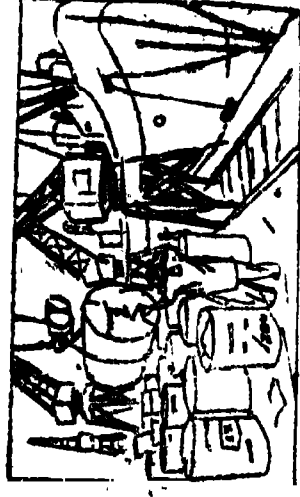
پاکستان میں قومی بیداری، روشن خیالی اور علم کی ترقی کے پیش نظر
اخباروں اور جریدوں کی مانگ تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اس
اہم ضرورت کو پورا کرنے اور ادب کی ترقی کے لئے
پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن نے مشرقی پاکستان کے
مقام کھلنا میں اخباری کاغذ کا ایک عظیم کارخانہ قائم کیا ہے۔
یہ کارخانہ ہر سال ۲۳۰۰۰ ٹن اخباری کاغذ اور ۱۲۰۰۰ ٹن ٹیکنیکل
کاغذ تیار کر سکتا ہے۔ جو پاکستان کی موجودہ ضرورت کے لئے کافی ہے
پیداوار کو دوگنا کرنے کے لئے مناسب انتظام رکھا گیا ہے تاکہ کاغذ
کی مانگ بڑھنے پر اس کو آسانی سے پورا کیا جا سکے۔
کھلنا کا کاغذ آپ کے فکر و عمل کو سنوارتا ہے۔
اب خبریں کثرت سے پڑھیئے!
کھلنا نیوز پرنٹ مل لمیٹڈ

ڈاکخانے کے سیونگ بینک کی
نئی پیشکش
روپیہ نکالنے کی بے مثل سہولت
آپ ایک سے زائد ڈاکخانوں سے روپیہ نکلوا سکتے ہیں
ڈاکخانے کے سیونگ بینک میں حساب رکھنے والے اب پچاس روپے تک رقم کسی بھی ڈاکخانے سے نکال سکتے ہیں جو اسی علاقے کے صدر ڈاکخانے کے تحت واقع ہو۔
آپ صرف اپنی پاس بک مع تصدیق شدہ تصویر اس علاقے کے کسی بھی ڈاکخانے میں پیش کر دیں جہاں سے آپکو مبلغ ۵۰ روپے تک ادا کر دیئے جائیں گے بشرطیکہ اتنی رقم آپ کے کھاتے میں جمع ہو - رقم جمع کرنے والے بذات خود رقم نکلوا سکتے ہیں۔
PASS BOOK

کے سی۔ آر کی مصنوعات
قابلِ اعتماد اور حسبِ منشاء
کراچی کاربن اینڈ ربن مینوفیکچرنگ کمپنی ہمیشہ اس بات کے لئے کوشاں رہی ہے کہ پاکستان
کو درآمدی مال کی غلامی سے نجات دلوائی جائے۔ کے سی آر کی مصنوعات
کی بدولت ملک کو لاکھوں روپے کا زرمبادلہ بچ رہا ہے۔
آج ہم حکومت، اخبارات، خبر رساں ایجنسیوں، ہوائی کمپنیوں، صنعتی اور
کاروباری اداروں اور بینکوں کو:
کاربن پیپر۔ مومی کاغذ۔ ٹیلیگراف ٹیپ
ٹیلی پرنٹر رولز۔ اکاؤنٹنگ مشین رولز۔ ڈاشامپ پیڈ۔ سیاہی والے پیڈ۔
ٹائپ رائٹر ربن۔
اور دیگر اشیاء فراہم کرتے ہیں۔
کے سی آر عمدگی اور اعتماد کا نشانِ امتیاز ہے
KCR
PRINTER
CARBON
PAPER
CARBON PAPER
کراچی کاربن اینڈ ربن مینوفیکچرنگ کمپنی لمیٹڈ۔ کراچی
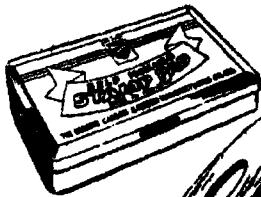
یہ طیارے کس طرح اترتے ہیں ؟

ابھی آسمان پر ایک نشان ہی نمودار ہوتا ہے کہ ہوائی اڈے پر کام کرنے والا ہر شخص چوکنا
ہوکر اس کوشش میں مصروف ہو جاتا ہے کہ آنے والے اس گرجتے ہوئے
چمکدار پرند کو بحفاظت اپنی منزل مقصود پر پہنچا دیا جائے۔ لیکن جس وقت
ہر کارکن انتہائی مصروف ہوتا ہے اور حفاظتی انتظام کے ہر ہر نکتہ پر بار بار غور
کیا جاتا ہے ایک اہم چیز ایسی بھی ہے جس پر کوئی شخص معمولی توجہ کی ضرورت بھی
محسوس نہیں کرتا۔ یہ ہوائی اڈے کے اس مقام کی مضبوطی کا سوال ہے جہاں لاکھوں پاؤنڈ
وزن صرف چند سو مربع انچ زمین پر ڈیڑھ سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے دوڑتا ہوا ایک ٹن اترے گا
اور فی مربع انچ کم از کم ایک ہزار پونڈ وزن ڈالے گا۔ لیکن اگر ایسے جہاز ہر پانچ پانچ منٹ کے وقفے سے
بھی اترتے رہیں تب بھی کسی کو ذرہ بھر فکر نہیں ہوگی کیونکہ سب جانتے ہیں کہ پاکستان کے
بین الاقوامی ہوائی اڈے زیل پاک سیمنٹ سے بن رہے ہیں۔

زیل پاک

سیمنٹ جلد سخت ہو جاتی ہے اور ہر دوسرے سیمنٹ سے زیادہ مضبوط ہے

مشہنگ ایجنٹس - پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن

"ہم قلم" کا شمارہ فروری ۱۹۶۱ء

سالگرہ نمبر ہوگا

جو جنوری کے آخری ہفتہ میں شائع ہو جائے گا

معاونین حضرات سے گذارش ہے کہ اپنی تخلیقات

۳۱ دسمبر تک عنایت فرمائیں

تفصیلی اعلان اگلے شمارہ میں دیکھئے

زیرِ نگرانی

آدم جی انڈسٹریز لمیٹڈ
کراچی

ٹالسٹائی کی پچاسویں برسی

ماسکو میں اس سال دنیا کے عظیم مصنف لیو ٹالسٹائی کی پچاسویں برسی کی تقریب خاص اہتمام سے منائی گئی۔ اس میں شرکت کے لئے دنیا کے بہت سے ملکوں کے ادیبوں کو مدعو کیا گیا۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کو بھی دعوت نامہ بھیجا گیا۔ جو اگرچہ بہت دیر سے بھیجا گیا تھا لیکن اس تقریب کی اہمیت کے پیش نظر یہ مناسب سمجھا گیا کہ پاکستان کو اس میں ضرور شریک ہونا چاہیئے۔ چنانچہ سیکرٹری جنرل کے نمائندہ جناب جمیل الدین عالی ۱۵ر نومبر ۶۰ء کو روانہ ہوئے اور برسی کی تقریبات میں شرکت کی۔

(تفصیل آئندہ شمارے میں)

ترجموں کا پروگرام

رائٹرز گلڈ کے مرکزی دفتر نے ان ترجموں کی شرح بیس روپے فی ہزار الفاظ تجویز کی ہے جو پاکستان کی کسی قومی یا علاقائی زبان سے اردو یا بنگالی میں کئے جائیں گے۔ جو حضرات ترجمے سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ گلڈ کو اپنے کوائف حسب ذیل صورت میں بھیجیں۔

(۱) کارکن کا نام و پتہ
(۲) کس زبان میں ترجمہ کر سکتے ہیں
(۳) کس زبان سے ترجمہ کر سکتے ہیں
(۴) ابتک کون کونسے تراجم شائع کر چکے ہیں

یہ معلومات

دفتر میں رہیں گی اور بوقت ضرورت ان سے رجوع کیا جائے گا۔

طبع زاد افسانہ پر انعام

پاکستان رائٹرز گلڈ ملتان سب ریجن نے اردو زبان میں بہترین طبع زاد افسانہ لکھنے پر مبلغ دو سو روپیہ بطور انعام دینے کا اعلان کیا ہے۔ تمام پاکستانی ادیب اس مقابلے میں حصہ لے سکتے ہیں۔ افسانے دو خوشخط نسخوں میں بنام جناب اکرام الحق سکریٹری ملتان گلڈ۔ "الاکرام" نشتر روڈ ملتان ۱۵ر دسمبر ۶۰ء تک بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک پہنچنے چاہئیں ——— شرائط مقابلہ یہ ہیں:

۱- افسانہ طبع زاد ہو۔ کسی دوسری زبان سے ترجمہ نہ کیا گیا ہو اور نہ اس کا پلاٹ کسی تاریخی واقعہ سے اخذ کیا گیا ہو۔
۲- افسانہ مختصر ہو۔
۳- معاشرے کا اصلاحی پہلو حتی الوسع مدنظر ہو۔

الجزائر کو سلام
ساقی فاروقی
ان کے علاوہ

دی بنک آف بہاولپور لمیٹڈ

سینٹرل آفس :- پی آئی ڈی سی ہاؤس - کچہری روڈ - کراچی - نمبر ۴

اکثریت حصص حکومت مغربی پاکستان کے پاس ہے۔
رجسٹرڈ ہیڈ آفس بہاولپور (مغربی پاکستان)

سرمایہ

منظور شدہ	۲۵ لاکھ روپیہ
جاری شدہ	۲۵ لاکھ روپیہ
ادا شدہ	۲۵ لاکھ روپیہ

شاخیں :-

۱ احمد پور شرقیہ
۲ بہاولپور (ہیڈ آفس)
۳ بہاولنگر
۴ چشتیاں
۵ گجرانوالہ
۶ گجرات
۷ ہارون آباد
۸ حاصل پور
۹ حیدر آباد
۱۰ جیکب آباد
۱۱ کراچی - لیاقت بازار
۱۲ کراچی - جوڑیا بازار
۱۳ کراچی - پی آئی ڈی سی برانچ
۱۴ کراچی - لالوکھیت
۱۵ کموکی
۱۶ قصور
۱۷ خانپور
۱۸ لاہور
۱۹ لیاقت پور
۲۰ لائل پور
۲۱ ملتان
۲۲ رحیم یار خاں
۲۳ صادق آباد
۲۴ سرگودھا
۲۵ سکھر
۲۶ وزیر آباد

ہر طرح کا بینکنگ کاروبار کیا جاتا ہے۔
انتہائی تقابلی شرحوں پر رقوم جمع کی جاتی ہیں۔
منظور شدہ تمسکات پر قرضے دیئے جاتے ہیں۔
تفصیلات کے لئے قریبی برانچ کے منیجر سے رجوع کریں۔

ماہنامہ

ہم قلم

ادارہ مصنفین پاکستان (پاکستان رائٹرز گلڈ) حلقہ کراچی

کا ترجمان

جنوری ۱۹۶۱ء

جلد ۱ —— شمارہ ۵

جس میں اشاعت الجزائر بھی شامل ہے

فی پرچہ دس آنے
(۶۲ نئے پیسے)

ہمارا منشور

"ہم پاکستان کی جملہ زبانوں کے ادیب خود کو مادرِ وطن کی ترقی، عظمت، بین الاقوامی امن کے آدرش اور انسانیت کی ترقی کے لئے وقف کرتے ہیں۔ ہم ان حقوق انسانی پر ایمان رکھتے ہیں جن کی تشریح اقوام متحدہ کے منشور میں کی گئی ہے۔ بحیثیت ادیب کے ہم اپنے خیالات کے اظہار اور ترسیل کی آزادی کے لئے بنیادی حقوق کے حامی ہیں جس کے بغیر تخلیقی ادب بے مقصد ہوتا ہے۔ ہمیں اپنی ان عظیم روایات پر جو ہمیں ماضی سے ملی ہیں، بڑا فخر ہے۔ ہم ان کے تحفظ اور ان کو مزید فروغ دینے کا عہد کرتے ہیں۔ ہم اپنے مقدس فرض سے جو صداقت کی عکاسی، حب وطن کی قدروں کی نشوونما، بین الاقوامی اخوت اور تعاون کے فروغ اور انسانی تعلقات کے قیام سے متعلق ہے، کماحقہ، آگاہ ہیں تاکہ انسانیت زیادہ سے زیادہ راحت، طمانیت اور وقار کے ساتھ اپنا وجود باقی رکھ سکے۔

ادیب ہونے کی حیثیت سے فرداً فرداً اور اجتماعی طور پر ہم ایک ایسے خوش حال اور صحت مند معاشرے کی ترقی کے لئے اپنی ذمہ داری کو قبول کرتے ہیں جس میں سب کے لئے آزادانہ اور مساوی مواقع فراہم ہوں، اور جہاں دولت و اقتدار، انسانی قدروں اور روحانی تصورات کے تابع ہوں۔ اسی لئے علم و سائنس کی ترقی کو دنیا میں امن اور خوشحالی کے فروغ کا ذریعہ سمجھتے ہیں"

(پاکستان رائٹرز گلڈ کے تاسیسی اجلاس میں بروز ۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء منظور ہوا)

سالانہ
چھ روپے
چندہ پیشگی

پتہ: ۳۵ ہوٹل ایکسلسیر
صدر - کراچی ۳
فون ۵۳۰۵۵/۲۰

ترتیب

	عنوان	مصنف	صفحہ
الجزائر اور اسلام	دامن کی آگ	انتظار حسین	۶
	الجیریا بانی (دو سے)	جمیل الدین عالی	۱۲
	گہوارۂ جنوں	سید فیضی	۱۴
	ایک نازک کرن	جلیل حشمی	۱۶
	حصارِ عظمت	عبدالعزیز فطرت	۱۷
	فرانسیسی ضمیر کی آواز	ژاں پال سارتر	۲۱
	ماتم میں ہم شریک ہیں	ساقی فاروقی	۲۴
	الجزائر اور ہمارے دانشور	جمیل جالبی	۲۵
	ایک دن، سو سال (افسانہ)	نوید انجم	۲۸
مضامین	میراجی کا مشن	مظہر ممتاز	۴۵
	مصالحت کا آغاز	مرکز	۷۴
	نوبل پرائز	"	۷۴
بنام ایڈیٹر	اُردو کا بین الملکی انعام	عبداللطیف اعظمی	۷۱
نظمیں	تأثرات	رئیس امروہوی	۳۸
	پھیری والا	سجاد باقر رضوی	۳۹
	ابھی جینا ہے بہت	محبوب خزاں	۳۹
	عیشِ غم	رفعت سروش	۴۰
	نارسائی	مشتاق شیدا	۴۰
غزلیں		وامق جونپوری، صبا اکبرآبادی	۴۱
		اطہر نفیس، ثریا شہاب	۴۲
		زبیر رضوی، شاعر ندیم	۴۲
		محب عارفی، تحسین لدھیانوی	۴۳
افسانے، خاکے	وحشت کرنا شیوہ ہے	رضیہ فصیح احمد	۴۹
	ترکِ محبت کے باوجود	ابوالخطیب	۵۴

ریشمی فیتہ (ترجمہ) — طاہر احمد

ثقافتی ورثہ — ایک پشتو لوک گیت — تاج سعید

خبرنامہ — اطراف عالم، حلقۂ کراچی اور مغربی پاکستان کی ادبی خبریں

ادارتی اعلانات و شذرات —
کاپی رائٹ
آدم جی ادبی انعام کی تقسیم
گلڈ کے اقدامات سال گذشتہ
کیا آپ کی حق تلفی ہوئی ہے۔

آدم جی ادبی انعام کے قواعد
مصنفین اور ناشرین کے معاہدے
گلڈ کی ادبی نشستیں
پنڈت جواہر لال نہرو کے نام۔

ابتدائیہ

یہ شمارہ ایک خصوصی نوعیت رکھتا ہے، جب وعدہ الجزائر کے مظلوم اور مجاہدوں کی خدمت میں ہم ادنیٰ سا ہدیۂ عقیدت۔ ہم اسے الجزائر نمبر نہیں کہتے کیونکہ ہم نہیں سمجھتے کہ یہ شمارہ شائع کرکے ہم نے وہ حق ادا کر دیا ہے جو الجزائر کی آزادی کی جنگ لڑنے والوں کی طرف سے ہم پر عائد ہوتا ہے۔ قدرت اللہ شہاب کا یہ قول درست ہے کہ اس مجلہ کی اہمیت کے پیش نظر ہمیں ایک باقاعدہ الجزائر نمبر نکالنا چاہیئے تھا تاہم فی الحال ایک تیم تحت خاص نمبر نکالنے کی بجائے ہم نے بعض نمائندہ تخلیقات کو آپ کے سامنے پیش کرنا بہتر سمجھا۔ خدا کرے ہم کل الجزائر کے شایانِ شان ایک پورا خاص نمبر پیش کر سکیں۔ شہاب صاحب کا مطالبہ ہمارے لکھنے والوں کے لئے چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔

۲۔ ۳ جنوری کو فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں صدر مملکت پاکستان آدم جی ادبی انعام تقسیم فرمائیں گے۔ کسی ملک کے ادیبوں کے لئے یہ بڑے اعزاز کی بات ہے کہ ان کی مملکت کا سربراہ ان کی تخلیقی سرگرمیوں کی ہمت افزائی اس سطح پر کرے نوبل انعام ہر سال سویڈن کے سربراہ یعنی شاہ سویڈن تقسیم کرتے ہیں۔ اور صدر مملکت کا یہ فیصلہ اس امر کی ضمانت ہے کہ آئندہ سے ہر سال یہ انعام صدر پاکستان کے ہاتھوں تقسیم ہوا کرے گا۔ یہ پاکستان میں ایک نہایت شاندار ثقافتی روایت کا آغاز ہے۔

آدم جی ادبی انعام ایک خانوادے کا عطیہ ہے جو بیس ہزار روپے سالانہ کی شکل میں اردو اور بنگلہ کی بہترین کتابوں پر دیا جاتا ہے۔ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے مشرقی ممالک میں پاکستان پہلا ملک ہے جہاں ایک غیر سرکاری ادبی اعزاز کو یہ منزلت حاصل ہوئی ہو۔

۳۔ دسمبر کے مہینے میں بہت بڑے بڑے واقعات ہوئے مگر ہمارے لئے سب سے اہم واقعہ کراچی کی سائنس کانفرنس ہے جس کی کارروائی اردو میں ہوئی۔

سائنس کانفرنس میں کوئی جذباتی اور "صرف ادیب" لوگ شریک نہیں تھے بلکہ ملک کے مشہور محققین اور سائنس کے ماہرین تھے جنہوں نے مغربی اداروں سے بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کی ہیں اور جو صرف انگریزی ہی نہیں بلکہ کئی کئی یورپی زبانوں پر عبور رکھتے ہیں اور بہت سخت کالر والے حضرات سے بہتر انگریزی بولتے اور لکھتے ہیں۔

ان ماہر سائنسدانوں نے بڑے بڑے ادق سائنسی مضامین پر طول طویل مقالے اردو زبان میں پڑھ کر ایک بار پھر ثابت کر دیا کہ اردو صرف ظلم و تغافل کی شکار ہے ورنہ وہ فوری طور پر ہر مضمون کے لئے ہر سطح پر ذریعہ تعلیم بن سکتی ہے۔

کاش سخت کالر اب بھی نرم ہو جائیں۔

جمیلہ بوحائرؔی

ایک زخمی کلی
گلستان ہوگئی

ذوقِ یقین

شیروں کو
روباہی

موت
دین کے

الجزائر کو سلام

الجزائری مجاہدین کا پرچم

سکرٹری جنرل کا پیغام

جناب مدیر ہم قلم تسلیم۔

یہ بڑی اچھی بات ہے کہ آپ جنوری کے ہم قلم کا ایک حصہ الجزائر کے لئے مخصوص کر رہے ہیں لیکن یہ اور بہتر ہوتا اگر آپ ایک پورا نمبر اس کے لئے وقف کرتے اور پاکستان کے ہر دانشور، ہر ادیب اور ہر شاعر سے اس کے لئے لکھواتے۔

یہ سچ ہے کہ کسی موضوع پر تخلیقی ادب حسب فرمائش پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ کہانی ہو یا کوئی شعری تخلیق، ایک جذبۂ بے اختیار کی پیداوار ہوتی ہے تاہم چند لفظ، چند سطریں، چند صفحے ان مظلوم لیکن جری انسانوں کے لئے کسی اور عنوان بھی لکھے جا سکتے ہیں جو جان کی بازی لگا کر اپنے بنیادی پیدائشی حق آزادی کے لئے بے جگری سے لڑ رہے ہیں۔ آخر ہم لوگ قراردادیں منظور کرتے ہیں تقریریں جھاڑتے ہیں جو نہ منظوم ہوتی ہیں نہ افسانوں کی شکل میں ——

اس میں شک نہیں کہ ہم لوگ گوناگوں مشکلات میں مبتلا ہیں اور الجزائری بھائیوں کو کوئی عملی امداد پیش نہیں کر سکتے —— مگر ہم استعمار پسندوں کا جی تو جلا سکتے ہیں

قدرت اللہ شہاب

دامن کی آگ

میں افریقہ کے اس نقشے کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں جو میں نے محفل میں یاد کیا تھا کہ ایک دوست نے چڑ کر مجھ سے پوچھ لیا ہے کہ "یہ بھی پتہ ہے کہ الجزائر کہاں واقع ہے؟"

میں سٹپٹا گیا۔ اس نے میری کمزوری سے فائدہ اٹھا کر دوسرا حملہ کیا۔ "لکھنے والے کا کام سیاست بگھارنا نہیں ہے۔ ایسی ہی تکلیف ہے تو الجزائر پر افسانہ لکھو۔"

میں الجزائر پر افسانہ کیوں نہیں لکھ سکتا۔ میں نے سوچا۔ مگر اب افسانہ لکھنے بیٹھا ہوں تو مجھے خیال آ رہا ہے کہ مجھے یہ تو معلوم ہی نہیں کہ الجزائر کا محل وقوع کیا ہے۔ میں اس کے بارے میں افسانہ کیا لکھوں گا۔ میں افریقہ کے نقشے کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور مجھے یاد نہیں آتا کہ ملکوں کے اس جنگل میں الجزائر کہاں آباد ہے۔ الجزائر کا نقشہ مجھے یاد نہیں آتا۔ اور اور نقشے ذہن میں ابھر رہے ہیں۔

پھاٹک حبش خاں میں ایک شخص تن و تنہا ایک چھت پر کھڑا تین دن سے لگاتار شین گن چلائے جاتا ہے۔

میں نے دوسرے دن اخبار کی ایک ایک خبر غور سے پڑھی۔ پھر تیسرے دن سارا اخبار چھان مارا۔ اس شخص کے متعلق کوئی خبر نظر نہیں آئی۔ اور مجھے دنوں اس شخص کا خیال آیا اور رہ رہ کر حیران ہوا کہ آخر وہ شخص گیا کہاں! فسادات کے واقعات اب کہانی بن چکے ہیں۔ تیرہ سال کی مدت میں ہم بہت کچھ بھول گئے۔ مگر وہ شخص جو شین گن چلاتے چلاتے گم ہو گیا تھا آج مجھے پھر یاد آ گیا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ جب پورا شخص میرے تصور میں دھندلا گیا ہے تو یہ شخص کیوں مجھے ایکا ایکی ایسے یاد آیا جیسے یہ کل کی بات ہو۔ اور اب مجھے لگے پچھلے اور اور خیال آ رہے ہیں۔ جنگ اُحد میں حضرت ... نے نیام توڑ ڈالی اور اعلان کیا کہ اب یہ تلوار نیام میں نہیں جائے گی۔ وہ تلوار نیام میں نہیں گئی کہ سر قلم کرتے کرتے ٹوٹ گئی۔ اس کے بدلے میں حضرت علی پر ذوالفقار نازل ہوئی۔ طارق نے ہسپانیہ کے ساحل پر اتر کر کشتیاں جلوا دیں اور مولانا محمد علی نے لندن میں اتر کر اعلان کیا کہ میں آزادی لئے بغیر وطن واپس نہیں جاؤں گا۔ اور وہ وطن واپس نہیں آئے۔ پیغمبروں کی زمین کی راہ ملکِ عدم سدھا گئے۔

اِن اَنمل بے جوڑ یادوں سے فائدہ۔ اگر مجھے مسلمانوں کی پوری تاریخ بھی اَزبر ہے تو بھی الجزائر کا محل وقوع نہ جاننے کی تلافی نہیں ہو گی۔ آج مجھے بدر و اُحد کے قصے نہیں الجزائر کا افسانہ لکھنا ہے۔

اَنمل بے جوڑ تاریخی یادوں کو ایک طرف کر کے میں الجزائر کے بارے میں سوچنا شروع کرتا ہوں۔ میرا ذہن پھر بھٹکتا ہے۔ اور اب مجھے ایک کہانی یاد آ رہی ہے۔ ایک شہزادہ تھا۔ اس شہزادے کی چار بیویاں تھیں۔ ایک دن کیا ہوا کہ شہزادے کو سفر درپیش ہوا۔ وقتِ رخصت بیویوں نے اس سے لمبی چوڑی فرمائشیں کیں۔ مگر چوتھی بیوی نے کہا

ے جونی تھی صرف ایک سبز پنکھیا کی فرمائش کی۔ تو شہزادہ
ان سب کی سن سفر پر روانہ ہوا۔ بعد ایک مدت کے جب
وہ دیس واپس ہونے لگا تو اس نے اپنی چہیتی بیویوں کی فرمائش
یاد کیں اور نوع بہ نوع مال و اسباب کا سودا کیا۔ ہیرے
جواہرات کہ دیکھنے سے آنکھوں میں چکا چوند آئے خرید دیس
جانے والے جہاز میں سوار ہوا۔ جہاز کا بادبان اُٹھا اور لنگر
کھلا۔ پر جہاز روانہ نہ ہوا۔ تب جہاز کا کپتان مسافروں سے
مخاطب ہوا کہ اے عزیز و مقرر تم میں سے کوئی مسافر اپنی
کوئی فرمائش بھول گیا ہے کہ جہاز روانہ نہیں ہوتا۔ بس
ہر مسافر کے تئیں لازم ہے کہ دل میں اپنے غور کرے کہ وہ
کیا بھول گیا ہے۔ تب شہزادے نے تامل کیا اور اسے یاد
آیا کہ وہ سبز پنکھیا ساتھ لے چلنا تو بھول ہی گیا ہے .....
اور میں سوچ رہا ہوں کہ میں کس جہاز کا مسافر ہوں اور کس
سبز پنکھیا کو بھول گیا ہوں کہ سبز پنکھیا کو بھول جانے کے بعد
نہ جہاز چلتا ہے نہ افسانہ لکھا جاتا ہے۔ راوی نے یوں بیان
کیا ہے کہ میں نے ایک بچے کو دیکھا کہ دامن میں اس کے
آگ لگی ہے۔ جوں جوں وہ بھاگتا ہے وہ آگ اور بھڑکتی
ہے۔ وہ لاشوں کے درمیان بھاگا چلا جاتا تھا اور رخ اس
کا فرات کی سمت تھا۔ پھر نہ معلوم ہوا کہ وہ کہاں گیا۔ اس
رات کئی بچے اس رستاخیز میں گم ہو گئے۔ اور سن ستاون
کا رستاخیز میں جلتی ہوئی دلی سے ایک سوار نکلا۔ اس کا
روشن چہرہ گرد سے اَٹ گیا تھا، زلفیں بکھر گئی تھیں۔ جب لکھنو
کا رن پڑا تو وہ کہ اپنے تئیں شہزادہ فیروز شاہ کہتا تھا
بڑھ بڑھ کر حملے کر رہا تھا۔ لکھنو سے روہیلکھنڈ، روہیلکھنڈ
کا معرکہ کم ہوا تو نربدا ندی کے کنارے تانتیا توپی کے ہمراہ
آیا۔ پھر اکیلا جنگل جنگل خاک چھانتا پھرا اور آنکھوں سے
اوجھل ہو گیا۔ کسی نے کہا کہ ہم نے اسے مدینہ منورہ میں دیکھا
تھا کہ اس مقدس شہر کی گلیوں میں بھیک مانگتا پھرتا تھا۔
اور جنرل بخت خاں جو شکست کے بعد پھاٹک حبش خاں کے

گم شدہ شخص کی طرح غائب ہو گیا۔ ہر رستاخیز میں کتنی
آتش بداماں بچے، کوئی شعلہ صفت سپاہی گم ہو جاتا ہے
ہم اسے بھول جاتے ہیں اور اس کے ساتھ زندگی کا کوئی
ورق جل جاتا ہے اور جہاز ٹک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ میں
کہ الجزائر کا محل وقوع بھول چکا ہوں افریقہ کے نقشہ میں
اسے تلاش کرتا ہوں۔ افریقہ کے نقشہ میں الجزائر نہیں ملتا
اور میرا تصور بار بار پھاٹک حبش خاں تک منزل منزل
بھٹکتا ہے۔ تاریخ اور جغرافیہ کی سیدھی سادی حقیقتیں میرے
ذہن میں گڈمڈ ہو گئی ہیں۔

"یار یہ سب جگہ کے مسلمان ایک ہی سے ہوتے
ہیں۔ نہتے مشین گنوں سے جا بھڑے۔ بہت
لوگ ہیں"

اور مجھے پھر ستاون کی دلی یاد آ جاتی ہے۔ جب توپیں
اور بندوقیں ٹھنڈی اور فتحیاب فرنگی شہر میں داخل
ہوئے تو گلیوں کے لوگ اینٹ پتھروں سے لڑے۔ اور
ٹیپو سلطان نے جب سارا لشکر کٹوا دیا تو اکیلا گھوڑے
پر سوار ہو دشمن کی صفوں میں گھس گیا۔ سب جگہ کے
مسلمان ایک ہی سے ہوتے ہیں۔ پہلے نیام توڑ ڈالتے ہیں
اور آخر میں ان کے ہاتھ میں ٹوٹی تلوار رہ جاتی ہے۔
تو آج کی خبر یہ ہے کہ نہتے مشین گنوں سے جا بھڑے
اور بھن گئے۔

۔ مال روڈ کہ دن بھر اتوار کے باعث خاموش
رہی تھی رواں دواں ہے۔ بس سٹینڈ پر ہجوم بڑھتا چلا
جا رہا ہے اور بس ہے کہ آنے کا نام نہیں لیتی۔ ایک شخص
نے کھڑے کھڑے قریب ہی فٹ پاتھ پر بچھے ہوئے اردو
انگریزی سب اخباروں کی سرخیاں پڑھ ڈالیں۔ الجزائر
میں سو مسلمان گولی سے ہلاک ہو گئے۔ دو سو زخمی ہو کر ہسپتال
پہنچ گئے۔ "اچھا جی بہت آدمی مر گیا" اس نے بس جانب کی
اور قریب بیٹھے ہوئے خوانچہ فروش سے مخاطب ہو گیا

[illegible] دیا؟ اور میں مال جمع کر کے پھر اسی
[illegible] میں جا بیٹھتا ہوں جو ہمارا مقدر ہے۔ اخبار پڑھتے
[illegible] نے چائے کا گھونٹ لیا اور فوراً رکھ دی " اچھی
نہیں بنی؟ چائے اچھی نہ بنی ہو تو ہم سب کو بہت کوفت ہوتی
ہے۔ مگر منیجر کا عذر یہ ہے کہ بازار میں چائے کی پتی نہیں مل
رہی۔ اس کی طرف سے اس قسم کے عذر کے ہم عادی ہو چکے
ہیں۔ آج بازار میں چائے کی پتی نہیں مل رہی۔ آج چینی
نہیں مل رہی۔ آج دودھ دستیاب نہیں ہوا۔ یہ سب کہنے
کی باتیں ہیں۔ اصل میں چائے خانے کا انتظام بگڑ گیا ہے۔
اور ہم اس زمانے کو جب یہاں مزیدار چائے ملا کرتی تھی اس
طرح یاد کرتے ہیں جیسے میری نانی اماں اپنی نانی اماں کے
حوالے سے غدر سے پہلے کے زمانے کو یاد کرتی تھیں کہ بی بی
ان دنوں گیہوں آٹھ آنے من ملتا تھا۔ اور میں اس وقت
اس زمانے کو یاد کر رہا ہوں جب کسی روز صبح کو اچانک
بازار بند ہونے لگے۔ جلسوں میں چندے کی اپیلیں ہوتیں
اور بوڑھیاں کانوں کی بالیاں اور جوان گلے کی چمپا کلی
اُتار دیتیں اور شاعر نظمیں لکھتے، کبھی ترکوں کے لئے کبھی
عربوں کے لئے۔ ان دنوں ہمارے پاس بھی کچھ تھا، عورتوں
کے گلے میں تھوڑے زیور شاعروں کے پاس تھوڑے لفظ۔
تلوار ہم پہلے ہی توڑ بیٹھے تھے۔ اور چونکہ عربوں نے ان
زیوروں اور ان لفظوں کا حساب بے باق نہیں کیا ہے
سو انھیں مزید قرضہ نہیں دیا جا سکتا۔ حساب جو جو بخشش
سو سو۔ تو الجزائر کے عربوں کیلئے اب کسی معزز خاتون کے
گلے کی چمپا کلی نہیں اُتر سکتی۔ اور میں افسانہ لکھنے سے قاصر
ہوں کہ الجزائر کا محل وقوع میں بھول چکا ہوں۔۔۔ ضرور
ہماری زندگی کا کوئی ورق جل گیا ہے۔

" یہ چائے بہتر ہے " ظفر کے منہ کا بگڑا مزہ پھر درست
ہو گیا۔ اور اب چائے کے ساتھ محفل کی بوریت دور ہوتی
جا رہی ہے۔ باہر مال روڈ پر ٹریفک معمول کے مطابق
جاری ہے۔ سامنے [illegible] کے درخت کے نیچے ایک لڑکا بہت
دیر سے اخبار کی سرخی [illegible] کر رہا ہے اور تھک ہار
کر وہ مال جمع کر کے دوسری سڑک پہ نکل جاتا ہے۔ اور
ارشد ہمیں بتا رہا ہے [illegible] پہ کبھی گوبر پڑا
دکھائی نہیں دیتا۔ ارشد حال ہی میں یورپ سے واپس
آیا ہے مگر پھر پا بہ رکاب ہے۔ لیڈرز پروگرام میں امریکہ
جاتے جاتے رہ گیا۔ مگر اسے یقین ہے کہ اسے یونیسکو کا
وظیفہ ضرور مل جائے گا۔ ارشد دانشور ہے اور بین الاقوامی
امن کے آدرش میں اور ان حقوق انسانی پر ایمان رکھتا
ہے جن کی تشریح اقوام متحدہ کے منشور میں کی گئی ہے۔
آج کی خبر یہ ہے کہ الجزائر میں سو مسلمان گولی سے ہلاک
ہو گئے۔ الجزائر میں ایک دن میں سو مسلمان ہلاک اور
دو سو زخمی ہوئے۔ اقوام متحدہ کے ٹھہر والوں سے ایک الجزائری
رہنما یہ کہہ رہا ہے کہ وہاں دو ہزار سے زیادہ مسلمان کھیت
ہو چکے ہیں۔ اور مجھے پھر سنہ ۴۷ء کے دن یاد آ رہے ہیں۔
الجزائر پر شاید سنہ ۴۷ء ٹوٹ پڑا ہے۔ اور وہ شخص جو چپ چاپ
حبش خاں سے گم ہوا تھا آج کہاں ہوگا؟ عرب قصبہ کی
گلیوں میں ہلچل ہے اور باب الاحد میں مسلمانوں کا ہجوم
بڑھتا چلا جاتا ہے۔

ہاتھ میں پرچم
سینے میں گولی

اوران - ۱۵ دسمبر

فرانسیسی حفاظتی دستوں نے آج ایک نوجوان الجزائری
مسلمان کو گولی سے مار دیا۔ یہ نوجوان اوران شہر کے
بڑے چوک میں محاذ آزادی قوم (ایف ایل این) کا
پرچم بلند کئے اسے گردش دے رہا تھا۔

(رائٹر، اے پی)

تو چپ چاپ حبش خاں کا گم شدہ شخص چپ چاپ حبش خاں سے
نکل کر کس طرف گیا ہوگا۔ شاید گم ہونے والے گم نہیں ہوا کر

[illegible] ہے۔ احد آج کی خبر یہ ہے کہ الجزائر میں سو
[illegible] ہو گئے۔ ارشد کو اطمینان ہے کہ اس موقعہ
[illegible] پال سارتر ضرور کوئی بیان دے گا۔ ارشد انسانیت
کے مستقبل سے مایوس نہیں ہے کہ منشور حقوق انسانی ظہور
میں آچکا ہے۔ اور میرا تصور زمانۂ ماقبل منشور میں بھٹک
رہا ہے۔ اُحد، اور کربلا، اور ہسپانیہ کے ساحل، اور سرنگاپٹم
میں سوچ میں پڑ جاتا ہوں کہ الجزائر بھی کہیں واقع نہ ہو۔
پھر میں حیران ہونے لگتا ہوں کہ اک مشت خاک کہاں کہاں
پھیلی ہوئی ہے۔ تو عرب قصبے کے مقتل ہونے اب الجزیرہ
کے قلب سے کتنی دور ہوں گے؟ عرب قصبے کے گرد ا
گرد تار کھینچے ہیں۔ خار دار تار کی سرحد سے الجزیرہ کے
قلب تک سنگینیں تنی ہیں۔

"آخر ان لوگوں کے دماغ میں کیا سمائی ہے" ظفر
پریشان ہو کر کہتا ہے "کہیں چاقوؤں سے بھی مشین گنوں کا
مقابلہ ہوا ہے"

میرا تصور پھر بھٹک رہا ہے۔ کاش اس روز اپنی
تلوار نہ ٹوٹی ہوتی۔ صحرا کی ہوا اور دامن کی آگ آخر اسے
کہاں اُڑا لے گئی۔ اور میری نظر اپنے دامن پر جاتی ہے۔
دامن کی آگ اب تک بھڑک رہی ہے؟ اور الجزائر! الجزائر
ہمارے دامن کی آگ ہے۔ اور میں دامن کی آگ سے
غافل الجزائر کے محل وقوع سے بے خبر افسانہ لکھنے سے
معذور سوچتا ہوں کہ میں کس جہاز کا مسافر ہوں اور کیا
شے عزیز بھول گیا ہوں۔ مگر ذکر عرب قصبے والوں کا تھا۔
تو عرب قصبے کے لوگ الجزیرہ کے قلب سے اب کتنی دور
ہوں گے؟ جو موت سے بھاگتے ہیں وہ موت ہی کی طرف
بھاگتے ہیں۔ مگر وہ جو موت کی طرف لپکتا ہو؟ مور چہ سے
مورچہ کی طرف لپکتا ہوا وہ شعلہ مدینہ کی ٹھنڈی گلیوں میں
بھکاری فقیر کی پُرسوز صدا بن گیا۔ جو موت کی طرف لپکے انہیں
مردہ مت جانو۔ وہ اب بھی کسی مورچے پر لڑتے ہوں گے مگر
یہ کہ ہمیں نظر نہیں آتے۔ افسوس ہے ان مورچوں پر جو ٹھنڈے
ہو گئے۔ افسوس ہے ان آنکھوں پر جنہوں نے دامن کی آگ
کو نہ دیکھا۔ اور اگر سوچو تو آج بڑے افسوس کا دن ہے۔
پرچم اس کے ہاتھ میں تھا، گولی اس کے سینے میں لگی، اور
عرب عورتیں اپنے شہیدوں پر گریہ کرتی تھیں۔ اور وہ ایک
شہید تھا جس کے لئے گریہ کرنے والا کوئی نہ تھا۔ تب عرب
عورتیں اپنے اپنے گھروں سے اس خاموش گھر میں گئیں
اور بلا امتیاز قبیلہ جمع ہو گئیں اور انہوں نے حمزہ کیلئے
گریہ کیا۔ اور ارشد کل ذکر کرتا تھا کہ فرانس کی مزاحمتی تحریک
پر ایک نیا ناول آیا ہے۔ ارشد نے جس چاؤ سے اسپین کی
خانہ جنگی سے متعلق ناول جمع کئے تھے اسی چاؤ سے فرانس کی
مزاحمتی تحریک کے بارے میں لکھی جانے والی چیزیں جمع کی
ہیں۔ ارشد دانشور ہے اور منشور حقوق انسانی میں ایمان
رکھتا ہے اور ہنگری والوں کے جوش آزادی کا معترف ہے۔
افسوس ہے مدینہ کی ان عورتوں پر جو حمزہ کے سوگ میں نہ
بیٹھیں۔ افسوس ہے اس پر جس نے مرغ کے بانگ دینے
سے پہلے پہلے تین بار اپنے رفیق کا انکار کیا۔ افسوس اس
قلم پر جس نے دامن کی آگ کا افسانہ نہ لکھا۔ اور اگر سوچو
تو آج بڑے افسوس کا دن ہے۔ وہ شخص جس کے ہاتھ میں سرخ
پنجہ والا سبز و سفید پرچم گردش کرتا تھا اور گولی جس کے
سینے میں لگی منوں مٹی کے نیچے سوتا ہے۔ اور وہ جنہیں
دامن کی آگ اور صحرا کی ہوا بستیوں سے دور لے گئی۔
سونے جنگلوں میں آندھی سے اکھڑی ہوئی کھجوروں کے
تنوں کی مثال وہ گرے پڑے ہیں۔ صحرا کے غبار نے انہیں
چادر اڑھائی اور ہواؤں نے ان کے لئے گریہ کیا۔

"کیا بج گیا؟"

ارشد جو ابھی ابھی [illegible] سے ملاقات کے بعد علامہ
اقبال کا قائل ہو گیا ہے گھڑی کو کان سے لگاتا ہے پھر جواب
دیتا ہے "ساڑھے گیارہ"

"آج جاڑا ہے۔ چلو بھئی" اور ہم بڑبڑا کر رہ گئے

ہوتے ہیں۔
"بارش نہیں ہوئی۔ اب کے خشک سردی ہے" باہر
نکلتے ہوئے ہمارے دانت بجنے لگے۔
"سردی تو خیر لندن میں بھی ہوتی ہے" ارشد
نے اپنے اوورکوٹ کے بٹن لگاتے ہوئے کہا "مگر یہ کمبخت
خشک سردی جسم کو کاٹتی ہے"
کہرے میں مال کی منور روشنیاں دھندلا گئی ہیں۔
خشک سردی ہماری کنپٹی اور کانوں کو چاقو کی دھار کی مانند
کاٹتی ہے۔ اور آج کی خبر یہ ہے کہ الجزیرہ میں بہت بارش
ہوئی ہے۔ پانی سے شرابور مظاہرین باب [illegible] میں جمع ہیں۔

جیل کورٹ کی ایک گلی میں اوپر سے گولیاں آ رہی ہیں اور [illegible]
بارہ سالہ عرب زادے کو گلی سے نکلنے کا راستہ نہیں مل [illegible]
عرب عورتیں اُحد کے شہیدوں پر گریہ کرتی ہیں۔ ان کے
بیٹوں نے اپنی کشتیاں جلا دیں اور اپنے نیام توڑ ڈالے
اور ان کے ہاتھ میں ٹوٹی تلوار ہے۔ تو اب مظاہرین کس [illegible]
موڑ پر ہوں گے؟ الجزیرہ کا قلب عرب قصبہ [illegible]
دور ہے؟ عرب قصبے کے گرداگرد خاردار تار کھنچے [illegible]
بلندیوں سے عرب عورتوں کے بین کی صدائیں آ [illegible]
ہیں۔ بارہ سالہ عرب لڑکا جیل کورٹ کی گلی میں اکیلا
ہے۔ دامن کی آگ بھڑکتی جاتی ہے۔ اور الجزائر کے
صحراؤں میں ہوا بہت تیز چلتی ہے۔

اذیت بند کرو

پروفیسر رینے کیپتاں کا خط، فرانس کے وزیرِ تعلیم کے نام

جنابِ والا۔ آج 'جرنل پارلے' میں یہ خبر میری نظر سے گزری کہ علی بومنجل نے الجزیرہ میں چھت سے کود کر خودکشی کر لی۔ اس تشدد سے بچنے کے لئے جو پولیس [illegible] کے بہانے روا رکھتی ہے۔

جن دنوں میں شمالی افریقہ میں تحریکِ مزاحمت کی رہنمائی کر رہا تھا، علی بومنجل الجزیرہ کی قانون کی فیکلٹی میں میرا طالب علم تھا۔ مجھے ان حالات میں اس کی موت واقع ہونے سے بہت صدمہ پہنچا ہے۔ اس سے افسوسناک طور پر اُن بیانات و واقعات کی تصدیق ہوتی ہے جو ہم نے چند دن قبل پی۔ ایچ۔ سائمن کی کتاب "[illegible] بند کرو" میں پڑھے تھے۔

جب تک میرے ملک کی حکومت اس قسم کی اذیت جو ہم جنگ کے دنوں میں جرمن قیدیوں کو بھی نہ دیتے تھے، الجزائریوں پر روا رکھے گی۔ میرے لئے فرانس کی کسی بھی سرکاری درس گاہ میں درس جاری رکھنا ممکن نہ ہوگا۔ میں پڑھانا بند کر دوں گا۔

آپ اگر چاہیں اور کر سکتے ہوں تو مجھے برطرف کر دیجئے۔ میں ہر ایسے اقدام کا خیر مقدم کروں گا جس سے ایسے واقعات کے خلاف میرا احتجاج زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے جو فرانس کی بدنامی کا باعث بنتے ہوں۔

الجیریا بانی

بے کس بے ہتھیار کلا نے بھیجا ہے پیغام
جو نہ لکھے الجیریا بانی اُس پر شعر حرام

اِس پیغام کو خون کی دھاریں بہہ بہہ کر چمکائیں
خون کی دھاریں جن کے سوتے خشک نہ ہونے پائیں

خشک نہ ہونے پائیں یہ سوتے بنتے جائیں تال
گہرے گہرے خون کے تال کھڑا دیکھے ڈیگال

اِس ڈیگال کا دیس ہے روسو' والٹیر کا دیس
روسو' والٹیر کے دیس نے بدلے کیا کیا بھیس

اک وہ بھیس کہ جس کی گرمی راکھ کرے بستیل
اک یہ بھیس کہ جس پر روئیں راوی دجلہ نیل

راوی دجلہ نیل یہ ہی کیا گنگا جمنا روئیں
گنگا جمنا نہیں اکیلے جگ کے دریا روئیں

جگ کے دریا روئیں تو غالی چپ بیٹھا شرمائے
چپ بیٹھا شرمائے کہ غالی حلوہ روٹی کھائے

غلوہ رو دی کھا مرے پیارے پی چھین کے جام
تو جس دیس کا راگ الاپے وہاں ترا کیا کام

وہاں ترا کیا کام جہاں پر گھومیں لاکھوں ناگ
گھومیں لاکھوں ناگ کہ جن کے روئیں روئیں ہے آگ

برسے آگ اندھیاریا پر اور بھڑکیں سات آکاش
سات آکاش جلیں اور کبھو یں ہونا نہیں نراش

ہونا نہیں نراش کہ پیارو جاگ اُٹھے ہیں ضمیر
کانر کا من جاگ اُٹھے تو سو ویروں کا ویر

جاگا جگ اور ہاتھ اُٹھے اور کھنچ گئی ایک کمان
کھنچ گئی ایک کمان کہ جس سے چھوٹیں پل پل بان

بان چلیں اور پیرس رانی سہمی سہمی جائے
پیرس رانی ڈری تو پنڈت یو۔ این۔ بھی گھبرائے

یو۔ این۔ جی کا جنتر منتر دھن اور گیان اور دھیان
آج نہیں تو کل دیکھیں گے سگے بڑا بلوان

دو سو برس پہلے چھینا تھا یونہی تمہارا تاج
پیرس رانی آنکھیں کھولو پر جا مانگے راج

گہوارۂ جنوں

الجیریا کہ آج ہے گہوارۂ جنوں،
کل یک چمن بدوش، بہاراں نصیب تھا
ہنگامہ ہائے شوق سے کتنا قریب تھا
اور اس کے صبح و شام
اک نوعروسِ وقت کا زیور بنے ہوئے
عصر آفرینیوں کے پیمبر بنے ہوئے
خوش گشت و خوش خرام!
ناآشنائے منزل و نامحرمِ مقام!
آسودۂ بہار تھے راہِ حیات میں
نغمے ہوں جیسے محوِ نموِ کائنات میں

لیکن — خرامِ وقت نے پھونکا ہے وہ فسوں
الجیریا ہے آج الم زارِ کُشت و خوں
آج اس کی صبحیں خوں میں نہاں ہوئی سی ہیں
آج اس زمیں پہ آندھیاں چھائی ہوئی سی ہیں

ان آندھیوں میں پہلے بھی کڑکی ہیں بجلیاں
دیوِ ستم نے پہلے بھی پرچم اڑائے ہیں
پہلے بھی دل کے زخموں میں تھی غم کی داستاں
ظلم و جفا نے پہلے بھی مقتل سجائے ہیں

ذوقِ طلب تھا، ذوقِ عمل تھا کہ عزم تھا
مجبور جب بھی نکلے ہیں تیغ دو دم بدست
کھائی ہے اقتدار نے ہر گام پر شکست!
سنگِ گراں بنے تھے جو راہوں میں ٹل گئے
یوں بھی تو زندگی کے طریقے بدل گئے۔

ویت نام ہو کہ مصر ہو تیونس کہ چین ہو
اپنی جگہ پہ لالۂ خونیں جگر تھے سب،
ذوقِ عمل نے بخشی انھیں اک حیاتِ نو
آج اپنی زندگی کے وہ خود ہی نقیب ہیں
منزل تلاش راہی تھے۔ منزل نصیب ہیں

الجیریا بھی ہے انھی راہوں میں گامزن
سرگشتہ و خراب جنوں، تیرہ پیرہن
اور اس کے سخت کوش مجاہد، وہ صف شکن
رنگیں ہے جن کے خون سے افسانۂ وطن
پھولوں کی طرح دامن کفنیں سجاتے ہیں
اُن کے جنوں بدوش عزائم کے ساتھ ساتھ
کلیوں کے خوں کشیدہ چمن جھلملاتے ہیں۔

یہ امتزاجِ برق و شرر، جہدِ پُر اثر!!
ہر سانس کا شمار تقاضائے زیست ہے
طوفاں ہو یا شرار، تقاضائے زیست ہے؛
اور۔ زندگی یہ ہے کہ ابھی چوٹ کھائے گی
یہ زندگی شعور کے محور بنائے گی
نغمے چٹانوں کے بربطِ عزم سے بہ اہتمام
صبحِ نو کی پہلی کرن مسکرائے گی

ایک نازک کرن

(جمیلہ، الجزائر کی بیٹی)

ایک نازک کرن
بے کراں ہو گئی
ایک زخمی کلی
گلستاں ہو گئی
خوں چکاں سرزمیں
خوں فشاں ہو گئی
ایک زخمی اُڑی
اور نشاں ہو گئی

○

آندھیوں کے چلن!
ایک نازک کرن
لے کے انگڑائیاں
پھر جواں ہو گئی
بے کراں ہو گئی

○

اے قفس اے چمن
ایک گل پیرہن
دار پر جھوم کر
چوم کر بیڑیاں
جاوداں ہو گئی
ایک زخمی کلی
گلستاں ہو گئی

○

اے کشیدہ کماں
وہ غزالِ جواں
کھا گیا تیر، ہاں
لیکن اتنا کہوں
بہہ لیا ہے جو خوں

خاکِ ارضِ ختن
نور فشاں ہو گئی
پھوٹیں تابانیاں
سرزمینِ وطن
آسماں ہو گئی

○

تیرگی زادگاں
پنجۂ جور سے
خوں میں لتھڑی ہوئی
جو بھی زخمی اُڑی
صبح نو رو ز
مسکراتا ہوا
ضو فشاں، ضو فشا
اک نشاں ہو گئی

عبدالعزیز فطرت

حصارِ عظمتِ الجزیرہ

میں اک مسافر ہوں، اک مسافر
سکونِ قلبِ عزیز کی جستجو میں آوارۂ ازل ہوں
میں بحر و بر کے طویل و پُر پیچ راستوں سے
اُلجھ اُلجھ کر، ہزار مشکل سے
آن پہنچا ہوں تیرے در تک

سلام اے تابناک بستی، بہت مسافر نواز ہے تُو
تُو الجزائر کے غازیوں کا حصارِ عظمت ہے، الجزیرہ!
تری ہر اک رہگذر کے ذرّے
مجاہدانِ وفا کے ہمراز و ہمسفر ہیں
سلام تجھ پر،
کہ الجزائر کا قلب ہے تُو

غیور صحرا نورد غازی، جسُور باطل شکن مجاہد
کئی کئی بار تیری دیوارِ شہر کے سایہ میں رہے تھے
نئی نئی کامیاب جنگوں سے منتظر بھی
نئے نئے معرکوں کی تیاریوں میں اکثر
خود اپنی ہستی سے بے خبر بھی،

تری مسافر نوازیوں کی ہے دھوم ہر سُو
زمیں مسافر نواز ہے تو
مجھے یقیں ہے، کہ میرے دل کی تڑپ کو تسکین پہنچے گی
کہ تیری دیوار شہر کے ساتھ ساتھ انگور کی یہ بیلیں یہ تازہ خوشے
بڑی مسرت سے اپنی پُرکیف خوشبوؤں کو
ہواؤں کے دوش دلکش پہ
مُسافروں کے،
مُجاہدوں کے،
غبار آلود پاک چہروں کو چومنے پر اُبھارتے ہیں۔

میں دیکھتا ہوں،
کہ گرد صحرا میں لپٹے لپٹے پھر آ رہے ہیں
عمیق صحراؤں سے پلٹ کر
فرانس کے جور و ظلم سے بے دریغ پنجہ زنی کے شیدا
دلیر،
مردانِ حُر،
جوانانِ شعلہ فطرت،
فرانس کے دل کی تیرگی کو شعاعِ شمشیر دینے والے

ثباتِ ملت کی راہ صبر آزما کے رہرو
عدو پہ شبخوں اُلٹنے والے
وقارِ صحرا،
وقارِ دیں،
اور— وقارِ شمشیر کے محافظ؛
حیات تازہ کے خواب کو دلنواز تعبیر دینے والے
پھر آ رہے ہیں،
کہ اپنے زخموں کو تیرے تسکیں بخش سایوں میں،
تیری شفقت کی موج میں،

غبارِ صحرا — اگرچہ اُن کا نقاب رُخ ہے
سمومِ صحرا — اگرچہ ان کی جبین عظمت پہ شبنمی ہے
تھکن بھی — اس پروقار رفتار سے عیاں ہے
(کہ معرکے اور محاربے اُن کی زندگی ہیں)

مگر،
یہ زخموں کے باوجود اپنی جان پہ کھیل جانے والے
یہ صد سکوں مسکرا رہے ہیں،
کہ تیرے سایوں میں آ رہے ہیں۔
حسین پیڑوں، جمیل خوشوں کی خوشبوؤں کے لطیف جھونکو!
تمہاری خواہش، کہ ان جیالوں کی پیشوائی کا حق ادا ہو؛

مجھے پذیرائی کے اس انداز سے نہایت خوشی ہوئی ہے
کہ تاک کے دلفریب خوشوں کی پیاری خوشبو
مجاہدوں کے عفیف ہونٹوں پہ ثبت کرنے چلی ہے بوسے

سنو،
آج اک اجنبی مسافر بھی آرزو مندِ دلبری ہے،
سلام اے زندہ دل جیالوں کی عظمتوں کے نشانِ تاباں!
سلام اے الجزیرہ،
اے تابناک بستی
سلام تجھ پر

یہ کوہ و صحرا
یہ دشت و دریا
یہ نجمہ بیچپن
یہ آفتاب اور یہ ماہتاب اور یہ نجوم رخشاں
گل و گلستاں
یہ سرو و ریحاں

حسین باغات، اور عمارات، اور صحابہ
جلالِ فطرت کے سب نمونے
یمِ صداقت کی موجِ رقصاں
نگاہِ مومن، دقایرِ اسلاف، و
اور ـــ جوانانِ قوم پرور
نثار تجھ پر،
کہ تیری عظمت کا حق ہے ایسا خراجِ تحسین،

سلام اے تابناک بستی! مری تو بس ایک آرزو ہے،
کہ تیرے آزاد معبدوں کے حسین مناروں کے زیرِ سایہ
کسی حسین کنجِ تاک میں بیٹھ کر میں ان تیغ آزماؤں سے عہد باندھوں
کہ اُن کا عزم و ثبات لے کر
میں زندگی کے محاربوں میں شریک ہوں گا
میں حق و باطل کے معرکوں میں ہمیشہ حق ہی کا ساتھ دوں گا
جیوشِ ظلم و ستم کو میدانِ زندگی میں
مجاہدوں، اور غازیوں کی طرح قضا کا پیام دوں گا،
دعا یہی ہے، دعا کا حسنِ قبول پاؤں
سکونِ قلب عزیز پاؤں

میں اک مسافر ہوں، اک مسافر
سکونِ قلب عزیز کی جستجو میں آوارۂ وطن ہوں
میں بحر و بر کے طویل و پُر پیچ راستوں سے
اُلجھ اُلجھ کر ہزار مشکل سے
آن پہنچا ہوں تیرے در تک
سلام اے تابناک قریہ،
بہت مسافر نواز ہے تو
تو الجزائر کے نازیوں کا حصارِ عظمت ہے
الجزیرہ!

[illegible] مارنا ہمارا معمول ہے۔ آدمی ہمیشہ سے
[illegible] کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا رہا ہے
[illegible] مفاد میں قوت ارادی کے اس نرالے مقابلہ
[illegible] کے مقاصد بنیادی طور پر مختلف نظر آتے ہیں۔
[illegible] کے آدمی پن کے مقابل خم ٹھونک کر کھڑا ہو جاتا ہے
[illegible] کشتی کچھ یوں لڑی جاتی ہے گویا دونوں فریق ایک ساتھ
[illegible] نسل میں شامل نہیں رہ سکتے۔

اذیت کا منشاء یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص کو بولنے یا جاننے
[illegible] کیا جائے اس کا منشا یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کو دغا دے۔
[illegible] یہ ہے کہ معتوب شخص روئے گڑگڑائے اور گھٹنے ٹیک
[illegible] وہ سب کی نظروں میں اور خود اپنی نظروں میں
ایک ذلیل و پست حیوان بن کر رہ جائے۔ مطلب یہ ہے کہ اس
کی دغابازی اسے تباہ کر دے اور اس سے اس کا انسانی وقار
چھین لے۔ جو شخص پوچھ گچھ پر بول پڑتا ہے۔ اس پر پھر بات کرنے
کے دروازے بند نہیں ہو جاتے۔ بلکہ اسے ایک نئی حیثیت
بخش دی جاتی ہے۔ انسان سے ادنیٰ مخلوق کی حیثیت۔

الجزائر میں کچھ ایسی متضاد صورتیں پیدا ہو گئی ہیں کہ
ان میں مفاہمت جلدی نہیں ہو سکتی۔ ہر فریق فریقِ مخالف کے
مکمل اخراج کا طالب ہے۔ ہم نے عربوں سے ایک ایک کر کے
ہر چیز چھین لی ہے اور اب ہم نے ان کے لئے ہر شے کی یہاں
تک کہ ان کو اپنی زبان کے استعمال کی بھی ممانعت کر دی ہے
جس سے ہم پر پہلے ہی یہ ثابت کر دیا ہے کہ نوآبادیات کے
[illegible] کس طرح وہاں کی مخلوق تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ ہم
نے ان کی تہذیب کا صفایا کر دیا اور اپنی تہذیب کا دروازہ
ان پر بند رکھا۔ انھوں نے در خود سعی کی کہ ہمیں اپنے معاشرہ
میں شامل اور جذب کر لو۔ ہم نے انکار کر دیا۔ اگر ہم نوآبادیات
کی مخلوق کو نوآبادکاروں کے برابر حقوق دے دیتے تو ہم
نوآبادیات کو کس طرح لوٹتے کھسوٹتے۔ بھوکے ننگے، تعلیم سے
محروم [illegible] سے ناآشنا، نوآبادیاتی نظام نے انھیں [illegible]

[illegible] زندگی ہوتے تھے
[illegible] رہ سکتے۔ آقاؤں کے
مسلسل دباؤ کے تحت ان کے ذہن کا معیار سال بہ سال
گھٹتا چلا گیا۔

جب محرومی و ناداری نے انھیں بغاوت کی راہ پر
ڈال دیا تو اس قدیم مخلوق کے سامنے دو راستے تھے کہ یا تو
بھوکی مر جائے یا ہماری آدمیت کا جھنڈا گاڑ دے۔ وہ ہماری
ان سب قدروں کو اس کلچر کو جسے ہم اعلیٰ و برتر سمجھتے ہیں رد
کر دیں گے اور اب ان کا نصب العین یہ ٹھہرا ہے کہ وہ اپنے
آدمی ہونے کے دعویٰ کا علم بلند کریں اور ہماری فرانسیسی قومیت
کو ٹھکرا دیں۔

یہ بغاوت آبادکاروں کی طاقت ہی کو نہیں للکار رہی
وہ ان کی ہستی تک کو للکار رہی ہے۔ الجزائر میں اکثر یورپ
والوں کے لئے دو حقیقتیں وجود رکھتی ہیں جو ایک دوسرے کا ضمیمہ
ہیں اور ایک دوسرے سے الگ نہیں کی جا سکتیں یہ کہ انھیں خدائی
اختیار حاصل ہے اور یہ کہ مقامی باشندے انسان سے ادنیٰ
مخلوق ہیں۔ اصل میں یہ ایک حقیقت کی تصوراتی تفسیر ہے کیونکہ
ایک کی خوبی دوسرے کی امارت کی بنیاد ہے۔

اسی طرح سے لوٹ کھسوٹ لوٹنے کھسوٹنے والے کو لٹنے
پٹنے کے رحم و کرم پر ڈال دیتی ہے اور ایک کا دوسرے کے
رحم و کرم پر ہونا ہی نسل پرستی کو جنم دیتا ہے۔

یہ بڑی تلخ اور المناک حقیقت ہے کہ الجزائر میں یورپ
والوں کے لئے آدمی ہونے کے معنی فقط یہ ہیں کہ وہ مسلمانوں
سے برتر اور فائق ہو لیکن اگر مسلمان اپنے طور پر یہ سوچے کہ
اس کی آدمیت کا انحصار آبادکاروں سے [illegible] حاصل
کرنے پر ہے تو بتائیے اس کا کیا جواب ہے۔ جب یہ صورت
حال پیدا ہو جاتی ہے تو یورپ کے [illegible] معلوم ہوتا ہے [illegible]
کر اس کی حیثیت گھٹ گئی ہے اور وہ حقیر ہو چلا ہے۔
محکوموں کی آزادی کے [illegible]

جمیل جالبی

الجزائر اور ہمارے دانشور

ندھیری رات میں ایک دفعہ ہم جنگل سے گزر رہے تھے
ار کی تیز روشنی کے سامنے ایک جنگلی خرگوش آگیا اور کچھ
ا کر گھبرایا کہ وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ پچھلے دنوں جب صدر
ل صاحب الجزائر کے دورے پر تشریف لے گئے اور وہاں
کے خلاف زبردست خونی مظاہرے ہوئے اور وہ اپنے
ے کو مختصر کر کے واپس لوٹے تو مجھے وہ جنگلی خرگوش یاد
جو اندھیری رات میں تیز روشنی کے سامنے کھڑا کا کھڑا
یا تھا اور جس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے
دھر جائے۔ یہی حالت آجکل فرانس میں دیگال صاحب
ہے۔ ایک طرف تو وہ فرانس میں ذہنی آزادی کو کچل رہے
اور دوسری طرف الجزائر کے بارہ لاکھ فرانسیسی ان کی
ت کا تختہ الٹنے کے درپے ہیں۔ ان بارہ لاکھ فرانسیسی
ں کے مفاد کے تحفظ کے لئے پانچ لاکھ فرانسیسی فوجیں اس
ات سال کے عرصہ میں ایک لاکھ سے زائد الجزائری
نوں کی جانیں لے چکی ہیں۔ دیگال صاحب غالباً یہ بھول
یں کہ خون کا ہر قطرہ انقلاب کی قوت کو تازہ دم کر دیتا
۔ انڈوچین میں فرانس کی فوجیں جس طرح مار کر نکال
ی تھیں فرانس والے اس عبرتناک سبق کو شاید بھلا
یں ورنہ وہ الجزائر کے مسئلہ کو اس طرح الجھائے نہ رکھتے۔
ں کے اس انسانیت سوز اور وحشی رویے کی مذمت
ے کرتے مجھے یہ خیال آیا کہ ہم تو خیر سے الجزائر کے

حامی ہیں آخر ہم نے اب تک کیا کیا ہے؟ جب اس بات کا
تجزیہ کیا تو مجھے احساس ہوا کہ اس سلسلے میں ہمارا کوئی رد
ہی نہیں ہے۔ اور اگر کوئی رویہ ہے بھی تو وہ ایک عام سا
رویہ ہے۔ جو ہر اس شخص کا ہو سکتا ہے جس نے اپنی زندگی
میں ایک بار بھی اخبار پڑھا ہو۔ ہمارے ملک کے دانشور تو
اب اس حالت کو پہنچ گئے ہیں۔ جہاں کسی چیز کا اثر ہی نہیں
ہوتا۔ ہم نے ادب کو ہر چیز سے الگ کر کے اس کے چاروں
طرف ایک حصار باندھ دیا ہے اور بزعم خود یہ سمجھ رہے ہیں
کہ ادب اور ادیبوں کا معاشرہ کی سرگرمیوں، بین الاقوامی
حالات، سیاست اور اس کے مسائل سے کوئی تعلق ہی نہیں
ہوتا۔ ادب تو گویا ایک ایسی چیز ہے۔ جو انسان کے اندر کے
خلاؤں سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی وہ رویہ ہے جس نے ہمارے
حواس کو کند اور ہمارے احساسات اور تخلیقی صلاحیتوں کو
مردہ کر دیا ہے۔ ظاہر ہے جب ادیبوں کا یہ حال ہوگا تو ادب
میں کسی تخلیقی کارنامے کی آس لگانا بذات خود ایک جہل
سی بات ہے۔ ہمارے ادیب نہ اپنے دور کے حالات و
عوامل سے کوئی ذہنی دلچسپی رکھتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا
ہے کہ وہ اس دور میں زندہ بھی نہیں ہیں۔ نہ وہ اپنے زمانے
سے اثر قبول کر رہے ہیں اور نہ اس پر اثر انداز ہو رہے
ہیں۔ ان کا یہی مجہول رویہ ہے جس نے انہیں دھوبی کا کتا
بنا کر رکھ دیا ہے جو روز صبح کو گھاٹ جاتا ہے اور دن

علیحدہ ہوکر یا تو وہ گھٹتا رہتا ہے یا خالی الذہن ہوکر آنے جانے والوں کو دیکھتا رہتا ہے اور شام کو دھوبی کے ساتھ اسی راستے سے گھر لوٹ جاتا ہے۔ یہ بات تو ادب کے ہر طالب علم کو معلوم ہے کہ دانشوروں کی صرف ان نسلوں نے ہی کچھ کام کیا ہے جو اپنے دور میں ایک متحرک اور فعال قوت کی حیثیت سے زندہ تھیں۔ شبلی نعمانی کے دور ہی کو لیجئے۔ یہ نسل الگ تھلگ رہ کر ادب تخلیق نہیں کر رہی تھی بلکہ معاشرہ کے اندر ایک فعال قوت کی حیثیت سے زندہ تھی۔ ہر واقعہ ان کو متاثر کرتا تھا اور وہ ذہنی طور پر حرکت میں آجاتے تھے۔ جنگِ بلقان کے موقع پر سارے دانشوروں نے ہندوستان بھر میں نہ صرف ایک ہنگامہ برپا کر دیا تھا بلکہ اپنے اپنے طور پر اپنے ردِعمل کا اظہار بھی کر رہے تھے۔ خود شبلی نعمانی نے "شہر آشوب اسلام" لکھا ؎

مراکش جا چکا، فارس گیا، اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض سخت جاں کب تک

یہ سیلاب بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے
اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک

کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو
یہ ظلم آرائیاں تا کے، یہ حشر انگیزیاں کب تک

نگارستانِ خوں کی سیر گر تم نے نہیں دیکھی
تو ہم دکھلائیں تم کو زخمہائے خونچکاں کب تک

عروس بخت کی خاطر تمہیں درکار ہے افشاں
ہمارے ذرہ ہائے خاک ہوں گے زر فشاں کب تک

"جنگ بلقان" کا اثر سارے ملک کے دانشوروں پر اتنا گہرا تھا کہ وہ ذہنی محاذ پر جنگ بلقان ہندوستان میں لڑتے رہے اور تو اور ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں ایک طبی مشن بھی محاذ جنگ پر روانہ کر دیا۔ تحریک خلافت چلی تو سارے دانشور پیش پیش تھے۔ پھر یہی نہیں اسی قوت کے سہارے انھوں نے ادب میں کارہائے نمایاں بھی انجام دیئے وہ زندہ لوگ تھے۔ انھوں نے زندگی کو پورے طور پر ساتھ دیا۔ اسے قبول بھی کیا اور اسے بنایا سنوارا بھی۔ جب اثر قبول کرنے اور ردعمل کے اظہار کا یہ عالم ہو تو ظاہر ہے تخلیقی صلاحیت بھی بہت تنومند اور جاندار ہوگی۔ ایک ہماری نسل ہے کہ آندھی آئے یا طوفان اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوتی۔ ہم یا تو ماضی میں زندہ ہیں یا مستقبل میں اور یہ بھول گئے ہیں کہ بغیر حال کے نہ ماضی کوئی حقیقت رکھتا ہے اور نہ مستقبل کوئی معنی رکھتا ہے۔ اگر ادب صرف حصار میں بند ہوکر پیدا ہو سکتا تو ملک کے سارے سادھو اور رشی منی سب سے بڑے ادیب ہوتے

الجزائر کے سلسلہ میں ہمارا رویہ صرف یہ ہے کہ فرانس کا رویہ نہایت انسانیت سوز اور شرمناک ہے لیکن صرف اتنا کہہ دینے سے تو بات نہیں بنتی۔ یہ بات تو وہ بھی کہہ رہے ہیں جو مغرب میں رہتے ہیں۔ کرشنا مینن صاحب بھی یہی کہہ رہے ہیں اور کنیڈا کے وزیر خارجہ نے نیٹو کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے بھی ایسی ہی باتیں کہی تھیں۔ اپنے ملک کے دانشور کی حیثیت سے ہم سے تو یہ بھی نہ ہوا کہ ہم اپنی حکومت ہی سے مطالبہ کرتے کہ الجزائر کی عارضی حکومت کو تسلیم کرے۔ اب تک افریقہ و ایشیا کے ممالک نے بھی ایک دو کو چھوڑ کر الجزائر کی عارضی حکومت کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ کسی افریشیائی ملک کو یہ توفیق بھی نہ ہوئی کہ وہ فرانس سے تجارتی و سفارتی تعلقات منقطع کرنے کی دھمکی ہی دے دیتا ویسے ہم سب لوگ صبح سے شام تک اٹھتے بیٹھتے استعمار پسندی کو گالیاں دیتے رہتے ہیں۔ اگر الجزائر کی عارضی حکومت کو افریقہ ایشیا کی ساری قومیں تسلیم کر لیتیں اور فرانس سے تجارتی و سفارتی تعلقات منقطع کر لیتیں تو خود الجزائر کے مسئلہ میں کتنی جان پڑ جاتی!۔ ہم سے اچھے تو وہ بیدار ضمیر[۱۲۱] فرانسیسی دانشور ہیں جنہوں نے کھلے بندوں الجزائر کی حمایت

بہانے قلم کا سہارا لیا ہے۔ جنہوں نے فرانس میں یہ تحریک چلائی ہے کہ فرانسیسی نوجوان الجزائر میں فوجی خدمات انجام نہ دیں۔ جنہوں نے الجزائر میں فرانسیسیوں کے ظلم اور تشدد کے خلاف آواز بلند کی ہے اور ہم صرف تماشائی بن کر تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ ہم اور کچھ نہ کرتے تو ایک مینی فسٹو ہی شائع کر دیتے جس میں ملک کے دانشوروں کا ذہنی رویہ واضح کر کے الجزائر کی حمایت کا واضح الفاظ میں اظہار کیا جاتا اور جس کے ذریعہ ہمارے ضمیر کی آواز دوسروں تک پہنچ سکتی۔ یہ لکھتے لکھتے مجھے خیال آیا کہ میں بھی تو شاید ادیب ہی میں سے ایک ہوں۔ اس سے زیادہ اور کچھ کیا سکتا ہوں ہاں خدا کی بارگاہ میں زبور مقدس کے یہ الفاظ ضرور دہرا سکتا ہوں:

اے خداوند! تو کیوں دور کھڑا رہتا ہے؟
مصیبت کے وقت تو کیوں چھپ جاتا ہے؟
(زبور ۱۰)

(بقیہ ص ۳۱) افسانہ۔ نوید انجم

انہوں نے اپنے ارد گرد دیکھ کر زور سے کہا، "یہ ہم ان کے لئے کر ہی کیا رہے ہیں؟"

پھر وہ اٹھیں، تیزی کے ساتھ کمرے میں گئیں، جلدی سے واپس آئیں اور جمیلہ کے ہاتھ میں اپنے ہاتھ کا بنا ہوا ایک سوئٹر دیتے ہوئے بولیں، "بیٹا تو اپنی سہیلی کو یہ بھیج دینا ـــ اور میں کیا کر سکتی ہوں اور کیا دے سکتی ہوں! پر تو اُسے خط میں یہ ضرور لکھنا کہ میری خالہ کہتی ہیں، "تم لوگ ہمت نہ ہار بیٹھنا، آزادی سب کا حق ہے، آزادی تمہیں ضرور ملے گی!" سب نے حیرت سے آپا جی کو دیکھا، ان کی آنکھوں میں آنسو بالکل نہ تھے!

پاکستان رائٹرز گلڈ (حلقہ کراچی) کی پندرہ روزہ

ادبی نشستیں

۱۔ ۶؍ جنوری ۶۱ء (جمعہ)

صدر — ڈاکٹر شوکت سبزواری
افسانہ — انور
نظم — منظر ایوبی
غزل — شان الحق حقی

۲۔ ۲۵؍ جنوری ۶۱ء (جمعہ)

صدر — مجتبیٰ حسین
طویل نظم — ن۔ م۔ راشد
غزل — حامد عزیز مدنی

۳۔ ۳؍ فروری ۶۱ء (جمعہ)

صدر — ن۔ م۔ راشد
مقالہ — نثار عزیز
غزل — سلیم احمد
نظم — ساقی فاروقی

ان ادبی نشستوں کا پروگرام "ہم قلم" میں ہر ماہ شائع ہوتا ہے۔ شرکت کی عام اجازت ہے۔ مقام: ہوٹل ایکسلسیر۔ صدر۔ ۶½ بجے شام

نجم

ایک دن، سَو سال

آپا جی کی گود سے اون کا گولا لڑھکتا ہوا صحن کے پکے فرش کے اس سرے تک جا پہنچا اور نظریں بہک کر جمیلہ پر جا ٹکیں۔

"اے بی بی" سنتو مہترانی نے دور ہی سے ہانک لگائی۔ "اتنی دیر سے بلا رہی ہوں، ذرا اٹھو تو فرش کی صفائی کر ڈالوں!"

آپا جی بھی بہکی آواز میں بولیں، "جمیلہ۔ اے بیٹا! ذرا ادھر تو دیکھنا!"

سنتو جواب میں بولی "جمیلہ بی بی تو اندر اپنے دوست کو خط لکھ رہی ہے!"

جمیلہ کمرے میں نکلتی ہوئی بولی۔ "اری نامراد دوست کدھر ہے؟ سہیلی ہے۔ سہیلی!"

سنتو کھی کھی ہنستی ہوئی پلٹی "اے بی بی تو میں کوئی جھوٹ بولی ہوں!"

آپا جی جیسے ان تمام باتوں سے بے خبر سر کو قدرے جھکائے بیٹھی تھیں اور اون کے گولے سے چتکبرا بونگرا کھیلنے لگا تھا کبھی وہ گولے کو کھیل کر دائیں طرف لے جاتا تو کبھی بائیں طرف پھینک دیتا، اون کھل کھل کر سارے میں ایک جال سا بننے لگی، جمیلہ نے لپک کر گولا اٹھایا۔ "خالہ جی! کس خیال میں ہو؟ دیکھو تو ساری اُون کا ناس مار ڈالا ــ!"

آپا جی نے چونک کر سر جھکایا، جمیلہ کو ایک گہری نظر سے دیکھ اور اخبار سامنے کر کے بولیں، "دیکھ تو یہ تیری فوٹو ہے؟"

"ہائے!" جمیلہ نے سینے پہ دونوں ہاتھ دھر لئے اور اخبار پہ لپک گئی، سنتو پیچھے آ کر دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ "یہی بی بی تمہاری چھوٹی چھپ گئی!"

"اے لو میری فوٹو کیوں ہونے لگی۔ یہ تو کوئی اور جمیلہ ہے!" جمیلہ نے سانس روک کر کہا۔ "پر ہائے خالہ جی اس کی شکل مجھ سے کتنی ملتی ہے۔"

سنتو نے ٹانگ اڑائی۔ "یہ تو جمیلہ بی بی کی بہن معلوم دے ہے"

جمیلہ ایسے میں سنتو کا دخل دینا کبھی برداشت نہ کرتی یہ بات ہی کچھ ایسی تھی، سنتو کو نظر انداز کر کے آپا جی آکس نے خبر لے لیا اور بڑی تیزی سے پڑھنے لگی، آپا جی کی نظریں کسی خلا میں ڈوب گئیں اور سنتو چپ چاپ کھڑی کبھی تصویر کو اور کبھی ان دونوں کو دیکھنے لگی، جمیلہ نے پڑھنا چھوڑ کر دوبارہ تصویر کو دیکھا اور پھر اک ہلکی سی آہ اُس کے لبوں میں سے نکلی اور چپ چاپ سی کھوئی کھوئی نظروں سے آپا جی کو دیکھنے لگی، سنتو سے نہ رہا گیا، پوچھ بیٹھی، "بی ــ یہ کون ہے؟"

جمیلہ نے دھیرے سے کہا۔ "مسلمان لڑکی ہے۔ الجزائر کی جمیلہ ہے۔" اور پھر درشت لہجے میں منہ پھیرتے ہوئے بولی "چل اپنا کام کر تجھے کیا خبر دنیا میں کیا ہو رہا ہے!"

آپا جی نے سر اٹھاتے ہوئے کہا "اللہ خیر کرے، انسانوں کا خدا ہی نگہبان ہے!"

جمیلہ اپنے کمرے میں آ کر خط کو مکمل کرنے بیٹھی، پر اس سے اب کچھ لکھا ہی نہ جاتا تھا، خیال کے سمندر میں ایک طوفان سا اٹھ رہا تھا اور وہ اس میں بہتی چلی جا رہی تھی، طوفان کے تھپیڑے اسے ڈبونے پر تلے ہوئے تھے، بس وہ ہلکوروں میں جیسے کبھی کبھی چونک سی جاتی اور اپنے ارد گرد

دیکھتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے چاروں اور دھواں پھیل رہا ہے اور ہر چیز کسی ٹھوس دھند کی زد میں آ چکی ہے۔

گھبرا کر اس نے ہاتھ سے قلم رکھ دیا اور لفافے پر لکھا ہوا پتہ غور سے دیکھا، ایک غمگین مسکراہٹ اس کے لبوں پر آ کر رو دی اور زیر لب وہ بڑبڑائی۔ "فاطمہ تم نے میری تصویر مانگی ہے، کیا تم نے اپنے ملک کی جمیلہ کو نہیں دیکھا؟"

کچھ دیر تو سارے میں اس بات کا چرچا رہا کہ جمیلہ کی ہم شکل اور ہم نام لڑکی کی تصویر اخبار میں چھپی تھی، ابا میاں دفتر سے آتے تو سب سے پہلے اماں جی نے یہ بات بتائی پھر بھیا آتے تو وہ پہلے ہی سے تصویر دیکھ چکے تھے، آتے ہی انہوں نے جمیلہ کو چھیڑنا چاہا، "بھئی بڑی بہادر ہو ــ بہادری کی داستانیں سارے اخباروں میں چھپی ہوتی ہیں......"

جمیلہ نے اضطراب سے اپنے ہونٹوں کو دانتوں تلے دبایا۔ "مجھے مت چھیڑو ــــ" اس نے روہانسی آواز میں کہا۔ "اماں سے کہہ دونگی!"

ابا میاں نے خلاف توقع بھیا کی طرفداری کی۔ "ارے اسی لئے تمہاری بیٹی الجزائر کی فاطمہ سے قلمی دوستی رکھے ہوئے ہے!"

آپا جی قریب بیٹھی تھیں، چونک کر بولیں، "ہاں بیٹا سنتو کہہ رہی تھی تم اپنی سہیلی کو خط لکھ رہی تھیں۔ لکھ دیا؟"

"ہاں!" اس نے جھوٹ بولا

"ارے ذرا خیال رکھنا۔ کوئی ایسی ویسی بات مت لکھنا، وہاں سنسر ہوتے ہیں، کہیں اپنی سہیلی ہی کو کسی مصیبت میں نہ ڈال دینا!" بھیا نے تیزی سے کہا۔

"مجھے مت سمجھاؤ۔" اس نے جھنجھلا کر کہا۔

ابا میاں بولے۔ "وہاں تو آجکل وہ حال ہے جو اپنے ہاں تقسیم کے وقت ہوا تھا!"

آپا جی کے چہرے کی جھریوں میں ایک دم بہت سا اضافہ ہو گیا اور بالوں میں سے سفید چاندی کے سے تار الجھ کر ماتھے پر بکھر گئے، آنکھوں کی چمک راکھ میں دبی ہوئی چنگاری کی سی اور ہونٹوں کی کمان یک دم کس کر تن گئی اور پھر چولے سے ان کے سینے میں سے سانس ایک دھواں اٹھا اور سانسوں نے بھیگ رہی آنکھ [illegible]

کی چادر دے لی،

چادر کے اندھیرے میں ہولے ہولے تڑپتے ہوئے انھوں نے ماضی کے دریچے کے پٹ ڈھونڈے اور انھیں کھولا تو گزرتے ہوئے وقت کی کتاب کے پریشاں اوراق ارد گرد پھیل پھیل گئے ماضی کی مدھم روشنی یکدم بہت تیز ہو گئی، آپا جی کو یوں محسوس ہوا جیسے بدلیوں میں سے چاند نکلا اور ان کے نزدیک آنے لگا۔ اتنا قریب وہ اس کی روشنی میں اپنے احساسات کو مدغم کر سکتی تھیں، آپا جی ـ بڑھ کر اس چاندنی سے اپنی جھولی بھری اور اس جھولی میں وہ لیٹا انگوٹھا چوس رہا تھا،

"میں کہوں،" "ہمارے بھی اولاد تھی، پریوں کیسی ہر دم گود لئے رہتے تھے!" چاچی جی نے پوپلا منہ کھول کر کہا۔

آپا جی نے گھور کر انہیں دیکھا۔ اونھ! جب سے چاچی جی آخری دانت درد کرنے لگا تھا طبیعت ہی چڑچڑی ہو گئی تھی، جی میں منہ پہ جا کر کہیں "ہاں چاچی تم تو ایسی ماں تھیں کہ جیسے ماںتا تھی ہی نہیں" پر چپ ہی رہ گئیں۔۔

چاچا جی نے مصنوعی دانت دکھائے۔ "نیک بخت سے بچا ٹھیک طرح گلاتے نہیں!"

"انہیں لاڈ کرنے سے اتنی فرصت کہاں کہ ہنڈیا کی طرف توجہ کریں ــــ"

"ہاں تو ٹھیک ہے ــ میری جوتی پکاتے تمہارے لئے!" آپا جی نے بھڑک کر کہا۔ "میرا لال بیٹا روتے اور میں منہ کے حرف کو کھیتی مروں!"

بات بھی ٹھیک ہی تھی، اللہ نے پورے سات سال ترسا ترسا کر آپا جی کی گود میں ہنستا کھیلتا جیتا جاگتا کھلونا دیا تھا۔ تھا بھی وہ بالکل ولایتی کھلونے کا سا، گورا چٹا رنگ، کھلے ہوئے پھول کی طرح نازک، اتنی بڑی پیشانی، نیلی، گہری نیلی آنکھیں، بھورے سرخی مائل بال، آنکھوں کی پلکیں بڑی واضح اور اٹھی ہوئی ناک دیکھ کر آپا جی پھولے نہ سمائیں،

"وہ [illegible]"

وہ تھا ہی ایسا!!"

"باپ پر؟" آپا جی کا جی دہل دہل گیا۔ اے واہ یہ کوئی اپنے باپ پر تھوڑی گیا ہے، وہ تو ایسا بے وفا تھا کہ شادی کے تیسرے سال ہی نیا بیاہ کر بیٹھا تھا کہ بچہ نہیں ہوا اور پھر بیاہ کو ابھی پورے سات برس بھی نہ ہوتے تھے کہ دنیا سے ہی منہ موڑ بیٹھا تھا۔ اللہ نہ کرے یہ اپنے باپ پر جاتے۔ زور سے بولیں۔ "اے واہ ذرا ہونٹ تو دیکھو۔ بالکل میرے ہیں کہ نہیں؟"

"نیا زمانہ ہے رے لوگو نیا زمانہ" چاچی جی نے ماتھے پہ ہاتھ دھر کر کہا

آپا جی نے مسکرا کر چاچی جی کی گود میں کھلونے کو بٹھا دیا۔ "ذرا سچی سچی کہنا ایسا پیارا بچہ کس کا ہوگا!"

چاچی جی کے بوڑھے لب مسکرانے کے انداز میں پھیل گئے۔ "یہ تو بتا نام کیا رکھا ہے،" پھر جواب سنے بغیر جلدی سے بولیں، سعید نام رکھ لو۔"

"اے واہ — یہ نام تو بجو کے بھائی کا ہے، میں کیوں رکھنے لگی اپنے کھلونے کا نام سعید —" آپا جی نے تنک کر کہا۔ "نام تو میں نے رکھ دیا ہے — فیروز!" پھر دلارے بچے کے رخسار اپنے گالوں سے مس کرتے ہوئے انہوں نے اس کا نام دہرایا۔

"ایں؟" چاچی جی کا منہ کھل گیا۔ "اے لو ہم سے پوچھے بنا نام بھی رکھ لیا، اونہہ کیا نام رکھا ہے نگوڑا اللہ مارا۔"

"رہنے دو جی!" آپا جی نے برا مان کر کہا۔ "ایسا چن کر نام رکھا ہے کہ جو سنے سر دھنے، پر انہیں کیوں پسند آنے لگا — اونھ!"

"اتنا لاڈ پیار کرو گی، تو پچھتاؤ گی۔" چاچی جی پٹ سے بولیں۔ "بچے کو کھلاؤ گھی کا نوالہ پر دیکھو شیر کی نظر سے — ہاں!"

"تبھی تو سارے ماں سے بیزار نظر آتے ہیں!" آپا جی نے ہولے سے چوٹ کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

آپا جی نے فیروز کو اپنی حسب منشا پالا، مجال تھی کہ کوئی آنکھ اٹھا کر اس کی طرف بھی دیکھتا، پر دیکھنے کو یوں کس کا جی چاہتا تھا، بن باپ کا بچہ تھا مگر رشتے داروں کی تو کوئی کمی نہ تھی، ایک باپ کی جگہ چاچا ماموں تھے، اور اک آپا جی ہی ماں نہ تھیں، تین پھوپھیاں اور دو خالائیں ایسی تھیں کہ فیروز کے صدقے ہوئی جاتی تھیں، اور پھر وہ تھا پیارا، چاچی جی کے سارے خدشے بے بنیاد ثابت ہوئے تھے سارے لاڈ پیار نے بھی اسے جو بات کہیں، جھٹ کر دیتا، اور اپنے بچے کو دیکھ دیکھ کھل کھل جاتا اور ہزاروں دعائیں ایک سانس سے نکلا کرتیں،

اس روز بازار جاتے ہوئے جلوس دیکھا، ایک سبز پرچم لہراتے ہوئے لوگوں کا ہجوم چلا جا رہا تھا، "لے کے رہیں گے پاکستان!" آپا جی اڑا ہوا رنگ لئے گھر واپس آئیں، فساد ہونے کا ڈر تھا، آتے ہی کہا، "گھر سے باہر مت قدم رکھنا!"

چاچی جی نے جھٹ سے کہا، "لو دیکھو تو کیا زمانہ آیا ہے، وہ مائیں ہوا کرتی تھیں کہ خود بچوں کے جسم پر زرہ بکتر سجا کر میدان میں بھیجا کرتی تھیں اور اک یہ ہیں کہ مارے ڈر کے گھر میں چھپا رکھا ہے۔ ہوا کیا لوگوں کو اک تمہارے ہی لاڈلے کی........"

تیزی سے آپا جی نے بات کاٹی "واہ کیا بات کہی ہے، وہ وقت تو آنے دے کہ میرا بچہ ہتھیار پکڑ سکے، تب میں روکوں تو کہنا، کی عمر ہی کیا ہے —؟"

اس شام کرفیو لگا ہوا تھا، باہر جانے کی کس میں ہمت تھی، سبھی سارے گھروں میں دبکے ہوئے تھے، ہندوؤں اور مسلمانوں کا میں تصادم ہو چکا تھا اور گھر گھر لوگوں کے لبوں پر بھی فساد کی باتیں، لوگ آپس میں باتیں بھی کرتے تو سرگوشیوں میں جیسے گھروں کی دیواریں اینٹ پتھر کی بنی ہوئی نہ تھیں کاغذ سے بنائی گئی تھیں اور کاغذ پردے اتنے نازک ہوتے ہیں کہ سوئی کو ذرا سا دباؤ تو آر پار، اور ادھر تو گلیوں میں بندوقیں تھیں جن پر سنگینیں لگی ہوئی تھیں!!

"ہائے رے کیا مصیبت ہے؟" چاچی جی نے خاموشی سے گھبرا کر کہا۔

"اٹھارہ سو ستاون میں بھی...." چاچی جی نے بات چاہی پر چپ ہو گئے۔

"ہم آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں!" دس سالہ فیروز

چاچا جی سے سنی ہوئی بات دہرائی۔

"ہائے۔ ہائے!" آپا جی نے دل تھام لیا" یہ تو نے کدھر سے باتیں سیکھیں؟"

چاچا جی نے گھبرا کر کہا۔ "آخر کو میرا پوتا ہے، بہادروں کی سی باتیں نہ کرے گا تو کیا......."

"رہنے دو جی ایسی بہادری" آپا جی نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

سچ جانو تو آپا جی نے بیٹے کو یوں اپنی چادر میں چھپا چھپا کے رکھا کہ مرغی بھی اپنے پروں میں چوزوں کو نہ رکھتی ہوگی، پر نصیب کی بات جو ہو وہ کوئی کیونکر ٹالے، اس شام کرفیو لگنے کو ابھی دیر ہی تھی کسی نے تڑ تڑ دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا، آپا جی نے گھبرا کر دروازہ کھولا کہ چاچا جی آٹا خرید کر واپس آتے ہوں گے، پر بندوق کی نالی اک دم آپا جی کے سینے میں لگی اور وہ سفید لُٹا ہوا چہرہ لئے دونوں ہاتھ نالی کے ارد گرد رکھے لڑکھڑاتی ہوئیں الٹے قدم پیچھے کو صحن میں زبردستی ہو گئیں، چاچی جی برآمدے میں بیٹھی اپنے بالوں کی چٹیا ٹھیک کر رہی تھیں، بہت سے خوفناک چہرے دیکھ کے مارے ڈر کے چلائیں اور اک دم ایک دھماکے کی آواز آئی اور چاچی جی کا بوڑھا سر خون میں لت پت ہوکے فرش پر گرا نظر آنے لگا، آپا جی کے حلق میں بہت سی چیخیں گھٹ کر رہ گئیں پر اندر سے فیروز چیختا ہوا آپا جی کی طرف بھاگا آیا، آپا جی نے جھپٹ کر اُسے گھسیٹ کر اپنے دوپٹے کے پلو کو سر پہ رکھ کر کہا "میرے بچے کو نہ کچھ کہنا بھائی ــــ"

پر بھائی نے آپا جی کی آنکھوں کے سامنے فیروز کے سینے میں ایک لمبا سا چھرا گھونپا اور خون کا ایک فوارہ، ایک تیز دھار ان کے چہرے کو رنگ گئی اور بے ہوش ہوتی آپا جی کے منہ سے ایک دل دوز چیخ نکل گئی،

چیخ روکتے ہوئے آپا جی نے اپنی بھیگی آنکھوں پر سے بوڑھی پلکیں اٹھائیں اور جیسے نوچ کر پھینک دی اور گھبرا کر اپنے ارد گرد بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر انہوں نے سسکیاں بھرنی شروع کر دیں، سسکیوں کے ساتھ ان کے گلے سے خرخراہٹ کی آواز دبے دبے ماتم کے جذبات سب کو چھپانے کی ناکام کوشش کرنے لگی اور سب ارد گرد بیٹھے ہوئے اک دم چپ چاپ ہو کر رہ گئے،

اس خاموشی میں ان کی سسکیاں سب کے دلوں پہ غم کے دھماکے بن بن کے پھٹ رہی تھیں، اس کرب ناک لمحے میں ابا میاں نے اماں جی کی طرف دیکھا اور اماں جی نے ہلکی سی اک آہ بھر کر کہا، "وقت کا مرہم گزرے وقت کے ناسوروں کو مندمل کر دیتا ہے پر کوئی بہن کے دل سے پوچھے کیا ان کا دل اپنے دکھ اپنے غم کبھی بھول سکتا ہے"

ابا میاں مغموم نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے، "ہر جگہ یونہی ہوتا ہے جمیلہ کی ماں! آزادی کی خاطر بڑی بڑی قربانیاں دینی پڑتی ہیں"

جمیلہ بیچ میں بول اٹھی، "اب دیکھو نا اماں! اُدھر الجزائر میں کیا ہو رہا ہے، خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں، مائیں اپنے بچوں کو خود آزادی کی راہ میں قربان ہونے بھیج رہی ہیں اور ــ اور ــــ"

"اور یہ لڑائی وہ سو سال سے لڑ رہے ہیں!" بھیا نے بات پوری کی

آپا جی کی آنکھوں کے آنسو جیسے رک گئے، "سو سال!" انہوں نے اماں جی کے ساتھ دہرایا

اماں جی نے آپا جی کی طرف دیکھا اور آپا جی نے نظریں چار ہوتے ہی سر جھکا لیا، یکدم جیسے انہیں شدت سے احساس ہوا کہ وہ مجرم ہیں، انہوں نے کیا جرم کیا ہے یہ انہیں آج پتہ چلا ہے اور یہ سب لوگ جانتے ہیں کہ وہ ــــ!! وہ اور کچھ سوچتے ہوئے جیسے گھبرا گئیں، سینے کا اُتار چڑھاؤ تیز ہو گیا اور سانس روکتے ہوئے انہوں نے ابا میاں کی طرف دیکھا اور بڑی مشکل سے بولیں، سو سال سے لڑ رہے ہیں۔ پر کب تک؟"

ابا میاں نے ہولے سے کہا، "جب تک آزادی نہ ملے گی، آپا! تم جانتی تو ہو جب آزادی حاصل کرنے پہ کوئی تل جائے تو صدیوں کی غلامی کی زنجیریں ٹوٹ جاتی ہیں اور ادھر تو ساری دنیا الجزائر کے مظلوموں کی حمایت کرتی ہے!۔ تم ہی کہو کیا ہمیں ان کے ساتھ ہمدردی نہیں؟"

"ہمدردی؟" آپا جی بڑبڑائیں، پھر جیسے اپنا دکھ درد سارے غم، گزرے وقت کے رستے ہوئے ناسور سب دور ہو گئے سب مندمل ہو گئے

مصنفین کی تخلیقی سرگرمیاں

(کتابیں جو حال ہی میں چھپی ہیں یا زیر طبع / زیر تصنیف ہیں)

عبدالسلام خورشید

راہ و رسمِ منزل‌ہا
(مجموعۂ کلام سالک مرحوم)
قیمت ۳/۸

نامے میرے نام آتے ہیں
(سالک مرحوم کے نام ادبی خطوط)
(زیر طبع)

۳۔ تاریخ صحافت ہند
(اردو صحافت کا تاریخی جائزہ)
زیر طبع
ناشر: مجلسِ ترقی ادب۔ لاہور

۴۔ مکاتیب سالک
(مجموعہ خطوط)
(زیر طبع)

عبدالرشید ارشد

کانوں سنی
(سالک مرحوم کی ریڈیائی تقاریر)
(زیر طبع)
ناشر: الجدید، چوک انارکلی، لاہور

حمید شاہد

اڑان
(دیوانِ غزل) - قیمت ۲/۸/-
ناشر: گوشۂ ادب۔ چوک انارکلی۔ لاہور

شاہد صدیقی

چراغِ منزل
(مجموعۂ کلام) - قیمت ۲/-
انجمن ترقی اردو۔ حیدرآباد (دکن)

نظر حیدرآبادی

صفِ مژگاں
(مجموعۂ کلام) (زیر طبع)
ناشر: اردو اکیڈمی سندھ کراچی

اقبال اور حیدرآباد
(مجموعہ مقالات) زیر طبع
ناشر: اقبال اکیڈمی - کراچی

سلیمان ادیب

پاس گریباں
(مجموعہ کلام) - زیر طبع
ناشر: انجمن ترقی اردو۔ حیدرآباد (دکن)

محبوب خزاں

اکیلی بستیاں
(مجموعہ کلام)

نظیر صدیقی

شہرت کی خاطر اور دوسرے انشائیے
(زیر طبع)
ناشر: پاک کتاب گھر، پٹواٹولی ڈھاکہ ۱

مہر شاہ

خالہ اپوا کے نام
(طنزیہ و مزاحیہ خطوط)

ثروت زیم

(اردو میں پروڈیاں)
(زیر طبع)
ناشر: دار الکتاب - ۱۱/ایم کیرنگی

سعادت نظیر

۱۔ آب و تاب
(نظموں اور غزلوں کا انتخاب)
انجمن ترقی اردو - علیگڑھ

۲۔ نوید گل
(منظومات) - قیمت ۱۰/

۳۔ پھول کلیاں
(منظومات) قیمت ۱۰/
پتہ: کرن پبلیکیشنز - سلطان شاہی
حیدرآباد (دکن)

عبدالقیوم شفق ہزاروی

۱۔ بہار خزاں
(افسانوں کا مجموعہ)

۲۔ نقش و فن
(مثنوی)
ناشر - اردو اکیڈمی سندھ - کراچی

عبدالعزیز خالد

۱۔ سرود رفتہ
یونان کی عظیم شاعرہ سیفو اردو نظم کے قالب میں - (قیمت ۴/-)
ناشر مطبوعات مشرق ہرمزجی اسٹریٹ کراچی

۲۔ سلومی
عہد نامۂ جدید کے واقعہ پر مبنی منظوم ڈرامہ
قیمت ۲/-
(ادارہ ذہن جدید نیو کلاتھ مارکیٹ کراچی)

۳۔ غزل الغزلات
عہد نامۂ عتیق کے نغمۂ سلیمان کا منظوم ترجمہ مع حواشی - قیمت ۱/۱۲
ناشر - میسرز بک لینڈ، پرنٹرز پبلشرز - بک سیلرز - محمدی بلڈنگ بندر روڈ کراچی

۴۔ زنجیر رم آہو
طویل و مختصر نظموں کا مجموعہ
قیمت ۲/-
ناشر مطبوعات مشرق ہرمزجی اسٹریٹ کراچی

۵۔ گل نغمہ
رابندر ناتھ ٹیگور کی گیتانجلی اردو شعر میں (زیر ترتیب)

حبیب اللہ بیگ

اور انسان زندہ ہے
(ناہر سنگھ)
(ناول) قیمت ۶/-
ناشر - ٹائمز پریس کراچی

"رنگ محل"
دلی کی قدیم تہذیب کی داستان
مصنفہ
حمیدہ سلطان
سکریٹری انجمن ترقی اردو، دہلی

عشرت کرتپوری

کاکل صبح
(مجموعہ کلام) - قیمت دو روپیہ ۵۰ پیسے
ناشر - سب رنگ کتاب گھر - دہلی

ایک معروضہ
پنڈت نہرو کی خدمت میں

جناب عالی!

آپ ایک بڑے ملک کے وزیراعظم اور ایک بیحد مصروف انسان ہیں لیکن آپ ایک مشہور و معروف مصنف بھی ہیں اور گو پیش نظر مسئلے سے آپ کا ذاتی تعلق نہیں لیکن جماعتی حیثیت سے مزور ہے۔

ہمارے ملک میں ہندوستانی ادیبوں کی کتابیں ان کی اجازت کے بغیر شائع ہوتی رہی ہیں بلکہ یہ بھی ہوا ہے کہ فرضی کتابوں پر بھی ان کے نام ڈال دیئے گئے ہیں۔ ہمیں اس پر ندامت ہے۔ ہمارا پورا ملک، پوری قوم، پورا معاشرہ، چند افراد کے اس جرم پر خلش محسوس کرتا ہے لیکن اب ہم نے پوری قوت سے اس جرم کا سد باب شروع کر دیا ہے۔

شاید آپ نے سنا ہو کہ کرشن چندر کے نام پر دو جعلی کتابیں چھاپنے والے ناشروں کے خلاف خود گورنر مغربی پاکستان کے حکم پر قانونی کارروائی شروع ہو گئی ہے۔ اب ہمیں امید ہے کہ ہمارے ملک میں ایسے جرائم ختم ہو جائیں گے۔

لیکن جو کچھ یہاں ہوا ہے وہی ہندوستان میں بھی ہوا ہے۔ ہمارے مشاہیر کی قیمتی تصنیفات کو ان کی اور ان کے وارثوں کی اجازت لئے بغیر شائع کر دیا گیا ہے اور ان کے نام سے فرضی کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں۔

آپ کو یہ بتانا کہ اس تہذیبی ڈاکے کے نقصانات کیا کیا ہیں سورج کو چراغ دکھانا ہے، یہ نقصان صرف مصنفین یا ان کے ورثا کو مالی خسارے کے طور پر ہی نہیں پہنچتا بلکہ ایک پوری تہذیب، ایک پوری قوم کی بدنامی کی شکل میں بھی واقع ہوتا ہے۔

افسوس کہ اب تک آپکے یہاں کوئی ایسی کارروائی نہیں ہوئی جس سے پاکستانی مصنفین اور ان کے ورثا کی دادرسی ہو سکے۔

اس مسئلہ کا حتمی حل تو یہ ہے کہ آپ کی حکومت اور حکومت پاکستان کاپی رائٹ پر ایک معاہدہ کرے اور اس پر عمل بھی کرے لیکن ایک فوری حل یہ بھی ہے کہ جعل سازوں اور بد دیانتوں کے خلاف تعزیرات ہند کے تحت فوری کارروائی کی جائے جیسا کہ یہاں ہو رہا ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ دلی، بمبئی، لکھنو، حیدرآباد، کلکتہ وغیرہ میں علامہ اقبال، حفیظ جالندھری، فیض احمد فیض، شوکت تھانوی اور دوسرے مصنفین کی جو کتب ہندوستان میں ناجائز طور پر شائع ہو کر نہایت سستی بک رہی ہیں۔ ہم مثالوں سے آپ کا وقت ضائع نہیں کریں گے۔ صرف آپ کی ادنیٰ سی توجہ ہزارہا ایسے معاملات کا انکشاف کرا دے گی۔

ہم پاکستانی ادیبوں کا ایک ادارہ ہیں جو ہندوستانی ادیبوں کے لئے نہایت مخلصانہ جذبات رکھتا ہے اور چونکہ ان میں آپ بھی شامل ہیں اس لئے آپ سے توقع رکھتا ہے کہ آپ اس معاملے سے ذاتی طور پر دلچسپی لیں گے۔ یہ آپ کے لئے ایک چھوٹی سی بات ہوگی لیکن ہمارے بہت سے مسائل حل ہو جائیں گے۔

مصالحت کا آغاز

انجمن ناشرین کی طرف سے پہلا قدم

پاکستان پبلشرز اینڈ بک سیلرز ایسوسی ایشن کے ترجمان "کتابی دُنیا" نے جو کراچی سے شائع ہوتا ہے "ناشر، مصنف اور گلڈ" کے زیر عنوان علاؤالدین خالد صاحب کا ایک مضمون شائع کیا ہے۔ علاؤالدین خالد ایک سربرآوردہ ناشر ہیں اور ایسوسی ایشن مذکور کی عاملہ کے رُکن۔ اس مضمون میں موصوف نے گلڈ کے ان اعلانات کے حوالے دیئے ہیں جو مصنفین اور ناشرین کے تعلقات کے متعلق "ہم قلم" کے اکتوبر اور نومبر کے شماروں میں شائع ہوئے ہیں۔

۱۔ "ہمارے ہاں جب کبھی ناشر اور مصنف کے تنازعہ کا ذکر آتا ہے تو کسی شہادت، کسی تفصیل اور کسی معقول دلیل کے بغیر ہی یہ یقین کر لیا جاتا ہے کہ زیادتی یقیناً ناشر کی ہوگی اور مصنف تو 'محض' معصوم ہوگا۔"

۲۔ "اکتوبر کے ہم قلم میں پاکستان رائٹرز گلڈ نے اعلان کیا تھا کہ ایسے بدمعاملہ اور نادہند ناشروں کے نام جن کے خلاف مصنفین نے شکایات داخل کی ہوں پندرہ دن کے اندر (اگر انھوں نے مصنفین سے معاملات کی صفائی نہ کرلی) ہم قلم میں شائع کئے جائیں گے اور ضرورت پڑی تو قانونی چارہ جوئی بھی کی جائے گی۔ اس عرصہ میں رائٹرز گلڈ کے کئی سربرآوردہ لوگوں سے تبادلۂ خیال کا موقع ملا۔ اس مسئلہ پر جناب جمیل الدین عالی سے بھی ملاقات ہوئی۔ ان پر یہ بات واضح کی گئی کہ ہمارا موقف کسی بدمعاملہ پبلشر کی حمایت کرنا نہیں ہے مگر جماعتی شکل میں جو ایک پیشہ کی مذمت کی جارہی ہے وہ مذموم ہے۔ شکایت کرنے والا مصنف فرشتہ نہیں ہوسکتا۔ محض شکایت حرفِ آخر نہیں ہوسکتی۔ گلڈ جہاں مصنفین کے تحفظ کا علمبردار ہے وہاں اسے ان کے وقار کو بلند کرنے کے لئے ایسے بدمعاملہ مصنفین کے خلاف بھی کارروائی اتنی ہی شدت سے کرنی ہوگی جتنی شدت کے شکار ناشرین رہے ہیں۔"

"اب پاکستان پبلشرز اینڈ بک سیلرز ایسوسی ایشن قائم ہوچکی ہے۔ رائٹرز گلڈ کی طرح اس کے بھی تین مرکز ہیں کراچی۔ لاہور اور ڈھاکہ۔ یہ دونوں بااختیار انجمنیں اپنے اشتراک سے ادب، ادیبوں اور اشاعتی کاروبار کے ایک بہتر مستقبل کی داغ بیل رکھ سکتی ہیں۔"

۳۔ "ہم قلم میں نومبر کے شمارہ میں مصالحت کی مہلت کے زیر عنوان جو کچھ لکھا گیا ہے وہ مبہم ہے اور اس سے بات سلجھتی نہیں۔ اگر محض پگڑی اُچھالنا ہے تو یہ پگڑی دو طرفہ اُچھلے گی۔ سوال ایک ماہ کی مہلت کا نہیں جڑ کاٹنے کا ہے۔ کیا ناشروں اور ادیبوں کی انجمنیں مل کر کام نہیں کرسکتیں؟ "الٹی میٹم" کے پیچھے کس کا

بھلا ہوا ہے ۔۔۔۔ ادیبوں میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو بعض ناشروں کی طرح بدمعاملہ ہیں"

۴۔ "پاکستان رائٹرز گلڈ اور پاکستان پبلشرز اینڈ بک سیلرز ایسوسی ایشن نے با اختیار نمائندوں پر مشتمل ایک کمیٹی ایسے تمام نزاعی معاملات کو طے کرنے کے لئے لائحہ عمل بنائے اور تینوں شہروں لاہور، ڈھاکہ اور کراچی میں ہر دو ادارے ایک ایک کمیٹی بنالیں جن کے سامنے ایسی سب شکایتیں پیش ہوں اور جو فیصلہ وہ دیں وہ فریقین کو قبول ہونا چاہیے۔ ان فیصلوں کی اپیل بھی دونوں اداروں کی سینٹرل کمیٹی کے نمائندوں پر مشتمل کمیٹی کے روبرو پیش کی جا سکے گی"

علاؤالدین خالد صاحب کی مذکورہ بالا تجاویز متوازن اور معقول ہیں لیکن انھوں نے اپنا زاویۂ نگاہ پیش کرتے وقت اس امر کا لحاظ نہیں کیا کہ رائٹرز گلڈ اور ہم قلم نے پبلشروں کو من حیث الجماعت کبھی مطعون نہیں کیا۔ پبلشروں کا ادب کے فروغ میں جو حصہ ہے اس کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ خود خالد صاحب اوپر کے اقتباس ۳ کے آخری فقرے میں یہ مانتے ہیں کہ کچھ ناشرین بدمعاملہ ہیں۔ (مصنفین کی بدمعاملگی سے ہم الگ بحث کریں گے)۔ یہی تخصیص ہم بھی روا رکھتے ہیں۔ دسمبر کے شمارے کے شذرات میں ہم نے لکھا تھا:

"حکومت مغربی پاکستان کی یہ بروقت اور مستحسن کارروائی ان ناشروں کے لئے سرمۂ نور بصر ثابت ہونی چاہیئے جو چوری اور سینہ زوری کا یہ کاروبار اب بھی جاری رکھنے کی فکر میں ہیں اور ایماندار ناشروں کی برادری کو رسوا کر رہے ہیں۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کا مقصد ناشروں کو ختم کرنا نہیں، ان کا تعاون حاصل کرنا ہے اور ان سے مصنفین کے حقوق تسلیم کرانا ہے، حکومت یا گلڈ کالی بھیڑ پبلشروں کے سلسلے میں جو کارروائی کرے، اس سے قطع نظر باعزت ناشروں کی منظم جماعت کو بھی ان دھاندلیوں کے سدباب کے لئے موثر اقدام کرنا چاہیئے"۔

"ان ناشرین کو جن کے خلاف گلڈ کے مرکزی دفتر میں شکایتیں موصول ہوئیں مصالحت کے لئے ایک مہینے کی مہلت دی گئی تھی جو دسمبر تک ختم ہو رہی ہے۔ بعض ناشرین کے متعلق مغربی پاکستان کے علاقائی سکرٹری سید وقار عظیم صاحب نے یہ ذمہ لیا ہے کہ وہ اپنے ذاتی مراسم کے بل پر انھیں، فہام و تفہیم پر راضی کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ بدمعاملگی کا ایک آدھ معاملہ کسی اچھے پبلشر کے لئے باعثِ رسوائی یا پریشانی نہ بن جائے"

غالبًا خالد صاحب کے پیشِ نظر ہمارے مذکورہ بالا شذرات نہ تھے ورنہ وہ پگڑی اچھلنے اچھالنے کی بات نہ کرتے جس سے گلڈ کو کوئی دلچسپی نہیں۔ اکتوبر کے شمارے میں ہم نے مصنفین اور ناشرین کے معاہدوں کے سلسلے میں اپنے اراکین کو قانونی اور فنی مشورے کی پیشکش کرتے ہوئے یہ امید ظاہر کی تھی کہ "یہ طریقہ ان ناشروں کیلئے بھی مفید ثابت ہوگا جو مصنفین سے شکایات رکھتے ہیں" نومبر میں مصالحت کی مہلت والے اعلان میں بھی ہم نے لکھا تھا "مرکز کا بنیادی فرض یہ بھی ہے کہ مصنفین اور ناشرین کے تعلقات خوشگوار رہیں۔۔۔ لہٰذا مجوزہ مصالحت کے امکانات کا پورا پورا جائزہ لیا جائے۔ ہمیں امید ہے ناشرین اس مصالحانہ فیصلے کا خیر مقدم کریں گے اور ہمارے علاقائی سکرٹریوں سے تعاون کریں گے" یہ اعلانات خالد صاحب کے سامنے تھے کیونکہ انھوں نے ان کا حوالہ دیا ہے۔ مصالحت کی مہلت والے اعلان میں تو تعاون کی صورت بھی متعین کر دی گئی تھی۔ لہٰذا ہماری ناقص رائے میں تو خالد صاحب کے اس مضمون کے بجائے ناشروں کی طرف سے تعاون اور مصالحت کا کوئی عملی اقدام ہمارے

جاتے اتنا تو ہم زیادہ خوش ہوتے ۔

اس وقت تک ہمارے زیر غور دو ہی اُمور آئے ہیں جن میں ناشر نے بدمعاملگی کی ہے، ان پر عمل درآمد ملتوی کرنا اس لئے کہ بعض مصنف بھی تو بدمعاملہ ہیں، عجب سی منطق ہے ۔ زید نے بکر کو قتل کیا ہے تو اس کا مواخذہ ضرور ہوگا ۔ اس امر کے باوجود کہ بکر کے ایک بھائی بند نے زید کے قبیلے کے ایک جوان کو کبھی مارا تھا ۔ جب پاکستان کے چور ناشروں پر جو ہندوستانی مصنفین کی کتابیں ناجائز طور پر چھاپتے ہیں اعتراض کیا جاتا ہے تو وہ بھی اسی قسم کی بات کرتے ہیں کہ صاحب ہندوستان کے چور پبلشر بھی تو ہمارے مصنفوں کی کتابیں چوری چھاپتے ہیں ۔ اسی منطق کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پاکستان میں کرشن چندر کسی "سنلائٹ بک ڈپو" کے ہاتھوں رُسوا ہوتا ہے اور دلی میں کوئی تاج بک ڈپو فیض یا شوکت تھانوی کی کتابوں کی مٹی خراب کرتا ہے ۔ دونو مملکتوں کو اس سے کچھ فائدہ نہیں پہنچتا اور نقصان صرف مصنفوں کو ۔ کرشن چندر ۔ فیض اور شوکت تھانوی کو پہنچتا ہے ۔ تیرہ سال پہلے یہ منطق بانیٔ فساد ثابت ہوئی تھی لہذا غلط بحث کی کوششیں ہمارے نزدیک مستحسن نہیں ۔

اگر کسی مصنف نے کسی ناشر سے بدمعاملگی کی ہے اور وہ ناشر آخری راہ عمل کے طور پر اس کے خلاف عدالت سے رجوع کرنا چاہتا ہے تو ہم نہیں سمجھتے اس میں کونسی قباحت ہے ۔ ہاں موجودہ حالات میں اگر وہ ناشر گلڈ کے سامنے معاملہ پیش کرتا ہے اور استمداد کرتا ہے تو ناشر کو ناحق کی تصدیع و تکلیف سے نجات مل سکتی ہے ہم بڑی خوشی سے ان اُمور میں مبنی بہ انصاف فیصلہ کرانے کی کوشش کریں گے اگر پبلشرز ایسوسی ایشن یا ناشروں کی طرف سے ایسا ہی ذمہ لینے کو تیار ہے تو ہم اس کا خیر مقدم کریں گے لیکن ایسی پیشکش اس ایسوسی ایشن یا ناشر کی طرف سے باقاعدہ ہمارے پاس آنی چاہیئے ۔ اس وقت لاہور میں سید وقار عظیم، ہمارے علاقائی سکرٹری کے پاس قریباً ایک درجن ایسے معاملے ہیں جو بحُسن و خوبی طے ہو جائیں اور مصنفین کی شکایات کا ازالہ ہو جائے تو ہم اسے ادیبوں اور ناشروں کی ان ہر دو انجمنوں کے آئندہ تعاون کا سنگِ بنیاد سمجھیں ۔ گلڈ کے با اختیار نمائندے تینوں مراکز کے علاقائی سکرٹری ہیں ۔ اب ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ علاؤ الدین خالد صاحب اور ان کی ایسوسی ایشن عملاً کس قدر تعاون اور خلوص کا ثبوت دیتی ہے ۔ ایک اور نقطۂ امتحان چوری کی کتابوں کی اشاعت ہے کیا پبلشرز ایسوسی ایشن اس کا سدباب کرنے کا بیڑا اٹھاتی ہے! جہاں تک ہندوستان میں ان بدعنوانیوں کے انسداد کا تعلق ہے، ہم جملہ ذرائع سے اس کے لئے کوشش کر رہے ہیں لیکن اگر ہم یک طرفہ سیز فائر کر دیں تو اخلاقی طور پر ہمارے قدم مضبوط ہو جائیں گے ۔

مرکزی گلڈ نے ۱۱ دسمبر کو اس انجمن کی خدمت میں ایک باضابطہ مراسلہ بھی بھیج دیا ہے اور علاقائی سیکرٹریوں کو ضروری اطلاعات ارسال کر دی ہیں ۔

ناشرین اور کتب فروشوں کی کل پاکستان انجمن کے فرائض اس پر ختم نہیں ہو جاتے بلکہ یہ تو آغاز ہے ۔ ہم اس انجمن سے یہ بھی توقع کرتے ہیں کہ :

(۱) پاکستان میں فحش عریاں اور جنسی خیز ادب کی اشاعت بند کر دی جائے۔

(۲) کتابوں کی قیمت مقرر کرتے وقت ایک مناسب شرح سے زیادہ نفع نہ لیا جائے۔

(۳) کتب فروشوں میں سے اس تفریق اور طرفداری کا رجحان ختم کر دیا جائے جس کے سبب اچھے اچھے رسالے اور کتابیں پڑھنے والوں تک پہنچنے سے محروم ہو جاتے ہیں۔ یہ رویہ ایک خاص بیماری ہے جس کی تفصیل ناشرین اور کتب فروش خود جانتے ہیں اور ضروری سمجھا گیا تو ہم اس موضوع پر بھی تفصیل سے لکھ کر بتائیں گے کہ اگر کتب فروش کسی رسالے یا ناشر کتب کے خلاف ہو جائیں تو بہتر سے بہتر تخلیقی ادب قارئین تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔

اس کے علاوہ ہم اس انجمن کے سامنے ایک تجویز اور پیش کرتے ہیں اور وہ ہے معیاری شرح معاوضہ (اسٹینڈرڈ رائلٹی) اور تصدیق اشاعت کا معاملہ۔ رائلٹی کا معاملہ یقیناً مصنف اور ناشر کے مابین طے ہونا چاہیئے مگر گلڈ کا موقف ہمیشہ سے یہ ہے کہ اگر ناشر کسی کتاب کو قابل اشاعت سمجھے تو وہ اس کی رائلٹی ایک خاص شرح سے کسی طرح کم نہ دے۔ اس طرح استحصال محنت کا بنیادی سدباب ہو جاتا ہے۔ رہا یہ معاملہ کہ بڑا مصنف زیادہ لے گا تو یہ ایک کھلی بات ہے اور مقبول اور بڑے مصنف کو زیادہ سے زیادہ رائلٹی ملنی چاہیئے لیکن ادیب ایک محنت کش بھی ہے جس کے معاوضہ کی کم سے کم شرح یقیناً مقرر ہونی چاہیئے

اُمید ہے کہ ناشرین کی انجمن کم سے کم رائلٹی مقرر کرنے پر غور کرے گی اس سلسلے میں گلڈ کے مشورے اور خدمات ہر وقت حاضر ہیں جن میں غیر ملکی اداروں کے بارے میں جمع شدہ معلومات سے بڑی مدد ملے گی۔ اسی طرح یہ ہمارا پُرانا مطالبہ ہے کہ تعداد اشاعت پر کسی غیر جانبدار ادارے کا تصدیق نامہ لازمی ہے۔ یہ شکایت عام ہے کہ بہت سے ناشر منظور شدہ تعداد سے زیادہ کتابیں چھاپ لیتے ہیں تاکہ مصنف دوسرے ایڈیشن سے فائدہ نہ اُٹھا سکے۔ اس "وبا" کے بہت سے تریاق دریافت کئے گئے جن میں ہر کتاب پر مصنف کے دستخط کا نسخہ بھی تھا مگر یہ سب ہوائی باتیں ثابت ہوئیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ناشرین کی انجمن خود اس کام کو ہاتھ میں لے یا اگر مناسب سمجھے تو گلڈ کی خدمات حاصل کرے۔ گلڈ یقیناً اپنے ماہرین کے ذریعے ہر کتاب کی اشاعت کی تنقیح کر سکتا ہے اور ان خدمات کے عوض ناشرین سے کوئی معاوضہ بھی نہیں لے گا۔

ہم اس انجمن کے قیام کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ ہم ہر جماعتی اتحاد کا خیر مقدم کریں گے کہ اس سے مسائل جماعتی سطح پر طے ہو سکتے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ گلڈ اور انجمن ناشرین و کتب فروشان ملکی سطح پر مصنفین اور ناشرین کو ایک دوسرے کے قریب لے آئیں۔

آدم جی ادبی انعام کی تقسیم

۳ جنوری ۱۹۶۱ء کو ۶۰-۱۹۵۹ء کا انعام ایک تقریب میں تقسیم کیا جائے گا۔ یہ تقریب کراچی میں منعقد ہو گی۔

منصفوں ججوں اور انعام یافتگان کے علاوہ شاخ کراچی کی عاملہ، مرکز کے اراکین

تأثرات

زاق کا تنہا علاج دُوری ہے — دلِ حزیں - یہ کنارہ کشی ضروری ہے
ِ دوست کی جانب کشش ہے عین شعور — رہا گریز تو وہ جذبِ لاشعوری ہے
ے مُہر بہ لب ہو نہ اے گلِ نوخیز! — ابھی شگفتنِ غنچہ کی بات اُدھوری ہے
غِ حسن سے ہو کر گذر رہا ہوں میں — ہر اک "لمحۂ دید" ایک سال نوری ہے
اک تخیلِ دُوری بس اک تصورِ قرب — وگرنہ غیب ہے کیا اور کیا حضوری ہے
قِ دوست میں ابتک نصیب ہو نہ سکا — نشاطِ وصل میں جو کربِ ناصبوری ہے
م گل! قفسِ گل سے کر بھی جا پرواز — سُبک رَوی ہو تو عزمِ سفر ضروری ہے
رہا ہے اندھیروں سے سیلِ جلوۂ رنگ — کھلا کہ ظلمتِ غم کا مزاج نوری ہے
جزہ کہ ہر اک عہد کی ہوئی تکمیل — یہ حادثہ کہ ہر اک داستاں اُدھوری ہے
سکوں ہے ابھی قلزمِ حوادث کو — عبور کر کہ یہ دَورِ سکوں عبوری ہے

رئیسؔ اپنی وفا میں کوئی قصور نہیں
مگر یہ جرم کہ اقرارِ بے قصوری ہے

قمر رضوی

پھیری والا

ن نگر سے پھیری والا میری گلی میں آیا
لونگ، انگوٹھی، چھلّے، رنگ برنگے لایا
نے پوچھا اور بھی کچھ ہے، بولا میٹھا سپنا
لے کر جیون بھر اک نام کی مالا جپنا
نے کہا کیا مول ہے اس کا، بولا اک مسکان
اگ لگا دو اس سے رکھو من کی آن
تا سودا دیکھ کے آخر میں پگلی مسکائی
بھر کا روگ سمیٹ کے میں کیسی اِٹھلائی
گالال گلاب سا سپنا کب تک میرے سنگ
اس میں باس رہے گی کب تک اس میں رنگ
کے تار بکھر جائیں گے کب میرا دل ٹوٹے
رہے گا کب تک جادو پھیری والا جانے

محبوب خزاں

"ابھی جینا ہے بہت"

راستے دو ہیں، لگن ایک۔ وہی دل کا سکو
ابھی کتراؤ نہیں جادۂ شہرت سے بچو
رنگ اتر جائے گا چہرے سے تو جاؤ گے کہ
ابھی جینا ہے بہت، ہم بھی یہاں۔ تم بھی یہ

...ت سروش

عیشِ غم

حسن بے نیازی سے
تم نے درد بویا تھا،
میرے دل کے صحرا میں،
میں نے خونِ حسرت سے
اس کی آبیاری کی
آنسوؤں کی شبنم نے
اُس کو تازگی بخشی

اب یہ درد کا پودا
میرے دل کی زینت ہے
آج اس کی شاخوں پر
غم کے پھول کھلتے ہیں
اب تمہارے شاعر کو
عیشِ غم میسّر ہے

ڈر رہا ہوں میں لیکن
تم نہ مہرباں ہو جاؤ
اور خزاں نہ آ جائے
غم کے اس گلستاں میں
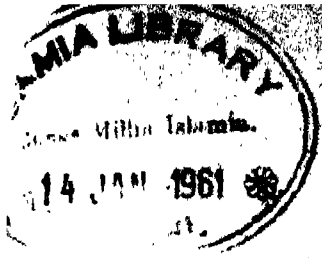
مشتاق شیدا

نارسائی

دل کے ایوان میں اپنی ہی صدائیں گونجیں
آنکھ بے خواب رہی حسرتِ دیدار لئے
کوئی آہٹ نہ سنی دل کے شبستانوں میں
کوئی مہتاب نہ اترا مرے غم خانوں میں

سرد راتوں کے ٹھٹھرتے ہوئے سنّاٹے میں
دل نکل جاتا ہے کشکولِ تمنّا لے کر
کو بکو بند دریچوں پہ صدا دیتا ہے
گنبدِ پردہ نشینوں کو جگا دیتا ہے

میں نے فریاد کو سینے میں چھپا رکھا ہے
اور وہ مہر بلب ہیں پسِ دیوارِ حیا
ان کی رسوائی کے احساس سے ڈر جاتا ہوں
سر جھکائے ہوئے گلیوں سے گزر جاتا ہوں

آہ اے دل کہ یہاں رسمِ جہانگیر نہیں
ان فصیلوں پہ لٹکتی کوئی زنجیر نہیں

ثق جونپوری

○

کہیں ساقی کا فیضِ عام بھی ہے
کسی شیشے پہ میرا نام بھی ہے
نظروں اسکی مے بھی جام بھی ہے
پھرے تو گردشِ ایام بھی ہے
نوائے چنگ و بربط سننے والو
پسِ پردہ بڑا کہرام بھی ہے
مری فردِ جنوں پر اُسے بہار رُو
گواہوں میں خزاں کا نام بھی ہے
نہ پوچھو بے بسی اس تشنہ لب کی
کہ جس کی دسترس میں جام بھی ہے
نہ ہوں مایوس شامِ غم کے مارے
کہ ہر آغاز کا انجام بھی ہے
محبت کی سزا ترکِ محبت
محبت کا یہی انعام بھی ہے
نگاہِ شوق ہے گستاخ لیکن
نگاہِ شوق کچھ بدنام بھی ہے
اُسے پہچاننا دشوار ہی کیا
کہ اُسکے ہاتھ میں اک جام بھی ہے
بہت بیزار ہیں وہ ہم سے واثق
مگر ہم سے انھیں کچھ کام بھی ہے

صبا اکبرآبادی

○

ہم دل و دیں کر چکے نذرِ حبیب
اب جو گزرے یا مقدر یا نصیب
اجنبی شہروں کا کیا شکوہ کروں
میں کہ تھا اپنے وطن میں بھی غریب
اے زمانہ ساز کیا کوسوں تجھے
جا تجھے عیشِ زمانہ ہو نصیب
سوچنے سے خود یقیں آتا نہیں
واقعاتِ عشق ہیں اتنے عجیب
دردِ دل تیری محبت تو نہیں
اے مرے ہمدرد اے میرے حبیب
تیلیوں کے فاصلے کو کیا کروں
گو قفس سے آشیانہ ہے قریب
اب کہیں ملتی نہیں حدِ سفر
منزلِ جاناں کو سمجھے تھے قریب
لعل و گوہر بھی لٹائے تھے کبھی
اب نہیں آنکھوں کو دو آنسو نصیب
تم سے اُلفت زندگی سے دشمنی
ہم خود اپنے دوست خود اپنے رقیب
رات دن اپنا وظیفہ ہے صبا
یا حبیب یا حبیب یا حبیب

○

اتوں کی اس بستی میں ایک عجب سودائی ہے
کیلئے یہ چال ہے اُس کا، کون ایسا ہرجائی ہے

س کیلئے پھرتا ہے اکیلا شہر کے ہنگاموں سے دور
ن ہی جسکی خاطر اس کو تنہائی راس آئی ہے

کے لب و رخسار کی باتیں ڈھل جاتی ہیں گیتوں میں
اکے خمِ کاکل کی کہانی وجہِ سخن آرائی ہے

ن ہی جسکی محرومی کے داغ ہیں اُس کے سینے میں
ن ہی جسکے خوابوں کی اک دنیا اُس نے بسائی ہے

اُسکی آشفتہ سری کا چرچا ہے ہم لوگوں میں
اتنی پُرکیف و مسرور اس کی شبِ تنہائی ہے

ہر آؤ ہم بھی اُس کے دل کی باتیں سن آئیں
تے ہیں دیوانہ ہے وہ، وحشی ہے، سودائی ہے

ثریا شہاب
سفارت پاکستان (ماسکو)

○

چشمِ میگوں اِدھر نہیں ہوتی
سعیِ غم کارگر نہیں ہوتی

جو ستارے تراش لیتے ہیں
ہائے اُن کی سحر نہیں ہوتی

عالمِ اضطراب میں اکثر
ہم کو اپنی خبر نہیں ہوتی

بے سبب کون غم اُٹھاتا ہے
آنکھ بے وجہ تر نہیں ہوتی

ہائے وہ منزلِ حیات جہاں
موت بھی چارہ گر نہیں ہوتی

ہم ہی ناواقفِ فغاں نکلے
آہ تو بے اثر نہیں ہوتی

موت کا انتظار کرنے سے
زندگی مختصر نہیں ہوتی

شاید اک آرزو نے ساتھ دیا
ورنہ یوں تو بسر نہیں ہوتی

جو نظر با اثر نہ ہو شہاب
کچھ بھی وہ نظر نہیں ہوتی

ر رضوی

○

کس سے پوچھیں اے غم جاناں بدلے تھے حالات کہاں
دل والے تو ساتھ چلے تھے چھوٹا اُن کا ساتھ کہاں

لگ کہے ہیں ڈھیر لگے تھے اس در پر نذرانوں کے
ہم بھی کیسے پاگل بیچی دل جیسی سوغات کہاں

وئی نہیں جو ساتھ مرے اشکوں کے موتی رول سکے
یے گھر کا آنگن سونا، اتری ہے برسات کہاں

اند شفق، شبنم، گل بوٹے، ساز، سحر، سرگم، مے خانہ
لکن ان تشبیہوں میں اس جانِ غزل کی بات کہاں

جانے کس سوچ میں گم ہے لوگ کہیں پر دنیا کے
ق میں دین و ایماں کیسے اونچی نیچی ذات کہاں

رکی اک اک راہ گزر پہ جال بچھے رسوائی کے
م ہوئی ہے سیر کو نکلیں ہاتھ میں ڈالے ہات کہاں

ی کے دامن میں یادوں کے کتنے سچے موتی ہیں
رکھ لوں جانے ہوں کل فرصت کے لمحات کہاں

ت مجھے تنہا سا پاکر دلی شہر نے لوٹ لیا!
ن دکن کی قاتل یادو تم نے بسر کی رات کہاں

رخر دیں نام تمہارا تھا تو بہت مشہور زبیر
شاطر سے کھیلی بازی کھا بیٹھے ہو مات کہاں

شاعر ندیم

○

ہمیں ہیں چند وہ مہ زادۂ شب
ہے روشن جن کے دم سے جادۂ شب

الٹ دی کس نے یہ خوابوں کی بستی
دمِ لطفِ بہارِ سادۂ شب

دماغ عطر پیرا ہن بھی ہوتا
اگر ہوتا کوئی آمادۂ شب

بس اک بھولی کہانی بن گئے ہیں
اترتے ہی خمارِ بادۂ شب

انھیں آنکھوں میں تم تارے
کہ ہیں نقش و نگارِ جادۂ شب

نہ وہ موجیں نہ وہ لہریں نہ وہ رنگ
ہوا کوئی جو دور افتادۂ شب

انھیں ہاتھوں میں ہے بزم صبوحی
کبھی تھے جو بہت دلدادۂ شب

○

بھر کو چلتے چلتے ہم کیا ٹھہر گئے ہیں
اُٹے ہیں صحرا دَر یا ٹھہر گئے ہیں

ہیں جدھر اُٹھی ہیں تصویر کھنچ گئی ہے
لما کے رہروانِ رعنا ٹھہر گئے ہیں

شوق میں کہ دیکھیں صید افگنی ہماری
مڑ کے آہوانِ صحرا ٹھہر گئے ہیں

ان کی آمد آمد اتنا اُچھل کے دل
وم ہو کر لمحے گویا ٹھہر گئے ہیں

جانے کب سے جاری رقصِ نگارِ ہستی
آئے ہیں تو سارے اعضا ٹھہر گئے ہیں

نقطہ اِک اُفق ہے تیرِ نظر ہمارے
کو ہدف سمجھ کر اتنا ٹھہر گئے ہیں

ول ہے کہ سایہ ہمراہ چل رہا ہے
شوق چل رہے ہیں، ہم یا ٹھہر گئے ہیں

ازہ خود ہے صحرائے عشق ہم بگولے
ٹھہر گئے ہیں پر کیا ٹھہر گئے ہیں

انقلاب آئے ہم یوں اٹل رہے ہیں
رواں پہ سائے گویا ٹھہر گئے ہیں

کائنات ساری تصنیف ہے ہماری
[illegible]

○

تاریکیوں کے نامہ برو رات ڈھل چکی
اب تو سحر کی بات کرو رات ڈھل چکی

پھیلی ہوئی ہے رات کے جنگل میں آگ سی
پھر مسکراؤ شعلہ رُخو رات ڈھل چکی

کب تک چھپے گا پردۂ شب میں سحر کا نور
شب کے نقیب حیلہ گرو رات ڈھل چکی

خاموش کیوں ہو نغمہ سرائی کا وقت ہے
شعلہ نواؤ، ہمنفسو رات ڈھل چکی

شب بھر چراغِ اشک جلائے بہت حزیں
کرنوں کا کوئی گیت بنو رات ڈھل چکی

ممتاز

میراجی کے مشن

تین نومبر ۱۹۴۹ء کی ایک اُداس صبح، میراجی نے جب
بت کی منزل پر دم توڑ دیا تو ارمانوں اور وفاؤں کی
ایک بیکراں سا اندھیرا پھیل گیا۔ میراجی کی بے سہارا
تنا، اللہ خاں ڈار کے خاکی جسم میں پینتالیس سال
پ رہی تھی کہ اسے ایک ہمدرد ساتھی مل جائے گا
جنگل، شہر شہر گھومنے کے بعد بھی کوئی ساتھی نہ ملا
ان کی رُوح وقت کا انتظار کئے بغیر ان کو بمبئی کی
باگتی فضا میں اکیلا چھوڑ کر کسی انجانی دنیا کی طرف
پ سی چلی گئی۔ اور میراجی کا دُبلا پتلا جسم جو جگر کی
ے اور بھی نحیف و نزار ہو گیا تھا بمبئی کی سیاہ مٹی
کر دیا گیا۔ اور آج گیارہ سال بعد، ان کی شخصیت،
عری، ان کی تنقید، ان کی تحریک، ان کے مشن کو
یا نادانستہ بھلا دیا گیا ہے۔ لیکن ابھی چند ایک
ابھی موجود ہیں جو ان کی تحریک، ان کے مشن کو
نے کے بعد مکمل کرنے کے لئے اپنی سی کوششیں
ہے ہیں۔

راجی سن ۱۹۴۹ء میں، مرنے سے چند مہینے پہلے،
شن کو مکمل کرنے کے لئے کراچی آنے کا پروگرام
تھے۔ اور جب میں ان سے بمبئی میں دسمبر ۱۹۴۸ء
ے رسالے خیال کے دفتر میں ملا تھا تو انھوں نے
اپنے پروگرام کی تفصیلات بتلائی تھیں۔

آج میں میراجی کے چند تجربوں اور پروگراموں
ذکر کرنا چاہتا ہوں جو ان کا مقصد حیات بنے ہوئے
تھے۔ ان کے مشن کسی خاص عقیدے اور نظریے
اشاعت اور تبلیغ کے لئے نہیں تھے جیسا کہ اکثر ادیبوں
نے ان کی زندگی میں، اور ان کے مرنے کے بعد، ان
پر الزام تراشے تھے۔ میراجی نے خود مجھ سے حیدرآباد میں
کہا تھا کہ وہ گیتوں اور نظموں میں نہ ہندو اور بدھ مذہب
کا پرچار کرتے ہیں نہ اسلام کا۔ ان کی گفتگو سے میں نے
ان کے ایمان کے بارے میں جو اندازہ لگایا تھا وہ کچھ
بھگت کبیر اور ابن تیمیہ کے درمیانی راستے کا نقش تھا
انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ بنگال کی ایک نازک
چاند کی سی شکل کی سانولی سلونی لڑکی میرا سین کے عشق کے
نتیجے میں انھوں نے ایک بہروپ ضرور اختیار کیا تھا اور
ان کے اس یک طرفہ عشق نے ان کے نفسیاتی اور جبلی
خواہشات میں ایک خلیج سی پیدا کر دی تھی۔ اور وہ اس
خلیج کو پاٹنے کی خاطر نت نئے تجربے کرتے رہے۔ کبھی ادب
میں، کبھی اپنی شخصیت میں، جس سے اُردو ادب میں اضافہ
تو ضرور ہوا مگر ان کی شخصیت میں ایک بڑی تبدیلی ہو گئی۔

میں یہاں میراجی کے بارے میں کرشن چندر کی ایک دلچسپ تشریح کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس کو کرشن چندر نے میرے سامنے اس وقت کی تھی جب میراجی کرشن کی کوٹھی کورو لاج میں رہا کرتے تھے۔

یہ کوئی چودہ سال پہلے کی بات ہے۔ جب میں پونا دوبارہ جنوری ۱۹۴۹ء میں اپنے ایک عزیز کی صاحبزادی کی شادی میں شریک ہونے گیا ہوا تھا۔ ان کا بنگلہ شالیمار فلم کمپنی کے سامنے تھا۔ اس کے برابر والے بنگلے میں اختر الایمان رہا کرتے تھے۔ جب میں پہلی دفعہ ۱۹۴۵ء اکتوبر میں لاہور سے واپس ہوتے ہوئے پونا میں ٹھہرا تھا تو ان سے وہیں میری ملاقات ہوئی تھی۔ اختر کے ساتھ فلم کے ایک ہیرو بھارت بھوشن بھی رہا کرتے تھے میری بھارت بھوشن سے بھی اکثر بات چیت رہتی خصوصاً ہم لوگ فلم سے ہٹ کر خلیل جبران کے ادب، کافکا کی ماورا ادراک حقیقت، کریک گرائیڈ کی خود وجودیت، جیمز جوائز کے نفسیاتی تجربے، اور خاص کر جوائز کی کتاب ......
Finnegan's Wake پر باتیں کیا کرتے۔
ایک روز اختر نے ہماری گفتگو میں شریک ہوتے ہوئے کہا تھا "میراجی نے جوائز کی اس کتاب میں قرآن کا ذکر تلاش کیا ہے، اور اس پر تحقیق کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بات ہم سب کے لئے بڑی دلچسپ تھی اور میری میراجی سے ملنے کی خواہش اور بھی بڑھتی گئی۔

جب میں شادی کی رسومات کے اختتام پر اپنے تین انگریزی کتابوں کے اردو ترجموں کی اشاعت کے سلسلے میں بمبئی جا رہا تھا تو اختر نے کہا تھا "بمبئی جا رہے ہو تو کرشن چندر کے گھر میراجی سے مل لینا، اور اپنے ترجموں کو بھی دکھلا دینا"

جب میں میراجی سے ملنے کرشن چندر کے گھر گیا تو سب سے پہلے مہندر ناتھ سے ملاقات ہوئی۔ ہم لوگ بہت ہی کشادہ اور وسیع ہال میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ کوٹھی کے اندرونی کمرے سے کرشن چندر آگئے اور اس کے بعد اوپر کی منزل سے وشوامتر عادل۔ اس وقت میراجی نہیں تھے۔ مہندر ناتھ نے بتلایا کہ وہ منٹو سے ملنے فلمستان گئے ہوئے ہیں۔ ان سب کے سامنے کرشن چندر سے ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ لیکن کرشن چندر نے ایک بات کہی جو میرے لئے نئی تھی! — دورانِ گفتگو میراجی کے بارے میں انھوں نے کہا "میراجی مسلمان ہیں بلکہ پکے مسلمان، ان کا ہندو نام ایک دھوکا ہے۔ صبح سویرے جو وہ بجے بجے ونتی کا راگ الاپتے ہیں وہ بھی محض فریب ہے۔ دراصل وہ مسلمان ہیں——"

اُسی روز میں نے منٹو سے اس بات کا ذکر کیا تو منٹو نے اپنے مخصوص طنزیہ لہجے میں کہا تھا "مظہر صاحب آپ ایک مضمون لکھیے، جس کا عنوان ہو کرشن چندر ہندو ہے"——

میراجی کو سکندر علی جگر مرحوم کا یہ شعر بے حد پسند تھا۔ یہ عشق نہیں آساں اتنا ہی سمجھ لیجئے۔
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے
میراجی نے اپنے اس عشق کی تکمیل کے لئے آگ کے دریا میں ڈوبنا کیوں پسند کیا جبکہ میراسین کو ان سے محبت نہیں تھی۔ یہ الگ بحث ہے، یہاں میں اس بحث میں نہیں جاؤں گا۔ البتہ میں نے ایک بات میراجی سے ان کی شاعری کے بارے میں یہ پوچھی تھی "میراجی آپ نے میراسین سے عشق کیا تھا تو آپ کو بنگالی زبان اور اس کے ادب سے لگاؤ ہونا چاہئے تھا بلکہ آپ کو بنگالی زبان میں شاعری کرنا چاہئے تھی" میراجی نے برجستہ کہا تھا "میرا ادیبی میٹھا

لئے ایک Symbol تھی جسے اس کی محبت اس کی
رفاکی آرزو نہیں تھی۔ میں نے بنگالی میں اس لئے شاعری
نہیں کی کہ وہ میرے جذبات اور احساسات کے اظہار
کے لئے میرا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔"

میں نے ایک اور بات بھی ان سے دریافت کی
تھی "میراجی تو پھر آپ نے فرانس کے میلارمے اور باڈلیر
کا اثر کیوں قبول کیا۔ انگریزی شاعر کیٹس، شیلے، اور بائرن
نے آپ کو متاثر کیوں نہیں کیا"

میراجی نے اس سلسلے میں بہت ساری باتیں کہی
تھیں۔ (میں اس کو مختصر طور پر بیان کرتا ہوں)۔ انھوں
نے کہا تھا کہ ایک اطالوی نقاد ماریو پراز کی کتاب
Romantic Agony نے ان کے نقطۂ
نظر میں بڑی تبدیلی پیدا کی۔ چونکہ انگریزی شاعر خالص
رومانی تھے اور ان کو خالص رومانوی شاعری پسند نہیں
تھی۔ چونکہ شعر کا تعلق تصور اور احساس دونوں سے ہے
اس لئے یہ بات فرانس کے شاعروں میں زیادہ نظر آتی ہے۔
اور جو سوز اور فسردگی کا تیکھا پن فرانس کی شاعری میں
رچا بسا ہوا ہے وہ کسی اور ملک کی شاعری میں کم ملتا ہے۔
ان کا خیال تھا کہ فرانس کے شاعروں میں ایک ٹھہراؤ اور
اضطراب ہے جو جذبے میں اُتر جائے تو مسرت اور شادمانی
کو بیدار کرتا ہے اور مچل جائے تو آندھی کی طرح بکھر جاتا
ہے۔ فرانس کے شاعر چونکہ حسن کو نیکی سمجھتے ہیں اور میراجی
کی شاعری بھی نیکی کی تلاش ہے۔"

میراجی جب دسمبر ۱۹۴۶ء میں حیدرآباد آئے تو انھوں
نے اپنے ایک اور نئے مشن کا اعلان کیا تھا۔ اب کے ان کا
[illegible] دنیا کی چکر لگانا تھا۔ وہ بھی منٹو کی طرح فرانس میں
[illegible]گی کے آخری دن گزارنا چاہتے تھے۔ لیکن موت نے ان
کی یہ خواہش بھی پوری نہیں کی۔ ان کا پروگرام تھا کہ جنوبی ہند

سے مشن کا آغاز کیا جائے۔ اور تمام براعظموں کی سیر کے بعد
آخیر میں قطب شمالی جا کر وہاں ایک سال تک قیام کریں تاکہ
چھ مہینے کے دن، چھ مہینے کی راتوں کو نظم کر سکیں۔ ان کی
تمنا تھی کہ وہ تلک کی کتاب [illegible] Home in
[illegible] Vedas) کا جواب لکھیں گے اور یہ ثابت کریں گے
کہ دنیا میں سب سے پہلے آدم نے قطب شمالی کے برفستان
میں جنم نہیں لیا تھا بلکہ ایشیا کے کسی ایک مقام پر۔

میراجی کی ایک اور خواہش تھی کہ قرآن پر تحقیق
کرنے کے لئے وہ جرمنی میں ٹھہریں گے۔ ان کا خیال تھا
کہ قرآنی امثال پر آج تک کسی مذہبی عالم نے قلم نہیں
اُٹھایا ہے۔ صرف ایک کتاب امام ماوردی کی عربی میں
موجود ہے۔ مگر اس پر تحقیق ہونی چاہیئے کیوں کہ جب تک
امثال کی ماہیت اور وجہ تسمیہ کو نہ سمجھا جائے قرآن کو سمجھا
نہیں جا سکتا۔

میراجی کا آخری مشن اُردو ادب کی ترقی اور اشاعت
کے لئے تھا۔ ان کا خیال تھا کہ سب سے پہلے بڑے پیمانے پر
اُردو لائبریری قائم کی جائے اور ساتھ ہی ادیبوں کے لئے
ایک ہوسٹل تعمیر کیا جائے۔ تاکہ وہ سب ایک پلیٹ فارم پر جمع
ہو کر تصنیف تحقیق اور تالیف کا کام کریں۔ اور دُنیا کی تمام
بڑی بڑی زبانوں میں اُردو ادب کو منتقل کریں تاکہ بیرونی
ممالک اُردو ادب سے واقف ہو سکیں۔
ان کا یہ بھی خیال تھا کہ ادب کی ترقی کے ساتھ ساتھ ادیب کی
معاشی تنگ دستی کو بھی دُور کیا جائے۔ اور ایک ایسا ماحول
پیدا کیا جائے جس سے ایک طرف دنیا میں اُردو ادب پھیل
جائے اور دوسری طرف ادیب اپنی دنیا میں مست اور مگن
رہ سکے۔

عرض ہے میراجی کے اس مشن کو عملی شکل دینے کی کوشش ایک دفعہ ۱۹۵۲ء میں کی تھی جب کہ میں حلقۂ ارباب ذوق کا جائنٹ سکرٹری تھا۔ میں نے ایک ادب دوست افسر کو جو ان دنوں ریاست قلات میں ایک بڑے عہدے پر فائز تھے۔ میراجی کے اس ادبی مشن کے بارے میں لکھا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ آغا صاحب اپنے اثر اور رسوخ سے اس پروگرام کو عملی جامہ پہنائیں گے۔ انھوں نے اپنے جواب میں مجھے لکھا تھا کہ وہ ذاتی طور پر اس کو پسند کرتے ہیں اور ذاتی طور پر امداد دینے کو ہیں۔ مگر ریاست کی طرف سے اتنے بڑے پروجکٹ کے لئے امداد کا وعدہ نہیں کر سکتے۔ اگر آغا صاحب اس میں اس پروگرام کو عملی شکل دے دیتے تو آج گلڈ اور بھی راستہ ہموار نظر آتا۔

* * * * *

مُصنفین اور ناشرین کے مُعاہدے

مَرکز کا اعلان

مرکز کے علم میں بہت سے ایسے معاملات ہیں جن میں ناشر نے مصنف کے ساتھ صریح ناانصافی کی ہے۔ ہم نے گزشتہ ڈیڑھ برس میں اراکین متعلقہ کے ایما پر ان ناشرین کے خلاف ضروری کارروائی بھی کی ہے اور چند معاملات میں ہمیں کامیابی بھی ہوئی ہے لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ مصنفین معاہدے کرتے وقت اپنی ضروریات سے مجبور ہو کر یا ناواقفیت کی بنا پر ناشرین سے عجیب غریب بے معنی اور غیر قانونی معاہدے کر بیٹھتے ہیں جن کے سبب بعد میں کامیاب قانونی کارروائی ممکن نہیں رہتی اور صرف اخلاقی اپیل کا سہارا رہ جاتا ہے

گلڈ ایسے معاملات میں اخلاقی اپیل سے تو کام لیتا ہی ہے اور اب کراچی، لاہور اور ڈھاکہ سے اس کے پرچے بھی جاری ہو رہے ہیں وہ ان حضرات کے استحصال کی جملہ تفصیلات کی اشاعت بھی کیا کرے گا لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ ضروری ہے کہ قانونی پیچیدگیوں کے پیش نظر مصنفین معاہدے کرتے وقت گلڈ سے مشورہ لے لیا کریں مرکزی دفتر کو بہترین قانونی مشیروں کے مشورے اور خدمات حاصل ہیں اور ہم ہر مصنف کے معاہدے کا مسودہ بلا معاوضہ تیار کرا سکتے ہیں۔ یہ بات مصنفین کے اپنے فائدے کی ہے۔

آئندہ سے مصنفین مرکزی دفتر کو اپنے معاہدے کی شرائط اور دوسرے ضروری امور لکھ دیا کریں ہم انھیں مسودۂ معاہدہ "صرف دس دن میں بھیج دیا کریں گے

مصنفین تیار کردہ معاہدے بھی نظرثانی یا اہم نکات پر قانونی مشورے کے لئے ہمیں بھیج سکتے ہیں۔ کسی قسم کا قانونی مشورہ دینے کی کوئی فیس وصول نہیں کی جائے گی۔

امید ہے کہ یہ طریقہ ان ناشرین کے لئے بھی مفید ثابت ہوگا جو مصنفین سے شکایات رکھتے ہیں۔

یہ بلا معاوضہ خدمات جملہ پاکستانی مصنفین کے لئے ہیں خواہ وہ گلڈ کے رکن ہوں یا نہ ہوں صرف عدالتی کارروائی کے لئے مصنف کو گلڈ کا رکن ہونا ضروری ہے تاکہ گلڈ کو اس کی قانونی نمائندگی حاصل ہو جائے۔

[illegible] شریمتی یہاں ہوتیں تو یہ حالت بھوری ان
[illegible] وقت اس کو کس نگاہ سے دیکھتیں۔ آپ سمجھتے
[illegible] معاملہ میں ان کے نقطۂ نظر کا خیال رکھنا کس قدر
[illegible] تھا —— میں نے دیکھا لڑکی کا رنگ سانولا ہے،
[illegible] معمولی لیکن آنکھیں بڑی بڑی کچھ کہتی ہوئی سی ہیں،
[illegible] میں کشش بھی ضرور ہے۔ اب معلوم نہیں شریمتی جی کو
[illegible] کچھ نظر آتا یا نہیں بہر حال میں دوبارہ تذبذب میں پڑ
گیا۔ دیکھئے کہیں آپ کو یہ غلط فہمی تو نہیں ہو رہی کہ شریمتی اس
[illegible] احتیاط اس وجہ سے ہیں کہ میں کچھ غیر ذمہ دار قسم کا آدمی ہوں
[illegible] اس سلسلہ میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ ایسا بالکل نہیں
ہے۔ [illegible] نے ایک مرتبہ شریمتی کو اپنی ایک سہیلی سے کہتے سنا
تھا۔

"مرد کو ایسا موقع ہی کیوں دو بہن۔"

آپ جان گئے ہوں گے کہ ان کی احتیاط موقع نہ
دینے کی احتیاط ہے اس میں میری کسی بدعنوانی یا بے احتیاطی
کا دخل نہیں۔ میں منع کرنے کے معقول بہانے ڈھونڈ رہا
تھا کہ وہ عورت بولی۔

"اس لڑکی کا دماغ کھراب ہے جی، پگلی ہے۔ بس سارا
دن چپ چاپ بیٹھی رہے ہے، نہ کسی سے بولتی ہے نہ چالتی
ہے۔"

سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کو کیا سمجھوں۔ شریمتی جی اس کو
[illegible] پلڑے میں ڈالتیں یا اُس میں؟

ادھیڑ بن میں پڑا رہا تھا اب آخر ایسا بھی کیا کہ میں انھیں
اب تک نہ دے سکوں۔ میں نے اپنے آپ کو شرم دلائی۔ "یا
ہاں کہہ دوں یا نہ، آخر اس سوچ بچار سے فائدہ!"

"تمہیں کتنے دن کے لئے کوارٹر چاہیئے؟" آخر میں
نے پوچھا۔

"جتنے دن کے لئے دے دیں حجور، اگر ہمیں کوئی دوسرا
کوارٹر مل گیا تو ہم ادھر سے چلے جائیں گے جی" عورت بولی۔

"تم ایک مہینہ اس کوارٹر میں رہ سکتی ہو، اس عرصہ
میں کوئی اور انتظام ضرور کر لینا" میں نے شریمتی کی واپسی
میں ایک ماہ کا مارجن رکھ کر کہا۔

"بہت اچھا جی، خدا حجور کے بال بچوں کو سلامت
رکھے" وہ عورت دعائیں دیتی تیزی سے چلی گئی مبادا میں
اپنا فیصلہ بدل دوں اور اس کے پیچھے بچوں کی قطار بھی۔
بے چاری پاگل ہو گئی نہ جانے کیوں —— میں نے
سوچا۔ مجھے پاگلوں سے ہمیشہ سے ہمدردی رہی ہے ——
دیکھئے پھر آپ مسکرائے ——

اس بات کو میں بھول بھال گیا۔ چند دن بعد مجھے
یہ اندازہ ہوا کہ وہ لوگ کوارٹر میں آ گئے ہیں۔ کبھی میں پگلی
لڑکی کو نل پر پانی بھرتا ہوا دیکھتا کبھی کوارٹر کی طرف کوئی کالا
بھجنگ بچہ کھیلتا ہوا نظر آتا جو مجھے دیکھ کر سرپٹ دوڑتا ہوا
کوارٹروں کے احاطے میں پناہ لیتا اور بس ——
ایک دن جب میں غسل خانہ کے باہر دھوپ میں
پڑا ہوا تولیہ لینے گیا تو دیکھا کہ وہ لڑکی ہاتھ میں بالٹی لئے
نل کی طرف جا رہی ہے۔ اس کی غیر معمولی رفتار دیکھ کر میں
ٹھٹکا اور یہ دیکھ کر مجھے کچھ عجیب سا احساس ہوا کہ اس کے
دونوں پاؤں زنجیر سے بندھے ہوئے ہیں اور اس
میں ایک موٹا سا تالا پڑا ہوا ہے۔ گو وہ چند انچ کے چھوٹے
چھوٹے قدم رکھ کر گھسیٹ رہی تھی لیکن اس کی آنکھوں
میں چوکڑیاں بھرنے والے ہرن کی وحشت تھی۔ اس کو دیکھ کر
مجھے کچھ دکھ سا ہوا۔

"یہ زنجیر کس نے ڈالی ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔
"اماں نے" اس نے کہا۔
اسی وقت ماں کوارٹر کے احاطے سے نکلی۔ "سلام
صاحب"

"ارے یہ تم نے اس کے پاؤں میں زنجیر کیوں ڈال

رکھی ہے!" میں نے کہا

"اس سے پوچھو صاحب، بھاگ جاتی ہے، میں بوڑھی عورت، گھر کے کام کاج کو دیکھوں یا اس کو دیکھوں، ادھر نظر بچی اُدھر گھر سے غائب۔ آج صبح تین بجے کی نکلی ہے اس وقت پکڑ کر گھر جا سے لائے ہیں۔"

لڑکی کے چہرے کے تاثرات میں ذرا بھی تبدیلی نہیں آئی تھی جیسے اس نے کچھ سُنا ہی نہ ہو۔

"کب سے یہ حال ہے اس کا؟" میں نے پوچھا

"بہت دن سے جی"

"اسے کسی ڈاکٹر کو دکھاؤ نا"

"بہت دکھایا جی۔"

لڑکی پانی بھر کر چلی گئی تو میں نے کہا "اسے دماغی ہسپتال میں داخل کر دو، تمہیں بھی پریشانی نہیں ہوگی اور اس کا علاج باقاعدہ ہوتا رہے گا۔"

"اچھا جی ——" عورت نے ہامی بھر لی اور میں اندر آ گیا۔

گرمیاں شباب پر تھیں۔ میں رات کے کھانے کے بعد ٹہلنے چلا گیا۔ وہاں سے لوٹ کر سونے کے ارادے سے باہر لان میں آیا، چاندنی چھٹکی ہوئی تھی، احاطے کے لمبے درخت سرکنڈے اس پاکیزہ ماحول میں عقیدت سے چپ چاپ کھڑے تھے۔ دفعتاً کوارٹروں کی طرف سے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں، کچھ مارپیٹ کا شور تھا کچھ تین آوازوں مختلف ٹونوں میں چیخنے کا۔ ماحول کا طلسم جیسے ٹوٹ گیا۔ میں نے غلام کو بلا کر پوچھا "یہ کیا تماشہ ہے بھئی۔؟"

"وہ لڑکی آج تین دن بعد گھر آئی ہے، ماں نے لڑکی کو اور خاوند نے اسے مارا۔" کچھ دیر ٹھہر کر اس نے کہا "یہ اچھے لوگ نہیں جی، دن رات دنگا فساد، مفت میں کوٹھی کی بھی بدنامی ہوتی ہے آپ انہیں جواب دے دیں جی۔"

"میں نے انہیں ایک مہینہ رہنے کو کہا تھا انہیں یاد دلا دینا اور انھوں نے اس لڑکی کو ابھی تک دماغی ہسپتال میں داخل نہیں کروایا؟"

"دماغی ہسپتال؟" نوکر نے مجھے حیرت سے دیکھا

"ہاں جب اس کا دماغ ٹھیک نہیں تو اسے دکھانا چاہیئے۔ اس کے باپ سے کہنا کل اسے لے جائے میں چٹھی لکھ کر دوں گا"

"دماغ واغ سب ٹھیک ہے جی، یوں ہی ——" وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا۔

یہ بے چارے ان پڑھ لوگ ہیں بالکل جاہل سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں پاگل صرف وہ ہے جو ننگ دھڑنگ پھرے، اور لوگوں کو پتھر مارے۔ یہ بات اس نے کہہ بھی دی۔

"جناب آپ اس کی باتیں سنیں تو پتہ چلے کہ وہ کیسی پاگل ہے، بڑے بڑے دماغ والوں کے کان کترتی ہے"

ان بے چارے کو یہ نہیں معلوم کہ پاگلوں کے فلسفے کے آگے واقعی دماغ دار عاجز رہ جاتے ہیں۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی "بہت سے پاگل ایسے بھی ہوتے ہیں جو عقلمندی کی باتیں کرتے ہیں۔ پاگل خانے میں بہت سے پاگل شطرنج کھیلتے ہیں، شطرنج کھیلنا کچھ آسان کام ہے؟ اور بہت سے لوگوں کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ پاگل ہیں" —— یہ سب میں نے اس سے اس لئے کہا کہ شاید یہ باتیں وہ لڑکی کے باپ کو بتا دے اور اسے بھی کچھ شک ہو تو وہ دور ہو جائے لیکن یہ باتیں سُن کر وہ بے یقینی سے مسکرایا جیسے وہ مجھے بھی اسی قسم کے پاگلوں میں سے ایک سمجھ رہا ہے اور سلام کر کے چلا گیا۔

دو چار روز بعد پھر ایک دن اسی قسم کے شور و غل کی آواز آئی اور پتا چلا کہ لڑکی پھر غائب تھی ... جا کر ایک دم جوان بن جاتا ہے اور باقی سال نہایت

[illegible] رہتا ہے ہاتھ باندھ کر اکھڑا ہوا۔

"کیا بات ہے بابا؟" میں نے پوچھا۔

"آپ ان عیسائی لوگوں کو نکال دیں جی"

"کون عیسائی؟"

"جن کو آپ نے کوارٹر دیا ہے"

"یہ عیسائی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ان کا کیا عجب ہے جی، کبھی مسلمان بن جاتا ہے، کبھی پھر عیسائی بن جاتا ہے" بابا نے حسب عادت اردو، پنجابی اور پشتو کی کاک ٹیل بنا کر پیش کی۔

"تو کبھی یہ لوگ مسلمان ہو گئے تھے؟" میں نے دلچسپی لی

"ہاں جی — اپنی لڑکی کی شادی انھوں نے ایک مسلمان سے کیا اور سب لا کے ہاتھ سے مسلمان بن گیا مرد کا نام ہو گیا محمد سلیمان، عورت کا نام ہاجرہ بی بی، بچوں میں کوئی محمد انور کوئی سلطانہ کوئی کچھ، اور جب لڑکی کے خاوند نے اس کو چھوڑ دیا تو یہ سب کا سب گرجا میں جا کر پھر عیسائی بن گیا اور وہی جان اور البرٹ کا ڈم نام بنا لیا —"

"اچھا —" میں نے بمشکل ہنسی روکی۔ "تو یہ صرف لڑکی کی شادی کرنے کے لئے مسلمان ہوئے تھے؟"

"ہاں جی اسی کے پیچھے۔ اب بولتے ہیں، ہمیں تمھاری برادری میں آ کے کیا ملا۔ مسلی نام اور محلہ والوں کے طعنے ملا۔ عیسائی ہوتا ہے تو پیسے ملتا ہے، بچوں کے کپڑے ملتا ہے — دودھ اور گھی ملتا ہے —" لالچی آدمی ہے جی، بہت خراب آدمی ہے۔"

"اس آدمی نے لڑکی کو طلاق کیوں دے دی؟" میں نے پوچھا۔

"ایسی عورت کو کون رکھ سکتا ہے جی" اس نے کہا۔ "بالکل فضول لوگ ہیں، رکھنا ہی ہے جی تو بہت سے مسلمان لوگ مارا مارا پھرتا ہے۔ کئیوں نے ہم سے بولا ان کو جگہ دے دو جی۔ ان کا کیا ہے کسی گرجا میں بیٹھ جائے گا تو پادری لوگ آپ جگہ دے گا"

"اچھا، اس آدمی کو ذرا میرے پاس بھیج دینا" میں نے کہا۔

بابا اپنی بات کا خاطر خواہ اثر نہ دیکھ کر کچھ خفا سا دربار سے چلا گیا۔ اور تھوڑی دیر بعد کالا بھجنگ، کمزور سا ایک آدمی سفید قمیص پجامے میں جگمگاتا میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"جی؟" وہ سراپا استفسار تھا۔

"یہ ہر روز تمھارے گھر میں کیا جھگڑا ہوتا ہے؟" میں نے آواز میں پوری صاحبیت برقرار رکھی۔

"کیا بتاؤں صاب" وہ منمنایا "میں تو اس جندگی سے ہی تنگ آ گیا ہوں رات دن ماں بیٹیاں لڑتی ہیں۔ ایک کھانا نہیں پکاتی، دوسری بھی نہیں پکاتی۔ دن بھر کا تھکا ہارا آتا ہوں تو چولھا جلاتا ہوں"

"قصہ کیا ہے؟"

"کصہ کیا ہے، کسمت کی کھرابی ہے جی، ایک تو ہاتھ سے نکل ہی گئی اب دوسری بھی پاگل بن رہی ہے"

"تم دوسرے کوارٹر کا بندوبست کر لو"

"بہت اچھا جی —" وہ گردن سینے پر ڈھلکا کر خم سا چلا گیا — مجھے کچھ افسوس سا ہوا، کچھ ضمیر نے ملامت بھی کی۔ ایک پریشان حال کنبہ کو یوں بے گھر در کر دینا کونسی انسانیت ہے لیکن میں نے ضمیر کو تھپکی دی، آخر ہماری بھی تو کچھ مجبوریاں ہیں۔ بدھو ٹھیک کہتا ہے ہماری بدنامی ہے، بابا بھی ٹھیک کہتا ہے اور پھر شہ[illegible] جی — ان کو سب سمجھانا کس قدر مشکل ہوگا۔ اس رات میں بہت دیر تک Psychology of [illegible] پڑھتا رہا۔ طرح طرح کے complexes بعض اوقات انسان کے ذہن کو بالکل الٹ دیتے ہیں اور کبھی اس کی شخصیت کو دو [illegible] میں کاٹ دیتے ہیں [illegible] کے ٹکڑے۔ ایک حصے کو دوسرے کی خبر نہیں رہتی [illegible] بہت بات کے [illegible]

[illegible] لڑکی کے ماں باپ پر بھی۔ میں ان کو اتنی دور
[illegible] سے یہ تک ضروری نہ سمجھا کہ مجھے ڈاکٹر کی
[illegible] دیتے۔ میں نے اندر آ کر میڈیکل سپرنٹنڈنٹ کو
کہا۔ اس نے کہا۔ "لڑکی پاگل نہیں ہے جی" اور کمٹ
[illegible] دیا۔ میرا خون کھولنے لگا۔ ہمارے ملک سے تمیز
[illegible] سب اُڑ گئی، اگر ایک منٹ بات کر لیتا تو جانے کیا
[illegible]۔ گدھے کو آتا ہی کیا ہے۔ ذرا سی دیر میں اس نے
[illegible] لیا کہ لڑکی پاگل نہیں ہے بڑے بڑے ماہرِ نفسیات
[illegible] سر مارتے ہیں ایک ایک مریض پر ——— بھاڑ میں جائیں
[illegible] ——— مارے غصہ کے میں نے انسانی ہمدردی سے قطعی
[illegible] کھینچ لیا اور بیرے کو بلا کر کہہ دیا۔ ان لوگوں سے کہو صبح
[illegible] کو اور ضرور خالی کر دیں اور بیزار ہو کر ایک دوست
[illegible] ہاں چلا گیا ——— دوست نے مجھے دیکھتے ہی عجیب طرح آنکھ
[illegible] اور کہا ——— "یار کن کو اُڑائے اڑائے پھرتے ہو کار دیں
[illegible] بھابی سے کہوں گا۔"

کم بخت کو بڑی سنجیدگی سے ہکلا ہکلا کر سارا قصہ
سنایا لیکن آخیر میں اس نے پھر آنکھ ماری اور کہا ——— "یار،
تمھیں بڑی تفکار ہیں اس کی"

میں نے اسے جی بھر کر بُرا بھلا کہا اور کبھی نہ ملنے کا عہد
کر کے وہاں سے چلا آیا۔ گھر پہنچا تو تانگہ کھڑا تھا اور شریمتی جی
سامان اُتروا رہی تھیں۔

"خیر تو ہے اتنی جلدی کیسے چلی آئیں!" میں نے پوچھا
"کئی دن سے دل گھبرا رہا تھا، بڑے بُرے خواب
نظر آ رہے تھے، میں نے کہا تھا تمھاری کیسی طبیعت ہے۔ ایک
ہفتہ سے تمھارا خط بھی نہیں ملا تھا"

"خط تو میں نے کل ہی لکھا ہے"

"تو کیا میرا آنا ناگوار ہوا؟" ایک دم تیور بدل کر بولیں
[illegible] واہ یہ کیا کہتی ہو میں تو خود اُکتا گیا تھا تنہائی
[illegible] جلدی جلدی سامان اتارنے لگا۔

شام کے کھانے کے بعد میں نے پیچھے سے بیرے سے
کہا "ان کو اور [illegible] والوں سے کہو کمرہ ابھی خالی کر دیں" اس
نے واپس آ کر کہا "وہ کہتے ہیں آپ نے صبح کے لئے کہا تھا، ہم
صبح چلے جائیں گے اس وقت کہاں جائیں"

بات معقول تھی، میں خاموش ہو گیا۔ فائلوں کی ٹرے
لے کر اسٹڈی میں جا بیٹھا، شریمتی اپنی گرہستی لے کر وہیں
آ گئیں۔ میں ایک کیس میں بالکل کھویا ہوا تھا کہ دفعتاً وہ
بولیں "سنتے ہو وحشت کرنا کے کیا معنی ہیں!"

"ہونہہ ——— وحشت کرنا معنی وحشت کرنا اور کیا" میں
نے فائل پر سے ذہن ہٹائے بغیر کہا۔

"وحشت کرنا معنی دور بھاگنا پرہیز کرنا تو نہیں" انہوں
نے پوچھا

"ہاں یہی ہیں" میں نے خوش ہو کر کہا "مگر آج کے
دن "وحشت کرنا" کیوں یاد آ رہا ہے تمھیں؟"

"کچھ نہیں، تمھاری ڈائری میں ۱۶ جون کی تاریخ میں
یہ شعر لکھا ہے

دور بہت بھاگو ہو ہم سے سیکھا طور غزالوں کا
وحشت کرنا شیوہ ہے کچھ اچھی آنکھوں والوں کا

"اچھا ——— "میں نے چونک کر کہا ——— "خوب ———
بہت دن ہوئے انور نے شعر سنایا تھا، مجھے اچھا لگا تو میں
نے لکھ لیا"

"مگر وہ تو ۱۶ جون ———"

"ارے بھئی میں نے ڈائری کھولی اور لکھ لیا کوئی تاریخ
دیکھ کر تو نہیں لکھا تھا"

"مگر پہلے تو نہیں تھا"

"کب نہیں تھا؟"

"جب میں گئی تھی"

"تب نہیں ہوگا ——— مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم میری
آفس ڈائری اس قدر غور سے پڑھتی ہو!"

"دیکھو کیا تمہاری آفس ڈائری سے، پہلی ہی نظر پڑ
پوچھ لیا؟" شریمتی کا حوا [illegible] جب ہم ہونے لگا تو میں نے
ات ٹپٹ دیئے۔ "آؤ تھوڑی دیر قبل آئیں پھر سوئیں

چاندنی رات میں دمکتی سفید چادروں اور سفید
پر جب ہم لیٹے اور رات کی رانی کی مہک دل و دماغ
نے لگی اور میں نے شگوفہ کہہ کر باہیں پھیلائیں تو دفعتاً
ہوا۔ "یہ کون لوگ ہیں کوارٹر میں؟"
میں نے ہکلا ہکلا کر سارا قصہ سنایا اور آخر میں
بے چاروں کی لڑکی پاگل ہے بہت پریشان کرتی ہے
—— میں نے ان سے کہہ دیا ہے صبح کو کوارٹر خالی
یں"
"مگر وہ لڑکی پاگل تو نہیں ہے" شریمتی ایک دم بولیں
"تمہیں کیسے معلوم؟"
"میڈیکل سپرنٹنڈنٹ کہہ رہا تھا"
"وہ تمہیں کہاں ملا؟"
"ارے بھئی ملتا کہاں، میں نے اسے فون کیا تھا،
ی ڈائری میں اس کا نمبر لکھا ہوا تھا"
"اچھا —— لیکن میرا خیال ہے ڈاکٹر نے اسے اچھی
نہیں دیکھا وہ لڑکی قطعی پاگل ہے"
"کیا تم نے اچھی طرح دیکھا ہے؟"
"سچ سچ —— بھئی حرکتوں سے بھی تو پتہ چل جاتا
بلکہ اس کی آنکھوں سے صاف نظر آتا ہے۔ ان پاگلوں
آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی دحشت ہوتی
م خود دیکھ لینا"
وحشت!! —— اچھا —— شریمتی کی آواز کچھ بُ
ر ہوتی جا رہی تھی۔
"آؤ سو جائیں ——" میں نے اپنے ارمانوں کو سُلا کر

بات مختصر کر دی۔
ابھی پوری طرح صبح نہ ہوئی تھی۔ میں عالمِ نیم خوابی
میں اس احساس کے مزے لے رہا تھا کہ ایک کندن سا
میرے نزدیک کے بستر پر پڑا دمک رہا ہے، شریمتی کے
ریشم جیسے سنہری بال سارے تکیے پر بکھرے ہوئے ہیں
پو پھٹ رہی ہے اور میرے گھر کی رونق لوٹ آئی ہے کہ
دفعتاً کوارٹروں کی طرف سے پھر شور و غل بلند ہوا۔ اس
دفعہ یہ پچھلی تمام باریوں سے شدید تھا۔ لڑکی کے بلبلا کر
رونے اور پھر متواتر کچھ بجنے کی آواز آ رہی تھی۔ ماں باپ
چیخنے چلانے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی
کوشش کر رہے تھے۔ میں غصہ سے کھول اٹھا۔ واقعی
ان لوگوں نے ہمارے بنگلے کو نا جانے کیا سمجھ لیا ہے۔ ہم
بھی میری وجہ سے انھیں کچھ نہیں کہتے، سچ ہے ان لوگوں
کے ساتھ بھلائی نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ یہ تک خیال نہیں
کرتے کہ ہم باہر لان میں سو رہے ہیں۔ بڑبڑا کر میں نے
چپل پہنے۔ بس بہت ہو چکا، میں ابھی ان کا سامان سڑک
پر پھینک دوں گا، تماشہ بنا رکھا ہے۔ دل میں ہلکا سا
یہ احساس ضرور تھا کہ میرے ان لوگوں کو ڈانٹنے کا شریمتی
پر اچھا اثر پڑے گا اور تھوڑی بہت غلط فہمی اگر ہوگی تو
رفع ہو جائے گی۔ میں نے کوارٹر کے احاطے کا دروازے
پر ہاتھ مارا۔ وہ اندر سے بند تھا۔ میں نے اسے کئی بار
زور سے دھڑ دھڑایا لیکن مار پیٹ اور گالی گلوچ
میں کسی نے اس کو کھولنے کی پرواہ نہ کی۔ میں گھوم کر
کوارٹروں کی کھڑکی کی طرف گیا۔ لڑائی اسی طرف ہو رہی
تھی۔ آوازیں صاف ہوتی جا رہی تھیں کوارٹر کے دروازے
کے پار لڑائی کا کچھ کچھ نقشہ بھی نظر آ رہا تھا۔ باپ لڑکی
سے کہہ رہا تھا۔
"دیتی ہے پیسے یا نہیں؟" اور عورت کہہ رہی تھی۔
"مگر وہ لے بھونکے حرامی کو دیتی ہمیں کس لئے [illegible]

[illegible] نے اس نے ایک پیسہ دیا جو آج عام ہے
[illegible] بھی کہ اب کی اور آگہت بھی، ہاتھ دھری

آدمی پھر لڑکی کو بے دردی سے مارنے لگا۔ میں
[illegible] پریشان سا کھڑا تھا۔ لڑکی چلا رہی تھی: "مجھے پاس
پیسے نہیں تھے" مار دیا تھا اس نے: گلے سے معمولی سا
ایک [illegible] اتار کر اس نے زمین پر پھینک دیا۔
"اچھا، اور اپنے صاحب سے جو روپیہ لائی تھی!"
"کن صاحب سے؟"
"یہ جن کے کوارٹر میں ہم رہتے ہیں اور کون
[illegible] بھولی بن رہی ہے میں نے اپنے کانوں سے مانگتے
ہوئے سنا ہے"

"[illegible] لڑکی نے [illegible]
نکالیں: "مانگتے ہوئے تو سنا ہے نہیں جانتا" وہ چلایا تھا: "
جا، صبح دیکھا جائے گا — کہو تو ابھی مار کر بھی چھوا دوں؟"
اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں اس آ
سے مڑا کر کسی نے دروازہ نہیں کھولا تو توڑ ڈالوں گا
جب پلٹا تو دیکھا کشور [illegible] تھی — میری شکستہ
بلی کی طرح میرے نزدیک کھڑی سب کچھ دیکھ اور سن
رہی ہے۔ اس نے مجھے جن نظروں سے دیکھا اس کے
بعد بھی اگر زمین نہ پھٹی اور میں اس میں نہ سمایا تو
میری انتہائی سخت جانی اور بے غیرتی کی دلیل ہے
بس اور کیا ———

گلڈ کے انعاماتِ سالگرہ

پاکستان رائٹرز گلڈ (مرکز) نے سال آئندہ سے ہر ۳۱ جنوری کو دس ادبی انعامات دینے کا اعلان کیا ہے
ہر انعام کی رقم ایک ہزار روپیہ ہوگی۔ یہ انعامات اُردو اور بنگلہ کی حسبِ ذیل اصنافِ ادب کی بہترین
تخلیقات پر دیئے جائیں گے۔

(۱) شاعری (۲) افسانہ۔ طویل افسانہ۔ رپورتاژ (۳) یک بابی ڈرامہ
(۴) تنقیدی مضمون (۵) مزاح (نظم یا نثر)

پہلے سال کے انعام کے لئے دسمبر ۶۰ء سے نومبر ۶۱ء تک کی مدت میں شائع شدہ تخلیقات پر غور
کیا جائے گا اور انعام کا اعلان ۳۱ جنوری ۶۲ء کو ہوگا۔
یہ انعامات گلڈ کے سالانہ انعاماتِ سالگرہ کہلائیں گے۔
علاقائی زبانوں کے ادب کی ترویج اور حوصلہ افزائی کے لئے گلڈ کی طرف سے انعامات کا سلسلہ جاری
کرنے کا اعلان عنقریب کیا جائے گا۔

مضمون نگار حضرات
• مسودات کی نقلیں اپنے پاس محفوظ رکھیں۔ ناقابلِ اشاعت مضامین ضائع کر دیئے جاتے ہیں۔
• مضامین نظم و نثر ایک صفحہ چھوڑ کر لکھیں۔

ابوالخطیب

ترکِ محبّت کے باوجُود

میرے بچے کو جانوروں سے بڑی محبت ہے قریبی عزیز
یہاں سے ایک دن وہ ایک چوزہ لے آیا اس کی دیکھ بھال میں
نے دن رات ایک کر دیئے لیکن چوزے کی عمر نے وفا نہ کی اس
موت کے چند روز بعد میرا لڑکا پھر محلے کے شریر لڑکوں سے
کتے کے پلے کو بچا کر گھر لے آیا اور سب کچھ بھول کر اس کی
رش میں ہمہ تن مصروف ہو گیا

اپنے بچے سے میں بہت خوش ہوا کہ جو باپ بن کر
مہ داری میرے اندر نہ پیدا ہو سکی وہ میرے بچے میں نہ صرف
بلکہ طاقتور ہے، جو ذی روح اسے مل جاتا وہ اس کی
رش میں ہمہ تن مصروف ہو جاتا، یہ جاندار چاہے جانور
انسان یا کوئی پھل پھول والا پیڑ وہ ان سب کی خدمت
بڑا خوش نظر آتا ہے۔

خاندان میں ایک رکن کے بڑھ جانے کے بعد صبح کی
ے کے لئے پانی بڑھا دیا گیا۔ لیکن ابتدا میں میری بیوی
ذرا اس اضافے کی مخالفت کی لیکن ذوالقرنین کے اصرار
اس کی امی کو بھی مجبور کر دیا کہ وہ بھی اس کے کام میں
ہاتھ بٹائے اور پلے کو روز چائے پلائے۔

چائے تیار ہوئی تو سب سے پہلے ذوالقرنین ایک چھوٹی
پلیٹ لے کر پلے کے پاس پہنچا اس کے سامنے پلیٹ
اس میں چائے انڈیلی اسے چاٹا پلے نے پلیٹ میں
منہ ڈال کر زبان سے سپڑ سپڑ کر کے چائے پینا شروع کی
تو ذوالقرنین تالیاں بجاتا ہوا بھاگا بھاگا اپنی امی کے
کمرے میں آیا اور خوش خبری سنانے لگا

" امی! امی! ہمارے پلے نے چائے پی لی، وہ کتنا
اچھا ہے "

" اچھا کیا اب تو بھی پی لے " میری بیوی نے جواب
دیا۔ ذوالقرنین اس جواب کو سُن کر وہاں نہ رُکا وہ پھر اپنے
پلے کے پاس چلا گیا کتے کے پلے کا چائے پینا اس کے لئے
سب سے زیادہ دلچسپ اور پر مسرت تھا۔

یہ پلا میرے لڑکے سے بڑا مانوس ہو گیا جب وہ اسکول
جاتا تو یہ کچھ دور تک اسے پہنچانے جاتا اور جب وہ اسکول
سے واپس آتا تو دور ہی سے اسے دیکھ کر دوڑتا اس کے پیروں
میں لوٹنے لگتا اور اس کے پیروں سے گیند کی طرح کھیلتا رہتا۔
پلے سے جب وہ کتا ہوا تو میرے لڑکے نے اس کے
نام کے لئے مجھ سے کہا اور از راہ تفنن اس وقت میری زبان
سے بے ساختہ نکل گیا پیارو۔ یہ نام سارے گھر کو بہت پسند آیا
ذوالقرنین اس نام کو سن کر باہر گیا اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر
مسکرا کر اسے مخاطب کیا۔

" کتا ہے تیرا نام پیارو ہے پیارو " کہا کیا پیارو اس
کتے کو سن کر کتے نے منہ اوپر اٹھا لیا اور اگلے پنجوں سے زمین

[illegible] بیٹھے رہی بیٹھے دم ہلانے لگا جیسے یہ تمام
[illegible] ہے۔ وہ ہر روز ہمارے گھر کے سامنے بیٹھا
[illegible] آس پاس اگر ذرا سی بھی آہٹ ہوتی تو وہ ہڑبڑا کر
[illegible] اور زور سے بھونکتا ہوا گلی میں ٹہلنے لگتا جب کوئی
[illegible] گھر کے قریب نظر نہ آتا تو پھر اپنی اسی جگہ پر آکر سر
[illegible] رہنے لگتا جو اس نے ذرا سی کھود کر اپنے لئے بنالی تھی۔
یہ جگہ ہمارے مکان کے صدر دروازے کے بالکل قریب
لیکن دوپہر کے وقت وہ محلے کے کتوں کے ساتھ ضرور
جاتا اور جب اندھیرا ہونے لگتا تو وہ زبان نکالے دوڑتا
[illegible] گھر کی طرف آتا اور دروازے کے سامنے کچھ دیر تک
[illegible] اوں اوں" کرتا۔ اس کی اوں اوں کو سن کر میری بیوی
[illegible] دروازے پر آتیں اسے دیکھ کر مسرت سے ان کی بھی آنکھیں
[illegible] چمکتیں اور اس سے کہتیں "آگیا میرا بے زبان چوکیدار"

میرے بچے رات کو ذرا جلدی سو جانے کے عادی
[illegible] اس لئے مغرب کی نماز کے بعد ہی وہ باورچی خانے میں
[illegible] اپنی ماں کو پریشان کرتے میری بیوی جلدی جلدی روٹیاں
[illegible] کر چنگیر میں ڈالتی تو میرے بچے چنگیر کے گرد سرک آتے
[illegible] لڑکی حمیرا روٹی کے چار ٹکڑے کرتی اور آپس میں
تقسیم کر دیتی لیکن ذرا میری سب سے چھوٹی بیٹی نسرین کو باہر
بیٹھے ہوئے پیارو کا بھی خیال آجاتا تو سب اپنے اپنے حصے کی
روٹی میں سے اس کا حصہ نکال کر ذوالقرنین کے ہاتھ میں رکھتے
وہ سب نوالوں کو شوربے میں ڈبو کر باہر جاتا ان نوالوں کو
[illegible] ٹوٹی پلیٹ میں رکھ دیتا جو میری بیوی نے چند روز
[illegible] سے اس کے لئے باہر رکھ دی تھی۔ پیارو ہمارے مختصر
[illegible] خاندان میں اس حیثیت سے رہتا تھا لیکن میری بیوی اسے
گھر میں نہیں گھسنے دیتی تھیں کبھی کبھی نسرین اپنے بچپن کے
[illegible] سے مجبور ہو کر (جب بیوی گھر میں نہ ہوتیں) پیارو کو اندر
[illegible] ۔ وہ دم ہلاتا اندر آجاتا تو وہ پیار کرکے اس

کی پیٹھ پر [illegible] ایک دن میری بیوی نے نسرین کو کتے
کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتا دیکھ لیا تو اس کے قریب آکر اس کے ایک
تھپڑ رسید کیا اور پیارو کو مارنے کے لئے ڈنڈا اٹھایا وہ
ڈنڈے کھاتے ہی قیاؤں قیاؤں کرتا باہر بھاگا اور میری
بچی روتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی غصہ ان کا ابھی
تک ٹھنڈا نہیں ہوا تھا وہ پھر دروازے کے پاس گئیں
باہر دیکھا پیارو دیوار سے لگا زبان سے نکال کر دم ہلا رہا
تھا اور انھیں دیکھتے ہی اس نے آنکھیں نیچی کرلیں اس کو اس
حالت میں دیکھ کر بیوی کو اس پر پھر رحم آگیا اور ڈنڈا خود
بخود ان کے ہاتھ سے گر گیا۔

جب شام ہوئی تو انھوں نے خود شوربے میں روٹی
ڈبو کر اس کی پلیٹ میں ڈالی وہ پھر اوں اوں کرتا ان کی طرف
آیا تو انھوں نے ہانڈی میں سے کچھ بوٹیاں بھی نکال کر اسے
ڈال دیں۔ روٹی کو چھوڑ کر وہ اس پر دوڑ پڑا اور دم ہلا ہلا کر اسے
کھاتا رہا۔

اس کراچی میں بعض وقت ہم پر ایسا بھی پڑا کہ گھر میں
کئی کئی روز تک کھانے کو کچھ نہ ہوتا تو بیوی ان سوکھے ٹکڑوں
کو پکا پکا کر ہم سب کو کھلاتیں جسے وہ بھوسی والے کے لئے
رکھ چھوڑتی تھیں کیونکہ یہ لوگ محلے محلے گھوم کر گائے بھینسوں
کے لئے ان ٹکڑوں کو خرید کر اپنے مویشیوں کو کھلاتے تھے
لیکن اس آڑے وقت میری بیوی نے انھیں سوکھے ٹکڑوں
کو نعمت تصور کیا ہم انہیں کو خوشی سے کھا لیتے پھر صبح سویرے
میں کام کی تلاش میں نکل جاتا اور بچے اسکول چلے جاتے۔

حسب معمول کھانے کے وقت یہ ٹکڑے پیارو کو بھی
ڈالے جاتے لیکن .. وہ انھیں سونگھ کر چھوڑ دیتا اور دیوار سے
لگ کر بیٹھ جاتا اس وقت ہمیں دکھ کے ساتھ افسوس بھی ہوتا۔
افسوس اس بات کا کہ اب یہ بھوکا رہے گا اور دکھ اس بات
کا کہ ہمیں پہلے ہی سے معلوم ہو جاتا تو ان ٹکڑوں کو ہم سب
بچے آپس میں تقسیم کرکے کھا لیتے کیونکہ ان دنوں تو یہ سوکھے

ٹکڑے بھی پیٹ بھر کر نہ کھا سکتے تھے بیوی دوسرے دنوں کا خیال کرکے خود ہی کم پکاتی تھیں۔

اس حادثے کے بعد دوسرا دن پھر آیا پیارو باہر بیٹھا منہ اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا اسے منتظر دیکھ کر میری بیوی دروازے پر آگئیں اور بڑے غم زدہ انداز میں منع کرنے کے لئے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے ان کے منہ سے بھی نکل گیا۔" پیارو۔ تیرے لئے گوشت اور شوربہ نہیں۔ سوکھے ٹکڑے تو کھا نہیں سکتا اللہ سے دعا کر کہ انھیں کام مل جائے"

اس آواز اور اشارے پر پیارو نے سر کو اٹھایا اور دم سے پھر زمین کو پیٹ کر سر جھکا لیا اور اوں اوں کرتا رہا' اس کو اس عالم میں دیکھ کر ہم سب کھانا چھوڑ کر دروازے پر آگئے لیکن اس کی ان حرکات کو بالکل نہ سمجھ سکے آخر وہ ان حرکات کے ذریعے ہم سے کہہ کیا رہا ہے ؟ اس کو اس حالت میں دیکھ کر ہم سب کو بڑا دکھ ہوا اس دکھ نے ہماری بھوک بھی ختم کر دی۔ اور ہم دروازے پر کھڑے رہے تھوڑی دیر بعد اس نے پھر سر اٹھا کر ہمیں دیکھا اور اٹھ کر چلا گیا۔

اس مفلسی کے زمانے میں میری بیوی کی حس بہت تیز ہوگئی تھی پیارو کے جانے کے بعد انھوں نے ہمیں مخاطب کر کے کہا

" دیکھو مفلسی میں جانور بھی ساتھ چھوڑ دیتے ہیں"

اس کے جانے کے بعد ہم پھر باورچی خانہ میں چلے گئے بیوی نے بچوں سے کھانے کے لئے بڑا اصرار کیا۔ آخر طبیعت پر جبر کر کے ہمیں ان سوکھے ٹکڑوں کو کھانا پڑا جو اس دن بیوی نے گرا میں پکائے تھے۔ ٹکڑے کھا کر اس رات ہمیں نیند نہ آئی سارے دنوں سے زیادہ اس رات مفلسی کے تصور نے ہمیں بہت پست ہمت اور افسردہ کیا۔

گھر کے دروازے بند کر دیئے گئے کیونکہ کھلا رکھنے سے اب فائدہ کیا تھا لیکن بیوی نے کھڑکی بند نہ کی۔ آخر گھڑی نے جب دس کے گھنٹے بجانا شروع کئے تو وہ ایک بار انھیں کھڑکی میں جھانک کر اسی جگہ دیکھا جہاں پیارو بیٹھا کرتا تھا اس وقت پیارو وہاں نہ تھا۔ اب وہ کبھی بیوی سے جدا نہ ہو سکا انھوں نے ایک دم کھڑکی کے بھی کواڑ بند کرنے کو کواڑ کھڑکی کے بند نہ ہوئے بلکہ ان کے دل کے کواڑ بھڑ گئے۔

لالٹین بڑھا کر انھوں نے سب سے سونے کے لئے کہا سب اٹھ اٹھ کر اپنی اپنی چارپائی پر چلے گئے بیوی کو پھر گھر کے پچھلے دروازے کا خیال آیا کہ اسے بند کیا گیا ہے یا نہیں یہ سوچ کر وہ باہر صحن میں آئیں پچھلا دروازہ بند کرنے سے پہلے ذرا باہر جھانک کر دیکھا تو انھیں اوں اوں کی آواز آئی وہ چونکیں اور غیر اختیاری طور پر ان کی زبان سے نکل گیا۔ " ارے یہ رہا پیارو" اس آواز کو سن کر ہم سب دوڑے پیارو کے پاس پہنچے اسے دیکھا ان کی گردن اور کانوں سے خون ٹپک رہا تھا گوشت میں لپٹی ہوئی بڑی سی ہڈی اس کے سامنے پڑی ہوئی تھی

" اے امی یہ تو خون میں لہولہان ہے، گوشت اور ہڈی بھی اس کے سامنے پڑے ہوئے ہیں شاید کہیں سے لڑ جھگڑ کر یہ اسے لایا ہے" ذوالقرنین نے اس کے قریب جاتے ہوئے کہا

" اچھا ذرا لالٹین تو جلاؤ"۔ بیوی نے بڑی لڑکی کو اشارہ کیا۔

حمیرا جلدی سے لالٹین جلا کر لائی تو ہم سب دروازے کے باہر آکر اس کے زخموں کو دیکھنے لگے واقعی اس ہڈی کے لئے کتوں نے اسے بہت زخمی کر دیا تھا۔

اس کے گھر واپس آنے سے ہمارے دل پھر اسی مسرت سے لبریز ہو گئے ... ایسی دید اور مسرت سے کسی عزیز کے دوبارہ مل جانے سے ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہمارا دل اس کے زخموں سے بھی درد محسوس کر رہا تھا اس وقت خوشی کے ساتھ یہ جذبہ بھی ہم سب کے چہروں

یاں تھا میری بیوی سے دریافت کرنے والوں سے کہا
"اسے اس وقت اندر بلوا لو اور اس کا خون پونچھو"
اس کے لئے ذرا نسرین بڑھی تو بیوی نے اسے روک کر میری
طرف اشارہ کیا
"یہ کام تم کرو" میں نے ہاتھ سے چمکار کر اسے اندر
چلنے کو کہا وہ اٹھا چلا تو لنگڑانے لگا۔
"ہائے ہے ظالموں نے اسے مارا بھی ہے ایک ہڈی
کے لئے اس کا کیا حال کر دیا ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی
ڈی نے مارا ہے اس کے کوئی اولاد نہ ہو گی"
کتا اندر آگیا۔ میں نے پرانے کپڑے کو پھاڑ کر
ں کا خون صاف کیا۔ اس حالت میں بیوی نے اسے گھر سے
ہر نہ نکالا بلکہ ایک کونے کی طرف اشارہ کیا۔ پیارو صحن میں سے
کر وہاں چلا گیا ہڈی باہر پڑی چاندنی میں چمکتی رہی۔ کتا
ے دیکھتا رہا۔ ہم سب نے ایک نظر اس ہڈی پر ڈالی اور ہم
نے اپنے بستروں میں آکر آنکھیں بند کر لیں۔
دوسرے دن صبح میں پھر روزگار کی تلاش کے لئے
سے نکلنا ہی چاہتا تھا کہ میری بیوی نے مجھے باہر جانے سے
کتے ہوئے کہا
"آج پیارو کے لئے اسپتال سے دوا لے آؤ آخر جب
ارے ساتھ رہتا ہے تو اس کی خبر گیری کون کرے گا"۔
نوکری دلانے والے دفتر کی بجائے اس روز جانوروں کے
بنال چلا گیا۔
ایک ادھیڑ عمر کے آدمی سے دوائی اور جلدی سے گھر
لیکن میاں پیارو نہ تھا بیوی نے نسرین سے کہا وہ ڈبڈی
ی دروازے پر گئی اور کتے کا نام لے کر چیخنے لگی۔ اس
وہ دوسری گلی میں تھا۔ بچی کی آواز سنتے ہی وہ لنگڑاتا
یا تو نسرین نے اندر آنے کا اسے اشارہ کیا لیکن دروازے
۔ وہ رک گیا اور زبان نکال کر دم ہلاتا رہا۔
"ہائے امی پیارو آگیا۔ جانے کیسے یہ آتا نہیں"

نسرین نے دروازے پر ہی سے کتے کی شکایت کی
میری بیوی دروازے پر آگئی انھوں نے پچکار کر
اسے اندر بلایا تو اس نے دم دبا کر دروازے میں قدم رکھا
اور سر اٹھا کر انھیں دیکھا "ہاں ہاں چل" میری بیوی نے
اس سے پھر کہا
اس آواز کو سن کر وہ جلدی سے دروازے میں سے
ہو کر صحن میں آگیا اور مجھے دیکھتے ہی اپنی دم زمین پر پٹخنے
لگا۔!
"اچھا۔ اچھا" میں نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر اس
کی محبت کا جواب دیا اور اس کے زخموں پر دوا لگانا شروع
کر دی دوا تیز تھی وہ اسے لگ رہی تھی اس لئے اب اس کی
اوں اوں میں کرب بھی پیدا ہو چکا تھا۔
"ذرا جلدی کرو اسے تکلیف ہو رہی ہے" میری
بیوی نے اسے کراہتے ہوئے دیکھ کر کہا
"میں خود تو دیر نہیں کر رہا" مجھے نہ جانے کیوں غصہ
آگیا
جب دوا اس کے سارے زخموں پر لگا دی تو میں نے
حمیرا سے صابن کے لئے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا حمیرا صابن لے
آئی تو میں غسل خانے کی طرف جانے لگا پیارو پھر پیروں
میں الجھ گیا اور مجھے آگے نہ بڑھنے دیا
"کیا ہے" میں نے اپنی بیوی کی طرف مسکراتے ہوئے پوچھا
"ذرا اس کے سر پر محبت کا ہاتھ پھیر دو، تھوڑا سے
تھپتھپا دو۔ میں بھی جب کبھی کسی پڑوسن کے یہاں سے آتی ہوں
تو یہ سالا اسی طرح میرے پیروں پر بھی لوٹ جاتا ہے" میری
بیوی نے کہا
میں نے اپنا ہاتھ اس کی گردن پر پھیرا تھپتھپایا تو
اس کی اوں اوں سے کرب کا احساس تو ختم ہو گیا لیکن اوں اوں
باقی رہا اس کا سارا بدن اس آواز کے ساتھ حرکت کر رہا تھا

اس واقعے کے چند روز بعد میں خود بیمار پڑ گیا۔
بیماری کے اسپتال جانا پڑا۔ وہاں سے آٹھویں
چھٹی مل گئی ۔۔۔ بیماری پوری طور پر ختم نہیں ہوئی
کرتے ہی حالت پھر خراب ہو گئی ۔۔۔ اتنی خراب کہ
بچنے کی اُمید نہ تھی۔ ہر وقت موت کا خیال مجھے ستاتا
۔ اس وقت کائنات کا حسن، اپنی ناکام زندگی کا
اور یار دوستوں کی بے اعتنائی مجھے رہ رہ کر یاد
تی تھی لیکن اس غم کے ساتھ ساتھ اللہ سے تعلق بھی میرا
بڑھ گیا تھا اس کے فرائض تو میں چارپائی پر لیٹے لیٹے
ادا کرتا۔ ڈوبتے سورج اور چڑیوں کو میں اپنی کھڑکی
سے دیکھ لیتا۔ لیکن دوست ان میں سے کوئی ابھی تک
میری خبر لینے بھی نہ آئے تھے۔ دوستوں کی بے تعلقی کو اس
وقت میرے بیمار اور بے قرار دل نے سب سے زیادہ
محسوس کیا اور ذرا سی آہٹ پر میں چونک پڑتا لیکن یہ آہٹ
کسی انسان کی نہ ہوتی بلکہ ہوا کا کوئی تیز جھونکا کواڑوں
سے ٹکرا کر بچوں کی طرح آگے بھاگ جاتا۔

بڑی دیر کے بعد لوگوں سے نا امید ہو کر میں نے
آنکھوں کو بند کر لیا۔ کیونکہ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا اس
تاریکی کو دور کرنے کے لئے میری بیوی نے چراغ جلایا
اس وقت میں نے اس روشنی کی طرف سے بھی منہ
پھیر لیا اور کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں۔

تھوڑی دیر بعد دروازے پر پھر آہٹ ہوئی ۔۔۔
کواڑوں سے پھر کوئی چیز ٹکرائی لیکن میں نے اسے بھی ہوا
کا جھونکا سمجھ کر کروٹ نہ بدلی تو پھر میری بیوی نے کہا۔

"ذرا کروٹ تو بدلئیے، دیکھئے آپ کی عیادت کو
کون آیا ہے"

لفظ عیادت کو سن کر اس وقت میرے اندر جان
آ گئی میں نے جلدی سے کروٹ بدلی، دروازے کی
طرف دیکھا پیارو کھڑا اوں اوں کر رہا تھا مجھ سے کے

[illegible] پڑی اور وہ
ہانپتا ہوا معلوم دیتا تھا جیسے بڑی دور سے دوڑتا ہوا
آ رہا ہو اس وقت اس کے زخم بھی باہر سے دکھائی دے
رہے تھے اس لئے اس بے زبان کی محبت پا کر میں بیان
نہیں کر سکتا کہ کس خوشی سے دوچار تھا۔ البتہ اس وقت میں
صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ اس خوشی کی موجودگی میں موت کا
بھیانک تصور میرے ذہن سے دور ہو گیا اور کبھی وہ میرے
ذہن میں لہراتا بھی تو اس سے مجھے دکھ نہ پہونچتا۔

"آج اسے قریب آنے دو" میں نے اپنی بیوی سے
التجا کی۔

"نہیں یہ نجس ہے، اس کی محبت اتنی دور ہی سے
ہمیں خوش رکھ سکتی ہے"

اپنی بیوی کے اس جواب سے مجھے ذرا تکلیف ہوئی
لیکن میں اس وقت تک اسے مسکرا کر دیکھتا رہا جب تک
وہ میرے سامنے کھڑا رہا۔

پیارو سے اب میری دوستی اور بڑھ گئی کچھ دن بعد
اللہ نے مجھے شفا بخشی میں کام کاج کے قابل ہوا ایک فرم
میں ملازمت بھی مل گئی۔ اب میں صبح جلدی سے ناشتے سے
فارغ ہو کر بس کے لئے بھاگتا تو پیارو مجھے آگے نہ بڑھنے
دیتا جب تک کہ میں اس کے سر یا پیٹھ پر اپنا پیر رکھ کر اسے
ہلا نہ دیتا لیکن جب میں رات کو گھر واپس آتا تو اس وقت
بھی وہ میرا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا صرف اس اظہار
محبت ہی سے مطمئن نہ ہوتا جو میں صبح کے وقت اختیار
کیا کرتا تھا بلکہ اس اندھیری رات میں وہ میرے قدموں
میں لوٹ کر ان پر اپنی تھوتھنی بھی رگڑتا۔ تو میں اسے گیند
کی طرح پیر سے لڑھکا دیتا میرے پیر کا سہارا پا کر وہ چار
قلابازیاں کھاتا پھر اپنی چمکتی آنکھوں سے مجھے دیکھ کر اٹھتا
مٹی جھاڑنے کے لئے اپنے بدن کو ہلاتا میں پھر اس کے سر
پر پیر رکھ دیتا تو اس کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکلتی اس کے

ر اروز کا معمول تھا لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا کہ میں
ات کے پہر ہی گھر میں گھسنا چاہتا تو وہ مجھے
لے بچوں پر بیٹھ کر بڑی نرم آواز میں آہستہ
ں بھوں کرتا رہتا میں کچھ دیر تک خاموش کھڑا
رہتا لیکن وہ مجھے وہاں سے سرکنے نہ دیتا
تک جب تک میں اس کے سر پر پیر رکھ کر اس
و جھکا نہ دوں۔

ب دن ایسا ہوا کہ وقت مقررہ پر میری آنکھ تو
ن چائے نہ ملنے کی وجہ سے میں چارپائی سے
چائے نہ ملنے سے اعصاب میں جو اینٹھن تھی وہ
ں طرح میری رگوں میں دوڑنے لگی میرے ہاتھ
ور پیر بھی بھاری ہو گئے۔

یٹے ہی لیٹے میں نے بچوں کے اسکول جانے کی
بھی سنی لیکن انھیں گھر سے جاتے ہوئے دیکھنے
ری آنکھیں نہ کھل سکیں تھوڑی دیر بعد میری
آئی۔ اور . . . .

مول کے مطابق اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے
و پکڑا ماتھے کا بوسہ لے کر تتلاتے ہوئے کہا
ا جان چھ بج ہو گئی"
می پہلے چائے لاؤ، سوائے چائے کے اس وقت
یں اٹھا سکتا۔ آنکھیں بند کئے ہوئے ہی میں نے اپنی
ر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔
ئے اب نہیں بنے گی بچے بھی آج بغیر چائے کے
یں۔ اگر پینا ہے تو خود اٹھ کر بناؤ اور پی لو" میری
از کانوں میں آئی میں نے ایک آنکھ کو بمشکل کھولا
، وہ بیٹھی خط لکھ رہی ہیں۔
یسا کونسا ضروری خط آ گیا آپ کے ہی [illegible] لے بیٹھے
"
ی اس آپ کو [illegible] کھانے پینے سے غرض [illegible]

کا ہوتا ہے کچھ ہی ہو" میری بیوی نے جواب دیا
"بھئی آخر ایسی کیا بات ہے" میں نے لیٹے لیٹے
ان سے پھر پوچھا
اس مرتبہ انھوں نے مجھے جواب دینے کے بجائے
چھوٹی بچی کو ایک خط دیتے ہوئے کہا
"جاؤ اپنے ابا کو دے دو" نسرین خط لے کر میرے پاس
آئی اور خط کو تکیے کے پاس رکھ دیا میں نے اسے آنکھیں
کھول کر ذرا ایک نظر دیکھا۔ لیکن چائے نہ ملنے سے کا ہلی اور
میٹھے میٹھے درد کی وجہ سے میں اسے پڑھ نہ سکا کیونکہ اس
وقت مجھ سے اٹھا ہی نہیں جا رہا تھا۔
"میری خالہ کا انتقال ہو گیا" بیوی کی غم زدہ آواز پھر
میرے کانوں سے ٹکرائی
"کیا مطلب؟" یہ سن کر میں گھبرا گیا اور خط اٹھا کر لیٹے
ہی لیٹے پڑھنے کی کوشش کی۔
خط پڑھتے بیوی نے مجھے دیکھ لیا تو اس نے پھر قلم
روک کر بھرائی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا
"خالہ جان! ہم سب بھائی بہنوں سے بے انتہا محبت
کرتی تھیں ویسے اللہ رکھے ان کی بھی اولاد کچھ کم نہ تھی لیکن ہم چھوٹے
بچے جہاں وہ دیکھتیں پھول کی طرح چن لیتیں ہماری ماں سے
لڑ کر وہ ہمیں اپنے گھر لے جاتیں اپنے پاس بٹھا کر کھانا کھلاتیں
اور جب سونے کا وقت ہوتا تو ہمیں کوئی عمدہ سی کہانی سنا کر
تھپک تھپک کر سلا دیتیں" . . . .
. . . "ایسے محبت والے لوگ اب ہمارے زمانے میں کہاں"
"ہاں میں نے خود انھیں ایسا ہی پایا لیکن مجھے تم نے
بتایا کیوں نہیں" میں نے تسلی دے کر ان سے مزید دریافت
کیا ـــــ
"خط آج ہی تو آیا تھا آپ خود دیر میں آئے اور چائے پی کر
اٹھ کر بغیر کچھ کھائے پیے بستر پر دراز ہو گئے [illegible]
کہ میری بیوی نے پھر خط لکھنا شروع کر دیا۔ میں نے پھر [illegible]

پھر گیا اور وہاں جھک کر اس نے پھر اسے گاڑی کی طرف کھینچا
"بھائی تم اس پر رحم کرو۔ اس سے کوئی خطا ہو گئی ہو تم
معاف کر دو۔ ہمارا پورا خاندان اس سے محبت کرتا ہے"
ماں نے مہتر کو منانے کی کوشش کی۔

"نہیں بابو جی اس کی موت میرے ہاتھوں لکھی ہے
سا کتا تو میں نے ابھی تک نہیں دیکھا جب اسے پکڑنے کے
ئے میں آپ کے گھر کی طرف بڑھا تو مجھے اور میرے ہاتھ کی
نچی کو دیکھ کر بھی یہ نہ بھاگا۔ بلکہ مجھ پر اُلٹا جھپٹا۔ جیسے میں
پ کے گھر پر ڈاکہ ڈالنے جا رہا تھا" یہ جواب اس نے پیارو
و پھر گاڑی کی طرف کھینچتے ہوئے دیا

اس کشمکش میں بڑی دیر ہو گئی تھی کئی مرتبہ وہ پورا
ور لگا کر پیارو کو گاڑی کی طرف لایا۔ لیکن پیارو نے اسے
ر بار تھکا کر رکھ دیا بعض مرتبہ اس نے اسے خود اپنی طرف
کھینچ لیا۔ مہتر نے ایک دفعہ پھر اپنی ساری انسانی قوتوں کو
میٹ کر پیارو کو گاڑی کی طرف کھینچا۔

ان ساری طاقتوں کے زور پر پیارو گاڑی کی طرف
گھسٹنے لگا لیکن گھسٹتے ہوئے اس نے پھر میری طرف منہ کر کے
یک دردناک چیخ ماری۔

اس کی اس چیخ میں اس کی پہلے کی اوں اوں کی محبت
کے ساتھ کچھ شکایت بھی شامل تھی۔

یہ چیخ میرے کلیجے کے پار ہو گئی اب وہ گاڑی کے بہت
ریب آ گیا اب اس نے قینچی سے نکلنے کی بالکل کوشش نہ کی
میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا

"بھائی جمعدار! کچھ لے دے کر کام چل جائے تو میں اس
کے لئے بھی تیار ہوں، لائسنس میں کل بنوا لوں گا" اس مرتبہ
ں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کی خوشامد کی۔

پیارو پر مہتر کا بڑا وقت صرف ہو چکا تھا اس احساس
نے بھی اسے مشتعل کر دیا تھا آس پاس کے بہت سے لوگ
س ہنگامے کو دیکھنے وہاں جمع ہو گئے تھے لیکن اس وقت ان

کے چہرے بھی اداس اور بیزار تھے۔ اس مہتر کا دوسرا ساتھی
محلے کے آوارہ کتوں کو پکڑنے کے لئے قینچی لئے محلے کی تنگ
گلیوں میں گھوم رہا تھا محلے کے بچے اس کے آگے پیچھے گھوم
رہے تھے جس کسی گلی میں انھیں کوئی کتا سوتا ہوا نظر آتا وہ
اسے جگا کر بھگا دیتے۔ بعض بچے تو گھروں میں جا کر کتوں کے
مالکوں کو اطلاع کر آتے تو وہ اپنے اپنے کتوں کو گھروں میں
باندھ کر چھپا دیتے۔

دھوپ سخت پڑ رہی تھی مہتر اپنا شکار نہ پا کر ناکامی
کے جذبے کے تحت دیوانہ سا ہو گیا تھا۔

اپنی خالی قینچی لے کر گھومتا ہوا وہ سڑک پر آ نکلا اور
اس کے ساتھی مہتر نے اسے دیکھ لیا اسے دیکھتے ہی اس میں
پھر قوت عود کر آئی اس نے پھر زور سے جھٹکا دے کر پیارو
کو گاڑی کے اور قریب کرنا چاہا تاکہ اسے گاڑی میں
ڈالنے میں آسانی ہو۔

اس جھٹکے کو پا کر پیارو نے میری طرف سے منہ پھیر
کر اس شکنجے سے نکلنے کے لئے صرف اپنی حیوانی طاقت کے
بل بوتے پر ایک جوابی جھٹکا اور دیا اس حیوانی طاقت کے
جھٹکے کو پا کر مہتر زمین پر گر پڑا لیکن قینچی کو اس نے نہ چھوڑا
بلکہ اپنے سینے سے لگا کر اسے مضبوطی سے پکڑ کر اپنے دوسرے
ساتھی کو آواز دینے لگا

"او کلو، ارے او کلو، جرا جلدی کر ہاتھ سے کتا چلا"
اس آواز کو اس کے پریشان ساتھی نے سُنا اس
نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اسے اور کتے کو گرا دیکھ کر وہ
اس کی طرف دوڑا قریب آتے ہی پوری طاقت سے لوہے کی
وزنی قینچی پیارو کی کمر پر ماری

"قیاؤں قیاؤں" اس چوٹ کے پڑتے ہی پیارو کی
ہمت جواب دے گئی اور زبان باہر نکل پڑی۔۔

اس کرب ناک آواز سے کلو اور مشتعل ہوا اس نے
جلدی سے اسی جگہ سے اس کی کمر کو پکڑا جہاں اس نے چوٹ

ماری تھی۔

پیارو دہ تھا سا ہو گیا ان دو تو سنے اس کی ڈولی بنائی
ور اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر گاڑی کے پاس لائے کلجو گاڑی کے
ور قریب ہو گیا۔ اس نے اپنے ایک ہاتھ سے تھیلی پکڑی اور
دوسرے ہاتھ سے گاڑی کا پٹ کھولا اور جلدی سے ان دونوں
نے اسے بورے کی طرح گاڑی میں گرا دیا

پہلے بہتر نے جلدی سے گاڑی کا دروازہ بند کیا اور
میرے پاس کھڑا ہو کر دونوں ہاتھوں کو جھاڑ کر دوستانہ انداز
سے میری طرف دیکھا۔

"میں اب اسے دیکھ لوں"

"جواب دینے سے پیشتر اس نے میری طرف پھر دیکھا جیب
سے بیڑی نکالی اور میری طرف بڑھائی

"نہیں بھائی میں بیڑی نہیں پیتا" میں نے جواب دیا
کلجو اسے ڈال کر اپنے فنکار کی تلاش میں پہلے ہی جا
چکا تھا اس کی دیوانگی اور بڑھ گئی تھی لیکن یہ مہتر پیارو کو
دیکھ کر کے اپنی اصل حالت پر آگیا تھا۔

اب اس نے بیڑی جلا کر اطمینان کے ساتھ لمبے لمبے کش لینا
شروع کر دیئے، اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں اب شیطانی
شرارت تیرنے لگی۔

"بتاؤ! کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں" میں نے پھر
اس سے پوچھا

اس وقت بیڑی اس کے منہ میں تھی اس لئے اس
نے ہاتھ کے اشارے سے رضامندی کا اظہار کیا اور
وہاں سے چلا گیا۔

"پیارو!" میں نے گاڑی کے پٹ سے [illegible]
کتے کو آواز دی"

پیارو گاڑی کے کونے میں سمٹا ہوا بیٹھا تھا میری
آواز سن کر وہ پچھلی ٹانگوں سے گھسٹتا ہوا پٹ کے قریب
آگیا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہاں بھی دم ہلانے
لگا۔ اس وقت اس کی آنکھوں سے وہی محبت روشن تھی جو
صبح گھر سے جاتے وقت وہ میرے پیروں میں پڑ کر مجھ پر نچھاور
کیا کرتا تھا۔ جب میں رات کو آتا تو ایسی ہی روشن آنکھوں
سے میرا استقبال کیا کرتا وہ میرے سامنے خاموش کھڑا زبان
نکالے ہانپ رہا تھا اور مجھے دیکھ رہا تھا۔ سوائے محبت کی روشنی
کے اس کی آنکھوں میں کوئی اور شکایت نہ تھی اسے اس عالم
میں دیکھ کر میرا سر چکرانے لگا۔ ساتھ ساتھ میرا دل بھی ڈوبنے لگا
اس وقت اس روشنی کو مقابل دیکھ کر میں ایسا محسوس کرنے
لگا کہ میرے پاس اپنی کوئی ایسی انسانی صفت نہیں جو اس
روشنی کے مقابل ٹھہر سکے۔

کیا آپ کی حق تلفی ہوئی ہے؟

گلڈ نے متعدد قراردادوں اور تحریکی صحافت کی امداد سے حکومت کو کاپی رائٹ قانون پر ازسرِ نو غور و خوض کے لئے آمادہ
کر لیا ہے اور اب حکومت نے ایک کمیٹی کی تشکیل کر دی ہے جو اپنی رپورٹ پیش کرے گی۔ اس کمیٹی میں گلڈ کا ایک نمائندہ
شامل کر لیا گیا ہے گلڈ کے پاس حکومت کے سامنے اپنے موقف کی وضاحت کرنے کے لئے کافی حقائق اور تجاویز موجود
ہیں لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ مندرجہ ذیل معاملات کی تفصیلات بھی حکومت کے سامنے پیش کی جائیں۔

۱۔ ایسے کیس جن میں بھارتی ناشرین نے پاکستانی مصنفین کی حق تلفی کی ہے۔

۲۔ ایسے کیس جن میں پاکستانی ناشرین نے بھارتی مصنفین کی حق تلفی کی ہے۔

۳۔ ایسے کیس جن میں مشہور مصنفین کے نام سے فرضی کتابیں جو ان کی تصنیف نہیں چھاپ دی
گئی ہیں۔ ایسے کیس بہت ہوئے ہیں لیکن ہمیں ان کی مستند تفصیلات درکار ہیں اہم متعلقہ مصنفین اور ان کے ناشرین،
احباب اور دوسرے ہمدردوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ہمیں بہت جلد ضروری تفصیلات سے آگاہ کریں ہم
[illegible]

جمہ: طاہر احمر

ریشمی فیتے

ایک عرصے کے بعد اس کو اس بندھی تھی۔

وہ جب سرائے کی سیڑھیوں پر آیا تو دور بگوڈے کے
ر سفید کبوتر اڑ اڑ کر بیٹھ رہے تھے اور بھکشو سڑک سے
ہے تھے۔ اس کو آگے جانا تھا عرصہ سے وہ کسی لڑکی کی شدت
محسوس کرتا تھا جو بیوی بن کر اس کے ساتھ زندگی کے راستے
ہکے لیکن اب تک اس کو بے حد ناکامی ہوتی آئی تھی۔
وہ ایک رشتے کی امید میں جو ایک دم سے پیدا ہوئی تھی
مد خوش تھا کل ہی اس کے دوست نے اسے قریبی گاؤں
ز سرائے سے دور نہ تھا ایک اچھے خاندان کی لڑکی کے
ہ میں بتایا تھا جس کے ماں باپ کو اس کے اچھے رشتے
ی فکر تھی۔ وہ خوش تھا کہ لڑکی ہر طرح سے معزز اور سماجی
پر اس کے برابر کی تھی۔ اس کے دوست نے گاؤں
دھ بگوڈا میں لڑکی سے ملاقات اور اسے پاس سے دیکھنے
نظام پہلے سے مکمل کرا دیا تھا۔ وہ اسی خوشی میں اب سرائے
یڑھیوں سے اتر کر صبح کی خاموش اور سنسان سڑک پر
ا تھا۔ وہ ایک دولت مند، حسین اور اجنبی لڑکی سے شادی
نے جانے کی سوچ سوچ کر کافی بے قرار اور گھبرایا ہوا
کل جب سے اسے یہ خبر ملی تھی اس نے نہ تو ٹھیک سے
کھایا تھا اور نہ وہ رات کو پوری طرح سو سکا چنانچہ وہ
خلاف معمول بہت سویرے اٹھ کر داڑھی بنا کر نہا دھو کر
اور اعلیٰ قیمتی لباس پہن کر تیار ہو گیا۔ وہ آپ ہی آپ کبھی تیز
ہو جاتا اور کبھی سست اور کبھی کبھی بڑی مسرت اور بیقراری
سے صبح کے نرم سندر اجالے کو جو بوڑھے درختوں اور سنہری
کھیتوں کے پرے سے پھوٹ رہا تھا مسکرا مسکرا کر دیکھتا۔
وہ ابھی شہر سے باہر بھی نہ آیا تھا کہ اس کی نگاہ ایک بیحد
بوڑھے اور مقدس بھکشو پر پڑی جو بگوڈا کی سیڑھیوں پر ایک
پرانی کتاب کھولے بیٹھا صبح کے دھندلے اجالے میں نہ
جانے کیا زور زور سے پڑھ رہا تھا، وہ بوڑھے کو اس قدر
سویرے اتنی پرانی میں اس عجیب و غریب زبان میں بڑبڑاتے
ہوئے سن کر بے حد متحیر ہوا اور وہ اس پراسرار بوڑھے کو
ٹھٹھک کر دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔ وہ آپ ہی آپ اس کے
پاس آ گیا لیکن پھر بھی وہ اس کتاب اور بوڑھے کے لفظ
بالکل نہ سمجھ سکا۔ حالانکہ اس نے پوجا پاٹ اور سنسکرت
کی تمام علمی اور مذہبی کتابیں پوری طرح پڑھی تھیں۔ وہ
اس عجیب کتاب اور اس کے نئے الفاظ پر صرف حیران
ہو سکا۔

"بوڑھے چچا! کیا میں معلوم کر سکتا ہوں یہ آپ کیا
پڑھ رہے ہیں۔ آج کتابوں کے بارے میں مجھے پہلی مرتبہ
احساس کمتری ہوا ہے۔" آخر اس نے بوڑھے کے قریب جھک
کر کہہ ہی دیا۔

"بے شک تم اس کو نہیں جانتے" بوڑھے نے اپنی گردن اُٹھائی اور مسکرا کر سفید بھنوؤں کی اوٹ سے بوڑھی آنکھوں سے دیکھا۔ "یہ کسی ایسی زبان میں نہیں جس کو تم کبھی جان سکو"۔

"پھر یہ کیا ہے؟"

"تم ایک فانی انسان ہو۔ اور یہ کتاب محبت بھری روحوں کی دنیا کی ہے"۔

"تو تم کیا کوئی بھٹکی ہوئی روح ہو۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"بچے! پہلے سوال کا جواب پھر کسی وقت کے لئے اُٹھا رکھو۔ ہاں یہ سنو کہ میں یہاں کیا کر رہا ہوں۔ دراصل تم آج بہت سویرے سفر پر روانہ ہوئے ہو ورنہ مجھے نہ پاتے۔ میں رات اور سویرے کے درمیانی وقفہ میں کسی درخت کے نیچے ملتا ہوں اور مجھے اس راستے سے پیار ہے، اسی راستے پر انسان اور پیار بھری روحیں چلتے ہیں لیکن تم ان میں تمیز نہیں کر سکتے۔ یہ میرا کام ہے۔ میں ان کو دعائیں اور پھول بانٹتا ہوں اور ان کے سوال بتاتا ہوں"۔

"کیسے سوال"؟

"جو میرے سے متعلق ہیں"۔

"وہ کیا"؟

"محبت اور شادی بیاہ"

مسافر کی خوشی اور دلچسپی کی کوئی حد نہیں رہی، وہ چھوٹے بچوں کی طرح کود کر بوڑھے کے پاس آبیٹھا۔

بوڑھا اسی طرح سکون سے نظریں گاڑے بیٹھا تھا۔ اس کی سفید بھنویں۔ طویل سفید اُون جیسی ڈاڑھی جو اس کے ہاتھ میں رکھی ہوئی پُر اسرار کتاب پر آ رہی تھی ہوا سے لہرا رہی تھی۔ مسافر کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ کسی پُرانے سایہ دار درخت کی شاخوں کے نیچے بیٹھا کھیل رہا ہے۔ اس کے چہرے پر حیرت اور معصومیت تھی۔

"بابا! تم وہ آدمی ہو جو مجھے ایک ایسی بات جس کی مجھے بے قراری ہے"۔ اس نے بڑی بے بھکشو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

"میں لڑکیوں کے معاملہ میں بڑا بدقسمت میں آج تک اکیلا ہوں بابا۔ اور کسی اچھی لڑکی میں جس کے ساتھ قدم ملا کر زندگی بھر چل سکوں تک اکیلا ہوں۔ آج پہلی بار ایک ایسا دن آیا مجھے ایک لڑکی سے ملنا ہے جو نہ صرف لڑکی ہی کے ماں باپ مجھ سے اس کی شادی پر رضامند ہو بابا۔ مجھے بتاؤ کیا میں اس کو پانے میں کامیاب ہو

"تمہارا نام اور پتہ کیا ہے؟ بوڑھے نے نیلی آنکھیں بڑی شفقت سے اُٹھا کر دریافت کیا۔ اسے اپنا نام پتہ بتا دیا۔ بوڑھے نے کچھ دیر اپنی دو کتاب کے صفحے اُلٹ پلٹ کئے۔ انگلیوں پر کچھ گنا گہرے نیلے آسمان پر صبح کے ٹمٹماتے ہوئے ستار طرف دیکھتا رہا آخر اس نے دھیمی اور گہری آواز

"مجھے ڈر ہے یہ ملاپ نہ ہو سکے گا۔ قدرت آسمان پر ہی طے کرتی ہے اور تمہاری ہونے والی صرف تین سال کی ہوئی ہے۔ تم کو اپنی شادی کے چودہ برس اور انتظار کرنا ہے۔ بے فکر رہو تم اسی ضرور کامیاب ہو گے"!

"بے فکر رہو! تمہارا مطلب ہے کہ میں چودہ ابھی تنہا رہوں گا"؟

"یہی بات ہے"۔

"اور میں اس حسین لڑکی سے جو ہر لحاظ سے پلے سے شادی نہ کر سکوں گا"___؟

"بالکل صحیح"

مسافر کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ بوڑھے کی بات کرے یا نہیں۔ اچانک اس کی نظر بوڑھے کی معصو

جیب میں بہت سارے لال فیتے بھرے ہوئے تھے۔
"بابا! یہ کیا ہے۔ کیا تم کھیلتے جوان سے؟"
"ریشم کے لال فیتے"۔ بوڑھے کے چہرے پر بیحد دوستانہ بھرپور مسکراہٹ کی لہر دوڑ گئی۔ اس کی آنکھوں میں بچوں کی شرارت اور شوخی تھی۔
"بس یہی تو میرا کام ہے۔ میں اس کتاب میں سے صبح دنوں کے پھوٹنے سے پہلے جب سورج بوڑھے ساگر کی ل سے سر نکالتا ہوتا ہے میں شادیاں نوٹ کر لیتا ہوں۔ جب کوئی لڑکی یا لڑکا پیدا ہوتا ہے اور اس کے لئے مرد عورت بننے کا حکم ہو جاتا ہے تو میں آدھی رات کو ان ان راستوں ویران مجذوبوں اور چمگادڑوں اور جنگلوں سے آباد برگد کے درختوں کی خوفناک چھاؤں طویل راستے طے کر کے اس نوزائیدہ لڑکی اور لڑکے پاؤں ایک دوسرے سے ان سرخ فیتوں سے باندھ دیتا ں۔" ایک دم سے بوڑھا سمندر کی سرکش اور سفید موجوں طرح مضبوط اور بپھرا ہوا سا تھا۔
"اور پھر یاد رکھو ایک بار بندھنے کے بعد ان بندھنوں کوئی نہیں توڑ سکتا — غریبی۔ دولت۔ خاندان یا ہزاروں ل کے فاصلے۔ دوستی یا دشمنی یا کوئی بھی چیز نہیں جو اس پ کو توڑ سکے۔ ان سب باتوں کا ایک ہی نتیجہ نمودار ہوتا ہے۔ اور وہ ہے لڑکی لڑکے کا ازدواجی رشتہ ... اسے ئی نہیں ٹال سکتا۔"
"کیا تم میرا فیتہ باندھ چکے ہو؟"
"بالکل"۔ اس نے لاپرواہی سے مسافر کو جواب دیا
"اور وہ تین سالہ منی ہے کہاں جس کو میری بیوی نامقدر ہو گیا ہے؟"
"ہاں! ہاں!" بوڑھا پھر دوستانہ موڈ میں آ گیا۔ "وہ یہاں قریب ہی ایک منڈی میں ایک سبزی فروش عورت کے ہاں رہتی ہے۔ وہ عورت ہر روز صبح منڈی میں سبزی بیچنے آتی ہے۔ اگر تم کو دلچسپی ہو تو میرے ساتھ آؤ"۔ بوڑھے نے اُٹھ کر چلتے ہوئے کہا — مسافر کچھ دیر ٹھہر کر کچھ سوچنے لگا۔
"تم اپنے دوست کا انتظار کر رہے ہو نا"۔ بوڑھے نے قریب آکر کہا — "دیکھ لو! اب اُجالا ہو گیا ہے اور اب وہ نہ آئے گا۔" مسافر بوجھل قدموں سے گردن جھکا کر بوڑھے کے ساتھ ہو لیا۔ راستے میں وہ بڑی دلچسپ باتیں کہتے رہے اس کو یہ بوڑھا بڑا ہی زندہ دل معلوم ہوا۔ اس نے مسافر کو بتایا کہ اسے اپنا کام بہت پسند ہے۔
"میرے اس نازک سے فیتے میں بھی کیا قوت ہے۔ میری بوڑھی آنکھیں چھوٹے بچے بچیوں کو اپنے اپنے گھروں میں بڑا ہوتا دیکھتی ہیں۔ زیادہ تر وہ ایک دوسرے کے وجود سے بالکل اجنبی رہتے ہیں لیکن جب وقت آتا ہے تو وہ سر سے پاؤں تک ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ بھولے اور مجبور انسان — اور ہاں! اگر کوئی لڑکا یا لڑکی درمیان میں آ بھی جائے تو وہ اس ریشمی فیتے میں اس بری طرح اُلجھ جاتا ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن خودکشی کر لیتا ہے۔ میں نے ان گنت برسوں سے زندگی کو اسی طرح اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ تم نہیں سمجھ سکو گے جیون کے ان بندھنوں کو"۔
اب وہ منڈی میں آ پہنچے تھے جس میں بھانت بھانت کی بولیوں سے کان پڑی آواز نہ آتی تھی۔
"میرے پیچھے پیچھے آؤ"۔ بوڑھا مسافر کو ساتھ لے چلا۔ وہ کنجڑے کی ایک چھوٹی سی دوکان پر پہنچے جہاں ایک بوڑھی غلیظ عورت اپنے گندے بال بکھیرے بیٹھی سبزی بیچ رہی تھی اس کی گود میں ایک ننھی سی بچی تھی بوڑھی کی آنکھوں میں پانی اُتر آیا تھا جس کی وجہ سے وہ تقریباً اندھی ہو گئی تھی۔
"وہ رہی تمہاری ہونے والی بیوی — وہاں!

ڑھے نے اشارہ کیا۔ مسافر غصہ سے جھنجلا گیا۔

"تم اس عمر میں میرے سے مذاق کرتے ہوئے اچھے
نہیں لگتے"۔

"میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس بچی کی قسمت کے
ستارے شاندار ہیں۔ یہ تم سے شادی کرکے راحت و آرام
سے بسر کرے گی"۔

مسافر نے بوڑھے کی طرف غصہ سے دیکھا جس کی سفید
داڑھی سینہ پر لہرا رہی تھی۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ بوڑھے کو
سخت سست سنا ڈالے۔ مسافر کے صبر کی حد ہو گئی تھی۔

"دغا باز ۔۔۔ مذاق کرنے کے لئے میں ہی بدنصیب
رہ گیا ہوں بڑے میاں اب چلتے پھرتے نظر آؤ"۔ وہ یہ کہکر
آگے بڑھ گیا۔ لیکن اس نے جب نظر اٹھائی تو بوڑھا
منڈی کی بھیڑ کو چیرتا ہوا نہ جانے کب کا جا چکا تھا۔ وہ اور
بھی جھنجلا کر رہ گیا۔

مسافر اب اکیلا ہی گھر چل پڑا۔ اس کا دوست نہ آیا
تھا اور وہ حیران تھا کہ بوڑھے کی باتوں پر یقین کرے یا
نہیں۔ وہ جوں جوں اس گندی سی مذاق کے بارے میں
سوچتا اس کو شادی کا تصور بڑا مضحکہ خیز معلوم ہوتا۔ وہ گھبرا کر
رات بھر غصہ اور جھنجلاہٹ کی وجہ سے سو بھی نہ سکا ۔۔۔ صبح
ہوتے وہ ایک نوکر کو ساتھ لے کر منڈی چل دیا۔ اس نے
نوکر کو آمادہ کر لیا کہ اگر وہ اس خبیث عورت کی گود میں سوتی
ہوئی بچی کو چھرے سے مار دے تو وہ اس کو منہ مانگا انعام دے۔

منڈی میں عورت بچی کو پاس بٹھائے ہوئے سبزی بیچ
رہی تھی۔ نوکر نے موقع پاتے ہی چاقو نکالا اور بچی کی سینہ
میں گھونپ دیا اور بھاگ لیا۔ منڈی میں کھلبلی مچ گئی...
مسافر اور نوکر اس گڑبڑ میں آرام سے فرار ہو گئے۔

"تو تم نے کام تمام کر دیا اس کا؟"

"نہیں حضور! جس وقت میں نے چاقو نکال کر لڑکی پر
وار کیا تو وہ ایک دم مڑ گئی اور میرے چاقو سے اس کی

صرف ایک بھوں چھل گئی ہے۔ مسافر نے پریشان ہو کر ا
دن شہر چھوڑ دیا اور گاؤں گاؤں، بستی بستی پھر کر د
واقعہ بھول بھی گیا۔ وہ نصف عمر کی خاک چھانتا پھر تا
اور بے حد اداس اور مایوس ہو گیا تھا۔ یہ بات بھی نہ
کہ اس عرصہ میں اس کی زندگی میں کوئی لڑکی نہ آئی ہو
لیکن لڑکیاں ہمیشہ برسات کی دھوپ کی طرح آتی رہیں
ہر بار اس کی محبت اور آشاؤں کے دیئے گل ہو گئے
لڑکیاں پھول لے کر آئیں اور خزاں کے پتے چھوڑ گئیں
ابھی تین سال قبل ایک عورت کے ماں باپ نے ا
دولہا کے لئے موزوں جان کر اسے پسند کر لیا تھا۔ شاد
کا سب انتظام مکمل ہو رہا تھا اور شادی کی تاریخ بھی
گئی تھی کہ ایک صبح اس کو معلوم ہوا کہ لڑکی نے کوئیں
چھلانگ لگا لی۔ وہ کسی اور سے محبت کرتی تھی اس کے ایک
عرصہ کے بعد اس کی ملاقات ایک گاؤں میں ایک مندر
لڑکی سے ہوئی جو پگوڑے میں شمعیں جلاتی تھی۔ وہ چند د
میں اس چھوٹی سی پجارن سے بہت مانوس ہو گیا اور د
دونوں ایک دوسرے کے رفیق بن گئے تھے چنانچہ ان
رشتہ طے ہو گیا۔ ایک دن مسافر شہر سے اس کے لئے زیور ا
کپڑے خریدنے گیا تھا کہ واپسی پر اسے معلوم ہوا کہ کسی سخ
مرض میں مبتلا ہو گئی ہے۔ وہ اس کی تندرستی کا انتظار کر
لیکن جب وہ تندرست ہوئی تو اس کے تمام بال جھڑ گئے
وہ گنجی ہو گئی اور بیماری میں اس کی آنکھیں بھی جاتی رہیں
لڑکی نے اس کو صاف بتا دیا کہ وہ اپنے لئے کسی مناسب
کی تلاش کرلے ۔

قسمت نے حال ہی میں اس کو ایک اور سنہری مو
دیا۔ لڑکی جو ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور تعلیم
بھی تھی سنسکرت میں اس کی شاگرد ہو گئی۔ اسے آرٹ ا
کو تیا سے بڑی دلچسپی تھی۔ یہاں میدان صاف تھا اور کو
ذمہ داری نہ تھی لیکن لڑکی ایک دن چوک میں ایک تیم

گھوڑے کی ٹاپوں میں آ کر مر گئی۔ مسافر کو اب کے ذرا بھی
دکھ نہ ہوا۔ اس نے ایک کرب انگیز مسکراہٹ سے اس خبر
کو سنا۔ وہ اب ایک تلخ اور مایوس انسان تھا۔ اس نے
اُمید کے تمام دیپ خود ہی بجھا دیئے اور بے حد غم پسند
ہو گیا۔ اس نے عورتوں کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا
اور اپنے کام میں لگ گیا۔ اس کی عمر کا یہ ویسے بھی اب
ستالیسواں سال تھا۔ لیکن اسے اب بھی چین سے بیٹھنا نہ
ملا۔ جس گاؤں میں وہ دھرم شالہ میں پڑھاتا تھا وہیں کے
مکھیا نے ایک دن اسے مشورہ دیا کہ وہ اس طرح بیکار زندگی
نہ گزارے بلکہ اس کی بھانجی سے شادی کرلے۔ یہ موضوع
اس کے لئے تکلیف دہ تھا۔ اس نے بُرا سا منہ بنایا اور
خاموش رہا۔

"کیوں اس کا کیا مذہب؟"

"میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے۔ آپ بتا سکتے ہیں" مسافر
نے اپنے سفید ہوتے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"میں اب ان باتوں میں آنے والا نہیں۔ یہ پیشکش
آپ کہیں اور کریں۔"

"ارے! تم کتنے عجیب آدمی ہو۔ بھئی میں مذاق نہیں
کرتا صرف تمہاری مرضی کا انتظار ہے۔ تم ہاں کر کے دیکھ
ہی لو نا اس بار۔ آخر اس میں جاتا کیا ہے۔ کہہ دو ہاں بس۔"
مسافر نے جو تماشائے اہل کرم دیکھنا چاہتا تھا بڑے کرب
آمیز شوخ لہجے میں ہاں کرلی۔ وہ جانتا تھا یہ صرف فریب ہوگا
لیکن دیکھیں یہ خود فریبی کیسی رہتی ہے۔ اس نے کسی پُرانی
چوٹ کی تکلیف کو جیسے محسوس کیا ہو۔
لیکن اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب وہ حجلۂ
عروسی میں داخل ہو رہا تھا۔ اس وقت تک وہ مرا نہ تھا
لڑکی بھی زندہ تھی۔ وہ صرف دُلہن کے بارے میں اتنا جا
تھا کہ وہ ایک نوجوان غریب لڑکی ہے۔ آخر مسافر کی شا
ہو ہی گئی۔ وہ لڑکی اپنے بال ایک خاص طریقہ سے بنایا
تھی جو اسے بہت عجیب لگتے۔ بالوں کی ایک لٹ لڑکی
چہرے پر ایک طرف پڑی رہتی۔ ایک دن اس نے
سے اس کی وجہ پوچھی۔ لڑکی نے بالوں کی لٹ ہٹا
ایک پُرانے نشان کی طرف اشارہ کیا۔

"—— دیکھو"!

"یہ تمہیں کیسے لگی؟"

"جب چھوٹی سی تھی تو میری نانی سبزی بیچتی تھ
وہ مجھے گود میں لے کر منڈی جاتی تھی۔ ایک دن ایک
نے بلا وجہ مجھے قتل کرنے کے لئے مجھے چاقو مارا لیکن
بچ گئی اور اس کے چاقو سے میری یہ بھوں چھل گئی۔ و
بھاگ گیا۔ نانی کو بڑی حیرت تھی کیونکہ گاؤں میں ہمارا کو
بھی دشمن نہ تھا۔"

"کیا تمہاری نانی اندھی تھی؟"

"ہاں! تم کیسے جانتے ہو"؟

"وہ چور میں ہی ہوں۔"

"مذاق کرتے ہو۔"

"دیکھ لو میں نے تم کو چرا لیا۔ زندگی ہم کو بھولا
چوٹیں ہی تو دیتی ہے۔" دلہن نے کچھ نہ سمجھ کر مسافر کی طرف
دیکھا اور شرما کر نظریں نیچی کرلیں۔ مسافر کی آنکھوں میں ا
کے لئے جنم جنم کا پیار تھا۔

ہندوستان اور پاکستان کے اُردو ادیبوں میں تعاون

اور

اُردو کا بین المملکتی انعام

محترمی السلام علیکم

"ہم قلم" کی تازہ اشاعت (بابت ماہ دسمبر سنہ ۶۶ء) میں محمد عتیق صدیقی صاحب کا خط غور سے پڑھا۔ مجھے موصوف کی ایک دو باتوں کے علاوہ بحیثیت مجموعی سبھی سے اتفاق ہے۔ میں جس بات کو سب سے زیادہ اہم اور ضروری سمجھتا ہوں، اس کا اس خط میں صراحت کے ساتھ ذکر نہیں ہے، مگر جو تجاویز پیش کی گئی ہیں، ان کا لازمی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے اُردو ادیبوں میں بہت گہرا اور مستحکم رشتہ قائم ہونا چاہیئے۔ اس رشتے کو قائم اور برقرار رکھنے کے لیۓ وقتاً فوقتاً ملنے جُلنے کے لیۓ مواقع بہم پہنچانا چاہیئے۔ کبھی سالانہ کانفرنس کے ذریعہ، کبھی مشاعرہ کے بہانے، کبھی مختلف قسم کی ثقافتی سرگرمیوں کے نام پر۔ اسی طرح جب تک دونوں ملکوں کے درمیان کتابوں کی تجارت پوری آزادی کے ساتھ شروع نہیں ہو جاتی، کم از کم اس وقت تک کے لیۓ دونوں جگہ کے ادیبوں میں ایسا رابطہ پیدا کیا جائے اور اس کے لیۓ فضا پیدا کی جائے اور حالات سازگار کیۓ جائیں کہ وہ قیمتوں کے فرق کو نظر انداز کر کے آپس میں اپنی تصانیف کا تبادلہ کر سکیں۔

دونوں ملکوں کی اُردو کی بہترین کتابوں پر بین المملکتی انعام کی تجویز کی کامیابی میں اگرچہ بظاہر بہت سی مشکلات اور دقتیں ہیں، مگر ہے بہت مفید۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس کو حکومت کے ذمہ کیا گیا، جیسا کہ عتیق صاحب نے لکھا ہے، تو اس کی کامیابی کے امکانات بہت کم ہو جائیں گے۔ اولاً حکومتوں کے تعلقات خارجی اسباب کی بنا پر بنتے بگڑتے رہتے ہیں، دوسرے حکومتوں کی بہت سی مصلحتیں ہوتی ہیں، جن کی وجہ سے مفید سے مفید اسکیمیں کبھی کبھی دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ اُردو زبان پاکستان کی قومی زبان ہے، اس لیۓ بظاہر وہاں کی حکومت کو اس تجویز کو قبول کرنے میں شاید تامل نہیں ہوگا، مگر ہندوستان کی صورت حال اس سے بالکل مختلف ہے۔ مرکزی حکومت کا اُردو کے ساتھ جو مناسب سلوک ہے، اس کا اعتراف کرتے ہوئے، یہاں کے لسانی اختلافات کی وجہ سے، مجھے بہت کم اُمید ہے کہ سرکاری طور پر بین المملکتی انعام دینا ممکن ہوگا۔ اس لیۓ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اس طرح کے انعامات کا انتظام، چاہے ہندوستان میں ہو یا پاکستان میں، ادبی انجمنوں اور اداروں کو کرنا چاہیئے۔ کانفرنسوں میں بھی چاہے حکومت کی امداد شامل ہو، مگر اس کا اہتمام خالص آزاد اداروں کو کرنا چاہیئے۔

عتیق صاحب نے اپنے خط کے آخر میں جس چیز کو ہندوستان اور پاکستان کی علمی و ادبی زندگی کا سب سے

پڑا المیہ قرار دیا ہے، وہ ممکن ہے کہ اس لحاظ سے صحیح ہو کہ ہم ادیبوں کے ذرائع اتنے محدود ہیں کہ ہم خود اپنے اپنے ملک کی بہت سی اہم مطبوعات سے ایک عرصے تک ناواقف رہتے ہیں اور بقول شفیق صاحب اس وقت خبر ہوتی ہے جب وہ باسی ہو چکی ہوتی ہیں۔ مگر یہ بات صحیح نہیں ہے کہ نئی مطبوعات کی اطلاع میں شائع نہیں ہوتیں۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ سے ایسے رسالے نکلتے ہیں، جن کا کام ہی صرف یہ ہے کہ وہ اپنے قارئین کو نئی مطبوعات اور اہم کتابوں سے متعارف کرائیں۔ مثلاً پاکستان سے "کتابی دُنیا" نکلتا ہے اور ہندوستان سے "کتاب نما"۔ مگر یہ رسالے اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب اس لئے نہیں ہیں کہ انھیں تمام ناشروں اور ادیبوں کا تعاون حاصل نہیں ہے، ورنہ یہ رسالے اس مقصد کے لئے بہت مفید ہو سکتے ہیں۔ بعض اخبارات و رسائل ادبی خبریں بھی مستقل طور پر شائع کرتے ہیں۔ مثلاً "ہم قلم" (کراچی) "ہماری زبان" (علی گڑھ) "فروغ اُردو" (لکھنؤ) اگر ان کالموں میں اہم مطبوعات کی اطلاع بھی شائع کر دی جایا کریں تو افادے کا میدان اور وسیع ہو جائے گا۔ مگر میں تخصص (اسپشلائیزیشن) کا قائل ہوں۔ ہر رسالہ اور ہر اخبار کو ہر کام نہیں کرنا چاہیئے، اس لئے میرے خیال میں یہ کام بنیادی طور پر ان ہی رسالوں پر چھوڑ دینا چاہیئے، جنہوں نے مخصوص طور پر اُردو مطبوعات کے بارے میں جملہ معلومات مہیا کرنے کی ذمہ داری لی ہے۔ حسنِ اتفاق سے ایسے رسالوں کے چندے بھی زیادہ نہیں ہوتے اور وہ مضمون نگاروں اور مصنفوں کو بالعموم اعزازی طور پر جاری کرنے میں فیاضی بھی برتتے ہیں، اس لئے آسانی سے ان سے فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔

آخر میں میں اس کی معذرت چاہتا ہوں کہ میں نے اس مضمون نما خط میں ہر جگہ اُردو لکھا ہے — اُردو کے ادیب، اُردو کی مطبوعات — ایسا صرف اس لئے ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کی مختلف زبانوں میں سے صرف اُردو سے میرا تعلق ہے اور جو کچھ میں کہہ سکتا ہوں صرف اسی کے بارے میں، اس لئے میں نے دوسری زبانوں کا ذکر نہیں کیا ہے، ورنہ ان سے مجھے کوئی بیر نہیں ہے۔

آپ کو یہ سُن کر خوشی ہوگی کہ ۱۳ سال کے طویل عرصے کے بعد رسالہ جامعہ دوبارہ جاری ہو گیا ہے۔ پہلا شمارہ بھیج رہا ہوں۔ اُمید ہے کہ "ہم قلم" اس کے تبادلے میں جاری ہو جائے گا۔ والسلام

خاکسار عبداللطیف اعظمی

'رسالہ جامعہ'

جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر — نئی دہلی

مرکز

کاپی رائٹ

حکومت سے گلڈ کے چند مطالبات

یونیسکو کے ایک ماہر جنوری میں کاپی رائٹ قانون کا دوسرا مسودہ تیار کرنے آرہے ہیں گلڈ انہیں قانونی مشورے اور دیگر ندا پیش کر چکا ہے لیکن اس سلسلے میں اپنے چند بنیادی مطالبے پھر پیش کر دینا چاہتے ہیں۔ امید ہے کہ ناشرین کی انجمن ہم سے اتفاق کرے گی۔ ہم ملکی صحافت اور ادبی رسائل سے بھی کھلے تعاون کی اپیل کرتے ہیں۔

(۱) مصنفین کی تصنیفات پر ان کے ورثاء کا حق مصنف کے انتقال کے سو برس بعد تک قائم رہے۔

(۲) کاپی رائٹ قانون کو فوجداری قانون کی حیثیت دی جائے تاکہ جرائم کا ارتکاب کم سے کم ہو جائے۔

(۳) ہر تصنیف کے لئے اشاعت سے پہلے مصنف اور ناشر کے مابین تحریری معاہدہ لازمی قرار دے دیا جائے جو رجسٹرار ضلع کی عدالت میں رجسٹرڈ ہو جائے۔ (گلڈ اپنے اراکین کی حد تک پورے پاکستان میں ہر معاہدے کی رجسٹریشن فیس ادا کرنے پر تیار ہے۔)

(۴) ناشرین کا رجسٹریشن لازمی قرار دیا جائے تاکہ بدعہدی اور بددیانتی کی صورت میں دیگر قانونی کارروائی کے علاوہ ان پر ایک مستقل گرفت رہ سکے۔ اس سے فحش اور مخرب اخلاق ادب کی اشاعت پر بھی گرفت زیادہ ہو جائے گی۔

(۵) مصنف کی اجازت کے بغیر اس کی تخلیقات کا انتخاب غیر قانونی قرار دے دیا جائے۔ خلاف ورزی کی سزا جرمانے کے علاوہ سزائے قید کی شکل میں بھی ہو۔

(۶) کاپی رائٹ کی خلاف ورزی مصنف کی رپورٹ پر قابل دخل اندازی پولیس قرار دے کر تعزیرات پاکستان اور ضابطہ فوجداری میں ضروری اضافے کئے جائیں تاکہ مصنف کے کاپی رائٹ پر ڈاکہ عام چوریوں کی ذیل میں آ سکے۔ اور مصنف کو دیوانی کارروائیوں میں سرگردانی نہ کرنی پڑے۔ قانون خود مجرم کی گرفت کرے۔

یہ ہمارا سب سے اہم مطالبہ ہے

(۷) کاپی رائٹ قانون کی خلاف ورزی کی دیگر سزائیں مناسب حد تک بڑھائی جائیں۔ اس وقت یہ سزائیں مضحکہ خیز حد تک کم ہیں۔

(۸) اس قانون کے معاملے میں ہندوستانی ادیبوں کو پاکستانی ادیبوں کی طرح سمجھا جائے یعنی خاص طور پر اس قانون میں ہندوستانی ادیبوں کے حق تصنیف کی حفاظت پاکستانی ادیبوں کے حقوق کی حفاظت کی طرح کی جائے۔

نوبل پرائز

الفریڈ نوبل کا وصیت نامہ ــــ دُنیا بھر کے اُمرا، تجاّر اور صنعت کاروں کیلئے لمحۂ فکریہ

میں ــــ الفریڈ برن ہارڈ نوبل۔ بعد از غور و فکر اعلان کرتا ہوں کہ اپنی ترکے کی جائیداد کے بارے میں میری آخری وصیت یہ ہے:-

میرے منتظمین میری تمام قابل انتقال جائداد کے بارے میں ذیلی اقدامات اٹھائیں:

میری تمام قابل انتقال جائداد کو نقدی میں تبدیل کر دیا جائے۔ اور ان رقوم کو محفوظ تمسکات میں لگایا جائے۔ اس طور پر جو سرمایہ لگے گا وہ ایک فنڈ بن جائے گا۔ جس کا نفع ہر سال ان اشخاص میں تقسیم کیا جائے جو عالم انسانیت کے لئے سال گزشتہ میں سب سے زیادہ ٹھوس طریقے سے کارآمد رہے ہوں۔

نفع ہذا کو پانچ برابر حصص میں منقسم کیا جائے اور اس طرح تقسیم کیا جائے کہ ایک حصہ اس شخص کو ملے جس نے علم الطبیعات میں سب سے اہم دریافت یا ایجاد کی ہو۔ . . . . ایک حصہ اس شخص کو ملے جس نے سب سے اہم کیمیاوی دریافت یا ترقی کی ہو۔ ایک حصہ اس شخص کو ملے جس نے علم الابدان یا طبابت میں سب سے اہم دریافت کی ہو۔ ایک حصہ اس شخص کو ملے جس نے بہترین آورشی ادب تخلیق کیا ہو، اور آخر میں ایک حصہ اس شخص کو ملے جس نے مختلف قوموں میں اخوت بڑھانے، فوجوں میں تخفیف یا خاتمے کے لئے، اور امن کانگریس بلانے یا مقاصد امن بڑھانے کے لئے سب سے اہم کام کیا ہو۔

علم الطبیعات اور علم الکیمیا کے انعامات کا انتظام سوئڈش اکیڈیمی آف سائنس اسٹاک ہام کرے۔ . . علم الابدان اور حکمت کے انعام کا انتظام کارولینن میڈیکو سرجیکل انسٹی ٹیوٹ اسٹاک ہام کرے۔ ادب کے انعام کا انتظام اکیڈیمی آف اسٹاک ہام کرے۔ اور امن کے انعام کا انتظام ناروے جین اسٹارٹنگ کے منتخب کردہ پانچ اشخاص کی کمیٹی کرے۔

میں واضح طور سے یہ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ تقسیم انعامات میں قومیت کی کوئی تفریق نہ کی جائے یعنی سب سے زیادہ حقدار شخص کو انعام دیا جائے چاہے وہ اسکینڈینیوین ہو یا نہ ہو۔

یہی میرا صحیح وصیت نامہ ہے اور یہ وصیت نامہ تمام دیگر وصیت ناموں کی جو میری وفات کے بعد علم میں آئیں تنسیخ کرتا ہے۔"

الفریڈ برن ہارڈ نوبل

پیرس - ۲۷ - نومبر ۱۸۹۵ء

آدم جی ادبی انعام کے چند اہم قواعد

انعام دس ہزار روپے کا ہوگا۔ اگر دس ہزار کا انعام ایک کی بجائے دو کتابوں کو دینے کا فیصلہ کیا گیا تو لازماً ایک کتاب نثر کی اور ایک نظم کی ہوگی۔ انعام نثر کی دو کتابوں یا شاعری کے دو مجموعوں میں تقسیم نہیں کیا جائے گا۔

ضوابط مختصراً حسب ذیل ہیں:-

- انعام کے لئے صرف طبعزاد کتابوں پر غور کیا جائے گا۔ اگر کوئی کتاب کسی زبان کے کسی اور فن پارے سے ترجمہ یا ماخوذ ہے تو انعام کے لئے زیر غور نہیں آئے گی۔ طبعزاد کتابوں میں ناول، مختصر افسانہ، ڈرامہ، شاعری، ادبی تنقید، سفرنامے اور سوانح سب شامل ہیں،
- کتاب کے مصنف کا پاکستانی شہریت کے قانون کی رو سے پاکستان کا شہری ہونا ضروری ہے۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کا ممبر ہونے کی شرط نہیں ہے۔ مصنف کے لئے ضروری نہیں کہ اپنی کتاب خود بھیجے پاکستان کا کوئی بھی شہری کتابیں بھیج سکتا ہے جو اگست اور جولائی کے درمیان شائع ہوئی ہوں۔
- انعام کا اعلان ۲۴ را کتوبر کو کیا جائے گا۔ کتاب کا پہلا ایڈیشن اس سال کی ۳۱ رجولائی کو ختم ہونے والے سال میں شائع ہونا چاہئے۔ اور کتاب کی پانچ جلدیں بذریعہ رجسٹری یا ذاتی طور پر گلڈ کے مرکزی دفتر (۳۷۔ ہوٹل ایکسلسیر صدر۔ کراچی) میں پہنچانی ضروری ہیں
- مرحوم مصنفین کی کتابیں بھی شامل کی جاسکتی ہیں بشرطیکہ سال متعلقہ میں پہلی بار شائع ہوئی ہوں کتابیں بھیجنے کے ساتھ کوئی فیس ضروری نہیں ہے۔
- جملہ ضوابط اور فارم داخلہ گلڈ کے مرکزی یا علاقائی دفتر سے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ فارم بغیر قیمت دیا جائے گا۔ فارم کے بغیر کوئی کتاب وصول نہیں کی جائے گی۔

ثقافتی ورثہ

مترجمہ: تاج سعید

پشتو لوک گیت

پھولوں بھرے اُوڑبل[1] کو پیاری
ایسے رُخ پر موڑ ذرا تو ——
مرتے سمے شیدائی تیرا
جی اُٹھے پھر دیکھ کے اس کو

○

نینوں کے کشکول بنا کے درشن پائیو تم
کرکے بہانہ آئی رے، مت اِسے گنوائیو تم

○

ساجن میرا ہے لالہ کا پھول
جس کے درشن کو جگیا میں آئیں
گیت گاتی ہوئی بلبلیں

[1] ماتھے کے اوپر کے وہ بال جنہیں ایک خاص انداز سے سجایا جاتا ہے۔

خبر نامہ

اطرافِ عالم

کُل ہند یادگارِ جگر کمیٹی۔ دہلی (بھارت) میں ایک کل ہند یادگارِ جگر کمیٹی کا قیام عمل میں آیا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صدر اور جناب صدیق حسن صاحب سیکرٹری منتخب ہوئے ہیں۔

مولانا آزاد لائبریری۔ بھارت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے ۱ر دسمبر ۱۹۶۰ء کو علی گڑھ (یوپی) میں مولانا آزاد لائبریری کا افتتاح کیا۔

قمر مراد آبادی کو پنشن۔ حکومت ہند نے اُردو کے مشہور شاعر جناب قمر مرادآبادی کو ان کی علمی و ادبی خدمات کے صلہ میں مبلغ پچاس روپیہ ماہوار کی پنشن منظور کی ہے۔

غالب سے متعلق انسائیکلوپیڈیا۔ بنارس (بھارت) کی غالب اکیڈیمی کے زیر انتظام مرزا غالب کے بارے میں جو انسائیکلوپیڈیا ترتیب دی جا رہی ہے۔ اس کے مؤلف مولانا خیر بہوروی نے اعلان کیا ہے کہ بھارت کے وزیر اعظم پنڈت نہرو اس کتاب کو اپنے نام سے معنون کرانے پر راضی ہوگئے ہیں۔ اس کتاب کا پہلا حصہ غالب چیتروالی (البم) غالب کی تصویروں پر مشتمل ہوگا۔ بقیہ حصے میں غالب کی غزلیں اور ان کی تصانیف شامل ہوں گی۔

مشرقی پنجاب اور اُردو۔ مشرقی پنجاب (بھارت) میں ڈسٹرکٹ بورڈوں کا تمام کام اب اُردو کے بجائے انگریزی یا پنجابی میں ہوا کرے گا۔

اُردو کے پہلے صاحب کلیات شاعر کی ۳۶۰ ویں برسی۔ نصیر آباد (دکن) میں گزشتہ ماہ ادارہ ادبیات اُردو کے زیر انتظام اُردو کے پہلے صاحب کلیات شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ کی ۳۶۰ ویں برسی منائی گئی۔ ایک اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے راجا بھگوان داس بھگوان نے کہا کہ آج سے ۶۰ برس قبل اُردو شاہی دفتر اور سرکاری زبان تھی لیکن افسوس ہماری غلامانہ ذہنیت کے باعث آج اُردو اپنا وہ مقام حاصل نہ کر سکی۔

عالمی ادبی کانفرنس۔ ٹیگور صد سالہ کمیٹی (دہلی) کے سکریٹری نے اعلان کیا ہے کہ ٹیگور کی سالگرہ کے موقع پر دہلی میں اعلیٰ پیمانہ پر ایک عالمی ادبی کانفرنس اور نمائش منعقد ہوگی۔ اس موقع پر رابندر بھون کا افتتاح

بھی ہوگا۔ اس عمارت پر چالیس لاکھ روپیہ صرف ہوا ہے۔

غالب اور اُنکی شاعری انگریزی! انگریزی زبان میں پہلی مرتبہ غالب اور ان کی شاعری کے نام سے ایک کتاب شائع ہو رہی ہے مسٹر بی ایل نکمن پال نے اعلان کیا ہے کہ جلد ہی یہ کتاب منظر عام پر آجائے گی۔

کل ہند اُردو کانفرنس۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) کے زیر اہتمام عنقریب کانپور (یوپی) میں دو روزہ کل ہند اُردو کانفرنس منعقد ہوگی۔ اس کانفرنس میں انجمن کی تمام شاخوں کے نمائندے شرکت کریں گے اس کانفرنس کے انعقاد کا ایک اہم مقصد اُردو کو بھارت میں اس کا جائز مقام دلانا ہے۔

دہلی میں آزاد بھون کا قیام۔ دہلی ۱۱ نومبر کو بھارت کے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے "آزاد بھون" کا افتتاح کیا۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے سائنس و ثقافتی اُمور کے وزیر پروفیسر ہمایوں کبیر نے کہا کہ عمارت میں انتظامیہ کے دفتروں کے علاوہ نمائش کی دو گیلریاں ایک بیش بہا لائبریری اور ریڈنگ روم، ریسرچ کی سہولتیں، لکچروں، سمپوزیم اور سمینار کے لئے کمرے بھی موجود ہیں۔ ان کے علاوہ اس عمارت میں اور بہت سی ضروری سہولتیں فراہم کرنے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔

یوم بہادر شاہ۔ جنوری کے دوسرے ہفتہ میں بھوپال (بھارت) میں بہادر شاہ ظفر کی صد سالہ برسی منائی جائے گی۔ اس موقع پر ایک مشاعرہ ہوگا اور کچھ ڈرامے پیش کئے جائیں گے۔

بہار اُردو کانفرنس۔ ۲۳ دسمبر ۱۹۶۰ء کو مظفر پور میں انجمن ترقی اُردو (ہند) کے معتمد عمومی جناب پروفیسر آل احمد سرور نے بہار اُردو کانفرنس کا افتتاح کیا۔ اس تقریب میں چار سو مندوبین اور دیگر مشاہیر ادبا و شعرا نے شرکت کی۔ اس کانفرنس کا مقصد اُردو کو بھارت میں اُس کا جائز مقام دلانا ہے۔

ایران میں یوم جگر۔ حضرت جگر کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے تہران یونیورسٹی نے ایک مشاعرہ منعقد کیا جس میں ایران کے ممتاز مشاہیر شعرا، تہران یونیورسٹی کے اساتذہ، ایران میں مقیم پاکستانی باشندے اور پاکستانی سفیر مسٹر اختر حسین نے شرکت کی۔ اس مشاعرہ میں جگر مرحوم پر کئی اُردو اور فارسی نظمیں پڑھی گئیں۔

شکسپیر کی برسی۔ حکومت برطانیہ ۱۹۶۴ء میں ولیم شکسپیر کی چہار صد سالہ برسی نہایت تزک و احتشام سے منانے کے لئے مالی امداد دینے پر غور کر رہی ہے۔ تاکہ ایک عمدہ عمارت ایک آرٹ گیلری قومی تھیٹر اور ایک کانفرنس ہال کی تعمیر ہو سکے۔

فرانسیسی ناول پر انعام۔ حال ہی فرانسیسی مصور برنارڈ کی اہلیہ انابیلی کو ان کے ناول "Every Day Here" پر "Prix Julia" کا انعام دیا گیا ہے۔

مشہور حبشی نژاد ادیب کا انتقال۔ گزشتہ دنوں امریکہ کے مشہور حبشی نژاد ادیب رچرڈ رائٹ کا انتقال ہوگیا۔ مرحوم کی عمر ۵۲ سال کی تھی۔ انھوں نے سفید نسل بیوی ایلن اور دو بچے چھوڑے ہیں۔ جنھوں نے فرانسیسی شہریت اختیار کر لی ہے۔ رچرڈ رائٹ اپنی دو کتابوں "نے ٹو سانگ" (قومی گیت) اور

بلیک بوائے (حبشی لڑکا) کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔

میکسم گورکی کے خطوط۔ روسی سائنس اکیڈمی نے غیر ملکی ادیبوں سے گورکی کی خط وکتابت کے نام سے میکسم گورکی کے خطوط کا انتخاب شائع کیا ہے۔

پیرس میں ٹیگور کا صدسالہ یوم پیدائش۔ پچھلے دنوں پیرس میں رابندر ناتھ ٹیگور کا صد سالہ یوم پیدائش منایا گیا۔ ڈاکٹر رادھا کرشن نے اس تقریب کا افتتاح کرتے ہوئے ٹیگور کی شخصیت فن اور ان کے کلام پر روشنی ڈالی۔

مغربی پاکستان

سائنس کے موضوعات پر اردو میں انعامی مضامین۔ اُردو اکیڈیمی لاہور نے فیصلہ کیا ہے کہ اسکولوں، کالجوں۔ اور یونیورسٹیوں میں سائنس کے موضوعات پر اُردو میں مضامین لکھوا کر مقابلہ کرایا جائے گا اور نشر کے تین مضمونوں پر تین ہزار روپوں کا انعام دیا جائے گا۔

اردو سندھی اُدبی کنونشن۔ یکم جنوری ۱۹۶۲ء کو مرکز علم وادب میرپور خاص کا کل سندھ اردو سندھی اُدبی کنونشن منعقد ہو رہا ہے۔ جس کے افتتاح کے لئے وزیر تعلیم جناب حبیب الرحمٰن سے درخواست کی گئی ہے۔ اس تقریب میں سابق صوبہ سندھ اور کراچی کے اکثر مشاہیر شعراء وادبا شرکت کریں گے۔

پنجاب یونیورسٹی اُردو سوسائٹی کا سالانہ جلسہ۔ مغربی پاکستان پبلک سروس کمیشن کے چیرمین لفٹیننٹ جنرل ناصر علی خان نے لاہور میں پنجاب یونیورسٹی اُردو سوسائٹی کے سالانہ اجلاس میں اُردو ادیبوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ وہ معاشرے کے موجودہ تقاضوں کو سامنے رکھ کر ادب کی تخلیق کریں۔ انھیں متقدمین کا تتبع کرنے کے بجائے اُردو ادب کو موجودہ اقدار کا آئینہ دار بنانا چاہیئے۔

مولانا ظفر علی خاں کی یادگار۔ لائلپور کے ایک عام اجلاس میں متفقہ طور پر ایک قرارداد منظور کی گئی ہے۔ جس میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا ہے۔ کہ بابائے صحافت مولانا ظفر علی خاں مرحوم کی کوئی موزوں یادگار قائم کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے ضروری انتظامات کرنے کے لئے ایک کمیٹی بھی قائم کی جائے۔ اس جلسہ میں لائلپور اور اس کے قرب وجوار کے اکثر مقتدر ادیبوں صحافیوں اور شاعروں نے شرکت کی۔

اسد ملتانی کی پہلی برسی۔ گزشتہ دنوں ٹاؤن ہال ملتان میں یوم اسد منایا گیا۔ ملتان کے تمام ادبی حلقوں نے اس تقریب میں حصہ لے کر اسد مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اس موقع پر ملتان رائٹرز گلڈ کے اراکین بھی موجود تھے۔ ملتان کے بعض ممتاز ادیبوں نے اسد مرحوم کی شخصیت اور فن پر مقالے پڑھے جن میں مرحوم کی علمی وادبی خدمات پر روشنی ڈالی گئی تھی۔

اچھی کتابوں پر انعام - اباسین آرٹ سوسائٹی (پشاور) نے سال رواں کی دو بہترین کتابوں پر پانچ پانچ سو روپے دینے کا اعلان کیا ہے سوسائٹی نے اردو اور پشتو کے مصنفین سے درخواست کی ہے کہ وہ جلد سے جلد اپنی تصانیف سکریٹری کو ارسال کر دیں۔

سکھر میں پاکستانی مصنفین کا اجتماع - حال ہی میں سکھر کے ڈپٹی کمشنر جناب جمشید رضا الرحیم نے سکھر گلڈ کے شعبۂ اشاعت کا افتتاح کیا۔ حاضرین نے علاقائی گلڈ کی پہلی اشاعت "ماروی کے دیس میں" بہت پسند کی اور کہا کہ اس کی اشاعت میں کارکنان کا جذبہ قابل ستائش ہے کہ انھوں نے اپنے [illegible] کے لوک گیت اکٹھے کئے۔ [illegible] جنوری سے سکھر گلڈ کے زیر اہتمام پاکستانی مصنفین کا دو روزہ [illegible] ہوگا۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کے سکریٹری جنرل قدرت اللہ شہاب اس کا افتتاح فرمائیں گے۔ پہلی نشست کی صدارت جناب سید وقار عظیم کریں گے۔ اس نشست میں پاکستان کی تمام علاقائی زبانوں کے مصنفین تقریریں کریں گے۔ دوسری نشست مشاعرہ کی ہوگی جس کی صدارت جناب فیض احمد فیض کریں گے۔ اس مشاعرے میں تمام علاقائی زبانوں کے شعرا شرکت فرمائیں گے۔ تیسری نشست سمپوزیم کی شکل میں محترمہ قرۃ العین حیدر کی زیر صدارت ہوگی۔

حلقہ کراچی

سائنسی موضوعات پر اردو میں مقالے - پچھلے دنوں کراچی میں پاکستان سائنٹیفک سوسائٹی کا افتتاح کرتے ہوئے کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر مسٹر بی۔ اے ہاشمی نے سائنٹیفک اور ادبی شعبوں کے درمیان توازن پیدا کرنے کی ضرورت پر زور دیا اس جلسہ میں سائنسی موضوعات پر اردو میں چالیس مقالے پڑھے گئے۔ ملک کے ممتاز سائنسدانوں نے اردو میں مقالے پڑھ کر یہ ثابت کر دیا کہ سائنس کی اعلیٰ تعلیم اور نظریات کی اشاعت کے لئے اردو زبان میں ذریعہ تعلیم بننے کی کتنی بڑی صلاحیت موجود ہے۔

اردو یونیورسٹی - کراچی ۱۱ دسمبر مجلس طلباء کے زیر اہتمام ایک اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے بابائے اردو نے اردو یونیورسٹی کے قیام، موجودہ دور میں اس کی اہمیت، اور آنے والے زمانے میں اس کی افادیت پر زور دیا۔ بابائے اردو نے پاکستانی طلباء سے خاص طور پر اپیل کی کہ وہ اردو یونیورسٹی کے قیام کے لئے سرمایہ فراہم کرنے میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔

گلڈ کی پندرہ روزہ ادبی نشستیں - کراچی۔ ۹ دسمبر کو گلڈ کراچی کی پندرہ روزہ ادبی نشست محترمہ نثار عزیز کی صدارت میں ہوٹل [illegible] میں منعقد ہوئی۔ غلام عباس نے فن افسانہ نگاری پر اپنی آراء پیش کیں۔ آخر میں جناب جمیل الدین عالی نے روس میں اردو کے موضوع پر اپنے دورے کے تاثرات بیان کئے۔

۲۳ دسمبر ۱۹۶۰ء کو حلقہ کراچی کی ایک اور پندرہ روزہ ادبی نشست ہوئی جس کی صدارت جناب ممتاز حسین نے فرمائی۔ جناب حفیظ ہوشیارپوری نے اپنی غزل اور جناب عبدالعزیز خالد نے اپنی نظم پیش کی۔

ہمارے نئے اعشاری سکے

ایک اور انقلابی اصلاح

اہم خصوصیات :- ایک پیسہ، پانچ پیسے اور دس پیسے کے نئے سکے
یکم جنوری ۱۹۶۱ء سے جاری کئے جا رہے ہیں۔

موجودہ سکے ان کے ساتھ ساتھ چلتے رہیں گے۔
پچیس پیسے، پچاس پیسے اور سو پیسے (ایک روپیہ) کے نئے سکے بعد میں
جاری کئے جائیں گے۔ فی الحال موجودہ چونی اور اٹھنی علی الترتیب چوتھائی
اور نصف روپیہ کے برابر شمار ہوگی۔
روپیہ کے نام یا قیمت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ ادائیگی دونوں طرح
کے سکوں میں کی جا سکتی ہے۔ پرانے سکوں کی قیمت نئے سکوں میں
ظاہر کرتے وقت جہاں کہیں چھوٹی کسریں واقع ہوں
مبادلے کے نقشوں کے مطابق دور کی جا سکتی ہیں جو حکومت نے
معین کر دیئے ہیں۔

تبدیلی کا نقشہ

پرانے سکے نئے سکوں میں حسب ذیل منظور شدہ نقشے کے مطابق تبدیل کئے جا سکتے ہیں :-

آنے / پائی		۳	۶	۹	آنے / پائی		۳	۶	۹
۰	۰۰۰	۲	۳	۵	۹	۵۶	۵۸	۵۹	۶۱
۱	۶	۸	۹	۱۱	۱۰	۶۲	۶۴	۶۶	۶۷
۲	۱۲	۱۴	۱۶	۱۷	۱۱	۶۹	۷۰	۷۲	۷۳
۳	۱۹	۲۰	۲۲	۲۳	۱۲	۷۵	۷۷	۷۸	۸۰
۴	۲۵	۲۷	۲۸	۳۰	۱۳	۸۱	۸۳	۸۴	۸۶
۵	۳۱	۳۳	۳۴	۳۶	۱۴	۸۷	۸۹	۹۱	۹۲
۶	۳۷	۳۹	۴۱	۴۲	۱۵	۹۴	۹۵	۹۷	۹۸
۷	۴۴	۴۵	۴۷	۴۸	۱۶	۱۰۰	۰۰۰	۰۰۰	۰۰۰
۸	۵۰	۵۲	۵۳	۵۵					

مثال :- ایک آنہ ۳ پائی = آٹھ نئے پیسے

یکم جنوری ۱۹۶۱ء سے جاری کئے جا رہے ہیں

جاری کردہ - وزارت مالیات حکومت پاکستان

جنوری ۱۹۶۱ء

آدم جی کے پارچہ جات

دیرپا ہوتے ہیں

زیرِ نگرانی

آدم جی انڈسٹریز لمیٹڈ

کراچی

Printed at The International Press, McLeod Road, Karachi

ادارۂ مصنفین پاکستان

حاتم

[illegible]
ان تحریروں کے حقوق [illegible]

ماہنامہ
ہم قلم

ادارہ مصنفین پاکستان، حلقہ کراچی
(پاکستان رائٹرز گلڈ) کا ترجمان

جلد ۱ — شمارہ ۸

مارچ ۱۹۶۱ء

فی پرچہ ۳۷ پیسے (دس آنے)
سالانہ چھ روپے
(جس میں خاص نمبر بھی شامل ہیں)

پتہ
۳۷ ہوٹل ایکسلسیر، صدر، کراچی ۳
فون ۵۰۰۸۰

ہمارا منشور

. ہم پاکستان کی جملہ زبانوں کے ادیب خود کو اور وطن کی ترقی،
لت، بین الاقوامی امن کے آدرش اور انسانیت کی ترقی کے لئے
ن کرتے ہیں، ہم ان حقوق انسانی پر ایمان رکھتے ہیں۔ جن کی تشریح
ام متحدہ کے منشور میں کی گئی ہے۔ بہ حیثیت ادیب کے ہم اپنے خیالا
ے اظہار اور ترسیل کی آزادی کے لئے بنیادی حقوق کے حامی ہیں
ں کے بغیر تخلیقی ادب بے مقصد ہوتا ہے۔ ہمیں اپنی ان عظیم روایات
جو ہمیں ماضی سے ملی ہیں، پورا فخر ہے۔ ہم ان کے تحفظ اور ان کو
ید فروغ دینے کا عہد کرتے ہیں۔ ہم اپنے مقدس فرض سے جو
داقت کی عکاسی، حب وطن کی قدروں کی نشو و نما، بین الاقوامی
ت اور تعاون کے فروغ اور انسانی تعلقات کے قیام سے متعلق
ے، کما حقہ آگاہ ہیں تاکہ انسانیت زیادہ سے زیادہ راحت و عافیت
ر وقار کے ساتھ اپنا وجود باقی رکھ سکے۔

ادیب ہونے کی حیثیت سے فرداً فرداً اور اجتماعی طور پر ہم
ے ایسے خوشحال اور صحت مند معاشرے کی ترقی کے لئے اپنی ذمہ
ی کو قبول کرتے ہیں جس میں سب کے لئے آزادانہ اور مساوی
ائع فراہم ہوں، اور جہاں دولت و اقتدار، انسانی قدروں اور
مالی تصورات کے تابع ہوں۔ اسی لئے علم و سائنس کی ترقی
دنیا میں امن اور خوش حالی کے فروغ کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔"

(پاکستان رائٹرز گلڈ کے تاسیسی اجلاس میں
بروز ۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء منظور ہوا)
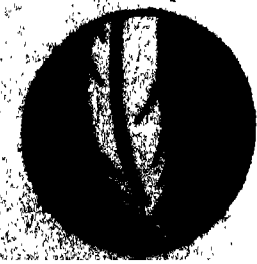
ترتیب

	اداریہ			۳
ین	اُردو ناول کا آغاز اور ابتدائی نشوونما	اختر انصاری دہلوی		۹
	تحلیل سرست سے متعلق چند غلط فہمیوں کا ازالہ	اختر رضوی		۲۸
	سائنس کی تعلیم اپنی زبان میں	ایک خبر		۵
یں	میرا سفر	سردار جعفری		۳۹
	میں تماشہ ہوں تماشائی بھی	سید فیضی		۴۱
	چاندنی	عبدالعزیز فطرت		۴۳
	رات	نجمہ جلالی		۴۴
	سورج مکھی مستقبل	انور فرہاد		۴۰
	دوہے	تاج سعید	ارتضیٰ عریلی	۴۵
زلیں		عزیز حامد مدنی	نور بجنوری	۷۲
		شاعر لکھنوی	انجم رومانی	۷۳
		جمیل ایوبی	صادق مدہوش	۷۴
		تاب اسلم	شیدا گجراتی	۷۵
افسانے	تجربہ	محمد عمر میمن		۴۶
	چند بُت چند تیشے	نجم فضلی		۵۴
ڈرامہ	ناچس اور چور	آغا ناصر		۶۶
قافتی ورثہ	چاند (شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ)	پیکر دا سلاح (مطیک)		۷۶
خبرنامہ	اطراف عالم، مرکز، حلقہ کراچی اور مغربی پاکستان کی ادبی خبریں			۷۷

اداریہ

دو سال پہلے ادارۂ مصنفین پاکستان قائم ہوا تھا۔ اس قلیل مدت میں "ادارے" نے پاکستان کی قومی اور علاقائی زبانوں کے ادیبوں کو نہ صرف منظم کیا اور ان کے مسائل کے حل تلاش کرنے اور ان کے حقوق کے تحفظ کی کوشش کی۔ بلکہ ملک کے گوشے گوشے میں ثقافتی اور سماجی سرگرمیوں کو فروغ دیا۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا ادبی ادارہ ہے جس نے پاکستان کی مختلف قومی اور علاقائی زبانوں اور تہذیبوں کو ہم آہنگ اور استوار کرنے کی داغ بیل ڈالی۔

اگر "ادارے" کا قیام پاکستانی ادیبوں کے لئے اپنے حقوق کے تحفظ اور اپنے مسائل کو حل کرنے میں ایک نئے باب کا افتتاح کرتا ہے تو اس کی تنظیم پاکستان کی قومی اور علاقائی زبانوں اور تہذیبوں کی اشاعت اور ترویج کے لئے ایک نئے دور کا آغاز کرتی ہے۔ "ادارہ" ایک طرف ادیبوں کے حقوق کے تحفظ کا ضامن ہے تو دوسری طرف ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا محرک بھی ہے۔ جہاں وہ ادیبوں کو اپنے مفاد عام کے لئے ایک مرکز پر جمع کرتا ہے اور ان کی اقتصادی و دیگر فلاح و بہبود کے لئے کوشاں ہے وہیں وہ ادیبوں میں قومی شعور بھی بیدار کرتا ہے۔ اور ان میں عالمگیر انسانی قدروں کے تحفظ کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔

"ادارے" کی مرکزی مجلس عاملہ کا چوتھا اجلاس، ہوٹل ایکسلسیئر کراچی میں ۲۹، ۳۰ اور ۳۱ جنوری ۱۹۶۱ء کو منعقد ہوا۔ اراکین عاملہ نے پاکستان کی قومی اور علاقائی زبانوں کے نمائندوں کی حیثیت سے اس سہ روزہ اجلاس کی پانچ نشستوں میں بائیس گھنٹے تک پاکستانی ادیبوں کے جملہ مسائل اور ان کے حقوق کے تحفظ کے جملہ طریقوں پر غور کیا۔

اس اجلاس میں الجزائر پر منظور شدہ قرارداد اس امر کی وضاحت کرتی ہے کہ پاکستانی ادیب استعمار پرست قوتوں کے خلاف صف آرا ہو چکے ہیں۔ اور وہ عالمگیر انسانی قدروں کے بقا اور فروغ کے لئے دیگر ممالک کے ادیبوں کے دوش بدوش چل رہے ہیں۔

اس اجلاس میں ادیبوں کے حقوق کے سلسلے میں متعدد اہم فیصلے بھی کئے گئے۔ پاکستانی ادب اور ثقافت کی اندرون و بیرون پاکستان ترویج، اشاعت اور فروغ کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا گیا۔ اور اس کے علاوہ غیر ملکی ثقافت و ادب [illegible] کو پاکستانی زبانوں سے متعارف کرانے کے وسائل پر سنجیدگی سے غور کیا گیا۔

اجلاس میں مرکز اور حلقوں کی پیش کردہ رودادیں اگر ایک طرف اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ پاکستانی ادیب "ادارے" کو ادیبوں کی ایک تحریک سمجھنے لگے ہیں اور اس کی سرگرمیوں میں حصہ لے کر اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے متحد ہونے لگے ہیں تو دوسری طرف یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ "ادارے" کی وجہ سے پاکستان کے گوشے گوشے میں ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا آغاز ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ اس ضمن میں "ادارے" کا سب سے بڑا کارنامہ مختلف قومی اور علاقائی زبانوں اور تہذیبوں کو ہم آہنگ کرنا ہے۔ جس کے نتائج بہت دور رس ثابت ہوں گے۔

"ادارے" کی کاوشوں اور [illegible] کوششوں سے ناشرین کی [illegible] کا اعلان [illegible] کیا ہے۔

[illegible]

مالی امداد بھی مل گئی ہے اور وہ اُردو کو سائنس کی تعلیم کا ذریعہ بنانے کے لئے ایک ٹھوس پروگرام پر عمل کر رہی ہے اور اس کے تحت نمونے کی جماعتوں، مذاکروں اور مضمون نویسی کے مقابلوں کا اہتمام کیا جائے گا۔ اور سائنسی موضوعات پر کتابیں شائع کی جائیں گی۔

سابق وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی میاں افضل حسین نے جو اس تقریب کے صدر تھے۔ اکیڈمی کے پروگرام کو سراہا اور امید ظاہر کی کہ اُردو میں سائنس پڑھانے کے تجربات سے یہ پتہ چل جائے گا کہ اس سلسلے میں مشکلات کی صحیح نوعیت کیا ہے اور ان پر کیوں کر قابو پایا جاسکتا ہے

لیکچر :۔ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ طبیعات (فزکس) کے صدر ڈاکٹر عبدالبصیر پال نے "آواز" کے مسئلے پر لیکچر دیا اور آواز کی تخلیق، اس کی نوعیت، اور خصوصیات کا تفصیل سے تذکرہ کیا وہ اپنے لیکچر کی تشریح کے لئے متعدد سائنسی آلات بھی ساتھ لائے انھوں نے بلا تکان پون گھنٹے تک اُردو میں دلچسپ لیکچر دیا اور آلات کے ذریعے اپنے نکات کی وضاحت کرتے رہے آخر میں انہوں نے طلباء کے متعدد سوالوں کے جوابات بھی دیئے لیکچر سے قبل انہوں نے کہا کہ مجھے اُردو میں طبیعات پڑھانے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی بلکہ میں اس میں آسانی پاتا ہوں۔ آپ نے کہا مثال کے طور پر میرے موضوع سے متعلق ایک اصطلاح کیلئے انگریزی میں صرف ایک لفظ "وائی بریشن" ہے مگر اردو میں لرزنا، کانپنا، ارتعاش ایسے متعدد الفاظ بروئے کار لائے جاسکتے ہیں۔

اُردو کی فضیلت :۔ لیکچر کے اختتام پر مختلف کالجوں کے تین اساتذہ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ صدر شعبہ نباتات دیال سنگھ کالج ڈاکٹر رفیق احمد نے کہا کہ جماعتوں میں لیکچر دینے کے بعد جب اُستاد اپنے طلبا کو سوال کرنے کی دعوت دیتے ہیں، تو وہ خاموش بیٹھے رہتے ہیں لیکن آج مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ڈاکٹر پال کا لیکچر ختم ہوتے ہی سوالات کی ایک بوچھاڑ ہوئی۔ یہ اُردو کا فیض ہے۔ کیوں کہ طالب علم سوال اسی وقت پوچھتا ہے۔ جب اسے لیکچر سمجھ میں آیا ہو۔ ڈاکٹر رفیق نے کہا کہ ہم اپنے چند سائنس دانوں کی ذات پر فخر کرتے ہیں مگر اپنی قوم کو سائنس سے بے بہرہ پاکر شرم بھی آتی ہے۔ آپ نے کہا جب تک اُردو کو ذریعہ تعلیم نہیں بنایا جاتا سائنس کی تعلیم عام نہیں ہوگی۔ دیال سنگھ کالج کے شعبہ ریاضیات کے صدر پروفیسر [illegible] نے کہا کہ اُردو تحصیل علم کے راستے میں رکاوٹ نہیں ہے۔ اصطلاحات کا کوئی مسئلہ نہیں۔ البتہ نشانات کا مسئلہ ہے لیکن ہم سائنسی نشانات کو اس طرح قبول کریں گے جس طرح ٹریفک کے نشانات مغرب سے لئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ رومن رسم الخط اپنانے کے بعد اصطلاحات اور [illegible] بائیں سے دائیں کو لکھے جاتے ہیں۔ جذب کرنے میں دقت نہیں ہوگی۔ گورنمنٹ کالج کے پروفیسر ڈاکٹر حمید [illegible] تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ ہم فارسی رسم الخط [illegible] چلا سکتے ہیں۔ آپ نے کہا یورپ نے علم ہندسہ عربوں سے لیا لیکن اس سے لکھنے کے ہاتھ میں کوئی تبدیلی نہیں کی اکائی آج بھی دائیں ہاتھ کے پہلے ہندسے کو سمجھا [illegible] اصطلاحات کو قبول کرتے وقت اپنا ہاتھ کیوں بدلیں [illegible] عسکری نے مزید بتایا کہ اُردو میں ایک طالب علم کو دو سو الفاظ فی منٹ ہوتی ہے۔ جبکہ انگریزی میں اتنی الفاظ فی منٹ رہ جاتی ہے۔ آپ نے کہا کہ ہمارے معیار کی پستی کا سب سے بڑا سبب یہی ہے۔ کہ ہمارے ان طالب علموں کے مقابلے میں بہت کم پڑھتے ہیں [illegible] زبان ذریعہ تعلیم ہے۔

(امروز)

ایک تبصرہ

جب کبھی اُردو کو یونیورسٹی کی سطح پر تعلیم کا ذریعہ بنانے کا [illegible] میں سائنس نہیں پڑھائی جاسکتی، اُردو کے اکثر [illegible] سکتے ہیں اور [illegible]

اجاگر کرے۔ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ فزکس کے سربراہ
البصیر پال کا کہ انھوں نے نہ صرف اُردو کی لاج رکھ
ردو کے بہی خواہوں کو بھی احساسِ کمتری سے نجات
لی دور کی اہم ترین سائنس فزکس کے ایک پروفیسر کا
کے دقیق ترین موضوع "آواز" پر اُردو میں ایک طویل
س زبان کے عروج کی پہلی سیڑھی ثابت ہو۔
کومت پاکستان کی سرپرستی میں کام کرنے والی اردو
ے جس کی بنیاد ملک کے نامور سائنسداں ڈاکٹر بشیر احمد
رکھی تھی سینا ہال میں ڈاکٹر پال کے لیکچر کا اہتمام کیا
کے ایک کونے میں معروف سائنسداں اور انگریزی
جانے پہچانے علمبردار میاں افضل حسین تقریب کی کرسی
رہے تھے، پاس ہی لیکچرار کا منبر اور ایک تختۂ سیاہ
دوسری جانب زیرِ بحث موضوع سے متعلق بیش قیمت
ایک عارضی لیبارٹری قائم کی گئی تھی، ہال سائنس
بھرا ہوا تھا، جو یونیورسٹی کے تدریسی شعبوں اور مختلف
آئے تھے۔ مہمانوں میں سائنس کے معروف اساتذہ
کے اہلِ قلم موجود تھے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے اُردو دانو
تعارف کرایا، صاحب صدر نے سائنس کا ذریعہ
کی مشکلات کا ذکر کیا اور ڈاکٹر عبدالبصیر پال نے
چیلنج قبول کر کے ایک تجربہ گاہ کے ماحول میں "آواز"
لیکچر دینا شروع کر دیا۔ آواز، "وائی بریشن" سے
ہے، ڈاکٹر پال کو اس لفظ کا اُردو مترادف ڈھونڈنے
قت" پیش آئی، کیوں کہ وہاں لفظوں کی ایک قطار
وہ کہہ رہے تھے میری "دقت" اُردو کی لغوی مفلسی
ہیں بلکہ اس کی امارت اور وسعت کے سبب پیدا
گریزی کے ایک لفظ کے لئے اُردو میں چار لفظ
تھرتھرانا" اور ارتعاش موجود ہیں۔ آپ جس سے
م لیجئے۔
کٹر پال نے لیکچر میں مقامی رنگ بھرنے شروع کئے

کہ انگریزی زبان جن کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی، گونج (رزوننس)
کا اُصول سمجھانے کے لئے انھوں نے اپنے امرتسر والے تین
منزلہ مکان کا قصہ چھیڑ دیا، جس کے ایک دروازے کا چابک
ٹک ٹک بجنے لگا تھا۔ آواز کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے
انہوں نے گدھے کو تضحیک کا نشانہ بنایا اور اپنی لیبارٹری میں
تجربہ کر کے بتا دیا کہ اس بے ڈھنگے جانور کے گلے میں شکم تاروں
کی تعداد ارتعاش چونکہ تناسب کے لحاظ سے ہم آہنگ نہیں
ہوتی، اس لئے وہ بے سُری آوازیں نکالتا ہے، کہنے لگے اگر
کوئی اے سی کرنٹ کی ماہیت نہ سمجھتا ہو تو اس کے دونوں
گالوں پر باری باری تھپڑ ماریئے، ایک اِدھر اور ایک اُدھر،
دو منٹ میں سمجھ جائے گا۔ ڈی سی کرنٹ کا مطلب سمجھانے
کے لئے صرف ایک ہی گال پر مسلسل چند تھپڑ رسید کرنا کافی
ہوگا۔ آلاتِ صوت پر تجربات کرتے ہوئے ایک کا نام بڑے
غلام علی خاں اور دوسرے کا چھوٹے غلام علی خاں رکھ دیا گیا۔
ڈاکٹر پال کا دعویٰ تھا کہ جب تک ان دونوں کی تعداد ارتعاش
میں ایک معقول نسبت قائم ہے وہ بے سُرے نہیں ہو سکتے۔
ایک خشک موضوع پر اتنا دلچسپ لیکچر اُردو ہی میں
دیا جاسکتا تھا، لیکچر ختم ہوا تو استاد کو محسوس ہوا کہ وہ کسی
گونگی بہری جماعت کو نہیں پڑھا رہے تھے۔ چونکہ تمام طلبا
نے اُستاد کی تمام باتوں کو سمجھا اور ان پر غور کیا تھا، اس لئے
لیکچر ختم ہوتے ہی سوالات کی بوچھاڑ ہو گئی۔ بڑے بڑے
عالمانہ سوالات پوچھے جا رہے تھے۔ سائنس کے ایک اور
پروفیسر ڈاکٹر رفیق احمد نے اسے "اردو کا فیض" قرار دیا۔
وہ کہہ رہے تھے۔ ہم انگریزی میں لیکچر دینے کے بعد طلباء کو
سوال کرنے کی دعوت دیتے ہیں، تو وہ گم سُم بیٹھے رہتے ہیں۔
آج اُردو میں لیکچر سنا ہے اور اُردو میں سوال کرنے کی اجازت
ہے تو سب جاگ اُٹھے ہیں یہ بات بھی درست تھی۔ طلباء کو آج
لیکچر کو انگریزی میں سمجھنے اس پر اُردو میں غور کرنے اور پھر
سوال کرنے کے لئے اپنے خیال کا انگریزی ترجمہ کرنے کے حوصلہ

مشکل مراحل سے نہیں گزرنا پڑا تھا۔

ڈاکٹر پال نے تجربات کی دنیا میں تجربے کی ایک راہ کھول دی ہے۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ نے یہ کہہ کر اُردو کے بہی خواہ کی ترجمانی کی ہے کہ اب تک بغیر آزمائش کے اُردو کو رد کیا جاتا تھا۔ اب اُسے سائنس کی اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنانے کا تجربہ شروع ہوا ہے اگر یہ تجربہ ناکام ہوگیا تو ہم کبھی اُردو کا نام نہیں لیں گے۔ اور ابتدا چاہتی ہے کہ یہ تجربہ ناکام ہو سکتا تجربات کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اور اس میں سلیم الزماں، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر عبد الغنی ا[illegible] نذیر احمد اور ڈاکٹر شمیع چودھری ایسے بلند پایہ سا[illegible] حصہ لیں گے۔

(تلخیص — امروز)

اِدارۂ مصنفین پاکستان (حلقہ کراچی) کی پندرہ روزہ

اَدبی نشستیں

۱۔ ۳ / مارچ ۱۹۶۱ء (جمعہ)

صدر .. .. حفیظ ہوشیارپوری

ڈرامہ	آغا ناصر
نظم	قمر جمیل
افسانہ	ضیاء الحسن موسوی

۲۔ ۱۳ / مارچ ۱۹۶۱ء (جمعہ)

صدر .. .. ممتاز حسن

عنوان مباحثہ : اُردو شاعری میری نظر میں

حصہ لینے والے : ممتاز حسین ۔ مجتبیٰ حسین
حفیظ ہوشیارپوری
عزیز حامد مدنی ۔ جمیل جالبی
ضیا جالندھری

نشستوں میں شرکت کی عام اجازت ہے۔
مقام ہوٹل ایجلیر۔ صدر ۔ ۴½ بجے شام

(ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر : طفیل احمد جمالی .. .. مطبع انٹرنیشنل پریس ۔ کراچی)

اختر انصاری دہلوی

اُردو ناول کا آغاز اور ابتدائی نشو و نما

(نذیر احمد سے رسوا تک)

اُردو ناول نے ایک باقاعدہ صنف ادب کی حیثیت سے انیسویں صدی کے نصف آخر میں جنم لیا۔ ادوارِ ماقبل، خصوصاً انیسویں صدی کے نصف اول میں قصے کہانیوں کی بے شمار کتابیں متعدد اور متنوع افسانوی اسالیب کے تحت اردو میں لکھی گئیں۔ مگر ناول کی مخصوص ٹکنیک ان میں سے کسی ایک میں بھی نہیں پائی جاتی، اور اس کا پایا جانا ممکن بھی نہیں تھا۔ اس لئے کہ اُردو میں ناول کی ٹکنیک یکسر انگریزی ادب کے اثرات کی مرہون منت ہے، اور انگریزی ادب کے اثرات ۱۸۵۷ء کے بعد ہی ہمارے ادب پر پڑنے شروع ہوئے۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان سے انگریزوں کا تعلق جتنا پرانا ہے، ہندوستانی ادب پر انگریزی ادب کا اثر اتنا پرانا نہیں ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا پورا دور ہندوستانی سماج اور سیاست کے لئے جس انتشار، اضطراب، کشاکش، تذبذب، بے اطمینانی اور ابتری کا زمانہ تھا، اس کے ہوتے ہوئے مغرب کے ذہنی و فکری اثرات بہت دُور رس ثابت نہیں ہو سکتے تھے۔ اور ذوقی و وجدانی عوامل کی کارفرمائی تو ان حالات میں ممکن ہی نہیں تھی۔ البتہ سن ستاون کے بعد ہندوستانی عزائم کی مکمل شکست اور برطانوی تسلط کے مستحکم قیام کے ساتھ جو حالات رونما ہوئے، وہ تہذیبی و ثقافتی کارگزاریوں کے لئے ضرور موافق و سازگار رہے۔ ان حالات میں جو ذہنی فراغت اور دماغی سکون لوگوں کو میسر آیا وہ دراصل سیاسی مغلوبیت اور سیاسی بے بسی کا نتیجہ یا اس کا دوسرا روپ تھا۔ لیکن اس کو کیا کیجئے اسی عملی بے دست و پائی کے ماحول میں فکری و تصوری اور ادبی تحریکوں کو جنم لینے اور پروان چڑھنے کا موقع ملا۔ یہ اسی دور میں برطانوی حکومت کے ساتھ مغربی تہذیب و تمدن شعر و ادب اور علم و حکمت کے اثرات بھی زیادہ منظم طور پر ہندوستان میں داخل ہوئے اور برگ و بار لائے۔ آزاد سرسید اور حالی کی شعوری کوششوں سے اُردو ادب نے مغربی ادب کے موضوعات اور اسالیب کو اپنے دامن میں جگہ دی۔ اور اُن جدید رجحانات میں جو اس طرح اُردو نظم و نثر پر اثر انداز ہوئے ناول نگاری کا رجحان بہت اہمیت کا حامل تھا۔

صنفِ ناول کا جائزہ لینے سے قبل اس سوال پر غور کرنا شاید نامناسب نہ ہو کہ اردو زبان کے نثری ادب میں ناول کی پیدائش سے پہلے وہ کون سے ایسے عناصر تھے۔۔۔ جن کی موجودگی نے ناول کے آغاز و ارتقاء کے لئے راستہ صاف کیا۔ اس سلسلے میں بعض نقادوں نے سرور کی فسانۂ عجائب اور محمد حسین آزاد کی آبِ حیات کا ذکر کیا ہے۔ فسانۂ عجائب قدیم داستانوں کے سلسلے کی ایک کڑی ہے، اور زبان و انداز واقعات، ذہنیت، ماحول اور طرزِ قصہ گوئی کے لحاظ سے قدیم داستانوں ہی کے انداز کی چیز ہے۔ لیکن جس طرح میر امن کی

بھاراپنی باغیانہ، مجددانہ، اور تازہ کار روشِ زبان کی بنا پر
دو کی تمام قدیم داستانوں سے الگ اور ممتاز ہو جاتی ہے،
ارح فسانۂ عجائب بھی بعض ایسے عناصر کی شمولیت کے باعث
اصل ناول کی ٹکنیک کے اہم اجزا ہیں، اُردو کے قدیم
الی ادب میں ایک منفرد کارنامہ قرار پاتی ہے۔ کردار
ی، ماحول کی مصوری، اور مقامی رنگ کی عکاسی ناول
اص اجزائے ترکیبی ہیں، اور اُردو کی افسانوی دنیا میں
یز ہیں (ابتدائی، ناپختہ اور نامکمل شکل ہی میں سہی)
، سے پہلے ہمیں فسانۂ عجائب ہی میں ملتی ہیں۔ یوں فسانۂ عجائب
، پیشرو کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے، اور قدیم طلسماتی قصوں
. جدید اُردو ناولوں کے درمیان کی کڑی قرار پاتی ہے۔ آزاد
آبِ حیات افسانوی دنیا کی چیز نہیں (سوا اس کے کہ اس
جگہ جگہ تاریخی صداقت کا جو فقدان پایا جاتا ہے۔ یا افسانہ
زی یا ادبی گپ بازی کی جو مثالیں ملتی ہیں۔ ان کی بنا پر
ئی طنزاً اُسے ایسا کہے۔) یہ ادبی تاریخ و تنقید کے باب میں
ے اہم کارنامہ ہے۔ لیکن آزاد نے شعرا کی شخصیت نگاری اور
دار نگاری کچھ اس طور سے کی ہے کہ حقیقی افسانہ نگاری کے
ں عناصر خود بخود جھلک اُٹھے ہیں۔ آبِ حیات کے شخصی و
اتی مرقعوں میں اشخاص کے ساتھ ان کا ماحول، اُن کی معاشرت
کی رفتار و گفتار، اور ان کی چال ڈھال ایک جیتے جاگتے
بعیت بداماں انداز میں ہماری نظروں کے سامنے آجاتی
ے۔ یہ آزاد کے تصور زا الفاظ کا سحر ہے، اور اس خصوصیت
، آبِ حیات کے ساتھ ان کی دوسری تصانیف مثلاً نیرنگِ
ال، قصصِ ہند اور دربارِ اکبری بھی پورے طور پر شریک
۔ ہمارے بعض مبصروں کا کہنا ہے کہ آزاد کے ان سب
رناموں نے اپنے متذکرہ اوصاف کی بنا پر اُردو کی جدید
ل نگاری کو متاثر کیا اور بہتر اور کامیاب تر ناولوں
لئے زمین ہموار کی۔

اُردو کے اولین ناول نگاروں میں سب سے پہلے مولوی
نذیر احمد کا نام آتا ہے۔ یہی اُردو کے پہلے باقاعدہ ناول نگار
ہیں بعض لوگ ناول کی ابتدا کا سہرا سرشار کے سر باندھتے
ہیں۔ جو غالبًا صحیح نہیں، کیونکہ فسانۂ آزاد دسمبر ۱۸۷۸ء سے
اودھ اخبار میں بالاقساط شائع ہونا شروع ہوا، اور ۱۸۸۰ء
میں کتاب کی شکل میں چھپا۔ اور اُدھر نذیر احمد کا پہلا ناول
مراۃ العروس فسانۂ آزاد سے دس برس پہلے یعنی ۱۸۶۹ء
شائع ہو چکا تھا، اور غالبًا اس سے بھی کئی سال قبل لکھا
گیا ہوگا۔ ان کا دوسرا ناول بنات النعش بھی سرشار کے
فسانے سے پہلے یعنی ۱۸۷۳ء میں شائع ہوا۔ ممکن ہے کہ بعض
لوگ سرشار کے فسانے کو اُردو کا پہلا ناول اس لئے قرار دیتے
ہوں کہ نذیر احمد کے ناولوں میں اصلاح، تبلیغ، افادیت
اور مقصد کا عنصر بہت نمایاں ہے، اور اس کے برعکس
فسانۂ آزاد میں افسانوی دلچسپی کا عنصر ہمیشہ غالب رہتا ہے۔
مگر اس تنقید کے جائز و صحیح ہونے کے باوجود نذیر احمد کے
ناول حقیقی ناول ہیں، اور از بسکہ زمانے کے لحاظ سے اُن
کو فسانۂ آزاد پر تقدم حاصل ہے اس لئے لامحالہ نذیر احمد
ہی اردو کے پہلے ناول نگار قرار پاتے ہیں۔ نذیر احمد کے
ناولوں میں مراۃ العروس (۱۸۶۹ء) بنات النعش (۱۸۷۳ء)
توبۃ النصوح (۱۸۷۷ء)، فسانۂ مبتلا (۱۸۸۵ء)، اور ابن الوقت
(۱۸۸۸ء) زیادہ مشہور ہیں، اور ان میں توبۃ النصوح اور
فسانۂ مبتلا فنی حیثیت سے باقی دوسرے ناولوں پر فوقیت
رکھتے ہیں۔

نذیر احمد کے ناولوں کی اہمیت اس امر میں ہے کہ مصنف براہ راست
زندگی سے مواد حاصل کرتا ہے اور اسکی زبان صحیح معنوں میں افسانہ نگار کی زبان ہے یعنی
ٹھیٹھ ٹکسالی محاورہ پر مبنی، کہیں کہیں شوخی و ظرافت سے
مزین اور اکثر مقامات پر زندہ دلی و خوش طبعی سے مملو —
پھر یہ کہ مولوی صاحب نے قدیم داستانوں اور افسانوں کی عام
اور مشترک خصوصیت یعنی فوق الفطرت عناصر کی کارفرمائی سے

پنے ناولوں کو بالکل محفوظ رکھا' اور یوں اُردو ناول پہلی بار نعت
طریت اور حقیقت نگاری سے ہم کنار ہوا۔ اُن کے ناولوں
ں بعض نمایاں خوبیوں کے ساتھ کچھ واضح عیوب بھی نظر آتے
ں۔ پلاٹ اور قصہ پن کی کمی ان کے یہاں اکثر محسوس ہوتی
ے' جس کو وہ خطابت، واعظانہ تلقین اور عالمانہ بحث آرائی
ے پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے عقائد اور زاویہ
ے فکر، ایک خفیف سے اصلاحی رجحان کے سوا کوئی حقیقی ترقی
ندانہ عناصر اپنے اندر نہیں رکھتے، اور اُس زمانہ کے ذہنی
رسماجی تعصبات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ کردار نگاری میں
ی وہ بہت زیادہ کامیاب نہیں ہیں ان کے بیشتر کردار
ثالی ہیں جو فرضی مقاصد کی روشنی میں زبردستی گھڑے گئے
ں اور اسی لئے واقعیت و اصلیت سے ہٹے ہوئے معلوم ہوتے
ہیں لیکن زندگی پر مصنف کی گرفت اتنی مضبوط ہے، اس کا
مطالعہ اتنا وسیع ہے، اس کا مشاہدہ اتنا عمیق، اور جزئیات
تفصیلات سے اس کی واقفیت اتنی مکمل ہے کہ مثالیت
ے باوجود حقیقت اپنا رنگ جمائے بغیر نہیں رہتی اور بعض کردار مثلاً
روح، کلیم اور مبتلا فی الحقیقت بہت جاندار ہیں نذیر احمد کے ناولوں کا
سب سے نمایاں نقص مقصدیت کا اُبھار ہے۔ تدریسی انداز ہر جگہ غالب
رہتا ہے۔ خطابت اور وعظ و تلقین کی زیادتی صناعی اور
فنکاری کو اُبھرنے کا موقع نہیں دیتی۔ تبلیغی مقصد کا شعور
ی شعور پر حاوی رہتا ہے۔ مذکورہ خامیوں کے باوجود
ذیر احمد کے ناول نہ صرف اپنی صنف بلکہ جدید اُردو نثر
، نہایت اہم کارنامے ہیں اور غیر معمولی وزن و وقار
، حامل ہیں۔

نذیر احمد کی ناول نگاری کا سلسلہ دہلی میں جاری رہتا
، مگر اس کے ساتھ ساتھ لکھنؤ میں بھی ناول نگاری کے ذوق
ابتدا ہوتی ہے' اور اپنی ابتدائی منزل میں یہ ذوق حلقہ
دھ پنچ کی ادبی سرگرمیوں میں پروان چڑھتا ہے۔ اودھ
(۱۸۷۷ء) میں نکلنا شروع ہوا۔ اس کے خاص لکھنے
ں مرزا سجاد حسین [illegible]

جوالا پرشاد برق، تربھون ناتھ ہجر، عبدالغفور شہباز، م
مچھو بیگ ستم ظریف، احمد علی کسمنڈوی، احمد علی شوق او
اکبر الہ آبادی تھے۔ ان میں سے سجاد حسین، سید محمد آزاد او
جوالا پرشاد برق نے ناول نگاری کی طرف بھی توجہ کی۔ سجاد
کے قلم سے متعدد ناول نکلے، جن میں حاجی بغلو
احمق الذین۔ طرحدار لونڈی، میٹھی چھری اور کایا پلٹ
کے نام یہاں لئے جاسکتے ہیں۔ نواب سید محمد آزاد کا نوا
دربار بہت مشہور ہوا' جس میں رئیسوں اور نواب زادو
کی عیش پرستی اور بدقوارگی کو ظریفانہ پیرائے میں پیش
کیا گیا ہے۔ جوالا پرشاد برق نے شیکسپیر کے متعدد ڈر
اور بنکم چندر کے کئی بنگالی ناولوں کو اُردو کا جامہ پہنایا۔
کے اچھے اور کامیاب ترجموں میں معشوقۂ فرنگ اور مار
کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔

جہاں تک ہیئت اور تشکیل کا تعلق ہے' یہ ناول ن
کے ناولوں پر فوقیت نہیں رکھتے، گو ان میں تلقین و وع
وہ جنوں نہیں ہے جس نے نذیر احمد کے ناولوں کی فن
حیثیت کو صدمہ پہنچایا۔ مجموعی حیثیت سے یہ اُس معیار ا
وزن و وقار کی چیز نہیں ہیں جو نذیر احمد کے ناولو
حصہ ہے!

اُردو ناول کے اودھ پنچی دور کے اہم ترین مصن
رتن ناتھ سرشار ہیں۔ یہ حلقہ اودھ پنچ کے رکن تھے بھی
نہیں بھی تھے۔ اکثر نقادوں نے ان کو اودھ پنچ کے انمو
رتنوں میں شمار کیا ہے۔ لیکن ایسا کرنا صرف ایک حد تک
درست ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جب ۱۸۷۷ء میں اودھ پنچ شا
ہونا شروع ہوا تو سرشار بھی اس کے لکھنے والوں میں شا
تھے۔ لیکن جب ۱۸۷۸ء میں وہ اودھ اخبار کے ایڈیٹر م
ہوئے تو یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔ یا برائے نام رہ گیا۔ پھر کچھ
مدت اور گزر جانے کے بعد تو تعلقات واقعی خراب ہوگئے
اور باہمی تلخیوں کے ساتھ ادبی معرکہ آرائیاں شروع ہوگئیں
[illegible]

یں حلقۂ اودھ پنچ کے رکن تھے، لیکن جلد ہی وہ اِس
سلسلے سے کٹ گئے، اور یہ کہ ان کا گراں قدر ادبی کارنامہ

انۂ آزاد لکھنؤ کے اودھ پنچی دور کی پیداوار ضرور ہے، مگر
پانہ کارنامہ نہیں ہے۔ یا شاید ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ سرشا
تھا اودھ پنچ کے ہم عصر ادیب تھے اور فسانۂ آزاد اودھ پنچ
اہم عصری کارنامہ ہے۔

سرشار نے چھوٹے بڑے کئی ناول لکھے۔ مثلاً سیر کوہسار
نگے سیار، طوفان بدتمیزی، بچھڑی دلہن، کامنی اور کڑم دھم
یکن جو خوبیاں فسانۂ آزاد میں جمع ہو گئیں اور سرشار کی حیرت
نگیز صلاحیتوں کو جس طرح اس طویل ڈھیلے ڈھالے قصہ میں
ظاہر ہونے کا موقع ملا وہ بات کسی دوسرے ناول میں پیدا
نہ ہو سکی۔ فسانۂ آزاد ایک عظیم کارنامہ ہے۔ اس کو محض
سرشار کی شاہکار تصنیف خیال کرنا کافی نہیں ہوگا۔ دراصل
یہ اُردو نثر کا شاہکار ہے۔ بلکہ پورے اُردو ادب کی شاہکا
تخلیقات میں شمار کیے جانے کے قابل ہے۔ اس کی لائق ذکر
خصوصیات بے شمار ہیں۔ غیر معمولی حجم بے اندازہ پھیلاؤ،
نہایت درجہ وسیع کینوس، لاتعداد طبقوں کی نقشہ کشی، بے شمار
انسانوں کی ہمدردانہ ترجمانی، انسانی زندگی کے ہزاروں
پہلوؤں اور انسانی فطرت کے لاکھوں خصائص کی عکاسی،
مزاحیہ کردار نگاری، مسلسل شگفتگی، خوش طبعی اور زندہ دلی،
کہیں لطیف بذلہ سنجی اور کہیں نری قہقہہ آفرینی —— یہ اور
ایسی کتنی ہی منفرد خصوصیات ہیں جن کی بنا پر یہ ناول ایک
دیو قامت ادیب کا عظیم الہیئت اور عظیم القدر کارنامہ قرار
پاتا ہے۔ اُردو کی دنیائے اَدب میں اس وزن و وقار
کی تصانیف انگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں۔

مشرقی ادب میں فسانۂ آزاد کا وہی مقام ہے جو یورپ
کے ادب میں ہسپانوی ادیب سروِنٹیز کے ناول ڈان کوئکزو
کو حاصل ہے۔ دونوں عظیم کارنامے ہیں۔ دونوں طنزیہ اور
مزاحیہ اسلوب پر مبنی ہیں۔ دونوں مزاحیہ کردار نگاری کے
مثالی نمونے پیش کرتے ہیں۔ جس طرح ڈان کوئکزو یورپ

کا پہلا عظیم ناول ہونے کے ساتھ ساتھ کئی سو سال کی یور
زندگی پر ایک شدید اور تیکھے طنز کی حیثیت رکھتا ہے، اسی
فسانۂ آزاد بھی اُردو کا پہلا عظیم ناول ہے، اور ہندوستا
میں قرونِ وسطیٰ کے تہذیبی اور تمدنی باقیات پر ای
بے محابا طنز ہے۔ پھر دونوں میں کچھ ایسے عناصر بھی ہ
جو انسان کی خلقی کمزوریوں اور نفس انسانی کی دا
بوالعجبیوں کے اشارے اور علامتیں ہیں۔ اگر سروِنٹیز
نے ڈان کوئکزو اور سانکو پینزا کو بعض عام مضحک
اوصاف کے نمونے بنا کر پیش کیا ہے، تو سرشار نے
ایک اتنا ہی جاندار اور غیر فانی کردار خوجی تخلیق کیا ہے
انسانی فطرت کے گہرے مطالعے اور تفہیم پر مبنی ہے ا
نفسِ انسانی کے بعض اساسی عوامل کی نمائندگی کرتا ہے

فسانۂ آزاد کے ان اوصاف میں جو پڑھنے والے
توجہ کو فوراً جذب کرتے ہیں اس کے مصنف کی حیرت انگ
قادر البیانی کا ذکر سب سے پہلے آتا ہے۔ سرشار زبا
اور محاورۂ زبان پر غیر معمولی قدرت رکھتے ہیں۔ بیان ا
اظہار کے مختلف اسالیب سے ان کی واقفیت بے مثال
اُن کی زبان ٹکسالی زبان ہے، اور انیسویں صدی کے نص
آخر میں اُردو کے جو مختلف روپ اور پیرایہ ہائے بیا
لکھنوی سماج کے مختلف طبقوں میں رائج تھے ان کے ست
میں انھوں نے عجیب و غریب مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ ل
لکھنؤ یا اودھ کے ہر طبقے کا روزمرہ ہمیں فسانۂ آزاد
ملتا ہے۔ اور یہ ہندو مصنف مسلمان بیگمات اور پردہ
خواتین کے محاورہ و روزمرہ کو جس سہولت اور عمدگی۔
پیش کرتا ہے وہ اس کی قادر البیانی کا سب سے بڑا ثبو
ہے۔ (یہاں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ
نے جو بیگماتی زبان لکھی ہے وہ واقعی بیگماتی زبان۔
یا جیسا کہ ان کے اودھ پنچی مخالفین کا کہنا تھا، محض مغلانی
ماماؤں اور پیشہ ور خدمتوں کی زبان ہے۔) یہ صلاحیت
کوئی معمولی صلاحیت نہیں ہے، نہ یہ کوئی ایسی چیز۔

ہر شخص کتب یا مدرسے کی تعلیم یا کتابوں کے مطالعے سے
مل کر سکتا ہو۔ اس کے لئے بڑی قلبی وسعت، ذہنی توانائی
مزاج جو صلگی درکار ہوتی ہے۔ انسانی زندگی سے گہری
یا اور خود انسانوں سے گہری اور پُر خلوص محبت کے بغیر اس
بت کا پیدا ہونا ناممکنات سے ہے۔

یہ تو ہوئی سرشار کے اسلوب کی وسعت دامانی، پہلو
ں اور جامعیت۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کا یہ امتیازی
ن بھی قابل ذکر ہے کہ اس میں ایک غیر معمولی تیزی، پھرتی،
ؤ اور بہاؤ کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ وہ جو تنقید کی
ں میں نثر یا اسلوب نثر کے لئے رواں دواں کی صفت
ال کی جاتی ہے، سرشار کی تحریر اس کی بہترین مثال
وہ در حقیقت اتنی رواں دواں زبان لکھتے ہیں کہ
صفحۂ قرطاس پر دوڑتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔
ڑھنے والا بھی خود کو ہانپتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ غرضکہ
ار کا اسلوب بے پناہ زندگی اور بے اندازہ توانائی
ا ہے۔

فسانۂ آزاد کے اہم ترین اور نمایاں ترین اوصاف
لی چیز کردار نگاری ہے۔ سرشار کو اس فن میں بڑی
ہ حاصل تھی۔ انہوں نے سینکڑوں مختلف اور متنوع
اپنے ناول میں خلق کئے ہیں اور ہر کردار کو ایک
در جیتے جاگتے انسان کا روپ عطا کر کے اپنے ساحرانہ
کے پیکر میں غیر فانی بنا دیا ہے۔ فسانۂ آزاد میں ہم
ں کے ایک گھنے جنگل اور انسانی فطرتوں کے ایک
ں سمندر سے دوچار ہوتے ہیں۔ اور کردار نگاری اتنی
اور کامیاب ہے کہ ہر شخص اپنے مخصوص اوصاف
پر صفات اور دوسروں سے الگ پہچانا جاتا ہے۔
س زندۂ جاوید نقش بن کر قاری کے حافظے میں
ما ہو جاتا ہے۔ ٹالسٹائے کا شہرہ آفاق ناول
ینڈ پیس کرداروں کی کثیر تعداد کے لحاظ سے مغربی

ادب میں شاید اپنا جواب نہیں رکھتا۔ پھر یہ امر خاصا حیرتناک
ہے کہ فسانۂ آزاد کے کردار تعداد میں وار اینڈ پیس
کے کرداروں سے اگر زیادہ نہیں تو کچھ کم بھی نہیں ہیں۔
سچ یہ ہے کہ کرداروں کی پیدائش اور تشکیل کے معاملے
میں دنیا کے کم مصنف سرشار کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ کرداروں
کی اس بہتات کا نتیجہ یہ ہے کہ ناول میں ہر جگہ انسانوں
کا ایک جم غفیر نظر آتا ہے، ایک انبوہ، ایک ہجوم،
ایک مجمع جو مختلف، متنوع اور متفرق انسانوں پر مشتمل
ہوتا ہے۔ انسانی مجموں سے یہ دلچسپی، مجموں میں کھو جانے
اور ڈوب جانے کی یہ صلاحیت، افراد، ہجوم کو صحت، صفائی
اور باریکی کے ساتھ دیکھنے کی یہ قدرت، انسانی اجسام کو چیر کر
انبوہ انسانی کے پار ہو جانے والی یہ نظر، اور ہر رنگ، ہر قماش،
ہر مرتبے اور ہر طبقے کے اشخاص کے ساتھ یکساں ہمدردی کا
یہ رویہ — یہ سرشار کے ذہن کے امتیازی اوصاف ہیں۔
اور وہ ذہن جو ان اوصاف کا مالک ہو یقیناً کوئی معمولی ذہن
نہیں ہو سکتا۔ بلاشبہ سرشار غیر معمولی اور بدرجۂ غایت منفرد
ذہنی خصوصیات کے آدمی تھے۔ ان کے دل و دماغ کی بڑائی
کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں!

اسی ضمن میں مزاحیہ کردار نگاری کا ذکر بھی آجاتا ہے۔
اگر سرشار کردار نگاری میں غیر معمولی دستگاہ رکھتے ہیں تو
مزاحیہ کردار نگاری کے فن میں وہ لاثانی ہیں۔ مزاحیہ کردار
نگاری یا کرداری مزاح کی تخلیق دراصل مغربی مصنفین کا فن
ہے، جنھوں نے اپنے ناولوں، ڈراموں اور انشائیوں میں
غیر فانی مزاحیہ کردار خلق کئے ہیں۔ اُن میں سروانٹیز کے
ڈان کوئگزوٹ، شیکسپیر کے فالسٹاف اور ڈکنس کے پکوک کو
عالمگیر شہرت کا شرف حاصل ہے۔ اُردو ادب میں سرشار سے
پہلے اس کی دو ایک مثالیں عمرو عیار اور مرزا ظاہر بیگ کی
شکل میں ملتی ہیں اور بس! سرشار ہمارے یہاں صحیح معنوں
میں مزاحیہ کردار نگاری کے بانی اور موجد ہیں — اور خاتم

بھی، کیونکہ خوجی کے بعد اردو ادب کوئی دوسرا مزاحیہ کردار جو
اتنا ہی جاندار، اتنا ہی نکیلا، اتنا ہی جامع اور اتنا ہی معنی خیز
ہو، پیدا کرنے سے قاصر رہا ہے۔ اُردو افسانہ و ناول کی
گزشتہ ستر سال کی تاریخ ممکن ہے اپنے دامن میں بعض
مزاحیہ کردار بھی رکھتی ہو، مثلاً سجاد حسین کے حاجی بغلول،
ایم اسلم کے مرزا جی اور امتیاز علی تاج کے چچا چھکن۔ لیکن
سرشار کا خوجی اپنی تمام کوتاہیوں کے باوجود اُردو میں ابتک
مزاحیہ کردار نگاری کی بہترین مثال ہے۔ فنی نقطۂ نظر سے
سرشار نے اس تخلیق کے سرانجام کرنے میں کم و بیش وہی
کامیابی حاصل کی ہے جو مذکورۂ بالا مغربی مصنفین کا طرۂ
امتیاز رہی ہے۔ مشرق کے اُدب میں طلسم ہوش ربا کے
عمرو عیار کے علاوہ کوئی دوسرا مزاحیہ کردار ایسا نہیں ہے
جس کو اس ضمن میں قابل ذکر بھی خیال کیا جا سکے۔

فسانۂ آزاد کا طنزیہ و ظریفانہ پیرایہ بھی اس کے
اہم ترین پہلوؤں میں ہے۔ اس سلسلے میں تنقید کا فرض
یہ ہے کہ سرشار کی ظرافت کا سرچشمہ دریافت کیا جائے
اُس کی سماجی بنیادوں کا کھوج لگایا جائے، اور اس کے
تہذیبی محرکات کو بے نقاب کر کے ان کی نوعیت کو اچھی طرح
سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ ظاہر ہے کہ ظرافت براہ راست
زندگی کے بطن سے پیدا ہوتی ہے۔ اور ظرافت نگار اپنے
اردگرد کے مادی حالات، فکری اسالیب، ذوقی رجحانات
اور عملی مشاغل سے اپنی ظرافت کا مواد حاصل کرتا ہے۔
زندگی، زمانہ، سماج، ماحول، عقائد و اقدار اور اشخاص و
شخصیات میں جو ناہمواریاں، بوالعجبیاں، بے اعتدالیاں،
تضادات اور تناقضات پائے جاتے ہیں وہی ظرافت نگار
کے ذہن میں شوخی و بذلہ سنجی اور ہجو و طنز کے ہیولے بن جاتے
ہیں۔ تو پھر سوال یہ ہے کہ وہ کون سا مخصوص ماحول تھا اور
اس ماحول کی وہ کیا مخصوص نوعیت تھی جس کے بطن سے سرشار
کی ظرافت نے جنم لیا۔

یہ تو ظاہر ہے کہ فسانۂ آزاد کا سماجی پس منظر انیسویں
صدی کا زوال پذیر اور انحطاط زدہ لکھنوی تمدن ہے۔
سرشار نے اپنے ناول میں اسی مخصوص تمدن کے بعض
اور جاذب نظر پہلوؤں کو پیش کیا ہے، اور اسی تمدن
معاشرے کے بعض انوکھے، دلچسپ اور مضحک اُوضاع
اطوار اور اُوصاف و خصوصیات کی مصوری کی ہے
سے ان کا مقصد محفل آرائی بھی ہے، تضحیک بھی اور
انگیزی بھی۔ مگر غور طلب بات دراصل یہ ہے کہ یہ مخصوص
جس کو سرشار نے اپنا موضوع بنایا۔ کیوں، کس بنا پر
کن معنوں میں مضحکہ خیز تھا۔ اس کی یہ بوالعجبیاں کہاں
آئیں۔ اس کی ناہمواریوں کی تہہ میں کون سے اسباب
تھے؛ اس میں ظریفانہ حس کو متحرک کرنے کی جو صلا
تھی وہ کن عوامل کا نتیجہ تھی؛

قاعدہ ہے کہ جب سماج کا بنیادی ڈھانچہ بد
یعنی ذرائع پیداوار میں ترقی ہوتی ہے، دولت آ
کے طریقے بدلتے ہیں اور دولت کی تقسیم نئے اندا
ہوتی ہے تو زندگی کے تمام شعبوں میں اہم تبدیلیا
ہوتی ہیں۔ اقتصادی طبقات کی از سر نو تشکیل ہو
سماجی تعلقات کی نوعیت بدلتی ہے۔ رہن سہن، م
تمدن، اخلاق، غرضکہ زندگی کا ہر شعبہ متغیر ہو جاتا۔
پیرہن کے ساتھ زندگی کا داخلی پیرہن بھی تبدیل ہ
یعنی خیالات، تصورات، عقائد، اقدار اور نقطہ ن
میں بھی انقلاب آتا ہے۔ اب اگر اس ہمہ گیر تاریخ
کے دور میں سماج کا کوئی طبقہ بدلنے سے انکار کرے
کا کارواں اسے پیچھے چھوڑ کر خود آگے بڑھ جاتا۔
کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ طبقہ جمود، قدامت پرستی
پسندی، زوال اور پستی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس
میں، مشاغل و معمولات میں، آداب و اخلاق میں
ورواج میں، میکانکیت اور کھوکھلے پن کے آثار

ے گئے ہیں۔ اعلیٰ مقاصد مفقود ہو جاتے ہیں، تعمیری عزائم ختم
جاتے ہیں، اصلاح و ترمیم کا جذبہ خیرباد کہہ جاتا ہے۔ مجددانہ
فکر، سعی و کاوش، حرکت و نمو، صلابت و حرارت، اور
راب والتہاب کی صلاحیتیں اور کیفیتیں باقی نہیں رہتیں۔
ن زبونیٔ ہمت، مجہولیت، جھوٹی طمانیت، بے بسی اور بے
ی وبالی کی حکمرانی دکھائی دیتی ہے۔ اس سلسلے میں اہم بات
ہ کہ اس طبقے کو اپنی پس ماندگی، نالائقی اور بد توفیقی کا اگر
علم نہیں تو ایک غیر شعوری احساس ضرور ہوتا ہے۔ پھر بسا
ت نکمے پن کے اس احساس کو دبانے کے لئے اس طبقے کے
عیش پرستی اور بوالہوسی کے ہنگاموں میں غرق ہو جاتے ہیں
پنے اوقات کو راگ رنگ، ہوحق اور نمائش و زیبائش
، کر دیتے ہیں۔ سرشار نے اپنے ناول میں اسی نوع کے
طبقے کی عکاسی کی ہے۔ یہ وہ جاگیردار طبقہ تھا جو سلطنت
کے خاتمے تک اودھ میں برسر اقتدار تھا، اور اب ایک
ے ہوئے تاریخی دور کے باقیات کی حیثیت رکھتا تھا۔
اپنے زمانے کی تاریخی قوتوں سے ہم آہنگ نہیں تھا۔
ی حکومت، نئی تجارت، نئی صنعت و حرفت، نیا نظم و
راتے ہیں، جن دقیانوسی خیالات اور رسوم مذموم کو ہدف
ناتے ہیں ان سے کسی نہ کسی حد تک محبت بھی کرتے ہیں وہ
نوں میں ان کی تخریب کی در پے یا ان کی شکست و ریخت
اہاں نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے زمانے کے تمدن پر جو
انھوں نے کی ہے اس میں وثوق، پختگی اور فیصلہ کن
کی کمی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کی ظرافت بہت کم
ازونادر ہی طنز کی حدوں کو چھوتی ہے۔ اگر ان کی تحریر
ـــــ طنز ملتا بھی ہے تو شدت، تندی اور گہرے اثر
لی ہوتا ہے۔ فکری عنصر اور گہرے عمرانی شعور کی کمی کے
ان کے یہاں سطحی قہقہے بہت ہیں، اور دور رس عمیق
ت بھری ظرافت یا طنز بہت کم۔
فسانہ آزاد ایک عظیم الہیئت کارنامہ ہے اور جس

طرح اس کے محاسن اوصاف پڑھنے والوں کے ذہن پر چھا جاتے
ہیں، اسی طرح اس کے کمزور پہلو نمایاں اور وزنی نظر آتے
ہیں۔ ان کمزور پہلوؤں میں تشکیل اور ہیئت کا پہلو سب سے
نمایاں ہے۔ فسانۂ آزاد ایک طویل قصہ ہے، اتنا طویل کہ مصنف
اسے سنبھال نہیں سکا اور وہ غیر مربوط، غیر مسلسل اور ڈھیلا
ڈھالا ہو کر رہ گیا ہے۔ پلاٹ میں اتحاد، ہم آہنگی، گٹھن اور
چستی نہیں ہے۔ انتشار اور پراگندگی ہر جگہ ملتی ہے۔ معلوم
ہوتا ہے کہ سرشار نے لکھنے سے پہلے پلاٹ کی تفصیلات پر
غور نہیں کیا تھا اور واقعات کے اتار چڑھاؤ کا کوئی نقشہ
اپنے ذہن میں مرتب نہیں کیا تھا۔ بلکہ جیسے جیسے لکھتے گئے واقعات
اور مناظر خود بخود وجود میں آتے چلے گئے۔ پھر چونکہ ناول کا
کینوس بہت وسیع تھا اس لئے مجموعی حیثیت سے قصہ بے ربطی
کا شکار ہو گیا، اور بہت سے مختلف ٹکڑوں پر مشتمل نظر آنے
لگا۔ اسی طرح کرداروں کی کثرت اور تنوع جہاں فسانۂ آزاد
کی بہت بڑی خوبی ہے وہاں کسی حد تک ایک کمزوری بھی ہے
مجموعی طور پر سرشار کی کردار نگاری حیرت انگیز طور پر کامیاب
ہے۔ مگر پھر بھی کردار اتنے زیادہ ہو گئے ہیں کہ ناول نگار
کے قبضۂ قدرت سے باہر ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں، اور
سنبھالے نہیں سنبھلتے۔ دلچسپی کے اعتبار سے بھی ناول میں
ہمواری کا فقدان ہے۔ کہیں قصہ انتہا درجے کا جاذب توجہ
ہے، تو کہیں بے مزہ، سست اور پھسپھسا ہو کر رہ گیا ہے۔
منظر نگاری اور تصویر کشی میں بھی کہیں مصنف بے مثال
صناعی کا ثبوت دیتا ہے اور کہیں پھوہڑ پن کا شکار ہوتا ہوا
نظر آتا ہے۔ اس کا سبب جیسا کہ سرشار کے حالات زندگی
اور اوصاف شخصی کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے یہی ہے کہ وہ
حد درجہ بے پرواہ اور لاابالی قسم کے انسان واقع ہوئے
تھے۔ اخباری ضروریات کے تحت وقت کے وقت لکھتے
تھے اور کاتبوں کے تقاضے سے مجبور ہو کر برا بھلا جیسا کچھ بھی
ممکن ہوتا تھا گھسیٹ کر ان کے حوالے کر دیتے تھے۔ ظاہر

ہے کہ اس روش سے انھوں نے اپنے ساتھ اور اپنی بے مثال صلاحیتوں کے ساتھ جی بھر کر بے انصافی کی۔ ان کی ظرافت بھی جگہ جگہ پست، پھکڑ اور پوچ ہو کر رہ گئی ہے۔ مجموعی حیثیت سے اس میں زندگی اور توانائی پائی جاتی ہے۔ وہ کبھی کبھی طنز بھی بن جاتی ہے، مگر بہت کم اس بلند سطح پر پہنچتی ہے جو طنز اور ظرافت کی اعلیٰ ترین منزل ہے، جہاں ہنسنے ہنسانے کا شغل محض تفریحی ہونے کی بجائے تعمیری اور مقصدی ہو جاتا ہے، اور لطافت، معنویت، ادبی حسن اور تاثیر میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ اصل یہ ہے کہ سرشار میں اعلیٰ ترین مزاح نگاری کی صلاحیت تھی۔ لیکن انھوں نے اپنی فطری بے پروائی کے سبب سے اس صلاحیت سے پورا فائدہ نہیں اُٹھایا۔ چنانچہ اگر ایک طرف ان کے یہاں سوئفٹ کا سا زہریلا، جارحانہ، سفاکانہ اور دل خراش طنز نہیں ہے، تو دوسری طرف وہ ایڈیسن، غالب اور ہمارے موجودہ دَور کے مزاح نگار پطرس کی لطیف ظرافت سے بھی بیگانہ نظر آتے ہیں۔ ان کے بے محابا قہقہے والٹیر کی یاد دلاتے ہیں۔ مگر یہ قہقہہ آفرینی بھی اکثر یا بسا اوقات محض استہزا، تمسخر اور پھکڑپن ہو کر رہ جاتی ہے۔ وہ اعلیٰ مزاح کی صلاحیت رکھنے کے باوجود عملاً ایک کیریکچرسٹ یا کارٹونسٹ تھے اور غالباً یہی چیز تھی جس کے باعث مزاحیہ کردار نگاری میں ان کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ فسانۂ آزاد کے کمزور پہلوؤں کے تذکرے میں مفکرانہ وزن کی کمی کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے۔ سرشار ایک تمدنی نقاد ہیں، مگر اُن کی تمدنی تنقید یا اصلاحی جدوجہد کی تہ میں کوئی غور و فکر نہیں پایا جاتا۔ ان کے پاس کوئی منضبط نظریۂ حیات نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے طویل ناول میں کسی مفکرانہ نظام کا پتہ نہیں چلتا۔ اس لحاظ سے نذیر احمد کو ان پر بدیہی فوقیت حاصل ہے۔

سرشار کے بعد اس دور کے اہم ناول نگاروں میں شرر کا نام آتا ہے۔ ان کے ناولوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ چند کے نام یہ ہیں: ملک العزیز ورجنا، منصور [illegible] فردوس بریں، حسن کا ڈاکو، فتح اندلس، ایام عرب، [illegible] فلورنڈا۔

شرر نے تاریخی ناول نگاری کو اپنا مخصوص [illegible] دیا، جس کی بنا پر بعض ادبی حلقوں میں ان کو اُردو کا [illegible] کہا گیا ہے۔ لیکن شرر کو والٹر سکاٹ کہنا اتنا ہی بے[illegible] جتنا آغا حشر کو اُردو کا شیکسپیر یا حفیظ جالندھری کو اُرد[illegible] قرار دینا۔ تاریخی ناول نگاری کے جو مطالبات ہیں [illegible] کو پورا نہیں کرتے۔ تاریخی ناول نگار دراصل ایک [illegible] ہوتا ہے جو معمولی مورخ کی طرح اہم سیاسی واقعات اور انقلابات کا ذکر نہیں کرتا۔ نہ سلاطین و اُمرا کی [illegible] آرائیوں اور درباری سازشوں کو اپنا موضوع بنا[illegible] بلکہ ان تمام خارجی مظاہر حیات کی تہہ میں جو تمدنی اور معاشی حالات ایک خاص تاریخی دور میں پردا[illegible] ہیں ان کے چہرے سے نقاب اُٹھاتا ہے۔ اس کی [illegible] آئینے میں ہم اس زندگی کی جھلک دیکھتے ہیں جس کی تاریخی دور دوسرے تاریخی دور سے الگ اور مختا[illegible] تاریخی ناول نگار جس تاریخی زمانے کو اپنا موضوع [illegible] اس زمانے کی تاریخی قوتوں سے پوری طرح واقف [illegible] وہ یہ جانتا ہے کہ اس خاص زمانے میں تاریخی ار[illegible] نشو و نما کے لحاظ سے زندگی کس دَور سے گزر رہی [illegible] بنیادی ڈھانچہ کیا تھا، اقتصادی طبقات کی [illegible] تعلقات کی نوعیت کیا تھی۔ وہ اس زمانے کی [illegible] کو بے نقاب کرتا ہے، یعنی مختلف اہم اور غیرا[illegible] سطحی پہلوؤں سے گزر کر ان کے بنیادی پہلو[illegible] اور دکھاتا ہے۔ اس کی نظر زندگی کے سرسر[illegible] اکتفا نہیں کرتی اور زندگی کی سطح تک محدود [illegible] سطح کو چیر کر ان بنیادی قوتوں تک پہنچتی ہے [illegible] تہوں میں کارفرما ہوتی ہیں۔ الغرض تاریخی [illegible]

ہے کہ وہ زندگی کے اصلی خط و خال یعنی تمدن و معاشرت
رواج اور عقائد و اقدار کی ترجمانی اس طرح کرے کہ ایک
دور کی زندگی اور دوسرے تاریخی ادوار کی زندگی
فرق ہے وہ واضح ہو جائے۔ شرر کے ناول اس معیار
پر نہیں اترتے۔ وہ محض چند تاریخی اشخاص، چند تاریخی
اور ملکوں اور چند تاریخی جنگوں کے نام اپنے ناول
شامل کرکے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ان کا ناول تاریخی بن گیا،
خود تاریخی ناول نگاری کے فرائض سے عہدہ برآ ہو
یہی سبب ہے کہ ان کے تمام نام نہاد تاریخی ناول کردار
واقعات اور فضا کے لحاظ سے یکساں ہیں۔ مختلف
میں اشخاص اور مقامات کے نام بدلتے رہتے ہیں
ت کی نوعیت اور کرداروں کی عام ذہنیت میں کوئی
نہیں ہوتی۔ ہر ناول میں مسلمان ابطال کفار سے نبرد
تے ہیں اور فتح حاصل کرتے ہیں۔ ہر ناول کا ہیرو
دلیر، بے حد راستباز، صداقت کیش، خدا ترس، بلند
اور پاکیزہ خصلت ہونے کے ساتھ حسن و جمال کا دیوتا
ہے۔ وہ اسلام کی خاطر اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتا
عیسائی شہزادیوں سے عشق کرنے کو بھی اپنا پیدائشی
کرتا ہے۔ ہر ناول کی ہیروئن ابتدا میں مسلمانوں
کرتی ہے اور بعد میں ان کی بے مثل شجاعت عالی
دل پسندی اور دوسرے اعلیٰ اوصاف سے متاثر
لام قبول کرلیتی ہے اور ہیرو سے شادی کرکے اپنے
الی کا ثبوت دیتی ہے۔ غرضکہ شرر کے تاریخی ناول
افسوس کے ساتھ یہ محسوس کرتا ہے کہ یا تو شرر کو
ناول کے لوازمات سے پوری آگاہی نہیں تھی، یا
لامی تاریخ میں وہ بصیرت اور درک حاصل نہیں تھا
ناول نگار کے لئے کامیابی کی اولین شرط ہے۔ ظاہر ہے
اپنے تاریخی ناولوں کے لئے اودھ کے تمدن اور لکھنؤ
رت سے مواد حاصل کرتے تو بہت زیادہ کامیاب ہوتے،
کیونکہ اسلامی ہندوستان کی تاریخ کا یہ مخصوص دور ان کے
سامنے کی چیز تھی اور اس کے تمام پہلوؤں اور مختلف گوشوں
سے وہ گہری واقفیت رکھتے تھے۔

اب تک ہم نے شرر کے ناولوں کے مواد پر اظہار خیال
کیا ہے۔ جب ہم مواد و موضوع سے ہٹ کر فنی پہلو پر نظر ڈالتے
ہیں تو دوسرا ہی عالم نظر آتا ہے۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ شرر
کے ناول اردو ناول کے ارتقا میں نذیر احمد اور سرشار کے
ناولوں سے بہت آگے کی منزل کا نشان ہیں، اور یہ ایک
بہت بڑا قدم تھا جو اردو ناول نے ترقی کے راستے پر آگے
بڑھایا تھا۔ جہاں تک ناول کی تکنیک کا تعلق ہے شرر براہ
راست مغربی ناول سے متاثر معلوم ہوتے ہیں، اور اس باب
میں ان کو اپنے پیش روؤں پر نمایاں فضیلت حاصل ہے۔
ہر چند کہ نذیر احمد نے قدیم داستانوں کے مخصوص اسلوب کے
خلاف بغاوت کی تھی اور فوق الفطرت عناصر اور خارق عادت
امور کو ناول سے خارج کرکے اسے واقعیت اور عقلیت سے
ہم کنار کیا تھا، تاہم جدید ناول کے بہت کم مطالبے انھوں نے
پورے کئے۔ رہا فسانۂ آزاد، تو ہیئت اور بناوٹ کے لحاظ
سے وہ بدیہی طور پر ناول کی نسبت قدیم داستانوں سے زیادہ
قریب ہے۔ اردو میں ناول نگاری کا جدید انداز پہلی دفعہ
ہمیں شرر کے ناولوں ہی میں ملتا ہے۔ نذیر احمد اور سرشار
کے ناولوں کو اگر شرر کے ناولوں کے پس منظر میں دیکھا جائے
تو وہ ایک عبوری دور کے کارنامے معلوم ہوتے ہیں، اور
صاف یہ محسوس ہوتا ہے کہ جدید ناول نگاری کی باقاعدہ
ابتدا شرر نے کی۔

شرر ایک اعلیٰ درجے کے انشا پرداز تھے۔ ناولوں
کے علاوہ انھوں نے علمی، ادبی اور تاریخی مضامین بھی کثرت
کے ساتھ لکھے۔ چنانچہ ان کے ناول نگارش اور طرز تحریر
کے لحاظ سے بھی پچھلے کارناموں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ نذیر
احمد ایک مخصوص طرز کے مالک تھے۔ اسی طرح سرشار کا

اسلوب بھی ایک مخصوص انفرادی شان کی چیز تھی۔ شرر کی
نثر غالباً ایسی اور اتنی اعلیٰ خصوصیات کی حامل نہیں تھی اور
ان کا اسلوب اتنا منفرد نہیں تھا۔ پھر بھی اُردو زبان کے
ارتقائی سفر کے زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو وہ زیادہ ترقی
یافتہ چیز معلوم ہوتی ہے، اور جہاں تک محض ناول نگاری کا
تعلق ہے، ان کی زبان نذیر احمد اور سرشار کی زبان سے
بہتر اور زیادہ مناسب تھی۔

اُردو ناول کے ارتقائی سفر میں اگلا اہم سنگِ میل
سجاد حسین انجم کسمنڈوی کا ناول نشتر ہے جو ۱۳۱۱ھ مطابق
۱۸۹۴ء میں لکھا گیا۔

انجم کسمنڈوی کو اُردو کے بدقسمت ترین لکھنے والوں
میں شمار کرنا چاہیے۔ اُردو ادب کی تاریخ و تنقید میں جس
بیدردی اور صریحی بے انصافی کے ساتھ ان کو نظر انداز کیا
گیا ہے اس کی مثالیں بہت کم ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ لوگ
ان سے یا اُن کے ناول سے ناواقف رہے ہوں یا ہوں۔
نشتر ان ناولوں میں ہے جو کثرت کے ساتھ پڑھے گئے ہیں۔
پچھلے پچاس سالوں میں اس کے بیسیوں ایڈیشن چھپے۔ وہ
ایڈیشن سستے اور ادنیٰ قسم کے سہی، بوسیدہ بادامی کاغذ
پر چھپتے ہیں اور جلد سے بے نیاز اور گیٹ اپ کے محاسن
سے یکسر بیگانہ ہوتے ہیں۔ مگر بہرحال کتاب برابر چھپتی رہی
ہے۔ کبھی خارج از اشاعت نہیں ہوئی۔ اس کے نسخے پُرانے
کتب فروشوں کے یہاں، سامنے کی الماریوں میں نہ سہی،
اندرونی گوداموں میں ضرور موجود رہے ہیں۔ اور بغیر کسی
دقت کے دستیاب ہوتے رہے ہیں۔ ناول کے مصنف کے
بارے میں بھی لوگوں کو اتنا تو معلوم ہی رہا ہے کہ یہ سجاد
حسین انجم کسمنڈوی وہ سجاد حسین نہیں تھے جو اودھ پنچ کے
بانی و مدیر اور پیغامِ ظرافت کے موجد تھے۔ کہنے کا مطلب
یہ ہے کہ نہ تو نشتر کوئی گم شدہ تصنیف ہے اور نہ اُس کے
مصنف ہی کو نامعلوم و گمنام خیال کیا جا سکتا ہے۔ اس
باوجود اُردو ناول کی تاریخ اور اُردو ادب کے
میں ان دونوں کو وہ جگہ نہیں ملی جس کے وہ یقیناً مستح
لکھنے والے بڑی آسانی کے ساتھ نذیر احمد، سرشار،
سے گزرتے ہوئے رسوا پر آجاتے ہیں اور پھر بیسویں
میں داخل ہو جاتے ہیں۔ انجم کسمنڈوی مع اپنی تصنیف
منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ بے انصافی کی یہ روش اکثر تنق
جائزوں میں نظر آتی ہے۔ ویسے ناول کے عام قارئین
بیشتر اس کی تعریف میں رطب اللسان ہی پائے گئے۔
کبھی بعض اہم نقادوں نے بھی مصنف اور اس کی
دل کھول کر تعریف کی ہے اور قیاساً ضمناً طور پر خراج
پیش کیا ہے۔ مثلاً حضرت نیاز فتحپوری نے اپنی تحریر
کسی جگہ اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ اپنے مطالعۂ شعر
کے دوران میں وہ دو مرتبہ آنسو بہانے پر مجبور ہوئے
ایک تو اس وقت جب انھوں نے مثنوی زہرِ عشق پ
پڑھی اور دوسرے اس دن جس دن ناول نشتر ان
سے گزرا۔ اس ساری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ انجم کسمن
ناول نشتر موجود و معلوم، نیز کسی حد تک معروف ہوتے
بھی ہمارے ادبی تذکروں اور تاریخوں سے مفقود رہا
اور اب ضرورت اس بات کی ہے کہ خاطر خواہ تنقیدی
سے کام لیتے ہوئے اس کے بے مثل ادبی محاسن کا اعترا
جائے اور اُردو ناول کے ارتقا میں جس مقام اور اہمیت
مستحق ہے اس کو واضح طور پر تسلیم کیا جائے۔

نشتر کا جائزہ لیتے وقت ہماری نظر سب سے
اس کی خارجی ہیئت کے دو نمایاں پہلوؤں پر پڑتی۔
اور غالباً یہی ناول کے وہ دو پہلو بھی ہیں جن کی بنا پر
کے مورخوں اور نقادوں نے اس اہم افسانوی تخلیق کو
بیشتر نظر انداز کیا۔

پہلی چیز ناول کا حجم ہے۔ اس کا کینوس کچھ زیادہ

نہیں. بلکہ خاصا محدود ہے۔ ایک ناول محض طویل، ضخیم اور بھاری
بھرکم ہونے کی بنا پر جو اثر ڈالتا ہے اور جس طرح اپنی اہمیت
منواتا اور ادبیات میں اپنی جگہ بناتا ہے اس سے یہ ناولٹ محروم
رہا۔ لوگ اسے ایک چھوٹی موٹی چیز سمجھ کر نظرانداز کرتے رہے
اصل یہ ہے کہ اپنی بناوٹ اور خارجی ہیئت کے لحاظ سے یہ
ایک ناولٹ ہے۔ اور چونکہ ناولٹ کی حیثیت سے اپنی صنف
کے ایک بلند معیار پر پورا اُترتا ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ
اُردو کے اچھے اور لائق ذکر ناولوں کے زمرے سے خارج سمجھا
جائے. موجودہ دور کے کارناموں میں اگر سجاد ظہیر کے طویل مختصر
افسانے لندن کی ایک رات، اور عصمت چغتائی کے ناولٹ
ضدی کو اُردو ناول کے ارتقائی سلسلے کی اہم کڑیاں خیال کیا
جاسکتا ہے تو نشتر کو نظرانداز کر دینے کا بظاہر کوئی جواز موجود
نہیں ہے. بلکہ ادبی انصاف کا تقاضہ تو یہ ہے کہ نشتر کو اہم تر
مقام دیا جائے، کیوں کہ دلچسپی، تاثیر، دلدوزی اور بعض دُسری
فنی خوبیوں میں یہ ان دونوں سے بڑھا ہوا ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ یہ ناول (بقول مصنف) فارسی
زبان کے ایک حصے کا ترجمہ ہے۔ چنانچہ یہ ممکن ہے کہ تاریخ
تنقید میں اس کے بالعموم نظرانداز کئے جانے کا ایک سبب
بھی رہا ہو کہ یہ طبع زاد تصنیف نہیں، بلکہ محض ایک ترجمہ ہے
اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ درحقیقت ترجمہ ہے؟

ناول کا جو نسخہ اس وقت راقم الحروف کے پیش نظر
ہے اس کے سرورق پر ہی اس امر کا اعلان ہے کہ اس کو
منشی سجاد حسین کسمنڈوی متخلص بہ انجمؔ نے فارسی زبان سے
نے سے "بہت ہی پُراثر اور فصیح اُردو" میں ترجمہ کیا۔ سرورق
کے بعد التماس مترجم کے عنوان سے ایک مختصر دیباچہ ہے جس
میں بتایا گیا ہے کہ یہ ایک فارسی قصے کا ترجمہ ہے اور "اصل
کتاب سیدھی سادی فارسی ہندی آمیز زبان میں قلمی مجھے
ملا موجود ہے۔ سال تصنیف ۱۲۰۵ھ اور تاریخ کتابت ۱۲۱۶ھ
یعنی مصنف نے اپنے عشق و محبت کا واقعہ نہایت سادہ الفاظ
و عبارت میں لکھا ہے بےتکلف اور تصنع غالباً بہت ہی
قصہ ہے۔ اس لئے دیکھنے والے واقعی کلیجہ تھام لیتے ہیں
کے بعد اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ کس طرح وہ
اصرار خصوصاً "منشی محمد نورالحسن کاکوروی" کی عنایت
یہ ترجمہ کیا گیا۔ پھر دیباچے کے آخری حصے میں یہ جملہ
سے گزرتا ہے: "جن حضرات نے اصل کتاب دیکھی ہے
ترجمے کو بھی ملاحظہ فرمائیں گے تو میری جگر کاوی اور خو
کی رنگ آمیزیوں کی داد دیتے ہی بن پڑے گی۔ اس
"جن حضرات نے اصل کتاب دیکھی ہے" کا ٹکڑا کسی
پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے۔ جب اصل کتاب قلمی مسو
شکل میں تھی اور یہ مسودہ خود منشی صاحب کے قبضے میں
عام پڑھنے والوں تک تو اس کی رسائی ممکن ہی نہیں تھی
یہ کون حضرات تھے جنھوں نے کتاب دیکھی اور اگر د
طرح بظاہر ہے کہ "حضرات" سے منشی صاحب کا مطلب
وہ چند مخصوص احباب ہو سکتے ہیں جن کو مسودے پر نظ
کا موقع ملا۔

بہرحال دیباچے کی منقولہ اور مذکورہ سطور کی ر
میں یہ امر بالکل واضح ہے کہ یہ ناول فارسی قصے کا ترجمہ
اور اس امر کے ماننے میں کسی کو تامل بھی نہیں ہونا چاہ
مزید ثبوت درکار ہو تو وہ یوں فراہم ہو جاتا ہے کہ ناو
اکثر صفحات پر منشی صاحب نے اپنی مترجمانہ حیثیت سے
آرائی بھی کی ہے جس کی چند مثالیں یہ ہیں:-

" غالباً بخ کی منشی گری مراد ہے۔ جیسا آئندہ معلوم
ہوگا۔ مترجم"

"اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منگ صاحب مصنف
کے نانا فارسی یا اُردو پڑھتا تھا۔ مترجم"

" بیان سے پتہ چلتا ہے کہ صاحب بہادر کی میم نہ
تھی اور عیاش بھی تھے۔ مترجم"

" اس کا نام آگے کہیں نہیں آیا ہے۔ اس سے تعلیں

ہوتا ہے کہ یہاں ہو گی۔ مترجم"
"اسی طرح بہت سے شعر حضرت نے پڑھے جس کے تین
حصے پانچ صفحوں پر ہیں۔ ایک عام عاشقانہ انداز کے، دوسرے
حسینوں کی تعریف میں، تیسرے اپنے حسب حال۔ میں نے وہ
سب چھوڑ دیئے۔ مترجم"
"دیکھئے خانم جان کیا ستم کر رہی ہے۔ اب لوگوں کا کتاب
میں جی لگے گا۔ چوٹیں شروع ہو گئیں۔ جواب تو برجستہ اور
شافی دیا۔ مترجم"

"اس فقرے کو اصل ہی لکھ دیا۔ اس میں لطف
ہی اور ہے اور ترجمے میں یہ بات کہاں۔ مترجم"
"حسن شاہ اور خانم جان تو صاحب معاملہ تھے۔
مگر صاحب بہادر بڑے مسخرے تھے۔ جہاں
دیکھو ٹپکے پڑتے ہیں۔ افسوس اب ایسے
انگریز نہیں آتے ورنہ ہم بھی بناتے۔ مترجم"
"خاص لفظ مصنف صاحب کا ہے۔ مترجم"
"حضرت کے عشق کی بس اتنی کائنات ہے۔
مترجم"

"یہاں پر ایک پرانی مثنوی کے بہت سے شعر
بھی لکھے ہیں جو بے مزہ ہونے کے علاوہ کسی
قدر فحش بھی ہیں۔ میں نے سب چھوڑ دیئے۔
انداز بیان کو میں نے بہت نبھایا ہے اور
مصنف نے تو اس زمانے کی تہذیب کا کچھ
خیال ہی نہ کیا تھا۔ مترجم"
"جس کو قاصد بھیجنا دشوار ہو وہ عاشقی کا دعویدار
ہو۔ غضب نہیں تو کیا ہے۔ مترجم"

ان حاشیوں سے بظاہر یہ بات مکمل طور پر ثابت ہو جاتی
ہے کہ یہ ناول طبع زاد نہیں، ترجمہ ہے۔ لیکن ـــ اس سلسلے
میں ایک بات راقم الحروف کے ذہن میں آتی ہے اور اس
اظہار شاید نامناسب نہ ہو۔ نیز یہ کہ یہ راقم الحروف کا محض
قیاس ہے، کوئی قطعی اور طے شدہ رائے نہیں ہے۔ اُمید
کہ اسی روشنی میں اس پر غور کیا جائے گا۔ کہنا یہ ہے کہ یہ
ممکن ہے کہ نشتر دراصل منشی سجاد حسین کی طبع زاد تصنیف
ہو .... بعض انھوں نے ع
و ہوس اور ہجر و وصال کی ایک داستان کو براہ راس
اپنے ذہن و قلم سے منسوب کرنا مناسب نہ خیال کیا ہو
بات کو نباہنے کے لئے یہ ظاہر کرنا ضروری سمجھا ہو کہ یہ ک
طبع زاد تصنیف نہیں ہے بلکہ محض ایک ترجمہ ہے۔ ابھی ا
زمانے کو گزرے ہوئے کچھ بہت زیادہ مدت نہیں ہوئی ج
ناول پڑھنا اور لکھنا، بلکہ شاعری کرنا بھی بعض ثقہ ا
تقدس مآب حلقوں میں معیوب خیال کیا جاتا تھا۔ ممکن
کہ منشی صاحب اپنے آپ کو کچھ ایسے ہی تقشف زدہ اح
میں گھرا ہوا پاتے ہوں۔ اور کسی دوسرے کے کندھے پر
کر بندوق چھوڑنے ہی میں ان کو عافیت نظر آئی ہو۔ یہ
ظاہر ہے کہ ناول شروع سے آخر تک عشق و عاشقی سے مملو
ہے۔ اور ناول کے کردار جس ماحول میں سانس لیتے ہیں ا
طوائفوں اور طوائفوں کی کاروباری زندگی کا ماحول ہ
اور گو ہیروئن کی محبت ایک شدید، والہانہ اور بے پیمانہ جذ
عشق ہے جو سراپا نیاز کیشی، سپردگی، افتادگی اور دل
جان سپاری سے مملو ہے، اور جس کی خاطر وہ بالآخر اپ
جان تک قربان کر دیتی ہے، ہیرو کی محبت بہت حد تک
و جسمانی نوعیت کی ہے۔ چنانچہ ناول میں خالص جسمانی
چھیڑ چھاڑ، نوک جھونک، چہل، لگاوٹ اور بدمستی کی ک
نہیں۔ تو کیا تعجب ہے کہ عشق بازی، کام جوئی اور چوما چا
کی اس بے محابا داستان کو ایک طبع زاد تخلیق کے طور
پیش کرنا منشی صاحب نے اپنی بزرگی اور متانت کے

خیال کیا ہو اور اُسے ایک خود نوشت قلمی سرگزشت کا ترجمہ کہہ کر پیش کرنا زیادہ مناسب سمجھا ہو۔ مزید برآں ہو سکتا ہے کہ اس بے ضرر ادبی جعل سازی اور مصلحت آمیز دروغگوئی میں ان کو اس خیال سے بھی سہارا ملا ہو کہ خود نوشت روداد محبت والی بات لوگوں کے جذبۂ تجسس کو اُبھار کر ناول میں مزید دلکشی پیدا کرنے کا باعث ہوگی۔ دنیائے ادب اس نوع کے ادبی ہتھکنڈوں کی مثالوں سے کبھی خالی نہیں رہی! اس کی ایک بہت اچھی مثال J. J. Morier کا مشہور انگریزی ناول Haji Baba of Ispahan ہے۔ یہ قطعی طور پر مصنف مذکور کا طبع زاد کارنامہ ہے جس کو اس نے ایک ایرانی دوست کے خود نوشت سوانح حیات کا انگریزی ترجمہ کہہ کر پیش کیا ہے، اور جیسا کہ ضروری تھا فارسی مسودے کے حصول کے سلسلے میں ایک لمبا چوڑا من گھڑت قصہ بھی بیان کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ اس ناول میں ایرانی زندگی کا مذاق اُڑایا گیا ہے، اور مشرقی تہذیب و تمدن پر متعصبانہ چوٹیں کی گئی ہیں۔ چنانچہ تضحیک و تنقید کی ذمہ داری سے بچنے کے لئے مصنف کو ترجمے کا ڈھونگ رچانا پڑا۔ راقم الحروف کے خیال میں نشتر کے مصنف نے بھی ناول کی ذمہ داری کو اپنے سر لینا پسند نہیں کیا اور اسے ایک ترجمہ ظاہر کیا۔

یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر نشتر کے بارے میں اس قسم کی قیاس آرائی کا سبب کیا ہے اور ایسی کون سی ضرورت آپڑی کہ منشی صاحب کے بیان پر شک کیا جائے اور جس چیز کو وہ ترجمہ بتا رہے ہیں اسے طبعزاد تخلیق ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا جائے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ناول میں پلاٹ کی نوعیت، قصے کا ارتقاء، واقعات کا اتار چڑھاؤ اور بہت سے دوسرے ضمنی پہلو اور جزئی اُمور ایسے ہیں کہ ان کی بنا پر ترجمے والی بات مشکوک معلوم ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر ناول میں ایسی اندرونی شہادتیں موجود ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ "سچا واقعہ" نہیں بلکہ "افسانہ" ہے۔

سب سے اہم اندرونی شہادت قصے کی واقعاتی ترتیب سے متعلق ہے۔ کسی کا قول کہ "حقیقت افسانے سے زیادہ عجیب ہوتی ہے" ممکن ہے کہ بعض اعتبارات سے صحیح ہو، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حقیقت حقیقت ہے اور افسانہ افسانہ۔ مطلب یہ کہ ناول یا افسانے میں جو مخصوص تکنیکی عناصر پائے جاتے ہیں — یعنی ڈرامائیت، توازن و تناسب، مختلف اجزا میں مخصوص ربط، واقعات کی خاص ترتیب، مخصوص اُتار چڑھاؤ، بعض اُمور کو اُبھارنے اور بعض امور کو نظرانداز کر دینے یا پس منظر میں ڈال دینے کا خاص انداز اور پھر اگر ناول ہے تو کہیں وسط میں اور اگر افسانہ ہے تو آخری حصے میں ایک نقطۂ عروج وہ زندگی کے اصلی واقعات یا حقیقی کوائف میں نہیں پائے جاتے۔ حقیقی زندگی کے لاکھوں کروڑوں واقعات میں اگر ایک آدھ واقعہ افسانوی حسن اور ڈرامائیت کا حامل نظر آئے تو اس کی سند نہیں۔ وہ فطرت کی عام روش نہیں ہے فطرت کی بھول ہے۔ فطرت اس تنظیم اور باقاعدگی کی پابند نہیں ہے جس کی کارفرمائی ہمیں افسانہ یا ناول میں ملتی ہے افسانوی آرٹ سے واقفیت رکھنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ زندگی کے کسی اصلی واقعے کو جوں کا توں قلم بند کر دینے سے کوئی اچھا افسانہ وجود میں نہیں آسکتا۔ اس میں شک نہیں کہ زندگی کے اصلی واقعات ہی افسانہ نگار کا خام مواد ہیں۔ لیکن وہ اس مواد کو من و عن پیش کر دینے کی بجائے اسے ایک خاص سانچے میں ڈھالتا ہے۔ زندگی سے اسے جو مسالہ ملتا ہے وہ پیچیدہ بے ترتیب اور اُلجھا ہوا ہوتا ہے۔ وہ اس کو ایک خاص Design اور ایک خاص Pattern کا روپ عطا کرتا ہے یہی دراصل افسانوی آرٹ ہے۔ کاٹ چھانٹ، حکّ و انتخاب اور تراش خراش کا عمل افسانے کو افسانہ بنانے کے لئے ازبس ضروری ہے۔ اور یہی دراصل افسانہ نگار کے خلاقانہ ذہن

کا تخلیقی عمل ہے۔ اب اس حقیقت کی روشنی میں ہم نشتر پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں کرداروں کے عمل اور واقعات کے بہاؤ میں افسانہ نگار کے ذہن کی کارفرمائی صاف طور پر جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ خصوصاً ناول کے آخری حصہ میں واقعات جو روش اختیار کرتے ہیں اور افراد جس انداز میں اپنے المناک انجام کی طرف بڑھتے ہیں (بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ دھکیلے جاتے ہیں) وہ صریحی طور پر افسانوی آرٹ کا مظاہرہ ہے۔ کوئی پڑھنے والا یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ قصے کی حرکت افسانہ نگار کی کوشش اور من مانی کارروائی کی مرہون منت ہے۔ یہی ناول میں وہ سب سے قوی اندرونی شہادت ہے جو اس کو ایک "سچے واقعے" سے زیادہ ایک "من گھڑت افسانہ" ثابت کرتی ہے۔

اس کے علاوہ جو دوسری اندرونی شہادتیں ناول میں ملتی ہیں اُن سے فی الحال صرفِ نظر کیا جاتا ہے۔ قوی امید ہے کہ قارئین اپنے مطالعے کے دوران میں خود محسوس کریں گے۔

باقی رہے وہ حاشیے جو ناول کے مختلف صفحات پر منشی صاحب نے مترجم کی حیثیت سے درج کئے ہیں اور جن سے بظاہر یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ ناول فارسی قصے کا ترجمہ ہے، تو شاید اس کے ماننے میں کسی کو تامل نہیں ہوگا کہ اس قسم کی حاشیہ آرائی فرضی بھی ہو سکتی ہے، اور کوئی بھی ذہین مصنف اس نوع کے حاشیے اپنے ذہن سے ایجاد کر کے بھی لکھ سکتا ہے۔

بہرحال جیسا کہ اس بحث کے شروع میں کہا گیا تھا، یہ سب محض ایک قیاس ہے اور اس سلسلے میں جتنی باتیں بھی کہی گئیں وہ سب ظنی و قیاسی ہیں۔ ہو سکتا ہے ناول درحقیقت ترجمہ ہی ہو اور یہ بحث ناحق ہی اُٹھائی گئی ہو، لیکن اس صورت میں بھی راقم الحروف کے لئے یہ خیال باعث اطمینان ہوگا کہ یوں کچھ اور نہیں تو ضمنی طور پر نشتر کے بعض اہم اور قابل ذکر پہلو ہی معرضِ گفتگو میں آ گئے۔ اور پھر اگر یہ ناول درحقیقت فارسی قصے ہی کا ترجمہ ہے، تو یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ ایک آزاد ترجمہ ہے جس میں مترجم نے مترجم کے حق سے پورا فائدہ اُٹھایا ہے اور نگارش کے معاملے میں بھی اپنی تخلیقی صلاحیت کو پورے طور پر ظاہر ہونے کا موقع دیا ہے۔ اشعار کے استعمال میں اس نے خاص طور پر آزادی سے کام لیا ہے۔ فارسی قصے کے متن میں جو اشعار فارسی اور اُردو کے تھے ان کو کم کرنے کی کوشش کی ہے، اور بکثرت اشعار کچھ اپنے اور کچھ بعض شعرا کے، اپنی طرف سے بھی داخل کئے ہیں۔ پہلی چیز کا علم ہمیں بعض ذیلی حاشیوں سے ہوتا ہے، اور دوسری بات یوں ظاہر ہوتی ہے کہ مسودے کا سالِ تصنیف ۱۲۰۵ھ بتایا گیا ہے جس سے یہ لازم آتا ہے کہ اس میں پائے جانے والے اشعار زیادہ سے زیادہ میر تقی میر اور اُن کے معاصرین کے دور تک ہو سکتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں صورتِ حال اس کے خلاف ہے، یعنی ناول میں ریاض خیرآبادی اور ان کے معاصرین تک کے اشعار نظر آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب مترجم کا تصرف ہے اور مجموعی طور پر یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ ناول اگر ترجمہ ہے تو قطعی طور پر آزاد ترجمہ ہے۔ مورخوں اور نقادوں کی یہ فروگزاشت بہرحال ناقابلِ معافی ہے کہ وہ اس کو ترجمہ سمجھ کر نظرانداز کرتے ہیں۔

اور اب چند الفاظ ناول کے بعض دوسرے پہلوؤں کے بارے میں!

ناول کا موضوعِ اصلی تو وہی ہے جو کم از کم انیسویں صدی کے آخر تک صنفِ ناول کا تنہا موضوع تھا، یعنی عشق و محبت اور عشق و محبت کی جنوں خیزیاں، کرشمہ سازیاں اور ہلاکت آفرینیاں! لیکن اس موضوع کو جس پس منظر میں اُبھارا گیا ہے وہ قطعی طور پر اچھوتا ہے، کیونکہ اس کا تعلق ہندستانی زندگی، ہندوستانی معاشرے اور ہندوستانی تاریخ کے ایک گم شدہ اور از یاد رفتہ پہلو سے ہے۔ آج ہم میں سے کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ابتدائی دَور میں جو انگریز بسلسلۂ ملازمت اور بہ حیلۂ معاش ہندوستان آئے تھے، ان میں وہ حاکمانہ غرور اور الگ تھلگ رہنے کا وہ انداز بالکل نہیں تھا جو بعد کے زمانے میں انگریزوں کا

ام رویہ رہا ہے۔ سترھویں اور اٹھارویں صدی میں انگریزوں
اور شاید انگریزوں سے زیادہ فرانسیسیوں کے لئے ہندوستان
میں آکر ہندوستانی معاشرت اور ہندوستانی طور طریقے
اختیار کرنا اور یہاں کے باشندوں کے ساتھ موانست اور
مجالست کے رشتے قائم کرنا کوئی انہونی یا غیر معمولی بات
نہیں تھی۔ مشرقی وضع کے دیوان خانوں میں اٹھنا بیٹھنا، مشرقی
لباس پہننا، حقہ پینا، یہاں کی زبان، یہیں کے لب و لہجے میں
بولنا، اردو اور فارسی شاعری سے شغف رکھنا اور اسی نوع کے
دوسرے رجحانات عادتاً یا شغلاً ان میں پائے جاتے تھے اور
وہ ان کو ہرگز اپنے لئے باعث عار نہیں سمجھتے تھے۔ نشتر میں
ہیرو اور ہیروئن کے بعد تیسرا اہم کردار منگ نامی ایک انگریز
کا ہے، اور اس کی زندگی کا جو رُخ اس ناول میں ہماری
نظروں کے سامنے آتا ہے اس کی بنا پر یہ نتیجہ نکالنا مشکل
نہیں کہ وہ اسی مزاج اور منہاج کا انگریز تھا۔ پھر یہی چیز اس
کی فطری زندہ دلی اور طبعی شگفتگی کے ساتھ مل کر ناول کی
فضا میں ایک عجیب و غریب تازگی کا عنصر پیدا کرتی ہے، اور
پڑھنے والا خود کو ایک ایسے ماحول میں پاتا ہے جو پُرانا ہوتے
ہوئے بھی نیا ہے، جو دلچسپ بھی ہے اور تاسف خیز بھی، بصیرت
افروز بھی اور عبرت انگیز بھی۔ ہندوستانی رئیسوں کی طرح
طائفوں کو ملازم رکھنا اور اپنے ایوانوں میں رقص و سرود
کی محفلیں منعقد کرنا بھی غالباً اس دور کے انگریز حکام کا محبوب
مشغلہ تھا۔ چنانچہ ناول میں نہ صرف منگ صاحب بلکہ اور جن
انگریزوں کا ذکر ہے وہ بھی اس شوق یا علت میں گرفتار نظر
آتے ہیں۔ اس ضمن میں دوسو سال پہلے کی ہندوستانی زندگی
کے ایک تاریک گوشے پر بھی روشنی پڑتی ہے، اور طوائفیت
کا ادارہ ایک خاص شکل میں ہماری نظر کے سامنے آتا ہے
ناول کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں کشمیری طائفے
خانہ بدوشانہ انداز میں ادھر سے ادھر گھومتے تھے اور صاحب
ثروت لوگوں کے یہاں ملازمت کے جویا ہوتے تھے۔

ہر طائفہ عموماً متعدد طوائفوں، سازندوں اور ان کے قرابتداروں
اور خدمت گاروں پر مشتمل ہوتا تھا۔ پھر جب کسی طائفے کو کہیں
ملازم رکھ لیا جاتا تھا تو اس کے افراد اپنے خیمے نصب کر کے
وہیں رہنا شروع کر دیتے تھے اور مقررہ ماہانہ مشاہرے پر ان
کی گزر اوقات ہوتی تھی۔ طوائفیت ایک قدیم ادارہ ہے۔ اور
معلوم و معروف چیز ہے، لیکن اس مخصوص شکل سے کم از کم آج ہم
واقف نہیں ہیں۔ زیرِ نظر ناول ہی سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے
کہ آج سے دوسو سال قبل کے ہندوستان میں یہ ایک زندہ اور
جیتی جاگتی حقیقت تھی۔ نشتر اُردو کا وہ تنہا ناول ہے جو گزری
ہوئی ہندوستانی زندگی کے اس خاص پہلو کو پیش کرتا ہے۔ اور
جس میں قصے کا تانا بانا ایک کشمیری طائفے کے اردگرد بُنا گیا
ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مرقع اپنی تفصیلات اور
جزئیات میں پڑھنے والوں کے لئے بے اندازہ دلچسپی کے ساتھ
بے پایاں عبرت و بصیرت کا سامان بھی رکھتا ہے۔ یہی وہ چیز
بھی ہے جو اس ناول کو اچھوتا اور منفرد بناتی ہے۔

زبان کے لحاظ سے بھی یہ ناول خاص اہمیت رکھتا ہے۔
مصنف کو بیان و اظہار پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے اور اس
کی تحریر میں بے مثل روانی، صفائی اور گھلاوٹ پائی جاتی ہے۔
خارجی معاملات کی پیچیدگیاں ہوں یا داخلی واردات کی نزاکتیں،
سہولتِ ابلاغ سب کو پانی کرتی چلی جاتی ہے۔ وہ جو بعض ادبی
تحریروں میں ایک بے نام سی لذت پائی جاتی ہے اُس کی
بڑی اچھی مثال نشتر کی زبان ہے۔ اس کا یہ مطلب نہ نکالا
جائے کہ مصنف نے انشا پردازی کا کمال دکھایا ہے۔ ناول یا
افسانے میں انشا پردازی کی گنجائش ہی کہاں ہوتی ہے؟ بلکہ
یہ کہنا بھی شاید مبالغہ نہ ہو کہ ناول یا افسانے میں انشا پردازی
کا حسن عیب بن جاتا ہے اور تصنع کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔
(یلدرم، نیاز فتح پوری اور اس اسکول کے دوسرے لکھنے
والوں کے تخیلی و رومانی افسانوں کی بات دوسری ہے۔) نشتر
کی زبان ناول کی زبان ہے اور ناول کی زبان ہوتے ہوئے

بڑی لطیف۔ بڑی ستھری اور بڑی مزے دار زبان ہے بعض پرانے مصنفوں کی روش یہ رہی ہے کہ بات بات میں شعر استعمال کرتے ہیں اور جتنے جملے نثر کے لکھتے ہیں اتنے ہی اشعار بھی درج کرتے ہیں۔ منشی صاحب کو بھی اس کا بڑا لپکا ہے۔ شعر ہر وقت ان کی زبان پر رہتا ہے۔ شاید ہی کوئی صفحہ ناول کا ایسا ہو جس پر پانچ سات شعر موجود نہ ہوں۔ اور بعض جگہ تو اس سے بھی زیادہ ہیں۔ مگر اس میں خوبی یہ ہے کہ اشعار کا استعمال غائیت درجہ برمحل اور حسب موقع ہے۔ نثر اور نظم کی کڑیاں اتنی خوبصورتی کے ساتھ ملتی چلی جاتی ہیں کہ تحریر کے بہاؤ میں ذرا فرق نہیں آتا۔

نشتر کا سب سے بڑا حسن، اس کی کامیابی کا سب سے بڑا راز، اور اس کی اہمیت کا سب سے بڑا سبب اس کی بے پناہ تاثیر ہے۔ یہ ایک دل دوز اور دل گداز ٹریجڈی ہے جو پڑھنے والے کو رُوح کی گہرائیوں تک ہلا دیتی ہے۔ اور عشق و محبت کی روایتی ہلاکت آفرینیوں کا ایک حقیقی نقش ذہن پر مرتسم کرتی ہے۔ اُردو کے دوسرے اہم ناول اس ناول سے زیادہ اہم اور زیادہ وقیع کارنامے ہیں لیکن وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ دل کو چھونے اور رُوح کو مرتعش کرنے کی جو کیفیت اس میں پائی جاتی ہے وہ اس حد تک کسی دوسرے اُردو ناول میں نہیں پائی جاتی۔

اُردو کی عشقیہ شاعری میں جس مزاج اور رنگ و آہنگ کی چیز مثنوی زہر عشق ہے وہی ناول کی دنیا میں نشتر کی خصوصیت ہے۔ ناول کے آخری حصے میں ایک مقام خاص طور پر زہر عشق کی یاد دلاتا ہے ملاحظہ ہو۔

"میرے پیارے! اگر بعد میرے مرنے کے تمہارا یہاں آنا ہو تو میری قبر پر ضرور آنا۔ خدا کے لئے اغماض نہ کرنا۔ گو تم کو تودۂ خاک حسرتوں کا ڈھیر دیکھ کے رنج ہوگا۔ مگر آنا ضرور۔ لیکن ذرا سنبھلے ہوئے —— اگرچہ میری خاک مرقد اس قابل نہیں ہے کہ تمہارا غبارِ دامن بن سکے۔ مگر شانِ بندہ نوازی اور حق محبت کے خیال سے بلا سے دُور ہی سے آ کے فاتحہ پڑھ دینا اس فعل سے نہ صرف میری رُوح ہی خوش ہوگی بلکہ تمہاری وفاداری کی لوگ تعریف کریں گے۔ آہ مجھے اس کی بھی اُمید نہیں کہ تم میرے بعد بھی آسکو۔ میری تقدیر ایسی کہاں کہ میرا میرا جانِ عزیز سے عزیز دوست میری قبر پر آئے۔ ہاں گر صادق اثر کرے اور میری محبت رنگ اپنا جمائے تو کیا عجب ہے۔ —— دیکھو یہ میری وصیت سمجھو کہ اگر تم میرے بعد آنا تو حال بے حال نہ کرنا اور میری جان کی قسم میرے سر کی قسم ہے رنج نہ کرنا۔ کوئی حرکتِ دیوانگی و بے تابی نہ کر بیٹھنا۔ اس میں کوئی فائدہ نہیں۔ بجز اس کے کہ بے وجہ اپنی طبیعت کو خراب کرو اور ناحق کے صدمات اٹھاؤ۔ صبر سے بہتر کوئی علاج نہیں جس قدر استقلال سے کام لوگے اور تحمل کروگے تمہارے حق میں مفید ہے۔ اور نیز میری رُوح کو ثواب پہنچے گا۔ دنیا کے رنگ ہی یہ ہیں —— خدائی کارخانہ ہے کس کو دخل؟ —

ایک مماثلت اور —— جو لوگ مغرب کے افسانوی ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے ذہن میں اگر نشتر کے ساتھ ٹامس ہارڈی کے مشہور ناول Tess of the Dervervilles کی یاد تازہ ہو جائے تو وہ بھی ایک قدرتی بات ہوگی، کیونکہ مظلومی اور موت دونوں ناولوں کے مشترک عنوان ہیں دونوں جگہ یکساں غم گینی کی فضا پیدا کرتے ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ نشتر اپنی اعلیٰ اور اچھوتی خصوصیات کی بنا پر اُردو نثر اور اُردو ناول کے ذخیرے میں ایک گراں مایہ ہے اور سجاد حسین انجم کسمنڈوی اُردو کے صف اول کے لکھنے والوں میں ہیں۔ ان دونوں کو ہمارے ادب میں جو جگہ ملنی چاہیئے تھی وہ نہیں ملی۔ لیکن اب اس فروگزاشت کی تلافی ہونی چاہیئے اور اس میں مزید تاخیر ایک سنگین اُدبی جرم ہے۔

مرزا محمد ہادی رسوا اس دور کے آخری ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول تعداد میں زیادہ نہیں اور ان کا اصلی کارنامہ امراؤ جان ادا ہے جس کا سال تصنیف ۱۸۹۹ء ہے۔ یہ رسوا ہی کا شاہکار نہیں بلکہ اُردو میں فن ناول نویسی کا

- - - - - - - بھی ہے ۔ شرر
کے ناولوں کے بعد یہ ایک بہت بڑا قدم تھا جو اردو ناول نے
زندگی کی شاہراہ پر اٹھایا ۔ نذیر احمد کے ناولوں میں اصلاحی
جذبہ اور مقصدی رجحان بہت زیادہ نمایاں تھا ، جس نے ان
کے کارناموں کو مواعظ و نصائح کی پوٹ بنا کر رکھ دیا ۔ سرشار
کا کارنامہ ساخت اور تشکیل کے لحاظ سے قدیم داستانوں کے
انداز کی چیز تھی ۔ شرر نے بیشک جدید ناول کی ٹکنیک سے
کام لیا ۔ لیکن اس کے باوجود ان کے ناول اپنی ہیجان پسندی ،
سستی جذباتیت اور نام نہاد تاریخی رومان نگاری کے سبب
سے کچھ قدیم انداز کی چیز معلوم ہوتے ہیں ۔ یا یوں کہیئے کہ جس
طرح نذیر احمد اور سرشار کے ناول شرر کے ناولوں کے مقابلہ
میں قدیم انداز یا عبوری دور کے کارنامے معلوم ہوتے ہیں ،
اسی طرح شرر کے ناول امراؤ جان ادا کے مقابلے میں کچھ پرانے ،
کچھ ناپختہ ، اور کچھ نامکمل سے نظر آتے ہیں ۔ قصہ مختصر یہ کہ امراؤ
جان ادا پہلا ناول ہے جو عبوری یا تجرباتی دور کی پیداوار معلوم
ہونے کی بجائے اپنی صنف کا ایک پختہ ، کامیاب اور بلند نمونہ
ہے اور ایک ترقی یافتہ رچے ہوئے فنی شعور کی پیداوار معلوم
ہوتا ہے ۔ امراؤ جان ادا تک پہنچ کر اردو ناول اپنے ابتدائی
نشوونما کے اختتام کو پہنچ جاتا ہے ! ۔

ساخت کے لحاظ سے امراؤ جان ادا پچھلے تمام کارناموں
پر فوقیت رکھتا ہے اور بعد کے اکثر ناولوں سے بھی بہتر ہے ۔
ابتدائی حصہ جس میں ہیروئن کو قارئین سے متعارف کرایا گیا
ہے ، تعارف و تقریب کے ایک قدیم اور فرسودہ انداز کا نمونہ
ہے اور اسی لئے غیر دلچسپ اور بے جان ہے ۔ لیکن باقی تمام
قصہ جو خود نوشت سوانح عمری کے انداز میں ہے ، تنظیم ، باقاعدگی
توازن اور حسن تشکیل کے اعتبار سے لاجواب ہے ۔ واقعات
نہیں آہستہ آہستہ کھلتی ہیں ۔ ایک واقعے کے بطن سے دوسرا
واقعہ قدرتی طور پر پیدا ہوتا ہے ۔ اور قصہ دھیمے اور دلنشین
انداز میں بتدریج آگے بڑھتا ہے ۔ واقعات میں جو ترتیب ،
ربط ، تسلسل اور ارتقا ہے ، وہ ایک فطری انداز لئے ہوئے
ہے اور آورد یا ساختگی کے احساس سے قطعی مبرا ہے ۔ مجموعی
حیثیت سے فنی ضبط و احتیاط امراؤ جان ادا کی بہت نمایاں اور
قابل تعریف خصوصیت ہے ۔

جہاں تک موضوع کا تعلق ہے امراؤ جان ادا بظاہر
ایک طوائف کی زندگی کا مرقع ہے جس کے مختلف اجزا میں لکھنؤ
کی طوائفوں کی عام زندگی خود بخود جھلکتی نظر آتی ہے ۔ مگر غور
کیا جائے تو ناول کا موضوع اس سے کہیں زیادہ وسیع و فراخ
ہے ۔ دراصل مصنف نے انیسویں صدی کے لکھنوی تمدن و
معاشرت کی عکاسی کی ہے ۔ اس عکاسی میں کوئی غائیتی میلان
نہیں پایا جاتا ۔ کہا جا سکتا ہے کہ رسوا فن کار ہیں ، مبلغ یا
مصلح نہیں ہیں کہ اپنے تبلیغی مقاصد اور مصلحانہ عزائم کا برملا
اظہار کریں ۔ وہ جو کچھ دیکھتے ہیں ، اس کو خلوص اور دیانتداری
کے ساتھ پیش کر دیتے ہیں ۔ اصلاح یا انقلاب یا تخریب و تعمیر
سے کوئی سروکار نہیں رکھتے ۔ یہ بات ایک حد تک صحیح ہے ۔
تخلیقی فن کے آداب بلاشبہ اس کی اجازت نہیں دیتے کہ
کوئی ناول نگار اپنے مقاصد کو کھلم کھلا اور براہ راست پیش
کرے ، ان کا ڈھنڈورا پیٹے ، اور بھونڈی تبلیغ و تلقین پر اتر
آئے ۔ لیکن ہر فن کار سے یہ توقع ضرور کی جاتی ہے کہ اس کے ذہن
میں زندگی سے متعلق کچھ واضح اور معین مقاصد ہوں جن کو وہ فن اور
فنی تقاضوں کا مناسب احترام کرتے ہوئے پورا کرنے کی کوشش
کرے ۔ رسوا کا ناول فن اور مقصد کا یہ امتزاج پیش نہیں کرتا ۔
اگر وہ ایک طرف نذیر احمد کے ناولوں سے بہتر فنی کارنامہ قرار
پاتا ہے تو دوسری طرف کامیاب مقصدی ناولوں کی عظمت
اور گراں مائیگی سے بھی محروم ہے ۔ رسوا نرے حقیقت نگار ہیں
تنقیدی حقیقت نگار نہیں ہیں ۔

یہ مقصدیت کے فقدان اور نام نہاد غیر جانبدارانہ انداز
ہی کا نتیجہ ہے کہ رسوا اپنے ناول کے موضوع کے ساتھ پورا
انصاف نہیں کر سکے ہیں ۔ وہ طوائفیت کے ادارے پر جو کم و بیش

دس ہزار سال سے انسانی تمدن کے چہرے پر ایک بدنما داغ بنا ہوا ہے، سائنٹفک انداز میں روشنی نہیں ڈال سکے ہیں، نہ اس کو کسی جاندار تنقید کا نشانہ بنا سکے ہیں۔ وہ یہ واضح کرنے سے قاصر رہے ہیں کہ طوائف کا وجود جزو غیر منفک ہے اس معاشرے کا اور لازمی و قدرتی نتیجہ ہے اس نظام حیات کا جو معاشی استحصال پر مبنی ہو۔ استحصالی سماج عورت کی انسانی حیثیت کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ صرف اس کی جنسی حیثیت کو تسلیم کرتا ہے۔ ایسے سماج میں عورت محض جنس لطیف، محض آرائش خلوت اور شبستان عیش کی زینت خیال کی جاتی ہے۔ اس کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ اپنی انسانی صلاحیتوں سے کام لے اور اپنی دماغی یا جسمانی محنت سے اپنا پیٹ بھرے۔ جسم فروشی ہی وہ تنہا آزاد پیشہ ہے جس کو وہ ایسے سماج میں ہر وقت اختیار کر سکتی ہے۔ ادارۂ طوائفیت کے پس منظر میں جو معاشی اور تمدنی عوامل کارفرما رہے ہیں اُن سے رسوا واقف نہیں ہیں۔ وہ اس نظریاتی شعور اور سائنٹیفک انداز نظر سے قطعاً محروم ہیں جس کے بغیر موجودہ دور میں نہ صرف طوائف بلکہ مجموعی حیثیت سے عورت کے مسائل کو سمجھا نہیں جا سکتا، نہ ان خطوط کو واضح کیا جا سکتا ہے جن پر آئندہ نسوانی دنیا کا ارتقا ممکن ہے۔ امراؤ جان ادا میں اس نقطۂ نظر کی کارفرمائی نہیں ملتی کہ ہماری زندگی میں طوائف کا وجود نفرت کا مستحق نہیں بلکہ ہمدردی اور دل سوزی کا طالب ہے۔ مختصر یہ کہ رسوا مقصدیت اور مقصدی میلان کے نہ ہونے کے سبب سے طوائف کے موضوع پر ہمدردانہ اور روادارانہ نقطۂ نظر سے روشنی نہیں ڈال سکے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ موجودہ دور میں یہی نقطہ نظر ہے جس کو اختیار کر کے سماجی انصاف کے تقاضوں کو پورا کیا جا سکتا ہے۔ رسوا نے شہرۂ آفاق رُوسی ناول یاما دی پٹ کے مصنف الگزنڈر کپرن کی طرح طوائف اور طوائفوں کی زندگی سے متعلق ایک ناول تو لکھا لیکن وہ سماجی حیثیت کا وہ سائنٹیفک اور عادلانہ تجزیہ پیش کرنے سے قاصر رہے جو یاما دی پٹ کی روح رواں ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ رسوا نے اپنا ناول آج سے پچاس سال قبل لکھا تھا، اور ان سے یہ توقع ہرگز نہیں کی جا سکتی کہ وہ طوائف کے موضوع پر جدید سائنٹیفک نظریوں کی روشنی میں کچھ لکھیں گے اس فرض سے تو کوئی موجودہ دور کا مصنف ہی عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ قاضی عبدالغفار کی تصنیف لیلےٰ کے خطوط انھیں نظریات کی ترجمان ہے اور بیسویں صدی کے سائنٹیفک شعور کی پورے طور پر حامل ہے۔ یہ بات اپنی جگہ پر درست سہی۔ لیکن طوائف کی زندگی کو ناول کا موضوع بنانا اور وہ جو طوائف کے دل میں شریفانہ زندگی بسر کرنے اور انسان کی ایک نسل اپنی گود میں پالنے کی مبہم یا غیر مبہم خواہش لازمی طور پر پائی جاتی ہے اس سے اغماض برتنا اور پڑھنے والے کے ذہن میں اس کا احساس پیدا کرنے کی کوئی کوشش نہ کرنا ایک اہم انسانی ذمہ داری سے منہ موڑنے کے مترادف ہے۔ رسوا سے اتنی توقع ضرور کی جاتی ہے کہ ناول کے واقعاتی ارتقا سے کام لیتے ہوئے وہ اُس انسانی جوہر کو جھلکانے کی کوشش کریں گے جس سے کوئی بازاری عورت بے گانہ نہیں ہوتی۔ مگر افسوس کہ رسوا اس توقع کو پورا نہیں کرتے۔ ان کو اپنے ناول کی ہیروئن سے بظاہر کوئی ہمدردی نہیں، بلکہ اگر بین السطور دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اُن کے دل میں طوائف کے خلاف ایک غیر شعوری اور دبی دبی سی نفرت پائی جاتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے کے سماجی تعصبات کا شکار ہیں۔ اور ان کے زمانے میں ایک عام سطحی انسان کا جو نقطۂ نظر اس سلسلے میں تھا وہی ان کا زاویۂ نگاہ ہے۔ یہاں ان کی فنکارانہ غیر جانب داری بھی ختم ہو جاتی ہے۔

امراؤ جان ادا پر اظہار خیال کرتے وقت ضمناً اس امر کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے کہ بازاری عورت کو ناول کا موضوع بنانے میں رسوا کو اوّلیت کا شرف حاصل ہے۔ اُن سے پہلے سجاد حسین کسمنڈوی اپنے ناول نشتر میں اور نذیر احمد فسانۂ مبتلا میں طوائفوں کے کردار پیش کر چکے تھے۔ لیکن رسوا نے

شخص ہیں جنھوں نے طوائف کو ناول کا ایک مرکزی کردار قرار
دیا اور طوائف کی زندگی کو محور بنا کر اس کے ارد گرد ایک قصے
کے واقعات کا جال بُنا۔ ہرمائی فسانۂ مبتلا کی ہیروئن نہیں،
محض ایک ضمنی کردار ہے، جس کو مولوی نذیر احمد اپنے اخلاقی
درس کی تکمیل کے لئے ناول کے پلاٹ میں داخل کرتے ہیں۔
یہ اور بات ہے کہ وہ مصنف کی کوشش اور خواہش کے بغیر
ایک جان دار کردار ثابت ہوتی ہے۔ اور اہمیت میں ہیروئن
کو پس پشت ڈال دیتی ہے۔ (توبۃ النصوح میں یہی حال کلیم
کا ہے۔) نشتر کی ہیروئن بھی ناول کے پلاٹ میں غالباً وہ نمایاں
حیثیت نہیں رکھتی جو امراؤ جان ادا کی رسوا کے ناول میں ہے
پھر یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہرمائی نذیر احمد کے ناول
میں اس وقت داخل ہوتی ہے جب وہ بازار کی گندگی سے
نکل کر ایک مرد کا دامن تھام لیتی ہے۔ اسی طرح نشتر کی
ہیروئن کو صرف ایک حد تک طوائف کہا جا سکتا ہے کہ کسی اتفاق
کی بنا پر ایک کشمیری طائفے میں داخل ہو گئی ہے۔ اُس کو
پیشہ ورانہ زندگی اختیار کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے، لیکن وہ کسی
طور سے آمادہ نہیں ہوتی۔ مطلب یہ کہ نذیر احمد اور سجاد حسین
نے صحیح معنوں میں طوائف کی زندگی پر قلم نہیں اُٹھایا۔ اور
درحقیقت رسوا ہی اردو کے وہ پہلے ناول نگار ہیں جن کی نظر
اس طرف گئی۔

یہ ہے ایک سرسری روداد اس ارتقائی سفر کی جو اردو
ناول نے پیدائش سے عنفوان شباب تک طے کیا۔ اس روداد
میں صرف اہم منزلوں کی نشان دہی کی گئی ہے، اور صرف
چند بڑے اور نمایاں سنگ میل نظروں کے سامنے لائے
گئے ہیں۔ اس سفر کو ناکام یا غیر اطمینان بخش نہیں کہا جا سکتا
ادبی نشو و نما ارتقا کی رفتار قدرتی طور پر نہایت سست ہوتی
ہے۔ فکری اور ذوقی رجحانات کا قوام جلد اور آسانی کے ساتھ
گاڑھا نہیں ہوتا۔ خیالات کے رچنے میں دیر لگتی ہے۔ تجربات
کے کھلنے پھولنے کے لئے وقت درکار ہوتا ہے۔ نذیر احمد سے
رسوا تک کوئی بہت طویل مدت نہیں ہے۔ لیکن مراۃ العروس
اور امراؤ جان ادا کے فنی معیاروں میں بڑا تفاوت ہے۔ جو
تحریک مراۃ العروس کے ساتھ پیدا ہوئی اس کا امراؤ جان ادا
تک پہنچ کر جوانی کی منزل میں داخل ہو جانا خاصی توانائی
اور کافی تیز رفتار ترقی کا ثبوت ہے۔ یہ تحریک اپنی زندگی
کے اگلے مدارج اور ادوار میں اس توانائی کو اور ترقی کی اس
رفتار کو کس حد تک قائم رکھ سکی، یہ امر اس مطالعہ کی حدود
سے باہر اور ایک دوسری ادبی صحبت کا محتاج ہے۔

(بقیہ صفحہ ۳۶) سچل سے متعلق . . . . .

کی محبت اور پسندیدگی کے نقطوں پر ایک دوسرے سے اور
زیادہ قریب ہو جاتا تھا مذکورہ مضمون کی غیر ذمہ داری
کے سبب قربت کے ایک اور موقع سے محروم ہو گئے۔
آخر میں قارئین یہ ضرور یاد رکھیں کہ سچل سرمست
آج سے دو سو برس پیشتر کے شاعر ہیں چنانچہ ان کے نظریہ
یا ان کی اردو شاعری پر تنقیدی نگاہ ڈالنے سے پیشتر
اس دور کے ملکی اور مقامی ماحول نیز ان کے ہمعصر شعرا کو
نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔ ان کا اردو کلام بہت مختصر اور
جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کل پچاس غزلوں پر مشتمل ہے ان
کی فکری اور فنی قوتوں اور صلاحیتوں کا زیادہ سے زیادہ
بہتر اندازہ کرنے کے لئے ان کے سندھی اور سرائکی کلام کا
مطالعہ بھی ضروری ہے۔

اختر رضوی

سچل سے متعلق چند غلط فہمیوں کا ازالہ

ماہنامہ "ہم قلم" کے دسمبر ۶۰ء کے شمارہ میں "سچل
رمست کی "اردو شاعری" کے عنوان سے ایک مضمون میری نظر
سے گزرا ہے۔ جس میں سچل اور ان کی شاعری کا تعارف پیش
رنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سچل ۱۷۳۹ء میں موضع دراز
صیل گمبٹ (خیرپور ڈویژن) میں پیدا ہوئے اور ۱۸۲۹ء
ں رحلت کی۔ اس اعتبار سے وہ ہمارے ماضی کے شاعر ہیں
ر ماضی سے متعلق اس قسم کے تعارفی مضامین بڑی نیک
تی کے ساتھ لکھے جاتے ہیں۔ مقصد اس کے پس منظر میں یہ ہوتا
ہے کہ اس طرح پاکستان کے جملہ نئے اور پرانے باشندے
نی ادبی اور ثقافتی ورثہ کی قدر و قیمت سے آگاہ ہوں اور
ب ایسی فضا وجود میں آئے جس میں پاکستان کے جملہ باشندوں
ں حب الوطنی، یگانگت اور یکجہتی کے تصورات کو زیادہ سے
ادہ ٹھوس استحکام حاصل ہو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ماضی یقیناً حال سے کمتر اور
ں یقیناً مستقبل سے کمتر ہوتا ہے۔ لیکن مستقبل و حال کے
بلہ میں ماضی کی یہ کمتری کوئی ایسی کمتری ہرگز نہیں ہوتی
ہم اسے نظرِ حقارت سے ٹھکرا دیں یا اس سے اپنا رشتہ
طع کر لینے کی کوشش کریں۔ ہمیں یہ حقیقت ہر حال میں
پس کرتے رہنا چاہئے کہ اگر ہمارا "حال" شاندار ہے تو
ں کی تعمیر میں بنیادی طور پر ہمارے ماضی کا حصہ شامل ہے
اور یا اگر ہمارا مستقبل ہمارے حال سے بھی زیادہ شاندار ہوگا
تو اس کی تعمیر یقیناً ہمارے حال کی جد و جہد کی مرہون منت
ہوگی۔ انسانی معاشرہ میں کوئی ترقی براہِ راست آسمان سے
نازل نہیں ہوتی اور نہ اچانک طور پر ہی وجود میں آتی ہے
خواہ وہ گرد و پیش کا تعارف اور کائنات کا علم ہو خواہ فکر و
شعور اور تہذیب و تمدن۔ یہ سب ایک سے دوسرے اور
دوسرے سے تیسرے زینہ پر چڑھتے ہوئے آج اس عروج
تک پہنچے ہیں —— پتھروں اور خشک لکڑیوں کو باہم رگڑ
کر آگ پیدا کرنے والے لوگ آج کے مقابلہ میں کتنے ہی
غیر مہذب یا کمتر سمجھے جائیں لیکن دیا سلائی اور برقی آگ تک
ہم انھیں کے توسل سے پہنچے ہیں۔ آج ہم امراض و حوادث
سے محفوظ رہنے کے لئے دعاؤں، کرامتوں اور ٹونوں ٹوٹکوں
پر عقیدہ رکھنے والوں پر بجا طور پر ہنس سکتے ہیں لیکن انسانی
سماج کے اس ابتدائی دور میں جس میں کہ عام آدمی ایسی
ہر اُفتاد کے سامنے خود کو بے بس اور معذور پا کر مایوسی اور
پست ہمتی کے قعرِ عمیق میں گرتا جا رہا تھا ہمیں ٹونوں ٹوٹکوں
کے ایجاد کرنے والوں کو ویسا ہی محسنِ انسانیت اور دانا
تسلیم کرنا پڑے گا جیسا کہ آج ہم اپنے ڈاکٹروں اور سائنس
دانوں کو مانتے ہیں جو کہ ہمیں ہر آفت سے عہدہ برآ ہونے
کا یقین دلا کر ہم میں زندگی اور ترقی کی چاہ پیدا کرتے ہیں۔

اور زیادہ آسان صورت میں یوں سمجھئے کہ آپ چاہے اپنے والدین
ے اس وقت کتنے ہی زیادہ تعلیم یافتہ اور روشن دماغ
ہوں لیکن یہ آپ کو ماننا پڑے گا کہ اس دنیا میں آنے کے بعد
یہاں کی ابتدائی معلومات آپ کو اپنے والدین ہی کے ذریعہ
حاصل ہوئی ہیں اور اگر آپ کو ان سے یہ ابتدائی معلومات
حاصل نہ ہوتیں تو آپ ہرگز ہرگز اتنے تعلیم یافتہ یا روشن
دماغ نہ ہوتے کہ جتنا اب آپ خود کو سمجھتے ہیں —— انہی
حقائق کی بنا پر یہ کلیہ قائم ہوتا ہے کہ حال کی تعمیر کے لئے ماضی
کا مطالعہ اور مستقبل کی تعمیر کے لئے حال کا تجزیہ قطعی طور پر
لازمی ہوتا ہے۔ اسی لئے ہر زندہ قوم اپنے ماضی کی تاریخ،
روایات اور اپنے بزرگوں کے قدیم علمی و فکری نظریوں اور
تصورات کو زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتی ہے اور ان کا
احترام کرتی ہے۔ محض اس لئے نہیں کہ ان سب نے اس
کے حال کی تعمیر میں جو کردار ادا کیا ہے اس کا شکریہ ادا
کرتا ہے بلکہ اس لئے کہ ماضی و حال کا موازنہ مزید ترقی
حاصل کرنے کے جذبہ کو اعتماد اور تحریک دے، قدیم علمی
و فکری نظریوں کو موجودہ دور کے ترقی یافتہ تصورات سے
ہم آہنگ کیا جائے، کامیابیوں اور ناکامیوں کے سابقہ
تجربات سے فائدہ اٹھایا جائے اور ماضی کے روشن مرکزی
نکتوں پر قوم کے افراد کو مجتمع کر کے ان میں قومی یکجہتی اور
ملت کے تصورات کو منظم و مستحکم کیا جائے —— ماضی
کی اہمیت و احترام کا یہ نظریہ ہی ترقی پسند نظریہ ہے اور
اسے کسی طرح بھی ماضی پرستی یا رجعت پسندی کا نام نہیں
دیا جا سکتا۔ کیوں کہ اس نظریہ کا حتمی ردّ عمل حال کو اور آگے
بڑھاتا ہے ماضی کی سطح پر پلٹنے کی ہمت افزائی نہیں کرتا۔
مجھے کافی حد تک یقین ہے کہ مذکورہ بالا مضمون شعوری
یا غیر شعوری طور پر ماضی کے تعارف و احترام کے اسی ترقی
پسند اور صحت مند نظریہ کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ کیونکہ سچل
سرمست بھی ہمارے ان ممتاز قومی بزرگوں میں سے ہیں جنھوں
نے ہمارے لئے شعر و نغمہ کے لطیف پردوں میں سوز و گداز،
درد و محبت، وصل و فراق، حسن و عشق اور عشوہ و ادا کی کیفیات
کے قیمتی خزانوں کے علاوہ وحدت و کثرت اور معرفت و حقیقت
کے معنی آفرین پیرایہ میں انسانی عظمت و مساوات کا قابل
فخر پیغام چھوڑا ہے۔ ان کے دوہے، ابیات، کافیاں اور
سی حرفیاں آج دو سو برس سے وادیٔ سندھ، ملتان، بہاولپور
اور پنجاب کے ملحقہ علاقوں میں کیف و عقیدت کے ساتھ
گائی جاتی ہیں۔ اور وادیٔ سندھ میں انھیں صوفیوں کے تاج
اور شاعر بے نظیر کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔

پاکستان کے جملہ قدیم صوفی اور عوامی شعرا میں سچل
سرمست ہی وہ واحد بزرگ ہیں جنھوں نے اپنی مادری زبان
سندھی سمیت فارسی، سرائکی اور چار زبانوں میں کامیاب
شاعری کی ہے۔ ان میں فارسی اور سرائکی زبانوں کے متعلق
تو یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ اوّل الذکر کے سرکاری زبان
ہونے اور ثانی الذکر کے قریبی اور ملحقہ علاقوں میں رائج ہونے
کی وجہ سے وادیٔ سندھ میں ان کا چلن عام رہا ہوگا لیکن
اُردو کے بارے میں ایسی کوئی بات نہیں کہی جا سکتی کیونکہ
ان دنوں آج کی طرح نہ تو یہ قومی زبان کی حیثیت رکھتی تھی
اور نہ اس کے بولنے والے ہی آج کی طرح کافی تعداد میں
ہر جگہ پھیلے ہوئے تھے۔ ایسی صورت میں اگر میں ضعیفُ
الاعتقادی کا سہارا لوں تو کہہ سکتا ہوں کہ سچل پہلے ہی سے
جانتے تھے کہ اُردو ایک دن ان کے ملک کی قومی زبان
بنے گی۔ اسی لئے اسے عوام میں مانوس و مقبول بنانے کے
لئے انھوں نے اُردو میں شاعری کی۔ مگر اس خیال میں چونکہ
ضعیف الاعتقادی شامل ہے اس لئے جب تک کوئی اور بات
تحقیق میں آئے ہم اپنے اس قیاس پر اعتماد کر سکتے ہیں کہ
سندھ میں اُردو زبان بعض صوفیائے کرام، سیلانی فقرا، اور
دربارِ مغلیہ سے تعلق رکھنے والے بعض امرا، عمالِ فوجیوں
اور فن کاروں کے ذریعہ آئی اور سچل سرمست کے زمانہ

میں یہاں کچھ نہ کچھ اُردو جاننے والے ضرور موجود تھے خواہ ان کی تعداد چند سو ہی کیوں نہ ہو۔ بہرحال واقعہ کچھ بھی ہو لیکن یہ جیتی جاگتی حقیقت ہے کہ اپنے ہمعصر پاکستانی شعرا میں سچل سرمست نے سب سے پہلے اُردو زبان میں شاعری کی۔ ان کی چار سے لے کر نو اشعار تک کی پچاس غزلیں میری نظر سے گزری ہیں۔ ان کی زبان اتنی صاف اور سادہ ہے، انداز بیان اتنا مؤثر اور دلکش ہے اور مضامین اتنے بلند منفرد اور متنوع ہیں کہ بے ساختہ ان کی فنی عظمت دل میں گھر کر جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے اُردو اشعار میں ایک خاص قسم کی کیف و مستی کا جو سرور پایا جاتا ہے اور حسنِ ادا میں جو بے ساختگی اور بے تکلفی محسوس ہوتی ہے اس سے یہ گمان تک نہیں ہوتا کہ یہ کسی ایسے شاعر کے شعر ہیں کہ جس کی مادری زبان اُردو نہیں ہے۔ آمد اور برجستگی کا یہ حال ہے کہ ہر شعر بالکل اسی شکل میں نظر آتا ہے کہ جیسا وہ شاعر کے دل میں رہا ہو۔ سچل کے اُردو اشعار میں خیال اور اس کی ادائیگی کے مابین کہیں بھی اُلجھاؤ، تکلف، تصنع آورد یا ترجمہ کی اُدنیٰ جھلک بھی نہیں دکھائی دیتی۔ یہ خوبیاں انھیں اپنے بہت سے ہمعصر اُردو شعرا کے مقابلہ میں برتری عطا کرتی ہیں۔

لیکن، ہم قلم کے مذکورہ مضمون میں سچل کا تعارف جس انداز سے پیش کیا گیا ہے اس سے کچھ ایسا مترشح ہوتا ہے کہ مضمون نگار نے یا تو سچل کا ٹھیک سے مطالعہ نہیں کیا اور یا پھر ان کا قلم ان کے مطالعہ اور خیالات کا ساتھ نہیں دے سکا۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں وہ سچل کی اُردو شاعری کو معجزہ اور ان کی زبان و سلاست کی خصوصیت کو بہت سے قدیم اُردو شعرا پر سبقت تسلیم کرتے ہیں وہاں بہت سی ایسی غلط باتیں بھی کہہ جاتے ہیں کہ جن سے سچل کے کردار اور فن کے متعلق عام گمرہی پھیلتی ہے یا جن سے ملک کے ایک خاص حصہ کے لوگوں کے خلاف عام غلط فہمی اور تلخی کو ہوا مل سکتی ہے۔

یہ ملاحظہ ہو کہ مذکورہ مضمون کا مواد ہم قلم کے کل تین ص کا پھیلاؤ رکھتا ہے لیکن اس میں سچل کے محاسن پر مذکورہ بالا فقروں کے علاوہ کل مواد یا تو سندھی زبان اور شاہ عبداللطی بھٹائی سے متعلق ہے اور یا پھر اہل سندھ اور سچل کی تنقیص جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں مجھے صاحب مضمون کی نیک نیتی پر کوئی شبہ نہیں لیکن معاملہ یہ ہے کہ ان کی یہ نیک ن بدقسمتی سے ان کے انداز تحریر سے شکست کھا گئی ہے مضمون خ کچھ اپنے مواد ترکیبی سے اتنا بے ربط اور پراگندہ ہے کہ ا سے قاری کے ذہن پر کوئی صحت مند مجموعی تاثر نہیں ہوتا۔ ی نہیں چلتا کہ صاحب مضمون کیا کہنا چاہتا تھا اور کیا کہے جا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اسے ایک بار یا بار بار پڑھ کر ایک ایسا شخص جسے سچل اور اہل سندھ کے بارے میں حقائق زیادہ علم نہیں موصوف کے لفظوں میں یہ سمجھنے پر مجبور ہوتا کہ تہ بعض اہل سندھ سندھی زبان کے علاوہ کسی دوسری ز کے سیکھنے سمجھنے کو کفر کے مترادف تصور کرتے ہیں۔ اہل سندھ کے ذوق میں لونڈے کو ایک خاص درجہ حاصل ہ سچل سرمست کا محبوب بھی یہی سندھ کا سانولا سلونا لڑکا ہ انھوں نے اپنے اسی دلبر کی شان میں لاتعداد شعر کہے ہیں ان کے یہاں شاعری کا محور ان کا صرف یہی دلبر (لونڈا) وہ اپنی شاعری کو ایک علیحدہ ڈگر پر ڈالنا چاہتے تھے مگر ا فکر کی راہیں تبدیل کرنے کی عمداً کوشش میں ناکام رہ وہ اپنے خیالات کو اُردو شعر کے سانچے میں ڈھالنے پر قادر تھے مگر خیالات کی علٰحدہ علٰحدہ ترتیب و تہذیب پر حاصل نہ تھی ـــ وغیرہ وغیرہ۔ حالانکہ ان میں سے ایک بات بھی درست اور صحیح نہیں ہے۔

مجھے فاضل مضمون نگار کے حق تنقید پر کوئی اعتراض نہیں اور میں کسی بھی فرد یا گروہ کو خواہ وہ کسی حیثیت کا ہو کسی بھی دوسرے تعلق رکھتا ہو تنقید سے بالا تر نہیں سمجھتا

ٰوں نے اپنے اس مختصر سے مضمون میں غلط تنقیصی مواد کی
ٰزت اور اپنے انداز تحریر سے عام قاری کے ذہن پر سچل
ر اہل سندھ کی جو تصویر بٹھائی ہے میں اسے کسی بھی طرح
ٰی ایسی تصویر نہیں کہہ سکتا کہ جس میں صاحب تصویر کے
ٰ خدوخال کی ادنیٰ جھلک بھی پائی جاتی ہو۔

اہل سندھ کے بارے میں ان کا یہ کہنا کہ "وہ سندھی
ن کے علاوہ کسی دوسری زبان کو سیکھنا سمجھنا کفر کے برابر
تے ہیں" ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ مجھے اہل سندھ میں
ں مل کر رہنے اور انھیں سمجھنے برتنے کا فاضل مضمون نگار
، کہیں زیادہ موقع ملا ہے اور میں پوری ذمہ داری کے
ٰ کہہ سکتا ہوں کہ سندھ میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے
ٰ سندھی زبان کے علاوہ کسی دوسری زبان کو سیکھنا سمجھنا
ٰ سمجھتا ہو اور جہاں تک "سندھی اہل قلم" کا سوال ہے تو میں
ے یقین و اعتماد کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ ایک
سندھی اہل قلم ایسا نہیں ہے کہ جو سندھی کے علاوہ کوئی
ٰ نہ کوئی دوسری زبان نہ جانتا ہو۔ میری نظر سے آج
ٰ کسی سندھی اہل قلم کی کوئی ایسی تحریر نہیں گزری کہ جس
ٰ انھوں نے سچل سرمست کو اس وجہ سے "فراڈ" یا
ٰ الوقت" کے خطاب سے نوازا ہو کہ انھوں نے اُردو
ٰ بھی شاعری کی۔ میں بڑی حد تک وثوق کے ساتھ کہہ
ٰ ہوں کہ یہ "فراڈ" اور "ابن الوقت" کے الفاظ فاضل
ٰ ون نگار کے خالص اپنے ہیں جنہیں وہ محض بے خیالی
ٰ دوسروں سے منسوب کر رہے ہیں۔ جب تک موصوف
ٰ من میں کوئی حوالہ پیش نہ کریں اس وقت تک میں
ٰ اس رائے پر قائم رہوں گا کہ انھوں نے محض سچل اور
ٰ د کی محبت میں ایک رنگ پیدا کرنے کے لئے "بعض
ٰ نظر سندھی اہل قلم" کی تخلیق کی ہے۔ میرے خیال
ٰ اگر موصوف کو یہی کرنا تھا تو اس صنعت کی جگہ "بعض تنگ
ٰ ہل قلم" یا صرف "بعض اہل قلم" کے الفاظ ان کا مفہوم ادا

ادا کرنے کے لئے بالکل کافی تھے مگر "تنگ نظر" کے ساتھ یہ
"سندھی" کی تخصیص کم از کم ایک اَدبی مضمون کے لئے
کسی طرح مناسب نہ تھی۔ پُرانے دور میں تو تنگ نظر
سندھی، تنگ نظر مہاجر یا تنگ نظر پنجابی، پٹھان اور
بنگالی وغیرہ کی اصطلاحوں کی گنجائشیں تھیں مگر "نئی قدریں"
ان کی ہرگز متحمل نہیں ہو سکتیں۔ فاضل مضمون نگار کو اپنی
جانب سے ایسی اصطلاحوں کا آغاز نہ کرنا چاہیئے تھا۔

"لونڈوں" کے متعلق فاضل مضمون نگار کی یہ تحقیق، کہ
انھیں ارباب سندھ کے ذوق میں "ایک خاص درجہ" حاصل
ہے، بڑی دلچسپ ہے لیکن ان کی یہ تحقیق محض تصوراتی ہے
یا خیالی، مشاہداتی ہے یا تجرباتی اس کے بارے میں انھوں
نے کچھ نہیں لکھا یعنی ؎

کچھ بھید نہیں کھلتا کیا چیز ہے بنیادی

. . . .

بہرحال چونکہ ماضی و حال کے جملہ محققوں میں یہ ہمارے
بھائی "عین الف" ہی وہ پہلے محقق ہیں کہ جنھوں نے
ارباب سندھ میں اس ذوق کو دریافت کیا ہے اور اصرار
کرتے ہیں کہ اسے "خاص درجہ" حاصل ہے۔ لہٰذا اس پر
ہمدردی سے غور کیا جانا چاہیئے۔

پتہ نہیں یہ صاحب کہاں کے باشندے ہیں اور خود
ان کے ذوق کی کیفیت کا کیا خانہ ہے مگر "ارباب سندھ" کے
بعد جب وہ سچل سرمست کو بھی اسی ذوق میں گرفتار بیان
کرتے ہیں تو مجھے خواہ مخواہ یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ کہیں
یہ حضرت کوئی خاص رعایت تو نہیں پیدا کر رہے ہیں....
بہرحال جب وہ یہ غلط حتمی فیصلہ صادر کرتے ہیں کہ سچل کا
محبوب بھی یہی سندھ کا سانولا سلونا لڑکا ہے اور یہی ان
کی کل شاعری کا محور ہے تو اس سے کسی کو کوئی رعایت ملتی
ہو یا نہ ملتی ہو لیکن قاری کے ذہن میں سچل اور ان کی
شاعری کا مقام بالکل گر جاتا ہے۔ میں بلاخوف تردید کہہ

سکتا ہوں کہ جتنا یہ غلط ہے کہ سچل کا محبوب کوئی لڑکا تھا اتنا
ہی یہ بھی غلط ہے کہ ان کی شاعری کا محور صرف ان کا دلبر
ہے۔ دراصل فاضل مضمون نگار نے سچل اور اس کی
شاعری کو دوسروں کے سامنے پیش کرنے سے پہلے خود
بھی قرینے سے نہیں سمجھا ورنہ یہ حقیقت ان پر بھی منکشف
ہوتی کہ سچل کا محبوب بڑا عظیم المرتبت محبوب ہے، کبھی وہ
خود سچل کی ذات ہے کبھی کوئی اور پیاری ہستی اور کبھی
ذات خداوندی اور ان کی شاعری کا محور بھی صرف دلبر
نہیں بلکہ عشق ہے، انسانی مساوات ہے اور وحدانیت
ہے۔ ملاحظہ ہو۔

منصور ہو یا سرمد ہو صنم یا شمس الحق تبریزی ہو
اس تیری گلی میں اے دلبر ہر ایک کا سر قربان ہوا

نام و نشاں سے بنکے یگانہ دلبر اس جگ آئے گا
عشق کی اس کے ہے یہ نشانی دین اور کفر اڑائیگا

برائے خواہش الفت ہوا اظہار وہ بے چوں
اسی دنیا میں وہ دلدار بن انسان آیا ہے

سمجھا سچل نے بیشک مجھ میں ہے حق سمایا
جب سے ہے دل لگایا دوئی رہی ہے جاتی

عشقا امام میرا دیگر امام کیا ہے
میخانہ خود ہوا ہوں جرعہ یا جام کیا ہے

کیوں سہو کا سجدہ کرے وہ عشق ہے جس کا امام
دم بھر بھلانا دوست کو نے عاشقوں کا کام ہے

میں یار یار ہوں خود کچھ بھی نہیں تفاوت

یار مرا ہر صورت رنگا رنگی آپ دکھائے گا
ملا ہو یا قاضی ہو یا پھر سے تلک لگائے گا
حافظ بنکر حفظ کرے گا پوتھی بھی وہ پڑھائے گا
جوگی بنکر جوگ کما کر گنگا پر بھی جائے گا
ہاٹ پہ آکر بیٹھے گا اور پھر سے بانگ سنائے گا
لوں لوں نے وچ لالی لاکے پیالا عشق پلائے گا
شاہی نام جو آپ پہ دھر کے سارا دیس دبائے گا
مفتی بن کر فتویٰ دے کر سولی پر لٹکائے گا
بزرگ شیخ مشائخ بن کر ظاہر ذکر کمائے گا
کب کب منہ پر خاک ہے ملتا جامہ پھر پہنائے گا
سچل کیوں نہ پہچانی صورت سارا ایک سنائے گا
نوعا نوع پوشاکاں پاکے دلبر اس جگ آئے گا

تصوف کے مکتب فکر میں سچل وحدت الوجود کے نظریہ
کے مجتہد اور نقیب تھے۔ ان کا مقام معرفت ان بزرگوں سے
کہیں زیادہ بلند تھا جو ایک حد عروج پر جا کے ششدر
حیران اور "صم بکم" ہو کر لوٹ آتے ہیں۔ وہ اپنی نگاہ حقیقت
آشنا سے آفتاب اسرار کو حجابات کے گھنے بادلوں میں چھپے
ہونے کے باوجود دیکھنے پر قادر تھے فرماتے ہیں:

مری آنکھوں نے اے یارو عجب اسرار دیکھا تھا
میانِ ابر اس خورشید کا دیدار دیکھا تھا
حذر حاصل ہوا تھا جس جگہ ان علم والوں کو
وہاں میں نے وہی نور مبیں اظہار دیکھا تھا
برابر ہیں بہر جا جس طرح سورج کی یہ کرنیں
یہ ہر مظہر اسی انداز سے انظار دیکھا تھا
کنارا تھا نہ جس کا تو سچل اس بحر میں آیا
نگونسار اس میں ہر اک طالب دیدار دیکھا تھا

ایک اور مقام پر عالم کیف و مستی میں وہ رموز
معرفت کو اس طرح کھول کر بیان کرتے ہیں:۔

اگر اثبات کو سمجھا نہ ہے گر تو گدا ہوگا

فنا کی بات باطل ہے اگر تو ہم سے سچ پوچھے
خدا ہے تو بقا باللہ نہ ہرگز تو فنا ہوگا
نہ جلوہ گاہ ہے ہر دو جہاں نے کوئی جلوہ ہے
تری جائے نظر ہے تو نظر سے خود لقا ہوگا
زمیں پر کیا فلک پر کیا دگر کیا عرش وکرسی پر
دروں بیروں ہمہ ہر جا تو کلی جا بجا ہوگا
ہوالاوّل ہوالآخر ہوالظاہر ہوالباطن
یہاں بھی وہ وہاں بھی وہ سچل پھر تو کجا ہوگا !

بڑی بات یہ ہے کہ وحدت و معرفت کے اس بام
ارج تک جا پہنچنے کے باوجود سچل اس کے ابتدائی زینوں
نا اپنی ذات اور اپنے محبوب کو فراموش نہیں کر دیتے
رجس طرح وہ کثرت سے وحدت تک رسائی حاصل
بنے ہیں اسی طرح وحدت سے کثرت تک پلٹ کر اپنی
راج معرفت کی تصدیق کرتے ہیں۔ وہ رموز قدرت کا سراغ
لیتے ہیں مگر اس میں گم ہو کر فنا کی منزل میں داخل ہونا پسند
ہیں کرتے۔ اس لئے کہ ایسا کرنے پر نہ احساس وصل
نا رہے گا اور نہ لذت شوق۔ یہی نکتہ ان پر بشریت
عظمت و اہمیت منکشف کرتا ہے اور وہ خود کو پھر اسی
ل کے روپ میں ڈھالتے ہیں جس کے سینے میں ایک
ڑکتا ہوا دل ہے اور جس کا ایک مجازی محبوب بھی ہے
پل کی پختگی فکر یا رفعت عشق ہے کہ وہ جب چاہتے
ا اپنے محبوب کو مجازی رنگ میں دیکھتے ہیں اور جب
ہتے ہیں اس میں مظہر خداوندی کی نشان دہی کرتے
نے ہیں۔

جلایا طور سینا کو تھا جس نور تجلی نے
ترے کوچے میں اس انوار کو اظہار دیکھا تھا

اسے ابہام، تضاد یا تلون نہیں بلکہ تاسیس معرفت
ہا جا سکتا ہے۔ بہ ظاہر یہ راہ بڑی کٹھن ہے بلکہ بہت
ا دشوار ہے مگر سچل ہمیں اس میں پورے اعتماد کے

ساتھ گامزن دکھائی دیتے ہیں۔

یہ سچل کے فن اور دیانت کا کمال ہے کہ بشریت،
بشریت و رفعت کی درمیانی منزل اور معرفت کے مقام
اعلیٰ کی سطح پر سالک کے جذبات و احساسات کی جو کیفیت
ہونی چاہیئے اسے وہ بالکل اسی انداز میں پیش کرتے ہیں۔
یہ غزل دیکھئے اس میں آپ کو ہجر و وصل کا ذکر تو نظر آئے گا
اور ان کے تاثرات بھی سچل کے دل پر رینگتے دکھائی
دیں گے لیکن ان میں ہیجانی کیفیت اور مد و جزر کی بجائے
آپ کو ایک خاص قسم کا سکون نظر آئے گا اور آپ محسوس
کریں گے کہ اپنی بشریت اور معرفت کی اس درمیانی
منزل میں سچل محبوب کے وصل و فراق کو اس کی ایک ہی
دلکش ادا کے دو نام سمجھتے ہیں اور دونوں ہی سے مطمئن ہیں:

کاگا نے یہ خبر سنائی یار میرے گھر آئے گا
آئے گا دل جائے گا پھر تجھ کو برہ بچھائے گا
یار مرا عیّور ازل سے عاشق کو آزمائے گا
پہلے اپنا مکھ دکھلا کر پھر سے ہجر اڑائے گا
دم دم دوست دلاسا دیکر غم کا جام پلائے گا
کس دن آپ دکھائیگا پھر کس دن آپ چھپائے گا
سچل تجھ کو دلبر اپنا خود دیدار دکھائے گا
جب تب اوّل آخر ساجن پاؤں تمہے در پائے گا

لیکن وصل و ہجر کا یہ سرسری احساس عام انسانی
سطح کے جذبات کے مطابق نہیں اس لئے اپنے فیصلے کے
مطابق سچل آگے بڑھتے ہیں اور اسی مقام پر واپس
آجاتے ہیں جہاں سے چلے تھے یا جس مقام نے انھیں معرفت
کی رفعت تک پہنچایا تھا۔ یہ وہی مقام بشریت ہے جہاں
دل سوز فرقت میں تڑپتا ہے اور لذت وصل میں مدہوش
ہوتا ہے۔ جہاں عشق کی وحشت خیزیاں بھی ہیں اور حسن
کی فسوں سازیاں بھی۔ غمزۂ و اُدا کے کرشمے بھی اور فریاد
و فغاں کے نالے بھی۔ اب اپنے اس مقام پر پہنچ کر سچل ان

ی باتوں سے بالکل اسی طرح متاثر ہوتے ہیں کہ جس
ح ایک حساس انسان کو ہونا چاہیئے اور ان کا اظہار
ا اسی پر معنی، سادہ اور موثر پیرایہ میں کرتے ہیں کہ
ں طرح انکا جیسا ایک بلند پایہ شاعر کر سکتا ہے۔ ملاحظہ
:

زندگی میری بجز دوست کے ہے عین عذاب
خاک اس دید میں حاصل جسے دیدار نہیں

آئی نہ راس میری فریاد میرے گل کو
اس واسطے سیّحل میں چھوڑوں نہیں پکاراں

پھر دیکھ میری جانب تجھ بن پھروں اداسی
تیرے لئے گداگر میں در بدر ہوا ہوں

ایسی نہ تھی امید یہ دلبر نے کیا کیا
دل کو دلاسہ دے کے وہ دلبر چلا گیا
دل لوٹ لی مری نہیں جھانکا مری طرف
مجنوں بنا کے مجھ کو وہ دل سے بھلا گیا

کچھ نہیں تسکین دل کو ہجر کی بیہات سے
کیوں نہ دیوانہ بنوں جب دور وہ جانی ہوا
ہم نے دم بھر جلوہ دیکھا دے دیا اُسنے فراق
یہ وصال یار گویا ابر اسمانی ہوا

ترے ہی ناز سے آنکھوں کے میں غلام ہوا
ترا ہی عشق مرا پیشوا امام ہوا

کروں میں کس کو بھلا اپنے حال سے آگاہ
ترے ہی درد سے قصہ مرا تمام ہوا

کیا ہے دل پہ مرے عشق نے قیام اپنا
مرا فرائض و سنت کو اب سلام ہوا

تیرے جو نین دیکھے حیرت میں پڑ گیا ہوں
تو نے کیا ہے مجھ کو بے خواب شکر للہ

وہ شاہ عشق آیا دیکھو سیّحل تماشا
فرار ہو چکی ہے اب میری عقل ساری

مجھ کو فنا کرے گی جاناں تری جدائی
فرقت میں تجھے در در کرتا ہوں میں گدائی
تیرے فراق سے میں دیوانہ ہو رہا ہوں
مجھ کو ہوئی ہے حاصل الفت میں جگ ہنسائی
دو چار دن کا میلہ دو چار دن فراقی
سیکھی کہاں سے تو نے یہ رسم آشنائی
واپس نہ دے دل سیّحل کا کوچہ میں جو پڑا ہے
سینے پہ اس کے نوبت الفت نے ہے بجائی

یہ ہے طریق مشکل آساں نہ اس کو سمجھو
اس عشق میں ملے یارو صد جور صد جفا ہے
اس کو خبر نہیں ہے اس عشق کی ملے یارو
جو شخص ہے یہ کہتا معشوق بے وفا ہے

طالبیں کیا فلاطوں لقماں بھی قید ہوتا
اس زلف کے ستم نے سب پر اثر کیا ہے

ناحق مسافروں سے آنکھوں کی ہے لڑائی
تم نے تو گواہ ان پر ہر شہر و بر کیا ہے

مضمون کی مزید طوالت کے خوف سے سچل کے انہی
اشعار پر کفایت کرتے ہوئے اب میں قارئین سے سوال
کروں گا کہ کیا سچل کے ان اشعار میں کسی جگہ آپ کو کوئی
سانولا سلونا سندھی" ان کے محبوب کی حیثیت سے نظر آتا
ہے یا سچل کی شاعری کا محور یہی لڑکا محسوس ہوتا ہے
اور کیا آپ اس نتیجہ تک پہنچ سکتے ہیں کہ سچل اپنی مخصوص
ڈگر پر چلنے میں ناکام رہے ہیں۔؟۔

سچل نے سندھی، سرائکی اور فارسی میں زیادہ کھل
کر شاعری کی ہے اور ان میں سے ہر زبان میں ان کے
ضخیم دواوین موجود ہیں۔ لازم یہ تھا کہ فاضل مضمون نگار
ذمہ داری کے ساتھ سچل کو سمجھنے کے لئے ایک سرسری نظر
دواوین پر بھی ڈال لیتے اور اگر ان کے لئے یہ ممکن نہیں
تھا تو اپنے موضوع کے مطابق وہ کم از کم ان کے کل اُردو
اشعار تو غور سے دیکھ ہی لیتے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ
مطالعہ کی زحمت گوارا کرنے کی بجائے انھوں نے محض اپنی
ذہنی پرواز اور قلم کی روانی ہی پر زیادہ بھروسہ کیا۔ یہ
اسی کا نتیجہ ہے کہ نہ صرف خود انھوں نے سچل کے بارے
میں غلط رائے قائم کی بلکہ اوروں کو بھی غلط فہمیوں میں
مبتلا کر بیٹھے۔

ایک اعتراض اور رہ جاتا ہے۔ فاضل مضمون نگار
نے یہ بھی رقم کیا ہے کہ سچل اپنے خیالات کو تو اُردو اشعار
کے سانچے میں ڈھالنے پر قادر تھے مگر خیالات کی علٰحدہ
علٰحدہ ترتیب و تہذیب پر دسترس حاصل نہ تھی۔ مجھے
خیال میں فاضل مضمون نگار کا یہی ایک الزام ایسا ہے کہ
جس میں کچھ ذہانت کی چمک دکھائی دیتی ہے لیکن یہ ان
کی بدقسمتی ہے کہ اپنے اس فیصلہ کی تصدیق میں انھوں نے
جو مثال پیش کی ہے وہ ان کے الزام کو خود ہی سرے سے
غائب کر دیتی ہے۔ اس ضمن میں مزید فرماتے ہیں "یہی
وجہ ہے کہ ایک ہی غزل میں دلبر کا قصیدہ بھی ہے اور
نبیؐ کی مدح بھی۔ ایک غزل حمد کے مطلع سے شروع ہوتی
ہے درمیان میں دلبر صاحب تشریف لے آتے ہیں اور پھر
ایک شعر صاحب لولاک کے وصف میں بھی بیان ہو جاتا
ہے۔"

پہلے تو ان کی یہی ستم ظریفی ملاحظہ کیجئے کہ وہ غزل کے
اشعار میں مختلف فیہ مضامین بیان کرنے پر اعتراض کرتے
ہیں یعنی ایک غزل میں اگر دلبر کی تعریف بیان کی گئی ہے
تو اسی میں نبی کی مدح نہ ہونی چاہیئے۔ حالانکہ غزل کے
بارے میں یہ مسلمہ اصول ہے کہ اس میں دنیا بھر کے سارے
موضوعات پر شعر کہے جا سکتے ہیں اور کہے جاتے ہیں ــــ
لیکن اگر سچل کی اس خصوصیت کے پیش نظر کہ ان کی غزلیں
عموماً مسلسل ہوتی ہیں اور ان کے اشعار کے بنیادی موضوع
میں بڑی حد تک ہم آہنگی پائی جاتی ہے، یہ اعتراض وجہاً
مان بھی لیا جائے تو فاضل مضمون نگار کی یہ مزید ستم ظریفی
ان کی تکذیب کر دیتی ہے کہ جو مثال اس ضمن میں انھوں
نے سچل کی پیش کی ہے اس میں کہیں یہ نہیں پایا جاتا
کہ دلبر کی مدح کے ساتھ نبی کا قصیدہ بھی ہو۔ انھوں نے
اپنے دعوے کے ثبوت میں یہ شعر پیش کیا ہے،

گر دھی کو فرماں ہوا گھرے دوست پیارے کو بلا
صد ناز و عزت سے چلا وہ صاحب لولاک ہے

فرماتے یہ ہیں کہ یہ غزل حمد کے مطلع سے شروع
ہوئی درمیان میں دلبر صاحب تشریف لائے اور پھر یہ
شعر صاحب لولاک کے وصف میں ہو گیا۔ اس صریح جھوٹ
کی تصدیق کے لئے میں وہ پوری غزل قارئین کے سامنے
پیش کرتا ہوں:

حق پاک ہے حق پاک ہے حق خالق افلاک ہے
گر خرم و بیباک ہے گر خود بخود غمناک ہے
گر دھی کو فرماں ہوا گھرے دوست پیارے کو بلا
صد ناز و عزت سے چلا وہ صاحب لولاک ہے

گہ حیدرِ کرار ہے شاہِ یتیماں یار ہے
دلدل سوار آقائے ارض اور مالکِ افلاک ہے
گہ واعظِ شہرِ مبیں، میخانے میں بھی ہے مکیں
گہ خاک میں غلطاں ہے وہ گہ دست در فتراک ہے
گہ ہے حسین اور گہ حسن گہ ان کا رنگیں پیرہن
گہ سبز گہ سبزہ بدن گاہے وہ خوش پوشاک ہے
ہر جا ظہورِ یار ہے سب میں سچل اسرار ہے
دیکھا جسے با اعتبار اس کا جگر صد چاک ہے

یہ غزل سندھی ادبی بورڈ کے شائع کردہ سچل سرمست
سرائکی کلام کے مجموعہ کے آخر میں اُردو کلام کے صفحات پر بالکل
اسی ترتیب کے ساتھ موجود ہے جیسی کہ میں نے یہاں پیش
کی ہے اور اس غزل کے کل اشعار بھی اتنے ہی ہیں کہ جتنے
میں نے درج کئے ہیں۔ اب اسے سامنے رکھ کر قارئین کرام
خود انصاف سے فرمائیں کہ اس میں "صاحب لولاک" والے شعر
سے پہلے یا بعد میں، ہی کہیں وہ دلبر والا شعر کہاں ہے کہ جسے
بنیاد بنا کر فاضل مضمون نگار نے سچل کو خیالات کی ملحدہ ملحدہ
ترتیب و تہذیب دینے کی صلاحیت سے معذور بیان کیا
ہے اور آوارہ خیال مسلک فرما دیا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ
اسی "صاحب لولاک" والے شعر کے مصرعۂ اولیٰ میں جو لفظ
"دوست" آیا ہے وہی فاضل مضمون نگار کی نگاہوں میں
کھٹک کر دلبر کی شان میں ایک پورا ملحدہ شعر بن گیا ہو۔ !
اگر یہ معاملہ ہے تو میں ان سے عرض کروں گا کہ جناب والا!
یہاں دوست کے معنی ہرگز اس "سانولے سلونے لونڈے"
کے نہیں ہیں جو مذکورہ مضمون لکھتے وقت آپ کے ذہن پر
چھایا ہوا تھا بلکہ یہ شعر نبی کریم کی شان میں ہے اور معراج
کے واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے اور مصرعۂ اولیٰ کا فقرہ
"مجھے دوست پیارے کو بلا" ذات قدوس کی جانب سے
بصورت فرمان امین وحی سے منسوب ہے ــــ کاش کہ
آپ نے اس پر معمولی سی توجہ دی ہوتی اور اتنی بڑی غلط

فہمی کے شکار نہ ہوتے !!

اِس قسم کے غلط الزامات و اعتراضات کے علاوہ فا
مضمون نگار نے اپنے مضمون کے تقریباً نصف حصہ میں سند
زبان اور شاہ بھٹائی اور شاہ بھٹائی و سچل پر غیر متعلق تب
کے اپنے کافی فیصلے دیئے ہیں لیکن چونکہ ان کے ان فیصلوں
سچل سرمست کی اُردو شاعری سے جو کہ اصل موضوع ہے کو
تعلق نہیں اس لئے میں انھیں نظر انداز کرتا ہوں۔ البتہ
ان سے یہ ضرور کہوں گا کہ وہ اس کا خیال رکھیں۔ اگر شا
بھٹائی کے بعد سچل نے دلوں میں اپنا مسکن بنایا ہے تو یقی
ان کی راہ فکر اور ان کے انداز میں انفرادیت ہی ہوگی
سورج کے سامنے چراغ کی اہمیت ہی کون تسلیم کرتا ہے
بہر حال جیسا کہ میں شروع میں عرض کر چکا ہوں مجھے
اس بارے میں بڑی حد تک کوئی شبہ نہیں کہ فاضل مضمو
نگار سچل سرمست اور ان کی اُردو شاعری کو بڑی نیک نی
کے ساتھ متعارف کرنا چاہتے تھے لیکن جیسا کہ میں اپنے اس
مضمون میں بحث کر چکا ہوں ان کی یہ نیک نیتی ان کی تح
اور غلط بیانی کا ساتھ نہ دے سکی ــــ اگر اس قسم کے تعار
مضامین کی اشاعت و تبلیغ کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ ہم اپ
ماضی کے ثقافتی ورثہ سے زیادہ سے زیادہ صحیح طور پر با
ہوں، ہم میں حب الوطنی اور قومی یکجہتی کے احساسات
پکڑیں اور ہم اپنے ماضی کے ان فکری نظریوں کو جو آج بھ
ہمارے عوام کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں دورِ حا
کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کریں تو مجھ
علاوہ آپ بھی پوری ایمانداری کے ساتھ یہ کہنے پر مجبو
ہوں گے کہ "تین الف" صاحب کا مذکورہ مضمون ہرگز ہر
اس مقصد کو پورا نہیں کرتا۔ بلکہ ایک جانب اس مضمو
نے سچل سرمست اور ان کی شاعری کو اُردو حلقوں میں نظ
سے گرا دیا ہے اور دوسری جانب سندھی حلقوں میں شکای
اور بے چینی پیدا کر دی ہے۔ اور یہ دونوں حلقے کہ جنہیں ہم

(باقی بر صفحہ ۱۲۹)

مصنّفین کی تخلیقی سرگرمیاں

(کتابیں جو حال ہی میں چھپی ہیں یا زیر طبع/زیر تصنیف ہیں)

سیدہ انیس فاطمہ
ان کا معاشی پس منظر
تحقیقی مضامین) قیمت -/۲
بیر احمد عثمانی کالونی ناظم آباد کراچی

عارف حجازی
یادیں کچھ افسانے
(رپورتاژ کا مجموعہ)
ت پاکستان. بی-۵/۳۵ گوجرانوالہ ناظم آباد کراچی
قیمت ۲ روپے ۵۰ پیسے

اختر انصاری (دہلوی)
ل اور درس غزل
(غزل کی تعلیم پر پہلی تصنیف)
ترقی اردو (ہند) علی گڑھ - یوپی
قیمت -/۲

بادۂ شبانہ
غزلیات اور نظموں کا مجموعہ)
قیمت -/۳
ادارۂ فروغ اردو - لاہور

ٹیڑھی زمین
لطائف کا مجموعہ) زیر طبع

مطالعہ و تنقید
(تنقیدی مضامین کا مجموعہ)
(زیر طبع)

یادوں کے چراغ
کے اور مرثیے) (زیر طبع)

کرشن چندر
سڑک واپس جاتی ہے
(نیا ناول) قیمت ۶ روپے/۵۰ پیسے
ناشر: مکتبۂ افکار - رابسن روڈ - کراچی

پروفیسر سید نواب علی
تاریخ صحف سماوی
(تاریخ و تحقیق)
ناشر: مکتبۂ افکار - رابسن روڈ - کراچی

کرشن چندر
ایک خوشبو اُڑی اُڑی سی
(نئے افسانوں کا مجموعہ)
(زیر طبع)
ناشر: مکتبۂ افکار - رابسن روڈ - کراچی

انجم اعظمی
۱- لہو کے چراغ
(شعری مجموعہ) قیمت -/۴
ناشر: کراچی آرٹ اکیڈمی - معرفت انٹرنیشنل
بک ڈپو - مشن روڈ - کراچی
۲- لب و رخسار
(عشقیہ نظمیں) (زیر طبع)
۳- غالب کی اردو شاعری
(تحقیق و تنقید) زیر تصنیف

خورشید احسن صدیقی
شبلی بحیثیت اردو شاعر
(تنقید) (زیر طبع)

نظیر صدیقی
شہرت کی خاطر
(انشائیوں کا مجموعہ) (زیر طبع)
ناشر: پاک کتاب گھر - پٹواٹولی - ڈھاکہ ۱

ڈاکٹر رب نواز اورک زئی
فلسفۂ زندگی
(مضامین کا مجموعہ) زیر تصنیف

وفا راشدی
۱- حیاتِ وحشت
(وحشت کلکتوی کے حالات زندگی، شخصیت شاعری
اور فن کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ) زیر تصنیف
۲- یادگارِ وحشت
(وحشت کلکتوی پر مضامین کا مجموعہ) زیر تصنیف
۳- نئی بنگلہ کہانیاں
(بنگلہ کہانیوں کا مجموعہ) زیر تصنیف
۴- بے ایمان
(بنگلہ ناول کا ترجمہ) زیر تصنیف

ابن انشا
چینی نظمیں
(قدیم و جدید چینی شاعری کے منظوم تراجم) قیمت -/۳
ناشر: لاہور اکیڈمی - ۲۰۵ سرکلر روڈ - لاہور

انور
سورج بھی تماشائی
(افسانوں کا تیسرا مجموعہ) زیر طبع

عبدالعزیز خالد
گلِ نغمہ رابندرناتھ ٹیگور کی معرکۃ الآرا کتاب

ار جعفری
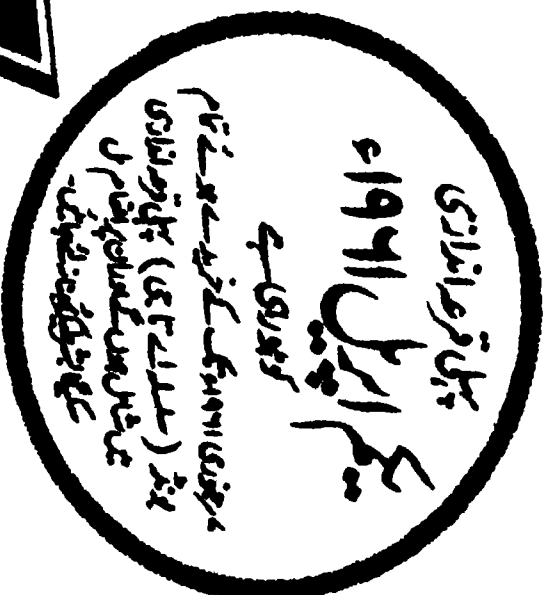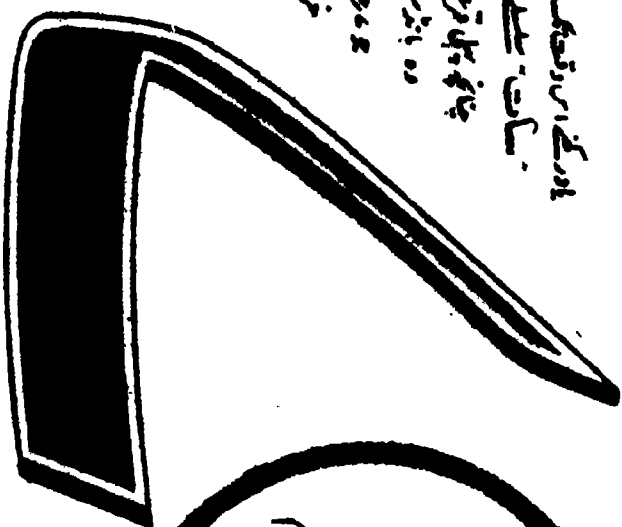
پھراک دن ایسا آئے گا
نکھوں کے دیئے بجھ جائیں گے
اتھوں کے کنول کمھلائیں گے
اور برگ زباں سے نطق وصدا
کی ہر تتلی اُڑ جائے گی
اک کالے سمندر کی تہہ میں
لیوں کی طرح سے کھلتی ہوئی
پھولوں کی طرح سے ہنستی ہوئی
ساری شکلیں کھو جائیں گی
خون کی گردش، دل کی دھڑکن
سب راگنیاں سو جائیں گی
اور نیلی فضا کی مخمل پر
ہنستی ہوئی ہیرے کی یہ کنی
یہ میری جنت، میری زمیں
اس کی صبحیں، اس کی شامیں
بے جانے ہوئے، بے سمجھے ہوئے
اک مشتِ غبارِ زمانہ پر
شبنم کی طرح رو جائیں گی
ہر چیز بھلا دی جائے گی

یادوں کے حسیں بُت خانے سے
ہر چیز اُٹھا دی جائے گی
پھر کوئی نہیں یہ پوچھے گا
سرؔدار کہاں ہے محفل میں

لیکن میں یہاں پھر آؤں گا
بچّوں کے دہن سے بولوں گا
چڑیوں کی زباں سے گاؤں گا
جب بیج ہنسیں گے دھرتی میں
اور کونپلیں اپنی انگلی سے
مٹی کی تہوں کو چھیڑیں گی
میں پتّی پتّی، کلی کلی
اپنی آنکھیں پھر کھولوں گا
سرسبز ہتھیلی پر لے کر
شبنم کے قطرے تولوں گا
میں رنگِ حنا، آہنگِ غزل
اندازِ سخن بن جاؤں گا
رُخسارِ عروسِ نو کی طرح
ہر آنچل سے چھن جاؤں گا

جاڑوں کی ہوائیں دامن میں
جب فصلِ خزاں کو لائیں گی
رہرو کے جواں قدموں کے تلے
سوکھے ہوئے پتّوں سے میرے
ہنسنے کی صدائیں آئیں گی
دھرتی کی سنہری سب ندیاں
آکاش کی نیلی سب جھیلیں
ہستی سے مری بھر جائیں گی
اور سارا زمانہ دیکھے گا
ہر قصّہ مرا افسانہ ہے
ہر عاشق ہے سردار یہاں
ہر معشوقہ سلطانہ ہے

میں ایک گریزاں لمحہ ہوں
ایّام کے افسوں خانے میں
میں ایک تڑپتا قطرہ ہوں
مصروفِ سفر جو رہتا ہے
ماضی کی صراحی کے دل سے
مستقبل کے پیمانے میں
میں سوتا ہوں اور جاگتا ہوں
اور جاگ کے پھر سو جاتا ہوں
صدیوں کا پرانا کھیل ہوں میں
میں مر کے امر ہو جاتا ہوں

○

انور فرہاد

سورج مکھی

آنکھیں سرخ ہیں، چہرہ زرد
جسم دہکتا ہے، دل سرد
آئینے پر جمی ہے گرد
آنکھ سے جھانک رہا ہے درد
آ اس بستی تک خورش

مستقبل

دامنِ شب کا کنارا چھوٹا
اک چمکتا ہوا تارا ٹوٹا
اک دہکتا ہوا دھارا پھوٹا
رات بے نور ہے، بھرپور نہ
منزلِ صبح بہت دور نہ

سید فیضی

میں تماشہ ہوں، تماشائی بھی ــــ

کون کہتا ہے کہ فن کار ہوں میں ؛
فکر و احساس کا مارا ہوا اک انساں ہوں
جس کے ٹوٹے ہوئے معصوم سے نازک دل پر
صاف اُبھرے ہوئے آتے ہیں نظر
چند بے نام سی چوٹوں کے نشاں ــــ
اور لوگ ــــ
میرے آئینۂ ہستی کی ضیا تابی میں
دیکھ کر عکس خود اپنا یہ سمجھ لیتے ہیں
جیسے فن کار ہوں میں !
کیا اسے ندرتِ تخیل کہوں
یا گرانباریٔ ذہن ــــ
سینکڑوں نغمے گھٹا بن کے برس پڑتے ہیں
نغمے ــ ہنستے ہوئے، روتے ہوئے، مغموم، اداس !!

زندگی ــ ایک ادائے پرفسوں
کائنات ــــ ایک تبسم پہ نثار
کبھی بھی مری شاداب نگاہی کا فسوں
جیسے موجوں میں لرزتا ہوا پندارِ سکوں
جیسے بازیچۂ فطرت کا طلسمی ہیجان
پھیلتی راہوں میں دیوار سی حائل کر دے
جیسے بے نام سے خوابوں میں کوئی اترا کر
اک نہ اک رنگِ حقیقت بھر دے !!
کالی چادر پہ چمکتے ہوئے موتی ــــ اور میں
بکھری بکھری ہوئی زلفوں کے گھنے سایوں میں
لرزشِ موجۂ انوار سے تابندہ ہوں۔
مضمحل ہے یہ پُراسرار خموشی، لیکن
ایک ہنگامۂ محشر ہے بپا
کہیں ہنسنے، کہیں رونے کی صدا ــــ
کتنی صدیوں سے مرے ذہن کی شورش کا مزاج
اِن مسائل سے اُلجھتا ہی رہا !

قہقہے میرے ہیں اور بھیگے ہوئے یہ آنسو
غم کے ماتھے سے جو ٹپکے ہیں پسینہ بن کر
میرے ہیں ــ اور یہ فضائیں کہ جہاں
پھول کے ساتھ ہی کانٹے بھی لگے رہتے ہیں
جہاں طوفان بھی چشموں کی طرح بہتے ہیں
زخمۂ شوق سے چھڑتا ہے جہاں دل کا رباب
سسکیاں بن کے پگھلتا ہے جہاں عہدِ شباب
برق پاروں سے اُلجھتی ہے جہاں طبعِ رواں

چاند بھی اپنی جوانی کو لٹاتا ہے جہاں
سب کے سب میرے ہیں،
میں خالقِ رعنائی ہوں
وقت ہے میرا تماشا، میں تماشائی ہوں۔

میری آنکھوں میں دہکتی ہوئی زیبائی ہے
میں خدا ہوں! مری تخلیق میں پیدائی ہے
میرے ماحول نے فطرت سے جلا پائی ہے
میری جو بات ہے، اعجازِ مسیحائی ہے
میرا ہر شعر وہ روتا ہُوا نغمہ ہے جسے
خلشِ خار سے بے وقت ہنسی آئی ہے
سسکیاں بھی مری چیخوں کا اثر رکھتی ہیں
اور یہ میرا تبسم تو خدا جانے کیا ——— !

دیکھ یہ حلقۂ گرداب ہے یا موجیں ہیں
روز اُٹھتا ہے یہ طوفان مرے سینے میں
میں سمندر ہوں ———
سمندر تو مگر،
گھٹتے بڑھتے ہوئے آسودۂ ساحل ہی رہا
اور میں ——— !
میری آنکھیں نہیں، میں پیکرِ بینائی ہوں
راہ چلتے ہوئے، بڑھتے ہوئے لاکھوں منظر
جن میں نیلام بھی شامل ہے مرے گیتوں کا

چھوڑتے جاتے ہیں میرے لئے قدموں کے نشاں
وقت بدلے کہ تڑپتا رہے فرسودہ نظام
اس چمکتے ہوئے سورج کی قسم
میری قسمت ہے سرافگندہ، خموش
اپنے دامن میں چھپکتے ہوئے طوفان لئے
اپنی منزل پہ شب و روز نظر رکھتا ہوں
جانے کیا بات مری فطرتِ فن کار میں ہے
میں اگر چاہوں تو انگاروں پہ نیند آجائے
میں اگر چاہوں تو کانٹوں سے گذارا کرلوں
یہ بھی ممکن ہے سویرا ہوجائے
فرشِ مخمل پہ مجھے کروٹیں لیتے لیتے ———

میری آواز میں رَس ہے، مری آہوں میں اثر
میں گنہگار نہیں ———
ایک شفاف سا آئینہ ہوں جس میں ہر عکس
اپنی فطرت کے مطابق ہی ڈھلا کرتا ہے
وہ شرر ہوں کہ مرا ذوقِ تپش اپنا کر
اک زمانہ مری مانند جلا کرتا ہے
میرے انفاس میں مضمر ہے نمودِ مہ و سال
میری ہر بات کو وقت اپنی کہا کرتا ہے
کون ہے جو مری پرواز کو محدود کرے
اور میں نے تو محبت کی ہے !

عبدالعزیز فطرت

چاندنی

نگاہِ تشنہ کی بجھا رہی ہے پیاس چاندنی
کہ ہے جنون و جذب کی مرے اساس چاندنی

عجیب دھیمے پن سے کہہ رہی ہے داستانِ غم
فسردہ رو شکستہ دل اُداس اُداس چاندنی

سخنوری کی چاشنی لئے ہوئے سکوت میں
ریاضِ دلبری کی لے کے آئی، باس چاندنی

مرے دلِ حزیں کو اپنا ہم مذاق جان کر
اُتر پڑی حریمِ دل کے آس پاس چاندنی

اُداسیوں سے اس کی مجھ کو دولتِ سکوں ملی
شگفتگی کی یاد میں رہی اُداس چاندنی

نجمہ جمالی

رات

ان درختوں کی اوٹ میں چھپ کر
چاند، صد سالہ وارداتوں کی
پھر کہانی سنانے والا ہے
سیکڑوں سال پچھلی راتوں کی

نکہتیں لے کے دوش پر اپنے
ہولے ہولے صبا گزرتی ہے
یہ عروس چمن کی رعنائی
شب میں سو سو طرح سنورتی ہے

وادیٔ نیل کی حسیں پریاں
دھیمے دھیمے سُروں میں گاتی ہیں
نہیں معلوم کس زمانے کا
اک فسانہ سنائے جاتی ہیں

رات خاموشیوں کے مدفن میں
کتنی مدہوش ہو کے سوتی ہے
صبحدم گل کا چہرہ نم ہوگا
رات بھر دل کی آنکھ روتی ہے

بے نیازانہ کوئی زہرہ جبیں
سیکڑوں پھول بھر کے دامن میں
کیوں سرِ شام ہی سے بیٹھی ہے
اپنی تنہائیوں کے آنگن میں

تاج سعید

دوہے

سانولا سلونا پنڈا تیرا، اور ری مچھیرن ہائے
تن کے اس سناٹے میں وہ جانے کیسے بلائے

بدن سنہرا مہکے تیرا چندن کی خوشبو سے
گورا گورا مکھڑا گوری دمکے لال لہو سے

پیشانی جوں چندن تختہ، موتی ایسے گال
بانہوں میں ہی رات کی رانی، ریشم جیسے بال

نار نہ کوئی اس نگری میں اپنی بندھائے ڈھارس
یہ کیسا ہے متھرا اپنا، یہ کیسا ہے بنارس

محل میں بیٹھی چھم چھم کرتی دیکھی اُلھڑ نار
اس سنگ پریت لگائیگا جو ہوگا شاہو کار

جھم جھوم پشاور روُھرتی متھرا کی ہے آس
تاجؔ پیا اس روگ کے کارن رہے سدا اُداس

ارتضیٰ عزمی

دوہے

اُردو میں دوہے کہہ کہہ کر ہم ہندی آمیز
سُلگ رہی ہے آگ جو من میں کریں ہیں اس کو تیز

دُوہا ہو یا شعر غزل کا سب کی ایک ہی ریت
دل سے اُٹھے تو سب کے من میں اُترے ہے سنگیت

رادھا ہو یا گُل تو اُس پر آئے ہے الزام
کوئی نہ پُوچھے کاہے بجائے ایسی مُرلیا شیام

جان کے بدلے سستی ہے اس کے چرنوں کی دھول
ڈگر ڈگر میں کھلا دیئے ہیں جس نے ہزاروں پھول

کبھی کبھی تنہائی میں مجھ کو ہوا ہے یہ احساس
ابھی ابھی جیسے بیٹھا تھا کوئی میرے پاس

دل والے پھر کس کارن دُکھ درد کا بوجھ اُٹھائیں
جب ان کے ہوتے دنیا میں پتھر پُوجے جائیں

آ بھی جا او چندر کماری بیت نہ جائے رات
پھر تیرا رستہ روک نہ لے کہیں کرنوں کی برسات

ساجن میں گوری کے آنچل کے من ایسے لہرائے
جیسے تیز ہوا میں عزمیؔ دیئے کی لَو تھرائے

جس کے من میں رچا بسا ہو ماتر بھوم کا پیار
اس کے ہاتھ میں دونوں برابر، قلم ہو یا تلوار

محمد عمر میمن

تجربہ

بات گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی ہوئی ریشم کے کیڑوں تک آپہنچی۔ بوڑھا کرنل اس سے کہہ رہا تھا وہ اسے چائنیز ایمبیسی سے ریشم کے کیڑوں کو پالنے سے متعلق لٹریچر لا دے۔ دراصل ان دنوں اسے سندھ کے کسی دور دراز علاقہ میں ہندوستان میں چھوڑی ہوئی اپنی زمین کے عوض بہت ساری زمین الاٹ ہوئی تھی۔ اور عنقریب وہ وہاں شہتوت وغیرہ کی کاشت کرنے کا ارادہ رکھتا ہے جس سے وہ ریشم کے کیڑے پالے گا۔

"دیکھو تو سہی! —— میں اپنے ملک کے لئے کتنے فیضان بخش ذریعے کا اہتمام کر رہا ہوں۔ سلک انڈسٹری سمجھے —— !" کرنل مسکرانے لگا ——

اور پھر جب بوڑھے، انڈین آدمی سے رٹائرڈ کرنل کی آنکھوں میں نیند کا سحر آلود نشہ، سرخ شہابی ڈورے بھر کر کچھ اور بھی شدید ہو گیا تو اس نے سوچا اب چل دینا چاہیئے، رات بہت بھیگ چکی ہے۔ اُٹھنے کی آہٹ پاکر نیم غنودگی کے عالم میں کرنل نے چونک کر پوچھا: "کیوں —— ؟" تو اس نے دھیمے سے اُونگھتے ہوئے کرنل پر الوداعی نظریں ڈالتے ہوئے کہا:

"اچھا تو اب میں چلتا ہوں ——"

"اچھا ——" اس نے نیند سے بوجھل آواز میں جواب دیا اور شب خوابی کے ڈھیلے ڈھالے لباس میں صوفے پر کچھ اور سمٹ سا گیا۔

وہ باہر برآمدے میں نکل آیا۔ خزاں کے دریا
تھے، ماہ کا وسط تھا اور چاند کی ساری چمک اپنے بر
لئے اکاسیا کے کہن سالہ پیتوں سے بتر اور ہیکل در
اُٹھائے ننگی باہیں پھیلائے ٹنڈ منڈ سے کھڑے تھے
سرخ بجری والی سڑک پر ہولیا جو نیم دائرے کی صور
گیٹ تک جاتی تھی۔ ہر طرف بوجھل سناٹا دھیمے د
میں فضا سے سرگوشیاں سی کر رہا تھا جیسے رات دبے
سے گزر رہی تھی۔ فضا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی۔ اس نے ج
سگریٹ نکال کر سلگائی، کوٹ کے کالر چڑھائے اور
جیبوں میں ہاتھ ڈال کر شانوں کو اُونچا کیا اور دھیمے
میں دبلی سگریٹ کے کش لیتے سرخ سرخ بجری کا سینہ
چلنے لگا۔ گلاب کی کیاری کے نزدیک کوئی سفید لباس
سوکھی گھاس پر بیٹھا تھا۔ خشک پتوں پر اس کے ق
آہٹ اُبھر رہی تھی جس سے اس نے یک لخت سرا
دیکھا۔ وہ اسے دیکھتی ہی رہی، یکایک اس کی نظر بھی
پڑ ہی گئی، رٹائرڈ کرنل کی بیٹی کو دیکھ کر وہ سڑک
گلاب کی کیاری تک آیا۔۔۔ دونو ایک دوسرے کو د
لمحات ایک دوسرے کے سینے میں جذب ہوتے گئے۔ ا
لمحہ میں وہ اسے بے حد حسین نظر آئی۔ وہ ایک لمحہ خامو
اتھاہ ساگر میں ڈوبتا چلا گیا اور پھر وہ بغیر کچھ کہے سنے

ں کی طرف چل دی۔ دیر تک خشک پتے اس کے جاتے قدموں
ہوئے مجروح ہو کر سرگوشیاں کرتے رہے۔ وہ وہیں کھڑا
ا

"ہنہ ——— تو گویا محترمہ آپ کا یہ انداز ہے۔ خیر دیکھا
گا!" اس نے بالکل غیر ارادی طور پر طنزیہ انداز میں [illegible]
ح بڑبڑاتے ہوئے شانوں کو جنبش دی اور سگریٹ کو جوتے
ل کر زور گیٹ سے باہر نکل آیا۔

اسی شام کرنل اور اس کی بیوی کے بے حد اصرار پر
نے کھانا بھی وہیں ان کے ساتھ کھا لیا تھا۔ اور پھر رات
ں باتیں کرتا رہا تھا۔ وہ باتیں جو مختلف مدارج سے گزرتی
زکار کرنل کے ماضی اور اس کے گذشتہ کارناموں سے
تیں یہ باتیں ——— جیسے وہ گذرگاہیں تھیں جو خواہ کتنی
ے دوسرے سے مختلف ہوں، مخالف سمتوں میں جاتی ہوں
ں یا مخالف ہوں نا ممکن تھا کہ کرنل کی زندگی کے چوراہے
گزرتی ہوں۔

اں بجے تک سب ہی اُٹھ کر اپنے اپنے کمروں کی جانب
ئے تھے ایک کرنل ہی ایسا تھا جو اب بھی اس سے گفتگو کرنے
ں نظر آتا تھا۔ اس کی باتوں سے ظاہر تھا کہ ان دنوں اس
دگی گرمیوں کی خشک جھلستی ہوئی دوپہر سے زیادہ
ان تھی۔ بہت اُجاڑ، غیر جاذب، بے کیف اور خشک!
ے پنشن لئے ایک عرصہ گزر چکا تھا۔ سارے رفقاء
کے سبب بچھڑ کر اس کی طرح جانے کن اُجاڑ ویرانوں میں
گذار رہے تھے۔ زندہ تھے یا مرکھپ چکے تھے اسے کچھ
ر نہ تھا۔ بس اب تو اسے بڑی شدّت سے کسی ایسے آدمی
تھی جس سے گھنٹوں وہ اپنے تابناک ماضی کی باتیں
۔ اور جو اس کی ویران زندگی میں پھیلی لامتناہی
ں کے احساس کو زائل کر سکے۔ اس کے تمام گزرے
ہوں کو اس سے کُرید کُرید کر پوچھے ان میں دلچسپی کا
ے تاکہ کرنل کو اپنے بے مصرف ہونے کا احساس بالکل

نہ ہو سکے جو کسی ویران سی جگہ پر زندگی گزار رہا ہے۔ اور اب
جس کی ضرورت دنیا کو نہیں رہی۔ اپنے گزرے کارنامے سناتے
وقت بوڑھے کرنل کی گدلائی ہوئی آنکھوں میں چمک بڑھ
جاتی، سینہ فخر سے پھول جاتا۔ اور تب ایسے بوجھل لمحوں میں
وہ شدت سے محسوس کرتا کہ کرنل کی باتیں اس کے ماضی کی صدائے
بازگشت ہیں۔ راکھ کے نیچے دبی ہوئی وہ چنگاریاں ہیں جن
کو کرید کرید کر وہ اپنی گلیشیر کے برفانی تودوں کے نیچے
ٹھٹھری ہوئی منجمد زندگی کی بقا کے لئے تھوڑی بہت حرارت
فراہم کر لیتا ہے۔ اور اب تو وہ عمر کے اس دور سے گزر رہا تھا
جب انسان کے پاس محض ماضی کی یادوں کا سرمایہ ہی باقی
رہ جاتا ہے تاکہ اس سے بوجھل حال، گھمبیر اور بے کیف مستقبل
کے احساس سے نجات پائی جا سکے ——— ماضی کی یادیں ——— وہ
ماضی جو خواہ کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو۔ ایک دور میں جا کر انسان
کے لئے تابناک بن جاتا ہے۔

اس تنہائی کے احساس کو زائل کرنے والا یا تو وہ تھا یا
اس کا باپ ——— باپ بھی کرنل کی طرح بوڑھا ہی تھا اور اب
مکمل چالیس تک یونیورسٹی میں سروس کرنے کے بعد ریٹائرڈ
ہو کر زندگی کے باقی ماندہ دن بے کیفی سے تو نہیں ہاں پھر بھی
ایک حد تک تنہائی کا احساس لئے گذار رہا تھا۔ اس کے والد
کو ہمیشہ ہی کتابوں سے عشق رہا تھا چنانچہ ایسے ویرانے میں
جہاں تنہائی کا احساس اور بھی شدید ہو جاتا ہے وہ ایک حد
تک مطالعہ سے اس طوالت اور تنہائی سے فرار حاصل کر لیتے
تھے۔

اکثر کرنل بوڑھے پروفیسر کے پاس آ جاتا اور پھر
پروفیسر کرنل کے ٹیسٹ کے قصے پُرانی کتابوں سے ڈھونڈ
ڈھونڈ کر سُناتا۔ کرنل کا مکان ایک اُجاڑ سے ٹیلے پر واقع
تھا۔ دُور دُور پر کہیں اِکّا دُکّا پرانی وضع قطع کے چار، چھ
بنگلے تھے جن میں سے ایک پروفیسر کا بھی تھا۔ سرِ شام ہی
یہاں گہرا سناٹا چھا جاتا۔

اس کو بوڑھے کرنل سے والہانہ عشق نہ تھا بلکہ اس کی ساری دلچسپی محض ریحانہ تک ہی محدود تھی۔ اس کو دیکھتے رہنے، اس سے گفتگو کرنے اس کے نزدیک آجانے اور اسے اپنانے کی چاہت میں وہ اکثر بوڑھے کرنل کے پاس آنکلتا۔ لیکن وہ تو کچھ اس طرح بچی کھنچی رہتی کہ اسے گفتگو کا موقع ہی نہ ملتا یا کبھی محض دو چار سے رسمی جملوں تک ہی بات کو محدود کرکے اس سے بے خبر نٹنگ میں ہمہ تن مصروف ہوجاتی اور تب ایسے ویران اُداس سے لمحوں میں بے اختیار اس کا جی چاہتا سر کو زور سے دیوار سے دے مارے یہاں تک کہ سب کچھ ٹوٹ پھوٹ جائے ریزہ ریزہ ہوکر بکھر جائے۔ وہ نٹنگ کئے جاتی اور اسے بادل ناخواستہ بوڑھے کرنل کی داستانیں سُننی پڑتیں۔ جنگ کے قصے۔ موت کے منہ سے کرنل کے نکل آنے کے واقعات۔ اسے جنگ سے ویسے ہی نفرت تھی۔ اور پھر وہ تو زندگی کے اس دَور سے گزر رہا تھا جب دل جوان ہوتا ہے اور نو بہ نو اُمنگوں اور جذبات سے سرشار — اور یہ بوڑھا کرنل جنگ کے لرزہ خیز قصے سُنا سُنا کر اس کے وجود کا سارا آہنگ، سارا سکون اور اطمینان پاش پاش کردیتا۔ راکھ کی دبیز تہوں کے عقب سے کسی بجھتی چنگاری کو کرید کر ہوا دی جاتی اور کرنل اپنے جھرّیوں زدہ لیکن کلین شیو چہرے پر کبھی مسرت کبھی دکھ کا احساس لئے اپنے ماضی کے لامتناہی تذکروں میں گم ہوجاتا۔

ریحانہ کو دو ایک بار اس نے یونیورسٹی میں بھی دیکھا تھا۔ اور اس کی خوبصورتی نے ہمیشہ اس کے جذبۂ شوق کو ہوا دی تھی۔ لیکن جانے کیا بات تھی جتنی اس نے اس کے نزدیک آنے کی کوشش کی اتنا ہی اس سے دُور ہوتا چلا گیا۔ اکثر ڈرائنگ رُوم میں وہ ریڈیو کے پاس بیٹھی نٹنگ کر رہی ہوتی۔ وہ دیر تک بیٹھا اس کی ممی اور اس کے چھوٹے بہن بھائیوں سے گفتگو کرتا نت نئے لطائف سُنا سُنا کر انھیں ہنساتا لیکن جب وہ ان تمام حرکات کا ردِ عمل اس کے چہرے پر دیکھنے کے لئے اسے کنکھیوں سے دیکھتا تو وہ اسے اتنی پرسکون مطمئن نظر آتی کہ بے اختیار اس کا دل چاہتا کسی دیوار سے اپنا سر ٹکرا دے اتنی ڈل اور ان ریسپونسیو [illegible] ایک مبہم سی مسکراہٹ بھی اس کے لبوں پر نہ آتی۔ یا کبھی کبھار جب وہ کوئی عجیب سی بات کہہ دیتا تو وہ اپنی جھکی جھکی نظروں کو کچھ اس طرح لمحہ بھر کے لئے اُٹھا کر اتنی اجنبیت اور غیر یقینی سے اُسے دیکھتی کہ بے اختیار اس کا جی چاہتا کہ کہدے:

"تم یہ سوچ رہی ہو، یہ انسان پھر کہاں سے نازل ہوگیا ہے۔ تو تم اسے نہیں جانتیں۔ واہ بھئی، مجھے نہیں جانتیں — اچھا مذاق ہے۔ ارے میں تو وہی انسان ہوں جس نے جیتا زمانوں اور صدیوں میں تم جیسی لڑکی کے لئے لاکھوں ٹھوکریں کھائی ہیں۔ اور اب اسی لئے یہاں بھی پہنچ گیا ہوں — لیکن یہ کیا آج تم ملی بھی ہو تو اس قدر اجنبی اجنبی کی سا تعلق — بے گانہ — جیسے تم مجھے پہچانتی ہی نہیں —"

پھر وہ انسان جس کی آنکھوں کی نیلگوں وسعتوں پر ساری دنیا سمٹی ہوئی تھی اسے ہر جگہ نظر آنے لگا۔ وہاں بھی۔ جہاں اس کی موجودگی کا کوئی سوال ہی نہیں پید ہوتا تھا۔ اس کے نزدیک آنے کے لئے وہ اسے زندگی کے ہر ہر موڑ پر منتظر ملنے لگا۔

پھر وقت انگور کی بیلوں سے ڈھکے پُرسکون راستوں سے ہوکر گزرنے لگا جن میں گنگناتی ہوئی خنک ہوائیں چلتی تھیں اور وقت کی ان پُرسکون گزرگاہوں پر چاند اپنی طویل کرنوں سے روشنی کے نئے نئے نمونے بناتا گیا۔ بڑا کرنل اور پروفیسر وقت کے اس سفر سے مطمئن ہوکر.. بین الاقوامی مسائل پر گفتگو کرتے رہے۔ بوڑھا پروفیسر کہنہ کتابوں سے کرنل کے ٹیسٹ کے قصے نکال کر اسے سُناتا رہا اور گھر کی بڑی بوڑھی عورتیں پاندانوں پر گھری ہوئی خاندانی پولیٹکس میں اُلجھی رہیں۔

اس نے کرنل کے یہاں آنا جانا بالکل ترک کر

ن دنوں ایک ٹسٹ کرکٹر [illegible] کی
آمد و رفت کرنل کے یہاں بہت بڑھ گئی تھی۔ اس کے پاس ایک
خوبصورت نیلی کار تھی جس میں وہ کرنل اینڈ کمپنی کو بہت دور دور
سیر کرانے لے جاتا تھا۔

اکثر جب وہ کسی شکست خوردہ شکاری کی طرح بوجھل
اور تھکے تھکے قدموں سے کرنل کے گھر سے ملی سڑک سے گزرتا تو
برآمدے میں بیٹھے ہوئے کرکٹر، خالہ، ریحانہ اور نجمی وغیرہ کے
قہقہے اس کے دل میں ایک درد سا بھر دیتے اور ایسے لمحے میں
اسے اپنی محرومی اور ناکامی کا احساس اور بھی شدّت سے ہونے
لگتا۔ اس احساسِ شکست نے اسے اس درجہ مایوس کر دیا تھا کہ
اس نے کرنل کے یہاں آنا جانا تقریباً ختم کر دیا۔ اب بھی کبھی کبھا
کرنل خود پروفیسر کے پاس آنکلتا۔ اور پھر تنہائی کے اس احساس
کو زائل کرنے کے لئے کہنہ کتابوں کے کرم خوردہ صفحات سے
فراق و وصل کے قصے نکالے جاتے لیکن وہ کرنل کا سامنا کرنے
سے کترا جاتا۔ جان بوجھ کر انجان بن جاتا کہ مبادا کہیں کرنل کی
نظر اس پر نہ پڑ جائے اور وہ اس سے گھر نہ آنے کا شکوہ کرنے
لگے۔ اور اسے دل پر جبر کر کے کہیں کرکٹر کے سامنے نہ بیٹھنا پڑے
جہاں مایوسی اپنی ناکامی اور محرومی کا احساس اور بھی شدید ہو
جاتا ہے۔ یہ بات نہیں تھی کہ اسے ڈر تھا ریحانہ اس سے بات
نہ کرے گی اور اسے بونقوں کی سی صورت بنائے اس بزم میں
بن بلائے مہمان کی طرح بیٹھنا پڑے گا۔ بہرحال خالہ اور
نجمی وغیرہ تو اس سے بات کریں گے ہی لیکن اس کے باوجود
اسے اس کا احساس تھا کہ ریحانہ کے رویے کی سرد مہری اور بے
تعلقی اسے سخت گراں گزرے گی۔ وہ تو اس کی ذات میں کسی
قسم کا انٹرسٹ ہی نہیں ظاہر کرتی ہے بلکہ ایک معمولی سی صورت
شکل والے کرکٹر سے ہنس ہنس کر پہروں گفتگو کرتی رہتی ہے۔
اس کی ذات میں ڈوبی ہوئی اس کے ہر ہر فقرے پر ہنس ہنس کر۔

ایک عرصہ تک وہ کرکٹر کرنل کے یہاں آتا رہا۔ وہ
اپنی کار میں انھیں سیر کے لئے لے جاتا۔ انھیں دنوں کسی باہر
سے آئی ہوئی ٹیم کے ساتھ ٹیسٹ میچ ہونے والا تھا۔ ایک شام
وہ اُداس سا کرنل کے گھر کی طرف سے گزر رہا تھا۔ جیسے ہی وہ
ان کے گیٹ کے نزدیک پہنچا اسی لمحے کرکٹر کی کار آ کر رُکی۔ اس
نے دیکھا وہاں سبھی لوگ بیٹھے تھے۔ یہ سب دیکھ کر درد کی ایک
ٹیس اس کے دل میں اُٹھی اور اس کی رُوح پر ایک بے نام
سی خلش کا پردہ پڑ گیا وہ اسے دیکھ کر عجیب نظروں سے مسکرائی
وہ سر جھکائے جانے لگا تو خالہ بولیں۔

"ارے ظفر! کہاں چلے، آؤ بیٹھو نا۔ اب تو تم آتے ہی نہیں۔"

"نہیں خالہ ایسی کوئی بات نہیں ذرا مصروف رہا ان دنوں
اور پھر ......"

"اور پھر کیا ......؟"

"میں نے سمجھا، میری موجودگی کسی کو گراں نہ گزرے کہیں
اس لئے نہ آیا اور کچھ دنوں۔ لوگ بہت مصروف ہوتے ہیں
نا خالہ ......"

اس نے کن انکھیوں سے دیکھا وہ جھلائی ہوئی سی اپنے
ہونٹ کاٹ رہی تھی۔

- - - - - - - - - -

اسے معلوم نہ ہو سکا کہ اس کی بات کا خالہ نے کیا جواب دیا
وہ تو اتنا اُداس تھا کہ بغیر آگے کچھ کہے سنے ہی وہاں سے تھکا
تھکا سا چلا آیا۔ نہ جانے کیوں کرکٹر کو اپنے مدمقابل دیکھ کر اسے
محسوس ہونے لگتا جیسے اس کی کوئی عزیز ترین شے اس سے
زبردستی چھین لی گئی ہے ......

اس درمیان میں اس کی ایک انگریزی کہانی کسی رسالے
میں شائع ہوئی تو اس نے نجمی کو وہ رسالہ دے دیا شاید اسی
بہانے وہ اسے پڑھ لے ......

"تم پڑھنا ......!"

وہ کیا پڑھتا۔ دس برس کے لڑکے کے پلے کیا پڑتا ......
تین چار روز بعد وہ رسالہ لے کر آیا تو اس نے پوچھا

"کس کس نے پڑھا بھئی ——؟"

"کیوں، میں نے صرف پڑھا ہے اور کون پڑھتا۔ آپ نے مجھی کو ہی دیا تھا نا —— مگر ظفر بھائی یہ سب آپ نے کیا لکھا ہے ——؟"

وہ چپ ہو گیا ——

ایک عرصہ گزر گیا وہ کرنل کے یہاں نہ گیا —— وہ جب بھی وہاں گیا تھا اس نے یہی محسوس کیا تھا وہ اس کی ذات میں ذرہ برابر بھی دلچسپی نہیں لیتی بلکہ موقع ملتا ہے تو ایک آدھ چوٹ کرنے سے بھی نہیں چوکتی۔

یونیورسل اسٹور میں چند رسالے دیکھ رہا تھا کہ اچانک وہ بھی بچی کو لئے آ پہنچی —— اس نے پیسے دیئے اور جلدی سے وہاں سے نکل آیا۔ دور تک ریحانہ کی نظریں اس کا تعاقب کرتی رہیں وہ اس قدر جذباتی ہو گیا تھا کہ اس کا سامنا کرنے سے بھی ہچکچا رہا تھا۔ جوں ہی وہ چند قدم آگے بڑھا اس نے دیکھا خالہ تنہا کھڑی ہیں۔

"ارے کہاں چلے ظفر ——؟ وہ بولیں "ذرا ٹھہرو، ریحانہ آجائے تو ساتھ ہی چلتے ہیں ——"

کوئی مفر کی صورت ہی نہ تھی۔ وہ چپکا ہو رہا —— بڑھتے قدم یک لخت تھم سے گئے۔

خالہ کے پیروں میں ایگزیما تھا جس کے سبب وہ کھڑاؤں پہنا کرتی تھیں۔ ساڑھی خواہ کتنی ہی قیمتی ہو لیکن پیروں میں تو کھڑاؤں ہی رہتیں۔ اسی لئے وہ اسٹور میں بھی نہیں گئی تھیں چند لمحات بعد ریحانہ اوولٹین کا ڈبہ لئے آ گئی ——

"ظفر تم آتے کیوں نہیں ——؟" خالہ چلتے چلتے بولیں۔

اور اس نے بجائے جواب دینے کے ایک عدد سوال جھاڑ دیا۔

"خالہ —— اب وہ کرکٹر نہیں آتا آپ کے یہاں؟" اس چوٹ پر وہ سخت جھنجھلا گئی۔

"نہیں وہ کہیں اور چلا گیا ہے۔ اب نہیں آتا۔"

"تو آیا کروں گا ——" وہ بولا

"تو —— "کوئی جملہ اس کے لبوں تک آتے آتے رک گیا اس نے منہ پھیر لیا۔ جانے وہ کیا سوچ رہی تھی۔

"ارے ظفر سنا تم نے، وہ جو ہمارے یہاں نوکر تھا نا۔ ارے بھئی، وہی، کریم۔ کل وہ ہمارا ریڈیو لے کر بس بھاگ ہی رہا تھا کہ اچانک ریحانہ کی نظر پڑ گئی۔ کرنل صاحب اپنی زمینوں کے سلسلے میں سندھ گئے ہوئے تھے میں بچی کو لے کر باہر گئی ہوئی تھی۔ دیکھو تو سہی میاں —— جوان بچی گھر میں موجود تھی نہ"

"اچھا ——" وہ حیرت سے بولا۔

"میں اتنی چیخی چلائی۔ دل بری طرح کانپ رہا تھا، نہ جانے اگر وہ ریڈیو چھوڑ کر ......" اس بار خالہ کی بجائے وہ بولی اور جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا —— "کم بخت —— برابر میں جو خشک سا پنجابی میجر رہتا ہے نا۔ میں اتنی چلائی لیکن کم بخت کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ بس بیٹھا اخبار پڑھتا رہا۔ خدا کا شکر ہے جانے کریم کے دل میں کیا آئی کہ ریڈیو چھوڑ کر بھاگ نکلا ——"

"ارے تو مجھے کیوں نہ بلوا لیا ——" ریحانہ کے رویئے کی یہ یک بیک تبدیلی دیکھ کر اس نے بھی کہہ دیا۔

"ہاں جی، ٹھیک ہے اب میں آپ کو بلانے جاتی اور وہ کم بخت ریڈیو کے ساتھ کیش (Cash) بھی لے کر رفو چکر ہو جاتا —— بی۔ بی۔ جان —— دیکھئے یہ ہیں آپ کے ہنہ 'بدھو' ایم۔ اے میں جو پڑھتے ہیں۔"

خالہ ہنسنے لگیں۔ وہ خفیف سا ہو گیا، لیکن اسے آج مسرت کا ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا ریحانہ کی یہ ازلی خاموشی تو ٹوٹی۔

"کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے ——" وہ یونہی گنگنانے لگا۔

"کیا مطلب؟" ریحانہ چونکی اور پھر اس نے سارے راستے کوئی بات نہ کی وہ انھیں گھر چھوڑ کر چلا آیا

کرنل ان دنوں اپنی اراضی پر تھے۔ اور پروفیسر اب

کی خشک اور ضخیم کتابوں میں ڈوبا ہوا اپنی زندگی کی ان تنہائیوں کے احساس کو زائل کر رہا تھا۔ شام ہوتے ہی وہ کرنل کے یہاں جا دھمکا۔ اس دن رہ رہ کر اس کے ذہن میں بس یہی خیال قلابازیاں کھاتا رہا تھا کہ آخر یہ ریحانہ کس قسم کی لڑکی ہے؟ ایک چھلاوہ، انسانی نظر کا دھوکہ، سراب! اس لڑکی کی ہر بات ہی نرالی ہے۔ جیسے اس نے کوئی خواب سا دیکھ رکھا ہے۔ اور اب زندگی کی رہ گذر پر بیٹھی اپنے سپنے کے شہزادے کی منتظر ہے جو کبھی نہ آسکے گا۔ اس نے سوچ لیا تھا آج موقع ملتے ہی وہ اس سے صاف صاف کہہ دے گا۔

"تم۔ تم، اپنے آئیڈیل کے انتظار میں ساری عمر گذار دوگی لیکن وہ پلٹ کر نہ آئے گا۔ پگلی، اگر خواب کبھی حقیقت کا روپ دھار سکتے تو خواب ہی کیوں کہلاتے..... وہ آئیڈیل وہ تو بس کنواریوں کے دل خوابوں میں آکر چپکے سے دھڑکانا ہی جانتا ہے۔ آخر تم مجھ سے اتنی ہراساں کیوں ہو؟ میں اتنا بُرا بھی تو نہیں۔ اب یہ اور بات ہے مجھ میں انسانیت کی عظمت کی نسبت کمزوریاں زیادہ ہیں۔ میں تمہارے اس تصوراتی آئیڈیل کی طرح فرشتہ نہیں ہوں جو جگمگاتی کہکشاں کی دوُدھیا سڑک پر بلندیوں پر بٹھا کر تمہاری پرستش کرتا ہے اور جو محض تمہارے حُسن کو دیکھ کر ہی مطمئن ہو جاتا ہے وہ تمہیں کانچ کا ایک نایاب ٹکڑا سمجھ کر بلندیوں پر رکھنا چاہتا ہے لیکن میں تمہیں ان بلندیوں سے اُتار کر اپنے برابر میں لا کھڑا کرنا چاہتا ہوں تاکہ تمہیں چھو سکوں، محسوس کر سکوں، مجھے یہ احساس ہو جائے تم محض میرا تصور ہی نہیں ایک جامد اور ٹھوس حقیقت بھی ہو—"

ڈرائنگ روم کی سرمئی نیم خوابیدہ، نیم روشن سی فضا میں وہاں خالہ اور نجمی کے ساتھ وہ بھی بیٹھی تھی۔ چند رسمی سے جملوں سے ہوتی ہوئی بات گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی گئی۔ آج وہ بغیر کسی نفرت کے اظہار کے اس سے باتیں کر رہی تھی، اور وہ مسلسل اس تبدیلی کی بابت غور کر رہا تھا۔

"ارے آپ کو معلوم ہے، وہ جو ہمارے یہاں ایک فلسفی سا آتا تھا نا۔ ارے بھئی وہی"

"کون—؟"

"ہائے اللہ، بھئی آپ سمجھتے کیوں نہیں—وہی جن کے بال بڑھے ہوئے تھے"

"اچھا وہ—احمد صاحب نا—"

"ہاں—وہی"

"پھر کیا ہوا—؟"

"وہ حضرت بڑے بیہودہ نکلے۔" اس بار خالہ بولیں۔ "کچھ دن بعد بی بی جان سے بولے ریحانہ کی شادی کیوں نہیں کر دیتیں آپ.... بعد میں پتہ چلا حضرت اسی لئے یہاں آیا جایا کرتے تھے..... ہنہ چغد، اور میں اس شادی وادی کو بڑی واہیات سی چیز سمجھتی ہوں، مفت میں ساری عمر کی غلامی کون کرتا پھرے؟"

اس کا دل اندر ہی اندر خزاں رسیدہ، تُند آندھی میں اِدھر اُدھر آوارہ پھرتے سوکھے پتّے کی طرح کانپا

"بڑا واہیات قسم کا ڈفر تھا، میں اسے سخت ناپسند کرتی تھی—" وہ کہے جا رہی تھی۔

"بھئی وہ جو آپ کی ایک سہیلی تھیں نا، شاید انجم—وہ کیا کر رہی ہیں ان دنوں؟" موضوع کو بدلنے کے لئے وہ انجم کا تذکرہ نکال بیٹھا۔

"عشق! ہا۔ ہا۔ عجیب بَغَولڑکی ہے، کہتی تھی عشق اور شادی بڑی واہیات سی چیزیں ہیں لیکن مری جا رہی ہیں آجکل ایک صاحب زادے کے فراق میں!"

یہ اس کی بات کا جواب تو نہ تھا، انجم کے بارے میں تو اس نے یوں ہی بس بات بڑھانے کو پوچھ لیا تھا ورنہ وہ تو خود اس کی کلاس میٹ تھی، وہ اچھی طرح جانتا تھا اس قسم کی کوئی بات نہیں یہ سارا قصہ محض ریحانہ کی اختراع کے سوا کچھ نہیں ہے مگر اس من گھڑت کہانی کو بیچ میں لانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ وہ سمجھ نہ سکا۔

"مجھے تو اپنی ننھیال والوں سے عشق ہے" وہ کہہ رہی تھی۔
میرے سارے ماموں اس قدر زندہ دل قسم کے انسان ہیں۔ شوخ
ظریف، بزلہ سنج۔ ان کے پاس بیٹھو تو پتہ ہی نہیں چلتا دن کب
اور کیسے گذر گیا۔ یوں محسوس ہوتا ہے زندگی میں ہنسی ٹھٹھے کے
سوا کچھ ہے ہی نہیں۔"

"اچھا"

"اور ایک یہ ہیں ہمارے ددھیال والے، توبہ، بڑی عجیب
خصوصیت کے حامل ہیں"

"اب چپ بھی رہو نا ریحانہ بیٹے۔ اتنی باتیں نکو کرو۔"
خالہ نے خالص دکنی لہجے میں مداخلت کی۔ عام طور پر وہ گفتگو
میں باقاعدہ اس بات کی کوشش کرتی تھیں کہ حیدرآبادی لہجہ نہ
آجائے۔

"واہ بی بی جان! آپ اپنی سسرال والوں کے متعلق
کچھ سن ہی نہیں سکتیں! جھوٹ تھوڑی ہی کہہ رہی ہوں 'ہاں'
یہ سب کے سب کالے، خشک، اور لمبے ہوتے ہیں!"

باتوں باتوں میں اسے محسوس ہوا ریحانہ عشق وغیرہ کو
خلل دماغ سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی مگر ساتھ ہی وہ یہ بھی
محسوس کر رہا تھا کہ وہ گھوم پھر کر ایسے موضوعات پر آجاتی
ہے جن میں محبت کے تذکرے ہوں۔

"ہاں نہیں تو ۔۔۔ اچھا خاصہ معقول قسم کا شاعر ہے پھر
بھی اس واہیات چکر میں پھنس گیا ہے"

وہ زیدی کے متعلق کہہ رہی تھی جس کی ایک طویل نظم
کتابی صورت میں لندن کے کسی پبلشر نے شائع کی تھی، وہ یونیورسٹی
بھر میں بہترین شاعر مشہور تھا۔ ان دنوں اسے کسی لڑکی سے
جذباتی قسم کا لگاؤ ہو گیا تھا جو شاعروں کے لئے کوئی نئی بات
نہیں، پھر آخر وہ اس واقع کو اتنی اہمیت کیوں دے رہی تھی

"بھلا کوئی تک بھی ہے، دیکھو نا میاں، اچھا خاصہ کچھ ہے پھر
بھی" خالہ بولیں

"ہاں نہیں تو کوئی بات بھی ہوئی آہیں بھر رہے ہیں فراق
میں حضرت"

وہ اپنے کو بہت زیادہ نروس فیل کرنے لگا: اس قسم کے تاثر
ہیں محبت کے بارے میں تو اس کا مطلب ہے وہ اب تک محض جھک
ہی مارتا رہا ہے۔

"کیوں بی بی جان! یہ محبت وغیرہ ہے نا سخت قسم کی حماقت"
وہ بڑی شوخی سے اپنی ماں سے بولی

"ہاں۔ ہاں" خالہ کے چہرے پر اطمینان کی ایک لہر دو[ڑ]
گئی، جیسے انھیں پختہ یقین ہو گیا تھا۔ جوانی کی دہلیز پر کھڑی ا[س]
کی لڑکی سے کسی قسم کی لغزش سرزد نہ ہوگی۔

"ہا۔ ہا۔ ہا۔" وہ کھلکھلا کر ہنس دی، اس کے موتیوں [جیسے]
سپید دانت بڑے بھلے لگ رہے تھے۔

"کتنا عجیب دکھتا ہے صاحب! صاحبزادے کچھ یوں [...]
سے فرما رہے ہیں" دیکھو میں بتا نہیں سکتا ۔۔۔ تم آخر سمجھتی کیوں
نہیں، مجھے تم سے وہ، وہ ہو گئی۔ پتہ نہیں کیسے۔" یہ صاحب
"وہ" کی خوب رہی، اور ملاحظہ ہو، جواباً محترمہ شرما رہی ہیں
لجا رہی ہیں گلابی ہوئی جا رہی ہیں۔ نظریں نیچی کئے دوپٹہ کا [پلو]
چباتے ہوئے کہہ رہی ہیں" تو پھر آبا سے ملونا"۔۔۔ واہ خوب۔
بھئی"

اس کے تصوراتی شیش محل دھم سے زمین پر گر کر چکنا [چور]
ہو گئے، وہ بجھ سا گیا اسے محسوس ہوا کوئی چیز جیسے اس کے اندر
اندر ٹوٹ پھوٹ گئی ہے!

اس نے گھڑی کی طرف دیکھا، ساڑھے دس بج رہے [تھے]
اس نے چلنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ سردی کے دن تھے وہ لو[گ]
بالائی منزل کے ایک کمرے میں آتش دان کے نزدیک بیٹھے
[تھے] باہر سرد ہوائیں سرسرا رہی تھیں۔ جاتے جاتے اس
اونگھتے ہوئے نجمی سے کہا:

"نجمی ۔۔۔ اسٹیر کیس والا دروازہ بند کر لو، چلو"

"رہنے دیجئے، اب نجمی کہاں اٹھے گا بے چارہ اسے
دیجئے، چلئے میں چلتی ہوں" وہ فوراً بولی۔ وہ اٹھی، خالہ

[کو]ئی مزاحمت نہ کی۔ وہ دھیمے دھیمے اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی زینہ
[ا]ترتے ہوئے اسے بڑی تکلیف ہو رہی تھی۔ گھپ اندھیرے
[مے]ں وہ دبے قدموں سے سنبھل سنبھل کر آہستہ آہستہ اُترنے لگا۔
[جا]نے کیوں ریحانہ نے جان بوجھ کر زینہ کی بتی نہ جلائی تھی۔ اسے
[حیر]ت ہوئی۔ "شاید بھول گئی ہوگی"، اس نے دل میں کہا اور آہستہ
[آہس]تہ ٹٹول ٹٹول کر اُترنے لگا۔ وہاں مکمل سکوت تھا۔ ان کے
[اپ]نے قدموں کی آوازیں گونج رہی تھیں یا ریحانہ جذباتی ہو
[رہ]ی تھی...، جیسے وہ کسی بات سے بہت زیادہ متاثر ہو گئی تھی۔
[اس] کی گہری گہری سانسیں گونج رہی تھیں۔

آخری سیڑھی پر قدم رکھ کر جیسے ہی اس نے باہر کا
[د]روازہ کھولا، ہوا کا بے حد سرد اور شریر سا جھونکا اس کے
[ک]انوں میں مدھم سی سرگوشیاں کرتا ہوا گزر گیا۔ اسے ایک جھرجھری
[س]ی آگئی۔ اچانک اسے محسوس ہوا ریحانہ اس کی پشت کے بہت
[نز]دیک ہی کھڑی ہے اور اس کے تنفس کا تعطر اور مدھم مدھم
[حر]ارت اس کے رخساروں کو ہولے ہولے چھو رہی ہے، وہ
[ک]چھ بھی تو نہ سمجھ سکا۔

اچانک اسے خیال آیا۔ موقع ہے، تنہائی ہے، رات
[کی] تنہائی رومانٹک ہے کیوں نہ اپنے دل کی بات اس سے کہہ
[د]ے۔ کہہ دے کہ تم ساری عمر اپنے تصوراتی پیکر اپنے آئیڈیل
[ک]ی تلاش میں سرگرداں رہو گی لیکن تم یہ کیوں نہیں سمجھ لیتیں
[ک]ہ تم اور تمہارے آئیڈیل کی زندگی کچھ اس طور پر تراشی گئی
[ہ]ے کہ جہاں تم پہنچو وہ وہاں سے جا چکا ہو۔ زندگی کے اس
[س]یل رواں میں تم اسے نہ پا سکو گی۔ تم اپنے ارد گرد پھیلے ہوئے
[ا]نسانوں میں سے کسی کا انتخاب کر لو۔"

دروازے کا ایک پٹ پوری طرح کھل چکا تھا اور وہ
ایک قدم اندر اور دوسرا باہر رکھے ریحانہ کی گرم گرم سانسیں
[م]یں الجھ رہا تھا۔ باہر سے مدھم مدھم روشنی زینہ پر آرہی تھی۔
اس نے پلٹ کر ریحانہ کے چہرے کو دیکھا وہاں اسے اس کے
ہونٹوں کے خمیدہ کونوں میں تشنگی اور ناآسودگی کا تمامتر

احساس سمٹا ہوا دکھائی دیا کچھ اس طرح سے اسے محسوس ہوا وہ اس
احساس کے آتشیں سحر کے حصار سے ایک قدم آگے بھی نہ بڑھ
سکے گا۔ اس نے ابھی کچھ کہنے کے لئے اپنے ہونٹ کھولے ہی تھے
کہ وہ بولی۔

"ظفر — ظفر —"

"ہوں —"

"یہاں کتنی سردی ہے" یکایک بڑے سپردگی کے سے
انداز میں وہ شاخ بید کی طرح لچک کانپی اور اس کی آغوش میں
آگری۔ وہ مخمور سی ہو کر اس سے بالکل چمٹ سی گئی، اور اس
نے محسوس کیا کہ اس کا سارا وجود کسی چٹان کی طرح سخت اور
تانت کی طرح تنا ہوا ہے اور اس کا ابھرا ہوا سینہ اندرونی
ہیجان سے متلاطم ہے...... جانے اس کے سینے سے چھپے ننھے
دو کبوتر کب تک اپنی چونچیں اٹھائے اس سے سرگوشیاں
کرتے رہے اور جانے کتنی دیر تک اُن کے سانسوں کا مد و
جزر ایک دوسرے میں مکمل مل کر الجھتا رہا بس اسے اتنا ہی
ہوش تھا وہ اس سے کہہ رہی تھی

"ظفر — کل آؤگے نا، ضرور آنا —"

اس نے دھیمے سے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا اور سرد
رات میں ازلی تنہائی کا احساس لئے بوڑھے کرنل کی کوٹھی سے
نکل آیا...... سرد رات کے سکوت میں خشک پتے
اس کے قدموں کے نیچے آآکر مجروح ہوتے رہے، شور مچاتے
رہے، چیختے رہے، چلاتے رہے۔

نجم فضلی

چند بُت چند تیشے

برگد کا پیڑ آبادی سے کافی فاصلے پر ایک ویران جگہ اپنی شاخیں پھیلائے چپ چاپ کھڑا تھا۔ کبھی کبھی کوئی مسافر تھوڑی دیر کے لئے اس کے سائے میں ٹھہر جاتا پھر تازہ دم ہوکر آگے چل کھڑا ہوتا اور وہ پھر اکیلا رہ جاتا۔ اور مایوسی سے اپنے چاروں طرف دیکھتا رہتا۔ کوئی کوئی مسافر چلتے چلتے کچھ نرم و نازک پتے بھی توڑتا جاتا اور وہ کافی دیر تک اس نئے درد سے بے چین رہتا۔

یہ درخت جب چھوٹا تھا تو اس کے چاروں طرف آبادی تھی۔ بچے اس کی شاخوں پر جھولا ڈالتے اور رادلھا پالی کھیلتے تھے۔ اس وقت بھی اس کی شاخیں ٹوٹتی تھیں بچے اس کی کونپلیں نوچتے تھے۔ مگر اس کے قوی مضبوط تھے۔ وہ اس قسم کے چھوٹے موٹے صدمے ہنسی خوشی برداشت کرسکتا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ آبادیاں آگے بڑھتی گئیں۔ ویرانے اس کے قریب آتے گئے۔ وہ آگے نہ بڑھ سکتا تھا۔ اس کی شاخیں مضبوط ہوکر پھیل گئیں۔ اس کے سائے کا محیط بڑھ گیا۔ مگر کچھ دنوں کے بعد ہرے بھرے پتے خشک ہوکر گر جائیں گے۔ آبادیاں اور آگے بڑھ جائیں گی اور اس کی بے برگ شاخیں اپنے اطراف کی طرح ویران ہو جائیں گی۔ پھر اس کے پاس سائے کی دولت بھی نہ ہوگی۔ کوئی مسافر اس کے سائے میں پناہ نہ لے سکے گا۔ اور پھر کسی دن کوئی بھی طوفان اسے جڑ سے اکھاڑ پھ گا۔

انور کافی دیر سے اس برگد کی ایک موٹی اُبھری ہ جڑ سے ٹیک لگائے لیٹا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ اُ نے اپنے سوٹ کے گندے ہونے تک کا خیال نہ کیا دور دور اُگی ہوئی گھاس کے چھدرے فرش پر لیٹا بڑی دیر سے اس درخت کے متعلق سوچ رہا تھا جیسے وہ اس درخت کو برسوں سے دیکھتا آیا ہو۔ جیسے و اس کے ماضی اور حال سے پوری طرح واقف ہو حالا ابھی کچھ دیر پہلے اس درخت کے پاس سے گزرتے ہوئ جانے کیوں اس نے اپنی کار روک دی اور آگر اس کی یں لیٹ گیا۔ اس سے پہلے وہ کبھی اس راستے سے گذ بھی نہ تھا۔

دوپہر کو جب وہ اپنے آراستہ کمرے میں لیٹا سگریٹ کے دھوئیں کے درمیان سے فریم میں لگی ہو حسین مناظر کی تصویروں کو گھور رہا تھا تو باہر سے آواز

"پوسٹ مین"

اور جب وہ باہر نکلا تو ڈاکیہ ایک خوبصورت لفا باہری برآمدے میں پھینک کر جا چکا تھا۔ اس نے اپنے پاؤں کے پاس پڑے ہوئے لفافے کو اُٹھایا اور دیکھ

سمجھ گیا کہ وہ بار بل کا ہے۔

"برتھ ڈے پر پُر خلوص تمناؤں کا اظہار"

یکایک اسے خیال آیا کہ آج ۲۹ راکتوبر ہے اور یہ
Birthday Greeting
ڈے
ں نے اسے جرمنی سے بھیجی ہے۔ اور اگر شاید یہ کارڈ
تا تو اسے خیال بھی نہ ہوتا کہ آج اس کی سالگرہ ہے۔
فود سے کتنا دور ہے —— اس کے دل میں درد سا
نے لگا۔

پھر ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھی۔

"ہلو"

"بھئی آج ڈلہوزی چلنا ہے نہ۔ فصیح نے پوچھا

"موڈ نہیں ہو رہا ہے"

"بھئی موڈ کو ہونا ہی پڑے گا۔ اس لئے کہ یہ دعوت
یہ ہی کی طرف سے ہے۔" فصیح نے بچوں کے انداز
کہا۔

"تم لوگ چلے جانا میرا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں
اگر آ سکا تو وہیں آ جاؤں گا"

اسے یاد آیا کہ آج اس کی چونتیسویں سالگرہ ہے۔
گلشن اور کتنے صحراؤں سے وہ گزر چکا ہے یہ سوچ کر
حیرت ہوتی۔ اور وہ اداس ہو جاتا۔ زندگی کے
س سال یونہی گزر گئے اور اسے پتہ بھی نہ چلا۔ اور
زندگی میں بچا ہی کیا ہے۔ تھوڑے ہی دنوں کے
ں کا شمار بزرگوں میں ہونے لگے گا۔

اس کے بال گھونگھریالے اور خوبصورت تھے۔
اور سجے کے صحت مند جسم پر عمدہ تراش کے کپڑے
کی شخصیت کو پرکشش بناتے تھے۔ گزشتہ چند سالوں
،ونا صاصحت مند ہو گیا تھا اور اس کے چہرے پر
بی ہوئی ہڈیاں دب گئی تھیں۔ اور چہرے پر رونق
تھی۔ مگر اس کو وہ کیا کر سکتا تھا کہ ایک مخصوص قسم کی
اداسی اس کی بے نیاز آنکھوں کا جزو بن گئی تھی۔ اور اسی
سبب وہ اپنی نوجوانی میں بھی اپنی عمر سے کچھ زیادہ کا ہی
محسوس ہوتا تھا۔

یکایک فوری طور پر لگائے گئے بریک کی چرچراہٹ
سے چونک کر وہ اٹھ بیٹھا۔ قدسیہ اپنی کار سے نکل رہی تھی۔

"ارے۔ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔؟ میں آپ کو گھر
پر بھی ڈھونڈھ آئی اور ڈلہوزی بھی دیکھ آئی۔ طبیعت تو ٹھیک
ہے نہ۔؟" قدسیہ نے اس کے قریب آتے ہوئے ایک سانس
میں کہہ ڈالا۔

"بس ایسے ہی رُک گیا تھا ذرا۔ چلو" اس نے سادگی
سے کہا۔

"چلیئے میں آپ کی کار ڈرائیو کرتی ہوں۔ آپ کی طبیعت
ٹھیک نہیں معلوم ہوتی"

"اور تمہاری کار —— ؟" دراصل اس کا بھی دل کار
چلانے کو نہ چاہ رہا تھا۔

"اسے یہیں چھوڑ دوں گی۔ بعد میں آ کر کوئی لے جائیگا"

"اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔ میں اپنی کار پر چلتا
ہوں۔ تم اپنی کار لے چلو"

لیکن وہ نہ مانی۔ آخر جب وہ پیچھے کی سیٹ پر بیٹھنے
لگا تو اس نے پھر ٹوکا۔

"نہیں آپ یہیں آگے کی سیٹ پر بیٹھئے۔ باتیں کریں
گے"

کار چل دی۔

زندگی کے چونتیس سال گزر گئے۔ اس نے پھر سوچنا
شروع کیا۔ اور چند کرب انگیز یادوں کے سوا کچھ بھی تو نہ
دیا ان چونتیس سالوں نے۔ کاش یہ یادیں بھی نہ ہوتیں
کاش یہ تنہائیاں بھی اس کی زندگی کی طرح ویران ہوتیں۔
مگر اس کی تنہائیاں یادوں کے صنم تراشتی رہتی ہیں۔ کتنی
چھوٹی سی تمنا ہے —— سکون۔ مگر شاید خالق کائنات

سے بولانز دالی اور لاتعنا ہی قوتوں کا مالک ہے اپنی چھوٹی سی تمنا اس کے کرم کی توہین ہے.....

"کیا سوچ رہے ہیں؟" قدسیہ نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"اب سوچنے کا وقت بھی کہاں رہا۔ جو کچھ سوچوں۔ زندگی کے اتنے قیمتی سال صرف سوچنے میں ہی تو برباد کئے ہیں" وہ اضطراری طور پر کہہ گیا۔

"آپ زندگی سے اور کیا چاہتے ہیں۔ آپ کے پاس کار ہے۔ بنگلہ ہے زندگی کی تمام آسائشیں آپ کو میسر ہیں آپ اکیلے ہیں کوئی ذمہ داری نہیں۔ اور پھر آپ ایک اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ اور چاہیئے ہی کیا"

"لیکن قدسیہ ان کے لئے مجھے کتنی قیمت ادا کرنی پڑی ہے شاید تم اس کا تصور بھی نہ کر سکو۔ کاش میں نے زندگی کو اپنی راہ پر چلنے دیا ہوتا۔ شاید اس صورت میں میں زیادہ مطمئن ہوتا"

"آپ کی باتیں میری سمجھ میں تو آتیں نہیں"

"یہی زیادہ اچھا ہے"

"کیوں" قدسیہ نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جس جس نے سمجھا ہے اس نے بھی نئے زخموں کے علاوہ کچھ نہ دیا"

سامنے فصیح، ریحان اور زیدی کھڑے تھے۔

"کیا کسی مسجد سے پکڑ لائی ہو؟" ریحان نے اپنے مخصوص انداز میں پوچھا۔

اس وقت یہ بیچلرس پیراڈائز........ Bachelors Paradise کے علاوہ کہیں نہ پائے گئے ہوں گے فصیح درمیان میں ہی بول اٹھا۔

"نہیں یہ اس وقت برگد کے ایک پرانے درخت کے نیچے گھاس پر لیٹے ہوئے ملے ہیں" قدسیہ نے جواب دیا۔

اتنے میں عرفانہ، شمسہ، شاہدہ جعفر اور طاہر ٹہلتے ہوئے آ گئے۔

"ملیر کے پاس حمیدہ نظر آئی تھی۔ میں نے سمجھا بھی نہیں آ رہی ہے" جعفر نے کہا

"شادی شدہ ہے کیا۔؟" ریحان نے فوراً پ[illegible]

"ہے تو کیوں؟" عرفانہ بول اٹھی۔

"پھر ٹھیک ہے" بڑی سادگی سے ریحان[illegible] دیا اور سگریٹ سلگانے لگا

سب لوگ ہنس دیئے اور جعفر جھینپ گیا۔

"بھئی میں نے تمام شادی شدہ لڑکیوں کے[illegible] تمہارے لئے محفوظ کر دیئے مگر خدا کے واسطے کنوار[illegible] رحم کرنا" ریحان نے پھر کہا۔ اور واقعی یہ عجیب بات[illegible] جعفر جس لڑکی میں دلچسپی لیتا اس کے متعلق جلد ہی انکشا[illegible] کہ وہ شادی شدہ ہے۔

تھوڑی دیر تک گپ بازی ہوتی رہی۔ پھر تمام لوگ کھیلنے میں مصروف ہو گئے تو وہ آ کر خاموشی سے اپنی کار[illegible] سیٹ پر لیٹ گیا۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہ تھی۔ اسے[illegible] محسوس ہو رہی تھی مگر اس وقت سردی کا کوئی سامان نہ[illegible] اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ یہ کوئی ایسا سردی کا موسم بھی[illegible] اس نے کار کے تمام شیشے چڑھا دیئے اور لیٹا سگریٹ[illegible] سب سے پہلے شاہدہ نے اس کی کمی محسوس کی

"نواب صاحب کہیں نظر نہیں آ رہے ہیں" ا[illegible] تمام بے تکلف دوست اُسے نواب صاحب ہی کہتے تھے

"کہیں بیٹھے فلسفے کی کوئی گتھی سلجھا رہے ہوں" کہہ کر ریحان پھر کھیل میں مصروف ہو گیا۔

سب اس کی عادت سے واقف تھے۔ وہ ہمیشہ[illegible] تھلگ رہتا۔ ان میں شامل ہو کر بھی الگ ہی محسوس ہوتا[illegible] کر اس کی مسکراہٹ بڑی کرب آمیز تھی۔ ہمیشہ اس کی آ[illegible] سے ایک انجانا کرب جھانکا کرتا۔ وہ ہمیشہ دل کھول کر[illegible]

تااور یہ قہقہے ہمیشہ کھوکھلے محسوس ہوتے۔ اور اسکی آنکھوں
مخصوص اُداسی اس کی تمام زندگی زندہ دلی کا بھانڈہ پھوڑ
تی۔

جعفر اور قدسیہ کو اس کی فکر ہوگئی۔ اور دونوں اسے
ونڈنے لگے۔ مگر اس کا آس پاس کہیں پتہ نہ تھا۔ ڈاک
لے کا کونہ کونہ چھان مارا مگر اس کا سراغ نہ ملا۔ اور جب
دونوں مایوس ہو چکے تھے تو انھیں اندھیرے میں کار کے
رے سگریٹ کا شعلہ نظر آیا۔

وہ سردی سے کانپ رہا تھا۔ قدسیہ نے اس کی پیشانی
ہاتھ رکھا اور جلدی سے کھینچ لیا۔ "اف آپ کو تو بخار ہے۔"
اس نے اپنا اوورکوٹ اُتارا۔ "لیجئے۔ اسے پہن لیجئے اور
ر چلیئے۔"

قدسیہ نے اس کے لئے کافی بنائی اور اسپرو کی دو
یاں دیں۔ "انھیں کافی کے ساتھ کھا لیجئے۔ اور اچھی طرح
ڑھ کر لیٹ جائیے۔ طبیعت کچھ ہلکی ہو جائے گی۔"

"اچھا تم جاؤ۔ کسی اور کو مطلع نہ کرنا۔"

لیکن تھوڑی دیر بعد جب اس نے قدسیہ کو وہیں بیٹھا
یا تو کہا۔

"قدسیہ تم جاؤ۔ اپنی تفریحات کا خون نہ کرو۔ میں ٹھیک
ں۔ ہاں اسپرو کی دو ٹکیاں اور رہنے دو۔ سر میں
مدید درد ہو رہا ہے۔"

"زیادہ اسپرو نقصان کرے گا۔ لائیے میں آپ کا سر
بادیتی ہوں۔ اور وہ اس کے منع کرنے کے باوجود اس کا سر
انو پر رکھ کر دبانے لگی۔ اور اسی لمحے اسے ذکیہ یاد آئی۔ جو
م و بیش روزانہ ہی اپنے زانو پر اس کا سر رکھ کر بڑے پیار
ے گھنٹوں اس کا سر دباتی رہتی تھی۔

ایک دوپہر جونہی وہ اپنے گھر سے نکلا۔ سامنے کے
دروازے پر کھڑی ہوئی ایک لڑکی نے اسے روک لیا۔

"سنیئے!"

"فرمایئے۔" وہ ٹھہر گیا

"ذرا ایک منٹ ٹھہر جایئے۔" پھر وہ اندر چلی گئی اور ہاتھ
میں ایک خوبصورت شیشی لئے ہوئے واپس آئی

"یہ لیجئے سر میں لگانے کا عمدہ تیل ہے۔ جب ختم ہو جائے
تو اور لے لیجئے گا۔" یہ اس کے خشک بالوں کی طرف اشارہ
تھا۔

"شکریہ۔ میں اپنے ہاتھ سے اپنے سر میں تیل نہیں
دباتا۔" کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ لیکن اسے اس لڑکی کی اس
بے تکلفی پر سخت حیرت ہوئی۔ یہ لڑکی جو خوبصورت نہیں
تھی تو بدصورت بھی نہیں تھی اس سے عمر میں یقیناً دو تین سال
بڑی رہی ہوگی۔ مگر یہ لڑکی محلے میں نئی ضرور تھی۔ ورنہ محلے
میں بہت سی لڑکیاں تھیں جنھیں وہ بچپن سے جانتا آیا
تھا۔ اگر ان میں کسی نے اس قسم کی حرکت کی ہوتی تو اسے
قطعی حیرت نہ ہوتی۔ اور اس سے زیادہ حیرت اسے اس وقت
ہوئی جب چند روز بعد وہ لڑکی اس کے کمرے میں گھس آئی

"طلعت اور امی اندر ہیں۔ یہ میرا کمرہ ہے۔" اس نے
جلدی سے کہا کہ شاید وہ لڑکی غلطی سے اس کے کمرے میں چلی
آئی ہو۔ لیکن اس لڑکی نے جیسے اس کی بات سُنی ہی نہ ہو۔

"آپ اتنی سگریٹ کیوں پیتے ہیں؟" اس نے بھرے
ہوئے ایش ٹرے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"میں چاہے جتنے سگریٹ پیتا ہوں۔ آپ کو اس سے
کیا غرض؟" اس نے قدرے ترشی سے کہا۔

"شاید تم مجھے بہت دکھی نظر آتے ہو اس لئے پوچھ رہی
ہوں۔" وہ آپ سے تم پر آگئی۔

"میرا نام شاہد نہیں انور ہے۔"

"میں جانتی ہوں مگر مجھے شاہد نام بہت پسند ہے اس لئے
تم کو شاہد ہی کہوں گی۔ میرا نام تو نہ جانتے ہو گے۔ میرا نام
ہے ذکیہ۔"

"بہت خوبصورت نام ہے۔" یکایک اس کے منہ سے

مل گیا۔ اور عجیب اتفاق تھا کہ اسے ذکیہ نام بہت اچھا لگتا تھا۔

"لاؤ میں تمھارے سر میں تیل دبا دوں؟" اور اس نے اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر اس کے سر میں تیل دبانا شروع کر دیا۔ پھر اس نے بڑے ہی ہمدردانہ اور اداس لہجے میں کہا۔

"دیکھو انور۔ میں دو ماہ سے اس محلے میں ہوں۔ مگر تم کو پتہ نہیں۔ میں کتنی ہی بار تمھارے گھر آتی ہوں مگر ایک تو تم گھر پہ زیادہ رہتے نہیں اور اگر رہتے بھی ہو تو اپنے کمرے سے نہیں نکلتے۔ اس لئے تم کو پتہ نہیں۔ میں ہمیشہ دیکھتی ہوں کہ تم کھوئے کھوئے سے رہتے ہو۔ اکثر رات کے بارہ ایک بجے تک تم کو گلی میں ٹہلتے اور سگریٹ پیتے دیکھتی ہوں۔ اور سوچتی رہتی ہوں کہ آخر تم کو کیا دکھ ہے۔ تم کیوں اُداس رہتے ہو مگر میں کچھ نہ سمجھ سکی۔ اور کچھ نہیں تو میں تمھارا دکھ درد تو بانٹ سکتی ہوں۔ آج سے تم مجھے دوست بنالو۔ اور اپنے رازوں میں شریک کرلو۔ میں تمہارے ہر دکھ میں شریک رہوں گی۔ اور تم کو ایک حقیقی دوست کا تمام خلوص دوں گی۔ بولو منظور ہے۔؟"

ذکیہ نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اور انور نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اور ساتھ اس کی آنکھوں میں نہ جانے کیوں آنسو چھلک آئے۔

ذکیہ نے اپنے دوپٹے کے آنچل سے اس کے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا

"ہش کہیں مرد بھی روتے ہیں؟"

انور کو کوئی خاص دکھ تو نہ تھا مگر نہ جانے کیسے ایک کرب آمیز اداسی اور شدید تنہائی کا احساس بچپن سے ہی اس کے دل میں رچ بس گیا تھا۔ اور وہ ہمیشہ اسے بے چین رکھتا۔

رفتہ رفتہ اسے پتہ چلا کہ ذکیہ آج کل اپنی بہن اور بہنوئی کے پاس آئی ہوئی ہے۔ وہ سات بہنیں ہیں جن سے صرف دو کی شادی ہوئی ہے۔ اس کے والدین غریب ہیں اور لڑکیوں کی عمریں بڑھتی جا رہی ہیں۔ اسی لئے ا[illegible] کے گھر کا ماحول بڑا تکلیف دہ ہو گیا ہے۔ سارے عزیز ا[illegible] لڑکیوں سے اس طرح برتاؤ کرتے ہیں جیسے یہ کوئی بہت بڑی مصیبت ہوں —— اس کی ماں نے تو ایک دن بھی کہا تھا کہ "ذکیہ بڑی اچھی بہت محبتی لڑکی ہے۔ بیچار[illegible] گھر کے کام میں ہاتھ بٹا دیتی ہے۔ تمھاری یا کسی کی طبیعت ذرا سی خراب ہو جاتی ہے تو پریشان ہو جاتی ہے۔ اور بار خیریت پوچھنے آتی ہے۔ مگر بے چاری بدنصیب ہے شادی نہیں ہوتی۔

ذکیہ کچھ ہی دن میں اس پہ چھا گئی۔ اور اس نے اس[illegible] بالکل بچہ بنا کر رکھ دیا۔ اور اس نے بڑی آسانی سے اسے [illegible] بھی کرلیا۔ کبھی وہ گھر سے بے ترتیب کپڑے پہنے نکلتا ا[illegible] ذکیہ سامنے ہوتی، اور اکثر ہی ایسا ہوتا، تو وہ اسے فور[illegible] ٹوک دیتی۔

"لاپرواہی کی بھی کوئی حد ہے۔ چلو جاکر دوسرے کپڑ[illegible] پہنو۔ تم کو کچھ بھی خیال نہیں ہوتا کہ دوسرے تمھارے متعلق کیا سوچیں گے؟"

"میری بلا سے جو چاہیں سوچیں" وہ جواب دیتا۔ [illegible]

"میں نہیں چاہتی کہ جو چاہیں سوچیں" اور اس جملے میں کس قدر پیار ہوتا یہ تو کوئی اس سے ہی پوچھے۔

کبھی وہ کنگھی کئے بغیر گھر سے نکل کھڑا ہوتا تو وہ فو[illegible] روکتی۔

"کنگھی نہ ہو تو میں منگوائے دیتی ہوں۔ اور کہو تو کنگھی بھی کر دیا کروں۔ مگر خدا کے واسطے اس طرح گھر سے نہ نکلا کرو۔ تمہیں اپنا کچھ خیال نہیں تو میرا ہی کچھ خیال کیا کرو حالانکہ وہ اس کی کچھ بھی نہ تھی مگر اس پر اس طرح اپنا حق سمجھتی تھی جیسے وہ ہی اس کی سب کچھ ہو۔

عام طور پر اس کا برتاؤ بزرگانہ ہوتا تھا لیکن اگر کبھی
وہ اُداس ہوتا یا ناراض ہوتا تو وہ بے حد پریشان ہوتی۔ اور
اس کی ذرا سی ناراضگی پر اس طرح رو دیتی۔ جیسے کوئی چھوٹی
سی بچی ڈانٹ کھا کر رونے لگتی ہے ـــــ کوئی بھی اچھی چیز
اگر اس کے گھر میں پکتی تو وہ اس کے لئے ضرور رکھتی۔ اور جب
تک وہ نہ کھا لیتا خود نہ کھاتی۔ اس کو چھوٹے موٹے تحفے
خرید کر دیتی رہتی۔ اور اس کے منع کرنے پر آزردہ ہو جاتی
لیکن اگر وہ اس کے لئے کوئی تحفہ لے آتا تو خوش ہونے کے
ساتھ ساتھ اسے سمجھاتی کہ خواہ مخواہ اس کے لئے پیسے ضائع
کئے۔ وہ اس کے لئے کچھ بھی کرکے بے حد خوش ہوتی۔

رات کو کبھی دیر تک اسے گلی میں ٹہلتا دیکھ لیتی یا
کہیں سے واپس لوٹتے پاتی تو فوراً روک لیتی۔

"تمہیں چین کیوں نہیں آتا۔ رات کو ساری دنیا سوتی
ہے۔ اور تم ہو کہ ادھر اُدھر بھٹکتے پھرتے ہو۔"

"کیا کروں نیند ہی نہیں آتی۔"

"تو تم مجھے بلا لیا کرو یا میرے پاس آ جایا کرو۔ میں تم کو
لوری سنا کر سلا دیا کروں گی۔ اکثر دیکھتی ہوں کہ تم ڈیڑھ دو بجے
واپس آتے ہو۔"

"تو تم دیکھتی رہتی ہو کہ میں کب آتا ہوں؟"

جب تک تم آ نہیں جاتے مجھے چین نہیں آتا۔ سوچتی
ہوں تم جانے کہاں بے مقصد گھومتے پھر رہے ہو گے۔"

ایک مخصوص قسم کی اُداسی جس نے اس کے دل میں
گھر کر لیا تھا اس سے تو وہ اس وقت بھی پیچھا نہ چھڑا سکا مگر
ان دنوں اسے ایک عجیب سا سکون محسوس ہوتا۔ کوئی
اس کے لئے چشم براہ رہتا تھا۔ کسی کو اس کا خیال تھا۔
کوئی اس کے گھر سے نکلتے وقت اس کے انتظار میں کھڑکی
پر کھڑا رہتا تھا۔ کسی نے اپنے خلوص کے سارے خزانے
اس کے لئے وقف کر دیئے تھے۔ یہ بات اس کے لئے
بہت بڑی تسکین کا باعث تھی۔ اور ذکیہ سے بچھڑنے کے
بعد اسے وہ لڑکی ہی نہ ملی جس کے سامنے بے اختیار جھک
جانے کو اس کا دل چاہے۔ پھر اس کے جھک جانے کی خواہش
بھی بالکل عجیب سی تھی۔ وہ اپنے عجز و انکسار میں بھی اپنی انا کو
برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ اور یہی بات وہ دوسری جانب
چاہتا تھا۔ وہ لڑکی کو ناز اور نیاز کے مجموعے کی شکل میں
دیکھنا چاہتا تھا۔ یوں تو زندگی میں کتنی ہی لڑکیاں آئیں
اور آج کل تو لڑکیوں نے زندگی میں آنے اور پھر ایک
زندگی سے نکل کر دوسری زندگیوں میں داخل ہوتے رہنے
کو فیشن بنا لیا ہے۔ چور دروازے سے دبے پاؤں آتی ہیں
اور پھر نظر بچا کر سامنے کے دروازے سے نکل جاتی ہیں۔
اسے تو ایسے گیسوؤں کا سایہ چاہیئے تھا جہاں وہ تھک کر
بیٹھ جائے تو اُٹھنے کا نام نہ لے مگر یہ گیسو بھی ابرِ رواں ثابت
ہوتے ہیں۔ جن کے سائے کسی ایک جگہ ٹھہرتے ہی نہیں
ـــــ اسے تو ذکیہ جیسی ایک لڑکی چاہیئے تھی جو دستک دے
کر سامنے کے دروازے سے آئے اور چور دروازے پر
اینٹیں چنوا دے۔

اسے ایسی لڑکیوں سے بے انتہا چڑ تھی جو مردوں
کے سامنے آتے ہی بغیر سوچے سمجھے احساسِ کمتری میں مبتلا
ہو جاتی ہیں۔ جن کے اپنے کوئی واضح نظریات نہیں ہوتے
جو ہمیشہ مرعوب ہونے کو تیار رہتی ہیں۔ مگر اس کا مطلب
یہ بھی نہیں کہ اسے فلرٹ کرنے والی سوسائٹی گرلس پسند
تھیں۔ جو اپنے مصنوعی حسن۔ ہٹ دھرمی اور ایک گمراہ سے
احساسِ برتری کے زعم میں دنیا کو ہیچ سمجھتی رہتی ہیں اور
حقیقی مسرت کی تلاش میں اپنی روح کے ویرانوں کو دن
بدن وسیع کرتی چلی جاتی ہیں۔ اسے تو بس ایک لڑکی چاہیئے
تھی جو مکمل لڑکی ہونے کے ساتھ ساتھ مکمل ساتھی بھی ہو۔

آہستہ آہستہ اس نے آنکھیں کھولیں۔ وہ کمرے میں
اکیلا پڑا تھا۔ باہر شور کی آواز آ رہی تھی۔ وہ اٹھ کر برآمدے
میں آیا۔ اس نے دیکھا تمام لوگ کوٹ پہنے اُونی چادریں

جسم پر ڈالے تاش اور کیرم میں گم ہیں۔ سگریٹ کے بیشمار ٹکڑے اور خالی پیکٹ ادھر اُدھر بکھرے پڑے ہیں۔ چائے کی اکثر پیالیوں کو ایش ٹرے کی جگہ استعمال کیا جا رہا ہے۔ اور چند پیالیاں ادھر اُدھر الٹی پڑی ہیں۔ سب مست تھے۔ کسی کو اس کا کوئی خیال نہیں۔ وہ پھر آکر اپنی کار میں لیٹ گیا۔ دور سے آتی ہوئی ان لوگوں کی آواز جانے کیوں اسے گراں گزر رہی تھی۔ اس لئے وہ پھر کار میں آکر لیٹ گیا۔

بارہ سال قبل جب وہ پاکستان آیا تھا تو اس کی تعلیم صرف انٹر تک تھی۔ اور سب سے پہلے جو ملازمت اس نے کی وہ ستانوے روپے ماہوار کی تھی۔ مگر اس نے صرف اس لئے چھوڑا تھا کہ اس کے تعلیم جاری رکھنے کے تمام راستے مسدود ہو گئے تھے۔ اور اس کے پرانے خیال کے والدین اس کی شادی پر مصر تھے اور وہ اس وقت قطعی شادی نہ کرنا چاہتا تھا۔

بچپن سے ہی وہ سوچا کرتا تھا کہ وہ خوب پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنے گا۔ بڑا ہو کر اس نے سوچا تھا کہ وہ کم از کم ایم اے تک تعلیم حاصل کرے گا پھر کوئی اچھی سی نوکری کرے گا جہاں کم از کم اسے پانچ سو روپے ماہوار ملے پھر وہ اپنا ایک چھوٹا سا خوبصورت سا مکان بنائے گا۔ اور آخر میں ایک چھوٹی سی کار خریدے گا۔ اور جب یہ تمام آسائشیں حاصل کرلے گا تو ایک مخلص سی خوبصورت سی لڑکی سے شادی کرلے گا۔ عورت اس کے لئے ہمیشہ قابل احترام ہستی رہی ہے۔ پیار اور لطافت کا مجسمہ رہی ہے۔ اور وہ تو ہر لڑکی کو ذکیہ کے پیمانے میں ناپنے کا عادی ہو چکا تھا۔ شادی شدہ زندگی کا جو خاکہ اس نے شروع سے ہی بنایا تھا وہ اس میں خون جگر کا رنگ بھرتا رہا اور اس کی اپنی زندگی کے خاکے کے رنگ رفتہ رفتہ اُڑتے رہے۔ وہ سوچا کرتا تھا کہ اس کی اپنی زندگی تو کسی حال میں گزر جائے گی مگر مستقبل کی ذمہ داریوں کا اسے شدید احساس تھا جو اسے بے چین رکھتا۔ وہ اپنی رفیقۂ حیات کی تکلیف کا تصور

بھی نہ کر سکتا تھا۔ بیوی کو وہ ملازمہ کی حیثیت نہیں دینا [illegible] تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے بچے میلے کپڑے پہنے گندے بدتمیز بچوں کے ساتھ نالیوں کی گندگی سے اور نئی نئی گالیاں سیکھیں۔ اور ڈیڑھ دو سو روپے بھی کچھ ہو سکتا تھا۔

اس زمانے میں جب وہ بی اے میں پڑھ رہا تھا ایک سو ساٹھ روپے کی ملازمت کر رہا تھا۔ اس پر [illegible] ساجدہ سے شادی کرنے پر دباؤ ڈالا تھا۔ ساجدہ بڑی سلیقہ شعار اور سمجھ دار لڑکی تھی۔ اور ذکیہ کے بعد [illegible] لڑکی پسند بھی آئی تھی۔ مگر صرف اسی خیال سے اس [illegible] دیا کہ اس وقت نہ ہی اس کی تعلیم مکمل تھی اور نہ ہی کوئی ملازمت وہ کر رہا تھا۔ حالانکہ اسے قطعی یقین تھا کہ سا[illegible] اس کے لئے بہترین بیوی ثابت ہوگی۔ بالکل ایسی وہ چاہتا تھا۔ مگر اب ساجدہ کی شادی ہو گئی ہے کے دو بچے ہیں اور اس کی ازدواجی زندگی بڑی [illegible] ہے۔ اور اب وہ سوچتا کاش اس نے ساجدہ سے کر لی ہوتی تو وہ بہت مطمئن ہوتا۔

ایم اے میں داخلہ لینے کے بعد اسے تعلیم ج[illegible] رکھنے کے لئے ملازمت ترک کرنی پڑی تو اس نے [illegible] پر گزارہ کرنا شروع کیا۔ اسے سنجیدہ کا ٹیوشن ملا۔ بچ[illegible] بھالی تو عمر لڑکی تھی۔ میٹرک میں پڑھتی تھی اور اس پندرہ سولہ سال کی رہی ہوگی۔ اور یہ سیدھی ساد[illegible] عمر کی لڑکی نہ جانے کیسے غیر محسوس طریقے پر اس کے [illegible] پر چھاتی چلی گئی۔

جب کبھی وہ ایک آدھ روز پڑھانے نہ جاتا تو [illegible] ہی تشویشناک لہجے میں پوچھتی۔

"ماسٹر صاحب آپ کل کیوں نہیں آئے تھے

شروع میں ایک بار اس نے اس کا جواب [illegible] سے دیا تھا۔

"ایک دن کے پیسے کاٹ لینا۔ مگر مجھ سے باز پرس نہ کیا

"آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ میں نے اس لئے تھوڑا ہی پوچھا
میں سوچ رہی تھی کہ کہیں آپ کی طبیعت نہ خراب ہو گئی
"

"جب کوئی فکر کرنے والا نہ ہو تو بیمار پڑنا بھی بیکار ہے۔"
نے نرمی سے جواب دیا
"میں سوچتی ہوں آپ بیمار پڑتے ہوں گے تو آپ کو
تکلیف ہوتی ہوگی۔ گھر میں اکیلے پڑے رہتے ہوں گے۔
ہوٹل میں کھانا کھا کر تو صحت یوں بھی برباد ہو جاتی ہے۔ پھر
آپ تو سگریٹ بھی بہت پیتے ہیں۔"
"سگریٹ تو زندگی کی سب سے اہم ضرورت بن گئی ہے۔"
"سگریٹ بہت نقصان کرتی ہے۔ آپ اتنی سگریٹ نہ
پیجئے۔" لیکن وہ سگریٹ نہ چھوڑ سکا۔
سنجیدہ اس سے رفتہ رفتہ بے تکلف ہوتی گئی۔
"آپ کل نہیں آئے تو میں بہت پریشان رہی۔ دعا
مانگتی رہی کہ خدا کرے آپ کی طبیعت ٹھیک ہو"— ایک دن
اس نے کہا
"حالانکہ خوب خوشیاں منائی ہوں گی کہ چلو ایک دن تو
ماسٹر صاحب سے نجات ملی"
"اللہ آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ آپ نہیں آتے تو سارا
دن بے مزہ گزر جاتا ہے۔"
یہ معمولی معمولی باتیں رفتہ رفتہ بہت اہم ہوتی گئیں۔
سنجیدہ اس سے بالکل بے تکلف ہو گئی اور وہ بھی رفتہ رفتہ
گھر کے ہی ایک فرد سا بن گیا۔
ایک دن وہ سنجیدہ کو پڑھا رہا تھا کہ اس کی ایک سہیلی
آئی۔ اسے دیکھ کر واپس لوٹنے لگی تو وہ بول اُٹھا۔
"میرے سر پر سینگ نہیں ہیں۔ آجائیے۔"
اور وہ رُک گئی پھر شرماتے ہوئے سنجیدہ کو ایک طرف
بلا لیا۔ اور دونوں ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگیں۔
ذرا دیر بعد ہی سنجیدہ واپس آ گئی تو اس نے پوچھا۔
"اتنی جلدی بھگا دیا تم نے اپنی سہیلی کو؟"
"وہ تو پاس ہی رہتی ہے۔ جب چاہتی ہے آ جاتی
ہے۔ آپ تو دن میں ایک بار تھوڑی دیر کے لئے آتے ہیں۔"
"کیا باتیں ہو گئیں۔؟" اس نے پھر پوچھا۔
"بڑی شرارتی ہے یہ شاہدہ بھی۔ کہہ رہی تھی تمہارے
ماسٹر صاحب تو بڑے تیز ہیں۔"
"اچھا!"
"اور کہہ رہی تھی۔" اس نے شرماتے ہوئے کہا۔ "بڑے
اچھے ہیں۔ شادی کر لو۔"
"پھر!"
"میں نے کہہ دیا۔ تمہاری رال ٹپک رہی ہے تو تم ہی
کر لو۔ ایم اے پاس ہیں۔ ان سے اچھا آدمی تم کو کہاں ملے گا۔"
"تو گویا تم کو میں بُرا لگتا ہوں۔؟"
"نہیں تو۔"
"تو تم سنجیدہ عابد سے سنجیدہ انور بننے پر رضامند ہو؟"
اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔
وہ خاموش رہی۔
"جواب دو نہ" اس نے دوبارہ کہا
"ہوں۔" اس نے آدھا چہرہ آنچل سے چھپا کر دوپٹے
کا کونہ منہ میں دبائے شرماتے ہوئے اور نیچی نظریں کئے
ہوئے صرف "ہوں" کہا۔
اس کے بعد وہ بے تکلفی سے آئندہ زندگی کے متعلق
باتیں کرنے لگی۔
"آپ سگریٹ بہت پیتے ہیں۔ میں نہیں پینے دوں گی
اتنے سگریٹ۔"
"میں بھی تو یہی چاہتا ہوں کہ کوئی ہو جو میرا سگریٹ
چھڑا دے۔"

"آپ اتنی محنت کرتے ہیں جبھی تو آپ کی صحت چوپٹ ہو گئی ہے۔ میں ہوتی تو کبھی آپ کو اتنی محنت نہ کرنے دیتی۔"

"سنجیدہ تم بہت اچھی اچھی باتیں کرتی ہو۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ باتیں میرے لئے تکلیف کا سبب نہ بن جائیں۔"

اس نے ایک دن سنجیدگی سے کہا۔

"کیا مطلب؟" سنجیدہ نے حیرت سے پوچھا۔

"میں ڈرتا ہوں اگر تم بھی عام لڑکیوں کی طرح ثابت ہوئی جو کسی جذباتی لمحے میں بڑے سے بڑا عہد و پیمان کر لیتی ہیں اور کسی دوسرے جذباتی لمحے میں پچھلے تمام عہد و پیمان یکسر بھول جاتی ہیں تو کیا ہوگا۔"

"ہائے اللہ آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ میں تو آپ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔"

"خیر یہ سب تو کہنے کی باتیں ہیں اس زمانے میں کوئی کسی کے لئے مرتا بھی نہیں۔ کل کو ممکن ہے تم نہ صرف مجھ کو بھول جاؤ بلکہ مجھے پہچاننے سے بھی انکار کر دو۔"

کہنے کو یہ بات اس نے یونہی کہہ دی تھی مگر اتفاق سے بالکل ایسا ہی ہوا۔ اس نے ٹیوشن چھوڑ دیا تھا اور سنجیدہ ایک دن اسے گھر کے کسی کونے میں بیٹھی خط لکھ رہی تھی کہ گھر کے کسی فرد نے دیکھ لیا۔ اس کے بعد کیا ہوا اس کا تو اسے پتہ نہیں مگر اس نے یہ ضرور دیکھا کہ سنجیدہ اس کے لئے اجنبی ہو گئی وہ بغیر اس کی طرف توجہ دیئے یوں گزر جاتی جیسے وہ اس کے لئے بالکل ہی اجنبی ہو — بلکہ کبھی کبھی تو اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے اس کا اپنا کوئی وجود ہی نہ ہو ورنہ سنجیدہ آخر اس قدر بے نیاز کیسے ہو جاتی وہ لڑکی جو اسے سب کچھ سمجھتی تھی۔ اب اسے پہچانتے بھی نہیں۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ اور ایسے موقعوں پر اسے مجاز کا ایک جملہ یاد آ جاتا ——

"یہ لڑکیاں زندگی میں ہنستی ہوئی داخل ہوتی ہیں اور روتا چھوڑ کر چلی جاتی ہیں۔"

اور اب اس کے لئے لڑکیوں میں دلچسپی لینے کا تصور بھی اس قدر خوفناک ہو گیا تھا کہ اگر کوئی لڑکی اس سے سے لگاوٹ سے کوئی بات کر لیتی تو اس کا دل کسی انجا خوف سے دھڑک اٹھتا۔

ایک بار عرفانہ نے اسے مضمحل دیکھ کر پوچھ لیا۔

"کیا بات ہے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں معلوم"

"ہاں آج میں کار نہیں ڈرائیو کروں گا۔ تم کو جا لے جاؤ۔"

اس نے فوراً جواب دیا اور تھوڑی دیر بعد عرفا لے کر چلی گئی۔

اس کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ اور اس کی وجہ اس کا عہدہ اس کی کار۔ اس کا اکیلا بنگلہ۔ اور ا کی دوسری تمام چیزیں تھیں جن کی اس کے دوستو جاننے والوں کو اکثر ضرورت پڑتی رہتی تھی۔

جب کبھی اس کے بنگلے کے آس پاس رہنے وا دوست اس سے اس قسم کی گفتگو کرتا۔

"یار انور۔ تم اپنے کمرے میں اکیلے پڑے رہ تمہیں تنہائی کا احساس نہیں ہوتا؟" تو وہ فوراً سمجھ جا کے دوست کے یہاں کوئی مہمان آ گیا ہے جس کے کی ضرورت ہے اور وہ فوراً کہہ اٹھتا۔

"تمہارے یہاں جگہ تو ہے نہیں۔ اگر کوئی مہ آجائے تو بڑی تکلیف ہوتی ہوگی۔" اور اس طرح دو دوست کی مشکل خود ہی حل کر دیتا۔ تاکہ وہ آسانی سے کی بات کہہ سکے۔

انور اپنے بنگلے کار اور دیگر تمام چیزوں کا استعمال کرتا جیسے وہ اس کی اپنی نہ ہوں۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا جیسے اسے ان تمام چیزوں سے نفر جیسے انہیں تمام چیزوں نے اس سے اس کا سکون کی مسرتیں اور اس کا آئیڈیل چھین لیا ہو —— اس لئے ان تمام آسائشوں کے ساتھ اس کا رویہ سوتیلی

ا اے کبھی اس کی فکر نہ ہوتی یہ چیزیں دوسروں کے
ہی کے استعمال سے تباہ ہو جائیں گی۔ کوئی ذرا سے
ے سے بھی کوئی چیز مانگتا تو وہ فوراً دے دیتا اس
د خلوص سے بالکل اُکتا گیا تھا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ
اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ سب کو اس کی کار۔ اس
۔ اس کا ٹیپ رکارڈر وغیرہ زیادہ عزیز تھا۔ اور
یں ان کے اور اس کے درمیان رشتہ تھیں۔ اور ر
ی طور پر اس نے اس بات کو تسلیم کر لیا تھا۔
اور اسی لئے اس کا برتاؤ خاصا کھردرا ہو کر رہ گیا
ں کے خلوص برتنے کا انداز بھی اتنا خشک تھا کہ لوگ
حقیقی جذبات نہ سمجھ پاتے۔ اور وہ ہمیشہ اپنے جذبات
پوشی کرتا۔ کوئی شادی کی بات کرتا خواہ اس کی ہو یا کسی
۔ وہ اس طرح مخالفت کرتا جیسے اسے شادی کے نام سے
ر چڑھ ہو۔ وہ کہتا۔
محبت اور شادی دنیا کی سب سے بڑی حماقتیں ہیں۔
آدمی شادی کرکے اُلّو کا پٹھا بن جاتا ہے۔"
حالانکہ خود اس کا دل چاہتا کہ اسے اپنی پسند کی ایک
فلص سی لڑکی مل جائے تو وہ فوراً شادی کر لے۔ اور
ر وہ کسی شادی شدہ کو مسکراتے ہوئے گزرتے دیکھتا
پنی زندگی رائیگاں معلوم ہونے لگتی۔
ایک دن قدسیہ آئی۔
انور صاحب یہ آپ ہمیشہ آفس سے آ کر بنگلے میں پڑے
۔ کہیں گھومنے پھرنے نہیں جاتے۔ آپ کی طبیعت
رائی؟"
بھئی مجھے تو اپنے مکان میں بڑا سکون محسوس ہوتا ہے۔"
ما کے بنگلے کے در و دیوار اسے کاٹنے کو دوڑتے
کا اس لیے کہ اس تنہائی سے سخت وحشت ہوتی تھی۔
ما کہ اس کی تنہائی کا احساس بجائے کم ہونے کے
بڑھ جاتا تھا۔ وہ اپنی روح کی ویرانیوں سے نجات
نہ پا سکتا تھا۔ تنہائی میں بھولی بسری یادیں اور کتنی ہی حسین
ان دیکھی صورتیں انجمن آرائی کرتی رہتی تھیں۔ مگر ہنگامے تو اس
کی یہ مسرت بھی چھین لیتے تھے۔ اور وہ انسانوں کے جنگل میں
خود کو بھیانک حد تک تنہا محسوس کرنے لگتا تھا۔

"فرزانہ کے یہاں فنکشن میں نہیں جائیں گے آپ؟"
قدسیہ نے پوچھا۔

"تم چلی جاؤ۔ اور ہاں تم کو ٹیپ رکارڈر کی بھی ضرورت
ہو گی نہ وہ لیتی جاؤ۔ اگر ضرورت ہو تو کار بھی لے لو" اس نے
جلدی سے کہا۔

"آپ تو ایسا کہہ رہے ہیں جیسے میں صرف ٹیپ رکارڈر
اور کار کے لئے ہی آئی تھی۔ اور میں نے فنکشن میں چلنے کو
تکلفاً کہہ دیا ہے" قدسیہ نے برا ماننے کے انداز سے کہا

"نہیں بھئی میرا دل نہیں چاہ رہا ہے فنکشن میں جانے
کو۔ اور ٹیپ رکارڈر وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جن کی ایسے موقعوں
پر ضرورت ہوتی ہی ہے۔ پھر آخر یہ کس دن کام آئیں گی۔"
اس نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔

دراصل وہ چاہتا تھا کہ قدسیہ اس کے پاس ہی ٹھہری
رہے۔ وہ نہیں جا رہا تھا تو وہ بھی نہ جائے۔ کچھ تو اس کے
جذبات کا احساس کرے۔ لیکن جب تھوڑی دیر بعد رسمی باتیں
کرکے وہ ٹیپ رکارڈر اور کار لے کر چلی ہی گئی تو اس نے
سوچا۔

قدسیہ بھی کاغذ کا پھول ہے۔ جس کا رنگ تو بہت دیدہ
زیب ہے مگر بُو سے محروم ہے ـــ اور پھر اس نے فوراً سوچا
کہ اس کا آئیڈیل بھی کاغذ کا پھول ہی ثابت ہوا جس میں اس
نے اپنے خونِ جگر کا رنگ تو بھر دیا۔ لیکن وہ اسے خوشبو نہ
عطا کر سکا۔

ایک دن یونہی بیٹھے بیٹھے اس نے جرمنی جانے کا پروگرام
بنا ڈالا۔ دو تین ماہ کی رخصت اسے مل سکتی تھی۔ اور جرمنی
وہ اس سے پہلے ٹریننگ کے سلسلے میں جا چکا تھا۔ اُو پچے

آلپیس Alps کے گنجان جنگلوں کی اداس اور ویران پگڈنڈیاں
اسے بے حد پسند تھیں۔ ان اجنبی فضاؤں میں وہ گھنٹوں بیٹھا
برف پوش چوٹیوں کو گھورا کرتا تھا۔ پتوں کی ہلکی ہلکی سرسراہٹ
اور چڑیوں کی اُداس چہچہاہٹ میں گم خود کو اور اپنی زندگی
کی تمام تنہائی اور کرب کو بھول جایا کرتا تھا۔ جہاں ایک
اُداس دوپہر کو ایک ویران پگ ڈنڈی پر اسے باربل ملی تھی
جو اس سے بہت جلد گھل مل گئی تھی۔

عجیب بات تھی کہ وہ مسرتوں کی تلاش میں اداسیوں
اور تنہائیوں کی طرف بھاگتا تھا۔ اور یہی اسے تسکین بھی دیتی
تھیں۔ باربل اس کی ہم مزاج اور ہم مذاق تھی۔ اسی لئے
دونوں بہت جلد ایک دوسرے سے قریب ہوگئے۔ باربل
نے شادی کی تجویز پیش کی مگر وہ ایسا نہ کر سکتا تھا — وہ
ٹریننگ پر آیا تھا۔ اس وقت تک اس کی تنخواہ صرف ساڑھے
تین سو روپے ماہوار تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ اتنی معمولی سی
تنخواہ میں وہ ایک مغربی ملک کی لڑکی کو کس طرح خوش رکھ
سکے گا — باربل نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ اس کے ساتھ
ہر حال میں خوش رہ سکے گی مگر وہ اس بات کو ماننے پر تیار نہ
تھا — پانچ سال بعد وہ پھر جرمنی جا رہا تھا۔ اب اس کی
تنخواہ آٹھ سو روپے ماہوار تھی۔ اس نے بنگلہ بنوا لیا تھا۔ کار
خرید لی تھی۔ ریڈیو کیمرہ اور ٹیپ رکارڈر تو وہ جرمنی سے ہی
لے کر آیا تھا۔ وہ تمام آسائشیں جن کے وہ خواب دیکھا کرتا تھا
اب اسے میسر تھیں۔ اب وہ واقعی باربل کو خوش رکھنے کے
قابل ہوگیا تھا۔ مگر اسے مشرق بہت پسند تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ
آتا تھا کہ مشرق اور مغرب کا اتصال کیوں کر ہو سکتا ہے۔
باربل اب بھی اسے خط لکھتی تھی۔ اور ہمیشہ پوچھا کرتی کہ وہ
دوبارہ کب آئے گا — اور اب اس نے غیر متوقع طور پر
پہنچ کر واقعی اسے چونکا دینے کا ارادہ کر لیا —

انور باربل نے اس کا بڑی گرم جوشی سے استقبال
کیا۔ جیسے وہ گزشتہ پانچ سال سے اس کا انتظار کرتی رہی ہو
اسے دیکھتے ہی وہ چند لمحوں کو اداس ہوگئی تھی۔ لیکن پھر فو
ہی اس طرح کھل گئی جیسے وہ اس کے لئے عزیز ترین ہستی ر
ہو۔ دوسرے ہی دن اس نے انور سے کہا۔

"انور۔ چلو آلپیس پر چلتے ہیں۔ آلپیس کی وہ ویرا
اور خاموش پگڈنڈیاں مجھے بے حد پسند ہیں جہاں پہلی بار
ایک اُداس دوپہر کو مجھ سے ملے تھے۔ جہاں گھنٹوں ایک
کا ہاتھ میں ہاتھ لئے ہم گھومے ہیں۔"

وہ دونوں آلپیس کے گنجان جنگلوں کے درمیان ا
خاموش پگ ڈنڈی پر پہنچ گئے۔ باربل اس کا ہاتھ میں ہا
لئے مسرت سے اپنے اطراف کا جائزہ لیتی ہوئی غزل گنگ
کرتی ہوئی ٹہل رہی تھی۔

"مجھے حیرت ہے انور اگر تم ان درختوں۔ ان برف پ
چوٹیوں اور اس پُرسکون فضا کو بھول گئے تھے۔ میں کب
تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ اُن گنت اداس لمحے میں نے ا
سکون فضا میں گزارے ہیں۔ جب بھی میری طبیعت پریشا
ہوتی میں اسی پرسکون خاموش جنگل میں چلی آتی۔ اور
یہاں کتنا سکون ملتا ہے کیا بتاؤں۔"

ایک لمحے کو انور کو خیال ہوا کہ باربل اس سے محب
کرتی ہے۔ اور شاید وہ بھی اسے بے حد چاہتا ہے۔ اور
اسے باربل سے شادی کر ہی لینی چاہیئے۔

"کیا بات ہے آج تم بہت خوش نظر آرہی ہو۔"
انور نے باربل سے پوچھا

"ہاں میں بہت خوش ہوں" اس نے ایک لمحے
اُداس ہوتے ہوئے کہا

"تم میرے پاس آئے ہو جب میں تم سے مایوس ہو
تھی۔ اور میں ڈر رہی ہوں کہ اب کہیں تم مایوس نہ ہو"

"کیوں؟" یکایک اس کا دل دھڑک اُٹھا۔

"میں تمہارا انتظار کر رہی تھی مگر تم نہ آئے۔ اور
انتظار کی راہ میں مجھے فریڈرک مل گیا۔ بالکل تمہاری ہی

ہے۔ تنہا اور اداس میں نے تمہارا سہارا چاہا۔ تم نے مجھے امید بھی نہ دلائی۔ اس نے میرا سہارا چاہا۔ میں اسے مایوس نہ کر سکی۔ اگلی پندرہ کو وہ آ جائے گا۔ پھر ہم دونوں ایک ہو جائیں گے۔ لیکن انور تم مجھے ہمیشہ یاد رہو گے۔ ایک دوست کی حیثیت سے میں تم کو ہمیشہ یاد رکھوں گی۔"

انور کے ہاتھوں پر اس کی گرفت اور مضبوط ہو گئی اور وہ کہتی گئی۔ "وہ لمحہ بڑا قیمتی تھا جب تم مجھے ان راہوں میں ملے تھے۔ اور اس کے بعد کے وہ تمام لمحے بڑے قیمتی ہیں جو میں نے اکیلے یہاں گزارے ہیں۔ اور شاید اب یہ لمحے کبھی واپس نہ آئیں جب ہم ایک دوسرے کا ہاتھ میں ہاتھ لئے دنیا سے بے نیاز اس پُرسکون ماحول میں مسرت کی گھڑیاں گزار رہے ہوں۔ میں ان لمحوں کو جاوداں بنا لینا چاہتی ہوں......

اور یکایک انور کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ باربرا کو بے حد چاہتا ہو۔ جیسے وہ اس کے ہی لئے اتنی دور آیا تھا اور اب باربرا اس کی نہ رہی۔ اس کے ہاتھ میں کسی کا ہاتھ نہیں وہ تو ہمیشہ سے تنہا ہے۔ آلپس کے ان گنجان جنگلوں کے درمیان ٹیڑھی میڑھی پگ ڈنڈیوں کی طرح جن پر کبھی کبھی کوئی سیاح آ نکلتا ہے اور اس کے جانے کے بعد یہ راہیں پھر اپنی ازلی اُداسی اور تنہائی میں ڈوب جاتی ہیں

آغا ناصر

ماچس اور چور

ایک ایکٹ کا ڈرامہ

کردار:-

عائشہ ——— ایک نوجوان لڑکی
——— ایک نوجوان مرد
نواب علی ——— عائشہ کا باپ
نزدو ——— بوڑھا ملازم

ایک کمرہ خاصا کشادہ اور آراستہ، مغربی اور مشرقی سمت ایک ایک دروازہ عقبی دیوار میں ایک کھڑکی۔

مغربی سمت دیوار کے ساتھ ایک خوبصورت چھوٹی سی مسہری پڑی ہے۔ مشرقی کونے میں ایک نہایت نفیس صوفہ سٹ ہے۔ درمیان میں ایک خوبصورت بک شلف ہے جس میں کتابیں بھری ہیں اور اوپر دو گلدان تازہ پھولوں سے بھرے ہوئے رکھے ہیں۔ کمرے کے وسط میں ایک آرام کرسی پڑی ہے۔

جب پردہ اُٹھتا ہے تو عائشہ مسہری پر سینے کے بل لیٹی کوئی میگزین پڑھنے میں مصروف ہے۔ کبھی کبھی وہ اپنی ٹانگیں ہلاتی جاتی ہے اس کا چہرہ سامعین کی طرف ہے۔

چند لمحوں بعد عقبی کھڑکی بہت دھیرے سے کھلتی ہے اب معلوم ہوتا ہے باہر سخت بارش ہو رہی ہے۔ اور گرج اور چمک ہے ایک نوجوان برساتی اوڑھے آہستہ سے کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل ہو جاتا ہے اور پھر آہستہ سے کھڑکی بند کر دیتا ہے عائشہ میگزین پڑھنے میں محو ہے۔ نوجوان جیب سے سگریٹ نکالتا ہے اور پھر ماچس سے جلانے کی ناکام کوشش کرنے کے بعد مسہری کے قریب آ جاتا ہے۔

نوجوان:- معاف کیجیے گا۔ آپ۔۔۔

عائشہ:- (ایک دم چونک کر چیخ پڑتی ہے)

نوجوان:- اوہ۔ آپ تو گھبرا ہی گئیں۔

عائشہ:- (خوف سے کانپتے ہوئے) کون ہو تم۔!

نوجوان:- (بڑے اطمینان سے) تعارف بعد میں ہوتا رہے گا فی الحال تو مجھے یہ بتلایئے کہ آپ کے پاس ماچس ہوگی۔ میرا ماچس بارش سے سیل گیا۔ اور مجھے سگریٹ کی شدید خواہش ہو رہی ہے۔

عائشہ:- (ابھی تک گھبرائی ہوئی ہے) کون ہو تم؟ تم یہاں کیسے آئے، کیوں آئے؟

نوجوان:- (مسکرا کر) آپ نے میری درخواست پر غور کرنے کی بجائے اپنے سوالات میں دو کا مزید اضافہ کر دیا۔ ڈریئے نہیں۔ خوف کی کوئی بات نہیں ہے۔

عائشہ:- مگر آخر تم ہو کون؟

نوجوان:- ایک ہی سوال بار بار دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں — میں اس وقت تک آپ کی کسی بات کا جواب نہیں دے سکتا جب تک مجھے ماچس نہ مل جائے۔

عائشہ:- ماچس میرے پاس نہیں ہے۔

نوجوان:- اوہ۔ تو پھر مجبوری ہے۔

وہ بڑے اطمینان سے اپنی برساتی اتار کر آرام کرسی کی پشت پر لٹکانے لگتا ہے۔

عائشہ:- یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟

نوجوان:- برساتی اتار کر لٹکا رہا ہوں۔ دیکھ نہیں رہی ہیں آپ؟

عائشہ:۔ آخر اس سب کا مطلب کیا ہے (اٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہے)
چاہتے کیا ہیں آپ؟
نوجوان:۔ ایک امر چاہتا تھا۔ آپ نے انکار کر دیا۔ اب اور کیا چاہوں گا۔
عائشہ:۔ یہ مذاق کی بات نہیں ہے مجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ تم کون ہو
اور کس غرض سے رات کے وقت میرے کمرے میں آئے ہو۔
تم آئے کس طرح؟
نوجوان:۔ اگر آپ اطمینان سے بیٹھ کر بات کر سکیں تو میں ان سارے سوالات
کا تفصیل وار جواب دے سکوں گا۔ اس طرح بڑا مشکل ہے!
عائشہ:۔ عجیب آدمی ہو (پریشان سی ہو کر اس کی طرف دیکھتی ہے)
(نوجوان میز پر پڑی ہوئی میگزین اٹھا کر دیکھنے لگ
جاتا ہے عائشہ جذبذ ہو کر بیٹھ جاتی ہے) آخر آپ
ہیں کون؟
نوجوان:۔ (رسالے کے ورق پلٹتے ہوئے) یہ امر کا لکھا ہوا ڈرامہ
پڑھ رہی تھیں آپ؟
عائشہ:۔ (جھپٹ کر رسالہ اس کے ہاتھ سے چھین لیتی ہے) آپ سیدھے
سیدھے یہاں سے جاتے ہیں یا نہیں؟
نوجوان:۔ نہیں۔
عائشہ:۔ تو میں نوکروں کو بلاؤں تاکہ وہ تمہیں باہر نکال دیں۔
نوجوان:۔ میں آپ کو کمرے سے باہر نہیں جانے دوں گا۔ آپ بہت
نازک ہیں۔ میں بہرحال مرد ہوں۔
عائشہ:۔ (ہونٹ کاٹتے ہوئے) میں آوازیں دے کر ڈیڈی اور
ممی کو بلا لوں گی۔
نوجوان:۔ بارش بہت تیز ہے اور بجلی کی گرج چمک اپنے زور پر ہے۔
آپ کی آواز آپ کے والدین کے کانوں تک پہنچنا مشکل ہے۔
عائشہ:۔ (جیسے ہار مان گئی ہو۔ بڑی خوشامد سے) آپ چاہتے کیا ہیں۔
یہاں کیوں آئے ہیں کس طرح آئے ہیں!
نوجوان:۔ (مسکرا کر) اب ٹھیک ہے۔ میں جو کچھ ہوں اس پر غور کیجئے۔ مگر
اسی شرط پر میں آپ کے ان سارے سوالات کا جواب دے سکتا
ہوں (تھوڑی دیر خاموشی) بولئے منظور ہے آپ کو؟

عائشہ:۔ (ریزرا سا ہو کر) جی
نوجوان:۔ ادھر آئیے (عائشہ ڈرتے ڈرتے اس کے قریب آتی ہے)
میرے پاس بیٹھ جائیے (بیٹھ جاتی ہے) اپنی پریشانی دور کر لیجئے۔
عائشہ:۔ جی؟
نوجوان:۔ (مسکرا کر) تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کیجئے۔ اس طرح کہ
آپ کا یہ خوف و ہراس سب دور ہو جائے۔ اور جب آپ خود کو
نارمل محسوس کرنے لگیں تو اپنے سوالات دہرا لیجئے۔
عائشہ:۔ جی
نوجوان:۔ ہاں تو آپ امر کا ڈرامہ پڑھ رہی تھیں۔ کیا عنوان ہے
اس ڈرامہ کا۔
عائشہ:۔ عنوان۔۔۔۔! چور۔۔۔۔!
نوجوان:۔ اوہ عجیب اتفاق ہے۔ پلاٹ کیا ہے۔
عائشہ:۔ مجھے یاد نہیں۔ میں نے ابھی صرف پہلا منظر پڑھا ہے۔
نوجوان:۔ پھر بھی ـــــ کیا ہوتا ہے
عائشہ:۔ ایک چور ایک طوفانی رات میں ایک نوجوان لڑکی کے
کمرے میں داخل ہوتا ہے۔
نوجوان:۔ (دلچسپی سے) ہوں۔ پھر اس کے بعد
عائشہ:۔ میں نے ابھی یہیں تک پڑھا ہے چور داخل ہو چکا ہے اور
لڑکی جاگ گئی ہے۔ وہ ابھی چور اس سے باتیں کر رہی ہے۔
نوجوان:۔ میرا خیال ہے اس کے بعد چور اس کے یہاں چوری نہیں
کر سکے گا۔
عائشہ:۔ کیوں؟
نوجوان:۔ اگر لڑکی خوبصورت ہے اور چور جوان ہے تو پھر نا ممکن ہے
غیر فطری ہے۔
عائشہ:۔ ہو گا ـــــ اب آپ مجھے بتا سکتے ہیں آپ کون ہیں۔
نوجوان:۔ ہاں۔ میں ضرور بتاؤں گا آپ ایک ایک کر کے اپنے سوالات
دہرائیں۔
عائشہ:۔ آپ کون ہیں؟
نوجوان:۔ سوال کی نوعیت بڑی غیر یقینی سی ہے میں کون ہوں؟ ظاہر

ہے کہ ایک انسان ہوں۔ مرد ہوں۔ جوان ہوں تعلیم یافتہ ہوں
اس سوال سے آپ کی کیا مراد ہے۔

عائشہ:۔ (پریشان ہوکر) میرا مطلب تھا آپ یہاں کیوں آئے ہیں اور کدھر سے آئے ہیں؟

نوجوان:۔ دیکھئے خاتون —— معاف کیجئے مجھے آپ کا نام معلوم نہیں ہے (خاموش بیٹھ جاتا ہے)

عائشہ:۔ (تھوڑی دیر انتظار کے بعد) آگے کہئے

نوجوان:۔ میں نے آپ کا نام پوچھا تھا۔

عائشہ:۔ میں نہیں بتاؤں گی۔

نوجوان:۔ میرے خیال میں اس میں کوئی عیب نہیں ہے۔

عائشہ:۔ ہو یا نہ ہو۔ مگر میں بتانا نہیں چاہتی۔

نوجوان:۔ تو پھر شاید میں کھل کر گفتگو نہ کرسکوں جب تک مجھے اپنے مخاطب کا نام معلوم نہ ہو میں بے تکلفی سے بات چیت نہیں کرسکتا۔

عائشہ:۔ آپ مجھے کسی بھی نام سے پکار سکتے ہیں۔ فیروزہ۔ رضیہ۔ سلمیٰ۔

نوجوان:۔ (ہنس کر) چلئے یہی سہی ہاں تو فیروزہ صاحبہ آپ کا یہ سوال کہ میں کس طرح اور کس غرض سے یہاں آیا ہوں واقعی بہت اہم ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ جو جواب ان سوالوں کا ہوگا اسے شاید آپ تسلیم نہ کریں۔

عائشہ:۔ کہیے ——

نوجوان:۔ مجھے شک ہے کہ میں واقعی یہاں کہیں سے آیا ہوں کیا آپ نے مجھے آتے ہوئے دیکھا تھا۔

(عائشہ انکار میں سر ہلاتی ہے)

تو پھر کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ میرا اپنا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ شاید میں صرف آپ کے تخیل کی پیداوار ہوں۔

عائشہ:۔ (غصہ سے) میں یہ سب فضولیات نہیں سننا چاہتی آپ فوراً چلے جایئے ورنہ میں آپ کو پولس کے حوالے کردوں گی۔

نوجوان:۔ آپ ایسا نہیں کرسکتیں۔

عائشہ:۔ کیوں؟

نوجوان:۔ اتنے آپ پولس کو بلانے کا انتظام کریں گی میں چلا جاؤں گا۔

عائشہ۔ تو پھر آپ چلے جایئے۔

نوجوان:۔ لیکن ابھی آپ نے پولس کو بلانے کا ارادہ کہاں کیا ہے۔

(باہر سے کسی کے پکارنے کی آواز آتی ہے)

عائشہ:۔ (گھبرا کر) یہ میرے ڈیڈی ہیں۔

نوجوان:۔ ہوا کریں ——

عائشہ:۔ آپ فوراً چلے جایئے وہ اسی طرف آرہے ہیں۔

نوجوان:۔ تو مجھ پر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

عائشہ:۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں آتی رات گئے کسی مرد کا تنہا میرے کمرے میں ہونا ٹھیک نہیں ہے۔

نوجوان:۔ یہ بات آپ کے لئے پریشانی کا باعث ہوسکتی ہے میرے لئے (بڑے اطمینان سے سامنے رکھی ہوئی چھوٹی میز پر پیر رکھ کر آرام کرسی پر لیٹ جاتا ہے)

عائشہ:۔ خدا کے لئے آخر آپ سمجھتے کیوں نہیں

(ڈیڈی کی آواز قریب آجاتی ہے، عائشہ)

وہ آگئے ۔ میں کیا کروں ۔ اُف میرے اللہ

(نواب علی داخل ہوتا ہے وہ ادھیڑ عمر کا موٹا تازہ آدمی ہے نائٹ گون پہنے ہوئے سر گنجا ہے آنکھوں پر موٹے سیاہ فریم کی عینک ہے۔)

نواب علی:۔ بیٹی عائشہ آج تو بارش

(اچانک نوجوان کی طرف دیکھ کر جو کرسی پر بڑے اطمینان سے لیٹا رسالے کی ورق گردانی کررہا ہے)

یہ کون صاحب ہیں۔؟

عائشہ:۔ (گھبرا کر) یہ۔۔ یہ رضیہ کے بڑے بھائی ہیں ڈیڈی یہ کسی پارٹی سے واپس آرہے تھے کہ راستے میں بارش نے آ لیا بھیگتے بھاگتے مشکل سے یہاں تک پہنچے۔

نواب علی:۔ ہوں۔

نوجوان:۔ (اٹھ کر) آداب عرض۔

نواب علی:۔ آداب لیکن تم نے بے چاروں کو یہاں کیوں بٹھائے، ڈرائنگ روم میں لے کر آجاتیں۔

[عائ]شہ:۔ (لا جواب سی ہوکر) جی ۔۔۔۔۔

[نوجو]ان:۔ جی ہاں۔ انھوں نے تو بہت کہا۔۔۔ لیکن میرے کپڑے اور
[ج]وتے سب کیچڑ میں لت پت تھے میں نے مناسب نہ سمجھا۔ اور
پھر خواہ مخواہ آپ سب کو تکلیف ہوتی۔

[نوا]ب علی:۔ تکلیف کیسی۔ رضیہ تو میری اپنی بیٹی کی طرح ہے تم اس کے بھائی
ہو۔ تمہیں ہم سے تکلف نہیں کرنا چاہیئے تھا۔

[نوجو]ان:۔ جی تکلف کیسا۔ اگر تکلف ہوتا تو پھر ایسے موسم اور ایسی رات
میں یہاں آتا ہی کیوں۔
رضیہ اور فیروزہ تو میری نظر میں۔۔۔۔۔

[عائ]شہ:۔ (زور سے کھانستی ہے) ہاں ڈیڈی رضیہ تو خود ہی مجھ سے کہا
کرتی ہے کہ عائشہ میرے سامنے گھر والے تمہیں ایسا ہی
سمجھتے ہیں۔ جیسا خود مجھے۔

[نوا]ب علی:۔ ہاں، ہاں۔ کیوں نہیں۔ مگر وہ فیروزہ کا کیا قصہ تھا یہاں۔
فیروزہ کون ہے!

[نوجو]ان:۔ فیروزہ۔۔۔۔ جی فیروزہ میری منگیتر کا نام ہے۔۔۔۔۔ دراصل یہ
تینوں بہت دوست ہیں آپس میں۔۔۔۔۔ رضیہ فیروزہ اور یہ۔۔۔

[نو]اب علی:۔ (ہنستا ہے) تمہاری منگیتر کی دوست ہے عائشہ۔ تب ہی تم
[ب]اں باتیں کرنے میں مگن ہوگئے۔ (پھر ہنستا ہے) کوئی بات نہیں۔ کوئی بات
[نہ]یں (عائشہ سے) لیکن تم نے انھیں۔ کیا نام ہے تمہارا صاحبزادے؟

[نو]جوان:۔ جی نام۔۔۔۔ میرا نام عشرت!

[نو]اب علی:۔ (گھور کر دیکھتا ہے) عشرت۔۔۔ لیکن یہ تو رضیہ کے چھوٹے
بھائی کا نام ہے۔ وہ جو گول مٹول سا آیا کرتا ہے اس کے ساتھ۔
بھائی ہے نا وہ تمہارا؟

[ن]وجوان:۔ جی۔۔۔ جی ہاں۔۔۔۔ ہے تو بھائی لیکن اب کیا عرض کروں
معاملات کچھ اور ہیں دراصل ہمارے والد نے دوسری شادی
کی اور وہ چھوٹا بچہ ہماری نئی امی کے ساتھ آیا حسنِ اتفاق
سے نام اس کا بھی عشرت ہی تھا (خود بھی زور سے ہنستا ہے)
(عائشہ اپنے ہونٹ چبا رہی ہے۔ نواب علی گھور رہا ہے)

نواب علی:۔ کیا کہا۔ دوسری شادی۔ لیکن تم نے تو ہمیں کبھی نہیں بتایا
عائشہ کہ رضیہ کی سوتیلی امی ہیں؟

عائشہ:۔ جی۔ وہ۔۔۔۔!

نوجوان:۔ یہ بات کبھی کسی سے کہنے کا نہیں۔۔۔۔ میں نے آپ سے جھوٹ
بولنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس لئے یہ کہہ دیا۔ ورنہ آج تک ہم میں سے
کسی نے کبھی یہ راز افشا نہیں کیا تھا۔

نواب علی:۔ (لمبی سانس) ہوں۔ بھلا کتنے سال ہوگئے تمہارے والد کے
انتقال کو۔

نوجوان:۔ والد کے انتقال کو۔۔۔۔ ٹھہریئے ذرا یاد کر لوں۔ آں آں۔۔۔

عائشہ:۔ (یہ رکھانس کر) تین بجے سے لگاتار بارش ہوتے چلی جا رہی
ہے۔

نواب علی:۔ یہ جھڑی تو مجھے لگتا ہے ہفتہ بھر تک لگی رہے گی۔

نوجوان:۔ جی ہاں۔۔۔ آثار تو کچھ ایسے ہی معلوم ہوتے ہیں جی تو آپ نے
پوچھا تھا۔ والد صاحب کے متعلق۔ تیس سال کے قریب ہو گئے
ان کی وفات کو۔۔۔۔ رضیہ تو بالکل ننھی سی گڑیا تھا۔ جب ان کا
انتقال ہوا تھا۔

عائشہ:۔ حرکتیں اب بھی اس کی بچوں ہی والی ہیں کہنے کو کہتی ہے کہ
دسمبر میں پورے ۲۳ سال کی ہو جائے گی۔

نوجوان:۔ ہاں مجھ سے دو ہی برس تو چھوٹی ہے۔

نواب علی:۔ اچھا بھئی تو تم عشرت میاں کو کچھ چائے وائے تو پلواؤ۔
یہ بھی کیا کہیں گے۔

عائشہ:۔ جی بہتر۔

نواب علی:۔ اچھا تم رہنے دو۔ تم باتیں کرو میں ممدو سے کہے دیتا ہوں
چائے کے واسطے۔ اچھا میاں۔ اگر بارش بند نہ ہو تو جانے
کی ضرورت نہیں ٹیلیفون کر دینا۔ میاں سونے کا انتظام
کر دیا جائے گا۔

نوجوان:۔ جی شکریہ۔

نواب علی:۔ (جاتے ہوئے) خدا حافظ۔۔۔ اچھا بیٹی شب بخیر
(جس دروازہ سے آیا تھا اسی سے نکل جاتا ہے)

نوجوان :۔ (اطمینان کر لینے کے بعد کہ نواب علی چلا گیا)

ہوں تو آپ نے جھوٹ بولا تھا۔ لیکن جھوٹ کبھی نہیں چھپتا۔

کیوں؟ آپ کا کیا خیال ہے عائشہ صاحبہ۔

عائشہ :۔ اب آپ فوراً چلے جائیے۔

نوجوان :۔ چائے آ جانے دیجئے۔

عائشہ :۔ میں کہتی ہوں اب میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتی چلے جائیے

فوراً۔

نوجوان :۔ (اطمینان سے مسہری پر بیٹھ جاتا ہے) آپ پھنس چکی ہیں محترمہ

عائشہ سلطانہ۔ اب یہ سب برداشت کرنا ہی ہوگا۔ میں نہیں

جاؤں گا۔ صرف ٹیلیفون کر دوں گا۔ اور آپ کے والد میرے

لئے بستر کا انتظام کرا دیں گے۔ ہا ہا۔ کیا سمجھیں آپ؟

عائشہ :۔ (سر پکڑ کر۔ کرسی پر بیٹھ جاتی ہے) میرے اللہ میں کس مصیبت

میں گرفتار ہو گئی ہوں۔

نوجوان :۔ (شرارت سے) خوبصورت لڑکیاں جب خفا ہوتی ہیں تو ان کا

حسن کچھ اور بھی نکھر جاتا ہے۔

عائشہ :۔ بند کرو یہ بکواس۔

نوجوان :۔ کمال ہے میں نے سنا تھا ہر نوجوان لڑکی اپنے حسن کی تعریف سنکر

خوش ہوتی ہے۔

عائشہ :۔ میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں۔ یاد رکھئے آپ کو ان باتوں

سے کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔

نوجوان :۔ مجھے جو کچھ حاصل کرنا تھا کر چکا اب مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔

عائشہ :۔ کیا حاصل کر چکے آپ

نوجوان :۔ جو حاصل کرنے کے لئے آیا تھا۔

عائشہ :۔ یعنی ...... ؟ (ممدو ہاتھوں میں ٹرے لئے داخل ہوتا ہے)

ممدو :۔ چائے

عائشہ :۔ دیکھئے یہ میرا نوکر ہے۔ میں اس سے اگر کہوں تو وہ ابھی آپ

کو گردن سے پکڑ کر باہر نکال سکتا ہے۔ (ممدو خاموشی سے

چائے کا سامان میز پر لگا رہا ہے)

نوجوان :۔ ممدو اتنا بدتمیز نہیں ہے کہ گھر آئے ہوئے ایک معزز مہمان

کے ساتھ جس کے لئے وہ ابھی چائے بنا کر لایا ہے۔ ایسا نازیبا سلوک کرے

وہ ایسا نہیں کرے گا۔

عائشہ :۔ وہ ایسا ہی کرے گا۔

نوجوان :۔ میرا خیال ہے وہ فوراً آپ کے ڈیڈی کے پاس دوڑا ہوا جا

اور ان سے کہے گا کہ بی بی کا دماغ کچھ گڑبڑ ہو گیا ہے سرکار کیوں

ممدو۔؟

ممدو :۔ (چونک کر) جی ہاں سرکار (نوجوان زور زور سے

ہنسنے لگتا ہے)

عائشہ :۔ (زور سے) کیا جی سرکار۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے

وہ بہرا ہے۔

ممدو :۔ جی سرکار۔ مجھے سرکار نے کہا تھا کالی اور چائے دو

چیزیں لے جانا۔

نوجوان :۔ تم جا سکتے ہو ممدو۔!

ممدو :۔ انڈا تو گھر میں تھا نہیں سرکار۔ ورنہ میں ضرور لے آتا۔

عائشہ :۔ چائے بنا دو۔ (ممدو چائے بنانے لگتا ہے) آپ چلے جائیے

فوراً چلے جائیے۔ ورنہ میں ویسا ہی کروں گی جیسا میں نے کہا

نوجوان :۔ کیا کہا تھا آپ نے؟

عائشہ :۔ یہی کہ ممدو سے کہہ کر آپ کو باہر نکال دوں گی۔

نوجوان :۔ (زور دے کر) آپ ایسا نہیں کر سکتیں۔

عائشہ :۔ کیوں نہیں کر سکتی؟

نوجوان :۔ اس لئے کہ چائے پی کر میں خود ہی چلا جاؤں گا۔

عائشہ :۔ (سانس لے کر) اوہ۔ آپ نے پہلی بار شرافت کا ثبوت دیا

نوجوان :۔ شکریہ۔ ممدو تمہارے پاس ماچس ہوگی۔

ممدو :۔ جی ہاں سرکار عمر اسی گھر میں گذری ہے۔

نوجوان :۔ (ہنستے ہوئے) ماچس۔ مجھے ماچس چاہیئے۔

ممدو :۔ ماچس۔ ہاں ہاں سرکار۔ کیوں نہیں (اپنی جیب سے ماچس

نکال کر دیتا ہے)

نوجوان :۔ (سگرٹ سلگاتا ہے جو اب تک اس کے ہاتھ میں تھی) شکریہ

ممدو :۔ (چائے کی پیالی اس کی طرف بڑھا رہا ہوتا ہے

کر. وہ پیچھے سرکار

شہ:- رچونک کر) تم اب جاؤ

:- اللہ کیا لاؤں سرکار۔

شہ:- کچھ نہیں۔ جاؤ۔ باہر چلے جاؤ (ممدو اپنا جھاڑن کندھے پر ڈالے چلا جاتا ہے)

ان:- چائے کا ایک گھونٹ بھر کر) آپ نہیں پئیں گی چائے ــ؟

شہ:- جی نہیں۔

ان:- بہت خفا ہیں؟

شہ:- (منہ دوسری طرف پھیر لیتی ہے)

ان:- میں جانے والا ہوں۔ صرف چند لمحے اور آپ کے پاس ہوں۔ شاید اس کے بعد پھر ہم ایک دوسرے سے مل نہ سکیں ایک دوسرے کو دیکھ نہ سکیں۔ چلتے چلتے اس قدر بے رخی تو نہ برتئے۔

شہ:- (کچھ سوچ کر) آپ ہی نے کون سی اپنائیت کا ثبوت دیا ہے۔

ان:- آپ نے چاہا بھی کب!

شہ:- یہ تک نہیں بتایا آپ نے کہ آپ ہیں کون اور کیوں آئے تھے

ن:- اگر آپ کسی اور سے اس کا ذکر نہ کریں تو بتا سکتا ہوں۔

شہ:- (بظاہر بے تعلقی سے) آپ کو غلط فہمی ہے کہ میں آپ کو اس قدر اہمیت دے سکتی ہوں کہ ہر کسی سے آپ کا ذکر کرتی پھروں۔ مجھے کیا پڑی ہے۔

ن:- تو پھر میں بتا دوں؟

:- آپ کی مرضی۔

ن:- سنئے۔ میں ڈرامے لکھتا ہوں۔ میرا ایک ڈرامہ ہے جس کا پہلا منظر یہ ہے کہ ایک نوجوان ایک غیر آباد علاقے میں ایک گھر میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہ رات کا وقت ہے۔ شدید بارش ہے نوجوان کو سگرٹ کی سخت طلب ہے لیکن اس کی ماچس پانی سے بھیگ گئی ہے جب ماچس کی تلاش میں وہ اس گھر میں آتا ہے تو وہاں اُسے ایک لڑکی ملتی ہے۔ نوجوان بہت دیر تک اس لڑکی سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ (خاموش ہو جاتا ہے)

عائشہ:- پھر ــ؟

نوجوان:- بس صرف اتنی سی بات تھی۔ میرا ڈائرکٹر کہتا ہے کہ یہ نا ممکن ہے کہ ایک اجنبی اتنی دیر ایک نوجوان لڑکی سے باتیں کر سکے۔ اس کا خیال تھا لڑکی فوراً شور مچا دے گی۔ اور دوسرے لوگوں کو جمع کر لے گی لیکن میں کہتا تھا کہ ایسا ممکن ہے۔ اور آج جب بارش شروع ہوئی تو میں گھر سے نکل پڑا۔ تاکہ ذاتی طور پر اس کا تجربہ کر سکوں۔ آپ کی کھڑکی میں روشنی دیکھ کر میں نے چپکے سے اندر جھانکا اور سچ کہتا ہوں آپ کو اور اس کمرے کو دیکھ کر مجھے بالکل ایسا محسوس ہوا جیسے میرے ہی ڈرامہ کا کمرہ ہے۔ میں کھڑکی کے راستہ چپکے سے اندر آ گیا (نوجوان اٹھ کھڑا ہو جاتا ہے اور برساتی اوڑھ لیتا ہے) میں نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کا دریچہ کھولا۔ اس طرح (کھڑکی کا پٹ کھولتا ہے) اور پھر اوپر چڑھ گیا۔ اس طرح (کھڑکی پر چڑھ جاتا ہے)

(عائشہ مضطرب سی ہو کر ایک دم اٹھ کھڑی ہوتی ہے)

اور پھر آپ کے کمرہ میں کود گیا۔ اس طرح (نوجوان باہر اندھیرے میں کود جاتا ہے)

عائشہ:- سنئے۔ (وہ بے چینی سے ایک لمحہ وسط میں کھڑی رہتی ہے اور پھر کود کر یک شلیف پر چڑھ جاتی ہے کہ باہر اندھیرے میں جھانکنے لگتی ہے) اپنا نام تو بتاتے جائیے۔ آپ کا نام کیا ہے۔

(دروازہ کھلتا ہے اور ممدو داخل ہوتا ہے)

نوجوان:- (باہر سے) اسمر (دور ہوتے ہوئے خدا حافظ)

(ممدو حیرت سے تک رہا ہے)

عائشہ:- خدا حافظ۔

وہ بڑی بے دلی سے نیچے اترتی ہے ممدو کی طرف گھور کر دیکھتی ہے وہ ایک دم گھبرا جاتا ہے۔ اور جلدی سے ٹرے اٹھا کر بھاگ جاتا ہے۔ عائشہ مسہری پر پڑا ہوا رسالہ اٹھا لیتی ہے۔ اور اسی طرح مسہری پر لیٹ جاتی ہے جیسی منظر کی ابتدا میں لیٹی تھی) اسمر ڈرامہ نگار۔ اسمر۔ ماچس اور چھد . . . . (پردہ آہستہ آہستہ گر جاتا ہے)

عزیز حامد مدنی

○

تازہ ہوا بہار کی دل کا ملال لے گئی
پائے جنوں سے حلقۂ گردشِ حال لے گئی

جراتِ شوق کے سوا خلوتیانِ خاص کو
اک ترے غم کی آگہی تا بہ سوال لے گئی

شعلۂ دل بجھا بجھا، خاکِ زباں اُڑی اُڑی
منزلِ صد ہزار تک موجِ خیال لے گئی

تیز ہوا کی چاپ سے تیرہ جنوں میں لَو اُٹھی
روحِ تغیرِ جہاں، آگ سے خال لے گئی

نرم ہوا پہ یوں کھُلے کچھ ترے پیرہن کے راز
سب ترے جسمِ ناز کے رازِ وصال لے گئی

رات کی رات بوئے مہ کوزۂ گل میں بس گئی
رنگِ ہزار میکدہ، روحِ سفال لے گئی

وصل و فراق دنیک دید گردشِ صد ہزار و صد
تجھ کو کہاں کہاں بھرے سرو کمال لے گئی

نافۂ آہو کے نثار۔ زخمِ نمود کا شکار
دشت سے زندگی کی رَو ایک مثال لے گئی

نور بجنوری

○

ٹپک رہا ہے مری آنکھ سے لہو اب تک
جھلک رہا ہے کسی شوخ کا سبُو اب تک
گلی گلی سے مجھے تاڑتا ہے سناٹا
کسے پکار رہا ہوں میں کُو بکُو اب تک
یہ کیا ہوا کہ مرے دل میں خاک اُڑنے لگی
ہے کائنات تو اقلیمِ رنگ و بُو اب تک
وہی شگفتنِ گُل ہے وہی طلوعِ سحر
نگارِ شب کو ہے آرائشوں کی خُو اب تک
وہی ہوائیں، وہی خوشبوئیں، وہی مہتاب
حریمِ زیست میں ہے شورِ ہاؤ ہو اب تک
نفس کی آمد و شُد کر رہی ہے غمّازی
چھپی ہوئی ہے کہیں تیری آرزو اب تک
اُڑائے پھرتی ہے مجھ کو تو یاد کی آندھی
بھُلا سکی نہ ہو شاید مجھے بھی تو اب تک

...لکھنوی

ہ کے طوفاں میں تشنہ لب گزری
شق کی زندگی عجب گزری

ہجر میں کب ہوا ہے اندازہ
ر گزری کہ ایک شب گزری

س نظر کی نہ ہو سکی تشریح
ل سے اکثر جو بے سبب گزری

بے طلب رہ کے بھی حیات اپنی
کتنی آسودۂ طلب گزری

وہ تبسم کی موج کیا کہیے
چپکے چپکے جو زیرِ لب گزری

آج تو گردشِ زمانہ بھی
اُن کے کوچے سے با ادب گزری

مجھ کو کیا کیا ترا خیال آیا
دھوپ سائے سے مل کے جب گزری

اُن سے کیا کہیے پرسشِ غم پر
وہ قیامت جو دل پہ اب گزری

صبح کا ذکر سن کے اے شاعر
سوچتا ہوں کہ رات کب گزری

انجم رومانی

چہروں کے ہیں جو ماند اُجالے پڑے ہوئے
ہیں رنگِ غم کی دھوپ میں کالے پڑے ہوئے

منزل مگر یہی ہے کہ پھرتے ہیں دشت دشت
سر پر غبار، پاؤں میں چھالے پڑے ہوئے

ہوتی نہیں دلوں کی تسلی کسی طرح
خالی ہیں آج بھی یہ پیالے پڑے ہوئے

کھلتی تھیں کوئے رنگ میں گل جن کی کھڑکیاں
اُن میکدوں پہ آج ہیں تالے پڑے ہوئے

مرنے کے بعد حشر جو ہوگا سو دیکھئے
ہیں زندگی میں جان کے لالے پڑے ہوئے

مصرف نہیں تو اہلِ ہنر کا نہیں کوئی
پتھر بھی ہوں تو کوئی اُٹھا لے پڑے ہوئے

انجم کہاں وہ سلسلۂ کاروبارِ شوق
ہیں اہلِ کاروبار سے پالے پڑے ہوئے

جمیل ایوبی

○

میری طرف ہیں اُن کی نگاہیں
لاکھ سہارے لاکھ پناہیں
بکھری بکھری زلفِ تمنّا
اُلجھی اُلجھی پیار کی راہیں
ترکِ وفا پر دل ہے مائل
کس کو چھوڑیں کس سے نباہیں
شعلہ بداماں کون چلا ہے
جاگ پڑیں سب سُونی راہیں
ساحل ساحل دامِ حوادث
طوفاں طوفاں اپنی پناہیں
ترک و طلب سے آگے نکل کر
کیسی منزل کیسی راہیں
یُوں بھی گزاری حیرانوں نے
لب پہ تبسم دل میں آہیں
گیسُو گیسُو جینے والو
عارض عارض جلوہ گاہیں

صادق مدہوش

○

حدیثِ جاں حدیثِ دیگراں ٹھہری تو کیا ہوگا
جہاں کی داستاں یہ داستاں ٹھہری تو کیا ہوگا
دلِ ناداں تری باتوں میں آکر ہم چلے تو ہیں
اگر محفل میں شرطِ نقدِ جاں ٹھہری تو کیا ہوگا
وہی اک بات جس پر مدتوں اُن سے رہی رنجش
وہی اک بات پھر سے درمیاں ٹھہری تو کیا ہوگا
شبِ غم کاٹ تو لیں زندگی کے کاٹنے والے
سحر بھی صورتِ شب سرگراں ٹھہری تو کیا ہوگا
گزرتی ہے ابھی تک تو اسی اُمید پر لیکن
یہ کوشش بھی جو سعیٔ رائیگاں ٹھہری تو کیا ہوگا
کوئی بتلائے پھر جینے کی صورت کونسی ہوگی
صبا اس بار بھی اک پل یہاں ٹھہری تو کیا ہوگا
وہی جس کے لئے اب تو ہمیں سب کچھ گوارا ہے
بلائے جاں وہی آرامِ جاں ٹھہری تو کیا ہوگا

آب اسلم

○

صبحِ بہار و شامِ خزاں کچھ نہ کچھ تو ہو
بے نام زندگی کا نشاں کچھ نہ کچھ تو ہو

خاموشیوں کی آگ میں جلتا ہے میکدہ
دلدادگانِ شعلہ رخاں کچھ نہ کچھ تو ہو

جینے کے واسطے کوئی صورت تو چاہیئے
ہو شمعِ انجمن کہ دھواں کچھ نہ کچھ تو ہو

چُپ چُپ ہے موج موج، کنارے اُداس ہیں
اے زندگی کے سیلِ رواں کچھ نہ کچھ تو ہو

صبحِ ازل کا روپ کہ شامِ ابد کا گیت
سایہ ہو، دھوپ ہو کہ گماں کچھ نہ کچھ تو ہو!

ساقی نے بھر دیے ہیں مبارک تجھے مگر
جو بجھ چکے ہیں اُن کا بیاں کچھ نہ کچھ تو ہو!

کوئی حسین گیت کوئی رس بھری غزل
یارو علاجِ غم زدگاں کچھ نہ کچھ تو ہو

مانا کہ تاؔب یوں بھی گزر جائے گی مگر
ذکرِ جمالِ گلبدناں کچھ نہ کچھ تو ہو

شیدا گجراتی

○

طے کر گیا حدودِ زمان و مکاں کوئی
پہنچا تری نظر کی بدولت کہاں کوئی

بکھرے ہوئے ہیں کتنے ہی جلوے سرِ اُفق
درپیش ہے نگاہ کو پھر امتحاں کوئی

پھر جگمگا اُٹھی ہے بساطِ حریمِ جاں
اُبھرا ہے لوحِ دیدہ و دل پہ نشاں کوئی

منزل خود اُسکے نقشِ قدم ڈھونڈتی رہی
گزرا کچھ ایسے بے خبرِ دو جہاں کوئی

شانوں پہ کائنات کا بارِ گراں لئے
بے اختیار ہے تری جانب رواں کوئی

طاری ہے انجمن پہ قیامت کی خامشی
شاید سُنا رہا ہے مری داستاں کوئی

عالم یہی رہا جو دلِ بے قرار کا
ہوگا ضرور حادثۂ ناگہاں کوئی

لے دے کے اب تو غم ہی مری کائنات ہے
کیا کیا دلِ حزیں پہ ہوا مہرباں کوئی

شیداؔ کہو گے کس سے محبت کی داستاں

ثقافتی ورثہ

شاہ عبداللطیف بھٹائی

مترجم: پیکر واسطی (علیگ)

چاند

اے چاند حسنِ یار سے نسبت نہیں تجھے
تو ایک شب چراغ وہ اک شمعِ جاوداں

جلتا ہے تجھ کو آتشِ زرّیں میں رات بھر
گلگشت کو چلا ہے وہ ماہِ لقا ابھی
چھپنا ہے تجھ کو گیسوئے جاناں کی چھاؤں میں

تجھ سے ہے التماس لطیفؔ جگر تپاں
یوں ہی کھلی رہے تری چشمِ گہر فشاں
جڑ دوں تری قبا میں طلائی اشرفیاں

گرمِ خرام یوں نہ ہو تازہ روی کے ساتھ
آنکھوں میں جلوہ زارِ تجلّی لئے ہوئے
پل بھر کو اب اُبھرنے نہ پائے کوئی کرن

تابانیاں بکھیر نہ اِس برہمی کے ساتھ
ہم کو گزارنے ہیں یہ لمحے کسی کے ساتھ
تو ورنہ جل بجھے نہ کہیں روشنی کے ساتھ

اے چاند تجھ پہ شامِ بلا کا نزول ہو
ہر شعلہ وش نظارے کے ٹکڑے پہ پھینک دے
میں تیرگی میں شمعِ رُخِ نازنیں لئے

جل جائے اپنی آگ میں تو صورتِ کباب
اندوہِ تیرگی کا سیہ پردۂ نقاب
دامن میں بھر کے پھینک دوں اُمید کے گلاب

کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے
تجھ کو کہاں نصیب وہ جوبن وہ خد و خال
ماتھے کا وہ اُبھار کہ جلتا ہوا حباب

اے چاند تجھ سے مجھ کو نہیں تابِ دشمنی
وہ انکھڑیوں کی جوت کہ چمپا کی چاندنی
وہ ابروئے خمیدہ کی محرابِ نقرئی

گر تو برا نہ مانے تو ایمان کی کہوں
تو خنجرِ رواں ہے کبھی تیغِ کند ہے
ہیں تیرے منہ میں سُرخ شرارے بھرے ہوئے

داماںِ حق سے رُوحِ صداقت نچوڑ دوں
ہے شمعِ عرش و فرش تری سوزشِ دروں
پھر بھی جبینِ شعلہ رُخاں کا نہیں فسوں

خبر نامہ

اطرافِ عالم

اُردو دوستی

یوپی کے نئے وزیر اعلیٰ مسٹر چندر بھان گپتا نے کانپور کے حلیم مسلم کالج میں انجمن ترقی اُردو کی کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے اس امر پر اظہار افسوس کیا کہ سابقہ حکومتیں اُردو کو اس کا صحیح مقام دلانے کے لئے جو اقدامات کرتی تھیں انھیں عملہ ناکام بنا دیتا تھا۔ مسٹر گپتا نے یقین دلایا کہ اب ان کی حکومت اس کی پوری جد وجہد کرے گی کہ اُردو کے متعلق حکومت کے احکامات کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ انھوں نے کہا کہ اُردو کو صرف مسلمانوں یا پاکستانیوں کی زبان سمجھنا تنگ نظری ہے۔ حالانکہ مشترکہ کلچر کے لئے اُردو کی ترقی بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔

انجمن ترقی اُردو کانفرنس

۷ رفروری ۱۹۶۱ء کو کانپور (یوپی) میں انجمن ترقی اُردو کی دوسری کل ہند کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے یوپی کے گورنر مسٹر رام کرشنا راؤ نے اعلان کیا کہ حکومت ہند نے ۵۸ء کی پالیسی کے تحت علاقائی زبانوں کو جو حقوق دیئے ہیں ان سے اُردو کو مستفید ہونے کا پورا موقع دیا جائیگا۔ انھوں نے انجمن کے منتظمین سے کہا کہ اگر اُردو فائدے کیلئے مذکورہ پالیسی میں کسی ترمیم کی ضرورت ہو تو وہ حکومت سے رجوع کرے۔ گورنر نے کہا کہ حکومت اُردو ہندی کو قریب لانا چاہتی ہے۔ لہٰذا اُردو کے ادیب اپنی ذمہ داریاں محسوس کریں۔

ٹیگور صد سالہ سالگرہ

مئی ۶۱ء سے مدراس میں ٹیگور کی صد سالہ سالگرہ کی تقریبات شروع ہو رہی ہیں۔ ان تقریبات میں ٹیگور کے ڈراموں پر مبنی تامل، انگریزی اور بنگالی میں ڈرامے پیش کئے جائیں گے۔ رابندر سنگیت چار ہفتوں تک پیش کیا جائیگا۔ یہ پروگرام کالیکشر اور انامل یونیورسٹی میں پیش کئے جائیں گے۔ اس موقع پر مستحق افراد کے لئے شانتی نکیتن میں موسیقی کے اعلیٰ تعلیم کیلئے وظائف کی بھی پیشکش کی گئی ہے۔

ہند و پاک تہذیبی کانفرنس

دہلی میں ۳۱ مارچ ۶۱ء سے ایک ہند و پاک تہذیبی کانفرنس منعقد ہوگی جس میں دونوں ملکوں کے ممتاز فنکار، مورخین، اُردو، ہندی، بنگالی، پنجابی اور سندھی زبان کے مصنفین شریک ہوں گے۔ بھارت کے وزیر اعظم پنڈت نہرو اس کانفرنس کا افتتاح کریں گے۔ اس کانفرنس کا آخری اجلاس ۲ راپریل کو ہوگا۔ اس کانفرنس کے انعقاد کا مقصد ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تہذیبی روابط کی نوعیت پر غور کرنا ہے تاکہ مختلف تہذیبی میدانوں میں دونوں ملکوں کے سرگرم عمل افراد ایک دوسرے کے قریب آسکیں۔

روسی ادیبہ کو سزا

روسی ادیبہ اولگا ایونسکایا کو جو شہرہ آفاق مصنف بورس پاسترنک (مصنف ڈاکٹر ژیواگو) کی گہری دوستوں میں سے تھیں آٹھ سال قید سخت کی سزا دی گئی ہے۔ اولگا پر مقدمہ چلاتے وقت ان پر الزام لگایا گیا ہے کہ انھوں نے ماسکو یونیورسٹی میں "بددیانتی" کا ارتکاب کیا ہے۔

کلام اقبال کا عربی ترجمہ

حکومت پاکستان اور متحدہ عرب جمہوریہ کے ثقافتی معاہدے کے تحت قاہرہ میں عنقریب علامہ اقبال کی کچھ کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا جائے گا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے متحدہ عرب جمہوریہ کی حکومت عربی اور انگریزی کے بعض افراد کی خدمات حاصل کر رہی ہے۔

مرکز

گلڈ اور بچوں کے بین الاقوامی گیت کا جشن

۴ر فروری ۱۹۶۱ء کو بی ڈیل اسکول، ناظم آباد کراچی کی عمارت میں گلڈ کے سکریٹری جنرل قدرت اللہ شہاب نے بچوں کے بین الاقوامی گیتوں کا افتتاح کیا۔ اس جلسہ میں وزارت تعلیمات کے افسر، محکمہ تعلیم کراچی کے اراکین، رائٹرز گلڈ اور غیر ملکی سفارت خانوں کے اراکین اور شہر کے عمائدین نے شرکت کی۔ اسکول کے بچوں نے دنیا کے مختلف ملکوں کے گیت ان کی زبانوں میں گائے۔ ان گیتوں کا اردو منظوم ترجمہ بھی پیش کیا گیا۔ پروگرام کے اختتام پر غیر ملکی سفارت خانوں کی معزز خواتین نے اپنے اپنے ملکوں کی لوریاں گائیں۔ اس کے بعد قدرت اللہ شہاب نے اپنی تقریر میں کہا کہ بیک وقت بیشمار بچوں کا نہایت نظم وضبط سے اسٹیج پر آنا اور بلا جھجک گیت گانا قابل تعریف ہے اور اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اسکول کا نظم درحقیقت ایک مثالی نظام ہے۔ شہاب صاحب نے یہ بھی کہا کہ اردو زبان میں بچوں کے گیتوں کی کمی کو اس تقریب نے خاطر خواہ طور پر پورا کیا ہے۔

بزم ادب (کراچی یونیورسٹی) کو گلڈ کا عطیہ

۳ر فروری ۱۹۶۱ء کو بزم ادب (کراچی یونیورسٹی) نے مشرقی و مغربی پاکستان کے ادیبوں کے اعزاز میں ایک استقبالیہ دیا۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے گلڈ کے سکریٹری جنرل قدرت اللہ شہاب نے گلڈ کی جانب سے یونیورسٹی کی لٹریری یونین کو پانچ سو روپوں کا عطیہ دیا۔ ساتھ ہی شہاب صاحب نے طلباء کو مشورہ دیا کہ وہ ادب میں ضرور دلچسپی لیں لیکن خام کار مصنف بننے کے بجائے ادب عالیہ کا مطالعہ کریں۔ اس موقع پر گلڈ کے ناظم اعلیٰ جمیل الدین عالی نے بھی تقریر کی۔ پاکستان کے مشہور بنگلہ شاعر جناب جسیم الدین نے تین بہترین مختصر افسانوں اور نظموں کے مصنفوں کو انعامات تقسیم کئے۔

گلڈ کے ایگزیکٹو سکریٹری یورپ میں

گلڈ کے ایگزیکٹو سکریٹری جمیل الدین عالی مورخہ ۱۷ر فروری ۱۹۶۱ء کو یورپ روانہ ہوئے۔ انہیں یونیسکو کی طرف سے فیلو شپ ملا ہے۔ عالی صاحب یورپ کے مختلف ممالک میں پانچ ماہ قیام کریں گے۔ اس دوران میں وہ پبلشنگ اور پرنٹنگ ہاؤسیز، ادیبوں، شاعروں، فنکاروں اور دانشوروں کی مختلف انجمنوں، سوسائٹیوں، حلقوں اور اداروں کے قیام، طریقہ کار، لائحہ عمل اور ان کے اغراض ومقاصد کا جائزہ لیں گے۔

گلڈ کی مرکزی مجلس عاملہ کے اہم اجلاس

۲۹ر اور ۳۰ر جنوری ۶۱ء کو کراچی میں گلڈ کی مرکزی مجلس عاملہ کے اہم اجلاس منعقد ہوئے۔ جن میں حلقہ کراچی کے اراکین کے علاوہ، مشرقی ومغربی پاکستان کے ان اراکین نے بھی شرکت کی جو مرکزی مجلس عاملہ کے جلسوں میں شریک ہونے کے لئے کراچی آئے تھے۔ مرکزی مجلس عاملہ نے اپنے جلسوں میں گلڈ کی گزشتہ سرگرمیوں کا جائزہ لیا اور آئندہ پروگرام کی تفصیلات پر روشنی ڈالی۔ اس موقع پر انتظامیہ نے بعض اہم فیصلے بھی کئے۔ انتظامیہ نے رکنیت کی درخواستوں پر غور کیا اور دو سو نئے اراکین کو ادارے میں شامل کرنے کی منظوری دی۔ اس نے سات افراد پر مشتمل گلڈ کا ایک وفد متحدہ عرب جمہوریہ بھیجنے کا فیصلہ بھی کیا۔ کاپی رائٹ کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا فیصلہ بھی کیا۔ مجلس عاملہ نے سندھی، پنجابی، پشتو اور گجراتی زبانوں میں قابل تعریف کام کرنے والوں کو ہر سال انعام دینے کا فیصلہ بھی کیا۔

ادارہ مصنفین پاکستان کی دوسری سالگرہ

۳۱ر جنوری ۱۹۶۱ء کو گلڈ نے اپنی دوسری سالگرہ منائی۔ سالگرہ کی تقریبات میں مرکزی مجلس عاملہ کے ان اراکین نے بھی شرکت کی جو

منعقد ہوا جس کا موضوع ۱۹۶۱ء کا علاقائی ادب تھا۔ اسی دن رات کے ۹ بجے کٹرک ہال صدر میں ایک ثقافتی پروگرام پیش کیا گیا۔ جس میں پاکستان کے مختلف علاقائی لوک ناچ اور گیت شامل تھے۔ اس مخصوص تقریب میں مرکز اور حلقہ کراچی کے بیشتر اراکین، سرکاری و غیر سرکاری حکام، اور شہر کے عمائدین نے شرکت کی۔

حلقہ کراچی

کراچی یونیورسٹی میں مذاکرے

انجمن اُردو (کراچی یونیورسٹی) کے زیر اہتمام ۱۳ر۱۴ر اور ۱۵ر فروری ۱۹۶۱ء کو کراچی یونیورسٹی (اینو کیمپس) میں مذاکرے ہوئے۔ جن کے موضوعات بالترتیب تنقید اور نقاد کا منصب؛ شخصیت اور شاعری؛ نظریہ اور شاعری تھے۔ مذاکروں میں شعبہ اُردو کے صدر جناب ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی۔ ڈاکٹر احسن فاروقی، ڈاکٹر مصطفیٰ، مجتبیٰ حسین۔ ڈاکٹر شاہ علی، احمد علی۔ ابوالخیر کشفی، اور جناب فضل کریم فضلی نے حصہ لیا ـــــ پہلے مذاکرات کی صدارت کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے کی۔ دوسرا مذاکرہ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کی صدارت میں ہوا اور تیسرے مذاکرے کی صدارت جناب فضل کرم فضلی نے کی۔ ان مذاکروں کی خاص خصوصیت یہ تھی کہ ان میں یونیورسٹی کے اساتذہ اور مہمان ادیبوں کے علاوہ کراچی یونیورسٹی کے طلباء و طالبات نے حصہ لیا۔ مذاکرے کے آخری دن ۵ بجے شام ایک مخصوص محفل مشاعرہ منعقد ہوئی جس میں جناب فضل کریم فضلی، ادیب سہارنپوری، تابش دہلوی، لکھنوی، منظر ایوبی، خمار انصاری، نظر جعفری، سحر انصاری، جون ایلیا، ر۔ع۔ صولت، واحد بشیر، ظریف جبلپوری اور بہت سے مقامی شعراء نے اپنا کلام سنایا۔

یوم غالب

۱۵ر فروری ۱۹۶۱ء کو نیشنل کونسل آف اسٹوڈنٹس کے زیر اہتمام تھیوسوفیکل ہال کراچی میں مرزا غالب کی ۹۲ ویں برسی منائی گئی۔ اس اجتماع کی صدارت کرتے ہوئے بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے کہا کہ غالب نے اُردو انشاپردازی اور شاعری کو ایک نیا انداز دیا اُردو شاعری کا جدید دور غالب ہی سے شروع ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ پاکستان کا لوگوں پر اُردو کے احسانات ہیں اس لئے انھیں اُردو یونیورسٹی کے قیام کے لئے جدوجہد کرنی چاہیئے۔ منصوبہ بندی کمیشن کے نائب صدر جناب ممتاز حسن نے غالب کے کلام اور ان کی شخصیت پر روشنی ڈالی۔ سید محمد تقی کے نزدیک غالب کے کلام میں عہد جدید کا سائنسی انداز فکر و نظر ملتا ہے۔ رفیق خاور نے بھی اجتماع سے خطاب کیا۔ جناب آفتاب احمد اور سلیم احمد نے مقالات پڑھے۔ آخر میں غالب پر ایک فیچر بھی پیش کیا گیا۔

بلوچ اکیڈمی کے عصرانے میں علاقائی زبانوں کے دانشور

۳۱ر جنوری ۱۹۶۱ء کو بلوچ اکیڈمی کراچی نے علاقائی زبانوں کے نمائندوں کو میٹروپول میں عصرانہ دیا۔ اسی روز صبح ۱۱ بجے سندھی ادبی بورڈ کے دفتر میں لاہور میں ہونیوالی علاقائی زبانوں کی کانفرنس کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا جس کی صدارت پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر چیرمین پنجابی ادبی اکیڈمی نے کی۔ اس اجلاس میں پنجابی، پشتو، سندھی، بنگالی اور بلوچی کے نمائندوں نے شرکت کی۔ عصرانے میں مذکورہ زبانوں کے دیگر دانشور بھی مدعو تھے۔ ڈاکٹر محمد باقر نے بلوچی اکیڈمی کی خدمات کو سراہتے ہوئے اس امر کا شکریہ ادا کیا کہ بلوچ اکیڈمی نے اپنے مطالبات کے ساتھ پنجابی اور گجراتی زبانوں کے جائز مطالبات کی بھی تائید کی ہے۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ ان اجتماعی اور مخلصانہ کوششوں سے پاکستان کے تمام باشندوں کو مساوی طور پر ایک دوسرے کی مشکلات سمجھنے کا موقع ملے گا۔ اور وہ اس طرح ایک دوسرے کی مدد سے اپنے اپنے مسائل حل کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔

شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور ان کی تعلیمات پر تحقیق

پاکستان کے ایک دانشور اعجاز الحق قدوسی جو ایک عرصے سے تاریخ تصوف کے مختلف گوشوں پر کام کر رہے تھے، نے دو سال کی مسلسل کاوش کے بعد ہند و پاک کے مشہور صوفی شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور ان کی تعلیمات پر اپنا تحقیقی کام مکمل کر لیا ہے۔ قدوسی کا یہ تحقیقی مقالہ تقریباً ۔۔۔ صفحات پر مشتمل ہے۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس (ریسرچ اکیڈمی) کراچی نے اس کتاب کو جلد شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

گلڈ کی پندرہ روزہ ادبی نشستیں

۳ فروری ۶۱ء کو ہوٹل ایکسلسیر (صدر) میں شام کے ۵ بجے گلڈ کی پندرہ روزہ ادبی نشست جناب ن۔ م۔ راشد کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ پروگرام کے مطابق محترمہ نشاط عزیز نے مقالہ، سلیم احمد نے غزل اور ساقی فاروقی نے اپنی نظم پیش کی۔ ۱۷ فروری ۶۱ء کو گلڈ کی دوسری ادبی نشست جناب شاہد احمد دہلوی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ سب سے پہلے صادق مدہوش نے اپنی غزل تنقید کے لئے پیش کی۔ اس کے بعد جناب انور نے اپنا افسانہ اور پروفیسر انجم اعظمی نے اپنی ایک تازہ نظم پیش کی۔

گلڈ کے ایگزیکیٹو سکرٹری کو الوداعی پارٹی

حلقہ کراچی کی جانب سے مورخہ ۱۰ فروری ۶۱ء کو شیزان ہوٹل صدر کراچی میں شام کے ۵ بجے ادارہ مصنفین پاکستان کے ایگزیکیٹو سکرٹری جمیل الدین عالی کو الوداعی پارٹی دی گئی۔ اس تقریب میں مرکزی اور حلقہ کراچی کی مجالس عاملہ کے بیشتر اراکین نے شرکت کی۔ حاضرین کی درخواست پر گلڈ کے ایگزیکیٹو سکرٹری نے ایک مختصر تقریر کی جس میں انھوں نے یونیسکو کے فیلوشپ کی قبولیت اور اپنے سفر یورپ کے پروگرام کے بارے میں بہت سی باتیں بتائیں۔ جمیل الدین عالی کے بعد حلقہ کراچی کے سکرٹری طفیل احمد جمالی، خازن جناب انور اور مرکزی گلڈ کے خازن جناب ابن انشا نے تقریریں کیں۔ آخر میں جناب شاہد احمد دہلوی اور جناب رازق الخیری نے عالی صاحب کو یونیسکو کی طرف سے ملنے والے فیلوشپ اور ان کی یورپ کو روانگی پر مبارکباد دی۔

مغربی پاکستان

گلڈ کی سالگرہ

۵ فروری کو بھاولپور میں "رائٹرز گلڈ" کی مقامی شاخ نے بھاولپور پریس کلب میں گلڈ کی دوسری سالگرہ منائی۔ سب سے پہلے ظہور نظر نے گلڈ کا منشور پڑھا۔ اس کے بعد مسٹر اشتیاق حسین اظہر کنوینر رائٹرز گلڈ بھاولپور نے اپنی مختصر تقریر میں گلڈ کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا۔ اور آئندہ پروگرام کی تفصیل پیش کی۔ آخر میں چند مقامی شعراء نے اپنے کلام پیش کئے۔

یوم عبدالقادر

۲۶ مارچ ۶۱ء کو لاہور میں بزم شعائر ادب کے زیر اہتمام یوم عبدالقادر منایا جائے گا۔ منتظمین نے اعلان کیا ہے کہ اس تقریب میں ملک کے مشہور اہل قلم شرکت کریں گے۔ اس موقع پر ایک مشاعرہ بھی منعقد ہوگا جس میں برصغیر ہند و پاک کے مشہور شعرا شریک ہوں گے۔

سچل سرمست کی برسی

خیرپور کی سچل کو آپریٹو اکیڈیمی نے ۲۸ فروری ۶۱ء کو سابق سندھ کے مشہور صوفی شاعر سچل سرمست کی برسی منا رہی ہے۔ اس موقع پر محکمہ قومی تعمیر نو نے ایک نمائش منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ منتظمین نے سہ روزہ ادبی اور موسیقی کانفرنس کے انعقاد کا بھی اعلان کیا ہے۔

کوہاٹ گلڈ

۲۹ جنوری ۶۱ء کو ادارہ مصنفین پاکستان شاخ کوہاٹ کا ایک خصوصی اجلاس زیر صدارت الحاج میاں غلام حیدر منعقد ہوا۔ شاخ کوہاٹ کے اراکین آذر سرحدی، نذیر اشک کاشمیری، ایوب صابر اور اختر وارثی شریک اجلاس تھے۔ اتفاق رائے سے سال رواں کے لئے عزیز وارثی کو گلڈ شاخ کوہاٹ کا سکرٹری منتخب کیا گیا۔ —— ۳۱ جنوری ۶۱ء کو ۸ بجے شب جناح لائبریری کوہاٹ میں گلڈ شاخ کوہاٹ کے زیر اہتمام ایک اجلاس زیر صدارت ایوب صابر منعقد ہوا۔ سکرٹری نے رائٹرز گلڈ کی پہلی سالگرہ پر مرکزی گلڈ کی ناقابل فراموش خدمات اور کارگزاریوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اس کے بعد نذیر اشک کاشمیری نے گلڈ کا منشور پڑھا۔ ساتھ ہی انھوں نے اپنا مقالہ "فنکار اور معاشرہ" بھی پیش کیا۔ جس کو حاضرین نے پسند کیا۔

مشرقی پاکستان

ٹیگور صدسالہ برسی

ڈھاکہ میں ٹیگور کی صد سالہ برسی منانے کیلئے مسٹر جسٹس ایس ایم مرشد کی صدارت میں ایک کمیٹی قائم کی گئی ہے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر محمود حسین بھی اس تقریب کے منانے میں اہم حصہ لیں گے۔ حکومت پاکستان نے اعلان کیا ہے کہ ٹیگور کی کوٹھی واقع [illegible]

دیرپا ہوتے ہیں

ہم قلم ادبی انعامات

قواعد

(ان قواعد میں انعامات کا اعلان ہونے سے پیشتر کسی بھی وقت کسی بھی قسم کی ترمیم یا تبدیلی کسی بھی شریک ہونے والے کو پیشگی اطلاع دیئے بغیر کی جا سکتی ہے)

۱۔ نام — ان انعامات کا نام "ہم قلم ادبی انعامات" ہوگا۔

۲۔ تقسیم — یہ انعامات ادارہ ہم قلم کی جانب سے ہر سال تقسیم کئے جائیں گے۔

۳۔ دائرے — تعداد میں یہ چار انعامات ہوں گے اور حسب ذیل اصناف میں سے ہر ایک صنف میں شائع ہونے والی بہترین ادبی تخلیق پر دئے جائیں گے۔

(۱) لسانی یا ادبی تحقیقی مقالہ
(۲) طویل نظم
(۳) طویل افسانہ
(۴) علاقائی ادب کا منظوم ترجمہ

ہر انعام کی رقم مبلغ پانچ سو روپے ہوگی

۴۔ استحقاق — انعامات میں غور کی جانے والی تخلیقات کے مصنف کے لئے ضروری ہے کہ وہ پاکستانی شہریت کے قانون کی رو سے پاکستان کا شہری ہو یا شہری رہا ہو۔ مصنف کے لئے ادارۂ مصنفین پاکستان کا رکن ہونا ضروری نہیں ہے۔ مرحوم ادیبوں کی تخلیقات پر بھی غور کیا جائے گا بشرطیکہ وہ سال متعلقہ میں پہلی بار شائع ہوئی ہوں۔

۵۔ میعاد — ہر سال [illegible] کے دوران کسی پاکستانی ادبی مجلے یا رسالے میں پہلی بار شائع شدہ تخلیقات پر انعامات کے [illegible] غور کیا جائے گا ——— ایک مرتبہ غور کی ہوئی تخلیق آئندہ کسی سال انعام کی مستحق نہ ہوگی۔

۶۔ طریق کار — انعامات کے [illegible] رسائل کا مطالعہ [illegible] ہم قلم [illegible] غور کرے گا [illegible] کے علاوہ پاکستان کا ہر شہری کسی

بھی سخن تحقیق کو انعامات میں غور کرنے کے لئے ادارے کو بھیج سکتا ہے۔

۷۔ ممنوعات ادارہ "ہم قلم" کے ہر رکن اور ادارہ مصنفین پاکستان (مرکز اور حلقہ کراچی) کے ہر انتظامی عہدے دار کی جملہ تخلیقات ان انعامات میں غور کئے جانے سے محروم رہیں گی۔

۸۔ اعلان انعام پانے والے مصنفین کے ناموں کا اعلان ہر سال "ہم قلم" کے اگست کے شمارے میں کیا جائے گا۔

۹۔ فیصلہ انعامات کے بارے میں کسی بھی متعلقہ امر کے سلسلے میں "ادارہ ہم قلم" کا فیصلہ قطعی اور آخری ہوگا۔

Printed at The International Press, McLeod Road, Karachi

مئی ۱۹۶۱ء

23 MAY

لندن
جنیوا
روم
بیروت
تہران
کراچی

PIA

707

پی-آئی-اے- ترقی کی راہ پر

پی-آئی-اے بوئنگ ۷۰۷ انٹرکانٹیننٹل کے کمانڈر دنیا کے پہلے غیر امریکی پائلٹ ہیں جو فیڈرل ایوی ایشن ایجنسی امریکہ کے سند یافتہ ہیں۔
نہایت قلیل عرصہ میں پی-آئی-اے کی سروس کا معیار اتنا بلند ہوگیا ہے کہ تجربہ کار بین الاقوامی مسافر بھی اس کی تعریف کرتے ہیں۔
پی-آئی-اے- کی دن دُونی رات چوگنی ترقی کی وجہ صرف ہماری کارگزاری ہی نہیں ہے بلکہ اس میں آپ کا تعاون بدرجہ اتم شامل ہے اور ہم آپ دونوں کے لئے یہ باعث فخر کارنامہ ہے۔

پاکستان انٹرنیشنل ایئرلائنز

تفصیلات اپنے سفری ایجنٹ یا پی آئی اے [illegible] روڈ- کراچی سے دریافت فرمائیے- ٹیلیفون نمبر ۵۱۰۶۱ / دس لائنیں-
کارگو کا دفتر:- سیفی ہاؤس [illegible] روڈ- کراچی- ٹیلیفون نمبر ۲۸۵۵۱ / تین لائنیں-

کیا آپ کی لائبریری میں یہ کتابیں موجود ہیں؟

ان کے بغیر آپ کی لائبریری نامکمل ہے، اس کمی کو دور کیجئے

ادب و تنقید

کتاب	مصنف	قیمت
مراثی انیس میں ڈرامائی عناصر	شارب ردولوی	۲/۵۰
دکنی ادب کی تاریخ	ڈاکٹر زور	۳/۲۵
اردو کی تین مثنویاں	خان رشید	۳/۵۰
داستان سے افسانے تک	وقار عظیم	۱۰/-
آغا حشر اور ان کے ڈرامے	"	۵/-
ایلیٹ کے مضامین	ترجمہ جمیل جالبی	۴/۲۵
افادی ادب	پروفیسر اختر انصاری	۱/۲۵
دکن میں اردو (جدید اڈیشن)	نصیر الدین ہاشمی	۱۰/-
نئے پرانے چراغ	آل احمد سرور	۵/-
تجربے اور روایت	ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی	۳/۲۵
تخلیق و تنقید	عبد السلام	۲/۶۲
اور پھر بیاں اپنا	اخلاق احمد دہلوی	۲/۵۰

تاریخ و تذکرہ

کتاب	مصنف	قیمت
چند ہم عصر	مولوی عبد الحق	۶/۵۰
تذکرہ جگر مراد آبادی	محمود علی خاں جامعی	۴/-
انسان کی کہانی	علاء الدین خالد	۴/۲۵
ابراہام لنکن	حامد حسن قادری	۳/۲۵
فلسفۂ انقلاب	جمال عبد الناصر	۳/-

تعلیم و سائنس

کتاب	مصنف	قیمت
تاریخ تعلیم	خالد یار خاں	۸/-
تاریخ کیسے پڑھائیں؟	"	۴/۲۵
اردو کیسے پڑھائیں؟	مولوی سلیم عبد اللہ	۲/-
فن تدریس	مشرف انصاری	۵/-
سائنس ہمارے لئے	میجر آفتاب حسن	۳/۵۰
جدید طبی ایجادات	ڈاکٹر شکور	۲/۵۰

ناول۔ افسانے

کتاب	مصنف	قیمت
تلاش بہاراں	جمیلہ ہاشمی	۰/-
آگ اور برف	الفت منہاس	۱/۵۰
رخصت اے زنداں	احسن فاروقی	۲/۵۰
سنگ گراں اور	"	۲/-
سیاہ پھول	اے حمید	۲/۵۰
سورج کا داغ	"	۲/۵۰

معیاری ادب ــــ ارزاں قیمت
سلسلۂ اکیڈمی لائبریری

کتاب	مصنف	قیمت
فسانۂ مبتلا	مولوی نذیر احمد	/۵۰
توبۃ النصوح	"	/-
الفوز الکبیر	شاہ ولی اللہ دہلوی ترجمہ سلیم عبد اللہ	/۲۵
دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ	مرزا فرحت اللہ بیگ	/-
نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ اپنی زبانی	"	/۲۵
اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر	شبلی	/۲۵
انتخاب مضامین سر سید	مع تنقید و سوانح	/۲۵
" مقالات شبلی	"	/۲۵
" افادات مہدی	"	/۲۵
شاہد رعنا	قاری سرفراز حسین	/-
احمق الذین	منشی سجاد حسین (ایڈیٹر اودھ پنچ)	/۲۵

مکمل فہرست مفت طلب کیجئے

اردو اکیڈمی سندھ
۱۶۔ بہادر شاہ مارکیٹ۔ بندر روڈ۔ کراچی

اردو مرکز
گنپت روڈ۔ لاہور

کتاب ایجنسی
تلک چاڑی، حیدر آباد

ہمارے تیار کردہ پختہ

اور معیاری رنگ

روز بروز زیادہ

مقبول ہو رہے ہیں

پاک ڈائز

اینڈ

کیمیکلز لمیٹڈ

داؤد خیل

ایکس فیکٹری قیمتیں (فی لانگ ٹن)

۱- سلفر بلیک پاک ایکسٹرا
کنسنٹریٹڈ گرینز ـــــ ۴۹۹۶٫۰۰ روپے

۲- کانگو ریڈ پاک ایکسٹرا
کنسنٹریٹڈ ـــــ ۱۲۵۰۰٫۰۰ روپے

۳- پاک ڈائرکٹ گرین۔ بی ـــــ ۱۰۳۲۶٫۳۰ روپے

۴- پاک ڈائرکٹ بلو۔ جی۔ ایس ـــــ ۸۹۶۰٫۰۰ روپے

۵- پاک ڈائرکٹ بلیک۔
کے۔ پی۔ کنسنٹریٹڈ ـــــ ۱۰۹۷۶٫۰۰ روپے

مینیجنگ ایجنٹس:- پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن

ہمارا منشور

"ہم پاکستان کی جملہ زبانوں کے ادیب خود کو اور وطن کی ترقی
ن، بین الاقوامی امن کے آدرش اور انسانیت کی ترقی کے لئے
ن کرتے ہیں، ہم ان حقوق انسانی پر ایمان رکھتے ہیں۔ جن کی
ن اقوام متحدہ کے منشور میں کی گئی ہے۔ بہ حیثیت ادیب کے ہم
ے خیالات کے اظہار اور ترسیل کی آزادی کے لئے بنیادی
ن کے حامی ہیں جس کے بغیر تخلیقی ادب بے مقصد ہوتا ہے۔
پنی ان عظیم روایات پر جو ہمیں ماضی سے ملی ہیں، پورا فخر
، ہم ان کے تحفظ اور ان کو مزید فروغ دینے کا عہد کرتے ہیں
پنے مقدس فرض سے جو صداقت کی عکاسی، حبِّ وطن کی
روں کی نشوونما، بین الاقوامی اُخوت اور تعاون کے فروغ
انسانی تعلقات کے قیام سے متعلق ہے، کماحقہٗ، آگاہ ہیں
تاکہ انسانیت زیادہ سے زیادہ راحت، طمانیت اور
ر کے ساتھ اپنا وجود باقی رکھ سکے۔

ادیب ہونے کی حیثیت سے فرداً فرداً اور اجتماعی طور پر
یک ایسے خوشحال اور صحت مند معاشرے کی ترقی کے لئے
ذمہ داری کو قبول کرتے ہیں جس میں سب کے لئے آزادانہ
دی مواقع فراہم ہوں، اور جہاں دولت و اقتدار، انسانی
دل اور رُوحانی تصورات کے تابع ہوں۔ اسی لئے علم و
ن کی ترقی کو دُنیا میں امن اور خوش حالی کے فروغ کا
ہ سمجھتے ہیں۔"

(پاکستان رائٹرز گلڈ کے تاسیسی اجلاس میں
بروز ۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء منظور ہوا)

ماہنامہ

ہم قلم

اِدارہ مُصنّفین پاکستان، حلقہ کراچی
(پاکستان رائٹرز گلڈ) کا ترجمان

جلد ـــــــ شمارہ ۹

مئی سنہ ۱۹۶۱ء

فی پرچہ	۶۲ پیسے
سالانہ	چھ روپے

اراکین ادارۂ مصنفین پاکستان سے ۵ رُوپے (سالانہ)
(جس میں خاص نمبر بھی شامل ہیں)

بھارت میں ترسیلِ زر کا پتہ
ایم برکت اللہ عادل
نمبر ۱۲۰۔ پک بازار روڈ کراس، بنگلور ملا

پتہ
۲۰ ہوٹل ایکسلسیر، صدر، کراچی نمبر ۳
فون ۵۳۰۵۵/۲۰

ترتیب

اداریہ

مضامین

اکبر الہ آبادی کی غزل	سید وقار عظیم
جگر کی غزل گوئی	صمدانی نقوی
چیکوسلواکیہ میں اُردو ادب اور اسکی تقیم	نصیر احمد زبیری

نظمیں

خلق کا محسن جفاکش مزدور	آغا شاعر قزلباش دہلوی (مرحوم)
آدمی	مصطفےٰ زیدی
ملاقات	ڈاکٹر وزیر آغا
جزیرے	قمر ہاشمی
ساحلی شہر میں ایک رات	منیر نیازی
ایک سنسان دوپہر	ساقی فاروقی
نیم کے پتے	جون ایلیاء

غزلیں

شاد عارفی	فارغ بخاری
جمیل ملک	شاہد عشقی
سحر انصاری	یوسف جمال انصاری
جعفر شیرازی	اقتدار قدر

افسانے

دو گمروں کی کہانی	رام لعل
آوازِ سنگ	انور خواجہ
سورج مکھی	نوید انجم

ثقافتی ورثہ

سال گزشتہ میں سندھی ادب کی ترقی	شیخ ایاز
پنجابی نظم	جلیل حشمی

ثقافتی سرگرمیاں (پشاور) ۷۵

خبرنامہ — اطراف عالم، حلقہ کراچی، مغربی پاکستان اور اور مشرقی پاکستان کی ادبی خبریں ۷۶

اداراتی اعلانات و شذرات — ایک نئی تحریک کا جائزہ ۷۴

ادیبوں کے لئے سنگ میل ۲۷

گلڈ کے اراکین کے لئے ایک اہم

اعلان

ادارہ مصنفین پاکستان حلقہ کراچی کی مجلس عاملہ نے اپنے حالیہ اجلاس منعقدہ ۲۰۔اپریل ۶۱ء میں فیصلہ کیا ہے کہ اراکین پاکستان رائیٹرز گلڈ سے ماہنامہ "ہم قلم" کا زر سالانہ بجائے چھ روپے کے پانچ روپے وصول کیا جائے۔ نیز یہ فیصلہ بھی کیا گیا ہے کہ ۳۰ رجون سنہ ۱۹۶۱ء سے "ہم قلم" کی خریداری قبول کرنے والے اراکین کو مزید ایک روپیہ کی رعایت دی جائے۔ یعنی ۳۰ رجون ۶۱ء تک "ہم قلم" کے خریدار ہونے والے اراکین سے صرف چار روپے وصول کئے جائیں گے۔

ہمیں اُمید ہے کہ پاکستان رائیٹرز گلڈ کے جملہ اراکین اپنے ترجمان ماہنامہ "ہم قلم" کی سرپرستی فرما کر ۳۰ رجون ۱۹۶۱ء تک اپنے فیصلے سے مطلع فرمائیں گے۔

بنگلہ کے نامور ڈرامہ نگار، آدم جی ادبی انعام پانے والے جواں سال پروفیسر عبدالستار "بے رمار سانہ" ۹ اپریل ۶۱ء کو سالگام میں رحلت فرما گئے۔ مرحوم کو ان کی تخلیق "کوبی دا" پر صدر پاکستان نے جنوری ۱۹۶۱ء آدم جی ادبی انعام برائے بنگلہ عنایت کیا تھا۔ مرحوم کی اُبھرتی ہوئی صلاحیتوں کے پیش نظر ان کا انتقال بنگلہ زبان کے لئے ایک عظیم سانحہ ہے۔

اسی مہینے میں اُردو کے ایک مشہور ادیب اور شاعر حسن امام وارثی رحلت فرما گئے۔ مرحوم نے غیر منقسم ہندوستان رسالہ "ندیم" کے ذریعے سے اُردو زبان کی بیش بہا خدمت کی۔ اور آخر وقت تک اُردو کی خدمت کرتے رہے۔ ان کے انتقال اُردو زبان کو بہت بڑا نقصان پہنچا ہے۔

ادارہ مرحومین کے پسماندگان سے اظہار ہمدردی کرتا ہے۔

اداریہ

ملک کے دانشور طبقے نے "ہم قلم" کا جس گرم جوشی سے خیر مقدم کیا ہے اور جس علمی دلچسپی کا اظہار کیا ہے، ادارہ اس کے لئے ان کا ممنون ہے۔ ان کے بیش بہا مشوروں کے پیش نظر ادارے نے فیصلہ کیا ہے کہ "ہم قلم" میں آئندہ سے سائنس اور دیگر علوم و فنون کے موضوعات پر بھی مضامین شائع کئے جائیں گے تاکہ "ہم قلم" وقت کی بدلتی ہوئی اقدار کا ساتھ دے سکے۔ اُمید ہے کہ یہ کوشش مفید اور کار آمد ثابت ہوگی۔

اُردو داں طبقے کو بیرونی ادبیات سے روشناس کرانے کا سلسلہ بھی جاری رکھا جائے گا۔ اس سلسلے میں پچھلے شمارے (بابت ماہ اپریل ۱۹۶۱ء) میں ایک مضمون "ڈنمارک کا ادب" شائع ہو چکا ہے۔ دیگر زبانوں کے ادب کے بارے میں بھی مستند مضامین شائع کئے جائیں گے۔

زیر نظر شمارے میں نصیر احمد زبیری کا ایک معلوماتی مقالہ "چیکوسلواکیہ میں اُردو ادب اور اس کی تعلیم" کے عنوان سے شامل ہے۔ پروفیسر سید وقار عظیم کا پُر مغز مضمون "اکبر الہ آبادی کی غزل" بھی اس شمارے میں شامل ہے۔ ہمدانی نقوی نے جگر مراد آبادی کے فن اور ان کے کلام پر بے لاگ تنقید کی ہے۔ اور ان کے فن اور غزل گوئی پر بڑے بھرپور انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ ادارے کو مسرت ہے کہ آغا شاعر قزلباش دہلوی مرحوم کی ایک غیر مطبوعہ نظم "خلق کا محسن جفاکش مزدور" بھی اس شمارے کی زینت ہے

ادارہ ان تمام قلمی معاونین کا شکر گزار ہے جن کی تخلیقات "ہم قلم" کے زیر نظر شمارے میں شامل ہیں

سابقہ اعلان کے مطابق اس شمارے میں ادارے کے نئے اراکین کی فہرست اور پرانے اراکین کے اسمائے گرامی اور پتوں کا صحیح نامہ شامل ہونا چاہئے تھا لیکن ادارے نے انکی اشاعت عمداً اگلے شمارے کے لئے ملتوی کر دی .... اس لئے کہ ادارے کی یہ کوشش ہے کہ جو فہرستیں شائع کی جائیں وہ مکمل، جامع اور صحیح ہوں، چاہے ان کی اشاعت میں کچھ تاخیر ہو جائے۔ ادارہ اس ضروری تاخیر کے لئے معذرت خواہ ہے۔

ادارۂ مصنفین پاکستان کے جملہ اراکین کی خدمت میں ماہنامہ "ہم قلم" .... بلا معاوضہ ارسال کیا جاتا تھا، اس سلسلے میں تمام اراکین کی خدمت میں گذارش ہے کہ "ہم قلم" کا یہ آخری شمارہ ہے جو بلا معاوضہ بھیجا جا رہا ہے۔ آئندہ سے اراکین کے لئے "ہم قلم" تخفیف شدہ زر سالانہ پر بھیجا جائے گا۔ اس ضمن میں اس شمارے میں ایک اہم اعلان ملاحظہ فرمائیے۔

سید وقار عظیم

اکبر الہ آبادی کی غزل

اکبر کو لوگ عام طور سے غزل گو نہیں بلکہ ظریف شاعر کی حیثیت سے جانتے اور پہچانتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ تذکرہ نویسوں اور نقادوں نے ان کی غزل پر تفصیل و وضاحت سے اظہار خیال کیا اور دوسرے نامور ہم عصروں کی محفل میں انہیں بھی اس مقام پر جگہ دی ہے جو ان کے رتبے اور بزرگی کے شایانِ شان ہے لیکن لوگوں نے اب بھی اکبر اور غزل کے رشتے کو اجنبیت، غیریت اور بیگانگی کی نظر سے دیکھنے کی عادت نہیں چھوڑی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ غزل کے ساتھ اکبر کا تعلق بڑی قریبی یگانگت کا ہے اور یگانگت کے اس رشتے میں قدامت پسندی کے سارے رسوم اور روایت پرستی کے سارے قیود اس طرح موجود ہیں کہ اکبر کے ہم عصروں میں سے کسی اور کے یہاں نہیں ملتے۔ اکبر کی پرورش ایسے ماحول میں ہوئی جس کا تہذیبی مزاج غزل اور غزل کی پیدا کی ہوئی روایت کے رنگ میں ڈوبا اور رچا ہوا تھا۔ گھر میں فارسی اور اردو کے اساتذہ کے دیوانوں کے مطالعہ کے علاوہ ایسی مجلسی زندگی سے سابقہ جس کا ہر گوشہ شعر و شاعری کے نغموں کی جھنکار سے گونج رہا ہو، گھر سے باہر شب و روز مشاعروں اور خصوصاً طرحی مشاعروں کی محفلیں اور ان محفلوں میں اساتذہ کی ہنرمندیوں کے معرکے، اُستادی شاگردی کے

تعلق کے جملہ آداب کی پوری پابندی، زمانے کے مذاق کے مطابق مشق سخن اور تربیت و اصلاح کا اہتمام و احترام۔ مختصر یہ کہ غزل ہمارے معاشرے میں جن تہذیبی اور فنی رسوم و قیود کی پابندی کے ساتھ کہی جاتی ہے اور جس کی بنا پر ایک طرف غزل اور غزل گو کے درمیان اور دوسری طرف غزل اور اس کے تہذیبی ماحول کے درمیان رچی ہوئی ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے وہ سب اُس وقت اکبر کے گرد و پیش موجود تھے جب انھوں نے غزل کہنی شروع کی اور اس کا نتیجہ ہے کہ ان کی غزل موضوع اور اسلوب کی اعتبار سے روایت کی قدامت کا وہ نمونہ پیش کرتی ہے جس کا نام و نشان موم اور غالب اور پھر حالی اور داغ کی غزلوں تک پہنچتے پہنچتے مٹ چکا ہے۔ اکبر کی غزل نے سارے بھولے ہوئے مضامین اور ان مضامین کے ادا کرنے کے اسالیب کو ایک بار پھر زندہ کیا اور غزل کی محفل ایک بار پھر قدامت اور قدامت کی آغوش میں پرورش پانے والی روایت کے چراغوں سے جگمگا اٹھی۔ اس غزل میں خصوصیت سے اکبر کی شاعری کے ابتدائی دوروں کی غزل میں، حسن و عشق، حکمت و اخلاق، تصوف و معرفت کی دنیا سے تعلق رکھنے والے ہر قابل تصور مضمون کو ان تمام شاعرانہ تشبیہوں، استعاروں، تلمیحوں، اشاروں

متوں کے ذریعے اور ان تمام روایتی لفظوں اور ترکیبوں کی
سے شعر کے سانچے میں ڈھالا گیا، جو تین صدی سے غزل کے
ن سے بندھے چلے آرہے تھے۔ مثال کے طور پر چند شعر
حظ فرمائیے؛

وہ تو موسیٰ ہوا جو طالبِ دیدار ہوا
پھر وہ کیا ہوگا کہ جس نے تمہیں دیکھا ہوگا
قیس کا ذکر مری شانِ جنوں کے آگے
اگلے وقتوں کا کوئی بادیہ پیما ہوگا

وہ شناور ہوں جو ہر موج کو ساحل سمجھا
وہ مسافر ہوں جو ہر گام کو منزل سمجھا

بس یہی دولت مجھے دی تو نے اے عمرِ دراز
سینہ اک گنجینۂ داغِ عزیزاں ہو گیا

ہمسر اُس طرۂ مشکیں کی نہیں کوئی بلا
کوئی فتنہ نہیں اُس نرگسِ جادو کی طرح

دل مایوس میں وہ شورشیں برپا نہیں ہوتیں
اُمیدیں اسقدر ٹوٹیں کہ اب پیدا نہیں ہوتیں

بڑھا کر آرزو اتنا گھٹایا عشق نے مجھ کو
کہ کانٹا رہ گیا میں اپنے گلزارِ تمنا کا

امانت عشق کی بعد اپنے کیا جانے ملے کس کو
نہیں معلوم جائے کس کے سر یہ دردِ سر اپنا
کہیں دیکھا نہ ہستی و عدم کا اشتراک ایسا
جہاں میں مثل رکھتی ہی نہیں اُنکی کمر اپنا
حباب آسا اُٹھایا بحرِ ہستی میں جو سر اپنا
بنایا بس وہیں موجِ فنا نے ہمسفر اپنا

نزاکت کے اثر سے شعر میں بھی بندھ نہیں سکتا
بچا جاتا ہے پہلو مجھ سے مضمونِ کمر اپنا

تصور ان کے عارض کا زبس رنگین و نازک تھا
پری بن کر ہمارے شیشۂ دل میں اُتر آیا
گیا تھا ہو کے رخصت صورتِ تسکین دل مجھ سے
برنگِ ہوش واں سے پھر کے اپنا نامہ بر آیا

تجربے کے بعد نسخے سے کشا آخر گلاب
کھنچنے میں تیرے عارض کا پسینا ہی پڑا

نزع میں آئی تجلی روئے جاناں کی نظر
زہر سمجھے تھے جسے وہ شربتِ دیدار تھا

فطرت میں سلسلہ ہے کمال و زوال کا
گھٹتا ہے بدر کا تو ہے بڑھنا ہلال کا

اُلفتِ گیسو نے آخر دی مرے دل کو شکست
ہائے کیا انمول شیشہ تھا مگر بال آگیا

زُلف نے پرتو دیں نام کو رہنے نہ دیا
آخر اس لام نے اسلام کو رہنے نہ دیا

اُن کی صورت دیکھ کر آنے لگی یادِ خدا
نورِ رُخ اُن کا چراغِ راہِ عرفاں ہو گیا

اِس توقع پر کہ تیرے پیرہن میں صرف ہو
ماہِ نو بھی چرخ پر شکلِ گریباں ہو گیا

یہ سب شعر کسی نہ کسی لحاظ سے غزل کی اُس قدیم روا

کے مظہر اور ترجمان ہیں جسے اکبر کے عہد میں بھی فرسودہ سمجھا جانے لگا تھا۔ لیکن اکبر اس طرح کی غزلیں جس انہماک اور اہتمام اور ذوق و شوق سے کہتے ہیں اس سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ وہ بہ حیثیت غزل گو کے غزل کی قدیم روایت کی پابندی و پیروی کو اپنا فنی منصب جانتے ہیں اور اس روایت کو اس کے جملہ متعلقات کے ساتھ، خواہ وہ زمانے کی نظر میں کتنے ہی مذموم اور مردود ہوں، قبول کرتے، سے محبوب جانتے اور اسے زندہ رکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ معاشرت اور تہذیب اور اس کے ساتھ ساتھ اس معاشرت اور تہذیب کے اخلاق اور دینی عقائد سے اکبر کو جو قلبی تعلق ہے وہ انھیں غزل کی اس فرسودہ روایت کا پرستار بناتا ہے اور بہ حیثیت غزل گو کے اکبر کی عظمت یہ ہے کہ انھوں نے غزل گوئی کے ایک ایسے دور میں جب غزل کی فنی روایت کے خلاف آوازیں اٹھنی شروع ہو گئی تھیں اور جب غزل کے مزاج میں انقلابی تبدیلیاں پیدا ہونی شروع ہو گئی تھیں غزل کی قدامت کو اس کے سارے ظاہری اور باطنی عیبوں کے ساتھ زندہ رکھا۔ لیکن حقیقت میں اکبر کی عظمت کے دو پہلو اور بھی ہیں۔ ایک یہ کہ اس قدیم روایت کے پرستار ہو کر اور اس قدیم روایت کے عیبوں کو عزیز رکھ کر بھی انھوں نے ایسے شعر کہے ہیں جو اپنے شاعرانہ اور حسن و نزاکت کی بنا پر اچھے سے اچھے غزل گو شاعر کے لئے سرمایۂ افتخار بن سکتے ہیں اور دوسرے یہ کہ انھوں نے غزل میں نئے مضامین اور نئے اسالیب کا اضافہ کر کے اس کی روش میں ایک ایسا انقلاب پیدا کیا کہ اس کا مزاج ہی بدل گیا اور غزل کے اس نئے رنگ سے غزل کے فنی امکانات میں وہ وسعت، فراخی اور کشادگی پیدا کر دی جس کا تصور غالب کی غزل کے بعد پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔ اکبر کے اس نئے رنگ کو دیکھ کر غزل کے شیدائیوں کے لئے یہ حکم لگانا آسان ہو گیا کہ غزل کے مضامین اور اس کے اظہار کے اسالیب کی کوئی حد نہیں۔ اور روایت کی بے شمار قیدوں میں جکڑی ہوئی ہونے کے باوجود یہ صنف آزاد ہے —— اس میں ہر بات کہی جا سکتی ہے اور نہ جانے کس کس طرح کہی جا سکتی ہے، بشرطیکہ بات کہنے والا (یعنی غزل گو) غزل کا صحیح مزاج داں ہو۔ اکبر کی قدامت پرستی نے انھیں غزل کا صحیح مزاج داں بنایا اور ان کی انقلاب پسندی نے اس قدیم صنف کے مزاج کے ایسے ایسے رُخوں سے پردہ اُٹھایا جو اب تک نظروں سے پوشیدہ تھے —— یہ رُخ خیال کے بھی ہیں اور بیان کے بھی۔ پہلے چند شعر ایسے ملاحظہ فرمایئے جن کا تعلق اکبر کی عظمت کے اس پہلو سے ہے جس کی بدولت غزل میں خیال یا بیان کے حسن، نزاکت اور لطافت کے بے شمار نقش نمایاں ہوتے ہیں۔ یہ شعر اکبر کے رنگِ تغزل کے چند نمونے ہیں:

ہوش بھی بار ہے طبیعت پر
کیا کہوں حال ناتوانی کا

روشن دلِ عارف سے فزوں ہے بدن ان کا
رنگین ہے طبیعت کی طرح پیرہن ان کا
محروم ہی رہ جاتی ہے آغوشِ تمنا
شرم آ کے چرا لیتی ہے سارا بدن اُن کا

اَب کہاں اگلے سے وہ راز و نیاز
مل گئے، صاحب سلامت ہو گئی

خود سمجھتا ہوں کہ رونے سے بھلا کیا حاصل
پر کروں کیا یُونہیں تسکین ذرا ہوتی ہے

خدا پناہ میں رکھے کشاکشِ غم سے
اسی سے تارِ نفس جلد ٹوٹ جاتا ہے

کیا پُوچھتے ہو مجھ سے کہ میں خوش ہوں یا ملول
یہ بات منحصر ہے تمھاری نگاہ پر

شیخ جی آپ کو اللہ سلامت رکھے
آپ کا دم بھی غنیمت ہے مسلمانوں میں

منہ ہم کو لگاتا ہی نہیں وہ بتِ کافر
کہتا ہے یہ اللہ سے انکار تو کر لیں
سو جان سے ہو جاؤں گا راضی میں سزا پر
پہلے وہ مجھے اپنا گنہ گار تو کر لیں

ہے خطا میری جو نکلے منہ سے لفظ آرزو
آنکھ سے نکلے محبت کی نظر تو کیا کروں

اکبر ہنوز اُن سے ہے اُمید وارِ لطف
بدلی ہوئی نگاہ کو پہچانتا نہیں

میں نے دیکھی ہیں غزالوں کی بہت چالاکیاں
ہائے اُن آنکھوں کی سی ان میں کہاں بیباکیاں

جستجو ہی میں وہ لذت ہے کہ اللہ اللہ
کیوں میں پوچھوں وہ دلآرام ملیگا کہ نہیں

یا رب ایسا کوئی بُت خانہ عطا کر جس میں
ایسی گزرے کہ تصور بھی گنہ گار نہ ہو

جنابِ شیخ پھر آخر بسر کروں کیوں کر
جدھر اُٹھاتا ہوں آنکھیں اُدھر معاذ اللہ

جلوۂ گُل نے چمن میں مجھے بے چین کیا
رل ہی جاتے ہیں تری یاد دلانے والے

نگاہِ نازِ بُتاں پر نثار دل کو کیا
زمانہ دیکھ کے دشمن سے دوستی کر لی

زلف میں دل کی گرفتاری بُری
سب مرض اُچھے یہ بیماری بُری
ہوش سے عاشق کو بچنا چاہئے
راہِ دل میں یہ گراں باری بُری

اِس اک گناہ کو منظور کیجئے تو مجھے
تمام اور گناہوں سے اجتناب رہے

پاسِ خاطر تھا اگر تو رنج کیوں ہم کو دیئے
اب عبث ہے اس کی پرسش، دل بھر آیا رو دیئے

چمکا ترا جمال جو محفل میں وقتِ شام
پروانہ بے قرار ہوا شمع جل گئی

سراپا اک نگاہِ شرمگیں ہے وہ پری پیکر
کجا آنکھیں اُٹھانا آپ وہ مشکل سے اُٹھتا ہے

تغزل کے ان شعروں میں وَلی سے دآغ (امیر اور اسیر) کے عہد تک کے مختلف شاعروں کا رنگ بھی ہے اور اس رنگ میں اکبر کے تجربے اور احساس کا رنگ بھی شامل ہے اور یوں تغزل کی قدیم روایت میں جا بجا ایک انفرادی شان بھی پیدا ہوئی ہے، لیکن اس انفرادی شان کا مظہر حقیقت میں ان کی غزل کا وہ پہلو ہے جس میں اکبر نے اپنے عہد کے سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی مزاج کو غزل کے سانچے میں ڈھالا ہے اور غزل کے پُرانے خیالات کو نئے ماحول کے پس منظر میں پیش کرنے کے علاوہ اس میں ایسے خیالات کو جگہ

ا ہے جو بظاہر غزل کے خیالات نہیں معلوم ہوتے۔ لیکن اکبرؔ
ایک طرف غزل کے مزاج کی بنیادی خصوصیتوں کو اپنے
منے رکھ کر اور دوسری طرف نئے خیالات یا نئی طرح کے
ات کے لئے اظہار کا ایک نیا اسلوب اختیار کر کے اس "عبث"
ن کا نازک مقام دلایا ہے اور یوں اکبرؔ کی غزل مضامین
وسعت اور تنوع کے اعتبار سے اور اس کے ساتھ بیان
جدت اور معنویت کے نقطۂ نظر سے ایک نئی غزل کی پیش رو
اکبر کے اس نئے رنگِ غزل کی ایک خصوصیت تو اس
زبے کی سچائی ہے اور دوسرے احساس کا خلوص۔ اکبر
پنی اس نئی غزل کا پورا موضوع اپنے معاشرے سے لیا اور
ماضی کی روایت میں سمو کر اس طرح غزل کے سانچہ میں
اکر موضوع اپنے نئے پن کے باوجود اور بظاہر غزل کا
ما نہ معلوم ہونے کے باوجود بےگانہ اور غیر نہیں معلوم
اکبر کی غزل کے ایسے اشعار کو (جن کی تعداد ان اشعار
قابلے میں کہیں زیادہ ہے جن کا ذکر اب تک ہو رہا ہے)
ین اور مضامین کے بیان و اظہار کے گوناگوں اسالیب
عتبار سے تقسیم کرنے کے بجائے کچھ ایسے اشعار پیش کرنے
فا کرتا ہوں جو اکبرؔ کے فن کی اس نمایاں اور انفرادی
یت کے مظہر ہیں جس کا ذکر میں اس وقت کر رہا ہوں۔

بتوں کے پہلے بندے تھے مسوں کے اب ہوئے خادم
ہمیں ہر عہد میں مشکل رہا ہے با خدا ہونا

پرداتوڑا آپ نے اس بت کو آیا کر دیا
خود پری تھی اب اسے پریوں کا سایا کر دیا

ہر رنگ میں ہیں پاتے بندے خدا کی روزی
ہے جینیز تو پھر کیا انگریز ہے تو پھر کیا
منزل وہی ہے جس کو نبیوں نے ہے بتایا
اسٹیم ہے تو پھر کیا ہمیز ہے تو پھر کیا

مے خانۂ رفارم کی چکنی زمین پر
واعظ کا خاندان بھی آخر پھسل گیا

تذکرۂ صاحب نسب نامے وہ وقت آیا ہے
بے اثر ہو گی شرافت مال دیکھا جائے گا

اس کو جھگڑا ہی رہا اور یہ خدا تک پہونچ
دل پرسوز جو ہاتھ آئے تو انجن کیسا

مری تقریر کا اس مس پہ کچھ قابو نہیں چلتا
جہاں بندوق چلتی ہے وہاں جادو نہیں چلتا

قتل سے پہلے ہے کلورافارم
شکر ہے ان کی مہربانی کا

ہر تعلق مرا سرمایہ ہے اک نا دل کا
میری ہر رات سے ہے ایک کہانی پیدا

وہی پریاں ہیں اب بھی راجہ اندر کے اکھاڑے میں
مگر شہزادۂ گلفام پر شیدا نہیں ہوتیں

سانس لیتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں
یہ نہ سمجھیں کہ آہ کرتا ہوں

اتنی آزادی بھی غنیمت ہے
سانس لیتا ہوں، بات کرتا ہوں

شیخ صاحب خدا سے ڈرتے ہیں
میں تو انگریزوں ہی سے ڈرتا ہوں

ہیں کلکٹر نزع میں عملے کھڑے ہیں دم بخود
جب خدا ہی ہو گیا حاضر تو ناظر کیا کریں

فتنہ اُن آنکھوں سے اُٹھا تو مچی واہ کی دھوم
سچ یہ ہے صاحبِ اقبال کی ہر بات اچھی

کیا ذوقِ عبادت ہو اُنکو جو مس کے لبوں کے شیدا ہیں
حلوائے بہشتی ایک طرف ہوٹل کی مٹھائی ایک طرف

علمِ دیں مفقود ہے گم ہے صراطِ مستقیم
خضرِ رہ بنتا ہے ہر غولِ بیاباں ان دنوں
اپنے اُشتر کو یہ کیا لے جائے گا سوئے حجاز
مست خود ہے بینڈ کی گت پر حُدی خواں ان دنوں

مَفر نہیں ہے ہمیں خانقاہِ سیّد سے
قفس میں ہیں تو اس اَڈّے کو چھوڑ جائیں کہاں

فریادی کے کاش طریقے ہوں منضبط
یک تختہ ظلم کی بھی تو وہ ٹھانتا نہیں

خط میں کیا لکھا ہے قاصد کو خبر کیا اس کی
پوچھتا ہے تجھے انعام ملے گا کہ نہیں

حرم والوں سے کیا نسبت بھلا ہم اہلِ ہوٹل کو
وہاں قرآن اُترا ہے یہاں انگریز اُترے ہیں

برباد و منتشر بھی ہو گئے اسی ہوا سے
کس زعم میں اٹھے ہو تن کر تم اے بگولو!

کھل گیا مصحفِ رخسارِ بتانِ مغرب
ہو گئے شیخ بھی حاضر نئی تفسیر کے ساتھ

اس تماشا گہہ ہستی میں مجھے حیرت ہے
اک نیا فلسفہ ہو جاتا ہے ہر سین کے ساتھ

شیخ ڈرتے ہیں کہیں دم نہ نکل جائے مرا
اُنس اس وجہ سے کم رکھتے ہیں یاسین کیساتھ

حسن مس پر کر نظر مذہب اگر جاتا ہے جائے
قدرداں کو نرخ کی کیا بحث اکبرؔ مال دیکھ

مزاجِ شریف اُن میں باقی نہیں ہے
تو کیا منہ سے الحمد للہ نکلے

مرید دہر ہوئے وضعِ مغربی کر لی
نئے جنم کی تمنّا میں خودکشی کر لی
جو حسنِ بُت کی جگہ حُکمِ مس ہوا قائم
تو عشق چھوڑ کے ہم نے بھی نوکری کر لی

اکبرؔ مریض ہے تو دعا بھی اُسے سکھاؤ
ایسا نہ ہو کہ صرف دَوا ہی کا ہو رہے

میں تو انجن کی گلے بازی کا قائل ہو گیا
رہ گئے نغمے حُدی خوانوں کے ایسی تان لی

خوشی کیا ہو جو میری بات وہ بت مان جاتا ہے
مزا تو بے حد آتا ہے مگر ایمان جاتا ہے

بزن کونسل میں اسپیکر تو رخصت قرأتِ مصری
کروں کیا ممبری جاتی ہے یا قرآن جاتا ہے

عقبیٰ کی باز پرس کا جاتا رہا خیال
دنیا کی لذتوں میں طبیعت بہل گئی

ان اشعار میں سے اکثر ایسے ہیں جن میں اکبر نے ایسے
موضوع بنایا ہے جو ایک خاص عہد کی سیاسی اور
زندگی کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ ان خیالات کے
لئے ایک طرف تو اکبر نے ایسے الفاظ کو علامت، اشارے
کی صورت دی ہے جو بدلے ہوئے زمانے کے مزاج
ترجمانی کرتے ہیں اور دوسری طرف ان الفاظ کے
ایسی فضا تیار کی ہے کہ ان کے لغوی مفہوم میں تخیلی
پیدا ہو جائے اور وہ اپنے لغوی مفہوم سے بہت آگے
ایسی حقیقت کے مظہر بن جائیں جسے شاعر کے مشاہدے
نے شعر کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ اکبر نے ان سیدھے
الفاظ کے ساتھ ایسے تصورات وابستہ کر دئے ہیں کہ جب
آتے ہیں تو بعض واضح خیالی پیکر اپنے ساتھ لاتے
اشعار میں سے بعض بظاہر ایسے بھی ہیں جن میں شاعر
بات کہی ہے جو اس سے پہلے بھی غزل کے شعروں میں
کہی جاتی رہی ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ بظاہر پرانی
بات ماحول اور زمانے کے فرق اور بیان کے اسلوب اور انداز
کے فرق سے بالکل نئی بن گئی ہے اور اس میں زندگی کے بدلے
ہوئے طریقوں پر ایسی تیکھی طنز ہے جو کسی صاحب بصیرت ہی
کو زیب دیتی ہے۔ اکبر نے اپنی غزل کے ذریعے (اصلاحی خدمت
کے علاوہ) بہ یک وقت کئی خدمتیں انجام دی ہیں۔ انھوں نے
بہت سے نئے الفاظ کو غزل کی زبان کا جزو بنا کر اسلوبِ اظہار میں
وسعت پیدا کی۔ انھوں نے پرانے الفاظ اور اصطلاحوں کے
مفہوم میں معنی کی نئی وسعتیں اور گہرائیاں پیدا کیں۔ انھوں
نے غزل میں ایسے مضامین داخل کئے جنھیں اب تک غزل کے
دائرے سے خارج سمجھا جاتا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ
انھوں نے غزل کو بھی معاشرتی اصلاح کا ایک موثر ذریعہ
بنا کر اس کے لئے ایک نئے رجحان کے دروازے کھولے
اور غزل میں پہلی مرتبہ نظم کی شان پیدا ہوئی —— اور
لطف یہ کہ یہ سب کچھ اس طرح کیا کہ غزل کے نام کے ساتھ
حسن و لطافت کا جو تصور وابستہ ہے اس میں کہیں کمی نہیں
آئی۔ غزل کو اکبر نے ایک نئے مزاج سے آشنا کیا، لیکن
اس طرح کہ غزل کی نزاکتِ طبع میں فرق نہ آیا۔ وہ ہماری
سیاسی اور معاشرتی زندگی کے ایک بے حد اہم عہد کے
تقاضوں کی مکمل ترجمان ہوتے ہوئے بھی غزل ہے۔

مصنفین کی تخلیقی سرگرمیاں

(کتابیں جو حال ہی میں چھپی ہیں یا زیرِ طبع/زیرِ تصنیف ہیں)

محشر بدایونی

بین باجے

(بچوں کے لئے نظمیں) قیمت ۲ روپے
ناشر: بچوں کا مکتبہ، ۱۳ - مدینہ مارکیٹ گارڈن روڈ - کراچی

میرزا ادیب

فصیلِ شب

(ڈراموں کا مجموعہ)
ناشر: انجمن مصنفین - لاہور

احمد سعدی

۱- سراج الدّولہ
(بنگالی اسٹیج ڈرامہ)
۲- تاریک زینہ
(علاءالدین الآزاد کی بنگالی کہانیاں)
۳- شبِ تاریک
(عبدالغفار چودھری کی بنگالی کہانیوں کا مجموعہ)
۴- یہ میری دُنیا یہ میری بستی
(منتخب بنگالی کہانیوں کا مجموعہ) (زیرِ طبع)
۵- سُلطان شہید
(بنگالی اسٹیج ڈرامہ)
۶- دل کا درد
۷- بابلا
(ناولیں) زیرِ تصنیف

حاذق الخیری

گذرتی شب

(افسانوں کا مجموعہ) قیمت ۳ روپے
ناشر: عصمت بک ڈپو - کراچی ۳۲

فارغ بخاری

برات عاشقاں

(رپورتاژ) (زیرِ طبع)

رضا ہمدانی

پشتو افسانہ (زیرِ طبع)

فارغ بخاری - رضا ہمدانی

پشتو شاعری کا ارتقا (زیرِ طبع)

نظیر صدیقی

شہرت کی خاطر

(انشائیوں کا مجموعہ) قیمت ۳/۵۰
پاک کتاب گھر - ۳۹ پٹواٹولی ڈھاکہ ۱

بیگم خورشید عبدالحفیظ

تہنیت

(ناول) قیمت ۳/۵۰
شاہان بلڈنگ - پریڈی سٹریٹ صدر کراچی

جمیل جالبی

حاجی بغلول (ناول) مع مقدمہ فرہنگ
قیمت ۲/۵۰ روپے
ناشر مشتاق بک ڈپو - نزد اُردو کالج کراچی ۱

ایم - اے شمیم (ملک)

۱- جذب و نظر
(مجموعہ کلام ۱۹۵۴ تا ۱۹۶۲) (زیر...
۲- روحِ غالب
تحقیق و تنقید - قیمت ایک رو...
ناشر - یونیورسٹی بک ڈپو - راولپ...

احمد ریاض (مرحوم)

موجِ خوں

قیمت ۵/- روپے
ملنے کا پتہ
مجلس یادگار ریاض کچہری بازار - لا...

منظر ایوبی

اُردو شاعری کے نئے موض...

(بیسویں صدی) (تحقیق و تنقید) (زیر...

کرشن چندر

۱- سڑک واپس جاتی ہے
(ناول) قیمت ۶/۷۵ روپے
۲- ایک خوشبو اُڑی اُڑی سی
(۱۶ نئے افسانے) زیرِ طبع
ناشر: مکتبۂ افکار - رابسن روڈ کر...

پروفیسر سید نواب علی

تاریخ صحفِ سماوی

(اسلامیات) قیمت ۵ روپے
ناشر - مکتبۂ افکار - رابسن روڈ...

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر طفیل احمد جمالی - مطبع - انٹرنیشنل پریس کراچی

مدانی نقوی

جگر کی غزل گوئی

جگر کی غزل کے مطالعہ سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے
رغزل کے پس منظر پر غور کرلیا جائے ۔ کہتے ہیں، اُردو شاعری
ں غزل کا سب سے پہلا تجربہ امیر خسرو نے کیا : یہ غزل فارسی
وریختہ کی ایک ملی جلی شکل تھی ۔ اس ایک غزل سے کسی
یادی روایت کے قیام کی توقع فضول ہے ۔ پھر یہ بھی وثوق
ے نہیں کہا جاسکتا کہ جو غزل امیر خسرو سے منسوب کی جاتی ہے
ہ واقعتاً ان کی تھی بھی کہ نہیں ۔ اگر تھی بھی، تب بھی اس غزل
کے پڑھنے سے جو تاثر ذہن و دماغ پر مرتب ہوتا ہے وہ اس
ے زیادہ کچھ نہیں کہ امیر خسرو نے جہاں بہت سی کہہ مکرنیاں
لیں، گیت جوڑے، راگ اور سُر بنائے وہیں تفریحاً اُردو
بان میں غزل لکھنے کی ایک کوشش کی ہو ۔ وہ اس معاملہ
ماسنجیدہ نہ تھے ۔ اگر سنجیدہ ہوتے تو یقیناً اُردو زبان میں
زل کی روایت اپنی ظاہری ہیئت اور داخلیت کے ساتھ
بل توجہ چیز ہوتی ۔ یہ خیال بھی اس لئے آتا ہے کہ خسرو نے
سیقی سے شغف کیا تو اسے نئے نئے راگوں اور آلات موسیقی
ے روشناس کر دیا ۔ کہہ مکرنیاں ایسی لکھیں جو سینکڑوں برس
زر جانے کے بعد بھی اسی طرح تازہ ہیں جیسے آج کی بات ،
ان ۔ ان کہہ مکرنیوں کی ایک ثقافتی حیثیت بھی ہے ۔ خسرو
نے کہہ مکرنیوں سے جہاں تفریح کا سامان مہیا کیا ہے وہیں
ندوستان کے ذہن کی نمائندگی بھی کی ہے ۔ اس وقت
کے طرز بود و باش، عقائد و اوہام اور تہذیبی عناصر کو سمونے
کی کوشش کی ہے ۔ مگر اُردو غزل کی طرف وہ سنجیدگی سے
مائل نہ ہوسکے ۔ خسرو فارسی زبان کے ممتاز غزل گو شعرا میں
شمار ہوتے ہیں ۔ ان کی غزلوں میں جو رچاؤ، جو خلوص اور جو
بانکپن ملتا ہے وہ زبان و بیان کے اعتبار سے فارسی سہی
لیکن ہندی فکر و نظر سے مالا مال ہے ۔ غزل کی اس بے
پایاں صلاحیت کے باوجود اُردو میں غزل کا ایک ہی تجربہ
کرکے چپ سادھ لینا صرف دو ہی باتوں کی طرف اشارہ
کرتا ہے ۔ یا تو یہ کہ وہ اُردو میں غزل لکھنے کو در خور اعتنا نہیں
سمجھتے تھے اور بر سبیل تفنن کبھی یہ موقتی شغل کرلیا تھا، یا پھر
یہ ایک کوشش جو ان کے انتساب سے منسوب ہے، ان کی
کوشش تھی ہی نہیں ۔ چاہے حقیقت ان دونوں باتوں میں
سے کسی ایک میں ہو، یہ بات تو مسلّم ہے کہ امیر خسرو کی اس
غزل کے بعد قریباً تین سو برس تک ہندی فن کاروں کا
ذہن اُردو غزل کی ترویج کی طرف مائل نہ ہوسکا ۔

تین سو سال کی اس خموشی کے بعد جنوبی ہند میں ہمیں
پھر ایک بار اُردو غزل کے نشانات ملنے لگتے ہیں ۔ قلی قطب
شاہ کے دیوان کی تدوین ۱۰۲۵ ہجری میں ہوئی ۔ قطب شاہ
نے جہاں اور اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی وہیں غزل کو
بھی اپنایا اور دکنی اُردو میں اشعار مرتب کئے ۔

سوال یہ ہو سکتا ہے کہ قطب شاہ نے غزل کیوں لکھی۔
اس کا جواب ہمیں اس دور کی تہذیبی اور تمدنی روایات میں
ملتا ہے۔ قطب شاہ نے جہاں مثنویاں لکھیں، سہیلے اور
گیت لکھے، وہیں غزل سے بھی مناسبت پیدا کی۔ فارسی
غزل میں حسن و عشق کے معاملات کے تعلق سے جو رموز و ایہام
کی سلگتی چنگاریاں تھیں ان میں بھی وہی تابانی اور وہی
ضوفشانی تھی جو ہندی دوہوں، ہندی گیتوں اور لوک
گیتوں میں تھی۔ قطب شاہ کے لئے یہ پہلو فطری مناسبت
رکھتا تھا، اس کے علاوہ شمالی ہند میں فارسی غزل منزلِ کمال
پر تھی ـــــ سیاسی اور سماجی اعتبار سے جنوبی ہند کا ذہن
شمالی ہند کے ذہن و مزاج سے قدرے مختلف ہے۔ فن
کی آفاقیت اپنی جگہ مسلّم ہے مگر طبیعت اور مزاج کا یہ اختلاف
تخلیقِ فن پر جداگانہ اثرات چھوڑتا ہے۔ قطب شاہ نے
فارسی زبان میں غزل کہنے سے اس لئے اجتناب کیا ہو کہ وہ
بدیسی زبان تھی۔ اس نے غزل کی ہیئت تو قبول کر لی لیکن
دل کی باتوں کے لئے اپنی ہی زبان کو ترجیح دی۔ فارسی میں
فرامین لکھے لیکن شاعری دکنی زبان میں کی اور اس بھرپور
انداز میں کی کہ آج سارے نقاد بلا تامل اسے اُردو غزل کا پہلا
صاحبِ دیوان شاعر مانتے ہیں۔

قطب شاہ کی غزل کا انفرادی پہلو ایک یہ بھی ہے کہ
قطب شاہ نے اس وسیلہ سے دکن کے ذہن کی نہ صرف
قیادت کی بلکہ یہ ثابت بھی کیا کہ اپنی روایات، اپنی تہذیب
اور اپنی معاشرت میں جو حسن ہے، جو اپنائیت ہے، جو بیساختگی
ہے وہ بدیسی محاوروں اور بدیسی طرزوں میں نہیں۔ اس
نے بلبل کی بجائے ہنسوں کو، موروں کو، بطوں کو اپنی شاعری میں
جگہ دی۔ اسے ہرن کی آنکھوں میں جو رس نظر آتا ہے وہ نرگسِ خمار
میں نہیں دکھائی دیتا۔ اسے مشکِ ختن کی بجائے۔ بھاگ
متی کی مانگ کا سیندور زیادہ مہکتا محسوس ہوتا ہے قطب
شاہ کی غزلیں مقامی روایات سے بھری پڑی ہیں۔ اس میں
فارسی غزل کی بدیسی معاملہ بندی نہیں۔ اس کے منڈیر
گلاب کے تختے ہی نہیں، جوہی، اور گیندے کے پھول
کھلتے ہیں اور گرمیوں کی تپتی دوپہروں میں کالے چکیلے
والا "کاگا" اس کی محبوب کے پیام اسے سُناتا اور
کے ذہن پر گہری خراش چھوڑ جاتا ہے۔

قطب شاہ نے غزل کو اُردو کا قالب دیا اور
اپنی تہذیب کا جزو بنالیا۔ پھر ولی نے اس کی جرأت بڑھا
سعد اللہ گلشن کی زیارت کو جب دلی گئے تو اُردو غزل
بیاض بھی ساتھ تھی۔

لوگوں نے دیکھا، اردو زبان جو شائستہ نہ تھی،
تھی، پوچ تھی۔ کسی لطیف فکر و تاثر کے اظہار کے لئے غیر موزوں
تھی، یکایک ایک ایسی شان سے نمودار ہوئی جس کی
دل فریبی اور گرمئ احساس پر ایمان لانا ہی پڑا۔ اس کے
پھر یہ خیال ایسا عام ہوا کہ یکے بعد دیگرے سینکڑوں شعرا
نے اس کی ہیئت کو اپنایا اور اپنی اپنی طبعِ سخن کو آزمایا۔
ایہام پرستی کا دور، دلی اور لکھنو مکتبِ شاعری کا دور اور
تقی میر کا دور سب اسی غزل کے ارتقاء کی کڑیاں ہیں
میر تقی میر تک یہ ورثہ پہنچتے پہنچتے کافی نکھر آیا تھا، میر صاحب
کی طبیعت کا سوز و گداز، ان کے فکر و احساس کی غم آمیز
سادگی اور ان کی نازک مزاجی نے غزل کو ان کے ہاتھوں
ایک ایسا شعار عطا کیا جو غزل کی بنیادی خصوصیات میں شمار
ہوتا ہے۔

پچھلے ڈھائی سو برس سے غزل کی روایت قائم ہے
مزاج کے شاعر نے غزل میں شعر موزوں کئے ہیں۔ یہی
ہے کہ اُردو شاعری میں شاید غزل ہی ایک ایسی صنف
ہے جس میں اچھے اور بُرے اشعار کا رطب و یابس کثرت
سے ملتا ہے۔ غزل کی یہ مقبولیت اس کے حق میں رحمت بھی
زحمت بھی۔ خالص غزل کے مطالعہ کے لئے اگر آپ بیٹھیں
آپ کو ایسے ایسے غزل گو شعرا سے دوچار ہونا پڑے گا جن

...کی ایک شعر سے بھی آپ وجدانی کیف حاصل نہ کر سکیں گے
...ای بے ربطی اور بے سوادی نے حالی جیسے باریک بیں نقاد
...غزل کے معاملہ میں بے رخی پر آمادہ کر دیا تھا اور وہ
انتہاپسندی کا شکار ہو گئے تھے۔ جوش ملیح آبادی نے غزل
...اس لئے "لایعنی" کہا کہ اس کے اختصار و اجمال کے لئے ان
کی طبیعت موزوں نہ تھی۔ پروفیسر کلیم الدین احمد نے غزل کے
رموز و علامات پر حصر کر کے اسے نیم وحشی صنف سخن قرار دیا
...اسے کسی فنی اور جمالیاتی نقطہ نظر سے قابل اعتنا نہ سمجھا
...یہ سب اسی انتہاپسندی کی باتیں ہیں جو غزل کے بے شمار
...اشعار نے خلجان کی صورت میں ناقدین کے ذہن میں پیدا کی
...بات تو یہ ہے کہ اس "ہجوم عاشقاں" میں ہمیں کچھ ایسے
...علمبردار بھی مل جاتے ہیں جن سے غزل کی آبرو قائم ہے۔
...علمبرداروں نے نہ صرف غزل کی روایت قائم کی بلکہ غزل
...اپنی زندگی کا مرقع بنا دیا۔ غزل کو وہ مُدرح عطا کی جو ابدالآباد
...زندہ رہے گی۔ غزل ان ہی کے طفیل ہماری تہذیب کی
...دار، ہماری روایات کی علمبردار، ہماری قوم کا مزاج،
...ذہن کی جوت اور ہمارے فکر و نظر کی آبرو بنی۔

ہیئت اور اسلوب کے اعتبار سے غزل کے دو پہلو ہیں
...پہلو تو خارجی ہے جس میں غزل کے ڈھانچے اور ساخت
...متعلق سے تعینات ملتے ہیں۔ جیسے مطلع سے اس کا شروع
...مقطع پر ختم ہونا۔ قافیہ اور ردیف کی پابندی، اوزان
...کا استعمال، اس کی مخصوص نغمگی اور ترنم کیف و سرور۔
...کی اس خارجی ہیئت میں، اگرچہ تبدیلیاں ہوتی رہیں،
...بنیادی ہیئت میں کوئی فرق نہ آیا۔ غزل کا داخلی پہلو البتہ
...سے متنوع رہا ہے۔ اس کے داخلی نظام پر ہر شاعر
...ذہن و مزاج نے جداگانہ اثرات دکھائے ہیں۔ اس کے
...و علامات کو ایک انفرادی شکل دے دی ہے۔ کسی زمانے
...ن و عشق کی حیثیت محض تجریدی تھی لیکن بقول ڈاکٹر یوسف
...خاں، اب احساس جمال، حیات و کائنات کے سمجھنے
کے لئے ایک قدر یا پیمانہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے تجربہ یا
مظاہر قدرت غزل کا موضوع ضمنی ہیں لیکن اس کے موضوع
کا پس منظر ضرور ہوتے ہیں۔ غزل کا انحصار تعقل سے زیادہ تاثر
پر ہے۔ انسانی شعور اور تحت شعور میں ہزاروں باریک باتیں
ہیں جن کے خارجی خطوط معین کرنے مشکل ہیں۔ وہ احساس کی
طرح لطیف و کیف آفریں ہوتے ہیں۔ وہ کسی تفصیل اور توجیہہ
کے متحمل نہیں ہو سکتے اور رمز و ایما کی زبان میں ادا ہو کر آپ
کی نکتہ رشناسی اور وجدان کی صلاحیت پر تکیہ کئے ہوتے
ہیں۔ غزل میں چونکہ شدّت احساس کی کار فرمائی ہے، گہری
دروں بینی ہے بے اندازہ کیف و تاثر ہے، اس لئے منطقی
تسلسل اور استدلال اس کی داخلیت کا تقاضہ نہیں۔ اس میں
وحدت احساس تو ملے گا لیکن وحدت فکر اس کی ہمہ گیر
فطرت کے منافی ہے شاعر کے قلب و دماغ پر جو احساس مستولی
ہوگا اس کا رنگ قبائے غزل پر نکھر آئے گا۔ کائنات کے لاکھوں
مظاہر سے اس کی نگاہیں دوچار ہوں گی لیکن احساس کی وحدت
اس کے ہر رد عمل میں جھلکتی رہے گی۔

جگر کے یہاں غزل کے برتاؤ سے ہماری مراد غزل کا یہی
داخلی پہلو ہے۔ ان کے یہاں غزل محض ایک روایت نہیں
بلکہ حقیقت بن گئی ہے۔ انھوں نے غزل کی خارجی ہیئت میں
یا اس کے رموز و علامات کی معنویت میں کوئی تبدیلی نہیں کی،
ان کی غزل کے سانچے وہی پرانے سانچے ہیں۔ ان کے رموز
و کنایات کا مفہوم بھی وہی پرانا اور روایتی ہے لیکن ان
پرانی بلوروں میں صہبائے غزل نے ایک نیا روپ اور نیا
نکھار پیدا کر رکھا ہے۔ ان کی غزل کا رنگ، اور غزل گو شعراء
کے رنگ سے الگ، بہت گہرا اور کیف و سرور آگیں ہے جگر
نے غزل کی شمع کو ایک ایسے دور میں روشن رکھا جبکہ اس صنف
سخن کے اور دیوانے بھی تھے۔ جنھوں نے اپنے اپنے رنگ
میں انفرادیت قائم کر رکھی تھی۔ فانی نے حزن و یاس کے عالم
میں شاعری کی اور غزل کو ایسا شائستہ اور رچا ہوا غم عطا

کیا جو ان کی اپنی شاعری کا جزو بن گیا۔ یاسؔ یگانہ چنگیزی نے غالب شکنی کے زعم میں غزل کو فکر و خیال کی بلندیاں عطا کیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ غزل کی ملاحت و کیف آفرینی، اس کی گھلاوٹ اور شیرینی کو متوازن نہ کر پائے۔ ریاضؔ نے خرابات کو غزل کا موضوع بنایا اور اس میدان میں اپنے لازوال نقوش چھوڑے۔ آرزوؔ نے سریلی بانسری سنبھال لی اور ہلکے پھلکے انداز میں غزل کو مترنم کیا، اصغرؔ گونڈوی کے ہاں غزل کے گلاب خوب مہکے۔ ان کی باتوں میں تصوف کا زیادہ اثر تھا۔ عشق و محبت کا کیف و کم، تصوف کی تار و پود میں زیادہ نفوذ نہ کر سکا اسی لئے غزل اپنی رفعتوں کے باوجود محبوب کے تعلقات سے بے گانہ سی رہی۔ فراقؔ کے یہاں غزل کی دنیا کچھ اور نقوش اُبھار رہی تھی۔ فراقؔ کی غزلوں میں وہ شدت احساس اور سوز و گداز موجود تھا جو کسی اچھی غزل کی خصوصیت ہو سکتا ہے لیکن اس میں استواری نہ تھی، ہمواری نہ تھی۔ وہ ایک اُبلتا سرچشمہ تھا جو پچھلی روایات کو اپنے جلو میں لئے کسی بڑے سیلاب کی غمازی کرتا تھا۔ حسرتؔ کے یہاں، البتہ، نگارِ غزل جیسے مطیع و منقاد ہو گئی تھی اور ان کی ذات غزل کی نئی اور پرانی تہذیب کے درمیان ایک سنگِ میل کی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ وہ گویا نئی غزل کے نقیب تھے اور بھرپور انداز میں شاعری کر رہے تھے۔ چکی کی مشقت اور مینائے غزل کی لطافت دونوں سے بیک وقت نباہ کرتے اور اپنی "طرفہ طبیعت" پر مسکراتے جاتے تھے، خارجی حالات و حوادث کو اذکارِ غزل میں شامل کر لینا حسرتؔ ہی نے شروع کیا لیکن بقول رشید احمد صدیقی، حسرتؔ کے یہاں اس کی حیثیت خبر کی سی ہے، جگرؔ کے یہاں یہ قلب کی دھڑکن بن کر نمایاں ہوتی ہے۔

ان کے علاوہ، شادؔ، صفیؔ، عزیزؔ، ثاقبؔ، محشرؔ، علی اخترؔ اور اثرؔ وغیرہم نے بھی کم و بیش اسی دور میں غزلیں کہیں اور اپنا ایک جداگانہ رنگ برقرار رکھا۔ اس انبوہ عاشقاں میں جگرؔ نے جب مینائے غزل کو اپنے سینے سے لگایا تو ان کا دل محبوب کے فراق و وصال سے بری طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ محبت سے دم سرشار تھے۔ کبھی کہتے۔

ذرّوں سے باتیں کرتے ہیں دیوار و در سے ہم
مانوس کس قدر ہیں تری رہ گزر سے ہم

اور کبھی

کوچۂ یار سے محبت ہے
در و دیوار سے محبت ہے

یہ محبت بے پایاں تھی۔ دل کی کسی اتھاہ گہرائی میں اس کا سوتا پھوٹ رہا تھا اور فکر و خیال کی وسعتیں اس کی آب سے شاداب ہو رہی تھیں۔ وہ مستانہ وار آئے مستانہ وار طرازی شروع کی۔ ان کا احساس انھیں کہہ رہا تھا۔

میری جانب نگراں ہے کوئی
اب زماں ہے نہ مکاں ہے کوئی
اب تو یوں محرمِ جاں ہے کوئی
جیسے رگ رگ میں نہاں ہے کوئی
ہر نفس اب تو یہ دیتا ہے صدا
کہ پسِ پردۂ جاں ہے کوئی

یہی وہ نگارِ غزل تھا جو حسرتؔ کی طرح جگرؔ کے یہاں مسکراتا چلا آیا۔ انھیں اسی "محبوب سزاوارِ غزل" کی مدح گری میں کچھ کہنا تھا اور صرف اسی کے لئے کہنا تھا۔ حسرتؔ اور جگرؔ اصلاً حسن و عشق کے شاعر ہیں لیکن جیسا کہ رشید احمد صدیقی لکھا ہے، ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ ایک محبوب کی موجودگی میں اور دوسرا محبوب کی دوری پر غزل خواں ہے۔ محبوب کی موجودگی وصال کی محرک ہوتی ہے، دوری [illegible] کی۔ جگرؔ محبت کے شاعر ہیں، حسرتؔ محبوب کے۔

جگرؔ کی غزل نہ تو صوفیانہ شاعری ہے اور نہ رندی اور سرمستی کی شاعری۔ نہ ان اشعار میں حزن و یاس نے جگہ پائی ہے اور نہ معقولات و فلسفہ نے اسے مسموم کیا ہے۔ یہ سیدھے سادے اشعار شاعر کی حیاتِ سادہ کی

...صورتیں ہیں جو تجربات اور محسوسات کی شکل میں اس
...ذہن و دماغ پر وقتاً فوقتاً مستولی رہی ہیں۔ کبھی ایسا
...محسوس ہوتا ہے کہ جگر کا دل عشق کی ولولہ سامانیوں سے گرم
...اور اس کی جنوں آسائیوں سے لبریز ہے۔ کبھی ان کی شاعری
...میں بھلی نیکی کی طرح تصوف کی چاشنی بھی آجاتی ہے جو
...بالعموم نہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انتہائی نا دانستگی میں کسی
...اندرونی وجدان کے تقاضے کے طور پر ظاہر ہوگئی۔ پھر ایک
...دور ایسی بھی آتی ہے جب کہ جگر کی غزل میں ان کی زندگی کے
...روزمرہ معمولات جھلکنے لگتے ہیں، ان کے اردگرد کی دنیا
...مسکرانے لگتی ہے اور وہ کہنے لگتے ہیں:

اک جگہ بیٹھ کے پی لوں مرا دستور نہیں
میکدہ تنگ بنا دوں مجھے منظور نہیں
نیز آداب محبت مجھے منظور نہیں
عشق دستور ہے خود عشق کا دستور نہیں

آداب محبت میں یہ آزادہ روی کچھ یوں ہی نہیں تھی۔
...بلاتکلف اور بلا ارادہ چلی آئی تھی اور ان کی طبیعت کا وصف
...بن کر رہ گئی تھی۔ غزل کو انھوں نے اپنے مزاج کی طرح برتا ہے
...غزل ان کے لئے جیسے کوئی فن نہیں، صنعت شعر نہیں، ان کا
...مزاج، ان کی اپنی طبیعت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی
...غزل میں آورد یا تصنع کی سی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ وہ
...بے تکان کہے جاتے ہیں، بے سوچے کہتے مگر اپنے احساس کی
...صداقت اپنے فکر کی روش اور اپنے ایثار کی بے باکی سے
...گھبراتے نہیں، ان سے یہاں احساس کی بالیدگی کے ساتھ
...ان کی کیفیات کا تلون ہے۔ آل احمد سرور نے لکھا ہے "حسرت
...نے حقیقت میں رومان تلاش کیا۔ جگر نے حقیقت کو رومان بنالیا"
...انھوں نے زندگی اور حسن کو جیسا پایا بے نقاب کر دیا۔ جگر
...سب رومانی شاعر ہیں۔ ان کی عشقیہ شاعری میں جو گہرائی اور
...کیفیت نظر آتی ہے وہ اسی رومانیت کا تقاضہ ہے اور اسی
...نے ان کے ادبی مرتبہ کو مستحکم کیا ہے۔ ان کا معیار حسن ماورائی

نہیں، ارضی ہے۔ ان کا محبوب موہوم نہیں، مستور و محجوب ہے۔
اسی کے وجوہ سے اسی کے قرب و بعد سے ان کے دل میں
وصال و فراق کی مختلف النوع کیفیتیں بیدار ہوتی ہیں اور جس
وہ اپنی غزل کے دامن میں کھینچتے جاتے ہیں، وہ قیس کی دیوانگی
پر ہنستے ہیں کہ وہ محرومی لئے ہوگیا حالانکہ شش جہت ان
کی نظر میں حسن حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ کبھی وہ محبوب کے کمال
قرب سے ایسے متاثر ہوتے ہیں کہ ان کا دل پکار اٹھتا ہے

کمال قرب بھی شاید ہے عین بُعد جگر
جہاں جہاں وہ ملے میں وہاں وہاں نہ رہا

حالی نے "آئیں وہ انجمن میں تو پھر انجمن کہاں" کہہ کر
خلوت کی ایک کیفیت سی پیدا کر دی تھی لیکن جگر اپنے تاثر میں
خلوت کی اس تہمت سے بھی بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ وہ محبوب
کے ساتھ کسی شرک کو بھی برداشت نہیں کرسکتے یہاں تک کہ
انھیں اپنی ہستی کا بھی ہوش نہیں رہتا۔ یہ کیفیت "قرب تام"
ہے کہ "بعد تام" سے آشنا کر دیتا ہے۔ اور یہ سب کچھ بھی
اس لئے ——

باتیں ہیں دو مقصود ہے ایک
تیری طلب یا اپنی طلب

طلب وحصول کی اس منزل میں، ایسا محسوس ہوتا
ہے کہ شاعر ہمیشہ کے لئے بیٹھ نہیں گیا، اس کے شوق کی ...
وہ نوردیاں منزل کی تہمت برداشت کرسکتیں، اسے ہجر و
فراق کی جنوں فرمائیوں کی بھی تمنا ہے۔ وہ اسی فراق و وصال
کی ملی جلی کیفیت میں کہتا ہے۔

نغمہ ترا نفس نفس، جلوہ ترا نظر نظر
اے مرے شاہد حیات اور ابھی قریب تر

جب شاہد حیات قریب سے قریب تر آجاتا ہے تو اس
کے دل میں رہ رہ کر ایک کسک سی بیدار ہوتی ہے، موہوم
سی لیے ربط سی، وہ اسی الجھن میں کہہ اٹھتا ہے کہ کاش وہ
قرب و وصال کے ان ہنگاموں سے دور اپنے دل کی گہرائیوں

…ڈوب کر دیکھ سکتا کہ محبوب کی تمنا اس کی رگ و پے میں کس
…جہ سرایت کی ہوئی ہے۔

شاہد و ساقی و بہار سے دُور
یعنی ہر کیف مُستعار سے دُور

اور پھر اس تنہائی اور یکتائی کی منزل پر آکر وہ پہلی
… محسوس کرتا ہے۔

بیت گئی جو دل پہ نہ پوچھ
ہجر کی شب اور آخرِ شب

اس رات کی تنہائی میں اسے 'وہ' یاد آنے لگتے
…ں۔ ان کی یادوں کے نقوش اُبھر آتے ہیں اور وہ سمجھتا
…ہے۔

اس جانِ تغافل نے پھر یاد کیا شاید
پھر عہدِ محبت کا ہر نقش اُبھر آیا

رات ناگن کی طرح آتی ہے اور شاعر کے دل و دماغ
…و اس درجہ مسموم کر جاتی ہے کہ وہ سحر کا انتظار کرنے لگتا
…ہے اور اسے محسوس ہوتا ہے۔

یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر
جیسے کوئی گناہ کئے جا رہا ہوں میں

اس گناہ کی زندگی سے دل گھبرا اُٹھتا ہے اور وہ وصال
…یب کی تمنا کرنے لگتا ہے۔ صبح آتی ہے۔ فطرت مسکراتی ہے
…ر شاعر کا دل فراق کی اذیتوں سے بے قرار ہے —— وہ
…بے تابانہ پکار اُٹھتا ہے۔

تم جو ایسے میں چلے آؤ تو رو دوں دم بھر
صبح کا وقت بھی ہے خاطر: شاد بھی ہے

اس شعر کے اعجاز کا کیا کہنا! شبِ فراق کی ساری
…کایتیں اور اذیتیں ان چند لفظوں میں سمٹ کر آگئی ہیں:
یہیں سے اس کی بازگشت کا موسم شروع ہوتا ہے
…حرانوردیوں اور آوارہ گردیوں نے بہت سوں کو بہت کچھ
…عطا کیا ہے۔ شاعر کا دل بھی اپنی کامرانیوں پر سرشار ہے۔

اسے ایک نئے جلوہ کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی دروں بینی
نے اسے ایک "مقامِ دل" عطا کیا ہے۔ وہ اس مقامِ دل کو
حُسن و عشق کی منزل سے بلند محسوس کرتا ہے اور جھوم جھوم
کر کہتا ہے۔

نگاہوں میں کچھ ایسے بس گئے ہیں حُسن کے جلوے
کوئی محفل ہو لیکن ہم تری محفل سمجھتے ہیں

وہ میکدۂ حیات میں ایک نئی لگن، ایک نئی لے کے
ساتھ داخل ہوتا ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے، پھول وہی
ہیں۔ چمن وہی ہے مگر اب نگاہوں کا مقصود بدل گیا ہے۔
ان کا تاثر مختلف ہے۔

پھول وہی، چمن وہی، فرق نظر نظر کا ہے
عہدِ بہار میں تھا کیا، دورِ خزاں میں کیا نہیں

وہ اپنی گلشن پرستی پر نازاں ہے۔ "نگاہِ مسلسل" سے زیادہ
اسے "دزدیدہ نگاہی" میں لذت ملتی ہے۔ وعدوں کے اعتبار میں
اسے اس کیفیت کا احساس نہیں ہوتا جو "وعدہ نامعتبر" میں ہوتا ہے

مرا ذوق بھی، مرا شوق بھی، ہے بلند سطحِ عوام سے
ترا ہجر بھی، ترا وصل بھی مرے دردِ دل کی دوا نہیں

اب اس کے یہاں ہر نظر، پہلی نظر ہے۔ ہجر کی راتیں بھی
اس کے یہاں اب روشن ہیں۔ دردِ شب نشینی کے مداوا کیلئے
اسے نسیمِ صبح گاہی کی ضرورت نہیں۔

ہو گئی دل کو تری یاد سے اک نسبتِ خاص
اَب تو شاید ہی میسر کبھی تنہائی ہو

اس کے احساس کے جلو میں نیندان محبت ہی نہیں، عرفانِ
محبت بھی ہے اور وہ یونانی دیومالا کی زبان میں شدت "نارسیسیت"
کا فریفتہ و دلدادہ ہے۔ وہ گہری دروں بینی اور خود پرستی کا نقیب
ہے۔ اب وہ دل ہی کو رونقِ حیات اور سرمایۂ غم کو ساری
کائنات سمجھتا ہے۔

نگاہِ شوق جگر وقفِ چار سو کیا ہے
جو دل حسین ہو دُنیائے رنگ و بو کیا ہے

یا پھر ——

جب نظر اپنی حقیقت آئی
مجھ پہ خود میری طبیعت آئی

اور ——

عشق خزاں مزاج سے لطف جمال پوچھئے
جن کی نظر ہے خود بہار، ان کے لئے بہار کیا

رومانیت کی یہ اصلی روح جگر کے کلام میں آہستہ آہستہ داخل ہوئی اور پھر جگر کے تغزل پر اس طرح چھا گئی کہ سارے کیفیات مستعار، "حس وخاشاک کی طرح اس طوفان میں بہہ گئے۔ آل احمد سرور نے "آتش گل" کے دیباچہ میں ایک جگہ لکھا ہے "جگر آج سے دس سال پہلے تک نفسیاتی حقائق کی اس گہرائی تک نہ پہنچ سکے تھے مگر ایک عرصے کی طوفانی اور جذباتی زندگی کے بعد ان کے یہاں ایک ٹھہراؤ آیا۔ انھوں نے سنجیدگی کے ساتھ اپنے سرمایہ کا جائزہ لیا۔ وہ اصغر کے اور قریب جانا چاہتے تھے مگر ان کی افتادِ طبع نے انھیں حسرت سے قریب کر دیا۔ یہ تجزیہ کچھ درشرح وبسط کا محتاج تھا۔ کاش سرور صاحب اس فرض نصبی سے بھی عہدہ برآ ہوں۔ ہم دور افتادگان جگر کے لئے ان کی غزلوں میں ابہام کی کیفیت زیادہ ہے۔ اسی لئے ہم نے جگر کے کلام کا دور واری مطالعہ کیا ہے۔ اس مطالعہ کے دوران میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جگر کی زندگی کا خاصہ حصہ افراط و تفریط کی نذر ہو گیا۔ وہ ہنگاموں سے کھیلتے اور ان کی لذت اذیت میں جینے کا راز تلاش کرتے رہے۔ شعلہ طور میں "شیشیاں" کے دور سے لے کر "جذبات" کے دور تک ایک بحرانی کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ ایک نا استقامت اور عدم ہمواری سی کھٹکتی ہے، احساس میں گہرائی اور فکر میں پختگی کا پتہ نہیں چلتا۔ لیکن اس ناپختگی کے دور میں بھی ہمیں جگر کی زبان سے بعض چونکا دینے والی باتیں سنائی دیتی ہیں۔ کلام کی ناہمواری کے باوجود شاعر کے بیدار احساس کی زیرِ لب آواز کہیں نہ کہیں سے پھوٹ نکلتی ہے اور دل پر ایک کیف طاری کر جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

ایک تجلی، ایک تبسم، ایک نگاہ بندہ نواز
اس سے زیادہ اے غم جاناں دل کی قیمت کیا کہئے

یا پھر ——

لطف آزادیٔ زنداں بلا کیا کہئے
اب جو چھوٹے تو اسیر غم زنداں ہوں گے

وہ کیا احساس ہوگا جس کی رفعتوں کے آگے بلاؤں نے بھی رحمت کا روپ دھار لیا ہے۔ بلاؤں میں رہتے رہتے بھی طبیعت ان کی اس درجہ خوگر ہو گئی ہے کہ جب وہ نہیں ہوں گی تو ان کی یاد دل کو تڑپانے لگے گی۔

اسی دور کا ایک اور شعر ہے۔

لطافت مانع نظارہ صورت سہی لیکن
دھڑکنا دل کا کہتا ہے وہ گزرے ہیں ادھر ہوکر

ذرا غور تو کیجئے اس اشارہ کی لطافت پر۔ بہار لالہ وگل اور شوخیٔ برق وشرر کے انداز میں "حجابات نظر" ہو کر تو وہ بار بار سامنے آئے ہوں گے لیکن اس شعر کا جمالیاتی کیف ہی کچھ اور ہے۔ وہ گزر گئے ہیں۔ گذرگاہ کا ذرہ ذرہ حسن کی تابانیوں سے دمک اٹھا ہے۔ فضاؤں میں جیسے سینکڑوں گلاب کھل اٹھے ہیں۔ جی انھیں دیکھنے کو مچلا جاتا ہے مگر لطافت مانع نظارہ ہے۔

ادب شناس محبت، دل خراب ہوا
ترا حجاب نہ کرنا بھی اب حجاب ہوا

غرض یہ کہ اس ناپختگی کے دور میں بھی جگر کے یہاں ایسے اشعار موجود ہیں جن کا کیف وتاثر زیادہ رنگین اور زیادہ وسیع ہے۔ واردات کے دور میں آکر جگر کی شخصیت اور مستحکم ہو جاتی ہے۔ اب تک جگر کی نغمہ طرازیوں میں ایک بے چینی تھی۔ ایک اندرونی کش مکش کا احساس تھا۔ کبھی وہ حسن وعشق، رندی اور سرمستی کے گن گاتے تھے۔ کبھی ہر بت سیم تن کو اپنا مسجود سمجھتے اور اس کی محبت سے سینہ کی آگ

فرزنداں رکھتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ معرفت و تصوف کی باتیں بھی انھوں نے کیں۔ رندی اور سرمستی سے بڑھ کے، عشق جنوں ساز سے گھبرائے۔ ان کی ذات پر جیسے مختلف طاقتیں کارفرما تھیں۔ ایک طرف ان کی اپنی فطرت تھی جس میں رومان رچا ہوا تھا۔ دوسری طرف قاضی سید عبدالغنی شاہ منگوری اور اصغر گونڈوی سے ان کے وہ تعلقات تھے جو بطرز رشد و سلوک تھے۔۔۔ ان گوناگوں اثرات کے درمیان ان کی شخصیت کی نرم و گداز مٹی کسی ایک ڈھب پر آنا چاہتی تھی لیکن اسے وہ سانچہ ابھی تک میسر نہ آسکا تھا جو ان کی شخصیت کی صورت گری کر دیتا۔ ان کی شخصیت کی تعمیر میں ہوسکتا ہے تصوف نے بھی حصہ لیا ہو، ان کی عشق پرستی، ان کی رومانیت، ان کے بیدار دل اور طبیعت کی افتاد نے بھی کام کیا ہو لیکن ان تمام محرکات کے ساتھ جو چیز ان کی شخصیت کی صورت گری میں نمایاں نظر آتی ہے وہ وقت کی سب سے جاندار تحریک ہے جس نے اُدب کے دھارے کا رُخ پلٹ دیا تھا اور خیال و فکر کے لئے نئی نئی راہیں کھول دی تھیں:۔

جگر کی فطرت میں بے باکی ضرور تھی لیکن روایت پرستی نے انھیں زندگی کے اکثر حقائق سے بےگانہ کر رکھا تھا۔ ان کی فکر شاعرانہ ضرور تھی لیکن اس حقیقت کا سوز و گداز اور اس کی تلخیاں شامل نہ تھیں۔ وہ گھائل ہو کر بھی حقیقت سے فرار چاہتے تھے۔ وقت نے انھیں یہی سکھایا کہ وہ حقیقت کو عریاں دیکھیں۔ جو کچھ دیکھیں اسے اپنا محور فکر بنائیں۔ اپنی شاعری کا موضوع بنائیں یہ نہ ہو کہ آداب پرستی کی مصلحتیں اسے شایان اظہار نہ سمجھیں۔ جگر کے یہاں حساس دل تھا لیکن زندگی کی ان حقیقتوں سے جو بظاہر غیر اہم اور غیر فنکارانہ نظر آتی تھیں جگر نے ہمیشہ اغماض برتا تھا۔ نظر بچا کر گذر گئے تھے لیکن ادب کی اس ترقی پسند تحریک نے بار بار ان سے کہا، ان کے ذہن پر یہ بات مسلط کی کہ جو نظارہ ان کے سامنے آئے اسے وہ غیر شاعرانہ سمجھ کر گذر نہ جائیں۔ وہ اسے آنکھ پھاڑ کر دیکھیں اور اپنے فکر و خیال کا موضوع بنائیں۔

ویسے ۱۹۳۵ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک ہندوستان ادب کی بہت سی تحریکیں چلتی رہیں۔ ادب برائے ادب ادب برائے زندگی کے شاخسانے بھی نکلے لیکن ترقی پسند ادب کی تحریک نے اپنی مقصدیت کو زیادہ واضح کیا اور فکر و نظر کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ رابندر ناتھ ٹیگور سکون و آشتی کے گیت گاتے گاتے فاشزم کے خلاف آواز بلند کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اقبال کے ہاں تصور خودی اور فلسفۂ حیات ایک نئی توانائی اور نئی طاقت کے ساتھ پایا جا رہا تھا۔ سیاسی میدان میں آزادی وطن کی جدوجہد نے شدت اختیار کر لی تھی۔ جوش کے کلام میں اب دیہات اور رومان کے افسانے ہی نہ تھے بلکہ اس عام خیر و شر کے بارے میں حکیمانہ اور ترقی پسندانہ نقطۂ نظر ابھرتا جا رہا تھا۔ "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام" اور ایسی ہی کئی نظمیں جوش نے لکھیں اور آزادی کی لگن، سوفسطائیت سے انسان دوستی، عقل پسندی اور حب الوطنی کے جذبات کو ابھارتے رہے۔ نثر اور نظم میں بے شمار تخلیقات ایسی تھیں جن کا کینوس حقیقت پسندی پر مبنی تھا۔ اور وہ ادیب زندگی کے ہر شعبہ پر اپنی صحت مند جمالیاتی کاوش میں مصروف تھے۔ وہ مجہولیت اور ماورائیت کے فنکار نہ تھے۔ ان کے یہاں ایک بے قرار فعالیت تھی، ایک واضح مقصد تھا۔ وہ ماضی کی اچھی روایات کا استیصال بھی نہیں چاہتے لیکن سماج کے سم آلود عناصر کو بھی وہ برداشت نہ کر سکتے تھے۔ انھوں نے ادب کو ایک زندہ و پائندہ مطمح نظر عطا کیا اور اس کے شرمیلے پن کو دور کر کے اسے بے باکی عطا کی۔ اسی زمانہ میں دنیا کی مختلف زبانوں کے شہ پاروں کا ترجمہ ہوا۔ شعر و سخن کے میدان میں نئے نئے تجربے کئے گئے اور ادب کا دامن ان تجربات کے تنوع سے مالا مال ہوتا رہا۔ فارسی ادب کی اتباع سے ہمارے ادب میں جو بدیسی رنگ آگیا تھا وہ مقامی رنگ حاصل کرنے لگا

ادب کا ایک سماجی کردار متعین ہو گیا۔ اس دور میں جگر اپنے قدیم انداز میں غزل سرا تھے۔ ادب کی ان نئی نئی تحریکوں سے ان کی طبیعت میں ایک اُلجھن سی پیدا ہوتی اور وہ ان سے دُور رہنے کی کوشش کرتے۔ چنانچہ ترقی پسند ادب کی تحریک سے وہ اجتناب برتتے مگر نوعمر ترقی پسند شعرا کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی بھی فرمایا کرتے تھے۔ اس سے مقصد یہی تھا کہ ان کی طبیعت جو روایت پرستی کی خوگر ہو گئی تھی کسی تبدیلی کے لئے آمادہ تو نہ تھی مگر نئی نئی ادبی تحریکوں میں حقیقت پسندی کا جو رجحان بڑھتا جا رہا تھا اس سے وہ پوری طرح اغماض بھی برت نہ سکتے تھے۔

اس تذبذب کے باوجود ان کے پاس دل زندہ موجود تھا۔ ان کا احساس بیدار تھا۔ آگرہ اور کانپور کے ہنگاموں میں وہ چپ نہ رہ سکے۔ بلا ارادہ انھوں نے اسے آنکھ بھر کر دیکھا اور جو کچھ دیکھا تھا۔ جو بھی تأثر اس نظارہ نے ان کے ذہن و دماغ پر مرتسم کیا تھا اسے یکبارگی پوری شدت احساس کے ساتھ شعر کی صورت میں بیان کر دیا۔ وہ لکھتے ہیں۔

دشمن آدم آدمے، ہم سخنے نہ ہمدمے
چشم کشا دیک دمے، فتنۂ اہرمن نگر
آں ہمہ لغزش و خطا، ایں ہمہ سازش دغا
خلوت اہل دیں ببیں، خلوتِ اہلِ فن نگر
جسم زناقہ زار زار، روح زدرد بے قرار
مادر ہند اشک بار، مفلسیِ وطن نگر
وجہ زمفلسی مپرس، سیم و زر وطن مجو
رخ بنما بہ لندن و سیم و زر وطن نگر
جرم و خطا روا بتے، غدر و دغا شکا بتے
جور فرنگیاں مپرس، دار بہ بیں رسن نگر

اس نظم میں پہلی بار جگر نے اپنے سماجی شعور کا اظہار مکمل کیا تھا اس کے بعد حادثات پیہم ہوتے رہے۔ شاعر حساس طبیعت جگر گدازیوں سے اب کی بار روگرداں نہیں ہوئی بلکہ انھیں اپنے اوپر طاری کر لیا۔ چنانچہ ۱۹۴۳ء میں بنگال کے قحط نے انھیں اپنی طرف متوجہ کیا۔ اب تک تو وہ یہیں تک کہتے تھے۔

چاندنی ہے، ہوا ہے، کیا کہیئے
مفلسی کیا بلا ہے، کیا کہیئے

لیکن یہ مفلسی ذاتی تھی۔ شخصی تھی، اس میں درد تھا مگر اپنا درد۔ مگر جب جگر نے قحط بنگال پر نظر ڈالی۔ بلکتی اور سسکتی انسانیت کے دلخراش مناظر دیکھے۔ پڑھے اور سمجھے تو ان کا دل بھی بے قرار ہو اٹھا۔ انھوں نے قحط بنگال پر ایک نظم لکھی اور اپنے "ارباب وطن" "اغیار" اور "مجبور سفر" کی بند شوں کا مضمون ہمارے ذہن میں بالکل واضح ہے لیکن جگر نے جس دور میں یہ سب کچھ سوچا وہ محض قیافہ کی بنا پر نہیں تھا بلکہ وہ ایک شدید واقعہ کا سیدھا سادھا تاثر تھا۔ وہ تأثر حقیقت بن گیا اور شاعر کے احساس نے تاریخ کے دل کی دھڑکنیں تیز کر دیں۔

انھوں نے لکھا تھا

اک تیغ کی چشمک سی نظر آئی ہے مجھ کو
اک ہاتھ پس پردۂ در دیکھ رہا ہوں
بیداری و آزادی و اخلاص و محبت
اک خلد در آغوش نظر دیکھ رہا ہوں
جو خواب کہ شرمندۂ تعبیر تھا اب تک
اس خواب کی تعبیر جگرؔ دیکھ رہا ہوں

جگر کی شاعری کا یہ موڑ شاید بلا ارادہ تھا لیکن اپنے دور کی مختلف جاندار محرکات کا لازمی نتیجہ تھا۔ وہ ایک خاموش اعتراف تھا جو شاعر کی مختلف تخلیقات سے جھلک رہا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے ساتھ، فسادات کی وبا پھیلی اور نواکھالی اور بہار سے لے کر پنجاب اور دلی تک آگ اور خون کا ایک دریا بہہ گیا۔ اب عزیمت پر ور دَور میں جگر پھر خاموش نہ رہ سکے۔ اب کی بار انھوں نے جو کچھ لکھا، جو کچھ سوچا سمجھا

تھا اسے لئے ہوئے ترقی پسند ادیبوں کے اس مشاعرہ میں چلے آئے جو انھوں نے لکھنؤ میں ترتیب دیا تھا۔ ان کی زبان میں

— فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آجکل

یہ غزل، غزل برائے غزل نہ تھی۔ ایک اچھا خاصہ واسوخت تھا۔ ملک کے حالات، اربابِ وطن کی بے مہریوں، سفاکیوں اور درندہ مزاجیوں کا ماتم تھا۔ اس پر غفرین و حقارت تھی۔

شائستگی کے بھیس میں رُوحِ درندگی
اِنسان کے لباس میں شیطاں ہے آجکل
ہے زخمِ کائنات جو ہندو ہے ان دنوں
ہے داغِ زندگی جو مسلماں ہے آجکل
وہ دن گئے کہ طائرِ مقصود تھا شکار
انسان کا شکار خود انساں ہے آجکل

ان اشعار میں جگر جس گہرے سماجی شعور، انسان دوستی حق پسندی اور بے باکی کا اظہار کیا ہے، اس کا اظہار ان کے ابتدائی کلام میں نہیں ہوتا۔

فسادات اور کشت و خون کا یہ موسم جب گزر گیا تو شاعر کے فکر میں ایک طرح کی گہرائی اور وسعت پیدا ہوئی۔ جذبات جو بھڑک گئے تھے، برانگیختہ ہوگئے تھے، ان میں ٹھہراؤ اور سکون پیدا ہوا اور نتیجتاً ایک حوصلہ مندانہ احساس بیدار ہونے لگا۔

یہ صحن و روش، یہ لالہ و گل ہونے دو جو ویراں ہوتے ہیں
تخریبِ جنوں کے پردے میں تعمیر کے ساماں ہوتے ہیں
یہ خون جو ہے مظلوموں کا ضائع تو نہ جائے گا لیکن
کتنے وہ مبارک قطرے ہیں جو صرفِ بہاراں ہوتے ہیں

یہ رچی ہوئی کیفیت، یہ سلگتا ہوا انداز، یہ بانکپن، یہ دلنوازی اور تاثر سب اسی حقیقت پسندی کا حاصل تھے۔ جگر کے ساتھ ادب کی اس جاندار تحریک نے وہی کیا جو غالب کے ساتھ ان کے عشق نے کیا تھا۔ ایک نے عشق کی پذیرائی میں طرز میں ریختہ لکھنا چھوڑ دیا تو دوسرے نے حقیقت پسندانہ نئے جذبے کو اپنی فطرت سے کچھ اس طرح ہم آمیز کیا کہ رعنائیاں دوبالا ہوگئیں۔ جگر کے یہاں غزل اب ایک اور بے جان شاعری نہ تھی بلکہ اس کے اندر بڑی صحت توانائی در آئی تھی، وہ بجلی کی طرح بے قرار و تاباں تھی اب گلشن گلشن بھی گھومتے تو اپنے نشیمن اور لاکھوں بلا حکایتیں سناتے جاتے۔ آزادی پر غور کرتے تو کہتے۔

کام ادھورا اور آزادی
نام بڑے اور تھوڑے درشن
شمع ہے لیکن دھندلی دھندلی
سایہ ہے لیکن روشن روشن

اپنے اطراف واکناف پر نظر دوڑاتے۔ گھور گھور اس منظر کو دیکھتے جو ان کی آنکھوں کے سامنے آگیا اور گہرے تاثر اور غمگینی کے عالم میں کہہ اُٹھتے۔

بھری بہار میں تاراجیٔ چمن مت پوچھ
خدا کرے نہ پھر آنکھوں سے وہ سماں گزرے
بہت حسین سہی صحبتیں گلوں کی مگر
وہ زندگی ہے جو کانٹوں کے درمیاں گزرے

انھیں جیسے کانٹوں کے درمیان جینے کا ڈھنگ آگیا وہ اس پر راضی تھے کہ ——

صحنِ کعبہ نہ سہی، کوئے صنم خانہ سہی
خاک اُڑانی ہے تو پھر کوئی بھی ویرانہ سہی

ان کی نظریں صاف دیکھ رہی تھیں کہ جہل خرد وہ دن دکھائے ہیں جب انسان تو گھٹ گئے ہیں مگر ان کے سائے بڑھ گئے۔ اب وہ آدمی سے ملتے ہیں لیکن آدمیت کو سوں نہیں پاتے۔ اس کے باوجود انھیں ارتقا اور تعمیر کے جذبے کا پورا پورا احساس ہے ۔

جو طوفانوں میں پلتے جا رہے ہیں
وہی دُنیا بدلتے جا رہے ہیں
نکھرتا آرہا ہے رنگِ گلشن
خس و خاشاک جلتے جا رہے ہیں

انھیں یقین تھا کہ اس عفریت اور جنوں خیز دور کے بعد ایسا زمانہ بھی آئے گا جب کہ وہی ذوق و شوق ہوگا۔ سحر نے ہی ہاتھ سوئے پیمانہ بڑھیں گے اور حدیث حسن سے حیات مالا مال ہوگا۔ انسان اسیرِ آشیانہ نہیں رہے گا دشت و دریا دُور ہو جائے گا۔ جگر کے یہاں غزل نے لطافت پائی۔ سلجھا ہوا اسلوب اختیار کیا۔ اس میں شاعر ہی کا نہیں پورے معاشرہ کا دل دھڑکنے لگا، ان کی حدیث دلبری میں ہماری موجودہ زندگی کے نقش و نگار اُبھر آئے۔ ان کی غزل کے آبگینوں میں تندی صہبا بھی ہے اور شبنم کی ٹھنڈک بھی۔ ان کے پاس نورِ نظر بھی ہے، گرمیٔ احساس بھی۔ خلوت کی پُراسرار چاندنی بھی ہے اور جلوت کے ہنگامے بھی۔ احساس و فکر کے توازن کی کچھ بھرپور انداز میں ان کی غزلوں میں رچی بسی معلوم دیتی ہے اور یہی وہ خد و خال ہیں جنہوں نے جگر کی غزل کو ممتاز حیثیت عطا کی اور انھیں لازوال مقام عطا کیا۔

وہ ادائے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ
جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتحِ زمانہ

اُدیبوں کے لئے سنگ میل

مکرمی منظر ایوبی صاحب تسلیم نیاز قبول باد۔ جناب والا کا ارسال کردہ معاوضہ بابت اشاعت نظم ماہنامہ ہم قلم موصول ہوا۔ اس سلسلے میں ناچیز کا ایک اصول منضبط ہے یعنی ادبی تخلیقات کا معاوضہ صرف انہیں غریب شعرا اور ادبا کو ملنا چاہیئے جو اس کے مستحق ہیں اور جو ہو بامعاشی اعتبار سے خود کفیل ہیں ان کو کسی صورت میں معاوضہ قبول نہیں کرنا چاہیئے۔ اس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے مبلغ پندرہ روپے کی رقم واپس ارسال خدمت کی جاتی ہے۔ آنجناب کے حسب منشا یہ رقم کسی مستحق ادیب یا شاعر کو دی جائے یا رائٹرز گلڈ کی جانب سے اُردو ادب کی ترقی و ترویج میں کسی مفید طلب کام پر خرچ کی جائے۔ بہرحال آنجناب کو ذاتی طور سے کلیتاً اختیار ہے۔ میری ادبی تخلیق کا معاوضہ مجھ کو کہیں زیادہ مل چکا ہے یعنی تمام ادبی حلقوں میں نظم بڑے انہماک سے پڑھی گئی ایک ادیب کا سب سے بڑا صلہ یہی ہے۔

محترم جناب طفیل احمد جمالی کی خدمت میں تسلیم نیاز۔ محترم سے میری ملاقات میرپور خاص کے مشاعرے میں ہوئی تھی اور جب سے اب تک وہ دل و دماغ پر منقوش ہیں۔

نیاز کیش
پیکر واسطی (علیگ)
میرپور خاص

نصیر احمد زبیری

چیکوسلواکیہ میں اُردو ادب اور اسکی تعلیم

چیکوسلواکیہ میں اُردو زبان کی مستقل تعلیم کا سلسلہ کچھ ہی عرصہ ہوا قائم ہوا ہے۔ اس سے قبل وہاں پر چند مہینوں کے کورسس ہوا کرتے تھے جو مختلف ہندوستانی طالب علم یا سفارت خانہ کے لوگ کھولا کرتے تھے۔ جن کا مقصد روپیہ کمانا اور آرام سے زندگی بسر کرنا ہوتا تھا۔ ان کورسیز میں اُردو یا ہندوستانی بولنی سکھائی جاتی تھی اور اردو ادب یا اس کی تاریخ پر کسی قسم کی روشنی نہیں ڈالی جاتی تھی، اکثر تو یہاں تک ہوتا تھا کہ ان لوگوں کو عربی رسم الخط سے بھی واقف نہیں کرایا جاتا تھا۔ ان کورسیز میں زیادہ تر ایسے لوگ آتے تھے جن کا تعلق تجارت سے تھا اور جو اکثر ہندوستان جایا کرتے تھے۔

مستقل اُردو پڑھانے کا انتظام ۱۹۴۹ء سے شروع ہوا۔ پراگ یونیورسٹی میں ہندوستانی زبانوں کا شعبہ پہلے سے موجود تھا۔ جس میں ہندی۔ بنگالی اور تلگو کی تعلیم دی جاتی تھی۔ مسعود علی خاں صاحب نے آنے کے بعد اُردو زبان کا شعبہ قائم کرانے میں بہت بڑا حصہ لیا اور آخیر میں ان کو کامیابی ہوئی۔ اُردو کا شعبہ ستمبر ۱۹۴۹ء میں پراگ یونیورسٹی میں قائم ہوگیا جہاں پر اُردو کی باقاعدہ تعلیم شروع ہوگئی۔ جس میں اُردو لکھنا اور پڑھنا سکھائی جاتی تھی اور اُردو ادب اور اس کی تاریخ پر لیکچر ہوتے تھے۔ اس کو کامیاب بنانے کے لئے صاحب نے ان ہندوستانی طالب علموں کی مدد حاصل کی جو ز عرصہ کے لئے پراگ میں مقیم تھے۔ اور جن کو اردو زبان اچھی سے آتی تھی اور ادبی معلومات بھی تھیں۔ ذاتی تعلقات کی بر اور دیگر ذریعوں سے اُردو کی کتابیں منگوائی گئیں۔ اس میں مسلم یونیورسٹی اور انجمن ترقی پسند مصنفین نے بہت مدد کی اور کے ذریعہ کافی کتابیں حاصل ہوگئیں۔ احتشام صاحب نے اس کام میں کافی دلچسپی لی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت پرا کی یونیورسٹی اور نیشنل انسٹی ٹیوٹ کا لائبریری میں ۵ ہزار۔ زائد اُردو کتابیں موجود ہیں۔ اور قدیم اور جدید ادب بہترین کتابیں وہاں پر دستیاب ہوسکتی ہیں۔

شروع میں مسعود صاحب کو اوران کے ساتھیوں کو مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہاں کی زبان میں کوئی اُردو گر کی کتاب یا ڈکشنری نہیں تھی۔ گرامر کی کتابیں جو لائبریری میں وہ یا تو جرمن زبان میں تھیں یا انگریزی میں اور یہ دونوں ز ان تمام طالب علموں کو نہیں آتی تھیں جنہوں نے اُردو میں دا لیا تھا۔ ڈکشنری کی کمی سوویٹ اور نیشنل اکیڈمی کی اُردو روسی اور روسی اُردو ڈکشنری چھاپ کر پوری کردی روسی ڈکشنری میں ۶۰ ہزار اردو کے لفظ ہیں اور یہ ڈکث

۱۹۵۱ء میں ماسکو میں سوویٹ اور نشیل اکیڈمی کی
ان سے چھپی ہے) لیکن گرامر کی کوئی کتاب عرصہ تک حاصل
نہ ہو سکی۔ تمام ہندوستانی طالب علموں نے مل کر اُردو گرامر کا
ایک سودہ تیار کیا۔ اور شروع میں اس سے اور اس اُردو گرامر
سے جو انگریزی میں تھی کام لیا گیا۔ تین چار سال بعد جب وہاں
کے طالب علموں کو اُردو زبان پر کافی عبور حاصل ہو گیا تو ان کی
مدد سے اور ایک چیک پروفیسر صاحب کی مدد سے جنھیں بنگالی
اور عربی زبان آتی ہے ایک اُردو - ہندی - ہندوستانی گرامر
یہاں کی زبان میں چھپوائی گئی۔ اور اب یہ بھی کمی پوری ہو گئی
ہے۔ اس طرح سے پہلی مرتبہ زبان کے علاوہ اردو ادب اور
اس کی تعلیم کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔

شروع ہی سے اس بات کا بھی انتظام کیا گیا کہ جو
ہندوستانی اور پاکستانی ادیب پراگ آئیں یا اس طرف سے
گزریں تو وہ یونیورسٹی آکر اردو زبان اور ادب پر لیکچر دیں۔
اس بات کی بہت خوشی ہے کہ اب تک جتنے بھی ادیب پراگ آئے
انھوں نے بہت خوشی سے آکر یونیورسٹی میں اُردو ادب کے مختلف
پہلوؤں پر تقریریں کیں وہاں کے طالب علموں سے اُردو زبان
میں بات چیت کی۔ اور اس طرح سے بہت فائدہ مند ثابت
ہوئے ان میں سے عصمت چغتائی۔ کرشن چندر۔ علی سردار جعفری
خواجہ احمد عباس خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اُردو شعبہ کو
اس یونیورسٹی میں مضبوط کرنے میں ان لوگوں کا بھی بہت بڑا
ہاتھ ہے۔ اس کے علاوہ ایک مرتبہ وہاں پر مشاعرہ بھی کرایا گیا
جس میں علی سردار جعفری اور مخدوم محی الدین نے اپنی نظمیں
پڑھیں اور ہندوستانی طالب علموں نے مختلف شعراء کا کلام
سنایا۔ اس مشاعرہ میں اُردو طالب علموں کے علاوہ یونیورسٹی کے
بھی بہت سے طالب علموں نے حصہ لیا اور یہ مشاعرہ اُردو کو
مشہور کرنے میں بہت کامیاب ثابت ہوا۔ اس مشاعرہ میں
یہاں کے طالب علموں نے ان نظموں اور غزلوں کے ترجمے بھی
سنائے جو انھوں نے خود کئے تھے۔

طالب علموں نے یونیورسٹی ہی میں اپنے استادوں کی مدد
سے اردو افسانوں وغیرہ کا ترجمہ وہاں کی زبانوں میں شروع
کر دیا تھا۔ (چیکوسلواکیا میں دو زبانیں بولی جاتی ہیں۔ چیک
اور سلواک۔ یہ دونوں زبانیں ایک دوسری زبان سے بہت
ملتی جلتی ہیں اور آپس میں ترجمہ کی بھی ضرورت نہیں ہوتی ہے
پھر بھی دونوں کا ادب اور تاریخ بالکل مختلف ہے) جو وہاں
کے مختلف رسالوں میں چھپے اور اکثر ریڈیو سے نشر کئے گئے
اس کے علاوہ طالب علموں سے مختلف شاعروں اور ادیبوں
کی زندگی پر اور ان کے ادب پر مضمون لکھوا گئے جو نیا
اورینٹ میں چھپے۔ نیا اورینٹ چیکوسلواکیا کے اورنٹیل انسٹی
ٹیوٹ کا رسالہ ہے جو ماہ میں ایک مرتبہ انگریزی۔ عربی۔ چیک
اور روسی زبان میں چھپتا ہے اور جس میں مختلف ملکوں کے
ادیبوں کے مضمون اور افسانے وغیرہ ہوتے ہیں نئی کتابوں پر
تبصرے بھی ہوتے ہیں اور دیگر ممالک کی ادبی خبریں بھی چھپتا
کرتا ہے۔ کچھ عرصہ سے اس بات کی کوشش ہو رہی ہے کہ یہ
رسالہ اُردو اور ہندی میں بھی چھپا کرے۔ اس سلسلے میں کچھ
دقتیں پیش آ رہی تھیں۔ امید ہے کہ جلد ہی ان دقتوں پر قابو پا لیا جائے
گا۔ اور آئندہ سال سے یہ رسالہ اردو اور ہندی میں بھی چھپنے لگے گا۔

اس طرح سے پانچ سال کی تعلیم کے بعد ۱۹۵۴ء میں جب
پہلے طالب علم جن کی تعداد پانچ تھی۔ اُردو کی ڈگری لے کر نکلے
تو وہ اُردو زبان سے مکمل واقف تھے اور اُردو ادب پر انھیں
کافی عبور حاصل تھا۔ ان طالب علموں میں سے ژان مارک خاص طور پر
قابل ذکر ہیں۔ جنھوں نے اُردو کے ساتھ فارسی کی بھی تعلیم حاصل کی۔
انھوں نے اپنا مقالہ اقبال کی شاعری اور اس کے فلسفے پر لکھا اس میں
انھوں نے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اگر اقبال کی شاعری
اور ان کے فلسفہ کو آج کی نظروں سے دیکھا جائے تو وہ دنیا کی مشکلات
کے لئے ایک بہترین حل ثابت ہو سکتا ہے۔ انھوں نے یہ ثابت کیا ہے
کہ اقبال دنیا کے بڑے شاعروں میں سے ایک ہیں لیکن ان کے کلام
کا ترجمہ نہ ہونے کی وجہ سے دوسرے ملکوں کے لوگ ان سے ابھی تک

واقف نہیں ہیں۔ ماریک صاحب نے پیام مشرق کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ جو پچھلے سال کے آخر میں کتاب کی صورت میں چھپ چکا ہے۔ کتاب میں ایک صاحب کا اقبال پر ایک چھوٹا سا مضمون ہے اور پیام مشرق کا چیک زبان میں نظم میں ترجمہ ہے۔ جو انھوں نے ایک نوجوان شاعر کے ساتھ مل کر کیا ہے آجکل وہ علامہ اقبال کی دوسری کتابوں کا ترجمہ کر رہے ہیں جو ۶۲ء کے آخر میں چھپے گا۔ اس کتاب کے چھپنے کی اجازت مل چکی ہے۔

اُردو ادب کی تعلیم کے ساتھ ساتھ قدیم اور جدید اُردو ادب کے ترجمہ کا کام بھی شروع ہوا۔ اور ان کو کتابوں کی صورت میں چھپوایا گیا اور صرف اخباروں ہی میں چھپوا کر کام نہیں چھوڑ دیا جیسا کہ اب تک ہوتا آیا تھا۔ اس سے پہلے بھی اُردو کتابوں کا وہاں کی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا تھا۔ یہ ترجمے چیک زبان میں زیادہ ملتے ہیں اور سلواک زبان میں بہت کم۔ چند سال پہلے تک وہاں کے لوگوں کو یہ بات نہیں معلوم تھی کہ ہندوستان میں مختلف قومیں ہیں۔ جن کی اپنی الگ الگ زبانیں ہیں۔ اور ان کا اپنا ادب اور کلچر ہے۔ اس وجہ سے تمام کتابیں ہندوستانی ادب کے نام سے چھپا کرتی تھیں اور پڑھنے والوں کو یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ یہ کس زبان کی کتاب ہے اور یہی حال اُردو کی کتابوں کا بھی تھا۔ چیک زبان میں ہندوستان کی بہت سی کتابوں کے ترجمے موجود ہیں۔ جن میں ٹیگور کی کتابیں، پریم چند کی گئودان، کرشن چندر کے افسانے۔ ملک راج آنند کی کتابیں۔ اور مہابھارت۔ رامائن وغیرہ شامل ہیں۔ لوگ ان کے لکھنے والے سے اچھی طرح سے واقف ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ یہ کس زبان میں لکھتے تھے یا لکھتے ہیں اس کے علاوہ یہ تمام ترجمے یا تو جرمن زبان سے یا انگریزی زبان سے ہوئے تھے۔ مثلاً ایک پرانے رسالے میں یہ خبر پڑھ کر مجھ کو بہت ہنسی آئی اور افسوس بھی ہوا کہ خواجہ احمد عباس صاحب بنگال کے رہنے والے ہیں اور زیادہ تر انگریزی میں اس لئے لکھتے ہیں کہ یورپ میں بہ آسانی مشہور ہو سکیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس وجہ سے اب یہ کیا گیا ہے کہ جس زبان کی کتاب ہوتی ہے وہ اسی زبان کے نام سے چھپتی ہے

اور اس بات کی انتہائی کوشش کی جاتی ہے کہ کتاب کا ترجمہ براہ راست اس زبان سے ہو جس میں وہ لکھی گئی تھی یہ بھی کیا گیا ہے کہ پہلی کتاب میں اس زبان کی تاریخ پر ایک مضمون بھی چھپوایا جاتا ہے تاکہ لوگ کتاب پڑھنے سے پہلے اس زبان سے واقف ہو جائیں جس زبان میں کتاب لکھی گئی تھی اور اس کو اچھی طرح سے سمجھ سکیں۔ سب سے پہلے جن اردو کتابوں کا چیک زبان میں براہ راست ترجمہ ہوا ان میں علامہ اقبال کی پیام مشرق اور کرشن چندر کے افسانے شامل ہیں۔

۱۹۵۵ء تک اُردو کتابوں کے جو تراجم ہوئے وہ صرف چیک زبان میں تھے۔ اس وجہ سے سلواک زبان میں اُردو کتابوں کے ترجموں کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ ۱۹۵۵ء سے آج تک چھ اردو کتابوں کا ترجمہ ہو چکا ہے اور وہ کتابوں کی صورت میں شائع ہو چکی ہیں۔ سب سے پہلی کتاب "خواب کے نام سے چھپی جس میں اُردو کے جدید مشہور شاعروں کی نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ ان شاعروں میں جوش۔ فیض۔ مجاز۔ ابن انشا۔ قتیل شفائی۔ علی سردار جعفری۔ احمد ندیم قاسمی۔ ساحر لدھیانوی۔ احمد راہی۔ قیوم نظر۔ خلیل الرحمٰن اعظمی۔ اختر الایمان۔ مخدوم محی الدین اور فراق گورکھپوری شامل ہیں۔

اس کے بعد خواجہ احمد عباس کے افسانوں کا مجموعہ "کہتے ہیں جس کو عشق" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے بعد مجاز کی "آہنگ"۔ کرشن چندر کی ناول "دل کی وادیاں سو گئیں" اور افسانے "میں انتظار کروں گا" اور اُردو کے مختلف افسانوں کا مجموعہ "آنندی" کے نام سے شائع ہوئے۔ فیض صاحب کی تینوں کتابوں کا ترجمہ تقریباً پورا ہو چکا ہے اور آئندہ سال کے شروع میں چھپ کر تیار ہو جائے گا۔

کئی مرتبہ غالب کے دیوان کے ترجمہ کی کوشش کی جا چکی ہے۔ لیکن آج تک مکمل ہو کر نہیں چھپ سکا ہے گرچہ ان کی چند غزلیں مختلف اخباروں اور رسالوں میں چھپ چکی ہیں اور ریڈیو سے نشر ہو چکی ہیں۔ غالب کی غزلوں میں بہت کم

لات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ جو ابھی تک حل نہیں ہو سکی
کچھ عرصے سے وہاں اس مسئلے پر کافی بحث ہو رہی ہے کہ غزل
ترجمہ میں کس بات کو ترجیح دینی چاہیئے۔ اور کن چیزوں کو
رکھنا چاہیئے۔ وہاں کی شاعری میں ردیف کا استعمال بھی
ہوتا ہے۔ اور جس نظم یا غزل میں ردیف آئے وہاں
نہیں بھی جاتی ہے۔ امید ہے کہ وہاں کے ادیب اس
کے سلسلے میں کسی نتیجہ پر پہنچ جائیں گے اور غالب کا کلام
چھپ سکے گا۔ غالب کے کلام کو چغتائی کی مصوری کے ساتھ
نے کا خیال ہے اور امید ہے کہ ۱۹۶۷ء کے آخر تک پورا
ائے گا۔

آئندہ پانچ سال کا پروگرام اُردو کتابوں کے ترجمے کا
ہو چکا ہے اور ادبی مجلس نے اس کو منظور بھی کر دیا ہے۔
ں جدید شاعروں کے مجموعے شامل ہیں اور تین ناولیں
ی تک طے نہیں ہوا ہے کہ کونسی ناولوں کا ترجمہ ہوگا۔ گرچہ
ت یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ ان ناولوں میں کرشن چندر
اول "شکست" شامل ہوگی۔ جدید شاعروں میں ساحر
یانوی۔ سردار جعفری اور فراق گورکھپوری کی کتابیں شامل
گی۔ آج کل نظیر اکبرآبادی کی نظموں کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ ایک
ایک کتاب اُردو ادب کی تاریخ پر لکھی جا رہی ہے جس
لئے ابھی کافی مواد کی ضرورت ہے اور اندازہ ہے کہ اس
ب کے چھپنے میں ابھی کافی دیر لگے گی چونکہ یہ کتاب ابھی
پہلی ہی منزلوں پر ہے۔

چند سال میں اُردو کی دس کتابوں کا ترجمہ چھپ چکا
ور اُمید ہے کہ ۱۹۶۹ء تک ان کی تعداد بیس تک ضرور
جائے گی۔ اس طرح سے چیکوسلواکیہ میں جہاں اب سے
سال کوئی یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اُردو زبان اور اس کا
کیا چیز ہوتی ہے کافی مشہور اور مقبول ہو گیا ہے۔ اُردو
ل جو وہاں چھپتی ہیں چند ہی دنوں میں فروخت ہو جاتی
مثال کے طور پر مجاز صاحب کی "آہنگ" سلواک زبان

میں ۱۸ سو کی تعداد میں چھپی تھی اور ایک ہفتہ میں تمام جلدیں
فروخت ہو گئی تھیں۔ کرشن چندر صاحب کی ناول "دل کی
وادیاں سو گئیں" ۲ ہزار کی تعداد میں چھپی تھی اور ایک ماہ کے
اندر فروخت ہو گئی۔ چیکوسلواکیہ کی آبادی صرف ۱۴ ملین کی
ہے اس میں سے ۴ ملین سلواک ہیں۔ اس سے لوگوں کو اس
بات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُردو ادب کس قدر مقبول ہو گیا
ہے اور پسند کیا جاتا ہے۔ اُردو ادب کی مقبولیت اور اس
کے پسند آنے کا اندازہ ان تبصروں سے بھی لگایا جا سکتا ہے
جو ان کتابوں پر وہاں کے ادبی رسالوں میں چھپے اور جو وہاں
کے بہترین تبصرہ نگاروں نے لکھے جن میں اُردو ادب اور
اس کے ادیبوں کی کافی تعریف کی گئی ہے۔

مسعود صاحب نے ۱۹۵۱ء میں جو کام شروع کیا تھا اور
جس کی کامیابی میں بہت سے لوگوں کو شبہ تھا وہ پودا اب جڑیں
پکڑ گیا ہے اور ایک مضبوط درخت میں تبدیل ہو گیا ہے۔
چیکوسلواکیہ میں اس وقت تقریباً ۳۰ سے زیادہ چیک اور
سلواک لڑکے ہیں جنہوں نے یا تو اُردو زبان کی تعلیم پوری
کر لی ہے یا کرنے والے ہیں۔ یہ طالب علم دوسروں کو زبان
پڑھا کر یا کتابوں کے ترجمے کر کے اُردو کی خدمت کر رہے ہیں۔
براتی سلاوا میں جو سلواکیا کا دارالسلطنت ہے۔ اورنٹیل
انسٹی ٹیوٹ کی شاخ کھل گئی ہے اور اُمید ہے کہ وہاں بھی جلد
اُردو کا شعبہ قائم ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ چیکوسلواکیہ کے
دوسرے شہروں میں بھی زبانوں کے اسکولوں میں اُردو کا شعبہ
کھولنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ وہ تمام لڑکے جو اپنی تعلیم ختم
کر چکے ہیں زیادہ تر یونیورسٹی میں اُردو کے شعبہ میں یا پھر
اورنٹیل انسٹی ٹیوٹ میں ملازم ہیں کچھ لڑکے ریڈیو اسٹیشن اور مختلف
ادبی رسالوں کے دفتروں میں نوکر ہیں۔ اور اُردو ادب کو
نشر کر کے اور اخباروں میں چھپوا کر عام اور مشہور کر رہے ہیں
ایک صاحب جو اورنٹیل انسٹی ٹیوٹ میں ملازم ہیں
اور لمینا صاحبہ جو ریڈیو اسٹیشن میں ملازم ہیں چھ ماہ ہندوستان

رہ آئے ہیں اور تقریباً تمام ہندوستان کا دورہ کیا۔ اور یونیورسٹیوں میں اردو میں تقریریں کیں۔ اور اُردو شاعروں کا کلام ان کے ترجمہ کے ساتھ پڑھ کر سُنایا۔ ان دونوں نے ہندوستان کے تمام اُردو کے ادیبوں سے ملاقات کی۔ اس دورے نے ان دونوں کے ارادوں کو اور بھی وسیع کر دیا ہے۔ جلد ہی چند اور لڑکے۔ لڑکیاں چھ ماہ کے واسطے ہندوستان جانے والے ہیں۔ اُمید ہے کہ وہ بھی واپسی پر اُردو کی خدمت اور زیادہ کریں گے اور یہ سفران لوگوں کے لئے کارآمد ثابت ہوگا۔

چیکوسلواکیہ میں اورنٹیل انسٹی ٹیوٹ بہت پرانا اور یورپ میں بہت مشہور اور مقبول ہے۔ اور اس کو بہت عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کا اثر دوسرے ملکوں پر بہت اچھا پڑا ہے برلن میں اُردو کا شعبہ قائم ہوچکا ہے اور وہاں پر دیگر لوگوں کے علاوہ ڈاکٹر محمد احمد انصاری جنہوں نے پراگ میں ڈاکٹری پڑھی ہے۔ اُردو ادب پر لیکچر دیتے ہیں۔ انکی بیوی تو چیک ہیں اور جنہوں نے پراگ میں اُردو کی تعلیم حاصل کی ہے برلن میں یونیورسٹی میں اُردو کے شعبہ میں ملازم ہیں اور اُردو کتابوں کا جرمن زبانوں میں ترجمہ کرتی ہیں۔ جرمنی کے دو لڑکے آج کل پراگ میں اُردو کے شعبہ میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ پولینڈ۔ ہنگری اور بلگیریا وغیرہ میں بھی اورنٹیل انسٹی ٹیوٹ قائم ہوچکے ہیں۔ لیکن وہاں پر اُردو نہ جاننے والوں کی وجہ سے ..... اُردو کا شعبہ ابھی تک قائم نہیں ہو سکا ہے۔ اس بات کی کوشش ہو رہی ہے کہ شروع میں ان ملکوں کے طالب علم بھی چیکوسلواکیہ میں آکر اُردو کی تعلیم حاصل کریں جیسے جرمنی کے دو لڑکے آجکل پراگ میں اُردو تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اُمید ہے کہ جلد ہی کوئی معقول انتظام ہو جائے گا اور وہاں پر بھی اُردو کے شعبے کھل جائیں گے۔ ان تمام ملکوں میں بھی اُردو ادب کافی مقبول ہے۔ لیکن ابھی جتنی کتابوں کا ترجمہ ہوا ہے وہ زیادہ چیک۔ سلواک یا روسی زبان سے ہوئے ہیں۔

اس مضمون میں روس کا ذکر اس وجہ سے نہیں کیا ہے کہ وہاں پر اُردو ادب کے لئے جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس قدر زیادہ ہے کہ اس کے لئے ایک الگ مضمون کی ضرورت ہے مختصر طور پر آجکل روس میں سات ہزار لوگ اُردو زبان کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں جس میں تمام پیشوں کے لوگ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ تقریباً تمام موجودہ ادیبوں کی کتابوں کا ترجمہ مکمل ہو چکا ہے اور وہاں پر اقبال کے کلام کا بھی ترجمہ بھی پورا ہو چکا ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ علی سردار جعفری نے بھی وہاں سے واپس آکر ایک مضمون لکھا تھا۔

اگر اسی طرح سے یورپ کے اور ملکوں میں بھی اُردو پر کام کیا جائے جیسا کہ چیکوسلواکیہ میں ہو رہا ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ چند سال میں اُردو مقبول اور مشہور ہو جائے گی۔ اس سلسلے میں ہمیں ان لوگوں کی مدد ضروری ہے کتابیں وغیرہ بھیج کر وہاں پر طالب علم بھیج کر اردو کی بہت بڑی خدمت کر سکتے ہیں۔

امجد اکیڈمی حیدرآباد دکن

نے فیصلہ کیا ہے کہ حضرت امجد حیدرآبادی کی ایک مبسوط سوانح عمری مرتب کی جائے جس کے لئے حضرت امجد کی زندگی ہی میں اور ان کے مشورے سے مواد اکٹھا کرنا شروع کر دیا گیا تھا۔ اس غرض کے لئے مرحوم کی ساری تصانیف اور متفرق نظمیں اور تحریریں جلد سے جلد جمع کی جا رہی ہیں تاکہ سوانح میں آپ کی گوناگوں ادبی اور شعری خدمات پر مفصل روشنی ڈالی جا سکے   اس سلسلے میں ایسے حضرات سے جن کے ہاں حضرت امجد کی تبرکات موجود ہیں درخواست کی جاتی ہے کہ وہ معتمد اکادمی کو پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب کے پتہ پر (صابت نگر۔ روبرو مسجد سلیمہ خاتون) اطلاع دیں۔

معتمدین :- عمر یوسفی
یوسف سرمست

آغا شاعر قزلباش دہلوی (مرحوم)

خلق کا محسن جفاکش مزدور

دشت و جبل لرزتے ہیں۔ مزدور ہے وہ ذات — ناممکن الوقوع ـــــ جسے عینِ ممکنات
جس کا لقب جہان میں حلّالِ مشکلات — ایسا قوی ارادہ کہ قدرت کا دہنا ہات
محسن سمجھ کے خلق کا ایسے جوان کو
اُجرت دو اس سے پہلے عرق اس کا خشک ہو

عفریت کار کو یہ ہی دم بھر میں دے پچھاڑ — چھاتی پہ بیٹھ جائے تو دو کر دے یہ پہاڑ
وہ حوصلہ ہے جڑ سے درختوں کو لے اُکھاڑ — دامانِ دشت پھینک دے دم بھر میں پھاڑ پھاڑ
اِس کے ہی حق میں آیۂ اُکملتُ آیا ہے
ماتھے کا جب پسینہ زمیں پر گرایا ہے

شاہنشہِ عمل ہے تو غیرت کی ہے یہ کان — ہے یہ ہی رُوحِ اِنس یہ انسانیت کی جان
یہ وہ ہے دوسروں کے لئے خود لہو لہان — مَردوں کا مَرد، بارکش و محنتی جوان
اس کا زیاں سبب ہے زمانے کے سُود کا
ہر شخص مُرتہن ہے اسی کے وجُود کا

گیتی ہو، پھاوڑہ ہو کہ تیشہ ہو یا قلم! — سب ایک ہے برادری مزدُور سب ہیں ہم
مقصد جفاکشی ہے ہمارا قدم قدم! — جو یہ نہیں تو ناکس و نامَرد ہے وہ دم
جو شخص جی چرائے گا محنت کے نام سے
قطرہ نہ پائے گا وہ مسرت کے جام سے

مصطفےٰ زیدی

آدمی

مجھ کو محصور کیا ہے مری آگاہی نے
میں نہ آفاق کا پابند نہ دیواروں کا
میں نہ شبنم کا پرستار نہ انگاروں کا
اہلِ ایقان کا حامی نہ گنہگاروں کا
نہ خلاؤں کا طلب گار نہ سیاروں کا

زندگی دُھوپ کا میدان بنی بیٹھی ہے
اپنا سایہ بھی گریزاں ترا داماں بھی خفا
رات کا رُوپ بھی بیزار چراغاں بھی خفا
صبحِ یاراں بھی خفا، شامِ غریباں بھی خفا
دُزدِ ایماں بھی خفا اور نگہباں بھی خفا

خود کو دیکھا ہے تو اس شکل سے خوف آتا ہے
ایک مُبہم سی صدا گنبدِ افلاک میں ہے
تارِ بے مایہ کسی دامنِ صد چاک میں ہے
ایک چھوٹی سی کرن مہر کے اِدراک میں ہے
جاگ اے رُوح کی عظمت کہ مری خاک میں ہے

ڈاکٹر وزیر آغا

مُلاقات

پَوَن چلی
اور شب کی کنواری گھاس کے آنسو بکھر گئے
نرم مُلائم آنچل پر شبنم کے موتی لرز گئے
سبز گپھا میں گُم سُم بیٹھے
پھُول ایسے نازک پنچھی کے
پنکھ سنہری ڈول گئے!

پَوَن چلی
کچھ ہولے ہولے، خود سے لجاتی
ہر کھٹکے پر رُک سی جاتی
ننگے پاؤں، شب کی کنواری — گھاس پہ چلتی
پیڑ کے نیچے آن رُکی!

پیڑ کے نیچے
تنہائی کی گھور گپھا میں تم بیٹھے تھے
تھکی تھکی پلکوں سے تمہاری اوس کے موتی چمٹے تھے
پَوَن رُکی — سب بکھر گئے!!

قمر ہاشمی

جزیرے

ہر ایک لمحہ گریزاں ہے، ذہن آوارہ
بھٹک رہا ہوں خیالوں کی شاہراہوں پر
سسک رہا ہے مری انگلیوں میں جو سگرٹ
یہ چاہتا ہے کہ ہو جائے خاک میری طرح
وہ اک جزیرہ جو آباد ہے تخیل میں
اُبھر کے ڈوب گیا، ڈوب کر اُبھر آیا
کسی طویل سے کس کا حسین مرغولہ
اُبھارتا ہے جزیرے کا پیکرِ محسوس
وہ خوابناک سی شامیں

وہ کیف بار سحر
مسرتوں نے جہاں اپنی آنکھ کھولی تھی
وہیں جہاں پہ حسیں گوپیوں کی ٹولی تھی
وہیں جہاں کبھی رادھا کا ناچ ہوتا تھا
وہیں جہاں پہ بجائی تھی کرشن نے بنسی
ابھی ابھی کسی دوشیزۂ بہار نے بھی
کیا رقصِ بہاراں
دھنک کے سائے میں
کسی پہاڑ کے دامن میں آگ روشن ہے
اسی میں دامنِ دل، دامنِ سکوں ہیں تپاں
وہ ایک شعلۂ نمناک

جو حیات بھی ہے
پگھل رہا ہے سرِ کوہسارِ غم اب تک
مری نگاہ سے پنہاں ہے جامِ جم اب تک

منیر نیازی

۱

ساحلی شہر میں ایک رات

روشنیاں ہی روشنیاں اور نوحے تھکے جہازوں کے
بارش میں جادو کے منظر کھلے ہوئے دروازوں کے
کسی جتن سے بھی نہیں مانا
دل کو دکھایا بیتے دن کے ہنگاموں کا تماشہ بھی
شہر ہے سارا پتھر جیسا
میرا بھی دشمن ہے یہ اور اُس کے لہو کا پیاسا بھی
میں بھی اپنی سوچ میں گم ہوں
پاگل ہو کر ناچ رہی وہ ہوٹل کی رقاصہ بھی

ساقی فاروقی

ایک سُنسان دوپہر

نئے زخموں سے بدحواس زمیں
اپنی پیاسی زباں نکالے ہوئے
چیختی ہے کہ زندگی کا لہو؛
ایک نادیدہ آسمانی بلا؛
چاٹتی جا رہی ہے ——— اس کی صدا
اپنی ہی گونج سے اُلجھتی ہوئی
لَوٹ جائے گی، جس کے بعد وہی
ہفت افلاک سے برستی آگ
تیز رفتار ماہ و سال کی گرد
اور لمحوں کا وحشیانہ رقص!!

ن ایلیاہ

شہرِ محنت کی شاہراہوں پر
گرم و پُرشور دوپہر کے وقت
پھر رہا ہے اک اجنبی تنہا
دِل کے ہر زخم کو بھُلائے ہوئے

اور بہت دُور ان دیاروں سے
ایک ویران گھر کے آنگن میں
چیختی ہے خزاں کی تنہائی
اُڑتے پھرتے ہیں نیم کے پتّے
اور کوئی کسی کے ساتھ نہیں

شاد عارفی

مندر کا تصور کہ خمستاں کے ارادے
ہر پھر کے وہی کوچۂ جاناں کے ارادے

یہ عہدِ بہاراں یہ بیاباں کے ارادے
کیا جانیے کیا ہیں دلِ ناداں کے ارادے

جب فائدہ سیرِ چمن ہم نے اٹھایا
بیدار ہوئے چاک گریباں کے ارادے

تبدیلیٔ حالات کا پاتے ہی اشارہ
ڈھل جاتے ہیں شعروں میں سخنداں کے ارادے

یہ شاخِ نشیمن۔ یہ جھکولے۔ یہ تھپیڑے
مائل بہ عمل ہیں کسی طوفاں کے ارادے

کہتے ہیں کہ اربابِ طرب جان چکے ہیں
ہوتے ہیں جو اک بے سر و ساماں کے ارادے

کیا شرکتِ محفل سے ہمیں روک سکیں گے
دربان کے تیور کہ نگہباں کے ارادے

الجھے ہوئے حالات سدھر جائیں سنور جائیں
پا جائیں اگر زلفِ پریشاں کے ارادے

یہ چاند یہ تارے۔ یہ فضا کچھ بھی نہیں ہے
اونچے ہیں بہت عالمِ امکاں کے ارادے

بگڑی تھی جہاں عزمِ زلیخا کی طہارت
سنبھلے تھے وہاں یوسفِ کنعاں کے ارادے

اے شاد قیامت ہے کہ اربابِ ادب سے
محتاجِ تعارف ہیں غزل خواں کے ارادے

فارغ بخاری

آج کب لوگ فقط وہم و گماں چاہتے ہیں
چاہنے والے ہر اک چیز عیاں چاہتے ہیں

جو کبھی جلوۂ موہوم میں کھو جاتے تھے
اب وہ عشاق بھی احساس جواں چاہتے ہیں

آشیانوں میں سلگنا جنہیں مرغوب رہا
آج وہ تنکے بھی اک برق تپاں چاہتے ہیں

زندگی جن کی بہاروں کی تمنا میں کٹی
ان پہ یاروں کو گماں ہے کہ خزاں چاہتے ہیں

کوئی کیونکر انھیں شبنم کی ردا پہنائے
وہ خیالات جو شعلوں کی زباں چاہتے ہیں

سرِ پر شور سلامت ہے زمانے سے کہو
فارغ اک اور ابھی سنگِ گراں چاہتے ہیں

جمیل ملک

○

جو ہم نہ ہوں تو ترا اعتبار کون کرے !
نگارِ بزمِ سخن، تجھ سے پیار کون کرے !
فراق میں بھی ہے اک لذّتِ وصالِ دوام
مگر یہ طرزِ ستم اختیار کون کرے !
جو مانگنے کیلئے جائیں، بھیک بھی نہ ملے
وفا کی بات، سرِ کوئے یار کون کرے !
ہم آج اپنے کئے پر ہیں آپ شرمندہ
نگاہِ دوست تجھے شرمسار کون کرے !
اگر ہو رات، تو آنکھوں میں کاٹ لیں ہم لوگ
سحر سے تا بہ سحر انتظار کون کرے !
بہار ہو تو نظر آئیں رنگ رنگ کے پھول
خزاں کے دل میں تلاشِ بہار کون کرے !
وہ بے نیاز سہی، سرفراز ہیں ہم بھی
جمیل عرضِ طلب بار بار کون کرے !

شاہد عشقی

○

لطف سے تیرے سوا درد مہک جاتا ہے
یہ وہ شعلہ ہے، بجھاؤ تو بھڑک جاتا ہے
اک زمانے کو رکھا تیرے تعلق سے عزیز
سلسلہ دل کا بہت دُور تلک جاتا ہے
تم مرے ساتھ چلے ہو تو مرے ساتھ رہو
کہ مسافر سرِ منزل بھی بھٹک جاتا ہے
ہم تو وہ ہیں ترے وعدہ پہ بھی جی سکتے ہیں
غنچہ، پیغامِ صبا سے بھی چٹک جاتا ہے
راس آتی ہے تری یاد کو تنہائیٔ شب
درد کچھ رات گئے اور مہک جاتا ہے
مستیٔ شوق سنبھلنے نہیں دیتی عشقی
جام لب تک نہیں آتا کہ چھلک جاتا ہے

سحر انصاری

کس حال میں ہے یارِ ستمگار، کچھ کہو
اے ساکنانِ کوچۂ دلدار! کچھ کہو

فصلِ بہار آئی ہے، اس بار کچھ کہو
ہر سانس میں ہو کیوں خلشِ خار، کچھ کہو

بے کیف ہی سہی غمِ دنیا کی داستاں
ہے پھر اُداس اُداس دلِ زار، کچھ کہو

میں زیرِ بارِ سایۂ دیوارِ یار ہوں
میرا نفس نفس ہے گرفتار، کچھ کہو

دنیا سکوت ہی کو سمجھ لے نہ جرمِ عشق
آئے ہو کس خطا میں سرِ دار، کچھ کہو

کب تم نے مجھ کو حوصلۂ آرزو دیا
بڑھنے لگی ہے تہمتِ اغیار، کچھ کہو

بُت بھی ہے بے نیاز، خدا بھی ہے بے نیاز
دَیر و حرم میں کون ہے غم خوار، کچھ کہو

یارو! تمھارے حرفِ تسلی کو کیا ہوا
ہر زخمِ دل ہے دیدۂ خوں بار، کچھ کہو

اے اہلِ مصر! ہے کوئی دیوانۂ نگاہ
بکتا ہے حسن پھر سرِ بازار، کچھ کہو

کب تک غریبِ شہرِ تمنا رہوں سحرؔ
اک ہم زباں کا دل ہے طلبگار، کچھ کہو

یوسف جمال انصاری

ہر چند ترے پیار پہ اترائے ہوئے ہیں
ہم تجھ سے نہ ملنے کی قسم کھائے ہوئے ہیں

جانا ہی جانا تھا کہ پہنچے ترے دل تک
آنا ہے یہی آپ میں ہم آئے ہوئے ہیں

وہ کونسی تہمت ہے جو ہم پر نہ لگی ہو
ہم کونسا انعام نہیں پائے ہوئے ہیں

یاں آپ میں آنا بھی تو ہے آپ سے جانا
کیوں خود کو ہم اپنے ہی میں الجھائے ہوئے ہیں

اُمیدِ سحر کیا کہ بقدرِ نگہِ شوق
گیسوئے شبِ تار بھی لہرائے ہوئے ہیں

لوٹے گا بھی وہ تیر جو نکلا ہے کماں سے؛
کھلتے بھی ہیں وہ پھول جو مرجھائے ہوئے ہیں

پیتے ہیں تو کیوں نشے کا عرفاں نہیں ہوتا
جیتے ہیں کہ جینے کی سزا پائے ہوئے ہیں!

سینے میں دھڑکتے ہیں وہ بے گائے ہوئے گیت
الفاظ کی زد پر جو نہیں آئے ہوئے ہیں

مستِ مئے تخئیل ہیں لمحات و مناظر
یہ بھی مرے اشعار کے ہمسائے ہوئے ہیں

جعفر شیرازی

○

بجلی کڑکی، بادل گرجا میں خاموش رہا
اس کہرام میں بھی اے دُنیا میں خاموش رہا

صبح کی چاپ نے مجھ کو صدا دی میں نے بات نہ کی
شام کی چُپ نے مجھ کو پکارا میں خاموش رہا

کتنے گیت بکھیرتے موسم میرے سامنے آئے
میں تھا جاتی رُت کا سایا میں خاموش رہا

گزرے میرے پاس سے ہو کر شور بھرے میلے
سیلِ حوادث تُو نے دیکھا میں خاموش رہا

بکھرے میرے گرد سنہری آوازوں کے جال
میرے لبوں پر چُپ کا پہرا میں خاموش رہا

کتنے پانی سر سے گزرے میری زباں نہ کھُلی
ساحل ساحل دریا دریا میں خاموش رہا

جعفر دیکھ کے دَرد بڑھاتی زندگیوں کے سمے
بیت گئی اس دل پر کیا کیا میں خاموش رہا

اقتدار قدر

○

ضیائے صبحِ طرب ہے نہ ظلمتِ شبِ غم
تری تلاش میں پہنچے یہ کس مقام پہ ہم

وہیں پہ سجدۂ اخلاص کر لیا ہم
جہاں بھی رُکنے لگے راہِ جستجو میں قد

اسی خیال میں ہم کھوئے کھوئے رہتے ہیں
کسی کی چشمِ عنایت کا کھُل نہ جائے بھرم

ہم اہلِ دل ہیں رموزِ حیات سے واقف
خدا سمجھ کے بھی پُوجے ہیں چلتے پھرتے صن

نہ آئے ہم کبھی پیرِ مغاں کی باتوں میں
تمام عمر کیا احترامِ شیخِ حرم

طلسم گاہِ جمالِ حیات تیرے بغـ
ہے اک اُجاڑ سا ویرانہ تیرے سر کی قـ

لگائے پھرتے ہیں سینے سے سب غمِ عشرت
کسے نصیب زمانے میں قدرِ عشرتِ غم

رام لعل

دو گھروں کی کہانی

اپنی ازدواجی زندگی کے چھ سالوں میں پہلی بار جینو بترا نے اس بات کا اعتراف کیا کہ اس نے ریلوے کے گارڈ چمن بترا کے ساتھ شادی کرکے واقعی سخت غلطی کی تھی۔ ایسی غلطی کہ جس کی کوئی تلافی نہیں ہو سکتی تھی۔ پچھلے چھ سال کے واقعات نے نہ صرف اس کے دل و دماغ پر گہری خراشیں لگا دی تھیں بلکہ ان کے واضح اثرات بھی اس کے چہرے پر سے دیکھے جا سکتے تھے۔

وہ صرف تیئس سال کی تھی۔ تیئس سال اور نو دن کی۔ بہت آہستہ اور رک رک کر باتیں کرنا اس کی عادت میں داخل تھا۔ لیکن اب وہ بولتی تھی تو اس کے انتہائی دکھی اور حساس ہونے کا پتہ چل جاتا تھا۔ پہلے اس کے رک رک کر بولنے کے انداز میں جذبات کی ایک فراوانی سی موجود رہتی تھی۔ اب اس کی جگہ ایک عجیب سی احتیاط نے لے لی تھی۔ جیسے اب وہ صرف وہی کچھ کہے گی جس کی اسے ضرورت ہے۔ بلا ضرورت ایک لفظ بھی ادا نہیں کرے گی۔ بلا ضرورت کوئی حرکت بھی نہیں کرے گی۔ نہ مسکرائے گی، نہ مڑ کر دیکھے گی، نہ ہی کسی پر اپنی نظر غلط انداز تک ڈالے گی جس کے سامنے بڑے بڑے ثابت قدم بھی لڑکھڑا جاتے تھے۔

جس وقت اس نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کا اعتراف کیا اس دن وہ اپنے میکے میں اپنے بڑے بھائی دینا ناتھ ملہوترا کے سب سے چھوٹے لڑکے ٹومی کے 'برتھ ڈے' میں شامل ہونے کے لئے گئی ہوئی تھی۔ شہر میں موٹروں اور سائیکلوں کے سب سے بڑے ڈسٹری بیوٹرز ملہوترا کی کوٹھی کے وسیع اور قسم قسم کے پیڑوں اور پودوں کی خوشبوؤں سے مہکتے سرسبز لان میں سینکڑوں مہمان جمع ہو چکے تھے۔ پر لطف باتوں اور اونچے قہقہوں سے پوری فضا گونج رہی تھی۔ خوش نما چہروں، رنگ برنگی ساڑیوں، ڈوپٹوں اور اعلیٰ تراش کے کوٹوں اور سوٹوں کی ایسی افراط تھی کہ کسی ایک پر نگاہ ٹھہرانا مشکل تھا۔ لیکن کوٹھی کے ایک تنہا کمرے میں اپنے پانچ سال کے بچے ککی کی نکر کے بٹن بند کرتے وقت جینو بترا کا دھیان بار بار اپنے شوہر کی طرف جا رہا تھا جو ابھی تک وہاں نہیں پہنچا تھا اور اسے یقین تھا وہ وہاں آئے گا بھی نہیں۔ کبھی نہیں آئے گا۔ چھ سال کے عرصے میں وہ صرف دو تین بار ہی اس گھر میں آیا تھا۔ جو اعتراف وہ اپنے ماں باپ بھائیوں اور بہنوں کے بار بار طعنے دینے کے باوجود نہیں کر سکتی تھی وہ آج اس سے بے ساختہ ہی ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے سے کہا تھا — "تیرے ڈیڈی بہت برے ہیں۔ بہت ہی برے ککی!"

اس نے یہ بات انتہائی دکھی ہو کر کہی تھی۔ کہتے کہتے

اس کی آنکھوں میں آنسو بھی اُمڈ آئے تھے۔ جیسے ہوا کے تیز تیز
جھونکوں سے ساون کی بدلیاں آناً فاناً پورب سے پچھم جا
پہنچیں۔ اس وقت اس کے جسم پر سفید جارجیٹ کی سنہرے بارڈر
والی ساڑھی تھی۔ بال سنوارنے میں اس نے بڑی لاپروائی سے
کام لیا تھا۔ لیکن پھر بھی اس کی لمبی گردن کے پیچھے سیاہ
ریشمی بالوں کی ڈھیری بہت دلکش معلوم ہو رہی تھی۔

اس کا جی دعوت میں شامل ہونے کو نہیں چاہ رہا تھا۔
پھر بھی وہ لان پر پہنچ گئی۔ وہ میکے میں اسی مقصد کے لئے ہی
گئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی پروفیسر بھرڈوچہ کی مسز اپنی جگہ سے
اٹھ کھڑی ہوئیں اور حیران ہو کر بولیں۔ "مینو، تمہیں کیا ہوا؟
تم بہت 'ویک' دکھائی دے رہی ہو!!"

اشوکا مین، ارشاد ابلاغ اور سوشیلا بھوٹانی نے بھی
اسے گھیر لیا۔ اس سے طرح طرح کے سوالات پوچھے۔ سوشل
اجتماعات میں شامل نہ ہونے پر، بیمار دکھائی دینے پر اور —
اور اس کے بعد 'ہنی' مچن ہترا کے آج اس تقریب میں موجود نہ
ہونے پر!

وہ کسی کے سوال پر تو صرف مسکرا دیتی اور کسی کو مختصراً
جواب دے کر مطمئن کرنے کی کوشش کرتی۔ کسی کا دھیان بالکل
ہی دوسری طرف پھیر دینے کے لئے وہ اس کے کانوں یا گلے
میں پہنے ہوئے زیورات کی تعریف کرنے لگتی تھی۔

"اوہ! ہاؤ لولی!! کتنا پیارا 'پیس' ہے! معلوم ہوتا ہے
ابھی ابھی کسی 'فارن لینڈ' سے امپورٹ ہوا ہے۔"

"مسز سنہا! تمھاری ساڑھی کا یہ 'کلر' تمھارے اُداس
چہرے پر بہت کھل رہا ہے!"

"اوہ، ہیلو مسٹر دارجی! کہئے آج آپ کی مسز کہاں ہیں؟
کیا پنجاب گئی ہوئی ہیں؟ تب تو آپ بہت 'لونلی فیل' کرتے
ہوں گے!"

رنگ و بو کے ہجوم میں اس سرے سے اس سرے تک
وہ اسی قسم کے جملے کہتی ہوئی گھوم گئی۔ جب اس کی شادی نہیں ہوئی

ہوئی تھی وہ ایسی پارٹیوں کی سب سے بڑی دلکشی ہو
جب سے اس نے سولھویں میں قدم رکھا تھا ممی ا
اسے خاص طور پر لوگوں سے متعارف کرانے کے لئے
لے جاتے رہے تھے۔ جیسے آج سولن بروری کا بوڑھ
دختر شہلا اسلام کو ڈپٹی کلکٹر خورشید کے ساتھ لا
چالیس برس کا سرخ و سفید ڈپٹی کلکٹر شہلا اسلام ک
اور دوپٹے کے دلفریب رنگوں کے علاوہ اس کے جد
تراشے ہوئے بالوں کو بھی بڑی گہری نظر سے دیکھے جا ر
ایک میز پر اُس کی چھوٹی بہن سیما ممنوع کے
کسی گہری گفتگو میں کھوئی ہوئی تھی۔ دونوں ایک دو
محبت کرتے تھے۔

اس کی اونچے قد کی حسین و جمیل بھابی کتھئی ر
ساڑھی میں اپنے شوہر کے ساتھ گیٹ پر کھڑی آنے
کا سواگت کر رہی تھی۔ ایک ایشیائی ملک کے محکمہ اطلا
ایک افسر کی یورپین بیوی ہندوستانی لباس سا
بلاؤز پہنے چلی آ رہی تھی۔ لیکن اس کے سنہرے بال
انداز سے اس کے ماتھے اور شانوں پر لہرا رہے تھ
لوگوں کی نگاہیں اسی کی طرف بے اختیار اُٹھنے لگی تھ

لان میں مہمانوں کی میزوں کے بیچوں بیچ بچا
قریب بچے جمع تھے۔ ایک میز پر ٹوم کو ملے ہوئے
کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ دوسری میز پر نئے ماڈل کی ایک
کا ایک خوبصورت کیک بنا ہوا رکھا تھا۔ کیک کے
پُرزے میٹھے اور لذیذ تھے جو سب بچوں میں تقسیم
والے تھے۔

مینو ہترا کی نظر اپنے بیٹے ٹکّی پر جا پڑی جو سب
سے الگ تھلگ ایک کرسی کی پشت پر اپنے دانت
بڑی اُداس نظروں سے اس کیک کی طرف دیکھ رہا
جلدی سے اس کے پاس گئی۔ اسے پیار کیا۔ پچکارا۔
کے درمیان لے جا کر وہاں چھوڑنے کی کوشش کی

...ں!!! تو اسے انگلی سے تھام کر باہر لے گئی۔ وہ بجلی کی اداسی
...ب جانتی تھی۔ اس کے کسی جنم دن پر نہ کبھی اتنا بڑا اجتماع
...تھا نہ ہی اتنا بڑا اور دلکش کیک آیا تھا۔
...یونے اس کا دھیان بجلی کے رنگ برنگے قمقموں کی
...لے جانا چاہا۔ بڑے بڑے پودوں کے اندر جگمگاتی
...دھیانی ٹیوبوں کی طرف۔ اور دور تک کھڑی لمبی کاروں
...ہوئی کتنی ساری موٹروں کی طرف۔
"بجلی دیکھ تو! یہ کار کتنی لمبی ہے!"
"بجلی گن تو! یہ سب کاریں کتنی ہوں گی؟"
یکایک اس نے محسوس کیا وہ بجلی کی بجائے خود اپنا
...ہلانے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ ہجوم کے اندر کھڑی نہیں
...ی تھی۔ تنہا ہوجاتی تو خود کو پھوٹ پھوٹ کر رونے سے
...رکھ سکتی۔ اب بھی وہ اپنے آنسوؤں کا باندھ بمشکل تمام
...ے کی سے پوچھ رہی تھی —— "تو گنتی کیوں نہیں سناتا!
...ون، ٹو، تھری —— !"

دعوت ختم ہوجانے کے بعد وہ ماں باپ کی کار میں ہی
...ل گھر سے روانہ ہوئی۔ اس کے پاس مٹھائیوں کے دو بڑے
...پیکٹ تھے۔ وہ جانتی تھی چمن ان ڈبوں کو دیکھتے ہی بھڑک
...گا۔ انہیں اس کے ہاتھ سے چھین کر دیوار یا فرش پر دے
...گا۔ وہ اس کی میکے سے لائی ہوئی کوئی چیز دیکھ کر یا اس کے
...باپ کا ذکر سنتے ہی ایک عجیب سے غصے کا شکار ہو جاتا تھا
...چہرہ سرخ ہو جاتا۔ گھر کی چیزوں کو توڑنے پھوڑنے
...اس کے ہاتھ بے چین ہو اُٹھتے۔ اسے لے جانے کے لئے
...کے ماں باپ کے گھر سے تیسرے چوتھے دن کار آجاتی
...چمن اس بات کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ وہ وہاں چھپ کر
...جب چمن گھر میں نہ ہوتا۔ گاڑی کے ساتھ کہیں باہر
...وا ہوتا۔ لیکن پھر بھی اسے کسی نہ کسی طرح معلوم ہو جاتا
...اس وقت وہ اسے بھی کوستا اور اپنے سسرال والوں

بک دیتا تھا۔ ان کی کہیں بھی برائی سنتا تو اس کا چہرہ ایک عجیب
سی مسرت سے چمکنے لگتا تھا بسیا اور منوج کے قصے کو وہ بڑھا
چڑھا کر اپنے دوستوں میں سناتا رہتا تھا۔ تاکہ ان کی اور زیادہ
رسوائی ہو۔

یہ وہی چمن تھا جس کے ساتھ اس نے اپنے سارے خاندان
کی مخالفت کے باوجود شادی کرلی تھی۔ صرف اس لئے کہ وہ اسے
پسند کرنے لگی تھی۔ اس سے محبت کرنے لگی تھی۔ وہ اسے دیکھتے
ہی اس کی ہوکر رہ گئی تھی۔ نینی تال کے فلیٹس پر وہ کئی لڑکیوں
کے ساتھ بین الصوبائی فٹ بال ٹورنامنٹ کا فائنل دیکھنے کے
لئے گئی ہوئی تھی۔ وہ خود بھی ٹینس کی کھلاڑی تھی۔ ٹینس کے
کھیل میں کتنے خوبرو نوجوان اس کے پارٹنر بن چکے تھے، لیکن
اس کی نظر میں کوئی اور نوجوان اس قدر نہیں جچ سکا تھا جتنا
نادرن ریلوے کا فارورڈ کھیلنے والا چمن۔ ایک اونچے پیڑ کی
طرح ایستادہ اور مضبوط۔ کسی پہاڑ کی طرح پھیلے ہوئے اس
کے شانے۔ اور گھٹنوں تک پہنچنے والے لمبے لمبے بازو ——
جن کے حصار میں نہ جانے کیا کچھ نہیں آسکتا تھا! ایک دنیا،
پوری دُنیا۔ لیکن اس نے چمن کو دیکھ کر خود کو ساری دنیا کے
مقابلے میں بہت ہی حقیر اور چھوٹا محسوس کیا تھا۔ چمن کے
ہونٹوں پر ہمیشہ ایک عجیب مسحور کردینے والی مسکراہٹ کھیلتی
رہتی تھی۔ جیسے وہ ہونٹ بھینچ کر بھی رکھتا تب ان کے کسی
نہ کسی گوشے سے مسکراہٹ پھسل ہی پڑتی تھی۔

کھیل کے شاندار خاتمے پر جس کا سہرا چمن کے سر ہی
بندھا تھا وہ دوسری سب لڑکیوں کے بالکل پیچھے ہاتھ میں
آٹوگراف بک اور پن لئے کھڑی یہ سوچ سوچ کر کانپ
رہی تھی، نہ جانے چمن مجھے کس نگاہ سے دیکھتا ہے، میری
طرف دیکھتا بھی ہے یا نہیں! اگر چمن نے مجھے گھور کر دیکھا تو
میں تو بیہوش ہوکر گر پڑوں گی۔ میں آٹوگراف لئے بغیر ہی
کیوں نہ بھاگ جاؤں؟

دھکا دے کر باقی سب لڑکیوں سے آگے کر دیا۔ اور چمن بھی اپنے سامنے
ایک سترہ سال کی سمندر کی طرح گہری اور نیلی آنکھوں والی دبلی پتلی
لڑکی کو دیکھ کر چونک اٹھا تھا۔ گھبراہٹ کے مارے اس سے اپنے
ماتھے پر بار بار اڑتی ہوئی بالوں کی آوارہ لٹیں ہی نہیں سنبھالی
جا رہی تھیں۔ وہ اسے گھورتے گھورتے بڑی بے رحمی سے ہنس
پڑا تھا۔ اور اس کے ہاتھ سے آٹوگراف بک لے کر اس پر ایسی
بے نیازی سے قلم گھمایا تھا کہ مینو کو اپنی آنکھوں کے سامنے ہر
چیز گھومتی ہوئی دکھائی دینے لگی تھی۔ جیسے اوپر کی چیزیں نیچے
پہنچ جائیں اور نیچے کی اوپر۔ وہ تو خیر ہوئی کہ لڑکیاں اسے چھیڑتی
اور ہنستی ہوئی ہجوم میں سے باہر نکال کر لے آئیں ورنہ وہ تو
وہیں مر ہی چلی تھی۔

لیکن کچھ روز بعد اسی نینی تال میں وہی مینو ملہوترا اپنے
خاندان کی دولت و عزت کا سارا پندار بھول کر دو اڑھائی
سو روپے ماہوار تنخواہ پانے والے نچلے متوسط طبقے کے ایک
ریلوے گارڈ کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے اس کے پہلو بہ پہلو چلتی
ہوئی دکھائی دینے لگی تھی۔ ورجینا وُلف، جیمز جوائس اور ٹیگور
اور کرشن چندر کا ادب پڑھنے والی لڑکی سرسبزے سے ڈھکے
ہوئے اور گہرے سایوں میں ڈوبے ہوئے پہاڑوں کے نشیبوں
میں چمن بترا کے پاس بیٹھ کر گھنٹوں بڑی دلچسپی سے اس کی گاڑیاں
چلانے اور انھیں کنٹرول کرنے، مسافروں کی دھکا پیل سے
کامیابی کے ساتھ نپٹنے اور اپنے افسران بالا کی بیجا سختیوں کی
عجیب و غریب داستانیں سننے لگی تھی۔ اس کی نظر میں چمن ہی
ایک مکمل مرد تھا۔ مردوں کی دنیا کا واحد مرد جس کی غلام بننے
میں وہ فخر محسوس کر سکتی تھی۔ اسے دیکھتے ہی وہ بالکل پسپا ہو کر
رہ گئی تھی۔ وہ اس طرح پسپا ہرگز نہ ہوئی ہوتی اگر وہ اس سال
نینی تال نہ گئی ہوتی۔ وہاں جا کر چمن سے نہ ملی ہوتی۔ اس کے
اپنے ماحول میں کئی لڑکے تھے۔ جو اس کا ہاتھ تھامنے کے لئے
بے قرار رہتے تھے۔ لیکن ان میں سے ایک بھی تو ایسا نہیں تھا
جیسا چمن تھا۔ وہ چمن کو اپنے ماحول میں لے جا کر ان سب کو شکست

دینا چاہتی تھی۔ چمن اپنی پرشکوہ شخصیت کی بدولت اس کے
میں اپنے لئے ایک قابل احترام جگہ بنا سکتا تھا۔ چمن بھی
بے پناہ چاہتا تھا۔ پانچ فٹ کی دبلی پتلی اور ربڑ کی ما
و نازک عورت نے اپنے پیار سے اس دراز قامت شخصیت
لئے ایک ماہی بے آب کی طرح بے چین کر رکھا تھا۔ وہ ا
بغیر ایک پل بھی چین سے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اس کے لئے
ہی سب کچھ تھی۔ وہ گھر سے دور کسی گاڑی کے ساتھ ڈیوٹی
مینو کے تصور ہی میں ڈوبا رہتا تھا۔ تنہائی میں اس کے
باتیں کرتا تھا۔ کبھی کبھی تو راستے ہی میں کسی اسٹیشن پر گا
کر اور جھوٹ موٹ بیمار پڑ جانے کا بہانہ بنا کر دوسری گا
گھر لوٹ آتا تھا۔ مینو کو احساس تھا وہ اس کے ساتھ بالکل
کی محبت کیا کرتا تھا۔ اور وہ خوش بھی تھی مطمئن بھی۔ اس کی
ناز کرتی تھی۔ چمن اس زمانے میں بھی اس کے ماں باپ
نہیں کرتا تھا۔ انھیں وہ مغرور اور متکبر بتاتا تھا۔ اسے ا
کا سخت رنج تھا کہ انھوں نے اس شادی کی مخالفت کی
صرف مخالفت ہی نہیں بلکہ شادی کے موقع پر اسے ذلیل بھی
تھا۔ اس کے براتیوں کا استقبال اس شان سے نہیں
تھا جو ان کی اپنی شان کے شایاں ہوتا۔ وہ کسی امیرزا
سے ہوتا تو سسرال سے اسے جہیز میں موٹر اور دوسرا
قیمتی سامان ملا ہوتا۔ لیکن اسے غریب سمجھ کر بہت معمولی
کے ساتھ رخصت کر دیا گیا تھا۔ اس واقعے پر مینو اور ا
درمیان کئی بار بات ہو چکی تھی۔ مینو یہ بھی جانتی تھی و
بڑے جہیز کا خواہش مند نہیں تھا۔ لیکن وہ اس حقیقت کو
بھول سکتا تھا کہ اسے غریب سمجھ کر اس کے ساتھ ایسا
کیا گیا تھا —— دھیرے دھیرے اس کی نفرت بڑھتی گ
تو اس درجہ بڑھ چکی تھی کہ وہ انکی کسی تقریب میں شامل ہونا اپنی
تھا۔ وہ لوگ اسے ملنے آتے تو چمن انھیں گالیاں دیتا
وہ چمن کو نہیں بلاتے تب بھی وہ انھیں کوستا تھا۔
مینو ایک عجیب دلدل میں پھنسی ہوئی تھی

...چھوڑ سکتی تھی نہ اپنے شوہر کو۔ اپنے میکے میں منائی جانے
...ہر تقریب اسے اپنے شوہر کے ساتھ نہ ہونے پر ادھوری اور
...پھیکی لگتی تھی۔ بے کیف بھی اور تکلیف دہ بھی۔

ریلوے کالونی کے پاس پہنچ کر اس نے کار رکوالی۔ وہ
...یہیں سے کار واپس بھیج دیتی تھی۔ یہاں کے لوگ کار
...کو عجیب نظروں سے دیکھتے تھے۔ وہ ایک بازو پر مٹھائی
...کا پیکٹ اٹھائے اور دوسرے ہاتھ سے بکی کو تھامے ہوئے
...ریلوے کے بنے ہوئے کوارٹروں کے ایک طویل سلسلے
...میں داخل ہوگئی۔ چھوٹے چھوٹے کمرے اور تنگ و ناکافی صحن
...کسی دروازے کے سامنے ایک چھوٹا سا باغیچہ۔ بیشتر
...اجڑے ویران اور اجاڑ سے۔ زرد رنگ کی روشنیوں
...سے بھرے ہوئے کمروں میں نظر آنے والی عورتیں، خاموش،
...موٹی بھدی اور حسین۔ ہر طرح کی عورتیں۔ تعلیم کی کمی سے
...ہوئے چہرے۔ معمولی لباس کے کفن پوش جسم۔ چھوٹے
...سب اپنے ماحول کی ہر چیز قبول کرتے تھے۔ اس کا اثر
...نفرت بھی کرتے تھے۔ محرومی، مایوسی، کنگلی اور زندہ
...کی جدوجہد۔ ریل کی وردی میں کوئی تو بے جان پیکر کی طرح
...ہوا ملتا اور کوئی کوئی چہرہ ایک عجیب سی مکاری اور
...کی لئے ہوئے۔ یہاں لوگ مستقبل سے زیادہ حال کے
...میں ڈوبے رہتے تھے۔ مسائل جو ان کے اپنے ہوتے تھے
...والے۔ جن کا تعلق صرف زندہ رہنے سے ہوتا تھا۔

منو برابر دو طرح کی دنیاؤں میں گھومتی تھی۔ ایک وہ جو
...کے ماں باپ کی طرح امیر لوگوں کی تھی۔ دوسری وہ جو
...شوہر جیسے لوگوں کی تھی۔ ایک دوسرے سے میلوں دور۔
...ملنے والے فاصلے۔ کبھی کبھی تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے
...دوسرے کے خلاف صف آرا دو غنیم فوجوں کے درمیان
...بے بس سفیر کی طرح گھوم رہی ہے۔ شانتی اور امن چاہنے
...سفیر کی طرح لیکن اس کے ساتھ کوئی ہمدردی نہ رکھتا ہو۔

وہ اپنے کوارٹر کے سامنے پہنچی تو اس کا جی چاہا مٹھائی
کے پیکٹ باہر دروازے پر ہی چھوڑ دے۔ کسی کی آوارہ گھومتی
ہوئی بکری ان کی خاردار تاروں سے بنی ہوئی باڑھ میں سر
گھسائے مولیوں کے پتے توڑ توڑ کر چبا رہی تھی۔ بکی نے
اسے ہش ہش کر کے دور بھگا دیا۔

کوارٹر کے "اندھیرا تھا۔ کسی کمرے میں بھی روشنی نہیں
تھی۔ غسل خانے کے زنگ آلود پائپ میں سے پانی کی ایک
تیز دھار اوپر کی طرف اچھل اچھل کر زمین کی چھت کو بھگو رہی
تھی اور ایک مسلسل اداس گیت گا رہی تھی۔ اس نے مٹھائی
کے ڈبے برآمدے میں دیوار کے ساتھ لگی ہوئی چارپائی کے
بازو پر ٹکا دیئے اور اس کمرے میں گئی جس کا دروازہ کھلا
ہوا تھا۔ وہ اس کمرے میں رکھی ہوئی ہر ایک چیز سے مانوس تھی
پلنگ، کرسیاں کپڑوں کی الماری اور جوتوں کے ریک۔ لیکن
وہی چیزیں جیسے ہاتھ میں تیز دھار کے ہتھیار لئے اب اس پر
وار کرنے کے لئے گھات لگائے ہوئے ہوں! اس کے ایک
بھی قدم اور آگے بڑھتے ہی وہ اس پر چاروں طرف سے
ٹوٹ پڑیں گی!

بکی سہما ہوا سا اس کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ وہ چند
لمحوں تک اندھیرے کمرے میں بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ پھر
دھیرے سے ہاتھ بڑھا کر دیوار پر لگے بجلی کے سوئچ کو ٹٹولا۔
ٹک کی ہلکی سی آواز کے ساتھ ہی کمرے میں اجالا پھیل گیا۔
اور اسے ایک کونے میں کرسی پر لیٹا ہوا چمن دکھائی دیا۔ سفید
قمیض پہنے جس کا ایک حصہ اس کی نیلی پتلون میں سے نکلا ہوا
تھا۔ ایک آستین کہنی سے اوپر تک الٹی ہوئی تھی اور دوسری
کا کھلا ہوا کف نیچے لٹک رہا تھا۔ وہ کرسی کی پشت کے ساتھ
سر ٹکائے چھت کو گھور رہا تھا۔ وہ اسے دور سے دیکھتی رہی۔
بکی باپ کے پاس چلا گیا۔ لیکن اس کے ذرا فاصلے پر رک گیا۔
وہ بھی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے پاس گئی۔ جب بھی وہ
اپنے ماں باپ کے ہاں سے لوٹ کر آتی تھی اس کا جی اسی
طرح ڈوبا کرتا تھا۔ چمن۔ اسی طرح شراب پیئے ہوئے ملتا تھا۔

ب پی کر وہ خوب چلاتا تھا۔ اسے اس کے ماں باپ کی
رت، تنگ دلی، خودغرضی اور کمینگی کے طعنے دیا کرتا تھا۔
کی آواز پوری کالونی سنتی تھی۔ جہاں کا کوئی شخص مینو کے
تھ ہمدردی نہیں کرتا تھا۔ وہ انتہائی دکھی ہو کر رونے لگتی
۔ رات رات بھر روتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی چمن اٹھ کر اس
پاس آ بیٹھتا تھا۔ جب اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ جاتا تھا تو وہ ملے
رکرنے لگتا تھا۔ اپنے سلوک کے لئے معافی مانگتا تھا۔ وہ
نی شدت سے نفرت کرتا تھا اتنی ہی شدت سے پیار بھی
تا تھا۔

مینو اس کے پاس ایک دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ چپ
پ۔ سر جھکا کر فرش کو گھورنے لگی۔ چمن کے بوٹ گرد و غبار
اٹے ہوئے تھے۔ ان کی پالش غائب ہو چکی تھی۔ اس کے
ب بوٹ کا تسمہ کھلا ہوا تھا۔ اس کی غیر حاضری میں وہ نہ جانے
ان کہاں بھٹکتا پھرا تھا۔!

مینو نے اس کے بازو کو چھوا۔ چاہا کہ اس کے الٹے ہوئے
ن کو ٹھیک کر دے۔ دوسری آستین کی طرح اسے بھی بازو کی
ی تک اٹھا دے لیکن اچانک چمن نے ایک جھٹکے کے ساتھ
ا بازو کھینچ لیا۔ مینو کا دل اپنی جگہ سے اکھڑ کر حلق میں آ پھنسا
ں نے دانتوں کے درمیان ایک ہاتھ کی پانچوں انگلیاں دے
خود کو چیخنے سے روکا۔ چمن اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔
کی کو گھور رہا تھا جو سہما ہوا سا پاس کھڑا اس کی حرکتیں
ر دیکھ رہا تھا۔ اپنے باپ سے مشابہہ، اسی جیسی رنگت اور
ج بھی۔ یکایک ککی باپ کے بالکل قریب پہنچ گیا اور
ں کی ناک پر انگلی ٹکا کر بولا — "ڈیڈی! تم بولتے کیوں نہیں؟"

مینو ڈر گئی۔ ایسے موقع پر وہ بچے کی پروا بھی نہیں کیا
تا تھا۔ اس نے غصے کی کیفیت میں کئی بار ککی کو ایک طرف
یل دیا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا بڑھا کر ککی کو اپنی طرف
نچ لے لیکن اس کے آگے بڑھنے سے پہلے ہی چمن نے ککی کو
ا کر اپنی گود میں بٹھا لیا۔ اور اسے بھینچ بھینچ کر پیار کرتے
ہوئے کہنے لگا۔ "ککی! ککی پیارے، تو نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں
تیرے ساتھ نہیں بولوں گا! بول، تو نے یہ کیوں کہا؟"

مینو نے چمن کے لہجے میں ایک عجیب سی تھرتھراہٹ
محسوس کی جیسے وہ بڑی کوشش سے اپنے آنسوؤں کو بہنے
سے روکے ہوئے ہو۔ آج اس کے منہ سے شراب کی بو نہیں
آ رہی تھی۔ آج وہ شراب پیے ہوئے نہیں تھا۔ وہ اٹھ کر اس
کی پشت کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ اس کے بالوں میں انگلیاں
گھمائیں لیکن وہ ککی کو پیار کرتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں سچ
مچ آنسو بھرے ہوئے تھے جو اب اس کے گالوں پر بہہ نکلے
تھے۔ وہ ککی کے کان میں چپکے چپکے کہہ رہا تھا۔

"اس سال ہم بھی ککی کا برتھ ڈے بڑی دھوم دھام
سے منائیں گے۔ اپنی کالونی کے سارے بچوں کو بلائیں گے
جتنے بھی بچے یہاں رہتے ہیں۔ کیوں ککی! بول، سب کو بلائے
گا نا!"

ککی خوشی سے چہک کر بولا "ڈیڈی، ڈیڈی، ڈم کے
گھر میں اتنی بڑی موٹر کا کیک تھا۔ اتنا بڑا کیک"۔ اس نے
بازو پھیلا کر کیک کی جسامت کا اندازہ بھی بتایا۔

چمن بولا۔ "ہم اپنے بیٹے کے لئے کیک کی ریل گاڑی
بنوائیں گے۔"

"سچ ڈیڈی؟ آ ہا ہا! تب تو بڑا مزا آئے گا۔" وہ خوش ہو کر
تالی بجانے لگا۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر اداس ہو گیا اور بولا —
"ڈیڈی، ہم ڈم کو نہیں بلائیں گے۔ آج ڈم میرے ساتھ بولا بھی
نہیں۔ باقی سب لڑکوں کے ساتھ بولتا تھا۔"

یہ سن کر چمن نے سر گھما کر مینو کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ
سرخ ہو گیا تھا۔ گردن کی رگیں تن گئی تھیں۔ آنکھوں میں بھرے
ہوئے آنسو خشک ہو گئے تھے۔ لیکن اسی لمحے میں مینو دونوں ہاتھوں
میں اپنا منہ چھپا کر پھپک پھپک کر رو پڑی۔ اور روتے
روتے بولی — "نہیں ککی، ہم اس گھر کے کسی آدمی کو اپنے
ہاں نہیں بلائیں گے۔ وہ اپنے آپ آ جائیں گے تب بھی میں

(باقی صفحہ ۸۰ پر)

از خواجہ

آوازِ سنگ

میرا نام عبدالرحمٰن۔ پستے والا میں ہوں پٹھان ۔ لکھا نے
ہاں گاؤں ہو گلنگل

بار بار بابا

میرا نام عبدالرحمٰن ....

نیبر کے سرخ سرخ کالے کالے صدیوں کی دھوپ میں
بے اور قرنوں کے غبار میں اُٹے پہاڑوں کے وسیع سلسلے
کا ایک دور افتادہ گاؤں میں یہ آواز گونج رہی تھی۔ اس ماحول
میں یہ آواز بڑی اجنبی اور غیر مانوس معلوم ہوتی تھی ۔ گاؤں
کا زراہٹ کر ایک شہری طرز کے پختہ مکان سے موسیقی کی
بیں اٹھ کر شام کے مقدس اور گمبھیر سکوت کو مرتعش کر رہی تھیں
ہے گاہے قہقہوں ..... اور تالیوں کی آواز بھی ان
کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتی۔ گاؤں کے سارے چھیل چھبیلے اس
مکان کی بیٹھک میں جمع تھے ریڈیو پورے زور کے ساتھ
رہا تھا۔

گیت کے خاتمے پر کسی نے ایک نعرہ سر کیا

"یا علی"

"یا حیدر" مکان کے ایک گوشے سے ایک موٹی سمع خراش
بلند ہوئی حیدر کی "ر" دیر تک فضا میں معلق سی رہی۔
زمان خان کے موٹے موٹے ہونٹ خمیدہ ہو کر ایک دلکش
ملین مسکراہٹ میں تبدیل ہو گئے۔ زمان کی عمر پچاس سال

کے لپیٹے میں تھی۔ اس کی سنانوں کی طرح نکلی ہوئی گھنی کالی
کالی مونچھوں موٹے موٹے سرخ شہتوتی ہونٹوں اور سیاہ چمکدار
کھاتی آنکھوں نے اس کی شخصیت کو پر اسرار اور پر شکوہ بنا دیا
تھا۔ ان آنکھوں کی گہرائی میں غور سے دیکھنے میں مجرموں جیسا
تجسس اور کرید تیرتی نظر آتی تھی۔ اس نے زری پشاوری کلاہ
پر ریشمی مشہدی لنگی باندھی تھی جس کا شملہ اس کے چوڑے ماتھے
کے عین درمیان سے اُوپر تاج کی طرح اُٹھا تھا اور مور کے
پنکھ کی طرح پھیلا تھا۔ اس کے بیچوں بیچ زری کی تاریں چمک
رہی تھیں۔ زمان کے چہرے کی جلد سخت کھردری اور ڈھولک
کے چمڑے کی طرح کھنچ کر رخساروں کی ہڈیوں پر منڈھی ہوئی
تھی اس کے سنجیدہ چہرے سے اس کے اندرونی جذبات
رتی بھر بھی مترشح نہیں ہوتے تھے۔

بیٹھک کی دیواروں پر فلمی اداکاروں کی تصویریں اور
اشتہار چپکے تھے ریڈیو کی الماری کے اوپر نور جہاں اور
مدھو بالا کی تصویریں سنہری فریم میں جڑی آویزاں تھیں۔ ان
تصویروں کے درمیان زمان خان کی اپنی تصویر تھی اس نے
اپنی چوڑی چکلی چھاتی پر پستول لٹکایا ہوا تھا۔ زردوزی کے
کام کی واسکٹ پہن رکھی تھی۔ اس تصویر میں اس کی شخصیت
کا رعب اور تیور دوچند ہو گیا تھا۔ ریڈیو کی الماری کے بالمقابل
دو نواڑ کے کسے ہوئے پلنگ بچھے تھے جن کے جنگلوں میں گنگ

رنگی شیشیوں کے ٹکڑے اور سنہری ابری لگی ہوئی تھی۔ فرش پر نیلی دھاریوں والی دبیز دری پڑی تھی۔ کچھ لوگ پلنگ اور کچھ دری پر براجمان تھے۔ چلم گھوم رہی تھی۔ کش لگ رہے تھے اور ریڈیو بج رہا تھا۔

دغا دغا اُولی —— اُولی

ہوگئی اُلفت تم سے ہوگئی

دغا دغا اُولی ۔ اُولی .....

گاؤں کا جوان خون کھول رہا تھا سر ہل رہے تھے اجسام میں گھونگرو بج رہے تھے ان کے اعضا رجھوم جھوم کر سر و تال کا ساتھ دے رہے تھے زمان خان کے پاؤں بھی تبلے کی تھاپ اور ڈھولک کی گمک کی سنگت کر رہے تھے

گیتوں کے خاتمے پر زمان خان نے گھڑی دیکھی اور ریڈیو کی سوئی گھمائی "یہ ریڈیو پاکستان پشاور ہے اب آپ خبریں سُنیں پہلے انگریزی پھر اُردو میں"

زمان خان کرسی پر مستعد اور سنجیدہ ہوکر بیٹھ گیا سارا مجمع خاموش ہوچکا تھا زمان خان نے مزید تجسس پیدا کرنے کے لئے ریڈیو کی طرف جھک کر کان سپیکر کے ساتھ لگا دیئے۔ لوگوں کی یہ عام رائے تھی کہ زمان خان کو پشتو اور اُردو کے علاوہ انگریزی پر بھی اچھی خاصی دسترس حاصل ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ وہ بھی عام ناخواندہ پٹھانوں کی طرح انگریزی سے کلی طور پر نابلد تھا۔ لیکن اس نے اپنی گزشتہ طالع آزما زندگی میں انگریزی کے چند حروف سیکھ لئے تھے جن کو دوہرا کر وہ ان سادہ لوح پٹھانوں پر رعب گانٹھتا تھا۔ خاص طور پر انگریزی کا ایک لفظ تھرنانی (انتھارٹی) تو اس کی زبان سے چپک کر رہ گیا تھا بلکہ اس کا تکیہ کلام ہوگیا تھا۔ جب کوئی اس کی ناقص معلومات کو للکارتا اس کی باتوں پر شک وشبہ کا اظہار کرتا تو وہ قندھاری انار کی طرح سرخ ہو جاتا اور کوٹے لوہے کی بندوق کی طرح پھٹ پڑتا۔ اس کی کرخت اور سنگین آواز فضا کو تلوار کی طرح چیر ڈالتی۔ "تمھارے پاس کیا تھرنانی

ہے کہ میں غلط بکواس کر رہا ہوں میں نے چپہ چپہ چھانا ہے۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ کابل سے بخارا اور پشاور سے کلکتہ اور بمبئی تک پھرا سمجھتے ہو مجھے"

اس کی گرجدار گمبھیر آواز دیر تک فضا میں جیسے دُور خیبر کے کالے کالے سیاہ بے آب وگیاہ سے گزرتے ہوئے خانہ بدوش پاوندوں کے قافلے کے گلے میں بندھی بڑی بڑی گھنٹیاں بج رہی ہو آواز میں یہ گھن گرج اس وقت پیدا ہوئی جب سے کابل جانے والے چھکڑوں پر کلینر کے طور پر وہ لدے پھندے چھکڑوں کے اوپر بیٹھ کر دور رہ سرکتے ہوئے قافلے والوں کو آوازیں دیا کرتا آنے والے چھکڑوں میں اپنے ساتھی کلینروں سے باتیں کرتا۔ اس مشق سے اس کی آواز میں یہ طاقت پیدا ہوگئی۔

ریڈیو نے الجیریا کے قوم پرستوں کے با اور مغربی جرمنی میں بڑھتی ہوئی صنعتی ترقی کا ذکر خبریں سنائیں، خبروں کے خاتمے پر زمان خان۔ تبصرہ کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کیا۔ جب تک تبصرہ نہ کرلیتا اس کا خیال تھا کہ لوگ خبروں کا مفہو سکتے۔ یہ بات کسی حد تک حقیقت پر بھی مبنی تھی۔ لیکن لوگوں کی معلومات میں اضافہ کرنے کے کسی نیک خبروں کی وضاحت نہیں کرتا تھا بلکہ اپنی انانیت اور کے جذبہ کی تسکین کرتا تھا۔ اس طرح وہ تمام مجمع پر تھا اور ان پر چھا جاتا۔ لوگ اس کے منہ سے نکلے کے جادو میں کھو جاتے وہ نہایت رواں دواں سلیس پشتو بولتا۔

"اجی! یہ فرانسیسی گورے کیا مسلمانوں لڑیں گے الجیری مسلمان ان کو مار مار کر سمندر میں گ

انہوں نے سمجھ کیا رکھا ہے اصل میں بات یہ ہے کہ امریکہ اور
انگلستان ان فرانسیسی دلوں کا ساتھ دیتے ہیں ورنہ یہ تو
اروں کی عورتیں ہیں ـــــ زنخے ہیں بھانبوز نخے ـــــ
دنیا کی عیاش ترین اور ذلیل ترین قوم"
اس رات زمان خان بڑے موڈ میں تھا اس نے
فرانسیسیوں کی عیاشی کے متعلق پشاور کے قہوہ خانوں میں
سُنی ہوئی کہانیاں خوب مزے لے لے کر سنائیں لوگ زمان خان
کی معلومات سے ششدر رہ گئے
زمان خان کی زندگی کی کہانی ایک بدلتے سماج کی
کہانی ہے۔ زمان خان پہلے "زمانا کلینڈر" تھا۔ پھر زمانا ڈرائیور
ہوا۔ اور جب روپے کی ریل پیل ہوئی تو زمان خان بنگیا۔
اس نیم قبائلی اور نیم جاگیرداری سماج میں "خان" بن جانا
عزت و تکریم کی معراج سمجھا جاتا تھا۔ زمان کے لڑکپن کے
بارے میں عجیب و غریب حکایات مشہور ہیں۔ جب وہ دس
سال کا چنا گورا صحت مند لڑکا تھا تو اس کی ماں مرگئی۔ اس
سے بڑی دو بہنیں تھیں۔ اونچی لمبی سرو کی طرح ـــــ جوان و
خوبصورت ـــــ ان کے کالے کالے بال شانوں سے نیچے تک
جاتے تھے۔ اور ان کے سرخ سرخ گال دیکھ کر احساس ہوتا
تھا کہ ابھی خون کی دھاریں پھوٹ کر باہر نکل آئیں گی۔ زمان
کا باپ ان دو بہنوں کی اس طرح پرورش کر رہا تھا جس طرح
کوئی قیمتی پالتو جانوروں کی پرورش کرتا ہے وہ ان کی
الھڑ جوانی اور سڈول مضبوط جسموں کو دیکھ کر پھولا نہیں
سماتا تھا۔ جب زمان کی ماں مرگئی تو اس نے ایک دور دراز
گاؤں کے امیر ملک کے ہاتھوں دونوں معصوم بہنوں کو پانچ پانچ
سو روپے میں فروخت کر دیا۔ اور چند دنوں بعد خود بھی غائب
ہوگیا۔ کچھ سالوں بعد زمان کو معلوم ہوا کہ عورتیں بھی اس سماج
میں خرید و فروخت کی ایک جنس ہیں اسے اپنی بہنوں کے
اول کس مپرسی کے عالم میں بک جانے پر بے حد صدمہ ہوا لیکن
جب وہ خریدار بن گیا تو یہ دکھ کا احساس جیسے ایک دم زائل
ہوگیا۔
زمان نے باپ کے گم ہوجانے کے بعد کچھ دن گاؤں کے
ملک کے گھر روکھا سوکھا کھا کر گذارا کیا۔ آخر تنگ آکر وہ گاؤں
کے چند کھلنڈرے لڑکوں کے ساتھ پشاور بھاگ گیا۔ پشاور میں
سال دو سال کی خواری کے بعد اسے کابل جانے والے ٹرکوں
پر کلینر کی ملازمت مل گئی وہ اس ملازمت کو حاصل کر کے
خوش ہوا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس کا رنگ قندھاری انار
کی طرح سرخ ہوگیا۔ اس کے جسم میں کوئی غیر مرئی طاقت
انگڑائیاں لینے لگی۔ رگوں میں خون کی میٹھی کڑوی رویں بہنے
لگیں وہ خیبر کی ان ویران و سنسان بنجر و سنگلاخ وادیوں
کے درمیان چنار کے درخت کی طرح بڑھنے لگا۔ اب اس کے
کپڑے غلیظ اور متعفن ہوتے جگہ جگہ ان پر گریس اور موبائل کے
دھبے پڑے ہوتے لیکن اسے پیٹ بھر کر کھانے کو مل جاتا۔ اب
وہ کابلی دروازہ کے باہر قہوہ خانوں میں بیٹھنے والے ڈرائیور
طبقہ میں بے حد مقبول ہوگیا تھا۔ اس کے چاہنے والے کابل
سے پشاور تک پھیلے ہوئے تھے جانے ان سانپ کی طرح
لہراتی بل کھاتی پگڈنڈیوں پر وہ پاوندوں کی سرخ و سپید
اور صحت مند دوشیزائیں دیکھ کر کیوں اپنے آپ کو بھول جاتا
اس کا دل کسی سے آنکھیں چار ہوتے ہی اچھل کر حلق میں آجا
اس کے جسم و جان میں میٹھے راگ الاپتے آبشار گرنے لگتے
ذہن میں کوئی انجان نامعلوم سی کسک ایک غیر مبہم اور غیر مجسم
چاہت نئے نئے بہروپ دھار کر آتی۔ وہ ان تمام جذبوں اور
احساسات کا تجزیہ نہ کرسکتا۔
رفتہ رفتہ اسے اپنی بے بس اور شرمناک زندگی
کا احساس ہونے لگا۔ اب وہ قہوہ خانوں میں لوگوں کے اشارے
اور اپنی طرف اٹھتی ہوئی معنی خیز نظریں سمجھنے لگا تھا وہ حیران
تھا کہ اس نے ایسی ذلیل زندگی کیوں اختیار کی۔ لیکن اسے کچھ
معلوم نہ ہوسکا حالات کے دھارے نے اُسے تنکے کی طرح
ایسے بھنور میں پھنسا دیا تھا جہاں اذیت اور تکلیف کے کوئی

ت نہ تھی ۔ اسے اپنی طرح بہت سارے اور لڑکے بھی
ول میں پنجرے میں قید بے بس پرندوں کی طرح پھڑپھڑاتے
تے کچھ کوشش کئے اور کچھ اُداس — جب اس نے تمام
کا جائزہ لیا تو اسے احساس ہوا کہ یہ سب غریب کا
ہے انسان کو زندہ رہنے کے لئے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے
ن پہاڑوں کے لوگ اتنے مفلس کیوں ہیں میدانوں
خوش حالی ناچتی پھرتی ہے پہاڑوں میں نہ صرف انسان
ت بلکہ اس کا جسم اور روح تک بک جاتی ہے پھر بھی
ا پیٹ نہیں بھرتا اس کے ننگے جسم نہیں ڈھانپے جا سکتے

وقت نے اسے خیبر کی وادیوں میں ٹنخ ٹنخ کر ایسی چٹان
یا تھا جس پر زمانے کے انقلاب اور وحشت کے گھوڑوں
ار انسان گذر گئے تھے لیکن وہ اپنی جگہ جمی رہی تھی ۔ اس
پڑوں سے سڑاند اور عفونت دور ہونے لگی، اس کے
ہیں فریب وجعل سازی کے کیڑے پرورش پانے لگے
ن یہی ایک راستہ تھا جس کے توسط سے وہ غربت کے بحر
راں سے نکل سکتا تھا ۔ ان کوچوں کے غیر قانونی بچے اس کے
غ میں کلبلانے لگے ۔ اس نے غربت کو زیر کرنے اس پر فتح
ے کے گر سیکھ لئے تھے اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کر سکتا
اس کے ذہن میں پھنسی ہوئی برسوں کی کیلیں تجربات نے
پھینکی تھیں اس کی ہستی اندھیرے قبرستانوں سے سرکتی
ن شبستانوں میں جا نکلی تھی۔

اس نے افغانستان کا انقلاب اپنی آنکھوں سے دیکھا
نے پشاور کے بنیوں کو کابل شہر کے دروازوں کے باہر
نے امریکی کوٹ اور پتلونوں کے ڈھیر لگا کر بیٹھے دیکھا اور
ز ساتھیوں کے ساتھ ان پر آوازے کسے تھے امان اللہ
ں نے حکم دیا تھا کہ کوئی شخص شہر میں کوٹ پتلون اور ہیٹ
بغیر داخل نہ ہوں ۔ دیہات کے لوگ جب اپنے کاروبار
نجی کاموں کے سلسلے میں شہر میں آتے تو ان بنیوں سے
یے پر کپڑے لے کر پہنتے ۔ سادہ لوح دیہاتی اس مغربی
لباس کو پہن کر عجیب ہونق سے لگتے ۔ ان کی ہیئت کذائی دیکھ
کر بے اختیار قہقہہ لگانے کو جی چاہتا ۔ زمان نے امان اللہ
خان کے فرار کے بعد ان کپڑے کے ڈھیروں کو کابل کے
بازاروں میں جلتے دیکھا تھا ۔ اس نے بچہ سقہ کی حکومت کے
قصے بھی سُنے اور کابل پر نادر شاہ کے دوبارہ قابض ہونے
کا حال بھی چشم دید لوگوں سے سُنا تھا ۔

ان انقلابات کے ہنگاموں میں اس نے خیبر کی وادیوں
میں ایک نئے نظام کی آواز بھی سنی ۔ یہ آواز غیر مرئی اور غیر
مجسم تھی لیکن ہر باشعور آدمی کو صاف سنائی دے رہی تھی ۔
اب شرافت کی قدریں بدل رہی تھیں ۔ زمین شرافت کا لائسنس
نہیں رہی تھی اب جس کے پاس سرمایہ تھا وہی شریف گردانا
جاتا تھا ۔ خیبر کی وادیوں نے اس طرح کے انقلابات اور تغیرات
پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے ۔ سمندر پار سے آتے ہوئے جب سفید
چمڑی والے صاحب چلے گئے تو لوگوں نے سنا کہ اب اس
وادی کے دریاؤں اور ندیوں پر بند باندھ کر ان سے بجلی پیدا
کی جائے گی صدیوں کی سڑی اور جلی ہوئی زمین کو دوبارہ
سرسبز و شاداب کھیتوں اور باغوں میں تبدیل کر دیا جائے گا ۔
آج سے قبل کسی کو ان سنگلاخ پہاڑوں کی سخت جانی کو آزمانے
کا خیال نہ آیا تھا ۔ کوہ ہندوکش اور کوہ سفید کے دامن میں
پھیلی ہوئی وادیوں کے یہ غیور قبائل اب ایک نئے قومی جذبے
کے ساتھ ایک نوزائیدہ حکایت کی ترقی میں کوشاں تھے ۔ اس
سرزمین نے آریاؤں اور بدھوں کے عظیم کلچر کو جنم دیا تھا
اب یہ اس کلچر کو پھر زندہ کر رہے تھے ۔

زمان نے اس انقلاب کو کسی کتاب یا سکول میں پڑھ
کر نہیں سمجھا تھا ۔ بلکہ اپنے خون میں محسوس کیا تھا ۔ اس لئے
کہ وہ بھی اس بدلتے ہوئے نظام اور انقلاب کا ایک کارآمد
پرزہ تھا ۔ تجربات نے اس کی نگاہوں کو دوربینی اور اس کی
عقل کو ذکاوت بخش دی تھی ۔

جب پاکستان قائم ہوا تو وہ دو مچکڑوں کا مالک تھا
اس نے ایک حسین و جمیل عورت سے شادی کر لی تھی۔ جسے اس
نے دو ہزار روپے میں خریدا تھا

شہر میں رہائش اختیار کئے اسے کئی سال گزر چکے
تھے لیکن اس نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ شہر کی اس تیز لاپرواہ
اور کاروباری زندگی میں ٹھیک نہیں بیٹھتا۔ شہر کے ہنگاموں
اور شورشوں سے اس کا جی اُکتا گیا تھا۔ سرمائے کے جن نے
اس کے لئے زندگی ایک آسودگی اور مسرت کا طویل خواب بنا دی
تھی وہ اپنی اس شان دار زندگی کو اکیلے اس شہر میں گذارنا
نہیں چاہتا تھا جہاں سوائے چند بس مالکوں ڈرائیوروں،
کلینروں اور قہوہ خانے والوں کے اسے کوئی نہیں جانتا تھا انسانوں
کے اس انبوہ کثیر میں اس یم بے پناہ میں وہ ایک قطرہ تھا جس
کی انفرادیت بری طرح مجروح ہو رہی تھی وہ اپنی کامیاب زندگی
اور دولت کا مظاہرہ کرنا چاہتا تھا۔ اور یہ بات اسے صرف
اپنے گاؤں میں ہی حاصل ہو سکتی تھی۔ وہاں اس کی برابری کا
صرف ایک آدمی ہی دعویٰ کر سکتا تھا —— گاؤں کا ملک، مگر
وہ بھی دقیانوسی قسم کا آدمی تھا صاف اُجڈ تھا اسے کیا معلوم کہ
روپے سے آجکل کے ترقی پسند زمانہ میں ہر طرح کی آسائش
مہیا کی جا سکتی ہے جنگل میں منگل کا سماں ہو سکتا ہے۔ وہ اپنے
گاؤں میں ایک سفید براق گھوڑے پر سوار نہایت ٹھاٹھ اور
ٹھسے سے داخل ہوا۔ اس نے بوسکی کی قمیص پہن رکھی تھی۔
جس میں سونے کے تین بٹن چمک رہے تھے۔ لٹھے کی کلف
لگی سلوار کرکرا رہی تھی۔ زری کلہے پر مشہدی لنگی کا شملہ اُٹھا
ہوا تھا۔ واسکٹ پر زری کی تاروں سے بیل بوٹے کاڑھے
ہوئے تھے گلے میں چمکیلے کالے خول میں ولائتی پستول تھا ہاتھ
پر چوڑے ڈائل کی گھڑی دوہرے کفوں پر بندھی ہوئی تھی۔
واسکٹ کے جیبوں سے سُرخ سُرخ رومال جھانک رہے تھے
اور دو فونٹین پن بھی جیبوں کے ساتھ لگے چمک رہے تھے۔ اس
کے ساتھ ساتھ اس کی کالی آنکھوں کے اسرار نتھنوں کے پھیلاؤ

چہرے کی خشونت ہونٹوں کے موٹاپے اور چوڑے چکلے جسم
نے اسے شان و شوکت اور تیور و دبدبہ کا نشان بنا دیا تھا۔
گاؤں کے ملک نے اس کی بہت خاطر مدارات کی لیکن
جب اسے معلوم ہوا کہ یہ وہی زمان ہے جو اس کے گھر ایک
معمولی خدمت گار تھا۔ تو اس کے دل میں نفرت و حقارت کا
طوفان اٹھا۔ رات کو ملک نے زمان کے ساتھ کھانا بھی کھانا
گوارا نہ کیا۔ زمان نے اپنے مکان کا جائزہ لیا وہ بڑی خستہ
حالت میں تھا۔ زمان اور اس کے باپ کے چلے جانے کے
بعد ملک نے اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ زمان نے کچھ روپے دے کر
ملک سے قبضہ دوبارہ واپس لے لیا اور اس کے ساتھ ملحقہ
کھیت بھی خرید لیا۔

پشاور سے جب وہ دوبارہ گاؤں آیا تو اپنے ساتھ
مستری سیمنٹ اور دوسرا تعمیر کا ساز و سامان گدھوں پر لاد کر
لایا۔ پرانا مکان بالکل مسمار کر کے اس کی جگہ نیا مکان بنانا شروع
کیا یہ گاؤں میں پہلا واقعہ تھا کہ کوئی شخص ملک بابر خان کی
برابری کا دم بھرنے لگا تھا۔ گاؤں بھر میں ملک کی حویلی ایسی
تھی جس کو پختہ کہا جا سکتا تھا اس پر بھی جگہ جگہ پتھروں کے گرد گارا
تھوپا ہوا تھا۔ مکان کے درمیان ایک مچان بنی تھی جس کے
چاروں طرف بندوقوں کے لئے سوراخ تھے۔ ملک کو اپنی اس
بات کا جلد ہی احساس ہو گیا کہ اس نے زمان کو مکان واپس
کر کے بہت بڑی حماقت کی ہے اب یہ پاؤں کی جوتی سر کو آنے
لگی تھی۔ اس مکان کی تعمیر ملک کے وقار اور عظمت پر ایک
کاری ضرب تھی۔ جب مکان کی دیواریں قد آدم تک بلند ہو گئیں
تو ایک اندھیری رات کو ملک نے اپنے آدمی بھیج کر ان کو
گرا دیا۔ کئی بار یہ دیواریں بلند ہوئیں اور کئی بار زمین کے برابر
کر دی گئیں۔

زمان خان بھی ایک گرگِ باراں دیدہ تھا اسے علم تھا
کہ یہ کس کی شرارت ہے لیکن وہ کوئی ایسا طریقہ سوچ رہا تھا
جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹنے۔ ایک رات

وہ اپنے چند نوکروں کے ساتھ دیوار کے پیچھے مورچہ بنا کر بیٹھ گیا۔
ملک کے آدمی جب کدالیں اور بیلچے لئے قریب آئے تو اس نے
ہوا میں گولیاں چلائیں وہ کدالیں اور بیلچے چھوڑ کر سرپٹ بھاگے
زمان نے بھاگتے ہوئے ایک آدمی کی ٹانگ کا نشانہ بنایا وہ۔
اس کے سر کو بھی نشانہ بنا سکتا تھا لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ
کسی کو مار کر دشمنی مول لے اور پھر اس شخص کے بھائی بیٹے
اس سے انتقام لیں وہ اس گاؤں میں زندگی کے باقی دن امن
و امان سے گذارنے کی نیت سے آیا تھا۔ وہ شخص ہائے کرکے
گرا زمان نے دوسری گولی نہ چلائی اور اس کے ساتھیوں کو موقع
دیا کہ وہ زخمی کو اٹھا کر لے جائیں۔

اس واقعہ کے بعد کسی نے اس کے مکان کی دیواریں
گرانے کی کوشش نہ کی۔ چھ مہینوں سے کم مدت میں اس کا دو منزلہ
مکان تیار ہوگیا۔ جو اس علاقے میں اپنی نظیر آپ تھا۔ لوگ اسے
دیکھنے کے لئے دور دور سے آنے لگے اور گاؤں کے ملک کے دل
پر سانپ لوٹ کر رہ گئے آرے چل گئے۔ مکان جب تک روغن
ہو کر بالکل مکمل ہوگیا تو زمان پشاور سے اپنے بیوی بچوں کو بھی
لے آیا۔ اس کے سامان میں بیٹری کا ایک ریڈیو سٹ بھی تھا
ریڈیو بیٹھک میں جما دیا گیا۔ اس کی بیٹھک کے دروازے ہر کس
وناکس کے لئے کھلے تھے۔ گاؤں والوں کے لئے ریڈیو ایک حیرت
کی چیز تھا۔ گاؤں کے ملک کے علاوہ کسی کے پاس ریڈیو نہیں
تھا۔ ملک کو حکومت نے ریڈیو دیا تھا تاکہ وہ اسے حجرہ میں رکھے
لوگ خبریں اور پشتو پروگرام سن سکیں۔ سال میں حکومت کی طرف
سے اس ریڈیو کے لئے دو بیٹریاں بھی ملا کرتی تھیں۔ ملک نے
ریڈیو گھر لا رکھا تھا۔ کسی نے اس کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی جن
لوگوں کو پشاور جانے کا اتفاق ہوا تھا وہ اس عجیب وغریب
چیز کے متعلق بڑے دلچسپ انکشافات کرتے تھے۔ اب یہ عجوبہ
روزگار چیز ان کے گاؤں میں آگئی تھی۔ وہ اسے اطمینان سے
دیکھ سکتے تھے اور رنگ رنگ مزے مزے کے پشتو گیت اور
ٹپے سن سکتے تھے۔ صبح ریڈیو آیا اور شام تک گاؤں کے بچے بچے
کو معلوم ہو چکا تھا کہ زمان خان کے گھر ایک گانے والا
"صندق"* آگیا تھا

اس رات تقریباً سارا گاؤں اس کی بیٹھک
زمان نے ان کی چائے سے خاطر تواضع کی اب ا
خوشی سے پھول رہا تھا۔ اپنے گاؤں میں پہنچ کر ا
انفرادیت قائم کرلی تھی۔ اس میدان میں وہ یکتا تھا
میں گاؤں کا ملک گرد راہ بن کر رہ گیا تھا۔ لوگ
لکڑی کے اس "صندق" کو دیکھتے تھے جس کے ایک
گول سا نمبروں والا شیشہ لگا ہوا تھا اور پیچھے سے
روشنی باہر پھینک رہا تھا اس شیشے کے پیچھے ایک
کی سوئی لٹک رہی تھی۔ جو نیچے لگے ہوئے سفید بٹ
ایک کو گھمانے سے آگے پیچھے ہولی تھی

اس رات جب دس بجے پروگرام ختم ہوگ
سے ایک معمر شخص نے پوچھا

"خان گانے والے اس چھوٹے سے ڈبے
کر بیٹھ نہیں سکتے لیکن یہ آواز کہاں سے آتی ہے"

زمان خان نے مسکرا کر تمام مجمع پر ایک فتح
دوڑائی۔ اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا۔ چلم کا ایک لمبا
کر ناک اور منہ سے دھواں نکالا اور آنکھوں کو سک
گھمبیر آواز میں مخاطب ہوا۔

"پشاور لاہور اور کراچی جیسے بڑے بڑے شہروں
اسٹیشن میں جہاں سے لوگ گاتے ہیں مشینوں کے ذریعہ
آوازیں ہوا میں پھیلا دی جاتی ہیں اور ریڈیو انہیں کھینچ
سناتا ہے"

اس رات جب لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس
انھیں خدا کی قدرت کے علاوہ سفید چمڑی والے انسان
ایمان لانا پڑا۔

ریڈیو نے گاؤں میں زمان خان کی شخصیت سب
بنا دی تھی۔ گاؤں والے پہلے ہی ملک کے حجرے میں کم جا

---

* صندق پشتو میں صندوق کو کہتے ہیں۔

اور نوجوان تو اکثر ندی کے کنارے ہی اپنی محفلیں جماتے تھے انھیں
ملک کے غرور دولت کے گھمنڈ اور سرکار میں اس کے اثر و رسوخ
کی وجہ سے سخت نفرت تھی۔ اس نفرت میں محرومی کا احساس تھا
اب یہ سارے نوجوان زمان خان کی بیٹھک میں باقاعدگی سے آنے
لگے چراغ جلتے ہی زمان خان کی بیٹھک بے ہنگم قہقہوں اور پشتو
موسیقی کی تانوں سے گونج اٹھتی ــــ زمان ریڈیو کے طفیل گاؤں کی
سیاست کے اُفق پر ستارہ بن کر چمکنے لگا تھا۔

دوسری طرف اس ستارے کی چمک گاؤں کے ملک کے
سینے میں تیز خنجر کی طرح اُتر رہی تھی ان محفلوں کے تذکرے سن سن
کر اس کے کان پک گئے تھے، ایک ذلیل ڈرائیور اس کے باپ
دادا کے وقار اور سطوت کو بے پناہ صدمہ پہنچا رہا تھا اور ملک کچھ
نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے دل میں خطرے کی گھنٹیاں بج رہی تھیں
سابقہ ایک یونٹ کی اسمبلی میں قبائلی علاقہ کی طرف سے اسے نمائندہ
بنا گیا تھا اور اگر زمان کی مقبولیت کا یہی عالم رہا تو ہوسکتا ہے کہ
نئی اسمبلی میں نمائندہ چن لیا جائے۔ حالات نہایت تیزی سے
بدل رہے تھے۔ ورسک منصوبے میں گاؤں کے جو لوگ کام کرنے
گئے تھے اپنے ساتھ روپے اور نئے خیالات بھی لاتے تھے وہ اپنی
پرانی دشمنیاں اور انتقام بھول کر بے غیرت ہو گئے تھے۔ ورسک
میں تو سنا تھا کہ بے غیرتی کی انتہا ہو گئی تھی۔ اس منصوبے سے قبل
آفریدی کو مہمند قبائل کے درمیان شدید دشمنی تھی دریائے کابل
ان کے درمیان ایک فصیل کا کام دیتا تھا۔ یہ غیور پٹھانوں کی طرح
دشمنی کرتے اور غیور پٹھانوں کی طرح دیرینہ روایات کے مطابق
ایک دوسرے کے خون سے ہاتھ رنگ کے اپنے انتقام کی آگ کو ٹھنڈا
کرتے تھے لیکن اب دریائے کابل پر پل بنا کر ان کو آپس میں ملا دیا
گیا تھا۔ اب یہ دونوں قبائل ایک جگہ مل کر کام کرتے تھے ورسک
بند اور بجلی گھر کی تعمیر میں برابر کے شریک تھے روپے کے لالچ میں
آ کر یہ اپنے انتقام اور دشمنیاں بھول گئے تھے روپے نے ان کا ایمان
بھی خرید لیا تھا۔

اس بند کے مکمل ہو جانے کے بعد ۲۶ میل لمبی جھیل بن
جائیں جس کے پانی سے ایک طرف عظیم الشان بجلی گھر بنایا جائے گا
اور دوسری طرف پہاڑ میں سے ساڑھے تین میل لمبی سرنگ نکال
کر پانی خیبر کی وادی میں لایا جائے گا خیبر کی بے آب و گیاہ وادی
دوبارہ زندہ ہو جائے گی۔ خشک سرکنڈوں اور کانٹے دار جھاڑیوں
کی جگہ سرسبز کھیت لہلہا رہیں گے۔

اس دور افتادہ پسماندہ اور اونچے اونچے پہاڑوں
میں گھرے گاؤں میں ایسے انقلابات آ رہے تھے جن کا پہلے کسی
نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ لوگوں کو رفتہ رفتہ یہ بھی معلوم ہو گیا
کہ ملک کو سرکار کی طرف سے گاؤں کے لئے چینی کے پرمٹ ملتے
ہیں وہ ملک پشاور میں چور بازار کی نذر کر دیتا ہے۔ گاؤں کا
راشن بھی وہاں پہنچ جاتا ہے لوگ بھوکے مرتے ہیں اور ملک کی
تجوریاں بھرتی جاتی ہیں یہ تمام نئے خیالات اور معلومات باہر سے
گاؤں میں آنے والے لوگ لائے تھے ملک اس مسئلے پر کئی دن
سے سوچ رہا تھا کہ ان لوگوں کا داخلہ گاؤں میں بند کر دے لیکن
اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اس سے قبل اسے کبھی
ایسے مخدوش حالات کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ پاکستان قائم
ہونے سے قبل صرف ایک دفعہ ایک بڑا پٹھان راہنما اس کے
گاؤں آیا تھا۔ اس نے مہمان نوازی کے خلاف تحریک چلائی تھی
اس کا کہنا تھا کہ اس مہمان نوازی کی قبیح رسم نے ہمارے اخراجات
بڑھا دئے ہیں ہمیں مفلوک الحال بنا دیا ہے یہ مہمان نوازی اگر
جائز حد تک ہو تو ٹھیک ورنہ سوائے تصنع اور دکھاوے کے
اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن ملک نے مہمان سمجھ کر اس پر
ہاتھ نہیں اُٹھایا تھا ورنہ ایسے بے غیرت اور ننگ قوم افراد کو
گولی کا نشانہ بنا کر اسے انتہائی مسرت ہوتی تھی۔ پاکستان قائم
ہونے کے بعد تمام قبائلی ملکوں پر نعمتوں کی بارش ہونے لگی ہر
برسر اقتدار جماعت ان کی امداد و حمایت حاصل کرنے کے لئے
بیتاب رہتی۔ لیکن اب یہ نئی حکومت عجیب طریقوں سے ان کے باپ
دادا کی مقدس رسومات اور پاکیزہ روایات کو نیست و نابود کر رہی
تھی۔ کل کے کمینے لوگ آج سونے چاندی میں کھیل رہے تھے۔

ملک جابر خان نے ان تمام باتوں پر سوچ سوچ کر اپنے
دماغ کو ماؤف کر دیا تھا لیکن اسے کوئی حل نہیں مل رہا تھا۔
فی الحال اس کے سامنے سب سے بڑا خطرہ زمان خان کا وجود
تھا۔ اگر پاکستان سے پہلے کا زمانہ ہوتا تو وہ اس خنزیر کے بچے
کو چار آنے کی گولی سے ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا کر دیتا لیکن اب تو
جمہور کی طاقت اس کے ساتھ تھی اگر ایسا کرتا تھا تو آئندہ اسمبلی
میں اس کے منتخب ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا اور
سرکار کی نگاہوں میں الگ معتوب ہوتا۔ روپے کی محبت نے اس
کی مصنوعی عزت کا جنازہ نکال دیا تھا۔

ایک دن غصے میں آکر اس نے اپنے حواریوں کو طلب کیا
"ریشے! دیکھو اب یہ ذلیل کتے بھی ہمارے منہ آنے لگے
ہیں ـــ ان کا کوئی علاج کرو۔"

"جی ملک صاحب آپ نے سولے آنے ٹھیک فرمایا ہے۔
وہ بھی زمانہ تھا یہ نمک حرام آپ کی جوتیاں سیدھی کرتا تھا اب
یہ زمانہ بھی آیا ہے کہ کمبخت آپ کی ٹکر لیتا ہے یہ سب روپے کا
فتور ہے لیکن اس کو شاید معلوم نہیں کہ وہ پہاڑ سے ٹکر لے رہا ہے۔"

"ہاں شاید وہ اپنے تخم کو بھول گیا ہے" ملک جابر خان
نے اپنی موٹی کرخت آواز میں جواب دیا

"ملک صاحب آپ کو معلوم ہے کہ اس کی دونوں بہنیں
لاہور کے چکلے میں بیٹھی ہیں جن کو اس کے باپ نے پانچ پانچ
سو روپے میں بیچ دیا تھا"

"ہاں کسے معلوم نہیں"

ملک جابر تھوڑی دیر خاموش رہا پھر اس نے چلم کا ایک
کش لیا اچانک اس کا چہرہ گلنار ہو گیا اس نے ریشم خان کے
کان میں جھک کر کچھ کہا۔

"واہ واہ میں صدقے جاؤں۔ کیا دماغ پایا ہے آپ نے"
ریشم خان نے جوش میں آکر اپنی چوڑی رانوں پر زور زور
سے ہاتھ مارے اس کے بڑے بڑے ہونٹ پھڑ پھڑانے لگے
اور نسوار سے زنگ آلود دانت صاف دکھائی دینے لگے۔

ایک سرما کی صبح جب زمان خان سو کر اٹھا
دیکھا کہ بیٹھک کا دروازہ کھلا ہے اور ریڈیو غائب۔
کی چوری کی خبر آگ کی طرح گاؤں میں پھیل گئی۔ ز
سوگوار چہرے لئے بیٹھک میں آئے جیسے ان کا کوئی
ہے اور وہ سب ماتم پرسی کے لئے حاضر ہوئے ہوں
خان بڑا مطمئن تھا اس کے چہرے پر اداسی اور نشا
نشان نہیں تھا۔

"سنو! میرے پٹھان بھائیو" وہ لوگوں سے مخ
کوئی میرا ریڈیو چرا کر لے گیا ہے عزت سے واپس کر د
کچھ نہیں کہوں گا رات کو چپکے سے آکر بیٹھک دروازے
جائے ورنہ اس کا انجام خراب ہو جائے گا۔ عنقریب
ریڈیو اسٹیشن والوں کو ریڈیو سے نکلتی ہوئی شعاعوں کے
ہو جائے گا کہ ریڈیو کس کے پاس ہے اور وہ پشاور ر
سے اس کا نام نشر کر دیں گے۔"

یہ خبر جب ملک جابر خان کے کانوں تک پہنچی تو
ہوش خطا ہو گئے اسے اسمبلی کی رکنیت سرکار سے ملنے
چینی اور راشن کے پرمٹ سب ہوا میں اڑتے ہوئے نظ
وہ خوف و دہشت سے تھر تھر کانپنے لگا دشمن کی بندوق
سینے کے قریب دیکھ کر اسے اتنا ڈر محسوس نہیں ہوتا تھا جتنا
پیدا کر دیا۔

اس نے فوراً ریشم خان کو طلب کیا
"ریشے حرامی یہ سب تیرا قصور ہے اب میرا کیا ب
نے مجھے اس وقت کیوں نہیں بتایا۔
"ملک صاحب مجھے خود معلوم نہیں تھا"
"چپ رہو تخم حرام! اب میرا نام پشاور سے ن
گا میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ باپ
ساری عزت دریا برد ہو جائے گی۔ میں جیتے جی مر جاؤں
ریشم خان نے ڈرتے ڈرتے جابر خان کو ایک اور مش
دوسرے دن جب زمان خان گھر سے باہر نکلا تو

یدا انجم

سوُرج مُکھی

سعود گلی کا موڑ مڑا ہی تھا کہ ٹھٹھک کر رہ گیا۔
سامنے کے مکان کا دروازہ پورا کھلا ہوا تھا اور لالی کمر پہ
ؤں ہاتھ دھرے دہلیز کے درمیان کچھ اس طرح سے اکڑ کے
ہوئی تھی کہ سینے کا اُبھار کچھ زیادہ ہی اُبھر آیا تھا اور کولہوں
ا آپ ہی آپ ٹیک جاتی تھیں۔ اس کے سیاہ بال جن میں بھلے
بڑے بھلے نظر آتے، کچھ اُلجھے اُلجھے سے تھے اور ماتھے پر
لی لٹیں اس کے تمتماتے ہوئے رخساروں پر کہیں کہیں
کر عجیب بہار دے رہی تھیں۔ پر حسین وہ اس لمحے نظر
بں اتنی ہی بد زبانی سے وہ تڑ تڑ گالیاں اور کوسنے دیئے
تھی۔

"میرا کیا کہتی ہو، اپنے سور سے مردُود دے کی طرف تو دیکھ
و میائی ساری کی ساری تو نے نچوڑ لی۔ کتیا!" اس نے
، زمین پر تھوک کر کہا اور دایاں ہاتھ کولھے پر سے
ی تنی ہوئی گردن کی پشت پر بالوں کے نیچے رکھ لیا۔
چُپ رہ ری گشتی!" جینو تیلن ہڑبڑا کر چلائی۔ "زبان
کھینچ لوں گی!"

ہے ہے بڑی آئی سوُرنی!" اس نے اپنا ہاتھ نچایا۔
اپنا مرد سمجھ رکھا ہے جو یہ دھونس دیتی ہے؟"
چڑیل! اپنا خصم کھا گئی اب اور کیا۔ . . . . "
بکواس نہ کر حرامزادی!" ایک تڑاخے کے ساتھ لالی
کالی۔ "اپنے آپ کو دیکھ ری! میاں کے سامنے غیرِ دل

سے آنکھ مٹکاتی پھرتی ہے۔ اور وہ بے غیرت ہے کہ آنکھوں سے
دیکھتا ہے پر رہتا چُپ ہی ہے۔" پھر جلدی سے سانس لیکر بولی۔
"ہاں ہاں، اس کی زبان جو تو نے گُدی سے نوچ پھینکی ہے۔
کرے بھی تو کیا کرے غریب، آنکھوں دیکھے مکھی نگلتا رہتا ہے!"
جینو تیلن کو جب اور کوئی حربہ کارگر ہوتے نظر نہ آیا تو وہ
گلی کے درمیان تقریباً لیٹ لیٹ گئی اور دھول میں اُسنے
بالوں کو نوچتے ہوئے دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔
لالی نے فتح کے جذبے سے آلودہ نظریں ارد گرد کھڑے
لوگوں پہ ڈالیں اور بائیں ہاتھ کو سینے کے اُبھار کے درمیان
میں رکھ کر، اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ پھر نچلا لب قدرے
سکوڑتے ہوئے اس نے سر کے ایک جھٹکے کے ساتھ ماتھے پر
بکھری لٹوں کو پیچھے ہٹایا اور بڑی بے نیازی کے ساتھ دہلیز
پر سے قدم اُٹھا کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔
سعود نے بند دروازے کی طرف بڑی نفرت سے
دیکھا۔ پھر گلی کے درمیان لوگوں کے ہجوم میں روتی ہوئی تیلن
کو دیکھنے لگا جو لالی کے کوسنے اور طعنے دہرا دہرا کر بُری طرح
بلک رہی تھی اور ارد گرد بہت سی عورتیں اس پہ جھکی ہوئیں
اسے دلاسا دے رہی تھیں
"میں تو کہوں اس کے منہ ہی نہیں لگنا چاہیئے" ایک
اُدھیڑ عمر عورت کہہ رہی تھی۔
"اس کی تو ناک پہ مکھی بیٹھے تو آفت مچا دے۔ اُونہہ!

ہے نا ویسے کی بیٹی!" ایک نے ناک پہ انگلی رکھ کر کہا۔ "جیسا باپ لڑاکا تھا ویسی بیٹی ہے!"

وہ ان عورتوں کو بڑبڑاتے چھوڑ، آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا اپنے کمرے تک آیا۔ تالا کھولا اور پھر ایک انگڑائی لے کر جسم ڈھیلا کرتے ہوئے وہ اندر داخل ہو گیا۔

جب سے وہ اس محلے میں آیا تھا، روز روز کی لڑائیوں سے مانوس ہو گیا تھا۔ کوئی دن ہی جاتا تھا کہ لالی کی کسی عورت یا مرد سے جھڑپ نہ ہوئی ہو۔ کوئی بات ہو نہ ہو لالی کسی نہ کسی سے جھگڑا ضرور کر بیٹھتی اور پھر وہ گالیاں سناتی، وہ کوسنے دیتی کہ سننے والا حیرت سے اس کی طرف دیکھتا رہ جاتا۔

سچ پوچھو تو تھی بڑی حسین۔ پر اس کا حسن کچھ اس قسم کا تھا کہ چمکیلے سیاہ بالوں میں اکثر مٹی رچی بسی ہوتی اور ہونٹوں کی سرخی جس کو دیکھ کر اکثر دھوکا ہوتا کہ اس نے مسی لگا رکھی ہے، خون سے مشابہ معلوم ہوتی۔ چہرے پر دائیں آنکھ کے نیچے ایک بھورا تل اکثر مٹی میں چھپا رہتا اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ہر دم بیباکی سے دیکھنے والے کو گھورنے لگتیں۔ ان آنکھوں پر جھکی ہوئی پلکیں تو اتنی لمبی تھیں کہ بار بار آنکھ جھپکنے پر آنکھ میں جا پڑتی تھیں اور وہ ایسے میں بڑے دل فریب انداز سے مسکراتی اور اپنی لانبی انگلیوں سے اپنے پپوٹے مسلتے ہوئے اک گالی ضرور نکالتی۔

اس نے پہلی بار لالی کو جب دیکھا تو وہ اپنی پڑوسن سے اُلجھ رہی تھی۔ وہ دفتر سے واپس آیا تھا اور تھکا ہارا ابھی اپنے کمرے میں آ کر چارپائی پر لیٹا ہی تھا کہ شور سُن کر اُٹھا اور گلی میں نکل آیا۔ وہاں لالی کو اس نے دیکھا جو بری طرح چیختی چلاتی اپنی پڑوسن کو قبر میں ملنے والے عذاب یاد دلا رہی تھی۔

مسعود کو لالی اس لمحے ایک ایسی خونخوار خوبصورت عورت محسوس ہوئی جو اپنے حسن کے جادو سے سب کو دامِ عشق میں پھانس کر ان کے لہو اور گوشت سے اپنا پیٹ بھرتی۔ یہ خیال اُسے کیونکر آیا یہ اُسے خود معلوم نہ ہوا۔ بعد میں جب وہ لالی کی گالیوں اور کوسنوں پہ لعنت بھیجتا شرمندہ سا ہو کر اپنے میں لوٹا تو بھی اسے یہ پتہ نہ چلا کہ وہ عورت کیا شے تھی اس نے جھنجھلا کر خود سے کہا تھا۔ "دیوانی معلوم ہوتی۔"

پر وہ دیوانی نہ ہوتے ہوئے بھی دیوانی تھی اسے اس روز معلوم ہوا جب وہ سامنے کی گلی کے موڑ والے سے پان بنوا رہا تھا۔ لالو نے پان پر کتھا لگاتے دکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے آدمی سے کہا۔ "اوئے تو اسے سمجھاتا کیوں نہیں؟"

"کیوں لالو؟" یوسف رک گیا اور پھر اپنی چوڑی چھاتی پھلاتے ہوئے وہ لقے کبوتر کی طرح گڑکا۔ "کیا گ گل بات کیا ہوئی ہے، وہ تیری مستانی کل د سیناں سے گالی گلوچ کر رہی تھی!" لالو نے پان پر چو رکھی، یوسف یوں مسکرایا جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ "چھو کوئی اور بات کر۔"

لالو نے ایک آنکھ میچ لی۔ "یار تو بڑا خوش قسمت ہے۔"

"قسمت کی بات چھوڑ۔ اپنا اپنا جگرا ہوتا ہے لالو!"
یوسف نے اپنے دائیں بازو کو دوسرے ہاتھ سے تھپتھپایا

مسعود نے غور سے اسے دیکھا۔ وہ بڑا کڑیل جوان چہرہ بھرا ہوا، جس پہ روشن اور سیاہ آنکھیں بڑی چمک تھیں۔ قد اس کا درمیانہ تھا۔ مسعود نے سوچا اگر یہ شخص لمبا ہوتا تو کیسا لگتا؟ تب اسے کچھ ایسا احساس ہوا جیسے اگر کا قد ذرا سا بھی چھوٹا یا بڑا ہوتا تو وہ شخص اپنی تمام جاذ کھو بیٹھتا۔

لالو نے پان والا ہاتھ بڑھایا تو یوسف نے جلدی سے پان لے کر منہ میں رکھ لیا۔ مسعود کا اُٹھا ہوا ہاتھ تیزی سے نیچے

"اوہ! معاف کرنا باؤجی!" یوسف نے خوش دلی سے

"یہ پان میں بھلا لالو نے میرے لئے بنایا ہے!"

لالو ہنسا۔ "چل معاف کیا تجھے!" پھر مسعود کی طر دیکھ کر بولا۔ "یہ اپنا یار ہے جی۔ بڑا جیالا ہے!"

یوسف چلا گیا تو مسعود نے پان کھاتے ہوئے لالو سے
پوچھا "یہ ہے کون؟"
"باؤجی! اسی محلے میں رہتا ہے۔ وہ جو ہے نا لالی!۔
اجی وہی عورت جو بیوہ ہے!"
"بیوہ ہے؟" اس نے حیرت سے پوچھا
"ہاں جی۔ اسی سال خاوند مرا ہے اس کا" لالو نے کہا
"پر اس عورت کو تو جیسے اپنے میاں کی موت کا بالکل غم نہیں
ہے جی — دراصل ..... " اس کی آواز کم ہو گئی۔ "دراصل
کہتے ہیں وہ شادی لالی کے باپ نے زبردستی کرائی تھی اور
جب باپ مر گیا تو بھی لالی کو کوئی غم نہ ہوا — یہ عورت جات
بھی عجیب تھے ہے جی! یہ نہ اپنے باپ کے مرنے پر روئی، نہ
خاوند کی موت پر اس کی آنکھ سے کوئی آنسو نکلا اور — اور —"
وہ چپ ہو گیا
"اور کیا؟" مسعود نے اشتیاق سے پوچھا
"اللہ ہی جانتا ہے پر کہتے ہیں کہ لالی نے ہی اپنے
میاں کو مارا ہے!" وہ ہولے سے بولا
"کیوں؟" اس کے منہ سے آپ ہی آپ نکلا
"اللہ ہی ٹھیک جانتا ہے جی!" وہ سانس لے کر تیزی
سے بولا "پر لالی کے خاوند کے مرنے پر ادھر بڑا فساد ہوا تھا
جی۔ پولیس بھی آئی پر کچھ پتہ نہ چلا اور تب سے یہ عورت ہر
اک سے لڑتی پھرتی ہے۔ کہتی ہے یہ سب میرے دشمن ہیں!"
مسعود چپ رہا۔
لالو پھر بولا۔ "یہ جو ابھی یار ہے نا یوسف؟ یہ لالی کی سگی
ماسی کا بیٹا ہے جی۔ دونوں بچپن میں ایک دوجے سے کھیلے
ہیں۔ ویسے یہ سب کو معلوم ہے وہ تو اس کی دیوانی ہے دیوانی!
اب کل دوپہر کو بھی اسی کی خاطر سیناں سے لڑی تھی!"
"کیوں؟"
لالو نے ایک قہقہہ لگایا "یہ عورت جات میں بڑی جلن
ہوتی ہے۔ سیناں نے تھیں کہہ دیا یوسف بہت کھوبصورت
ہے بس وہ لالی کو تو آگ لگ گئی۔ ہے ہے تو کون اسے کچھ کہنے
والی" پھر ہولے سے بولا۔ "باؤجی یہ دونوں کا بیاہ اب ہونے
والا ہے نا!"
مسعود نے چونک کر پوچھا "تو وہ بیاہ بھی کرنے والے
ہیں پھر؟"
"پھر؟ کیا ہوا باؤجی؟" لالو نے حیرت سے سوال کیا
وہ چونکا اور دل ہی دل میں اپنی اوٹ پٹانگ سوچ
پر خود کو ملامت کرتا اپنے کمرے کی طرف آگیا۔
دوسری صبح جب وہ دفتر جا رہا تھا بڑ والے کنوئیں
کے قریب لالی کھڑی تھی اور اس کی کمر میں پیتل کی ایک گاگر
تھی جس کے گرد اس کی باہیں لپٹی تھیں۔ اس نے دیکھا۔
کانچ کی نازک چوڑیاں اس کی باہوں پہ سجی ہوئی تھیں اور
جب گاگر کمر سے وہ اتار کر زمین پہ دھرنے لگی تو وہ چوڑیاں
ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر بجنے لگیں۔
مسعود کو دل ہی دل میں لالی سے ایک خوف سا محسو
ہونے لگا اور چور نظروں سے اس نے اس کی طرف دیکھا
اسے اپنی طرف بالکل متوجہ نہ پا کر اس نے سکھ کا سانس لیا
اور نفرت سے زمین پر تھوکتے ہوئے وہ تیزی سے اپنی ر
ہو لیا۔ لیکن وہ ابھی چوک تک بھی نہ پہنچ پایا تھا کہ اسے لا
کی تیکھی آواز سنائی دی "میں نے تیری گردن نہ گھو
دی تو نام بدل دینا!"
گھبرا کر وہ مڑا۔
لالی نے اپنی ہم عمر ایک عورت کا گلا اپنے ایک
سے پکڑ رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ میں ایک پتھر تھا جو و
بار اس کے سر پر مارنے کی کوشش کر رہی تھی۔
دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے اور م
خوف زدہ سا کچھ دیر کے لئے کھڑا یہ سوچتا رہا کہ یہ دیکھتے ہی د
وہ کس بات پہ لڑ رہی ہے۔ ابھی تو اکیلی تھی اور ابھی وہ ا
عورت کے ساتھ مردوں کی طرح دست و گریباں ہو رہی۔

اسے لالی کی چیختی آواز سنائی دی۔ "حرام زادی مجھے کہتی ہے خصم مار کے صبر نہیں آیا — آ میں تجھے ماروں تو تیرے دل کو چین آ جائے — آ کمینے!"

اسی شام لالو کی دوکان سے سگرٹ کا ایک پیکٹ خریدتے وقت اسے صبح کی لڑائی یاد آئی تو اس کا جی چاہا اس سے لڑائی کی وجہ پوچھے مگر ہمت نہ ہوئی۔ چپ چاپ پیسے دے کر وہ مڑنے ہی لگا تھا کہ لالو نے چمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ دیکھا اور بولا۔ "باؤجی، صبح کی لڑائی دیکھی؟"

وہ یوں مزا لے لے کر بولا تھا جیسے کوئی بڑا اچھا تماشا دیکھا ہو

"نہیں۔ کیا بات ہوئی تھی؟"

"اجی وہ رضو نے صبح لالی کو کنویں کے پاس چپ چاپ دیکھا تو مذاق کر بیٹھی کہ بی بی چپ کیوں ہو گیا میاں یاد آ رہا ہے؟ — بس جی، اس نے تو لپک کر رضو کا گلا پکڑ لیا — اور پھر وہ تماشہ ہوا ہے باؤجی! کہ کیا بتاؤں!" وہ ہنسنے لگا۔

مسعود خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گیا۔ بے دلی سے اس نے وہ کتاب کھولی جو وہ اپنے کسی دوست سے مانگ لایا تھا۔ ناول قدرے دلچسپ تھا اور وہ اس میں منہمک ہو گیا۔

کہانی کا وہ حصہ جہاں ہیرو اور ہیروئین آپس میں ملتے ہیں بڑا پر لطف محسوس ہوا اور ایک ایسے ہی حصے میں جہاں سے بڑی حد تک لذت محسوس ہو رہی تھی وہ آنکھیں بند کر کے تصور ہی تصور میں ذہن کے پردے پر ان دو خیالی ہستیوں کو حقیقت بنا رہا تھا کہ اچانک اس کے کمرے کے دروازے پر ایک ہلکی سی دستک ہوئی اور وہ چونک گیا۔

اس نے کتاب پر نظریں جماتے ہوئے بڑے روکھے لہجے میں کہا۔ "کون ہے؟"

"باؤجی — یہ میں آیا ہوں!"

"کون؟" وہ آواز نہ پہچانا اور پھر بڑی کوفت محسوس کرتے ہوئے اس نے ناول ایک طرف رکھ دیا اور بولا

"آ جاؤ اندر!"

دروازہ کھلا اور سرد ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ یوسف اپنی تمام تر مردانہ دلکشی کے ساتھ اس کے کمرے میں آیا اور مسعود کو دفعتاً کچھ ایسے معلوم ہوا جیسے ناول کا ہیرو کتاب کے اوراق میں سے انگڑائی لے کر اٹھا ہو اور اس کے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

گھبرا کر اس نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

"بس جی۔ اک خط تو لکھ دینا — !" یوسف نے آہستہ سے کہا

اس کا دل چاہا صاف انکار کر دے پر منہ سے نکلا "کارڈ لکھوانا ہے؟"

"ہاں جی — بس یہ کارڈ — دو منٹوں کا کام ہے۔" یوسف نے دائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے کارڈ کو اس کے سامنے کیا۔ "وہ اپنا ایک یار بیلی ہے جی لاہور شہر میں۔ اس کو میں نے لکھا تھا نوکری کوئی ہو تو لکھ بھیجے۔ پر اس کا جواب نہیں۔"

"پھر؟" اس نے آنکھ کر بیٹھتے ہوئے کہا

یوسف نے جواب میں اس کی چارپائی پہ بیٹھتے ہوئے بڑی بے تکلفی سے کہا۔ "بس باؤجی کوئی ایسا خط لکھو کہ وہ جواب دیئے بغیر نہ رہے۔ بس ایسا خط لکھو کہ ادھر خط ملے اور ادھر وہ جواب لکھے!"

یہ خطوط لکھنے لکھانے کا سلسلہ ایسا چلا کہ وہ یوسف سے قدرے بے تکلف ہو گیا اور اب تو وہ بھی کبھی کبھار باؤجی کہہ کر بلانے کی بجائے یار یار کہہ کر بلانے لگا تھا۔ مسعود کا دل کئی بار باتوں کے دوران چاہنے لگا کہ وہ اسے لالی کو سمجھانے کو کہے۔ وہ ہر ایک سے لڑتی ہے یہ کوئی اچھی بات نہیں مگر پھر اپنے اس خیال پر شرمندہ سا ہو کر رہ جاتا۔ آخر وہ اس کی کیا لگتی تھی جو وہ اس کے بارے میں باتیں کرے۔ یوسف کیا سمجھے گا۔ اور یہ سوچتے ہی وہ چپ ہو جاتا۔ ہاں اسے کیا پڑی کر

ے پیٹے میں جان بوجھ، بے سوچے سمجھے ٹانگ اڑاتا!

اس دوپہر وہ دفتر سے ذرا جلدی واپس آیا تھا کہ
الی جینو تیلن سے لڑتی نظر آئی تھی۔ اور اپنے کمرے میں
ب وہ ستانے کو لیٹا تو اس کے ذہن میں بار بار اس کا خیال
گا۔ وہ خود اپنے احساسات پہ جھنجھلا گیا۔ آخر اُسے کیا۔
مرضی میں آئے کرے وہ اسے روکنے والا کون اور پھر
ں کی بات پہ اُلٹا وہ اسی کے ساتھ لڑ پڑی تو کیا عزت
ے گی؛

وہ اسی اُدھیڑبُن میں تھا کہ یوسف خط لکھوانے آیا۔
یار اس دفعہ اسے یہ لکھو کہ جلدی کسی نوکری کا بندوبست
۔ میں اب بہت دیر نہیں ادھر رہ سکتا"

"لیکن جب تک نوکری نہ ملے وہ تمہارا یا بے چارہ کیا
ہے؟" مسعود نے کہا

"یار کوشش کرے تو نوکری ملے" وہ ہنسا پھر جیسے کسی سوچ
ب گیا اور کچھ دیر بعد سر اُٹھا کر بولا "اچھا تو میرے یار!
لکھ ڈال کہ یوسف کہتا ہے میں پرسوں تیرے پاس پہنچ
ں بس آپ ہی آ کر کوئی نوکری ڈھونڈ لوں گا!"

"لیکن ۔"

"لیکن کیا؟"

مسعود نے ہمت کی "وہ لالی ۔ لالی کیا کرے گی!"

"اس کی فکر نہ کرو ۔ میں کچھ روپیہ لے کر آتے ہی بیاہ
لگا۔ تب تک وہ اپنے گھر میں رہے گی یار!" اور پھر
چ کر وہ بولا "وہ بھی اک مصیبت ہی ہے!"

مسعود چپ رہا

"یار آج پھر لڑی ہے؟" وہ خود سے جیسے بڑبڑایا۔ "وہ
ہے نا جینو اس سے ۔ اس کا جیٹھ مجھ سے شکایت کر رہا
ل نے بھی اچھا جواب دیا!"

"کیا؟" مسعود نے سانس روک کر پوچھا

"میں نے کہا اپنی بھرجائی کو سمجھاتا تھا کیوں اُسے چھیڑتی
ہیں اور پھر اچھا ہے لڑتی جھگڑتی ہے آخر کو عورت ہے ۔
وہ عورت ہی کیا جو لڑے نہ جھگڑے بس بُت کی طرح بیٹھی رہے
۔" وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگا اور پھر بولا۔ "پر گھر آ کر میں نے بھی
اس کے خوب ہاتھ لگائے ۔"

"تو نے لالی کو مارا؟" مسعود نے حیرت سے پوچھا

"آج کوئی نیا مارا؟" اس نے بھی حیرت سے کہا۔ "میری
مار کی تو وہ عادی ہو گئی ہے۔ پر آج تو میں نے اسے لال پیلی کر ڈالا
۔ پر عجب شے ہے یار وہ بھی ۔" وہ جیسے کچھ سوچ کر
مسکرایا اور چُپ ہو گیا۔

مسعود چپ چاپ اسے گھورتا رہا۔

یوسف پھر بولا "مار کھانے کے بعد مجھ سے نخرے سے کہنے
لگی۔ تو مجھ سے اب بیاہ جلدی سے کر ڈال نہیں تو میں زہر
کھاؤں گی!"

مسعود نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "اچھا؟"

"ہاں میرے باؤ!" وہ مزے سے بولا "اور تجھے پتہ
ہے؛ وہ میری مار کا کسی کو نہیں بتاتی! یار ویسے لالی جیسی کوئی
عورت نہیں لالی تو لالی ہی ہے!"

مسعود ہنس پڑا

تیسرے روز مسعود دفتر سے دیر سے آیا۔ اپنے کمرہ کا دروازہ
کھول رہا تھا کہ سامنے کے مکان کا دروازہ کھلا اور لالی گلی میں
نکلی۔ اسے دیکھ کر لالی نے نظریں نیچی کر لیں اور پھر بڑے مدھم
لہجے میں بولی "سلاما لیکم!"

اس نے گھبرا کر سلام کا جواب دیا

"وہ وہ " وہ چُپ ہو گئی۔ پھر بڑے اداس لہجے
میں بولی "وہ جاتے وقت سلام کہہ گیا تھا"

"اچھا یوسف چلا گیا؟" اس نے حیرت سے پوچھا

لالی نے ہولے سے سر ہلا دیا اور واپس مڑ کر اس نے
دروازہ کھولا اور تیزی سے اندر داخل ہوتے ہی اندر سے
دروازہ بند کر لیا۔

مسعود کو کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ دروازہ بند کر کے
رو رہی تھی۔ لیکن اپنے اس عجیب خیال پر اسے حیرت ہوئی اور
اور خود پر دل ہی دل میں ہنستا ہوا وہ اپنے کمرے کا دروازہ
کھلا چھوڑ اپنے کمرے میں داخل ہو گیا

سرہانے سے ناول اٹھا کر اس نے پڑھنا چاہا پر نظریں
خود بخود بہک کر کھلے دروازے میں سے ہو کر گلی میں جا پڑتیں
اور پھر سامنے کے بند دروازے پہ جا ٹھہرتیں۔ دو ایک بار
اس نے سٹپٹا کر دروازے پر سے اپنی نظریں ہٹائیں لیکن
کتاب کے اوراق ہو بہو کر اس کی نگاہوں کا مذاق اڑاتے
رہے۔ تنگ آ کر اس نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا اور لحاف
اوڑھ کر لیٹ گیا۔

اتوار کو دوپہر کے وقت وہ ستانے کو لیٹا ہوا تھا کہ آنکھ
لگ گئی اور آنکھ جب کھلی تو اسے اپنے دروازے کی دراڑ میں سے
لالی کی چمکتی ہوئی آنکھیں نظر آئیں۔ گھبرا کر وہ اٹھ بیٹھا۔

لالی نے آہستگی سے دروازہ کھٹکھٹایا

مسعود کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کہے۔ اٹکتے ہوئے بولا "کیا
——کیا بات ہے؟"

جواب میں وہ چپ رہی صرف دروازہ ہلکے سے دوبارہ
کھٹکھٹا دیا

مسعود نے دروازہ کھول دیا۔ وہ نظریں جھکائے بڑی
اداسی سے سر کے بالوں پر اپنے ہاتھ پھیرتی چپ چاپ اس
کے کمرے میں داخل ہو گئی .... اور کمرے کے فرش پر
بیٹھ گئی۔

"کیا بات ہے ——؟" وہ گھبرا رہا تھا۔

"اس کا خط نہیں آیا" وہ یوں بولی جیسے اگر کچھ نہ بولتی تو
آنکھوں میں سے آنسو بہنے لگ جاتے۔

"آ جائے گا —— آئے گا!" اس نے سٹپٹا کر کہا۔

"کب آئے گا؟" اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھول
کر مسعود کو دیکھا اور بڑی معصومیت سے بولی۔ "آخر کب تک
انتظار کروں؟"

"مسعود کو اس پہ بڑا ترس آیا۔ "تم فکر کیوں کر
اسے گئے آج ہفتہ ہی تو ہوا ہے!"

"ہائے ہفتہ کوئی چیز ہی نہیں؟" اس نے ر
رکھ، آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "باؤجی ہفتے بھر میں تو مرد
بھی گل سڑ جاتا ہے ... جو میں اس روز مر گئی ہو
دو گیا تو آج میری نعش بھی ......"

"کیسی باتیں کرتی ہو لالی!" مسعود نے ڈر کر

"سچی بات کہہ رہی ہوں جی! وہ اپنے گھٹنوں
باہیں کر کے بولی۔ "تم اسے لکھ دو جی۔ جلدی سے آ
تو میں کچھ کر بیٹھوں گی۔ ہاں!"

مسعود نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ تو یہ سوچ
وہی عورت ہے جو بڑی لڑاکی ہے۔ جب لڑائی پ
سنتی نہیں۔ اتنی اتنی بڑی گالیاں سناتی ہے کہ ا
سے سر جھکا لیتا ہے اور لڑتے وقت کیسی خونخوار نظ
لیکن آج یہی عورت کیسی معصوم دکھی اور حسین نظ
اس نے سوچا اگر وہ افسانہ نگار ہوتا تو اس عورت
کا افسانہ لکھتا!

وہ چونکا وہ اس کے قریب کھڑی کہہ رہی تھ
گے نا اُسے خط؟"

"آں —— ہاں ہاں!" اس نے کہا اور پھر

"اچھا میں چلی!" وہ دروازے کی طرف
اسے خط ضرور لکھ دینا۔ وہ کہتا تھا باؤجی کے قلم میں
خط لکھے تو جواب بڑی جلدی آتا ہے۔" پھر مڑ کر بو
دو گے نا اسے خط؟ —— میں خود بیٹھ کے لکھواتی پر
جان کو رو رہی ہو گی۔ دیر ہو گئی ہے!"

"جان کون؟" اس نے یونہی پوچھ لیا

"ہائے وہ جس کے برتن میں مانجھنے جاتی
بولی اور دروازہ کھول کر جاتے جاتے پھر مڑ کر کہ

ضرور لکھنا!"

تیسرے روز وہ پھر اس کے کمرے میں آدھمکی "کیوں باؤجی خط لکھا؟" اس نے روتی آواز میں پوچھا

مسعود نے گھبرا کر کہا "آں ہاں لکھ دیا — بس جواب آجائے گا" دراصل اس نے خط لکھا تو تھا لیکن ڈاک میں ڈالنا بھول گیا تھا اور ایسا بھولا تھا کہ اب لالی کے یاد دلانے پر اسے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔

لالی نے اپنے سفید لہنگے پہ ہولے سے اپنا ہاتھ پھیرا اور پھر اپنا خالی بازو اس کے سامنے کر کے بولی۔ "دیکھ میں نے اپنی ساری چوڑیاں اتار دی ہیں۔ جب تک اس کا خط نہیں آئے گا میں چوڑیاں نہ پہنوں گی اور دیکھ اگر اس کا خط پھر بھی نہ آیا تو میں کچھ کھاؤں گی پیوں گی بھی نہیں۔ نہ ہی حاجن کے ہاں کام کو جاؤں گی تو اُسے لکھ دے میں بھوکی پیاسی مر جاؤں گی ہاں!"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

وہ گھبراہٹ میں کچھ بھی نہ بول سکا۔ اس کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ چپ کیسے کرائے۔ ادھر اُدھر گھبراہٹ میں دیکھ کر بولا "نہ لے میں ابھی دوسرا خط لکھے دیتا ہوں تو چپ کر جا —"

لالی نے اور زور زور سے رونا شروع کر دیا "باؤجی وہ بڑا ظالم ہے۔ دیکھ نا وہ میرا ذرا بھی خیال نہیں کرتا۔ ہائے میں اپنا دکھ کسے کہوں کیسے بتاؤں۔ میرا کوئی نہیں ہے۔ اپنا کوئی بھی نہیں۔ ایک وہ ہے تو اسے میری بالکل پرواہ نہیں!"

اس نے ہاتھ ہلا ہلا کر بین کرنے شروع کر دیئے "ہائے مجھ کرموں جلی کا کوئی نہیں۔ مجھ تتی کا ...... !"

"لالی! لالی!" وہ بدحواس ہو کر چلایا "تو چپ کر جا — تو اپنے دکھ مجھے بتا میں اُسے خط لکھوں گا!"

لالی نے روتے روتے اپنی ناک پہ ایک ہاتھ رکھا اور حیرت سے بولی "باؤ تو اس کا دوست ہے نا — ہاں وہ مجھ سے کہتا تھا کہ تو اس کا بڑا پکا یار ہے — یہ تو ذرا بتا —" اس کی آواز سرگوشیوں میں بدل گئی۔ "وہ تجھ سے کبھی میرا ذکر کرتا ہے؟"

"ہاں — ہاں!" اس نے جلدی سے سر ہلایا "کئی بار تیری باتیں کرتا رہا —"

"سچ؟" وہ خوشی کے مارے تقریباً چیخ اٹھی۔

اس نے سر ہلایا جیسے اگر سر نہ ہلاتا تو سر پہ کوئی بھار بوجھ آن پڑتا۔

"یہ تو بتا کبھی اس نے یہ کہا کہ وہ مجھ سے —" وہ جھینپ گئی!۔

مسعود کے چہرے پہ خون کی گرمی بڑھ گئی۔

وہ شرما شرما کر کہنے لگی "ہائے میں کم بخت تو کسی سے کہہ بھی نہیں سکتی" اس نے سسکی سی لی۔ "اب دیکھو نا یہ محلے والیاں مجھے اس حرام زادے کی موت کا طعنہ ...." وہ چپ ہو گئی اور بے بسی سے اسے دیکھنے لگی۔

مسعود ہمت کر کے بولا "لالی یہ بتا کیا تجھے سچ مچ اس سے میرا مطلب ہے یوسف سے عشق ہے؟"

"عشق؟" لالی بڑبڑائی اور پھر کسی کنواری لڑکی کی طرح شرما کر اس نے سر جھکا لیا۔ اس کے چہرے پہ سرخی کی گہری لہریں اُبھرنے لگیں اور اپنے دائیں ہاتھ کے ناخن وہ اپنے دانتوں سے کاٹنے لگی اور پھر بری طرح شرمانے کے سے انداز میں اس نے "ہائے" کہا اور تیزی سے اُٹھ کر دروازہ کھولا اور گلی میں بھاگ گئی۔

دوسرے روز وہ دفتر سے آرہا تھا کہ لالی اسے اپنے کمرے کے باہر بیٹھی نظر آئی۔ اس نے نیا دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا اور قمیض بڑی صاف تھی۔ اس کے بالوں میں مٹی بھی نہ تھی اور چہرہ صاف اور نکھرا نکھرا تھا۔ آنکھوں کی پلکیں تو کچھ اتنی لمبی دکھائی دے رہی تھیں کہ مسعود نے سوچا کہ اس عورت کے چہرے پر بس پلکیں ہی پلکیں ہیں اگر یہ نہ ہوں شائد وہ اتنی حسین نظر نہ آئے۔

وہ اسے دیکھتے ہی جھجکتی ہوئی اٹھی اور اس کے قریب آ

"میں کب سے راہ تک رہی تھی باؤ!"

"کیوں کیوں —" وہ گھبرایا

"لے ہے وہ تیرے دوست کا خط آیا ہے" وہ ایک کارڈ اس کے سامنے کر کے بولی۔ "لے پڑھ جلدی سے پڑھ۔ ہاں!"

وہ اپنے کمرے کا تالا کھولنے لگا مگر وہ چیخی۔ "ہائے پہلے خط تو پڑھ لے باؤ!" پھر دھیمے سے بولی "تو کیسا دوست ہے کہ اپنے یار کا خط پڑھنے کی بجائے تالے کی فکر کرتا ہے!"

اس نے جلدی سے کہا "لالی دوست کا خط آرام سے پڑھنا چاہیئے!" اور تالا کھول کر کمرے میں داخل ہو گیا

وہ اس کے پیچھے پیچھے چھلانگیں سی لگاتی کمرے میں آئی اور زمین پر دھرنا مار کر بیٹھ گئی۔ "تو پڑھا لکھا ہے، ٹھیک ہی کہتا ہوگا۔ خیر اب آرام سے خط جلدی سے پڑھ ڈال!"

مسعود نے کارڈ پر ایک نظر ڈالی "لکھا ہے — لالی۔ تجھے سلام لکھا ہے لالی!"

"والیکم سلام!" لالی نے سر پر دوپٹہ اوڑھ کر شرماتے ہوئے کہا

"اور لکھا ہے کہ میں دو چار روز تک آجاؤں گا —— نوکری ....."

"جائے جہنم میں نوکری!" وہ تیزی سے بولی۔ "بس وہ آجائے نوکری کا کیا ہے نوکری کہیں بھی مل سکتی ہے، پر ....." وہ جھینپ گئی

مسعود نے سانس لیا "نوکری بڑی مشکل سے ملتی ہے لالی وہ لکھتا ہے کہ نوکری ابھی نہیں ملی۔ پر کوشش کر رہا ہوں اگر مل گئی تو پھر نہیں آؤں گا!"

"ہائے میری!" اس نے سینے پر دھپ سے ہاتھ مار کر کہا۔ "باؤجی اسے لکھو جلدی سے واپس آجائے۔ بس وہ آجائے ہاں!"

"اچھا" اس نے بغیر سوچے سمجھے کہا

"اور کیا لکھا ہے؟"

"نیچے لکھا ہے باؤجی کو سلام اور آخر میں لکھا ہے جواب دینے کی ضرورت نہیں میں اگر آ ....."

"ہائے دیکھا — وہ تو مجھ کرموں جلی کا ذرا بھی خیال کرتا!" وہ چہرہ لٹکا کر بولی۔ "دیکھ لو اسے پسند ہی نہیں اسے خط لکھواؤں ہائے — ہائے میری قسمت!"

"پاگل مت بن لالی۔ اس نے لکھا ہے کہ اگر میں آ رہا ہوں تو خواہ مخواہ خط کی کیا ضرورت —" وہ کچھ نہ سمجھنے کے سے انداز میں اسے سمجھانے لگا۔

"ہائے باؤ سچ کہتی ہوں۔ تو اپنے دوست کو کبھی خیال نہیں کرتا!" وہ چیخی۔ "اب میں تجھے کیسے بتاؤں میں اس کے بغیر اک پل نہیں رہ سکتی۔ ہائے میرا تو جی چاہتا ہے کپڑا بن جاتی عورت نہ ہوتی، اس کا پہناوا تو بنتی۔ اس کے ساتھ ساتھ تو رہتی اُسے میں اس کے پیر کی جوتی ہی بن جاتی پر — پر —" وہ ہچکیاں لینے لگی "پر اسے میرا بالکل خیال نہیں۔ ہائے میں مر گئی تو مجھے یاد کرے گا — پر پھر کیا فائدہ" وہ روتی ہوئی کمرے میں سے چلی گئی وہ حیرت سے دیکھتا رہ گیا

شام کے وقت وہ لالو سے پان لے کر کھا رہا تھا کہ ہلکا ہلکا گنگناتی ہوئی لالی وہاں سے گزری۔ اسے دیکھ کر اُداسی سے اس نے اپنا سر جھکا لیا اور چپ چاپ گزر گئی۔

لالو نے منہ کھول کر کہا "کیوں باؤجی یوسف کو خط لکھا ہے؟"

"یوسف کو — کیوں؟"

"یہ لالی ساروں کو کہتی پھرتی تھی کہ باؤجی کو یوسف نے خط لکھا ہے۔ اسے کوئی بڑی نوکری مل گئی ہے اور جلد ہی وہ آنے والا ہے — کیوں؟"

"ہاں — ہاں!" اس نے کہا اور تیزی سے واپس ہو گیا

دوسری صبح ابھی وہ دفتر جانے کی تیاری کرنے لگا تھا کہ لالی کی دروازے کے باہر سے آواز آئی — "باؤ — دروازہ کھول!"

ں نے قمیص پہنے بغیر دروازہ کھول دیا۔
رآگئی۔" ہائے باؤ قمیص کیوں اتار لی! ٹھنڈ لگ
وہ بھی اسی طرح سردی کی بالکل پرواہ نہیں کرتا۔
ں میں وہ کیا کرتا ہوگا۔ ہائے میں تو اس کو دیکھنے
ہوں" پھر آہستہ سے بولی " آج تو اسے خط ضرور لکھنا!"

ں نے جھنجھلا کر کہا۔" خط کی کیا ضرورت ہے۔"
پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔" باؤ۔ تجھے میں اپنا دل
ں۔ میں اپنا درد کیسے بتاؤں، ارے میرے دل میں
کے وہ ناسور ہیں کہ تو دیکھے تو تیرا دل دہل جائے۔ ارے
ول سناتے بھلا"
یشان ہوکر وہ اُسے پچکارنے لگا " ارے نہیں لالی۔
ور خط لکھوں گا۔ میں تو یونہی کہہ رہا تھا اری پگلی تو
نے لگی ۔ بس وعدہ کرتا ہوں آج ہی خط لکھوں گا"
ں نے اپنے سینہ پر دونوں ہاتھ دھر لئے " باؤ سچ کہتی
ں چلے تو میں ہوا بن جاؤں اور سانس بن کر اس
ہ پر کروں کیا میرا بس نہیں چلتا بس اس کے پیار
ہر دم جلتی رہتی ہوں پر اسے مجھ سے اتنا پیار نہیں
پرواہ تک نہیں — دنیا میں میرا اب اس کے
!"

وہ تجھے بہت چاہتا ہے —" اس نے ناگواری
وہم ہے کہ وہ تجھے چاہتا نہیں!"
عورت کا ہے کو ہوئی، تیل ہوتی تو اس کے بالوں
کے کام ہی آتی" وہ سسکی " وہ نہ آیا تو میں مر

ود کو اس پر بے انتہا ترس آیا
ین روز گزر گئے۔ وہ جب بھی مسعود کو کمرے میں
ارغ ہوتی تو جھٹ سے اس کے کمرے میں آجاتی
جوں دن گزرنے لگے۔ وہ زیادہ سے زیادہ اس
بیٹھی یوسف کا ذکر کرتی رہتی " باؤ تجھے خبر ہے

اُسے گوبھی بڑی پسند ہے اور میں تو گوبھی قیمہ بڑے ہی مزے
کا پکاتی ہوں — ارے ہاں تو بھلا کھانا کدھر کھاتا ہے! ہوٹل
میں! ارے چھوڑ بھلا وہاں بھی کوئی مزے کا سالن ہوتا ہے!
یوسف کو ذرا آنے دے پھر دیکھ میں تجھے اپنے ہاتھ کا پکا یا ہوا
سالن کھلاؤں گی۔ ہائے وہ تو میرے ہاتھ کے پکے ہوئے ساگ
پر جان دیتا ہے —" پھر وہ پلو سے آنکھیں پونچھتی اور کہتی " پر
اسے یہ تو جانو خبر ہی نہیں کہ میں اس کے بنا جیتے جی مر رہی ہوں
— ہائے باؤ اُسے خط لکھ جلدی سے آجائے!"
وہ اسے دلاسہ دیتا تو وہ اور روتی۔ مسعود کی سمجھ میں
کچھ نہ آتا یہ عورت چاہتی کیا تھی۔ کیا وہ یوسف کے پیار سے
مطمئن تھی؟ — اسے تو جیسے یوسف کے پیار میں اک خلا اک
تشنگی محسوس ہو رہی تھی!
یوسف نے لکھا تو تھا کہ جلدی آؤں گا مگر اس کی یہ جلدی
کوئی بیس دن کی مدت بنی۔ جس روز اس کا خط آیا کہ میں کل
پہنچ رہا ہوں لالی کا مارے خوشی کے بُرا حال تھا، ہاتھ میں
کارڈ لئے وہ لالو پان والے کے پاس پہنچی اور اُسے یوسف کے
آنے کا بتایا، جینو تیلن سے جھٹ پٹ صلح کرکے اس کے آنے
کا ذکر کیا اور سارے محلے میں بھاگتی پھری۔
مسعود شام کے وقت لالو سے پان کھانے گیا تو وہ اسے
دیکھتے ہی بولا۔" کیوں باؤ جی وہ آرہا ہے؟"
" ہاں!" اس نے بے رُخی سے کہا
لالو ہنسا۔" بس ختم ہوگئی بادشاہی!"
مسعود کا چہرہ غصے سے لال ہوگیا۔ اور بڑے طیش میں
آکر اس نے لالو کی گردن پر ہاتھ رکھ دیا" کیا بات ہے؟"
لالو خوف زدہ ہوگیا۔" اوہ باؤ — باؤ جی! کچھ نہیں
....." وہ گڑگڑانے لگا۔ مسعود نے اس کے شانے پر ایک
بھرپور ہاتھ مارا اور پھر اپنے کمرے کی طرف ہولیا
وہ دہلیز پر قدم رکھ رہا تھا کہ دور سے لالی کی آواز
آئی " کل صبح جب وہ آئے گا تو میں تیرے کمرے میں اُسے

لاؤں گی باؤ ---- تو اسے ضرور رکھنا نا۔ وہ میری قدر نہیں کرتا۔"

مسعود نے سوچا کہ وہ فضول غصے میں آیا ہوا تھا۔ یہ عورت کس قدر معصوم تھی یہ عورت یوسف کے پیار میں پاگل ہو گئی تھی اور اس میں لالی بے چاری کا کیا قصور تھا!

"ہاں لالی اسے ضرور لانا" اس نے آہستہ سے کہا۔

"کل اتوار ہے اور میں اپنے کمرے ہی میں موجود رہوں گا!"

لالی نے جھوم کر جیسے انگڑائی لی اور چھلاوے کی مانند اچھلتی کودتی گلی کا موڑ مڑ گئی۔

صبح شور سن کر مسعود جاگ اٹھا۔ کمرے کا دروازہ نیم وا کر کے اس نے گلی میں جھانک کر دیکھا۔ بہت سی عورتیں مرد اور بچے لالی کے گرد جمع تھے اور وہ چیخ چیخ کر گالیاں دے رہی تھی: "گشتیے! تو نے مجھے کیا سمجھا ---- اسے میں اپنے یوسف پر اس ایک باؤ کو کیا سینکڑوں باؤوں کو نثار کر دوں!"

جینو تیلن چلائی۔ "آنے دے یوسف کو وہ تیرے کرتوت دیکھے گا تو ..... !"

"او چپ کر مال زادی!" لالی چیخی۔ "میں تیری طرح تو نہیں کیتیے! کہ سگے جیٹھ کو پھنسائے پھروں ...... !"

مسعود نے کچھ اور نہیں سنا۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا رہا تھا اور کانوں کے پردوں پر ایک شور لہریں مار رہا تھا!

پلٹ کر اس نے دروازہ بند کیا اور اپنی چارپائی پر ... اکڑ کر بیٹھ گیا۔ پتہ نہیں وہ کب تک یوں ہی بیٹھا رہا مگر جب اسے ہوش آیا تو کوئی اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ مضمحل سا وہ اٹھا۔ دروازہ کھولا تو لالی کھڑی ہوئی نظر آئی۔

مسعود کا دل چاہا اسے غصے سے کہہ دے کہ وہ کبھی اس کے کمرے تک نہ آئے ---- آہستہ سے لالی دروازہ کھول کر اندر آگئی۔

مسعود نے دیکھا۔ لالی نے لال اور پیلے رنگ کی قمیض اور ویسا ہی لہنگا پہن رکھا تھا۔ اس کے بال بڑی طرح سے سنورے ہوئے تھے اور آنکھوں میں بے انتہا چمک تھی۔ ہونٹوں پہ مستی اور آنکھوں کا کاجل اس کے جذبات کو ظاہر کر رہا تھا۔ وہ بے حد خوش تھی اور اس کے بازوؤں پر کانچ کی رنگین چوڑیاں بھی ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر بلوریں قہقہے کی سی آواز دے رہی تھیں!

"کیا بات ہے؟" اس نے دکھ سے پوچھا

"اسے وہ جینو چڑیل سے آج میرا جھگڑا ہوا۔ کہنے لگی ہوئی کہ تجھے اب یوسف کی کیا ضرورت، باؤ جو موجود ہے ---- حرامزادی!" اس نے یکے بعد دیگرے چار پانچ موٹی موٹی گالیاں دے دیں۔

"دیکھو لالی، اب تو ادھر مت آیا کر ----" مسعود نے کہا "یوسف آجائے گا تو پھر تیرا بیاہ ہو جائے گا اور پھر تو ---- تو یہاں مت آنا ----" وہ رک رک گیا

"باؤ!" وہ اس کے قریب ہو گئی۔ "تو مجھے کیا سمجھتا ہے۔ میں تو تیری بڑی عزت کرتی ہوں۔ باؤ تو ہی تو اک میرا ہمدرد ہے اور میرا کون ہے ---- تجھ سے ہی تو میں یوسف کی شکایت کرتی ہوں۔ اور تو نے میرے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ تو نے میرے دکھ درد کو اپنا سمجھا ہے۔ میں تیرے احسان کو بھول سکتی ہوں! ہائے باؤ! یوسف کو ذرا آنے دے وہ ان ساروں کو ٹھیک کر دے گا۔ پر ہائے باؤ میں کیا کروں۔ جتنا پیار مجھے اس سے ہے اسے مجھ سے نہیں" وہ پھر اپنا رونا رونے لگی۔

اسی دم دروازہ کھلا اور یوسف کی آواز آئی۔ "لالی!"

لالی نے مسرت سے دروازے کی طرف دیکھا اور پھر تیزی سے اٹھ کر دروازہ کھول کر بولی: "یوسف ---- اوئے یوسف آگیا!"

مسعود چپ چاپ رہا

یوسف اکڑے ہوئے جسم کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ لالی اس کے سینے کے قریب سر جھکائے، خوشی سے بولی:

ہ! تیرا دوست آگیا!"

سعود نے بیدلی سے یوسف کو دیکھا۔ "آؤ — آؤ!"

یوسف اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑا ہوگیا۔ "اوئے

بلالو کیا کہتا ہے — یہ جینو تیلن کیا کہتی ہے!"

سعود نے بے بسی سے لالی کی طرف دیکھا وہ یوسف کا منہ

رہی تھی۔

یوسف نے کمر پہ ہاتھ رکھ کر اکڑ کے کہا۔ "اوئے باؤ، تونے

کے پردے میں بڑا حق ادا کیا —" پھر غصے سے لالی کی

دیکھ کر بولا: "اور تو نے میرے پیار کا خوب صلہ دیا لالی۔!"

لالی نے سر جھکا لیا

یوسف نے کڑک کر کہا: "چل گھر جا — خبردار جواب

ہر آئی!"

سعود نے سر اور جھکا لیا۔

گھنٹہ بھر بعد جب مسعود اپنا سامان باندھ رہا تھا، اس کے ذہن میں ایک ہلچل مچی ہوئی تھی اور سینے میں ایک طوفان برپا تھا۔ اسے کچھ خبر نہ تھی کہ یہ کیا ہوا تھا اور اب کیا ہونے والا تھا۔ وہ جیسے خود ایک طوفان تھا اور اپنی ذات پہ خود ہی تباہی مچا رہا تھا اور اب اندھیرے کے ایک منجدھار میں ڈوب رہا تھا —

اٹیچی کیس کو بند کر کے وہ گلی میں کھڑے ہوئے تانگے میں سامان رکھنے کو دروازے سے باہر آیا تو اسے لالی کی آواز سنائی دی۔ ٹھٹھک کر اس نے دیکھا۔ وہ گلی کی نکڑ پر کھڑی تھی اور ایک عورت سے کہہ رہی تھی۔ "ائے تجھے پتہ ہے یوسف نے میری خاطر باؤ سے لڑائی کی — ہائے ری میری خاطر — میری خاطر!"

ثقافتی ورثہ

ترجمہ، جلیل حشمی

پنجابی نظم

ذرا زُلفیں بکھیر کے دُوپٹے کو گرا
وہی گھنی گھنی چھاؤں وہی مہکی ہوا
وہی میٹھی ہنسی جیسے بجیں کہیں کانچ
وہی یادوں کی تھپک وہی دھیمی دھیمی آنچ
وہی سپنے ترے وہی غم وہی دھیان
وہی تُو وہی ہم وہی آہٹوں پہ کان
تجھے کس نے کہا، ہم اور ہو گئے
تجھے دل دے کر ہم چور ہو گئے!!

شیخ ایاز

سال گزشتہ میں سندھی اَدب کی ترقی

۱۹۶۰ء کے سندھی ادب کا سب سے زیادہ جاذب
ورجاندار پہلو یہ ہے کہ ہم نے اپنے افسانوی اور شعری
ب میں ان اقدار کو نسبتاً بہتر طور پر برتا ہے جو ہماری اپنی
آزیں ثقافتی روایات سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ وہ زندہ
بندہ ثقافتی روایات جن کا مادہ اب سندھی اَدب میں
نئے انداز سے ہو رہا ہے صرف سندھی اہل قلم کے لئے
ابل قبول نہیں ہیں بلکہ اُردو، ہندی اور مغربی زبانوں کے
بھی انھیں نئے اور پرکشش تخلیقی محرکات کے طور پر اپنا
، ہیں۔

گزشتہ ایک سال کی ادبی تحقیقات میں سب سے
بری نظر سندھی شاعری پر پڑی ہے اور یہ دیکھ کر مجھے مسرت
اہے کہ سطحی اور تقلیدی قسم کی غزل گوئی کا رواج اب
ے شعری اُدب سے کافی حد تک خارج ہو گیا ہے۔ غزلیں
بُوکم کہی گئی ہیں اور جو کہی گئی ہیں ان میں سے زیادہ تر
رلوں کے اپنے داخلی تجربات کی عکاسی کرتی ہوئی معلوم
ہیں۔ اس خوشگوار تبدیلی کا اثر اسلوب بیان پر بھی
پڑا ہے فارسی تراکیب لفظی اور غیر مانوس تشبیہات و
ارات کی بجائے ہماری غزلوں میں اب مقامی رنگ
ں اور سندھی لب و لہجے کی فراوانی نظر آتی ہے۔

معنوی اعتبار سے بھی ۱۹۶۰ء کی غزلوں میں ہمیں کچھ
ایسی ہی تبدیلیاں ملتی ہیں جیسی کہ اُردو کی گنی چنی غزلوں
میں نظر آتی ہیں۔ گنی چنی کا استعمال میں اُردو غزلوں کے
سلسلے میں اس لئے کر رہا ہوں کہ اردو کے غزلگو شعراء کی
اکثریت اب بھی اسی تغزل کی پیرو ہے جس میں چند مخصوص
الفاظ کی بازگشت کے علاوہ کسی جدّت طرازی کا سراغ مشکل
ہی سے مل سکتا ہے۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا جس کا
اطلاق کسی حد تک سندھی غزلوں پر بھی ہو سکتا ہے لیکن
جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ سندھی شاعری میں غزلوں
کی تعداد اب کم ہوتی جاتی ہے اور وہ سندھی شاعر جو آج
بھی غزلگوئی کی طرف مائل ہیں ان کے یہاں ذاتی مشاہدے
شخصی تجربے اور اپنے ماحول کے شدید احساس کی معنوی
خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ اس نئے رجحان کا یہ کرشمہ ہے کہ
ایک طرف تو انفرادیت پسندانہ نقطۂ نظر سے سندھی غزل
کو نئی تخلیقی صلاحیتیں ملی ہیں اور دوسری طرف وہ تشبیہات،
استعارات اور محاورات ہماری غزلوں میں داخل ہوئے
ہیں جن کو ہم اس لحاظ سے نیا کہہ سکتے ہیں کہ ان کا اظہار
اس سے پہلے کی غزلوں میں نہیں ہوا تھا۔
ہندی کی طرح سندھی زبان گیتوں کے لئے بیحد

موزوں ہے۔ گیتوں کا رواج یوں تو سندھی شاعری میں بہت پہلے سے ہے لیکن گزشتہ ایک سال میں جو مُنظرِ گیت میری نظر سے گزرے ہیں انھیں دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آئندہ جو گیت لکھے جائیں گے ان کی مقبولیت دیگر اُصنافِ شعری کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوگی اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ گیتوں میں جس بے تکلفی اور بے ساختگی سے ہم سلیس، سادہ اور مترنم سندھی الفاظ استعمال کرسکتے ہیں اس بے تکلفی اور بیساختگی سے سوائے دوہوں کے کسی اور صنفِ سخن میں نہیں کرسکتے۔ سندھی عوام شاہ لطیف اور سچل سرمست کی کافیوں سے جو رغبت رکھتے ہیں اس کا سبب بھی یہی ہے کہ ان میں انھیں اپنے دیس کی بولی اور اپنے رسم و رواج کی بھرپور ترجمانی ملتی ہے اور کچھ ایسی ہی کیفیت اب اُن البیلے گیتوں میں پیدا ہو چلی ہے جو بیتے ہوئے ایک سال میں لکھے گئے۔ ان گیتوں میں ہمارے شاعروں نے ہیئت (Forms) کے بعض بڑے خوش آئند تجربے کئے ہیں۔

دوہے لکھنے کا شوق ۱۹۶۰ء میں کچھ اور نمایاں ہوا ہے لیکن ایسے دوہے کہنے والے صرف دو تین شاعر ہی ہیں جنھیں واقعی دوہے لکھنے کا سلیقہ ہے اور جن کے دوہوں کو جدید سندھی شاعری میں مثالی حیثیت حاصل ہے۔

گیتوں کی طرح دوہوں کے لئے بھی سندھی زبان کا لب و لہجہ بہت مناسب ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اب سے تین چار سال پہلے میں نے سندھی دوہے لکھنے کی جو ابتدا کی تھی اسے سندھی ادب دوستوں نے بے حد پسند کیا اور ۱۹۶۰ء میں جو دوہے میں نے کہے ہیں ان میں سے بیشتر دوہوں کا منظوم اُردو ترجمہ بھی کیا جا چکا ہے۔

۱۹۶۰ء کے شعری ادب میں سندھی نظموں کا حصہ بھی سندھی شاعری کے روشن مستقبل کا آئینہ دار ہے ان نظموں میں زیادہ تعداد مقفیٰ نظموں کی ہے اور آزاد نظمیں ان کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔

بیت وائی اور کافی وہ اصنافِ سخن ہیں سندھی شاعری کی ابتدا ہوئی تھی یہ اصنافِ سخن شاعروں کو موجودہ دور میں بھی بے حد عزیز ہیں گذشتہ کی شاعری میں بیت وائی اور کافی کے کئی نمونے میری نظر سے گزرے ہیں۔ قدیم سندھی طرز لکھنے کا رواج از سرِ نو ہماری شاعری میں زندہ ہو اور میں اسے سندھی زبان و ادب کیلئے فالِ نیک تصور کرتا کے اعتبار سے سندھی بیت دیگر اصنافِ سخن سے بالکل الگ قوافی کا التزام ان میں کچھ اس طرح ہوتا ہے کہ بظاہر ان کی آزاد سے قریب تر ہوجاتی ہے لیکن درحقیقت قدیم زمانے سے جداگانہ اسلوب رہا ہے جس میں کبھی کبھی جدت طرازی سے بھی ہے۔ ۱۹۶۰ء کے سندھی بیت ہیئت کی جدت سے قطع نظر معنوی جدت آفرینی کے اعتبار سے اُدب کے لئے ایک نئی چیز ہیں۔

لوک گیتوں کا رواج ہر علاقے میں رہا ہے۔ نے کے بھی بہت سے ایسے لوک گیت ہیں جو اب تک ادب کی زیب و زینت نہیں بن سکے ہیں۔ یہ گزشتہ اُمید افزا ہیں کہ پچھلے ایک سال میں لوک گیتوں کو کے سلسلے میں بھی ہمارے چند ذی شعور اہلِ قلم منہمک رہے ہیں اور اس انہاک کے نتیجے میں جو گیت ہم تک پہنچے ہیں وہ ہمارا قابلِ قدر ادبی سرمایہ مجموعی طور پر ہم نے اپنے شعری سرمائے خوشگوار اضافے کئے ہیں ان کا ایک حوصلہ افزا بھی ہے کہ اس نئے دور میں سندھی شعر و ادب پہلے کی بہ نسبت کہیں زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا جا اب سندھی شعر و شاعری کے قدردان نہ صرف اس وادیٔ مہران محدود ہیں بلکہ برصغیر کے ہر ایسے خطے میں موجود ہیں جس کو دبستان کی حیثیت حاصل رہی ہے یہی نہیں بلکہ اشاعتی مہ

...ۓ نے ہمارے لئے کچھ اور آسانیاں پیدا کی
...ہیں امید ہے کہ کلچر کے دارالاشاعت سے شعری
...وں کی اشاعت کا مسئلہ کچھ اور زیادہ آسان ہوسکے

افسانوی ادب میں ناول اور ڈرامے کی کمی افسوسناک
...البتہ افسانوں کے معاملے میں سندھی افسانہ نگاروں
...تحسین قابل داد ہیں۔ سندھی افسانہ نگاروں میں
...افسانہ نگار ایسے ہیں جنھیں بڑے افسانہ نگاروں
...کہا جاسکتا ہے اور انھوں نے حسب معمول ۱۹۶۰ء
...بھی بعض بڑے اچھے افسانے لکھے ہیں جن میں اپنے
...کے سماجی اور معاشرتی مسائل کا گہرا شعور ملتا
...

افسانہ نگاری کے میدان میں طبع زاد افسانوں کے
...کافی تعداد ایسے افسانوں کی بھی ہے جو اردو، ہندی
...زبانوں سے سندھی میں ترجمہ کئے گئے۔

طنز و مزاح سے تعلق رکھنے والی نگارشات مجھے
...ایک سال کے ادب میں برائے نام نظر آئیں اور
...میں بھی کوئی ایسی قابل ذکر خوبی نہیں ملی جو تحریر کو طنز
...اح کے اس معیار پر لا سکتی جو اردو اور انگریزی کے
...نگاروں نے قائم کیا ہے۔ سندھی اہل قلم میں دو تین
...ے ذہین طنز و مزاح نگار ہیں اور انھوں نے ۱۹۶۰ء
پہلے کئی ناقابل فراموش تحریریں سندھی ادب میں
...ا کی ہیں لیکن ۱۹۶۰ء کا ادب ان کی تخلیقات سے
...ارا ہے اس کا سبب سوائے اس کے اور کچھ نہیں
...لتا کہ ان کی معاشی مصروفیات نے وقتی طور پر تخلیق
...سے بے نیازی اختیار کرلی ہے

۱۹۶۰ء سے پہلے کے سندھی ادب میں تنقیدی
...ین کی طرف ذرا کم ہی توجہ دی گئی تھی لیکن اس ایک
...ل میں کئی ایسے تنقیدی مضامین بھی لکھے گئے جن کو فن
تنقید نگاری کے لحاظ سے نثری ادب میں اور کچھ نہ سہی تو
اتنی اہمیت تو ضرور حاصل ہے کہ انھوں نے کسی حد تک
سندھی ادب میں تنقید نگاری کی کمی کو پورا کیا ہے۔

تاریخ کا ادب سے جو قریبی تعلق ہے اس تعلق کی
بنیاد پر سندھی میں ایسے مقالات اکثر و بیشتر لکھے جاتے
رہے ہیں جو ہمیں اپنے ماضی کے تہذیبی، تمدنی، ثقافتی
اور علمی و ادبی کارناموں سے رُوشناس کرسکیں۔ اس قسم
کے مقالات سے ہمارے ادب کو کچھ ایسی جاندار روایات
بھی مل جاتی ہیں جن سے ہم جدید تخلیقی ادب میں تجدیدی
محرکات کا کام لے سکتے ہیں۔ سال گذشتہ میں ہمارے
بعض محققین نے سومرہ عہد، کلہوڑہ عہد، مغلیہ دور اور
تالپور فرمان رواؤں کے زمانے کے متعلق چند بڑے کام
کے مقالات دیئے ہیں جن کے مطالعے سے ہمیں سندھی
زبان و ادب کی تاریخ کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہوتی
ہے۔ A general Survey of Sindhi language and literature .... کے طور پر
سندھی ادب کے متعلق ۱۹۶۰ء میں ایک قابل قدر مقالہ
انگریزی میں لکھا گیا جو ان اہل ادب کے لئے کافی حد
تک معلومات افزا ہوسکتا ہے جنھوں نے سندھی ادب
کا بالواسطہ مطالعہ نہیں کیا ہے۔

سال گذشتہ کے نثری ادب میں کچھ دلچسپ سفرناموں
اور دور حاضرہ کے اہم موضوعات پر ہلکے پھلکے سندھی مضامین
کا سلسلہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ سندھی نثر میں اردو نثر
کی طرح مختلف قسم کے تجربات کئے جارہے ہیں۔ عین ممکن
ہے کہ آئندہ اس قسم کی قلمی کوششیں ہمارے نثری ادب
کو مالا مال کرنے کے لئے زیادہ بہتر صلاحیتوں کا ثبوت دیں
اور سندھی ادب میں کئی صاحب طرز انشاء پرداز پیدا
ہوسکیں۔

سندھی کے بعض مشہور و معروف ماہرین لسانیات نے سندھی ادب کے ذخیرۂ الفاظ پر گزرے سال میں نسبتاً زیادہ بہتر طور پر کام کیا ہے۔ سنسکرت سے سندھی کا رشتہ ماں اور بیٹی کی طرح ہے۔ اس رشتے کی بدولت سنسکرت سے نکلے ہوئے جو الفاظ سندھی زبان و ادب میں مستعمل ہیں ان پر طویل تحقیقی مقالے سپرد قلم کئے گئے ہیں اور یہ بات اور بھی زیادہ خوش کن ہے کہ سندھی لغات کو جامع سندھی لغات کی حیثیت سے مرتب کیا گیا ہے۔ ۱۹۶۰ء میں اس لغات کی پہلی جلد جو صرف الف اور 'ب' کے حروف سے شروع ہونے والے الفاظ پر مشتمل ہے سندھی ادبی بورڈ نے شائع کی ہے

سندھی ادب کی ترقی و ترویج میں سندھی ادبی بورڈ نے جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں ان کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ اس ادارے نے گزشتہ چار پانچ سال میں ایک سو سے زیادہ معیاری سندھی ادبی کتابیں شائع کی ہیں۔ ان کتابوں میں قدیم سندھی [illegible] ادب سے تعلق رکھنے والی کتابیں بھی ہیں اور جدید ادب کو پیش کرنے والی کتابیں بھی۔ کتابوں کے علاوہ اس ادارے نے 'مہران' جیسا سہ ماہی جریدہ بھی سندھی ادب کی ترقی و توسیع کے لئے جاری کیا ہے۔ میں نے اس مختصر سے مضمون کی تیاری میں ۱۹۶۰ء میں شائع ہونے والے جن ادبی جریدوں سے مدد لی ہے ان میں [illegible] کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ مہران کے علاوہ 'نئیں زندگی' 'مارئی' اور 'روح رہان' کے شمارے بھی میرے پیش نظر ہیں۔

۱۹۶۰ء کے سندھی ادب کے متعلق جو کچھ میں [illegible] وہ نہ مکمل ہے اور نہ مفصل۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ گراں قدر تخلیقات میری نظر سے نہ گزری ہوں اس لئے میں نے [illegible] کے نام گنوانے سے احتراز کیا ہے۔ مقصد اس مختصر سے [illegible] کا یہ تھا کہ پاکستان رائٹرز گلڈ کی دوسری سالگرہ کے پر [illegible] موقع پر پاکستان کی ہر زبان کے اہل قلم جمع ہوئے ہیں [illegible] لئے یہ ایک اچھا شگون ہے کہ ہم ایک دوسرے کی ادبی تخلیقات اور مجموعی ترقی کے متعلق کچھ جان سکیں۔ میں نہیں کہہ سکتا میں نے اس مقصد کو کہاں تک پورا کیا ہے۔ بہرصورت عدیم الفرصتی کے باوجود جو کچھ مجھے ۱۹۶۰ء کے سندھی ادب کے متعلق معلوم تھا آپ کے سامنے پیش کر دیا۔

ایک نئی تحریک کا "جائزہ"

برادر محترم عالی صاحب   السلام علیکم۔ مزاج گرامی

ادارۂ مصنفین اگر مصنفین کے حقوق کی حفاظت کے لئے برسرِ عمل ہے تو مصنف فروش بھی اپنے مفاد سے غافل نہیں ہیں۔ میں آپ کی توجہ ماہنامہ "جائزہ" کے ایک حالیہ اقدام کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جو ادارۂ مصنفین کی کوششوں کو زک پہنچانے کے لئے کیا گیا ہے۔ مذکورہ پرچے کے ناشرائے آر ممتاز کی طرف سے ایک چھپا ہوا مراسلہ ایسے ادیبوں کے نام بھیجا گیا ہے جنہوں نے ۴۷ء کے بعد لکھنا شروع کیا ہے۔ بظاہر یہ مراسلہ اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ نئے لکھنے والے پرانے لکھنے والوں سے کم نہیں ہیں اور اس لئے ان کی نمائندہ اشاعت ضروری ہے۔ جس کے پیش نظر ان نئے لکھنے والوں کی تحریروں پر مشتمل ایک نمبر "جائزہ" نکال رہا ہے۔ لیکن بباطن مراسلے کا مقصد یہ ہے کہ نئے لکھنے والے شائع ہونے کے وعدے میں آکر انھیں آئندہ تحریریں چھاپنے کا غیر مشروط اجازت نامہ لکھ دیں۔ ہمیں ناشرین کی ان چالوں سے خبردار رہنا پڑے گا۔ میری رائے میں تو اگر ہر تحریر کے لئے الگ اجازت نامے کی قانونی پابندی کا التزام ہو سکے تو بہت مناسب ہوگا۔ یہ کام صرف ادارۂ مصنفین ہی انجام دے سکتا ہے۔

مخلص،   نصیر احمد ناصر

علاقائی سرگرمیاں

ادارہ مصنفین پاکستان پشاور (پشتو) کے تنقیدی جلسوں کا ایک مختصر خاکہ

ئدی اجلاس نمبر ۱ :- اتوار ۱۹ دسمبر ۱۹۶۰ء

صدارت :- شوکت علی خان

غزل :- ولی محمد طوفان

مقالہ :- قلندر مومند

اجلاس نمبر ۲ :- جمعہ ۲۳ دسمبر ۱۹۶۰ء

صدارت :- اصغر

غزل :- لطیف وہمی

اجلاس نمبر ۳ :- جمعہ ۳۰ دسمبر ۱۹۶۰ء

صدارت :- ولی محمد طوفان

غزل :- قلندر مومند

اجلاس نمبر ۴ :- جمعہ ۶ جنوری ۱۹۶۱ء

صدارت :- لطیف وہمی

غزل :- اکرام اللہ گران

افسانہ :- شمس خلیق

اجلاس نمبر ۵ :- جمعہ ۱۳ جنوری ۱۹۶۱ء

صدارت :- غلام عباس

غزل محمد اصغر

اجلاس نمبر ۶ :- جمعہ ۲۰ جنوری ۱۹۶۱ء

صدارت :- غلام محمد خان مقصد

غزل :- ظفر زہیر

اجلاس نمبر ۷ :- جمعہ ۲۷ جنوری ۱۹۶۱ء

صدارت :- عبدالرحیم مجذوب

غزل :- غلام محمد خان مقصد

اجلاس نمبر ۸ :- جمعہ ۳ فروری ۱۹۶۱ء

صدارت :- محمد اعظم اعظم

غزل داؤد خان داؤد

اجلاس نمبر ۹ :- جمعہ ۳۱ مارچ ۱۹۶۱ء

صدارت :- ولی محمد طوفان

غزل :- لطیف وہمی

مقالہ :- قلندر مومند

مرسلہ

ظفر زہیر

خبرنامہ

اطرافِ عالم

امجد اکیڈمی کا ایک اہم اجلاس

امجد اکیڈمی کی مجلس انتظامیہ کا ایک جلسہ حمایت نگر (حیدرآباد) (بھارت) میاں جناب پروفیسر عبد
کی قیام گاہ پر ہوا جس میں اُردو کے مشہور شاعر حضرت امجد حیدرآبادی کے سانحہ ارتحال پر افسوس اور م
متعلقین سے ہمدردی کا اظہار کیا گیا۔

استاد ملکھی رام لاہوری کی رحلت

پچھلے دنوں دہلی میں پنجابی زبان کے مشہور شاعر استاد ملکھی رام لاہوری ۹۱ سال کی عمر میں د
پا گئے۔ ملکھی رام پنجابی زبان کے قادر الکلام شاعر اور درجنوں سہ حرفیوں اور قصیدہ جات کے مص

اُردو دوستی

پٹیالہ (مشرقی پنجاب) کے لسانی محکمہ نے ہندی اور پنجابی ادبا کی حوصلہ افزائی کے ساتھ اُر
کے بھی ایک مشہور شاعر کی حوصلہ افزائی کا فیصلہ کیا ہے اس سال ادیبوں کی حوصلہ افزائی کے لئے
کے ڈاکٹر گوپال سنگھ دردی، ہندی کے سنت رام اور اُردو کے شاعر جوش ملسیانی کا انتخاب عمل میں
واضح رہے کہ یہ پہلا موقع ہے کہ حکومت نے اُردو ادیبوں کی حوصلہ افزائی کی۔

سائیکل رکشا والے اردو شاعر کو انعام

فرید کوٹ (مشرقی پنجاب) میں تسل تخلص کرنے والے ایک شاعر نے جو سائیکل رکشا چلا کر ا
کماتا ہے اپنی بہترین نظم پر تین سو روپے کا انعام حاصل کیا ہے۔ حال ہی میں پنجابی رائٹرز ا
ایشن نے اپنی مخصوص نشست میں اس انعام کا اعلان کر کے غریب اُردو شعرا و ادبا کی ہمت افزائی کی

امریکہ میں یومِ اقبال

۲۱ اپریل ۱۹۶۱ء کو واشنگٹن (امریکہ) میں علامہ اقبال کی ۲۳ ویں برسی منائی گئی اس تق
کی صدارت امریکی عدالت عالیہ کے مددگار جج ولیم اوڈگلس جو امریکہ میں اقبال سوسائٹی کے افزا
بھی ہیں نے کی۔ اس موقع پر ادارہ اقوام متحدہ کے دفاتر کے ناظم ڈاکٹر ولیم جوڈن نے اقبال
شخصیت اور ان کے فن پر روشنی ڈالی۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر ولیم اقبال کے بڑے مداح ہیں اور ان
پاکستانی شاعروں کا کافی مطالعہ کیا ہے۔

حکومت امریکہ اور اُردو

غیرملکی زبانوں سے امریکی طلبا کی دلچسپی کو حکومت کی جانب سے بڑی تقویت پہنچی ہے اس کا ا
اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ حکومت امریکہ نے ان زبانوں کی تعلیم کے لئے جو امریکہ میں عام ط
نہیں پڑھائی جاتیں ۵۶۹ وظائف مقرر کئے ہیں ان میں سے ۲۴۵ وظائف اردو، عربی، چینی، ہن
جاپانی، پرتگالی اور روسی زبان کی تعلیم کے لئے ہیں باقی وظائف افریقی بولیوں سے لے کر جد
تک ۱۳۰ دوسری زبانوں کے لئے ہیں۔

بزمِ سعدی کا سولہواں اجلاس

حیدر آباد (بھارت) ۲۵ مارچ ۱۹۶۱ء کو ۸ بجے شب بزمِ سعدی کا سولہواں اجلاس جناب قمر حسن چیف جسٹس کی صدارت میں منعقد ہوا۔ نظام نواب میر عثمان علی خان کی فارسی شاعری پر جناب برق موسوی نے پرمغز مقالہ پڑھا جس کی سامعین نے بے حد تعریف کی۔ جناب یوسف زئی نے تاجکستان کے ممتاز شاعر میرزا ترسون زادہ پر معلومات افزا مقالہ پڑھا۔ آخر میں فارسی طرحی مشاعرہ ہوا، اس مشاعرے کے لئے لندن سے اکبر حیدرآبادی، دہلی سے تلوک چند محروم، بمبئی سے رئیس امروہوی، پونا سے سید یعقوب، علیگڑھ سے ضیا احمد بدایونی، کراچی سے ناصح رضوی اور ڈاکٹر گل محمد بلوچ نے طرحی غزلیں روانہ کی تھیں۔ حیدرآباد کے شعرا میں شاہ عثمان نے غزل کہی تھی ...... جس کو قمر ساحری نے پڑھ کر سنایا۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر طاہر سلیم، خسرو قادری، برق موسوی، اثر ساحری، حامد بن شبیر، نور محمد نور، حیدر شمسی، شرر آستانی اور عبدالحمید حمید نے اپنا کلام سنایا۔ یہ یادگار محفل ۱۲ بجے شب اختتام کو پہنچی۔

حلقہ کراچی

گلڈ کی جانب سے ضیافت

مورخہ ۱۸-اپریل ۱۹۶۱ء کو ادارہ مصنفین پاکستان حلقہ کراچی کی جانب سے جرمنی کی مشہور و معروف پروفیسر ڈاکٹر شیمل کو ہوٹل شیزان صدر کراچی میں ایک ضیافت دی گئی جس میں حلقہ کراچی اور مرکزی مجلس عاملہ کے عہدیداروں نے شرکت کی۔ چائے کے بعد حلقہ کراچی کے سکریٹری طفیل احمد جمالی نے گلڈ کے قیام، لائحہ عمل، دستور اور اس کی دو سالہ کارگزاریوں کا مختصر خاکہ پیش کیا۔ آخر میں ڈاکٹر شیمل نے حاضرین کو یقین دلایا کہ وہ یورپی ممالک میں گلڈ پر مضامین لکھیں گی اور آئندہ جب کبھی پاکستان آئیں گی تو اردو میں تقریر کریں گی۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر شیمل یورپ کی بیشتر زبانیں جانتی ہیں بلکہ انھیں اسلامی فلسفے اور لٹریچر سے بڑا شغف رہا ہے یہی وجہ ہے کہ موصوفہ عربی، فارسی، اردو اور سندھی کو جلد از جلد سیکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس موقع پر جناب حفیظ ہوشیارپوری نے بھی تقریر کی۔

یوم اقبال

اقبال اکیڈمی کراچی کے زیر انتظام ۲۱ اپریل کو یوم اقبال منایا گیا اس سلسلے میں ہوٹل میٹرو میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر محمود حسین وائس چانسلر ڈھاکہ یونیورسٹی نے کی اس موقع پر ملک کے بیشتر ممتاز ادیب موجود تھے جلسے میں مشرقی و مغربی پاکستان کے ممتاز ادیبوں اور شاعروں نے اپنے گرانقدر مقالوں، معلوماتی تقریروں اور معیاری نظموں کی صورت میں علامہ اقبال کو خراج عقیدت پیش کیا۔

مصنفوں اور پبلشروں کے کاپی رائٹ

پچھلے دنوں دہلی میں بین المملکتی ثقافتی کانفرنس میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے پاکستانی وفد کی قیادت کی تھی اس کانفرنس میں ڈاکٹر صاحب نے خاص طور پر ادبی اور ثقافتی معاملات میں دونوں ملکوں کے درمیان معلومات طلبا، اور تحقیقی کام کرنے والوں اور پروفیسروں کے تبادلے پر زور دیا۔ انھوں نے کتابوں رسالوں ریکارڈوں وغیرہ کے تبادلے کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی کانفرنس نے مصنفین

کی کہ مصنفوں اور پبلشروں کے کاپی رائٹ کے حقوق محفوظ رکھنے کا بندوبست کیا جائے دونوں ملک کے ادیبوں مصنفوں اور صحافیوں سے دونوں ملکوں کے باشندوں کے درمیان خیر سگالی کی فضا پیدا کی اپیل کی گئی۔ واضح رہے کہ اس کانفرنس میں ادارہ مصنفین پاکستان کے ۴۰ اراکین نے شرکت کی تھی۔

جذبی گلڈ کی نشست میں

۱۴۔ اپریل کو ہوٹل ایکسلیئر صدر کراچی میں (حلقہ کراچی) کی پندرہ روزہ ادبی نشست زیر صدارت جناب ذوالفقار علی بخاری منعقد ہوئی پروگرام کے مطابق جناب حسین کاظمی نے فارسی سے ایک افسانے کا اردو ترجمہ اور جناب باسط سلیم نے اپنا ڈرامہ تنقید کے لئے پیش کیا ادارے کی اس نشست میں پاک و ہند کے مشہور شاعر جناب معین احسن جذبی بھی مدعو تھے۔ تنقیدی نشست کے بعد جذبی صاحب کی صدارت میں ایک غیر رسمی محفل مشاعرہ منعقد ہوئی جس میں حاضرین شعراء نے شرکت کی۔ جذبی صاحب نے اپنے تازہ ترین کلام سے حاضرین کو محظوظ کیا۔

ادارۂ مصنفین پاکستان (حلقہ کراچی) کی دو اہم قرار دادیں

ادارہ مصنفین پاکستان (حلقہ کراچی) نے پروفیسر عبدالستار کی قبل از وقت موت پر اظہار تعزیت کیا۔ مرحوم بنگلہ کے ایک بلند پایہ ڈرامہ اور افسانہ نگار تھے اور پچھلے سال ان کی تصنیف "کوبی دا" پر آدم جی ادبی انعام دیا گیا تھا۔ ایک قرارداد کے ذریعہ ادارے کی طرف سے مرحوم کے پسماندگان سے ہمدردی کا اظہار کیا گیا۔

دوسری قرارداد کے ذریعے ادارہ مصنفین پاکستان نے اُردو کے مشہور شاعر اور ادیب حسن امام وارثی کے انتقال پر ملال پر تعزیت کا اظہار کیا۔ حسن امام وارثی نے غیر منقسم ہندوستان کے صوبہ بہار میں اپنے ادبی ماہنامے "ندیم" گیا کے ذریعے اردو ادب کی بیش بہا خدمات انجام دی تھیں۔

گلڈ کی پندرہ روزہ اُدبی نشست

۲۸ اپریل ۱۹۶۱ء ۵ بجے شام کو ہوٹل ایکسلیئر صدر کراچی میں ادارے کی پندرہ روزہ ادبی نشست زیر صدارت جناب انجم اعظمی منعقد ہوئی۔ تنقیدی پروگرام سے پہلے آدم جی ادبی انعام پانے والے بنگلہ ڈرامہ و افسانہ نگار پروفیسر عبدالستار کی قبل از وقت موت پر ایک قرارداد کی صورت میں اظہار افسوس کیا گیا۔ بنگلہ کی مشہور ادیبہ بیگم جہین آرا و مقصود علی (اراکین گلڈ) نے اپنی مختصر تقریروں میں مرحوم کی شخصیت اور فن پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد اُردو کے مشہور شاعر و ادیب حسن امام کی رحلت پر بھی ایک قرارداد منظور کی گئی۔

پروگرام کے مطابق جناب اطہر نفیس نے اپنی غزل تنقید کے لئے پیش کی۔ اس کے بعد "اُردو ادب میں تجربے کی اہمیت" کے موضوع پر ایک محفل تذکرہ منعقد ہوئی۔

حلقہ مغربی پاکستان

[...]ں کا اُدب تخلیق کرنے کے [...] ادارہ قائم کرنے کی تجویز

ادارہ مصنفین پاکستان کے سیکریٹری جنرل قدرت اللہ شہاب نے سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کے جلسہ اسناد کے موقع پر اپنی تقریر میں اس بات پر زور دیا کہ ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے جو بچّا

پیمانہ پر ایسا غیر نصابی ادب تیار کرے جو بچوں کے لئے کافی دلچسپی رکھتا ہو۔ ایسی غیر نصابی دلچسپ کتابوں سے بچوں میں صحیح ادبی رجحان اور مقصدیت کا شعور پیدا ہوگا۔

ان میں جشنِ فرید

۱۵ اپریل ۶۱ء کو ملتان میں جشن فرید کا دو روزہ اجلاس شروع ہوا اس تقریب کا افتتاح اطلاعات و نشریات اور امور کشمیر کے وزیر جناب اختر حسین نے کیا انہوں نے قومی ثقافت کے صحیح مفہوم سے لوگوں کو آگاہ کیا خواجہ فرید کی شخصیت فن اور ان کے کلام پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی اور ان کی خدمات کو سراہا۔ اس تقریب میں پاکستان کے بیشتر ادیبوں، شاعروں، عالموں، اور دانشوروں نے شرکت کی۔ مرکزی گلڈ کی جانب سے ادیبوں کا ایک وفد بھی اس کانفرنس میں شریک ہوا جس میں گلڈ کے سکریٹری جنرل قدرت اللہ شہاب، فیض احمد فیض، شاہد احمد دہلوی، ممتاز حسین، سید وقار عظیم ذوالفقار علی بخاری، ابن انشا، انور، رفیق خاور، امیر حمزہ شنواری، انتظار حسین، فارغ بخاری، ناصر کاظمی اور مقصد علی وغیرہ شامل تھے

ادارہ مصنفین پاکستان کے اراکین اس تقریب میں شریک ہوئے جشن فرید کا یہ دو روزہ اجلاس بہت کامیاب رہا۔ معلوم ہوا ہے کہ صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے جشن کے اخراجات کے لئے پانچ ہزار روپیہ امیر بھاولپور اور .... وزیر تعلیم اختر حسین نے پانچ ہزار اور ایک ہزار روپے (بالترتیب) بطور عطیات دیئے۔

اقبال کی تقریبات

میرپور خاص۔ ۲۱ اپریل ۶۱ء کو تھرپارکر ڈسٹرکٹ کلچرل ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام یوم اقبال منایا گیا جس میں میرپور خاص کے مقتدر ادباء و شعراء کے علاوہ پاکستان کی کئی مشہور و معروف ادبی شخصیتوں نے شرکت کی۔ اقبال پر مقالے پڑھنے والوں میں میرپور خاص گورنمنٹ کالج کے پرنسپل سید کرار حسین پروفیسر مسعود احمد اور جناب اقتدار قدر بھی شامل تھے۔

۲۲ اپریل کو سکھر میں یوم اقبال منایا گیا۔ جس میں سکھر کے بیشتر ادیبوں نے شریک ہو کر علامہ اقبال کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اس موقع پر ایک عظیم الشان پاک و ہند مشاعرہ بھی منعقد ہوا جس میں پاک و ہند کے بیشتر مشاہیر شعرائے کرام نے شرکت کی۔

حکومت اور فنونِ لطیفہ

لاہور میں بچوں کے آرٹ کی بین الاقوامی نمائش کے موقع پر آرٹ کے شائقین کے ایک خاص اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے ناظم مارشل لاء (حلقہ بی) لیفٹیننٹ جنرل بختیار رانا نے کہا کہ موجودہ حکومت فنون لطیفہ کی پوری طرح ہمت افزائی کر رہی ہے اور آرٹ کو حکومت کا بڑھتا ہوا تعاون آئندہ بھی حاصل رہے گا۔
اس نمائش کا انتظام چائلڈ ویلفیر کونسل اور پاکستان آرٹ کونسل کے مشترکہ تعاون سے کیا گیا تھا۔

بن پاکستان (کوہاٹ) ادبی نشست

۱۵ اپریل ۶۱ء بوقت ۸½ بجے شب جناح لائبریری کوہاٹ میں پاکستان رائٹرز گلڈ کوہاٹ کا ادبی اجلاس زیر صدارت جناب نذیر اشک کاشمیری منعقد ہوا۔ اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے گلڈ کوہاٹ کے سکریٹری نے "گلڈ کا تعارف" کے عنوان سے ایک مضمون پڑھا۔ محمد شعیب قریشی نے "دردستان کا رومان" کے عنوان گلگت کے علاقائی گیتوں پر مشتمل ایک مختصر افسانہ اور نذیر اشک کاشمیری صدر مجلس نے اپنا

مضمون بعنوان "سحر البیان اور سحر اللسان" تنقید کے لئے پیش کیا۔ بعدہٗ ایک غیر طرحی مشاعرہ منعقد ہوا جس میں تسلائٹ لیفٹیننٹ صفدر قاضی سعید، مقرب آفندی، ادیب ساغر، محمد شفیع متین، شجاعت علی راہی، امتیاز ظلمت، عزیز اختر وارثی، شمس الزماں شمس اور صاحب صدر نے اپنا کلام سنایا۔ یہ اجلاس ساڑھے گیارہ بجے شب ختم ہوا۔

حلقہ مشرقی پاکستان

یوم اقبال

۲۱ اپریل ۶۱ء کو ڈھاکہ میں اقبال ہال اسٹوڈینٹس یونین کے زیر اہتمام یوم اقبال منایا گیا اس سلسلے میں ایک مجلس مذاکرہ منعقد ہوئی جس میں ڈھاکہ کے ممتاز ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کی کشور مجلس کی انتظامیہ کمیٹی نے بھی ٹی بی کی ٹکٹیں فروخت کرکے یوم اقبال کی تقریبات میں حصہ لیا۔

ڈھاکہ لٹریری کانفرنس

ڈھاکہ میں پچھلے دنوں انسٹیٹیوٹ آف انجینیرز کی عمارت میں انجمن ادب کے زیر انتظام لٹریری کانفرنس منعقد ہوئی اس کانفرنس میں پاکستان کے بیشتر ممتاز ادیبوں نے حصہ لیا جناب ممتاز حسین ڈپٹی چیرمین پلاننگ کمیشن نے اپنی تقریر میں کہا کہ اردو کا مسئلہ صرف لسانی، ادبی اور ثقافتی ہے اسے کسی سیاسی سوال میں خلط ملط نہ کیا جائے اردو کو دنیا کی کسی زبان سے چشمک نہیں بلکہ اس کے برعکس اس میں عجیب وغریب جاذبیت ہے جو دوسری زبانوں کے محاورات و الفاظ کو جذب کر لیتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ایسا ادب تخلیق کیا جائے جو گزشتہ دور کی تباہیوں کے بعد ابھرا اور تاریخ میں جاودانی زندگی قائم کرے کانفرنس میں جن ادیبوں نے مقالے پڑھے ان میں ادارۂ مصنفین پاکستان کے ایک سرگرم رکن جناب صلاح الدین محمد بھی شامل تھے۔ بیگم صوفیہ کمال اور جناب سلیم اللہ فہمی (جوائنٹ سیکرٹری وزارت خوراک و زراعت) نے اپنی تقریروں میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے اردو بنگلہ ادیبوں کے اتحاد پر زور دیا اور کہا کہ اردو اور بنگلہ کے ادبا کے درمیان قرابت ضروری ہے

نئے لکھنے والوں سے

- جواب طلب امور کے لئے ہمیشہ لفافہ کارڈ یا ٹکٹ ارسال فرمائیے۔
- مرسلہ مضامین نظم و نثر کی ایک نقل اپنے پاس ضرور محفوظ رکھئے، ناقابل اشاعت چیزیں ضائع کر دی جاتی ہیں۔
- تراجم پر اصل مصنف اور زبان کا نام ضرور لکھیئے۔
- تخلیقات ایڈیٹر کی ترتیب کے مطابق اپنے نمبر پر شائع کی جاتی ہیں تخلیقات کی فوری اشاعت پر اصرار نہ فرمایئے

(ادارہ)

بقیہ از صفحہ ۵۰

میں باہر نکال دوں گی"

چمن اور بکی دونوں حیران رہ گئے۔ چمن بکی کو اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے کا تناؤ کم ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں غصے کی جگہ پیار امڈ آیا تھا لیکن اس پیار میں بھی کھسیانہ پن نمایاں تھا۔ وہ بڑی کوشش سے مسکرایا اور کہنے لگا —— "لیکن اس میں رونے کی کیا بات ہے؟"

یہ تو اِنکے آبدار دانتوں ہی سے ظاہر ہے...
...کہ یہ
تبت
ٹوتھ پیسٹ استعمال کرتی ہیں
TIBET
TOOTH PASTE
with Chlorophyll
TIBET
سادہ یا کلوروفل کے ساتھ تبت ٹوتھ پیسٹ دانتوں کی
جلا اور بقا کا بہترین ذریعہ ہے۔ اس کے استعمال سے مسوڑے مضبوط
رہتے ہیں اور منہ میں مہک اور تازگی پیدا ہوتی ہے۔
کوہِ نور کیمیکل کمپنی لمیٹڈ — کراچی - ڈھاکہ
آرائشِ جمال کی معیاری مصنوعات اور عمدہ صابن بنانے والے
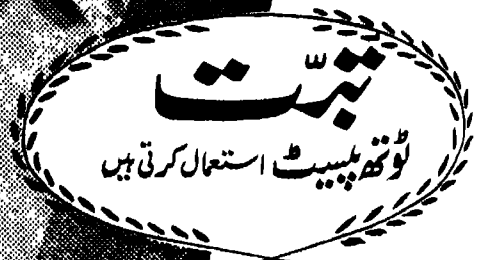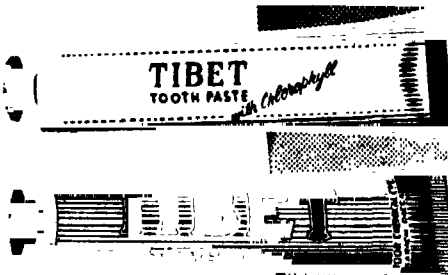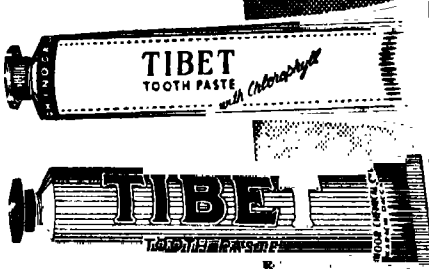
Printed at The International Press, McLeod Road, Karachi

جون سنہ ۱۹۶۱ء

شمارہ ۱۰

پاکستان رائٹرز گلڈ

ہم قلم میں شائع ہونیوالی ہر تحریر کا معاوضہ دیا جاتا ہے
ان تحریروں کے حقوق بحق مصنفین محفوظ رہتے ہیں

ماہنامہ

ادارۂ مصنفین پاکستان، حلقہ کراچی
(پاکستان رائٹرز گلڈ) کا ترجمان
جلد ـــــ شمارہ ۱۰

جون سنہ ۱۹۶۱ء

فی پرچہ	۶۲ پیسے
سالانہ	چھ روپے

(اراکین ادارۂ مصنفین پاکستان سے ۵ روپے (سالانہ)
(جس میں خاص نمبر بھی شامل ہیں)

بھارت میں ترسیل زر کا پتہ
ایم برکت اللہ عادل
نمبر ۱۲۰ - چک بازار روڈ کراس، بنگلور ۱

پتہ
۲۰ ہوٹل ایکسلیر، صدر، کراچی نمبر ۳
فون ۵۳۰۵۵/۲۰

ہمارا منشور

ہم پاکستان کی جملہ زبانوں کے ادیب خود کو مادر وطن کی ترقی،
لت بین الاقوامی امن کے آدرش اور انسانیت کی ترقی کیلئے
ف کرتے ہیں، ہم ان حقوق انسانی پر ایمان رکھتے ہیں۔ جن کی
رتیح اقوام متحدہ کے منشور میں کی گئی ہے۔ بہ حیثیت ادیب کے ہم
ے خیالات کے اظہار اور ترسیل کی آزادی کے لئے بنیادی
ن کے حامی ہیں جس کے بغیر تخلیقی اُدب بے مقصد ہوتا ہے۔
اپنی ان عظیم روایات پر جو ہمیں ماضی سے ملی ہیں، پورا فخر ہے
ان کے تحفظ اور ان کو مزید فروغ دینے کا عہد کرتے ہیں ہم
، مقدس فرض سے جو صداقت کی عکاسی، حب وطن کی قدریں
شو و نما، بین الاقوامی اُخوت اور تعاون کے فروغ اور انسانی
ات کے قیام سے متعلق ہے، کما حقہ، آگاہ ہیں تاکہ انسانیت
ہ سے زیادہ راحت، طمانیت اور وقار کے ساتھ اپنا وجود
رکھ سکے۔

ادیب ہونے کی حیثیت سے فرداً فرداً اور اجتماعی طور پر
ایسے خوشحال اور صحت مند معاشرے کی ترقی کے لئے اپنی
اری کو قبول کرتے ہیں جس میں سب کے لئے آزادانہ
ی مواقع فراہم ہوں، اور جہاں دولت و اقتدار، انسانی
ل اور رُوحانی تصورات کے تابع ہوں۔ اسی لئے علم و
ر کی ترقی کو دُنیا میں امن اور خوش حالی کے فروغ کا
سمجھتے ہیں۔"

(پاکستان رائٹرز گلڈ کے تاسیسی اجلاس میں
بروز ۳۱ر جنوری ۱۹۵۹ء منظور ہوا)

ترتیب

اداریہ

مضامین

اُردو شاعری میں ایہام گوئی	ڈاکٹر مولوی عبدالحق
قومی اور علاقائی تہذیبوں کا رشتہ	سبطِ حسن
فن اور لاشعور	ضمیر علی بدایونی
سائنس کا اثر ہماری تہذیب وثقافت پر	علی ناصر زیدی

نظمیں

ساتھیوں کی تلاش	منیر نیازی
میرے ہمدم، میرے محسن، میرے دوست	ظہور نظر
بساطِ ہوائے دل	سید وحید اختر
تلاش	شہاب جعفری
افریقا	سحر انصاری
سات پلوں کی ملکہ	منصور قیصر
آگ وہی ہے	ذکی احمد صدیقی

غزلیں

احسان دانش
ناصر کاظمی — قتیل شفائی
شکیب جلالی — قمر جمیل
قمر نجمی — مہدی ظہیر متو کلیمی
طاہر احمر — جمال پانی پتی

رپورتاژ

اُٹھ فرید اسّتیا	انور

منظوم کہانی

الحمرا کی بیٹی (واشنگٹن ارونگ)	جلیل حشمی

افسانے

کون کسی کا	ام عمارہ
نوردن	سعیدہ بدر

ثقافتی ورثہ	پشتو زبان کی اولین نظم	فارغ بخاری	۷۷
	کافی (خواجہ غلام فرید)	رشید لاشاری	۷۸
خبرنامہ	اطراف عالم، حلقہ کراچی، مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کی ادبی خبریں		۸۱
ضروری اعلانات	۱۔ ایک نوٹس		۲
	۲۔ راولپنڈی سب ریجن ۔ نیا دفتر		۶
	۳۔ پنجابی سب ریجن کا قیام		۶
	۴۔ پاکستانی شاعری انگریزی کے روپ میں		۷
	۵۔ لاہور کے دفتر کی منتقلی		۱۲
	۶۔ کراچی ریجن کی ادبی نشستیں		۷۳
	۷۔ مصنفین کی تخلیقی سرگرمیاں		۸۹
	۸۔ نئے اراکین کی فہرست		۹۵

اراکین پاکستان رائٹرز گلڈ سے

ضروری گزارش

اس ماہ کے "ہم قلم" کے بعد ادارہ پاکستان رائٹرز گلڈ کی جانب سے ماہنامہ "ہم قلم" آپ کی خدمت میں اس وقت بھیجا جائے گا جب کہ آپ اس کی خریداری قبول فرمالیں۔ اس سلسلے میں اراکین کے لیے خصوصی رعایت یہ رکھی گئی ہے کہ ۳۰ رجون ۱۹۶۱ء تک خریدار بن جانے والے اراکین سے صرف چار روپے سالانہ چندہ وصول کیا جارہا ہے اور اس کے بعد خریداری قبول کرنے والے اراکین سے پانچ روپے زرِ سالانہ وصول کیا جائے گا۔ توقع ہے کہ "ہم قلم" کی بقا اور استحکام کے لئے آپ اس کی سرپرستی قبول فرمائیں گے

اداریہ

بہت سی باتیں جو اس اداریے میں کہنے کی ہیں وہ آئندہ صفحات کے اعلانات اور اطلاع ناموں میں آگئی ہیں تاہم اگر گفتہ را باز گویم رواست۔ پہلی پر مسرت خبر تو یہی ہے کہ ہمارا مغربی پاکستان کا صدر دفتر لاہور میں پرانی انارکلی کے کرایہ کے دفتر سے اٹھ کر اس عمارت میں آگیا ہے جو اسمبلی ہال کے عقب میں منٹگمری روڈ اور کوپر روڈ کے مقام اتصال پر واقع ہے اور پرنسز ہوٹل کہلاتی ہے۔ ضروری انتظامات مکمل ہونے کے بعد اس کا نام "گلڈ ہاؤس" ہو جائے گا۔ یہ عمارت تین لاکھ پچاسی ہزار روپے میں حکومت نے پاکستان رائٹرز گلڈ کے نام منتقل کی ہے۔ آگے چل کر اس میں ایک بڑا کتب خانہ، دارالمطالعہ، ادیبوں کا کلب اور مہمان ادیبوں کا ہوسٹل قائم ہوگا۔ فی الحال اس کا کچھ حصہ تجارتی اداروں کے پاس کرایہ پر بھی رہے گا جس سے اس عمارت اور دفتر کے اخراجات پورے ہوں گے۔

مغربی پاکستان میں دوسری اہم خبر پاکستان رائٹرز گلڈ کے پنجابی سب ریجن کا قیام ہے۔ پنجابی لکھنے والے ادیبوں کی ایک بڑی جماعت ہے جسے اپنی فعال سرگرمیوں کے لئے ایک مرکز کی ضرورت تھی۔ پنجابی ادب کی تصنیف و اشاعت پنجابی زبان کے ادب سے متعلق گلڈ کے انعامات کا انصرام، پنجابی کی ترقی کے لئے مذاکرے اور جلسے منعقد کرنا اسی سب ریجن کی ذمہ داری ہوگی۔ دفتر اس سب ریجن کا بھی پرنسز ہوٹل میں علاقائی دفتر کے ساتھ رہے گا۔ البتہ کنوینر (ڈاکٹر عبدالسلام خورشید) سے خط و کتابت مسلم ٹاؤن لاہور کے پتے پر کی جائے۔

راولپنڈی سب ریجن نے بھی اپنا دفتر لے لیا ہے اور سرگرمیوں کا آغاز کر دیا ہے۔ گوجرانوالہ میں بھی فعال سب ریجن قائم ہو گیا ہے۔ لائلپور کے لئے نئے کنوینر جناب منظور احمد منظور مقرر ہوئے ہیں اور نئی مجلس عاملہ بنی ہے ملتان گلڈ ہاؤس ہوٹل کے متعلق جن اختلافات کی مبالغہ آمیز خبریں اخباروں میں چھپتی تھیں، بحسن و خوبی طے ہو گئے ہیں اور سبھی متعلقین نے اپنے حقوق گلڈ کے سکریٹری جنرل کے حوالے کر دیے ہیں بعض قانونی ملحوظات کے پیش نظر اب اس کے انتظام کے لئے ایک نسبتاً وسیع تر بورڈ بنایا جائے گا۔ بہاولپور میں بھی گلڈ کی سرگرمیاں زور پکڑ رہی ہیں حیدرآباد میں جو گڑبڑ تھی اس کا حل بھی علاقائی سکرٹری صاحب نے نکالا ہے اور انشاءاللہ اسی ماہ میں وہاں کے مسائل بھی طے ہو جائیں گے۔ پشاور میں نئی انتظامیہ بنی ہے۔ جن دو تین صاحبوں کو بعض امور پر اختلاف تھا اور جو الگ جلسے کرتے تھے ان سے درخواست کی گئی ہے کہ مرکز کی تسلیم کردہ انتظامیہ کے ساتھ تعاون کریں۔ پشاور کے اردو سب ریجن کی تشکیل نو بھی ہو رہی ہے اور ہم اپنے محترم جناب عبدالقادر ڈائرکٹر پشتو اکاڈمی اور

پروفیسر طاہر فاروقی کے خاص طور پر ممنون ہیں کہ ان کی کوششوں سے پشاور کے اُمور رو بہ توازن ہیں ۔ یوم رحمٰن بابا اور جشن خواجہ فرید کی تفصیلات آپ آئندہ اوراق میں ملاحظہ فرمائیں گے ۔

پاکستان کے ادب کو بیرونی دنیا سے متعارف کرانے کی پہلی شق وہ کتاب ہے جس میں پاکستان کی مختلف زبانوں کے منتخب شعری ادب کے انگریزی تراجم شامل ہیں ۔ اس سلسلے میں آئندہ دو کتابیں آرہی ہیں ۔ منٹو کی کہانیاں انگریزی میں اور پنجابی شاعری قدیم وجدید کے انگریزی ترجمے ، دوسری زبانوں کے تراجم بھی ہمارے آئندہ پروگرام کا جزو ہیں ۔

گلڈ کے دارالاشاعت سے بنگلہ اور اُردو کتابوں کی کھیپ (جس میں علاقائی زبانوں کی تاریخ اور تراجم بھی شامل ہیں) جولائی کے وسط تک بازار میں آجائے گی ۔ اخراجات میں کفایت کے لئے ہم نے دارالاشاعت کے صرف دو مرکز رکھے ہیں ۔ بنگلہ کے لئے ڈھاکے میں ، اُردو اور مغربی پاکستان کی دیگر زبانوں کے لئے لاہور میں جہاں طباعت واشاعت کی آسانیاں بہتر اور کم خرچ ہیں ۔ آئندہ کتابوں کے انتخاب کی ذمہ داری علاقائی دفتروں پر نہیں ، فقط مرکز پر ہے اور چونکہ دارالاشاعت قرض کے روپے سے شروع کیا گیا ہے اس لئے ٹھوس معیاری کم بکنے والی کتابوں کے ساتھ ساتھ شاعری اور فکشن کی ان کتابوں کو ترجیح دی جاتی ہے جن کی بازار میں زیادہ مانگ ہو ۔ اسی وجہ سے شروع میں پروگرام قدرے محدود بھی ہے ۔ دارالاشاعت ذرا چل نکلے تو نئے ادیبوں کی نگارشات کے لئے زیادہ گنجائش پیدا ہو جائے گی ۔ پروگرام میں مشمولہ کتابوں کے بارے میں کراچی اور لاہور کی بحث بھی غلط اور غیر متعلق ہے ۔ ان دونوں علاقوں کا فرق محض انتظامی ہے لسانی نہیں ۔ ایک ہی زبان کے متعدد ادیب اکثر مغربی پاکستان سے کراچی منتقل ہوتے رہتے ہیں اور اس کے بالعکس ۔ آئندہ شمارے میں ان ساری کتابوں کا اعلان شامل ہوگا ۔ اپنے مصالح اور تمایلات کو تقویت دینے کے لئے علاقائی سوالات پیدا کرنا گلڈ کے جذبۂ یگانگت کے منافی ہوگا ۔

انہی صفحات میں اس نوٹس کے اقتباسات (اُردو ترجمہ) بھی شائع کئے جا رہے ہیں جو ایک انتخابی پرچے کی طرف سے سکرٹری کراچی برانچ اور مدیر ہم قلم کو بھیجا گیا ہے ۔ اس نوٹس کا کافی وشافی جواب فوراً دیا گیا ، لیکن اس سے ہمارے قارئین اندازہ کریں گے کہ مشترکہ مفادات کے لئے کام کرنے والے کارکنوں کو کیا مراحل پیش آتے ہیں ۔ مقدمہ دائر کرتے ہیں پشاور سے دو صاحبان 'ان کو گلڈ اپنی اعلان کردہ پالیسی کے مطابق (ان صاحبوں کی درخواست پر) پبلشروں سے اپنا حق لینے کے لئے ، قانونی امداد کے طور پر کچھ رقوم دیتا ہے (زیادہ تر صورتوں میں یہ رقوم قرض ہوتی ہیں) اور دھمکی دی جاتی ہے سکرٹری کراچی برانچ کو کہ 'افتخار الدین سے تمہارے تعلقات طشت ازبام کئے جائیں گے اور دہلی میں تمہاری ہسٹری جو ہے اس کو بھی پبلک میں اچھالا جائے گا ۔ ورنہ ــــ' کیا اس کے لئے بلیک میل کے علاوہ کوئی نام ہو سکتا ہے ؟ لہ

(مرکز)

لہ اسی قسم کا ایک نوٹس سکریٹری جنرل کو بھی موصول ہوا ہے جو اتہامات اور دھمکیوں کا مضحکہ خیز مرکب ہے +

ایک نوٹس

بنام طفیل احمد جمالی سکرٹری کراچی انجمن و مدیر ہم قلم

(اقتباس)

مظفر اینڈ کمپنی ایڈووکیٹس

۲۷، جہانگیر کوٹھاری بلڈنگس کراچی

۸ مئی ۱۹۶۱

'جائزہ' کراچی کے ایڈیٹر پرنٹر پبلشر کے حسب ہدایت تمہیں لکھا جاتا ہے کہ ان دو خبروں[1] کے سلسلے میں غیر مشروط معافی مانگو جو ہم قلم اپریل ۱۹۶۱ء کے صفحہ ۳ پر شائع ہوئی ہیں۔ یہ معافی ہم قلم کے آئندہ شمارے کے ٹائیٹل کی پشت پر نمایاں طور پر چھاپی جائے ورنہ تمہارے خلاف دیوانی اور فوجداری اقدامات کئے جائیں گے ہرجہ خرچہ تمہارے ذمے۔

تم نے ماہنامہ جائزہ کراچی کے خلاف ایک شرانگیزی اور بلیک میلنگ کی مہم شروع کر رکھی ہے۔ معلوم ہوتا تم کو اس جماعت کے بے اثر و اقتدار کے متعلق کچھ غلط فہمی ہے جسے تم پاکستان رائٹرز گلڈ کہہ کے پکارتے ہو یہ جاننے موکل تم کو تمہاری گزشتہ ہسٹری یاد دلانا چاہتے ہیں، میاں افتخار الدین کے زمانے سے لے کر اب تک کی اور اس سے پہلے دہلی میں جو کچھ تم تھے اور تم کو مشورہ دیتے ہیں کہ سوچو ٹھنڈے دل سے اور خیال کرو تمہارا کیا حشر ہوگا جب تم کو تمہاری بداعمالیوں کی جواب دہی کے لئے عدالت میں لایا جائے گا۔ (لفظی ترجمہ)

راولپنڈی سب انجمن - نیا دفتر

راولپنڈی سب انجمن نے اپنی ادبی اور تنظیمی سرگرمیوں کا آغاز کر دیا ہے۔ ممتاز مفتی صاحب اس سب انجمن کے لئے کنوینر مقرر ہوئے ہیں اور سب انجمن کے لئے ایک باقاعدہ دفتر (نزد میسی گیٹ) حاصل کر لیا گیا ہے۔ ۲۸ رمئی ۶۱ کو پریس کلب، لیاقت گارڈنز میں اس کا افتتاح ہوا۔

پنجابی سب انجمن کا قیام

ہمارے اراکین کو یہ معلوم کر کے مسرت ہوگی کہ مغربی پاکستان میں پنجابی کا باقاعدہ سب انجمن قائم ہوگیا ہے جس کے کنوینر ڈاکٹر عبدالسلام خورشید مقرر ہوئے ہیں اور اراکین انتظامیہ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم۔ ڈاکٹر فقیر محمد۔ عبدالمجید بھٹی اور منیر نیازی۔ پنجابی کے ادیبوں کے تعاون سے یہ سب انجمن بہت جلد اپنی علمی ادبی سرگرمیوں کا آغاز کر رہا ہے۔

---

[1] پہلی خبر کا عنوان ہے "جائزہ" کے خلاف عدالتی کارروائی (رفقا اخباری رپورٹ) دوسری خبر ہے "جائزہ سے بے تعلقی کا اعلان" ——— وقار ابنِ بیان کہ جائزہ والے ان کے منع کرنے کے باوجود ان کا نام صلاح کاروں میں چھاپے جا رہے ہیں۔

قدیم و جدید پاکستانی شاعری، انگریزی کے رُوپ میں
پاکستان رائٹرز گلڈ کی پیشکش

PRESENTING
PAKISTANI
POETRY

مؤلفہ جی۔ الانا

: اُردو، بنگالی۔ سندھی۔ پنجابی۔ پشتو۔ بلوچی اور گجراتی کی منتخب
قدیم و جدید نظموں کے تراجم کا حسین مجموعہ

اُردو : اقبال۔ ظفر علی خاں۔ حفیظ جالندھری۔ جوش ملیح آبادی۔ فیض۔ راشد۔ احسان دانش۔ اختر شیرانی۔ مختار صدیقی۔ احمد ندیم قاسمی۔ قیوم نظر۔ یوسف ظفر وغیرہ

بنگلہ : نذرالاسلام۔ جسیم الدین۔ کوی غلام مصطفےٰ۔ فرخ احمد۔ ابوالحسین۔ سید علی احسن۔ بیگم صوفیہ کمال۔ شمس الرحمٰن۔ لطیف رشید وغیرہ۔

سندھی : شاہ لطیف بھٹائی۔ شاہ کریم۔ سچل سرمست۔ بیدل۔ شیخ عبدالحلیم جوش۔ شیخ ایاز۔ تنویر عباسی۔ سید حسن بخش وغیرہ

پشتو : چند عوامی گیت۔ امیر کروڑ پہلوان۔ رحمٰن بابا۔ احمد شاہ ابدالی۔ خوشحال خاں خٹک۔ سمندر خاں سمندر وغیرہ

پنجابی : وارث شاہ۔ فضل شاہ۔ سلطان باہو۔ ہاشم شاہ۔ خواجہ غلام فرید۔ صوفی تبسم وغیرہ

گجراتی : سالک پوپٹیا۔ قمر جوناگڑھی۔ توفیق پریتم وغیرہ

بلوچی : چند بلوچی لوک گیت۔ آزاد جمالدینی۔ گل خاں نصیر۔ قاسم ہوت وغیرہ

یہ مجموعہ جی الانا کے علاوہ حسب ذیل مترجمین کی کاوشوں کا حاصل ہے :۔
الطاف حسین۔ ایچ۔ ٹی۔ سورلے۔ مہدی علی سلجوقی۔ سر عبدالقادر۔ کیرن۔ اے۔ کیو۔ نیاز۔ بیگم یوسف جمال حسین۔ سید علی اشرف۔ محمد ایاز خاں۔ غلام یعقوب انور۔ شریف پٹیل وغیرہ

بہترین کاغذ طباعت۔ بڑا سائز ـــــ ضخامت سوا دو سو صفحے۔

قیمت دس روپے

تاریخ اشاعت ۲۰ رجون ۱۹۶۱ء

خریداری کیلئے حسب ذیل پتے پر رجوع کیجئے

پاکستان رائٹرز گلڈ

۲۰۔ بوٹل وارکسلے۔ صدر۔ کراچی۔ ۳

آپ پی-آئی-اے سے سفر کرنا پسند کرتے ہیں، کیونکہ

آپ جانتے ہیں کہ ....

پی-آئی-اے کی سروس کا معیار اتنا بلند ہو گیا ہے کہ ہر طیارہ اپنے مقررہ وقت پر پرواز کرتا ہے، اور ٹھیک وقت پر آپ کو منزلِ مقصود پر پہنچاتا ہے۔

- ہر پرواز، سبک رو، اور تیز رفتار ہوتی ہے اور اس کے علاوہ آپ کے آرام کے لیے انفرادی توجہ دی جاتی ہے۔
- ہوائی سفر سے روپیہ کی کفایت اور وقت کی کفایت ہوتی ہے۔ اور گرد اور تپش سے چھٹکارا حاصل ہوتا ہے۔
- ہر پرواز پر فرسٹ کلاس، اور ٹورسٹ کلاس نشستیں اور مشروبات کا مکمل انتظام ہے۔

یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے زیادہ لوگ پی-آئی-اے سے سفر کرنا پسند کرتے ہیں۔

پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز

تفصیلات اپنے سفری ایجنٹ یا پی آئی اے کلب روڈ سے براہ راست دریافت فرمائیے۔ ٹیلیفون ۵۱۰۶۱/دس لائنیں
کارگو کا دفتر سیفی ہاؤس کچہری روڈ۔ کراچی ٹیلیفون: ۵۱-۳۲۰۵۵/تین لائنیں۔

اکٹر مولوی عبدالحق

اردو شاعری میں ایہام گوئی

صنائع بدائع ادب کا جز ہیں۔ یہ ایک فطری چیز ہے
کا حسن بڑھانے کے لئے نہیں بلکہ اکثر اوقات مفہوم کو
طور پر ادا کرنے کے لئے اس کی ضرورت پڑتی ہے۔
جب صنعت کے ساتھ تصنع اور تکلف آجاتا ہے اور
سوچ کر اور کوشش کر کے صنائع کو داخل کیا جاتا ہے
م بے لطف اور مضحکہ خیز ہوجاتا ہے۔ شعر شعر نہیں
صنائع جگت ہوجاتا ہے اردو شاعری پر فارسی کا بہت
ر ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ یہ اس کی دست گرفتہ اور
رہ ہے۔ صنائع ادبی جو ہمارے ہاں رائج ہیں سب
سے آئے ہیں۔ اردو شاعری میں تجنیس۔ مراعاۃ النظیر
یہام وغیرہ کے بڑے دور دور رہے ہیں خاص
ہام کا تو ایک خاص دور گزرا ہے جب کہ اس کا شوق
حد تک پہنچ گیا تھا اور ایہام ریختے کی ایک قسم قرار
دی گئی تھی۔ چنانچہ میر تقی میر نے جہاں ریختے کی
گنوائی ہیں وہاں ایہام کو بھی اس کی ایک قسم بتایا
فرماتے ہیں۔

"پنجم ایہام است کہ در شاعران سلف دریں فن رواج
تا اکنون طبعہا مصروف ایں صنعت کم است گر بسیار
لی بستہ شود۔"

اس کے بعد وہ ایہام کی تعریف کرتے ہیں۔

"معنی ایہام اینست کہ لفظے کہ برو بنائے بیت بود آں دو
معنی داشتہ باشد یکے قریب یکے بعید۔ وبعید منظور شاعر
باشد و قریب متروک او۔"

ایہام گوئی کا سارا دارومدار ذو معنے لفظ پر ہے اور
یہ کھیل اسی سے کھیلا جاتا ہے۔ فارسی میں تکلفات کی کچھ کمی
نہیں خصوصاً متاخرین نے اس معاملے میں کوئی کسر نہیں
اُٹھا رکھی لیکن باوجود اس کے فارسی شعرا نے غزل میں صنائع
کے استعمال میں احتیاط سے کام لیا ہے اور اس کا استعمال
اس حد تک نہیں کیا کہ وہ گراں گزرے۔ اس لئے یہ خیال قرین
صحت معلوم ہوتا ہے کہ اردو ایہام گوئی پر زیادہ تر ہندی شاعری
کا اثر ہوا ہے اور ہندی میں یہ چیز سنسکرت سے پہنچی ہے۔

سنسکرت میں اس صنعت کا نام شلیش ہے شلیش
ایسے لفظ کو کہتے ہیں جس کے کئی معنی ہوں۔ اس کی کئی قسمیں
ہیں لیکن خاص قسمیں دو ہیں۔ سبھنگ اور ابھنگ۔ سبھنگ
وہ حالت ہے جب کہ لفظ سالم رہتا ہے اور ابھنگ وہ ہے
جب کہ لفظ کے ٹکڑے کرکے یہ صنعت پیدا کی جاتی ہے۔

ہندی میں اس صنعت کو بہت فروغ ہوا اور اس کی
لے یہاں تک بڑھی کہ بعض جدت پسند صاحبوں نے بہاری
کے کلام سے طبی نسخے نکالے ہیں۔ ہندی میں اکثر شاعروں
نے اس صنعت کو استعمال کیا ہے۔ مثلاً رحیم کہتا ہے

جیون رحیم گئی دیپ کی کل کپوت گئی سوئے
بارے اجیارو لگے بڑھے اندھیرو ہوئے

جیسے چراغ کی حالت ہے ایسے ہی خاندان میں کپوت کی حالت ہے۔ جلانے پر اُجالا ہوتا ہے اور بڑھانے پر اندھیرا۔

یہاں بارا کا لفظ ذو معنی ہے ایک معنے بچپن کے اور دوسرے جلانے کے۔ اسی طرح بڑھنا کے بھی دو معنے ہیں یعنی بچے کا بڑھنا اور چراغ کا بڑھنا یعنے بجھنا۔ آخری مصرع کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ بچپن میں بچہ اُجالا ہوتا ہے اور جُوں جُوں بڑھتا جاتا ہے تو وہ اندھیرا ہو جاتا ہے۔ بہاری لعل کا ایک شعر ہے۔

چرجیو جوری جورے کیوں نہ سینہ گنبھیر
کو گھٹی یہ ورش بھانو جانے ہلدھر کے ویر

(رادھا کرشن) کی جوڑی دیر تک قائم رہے۔ دونوں میں گہری محبت کیوں نہ ہو۔ دونوں برابر کی جوڑی ہیں۔ ایک ورش بھانو کی بیٹی ہے اور دوسرا بلرام کا بھائی ہے۔

یہاں ورش بھانو جا کے لفظ کو توڑ کر صنعت ایہام پیدا کی گئی ہے ورشبھ یعنے بیل اور انوجا کے معنے چھوٹی بہن اور اسی طرح ہلدھر کے دو معنے لئے گئے ہیں ایک بلرام کا نام ہے اور دوسرا ہلدھر یعنے بیل۔ دوسرا مطلب یہ ہوا کہ ایک تو بیل اور دوسری بیل کی چھوٹی بہن ——
رس خان کہتا ہے

کو رس کے مس جو رس چاہت سو رس کا ہنہ
بیو نیکو نہ پٹی ہو

یعنے گنو کے رس کے بہانے سے جو رس چاہتے ہو وہ کشن جی تم کو نہیں ملے گا۔ دوسرے معنے گورس کے دودھ کے ہیں۔

اورنگ زیب۔ بہادر شاہ اور ان کے بعد محمد شاہ کے عہد میں اگرچہ ہندی کے اعلیٰ درجے کے اُستاد بہت کم ہوئے ہیں لیکن تعداد میں ہندی شاعر بہ کثرت پائے جاتے ہیں اور کم تر درجہ کے شعراء کا یہ قاعدہ ہے کہ وہ بجائے معانی کے الفاظ سے زیادہ کام لیتے ہیں اور طرح طرح کی صنعتوں سے اپنی دکان سجاتے ہیں ایسے اُردو شعراء کیلئے جن کی رسائی بلند معانی تک نہ تھی اور جن کا تخیل بام رفعت تک پہنچنے سے عاجز تھا۔ یہ چیز بہت للچانے والی تھی۔ عہد محمد شاہ میں جس میں اُردو شاعری کا چرچا عام ہو گیا تھا اس بارے میں خاص امتیاز رکھتا ہے۔ اس دور میں چھوٹے بڑے سب شاعر ایہام گوئی میں مبتلا پائے جاتے ہیں۔ محمد شاہی دربار کے تکلفات نے اس قسم کی شاعری کو اور فروغ دیا۔ اس گروہ کا سب سے بڑا ملاذ نجم الدین شاہ مبارک آبرو ہے۔ آبرو گوالیار کے رہنے والے اور سراج الدین علی خاں آرزو کے شاگرد تھے۔ ابتدائی جوانی سے شاہجہاں آباد میں آگئے تھے۔ انہیں ایہام گوئی کا چسکا ایسا پڑ گیا تھا کہ گویا بغیر اس کے شعر سوجھتا ہی نہ تھا۔ طبیعت شوخ پائی تھی اس لئے اور بھی کھلے۔ مضمون بگڑتے بگڑ جائے۔ متانت رہے یا نہ رہے لیکن ایہام ہاتھ سے نہ جائے۔ شعر گوئی ایہام کے مترادف ہو گئی تھی۔ تمام ایہام گو شعراء کی یہی روش ہے۔ لفظ کی خاطر یہ بزرگ سوقیانہ پن اور فحش گوئی سے بھی نہیں چوکتے۔ آبرو کا دیوان اس صنعت سے مالا مال ہے۔ چند شعر نمونے کے طور پر لکھے جاتے ہیں۔

آج عاشق کی بے نصیبی ہے
کہ تم آس پاس سین چلے ہو بھاگ

بھاگ کے دوسرے معنے نصیب کے بھی ہیں۔

دعویٰ ہے جس کو شعر کی قوت کا آبرو
مضموں کا بوجھ آکے اُٹھاوے ہمن کے تال

تال کے ایک معنے تو ساتھ کے اور دوسرے معنے ایک پتھر یا لکڑی کا کندا جسے پہلوان زور آزمائی کے لئے اُٹھاتے

۵)

اس کی کتنی زبان شیریں ہے
دل مرا قفل ہے بتاشے کا

بتاشے کا قفل" کے معنے چھوٹے قفل کے ہیں ۔

تشنہ ہوں دلرُبا کی صورت کا کس کو دیا کہوں
حیران ہوں نہ دیکھا کوئی آبرو پیاسا

پیاسا بہ معنی پیا جیسا اور دوسرے معنی تشنہ کے

سُن کے جو جا غیر ہیں جا کر چھچھوندر چھوڑ دی
گھر جلا عاشق کا ان لوگوں کا کیا ٹوٹا ہوا

چھچھوندر ایک آتشبازی ہے اور چھچھوندر چھوڑنا
شگوفہ چھوڑنا ۔ ٹوٹا کے معنے ایک تو نقصان کے ہیں دوسرے
آتشبازی کے ہیں ۔

جان ہر جائی نہ ہو جا یا نکر تو جا بجا
جان جابے جا نجا جاتا ہی ہے تو جا بجا

جا بجا یعنے ہر جگہ اور جا بجا یعنے معقول جگہ جا ۔
آبرو کے ہم عصر اور شاگرد بھی ایہام گوئی میں شہرت
رکھتے ہیں ۔ ان میں سے چند کا ذکر کیا جاتا ہے ۔
محمد شاہ کرناجی دہلی کے رہنے والے اور ایہام گوئی
کے دلدادہ تھے ۔ آبرو کے ہم عصر تھے ۔

تری نگاہ کی کثرت سے اسے کمان آبرو
ہمارے سینہ پہ تودہ ہوا ہے تیروں کا

اس شعر میں تودہ ایک تو عام معنوں میں ہے یعنی ڈھیر
دوسرے معنے اس مٹی کے ڈھیر یا ٹیلے یا کچی دیوار کے
جس پر تیراندازی کی مشق کی جاتی ہے ۔

موجی ہے اپنے دل کا مجھے ندے کھے سے
اور اب مخالفوں نے وہ بات ہنسی ڈوئی

مچھی کے ایک معنے تو مچھلی کے ہیں اور دوسرے
ماسے کے ہیں ۔

ترے غنچہ دہن کی دیکھ لالی
اینٹھے تھا کلی کے گوش مالی

اس شعر میں "گوش مالی" سے ایہام پیدا کیا گیا ہے
ایک تو یہ کہ مالی کلی کے گوش (کان) اینٹھتا تھا ۔ دوسرے
گوش اور مالی کے لفظوں کو ملا کر "گوشمالی" بنایا گیا ہے جو
مضمون سے مناسبت رکھتا ہے ۔

شرف الدین مضمون بھی اسی زمانے کے شخص ہیں ۔ اگرچہ
آگرہ کے قریب کے ایک قصبے کے رہنے والے تھے لیکن ابتدائے
جوانی سے دہلی میں آ گئے تھے اور وہیں انتقال کیا ۔

ایک تو تھا ہی وہ مہرو خود پسند
ہو گیا دیکھ آرسی کے تئیں دوچند

یہاں ایہام چند کے لفظ سے پیدا کیا گیا ہے جس
کے معنے چاند کے بھی ہیں ۔

نہیں ہیں ہونٹ تیرے پان سے سرخ
ہوا ہے خون مرا آ کے لبریز

اس میں لبریز کے جز لب سے ایہام پیدا کیا
گیا ہے ۔

میاں آبرو کے ایک اور معاصر مصطفیٰ خاں یکرنگ
ہیں وہ بھی اس صنعت سے خوب کام لیتے ہیں ۔

لب شیریں سے تلخ کاموں کو
بولنا تلخ کام ہے تیرا

اس شعر میں ایہام کام کے لفظ میں ہے ۔

اب تو تمھیں نبا ہے ہی ہم سے بحث پڑے
ہم سب طرف سے ہار تمھارے گلے پڑے

ایک تو ہار کے معنے ہار کر ہیں اور دوسرے گلے
کا ہار ۔

امروہہ کے ایک صاحب سعادت علی تھے وہ بھی اس
رنگ میں کہتے ہیں ۔

اہل زر کے سیم تن ہوتے ہیں دام
صید ہو ہیں جس جگہ دیکھے ہیں دام

پپیہے کی طرح دارو کے شیشے
زبانِ حال سے کہتے ہیں پی پی

میر سجاد اکبرآباد کے تھے اور بہت خوش گو شاعر ہیں
لیکن جب کبھی موقع ملتا ہے تو ایہام گوئی سے نہیں چوکتے۔

ساقی بغیر جام کے جیو گا بچاؤ نہیں
جوں فیل مست آوے ہے ابر سیہ پلا

پلا ایک تو پینے سے ہے اور دوسرا پلنا ہے۔

مقبول اس جہاں کا ہرگز غنی نہ دیکھا
راجا وہی ہے جو کوئی یہاں سے گیا ہے رانا

رانا کے ایک معنے رانده کے ہیں اور دوسرے
معنے راجا کے ہیں۔

جان و دل سے قبول ہے جانا
ہر گلی میں تری مجھے آنا

جانا یعنی اے جان۔

قاتل کی تیغ آگے جاتے ہیں ہم ندھڑکے
ہرگز ہمارے دل میں سرکا نہیں ہے دھڑکا

ہر سادہ رو مخطط ہونے کی دھن رکھے ہے
لیکن کوئی نکالے تیرا سا خط تو لکھ دیں

لکھ دیں کے ایک معنے تو عام ہیں دوسرے معنی یہ ہیں
کہ ہم شرط کرتے ہیں۔

آبرو کے ایک ہم عصر میاں احسن اللہ ہیں انھیں بھی
ایہام کا لپکا ہے۔

یہی مضمون خط ہے احسن اللہ
کہ حسن خوبرویاں عارضی ہے

حاتم خاص دلی کے رہنے والے تھے۔ مشہور شاعر ہیں
اکثر سخنوروں کی صحبت پائی تھی آبرو اور ناجی کے ہمعصر اور
ہم کلام تھے۔ شاگرد بھی بہت سے تھے منجملہ ان کے مرزا رفیع
سودا ہیں ابتدا میں انھیں بھی ایہام کا بہت شوق تھا۔

مثال بحر موجیں مارتا ہے
لیا ہے جسنے اس جگ سے کنارا

ہجر میں زندگی سے مرگ بھلی
تاکہ سب مل کہیں وصال ہوا

نظر آوے تھا بکری سا کیا پر ذبح شیروں کو
تجانا میں کہ یہ قصاب کا رکھتا ہے دل گردا

دل گردا یعنی ہمت یا حوصلہ

خاصے بجن کا ملنا نہ سکے ہے عاشقاں کا
گاڑھے رقیب سامنے رہتے ہیں ہاتھ مل مل

مضمون کے ایک شاگرد محمد عارف تھے وہ بھی ایہام
گوئی میں طبع آزمائی کرتے تھے۔

دختر رز کو کہہ اس سے ملے
ورنہ عارف افیم کھاتا ہے

"افیم کھاتا ہے" یعنے اگر دختر رز (شراب) نہ ملی تو
وہ افیم کھانی شروع کرے گا۔ دوسرے معنے یہ ہیں کہ اگر
دختر رز نہ ملی تو افیم کھا کر جان دے دے گا۔

کمترین اگرچہ قوم کے پٹھان تھے مگر ایہام گوئی کی صنعت
انھیں بھی مرغوب تھی۔

تری انگیا میں کیا بلا کچھ ہے
جن نے دیکھا وہ ہاتھ ملتا ہے

ہاتھ ملنے سے ایہام پیدا کیا گیا ہے۔

تم شاہ پسند ہو ہم کمترین تمھارے
کے بیر ہم کو دوگے نازک بدن پیارے

شاہ پسند اور نازک بدن بیروں کی قسمیں ہیں بیر کے
دوسرے معنی باری کے ہیں۔

یہ متصدی نہیں ملتے اگر بھادوں سے ذاتوں میں
تو کیوں پیسے کماتے ہیں نقل کر کر براتوں میں

نقل اور برات کے الفاظ میں ایہام ہے۔ برات
کے ایک معنی تو معروف ہیں اور دوسرے معنے حساب کے
کاغذ وغیرہ کے ہیں

مصطفےٰ خاں یکرنگ کے بھائی ولاور خاں بیرنگ

(یکرنگ) بھی اس رنگ کے شعر کہتے تھے۔

سدا بیدار رہ غفلت سے ہو ترش
مثل مشہور ہے سویا سو چوکا

سویا اور چوکا دونوں ساگ ہیں۔ چوکا میں ایہام ہے۔ یہ ترش ہوتا ہے۔

اسی زمانے میں شاہ مزمل بھی ایک ایہام گو شاعر ہوئے ہیں۔

من ہون میرا مزمل ہو گیا
دشمنوں کے من کے چیتے ہو گئے

صلاح الدین عزت مکھن دیاک باز کا رجحان طبیعت بھی اس طرف پایا جاتا ہے۔

یہی ندیاں مرے آنسو سے جو میں ہجر میں رویا
کہے ہے ساری بستی ہائے مکھن نے ہمیں کھویا

اس میں کھویا اور مکھن کی مناسبت سے ایہام پیدا کیا ہے۔

مضمون کے ایک شاگرد فضل علی دانا بھی صنعت ایہام کے شایق معلوم ہوتے ہیں۔

دل میں ہر ایک کے سودا ہے خریداری کا
یوسفِ مصر مگر تو ہی ہے اُسے یار عزیز

ان کا ایک دوسرا شعر ہے۔

نہ جانے خون کو جس روز میرے اُس کے "قا قا ہے
رگ گردن سے میری اس کے خنجر کو علاقا ہے

یہاں علاقے کے لفظ میں ایہام ہے۔ علاقہ اُس گھنڈی یا ڈوری کو کہتے ہیں جو تلوار یا خنجر کی موٹھ میں لگی رہتی ہے۔

شاہ ولی اللہ اشتیاق کا شمار بھی انھیں شاعروں میں ہے۔

دو بالا ہو کے مخموری عبث آنکھوں کو ملتا ہے
پیالا اور بھی پی لے سجن یہ دور چلتا ہے

یہاں "چلتا ہے" ذو معنی ہے یعنی جاری ہے اور رخصت ہوتا ہے۔

اسی عہد میں اس طرز کے اور بھی کئی شاعر گزرے ہیں۔ مثلاً بحر و شاگرد آبرو۔ محمد اسمٰعیل بیتاب شاگرد یکرنگ شہاب الدین ثاقب۔ محمد مراد۔ عاجز وغیرہ یہ سب لوگ اس صنعت پر فریفتہ تھے۔

پوشاک۔ خوراک۔ تعمیر غرض زندگی کے ہر شعبے کے متعلق ہر عہد میں کوئی نہ کوئی جدت ایسی نکل آتی ہے جس کا عام رواج ہو جاتا ہے۔ کوئی ذہین یا صاحب اثر شخص اس کی ابتدا کرتا ہے اور بیسیوں اس کے مقلد اور پیرو پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہی چیز رفتہ رفتہ فیشن ہو جاتی ہے اور اس عہد کا ذوق کہلانے لگتی ہے۔ ادبیات میں بھی یہی ہوتا ہے۔ چنانچہ عہد محمد شاہی میں ایہام گوئی ایک فیشن ہو گئی تھی۔ لوگوں کو اس کا ایسا چسکا پڑ گیا تھا کہ ایہامی شعروں کی سب سے بڑھ کر داد ملتی تھی اس لئے چھوٹے بڑے شاعر سب اسی طرف ڈھل گئے۔

ایہام کے استعمال میں ان لوگوں نے طرح طرح کی نزاکتیں پیدا کی ہیں۔ مثلاً مشابہت صوت یعنی دو لفظ ہیں تو مختلف لیکن بولنے میں ان کی آواز یکساں ہے اس سے بھی ایہام پیدا کیا ہے۔ جیسے

یک رنگ پاس اور سجن کیا ہے کچھ بساط
رکھتا ہے دو نیں جو کہو تو نظر کرے

اس میں نظر اور نذر کی مشابہت صوت سے ایہام پیدا ہوتا ہے۔

باد صبا سے زلف معطر کی ہم تلک
مدت ہوئی کہ پہنچی نہیں ہے خبر اثر

حسرت شاگرد مظہر کا شعر ہے۔

کب کرے میرے عشق کو آڑے
اس کو تو ہم سے عار آتا ہے

آڑسے یعنی پلے۔
کبھی دو مختلف لفظوں کو ملاکر ایہام پیدا کیا جاتا ہے
جیسے

ہوئی ہے کل سے گم کیلی مرے طالع کھلیں کیونکر
نجومی فتحیابی اس سیاہ کوکب کو کوکب سے ہے

اس شعر میں کوکہر کا بگاڑ ہے اور کب سے مل کر کوکب ہوگیا۔

دل رشک کی جلن سین پھپولا ہوا پیا
کیوں غیر سین بلا کے کہا تم نین آب لا
(آبرو)

"آب لا" یعنی آبلہ۔

ترے غنچۂ دہن کی دیکھ لالی
اُبلتے تھا کلی کے گوشں مالی

گوش اور مالی دو جدا جدا لفظ ہیں ان کے ملنے سے گوشمالی ہوا جس سے ایہام نکلتا ہے۔ بعض اوقات لفظ کے ایک جز یا کسی قدر تغیر و تبدل سے ایہام کی صنعت پیدا کی جاتی ہے جیسے

وہ پختہ کار کب پڑھتا ہے ناما
نہیں بچاکہ لوں میں ہاتھ خاما

خاما کے جز خام سے ایہام پیدا کیا گیا ہے۔

تب سین ہر مصرا ہوا ہے اس کا مصری کی ڈلی
آبرو نے شعر میں جب سیں سرلبے تیرے ہونٹ

مصرع کو مصری کی مناسبت سے مصرا کر دیا ہے

نہیں ہیں ہونٹ ترے پان سے سُرخ
ہوا ہے خوں ہمارا آکے لبریز (مضمون)

لبریز کے جز اول لب سے ایہام پیدا کیا گیا ہے۔
یہ سچ ہے کہ رواج میں بڑے بھلے کی تمیز نہیں ہوتی اور ذوق کے معاملے میں چوں و چرا کی گنجائش نہیں لیکن جس چیز کی بنا حقیقت پر نہیں اسے پائیداری نصیب نہیں ہوتی۔ ایہام کا دور دورہ کچھ دنوں تو خوب رہا مگر آخر مردود ٹھہرا سخنور اسے غیر فطرتی سمجھ کر اس سے کنارہ کش ہونے لگے قائم اپنی بیزاری کو ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے۔

"ایں ستم کہ شاعران ابتدائی زمانہ محمد شاہ با خود تلاش الفاظ تازہ وایہام نمودہ شعر را از مرتبہ بلا انداختند تا بہ معنی چہ رسد۔ غرض ناگفتہ بہ"

سب سے پہلے اس طلسم کو مرزا جان جاناں مظہر توڑا۔ چنانچہ مصحفی اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں۔

"در دور ایہام گویان اول کسے کہ شعر ریختہ بہ فارسی گفتہ اوست"۔ اس کے بعد لکھتے ہیں۔

"فی الحقیقت نقاش اول ریختہ بایں وتیرہ با فقیر مرزا است۔ بعدہ تتبعش بہ دیگراں (سیدہ)" (۱)۔

قدرت اللہ شوق اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں۔

"می گویند اول کسے کہ طرز ایہام گوئی را ترک نمودہ را در زبان اردوے معلےٰ شاہجہاں آباد کہ الحال پسند خاطر عوام وخواص وقت گردیدہ مروج ساختہ زبدۃ العارفین قدوۃ الواصلین واقف رموز حجاب اکبر کاشف کنوز لطیف پیغمبر مرزا جان جاناں متخلص بہ مظہر مرثیے است فرشتہ صفت عادی نسب ....." (۲)

حکیم ابوالقاسم میر قدرت اللہ قاسم اپنے تذکرہ مجموعہ نغز میں اس بارے میں یوں رقم پرداز ہیں

"حق ایں است کہ ایجاد طرز و انداز وے نمودہ واز اس رویہ ایہام دوئی ساز وے فرمودہ" (۳)

مرزا صاحب کی نفاست طبع اور سلامت ذوق کے سب قائل ہیں۔ وہ نہایت خوش تقریر نازک مزاج اور صاحب کمال بزرگ تھے۔ فقر و درویشی میں جو اعلیٰ مرتبہ انہیں حاصل ہے شاعری اور خوشگوئی میں ان کا درجہ اس سے کچھ کم نہیں ان کے گوناگوں کمالات کی وجہ سے کسب فیض کے لئے دور دور سے لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور شاعری

لہ بہ معنے کجی (۱) تذکرہ ہندی صفحہ ۳۰۲ (۲) تذکرہ .... قلمی (۳) مجموعہ نغز جلد دوم صفحہ ۱۹۸۔

...ان کا بڑا احسان ہے انھوں نے اردو شاعری کو ایہام کی ...دلدل سے نکال کر خوشگوار فضا میں پہنچا دیا۔ ان کے کلام اور ...ان کے ذوق کے اثر سے دلی کی شاعری کا رنگ بالکل بدل گیا ...یہی وجہ تھی کہ اس وقت کے شعرا ایہام گوئی ترک کر کے ...بدے رستے پر پڑ لئے۔ علاوہ ان کے شاگردوں (مثلاً یقین ...رین۔ نقیہ دردمند۔ حسرت وغیرہ) کے دوسروں نے بھی ...ان کا اتباع کیا۔ یہاں تک کہ کہنہ سال اور کہنہ مشق شاعر ...حاتم بھی پرانی روشش سے دست بردار ہو گیا اور اس نے ...اپنے کلام سے اس قسم کے اشعار خارج کر کے ایک مختصر دیوان ...«دیوان زادہ» کے نام سے مرتب کیا۔ اس کے بعد سے ہمارے ...شعرا ایہام گوئی سے بیزاری ظاہر کرنے لگے۔ حاتم کہتا ہے۔

کہتا ہے صاف و شستہ سخن بس کہ بے تلاش
حاتم کو اس سبب نہیں ایہام پر نگاہ

سودا کا شعر بھی اس کی تصدیق کرتا ہے

یک رنگ ہوں آتی نہیں خوش مجھ کو دو رنگی
منکر سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں

لیکن اس کا چسکا ایسا پڑ گیا تھا کہ خود مرزا صاحب ...علیہ الرحمہ کے شاگرد جو نئی طرز کے بانی ہوئے ہیں کبھی کبھی ...اسی رنگ میں شعر کہہ جاتے تھے۔ مثلاً

نجھے پالا مشیت کے جو پالے میں پڑا جب کا
لرزتا تپ میں ہوں سردی میں رہتا ہوں رضائی میں

(یقین)

رضائی کا لفظ اس شعر میں مشیت کی رعایت سے ...ہے یعنے رضا کی مناسبت کے لئے۔

سونے سے سونا ہوئے دل سونا نہ منگ حق میں یقین
جس کو خدا کا شوق ہے سونا کرے سونا طلب

"سونا کرے" یعنے وہ نہ کرے"۔

کب کرے میرے عشق کو آدے
اس کو تو ہم سے عار آتا ہے (حسرت)

سن پت نہ ہگی تیری نفٹ نین مجھ سیں مت کر
صورت تری نہ دیکھوں تجھ بار ہا کہا ہوں (حسرت)

اس میں حسرت نے ایہام کی کئی صورتیں استعمال کی ہیں — سن پت ایک مقام کا نام ہے اور پت کے معنے عزت کے بھی ہیں۔ اسی طرح ٹھٹھہ مقام کا نام بھی ہے اور دل لگی کے معنے میں بھی آتا ہے۔ صورت میں سورت شہر سے مشابہت آواز پائی جاتی ہے۔ بار ہا ایک مقام کا بھی نام ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں میں اس کا شوق پھر بھی کچھ کچھ باقی تھا۔ میر کا یہ شعر خلاف واقعہ نہیں بلکہ اس کی کچھ اصلیت پائی جاتی ہے۔

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

خیر یقین اور حسرت نے تو اس دور میں پرورش پائی تھی جس میں ایہام گوئی کا جنون تھا اگر انھوں نے چند شعر اس رنگ میں کہہ دیئے تو کچھ مضائقہ نہیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ سودا اور میر حسن جیسے باکمال اور حقیقی شاعر بھی اس سے نہیں بچے۔ میر حسن فرماتے ہیں۔

سجن جل جاؤں گا میں رشک سے مت دیکھ آئینہ
دکھاتے غیر کو منہ آرسی تجھ کو بھی آئی نا

مژگاں سے جھاڑتے ہیں جو اس گلی کے تنکے
رہتے ہیں ہم دوانے روز ازل سے تنکے

اک دم میں بھوت ہیں وہ اکدم میں ہیں فرشتہ
ہم آشنا ہوئے ہیں دو چار دن سے جن کے

سودا کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

حکاک کا پسر بھی مسیحا سے کم نہیں
فیروزہ ہووے مردہ تو دیوے ہے تو جلا

پھکے ہے اس قدر تو مجھے دیکھ کر رقیب
چوہے کی بھانت جائے ہے نظروں بیچ بلا
غم سے خزاں کے خون جگر چھٹ اب لے نسیم
غنچے گلوں کے کچھ نہیں کھاتے انھیں کھلا

لے لالچی تو کیسہ غیروں کا مت ٹٹولے
جو کچھ تو چاہے ایک شب مجھ پاس آکے مولے
انصاف کچھ بھی یارو ہے عشق کے نگر میں
دل غم سے آب ہوئے اور چشم موتی رولے
دہقاں پسر وہ ہم سے یوں صلح کب کرے ہے
بوٹوں کے کھیت اوپر جبتک نہ جنگ ہولے

لیکن سودا کے ذوق کی داد دینی پڑتی ہے کہ کہنے
کو تو وہ یہ دو غزلیں کہہ گئے لیکن دونوں کے مقطعوں میں
اس کلفت کو دور کر دیا جو ان غزلوں کے پڑھنے سے ہوتی
تھی۔

ہو شاد اس غزل سے روح آبرو کی سودا
تو اس زمین میں ناداں طور اپنا کیوں نہ اولے

اور اس کے بعد ہی وہ دوسری غزل اس بحر
اور قافیے میں اپنے رنگ میں لکھتا ہے تاکہ الزام رفع
ہو جائے۔ دوسری غزل کا مقطع یہ ہے

اسلوب شعر کہنے کا تیرا نہیں ہے یہ
مضمون وآبرو کا ہے سودا یہ سلسلا

سودا نے اس طرح اپنی بریت کرلی۔ میر صاحب بھی کبھی کبھی اس صنعت کے پھندے میں آپھنستے ہیں لیکن ان بزرگوں کا کبھی کبھی دو چار اس قسم کے شعر کہہ دینا یا تو محض اتفاق ہے یا بغرض تفنن۔ اس لئے ان کو اس سے بری سمجھنا چاہیئے لیکن لکھنؤ کی شاعری میں ایک دور آتا ہے جس میں شعراء نے صنائع کا استعمال اس افراط اور بے اعتدالی سے کیا ہے کہ دورِ محمد شاہی بھول جاتا ہے لیکن یہ تاریخ ادب اردو کا دوسرا باب ہے جس کا ذکر ہم پھر کبھی کریں گے۔

صنعت ایہام جب التزام کے ساتھ برتی جاتی ہے تو شعر شعر نہیں رہتا تک بندی ہو جاتا ہے۔ جس دور کا ہم نے ذکر کیا ہے وہ اردو شاعری پر ایک بدنما دھبہ ہے لیکن انصاف شرط ہے۔ اس ضمن میں ایک فائدہ بھی ہوا ہے۔ ایہام گو شعرا نے اس دھن میں الفاظ کی جستجو میں ساری زبان کو چھان مارا اور اپنی زبان اور بول چال کے وہ الفاظ تلاش کر کے نکالے جن سے ہمارا ادب کبھی روشناس نہیں ہوا تھا۔ ان بزرگوں کا کلام محقق زبان اور لغت نویس کے لئے ایک بے بہا ذخیرہ ہے۔ گو یہ فائدہ ضمنی ہے لیکن ایک لحاظ سے بہت بڑا فائدہ ہے اور ہمیں ان بزرگوں کے احسان کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

ضروری اعلان

پاکستان رائٹرز گلڈ، مغربی پاکستان ریجن کا دفتر یکم جون ۱۹۶۱ سے حسب ذیل پتے پر منتقل ہوگیا ہے۔ تمام خط و کتابت اسی پتے پر کی جائے۔

پاکستان رائٹرز گلڈ، پرنسز ہوٹل
منٹگمری روڈ۔ لاہور

سبطِ حسن

قومی اور علاقائی تہذیبوں کا رشتہ

ملتان کی تاریخی عظمت سے آپ لوگ مجھ سے زیادہ واقف ہیں۔ پاکستان کا یہ مقدس خطہ صدیوں سے تہذیب کا گہوارہ اور فکر و فن کا نہایت اہم مرکز رہا ہے۔ اسی شہر میں سب سے پہلے معتزلہ نے عقل کی شمع روشن کی تھی۔ اسی شہر میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی علیہ الرحمہ نے چھ برس تک صوفیائے کرام کی صحبت سے فیض حاصل کیا، اور ہندی تہذیب اور ہندوی زبان کا درس لیا۔ اسی شہر کی روح پرور فضا میں حضرت امیر خسرو کی شاعری کے نغمے گونجے۔ یہ شہر مدتوں ہماری تہذیب کا ضمیر اور ہمارے ضمیر کی آواز رہا ہے۔ پس صاحبو، ملتان کے اہلِ دانش کی اس محفل میں مجھ پوربی کا تہذیب کے باب میں لب کشائی کرنا بہت بڑی گستاخی ہوگی۔ مگر یقین مانئے میری یہ عرض داشت تنقیدی جائزہ نہیں بلکہ سپاس نامۂ عقیدت ہے اور مجھے امید ہے کہ آپ اسے قبول فرمائیں گے۔

حضرات! ملتان کے صوفیائے کرام اور شعرا جن میں حضرت شیخ فرید الدین شکر گنج علیہ الرحمہ اور خواجہ فرید کے اسمائے گرامی سرِفہرست ہیں، وحدت الوجود کے قائل تھے۔ کائنات کا یہ فلسفہ ان کے ذہن، ان کے جذبات و احساسات، اُن کے کردار و اعمال غرض ان کی پوری شخصیت پر حاوی تھا۔ اگر تہذیب سے مراد طرزِ زیست اور مسلکِ حیات کے اقدار ہیں تو ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ان کی تہذیب وحدت الوجود کی تہذیب تھی۔ ان کی نظر میں ریگ زار اور پھول بن، نباتات و جمادات، حیوان اور انسان ایک ہی ذات کے مختلف رُوپ تھے۔ ایک ہی حقیقت کے مختلف مظہر تھے۔ ان کے نزدیک ہر گھاٹی وادیٔ ایمن اور ہر پتھر کوہِ طور تھا۔ جس نے جمال بینی اور دروں بینی کی منزلیں طے کرلیں وہ مذہب و ملت، رنگ و نسل، ملک و قوم کے امتیازات سے بے نیاز ہوگیا۔ ان کی نگاہ میں مومن اور کافر، شیخ اور برہمن، دیر اور حرم، بادشاہ اور گدا، رند اور پارسا، عارف اور عاصی سب یکساں تھے۔ وہ ظاہر و باطن میں کوئی فرق نہ سمجھتے تھے۔ وہ عشق کے بندے تھے، مہر و محبت ان کا مسلک تھا اور انسان دوستی ان کا مذہب۔ وہ زندگی کے تضادات کو دردمندی کی آگ پر پگھلاتے تھے اور پیار کے پیغام سے دلوں کو موہتے تھے۔ زبان اور تہذیب کا فرق بھی ان کے لئے بے معنی تھا چنانچہ آج اگر ان بزرگوں میں سے کوئی اس جلسے میں شریک ہوتا اور قومی اور علاقائی تہذیبوں یا زبانوں پر ہماری باتیں سُنتا تو اسے بڑی حیرت ہوتی۔ کیونکہ جن مسائل کو ان بزرگوں نے صدیوں پیشتر الفت اور آگہی سے حل کرلیا تھا، ہم ہنوز ان مسائل کے

مبادیات ہی میں اُلجھے ہوئے ہیں۔

قومی تہذیب اور علاقائی تہذیبوں کے رشتے کا جائزہ اسی پس منظر میں لیا جا سکتا ہے۔

کہتے ہیں کہ انسان کو تین چیزوں نے انسان بنایا اُس کے ہاتھوں نے، اس کے دماغ نے اور اس کی زبان نے۔ فلسفیوں اور سائنسدانوں میں ان عناصر کی تقدیم و تاخیر کے بارے میں ابھی تک اختلاف پایا جاتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ پہلے ہاتھوں نے کام کرنے کی طرح ڈالی تب ذہن نے چیزوں کا تصور کیا اور قوت گویائی نے لسانی علامتیں ترشیں یعنی بقول گوئٹے ابتدا میں عمل تھا۔ کوئی کہتا ہے کہ نہیں، پہلے ذہن نے سوچا پھر ہاتھ اور زبان نے ذہن کے ارادے کے مطابق عمل کیا۔ کوئی کہتا ہے کہ نہیں ابتدا میں کلام تھا۔ کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا تھا۔ ارسطو نے اسی بنا پر انسان کو حیوان ناطق سے تعبیر کیا تھا۔ اس اختلاف کے باوجود اس بات پر سب متفق ہیں کہ انسان عبارت ہے انھیں عناصر ثلاثہ کے اتحاد سے۔ غور سے دیکھا جائے تو کسی قوم یا علاقے کی تہذیب بھی انھیں عناصر کے امتزاج سے وجود میں آتی اور فروغ پاتی ہے۔

تہذیب معاشرے کے ذہنی، مادی اور جذباتی تخلیقات کا نچوڑ ہوتی ہے۔ اس کی تشکیل و تعمیر میں معاشرتی ماحول، ذرائع رزق، آلات دولت آفرینی، عقائد و اوہام، تاریخ اور روایات، رسوم و رواج، مذہب، زبان، قومی مزاج اور کردار سب کو دخل ہوتا ہے۔ انھیں سے ہمارے اقدار حیات متعین ہوتے ہیں جن کا عکس فنون لطیفہ میں، کھانے پینے کے سلیقے میں، عمارتوں اور مصنوعات میں، ادب اور آداب مجلس میں، زبان اور جمالیاتی ذوق میں صاف نظر آتا ہے۔ مگر ان مظاہر تہذیب میں زبان کو سب پر افضلیت اور فوقیت حاصل ہے کیونکہ ہیگل کے بقول زبان تہذیب کی رُوح اور اس کا عطر ہے۔ زبان دراصل جام جمشید ہے جس میں ہمیں تہذیب کے تمام پہلوا سامنے خد و خال صاف نظر آتے ہیں۔ زبان انسان کے خیالات، جذبات اور احساسات کو ادا کرنے کا سب سے حسین، سب سے لچک دار، سب سے آسان، سب سے زیادہ ترنم ریز اور سب سے زیادہ پرتاثیر آلہ ہے۔ زبان کے کرشموں کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہماری علاقائی تہذیبیں بڑی دولت مند ہیں۔ ان کا کلاسیکی ادب نہ صرف روح عصر کا نمائندہ ہے بلکہ اپنی معنی خیزی، بصیرت، نغمگی، گہرائی اور عالی حوصلگی میں دنیا کے بڑے سے بڑے کلاسیکی ادب کی ہمسری کرتا ہے۔

دنیا میں آج کل دو طرح کے ملک ہیں۔ ایک وہ جن کے ریاستی حدود کے اندر قریب قریب ایک ہی تہذیب اور زبان رائج ہے۔ جیسے افغانستان، مصر، فرانس، اٹلی اور جاپان وغیرہ۔ ان میں بعض نہایت ترقی یافتہ ہیں جیسے جاپان کہ قومی یکجہتی اور حب الوطنی کے اعتبار سے صف اول میں جگہ پاتا ہے۔ بعض بہت پچھڑے ہوئے ہیں جیسے افغانستان۔ دوسرے وہ ملک ہیں جن میں کئی کئی زبانیں بولی جاتی ہیں اور متعدد علاقائی تہذیبیں موجود ہیں۔ مثلاً پاکستان، ہندوستان، برطانیہ روس، سیلون، میکسیکو، سوئیزرلینڈ وغیرہ۔ ان ملکوں میں بعض بہت ترقی یافتہ ہیں جیسے برطانیہ، روس اور سوئیزرلینڈ وغیرہ۔ ان کی قومی یکجہتی اور حب الوطنی بھی شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ ان مثالوں سے میرا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ کسی ملک میں ایک زبان اور ایک تہذیب یا کئی علاقوں زبانیں اور کئی علاقائی تہذیبوں کے ہونے سے قومی یکجہتی اتحاد اور حب الوطنی پر کوئی ضرب نہیں پڑتی۔

بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ علاقائی تہذیبیں قومی تہذیب کی تشکیل و ترقی کی راہ میں حائل ہوتی ہیں... درآنحالیکہ واقعہ یہ ہے کہ قومی تہذیب علاقائی تہذیبوں کے حُسن امتزاج ہی سے فروغ پاتی ہے۔ چنانچہ سکاٹ لینڈ

اور ویلز کی علاقائی تہذیبوں کے بغیر برطانیہ کی قومی تہذیب کا
تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ قومی تہذیب اور علاقائی تہذیبوں
کے درمیان وہی رشتہ ہے جو دریائے سندھ اور اس کے
معاون دریاؤں میں ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے سینکڑوں دریا
ندی اور نالے دریائے سندھ کو سیراب کرتے ہیں۔ اگر یہ خشک
ہو جائیں یا ان کا رُخ دوسری سمت پھیر دیا جائے تو دریائے
سندھ کی حیثیت ایک جوئے کم آب سے زیادہ نہ رہ جائے گی۔
آج کا اجتماع بھی اس حسن امتزاج کی ایک روشن مثال ہے۔۔
یوں کہنے کو تو خواجہ فرید ایک علاقائی زبان کے شاعر اور
ایک علاقائی تہذیب کے نمائندے تھے مگر حقیقت میں ان کا
پیغام ہر محب وطن پاکستانی کے دل کو گرماتا اور تڑپاتا ہے
اپنی تہذیب اور اپنے وطن سے محبت کرنا سکھاتا ہے۔ چنانچہ
علاقائی تہذیبوں اور زبانوں کے فروغ سے قومی اتحاد یکجہتی
اور حب الوطنی کے جذبے کو صدمہ نہیں پہونچتا بلکہ اس جذبے
کی آبیاری ہوتی ہے۔ اس کو طاقت اور توانائی ملتی ہے۔
اس کے برعکس علاقائی تہذیبوں کی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں
ڈالنے سے ملک کے اندر انتشار، نفرت، اور بےچینی کی طاقتوں
کو فروغ ہوتا ہے۔ علاقائی تہذیبیں رنگ برنگ کے پھول
ہیں جن سے گلشن کے حسن اور دلکشی میں اضافہ ہوتا ہے۔
علاقائی تہذیبوں کی ترقی قومی تہذیب کی ترقی ہے۔ ان کی
بقا قومی تہذیب کی بقا ہے۔

بعض لوگ علاقائی تہذیبوں اور علاقائی زبانوں کو بڑی
حقارت سے دیکھتے ہیں۔ ان کی تضحیک کرتے ہیں بلکہ ان کے
وجود ہی سے انکار کر دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ قومی تہذیب
اور قومی زبان کی عمارت علاقائی تہذیبوں اور علاقائی
زبانوں کے کھنڈر ہی پر قائم ہو سکتی ہے۔ مگر یہ ان کی بھول
ہے۔ حقیقی تہذیب پیار اور ہمدردی سے فروغ پاتی ہے۔
تنگی اور عداوت سے فروغ نہیں پاتی۔ تہذیب کا پودا
محبت کی آبیاری سے بارآور ہوتا ہے، نفرت کی چنگاری اسے
جھلس دیتی ہے۔ اسی طرح بعض لوگوں نے قومی تہذیب اور
قومی زبان کی تحقیر و تضحیک کو اپنا شعار بنا لیا ہے اور اس
گمراہی میں مبتلا ہیں کہ ان کے اس طرز عمل سے اُن کی اپنی
علاقائی تہذیب اور علاقائی زبان کو فروغ ملے گا۔ وہ اس
قدر مشترک کو نہیں دیکھتے جو پاکستان کی مختلف علاقائی زبانوں
اور تہذیبوں کی شیرازہ بندی کرتی ہے۔ ان کو گلدستے کی
مانند سجاتی ہے، ان میں ربط، اتحاد اور ہم آہنگی پیدا کرتی ہے۔
قومی تہذیب دراصل قوم کی ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے جس کے
بغیر ہمارا جسد قومی مفلوج اور ناکارہ ہو جائے گا

اسی لئے علاقائی تہذیبوں کا احیا قومی تہذیب کے تقاضوں
سے بے نیاز ہو کر نہیں کیا جا سکتا۔ اگر یہ تہذیبی احیا ملک کی
قومی اور معاشرتی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتا، قوم کی شخصیت
کو زیادہ بھرپور، زیادہ حسین زیادہ حیات بخش اور فعال
نہیں بناتا تو یہ احیا مصنوعی، وقتی اور ناپائیدار ہوگا۔ وہ مٹی
کے پتلے کی مانند بے جان ہوگا۔ یہ پتلا ممکن ہے کہ تھوڑی
دیر کے لئے ہماری نگاہوں کو تفریح کا سامان فراہم کرے
مگر وہ ہمارے اقدار حیات کو متحرک اور تابناک بنانے سے
قاصر ہوگا۔

تہذیب کے لفظی معنی پودوں کی کاٹ چھانٹ کے ہیں۔
جس طرح پودوں کی قطع و برید سے ....
ان کی قوت نمو میں ان کی صحت وافزائش میں اضافہ ہوتا ہے اسی
طرح شجر تہذیب میں بھی قطع و برید لازمی ہوتی ہے۔ زندہ
قومیں مردہ اور فرسودہ اقدار کو مسلسل ترک کرتی جاتی ہیں
ورنہ یہ پرانی قدریں پیرتسمہ پا کی مانند قوموں کو آگے نہیں بڑھنے
دیتیں باشعور قومیں ماضی کی ہر چیز کی اندھا دھند پرستش یا
تقلید نہیں کرتیں اور نہ ماضی کی ہر تہذیبی قدر کو مقدس خیال
کرتی ہیں بلکہ وہ ہر پرانی قدر کی صداقت اور افادیت کو عہد
حاضر کے تقاضوں سے جانچتی ہیں۔ جن چیزوں کو وہ قوم کے
مفاد کیلئے مضر سمجھتی ہیں یا جو قدریں انھیں حیات اور جہد
حیات سے گریز و فرار کی تعلیم دیتی ہیں، وہ انھیں ترک کرتی
ہیں۔ رد و قبول کا عمل ہمیشہ سے جاری ہے۔ یہ نہ مشرق

کی تخلیق ہے نہ مغرب کی بلکہ ایک آفاقی قانون معاشرہ ہے۔ اور
اس میں جذباتیت کو بالکل دخل نہیں ہے لہٰذا ہمیں بھی اپنی قومی
اور علاقائی تہذیبوں پر غور کرتے وقت ردّ و قبول کے آفاقی
اصول کو ہمیشہ نظر کے سامنے رکھنا چاہیئے۔

آخر میں میں آپ کی توجہ ایک عالمی رجحان کی طرف
مبذول کرنا چاہتا ہوں۔ یہ عالمی رجحان صنعتی انقلاب کی پیداوار
ہے۔ صنعتی انقلاب کی وجہ سے دنیا کے ہر ملک کی معاشرتی
زندگی میں بڑی تبدیلیاں آئی ہیں۔ ان تبدیلیوں کا اثر تہذیب
پر بھی پڑا ہے کیونکہ تہذیب بہرحال ایک معاشرتی عمل ہے
صنعتی انقلاب کے باعث زندگی میں ایک خاص قسم کی مشینی
یکسانیت آتی جاتی ہے۔ چنانچہ ساری دنیا میں تہذیبی یکسانیت
کا رجحان بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ اب کنوئیں کی جگت
کی جگہ ٹیوب ویل لے رہے ہیں۔ کنواں گاؤں کی عورتوں
کی چوپال ہوتا تھا۔ اس کی منڈیر سے گانوں کی لہریں اٹھتی
تھیں۔ ٹیوب ویل مرد چلاتے ہیں لہٰذا وہ گیت اور رومان
جو کنوئیں سے وابستہ تھے آہستہ آہستہ ختم ہوتے جاتے
ہیں۔ چرخے کی جگہ سوت بنانے والے کارخانے لگ رہے
ہیں اور ترکھن کی گنگناہٹ خاموش ہوتی جاتی ہے۔ رس
بیلنے والے کولہوؤں کی جگہ شکر کے کارخانے قائم ہو رہے
ہیں اور رت جگوں کا لطف خواب ہوتا جا رہا ہے۔ اب
شادی میں شہنائی نہیں بجتی بلکہ بینڈ والے فلمی دھنوں کی نقالی
کرتے ہیں۔ اب تیل کے چراغ کی جگہ بجلی کی روشنی ہے،
گھوڑوں، رتھوں، تانگوں اور ریڑھوں کی جگہ بائیسکلیں،
موٹریں، ریل گاڑیاں اور ہوائی جہاز ہیں، تفریح کے لئے
ریڈیو، سینما، گراموفون اور ٹیپ ریکارڈر ہیں، کبڈی اور
گلی ڈنڈے کی جگہ کرکٹ، ٹینس، فٹ بال اور والی بال ہیں
غرض سائنس کی نئی نئی ایجادات کے باعث ہمارے ماحول
اور معاشرے، ہمارے طرز زیست اور طرز فکر، ہمارے
ذریعہ معاش، ہمارے اخلاق و اقدار، ہماری خوراک ....
اور پوشاک، حتیٰ کہ ہماری زبان اور تہذیب میں انقلابی
تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ فاصلے گھٹ رہے ہیں، اور
علاقائی حد بندیاں ٹوٹتی جاتی ہیں۔ علاقائی اور قومی تہذیبوں
میں بھی آہستہ آہستہ یکسانیت آتی جاتی ہے۔ ان کی انفرادیت
کا رنگ ہلکا ہوتا جاتا ہے۔ ایک عالمگیر تہذیب کے خدوخال
اُبھر رہے ہیں۔ یہ عالمگیر تہذیب ایک تاریخی حقیقت بن کر
ہمارے سامنے آ رہی ہے۔ اس پر خفگی اور برہمی کا اظہار
کرنا یا پرانی تہذیب کا ماتم کرنا دراصل اس قانون ارتقا
سے انحراف کرنا ہے جو تہذیب اور زبان پر بھی اسی طرح
حاوی ہے جس طرح پورے معاشرے پر۔ ہر نظام کہن کے
بطن سے ایک نظام نو طلوع ہوتا ہے۔ اس عالمگیر تہذیب
کی چھاپ ہماری قومی اور علاقائی تہذیبوں پر بھی پڑ رہی
ہے۔ اس کے امکانات پر غور کرنا اور اس سے اپنے رشتے
کی نوعیت کو متعین کرنا نہایت ضروری ہے۔ اگر قومی اور
علاقائی تہذیبوں نے عالمگیر تہذیب کے اس نئے دَور کی
اہمیت کو نظرانداز کر دیا اور اپنی انفرادیت قائم رکھتے ہوئے
اس عالمگیر تہذیب سے اپنے آپ کو ہم آہنگ نہ کیا تو ان کا
وجود خطرے میں پڑ جائے گا

ضمیر علی بدایونی

فن اور لاشعور

انسان کے ذہنی اعمال میں تخلیقی عمل ہی سب سے زیادہ پُراسرار، پیچیدہ اور ناقابلِ تعلیل واقع ہوا ہے۔ یونانیوں کے عہدِ حکومت و ثقافت سے لے کر آج تک، جبکہ ہم جمالیاتی مظاہر کی نو بنو فلسفیانہ تعبیرات ڈھونڈھ رہے ہیں، نہ تو ہم تخلیقی عمل کی حدود متعین کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں اور نہ ہی اس کے ماخذ و محرکات کا پتہ لگا سکے ہیں۔ جدید نفسیات نے نفسِ انسانی کی تمام گتھیوں اور پیچیدگیوں کا حل ڈھونڈنے کا عزم کیا ہے اور کوشش بھی کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نفسِ انسانی کا بیشتر حصہ جدید نفسیات کی تحلیلی کاوشوں سے روشنی میں آچکا ہے۔ لیکن بعض حصے اب بھی گہری تاریکی میں مستور ہیں۔ انسانی نفس کے ان مستور گوشوں میں فنی تخلیق کا مسئلہ بھی ہے جو ہنوز غیر حل شدہ ہے۔ جدید نفسیات کے سب سے بڑے نمائندے فرائڈ نے جب انسانی نفس کو جھانک کر دیکھا تو کچھ حصہ تو شعور کی چمک سے روشن تھا لیکن بیشتر حصے پر گہری تاریکی مسلط تھی اور ماگیرے "تعریقین" کی یاد دلا رہی تھی۔ اس "تعریقین" میں اسے سارے انسان برہنہ، سرنگوں اور خوفزدہ نظر آئے۔ انہیں انسانوں میں گوئٹے، دانتے، شیکسپیئر، بادلیر، واگنر، لینارڈو ڈاونسی بھی تھے۔ وہ سب اس قدر برہنہ تھے کہ فرائڈ کو کہنا پڑا کہ کاش میں لاشعور کو معرضِ انکشاف میں نہ لاتا اور تحلیلِ نفسی کو دریافت نہ کرتا۔ فن ادب اور لاشعور کے اس باہمی رشتہ کو اس نے اپنے اسی مجوزہ طریقِ تحلیل کے ذریعے دریافت کیا ہے۔ اس طریقِ تحلیل میں اس کی ساری ذہانت، بصیرت اور مطالعہ صرف ہوا ہے۔ اس نے وہ بڑے بڑے معمار نفسِ انسانی پر اپنے آلۂ تحلیلِ نفسی کا اطلاق کرتا ہے اور نتائج کو قوانین کی شکل دے دیتا ہے۔ فرائڈ سے جب یہ پوچھا گیا تھا کہ آپ کس طرح ہر جگہ جنسی محرکات کا پتہ لگا لیتے ہیں؟ تو اس نے جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ پتہ نہیں میں کس طرح معلوم کر لیتا ہوں اور نہ ہی یہ مجھے جاننے کی ضرورت ہے۔ مجھے اپنے آلۂ تحلیلِ نفسی کی مدد سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں میں اس پر غیر جانبداری اور ٹھنڈے دل سے غور کرتا ہوں اور اسی کو بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

فرائڈ کی نفسیاتی بصیرت نے جہاں ہمیں یہ بتلایا کہ انسانی اعمال کو متعین کرنے میں لاشعور اغلب حصہ لیتا ہے۔ وہاں اس نے یہ حقیقت بھی ظاہر کر دی کہ فنی تخلیق کے پس پردہ بھی لاشعور ہی کارفرما ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لاشعوری تقاضے انسانی شخصیت کے تحفظ و بقا کی بنیادی شرائط ہیں۔ اور کوئی فرد تحفظِ ذات اور اثباتِ ذات کی جبلتوں اور دوسری جبلتوں سے دامن نہیں بچا سکتا۔ کیونکہ ان کے بغیر نہ تو حیاتی تسلسل جاری رہ سکتا ہے اور نہ ہی اس کا انفرادی وجود باقی رہ سکتا ہے۔ اس لئے فطرت خود لاشعوری تقاضوں سے ہم آہنگی چاہتی ہے اور یہی اس کا انتہائی مقصود ہے۔ فرائڈ کے انقلاب انگیز انکشافات سے پہلے شعور کو انسانی اعمال کا مرکز و محور قرار دیا جاتا تھا لیکن فرائڈ کے نزدیک شعور انسانی نفس کا "جوہر" نہیں بلکہ اس کی ماہیت ہے جو دوسری خصوصیات کے ساتھ موجود بھی ہو سکتی ہے اور غائب بھی۔ البتہ لاشعور کا عمل دخل مستقل طور پر جاری رہتا ہے۔

لاشعوری خواہشات ہمیشہ درپے آسودگی رہتی ہیں لیکن ان کی تسکین میں تہذیب و معاشرت کی اقدار اور فرد کے محدود مادی وسائل کی رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں۔ اس لئے براہِ راست ان کی آسودگی

کا سروسامان مہیا نہیں ہوتا۔ اب لاشعور کے ایما پر عمل ارتفاع (SUBLIMATION) کے نقش و نگار بنتے ہیں۔ فرائڈ فن و ادب کے تحلیلی مطالعہ کے بعد یہ دعویٰ کرنے پر مجبور ہوا کہ مذہب، فن و ادب اسی ارتفاع کے ذریعہ وجود میں آتے ہیں۔ ارتفاع کا یہ عمل مختلف افراد کے ساتھ مختلف شکلوں میں نمودار ہوتا ہے۔ دُنیا کے تمام شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں میں جو ہم اختلافِ مدارج پاتے ہیں وہ اسی ارتفاع کے مختلف مدارج و مقامات ہیں۔

فن کو فرائڈ نے ایک خاص نقطۂ نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اس سے بہت کم بحث کرتا ہے کہ فنکارانہ صلاحیتوں کے مآخذ کونسے ہیں کیونکہ بقول ڈاکٹر ژونگ بدقسمتی سے تحلیل نفسی کے پاس کوئی ایسا آلۂ انکشاف نہیں جس کی مدد سے فنی تخلیق کا کامل طور پر تحلیلی تعاقب کیا جاسکے۔ گو فرائڈ نے فنکارانہ صلاحیتوں کا سراغ لگانے کا دعویٰ کیا ہے لیکن اس کے نقادوں نے اس دعوے کی صحت کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا ہے۔ البتہ وہ اس امر پر وافر روشنی ڈالنے میں کامیاب ہوا ہے کہ ایک فرد فنکار کا پیشہ کیوں اختیار کرتا ہے اور وہ کونسے محرکات ہیں جو اسے فن کو اپنانے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ تحلیلی نتائج اس نے فنکاروں کے ذاتی تجربات کی مدد سے اخذ کیے ہیں۔ فن کو فرائڈ بار بار "متبادل تسکین" کے نام سے پکارتا ہے۔ جس سے اس کا مقصود یہ ہے کہ فنکار اپنی لاشعوری خواہشات کی تسکین کے لیے فن کا سہارا لیتا ہے۔ برل نے اپنی ایک کتاب میں کسی فنکار کا یہ قول نقل کیا ہے کہ میں اس کی ذرا پرواہ نہیں کرتا کہ میری تصویروں سے ناظر کیا اثر لے گا۔ مجھے تو صرف اپنی تشنہ لبی کا مداوا چاہیے۔ اور یہی میرے فن کا انتہائی مقصود و مطلوب ہے۔

لاشعور کی شدید حیوانی خواہشات کو شعور قبول کرنے سے انکار کردیتا ہے کیونکہ معاشرہ میں اس نوع کی خواہشات کو مذموم قرار دیا جاتا ہے اسی لئے شعور انہیں ذہن کے نقطۂ ماسکہ سے ہٹا کر رد کردیتا ہے۔ لیکن یہ رد کردہ خواہشات ذہن سے ہمیشہ کے لئے محو نہیں ہوجاتیں بلکہ لاشعور کی کوٹھری میں پڑی اپنی آسودگی کے موزوں ترین لمحات کا انتظار کرتی رہتی ہیں۔ فنکار جب ایک عالمِ نو کو معرضِ وجود میں لاتا ہے تو لاشعوری خواہشات و مشمولات ارتفاع کے زینے سے اس جہانِ تخیل آفریدہ میں اُتر جاتی ہیں۔ یہ عمل اس قدر مخفی اور ملائم کے پردوں میں ہوتا ہے کہ فنکار کو بھی اس کا مبہم و غیر واضح شعور ہوتا ہے۔ انہیں رد کردہ خواہشات میں فنکار کا آبائی اُلجھاؤ (OEDIPUS - COMPLEX) بھی شامل ہے۔ ایک شاعر جب انتہائی والہانہ انداز سے اپنی ماں سے محبت و دلی قرب کا اظہار کرتا ہے تو اس کی تہ میں اس کا آبائی اُلجھاؤ کار ہوتا ہے۔ مذہب، معاشرہ اور تہذیب کے موانع اگر موجود نہ ہوں تو نظم کا یہ مواد جس پر عملِ ارتفاع کی چھاپ لگی ہوئی ہے اس نظم کے مواد میں تبدیل ہوجائے گا۔ جو محبوبہ کو مخاطب کرکے لکھی جاتی ہے۔ لیونارڈو ونسی نے مونالیزا کی لازوال و پُراسرار مسکراہٹ میں اپنی ماں کو مسکراتے دیکھا تھا۔ اسی لئے وہ [illegible] حُسن کے سامنے ٹھٹھک کر رہ گیا۔ وہ مدت العمر اس کے گرد چکر لگاتا رہا اور بالآخر اس نے اس مسکراہٹ کو اپنے آپ میں اور اپنے فن میں جذب کرلیا۔ ماہرینِ نفسیات نے اور خصوصاً سگمنڈ فرائڈ نے اس فنکار کی دوسری تخلیقات (SAINT ANNE) "جان دی بپٹسٹ" میں بھی آبائی اُلجھاؤ کے اثرات کو نمایاں کیا ہے۔ چودھویں صدی میں "طربیہ خداوندی" کا خالق دانتے بیاٹرس کے عشق میں نغمہ خواں دکھائی دیتا ہے۔ جسے اس نے زندگی میں صرف دوبار دیکھا تھا اور بیاٹرس سے گفتگو کا موقع اسے پھر بھی نہ ملا تھا مگر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بیاٹرس فردوس میں مادرِ کلیسا کی حیثیت سے اس کا استقبال کرتی ہے تو صاف محسوس ہوتا کہ مادرِ کلیسا کے پردہ میں اس کا آبائی اُلجھاؤ کارفرما ہے۔ ڈاکٹر جونز کے نزدیک جنہوں نے شیکسپیر کے مشہور ڈرامہ "ہیملٹ" کا اس زاویۂ نگاہ سے تجزیہ کیا ہے اس ڈرامہ میں جو شیکسپیر کے فلسفہ اور نظریات کا بطن البطون اور سب سے اہم سرچشمہ ہے اس میں شیکسپیر یہ کہنا چاہتا ہے کہ ہیملٹ کے تعطل و بے عملی کا سبب اس کے ضمیر کا وہ مجرمانہ احساس ہے جو اسے اپنی ماں سے لاشعوری تعلق ہونے کی وجہ سے پیدا ہوا کہ اس میں ڈاکٹر موصوف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شیکسپیر

خود آبائی اُبھار کی گرفت میں تھا۔ البتہ یہ الگ بات ہے کہ وہ اس اُبھار کو محسوس کر چکا تھا۔ اسی لئے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے ہیملٹ کی تمثیل کو "ادب کی مونالیزا" قرار دیا ہے۔ یہی حال تقریباً دستووسکی کا ہے بقول فرائڈ وہ پدر کشی (PARRICIDE) کا مرتکب ہوا ہے اور یہ پدر کشی دراصل اس کے آبائی اُبھار کا ایک منفی طریق آسودگی تھا۔ فرائڈ نے اس کو دستووسکی کے فن میں بڑی جامعیت سے نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ گوئٹے کی شہرۂ آفاق تمثیل "فاوسٹ" میں بھی اس کے آبائی اُبھار کے اثرات نمایاں ہیں۔ "فاوسٹ" کا دوسرا حصہ صرف نفسیاتی بحث کا مرکز بن سکتا ہے۔ کیونکہ پہلے حصہ میں شاعر بذاتِ خود تحلیل و وضاحت کرتا ہوا چلا جاتا ہے۔ البتہ دوسرے حصہ میں شاعر کی خلاقی قوتیں اس کی تخلیقی کاوشوں سے آگے نکل جاتی ہیں۔ دوسرے حصہ میں جب فاؤسٹ متحیر ہو کر کہتا ہے:۔

"ماں، ماں"! یہ کتنی عجیب آواز ہے"

تو ہمیں صاف طور پر محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کے آبائی اُبھار کی تجدید ہوئی ہے۔ البتہ ماہرینِ نفسیات یہ بتلانے سے قاصر ہیں کہ گوئٹے کے آبائی اُبھار نے "فاؤسٹ" کی تخلیق میں کس قدر حصہ لیا ہے البتہ اس کے اثرات واضح اور نمایاں ہیں۔

فرائڈ کے نزدیک خارجی حقیقت سے رابطہ پیدا کرنے کے دو ذریعے ہیں۔ ایک عملی، مثبت اور کارگر طریق کار ہے۔ یہ نفسِ شعور کا طریق کار ہے جو "ایگو" کہلاتا ہے اور جسے برتر ایگو (SUPEREGO) پر منحصر ہونا چاہیئے۔ اور اپنی تنظیم کے دائرہ کو فرد کی جبلی حرکت "اد (ID)" تک وسیع کرنا چاہیئے۔ یہ طریق کار راست اور حقیقی ہے۔ دوسرا ذریعہ متناقض ذریعہ ہے جسے افسانوی (FICTIONAL) طریق کار بھی کہا جاتا ہے۔ یہ حقیقت کو اپنے اساسی و اصلی خدوخال میں نمایاں کرنے کا رجحان نہیں رکھتا بلکہ حقیقت کو اپنے تخلیق کردہ تخیلی پیکروں (IMAGERY) میں ضم کر دیتا ہے۔ فرائڈ پہلے طریقہ کو سائنٹیفک اور دوسرے طریقہ کو فنکارانہ قرار دیتا ہے جن میں داخلی عنصر، خارجی عنصر پر غالب ہے۔ فنکار زندگی کی تصویر ضرور کھینچتا ہے لیکن اس کی ہر تصویر میں اس کی اپنی تصویر کے کچھ نقوش ضرور شامل ہوتے ہیں۔ جس طرح اینا کرینا ٹالسٹائی سے خالی نہیں اور "مادام بواری" فلوبیر ہے۔ اسی طرح فن کا کوئی گوشہ فنکار کے نقوش و آثار سے خالی نہیں ہوتا۔ اس اظہارِ ذات کو فرائڈ خود میلانی جبلت (PARTIAL INSTINCT) کا پیدا کردہ قرار دیتا ہے۔ جب نقادانِ ادب نے آندرے ژید کی "پاسٹر" کو ذاتی مرقع سے تعبیر کیا تھا تو آندرے ژید نے بڑے پُر جوش انداز سے کہا تھا کہ "اگر میں خود کو ماڈل کی حیثیت سے استعمال کرتا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ہی وہ شخص ہوں جس کا میں مرقع تیار کرنا چاہتا تھا۔

تمام فنکار خود نمائی کا مبالغہ آمیز اسلوب اختیار کرتے ہیں۔ یہ خود محبوبیت جسے نفسیاتی اصطلاح میں "نرگسیت" (NARCISSISM) سے تعبیر کیا جاتا ہے اگر معتدل اور جائز حدود میں ہو تو فنکار کو عظمت وعلویت بھی عطا کرتی ہے جس کی کامیاب مثالیں ٹالسٹائی، اسٹینڈال، کیزانووا، گوئٹے اور غالب و اقبال ہیں۔ لیکن اگر یہی انہماک بالذات حد درجہ شدید و مبالغہ آمیز ہو تو بلاشبہ فنکار کی روح تاثیر پذیر ہوتی ہے اور اس کا دائرۂ عظمت بھی محدود ہو جاتا ہے۔ اس کی نمایاں ترین مثالیں نیٹشے اور آندرے بریتوں، اُردو ادب میں جوش اور نیاز ہیں۔ جوش اقبال کے اسلوبِ خودنمائی کے تتبع میں ناکام نظر آتا ہے۔ اور نیاز ابوالکلام آزاد کی انانیت (EGOTISM) کا طریق اظہار اپنا نہ سکا۔ اس کا انحصار فنکار کے ارتفاعی عمل کی نوعیت اور اس کی اد اور ایگو کے باہمی توازن پر ہے۔ "اد" اور ایگو کے باہمی تعامل اور ان کے طریق کار کے متعلق فرائڈ رقمطراز ہے:۔

"ایگو، اد کا وہ حصہ ہے جو خارجی دُنیا کے اثرات کو براہِ راست قبول کرنے سے بدل جاتا ہے اور جو ادراکی شعور (PERCEPTUAL CONSCIOUS) کے ذریعہ اپنا کام کرتا ہے۔ یہ ایک لحاظ سے اوپری سطح کے امتیازات کی توسیع ہے۔ اس کے علاوہ ایگو کا ایک کام یہ بھی ہے کہ وہ اد اور اس کے میلانات پر خارجی دنیا کے اثرات کا بار بھی ڈال دیتی ہے اور یہ بھی کوشش کرتی ہے کہ لذت کوش طریقِ کار کو جو اد کا بنیادی طریقِ کار ہے حقیقی طریقِ کار میں بدل دے

ایگو میں ادما کی قوتیں ایک ذہنی کردار ادا کرتی ہیں۔ اور
اِڈ کی جبلتوں پر فرائض عائد کرتی ہیں۔ ایگو اِڈ کے بالکل برعکس
عقل و تمیز کی نمائندگی کرتی ہے۔ اور اِڈ جذبات و خواہشات
پر مشتمل ہے۔

(THE ego and THE Id)

اِڈ چونکہ انسانی وجود کا اساسی نقطہ ہے اس لئے فنی
تخلیقات کا اہم ترین سرچشمہ بھی اِڈ اور اس کے مطالبات و
مشمولات ہیں۔ لاشعور اِڈ کے درخت کا ہی ثمر ہے۔ اور اِڈ چونکہ
زندگی کا مرکزی رجحان ہے اور فنکار خود زندگی کا ایک مظہر ہے
اسی لیے جدید نفسیات میں فن کو لاشعور کا مظہر اور آئینہ دار کہا جاتا
ہے۔ لیکن اس آئینہ کا طریق انعکاس کسی قدر مختلف واقع ہے۔
لاشعوری خواہشات، شعور کے محکمۂ احتساب سے گزرنے کے بعد اپنی
نوعیت کے اعتبار سے ایک مرتفع شکل میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔
اور فن کے آئینہ میں صرف علائم کا اظہار ہوتا ہے۔ انہیں علائم
کی وجہ سے لاشعوری مشمولات اور فن میں ایک کاذب بعد حائل ہوتا ہے۔
ایگو کی گرفت ڈھیلی پڑتے ہی تخلیقی عمل کا آغاز ہو جاتا ہے۔
ایگو کی بندش ڈھیلی پڑنے کے اور بہت سے مظاہر ہیں۔ جیسے شراب کے
نشہ میں بیخود ہونا، خواب اور SCHIZOPHRENIA۔ لیکن فنی تخلیق
ان سب سے مختلف ہے۔ کیونکہ فنکار بلندی کی طرف جاتا ہے اور
دوسری کیفیات رجعت کی طرف مائل ہوتی ہیں۔ فنکار اس رجعت پر
بڑی چابکدستی سے قابو پالیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسی موقع
پر ارتفاعی عمل اپنے علامتی اسلوب میں ظاہر ہوتا ہے۔ فنی تخلیق
کے وقت تخلیقی فنکار لاشعور کی گرفت میں ضرور آجاتا ہے۔ لیکن اس کی
آزادی اور ارادہ قطعی سلب نہیں ہوتی۔ اسے لاشعور کی گرفت کا کچھ نہ
کچھ شعور ضرور ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ لاشعور کے بہاؤ پر اس حد تک اثر
انداز ہونا چاہتا ہے کہ اس کو اپنے قابو میں کر سکے اور وہ کسی نہ کسی حد تک
لاشعور کے اس ناقابل مزاحمت بہاؤ کا ہمدوش ہو جاتا ہے۔ بقول
مسکرنا لڈ ایک عظیم شاعر اس لیے نغمہ خواں ہوتا ہے کہ وہ نغموں کا انتخاب
کرتا ہے۔ یہ انتخابی صلاحیت اس کی اختیاری قوتوں سے پیدا ہوتی
ہے۔ اسی لئے برگساں نے تخلیق کو اختیار کے مترادف قرار دیا ہے۔
کانٹ نے فن کو جو اشیاء میں اضافہ کے نام سے پکارا اس کی تہ
میں بھی یہی تصور کارفرما تھا۔

سرریلسٹ فنکاروں کے نزدیک بھی فنی تخلیق اِڈ کے
تقاضوں سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن ان کے نقطۂ نظر کے مطابق
وہی فنکار عظیم ہوگا جس کی نظر اِڈ کی کار پردازیوں پر گہری ہوگی
اسی لئے سرریلزم کے موسس آندرے بریتوں نے سرریلزم کے منشور
میں فرائڈ کے انکشافات کا شکریہ ادا کیا تھا۔ سرریلسٹ فنکار تحت
کا مصور ہے لیکن جیسا کہ اندرے بریتوں نے کہا ہے سرریلسٹ
فنکار کا تخلیقی شعور خود لاشعور کے سرچشمہ سے فیضیاب ہوتا ہے۔
اسی لئے وہ فنی تخلیق کو "خواب" سے مشابہ بنانے کی ہر ممکن سعی کرتا ہے
خواب دراصل ایگو پر اِڈ کے غلبہ کا مظہر ہے۔ یہاں یہ امر بھی ملحوظ
رکھنا چاہیئے کہ ہر آرٹ انفرادی ہوتا ہے۔ یعنی فنکار کی ذہنی و فنی
انفرادیت کا اظہار اس کے فن میں بھی ہوتا ہے۔ اس لئے سرریلسٹ
فنکاروں کا یہ دعویٰ کہ وہ ترنگ کے اجتماعی لاشعور کی عکاسی
کرتے ہیں کسی اعتبار سے صحت مند نہیں معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کا
شخصی لاشعور ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں کولرج
کی مشہور سرریلسٹ نظم "KUBLA KHAN" کا ذکر بے محل نہ ہوگا
کولرج کی اس نظم نے ایسے بہت سے مسئلوں کو پیدا کر دیا ہے جو تخلیقی
عمل کے مطالعہ میں بڑی اہمیت اختیار کر لیتے ہیں۔ کیا واقعی کولرج
کا بیان اس نظم کے متعلق صداقت پر مبنی ہے؟ کولرج کے نقادوں
نے اس کے بیان کی صداقت کو تسلیم کر لیا ہے۔ اور جیسا کہ ایک
اہل نظر نے کہا ہے کہ کولرج کی یہ نظم فرائڈ کے نظریہ کی صداقت کا
بین ثبوت ہے۔

لاشعوری خواہشات کی آسودگی کی دو صورتیں ہیں۔ اگر کسی شخص میں
دوسرے شخص کو قتل کرنے کا جذبہ موجود ہے تو اب انتقال (TRANSFERENCE)
کی صورت میں وہ ڈاکو بن جاتا ہے اور ارتفاع کی صورت میں سرجن جو انسانوں
کا چیر پھاڑ کرتا ہے۔ انتقال سماج اور فرد دونوں کے لئے مضر ہوتا ہے
اور ارتفاع مفید کیونکہ وہ شعور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔

ایک سفاک قاتل کو سماج تحقیر و نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے لیکن سرجن کو معاشرہ میں بڑی عزت و وقعت حاصل ہوتی ہے۔ حالانکہ دونوں کا محرک ایک ہی ہے۔ لیکن دونوں کے طریق کار میں فرق ہے دونوں ایک ہی جذبہ کے تحت چیر پھاڑ کرتے ہیں لیکن ایک تعمیری اور دوسرا تخریبی انداز اختیار کر لیتا ہے۔ اور اسی لئے ان میں ایک ناقابلِ عبور فاصلہ حائل ہو جاتا ہے اور یہ گمان بھی نہیں ہونے پاتا کہ دونوں ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ روشن اور تاریک۔ یہی حال فنکار کا ہے۔ فنکار اپنے عزم و خواہش کی تکمیل کے لئے تعمیری ذرائع اختیار کر لیتا ہے اسی لئے پسندیدہ ہوتا ہے۔ ایک عامی جب جنسی خواہش سے مغلوب ہو جاتا ہے تو وسائل کی کمی سے فحش گفتگو اور ننگی تصویروں کا سہارا لیتا ہے۔ لیکن وہ اگر نسوانی لباس زیب تن کر لیتا ہے اور میراجی کہہ اٹھتا ہے۔

سفید بازو
گداز اتنے
زباں تصور میں حظ اٹھائے
اور اس کے بعد
میں ان کو ہلاؤں اتنی شدت سے جھٹکیاں لوں کہ سمٹ کے
عکس بن جائے بیکراں بحر بیکراں کا

لیکن یہاں ایک عامی اور فنکار کے مراتب میں صاف و نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ ایک ابتذال کی پستیوں میں افتادہ نظر آتا ہے اور دوسرا ارتفاع کی روشن بلندیوں پر پرواز کرتا دکھائی دیتا ہے اور بقول اقبال :-

نمود جس کی فرازِ خودی سے ہو وہ جمیل
جو ہو نشیب میں پیدا قبیح و نا محبوب

ایک ماہرِ نفسیات نے ایک اچھی نظم کو ایک جدید سامان سے آراستہ کمرے سے تشبیہ دی ہے جو بجلی سے کام کرنے والے سامان سے بھرا ہو۔ اس کمرے میں زیبائش، نفاست اور حسن ہوگا لیکن اس کمرے کے نیچے جو کمرہ ہوگا اس میں چونکہ اوپر کے کمرے کا تمام بجلی کا خام مواد موجود ہوتا ہے۔ اسی لئے اس میں ایک عجیب طرح کا محشر بپا ہوگا وہ حسن سے عاری اور نفاست و صفائی سے محروم ہوگا۔ لیکن اوپری کمرے کا سکون اس کمرے کی شورش، اس کا جمال اس کی قباحت، اس کا نظم اس کے اختلال و پراگندگی کا منت پذیر ہوگا۔ فرائڈ کی نفسیاتی بصیرت کا یہ سب سے اہم کارنامہ ہے کہ اس نے بلندی و پستی کے اس ظاہری التباس کو انسانی نظروں سے دور کر دیا۔

حسن کی ماہیت کے متعلق فرائڈ اور اس کے متبعین نے جو خیالات پیش کئے ہیں وہ ان کے انتہا پسند رجحان کے آئینہ دار ہیں۔ فرائڈ نے یہ کہہ کر کہ جمالیاتی تحریک کا سب سے بڑا ماخذ لاشعور ہے اور جمالیاتی کشش، جنسی کشش ہی کی ایک شکل ہے۔ یہ کوشش کی ہے کہ جملہ جمالیاتی مظاہر کو بھی لاشعور کے صنم تراش میلان کا نتیجہ قرار دے۔ جمالیاتی مظاہر کی گوناگونی کو وہ لاشعور کی بوقلمونی کا عکس قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک فنی تخلیقات و مساعی کے جملہ امتیازات غیر مناسب ہی نہیں سطحی بھی ہیں۔ تمثیلی آرٹ اور دوسری فنی مساعی میں نوعیت کا نہیں بلکہ مدارج کا فرق ہے۔ فنکار جملہ فنی ذرائع میں ایک جہانِ متخیلہ کی تخلیق کرتے ہیں۔ ہم فنی تخلیقات کو جس قدر قریب سے دیکھیں گے اسی قدر ہم پر یہ حقیقت کھل جائے گی کہ جملہ فنی مساعی کی گوناگونی کی تہ میں لاشعور کے مختلف بوقلموں مشمولات کارفرما ہیں۔ اور فن کے حیرت انگیز کارنامے اسی لاشعور کی معجزانہ کارفرمائیوں کے مظہر ہیں۔ یہ ایک متحیر کن حقیقت ہے کہ آندرے ژید نے اپنے مختصر ناول "PASTORAL SYMPHONY" کا پلاٹ کئی برس پیشتر اپنے ذہن میں تیار کر لیا تھا۔ اور بعد میں اسی پلاٹ سے مشابہ واقعات اس کی زندگی میں رونما ہونا شروع ہو گئے۔ اس کی زندگی اور اس کے فنی شعور کی مشابہت ہی نے اس ناول کو لکھنے کی تحریک پیدا کی۔ یہ تو بالکل واضح اور تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ بالعموم لاشعور ہی زندگی کی راہوں کا تعین کرتا ہے۔ گو شعوری تقاضے بھی زندگی کی رفتار کا رخ موڑتے رہتے ہیں۔ لیکن نفسیاتی مشاہدہ یہی بتلاتا ہے کہ لاشعور ہی عموماً راہِ حیات، اسلوبِ حیات اور وقوعاتِ حیات کا تعین کرتا ہے۔ اور یہ کہ انسانی زندگی لاشعور ہی کی ایک خارجی و عملی شکل ہے۔ آندرے ژید کے بعض سوانح نگاروں نے اس واقعہ کو ایک عجیب اتفاق

ہے دیکھنے کی کوشش کی ہے انہوں نے اس کی یہ توجیہ کی ہے کہ آندرے
ژید کا فنی شعور بلوغت و پختگی کے اس مقام پر پہونچ گیا تھا جہاں سے
مستقبل کے خدوخال نظر آنے لگتے ہیں۔ اس مافوق الفطرت اور غیر
فطری توجیہ سے قطع نظر اگر ہم اپنے نفسیاتی درک کی مدد سے اس معمہ کا
حل ڈھونڈھنا چاہیں تو اس کا سارا الجھاؤ دور ہو سکتا ہے۔ آندرے
ژید ایک عظیم فنکار تھا۔ اس قدر عظیم کہ آج بھی اس کے تخلیقی شعور کی
لہریں یورپین ادبیات میں بہہ رہی ہیں۔ لیکن اپنی فنکارانہ عظمت
کے باوجود وہ ایک انسان بھی تھا۔ شعور اور لاشعور کا مجموعہ۔ اس لئے
ناممکن ہے کہ وہ لاشعور کے تقاضوں سے دامن بچا سکا ہو۔ اس
کے لاشعوری تخیل نے جو مرقع حیات بنایا تھا وہ لاشعوری کارفرمائیو
سے عملی زندگی میں ظاہر ہو گیا۔ اور اس کی لاشعوری پیچیدگی نے
وقوعاتِ حیات کو اس کے فن میں منتقل کر دیا۔ فنکارانہ پیش بینی
اجتماعی و انفرادی لاشعور کے ادراک ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اور فنکار
اجتماعی و انفرادی دونوں لاشعور سے وابستہ ہوتا ہے۔ پروفیسر ژونگ
کے نفسیاتی نظریات کا مشہور نقاد جیکوبی اس کے نظریۂ فن کو ان لفظوں
میں پیش کرتا ہے:۔

"تخلیقی عمل جہاں تک ہم اس کا ادراک کر سکتے ہیں۔ انسانیت
کے ان لازمانی علائم کی تحریک سے عبارت معلوم ہوتا ہے
جو لاشعور میں پوشیدہ رہتے ہیں اور جن کی تہذیب تکمیل
سے فن کے مکمل نقوش اُبھرتے ہیں فنکار صرف خلقی تصورات
کے اشاروں کے تحت ہی کیوں نہ بولنا چاہے لیکن اس کی
زبان ہزارہا زبانوں کی ترجمانی کرتی ہے۔ وہ جو کچھ محسوس کرتا
ہے اسے اپنی فنکارانہ گرفت میں لے لیتا ہے اور اس پر
غلبہ حاصل کر لیتا ہے اور اسے فنی طور پر اپنا لیتا ہے..... اس طرح
عارضی ابدی بن جاتا ہے اور وہ اپنی ذاتی مشمولات کو فروغ
و رفعت عطا کر کے انسانیت کا مشترکہ سرمایہ بنا دیتا ہے۔"

فنی تخلیق میں لاشعور کے اثرات کو کئی نقادانِ فن نے تسلیم
کر لیا ہے۔ تھامسن نے اپنی تاریخ جمالیات میں فرائڈ کے نظریات
کا سات بار حوالہ دیا ہے۔ لیکن فرائڈ کے مابعد الطبیعاتی نتائج
فکر میں دہریت کا عنصر نمایاں ہے۔ اور جیسا کہ ایک نقاد نے اس کو غیر
مصالحت پسند دہریہ سے تعبیر کیا ہے۔ انسانی نفس اور اس کے اعمال
کو اس نے خالص مادی نقطۂ نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن
نظریۂ اضافیت اور کوانٹم نظریہ کے انقلاب آفریں انکشافات نے
شعور کو مادہ کا ماخذ بتلا کر مادی طریق تحلیل و نظر کی نارسائی ظاہر کر دی
ہے۔ اس لئے خالص مابعد الطبیعاتی حدود میں فرائڈ کے نظریات وہ
قدر و قیمت نہیں رکھتے جو اس صدی کے اوائل میں رکھتے تھے۔ اسی
لئے فنی تخلیق کے متعلق فرائڈ کے نظریات کی حیثیت بقول پروفیسر
ژونگ اغلب قیاسات سے زیادہ نہیں۔ غالباً اسی لئے آندرے
ژید نے فرائڈ کو "غیر پختہ عبقری" (IMBECILE GENIUS) کہا ہے۔ گو
فرائڈ کے نظریات سخت تنقید کی زد میں آ چکے ہیں۔ تاہم اس کی نفسیاتی و
تاریخی قدر و قیمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے
کہ فرائڈ بھی دوسرے عبقری الذہن انسانوں کی مانند انتہا پسندی کا شکار
ہوا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ فرائڈ بادلیر کے "قعرِ عمیق" کو کامل
طور پر فتح نہ کر سکا۔ لیکن یہ اس کا کم اہم کارنامہ نہیں کہ اس "قعرِ
عمیق" کے بعض گوشے روشن ہو کر سامنے آ چکے ہیں۔ اور یہ کہ کیا کوئی
انسان اس قعرِ عمیق کو مکمل طور پر روشن کر سکتا ہے؟ یہ خود ایک
زبردست مابعد الطبیعاتی مسئلہ ہے۔ بادلیر کا "قعرِ عمیق" کبھی بھی
روشن نہ ہو سکے گا۔ کیونکہ ہم اس اندھیرے کو کس طرح دور کر سکتے
ہیں جو ہمارے وجود کے سایہ سے پھیل رہا ہے ع

وہ سیاہ پردہ وہ رات کا ہو

علی ناصر زیدی

سائنس کا اثر ہماری تہذیب و ثقافت پر

سائنسی ترقی کے اس ممتاز دور میں جبکہ انسان جوہری توانائی کی مدد سے روزمرہ زندگی کا نقشہ ہی بدل دینا چاہتا ہے اور کرۂ ارض کو خیرباد کہہ کر چاند اور دوسرے سیاروں پہ کمند پھینکنے کو تیار ہے، جدید علوم کو تہذیب و ثقافت سے بالکل علیحدہ کر دینا ممکن نظر نہیں آتا۔ اگر ہم اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیں تو ہمیں یہ سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی کہ سائنس نے ہمارے معاشرتی، صنعتی، اقتصادی اور سیاسی رجحانات کو بڑی حد تک متاثر کیا ہے۔

ہماری تاریخ شاہد ہے کہ تہذیب و ثقافت کو ان ملکوں میں عروج حاصل ہوا جہاں آب و ہوا، جغرافیائی حالات، اقتصادی پس منظر اور معاشرتی مسائل نے اس امر کی اجازت دی۔ چنانچہ یونان، روم، مصر اور بحیرۂ روم کی آب و ہوا رکھنے والے تقریباً تمام ممالک کسی نہ کسی زمانے میں تہذیب کے علمبردار رہ چکے ہیں۔ قبل اس کے کہ ہم اپنی موجودہ تہذیب و معاشرت کا جائزہ لیں، اپنے ماضی پر ایک نظر ڈال لینا مناسب رہے گا تاکہ تقابل میں آسانی پیدا ہو جائے۔

اگرچہ ہماری زمین کی عمر تقریباً تین ارب سال ہے لیکن انسان کو اس خاک دان پر رہتے ہوئے دو لاکھ سے پانچ لاکھ سال تک کا عرصہ گزرا ہے۔ اس مدت میں اس قدر تضاد اس وجہ سے پیدا ہو گیا کہ انسان ارتقا کے کتنے ہی مدارج طے کرنے کے بعد موجودہ معیار پر پہنچا ہے۔ ان مدارج کا جائزہ لینے والا بڑی الجھن میں پڑ جاتا ہے کہ انسان کب سے "انسان" کہلانے کا مستحق ہوا اور اس سے پہلے کیا تھا؟ یہ ایک نازک مسئلہ ہے اور ہم اس کی تفصیل میں نہیں جائیں گے۔

لمبے چوڑے اعداد و شمار استعمال کرنے کی بجائے آیئے ہم یہ فرض کریں کہ لاکھوں سال کا یہ عرصہ ایک صدی کے برابر ہے یعنی انسان کی ابتدا اب سے سو سال پہلے ہوئی۔ ان سو سال میں سے ۹۸ سال تو برہنہ وحشیانہ حالت میں گزر گئے۔ کچھ ہوش آیا تو انسان نے درختوں کی چھال سے اپنے جسم کو ڈھانپنا شروع کیا۔ خانہ بدوش زندگی چھوڑ کر مل جل کر ایک جگہ رہنا سیکھا۔ اپنی مدد کے لئے بعض جانوروں کو رام کیا۔ زمین کرید کر اس میں کچھ بیج بکھیرے اور پھر اپنے لباس او اپنے جسم کی طرف کچھ توجہ کی۔

اٹھانوے برس یونہی گزر گئے۔ اس کے بعد لکھنے کا رواج شروع ہوا اور یہ تھا ترقی کی شاہراہ پر انسان کا پہلا اہم قدم۔ تحریر کی بدولت مختلف انسانوں کے مابین تبادلہ خیالات کا سلسلہ شروع ہوا اور کسی کو خیال آ گیا تو اس نے انسانی تہذیب کی تاریخ لکھنی شروع کر دی۔ کاغذ پیپر تو تھا نہیں۔ قدیم زمانے کی بہت سی تحریریں پتھروں اور چٹانوں پر کندہ نظر آتی ہیں۔ نہایت قدیم آرٹ دیکھنا ہو

فرانس اور دوسرے ملکوں کے تاریک غاروں کی سیر کیجئے جن میں اس گئے گزرے دور کے غیر متمدن انسانوں نے ہرنوں اور دوسرے جانوروں کے ایسے رنگین خاکے چھوڑے ہیں جو قرنیں گذر جانے کے بعد آج بھی دعوت فکر و نظر دیتے ہیں

یونان کے عروج کو صرف چھ ماہ گزرے ہیں جب وہاں ادب، فن اور موسیقی نے تمثیلی فروغ پایا۔ یہی زمانہ تھا کہ وہاں سائنس نے بھی جنم لیا اور پھیلنا شروع کیا۔ صرف چار ماہ ہوئے ہیں کہ عہد عیسوی شروع ہوا۔ چھاپہ خانے کی عمر مشکل سے ایک ماہ ہے۔ تین ہفتے ہوئے کہ جدید تجرباتی سائنس کا آغاز ہوا۔ دخانی انجن کی ایجاد صرف دو ہفتے قبل معرض وجود میں آئی۔ صرف پانچ دن گزرے ہیں کہ ذرائع حمل و نقل میں کچھ آسانیاں پیدا ہوئیں اور بھاپ سے ریلوے ٹرین اور بحری جہاز چلانے میں مدد لی جانے لگی۔ اس سے بھی کم عرصہ گزرا ہے کہ انسان برقی قوت سے روشناس ہوا۔ پھر رفتہ رفتہ تار برقی، ٹیلیفون، ریڈیو اور ٹیلی وژن کی ایجادات رونما ہوئیں اور انسانی برادری میں نسبتاً زیادہ میل جول اور زیادہ تفرقات پیدا ہونے شروع ہوئے۔

صرف دو دن گذرے ہیں کہ انسان نے پرواز کرنا سیکھا لیکن آج وہ دوسرے سیاروں پر جانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ اب فاصلے سکڑتے جا رہے ہیں اور زمین بہت مختصر جگہ معلوم ہونے لگی ہے۔ کل کی بات ہے کہ انسانی برادری میں بین الاقوامی جھگڑا پیدا ہو گیا اور پہلی عالمگیر جنگ میں ڈیڑھ کروڑ بے گناہ انسانوں کا خون بہہ گیا۔ اس جنگ نے انسان کے سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی مسائل کو حل کرنے کی بجائے انھیں مزید ہوا دی اور ایک دوسری عالمگیر جنگ کے لئے میدان ہموار کر دیا۔

تہذیب یافتہ انسان نے اپنی مختصر سی زندگی میں کئی فاش غلطیاں کی ہیں لیکن ابھی وہ مبتدی ہے۔ اس کی پوری تاریخ کے مقابلے میں اس کی موجودہ تہذیب اور ثقافت کا عرصہ نہایت مختصر ہے۔ تاہم اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ ابھی چند صدیوں پہلے پوری بنی نوع انسان نہایت پس ماندہ تھی، یہ امر یقیناً قابل صد داد ہے کہ آج ہم ترقی کی ایک عظیم شاہراہ پر گامزن ہیں۔ ہمارا ادب، ہمارا فن، ہماری تہذیب، ہماری ثقافت اور ہماری معاشرت ——— الغرض ہماری زندگی کا ہر پہلو ترقی پذیر ہے اور اس ترقی میں سائنس برابر کی شریک ہے کیوں کہ زندگی کی تقریباً تمام تر آسائشیں سائنس نے فراہم کی ہیں اور جب تک فراغت میسر نہ ہو انسان کسی میدان میں کوئی ترقی نہیں کر سکتا۔

اتنی ترقی کے باوجود ماہرین سائنس کہتے ہیں کہ یہ تو محض ابتدا ہے ایک نہایت تابناک اور درخشندہ مستقبل کی۔ علم و تحقیق کی ابھی کتنی ہی راہیں ایسی ہیں جن پر انسان نے ابھی قدم بھی نہیں رکھا۔ ہماری تہذیب و ثقافت معلوم نہیں ابھی کتنی کروٹیں بدلے گی۔ سائنس انسانی معاشرت کے بہت سے مسائل کو حل کرنے میں یقیناً ناکام رہی ہے لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس نے زندگی میں نت نئی آسانیاں پیدا کیں اور انسان کو اس قابل بنایا کہ وہ فکر معاش سے ایک حد تک آزاد ہو کر تہذیب و ثقافت اور ان سے متعلقہ مسائل پر غور و خوض کر سکے۔

اگر ہم اپنے ماضی پر ایک طائرانہ نظر ہی ڈالیں تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی کہ علم، تہذیب اور ثقافت کو صرف اسی زمانے میں فروغ حاصل ہوا جب انسان کو فکر معاش سے کچھ مہلت ملی اور جسمانی آرام میسر آیا اب سے لاکھوں سال پہلے انسان اور حیوان میں بمشکل امتیاز کیا جا سکتا ہوگا۔ اس دور کا انسان آنکھیں پھاڑے ہوئے چاروں طرف دیکھتا ہوگا اور ہر چیز پر حیرت زدہ ہو جاتا ہوگا

. . . . اُس زمانے کی

کی کوئی تاریخ تو موجود ہے نہیں کیوں کہ لکھنے پڑھنے کی صلاحیت
تھی ہی کس میں ۔ جو کچھ ہمیں معلوم ہو سکا ہے وہ نتیجہ ہے اُن
ماہرین آثار قدیمہ اور ماہرین انسانیات کی اَن تھک
کوششوں کا جو ماضی کو حال سے پیوست کرنے کی فکر میں
سرگرداں رہتے ہیں۔ قدیم انسان کے چھوٹے ہوئے اوزار،
ہتھیار، ڈھانچے، نقوش، برتن اور اسی قسم کی دیگر اشیا
اس کی معاشرت پر دھندلی سی روشنی ڈالتی ہیں۔

انسان کی مادّی ترقی جنوبی مغربی ایشیا سے شروع ہوئی

انسان میں ذرا سا شعور پیدا ہوا تو اس نے سب سے پہلے
مظاہر فطرت کو سمجھنے کی کوشش کی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ تمام
سائنسوں میں ہیئت قدیم ترین ہے۔ بعض لوگ اس زمانے
میں بھی چاند تاروں کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے جب کسی قسم
کے بھی ہیئتی آلات موجود نہ تھے۔ سطح ارض پر گزشتہ دور کی
بعض ایسی ہیئتی رصدگاہیں ابھی تک موجود ہیں جن میں کوئی
دُور بین نہیں کیونکہ اس زمانے میں دُور بین ایجاد ہی نہیں
ہوئی تھی۔

ہم یہاں ارتقائے انسان کی تفصیل تو بیان نہیں کر سکتے
البتہ یہ ضرور دہرانا چاہیں گے کہ ابتدائی انسان کی زندگی مشقت
پُر تھی۔ غاروں میں رہنے بسنے والے لوگ دن دن بھر شکار
کی تلاش میں پھرتے تھے۔ انھیں اتنا ہوش کہاں تھا کہ وہ
اپنے آپ کو اشرف المخلوقات سمجھتے اور اس برتری کے
تقاضوں کو پورا کرتے۔

ہزاروں سال یونہی گزر گئے۔ انسان نے کچھ ترقی کی
بھی تو طرح طرح کے طلسمات اور ضعیف اعتقادات میں مبتلا
ہو کر رہ گیا۔ جس چیز کو نہ سمجھ سکا، اُسی سے خوف کھانے لگا
اور اس کی پرستش کرنے لگا۔ بیسویں صدی کے اس ترقی
یافتہ دور میں بھی ایسے ضعیف الاعتقاد لوگوں کی کچھ کمی نہیں۔
الغرض ہمارا ماضی ایسی مثالوں سے پُر ہے جب انسان نے
عقل و فہم کو بالائے طاق رکھ کر جادو ٹونے، وہم اور ضعیف الاعتقادی
کو اپنا رہبر بنایا۔

اختصار کی خاطر ہم درمیانی عرصہ چھوڑ کر بابل اور مصر
کی قدیم تہذیبوں پر آتے ہیں۔ ان تہذیبوں نے سائنس
اور ثقافت کو بہت کچھ دیا اور ان کی ترقی کا باعث ہوئیں۔
اس زمانے کا تقریباً مکمل ریکارڈ ہمارے پاس موجود ہے۔
...۳ قبل مسیح سے بہت پہلے اہل بابل اور کلدانی قوم نے
دریائے دجلہ اور فرات کی وادیوں میں اور اہل مصر نے دریائے
نیل کی وادی میں کئی ارتقائی منازل طے کیں۔ یہاں کی زرخیز
زمین اور صحت بخش آب و ہوا نے زندگی میں نئی آسانیاں
پیدا کیں اور ان لوگوں کو اپنی ایک تہذیب، ایک ثقافت
کی بنا ڈالنے کا موقع میسر آیا۔

نہ صرف یہ کہ یہ لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے بلکہ انھوں نے
بعض میکانی آلات بھی ایجاد کئے۔ اہل بابل ۲۰۰ ۴ قبل مسیح
میں جنگوں کے لئے پہیے دار گاڑیاں اور رتھیں استعمال کرتے
تھے۔ تجارت کو فروغ دینے کے لئے اوزان ایجاد کئے گئے اور
دھوپ گھڑیوں کی مدد سے وقت شمار کیا جانے لگا۔ کلدانی قوم
...نے دن اور رات کو الگ الگ بارہ بارہ گھنٹوں میں
تقسیم کیا۔

کلدانی پجاری علم ہیئت کو بہت عزیز رکھتے تھے۔
انھوں نے سورج اور چاند کی حرکات کا صحیح صحیح مشاہدہ کیا اور
کہا جاتا ہے کہ وہ گرہن کے متعلق پیشگوئی کرنا جانتے تھے ہیئت
کے ساتھ ساتھ علم ریاضی نے جنم لیا۔ حساب کتاب اور اقلیدس
پر زور دیا جانے لگا۔ ابتدائی طرز کی جیومیٹری کو ارتقائی
منازل تک پہنچانے میں اہل مصر کا حصہ زیادہ ہے۔ انھوں
نے بعض اہم ہندسے بھی ایجاد کئے اور حیرت کی بات ہے
کہ انھوں نے زمین کے متعلق جو اعداد و شمار ترقی یافتہ
آلات کی مدد کے بغیر دریافت کئے تھے وہ آج کے معیار پر
تقریباً صحیح اُترے ہیں۔

الغرض شروع سے اب تک سائنس اور کلچر کا چولی

دامن کا ساتھ رہا ہے۔ دونوں کو آٹھویں اور چھٹی صدی قبل مسیح میں یونان میں فروغ حاصل ہوا۔ ایشیائے کوچک کے بسنے والوں اور ایونی باشندوں نے ایک ممتاز کلچر کی بنیاد ڈالی اور یہاں سے اس سائنس کی ابتدا ہوئی جس کی ترقی یافتہ شکل آج ہمارے سامنے ہے۔ غلاموں کی بہتات نے ان کے مالکوں کو اتنی فراغت اور فرصت بخشی کہ انھوں نے اسرار فطرت کو سمجھنے کے لئے سائنس کی سرحدوں کو وسعت دی اور انسان کو علم و آگہی کی دولت سے سرفراز کیا۔

کہاں تو وہ دور تھا اور کہاں یہ کہ انسان اب جوہری توانائی کو عام کرنے اور دوسرے جہانوں پر قدم رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ آج سائنس ہماری روزمرہ زندگی کا ایک لازمی جزو ہے اور اسے تہذیب و ثقافت سے الگ کرنا ناممکن ہے۔ سائنس داں کہتے ہیں کہ ایک گلاس پانی میں اتنی جوہری قوت پنہاں ہے کہ اس کی مدد سے ایک بڑا بحری جہاز بحر اطلانٹک کو پار کر سکتا ہے۔ ایک پونڈ کوئلہ میں اتنی توانائی موجود ہے کہ دس ہزار پونڈ کوئلہ جلانے سے بھی حاصل نہ ہو گویا کوئلے کو جلانا اسے ضائع کرنے کے مترادف ہے!۔

جہاں سائنس نے تہذیب و ثقافت کو فروغ بخشا وہاں وہ انھیں آن کی آن میں ملیامیٹ کرنے کی طاقت بھی رکھتی ہے۔ اگست ۱۹۴۵ء میں جاپان کے دو شہروں پر جو ایٹم بم گرائے گئے وہ اس بیان کی تائید کے لئے کافی ہیں۔ اس کے جلد ہی بعد سائنس دانوں کو اس عظیم قوت کے پُرامن استعمال کا احساس ہوا اور آج وہ ایک روشن مستقبل کی تعمیر میں مصروف نظر آتے ہیں۔

جوہری توانائی کی مدد سے برطانیہ اور امریکہ میں کئی سال سے برقی قوت پیدا کی جا رہی ہے۔ اس نئی قوت سے زراعت، صنعت و حرفت، طب و جراحی اور حمل و نقل میں جو آسانیاں پیدا ہوئی ہیں ان کی تفصیل آپ آئے دن اخباروں میں پڑھتے رہتے ہیں: ناٹیلس جیسی ایٹمی آبدوزیں اور سوانا جیسے ایٹمی بحری جہاز ہماری تہذیب میں ایک نئے باب کا افتتاح کر چکے ہیں۔ انسان ایک نئے دور میں داخل ہو رہا ہے۔ یہ جوہری توانائی کا دور ہے اور اب ہماری تہذیب بہت جلد "جوہری تہذیب" کہلانے لگے گی۔

صرف ساٹھ سال گزرے ہیں کہ رائٹ برادرس نے دنیا کا سب سے پہلا ہوائی جہاز چند میل کی رفتار سے اڑایا اور آج انسان کے بنائے ہوئے راکٹ پچیس ہزار میل فی گھنٹہ یا سات میل فی سیکنڈ کی زبردست رفتار سے مصروف پرواز ہیں۔ یہ رفتار زمین کی کشش کو شکست دینے کے لئے کافی ہوتی ہے اسی لئے اسے "رفتارِ فرار" کہتے ہیں۔

سائنسدانوں کے بنائے ہوئے مصنوعی سیارے نہ صرف زمین بلکہ شمس و قمر کے گرد گھوم رہے ہیں۔ اس وقت بھی انسان کا بنایا ہوا ایک راکٹ چاند کے سینے پر پڑا ہوا ہے۔ سائنس اور ادب کو ایک دوسرے سے کوئی لگاؤ ہو یا نہ ہو لیکن کیا موجودہ تہذیب و ثقافت کو جدید سائنسی دور سے جدا کرنا ممکن ہے؟۔

خواجہ دل محمد کا انتقال

اُردو کے مشہور شاعر اور ماہر درسیات و ریاضیات خواجہ دل محمد سابق پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور جو پاکستان رائٹرز گلڈ کے اہم اراکین میں سے تھے، لاہور میں انتقال فرما گئے۔ گلڈ اس غم میں مرحوم کے لواحقین کے ساتھ شریک ہے۔

منیر نیازی

ساتھیوں کی تلاش

کچھ اپنے جیسے لوگ ملیں
اِن رنگ برنگے شہروں میں
کوئی اپنے جیسی لہر ملے
اِن ساپنوں جیسی لہروں میں
کوئی تیز نشیلا زہر ملے
اِتنی قسموں کے زہروں میں
ہم بھی نہ گھر سے باہر نکلیں
اِن سُونی دوپہروں میں

ظہور نظر

میرے ہمدم، میرے محسن، میرے دوست

میری بیکل زندگی کی رہگذر پر دُور تک،
دونوں جانب، تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پیڑ ہیں
پیار کے صد رنگ پھولوں سے لدی ہیں جن کی لاکھوں ڈالیاں
جھومتی ہے جن میں بوئے مہر و اخلاص و وفا
چومتی ہے جن کو احساسِ محبت کی ہوا

بیٹھ کر جن کی گھنیری مہرباں چھاؤں تلے
میں نے کاٹی ہیں دوپہریں شدّتِ آلام کی
روتے روتے آ کے بیٹھا
ہنستے ہنستے شام کی

لوگ کہتے ہیں کہ یہ سب لوگ ہیں
اور ان کے نام ہیں ــــــ،
غزنوی، خالد، ریاض، احمد حسن، انشا، بشیر
سعد، محمود الحسن، بٹ جی، وحید، اکبر، امام

اور میں کہتا ہوں یہ سب پیڑ ہیں
پیار کے صد رنگ پھولوں سے لدی ہیں جن کی لاکھوں ڈالیاں
جھومتی ہے جن میں بوئے مہر و اخلاص و وفا
چومتی ہے جن کو احساسِ محبت کی ہوا
بیٹھ کر جن کی گھنیری مہرباں چھاؤں تلے
میری شخصیت مری تخئیل پاتی ہے جلا

سید وحید اختر

بساطِ ہوائے دل

زخموں کا بیاں پڑھیے، نشتر کی زباں سُنیے
کچھ حال ہمارا بھی اے چارہ گراں سُنیے

گُل بار نگاہوں سے کچھ خار بھی چُن لیجیے
گر ذوق ہے نغمے کا یہ حرفِ گراں سُنیے

جو چشم و سماعت کی ناگفتنی حسرت ہوں
کیوں دیکھیے خواب ایسے کیوں ایسی زباں سینے

جب تجربہ ہنستا ہے ارمانوں کی میّت پر
پھر مرگِ تمنّا پر کب دل کی فغاں سینے

اپنے ہی گریباں پر جب زور نہیں چلتا
بہتر ہے یہی پندِ پیرانِ مُغاں سینے

بشگفتگی غنچہ ہے اک چاک گریبانی
ہر منظرِ خنداں ہے نظروں کی پریشانی

ہیں روشنیٔ رُخ میں ظلمت کی کمیں گاہیں
نفرت کے نگینوں سے آباد یہ ویرانی

رن دار جہاں دیدہ آنکھوں کی بصارت ہیں
آلودگیٔ دل سے ہر تجربہ نورانی

ہیں مصلحتیں حاکم، جذبات غلام اُن کے
پتھرے ضرورت کے مجروح ہے پیشانی

صدیوں کی روایت کی میراث ہیں کچھ لاشیں
گھر نور سے خالی ہیں، روشن ہیں بہت قبریں

مرتی ہوئی قدروں کے ملبے میں سسکتی ہیں
سیّارہ و ثوابت پر پھینکی تھیں جو زنجیریں

ان باتوں سے خالی ہیں اذہان کے تہ خانے
جن باتوں کی ہوتی ہیں ہونٹوں پہ مُداراتیں

ہر چیز گراں ہے یاں، ہر جنس کی قیمت ہے
دل ہی ہے خراب ایسا جچتا نہیں نظروں میں

کیا ٹوٹ گیا دل میں، کیا پا کے گنوایا ہے
گرتی ہوئی تعمیروں کی گرد میں کیا ڈھونڈیں

گم گشتہ نشانوں کی یادیں بھی گنوا دیجے — ہر صوتِ جرس پر کیوں بیکار صدا دیجے
اس دشت نوردی میں اپنی ہی تباہی ہے — ہر نقشِ کفِ پا پر کیوں خود کو مٹا دیجے
کتنے ہی جہانوں کا مدفن ہے یہ ریگستاں — بنیادِ مکاں اس پر رکھتے ہی بھلا دیجے
جو لوگ بچھڑتے ہیں اس وقت کے دریا میں — ہر موج کو رو رو کر کیوں اُن کا پتا دیجے
انسانوں کے چہروں کی اس بھول بھلیاں میں — گم گشتگیٔ دل کے اسباب مٹا دیجے

پژمردہ اُمیدوں کا بے برگ گھنا جنگل
گر خود ہی نہ جل اُٹھے، آپ آگ لگا دیجے

○

ذکی احمد صدیقی

آگ وہی ہے

آنکھوں کی ٹھنڈک بھی دیکھی
لبوں کے شعلوں سے بھی کھیلا
کچی کلیاں جاگ اُٹھی ہیں
اُنگلی سے جب ساز کو چھیڑا
دل کی لیکن پیاس وہی ہے
آگ وہی ہے

کتنی چاندی پگھل گئی ہے
کتنا سونا دَمک اُٹھا ہے
پتھر میں بھی جان پڑی ہے
ٹھہرا پانی ہمک اُٹھا ہے
دل کی لیکن پیاس وہی ہے
آگ وہی ہے

شہاب جعفری

تلاش

دیس یہ جانا پہچانا ہے ! ——— کبھی یہ اپنا ہوتا تھا
اگلے برس تک اس مٹی میں پیار رہا را سوتا تھا
سانجھ سویرے اُن دیکھی برکھا سے نم رہتی تھی خاک
شام کا غنچہ، صبح کا سورج ، شبنم سے منھ دھوتا تھا
خاک سے تیرے بدن کی خوشبو ڈالی ڈالی اُڑتی تھی
دھیان کا بھونرا پھول کی بکھری پنکھڑیوں کو پروتا تھا
یاد کی اُٹھتی گرتی لہریں تجھ کو کہیں سے لے آتیں
ساحلِ نور پہ تیرا سایہ بیٹھا پانو بھگوتا تھا
اک ماندی سی لہر اچانک تیری گود میں آ گرتی
دھرتی سے آکاش تک اک آغوش کا عالم ہوتا تھا
سوتی رات کا جادو چلتا کھنچتے ہوئے دامن کی اوٹ
چاند کا جوبن چھلکا پڑتا ، ساگر پیاسا ہوتا تھا
گیسو تیرے بکھرے جاتے پہلو تیرے کھلے جاتے
شوق کی آنکھیں لوری دیتیں، تیرا حجاب نہ سوتا تھا
سبزہ سبزہ نیند بچھی تھی، چاند کی سی رفتار سے ہم
ہولے ہولے پانو اُٹھاتے، خواب کا عالم ہوتا تھا

جانے کون سے موڑ پہ تیرا ہاتھ اچانک چھوٹ گیا
گیان کی اس بورائی پون میں دھیان بھی تیرا ٹوٹ گیا

تیری دھرتی سارے جہاں میں پھر نہ کہیں پہچان ملی
اُس مٹی کی خوشبو پانے، بیج اشکوں کے بوتا تھا
چہرہ چہرہ وحشت ٹھہری آنکھیں تجھکو بھول گئیں
مُورت مُورت چُپ سی لگی تھی، جانے مجھے کیا ہوتا تھا
چڑھتے چاند کی آہٹ سُن کر نگری نگری میرا چراغ
رات کی جھکتی بدلی کے دامن کو پکڑ کر روتا تھا
رَستے رَستے بکھری ہوئی تھی میرے چراغ کی تنہائی
اک ماندی سی لَو میں کس کس کی پرچھائیاں سموتا تھا
رستہ چلتے لوگ بھی پاگل اُمیدوں کو سمجھاتے
کتنا ہی آئینہ دکھاتے ـــــ تیرا عکس نہ ہوتا تھا
دَل کے دَل بادل جب تیرا پُرسا دیکے چلے جاتے
دُور کہیں اک اَبر کا ٹکڑا جیسے مجھ کو روتا تھا

ہوش کے بجھتے دیئے میں ابتک اُس کا آنسو جلتا ہے
ابتک اُس کی کھوج میں پگلا دیس بدیس نکلتا ہے

سحر انصاری

افریقا

اے شب زدوں کے ملکِ سحر تاب، افریقا
اے تیرگی جبر کے مہتاب، افریقا
اے موجہ و تلاطم و گرداب، افریقا
دشتِ وفا کے آہوئے بیتاب، افریقا
اے رُوحِ دہر و قلب زمین و دماغِ زیست
اے اعتبارِ ہستی و چشم و چراغِ زیست
اے مسکنِ سیاہیٔ بدبختیٔ شعور
اے موسیٰ نظامِ صداقت کے کوہِ طور
اے ریگ زارِ محرمِ مہر و مہ و نجوم
اے گلشن فریب گہِ صرصر و سموم

جبروت و عزم و سطوت و ہیبت ہے تیرا نام
جذب و جنوں و قوت و عظمت ہے تیرا نام
رگ رگ میں تیری دولت و زر کا وفور ہے
چہرے پہ تیرے عظمتِ انساں کا نور ہے
تیری سیاہ خاک پہ عفریتِ نسل و رنگ
کرتا رہا معیشت و محنت کی سر و جنگ
تیرے لہو میں برف کدوں کے سفید فام
بن کر رہے شقاوتِ جرثومۂ جذام
تھے لعل جتنے معدنِ سنگِ سیاہ میں
سب قطرہ ہائے خوں تھے جنوں کی نگاہ میں
اہلِ ہوس نے کر دیا پامال نظمِ زیست
بے ساز و نغمہ ہو گئی یک لخت بزمِ زیست
کتنے پہاڑ ڈھ گئے طوفاں کے زور سے
کتنے چراغ بجھ گئے آندھی کے شور سے
تیرے شہید، وہ ترے فرزندِ حق شناس
تجھ پر نثار ہو کے تجھے کر گئے اداس
ہے تیرے دل میں درد کا لاوا دبا ہوا
تیرا جگر ہے تیرِ الم سے چھدا ہوا
ہر چند زیرِ تیغ ہے حلقومِ زندگی
پیشِ نظر ہے چہرۂ مغمومِ زندگی
لیکن یہ وقتِ ماتم و فریاد و غم نہیں
جوشِ جنوں کے فیض سے گلنار ہے زمیں
جوشِ جنوں کو دیکھ کہ کس درجہ تند ہے
جوشِ جنوں کے سامنے ہر تیغ کُند ہے

یہ اہتمامِ جبر ہے دو چار سال اور
کچھ دُور اب نہیں ہے خلوص و وفا کا دَور
صدیوں کی بیکسی نے اُٹھایا ہے اب سَر
پسماندگی ہوئی ہے تمنا کی راہبر
پھر ختم ہونے آئی ہے رنج و الم کی رات
پھر آج شعلہ بار ہے خاکسترِ حیات
پیڑوں کے اژدہام میں شاخوں کا پیچ و تاب
ہر خار بے قرار، ہر اک گل میں اضطراب
ہاں، چلچلاتی دھوپ بھی لَو دے اُٹھی ہے اب
ہاں، صرصر و سموم بھی ہیں محشرِ غضب
ہاں، ولولوں کے آہن و فولاد ہیں ترے
ہاں، شیوہ ہائے عالمِ ایجاد ہیں ترے
ہر تیرگی میں خنجرِ خورشید اُتار دے
ہر خس کدے کو جذبِ جنوں کا شرار دے
ہر زاویے سے ارض و سَما کی طناب کھینچ
ذرّے کے دل سے شعلگیٔ آفتاب کھینچ
اے اژدہے — جنون میں پھنکار بار بار
اے شیر — ایک جست میں دنیا کو کر شکار
اے فیل — جبر و ظلم کے اصنام رَوند دے
اے وحشیٔ اسیر — لگا اور قہقہے
چیتے کی طرح وادیٔ ظلمت کو پھاند لے
پھر روشنی کے واسطے زرباش چاند لے
تیرے قدم ستون ہیں تہذیبِ عشق کے
تیرے ہی سر پہ سرا ہوئے وحشت کے معرکے

انگڑائی لے کے طوقِ غلامی کو توڑ دے
دار و رسن کا پنجۂ مجرم مروڑ دے
کوہسار کی جبیں سے پسینہ نچوڑ کر
دریا کو شاخِ سبز کے مانند موڑ کر
سیلابِ عزم و جہد و طلب ساتھ لیکے چل
طوفانِ قہر و غیظ و غضب ساتھ لے کے چل
کوندے ہیں برق بن کے جو زتاف و زبیرا
بادل کی طرح جھنڈا ابابیس کا اُڑا
زنداں کے سنگ و خشت کی تنظیم توڑ دے
مقتل کے خونِ سرد میں اک آگ چھوڑ دے
بامِ اُفق کو چوم کے جامِ شفق اُچھال
ضربِ طرب سے توڑ دے خُمِ خانۂ ملال
زلفیں بکھیر، بندِ قبا توڑ، خاک اُڑا
مستانہ وار سینہ و ساق و کمر نچا
مردنگ و چنگ و بربط و دَف کی صدا پہ ناچ
نوکِ سنان و سرحدِ تیغِ قضا پہ ناچ
صحرا کی خاک چھان، بگولے اُڑا کے ناچ
سیارگانِ عالمِ وحشت پہ چھا کے ناچ
ہر سازِ انبساط کی لَے تیز کر کے ناچ
سامانِ قتلِ خسرو پرویز کر کے ناچ
رقصاں ہے چرخ، چاند کے دَف کو بجا کے ناچ
سر پر کلاہِ مہرِ منوّر سجا کے ناچ
ہاں ناچ، طفل و پیر و جواں تیرے ساتھ ہیں
ہم ساتھ ہیں، زمان و مکاں تیرے ساتھ ہیں

منصور قیصر

"سات پُلوں کی ملکہ"

مری چونچ میں اک سُنہری کلی تھی
جو نغموں کی کِھلتی ہوئی پھلجھڑی تھی
گلے میں دَھنک کا مرے ہار تھا اک
پَروں پہ مرے چاند کی چاندنی تھی
مری بات اُگتا ہُوا بھور جیسے
مری خامشی رات کی بانسری تھی
مرے سر پہ گنبد تھا نیلی ہوا کا
مرے پاؤں میں سِل کوئی مرمری تھی
مرے پاؤں میں جیسے زنجیرِ خوشبو
مرے ہاتھ میں رنگ کی ہتھکڑی تھی
وہ اک شہر تھا خواب کی رَو نقوں کا
میں پہلے پہل جب تصوّر بنی تھی
ہلی جب تو چاروں طرف تھی سَلاخیں
میں پنجرے میں پیدا ہوئی اور پَلی تھی
نہیں ہے یہ پیدائشِ تو نہیں ہے
وہ رنگین پنجرے کی سَوداگری تھی!

احسان دانش

○

وہ شوخ جو مجھ پہ مہرباں ہے
اب میرا حریف اک جہاں ہے

جب پھول تھے اب لہو رواں ہے
کم کیسے بہار سے خزاں ہے؟

بھٹکے ہوئے رہروؤں کی خاطر
آوازِ جرس رُوانِ دُواں ہے

اِس مجلسِ مے کدہ سے اُٹھو
ہر رِند یہاں تو سرگراں ہے

بھٹکے نہ تو راہ کیا ملے گی؟
منزل کا حجاب کارواں ہے!

شیون کی صدا، نہ بارشِ اشک
سنسان فضائے شہرِ جاں ہے،

اِس فصل کی منتظر تھی دُنیا،
ہر پھول پہ زخم کا گماں ہے،

کیا خضر کی جستجو سے حاصل
رہبر تو غبارِ کارواں ہے،

شاخوں میں تصرفِ صبا سے
اندازِ خرامِ گُل رُخاں ہے،

چشمے پہ بھڑک رہی ہے کونپل
دُنبالۂ چشمِ دلبراں ہے،

تاروں میں یہ گفتگو تھی کل رات
انسان بلا کا سخت جاں ہے،

تھا صرفِ چمن لہو یہ کس کا
مہکا ہُوا دامنِ خزاں ہے،

مشکل نہیں خودکشی بھی لیکن
آداب و اُصول کا زیاں ہے!!

شاید کوئی شعلہ سر اُٹھائے
اَب حدِ نگاہ تک دھواں ہے،

ہے عشق و ہوس میں فرق لیکن
درکار ذرا سا امتحاں ہے!

ارزاں سہی ہر قدم پہ جلوے
جلوؤں کے لئے نظر کہاں ہے؟

دل رُندھ گیا، سر سرائے آنسو،
پلکوں سے قریب کہکشاں ہے!

ہیں پاؤں میں آبلوں کی شمعیں
اب ڈھونڈھ وہ نقشِ پا کہاں ہے!

کرنا ہے حسابِ آبِ گُل بھی
بلواؤ شمیمِ گُل کہاں ہے!!

تم سے مجھے اک تعلقِ خاص
اب پوچھ رہے ہو سچ تو "ہاں" ہے

ہرچند شکستہ پا ہوں لیکن
منزل سے اُدھر مرا نشاں ہے!

تاروں کی ہنسی ہو یا گلوں کی
اک صورتِ شیون و فغاں ہے!

دیتے ہیں وہ اس طرح تسلّی،
ہم بھی تو وہیں ہیں تو جہاں ہے!!

اک جست کا مرحلہ ہے دُوری
دیوارِ حیات درمیاں ہے،

تم بھی تو نگر نگر پھرے ہو
دستورِ وفا کہاں کہاں ہے؟؟

مجھ سے بھی زیادہ خستہ غم،
دانش مرے غم کا رازداں ہے!

ناصر کاظمی

○

بنے بنائے ہوئے راستوں پہ جا نکلے
وہ ہمسفر مرے کتنے گریز پا نکلے

چلے تھے اور کسی راستے کی دھن میں مگر
ہم اتفاق سے تیری گلی میں آ نکلے

کھلا نہ غنچۂ دل ہی تو پھر بلا سے مری
ہزار غنچے کھلاتی ہوئی صبا نکلے

غمِ فراق میں کچھ دیر رو ہی لینے دو
بخار کچھ تو دلِ بے قرار کا نکلے

نصیحتیں ہمیں کرتے ہیں ترکِ الفت کی
یہ خیر خواہ ہمارے کدھر سے آ نکلے

یہ خامشی تو رگ رگ میں رچ گئی ناصر
وہ نالہ کر کہ رگِ سنگ سے صدا نکلے

قتیل شفائی

○

ابابیلوں کی یہ پرواز کیا ہے
کہو اس بے کلی کا راز کیا ہے

مچا ہے شور سا ہونٹوں کے پیچھے
یہی چپ ہے تو پھر آواز کیا ہے

سبھی ہیں مطمئن پیاسے بھی رہ کر
تری محفل کا یہ اعجاز کیا ہے

مجھے خوف آ رہا ہے قہقہوں سے
بھلا رونے کا یہ انداز کیا ہے

میں آپ اپنا تعاقب کر رہا ہوں
یہ عالم اے مرے دمساز کیا ہے

قتیل اس شہرِ غوغا میں نہ تو بول
یہاں پیارے تری آواز کیا ہے

شکیب جلالی

○

موجِ غم اس لئے شاید نہیں گزری سر سے
میں جو ڈوبا تو نہ اُبھروں گا کبھی ساگر سے

اور دُنیا سے بھلائی کا صلہ کیا ملتا
آئنہ میں نے دکھایا تھا کہ پتھر برسے

کتنی گم سُم مرے آنگن سے صبا گزری ہے
اک شرر بھی نہ اُڑا رُوح کی خاکستر سے

پیار کی جوت سے گھر گھر ہے چراغاں ورنہ
ایک بھی شمع نہ رَوشن ہو ہوا کے ڈر سے

اُڑتے بادل کے تعاقب میں پھرو گے کب تک
درد کی دُھوپ میں نکلا نہیں کرتے گھر سے

کتنی رعنائیاں آباد ہیں میرے دل میں
اک خرابہ نظر آتا ہے مگر باہر سے

وادیٔ خواب میں اس گل کا گزر کیوں نہ ہوا
رات بھر آتی رہی جس کی مہک بستر سے

طعنِ اغیار سُنیں آپ خموشی سے شکیب
خود پلٹ جاتی ہے ٹکرا کے صدا پتھر سے

قمر جمیل

○

جاؤ گہرِ جاں کے خریدار سے پُوچھو
احساس کی قیمت رَسن و دار سے پُوچھو

تنہائی کے زنداں سے نکلتی تو نہیں ہے
جینے کی تمنا در و دیوار سے پُوچھو

ہم لوگ کہ آوارۂ و بیدار ہیں کب سے
کس دام بکیں گے نگہِ یار سے پُوچھو

ہم لوگ بہاروں سے گزرتے ہیں مگر یوں
چُپ چاپ کہ زنجیر کی جھنکار سے پُوچھو

آساں نہیں دنیا میں قیامت سے گزرنا
لیکن کسی احساس کے بیمار سے پُوچھو

کچھ لوگ جمیل اپنے طلسمات میں گم ہیں
پتھر تو نہیں ہیں در و دیوار سے پُوچھو

قمر نجمی

○

شعر و نغمہ بن کے رگ رگ میں اُتر جاتی ہے رات
جب ترے ہمراہ آتی ہے نکھر جاتی ہے رات

کچھ دنوں سے یوں دبے پاؤں گزر جاتی ہے رات
جیسے میرے گھر کی ویرانی سے ڈر جاتی ہے رات

آپ کیا سمجھیں گے کیا ہوتی ہیں شب کی تلخیاں
آپ کے گھر چاندنی بن کر اُتر جاتی ہے رات

میں جہاں رہتا ہوں اس بستی کی یہ پہچان ہے
اُس طرف سے جب گزرتی ہے ٹھہر جاتی ہے رات

کون بڑھتا ہے اب اس کی پیشوائی کے لئے
دیکھنا یہ ہے کہ اب کے کس کے گھر جاتی ہے رات

جیسے لہرائیں کسی کے گیسوئے شبگوں قمرؔ
میرے دروازے پہ آکر یوں بکھر جاتی ہے رات

مہدی ظہیر قنو کلیمی

○

چھلکی شراب گیسوِ پیمانۂ کمر سے
دوشیزگی نے آنچل ڈھلکا دیا ہے سر سے
اُس بیوفا سے ہم نے کی آرزو وفا کی
سائے کی بھیک مانگی اک جلتی دوپہر سے
مانا چراغ و شب میں ربط حسیں ہے لیکن
رشتہ اک اور نازک ہے شمع کا سحر سے
بادل کی ہے جبھی تک دوشیزگی سلامت
جب تک ہوا نہ چھیڑے۔ چھایا ہے نہ کسے
پنگھٹ سے آتی گوری۔ پائل بنا چھماچھم
گھنگرو کی ایک "چھن" سی نکلے بھری نگر سے
تھم جائے نبضِ ہستی۔ نظمِ جہاں ہو برہم
سرف اک گنہ کی لذت چھن جائے گر بشر سے
بھونرا ہے ایسی شب کا اک "گنگناتا لمحہ"
اُڑ جائیں جب خوشی کے لمحات مختصر سے
خوابوں کے میرے موہوم اور سانولے دھندلکے
وہ! مجھ کو جھانکتے ہیں اُس "روزنِ قمر" سے
لے عشرتِ نظارہ سب تجھ کو دیکھتے ہیں
کوئی کسی نظر سے۔ کوئی کسی نظر سے
کچھ طے نہ کرسکے ہم کون ان میں ہے خوش انجام
وہ جو کسی کو پائے۔ یا جو کسی کو ترسے
ہر گل کے آگے بھونرا ہے روپ کا بھکاری
کب پیٹ بھر سکا ہے سائل کا ایک در سے
بھاتا ہے قنوؔ کو ایسی پگڈنڈیوں پہ چلنا
جو ہٹ کے چل رہی ہوں زندگی ہوئی ڈگر سے

ہر احمر

○

فورِ شوق میں بڑھتے ہیں تیرے دیوانے
نوں پہ مہرِ خموشی، نظر میں افسانے
ھر بکھرے گئے ہیں حیات کے عنواں
ھر بکھر جو گئے ہیں سبُو و پیمانے
صیلِ شہرِ طرب کو خبر نہیں شاید
سی کے سائے میں پھیلے ہوئے ہیں ویرانے
زورِ گردشِ افلاک توڑ ہی آئے
سر پھرے، یہ ستم کش، یہ تیرے دیوانے
یارِ لالہ و گُل میں کوئی نہیں اپنا
ز اس کے شہر میں شاید کوئی ہمیں جانے
شفق کی آگ، نہ دل کا لہو، نہ صحنِ چمن
با کے رنگ سے تازہ ہوئے ہیں افسانے
ارے دم سے ہے دَیر و حرم میں آبادی
ارے دم سے ہیں رنگین سارے خانے
مارے شہر کے نوخیز خوبرو احمر
ے ہیں مل کے بھی ہم سے رہے ہیں انجانے

جمال پانی پتی

○

غم کے ہاتھوں یہ محبت کی پریشاں حالی
دل بھی ویران ہے آنکھیں بھی ہیں خالی خالی
گوہرِ دید نہ پایا کہیں اے شوقِ تلاش
شب کا آغوش تہی، صبح کا داماں خالی
دیکھ یہ منظرِ خاموش، سحر سے پہلے
جیسے کچھ کہتی ہے یہ رات گزرنے والی
آج کی رات بھی ممکن نہیں سونا یارو
یاد پھر آئی وہی نیند اُڑانے والی
جھومتی پھرتی ہے پھولوں کو صبا شاخ بشاخ
بارِ مستی سے جھکی پڑتی ہے ڈالی ڈالی
گھومتے گھومتے تھک جاؤ گے سڑکوں پہ جمال
اب تو گھر جاؤ کہ ہے رات بھی ڈھلنے والی

انور

اُٹھ فریدا سُتیا

پاکستان رائٹرز گلڈ کے نمائندے جشنِ فرید میں حصہ لینے کے لئے کراچی سے ملتان جا رہے تھے۔ خیبر میل چلنے کے لئے تیار کھڑی تھی۔

ابن انشا نے نمائندوں کی حاضری لے کر تشویشناک لہجے میں کہا:

"بخاری نہیں آئے"۔

موکش علی طالبینی مقصد علی طاں بنگالی نمائندے نے پوچھا:

"کون بُکھاری۔؟ ایسٹ پاکستان میں جوٹ کا فصل بہت ہوتا۔ ویسٹ پاکستان میں بُکھاری کا فصل بہت ہوتا۔۔۔ یہ کون بکھاری ہے"؟

ابن انشا نے جواب دیا:

"صحیح بخاری۔ زیڈ۔ اے۔ بخاری۔ ذوالفقار علی بخاری"۔

شاہد احمد دہلوی نے برتھ پر اپنا بستر بچھاتے ہوئے کہا:

"جی نہیں۔ صحیح بخاری تو اے۔ ایس بخاری تھے۔ ان کے بڑے بھائی پطرس بخاری"۔

ابن انشا نے کہا:

"شاید آپ کو معلوم نہیں کہ پطرس بخاری فوت ہو چکے ہیں۔ اور اب زیڈ۔ اے۔ بخاری نے ان کا چارج لے لیا ہے اب صحیح بخاری زیڈ۔ اے بخاری کا حدود اربعہ بیان کرنے کے لئے کہا جاتا ہے۔ اور جب زیڈ۔ اے آجائیں گے اور آپ زیڈ۔ اے۔ بخاری کا حدود اربعہ دیکھیں گے تو خود بخود کہہ اٹھیں گے کہ صحیح بخاری وہی ہیں"۔

بخاری آگیا۔

"السلام علیکم"۔

سب نے کہا:

"وعلیکم السلام"۔

پھر وہ ابن انشا سے مخاطب ہو کر بولا:

"انشا جی، ہمارا برتھ کہاں ہے؟"

ابن انشا نے جواب دیا:

"آپ اور رفیق خاور ساتھ والے کمپارٹمنٹ میں؛ اس میں آپ ہیں۔ رفیق خاور ہیں۔ اور دو جوتوں کے سوداگر ہیں۔ آپ کا سفر بڑا آرام دہ کٹے گا"۔

بخاری نے کہا:

"لیکن جوتے آرام دہ بھی ہوتے ہیں۔ اور مضبوط بھی ہوتے ہیں"۔

پھر انھوں نے شاہد صاحب کے وضو کے لوٹے کی طرف دیکھ کر کہا:

"اچھا ہوا میں اس کمپارٹمنٹ میں نہیں ہوں۔ دیکھو یہ لوٹا میرے گھٹنوں کا بگل بجاتا رہتا"۔

شاہد احمد دہلوی نے موضوع بدل کر کہا:

"ارے بھئی ممتاز حسین بھی تو نہیں آئے۔"

ابن انشا نے بتایا:

"ممتاز حسین ایک دن پہلے ملتان پہنچ چکے ہیں۔"

اور خیبر میل چل پڑی۔

بخاری اور رفیق خاور دیر تک ہمارے کمپارٹمنٹ میں بیٹھے رہے، تاکہ ان کے واپس جانے سے پہلے جوتوں کے سوداگر سو جائیں۔ اور زیادہ اس لئے کہ کند ہم جنس باہم جنس پرواز۔ ویسے تو رفیق خاور اور بخاری بھی ہم جنس تھے۔ لیکن ان کے ساتھ جوتوں کے سوداگر تھے۔ اس لئے وہ دیر تک ہمارے کمپارٹمنٹ میں بیٹھے رہے۔ رفیق خاور نے سارے سفر میں صرف ایک کام کی بات کی:

"جی ہاں، چلا جا رہا ہوں۔ ماہ نو کو چلانا بڑا مشکل کام ہے۔ ماہ نو نے وقار عظیم اور حسن عسکری جیسے بڑے ادیبوں کو پچھاڑ دیا۔ لیکن میں تو ماہ نو پچھلے دس سال سے چلا رہا ہوں اور ماہ نو کے بلند معیار میں کس کو شک ہو سکتا ہے۔"

ابن انشا نے کہا:

"اور ماہ نو کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ وہ بک سٹالوں پر پہنچنے سے پہلے ختم ہو جاتا ہے۔ رفیق خاور نے ماہ نو کے ایک شمارے میں لکھا تھا کہ اردو ادب میں دو بڑے افسانہ نگار ہیں۔ انور اور قرۃ العین حیدر۔ ماہ نو کو انور کا تعاون حاصل ہے۔ اور وہ قرۃ العین حیدر کا تعاون حاصل کرنے کے لئے دن رات کوشش کر رہا ہے۔ چنانچہ میں پچھلے کئی ماہ سے انور کے افسانے پڑھنے کے لئے ماہ نو ڈھونڈتا پھر رہا ہوں لیکن مجھے ماہ نو کسی بک سٹال پر نہیں ملا۔ وہ اس قدر مقبول ہے کہ بک سٹالوں پر پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو جاتا ہے۔"

بخاری نے پوچھا:

"کون انور؟ انور عنایت اللہ؟"

ابن انشا نے میری طرف اشارہ کر کے جواب دیا:

"نہیں انور۔ صرف انور ۔۔۔ خالص انور۔ وہ اپنے نام میں کوئی ملاوٹ پسند نہیں کرتا۔ لوگ جب کسی کو پیار کرتے ہیں تو اس کو چھوٹا سا نام دے دیتے ہیں۔ انور کو پیار سے پکارنے والا کوئی نہیں۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو بڑے انور کہتا ہے۔ جب وہ کسی کہانی کو اطمینان بخش اختتام پہنچا دیتا ہے تو اپنے آپ سے کہتا ہے: ویل ڈن۔ انو کیونکہ وہ انور جو کہانی لکھتا ہے اس انور سے بالکل مختلف جو آپ کے سامنے بیٹھا ہے۔ یہ ٹومی تحریر جو انگریزی بولتا اور اردو لکھتا ہے۔ اور نہ انگریزی جانتا ہے نہ اردو۔"

ابن انشا نے اس تعارف کے ذریعے مجھ سے انتقام لیا تھا۔ وہ میرے چھوٹے سے نام کو بہت ناپسند کرتا ہے کہا کرتا ہے:

"چھوٹا نام چھوٹا ادیب۔ بڑا نام بڑا ادیب۔ دو نالی بندوق ایک نالی بندوق سے زیادہ مار کرتی ہے۔ اور تین نالی بندوقیں بھی ایجاد ہو گئی ہیں۔ مثلاً قرۃ العین اور دیکھ لو اس نے ہم سب کے بعد میں لکھنا شروع کر سب سے پہلے منزل کو چھو لیا ہے۔ میں نے غلطی کی اپنا نام ابن انشا رکھ لیا۔ مجھے اپنے پورے نام کو اپنا تخلص کرنا چاہیے تھا۔ شیر محمد خاں ابن انشا۔ اگر میں اپنے پورے نام کو تخلص کے طور پر استعمال کرتا تو سر سید احمد خاں سے پہلے مشہور ہو"

اور میں اسے کہا کرتا ہوں

"ابن انشا، مجھے تمہارا نام بالکل پسند نہیں۔ تم نے سن رکھا تھا کہ عربی النسل گھوڑے ریس کورس پر کامیاب ہوتے ہیں۔ اس لئے تم نے اپنا نام ابن انشا رکھا لیکن شاید تمہیں معلوم نہیں کہ تم عربی النسل گھوڑے نہیں بلکہ پنجابی ڈھگے ہو۔ اور مجھے تو اس ایسا کسی سٹنٹ پکچر معلوم ہوتا ہے، جیسے سن آف تارزن یا سن آف علی اور جب تم ادیبوں کی کسی مجلس میں پہنچتے ہو تو یہ احساس ہوتا کہ کوئی ادیب آ گیا ہے، بلکہ یہ احساس ہوتا ہے کہ

ابنا آگیا ہے۔ ویسے تم نے اچھا ہی کیا کہ پنجابی ڈھنگ سے عربی النسل گھوڑا بننے کی کوشش کی، ورنہ تم کولھو کا بیل بن کر رہ جاتے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ایک اچھا عربی النسل گھوڑا بننے کے لئے تمہارا نام ابن انشا نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ ابن بطوطہ ہونا چاہیئے تھا، تم میں ابن بطوطہ ہونے کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ پاکستان رائٹرز گلڈ ایک تحریک کا نام ہے کیونکہ تم اور رعالی اس کو ہمیشہ حرکت میں رکھتے ہو۔ گلڈ کا ہر ممبر ایک چھوٹے پیمانے پر ابن بطوطہ ہے اور اگر تمہارا نام ابن بطوطہ ہوتا تو تم ابن بطوطوں کی ایک پوری قوم کے سردار ہوتے، اور انشا جی کہلانے کی بجائے سردار جی کہلاتے۔"

بخاری سے میری پہلی ملاقات بمبئی میں ہوئی تھی۔ ایک ادبی مجلس میں اس نے غزل پڑھی تھی اور میں نے افسانہ۔ اس کو میرا افسانہ پسند نہیں آیا تھا۔ مجھے اس کی غزل پسند نہیں آئی تھی۔ اس لئے ہم ایک دوسرے کو بھول گئے۔ آزادی کے بعد ہم چند مرتبہ سوشل پارٹیوں اور ادبی مجلسوں میں ایک دوسرے سے ملے۔ لیکن اس نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ اس لئے میں نے بھی اس کو پہچاننے سے انکار کر دیا۔

مقصد علی ملّاں نے اپنے اوپر کے برتھ پر لیٹ کر اردو کی پہلی کتاب نکال لی۔ اور پڑھنے میں مشغول ہوگیا

آغا ناصر نے اپنے اوپر کے برتھ پر لیٹے ہوئے مقصد علی سے پوچھا:

"مقصد علی، یہ کیا ہے؟"

مقصد علی نے جواب دیا:

"اردو کی پہلی کتاب۔ ہم اردو سیکھنا شروع کیا ہوں۔ ہم اردو سیکھ کر قدرت اللہ شہاب کا سب ورکس پڑھنا چاہتا ہوں۔ ہم سنا قدرت اللہ شہاب اپنا اوٹو بایوگرافی لکھا ہے۔ اس کو پڑھنے کا ہمارا بہت شوق ہوگیا ہے۔"

آغا ناصر حیران ہوگیا:

"قدرت اللہ شہاب نے کونسی اوٹو بایوگرافی لکھا ہے،

مقصد علی؟"

مقصد علی بولا:

"شہاب کی سرگزشت۔ ہم سنا شہاب کی سرگزشت قدرت اللہ شہاب کا بیسٹ ورک ہے۔"

میں نے قہقہوں سے کمپارٹمنٹ میں زلزلہ پیدا کر دیا۔

ہا ہا ہا ہا ہا ہا۔

اور قہقہوں کے درمیان میں نے مقصد علی کے بیان کی تصدیق کی:

"میں تصدیق کرتا ہوں کہ شہاب کی سرگزشت قدرت اللہ شہاب کا ماسٹر پیس ہے۔"

شاہد احمد نے میرا بخاری سے مزید تعارف کراتے ہوئے کہا:

"اور ان کو گلڈ کے حلقوں میں کمانڈر ہا ہا کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے گلڈ کا گنبد ان کے قہقہوں سے گونجتا رہتا ہے۔"

مقصد علی اوپر کے برتھ سے مجھ سے مخاطب ہو کر بولا:

"کمانڈر ہا ہا! پلیز ڈسٹرب نہ کرو۔ ہم خواجہ فرید پر بنگالی میں گیت لکھتا ہوں"

اور یہ کہہ کے سو گیا۔

بخاری نے شاہد احمد کے دوٹے کو ان کے برتھ کے نیچے کر دیا۔ اور ثقافت پر ایک بہت ثقیل تقریر شروع کر دی۔ دو گھنٹے کی تقریر کے بعد کمپارٹمنٹ میں ثقافت کی روشنی پھیل گئی اور شاہد احمد خرّاٹوں کا دھرپد راگ الاپنے لگے، آغا ناصر کو سانپ سونگھ گیا، مقصد علی خواب میں خواجہ فرید پر بنگالی گیت لکھنے میں مشغول ہوگئے، رفیق خاور کا سر اونگھتے اونگھتے کھڑکی کے کونے سے ٹکرایا۔ اور میرے ہاتھ سے ریڈرز ڈائجسٹ چھوٹ کر میرے پیٹ پر گر پڑا۔

آخر بخاری نے کہا:

"ابن انشا، تمہارے سوا میری باتوں میں کوئی دلچسپی

نہیں سے رہا۔ اب میں اپنے کمپارٹمنٹ میں چلتا ہوں۔"

ابن انشا نے کہا:

"نہیں جی۔ بڑا لطف آ رہا ہے۔ ایسی صحبتیں کہاں نصیب ہوتی ہیں۔ آج کی رات باتوں میں ہی گزر جائے۔"

بخاری بولا:

"میاں نیند تو تمہیں بھی آ رہی ہے۔"

ابن انشا نے جلدی سے کہا:

"بالکل نہیں۔ ہرگز نہیں۔ مجھے تو آج تمام رات نیند نہیں آئے گی۔ میرے دانت میں بڑا سخت درد ہو رہا ہے۔"

بخاری نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا اور بولا:

"میرے سر میں بھی بڑی شدت سے درد ہو رہا ہے۔ تمہارے بٹوے میں آسپرو کے پیکٹ ہوتے ہیں۔ ایک مجھے دو۔"

"ہاں میں اپنے بٹوے میں ہمیشہ آسپرو کے پیکٹ رکھتا ہوں۔ آج میرے بٹوے میں تین پیکٹ تھے۔ لیکن شام کو ایک ادبی میٹنگ میں مجھے ابوالفضل صدیقی کا ایک افسانہ اور عبدالعزیز خالد کا ایک منظوم ڈرامہ سننا پڑ گیا۔ اور میں نے آسپرو کے تینوں پیکٹ ختم کر دیئے۔"

"لیکن تم نے آسپرو کے تینوں پیکٹ ختم کر کے اتنا بڑا مالی نقصان کیوں اٹھایا۔ میٹنگ سے بھاگ گئے ہوتے۔"

"میں بھاگ نہیں سکتا تھا، میں اس ادبی میٹنگ کا صدر تھا۔"

ابن انشا اٹھا۔ اس نے اپنے برتھ کے نیچے سے اپنا سوٹ کیس گھسیٹ کر باہر نکالا اور بخاری سے کہنے لگا:

"میں سوٹ کیس میں سے نکال کر دیتا ہوں آسپرو کا پیکٹ۔"

بخاری بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا:

"اور میرے پاس دانت کے درد کی دوائی ہے۔ میں لا کر دیتا ہوں تمہیں۔"

بخاری نے ابن انشا کو دانت کے درد کی دوائی اور ابن انشا نے بخاری کو سر کے درد کی دوائی دی۔ دوا کی پہلی خوراک نے ہی دونوں کو شفا بخشی۔ اور دونوں معاہدہ ہوا کہ چونکہ اب ان کو نیند آ جائے گی، اس لئے بخاری اپنی تقریر کا بقایا حصہ کل تک ملتوی کرنا گوارا کرے گا اور ابن انشا اس کے لئے کل تک انتظار کی زحمت برداشت
صبح ایک بجے بخاری نے کوریڈر میں کھڑے ہو کر کھڑ
میں سے آواز دی:

"ابن انشا!"

"ہاں!"

"نیند آئی؟"

"نہیں۔ بالکل نہیں۔ میرا دانت پہلے سے بھی زیادہ درد کرنے لگ گیا ہے۔"

بخاری نے جلدی سے کہا:

"میرا سر بھی درد سے پھٹا جا رہا ہے۔"

ابن انشا نے پوچھا:

"نیند نہیں آئی؟"

"نہیں۔ کوٹری آ گئی ہے۔"

"کوٹری آ گئی ہے؟"

"ہاں، کوٹری آ گئی ہے۔"

ابن انشا بستر سے ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا اور چلا لگا۔

"کوٹری آ گئی ہے۔ اٹھو دیکھو کوٹری آ گئی ہے یہاں وہ حادثہ ہوا تھا جس میں فرسٹ کلاس اور سیکنڈ کلاس کے ڈبے بھک سے اڑ گئے تھے۔ اور ایک تھرڈ کلاس بو الٹ گئی تھی۔ اور بہت سی قیمتی جانیں تلف ہو گئی تھیں۔ اٹھو سب اٹھو۔ دیکھو وہ تھرڈ کلاس بوگی اب بھی الٹی پڑی ہے"

ہم سب بھاگ کر کوریڈر میں پہنچ گئے۔ اور کھڑکیوں باہر جھانکنے لگے۔

لیکن شاہد احمد دہلوی کو خوانچوں کے دھرپد راگ سے رغبت نہیں تھی۔ ہم نے شاہد احمد دہلوی کی راگ ودیا کے بارے میں بہت کچھ سُن رکھا تھا۔ لیکن اس سے پہلے اس کا یقین نہیں آیا تھا۔

ہم نے دیکھا تھرڈ کلاس بوگی ڈھلوان پر اُلٹی پڑی تھی۔ اس کے پاس ہی وہ جگہ تھی جہاں فرسٹ اور سیکنڈ کلاس بوگی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر لٹکتی ہوئی لوہے اور لکڑی کے بڑے ڈھیر بن کر ٹھہر گئی تھی۔ اس کے سامنے ریلوے ملازمین کے کوارٹر تھے۔ یارڈ کی تیز بجلی کی بتیاں اُونچے اُونچے کھمبوں سے اس مغموم منظر پر روشنی ڈال رہی تھیں۔ ہم سہمی ہوئی اُداس نظروں سے اس مغموم منظر کو دیکھ رہے تھے۔

جب ہم کوٹری کے یارڈ سے باہر نکل گئے تو میں نے کہا:

"اچھا! یہ ہے وہ منحوس مقام!"

ایک درد سے بھرائی ہوئی اجنبی آواز نے ہماری توجہ اپنی طرف کھینچ لی

"ہاں، یہی وہ منحوس مقام ہے۔ یہی وہ منحوس مقام ہے۔"

وہ ایک اجنبی تھا۔ جو ہماری طرح کوریڈر میں کھڑا ہوا کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا۔ اس نے ایک لمحہ آنسوؤں سے چھلکتی ہوئی نظروں سے ہماری طرف دیکھا اور بولا:

"ہاں، یہی وہ منحوس مقام ہے۔ جہاں میری دو جوان لڑکیاں آناً فاناً موت کے منہ میں جا گریں۔ میں کوٹری کا اسسٹنٹ سٹیشن ماسٹر ہوں۔ میرا کوارٹر اس اُلٹی ہوئی بوگی کے بالکل سامنے ہے جس کو آپ دیکھ رہے تھے۔ میری بچیاں لاہور سے اپنی بیمار ماں کو دیکھنے آ رہی تھیں۔ وہ لاہور میں میڈیکل کالج کی سٹوڈنٹ تھیں۔ وہ اس جگہ جہاں میں کھڑا ہوں، کھڑی ہوئی ہمارے کوارٹر کو دیکھ رہی تھیں۔ اور میں سٹیشن پر ان کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ یہیں کھڑی تھیں جہاں میں کھڑا ہوں اچانک بوگی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ہوا میں اڑ گئی اور میرے بچے موت کے غار میں اُتر گئے۔ اور اب میں اس جگہ پر کھڑے ہو کر صبح شام اس اُلٹی ہوئی بوگی کے سامنے سے گزرتا ہوں کہ شاید بوگی ایک دفعہ پھر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ہوا میں بکھر جائے اور میں اپنے بچوں سے جا ملوں۔"

کوریڈر میں سناٹا چھا گیا۔

اجنبی اپنے کمپارٹمنٹ کی طرف چل پڑا۔

میں نے جاتے ہوئے اجنبی سے پوچھا:

"اور آپ کی بیگم صاحبہ کا کیا حال ہے؟"

اس نے ڈبڈبائی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا اور کہا:

"وہ خبر سُن کر بیہوش ہو گئی تھی اور پھر ہوش میں نہیں آئی۔"

اور وہ اپنے کمپارٹمنٹ میں چلا گیا

ہم سکتے کے عالم میں کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔

اور جب ہم اپنے اپنے بستروں میں آ کر لیٹے تو ہم میں سے کسی نے کوئی بات نہ کی اور کمپارٹمنٹ میں موت کی خاموشی چھا گئی۔

پھر شاہد احمد دہلوی کے لوٹے نے غافلوں اور گناہگاروں کے لئے بگل بجانا شروع کر دیا۔ دھرپد راگ بالکل ٹوٹ گیا۔ غافل اور گناہگار غفلت کی نیند میں گم ہو کر گناہوں کے خواب دیکھتے رہے۔ اور شاہد احمد دہلوی غافلوں اور گناہگاروں کی بخشش کے لئے خدا کے دربار میں سجدہ ریز ہو گئے۔

اور ہم، گناہگار غفلت شعار، شاہد احمد کی عاطفت کے سائے میں آرام سے سوئے رہے، لوٹے نے زور زور سے اذانیں دیں، ہم سوئے رہے۔ فجر کی نماز کا وقت آیا۔ ہم سوئے رہے۔ پھر بیرا ناشتے کی خبر لے کر آیا، ہم جاگ پڑے۔

ابن انشا بھی جاگا، لیکن صرف کروٹ لینے کے لئے! اس نے بیرے کی بات کا جواب دینے کی بجائے، کروٹ بدل کر اپنا منہ ہم سے پرے کر لیا اور اپنی سفید چادر اپنے اُوپر کھینچ کر مردار کی

طرح بے حس و حرکت ہوگیا۔

شاہد احمد نے پدرانہ شفقت کے لہجے میں کہا:

"انشا صاحب 'اُٹھیے'، ناشتہ آگیا"

ابن انشا کی لاش میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔

پھر میں نے برادرانہ جذبات سے مغلوب ہو کر شاہد احمد سے کہا:

"سونے دیجئے۔ بیچارے کا دانت دکھ رہا ہے۔ اسکے لئے کھانے سے زیادہ سونا مفید ہے۔"

ناشتہ ختم ہوگیا۔

شاہد احمد نے ناشتہ ختم کر کے خلال کیا، بیڑی سلگائی اور ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر بیٹھ گئے۔ بیڑی کے دو تین کش لینے کے بعد وہ بولے:

"بھئی، بخاری صاحب کے بغیر رونق نہیں ہوتی۔ کمپارٹمنٹ میں سناٹا چھایا ہوا ہے، بخاری صاحب کو آواز دیجئے تاکہ کچھ زندگی کا لطف آئے۔"

مجھے شاہد احمد سے اتفاق ہے۔ بخاری کی شخصیت میں ایک مقناطیسی قوت ہے۔ وہ زندگی کا سرچشمہ ہے۔ وہ زندگی کا مجسمہ ہے۔ وہ جس مقام پر کھڑا ہو وہاں فرش سے عرش تک اور اُفق سے اُفق تک زندگی پھیل جاتی ہے۔ وہ جس مجلس میں بیٹھا ہو، وہاں پر سب سے زیادہ قیمتی فرنیچر اور سب سے زیادہ نادر عجوبہ بن کر بیٹھ جاتا ہے۔ اُس کی آواز ایک راگ دریا ہے جس میں سے الفاظ ان گنت راگوں اور راگنیوں کے اوتار بن کر زمین پر اترتے ہیں۔ وہ ایک بڑا شاعر، ایک بڑا ایکٹر اور ایک بڑا مقرر ہے اس لئے وہ کچھ بھی نہیں، کیونکہ جب وہ شاعر ہوتا ہے، تو ایکٹر نہیں ہوتا، اور جب وہ سب کچھ ہوتا ہے تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ لیکن کچھ بھی نہ ہونے کے باوجود وہ اتنا بڑا ہے کہ بڑا بخاری بھی اتنا بڑا نہیں تھا۔ پطرس بخاری ذوالفقار علی بخاری سے صرف عمر میں بڑا تھا۔ اہلیتوں اور صلاحیتوں کے لحاظ سے ذوالفقار بخاری پطرس بخاری سے بڑا ہے۔ اس لئے ذوالفقار بخاری صحیح بخاری ہے۔

اور بخاری آگیا۔ اور ہمارے کمپارٹمنٹ کی چھت بلند ہو گئی۔ اور اس کی دیواریں پیچھے ہٹ گئیں۔ اور میں ریڈرز ڈائجسٹ کھول کے پڑھنے لگا۔

بخاری نے شاہد احمد کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا:

"شاہد" میرا خیال ہے کہ یہ لفظ ثقافت بہت ثقیل ہے اس کی بجائے ہمارے ادب میں ایک بہت فصیح لفظ موجود ہے۔ تہذیب۔ معلوم نہیں ہم تہذیب کو چھوڑ کر ثقافت کیوں استعمال کرنے لگ گئے ہیں۔ اور مجھے تو ثقافت سے بدبو آتی ہے۔ مجھے تو ثقافت کثافت کی ایک شکل معلوم ہے۔ اور بزم ثقافت بھنگیوں کی ٹولی کا ترجمہ محسوس ہوتا۔

شاہد احمد نے کہا:۔

"مجھے تو اس کا کوئی تجربہ نہیں۔ ابن انشا سے پوچھئے"

"ابن انشا سو رہا ہے۔"

"اب کب تک سوئیں گے؟ بہت سو چکے۔"

بخاری نے بلند گرجدار آواز میں ابن انشا سے کہا

"ابن انشا، تمھارا کیا خیال ہے کیا تہذیب کا لفظ ثقافت کے لفظ سے زیادہ موزوں نہیں ہے۔"

ابن انشا نے چادر سے منہ نکالے بغیر غنودگی آلود آواز میں کہا:

"میرے دانت میں درد نہیں ہے۔ میں سو رہا ہوں۔"

معلوم نہیں کونسا اسٹیشن تھا۔ گاڑی کھڑی ہوئی اور اختر انصاری اکبر آبادی اندر آگیا:

"السلام علیکم!"

سب چونک پڑے۔ سب کے چہرے لٹک گئے۔ حیدرآباد سے گزرتے وقت سب نے ڈری ڈری نظروں سے حیدرآباد کے پلیٹ فارم کو دیکھا تھا اور مطمئن ہوگئے تھے کہ اختر انصاری اکبرآبادی وہاں نہیں ہے۔ پھر سب نے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹیں پیدا کر کے کہا:

"ہیلو استاد"

"واہ، اُستاد واہ!"

"خوب خوب"

جشن فرید میں جا رہے ہو کیا؟"

اختر انصاری اکبرآبادی نے جواب دیا:

"جی ہاں — اور یہ کون ہے جو اب تک سو رہا ہے؟"

شاہد احمد نے جواب دیا: "ابن انشا"

پھر ابن انشا سے مخاطب ہو کر بولے؟"

ارے انشا صاحب، اُٹھیئے، اختر انصاری اکبرآبادی آپ سے ملنے آئے ہیں"

ابن انشا نے اور بھی گدے میں دھنستے ہوئے کہا:

"اب تو میں بالکل نہیں اُٹھوں گا"

اختر انصاری نے کہا:

"اُٹھو گے کیوں نہیں، انشا جی۔ میں تو بڑے بڑے سونے والوں کو جگا دیتا ہوں"

اور اس نے ابن انشا کو کندھوں سے پکڑ کر بٹھا دیا۔

یہ اختر انصاری اکبرآبادی گدائے اُردو ہے۔

گدائے اُردو ہونا بابائے اُردو ہونے سے بہت مشکل ہے۔ بابائے اُردو کے پاس پیسہ ہے۔ اور پیسے سے اُردو کی خدمت کرنا بہت آسان ہے۔ گدائے اُردو کے پاس پیسہ نہیں۔ اس لئے وہ اُردو کے پودے کی آبیاری اپنے خون سے کرتا ہے۔ وہ گاؤں گاؤں شہر شہر اُردو کے لئے بھیک مانگتا پھرتا ہے۔ بھوکا ننگا رہتا ہے۔ بے آرام ہوتا ہے۔ بے عزتیاں سہتا ہے۔ لوگ اس کو دیکھ کر منہ پھیر لیتے ہیں۔ اس سے نفرت کرتے ہیں۔ لیکن وہ کسی سے نفرت نہیں کرتا۔ اسے اُردو کے ہر ادیب سے والہانہ محبت ہے۔ وہ ان کا پیغام لے کر ملک کے ہر کونے میں جاتا ہے۔ وہ گاؤں گاؤں شہر شہر اُردو کے لئے بھیک مانگتا پھرتا ہے۔ اور جب لوگ اس کے کشکول میں چند الفاظ کی بھیک ڈال دیتے ہیں تو وہ ان میں نئی قدریں پیدا کر کے ان کے سامنے پھر پیش کر دیتا ہے۔

ابن انشا نے اپنے تکیئے کے نیچے سے اپنی عینک نکال کر آنکھوں پر لگا لی اور یہ دیکھا کہ بخاری کہاں بیٹھا ہے۔ پھر سب سے مخاطب ہو کر بولا:

"حضرات! اب بخاری صاحب اپنی تقریر کا وہ بقایا حصہ شروع کریں گے جس کو سنتے سنتے آپ کل رات سو گئے تھے اور جس سے آپ محروم رہ گئے تھے۔ لیکن وہ یہ بقایا تقریر یہاں نہیں کریں گے بلکہ ہم سب کو ڈائننگ کار کے پرسکون ماحول میں لے جائیں گے اور وہیں جا کے پیش کر کے اپنی بقایا تقریر سنائیں گے۔ کیا قوم کو یہ تجویز منظور ہے؟"

"منظور" "منظور"

بخاری نے ریڈیو پاکستان کے ڈائرکٹر جنرل کی بلند پوزیشن سے ریٹائر ہو کر ادیبوں کی آزادانہ اور بے تکلف فضا کو جس خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کیا ہے، وہ داد کے قابل ہے اس نے ادیبوں کی بین الاقوامی اُخوت کا بڑے کھلے دل سے خیرمقدم کیا ہے۔ اس نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے کہ بڑے ادیبوں کے پرائیویٹ ماحول میں نہ کوئی بڑا ہوتا ہے نہ چھوٹا۔ اس نے سب کو ڈائننگ کار میں جانے کی دعوت دے دی۔ مجھے بھی۔

ڈائننگ کار میں کوئی ثقیل تقریر نہیں ہوئی۔ دلچسپ لطیفے ہوئے۔ لیکن ان لطیفوں کو سنا جا سکتا ہے، لکھا نہیں جا سکتا۔

ملتان کے نزدیک پہنچ کر ہم نے اپنے سینوں پر پاکستان رائٹرز گلڈ کے بیج لگا لئے۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کے بیج پر سبز سرزمین میں ایک سفید رنگ کا پر رکھا ہوا ہے۔ معلوم نہیں یہ کبوتر کا پر ہے یا عقاب کا یا اُلو کا۔

ملتان کے ریلوے اسٹیشن پر ہماری بوگی کے سامنے جشن فرید کے رنگین قیمتی ریشمی بیجوں کا ہجوم تھا۔ ہمارے سامنے خواجہ فرید قوس قزح کے حسین رنگوں میں جلوہ نما تھے۔ ہمارے ذہنوں کے اُفق پر خواجہ فرید کی مقدس شخصیت نمودار ہو گئی۔ ہمارے سر احترام سے جھک گئے۔

(بقیہ اگلے شمارے میں)

تصنیف: واشنگٹن ارونگ
ترجمہ: جلیل حشمی

الحمرا کی بیٹی

(منظوم کہانی)

جب اسپین کے پانچویں فلپ اور ملکہ ایزابلا نے عنانیں اٹھائیں
کہ سیر ان وادی کے سارے میں چل کر کہن عظمتوں کے نشانات دیکھیں
وہ فن کے نوادر، اچھوتے نمونے، وہ صنعت گری کے کمالات دیکھیں
سنیں داستانیں مناروں میں محبوس دوشیزہ کمسن شہزادیوں کی
کہن سال، ابرو خمیدہ، تھکے، ادھ بجھے ستاروں کے طلسمات دیکھیں
سرا پردے سرکائیں صاحب حشم اندلسی شہریاروں کے عشرت کدوں سے
ملے خلوتوں، جلوہ گاہوں کی شان کہن، معابد میں گھومیں، خرابات دیکھیں
چڑھیں برجیوں پر، تماشا کریں بہتی نہروں کا، جھانکیں دریچوں سے، پیچ
کریں سیر محلوں کی، کوچوں میں ٹہلیں، پھریں رہگذاروں میں، باغات دیکھیں
چلیں اونچی سنگین چٹانوں پر، سیندوری سیندوری فصیلوں پہ گھومیں
سکوت گراں پر دھریں کان اور داستانوں سے آباد کھنڈرات دیکھیں
نظارا کریں دُہرے دُہرے دریچوں سے ویگا کی وادی میں شادابیوں کا
یہ کام آدمی زاد کے ہیں تو کیونکر۔ چلیں معرکہ ہائے جنات دیکھیں

○

تو غرناطہ والوں نے کیں خیر مقدم کی تیاریاں اک سے اک بڑھ کے سائیں
ہٹائے گئے شہ نشینوں، ستونوں، چھتوں، جالیوں اور کٹہروں سے جالے
سیہ روز، برباد بستی کی تقدیر پھر سالہا سال کے بعد جاگی
بصد تمکنت وردیاں زیب تن کر کے پہنچے محلات پر پہرے والے
ٹہلنے لگے پیادے الحمرا کی اونچی دیوار پر، چوڑی چوبرجیوں پر
چمکتی سنانیں، سجا جسم، جھلکتے ہوئے پیچ، تیر و ترکش سنبھالے
صدائیں کہیں طبل و قرنا کی آتی تھیں، بربط کہیں بجنے لگتے دھیمے دھیمے
ادھر کُھل رہے تھے نشاں مملکت کے، تو اُدھر کر رہے تھے رسالے

سجائے گئے قصر دہلیز سے کنگروں تک، ہوا کوچہ کوچہ فروزاں
جلائی گئیں لاکھوں کافوری شمعیں، جو گھی دیوں نے بکھیرے اُجالے
دُلہن کی طرح قصرِ الحمرا کو بل کے اس فشان سے شہریوں نے سجایا
دکھا دی دہی شوکت و کر و فرکہنہ، بڑے زندہ دل نکلے غرناطہ والے
جواں نغمہ زن تھے، حسینائیں دُف اور بربط بجاتی ہوئی پھر رہی تھیں
کہیں رقص میں محو شائستہ جوڑے نظر آتے تھے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے
بپا ایک طوفان تھا رنگ و بو کا کہ پھولوں کی بارش لگی تھی مسلسل
عباسی، چنبیلی، کنول، موتیے، چمپا، رابیل، نرگس، گلاب اور لالے
بہت ہی مہذب، بلا کے ذہین اور مہنش کم سخن درباری، اعیان و دولت
کنیزیں مؤدب، خواصیں خوش اخلاق اور پیش خدمت بٹے بھولے بھالے
دمِ گفتگو پھول جھڑتے لبوں سے، قدم رکھتے آہستہ، بے چاپ چپلے
ایڈرکوں، اک خوش ادا، نوجواں ملکۂ قلب کا منہ چڑھا پیش خدمت
چلا جھومتا جھامتا قصرِ شاہی سے گل گشت کو زیر لب گنگناتا
روش پر مڑا تھا کہ مہندی کی جھاڑی میں کی اک ٹہنی پر پرندے نے حرکت
کھڑے ہو گئے کان چٹی پہ بیٹھے ہوئے باز کے، وہ بھی ہٹا کٹا گھڑی بھر
پرندہ تھا نیلی فضاؤں میں پرّاں، مگر اس بچارے کی آئی جو شامت
تو جھٹ باز کی ڈوریاں کھول ڈالیں اُچھالا اُسے پوری قوت سے اوپر
شکاری اڑا اندر جھپٹا مگر وار خالی گیا، پھر بھی ہاری نہ ہمت
اشارے کئے اس کو بانکے نے لیکن وہ اڑتا گیا اپنی دُھن میں برابر
(یہ ملکہ کا محبوب ظالم اگر اب نہ لوٹا تو ہوگی نہایت ندامت)
اسی سوچ میں گرتا پڑتا چلا جا رہا تھا وہ اس پر نگاہیں جما کر
کہ اک ٹوٹے پھوٹے ہوئے برج پر باز جا بیٹھا، اب تو ہوئی وہ مسرت
وہ تیزی سے اُترا، کئی کھائیاں کر گیا پار سرکنڈوں کی سخت باڑیں
پڑی جان میں جان، چھوٹی ہوئی سست نبضوں میں پھر آئی تازہ حرارت
اب استادہ تھا بُرج الحمرا کے پھیلے سائے میں گم سُم وہ حیرت کے مارے
چڑھے کیسے اس اُونچی دیوار پر، کس طرح باز کو آسماں سے اتارے
بہت دیر اس جستجو میں پھرا، خاک چھانی بہت، کاٹے چکر پہ چکر
گیا بُرج کی پچھلی جانب تو آیا نظر ایک در جھاڑیوں کے کنارے

وہ اندر سے تھا بند، اک درز سے جھک کے جھانکا تو پایا عجیب ایک عالم
منقش ستوں، مرمریں حوض، گل کار دیواریں، چھت سے لٹکتے غبارے،
چمکتے ہوئے فرشِ بلّور پہ اپنے خوابوں میں کھوئی ہوئی بھوری سی بلّی،
طلا کار محراب کے نیچے پنجرے میں لیٹا ہوا ایک بلبل ہلا رہے،
حنا رنگ قالین پر ایک گوشے میں بکھرے تھے رنگین دھاگوں کے گولے،
دھرا تھا وہیں ایک نازک سا ہسپانوی ساز بھی صندلی مکے سہارے
(یہ صدیوں کا سنسان ویرانہ اور اتنی سج دھج کے ساماں پئے زینت)
ایلر کون تکتا ہوا رہ گیا —— (اتنا تاراج برج اور ایسے فضائے؟؟
یہ آنگن میں سوئی ہوئی بھوری بلی کوئی شاہزادی نہ ہو غم کی ماری)
جو سُن رکھے تھے اس نے لوگوں سے پہلے، اسے یاد آنے لگے قصّے سارے
پھریں اس کی آنکھوں میں قصّوں کے جادوگروں کی پُراسرار صندلی سی شکلیں،
مگر جی کڑا کر کے دروازہ حیرت کدے کا ایلر کون نے کھٹکھٹایا
(جو صورت بھی پیش آئے، آئے بلا سے، مگر دم سے یہ وقت ہونے کو آیا
اسیرِ طلسمات ہو جاؤں یا باز کو آسماں سے زمینوں پہ لاؤں)
سر اوپر اٹھایا تو روزن نما تنگ کھڑکی میں معصوم سا چہرا پایا
(میں کیا دیکھتا ہوں یہ کیا بھید ہے) آنکھیں مل کر جو کھولیں تو خالی تھا روزن
بہت دیر تک یونہی تکتا رہا وہ، نہ آہٹ ہوئی اور نہ آواز آئی
(کہیں یہ پری تو نہ تھی برج کی یا مجھے وہم نے یہ کرشمہ دکھایا)
ذرا زور سے اب کے دی اس نے دستک تو اس پیاری صورت کو پایا وہیں پھر
نہ کی جیل و حجت ذرا اور اپنی پروں والی ٹوپی کو سر سے اٹھایا
"معزز حسینہ سلام! آپ کے برج پر میرا باز آ کے بیٹھا ہوا ہے
اجازت جو دیں آپ تو جا کے لے آؤں، کمبخت نے آج بیحد تھکایا"
"اجازت نہیں مجھ کو زنجیرِ در کھولنے کی، نہ ہوں آپ ناراض صاحب!"
یہ کہتے ہوئے پڑ گیا اس کے شبنم سے گالوں پہ کھلتے گلابوں کا سایا
"حیادار خاتون! کیجے کرم، باز محبوب ہے ملکۂ عالیہ کا
بغیر اس کے کیا منہ دکھاؤں گا جا کر" (نہ سبکی ہو درباریوں میں خدایا!)
"بہت خوب! آپ اہلِ دربار ہیں۔"
"جی نمک خوارِ شاہانِ اسپین ہوں میں"

"تو پھر آپ سے چاہتی ہوں معافی کہ سرکار ہیں آپ اور ہم رعایا"
"بجا ہے جو درباری اچھے نہ ہوں ان سے بچنا ہی بہتر، مگر میں تو خانم
اک ادنیٰ سا خادم ہوں ایزابلا کا' یہ وہم آپ کے دل میں کیونکر سمایا
اگر آپ نے میری ان التجاؤں کو ٹھکرا دیا تو کدھر جاؤں گا میں
یہ عہدہ تو چھوٹے گا رسوائی بھی ہوگی ملکہ پلٹ دے گی اک پل میں کایا
مری لاج اب آپ کے ہاتھ میں ہے خدارا مرے حال پر رحم کیجئے ـــ!!"
پسیجا دل اس نازنیں کا ایلرکون کے نرم لہجے پہ اُتری وہ نیچے
دھڑکتے ہوئے دل، لرزتے ہوئے ہاتھ سے اس نے زنجیرِ در کو ہٹایا
کھُلے پٹ، سراپا جو آیا نظر تو وہ بُت بن گیا سَرد پتھر کا جیسے
خرابی بہت دل پہ گزری مگر دامنِ آداب کا چھوڑنا بے محل تھا
سو تیزی سے مینار پر چڑھ گیا باز کو لینے پُر پیچ زینے کے رستے،
بٹھائے ہوئے اپنی مٹھی پہ جب باز کو نیچے اُترا تو وہ ماہ پارا
تھی مصروف گولے پہ دھاگہ چڑھانے میں' بانکے کو دیکھا جو آنگن میں آتے
تو چھوٹ کر پرے جا گرا اس کی ترشی ہوئی انگلیوں سے اچانک وہ گولا
ایلرکون نے فرش سے وہ اُٹھا کر کیا پیش جھک کر نہایت ادب سے
بڑھا پنجۂ سیمگوں اس کی جانب تو چسپاں کر دی وہیں مہرِ بوسہ
اپالو نے وینس کو جس طرح چوما تھا نیلے سمندر کی موجوں کے نیچے
یہ اس والہانہ عقیدت کا اظہار تھا جو نہ بانکے نے پہلے کیا تھا
کبھی دست بوسی کے ہنگام انگڑائی ایسی اُمنگوں نے لی تھی نہ آگے،
حیا سے پسینہ پسینہ ہوئی جا رہی تھی وہ چینی کی شیشہ میلی گڑیا
کہ نا آشنا تھی وہ اس رسم سے' آج خلوت میں دیکھا جسے اس نے چلتے
وہ حیرت کے عالم میں پُرنم جبیں پر لکیریں لئے اس کا منہ تک رہی تھی
ادھر بانکا اپنی جسارت پہ سر کو جھکائے ہوئے تھا ندامت کے مارے
وہ محلوں کا پروردہ جُل دے گیا بُرج سالو بریتا کی سادہ ادا کو
"حیادار خاتون! دربارِ شاہی میں رائج ہیں تعظیم کے یہ طریقے"
مگر کھا چکا تھا رموزِ محبت میں وہ طاق، دل پر دو دھاری کا گھاؤ
وہ ملکہ کا طوطیٔ شیریں زباں چُپ تھا، لب بستہ تھا شوخ و طرّار بانکا
دھرے رہ گئے شوخیوں، دل لگی، بانکپن کے طریقے، چلن اور سبھاؤ

اُدھر عشق کے بادۂ نوچشیدہ کے نشے کی سرشاریوں کا سماں تھا
اِدھر شعلۂ حسن کے اک شرارے نے بھڑکا دیئے تھے ہزاروں الاؤ
اچانک ہوئی ہلکے قدموں کی آہٹ، وہ اک خوابِ صد رنگ سے جاگ اُٹھی
"مری پھوپی آتی ہے — اس نے تمھیں دیکھ پایا تو کیا ہوگا للّٰلہ جاؤ"
"مجھے اپنے جوڑے کا یہ پھول جب تک نہ دوگی مری جاں! نہیں جاسکوں گا"
"یہ لو پھول اور جاؤ وہ آ رہی ہے"
"اسے آنے دو، ہاتھ آگے بڑھاؤ"
لیا پھول اور ہاتھ کو تھام کر اس پہ بوسوں کی بوچھار بانکے نے کر دی

○

بہت دور بین اور محتاط مادام تھی فریڈے گونڈا، دوشیزہ کی پھوپی
بھتیجی کو بھونرے میں پالا تھا اس نے کہ تھی اسکے بھائی کی واحد نشانی
ہوا اس کو دنیا کی لگنے نہ دی تھی، منالیے سے باہر نہ چھوڑا تھا دم بھر،
نہایت ہی نفرت کیا کرتی تھی اہلِ دربار سے برُج کی وہ سیانی
رنگیلی خواصوں کو پہچانتی تھی، کھلے تھے کنیزوں کے اسرار اس پر
اُسے یاد تھا ہر مصاحب کا قصہ، نہ چھوٹی تھی بڑھیا سے کوئی کہانی
مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ پتوں میں رہتا نہیں دیر تک پھول چھُپ کر،
کہ سنگیں حصاروں میں بھی رہ کے کھاتی ہے اک تیر کیوپڈ کا اُٹھتی جوانی
کہ چھپتے نہیں پورے چاند آنگنوں میں، دیا جلتے ہی پھیلتے ہیں اُجالے،
کہ بل چیر کر پھوٹ بہتے ہیں جھرنے، نہیں دیکھتی بند عنوں کو جوانی

○

بھتیجی کے بدلے ہوئے رنگ کو بوڑھی مادام نے دیکھ کر سر ہلایا
(مری غیر موجودگی میں نہ گزرا ہو اس پر کوئی واقعہ ناگہانی
کہیں کوئی اس روپ کا لوبھی بھنورا نہ گزرا ہو میرے بغیچے سے ہوکر
پریشاں پریشاں نظر آرہی ہے نہ جانے مجھے کیوں مری پھول رانی)
سنبھالا لیا نو گرفتارِ اُلفت نے مشکل سے مادام کو دنگ پاکر
"ابھی ایک طیران کرتا ہوا باز ادھر آگیا تھا مگر خیر گزری
کہ پھر اُڑ گیا صید کا پیچھا کرتے ہوئے برج کے پار پر پھڑپھڑا کر"

منارے کے دُہرے دریچوں میں راتوں کو چھُپ چھُپ کے تکنے لگی راہ وینس
(کب آئے گا شدید پر مخمت گنگناتا ہوا وہ مرا شوخ اپالو نہ جانے
کہیں پیت میں بھی سالوریٹنا کی شہزادیوں کی طرح کوچے کوچے
نہ بدنام ہو جاؤں، پھیلیں نہ میری محبت کے بھی گلیوں گلیوں فسانے)

○

سُلگنے لگا اب پُونم کی کھِلی چاندنی میں دنی کا مہکتا مدھو بن
اُمنگوں کی مچلی ہوئی گوپیوں کے بلاووں سے گونج اُٹھا ہردے کا آنگن
چمکنے لگی چاندی ترشے بدن کی، سلجھنے لگے اُلجھے اُلجھے سے گیسو
صدف دو زیر دے ہٹے، طاقچوں میں شرارت سے ہنسنے لگے شوخ درپن
دُھڑک کر تلی تھیں بغاوت پہ مغرور اہرام سی چھاتیاں پیرہن سے
لبوں کی شفق گہری پڑنے لگی، کچھ دہکنے لگا اور مکھڑے کا کُندن
اُبھرنے لگیں رنگ میں ڈوبی قوسیں، لچکتے ہوئے دائرے، رس بھرے خط
بدن لیکے انگڑائیاں جاگ اُٹھا بھاری پڑنے لگی لانبی پلکوں کی چلمن
کبھی پیت کے گیت دھیمے سُروں میں بکھر جاتے "کب آؤگے اس نگریا
مری آنکھ بھی اب تو لگتی نہیں، ڈھونڈوں سپنوں کو، آواز دوں تجھ کو ساجن
نہ بہلے گا یوں نرت سے باورے من کا مور اب تو تنہائی کے سُونے بن میں"
کبھی سُوجھتی (توڑ کر سارے بندھن چلوں برج سے بن کے بانکے کی جوگن)

○

منارے کے دہرے دریچوں سے راتوں کو دوشیزہ چھُپ چھُپ کے تکتی جو رستہ
تو بڑھیا نہایت متانت سے لے بیٹھتی اپنا پند و نصائح کا بستہ
"میں دربار والوں کو پہچانتی ہوں، یہ شیطان زادے، ہوس کار ہیں یہ
بچھا دیتے ہیں رنگ رلیوں کے پھندے، اڑاتے ہیں دامانِ عصمت کے پرزے
مری اچھی بٹیا نہ تم ان کی باتوں میں آنا کہ حد درجہ عیار ہیں یہ
چھُپاتے ہیں یہ اُجلے اُجلے لباسوں میں ننگے ارادوں کی ناپاکیوں کو
خداوند ان سے بہو بیٹیوں کو بچائے، ازل کے گنہگار ہیں یہ ——"
مگر پیت کی آگ اک بار لگ جائے تو پھر بجھانے سے بجھتی کہاں ہے

○

بالآخر بجا بادشہ قبلہ عالم کے فرمان سے کوچ کا طبل اک دن

پڑھا کلمۂ شکر مادام نے سارے خدام شاہی وطن کو سدھارے
جو دیکھا نکلتے ہوئے بابِ انصاف سے شاہ کے کارواں کو تو پلٹی
وہ خوش تھی (کہ یہ خار چھاتی سے نکلا، خلاصی ہوئی نت کے کھٹکے سے بابے)
اِسی دُھن میں پہنچی وہ آنگن میں اپنے تو اک عربی النسل شبدیز دیکھا
خوشی کی جگہ بڑھ کے حیرت نے لے لی (بھلا کون آیا ہے گھر پہ ہمارے!)
نئی حیرتوں نے اُسے آلیا اور آگے بڑھی، پہنچی ایوان میں جب
وہاں اک سجیلا جواں اُس کی بیٹی کے آگے جھکا، سر سے ٹوپی اُتارے
نگاہوں سے کچھ التجا کر رہا تھا، جو آہٹ ہوئی تو وہ بھاگا اُچھل کر
اُڑانے لگیں مرمریں فرش پر دو سرے ملے مرکب کی ٹاپیں شرارے
اُدھر صدمۂ ہجرِ محبوب سے سسکیاں بھر رہی تھی وہ بے خوف ہو کر
اِدھر بوڑھی مادام پتھر کا پیکر بنی ایستادہ تھی حیرت کے مارے
فضا میں جو آواز رہوار کی تیز ٹاپوں کی ڈوبی تو وہ زخمی ناگن
کی مانند تڑپی —"گیا وہ گیا، کوئی آواز دے، کوئی اس کو پکارے!!"
"پکاروں کسے کس کو آواز دوں کون تھا جس سے باتوں میں مصروف تھیں تم؟!"
"وہی نیک بانکا تھا ایزابلا کا، جو باز اپنا لینے کو آیا تھا پھوپھی!
یہ کیوں آپ غصے میں آنے لگی ہیں میں کھاتی ہوں سوگند جیسی بھی کہیے
نہ ہو مجھ پہ سایا صلیب مقدس کا گر آپ سے جھوٹ بولوں ذرا بھی
مری آبرو پر نہیں آنے پایا کوئی حرف میں اتنی ناداں نہیں ہوں
جوانی کی سیپی میں محفوظ و مامون ہے آپ کے ساتھ عصمت کا موتی"
فرو ہو گئے اس پہ مادام کی بوڑھی آنکھوں سے اُٹھتے ہوئے سرخ شعلے
"نہ لانا کبھی اپنے دل میں خیال اُونچے محلوں کے پروردہ بانکوں کا بیٹی!"

○

دنوں پر گزرتے گئے دن مگر کوئی نامہ نہ پیغام آیا وہاں سے
ڈھکیں برف سے چوٹیاں اونچے سیرانوادا کی، چلنے لگیں ٹھنڈی ہوائیں
مگر اس محبت کی ماری نے فرصت نہ پائی جدائی کے سوزِ نہاں سے
گھِرے جھوم کر ابر، برکھا ہوئی، سبزہ پھوٹا، کھِلے شاخچوں پر شگوفے
مگر ایک ساغر بطِ بادۂ وصل سے تشنہ لب کو نہ آیا مغاں سے
اُترنے لگیں بوندیاں اُپسراؤں کی مانند، پائل سی چھنکاتی چھن چھن

مگر کانٹے نکلے نہ ہجراں کے سلگے ہوئے لوک گیتوں کے اس کی زباں سے
ابھرنے لگیں ریت پر سلوٹیں، ندیاں خشک ہونے لگیں ڈھیر کے ڈھیرے
مگر برج میں راہ تکتی ہوئی انکھڑیاں نم رہیں موج اشکِ رواں سے
بدلنے لگی رُت پہ رُت، پھیلیں انگور کی زلف سی پیچ و خم کھائی بیلیں
کئی صبحیں آئیں، کئی چاند آنگن سے گزرے مگر آنے والا نہ آیا
گلاب عارضوں کے ہوئے زرد، آنکھوں جلنے لگیں غم کی دھندلی سی شمعیں
دلِ زار کو کوئی گوشہ بھی فردوسِ عشاق کی خلوتوں کا نہ بھایا
پڑی رہتی پہروں کسی اُجڑے کونے میں چُپ چاپ نرگس کی مانند روتی
سنا کرتی پھوپھی سے لمبی کتھائیں مگر دل کو بھاتی ہیں کب یہ ادائیں
نہ کچھ ہوش ہوتا اُسے جاگتے میں نہ آتا نظر کوئی سپنا جو سوتی

○

اُڑائے ہوئے برج کے تجد کی خاک اک روز سر پر وہ غم کی ستائی
ٹہلتی ہوئی جشنِ مرگِ محبت منانے کو فوارے کے پاس آئی
جہاں پہلی بار اس کے ہاتھوں کو بانکے نے چوما تھا، رسمِ محبت چلی تھی
جہاں شیام نے پیت کو جوت رادھا کے پرشے کے مندر میں پہلے جگائی
تھی، پیمان باندھے گئے تھے محبت کے، آغاز عہدِ وفا کا ہوا تھا،
گرے حوض کے پانیوں میں جو بھور دوشیزہ کے بہتے اشکوں کے قطرے
تلاطم سا اک سطحِ شفاف پر آگیا، چھپ گئی جھاگ کی تہ میں کائی
ابھی سوچنے بھی نہ پائی تھی وہ کچھ کہ چادر پھٹی جھاگ کی سرسرا کر
اور اک غمزدہ سی پریشاں پری نے اُبھر کر جو پانی سے کی رونمائی
تو ہوش اُڑ گئے اس طلسماتی منظر سے، بھاگی وہ گھبرا ایسے وہاں سے
لیا آکے دم اپنی پھوپھی کے بستر میں، پاپوش بھی راستے میں گنوائی

○

بجا یا گجر جب کسی ڈیگلار نے تو وہ پھوپھی کے پہلو سے اُٹھی
اور اس سے گئی رات کی حیرت افروز، الجھی ہوئی داستاں کہہ سنائی
کہا پوپلے منہ سے بڑھیا نے "یہ سب ترے واہمے کا کرشمہ ہے بیٹی
تجھے خود ہی تیرے پریشاں خیالوں نے تصویرِ ژولیدہ کی دکھائی
اُسے خواب میں تو نے دیکھا ہے فوارے کے پاس کل رات سوتے میں شاید

وہ مینارِ در مائیلن کے جواں سال قیدی کی محبوبہ جس کو جدائی
کی آتش نے .....؟

"ہاں اب مجھے یاد آیا سنی تھی کہانی یہ بچپن میں ہم نے
کہ زنداں سے اپنے چہیتے کے ہمراہ اشبیلیہ جانے سے ہچکچائی،
مگر میں نے دیکھا ہے یہ جاگتے میں، مجھے یاد ہے کوئی سپنا نہیں تھا"

(وہ زہرائیدہ ہے تو پھر کیوں ڈروں آج پھر میں وہاں جاؤں گی اس سے ملنے)

. . . .

اُبلنے لگا حوض کا سرد پانی، اُبھرنے لگی جھاگ سے اپسرا اک
جواہر سے بوجھل کمربند باندھے، صدف دوز عبا گول کندھوں پہ ڈالے
لئے بانسری پنجۂ سیمگوں میں وہ استادہ تھی جھاگ کے بلبلوں پر
اسے دیکھ کر ڈر گئی پھر بچاری، اُڑے ہوش اور چھوٹے ٹھنڈے پسینے
گرا چاہتی ہی تھی غش کھا کے، اتنے میں زہرائیدہ نے کہا مسکرا کر
"ڈرو مت مرے پاس آجاؤ لڑکی، فقط پوچھنا چاہتی ہوں یہ تم سے
ترے دل نے بھی چوٹ کھائی ہے کاری؛ مرے حوض میں تیرے خاموش آنسو
اُٹھا دیتے ہیں ایک طوفاں ٹپک کر، تری ناؤ کو بھی لگے ہیں تھپیڑے؟"
"مقدس کنواری! بہاتی ہوں میں اشک محبوب کی بیوفائی کے غم میں
سلگتی ہے ٹھنڈی ہوا تو سُلگ اٹھتی ہے آگ ہجراں کی سینے میں میرے"
"تمہاری مدد کو میں تیار ہوں حوصلہ یوں نہ ہارو ادھر مجھ کو دیکھو
میں اک شاہزادی تھی، میں نے بھی آنکھیں لڑائی تھیں اک اجنبی نوجواں سے
مگر میری قسمت کہ میں اس کے ہمراہ اشبیلیہ جانے سے ہچکچائی
اُسی وقت سے جون کاہن کی شہزوری روح نے مجھ کو جکڑا ہے ایسے
برس ہا برس سے حصارِ طلسمیں میں ہوں قید، صورت نہیں مخلصی کی
اگر میری حالت پہ رحم آئے تجھ کو تو آزاد ہو سکتی ہوں تیرے صدقے"
"میں ہر رنگ میں آپ کے کام آنے پہ تیار ہوں جیسے کہئے کروں گی"
"تو آؤ ادھر — حوض سے لیکے چلو میں پانی مرے منہ پہ دو چار چھینٹے!
کہ صدیوں کے بعد اس اذیت کی لمبی کشاکش سے کچلی ہوئی روح چھوٹے"
لیا چلو بھر پانی اور اس پہ چھڑکا تو ہنسنے لگی وہ کھلیں جیسے غنچے

مگر دوسرے لمحے یوں حوض کے جھاگ میں ہو کے پانی ہوئی حل وہ جیسے
کہ بیٹھی تھی ساون کے بادل کی کوئی، گری بانسری حوض سے دُور ہٹ کر
وہ بے چاری تکتی رہی اس نظارے کو سہمی ہوئی خوف و حیرت کے مارے
اُدھر بانسری جُوں کی تُوں فرش پر تھی، اُٹھایا اُسے جی کڑا کر کے اُس نے

○

خبر اس کے دلکش، طلسمی سُروں کی گئی قرطبہ اور اشبیلیہ تک
چلا آتا کھنچ کر ادھر کو جو کوئی بھی سُنتا سریلی صدا بانسری کی
اِدھر اہلِ اندلس تھے مسحُورِ نَے اور اُدھر پنجمیں فلپ، شاہِ ریاست
کو لاحق ہوا اک عجب عارضہ جس نے ماؤف کر ڈالی حِسِ دماغی
نہ دربار لگتا نہ فرمان ہوتے نہ اعلان جلوہ گری کرتے حاجب
خلل انتظامِ حکومت میں بھی پڑ گیا اور ایزابلا سخت تشویش میں تھی
نہ کر پائے تشخیص شہ کا مرض، سر بہت پیر تدبیر اطبا نے جوڑے
جنوں کی جڑیں اور پھیلیں، بڑھیں، نخلِ دیوانگی سے نئی شاخ پھوٹی
"ہمیں عنبر و مشک سے غسل دو، ہاں بُلاؤ جا کر مقدس پدر کو
لپیٹو ہمیں پرچمِ مملکت میں، کرو ثبت تابوت پر مُہرِ شاہی
بصد شان و شوکت جنازہ اُٹھاؤ کھڑے دیکھتے کیا ہو اَے نابکارو!
ہمیں گاڑنا فرانسیہ کی زمیں میں کہ ہے وہ ہمارے اب و جد کی بھُومی
دبیرانِ دولت کہاں ہیں بلاؤ، رقم کارنامے ہمارے کراؤ
لکھیں آبِ زر سے تواریخ میں مملکت کے قلمکار سیرت ہماری
سُنو نابدولت کے فرمان بہرو!! چلو مت اشاروں پہ ایزابلا کے
ہمارے نمک خوار دیرینہ ہو تم یہ ایطالوی لومڑی اُف یہ کتنی
چلتروں سے توہینِ شاہی پہ اُکسا رہی ہے، کرو سرنگوں سلطنت کے
پھریرے، ولایات کے حکمرانوں کی خدمت میں دوڑاؤ قاصد، سپاہی
خبر دو ہماری رعایا کو فوراً اُتارو یہ ملبُوس، رنگیں قبائیں
سیہ ماتمی چوغے پہنو نمک خوارو تجہیز و تکفین میں دیر کیسی؟
ہمیں ایک عرصہ ہوا ہے مرے، مغفرت کو کلیساؤں میں ہاتھ اُٹھاؤ"
غرض فرش پر لیٹے لیٹے 'وہ چت' ایسے ہذیانی فرمان کرتا تھا جاری
ادھر ملکہ اور خیر خواہانِ ملک و حکومت پریشان تھے بے نہایت

دکریں حکمِ شاہی کی تعمیل تو زندہ درگور ہو جائیں مشاہ و کرّم
نہیں مانتے اس کا فرمانِ بذیاں نشاں تو لٹک جائیں گے دار پر ہم۔)
اسی سوچ میں گم تھی ایزا بلا (کس طرح ڈولتے تخت کو دے سہارا)
بُلائے ولایت ولایت کے سیانے طبیب، آزمودہ پُرانے منجّم
لئے لاٹھیاں ٹیکتے گنج ابرُو کہن کاہنوں سے بھی تعویذ گنڈے
پلائے گئے جام پر جام، گھولی گئی بھڑکے شعلوں میں شبنم
جڑی بوٹیاں آزمائی گئیں، کام لائے گئے بیش قیمت جواہر
مگر شاہ پر جو گزرنی تھی گزری، معلق نہیں ہوتی تقدیرِ مبرم
خیال آیا ایزا بلا کو یہ اک دن، ذرا راگ شکتی کو بھی آزمائیں
بہت شہرہ دوشیزۂ برج کی جادوئی بانسری کا ہے آج عالم عالم
دیا حکم — تبے عذر حاضر کرو فرنیڈے گونڈا کی کمسن بھتیجی کو فوراً!!"

○

چھٹے یاس کے تہ بہ تہ کالے بادل اور اُمید کی برق چمکی تنظر میں
لرزتے ہوئے ہاتھ سے برُج کی سہمی دوشیزہ نے بانسری جب اُٹھائی
ہوئی خشک ہونٹوں سے مَس تو اُبلنے لگے اس سے پُرسوز نغموں کے دھارے
گرفتارِ بیم و رجا کی کشاکش میں ایزا بلا تھی، خوشی انتہائی
ہوئی، دیکھا جب اس نے کشتِ جنوں آتشِ نغمہ سے جل چکی ہے سراسر
ملی شاہ کے ہوش و احساس کو بند و زندانِ دیوانگی سے رہائی
وہ اُٹھ بیٹھے آنکھوں کو مَلتے ہوئے، جیسے بیدار ہو خوابِ شیریں سے کوئی
دیا حکم، دربار ہو منعقد، کاروبارِ حکومت کی شُدہ لوٹ آئی

○

نکلتی نہ تھی بات ہونٹوں سے ملکہ کے فرطِ خوشی سے، بصد ضبط بولی
"مری محسنہ بول کیا چاہتی ہے کہ تو نے رکھی شرمِ فرماں روائی
ترے حیرت انگیز نغموں نے مجھ کو کیا سرخرو آج کم عمر لڑکی!
طبیبوں کے فن، سحر پرکاہنوں کے ہے بھاری تری ایک جادو نوائی
مری محسنہ بول کیا چاہتی ہے! مری محسنہ بول کیا چاہتی ہے!!"
نہایت ادب سے کھڑی ہو کے دوشیزہ نے اک طرف اپنی انگلی اُٹھائی
اشارہ وہ کہنے ہی پائی تھی، اتنے میں درباریوں کی صفوں کو اُلٹتا
بڑھا ملکۂ عالیہ کا چہیتا، جواں پیشِ خدمت دلربائی!!!

۵

کون کسی کا

ے کا موسم تو بوا جی صرف امیروں کے لئے ہے۔
توبس گرمی ہی بھلی۔ بلا سے رات کو اوس ہی
وئی فرق نہیں پڑتا۔ اب دیکھو نا کل رات
ہن کے پسلی میں ایسا درد ہے کہ کسی کل چین
نہ جانے کس بجاری کا پیش خیمہ ہے غریب آدمی
ربوبی نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا
ان لوگوں کی پرانی پڑوسن تھیں۔ اور ان کی
زیشن سے قطع نظر بالکل گھر کے ایک فرد کی سی
، ہر چھوٹے بڑے کام میں ان سے رائے لینا
ں۔ "اے ربوبی دیکھو نا یہ شاموز رات زبیدہ
ں۔ بھلا بتاؤ تو اب میری عمر ہے۔ شاموز اور
اماں ہلکے رنگ کے شاموز کا تھان ان کے
ں۔ اور ربوبی کا دل لوٹ پوٹ ہو جاتا۔
بسا ہے ہلکا ہلکا تو رنگ ہے بس ایک شلوکہ تم
باقی میں بچوں کی فراکیں بن جائیں گی۔ جب
ئی تمنا سے لائے ہیں تو بہن میری تم کو ان
حترام کرنا چاہیے" اسے بنوا ان سفید بالوں
ا شلوکہ بھلا کیا جچے گا۔ تم بھی سٹھیا گئی ہو۔
بے میں۔ میں اپنا تماشا تو بنوانے سے رہی،

اماں ان کے زریں مشورے قبول کرنے سے صاف انکا
دیتیں، —— اور ربوبی سوچتیں
یہ کیسی بیویاں ہیں کہ ساٹن شاموز پہننے سے بھاگ
ہیں کہ ساری عمر بیت گئی لیکن ایک کاسنی جارجٹ کی سا
کا ارمان تھا سو وہ بھی دل ہی میں رہ گیا۔ کنوار پنے میں
کی ساڑی ہی کو کاسنی رنگ رنگ کر دل کا ارمان یہ س
کر منا لیتی تھی کہ چلو اب نہیں۔ نہ سہی۔ بیاہ کے بعد میا
ایک کیا کئی ایک ساڑیاں لا دے گا۔ اور میاں کے خیال
گورا دپ دپ چہرہ کیسے لال بھبھوکا ہو جاتا تھا۔ اور کا
کالے گھنیرے بالوں کے بیچ دہکتا ہوا چہرہ ایسا معلوم ہوتا
جیسے اُمنڈتے بادلوں کے درمیان شفق پھول رہی ہو۔ او
اکیلے میں بال بکھرائے آئینہ دیکھ دیکھ آپ ہی آپ شرما
چلی جاتی تھیں —— مگر وہاں تو قسمت پر پہلے ہی جھاڑو پ
گئی تھی۔ کیسا کیسا ارمان تھا بیاہ کا لیکن بیاہ کے بعد جب
پر نظر پڑی تو سارے ارمان جھاگ کی طرح ایک دم سنن
سوکھ گئے۔ میاں کاہے کو تھے۔ جیسے دق کا مریض ہسپتال
بھاگ آیا ہو۔ چلو وہ تو اس پر بھی صبر کر لیتیں۔ لیکن او
ے دو کراماً کاتبین جیسے منیر اور نیاز داہنے بائیں کھڑ
ٹھنک رہے تھے اور میاں جنم جلے نے سب سے پہلی جوا

کی تو یہی کہ "اگر تم نے میرے بچوں کو اپنا سمجھا تو میں جانوں گا
تم نے مجھے اپنا سمجھا۔ بن ماں کے بچے ہیں، محبت سے پیش
آؤ گی تو یہ مانوس ہو ہی جائیں گے عورت کے دل میں بڑی
وسعت ہوتی ہے، اور تم عورت ہو۔ مجھے یقین ہے میرے
بچے تمھاری ممتا سے محروم نہیں رہیں گے " ـــــ میاں کا یہ
فصیح و بلیغ لیکچر سُن کر ان کا جی جل گیا تھا۔ ہاں اور کیا صورت
دیکھنا تو دور کی بات حد تو یہ ہے کہ گھونگھٹ تک نہیں اُلٹا
بس اپنا راگ چھیڑ کر بیٹھ گئے، خود غرض کہیں کے۔ ان کے
دل میں منیر اور نیاز کے خلاف نفرت کی ایک لہر سی اٹھی اور
رگ رگ میں سرایت کر گئی۔ نہ جانے کیوں اُنھیں خیال آیا
کہ جب تک یہ دونوں رہیں گے امتیاز میاں ان کی بات بھی
نہیں پوچھیں گے۔ وہ اسی سوچ میں گم تھیں۔ ان کا جی آپ
ہی آپ بھرا آرہا تھا۔ بیاہ کا ہے کو ہوا تھا جیسے دنیا کی
ساری بدقسمتی ان کے حصے میں آگئی تھی، کہ دو ننھے منے ہاتھ
ان کا ہاتھ آہستہ سے پکڑ کر سہلانے لگے ہمدردی کے لمس
سے انھیں اپنا چھوٹا بھائی منّو یاد آگیا۔ اور ان کی آنکھوں
کے سوتے پھوٹ پڑے۔ ٹپ ٹپ گرم گرم آنسو ننھے منے
ہاتھوں پر ٹپکنے لگے۔

"ایں آپ رو رہی ہیں" ننھی حیران آنکھیں ان کے چہرے
پر ٹکی ہوئی تھیں۔ لمحے بھر انھیں دیکھنے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کے
بعد نیاز نے قمیص کے دامن سے ان کی موٹی موٹی آنکھوں
سے آنسو پونچھ دیئے۔

"آپ اتنی بڑی ہوکر رو رہی ہیں۔ دیکھئے تو میں کبھی
نہیں روتا۔ دادی کہتی تھیں رہیں تو اس وقت بھی نہیں
رویا تھا جب ہماری اماں مر گئی تھیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور آپ صرف اپنی اماں کو چھوڑ کر آئی ہیں
اس لئے رو رہی ہیں۔" اور دلہن بی کے آنسو مارے حیرت
کے خشک ہوگئے۔ اتنی ننھی سی جان اور یہ پکی پکی باتیں۔ کیا
ماں کا پیار چھن جانے سے بچے یک لخت بڑے ہو جاتے ہیں؟

وہ بے ساختہ نیاز کو اپنے کلیجے سے بھینچ کر سسکیاں بھرنے لگ
"میں روتی تو نہیں بیٹے" ان کی زبان سے نکل گیا
لمحے بھر کے لئے حیرت زدہ ہو گئیں۔ کیسا ان کا بیاہ ہوا
کہ بس ایک رات میں دو پلے پلائے بیٹوں کی اماں بن گ
"اماں سنیئے" نیاز نے بڑے لاڈ سے ان کے گلے
باہیں ڈال دیں۔

"ہاں بیٹے" وہ اپنی آواز پر خود ہی متعجب تھیں۔
"آپ بالکل میری اپنی اماں ہیں نا"
"ہاں ایک دم تمھاری اپنی اماں ہوں"
"اور منیر کی بھی"
"ہاں ہاں منیر کی بھی، کہاں ہے منیر"
"دادی کے پاس سو رہا ہے۔ بلا لاؤں"
"نہیں رہنے دو آپ ہی اُٹھ کر آ جائے گا"
"میں آپ کے پاس سوؤں گا۔ دادی کہتی تھیں ہم
اپنی اماں کے پاس سوتے تھے"

بالکل تم اور منیر میرے ساتھ سوؤ گے" اس نے
کے سر میں انگلی سے کنگھی کرتے ہوئے کہا۔ اسے خود اپنے رو
پر حیرت ہو رہی تھی۔ اس کی نفرت پانی کی طرح بہہ گئی۔ ا
اب وہاں محبت اور جذبات کے سمندر ٹھاٹیں مار رہے
رات بھر شادی کے ہنگامے اور رسومات نے دن کا چورا
کر رکھ دیا تھا۔ اور اب ذرا ذہنی سکون ملا تو ان کی آنکھو
نیند گھلنے لگی۔ اور نیاز کو اپنے بغل میں لٹا کر خود بھی نیند
آغوش میں ڈوب گئیں۔ رات گئے جب امتیاز میاں با
سے آئے تو دلہن بی کو نیاز کے ساتھ سوتا دیکھ کر انھیں کوئی
زیادہ خوشی نہیں ہوئی۔ چاہے وہ جیسے بھی تھے لیکن آج
رات ان کی سہانی رات تھی۔ وہ یہ رات بیوی کے ساتھ ا
گزارنا چاہتے تھے ـــــ بیویوں کے معاملے میں انکی قسم
بڑی ہی اچھی تھی۔ نیاز۔ منیر کی والدہ بھی بہت ہی سید
سادی خوبصورت سی نیک عورت تھی۔ اور نازک اتنی

ے دو پے بچوں کا بوجھ نہ سنبھال کر تیسرے ہی بچے کے ساتھ خود
بھی رخصت ہو گئی۔ اس کی موت کے بعد امتیاز میاں بولائے بولائے
سے پھرتے تھے۔ ایسا لگتا تھا۔ جیسے زندگی کی ساری رونق مرنے
والی کے ساتھ دفن ہو کر رہ گئی تھی۔ اور انھیں اتنا صدمہ ہوا کہ
ایک نہ دو اکٹھے سات سال تک لوگوں کے اصرار کے باوجود
دوسری شادی کرنے کا نام نہیں لیا۔ اگر کوئی شامت کا مارا
نسبت لے کر آتا بھی تو یہ کاٹ کھانے کو دوڑتے۔ وہ تو سدا کے
ہی کھرے تھے۔ اگر ایک بار نہیں کی تو ہاں کہلوانا ناممکن نہیں تو
مشکل ضرور تھا۔ اور جب سات سال گزر گئے۔ اور لوگوں کو یقین
ہو گیا کہ اب امتیاز میاں رنڈوے ہی جائیں گے۔ تو یکبارگی
ان کی بائیں پسلی اتنی زور سے پھڑکی کہ ربوبی کی قسمت میں
بار ازدو ہو گئی۔ اتنے چاؤ چوچلے سے بیاہ کیا کہ لوگ دنگ رہ
گئے۔ ڈالے پر پانچ نہ سات اکٹھے گیارہ جوڑے کی بری لے
گئے۔ ایک سے ایک خوبصورت ساڑی۔ لوگوں نے مذاق اڑانا
چاہا تو کہا میں رنڈوا ہوں۔ لڑکی تو کنواری ہے پھر اس کے ارمان
کیوں دل ہی دل میں مریں۔ اب ان سے کون پوچھتا کہ گیارہ
ساڑیوں سے کون سے ارمان بے چاری کے نکل گئے۔ اور
کچھ نہیں تو بلا سے اپنی گذری ہوئی جوانی ہی کو دو ایک دن کے
لئے واپس بلا لیتے کہ اونچی دکان کا پکوان بھی میٹھا ہی رہتا۔ لیکن
امتیاز میاں تو بہرحال امتیاز میاں تھے۔ جن کا خود اپنے بارے
میں خیال تھا کہ انھوں نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی غلط قدم
اٹھایا ہی نہیں —— اور جب اتنے چاؤ چوچلے سے بی بی کا ڈولا
اترا تو سب سے پہلے حفظ ماتقدم کے تحت بچوں کا خیال آیا جس
کے نتیجے میں بیوی اس وقت نیاز سے لگی پڑی تھیں۔ اب یہ
امتیاز میاں کی عقل میں آ ہی نہیں سکتا تھا کہ نفرت کی وہ آگ
جو ان کی بے وقت کی راگنی نے ربوبی کے دل میں دہکائی تھی
صرف نیاز کے وجود ہی کی کشش تھی کہ بجھ گئی۔ ورنہ ان کا غصہ
تو ایسا تھا کہ ایک ذرا سی بات کے لئے انھوں نے اپنی اتنی پیاری
بہن سے قطع تعلق کر لیا تھا —— اور وہ دن اور آج کا دن کتنے
ہی چاند سورج چڑھتے ہی چلے گئے۔ لیکن ان میں سے ایک
دن بھی ایسا نہیں آیا کہ ربوبی کی پہلی اپنی تمام تر مظلومیت کے
باوجود ان کے دل سے وہ میل کھرچ ڈالتیں جو ان کی ایک
ذرا سی غلطی سے جم کر رہ گیا تھا۔

امتیاز میاں کچھ دیر تو بے بس سے بیوی کو دیکھتے رہے
اور پھر آہستہ سے ربوبی کا سر پکڑ کر ہلا دیا۔ ڈر کے مارے ربوبی کی
آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی پھٹی پھٹی آنکھوں سے میاں کے
ہونق چہرے کو دیکھتی رہیں۔ ہیں ہیں شکن سے ڈھکے ہوئے
لمبوترے چہرے میں کوئی کشش نہیں نظر آئی۔ گھٹیا سگرٹ کی
بو سے ان کی نفاست پسند طبیعت گھن کھا گئی، اور انھوں نے
بڑی بے اعتنائی سے کروٹ لے کر آنکھیں بند کر لیں ——
اب امتیاز میاں جل سے گئے۔

"سنو ادھر آؤ" امتیاز میاں نے ربوبی کو جھنجھوڑ ڈالا۔

"کیوں کدھر" ربوبی کی آواز کسی قسم کی شرم یا جھجک
سے یکسر عاری تھی۔

"یہاں آؤ نا بس ایک ذرا" امتیاز میاں نے دوسرے
پلنگ کی طرف اشارہ کیا۔

"کس لئے ——"

"ارے بس ایسے ہی ذرا۔ باتیں کریں گے —— آج
ہماری شادی کی پہلی رات ہے نا ——" جذبات کی شدت
سے ان کی آواز لڑکھڑا گئی۔

ہونہہ کمال ہے کس مزے سے کہہ رہے ہیں پہلی رات
ہے۔ خدا کی مار یہ بڑے بڑے دو دو بچے اور باتیں ایسی ہیں جیسے
کہ —— ربوبی نے حقارت سے منہ بنا کر میاں کو دیکھا۔ وہ
بڑے بے ڈھنگے پن سے مسکرا رہے تھے۔ ربوبی کو ایسا محسوس
ہوا جیسے کسی نے سوپ بھر انگارے ان پر سے نچھاور کر دیئے
ہوں۔

"اس بڑھوتی میں اس قسم کے چوچلے اچھے بھی لگتے ہیں
آپ کو ——" ربوبی کی آنکھوں میں نفرت کی آگ دہک اٹھی۔

امتیاز میاں جھکا کر مسکرانا بھول گئے۔ ابھی بگڑے دل سے پالا پڑا ہے۔

"میں بوڑھا ہوں لیکن تم تو بوڑھی ہو" وہ کمال بے حیائی سے بولے۔ ربو بی نے حسرت سے انھیں دیکھا امتیاز میاں کے زرد چہرے میں انھوں نے اپنا آئیڈیل دولھا ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن وہاں کہاں تھا ——— کچھ بھی نہیں۔ میاں اپنے سرد سرد ہاتھ سے مارے خوشامد کے ان کا سر سہلا رہے تھے۔ کہ بیوی کچھ ہی دیر کے لئے سہی ان کی بات مان لیتیں۔ ربو بی ایک لمحے کے لئے اکٹھیں بھی۔ لیکن میاں کی شکل دیکھتے ہی نفرت اور رحم کی ایک سرد سی لہر ان کے جسم میں پھیل سی گئی۔

"میں بوڑھی نہیں تھی لیکن اب بڈھے کی بیوی ہوں۔ اس لئے مجھے جوانوں کی طرح سوچنے کا کیا حق ہے۔" انھوں نے سرخ سرخ تکیہ پر سر رکھ دیا۔ ان کی جلتی ہوئی آنکھیں ——— امتیاز میاں کے سرد ہاتھوں کے لمس سے اور بھی دھک اٹھیں ——— نیاز کو اپنے بغل میں لیٹا دیکھ کر انکا جی بھر آیا میاں کی سوکھی مری باہیں دیکھ کر وہ بھری بھری باہوں کا انجانا گرم گرم لمس۔ جس کی تمنا میں وہ کنوار پنے میں سوچ سوچ کر مدہوش ہو جاتی تھیں یاد آیا ——— وہ تڑپ اٹھیں ——— ان کے تخیل کا رسیا ایسا سوکھا مارا تو نہیں تھا۔ انھوں نے تو کھلی آنکھوں سے بھی ایسے اینڈے بینڈے خواب نہیں دیکھے تھے۔

"کیسی باتیں کرتی ہو بھئی۔ ابھی ہماری شادی کو چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے ہیں۔ تم بھی کتنی عجیب ہو۔" میاں نے کاہے کو کبھی سوچا تھا کہ اتنی پیاری اتنی نازک سی لڑکی اتنی بڑی بڑی بولیاں بھی بول سکتی ہے۔

"یہاں تو سب ہی عجوبہ ہے کسی دولہن نے خواب میں بھی نہیں دیکھا ہو گا کہ وہ گھونگھٹ اٹھاتے ہی دو سپلے پلائے بچوں کی اماں بن جائے گی۔" ربو بی نے کروٹ لے کر سرخ چادر میں اپنا منہ چھپالیا ——— اور وہ دن آج کے دن ربو بی کے دل میں میاں کے خلاف نفرت کی جو بنیاد پڑی تو میاں مرتے مر گئے لیکن ان کا دل کبھی بھی میاں سے ہنس کر بولنے کو نہیں چاہا۔ انھیں دیکھ کر کبھی ان کے جذبات نے جولانی نہیں دکھائی۔ بس وہ امتیاز میاں کے لئے ایسا بن گئی تھیں جسے ضرورت پڑنے پر وہ اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر سکتے تھے۔ بس ایک سرد سی لہر ان کے تمام جسم میں پھیل کر رہ جاتی ——— منیر اور نیاز ان کی توجہ کا مرکز ہو کر گئے۔ بوڑھی ساس کی ایسی خدمت کی کہ لوگ عش عش کر اٹھے چھک چھک کر گھر کا کام کر رہی ہیں۔ منیر، نیاز کے کپڑے دھل رہے ہیں اور کہیں امتیاز میاں کی شامت آئی تو اپنی ایک کنگھی یا لنگی وغیرہ لے کر پہنچ جاتے۔

"کپڑے دھو رہی ہو ذرا یہ میرے کپڑے دھو دیتیں"

"رکھ دیجئے مجید کی ماں آئے گی تو دھو دے گی" ان کا ہنستا ہوا چہرہ محرمی ہو جاتا۔

"اور اگر تم ہی دھو دیتیں تو کیا ہوتا" ———

"نہیں مجھ سے آپ کے کپڑے نہیں دھلتے تو یہ ایسی ہوتی ہے ان میں ——" انھیں بے ساختہ ابکائی سی آجاتی۔ میاں سوچتے چلو آثار اچھے نظر آرہے ہیں۔ اگر ایک آدھ بچہ ہو گیا تو اس نک چڑھی عورت کا دماغ ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن توبہ کیجئے۔ ربو بی کسی تپتے ہوئے ریگستان سے کیا کم تھیں کہ جہاں اگر بھولے سے کوئی بیج گر بھی جائے تو وہ جھلس کر رہ جاتا۔

ساری خواہشیں ایک ایک کر کے دم توڑ گئیں۔ بس ایک ہی خواہش رہ گئی۔ کسی نہ کسی طرح میاں کو جلایا جائے۔ اچھی بھلی مشین پر بیٹھی میاں کا کرتا سی رہی ہیں اور کہیں سے بھولے بھٹکے امتیاز میاں آکر بیٹھ گئے تو آپ ہی آپ تمام کاجوں کا سہرا بندھ جاتا۔ اور اگر شامت کے مارے کہیں پوچھ بیٹھے کہ:

"میرا کرتا سی رہی ہو" تو جل کر کہتیں
"میں کیوں سینے بیٹھتی آپ کا کرتا وہ تو آپا بی اپنے میاں
کا دے گئی ہیں"
"لیکن کپڑا تو وہی ہے جو میں لایا تھا"
"تو کیا ہوا کیا ایک جیسے کپڑے بازار میں نہیں بکتے" وہ
جھنجلا کر قینچی وٹخ دیتیں۔
"کم بخت ذرا بھی نہیں چلتی" اور میاں بے چارے دل
کر کھڑے ہوتے۔ وہ ان کی اس نرالی ادا سے روز اول ہی سے
واقف ہو گئے تھے۔ بیوی کاہے کو تھیں گویا مچھلی کا کانٹا تھیں
کہ گلے میں اٹک کر رہ گئی تھیں نہ اس پار نہ اس پار۔
اور جب تک امتیاز میاں زندہ رہے انھیں کسی کل
چین ہی نہیں ملا۔ لڑکے ـــــ جن کے لئے شروع میں وہ
فکرمند ہوئے تھے لالوں لال تھے۔ ربوبی نے ایسے ٹوٹ کر
چاہا کہ اپنی ماں کی یاد کبھی پلٹ کر نہ آئی۔ یہ لاکھ اپنی محدود
آمدنی کا رونا روتے رہے لیکن ربوبی نے روکھی سوکھی کھا کر
نیاز اور منیر کو کالج میں داخل کرا ہی دیا۔ کماتے کماتے بے
چارے کی ہڈیاں گھس گئیں لیکن بیٹے بی۔ اے کر ہی گئے۔
ربوبی اتنی خوش جیسے سارے جہاں کی دولت انھیں نصیب
تھی۔ میاں جن کی شکل دیکھ کر ان کے بدن میں آگ لگتی تھی اگر
خوشی کا اظہار کر بیٹھتے تو یہ جل کر راکھ ہو جاتیں۔
"ہونہہ دیکھو تا بے چارے کو کیسا چہک رہے ہیں جیسے
انھیں کی کوششیں تو تھیں کہ بیٹے پڑھ کر نکل جاتے۔ وہ تو کہو
میرے بچوں کی قسمت اچھی تھی۔ جو خدا نے مجھے بھیج دیا۔ ورنہ
یہ تو ایسے تھے کہ اگر بیوی کہتی نکال دو تو بچوں کو نکال بھی دیتے
ـــــ چہ۔ رے۔ بیچارے ـــــ ذرا ملاحظہ کرو ان کی صورت
تعلیم یافتہ بیٹوں کے ابا جان ہیں ـــــ"
"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں
جس کا ہاتھی اس کا ناؤں۔ بیٹے تو بہرحال میرے ہی کہلائیں
گے" امتیاز میاں کبھی کبھار اپنی اہمیت جتا دیتے ـــــ اور
پھر آفت آجاتی ربوبی کے کلیجے میں تیر سا لگتا۔ رو رو کر آنکھیں
سجا لیتیں "اے واہ ذرا دیکھو تو اس مردوے کی باتیں واہ
کیا کہنے ہیں جیسے میرے بچے تو ہیں ہی نہیں ـــــ میں جس نے
اپنا خون پسینہ ایک کر کے ان لڑکوں کی خدمت کی کچھ بھی نہیں
اور یہ بے چارے سب کچھ ہیں ـــــ ہاں کیوں نہ ہو اب کمائی
کھانے کے دن ہیں نا۔ اس لئے میں تو غیر ہو ہی جاؤں گی۔
جب ایک ایک تار جسم سے اتار کر فیس ادا کی تھی تو باوا نہیں
تھے اور آج باوا بن گئے۔ اللہ کرے میں مر ہی جاؤں" ربوبی
محرومی کے احساس سے کلیجہ پھاڑ کر روتیں اور لڑکے جو اس
تمام عرصے میں منہ دیکھتے رہے ربوبی سے لپٹ جاتے۔
"اماں اماں جی آپ کیسی باتیں کرتی ہیں ہم تو صرف
آپ کے ہیں۔ اور آپ کے ہی رہیں گے۔ آپ سے زیادہ
ہمیں کون چاہے گا" منیر اور نیاز ان کے آنسو پونچھنے لگتے۔
اور ربوبی ایک عجیب قسم کا سکون محسوس کرتیں۔ ان کے شعور
میں نیاز کے ننھے منے ہاتھوں کا لمس جاگ جاتا جس کی پیاری
پیاری باتوں نے ان کی زندگی کا رخ پھیر کر رکھ دیا تھا۔
ان کے بہتے ہوئے آنسو آپ ہی آپ خشک ہو جاتے۔ کلیجہ جو
پکا پھوڑا بن گیا تھا۔ محبت کے دو جملے سے جیسے اس پر کوئی
مرہم کا پھاہا رکھ دیتا۔
بیٹے کمانے لگے تو ربوبی کو بہوؤں کی چاہت ہوئی۔
اور جب بہوئیں آئیں تو جیسے ربوبی کا سکھ چین۔ ان کی آمد کے
ساتھ ساتھ رخصت ہو کر رہ گیا۔ جس طرح انھوں نے بیٹوں کو
امتیاز میاں سے چھین لیا تھا۔ بہوؤں نے ان کی محبت پر چھاپا
مارا۔ وہ بے چین ہو گئیں۔ ہر گھڑی ان کا منہ دیکھنے والے
لڑکے بیویوں کے شبنمی آنچل تلے جا چھپے ـــــ ملے کیا کہ
میاں کی خدمت کی جائے۔ جیسے بھی تھے آخر میاں تھے۔ مگر
ساری عمر تو خار کھاتے گزری تھی اب اس بڑھاپے میں کیا
خاک خدمت کرتیں۔ دن بھر کے جلے مرے امتیاز میاں آتے
تو جیسے ان کا دل کٹ سا جاتا ـــــ اس بڑھاپے میں بھی

بے چارے کو چین نہیں ملا۔ بیٹے پہلے نکلے سب تو سب کبھی چھوٹے
منھ بھی نہیں کہا کہ "جانے دیجئے ابا اب آپ ہمیں اپنی خدمت
کا موقع دیجئے"۔ لیکن توبہ۔ یہ میٹھے بول سننے کو ربوبی کے کان
ترس کر رہ گئے۔ لیکن کبھی بھی دو جملے نیاز یا منیر کے منھ سے
نہیں نکلے۔ اور تو اور آخر مہینہ ہوتے ہوتے دونوں ہی بھول
جھاڑ کر ان کے آگے پیچھے گھومنے لگتے۔ اور انھیں غصہ
آجاتا۔

"شرم تک نہیں آتی میاں کونسی چھپن کروڑ کی چوتھائی
مجھے لاکر دیتے ہو بڈھے باپ کی کمائی پر ہاتھ پھیلاتے اچھا لگتا
ہے بھلا"

اور اگر کہیں امتیاز میاں کے کان میں ان کی گفتگو کی
بھنک پڑ جاتی تو الٹ پڑتے۔ منیر اور نیاز کی وہ خبریں لیتے
کہ توبہ ہی بھلی۔ بہوئیں بلبلا کر اپنے اپنے میئوں کو برا بھلا
کہنے لگتیں۔

"خواہ مخواہ کو بے غیرت بنے پھرتے ہیں"

"لو بھلا اگر بیٹے نے باپ کی کمائی سے مانگا تو کیا برائی
ہے۔ دنیا ہی ماں باپ کے پیسے پر جیتی ہے" ربوبی میاں
سے الجھ جاتیں۔

"جوان بیٹے ہیں۔ مہینے بھر ان کی روٹیاں توڑتے ہو
اور جو وہ چار پیسے مانگ بیٹھیں تو تم کو بھاری ہی نہیں کھلانے
کو اپنے باپ ہو لیکن دل سوتیلوں سے بدتر ___" وہ حقارت
سے میاں کو دیکھتیں۔ اور مارے جلن کے پلو میں بندھے ہوئے
سارے کے سارے پیسے بیٹوں کے حوالے کر دیتیں۔ اور
امتیاز میاں کے جذبات بری طرح مجروح ہوتے۔ انھیں
محسوس ہوتا جیسے انگاروں پر لوٹ رہے ہوں ___ جھنجھلا
جھنجھلا کر چیزوں کو اٹھا کر پٹخنا شروع کر دیتے اور بہوئیں
سسر کی پریشانی دیکھ دیکھ کر منھ پر آنچل کا پلو رکھے بس
مسکرائے چلی جاتیں ___ اور جو کہیں ربوبی کی نظر پڑ جاتی
تو ___

"ایک تم ہی لوگ نئی بہوئیں اس گھر میں نہیں آئی ہو میں
بھی بیاہ کر آئی تھی اور مجھ سے پہلے تمھاری اپنی ساس کا دولا بھی
اترا تھا۔ لیکن خدا نہ کرے ہم اتنے بے غیرت کاہے کو تھے کہ اپنے
سے بڑوں پر ہنستے۔ میں اپنے منھ سے کیا کہوں محلے والوں سے
پوچھ لو کہ میں نے اپنی ساس کو کیسے روئی کا پھاہا بنا کر رکھا تھا
اور ایک تم لوگ ہو کہ بوڑھے سسر پر ہنستی ہو۔

"اور آپ جو تمام دن بے چارے ابا جان کی جان میں
لگی رہتی ہیں"۔ بڑی بہو بڑی ہی منھ پھٹ تھی۔ "میں اگر ان کی
جان میں لگی رہتی ہوں تو تمھارا کلیجہ کیوں پھٹتا ہے۔ وہ میرے
میاں ہیں سسر نہیں۔ میں نے ان کے بڑھاپے پر اپنی
چڑھتی جوانی قربان کی تھی ___ اور تم ___ میں تو تم لوگوں
سے نہیں کہنے گئی کہ میرے بیٹوں کو کیوں ایسا ہتھیا لیا ہے کہ وہ
دو لمحے بھی ڈھنگ سے ہمارے پاس نہیں بیٹھتے ___" ربوا ایک
دم جلبلا کر بولیں۔

اور بہوئیں بے چاری جھینپ جھینپ جاتیں۔ ان کی
سمجھ میں ربوبی کے مزاج کا تلون کبھی جو آیا ہو۔ گھڑی میں تولہ
گھڑی میں ماشہ، ہر بات کی تردید کرنا ان کے حصے میں آیا تھا۔

انھیں دنوں شامت اعمال ___ ایک دن میاں دفتر
سے آئے تو چہرہ جو پہلے بھی کبھی بارونق نہیں رہا تھا۔ خاصا اترا
ہوا تھا، ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ ربوبی پڑوس میں دنیا
جہان کے قصے لئے بیٹھی تھیں۔ بڑی دلہن نے سسر کی حالت
ایسی دیکھی تو لپک کر ساس کو بلانے دوڑی وہاں بھلا ربوبی کو
اپنی بات کے آگے کب بہو کا اعتبار آتا سمجھ گئیں گھر میں کوئی
کام ہے میاں کے آنے کا صرف بہانہ ہے۔ جم کر بیٹھ گئیں۔ ویسے
بھی ہر کام الٹا کرنا ان کی سرشت میں داخل ہو گیا تھا لیکن جب
نیاز کی آواز آئی ___ تو آواز کے دھیمے پن سے دہل اٹھیں ___
گھبرا کر آنے کے لئے کھڑکی کا چوکھٹ پھلانگنے لگیں تو اوندھے
منھ زمین پر آ رہیں ___ ادھر سے زبیدہ کی اماں دوڑیں ادھر
سے بہو نے سنبھال کر اٹھایا تو ربوبی کے اچھے خاصے دو دانت

ہل کر رہ گئے تھے۔ ہونٹ کٹا ہوا تھا۔ کسی صورت سے کراہتی ہوئی گھر آئیں تو دیکھا میاں پلنگ پر پاؤں پھیلائے لیٹے ہیں۔ پھر کیا تھا ربوبی کی زبان تالو سے نہیں لگ رہی تھی۔ بولنے پر آئیں تو بہو بیٹے سے لے کر میاں کے سو پشت کو تو م کر رکھ دیا ——— بہو کبھی ساس اور کبھی سسر کو دیکھ رہی تھی جن کے چہرے سے کرب کے آثار نمایاں تھے۔ میاں پر ایک نظر ڈالی اور پھر بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو بھر کر جانے لگی تو ربوبی کی نظر پڑ گئی۔ دل افسوس کے احساس سے بھر گیا ——— بہو کو بلا کر لپٹا لیا۔

"میری باتوں کا بُرا مانتی ہو بیٹی۔ میں تو غصّے میں آپے میں نہیں رہتی۔ مگر ان بڑے میاں کو تو دیکھو ابھی مرے جا رہے تھے اور اب خاصے مزے میں پڑے ہیں۔" ربوبی نے اپنا سوجا ہوا ہونٹ سہلایا، درد سے سارا چہرہ پھٹا جا رہا تھا۔ کہ یک دم سے میاں پر نظر پڑ گئی، جو سارے جسم سے کانپ رہے تھے۔ گڑبڑا کر آگے بڑھیں۔ بہو نے دوڑ کر لحاف اوڑھا دیا۔ منیر کی دولہن چائے بنانے دوڑی اور ربوبی ہولائی سی میاں کی پٹی سے لگی بیٹھی دل ہی دل میں پچھتا رہی تھیں ابھی چند لمحے پہلے کیسے کیسے کوسنے دیئے ہیں اگر ان میں ایک بھی لگ گیا تو وہ کہیں کی بھی نہیں رہیں گی بال بچے سب آنکھ کھلنے کا بازار ہیں۔ طرح طرح کے اندیشے دل میں جنم لے رہے تھے نیاز گھبرایا گھبرایا ربوبی کو دیکھ رہا تھا۔

"اے میاں کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو کونسا لال ٹکا ہے میرے چہرے میں۔ باپ تمہارے بچتے نہیں نظر آتے دوڑو ڈاکٹر کے ہاں" ربوبی کی آواز ہر قسم کے جذبات سے بالکل خالی تھی۔ وہ چپ چاپ امتیاز میاں کی کھلی آنکھوں کو دیکھ رہی تھیں جن میں ساری زندگی کا کرب جھانک رہا تھا چوٹ سے سوجا ہوا ان کا چہرہ بھیانک لگ رہا تھا۔ منیر کی دلہن چائے لے کر آئی تو امتیاز میاں کوشش کے باوجود دو گھونٹ بھی حلق سے پار نہیں اتار سکے ربوبی خبط ہو گئیں کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو یاسین شریف لے کر پڑھنے بیٹھ گئیں۔ ابھی دو آیت بھی نہیں پڑھی ہو گی کہ نیاز ڈاکٹر لئے آ گیا منیر دفتر سے واپسی پر راستے میں مل گیا تھا۔ ڈاکٹر کے ہاتھ لگانے کی نوبت بھی نہیں آئی اور امتیاز میاں نے پٹ سے آنکھیں بند کر لیں۔ پیشانی پر پسینے کی چند بوندیں نظر آئیں اور پھڑکتے ہوئے نتھنے ساکت ہو گئے۔ نیاز اور منیر کوشش کے باوجود باپ کی اچانک موت پر اپنی چیخیں نہیں روک سکے۔ ربوبی پھٹی پھٹی آنکھوں سے امتیاز میاں کی لاش کی طرف دیکھ رہی تھیں جو ابھی چند لمحے پہلے بالکل انھیں کی طرح اچھا بھلا انسان تھا، اور اب محض ایک بے روح جسم۔ جس نے تمام زندگی کوشش کے باوجود محبت نہیں سیکھی، جس کے بچوں کو انھوں نے ماں سے بڑھ کر محبت دی گھر بھر میں ان کی محبت کُتے بلّیوں کے لئے بھی عام تھی لیکن میاں کے نام پر ان کے دل میں سدا خاک اڑتی رہی اور اس وقت ان کی موت پر ان کا دل کسی انجانے بوجھ سے دبا جا رہا تھا، لیکن آنکھوں میں خاک اُڑ رہی تھی، چوکھٹ سے لگی انھیں ایسا محسوس ہو رہا تھا، جیسے چوکھٹ کی کاٹھ ان کے قدموں سے نکلی جا رہی ہے۔ اور وہ ابھی بے سہارا ہو کر اوندھے منھ زمین پر آ رہیں گی۔ انھوں نے سہارے کے لئے امتیاز میاں کی طرف ہاتھ بڑھایا، لیکن وہ ہاتھ جو ان کے اشارے کے غلام تھے۔ آگے نہیں بڑھے اور ان کا ہاتھ پلنگ کی پٹی سے جا ٹکرایا۔ انھوں نے بے حسی سے منیر اور نیاز کی طرف دیکھا جنھوں نے آنکھیں مل مل کر سُرخ کر لی تھیں۔ آنسو تھے کہ تار بنے چہرے پر چلے آ رہے تھے ——— انھوں نے مایوسی سے اپنی آنکھیں ملیں۔ آنسو کا ایک قطرہ بھی تو ان کی آنکھ سے نہیں ٹپکا۔ بہوئیں سسکیاں بھر رہی تھیں۔ پاس پڑوس کے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ دیکھتے دیکھتے دن کی روشنی ختم ہو گئی گیس کا ہنڈہ روشن ہو گیا۔ لوگوں نے امتیاز میاں کو سنوار بنا کر کوری چٹائی پر لٹا دیا۔ ربوبی سحر زدہ سی

لاش کے پاس آکر بیٹھ گئیں ــــــ

"اماں اماں آپ کو کیا ہو گیا آپ روتی کیوں نہیں"

نیاز اُن سے لپٹ کر پھوٹ پڑا

"ایں بیٹا۔ میری آنکھوں میں جلن تو ہو رہی ہے لیکن آنسو نہیں آتے میں تو کوشش کر کے تھک گئی ــــ لوگ کیا کہیں گے ــــ میاں کی موت پر میری آنکھوں سے ایک آنسو بھی نہیں ٹپکا ــــ" ربو بی وحشت زدہ سی ہنسیں۔

نیاز نے چونک کر ربو بی کی آنکھوں میں دیکھا۔

"پاگل تو نہیں ہو گئیں اماں"

"میں ٹھیک ہوں بیٹے" ربو بی نیاز کی پریشانی بھانپ گئیں "بس میرا جی رونے کو ایک دم نہیں چاہ رہا ہے" انھوں نے بے چارگی سے سسکتے ہوئے منیر کو اپنے آپ سے لپٹا لیا ــــ

"اماں میری ــــ اللہ ــــ ماں پہلے ہی چھین لی تھی۔ آج بن باپ کا کر دیا۔ منیر نے عورتوں کی طرح بین کیا۔ ربو بی نے وحشت زدہ ہو کر امتیاز میاں کی لاش کی طرف دیکھا۔ کافور سے بھرے ہوئے چہرے پر انھیں مسکراہٹ کی جھلک دکھائی دی ــــ جیسے کہہ رہے ہوں ــــ لاکھ اپناؤ۔ بیٹے تو میرے ہی رہیں گے ــــ

اور ربو بی کی خشک آنکھوں میں ایک دم آنسوؤں کا سیلاب سا آگیا ــــ

پاکستان رائٹرز گلڈ (حلقہ کراچی) کی پندرہ روزہ

اُدبی نشستیں

۲ر جون ۱۹۶۱ء

صدارت :- حفیظ ہوشیارپوری
غزل :- صادق مدہوش
نظم :- ساقی فاروقی
مقالہ :- جمیل جالبی

۱۶ر جون ۶۱ء

صدارت :- مجتبےٰ حسین
افسانہ :- راجہ امین الرحمٰن
غزل :- طفیل احمد جمالی
نظم :- انجم اعظمی

۳۰ر جون ۶۱ء

صدارت :- سید ذوالفقار علی بخاری
افسانہ :- غازی صلاح الدین
غزل :- قمر جمیل

ان اُدبی نشستوں کا پروگرام "ہم قلم" میں ہر ماہ شائع ہوتا ہے۔ شرکت کی عام اجازت ہے

مقام

ہوٹل ایکسلیر۔ صدر

۴½ بجے شام

سعیدہ بدر

نورُ دین

نور دین بجد شریر لڑکا تھا۔ تکلیف دہ حد تک شریر۔ محلے
تقریباً سب اس سے نفرت کرتے۔ ماں مارتی۔ چچا مارتا۔
مارتا۔ محلے والے ڈانٹتے۔ مگر وہ دُبلا پتلا سانولا سا نور دین
شرارتیں کئے جاتا۔ دکان سے چیزیں چرالیں۔ ٹھیلے والو
تنگ کیا۔ پڑوسیوں کا ناک میں دم آگیا تھا۔

وہ ایک معمولی سے پوسٹمین کے پانچ بچوں میں سے ایک
جس کی نیکر پھٹی ہوئی اور قمیص میلی ہوتی۔ اور غلیظ سا بستہ
کر جب وہ دوپہر میں سیکنڈ شفٹ کے اسکول میں جاتا تو محلہ
امن چین ہو جاتا۔ ورنہ چلچلاتی دھوپ میں جب ساری
اپنے بچوں کو دبکائے دروازے بند کئے پڑی ہوتیں
میں موجود ہوتا ——— موسلا دھار بارشوں میں جب تمام
اپنے اپنے گھروں میں نمونیہ کے ڈر کے مارے بند رہتے
گلی میں کودتا، اُودھم مچاتا۔ بارش میں بھیگتا اور سب بچوں
پکارتا آوازیں دیتا کہ آؤ کھیلیں اور ساری مائیں اس کی
کو صلواتیں سناتیں۔ اور اس کی ماں۔ وہ مجبور عورت انجان
جاتی جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ وہ خود نور دین سے بے زار
اور تھک چکی تھی۔ کرتی تو کیا کرتی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ جون کی تپتی ہوئی دوپہر تھی۔
گھنٹے کی جد و جہد کے بعد چھوٹے بابو کو سلا کر میں نے اپنی
آنکھیں بند کیں اور اطمینان کی ایک لمبی سانس کھینچی کہ کسی نے
دروازہ تھپتھپایا۔ رشید! رشید! میں نے چھوکرے کو آواز دی۔
لیکن وہ بھی شاید سو چکا تھا۔ میں خود اٹھی اور دوپٹہ لپیٹ کر اس
سنسان دوپہر میں آنے والے پر خار کھاتی دروازے پر آئی۔
"کون ہے" میں نے ذرا اکھائی سے پوچھا۔ کوئی جواب نہ پاکر میں
نے دروازے کا ایک پٹ کھولا اور باہر جھانکنے لگی۔ ساری
گلی سنسان پڑی تھی اور دُھوپ پگھلی چاندی کی طرح بڑی چمک
رہی تھی۔ غصے کے مارے میں کھول ہی تو گئی۔ ان گلی کے لونڈوں
نے دوپہر کا آرام حرام کر رکھا ہے۔ میں لوٹنے کو تھی کہ میں نے
نور دین کی دبی دبی ہنسی کی آواز سنی۔ دراصل دروازہ کھٹکھٹا کر
وہ پڑوس کی ڈیوڑھی میں چھپا میرے اُوپر ہنس رہا تھا۔ میں لپک
کر باہر نکلی میرے ہاتھ میں پنکھا تھا۔ میں نے اسی پنکھے سے نور دین
کی اچھی طرح مرمت کر دی۔ مجھے آج تک اس کا گڑگڑانا یاد ہے۔
نہیں عرشی کی ممی میں آئندہ سے نہیں کروں گا۔ نہیں عرشی کی ممی
نہیں"۔ مگر میں نے اسے پیٹ ڈالا اور ۴ بجے جب سب بچے کھیلنے
کے لئے باہر گلی میں جانے لگے تو میں نے حکم لگایا کہ اگر نور دین کے
ساتھ کھیلے تو یاد رکھو شام کا نکلنا بند کر دوں گی۔ عرشی، فیضی بجھ
سے گئے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے گلی میں جھانکا تو تینوں ایک
پتنگ کے کنّے باندھ رہے تھے۔ نور دین کی جونہی مجھ پر نظر

پڑی دوڑ کر اپنے دروازے میں چھپ گیا۔

میں خود ماں ہوں اپنے شریر بچوں کی ماں۔ لیکن نہ جانے مجھے نور دین سے اتنی نفرت کیسے ہو گئی کہ جب میں نے بچوں کو اسکول میں داخل کیا تو انھیں منع کر دیا کہ خبردار اگر نور دین کے ساتھ اسکول گئے یا آئے تو بابا سے پٹوا دوں گی۔ بچوں کے لئے ماں کی حیثیت ایک دوست کی ہوتی ہے۔ جب جی چاہا رُوٹھ گئے اور جب جی چاہا من گئے۔ مگر باپ بچوں کے لئے ہمیشہ ماسٹر کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ میرے بچے بھی سہم گئے۔ ایک دو دن وہ ڈرے ڈرے سے رہے۔ اس کے بعد ایک دن انھیں خدا حافظ کہہ کر میں نے دروازہ بند نہیں کیا بلکہ کھڑی دیکھتی رہی۔ میں نے دیکھا کہ سڑک پر پہنچتے ہی چھپا ہوا نور دین چوکڑیاں بھرتا ہوا نکلا اور میرے اُجلے چٹے، دھلے دھلائے بچوں کے ساتھ چلنے لگا۔ میں اس دن تو آپے سے باہر ہو گئی اور ان کے بابا سے کہہ کر سزا دلوا دی۔ دونوں دیوار کے ساتھ کھڑے منہ بسورتے رہے۔ اور میں نے کوئی پرواہ نہ کی۔

لیکن آخر وہ دن آ گیا جب نور دین مجھے پہلی دفعہ اچھا لگا اور میں دل ہی دل میں اپنے رویہ پر پشیمان رہی۔ پھر میں نے پلیٹ میں میٹھے چاول بھر کر اسے کھلائے جیسے وہ میرا اپنا بیٹا ہو۔ اگر وہ دن نہ آتا تو آج میں ہرگز یہ کہانی آپ کو نہ سناتی اور نہ میرا دل اتنا دکھتا جتنا کہ آج دُکھ رہا ہے۔ جیسے نور دین اسے اپنی ننھی سی مٹھی میں لئے مسل رہا ہو اور اس کی معصوم خوفزدہ نظریں تو میرے تصورات کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ وہ ایک لمحے کے لئے بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ اس دن بلا کی گرمی تھی اور بہشتی ہڑتال کئے ہوئے تھے۔ نوکر چھٹی پر تھا اور نل خشک پڑا تھا۔ اور میرے گھر میں پانی کی ایک بوند پینے کو نہ تھی۔ کورے کورے نئے مٹکے ہمارے حلق کی طرح خشک پڑے تھے۔ میرا گھر اس محلہ کا واحد خوشحال گھر ہے جہاں بہشتی پانی بھرتا ہے اور نوکر موجود ہے۔ ورنہ اس محلے کی ہر عورت اپنا کھانا خود پکاتی ہے اور ہر بچہ نور دین کی عمر کو پہنچتے ہی بالٹیاں اُٹھا کر نل پر لائن لگا دیتا ہے۔ اس دن بھی جب سب بچے نل پر جانے لگے تو عرشی مچل گئے کہ ممی ہمیں بھی برتن دیجئے، ہم بھی پانی لائیں گے۔ میرا جی ہرگز نہ چاہتا تھا کہ میرے ننھے ننھے بچے جن سے ایک جگ بھی بمشکل اُٹھتا تھا، نل پر لائن میں کھڑے ہوں اور سورج کی بے رحم کرنیں ان کے چہرے سنولا دیں۔ مگر مجبوری تھی۔ میں نے عرشی کو ایک جگ اور فیضی کو گلاس دے دیا اور خود دروازے میں کھڑی انھیں گلی سے غائب ہوتے ہوئے دیکھتی رہی۔ وہ زندگی میں پہلی دفعہ اپنے دوستوں کے ساتھ جگ لئے خوشی خوشی بھاگ رہے تھے۔ ان بچوں میں نور دین نہ تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے کچھ طمانیت سی ہوئی۔ میں کتنی دیر تک دروازے پر کھڑی اپنے ننھے بچوں کی واپسی کا انتظار کرتی رہی لیکن گلی چپ چاپ تھی جیسے سارے بچے نل کی قطار میں لگ گئے ہوں۔ کھڑے کھڑے جب پاؤں تھک گئے تو میں آکر کرسی پر بیٹھ گئی۔ اتنے میں کیا دیکھتی ہوں کہ عرشی فیضی دونوں مل کر تانبے کی ایک گھڑیا کو بمشکل گھسیٹ کر صحن پار کر رہے ہیں۔ میں جلدی سے اُٹھی اور گھڑیا خالی کر کے انھیں واپس کرتے ہوئے پوچھا یہ گھڑیا کس کی لے آئے؟ عرشی نے اپنی بڑی بڑی معصوم آنکھیں فیضی کی طرف گھمائیں مگر فیضی صاف نظریں چرا گیا۔ "بتاتے کیوں نہیں"۔ میں نے ڈپٹ کر پوچھا — "نور دین کی ہے ممی — عرشی کی موٹی موٹی آنکھیں گلابی ہو گئیں اور ان میں آنسو چھلک آئے۔ "بلانا نور دین کو ہمیں" میں نے ملائمت سے کہا۔ نور دین سہما ہوا سا آکر برآمدے میں کھڑا ہو گیا اور میں نے پہلی دفعہ اسے غور سے دیکھا۔ پھٹا ہوا خاکی نیکر۔ دھول اور کیچڑ میں اٹے ہوئے پاؤں "یہاں آؤ بیٹے"۔ اس نے یوں حیران نظروں سے مجھے دیکھا کہ میں کٹ گئی۔ پھر نعمت خانے سے میٹھا لا کر میں نے اسے کھلایا۔ جسے منٹوں میں ختم کر کے اس نے گھڑیا اُٹھائی۔ چلو عرشی فیضی، وہ پکارا اور تینوں باہر دوڑ گئے۔ اس دن سے نور دین بلا روک ٹوک گھر میں آنے جانے لگا۔

دن بھر کی اس اذیت ناک گرمی کے بعد شام کے پانچ بجے بادل گھر آئے۔ چاروں طرف اندھیرا پھیل گیا جیسے رات ہو گئی ہو

اور خوب ہی مینہ برسا۔ گلی میں پانی کا تالاب بن گیا۔ بچے دروازہ پر کھڑے ہو کر تماشہ دیکھنے لگے۔ یکایک فیضی چلّایا نور دین میری ناؤ بھی پانی میں ڈال دو۔ نور دین دوڑ کر آیا تو میں نے دیکھا وہ بالکل بھیگ گیا تھا۔ بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ اس کی ماں بھی دروازے پر کھڑی تھی۔

"تم اسے روکتی نہیں بھئی کہیں بیمار پڑ گیا تو پھر آپ ہی پریشان ہو گی" میں نے اس سے کہا — "کیا کروں۔ وہ میری مانتا ہی نہیں کب سے منع کر رہی ہوں۔" اس مجبور عورت نے جواب دیا۔ میں نے غور سے اس کی ماں کی طرف دیکھا۔ ویران آنکھیں، خشک بال اور میلے کپڑے۔ اور پانچ زرد زرد کمزور اور لاغر بچے۔ اور ایک کمانے والا پوسٹ مین ایک ایسا گھر جہاں بچوں پر کوئی خاص توجہ نہیں کی جاتی۔ نہ غذا پر اور نہ تربیت پہ وہ بن بلائے مہمانوں کی طرح آتے ہیں اور خود ہی پل بڑھ جاتے ہیں۔ ایک کمرے کے مختصر سے غلیظ گھر میں اور سڑکوں، گلیوں پر۔

دوسرے دن مطلع صاف ہو گیا اور شفاف نکھری نکھرائی، دھلی دھلائی روپہلی دھوپ آنگن میں پھیل گئی۔ جون کی چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں۔ جولائی کی دوسری یا تیسری تاریخ تھی۔ دوپہر میں میں نے کھچڑی پکوائی تھی۔ باسمتی چاول کی خوشبودار کھچڑی، پاپڑ اور اچار بچوں کو بہت پسند تھے۔ مگر کھچڑی پکنے میں اتنی دیر ہوئی کہ بچے اسکول چلے گئے۔ میں نے انھیں ہاف ٹائم میں آکر کھانا کھانے کی تاکید کی اور برآمدے میں ان کے لئے جھولا ڈالنے لگی — بچے جب ہاف ٹائم میں گھر آئے ...

...... تو جھولے کو دیکھ کر کھانا پینا سب بھول گئے۔ نور دین بھی ان کے ساتھ تھا۔ وہ نسبتاً صاف صاف سا تھا۔ اور اس نے نیکر اور پاجامہ پہن رکھا تھا۔ سب جھولا جھولنے لگے۔ ۵ منٹ بعد میرے پکارنے پر سب ہاتھ منہ دھو کر میز پر آ گئے۔ ماما انھیں کھانا دینے لگی۔ چھوٹا بابو بخار میں بھن رہا تھا میں اسے لئے اندر بیٹھی رہی۔ گھنٹی بجی تو میں نے کہا "ارے بچو ہاف ٹائم ختم ہونے والا ہے"۔ مگر بچے خوش گپیاں کرتے اور کھاتے رہے۔ "اب جاتے ہو کہ نہیں؟" میں نے دھمکایا اور بچے ہاتھ دھو دھو کر

بھاگے۔ ماما برتن سمیٹنے لگی۔ "یہ کھچڑی کس نے بچائی؟" — "نور دین نے آپاجی آپ کی آواز سنتے ہی وہ کھچڑی چھوڑ کر بھاگ گیا۔"

"ارے" مجھے بڑا افسوس ہوا۔ بچے نے کھانا چھوڑ دیا۔ ماسٹر ایک بید ہی تو مار لیتا۔ ایسی کیا جلدی تھی۔ میں نے سوچا شام میں اسے کھچڑی کھلا دوں گی۔ کھچڑی عموماً بچوں کو مرغوب ہوتی ہے۔

شام اپنی مصروفیتوں کے ساتھ آئی اور گزر گئی۔ مجھے نور دین کا دھیان نہیں رہا۔ دو دن اور گزر گئے۔ تیسرے دن میں نے عرشی سے پوچھا کہ نور دین آج کل نظر نہیں آتا۔ "بیمار پڑا ہے ممی" عرشی نے جواب دیا

چنانچہ غریب پوسٹ مین کے ۵ بچوں میں سے ایک بچہ ہفتہ بھر تک گھر کے علاج پر پڑا رہا بغیر کسی طبی امداد کے۔ پڑوسنوں نے جو دوائی چاہی گھول کر پلا دی — پھر اسے سول ہاسپٹل میں داخل کر دیا گیا۔ اسے ٹائیفائڈ ہو گیا تھا۔ "اللہ رحم کرے" — میرا نہ جانے کیوں دل بھر آیا۔ مغرب کا وقت یوں بھی بڑا اداس ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ساری پریشان روحیں آسمانوں پر چکر لگا رہی ہوں۔ اور فضا غمناک نغموں سے بھر گئی ہو۔

نور دین ایک ہفتے تک سول ہاسپٹل میں رہا۔ آٹھویں دن اس کا بڑا بھائی میرے پاس آیا کہ عرشی، فیضی کو میرے ساتھ ہاسپٹل بھیج دیجئے۔ نور دین کی حالت بہت خراب ہے۔ ہر وقت عرشی، فیضی کو یاد کرتا رہتا ہے۔

"اچھا بھئی ذرا ان کے بابا آفس سے آجائیں میں ان سے کہہ دوں گی وہ خود عرشی فیضی کو لے کر آجائیں گے"۔

شام میں سڑک پر ہی بچوں نے اپنے بابا کو گھیر لیا کہ ہمیں سول ہاسپٹل لے چلئے۔ مگر انھوں نے کہا آج بہت دیر ہو گئی ہے کل چلیں گے۔

دونوں بچوں کے منہ اتر گئے اور وہ چپ چاپ باہر جا کر نور دین کے بڑے بھائی سے نور دین کی باتیں کرنے لگے۔

دوسرے دن صبح بڑی اداس، سوگوار تھی۔ عجیب سا سناٹا ہر طرف چھایا تھا۔ آنے والی کسی بُری گھڑی نے

سارے محلے پر اپنے پر پھیلا دیئے تھے۔ میں نے چھوٹے بابو کے کپڑے بیسن میں ڈالے اور دھو کر پھیلا دیئے۔ عرشی فیضی ناشتے کا انتظار کر رہے تھے۔ میں بھی میز پر بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی کہ سناٹے میں رونے کی آوازوں نے وحشت پیدا کر دی — میں بے چین ہو کر اپنی جگہ سے اٹھی اور دونوں بچے باہر بھاگے۔

پھر منٹ بعد وہ اندر آ گئے —— "ممی، ممی۔ عرشی نے درد میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ نور دین بالکل چپ چاپ بستر میں لیٹا ہے اس کی امی، اس کے ابا، چچا سب رو رہے ہیں۔"

"ارے" میرے ہاتھ سے اخبار چھوٹ گیا — "ممی نور دین مر گیا۔" فیضی نے اپنے بچپن کے بھرپور تحمل کے ساتھ اطلاع دی۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ عرشی شاید اس کا منتظر تھا۔ وہ بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

میں نے زبردستی دونوں کو چائے پلائی۔ بچے بے دلی سے چائے پی کر باہر چلے گئے اور میں دروازے پر کھڑی ہو گئی۔ نور دین کا باپ میرے بچوں کو چمٹا کر رو رہا تھا "ہائے مرتے ہوئے بھی تم دونوں کو یاد کرتا رہا۔"

ان کے کمرے میں عورتوں کا مجمع تھا۔ گھر کے باہر دری بچھی تھی اور اس پر سفید لٹھا پڑا تھا جسے ایک بوڑھا آدمی پھاڑ رہا تھا۔ عرشی، فیضی حیران حیران نور دین کے باپ سے لگے کھڑے تھے —— سہمے ہوئے

تھوڑی دیر بعد ڈولا تیار ہو گیا۔ سفید کفن میں لپٹے ہوئے پیارے سانولے نور دین کو اس کے چچاؤں نے ڈولے میں لٹا دیا باپ سر پکڑے چوکھٹ پر بیٹھ گیا جیسے اس نے کوئی بہت بڑی بازی ہار دی ہو۔ ماں بے قابو ہو کر دروازے سے باہر نکل آئی۔ "میرے نور دین —— میرے بچے مجھے چھوڑ کر کہاں چلا" عرشی، فیضی اور میں دروازے میں یکساں اپنے ننھے ساتھی کے لئے سسکتے رہے۔

سبز چادر پر ایک آدمی نے پھولوں کی چادر پھیلا دی۔ "ارے لوگو میرے دولہا کو کہاں لے چلے" —— نور دین کی ماں تڑپی۔ لوگوں نے ڈولا اٹھایا اور چلنے لگے۔

عرشی، فیضی اور میں یکساں رو رہے تھے۔ وہ شریر لڑکا جو اپنے پیچھے ساری گلی سونی کر گیا۔ ہم تینوں کا دوست تھا۔ ہم تینوں کا عزیز تھا۔ ہم تینوں کا ساتھی تھا۔

آج بھی جب پھلجھڑی بکتی ہے۔ میرے حلق میں نوالے پھنستے ہیں۔ ———

ایک بیٹا پھلجھڑی کھائے بنا دور کہیں نکل گیا ہے

ثقافتی ورثہ

امیر کروڑ
مترجم - فارغ بخاری

پشتو زبان کی اوّلین نظم

(۱۳۹ء)

شیر ہوں کوئی میری طرح پہلواں
ہند میں سندھ میں کاشغر میں نہیں

شیر ہوں میرے عزم اور ہمت کے تیر
برق بن کر جلاتے ہیں اغیار کو
میں جو میداں میں اتروں تو ہرگز کوئی
روک سکتا نہیں میری یلغار کو
فخر سے جھومتا رقص کرتا رہا
فتح و نصرت مری دیکھکر آسماں
کانپے کوہ و دمن لرز اٹھی زمیں
ہو گیا جب مرا اسپ تازی رواں
میری تلوار پہنچی ہرات و جروم
غرج اور بامیاں کو مسخر کیا
میں نے سارے جہاں میں مچائی ہے دھوم
میں نے ہی روم اور شام کو سر کیا
میری ہیبت سے سہراب و رستم ڈرے
زندگی اُن غریبوں پہ بھاری ہوئی
جب ہری وال کے میں کنارے گیا
کپکپی میرے اعدا پہ طاری ہوئی
میری ضربت سے زرنج کا ہے رنگ سرخ
میری ہمت کے آگے عدو زرد ہے
خون ہے سامنے میرے ضیغم کا دل
رُو برو میرے فغفور و کے گرد ہے
ابرِ رحمت ہوں میں دوستوں کیلئے
دشمنوں کے لئے برق ہوں قہر ہوں
ہوں میں احباب کے واسطے انگبیں
اور حریفوں کے حق میں مگر زہر ہوں
ہر طرف آج ہے میرا سکہ رواں
کوہ و صحرا پہ فرمان جاری مرا
کون ہے جو مقابل میں آئے مرے
ضرب گہری مری زخم کاری مرا

شیر ہوں کوئی میری طرح پہلواں
ہند میں سندھ میں کاشغر میں نہیں

خواجہ غلام فرید

مترجم : رشید لاشاری

کافی

ہر دل کا دلدار یار میرا — خوبوں کا سردار یار میرا
کہیں مُلا کہیں آمر ناہی — کہیں منصور اور دار یار میرا
خود ہی چھپائے رازِ حقیقی — خود ہی کرے اظہار یار میرا
کہیں بلبل ہے کہیں صورتِ گل — کہیں برگ کہیں ہے خار یار میرا
کہیں سرخی کہیں نازو نزاکت — کہیں کاجل کہیں دھار یار میرا
کہیں ڈھولک کہیں تان ترانہ — کہیں صوفی کہیں سرشار یار میرا
کہیں عابد کہیں نفلِ دوگانہ — کہیں کیفی مے خوار یار میرا
کہیں عاشق کہیں درد و مصائب — کہیں دلبر غمخوار یار میرا

یار "فرید" نہیں پردے میں
خود پردہ ہے یار یار میرا

زیرنگرانی

آدم جی انڈسٹریز لمیٹڈ
کراچی

خبرنامہ

اطرافِ عالم

رباعیات امجد حیدرآبادی
حلقہ پور (آندھرا) بھارت کے ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولز ایس سدا سیو نے حضرت امجد حیدرآبادی مرحوم کی پچاس رباعیوں کا تلگو زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی کی جانب سے اس مجموعے کی اشاعت کا انتظام کیا جارہا ہے۔

بہادر شاہ ظفر کی تصانیف
بہادر شاہ ظفر نے اپنی زندگی کے آخری ایام رنگون میں گزارے تھے، ظاہر ہے کہ انھوں نے وہاں کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہوگا۔ ظفر کے اس زمانے کی تحریریں اب تک منظرِ عام پر نہیں آئی ہیں۔ ظفر اکیڈمی (بنارس) نے اب یہ کام اپنے ذمہ لے لیا ہے کہ وہ ہندوستان اور اس کے باہر کے ملکوں میں ظفر کی تخلیقات تلاش کرے گی۔

ساہتیہ اکیڈمی اور بنگالی ادیب
مغربی بنگال (بھارت) کے وزیراعلیٰ ڈاکٹر بی۔ چندر رائے نے کلکتہ میں ایک ثقافتی تقریب کے موقع پر ہندی کے حامیوں پر الزام لگایا ہے کہ وہ بنگالی ادیبوں سے تعصب برتتے ہیں۔ ڈاکٹر رائے نے بھارتیہ ساہتیہ اکیڈمی کے اس اقدام کے خلاف سخت احتجاج کیا ہے جس کے تحت اکیڈمی نے اس سال بنگالی ادیبوں کو ان کی کتابوں کوئی انعام نہیں دیا۔

لندن میں یوم اقبال
۱۸ رمئی ۱۹۶۱ء کو لندن میں پاکستانی سفارت خانے نے اسلامی ثقافتی مرکز میں یوم اقبال منایا۔ اس تقریب کی صدارت لندن میں مقیم ملایا کے ہائی کمشنر نے کی۔ اس موقع پر لندن یونیورسٹی کے پروفیسر حیدر نے اقبال کے فارسی کلام پر ایک مقالہ پڑھا جسے کافی پسند کیا گیا۔ اس کے بعد کچھ پاکستانی خواتین نے اقبال کی نظمیں سنائیں۔ حاضرین میں افغان سفیر اور ان کی بیگم بھی شامل تھیں۔

عمر خیام کی نئی رباعیات
برطانیہ میں ان دنوں عمر خیام کی رباعیات کا انتخاب فروخت ہو رہا ہے۔ اس کا ترجمہ عمر خیام کے اس مسودے سے لیا گیا ہے جو ۱۹۵۰ء میں ملا تھا۔ اس کے مترجم میجر جان بادن ہیں۔ رباعیات عمر خیام کے اس انتخاب میں بہت سی ایسی رباعیات بھی شامل ہیں۔ جو انیسویں صدی کے مترجم فٹز جیرالڈ کو بھی معلوم نہیں تھیں۔

لندن سے اُردو اخبار کا اجرا
۹ر اپریل ۱۹۶۱ء سے لندن میں اُردو کا پہلا ہفت روزہ اخبار "مشرق" شائع ہونا شروع ہوگیا ہے۔ یہ اُردو کا پہلا اخبار ہے جو دنیا کے اس سب سے بڑے اخباری مرکز سے شائع ہو رہا ہے۔ یہ اخبار لاکسٹن پبلشرز کے زیرِ انتظام جناب محمود ہاشمی کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔

جسیم الدین کی ایک کہانی کا عربی ترجمہ

بیروت کے ایک عربی روز نامہ "الزماں" نے اپنی ۱۴ اپریل ۱۹۶۱ء کی اشاعت میں پاکستان کے مشہور شاعر و مصنف جسیم الدین کی مختصر کہانی القیثارہ ([illegible]) شائع کی ہے جس کا ترجمہ سلا عفیش نامی ایک مشہور لبنانی خاتون مصنف نے کیا ہے۔

مجلس ادب سکھر کی ادبی سرگرمیاں

سکھر کے چند ممتاز ادیبوں اور شاعروں پر مشتمل مجلس ادب (سکھر) پچھلے کئی مہینوں سے سکھر کی ادبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہے۔ ادبی و علمی جلسوں کے علاوہ اس مجلس نے اُردو ادب کی ترویج و ترقی کے لئے ایک ٹھوس پروگرام بنایا ہے۔ اس پروگرام کے مطابق مجلس نے اردو کا ایک سہ ماہی رسالہ "جام جم" نکالنا شروع کیا ہے۔ اب تک اس کے دو شمارے شائع ہو چکے ہیں جن میں نہ صرف ہند و پاک کے مشاہیر ادبا و شعرا کی تخلیقات شامل ہیں: بلکہ سابق سندھ کے ابھرتے ہوئے فنکاروں کی تخلیقات شامل کر کے ان کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔

ادارہ تعمیر نو کے ادبی انعامات

ادارہ تعمیر نو نے ادیبوں کی تخلیقی سرگرمیاں بڑھانے کے لئے کئی معقول انعامات دینے کا اعلان کیا ہے —— بہترین مختصر افسانے اور بہترین یک بابی ڈرامے پر ایک ایک ہزار روپے کا انعام رکھا گیا ہے۔ دوسرا اور تیسرا انعام بالترتیب پانچ سو اور تین سو روپے ہوگا۔

بہترین اسکٹ پر پانچ سو روپے کا انعام ہوگا۔ دوسرا اور تیسرا انعام تین سو اور ڈیڑھ سو روپے ہوگا۔

مختصر افسانہ زیادہ سے زیادہ دو ہزار الفاظ پر مشتمل ہونا چاہئے اور ان کا مقصد درجہ پنجم سے درجہ دہم تک کے طلبا میں قومی وقار اور شعور پیدا کرنا ہو۔ کہانیوں کا مرکزی تصور طبع زاد خیال تاریخی واقعات پر مبنی ہو۔ غیر زبانوں کی کہانیوں سے ماخوذ کہانیاں انعام میں شامل نہیں کی جائیں گی۔

یک بابی ڈرامے جن کا مقصد بھی قومی وقار اور قومی شعور پیدا کرنا ہو اسٹیج پر آدھے گھنٹے کی میعاد کا ہونا چاہیئے اور مستند ادبی مذاق پر پورا اُترنا چاہیئے۔ ان کا مرکزی خیال مقصدیت لئے ہوئے ہو اور کسی نہ کسی طرح قومی زندگی سے وابستہ ہو۔ اور ان کے اسٹیج کرنے کی لاگت کم سے کم آنی چاہیئے۔

([illegible]) دس منٹ میں پڑھے جاسکیں اور ان کی اساس پاکستان کی سماجی الجھنوں اور برائیوں پر ہو۔ ان تینوں کی زبان اردو ہو جن کا ترجمہ مغربی پاکستان کی مقامی زبانوں میں آسانی سے کیا جا سکے۔

مقابلے کے ججوں کا فیصلہ آخری تسلیم کیا جائے گا۔ مختصر کہانیوں، یک بابی ڈراموں اور [illegible] کے وصول ہونے کی آخری تاریخیں (بالترتیب) یکم اگست، یکم ستمبر اور یکم اکتوبر ۱۹۶۱ء مقرر کی گئی ہیں

اردو کتابوں کا روسی ترجمہ

پچھلے دنوں روس میں اُردو کی چند اہم کتابوں کے روسی زبان میں ترجمے شائع ہوئے ہیں۔ سجاد ظہیر کے طویل افسانے "لندن کی ایک رات"، کرشن چندر کا ناول "کھلا آسمان" اور بچوں کے لئے پریم چند کا ایک مجموعہ "سانپ کا من" اس سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

اُردو مجلس حیدرآباد (دکن) ۱۹۶۱ء کا پروگرام

اس سال اُردو مجلس حیدرآباد (دکن) کی طرف سے عہد حاضر کی دو مشہور ادبی شخصیتوں کی پُرخلوص ادبی خدمات کا اعتراف کیا جائیگا۔ جن میں سے ایک نے نظم اور دوسرے نے نثر کے میدان

میں گراں قدر اور بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ ۱۳؍اور ۱۴؍مئی ۱۹۶۱ء کو یوم فراق گورکھپوری منایا جائے گا۔ اور ماہ دسمبر ۱۹۶۱ء کے آخری ہفتے میں نیاز فتحپوری کی ادبی خدمات کے اعتراف کے لئے اُردو ہال حمایت نگر میں ایک جلسہ منعقد ہوگا۔

حلقہ کراچی

یوم حسرت

۱۳؍مئی ۱۹۶۱ء کو کراچی کے تھیوسوفیکل ہال میں حسرت موہانی میموریل سوسائٹی کے زیر انتظام یوم حسرت منایا گیا جس میں مولانا حسرت موہانی کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ جناب ظہیر الحسنین لاری نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ مولانا حسرت نے قیام پاکستان میں اہم کردار ادا کیا ہے، عوام کو ان کے نقش قدم پر چلنا چاہیئے۔ حسرت میموریل سوسائٹی کے نام اس سلسلے میں - - - - - - - - - - -

متعدد پیغامات موصول ہوئے تھے۔ وزیر تعلیم جناب اختر حسین وزیر مواصلات مسٹر ایف۔ ایم۔ خان اور اقوام متحدہ میں پاکستان کے مستقل مندوب جناب سعید حسن کے پیغامات بھی پڑھ کر سنائے۔ تینوں پیغامات میں مولانا حسرت کو ایک محب وطن، بلند پایہ اور شیریں مقال شاعر و ادیب اور ایک ممتاز سیاستداں کہا گیا ہے جس ذہنی انقلاب کی داغ بیل سر سید احمد خاں اور ان کے رفقا ر نے ڈالی تھی۔ مولانا حسرت نے اس کے رگ و ریشہ میں حیات کی گرمی اور نطق و شعر کی بجلیاں بھر دیں۔ جس آزاد مملکت اور اسلامی برادری کا خواب علامہ اقبال تمام عمر دیکھتے رہے مولانا نے اسکے لئے جان کی بازی لگا دی۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال اور حسرت موہانی دونوں شاعروں کو جنگ آزادی کی پہلی صف میں گنا جاتا ہے۔

جلسے کے بعد ایک مشاعرہ بھی ہوا جس میں کراچی کے ممتاز شعراء نے اپنا کلام سنایا

تاریخ سندھ

سندھ ادبی بورڈ نے آٹھ جلدوں میں تاریخ سندھ شائع کرنے کا اعلان کیا ہے۔ یہ تاریخ اردو سندھی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوگی۔ اس کتاب کی پہلی جلد اُردو زبان میں ۲ حصوں میں چھپ چکی ہے۔ دو جلدیں انگریزی میں چھپ رہی ہیں اور باقی جلدیں زیر ترتیب ہیں۔

راک فیلر فاؤنڈیشن کا عطیہ

امریکہ کی راک فیلر فاؤنڈیشن نے انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ کراچی کو ۶۲ ہزار ڈالر کی گرانٹ دی ہے جو اسلامی موضوعات کی کتابوں، مونوگراف اور دوسری مطبوعات کی ترتیب اور مغربی زبانوں اور عربی اور فارسی میں اسلامی لٹریچر کی طباعت پر خرچ کی جائے گی۔

یوم ٹیگور

۱۴؍مئی کو کراچی میں وزیر خارجہ جناب منظور قادر نے برصغیر کے فلسفی شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کی تصویروں اور کتابوں کی نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ ٹیگور برصغیر کے ایک عظیم فرزند تھے انھوں نے کہا کہ صرف بھارت ہی نہیں بلکہ پورے برصغیر کے باشندوں کو ٹیگور پر فخر ہے۔ یہ ٹیگور ہی تھے جنھوں نے ملکی تمدن میں مغربی اقدار کو سمویا۔

کلاڈ کی جانب سے غیر ملکی زبانوں کا ترجمہ

ادارۂ مصنفین پاکستان نے فیصلہ کیا ہے کہ پاکستانی لٹریچر کو غیر ممالک میں مقبول بنانے کے لئے ممتاز ادیبوں کی کتابوں اور شاعروں کے کلام کا غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ کیا جائے۔ ادارے کی طرف سے سب سے پہلے چند منتخب انگریزی نظموں کا کسی غیر ملکی زبان میں ترجمہ شائع کیا جائے گا۔

انجمن ترقی اُردو کا اشاعتی پروگرام

انجمن ترقی اُردو پاکستان نے اس سال کا جو اشاعتی پروگرام بنایا ہے اس میں بعض نہایت اہم کتابیں شامل ہیں۔ ۳۰ جون سالانہ تک تقریباً پچیس کتابیں شائع ہو جائیں گی۔ اس وقت حسب ذیل چار کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

۱ - **جیتا جاگتا** - مشہور عربی کلاسیکل کتاب "حیّ بن یقظان" از ابن طفیل کا ترجمہ جو ڈاکٹر محمد یوسف صدر شعبہ عربی - کراچی یونیورسٹی نے کیا ہے۔

۲ - **داستان زبان اُردو** - از ڈاکٹر شوکت سبزواری اُردو زبان کے آغاز و ارتقا، اور عہد بہ عہد لسانی تبدیلیوں کے بارے میں یہ کتاب درجۂ اسناد رکھتی ہے۔

۳ - **نصرتی** از بابائے اُردو بیجاپور کے ملک الشعراء ملّا نصرتی کے حالات زندگی اور اس کے کلام پر تفصیلی تبصرہ۔

۴ - **اُردو تنقید کا ارتقاء** از ڈاکٹر عبادت بریلوی

حسب ذیل کتابیں چھپ رہی ہیں۔

۱ - اُردو تھیٹر از ڈاکٹر نامی - اس موضوع پر یہ پہلی جامع تالیف ہے۔

۲ - سرشار کی ناول نگاری - از ڈاکٹر عبداللطیف ادیب

۳ - داس کیپٹل - کارل مارکس کی یہ کتاب پہلی بار کسی مشرقی زبان میں منتقل ہو رہی ہے ترجمہ سید محمد تقی مدیر "جنگ" کراچی نے کیا ہے جو تین جلدوں پر مشتمل ہوگا پہلی جلد جون سنہ کے آخر میں شائع ہو جائے گی۔

۴ - قاموس الکتب (جلد اول) یہ مذاہب سے متعلق اُردو کتابوں کی وضاحتی فہرست ہے جو تقریباً دو ہزار صفحات پر مشتمل ہوگی۔

۵ - مہ و انجم (فلکیات) مترجمہ ثناء الحق صدیقی

۶ - قدیم اُردو از بابائے اُردو

۷ - خطبات گارساں دتاسی حصہ اول و دوم

۸ - مقالات گارساں دتاسی " "

۹ - خیالات عزیز عزیز مرزا مرحوم

۱۰ - تاریخ ملت عربی - حصہ دوم از حتّی مترجمہ مولوی ہاشمی فرید آبادی

۱۱ - فن شاعری - ارسطو مترجمہ عزیز احمد

۱۲ - انگریزی ادب کی تاریخ - ڈاکٹر احسن فاروقی

۱۳- مولانا حالی (حالات و افکار) از بابائے اُردو

۱۴- دیوانِ شاہی - علی عادل شاہ

سال کی بہترین فلمی کہانی پر انعام

اُردو کی ایک فلم "اور بھی غم ہیں" کو سال کی بہترین فلمی کہانی قرار دیا گیا ہے ۔ اس طرح سال کی بہترین فلمی کہانی کا صدارتی انعام فلم "اور بھی غم ہیں" کے کہانی نویس اور ہدایت کار جناب دانش دیروی کو ملا ہے۔

حلقہ مغربی پاکستان

پاک ایرانی ثقافتی انجمن

راولپنڈی میں منصوبہ بندی کمیشن کے نائب صدر جناب ممتاز حسن نے پاک ایرانی ثقافتی انجمن کے دفتر کی نئی عمارت اور دار المطالعہ کا افتتاح کیا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ فارسی زبان نے ایرانی اور پاکستان کے لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں بڑا اہم کام کیا ہے۔ آخر میں ممتاز حسن صاحب نے پاکستان کے تعلیم یافتہ لوگوں سے فارسی زبان سیکھنے اور اسے ترقی دینے کی اپیل کی۔

علامہ اقبال کا مکان قومی یادگار

لاہور میں میکلوڈ روڈ پر واقع علامہ اقبال کی رہائش کو قومی یادگار قرار دے دیا گیا ہے۔ اس قومی یادگار میں مرحوم کی ذاتی چیزیں اور قلمی مسودات محفوظ رکھی جائیں گی تاکہ بیرونی ممالک کے سیاح اور پاکستانی عوام حسب خواہش دیکھ سکیں۔

فلمی شاعر اور صدر کا انعام

اُردو کے ایک مشہور شاعر جو ایک فلمی شاعر کی حیثیت سے بھی بہت مشہور ہیں نے ادارۂ مصنفین پاکستان پر زور دیا ہے کہ وہ مرکزی حکومت سے مطالبہ کرے کہ صدر کی جانب سے دئیے جانے والے انعامات کی فہرست میں بہترین فلمی گانے لکھنے والے کے لئے بھی ایک انعام مخصوص کیا جائے۔ انھوں نے یہ بات اس بنیاد پر کہی کہ فلمی مشاعر موسیقی کے ڈائرکٹر اور گانے والے کے درمیان ایک اہم حصہ ادا کرتا ہے۔ انھوں نے اس بات پر اظہار تعجب کیا کہ موسیقی کے ڈائرکٹر اور موسیقار تو صدر کے انعامات کے مستحق ٹھہریں لیکن ان کے درمیان کی ایک اہم کڑی کو نظر انداز کر دیا جائے

پاکستان میں عربی رسم الخط

بھارتی ماہر تعلیم خواجہ غلام السیدین پچھلے دنوں مختصر دورے پر پاکستان تشریف لائے تھے۔ لاہور میں اپنے قیام کے دوران میں انھوں نے عربی رسم الخط کے بارے میں اپنے . . . .

خیالات کا اظہار کیا۔ ان کے خیال میں پاکستان کے دونوں صوبوں کے درمیان لسانی رابطہ پیدا کرنے کے لئے ایک مشترکہ رسم الخط کی ضرورت ہے۔ چونکہ عربی رسم الخط کئی زبانوں میں مشترک ہے لہٰذا اگر پاکستان میں اس رسم الخط کو اختیار کر لیا جائے تو احساس قومیت اور باہمی مفاہمت کو تقویت پہنچے گی۔ واضح رہے کہ عربی رسم الخط اختیار کرنے کی تجویز پاکستان کے لئے کوئی نئی نہیں ہے کئی سال پیشتر اسی قسم کے خیالات کا اظہار مرحوم آغا خان نے بھی کیا تھا جس کے خلاف ملک کے تقریباً تمام چھوٹے بڑے اُدبی و علمی حلقوں نے بڑی شدت سے صدائے احتجاج بلند کی تھی۔ آخرکار عربی رسم الخط کی یہ تجویز مسترد کر دی گئی تھی۔

خواتین کی رفتار مطالعہ کتب

انجمن اقوام متحدہ (شعبہ علم و حکمت اور تہذیب و تمدن) اکیڈمی پنجاب) کے اعداد و شمار کے م
مغربی پاکستان میں ادھیڑ عمر کی ایک خاتون کی رفتار مطالعہ ایک ضخیم ناول یومیہ ہے۔ خوشحال گھرا
کی خواتین کتابیں خریدنے کے بجائے دوسروں سے مانگ کر پڑھنے کو ترجیح دیتی ہیں۔ چند امیر گھرا
ایسے بھی ہیں جو لٹریچر کو فرنیچر کی طرح گھر کی طرح زیبائش و زینت کی خاطر خریدتے ہیں۔ اکا د م
پنجاب کے سکریٹری مولانا صلاح الدین احمد نے اس جائزہ کے بارے میں کہا کہ یہ جائزہ اپریل ۵۹ء
میں لیا گیا تھا، نتیجہ پر مبنی رپورٹ ساٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ اقوام متحدہ نے اس کا خلاصہ اب
چار صفحات میں شائع کیا ہے جائزہ کی رو سے خواتین مطالعہ کے لئے اپنی گرہ سے کچھ خرچ کر
نہیں چاہتیں اُنکے خیال میں زائد مطالعہ صرف مستعار کتابوں سے ممکن ہے۔ اگر خواتین نے کتابیں
خود خرید کر پڑھنا شروع کر دیں تو ان کی اشاعت دس گنا بڑھ جائے گی۔

اُردو کو ذریعہ تعلیم بنانیکی تجویز

مغربی پاکستان کی اُردو اکیڈمی کی تقریب میں سپریم کورٹ کے مسٹر جسٹس ایس۔ اے
رحمٰن نے بھی تقریر کی۔ ان کے خیال میں طلبا کی ذہنی نشو و نما میں نمایاں ترقی صرف اسی صور
میں ہو سکتی ہے جبکہ انھیں اردو کے ذریعہ تعلیم دی جائے۔ اس موقع پر گورنمنٹ کالج لاہور کے
پروفیسر ایس۔ اے۔ قادر نے "منطقی اثباتیت" کے موضوع پر نہایت شستہ اردو میں لکچر
اس کے بارے میں جسٹس رحمٰن نے کہا کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُردو ذریعہ تعلیم بن سکتی
اساتذہ کو اپنے اندر اعتماد پیدا کرنا چاہیئے کہ وہ اردو میں آسانی سے تعلیم دے سکتے ہیں مغ
پاکستان کی اُردو اکیڈمی نے فنی اور سائنسی موضوع پر اُردو میں تقریروں کا ایک سلسلہ شرو
کر رکھا ہے تاکہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ مشکل سے مشکل اور فنی مضامین کی تعلیم اُردو میں دی جا
ہے۔ واضح رہے کہ اُردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا تجربہ کوئی نیا نہیں ہے۔ ۱۹۴۷ء کی آزادی سے پ
عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں تمام علوم و فنون کی تعلیم اُردو میں دی جاتی تھی۔ آزادی کے
کراچی کے اُردو کالج کی مثال ہمارے سامنے ہے جہاں نہ صرف فنون بلکہ سائنس، کامرس اور
ٹیکنیکل مضامین تک طلبا کو اُردو میں پڑھائے جاتے ہیں۔ اور جہاں کے طلبا، پاکستان
دوسرے کالجوں کے مقابلے میں (جہاں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے) بڑی حد تک امتیازی نمبر حا
کرکے امتحانات میں کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

پشاور میں رحمٰن بابا کا دو روزہ جشن

پاکستان رائٹرز گلڈ کے پشتو سب ریجن پشاور نے ۷۔۸ مئی کو بزم ثقافت اور ابا
آرٹ سوسائٹی کے اشتراک سے رحمان بابا کے مزار پر دو روزہ جشن منایا۔ ۷ مئی کو صبح رحمٰن
کے مزار پر فاتحہ خوانی کے بعد مشاعرہ کی پہلی نشست منعقد ہوئی جس کی صدارت پشتو اکیڈمی
ڈائریکٹر مولینا عبدالقادر صاحب نے کی اور مشاعرہ کا افتتاح پاکستان رائٹرز گلڈ کی مرکزی مجلس
رکن امیر حمزہ شنواری کے مقالے سے ہوا۔ مشاعرہ میں پشتو کے ایک سو چالیس شعرا نے حصہ لیا۔ اور
مقامی شاعروں نے بھی رحمٰن بابا کو خراج عقیدت پیش کیا۔ معاشرہ میں رحمٰن بابا کی زندگی اور

کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر پشتو میں مقالات بھی پڑھے گئے جنہیں لوگوں نے بڑی دلچسپی سے سُنا۔
مشاعرہ کا سارا اہتمام گلڈ کی مقامی شاخ نے کیا تھا البتہ بزم ثقافت اور اباسین آرٹ سوسائٹی کا اس تقریب کے اخراجات میں نمایاں حصہ تھا۔ پشتو کے شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ کراچی سے لیفٹننٹ کمانڈر انور لاہور ۔ سے ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ ڈاکٹر عبد السلام خورشید رکن صوبائی عاملہ شامل ہوئے۔ ملتان سے ریاض انور نے شرکت کی ۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے مشاعرہ کی پہلی نشست میں اُردو میں رحمان بابا پر مختصر اپرمغز مقالہ پڑھا اور ریاض انور نے غزل سُنائی۔

پنڈال کے ایک طرف نہایت ہی مختصر پیمانے پر صنعتی نمائش کا اہتمام تھا ایک سٹال میں پشتو اکیڈمی اور دار التصنیف پشاور نے مطبوعات اور نایاب قلمی نسخوں کی نمائش کا اہتمام کیا ہوا تھا۔
رحمن بابا کے جشن کا یہ افادی پہلو نمایاں تھا کہ اس سے اُردو اور پشتو کے اُدیبوں اور شاعروں نے ایک دوسرے کو قریب سے دیکھا اور سُنا۔

۸ رمئی کو امیر حمزہ شنواری نے مہمانوں کو پشتو شاخ کے اراکین کے ساتھ درۂ خیبر کی سیر کرائی اور لنڈی کوتل میں اپنے مہمان خانے میں پر تکلف دعوت دی۔ اس موقعہ پر ڈاکٹر عبادت بریلوی کی صدارت میں پشتو اور اُردو کا ملا جلا مشاعرہ بھی ہوا جس میں پشتو شعرا کے علاوہ اُردو شاعروں میں رضا ہمدانی اور ریاض انور نے اپنا کلام سنایا۔

لیفٹننٹ کمانڈر انور رحمان بابا کی برسی سے متعلق ایک پورتاژ لکھ رہے ہیں جو "ہم قلم" جولائی کے شمارہ میں شائع ہوگی

اقبال کے فلسفہ پر ریسرچ

۲۱ رمئی ۱۹۶۱ء کو راولپنڈی کینٹ کے پبلک سکول میں یوم اقبال کی تقریبات منعقد ہوئیں اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے وزیر اطلاعات نے ماہرین تعلیم پر زور دیا کہ وہ علامہ اقبال کے فلسفہ پر ریسرچ کریں۔ انھوں نے کہا کہ حکومت پاکستان اقبال اکیڈمی کو ہر سال ریسرچ کے لئے خاص رقم دیتی ہے لیکن محض روپے سے یہ کام نہیں ہو سکتا اس کے لئے اہل علم کے تعاون کی بھی ضرورت ہے۔

حلقہ مشرقی پاکستان

بنگالی یونیورسٹی

پچھلے دنوں برصغیر کے مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر شہید اللہ نے چاٹگام کے ممتاز شہریوں کے ایک بڑے جلسے میں بنگالی یونیورسٹی کے قیام کا منصوبہ پیش کیا۔ حاضرین نے بنگالی یونیورسٹی کے قیام کے ذرائع پر بھی غور کیا ——۔ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے پروفیسر احمد حسین کی قیادت میں ایک کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ معلوم ہوا ہے کہ وزیر داخلہ جناب ذاکر حسین اور وزیر صنعت جناب ابوالقاسم کو اس مجوزہ یونیورسٹی کے خاص سرپرستوں میں شامل کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ اُردو یونیورسٹی کے قیام کے لئے ایک ایسی ہی منصوبہ بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبد الحق نے پیش کیا تھا جس کی تکمیل اب تک نہ ہو سکی۔

ریجنل سکریٹری حلقہ مغربی پاکستان بنگال میں

ڈھاکہ میں انجمن ادب کے زیر اہتمام پریس کلب میں پروفیسر وقار عظیم ریجنل سکریٹری حلقہ مغربی پاکستان کے اعزاز میں ایک دعوت استقبالیہ دی گئی۔ وقار صاحب نے اس موقع پر تعلیمی اصلاحات کے کمیشن کی سفارشات کے متعلق حکومت پاکستان کی ایک اہم تجویز کا انکشاف کیا انھوں نے بتایا کہ حکومت قومی زبانوں اُردو اور بنگالی کی ترقی و ترویج کے لئے دو علیحدہ علیحدہ بورڈ قائم کرنے کے بارے میں سرگرمی سے غور کر رہی ہے۔ یہ بورڈ سرکاری زبانوں کے فروغ، اشاعت اور ترویج کے لئے ایک بہتر اور سازگار ماحول پیدا کریں گے ان بورڈوں کا ایک کام یہ بھی ہوگا کہ وہ اردو زبان اور ادب کی بنگالی میں اور بنگالی زبان و ادب کی اُردو میں مستند تاریخیں مرتب کریں۔ اس طرح دونوں قومی زبانوں میں ہم آہنگی پیدا ہوگی۔ وقار صاحب نے اپنی تقریر میں خاص طور پر اس بات پر زور دیا کہ اگر علاقائی زبانوں کو بھی پھلنے پھولنے اور ترقی دینے کے مواقع فراہم کئے جائیں تو ایسا کرنے سے کسی طرح بھی قومی زبانوں کی ترویج و ترقی کی راہ میں مشکلات پیش نہیں آئیں گی بلکہ ان سے اور مدد ملے گی۔ استقبالیہ کے بعد ادبی مباحثہ اور مشاعرہ ہوا جس میں ممتاز مقامی شعراء نے حصہ لیا

نذرُ الاسلام کی ۶۲ ویں سالگرہ

۲۴ مئی ۱۹۶۱ء کو اقبال نذر الاسلام سوسائٹی نے اسلامک اکیڈمی ڈھاکہ میں قاضی نذر الاسلام منانے کا اعلان کیا ہے اس سلسلے میں سوسائٹی کا موجودہ صدر نے تمام شاخوں کو ہدایات جاری کر دی ہیں کہ ۲۴ مئی کو ان کے زیر اہتمام بھی سالگرہ کی تقاریب منعقد کی جائیں امید ہے کہ پچھلے سالوں کی طرح اس سال بھی قاضی نذر الاسلام کی سالگرہ کی تقاریب کافی کامیاب رہیں گی۔

مُصنّفین کی تخلیقی سرگرمیاں

کتابیں جو حال میں چھپی ہیں یا زیرِ طبع / زیرِ تصنیف ہیں

انور

سورج بھی تماشائی

(افسانوں کا تیسرا مجموعہ)

(زیرِ طبع)

صبا اکبرآبادی

مندر کے پھول

(غزلوں کا مجموعہ) (زیرِ ترتیب)

چراغِ بہار

(آزادی کے بعد کی غزلوں کا مجموعہ)

(زیرِ ترتیب)

تضمین

(دیوانِ غالب کی مکمل تضمین)

(زیرِ طبع)

مرثیہ

(آٹھ مرثیوں کا مجموعہ)

(زیرِ طبع)

سلطان جمیل نسیم

پیاسا سمندر

(افسانوں کا مجموعہ)

عبدالعزیز خالد

دکانِ شیشہ گر

زہرِ داغِ دل کے بعد سات منظوم ڈراموں کا دوسرا مجموعہ

ضخامت ۲۱۸ صفحے قیمت تین روپے

ناشر: میسرز بک لینڈ پرنٹرز پبلشرز بندر روڈ کراچی

ارتضیٰ عزمی

شعلۂ فکر

(غزلوں، نظموں اور دوہوں کا مجموعہ)

(زیرِ ترتیب)

سید ابو تمیم

اُردوئے مصفّٰا

(بابائے اُردو کے خطوط کا ایک مجموعہ)

قیمت: ۷/۵۰

پتہ:- ۱۲- اُردو بازار - لاہور

جوگندر پال

دھرتی کا کال

(افسانوں کا مجموعہ)

قیمت ۲/۵۰

ناشر - حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی ۶

قمر تسکین

اولیائے کراچی

(تحقیق و سوانح)

قیمت: ۲/۵۰

دخترالجزائر

(اسلامی تاریخی ناول)

قیمت: ۳ روپے

بنتِ قریش

(اسلامی تاریخی ناول دوسرا ایڈیشن)

قیمت: ۶ روپے

تاریخ کراچی

(تاریخ)

قیمت ۱۰ روپے (زیرِ طبع)

ناشر: اشاعت کدہ - قاسم آباد - لالو کھیت، کراچی ۱۹

فہمیدہ اختر

اپنے دیس میں

(افسانوں کا مجموعہ)

قیمت ۴/۵۰

ناشر: یونیورسٹی بک ایجنسی - پشاور

انور عنایت اللہ

قندیلِ غم

(ناولٹ) (زیر طبع)

قیمت: ۱/۵۰

ناشر خیاباں پبلشرز۔ الہ آباد (یو۔پی)

پھولوں کے قافلے

(ناول) (زیر تصنیف)

احمد ریاض (مرحوم)

موجِ خوں

(مجموعہ کلام)

قیمت ۵ روپے

ناشر: مجلس یادگار ریاض۔ کچہری بازار لائل پور

ایم۔ اے شمیم (علیگ)

روحِ غالب

(تحقیق و تنقید)

قیمت: ۱ روپے

ناشر: یونیورسٹی بک ڈپو۔ راولپنڈی

ضیاء الدین احمد برنی

عظمتِ رفتہ

(تاثرات) (زیر طبع)

اظہار روش بدایونی

نمکین مٹھائی

(بچوں کیلئے مزاحیہ نظموں کا مجموعہ)

قیمت ۱ روپیہ

ناشر

ادبی ایجوکیشنل بورڈ۔ اے بی سینیا لائن کراچی

سید قمر ہاشمی

کتاب تجارت

تجارتی مراسلت پر طلباء اور اداروں کے لئے امدادی کتاب

(زیر طبع)

ڈاکٹر سید عبد اللہ

سرسید خان

اور ان کے نامور رفقاء کی اُردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ

قیمت: ۶ روپے

ناشر

مکتبۂ کارواں۔ کچہری روڈ۔ لاہور

باقی صدیقی

زخمِ بہار

(مجموعہ کلام) قیمت: ۲/۵۰

مکتبۂ کارواں۔ کچہری روڈ۔ لاہور

ظفر علی خاں

حبسیات

(مجموعہ کلام)

قیمت: ۲ روپے

مکتبۂ کارواں، کچہری روڈ۔ لاہور

خلیل الرحمٰن اعظمی

کاغذی پیراہن

(پہلا مجموعہ کلام)

قیمت: ۲/۷۵ روپے

فکر و فن

(تنقیدی مضامین کا مجموعہ)

قیمت ۳/۰۰ روپے

آزاد کتاب گھر۔ کلاں محل۔ دہلی

نوائے ظفر

بہادر شاہ ظفر کے کلام پر تنقید اور انتخاب

قیمت ۳/۲۵ روپے

مقدمۂ کلام آتش

(تنقید و تحقیق)

قیمت: ۳/۷۵ روپے

اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک

(تنقید و تحقیق) (زیر طبع)

انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ (یو۔پی)

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر ... طفیل احمد جمالی ... مطبع انٹرنیشنل پریس کراچی

ایک اہم اعلان

ادارہ "ہم قلم" کو ہر ماہ بعض حضرات کی جانب سے پرچہ نہ ملنے کی شکایات موصول ہوتی ہیں۔ ادارہ ایسے تمام حضرات سے درخواست کرتا ہے کہ وہ ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک "ہم قلم" کا انتظار فرمائیں۔ اس تاریخ کے بعد ادارہ "ہم قلم" کو پرچہ نہ ملنے کی اطلاع دیں تاکہ اس سلسلے میں متعلقہ ڈاک خانوں سے مناسب کاروائی کے لئے رجوع کیا جاسکے۔

(ادارہ)

نئے لکھنے والوں سے

- جواب طلب امُور کے لئے ہمیشہ لفافہ کارڈ یا ٹکٹ ارسال فرمایئے۔
- مرسلہ مضامین نظم و نثر کی ایک نقل اپنے پاس ضرور محفوظ رکھئے، ناقابل اشاعت چیزیں ضائع کردی جاتی ہیں
- تراجم پر اصل مصنف اور زبان کا نام ضرور لکھئے
- تخلیقات ایڈیٹر کی ترتیب کے مطابق اپنے نمبر پر شائع کی جاتی ہیں تخلیقات کی فوری اشاعت پر اصرار نہ فرمائیے

ادارہ

یہ اخبار جو آپ پڑھ رہے ہیں
... آپکو اس بیداری کے دور میں ترقی سے آگاہ کرتا ہے۔
ری قوم میں یکجہتی پیدا کر کے خوشحالی کی راہ پر اہم قدم رکھتا ہے۔
انقلابی اصلاحات کی اہمیت سے واقف رہنے کی خواہش
سے اخباروں اور جریدوں کی مانگ روز بروز
ڑھتی جارہی ہے۔ اس اہم ضرورت کو پورا کرنے کیلئے پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن
کا کھلنا (مشرقی پاکستان) میں اخباری کاغذ کا عظیم کارخانہ روزانہ
ا ٹن اخباری کاغذ اور تیس ٹن میکینیکل کاغذ بنا رہا ہے۔ آئندہ
ضروریات کے لئے اس کارخانے کی استعداد میں مناسب گنجائش رکھی گئی ہے۔
کھلنا کا اخباری کاغذ آپ کے فکر و عمل کو سنوارتا ہے۔
کھلنا نیوز پرنٹ مل لمیٹڈ
مینیجنگ ایجنٹس:۔ پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن
KURIMA/406

نئے اراکین جو ۳۱ جنوری سنہ ۱۹۶۱ء کو ادارۂ مصنفین پاکستان میں شامل کئے گئے

(حلقہ کراچی)

نام	پتہ	اصنافِ ادب
الیاس سیتاپوری	معرفت شفاعت احمد، ایل، بلاک نمبر۱، کوارٹر نمبر ۱۶۳۶ الوکھیت کراچی	مختصر کہانی، ناولٹ، ڈرامہ
اختر رضوی	۲۰۰، مس فاطمہ جناح کالونی، جمشید روڈ، کراچی	شاعری، کہانی، مقالہ
بیگم خورشید حنیفا	۶-سہائی بلڈنگ، پریڈی اسٹریٹ صدر، کراچی	شاعری، کہانی، ناول
بشیر احمد فاروق	چیب جان ایلفنسٹن اسٹریٹ، کراچی	شاعری
بہزاد لکھنوی	۹۴۳، پاکستان کوارٹرز، کراچی	شاعری
جی الآنہ	البرکت، کارنر لارنس روڈ و بریٹو روڈ کراچی	شاعری، سوانح نگاری
جمیل ایوبی	۴۳/ ۱/اے/۱، ناظم آباد کراچی	شاعری، مختصر کہانی
حاذق الخیری	"خیری اینڈ کو" ایڈوکیٹ، ڈنڈاس اسٹریٹ، بالمقابل وکٹوریا روڈ کراچی۳	افسانہ، ناول
حسنین کاظمی	۳۴۱، پاکستان کوارٹرز - لارنس روڈ کراچی -۳	شاعری، کہانی، ناول، مقالہ تنقید
خواجہ حمید الدین شاہد	(۲۲۵۴) پیر الٰہی بخش کالونی، کراچی -۵	شاعری، مقالہ نگاری، تنقید
ڈاکٹر ایچ، ایم سید شاہلی	۸۲، بنگلور ٹاؤن، ڈرگ روڈ، کراچی -۸	مقالہ نگاری، تنقید
راغب مرادآبادی	۱۳- ۱۲۵/۴، مارٹن روڈ کراچی -۵	شاعری، مقالہ تنقید
ریاض رؤفی	۱۲/بی، عیسیٰ جی ابراہیم جی نیو بلڈنگ، نرائن اسٹریٹ پاکستان چوک، کراچی	شاعری، افسانہ، ناول
رئیس امروہوی	معرفت روزنامہ شیراز - ۹ نیو کلاتھ مارکیٹ بندر روڈ - کراچی	شاعری، ناول، مقالہ، ڈرامہ تنقید
زینب خاتون (مسز عبد القادر)	معرفت بیگم منظور الحق ۴/- ۱۱/ ۱۶ اسٹریٹ نمبر ۱، گورنمنٹ ہاؤسنگ سوسائٹی، کراچی -۲۹	افسانہ، ناول
سلطانہ رحمٰن	ح/۳۱ - گارڈن روڈ، کراچی	شاعری، کہانی، مقالہ
سید آفاق احمد	بیورو آف نیشنل ری کنسٹرکشن ۲۳، وکٹوریا روڈ (حال - راولپنڈی)	مقالہ، افسانہ
سید قمر ہاشمی	۹۱۶ عزیز آباد، بلاک ۲ - فیڈرل بی - ایریا - کراچی ۱۹	شاعری، کہانی
شاعر لکھنوی	ٹھاکر داس تلسی داس بلڈنگ، بلاک نمبر سی، فلیٹ نمبر ۲ اے، ایم روڈ، نمبر ۴، فیرئر روڈ - کراچی	شاعری
شفیق حسن	۴/۱۰۹۱ ڈرگ کالونی - کراچی	افسانہ، ناول، مقالہ، ڈرامہ تنقید

نام	پتہ	اصنافِ ادب
شمیم جاوید	۱۱۷۷، پیر الٰہی بخش کالونی ۔ کراچی ۵	شاعری
شہلا شبلی	۲۵ پی، آئی، ڈی، سی فلیٹس باتھ آئی لینڈ، کراچی	مختصر کہانی
ظریف دہلوی	مکان نمبر ۳۹۰، مین روڈ، نزد بس اسٹینڈ، پیر الٰہی بخش کالونی کراچی	شاعری، مختصر کہانی
عبدالغنی شمس	۳/۲ بہار کالونی، کلیٹن روڈ، کراچی	شاعری، کہانی، مقالہ، ڈرامہ
عبداللہ قدسی	۴، کریسنٹ کورٹ، وکٹوریا روڈ کراچی ۳	ڈرامہ، ناول
عرش تیموری	روزنامہ "جنگ" برنس روڈ کراچی	افسانہ، مقالہ، ڈرامہ، تنقید
عنبر چغتائی	۳۶۸، اسلام گنج، گارڈن ویسٹ، کراچی ۵	شاعری، کہانی، مقالہ، تنقید
غازی صلاح الدین	اے/۶۷، خداداد کالونی، کراچی ۵	افسانہ
فرمان فتحپوری	باؤنڈ کورٹ، ملیر سٹی، کراچی ۲۳	مقالہ، تنقید
فراز خیر آبادی (فرید احمد فاروقی)	معرفت ۹/۱ مسلم کوارٹرز گذری باغ کالونی کراچی ۵	شاعری
فضل احمد صدیقی	۱۲۲ - ۱۲/۵، فاطمہ جناح کالونی بالمقابل جمشید روڈ، کراچی	شاعری، مقالہ نگاری، ڈرامہ نگاری
قمر تمکین	اشاعت کدہ ۱/۶ قاسم آباد ۔ لالہ زار کراچی ۱۹	افسانہ، ناول، مقالہ، تنقید
مبذول الحسین مضراب	بنگالی نیوز یونٹ، سنٹرل نیوز آرگنائزیشن ریڈیو پاکستان ۔ کراچی	مختصر کہانی، مقالہ نگاری تنقید
مجیب الرحمٰن خان	پروفیسر آف بنگالی، اسلامیہ کالج کراچی	شاعری، مقالہ نگاری، ڈرامہ نگاری تنقید
محمد عمر میمن	میمن منزل، ۲۲۱، بی/ بہادر آباد کراچی ۵	افسانہ
محمد عبدالغنی نیازی	معرفت ڈاکٹر ایم، اے سلام نیازی میونسپل ڈسپنسری صدر کراچی ۳	شاعری، افسانہ، مقالہ، تنقید
محمد احسن فاروقی	۴/۲، بلاک ۲ سی، ناظم آباد کراچی	ناول، تنقید
محمد زکریا مائل	جی ۹ ۔ کوارٹر نمبر ۱۱، فیڈرل کیپٹل ایریا ۔ کراچی ۱۹	مقالہ نگاری، کہانی ۔ ڈرامہ نگاری
مرزا صادق مدہوش	۵۱، ایف، جہانگیر روڈ، ویسٹ، نزد تین ہٹی، کراچی	شاعری
منظر ایوبی	کوارٹر نمبر ۸/د ۔ ۲ فیڈرل کیپٹل ایریا، کراچی ۱۹	شاعری، کہانی، مقالہ نگاری، ڈرامہ، تنقید
منظر صدیقی سیمابی	8/65 گلی ۲ مقابل چھوٹی مسجد دہلی کالونی گزری روڈ ۔ کراچی	شاعری، تنقید
مہدی علی سلجوق	پوسٹ بکس نمبر ۳۶۸، کراچی ۵	شاعری، مختصر کہانی، ناول نگاری، مقالہ نگاری، تنقید
ناصر گنگوہی	۱۰۹۸، پیر الٰہی بخش کالونی، کراچی	شاعری
نعیم البصیر	ایف ۳/۱۲ فیڈرل کیپٹل ایریا ۔ کراچی ۱۹	شاعری، کہانی، مقالہ نگاری، تنقید
یونس رمزی	۳۹۳، پاکستان کوارٹرز، لارنس روڈ ۔ کراچی	افسانہ، ناول

نوٹ: (مشرقی اور مغربی پاکستان کے حلقوں کی فہرستیں بمعہ صحیح نام آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیے)
(مندرجہ بالا فہرست حروفِ تہجی کے مطابق ہے)

T.P.65/596
united

Regd. S. No. 2410 Monthly HAM-QALAM Karachi June 1961

جولائی سنہ ۱۹۶۱ء

پاکستان رائٹرز گلڈ

دائرۂ مصنفین پاکستان حلقۂ کراچی

جشن فرید کے مذاکرے میں انتظار حسین تقریر کر رہے ہیں۔ صدر نشین جناب فیض ہیں

جشن فرید ملتان کے ایک اجلاس میں حاضرین کا ایک منظر

ہم قلم میں شائع ہونیوالی ہر تحریر کا معاوضہ دیا جاتا ہے
ان تحریروں کے حقوق بحق مصنفین محفوظ رہتے ہیں

ماہنامہ

ہم قلم

ادارہ مصنّفین پاکستان، حلقہ کراچی

(پاکستان رائٹرز گلڈ کا ترجمان)

جلد ۱ — شمارہ ۱۱

جولائی سنہ ۱۹۶۱ء

فی پرچہ دس آنے (۶۲ نئے پیسے)
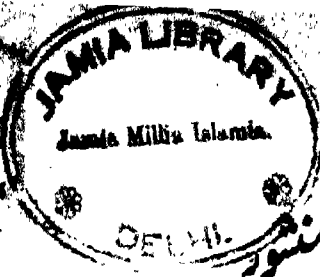
سالانہ چھ روپے

(اراکین ادارۂ مصنفین پاکستان سے ۵ روپے (سالانہ))
(جس میں خاص نمبر بھی شامل ہیں)

بھارت میں ترسیل زر کا پتہ
ایم برکت اللہ عادل
نمبر ۱۲ - چک بازار روڈ کراس بنگلور ۲

پتہ
۲۰۔ ہوٹل ایکسلسیر، صدر، کراچی نمبر ۳

ہمارا منشور

ہم پاکستان کی جملہ زبانوں کے ادیب خود کو اور وطن کی ترقی، عظمت، بین الاقوامی امن کے آدرش اور انسانیت کی ترقی کے لئے وقف کرتے ہیں، ہم ان حقوق انسانی پر ایمان رکھتے ہیں۔ جن کی تشریح اقوام متحدہ کے منشور میں کی گئی ہے۔ بحیثیت ادیب کے ہم اپنے خیالات کا اظہار اور ترسیل کی آزادی کے لئے بنیادی حقوق کے حامی ہیں جس کے بغیر تخلیقی ادب بے مقصد ہوتا ہے۔ ہمیں اپنی ان عظیم روایات پر، جو ہمیں ماضی سے ملی ہیں، پورا فخر ہے ہم ان کے تحفظ اور ان کو مزید فروغ دینے کا عہد کرتے ہیں ہم اپنے مقدس فرض سے جو صداقت کی عکاسی، حب وطن کی قدروں کی نشو و نما، بین الاقوامی اُخوت اور تعاون کے فروغ اور انسانی تعلقات کے قیام سے متعلق ہے، کما حقہ، آگاہ ہیں تاکہ انسانیت زیادہ سے زیادہ راحت، طمانیت اور وقار کے ساتھ اپنا وجود قائم رکھ سکے۔

ادیب ہونے کی حیثیت سے فرداً فرداً اور اجتماعی طور پر ہم ایک ایسے خوشحال اور صحت مند معاشرے کی ترقی کیلئے اپنی ذمہ داری قبول کرتے ہیں جس میں سب کے لئے آزادانہ مساوی مواقع فراہم ہوں، اور جہاں دولت و اقتدار، انسانی قدروں اور اعلیٰ تصورات کے تابع ہوں۔ اسی لئے علم و سائنس کی ترقی کو دنیا میں امن اور خوش حالی کے فروغ کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔"

(پاکستان رائٹرز گلڈ کے تاسیسی اجلاس میں
بروز ۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء منظور ہوا)

فہرست

			صفحہ
	اداریہ		۴
مضامین	انور دہلوی	تمکین کاظمی مرحوم	۱۰
	اُستاد جلیل	تمکین کاظمی مرحوم	۱۴
	آذر بائیگان	تمکین کاظمی مرحوم	۲۱
	اُردو نثر نگاری کے جدید رجحانات	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ	۲۵
	عمرانیات اور ادب	غلام حسین، ذوالفقار	۲۹
	پریم چند کی شخصیت	ظہیر فتحپوری	۳۷
نظمیں	بہار	احمد ندیم قاسمی	۴۱
	آدمی نامہ	ظہیر کاشمیری	۴۲
	خونِ شہیداں	منظور حسین شور	۴۷
	تجدید	انجم اعظمی	۴۸
	رات	قمر ہاشمی	۴۹
	ایک پھول اور کھلا	فضا ابن فیضی	۵۰
غزلیں	حرماں خیرآبادی (مرحوم)	خلیل الرحمٰن اعظمی	۵۵
	شاذ تمکنت	رئیس امروہوی	۵۶
	رضا ہمدانی	اثر صہبائی	۵۷
	مجید شاہد	اختر انصاری اکبرآبادی	۵۸
	شفقت کاظمی	رشید کامل	۵۹
افسانے	اندھیرے کا خوف	آمنہ ابوالحسن	۶۰
رپورتاژ	اُٹھ فریدا سُتیا	انور (دوسری قسط)	۶۶

علاقائی سرگرمیاں (لائل پور) ۸۴

خبرنامہ اطراف عالم، مرکز، حلقہ کراچی، مغربی اور مشرقی پاکستان کی ادبی خبریں۔ ۸۵

اداراتی اعلانات
بیرونی روابط کے سلسلے میں ایک نیا اور اہم قدم (لٹریری پاکستان) ۳
بیرونی روابط ۶
لیکھک سنگھ پترکا (بنگلہ رسالہ) ۷
آدم جی ادبی انعام کے نئے قواعد ۸
کاپی رائٹ ۲۳
ایک وضاحت (بین الملکی ثقافتی کانفرنس۔ دہلی) ۲۳
مصنفین کی تخلیقی سرگرمیاں ۸۲
حلقہ کراچی کی ادبی نشستیں ۹۵

بیرونی روابط کے سلسلے میں ایک نیا اور اہم قدم

لٹریری پاکستان

LITERARY PAKISTAN

پاکستان رائٹرز گلڈ بہت جلد لٹریری پاکستان کے نام سے ایک انگریزی سہ ماہی پرچے کی اشاعت، کا آغاز کر رہا ہے لٹریری پاکستان میں پاکستان کی ادبی سرگرمیوں کے احوال کے ساتھ ساتھ اردو بنگالی اور علاقائی زبانوں کے منتخب ادب پاروں کے انگریزی تراجم بھی شائع ہوں گے۔ مختلف ناشرین پاکستانی ادب کو بیرون ملک متعارف کرانے کے لئے جو کتابیں شائع کریں ان کا مختصر خلاصہ اور اشتہار بلا معاوضہ اس پرچہ میں شامل کیا جائے گا۔ پاکستان کے قومی اور علاقائی ادب کے کسی شعبے کے پس منظر کے متعلق مبسوط مضامین کا معقول معاوضہ ادا کیا جائے گا۔

(مزید تفصیلات آئندہ شمارے میں)

مرکز

اداریہ

لیجئے۔ گلڈ کی پہلی کتاب جو اُردو شاعری کے انگریزی میں تراجم کا مجموعہ ہے شائع ہوگئی۔ ترجمے کے متعلق یہ طے ہے کہ کبھی اصل کا بدل نہیں ہو سکتا خصوصًا شاعری کا ترجمہ۔ تاہم ان لوگوں تک جو اصل کی زبان نہ جانتے ہوں، ابلاغ کا یہی ایک برا بھلا ذریعہ ہے۔ بدقسمتی سے پاکستانی ادب بیرونی حلقوں سے اس حد تک روشناس نہیں جس حد تک کہ اس کا حق ہے، یہ کتاب اس کمی کی تلافی کے لئے پہلا قدم ہے۔ دوسرا قدم افسانوں کا انتخاب ہے۔ شاعری کا انتخاب جی۔ الانا صاحب نے اپنی پسند سے کیا تھا۔ گلڈ نے اسے اس لئے قبول کیا کہ ایک تیار کتاب مل گئی۔ افسانوں کے انتخاب کے لئے ایک باقاعدہ بورڈ مقرر کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں قارئین کی آرا اور مشوروں کا ہم خیر مقدم کریں گے۔ منٹو کے منتخبات اور پنجابی شاعری کے تراجم بھی اسی سلسلے کی آئندہ کڑیاں ہیں۔ اس پروگرام کو مزید تقویت انگریزی سہ ماہی "لٹریری پاکستان" سے ملے گی جس کا شمارہ اوّل کوئی دو ماہ تک آجائے گا۔ بیرون ملک پاکستانی ادب کو متعارف کرانے کے منصوبے کی مزید تفصیلات 'بیرونی روابط' کے زیرِ عنوان آپ کو اسی پرچہ میں ملیں گی۔

گلڈ کے مشرقی پاکستان زون کے بنگالی ماہنامہ 'لیکھک سنگھ پترکا' کے متعلق بھی اسی شمارے میں ایک اعلان شامل ہے۔ ۷ رجولائی کو ڈھاکے میں ایک خصوصی تقریب میں اسے پیش کیا جا رہا ہے۔ ڈھاکے سے گلڈ کے اُردو ترجمان قلمکار کا پہلا شمارہ پہلے ہی منظرِ عام پر آچکا ہے۔ گلڈ کے پبلشنگ ہاؤس کی دو بنگلہ کتابیں 'نوفل و حاتم' منظوم از فرخ احمد اور آخری نبی، مصنفہ مستفیض الرحمٰن مرحوم بھی جولائی میں آرہی ہیں۔

اُردو کتابوں میں سے حسبِ ذیل وسط جولائی تک شائع ہو جائیں گی۔

۱۔ تیسری منزل (افسانے) ہاجرہ مسرور
۲۔ سورج بھی تماشائی (افسانے) انور
۳۔ فصیلِ شب (ڈرامے) میرزا ادیب
۴۔ صدا بصحرا (مجموعہ کلام)۔ یوسف ظفر
۵۔ لال چادر (سید ولی اللہ کے ناول لال شالو کا ترجمہ) از یونس احمر
۶۔ اُردو میں سوانح نگاری (تحقیق و تنقید) ڈاکٹر سید شاہ علی

کوشش کی جا رہی ہے کہ پہلی کھیپ کی بقیہ کتابیں جن میں شیخ ایاز کا مجموعہ کلام (سندھی) اور اے۔ حمید کا ناول بھی شامل ہے، آخر اگست تک شائع ہو جائیں۔ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کی پنجابی کے چھ صوفی

شعرا، سائیں فیروز کی ہاڑے (پنجابی مجموعہ کلام) اور رشید لاشاری کے سندھی شاعری کے اُردو تراجم کی اشاعت میں بوجوہ نظرثانی تاخیر ہو گئی ہے۔

صدر مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کو ان کی طویل علالت کے پیش نظر مری میں اپنے مہمان کے طور پر کمبائنڈ ملٹری اسپتال میں داخل کرا دیا ہے۔ جناب صدر کے ذاتی معالج بریگیڈیر سرور اپنی نگرانی میں ان کا علاج کرا رہے ہیں اور دوا و غذا سے ان کے مرض کے علاج اور طاقت کی بحالی کے لئے ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے۔ صدر مملکت خود بھی دوبارہ اسپتال میں ان کی عیادت کو گئے یہ مولوی عبدالحق ہی کی نہیں علم کی توقیر ہے۔ بابائے اُردو نے ساری عمر علم و ادب اور زبان کی خدمات سے لئے بے نفسی سے کام کیا ہے اور ان کے ہم سب پر بے اندازہ حقوق ہیں۔
صدر مملکت اس مستحسن اقدام کے لئے تمام اہل علم کے شکریے کے مستحق ہیں۔

مولانا تمکین کاظمی ہم قلم کے معاون خصوصی تھے اور ہندوستان میں رہتے ہوئے بھی گلڈ کی تحریک سے دلچسپی رکھتے تھے۔ ۲۷ مئی کو حیدرآباد میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ہم ان کے لئے اپنے پرچے کا ایک حصہ وقف کر رہے ہیں۔ حرماں خیرآبادی بھی جو کہ اُردو کے پرانے شاعر اور مرد قلندر تھے ۲۱ جون کو کراچی میں حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے۔ خدا ان بزرگوں کو غریق رحمت کرے۔ ہمارا پرچہ پریس جا چکا تھا کہ ۳ جولائی کو امریکہ کے مشہور ناول نگار اور افسانہ نویس ارنسٹ ہیمنگوے کے اچانک انتقال کی خبر آئی۔ گلڈ نے تعزیت کا پیغام تو بھیج دیا ہے اس کے علاوہ اگلے شمارے میں ہم ہیمنگوے کے متعلق ایک مبسوط مضمون شائع کر رہے ہیں

اس مہینے کراچی میں جناب صدیق حسن کا انتقال ہوا ہے مرحوم کی عمر ۷۰ برس تھی مولانا عبدالحلیم شرر کے فرزند تھے اور ایک مدت سے علیل تھے گلڈ کی معرفت ایک سال تک مرحوم کو سو روپے ماہوار سرکاری وظیفہ بھی ملتا رہا۔

ہم قلم کے شمارہ مئی ۱۹۶۱ء میں انور خواجہ کا افسانہ آوازِ سنگ شائع ہوا تھا جس کے متعلق ہمارے پشاور کے دوستوں نے ہمیں لکھا ہے کہ اس سے پاکستان کے ایک طبقے کے جذبات مجروح ہوتے ہیں۔ چونکہ افسانہ نگار کا تعلق پشاور سے ہے اس لئے یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ انھوں نے اپنے گرد و پیش کی عکاسی صحیح کی ہو گی۔ بدقسمتی سے ہمارے قارئین کا احساس مختلف ہے اور اس سے بہت سے لوگوں کی دلآزاری کا پہلو پیدا ہوا۔ ایسی بات ہم قلم اور رائٹرز گلڈ کے منشا و مقاصد کے یکسر خلاف ہے اور ہم نے اپنے ان دوستوں سے جنہوں نے ہمیں شکایتی خطوط لکھے، اسی وقت معذرت کر لی تھی لیکن ہم قلم میں بھی اس کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

پشتو کے مشہور شاعر اور پاکستان رائٹرز گلڈ کے رکن جناب محمد اکبر خان اکبر عارضہ [illegible]

بیرونی روابط

پاکستان رائٹرز گلڈ کے ایگزیکٹو سکریٹری جمیل الدین عالی یورپ اور امریکہ میں ادبی انجمنوں کے نظام کار کا مطالعہ ختم کر کے وسط جولائی میں کراچی واپس پہنچ گئے ہیں۔ موصوف کو یونسکو نے پانچ مہینے کے لئے اس دورے پر بھیجا تھا۔ عالی صاحب نے اس دوران میں انگلستان، مغربی جرمنی، ہالینڈ، اٹلی، سوئٹزرلینڈ، فرانس اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کے مختلف اداروں سے گلڈ کے لئے روابط پیدا کرلئے ہیں۔ ان ممالک کے ناشرین اور ادیبوں کی انجمنوں نے پاکستانی ادب سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ فی الحال سوائے چند کلاسیکی کتابوں کے وہاں کے پڑھنے والے پاکستانی ادب کے بارے میں کچھ نہیں جانتے جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ خود ہمارے ملک سے کوئی ایسی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ دوسرے یہ کہ ہمارے ادب کے تراجم انگریزی میں موجود نہیں ہیں۔

اب جو ہم نے یہ روابط پیدا کرلئے ہیں یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی بہترین تخلیقات کے ترجموں پر توجہ کریں۔ اور اس کے علاوہ پاکستانی ادب اور ثقافت سے متعلق انگریزی میں لکھی ہوئی طبع زاد کتابوں اور مضامین کو بھی متعلقہ اداروں تک پہنچائیں۔ فی الحال ہم انگریزی زبان پر زور دے رہے ہیں کیونکہ موجودہ انتظامات کے مطابق دوسری یورپی زبانوں کے ناشر ہمارے ارسال کردہ انگریزی ترجموں اور طبع زاد مواد سے اپنی زبانوں میں خود ترجمہ کرالیں گے۔

گلڈ سب مترجمین کو دعوت دیتا ہے کہ وہ مندرجہ ذیل موضوعات پر اپنے انتخابات کا ترجمہ فوراً ہمیں بھیجیں۔

۱۔ پاکستانی ثقافت۔ پس منظر اور حال ۲۔ ناول

مترجم کے لئے ضروری ہے کہ پہلے وہ ایک سبق یا باب کا ترجمہ کر کے پورے ناول یا کتاب کے Synopsis کے ساتھ گلڈ کو بھیجے اور معاوضے کی شرائط بھی لکھ دے اگر وہ قابل قبول ہوئیں تو معاہدہ کر لیا جائے گا۔ واضح رہے کہ بیرونی انجمنوں نے زیادہ تر ناولوں اور ثقافتی موضوعات کی فرمائش کی ہے۔ نظم، افسانہ، اور ڈرامہ ان ممالک میں تجارتی طور پر منفعت بخش سودے نہیں ہیں اس لئے گلڈ خود ان کے تراجم برائے اشاعت مرتب کرے گا۔

واضح رہے کہ اگر اس پروگرام کے سلسلے میں مترجمین اور ادیبوں کا ضروری تعاون حاصل نہ ہوا تو ہم ایک زریں موقع کھو دیں گے۔ ابھی ہمارا تعلق ان ناشرین اور انجمنوں سے تازہ ہے اور ضروری ہے کہ ہم اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔ اس پروگرام میں دیگر فوائد کے علاوہ ادیب اور مترجم کا مالی فائدہ بھی ہے گلڈ اپنی خدمات بلا معاوضہ پیش کرتا ہے اور ڈاک کے اخراجات بھی برداشت کرے گا۔ ناولوں اور ثقافتی کتابوں کے مترجمین کو جزواً پیشگی معاوضہ بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ ہم چند مترجمین یا ادیبوں کو انتخاب کرنے کی بجائے ایک عام دعوت دے رہے ہیں تاکہ سب کو یکساں مواقع ملیں اگر اس پیشکش کا جواب خاطر خواہ نہ ملا تو پھر ہم از خود انتخاب اور ترجمہ کی ذمہ داری سنبھالیں گے۔ ادیبوں اور مترجمین کے لئے گلڈ کا رکن ہونا ضروری نہیں ہے۔

اس سلسلے میں مزید خط و کتابت مرکزی دفتر سے کی جائے۔

آدم جی ادبی انعام کے نئے قواعد

انعام کی مجموعی رقم ۲۰ ہزار روپے سالانہ ہے۔ اس میں سے دس ہزار روپے بنگالی کے لئے اور دس ہزار اُردو کے لئے ہے اگر کسی زبان میں دس ہزار کا انعام ایک کی بجائے دو کتابوں کو دینے کا فیصلہ کیا گیا تو لازماً ایک کتاب نثر کی اور ایک نظم کی ہوگی۔ انعام نثر کی دو کتابوں یا شاعری کے دو مجموعوں میں تقسیم نہیں کیا جائے گا۔

ضوابط مختصراً حسب ذیل ہیں۔

انعام کے لئے صرف طبعزاد کتابوں پر غور کیا جائے گا۔ اگر کوئی کتاب کسی زبان کے کسی ادبی فن پارے سے ترجمہ یا ماخوذ ہے تو انعام کے لئے زیر غور نہیں آئے گی۔ طبعزاد کتابوں میں ناول، مختصر افسانہ، ڈرامہ، شاعری، ادبی تنقید، سفرنامے اور سوانح سب شامل ہیں۔

کتاب کے مصنف کا پاکستانی شہریت کے قانون کی رُو سے پاکستان کا شہری ہونا ضروری ہے۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کا ممبر ہونے کی شرط نہیں ہے۔ مصنف کے لئے ضروری نہیں کہ اپنی کتاب خود بھیجے۔ پاکستان کا کوئی بھی شہری کتابیں بھیج سکتا ہے جو اگست اور جولائی کے درمیان شائع ہوئی ہوں۔ البتہ فارم بھیجنے والے کو یہ تصدیق اس میں کرنی ہوگی کہ مصنف کی رضامندی حاصل کر لی گئی ہے۔

انعام کا اعلان ۲۷ اکتوبر کو کیا جائے گا۔ کتاب کا پہلا ایڈیشن اس سال کی ۳۱ جولائی کو ختم ہونے والے سال میں شائع ہونا چاہیئے۔ اور کتاب کی پانچ جلدیں بذریعہ رجسٹری یا ذاتی طور پر گلڈ کے مرکزی دفتر (۲۰ - ہوٹل ایکسلسیر۔ صدر۔ کراچی) میں ۳۱ جولائی تک پہنچانی ضروری ہیں۔

مرحوم مصنفین کی کتابیں بھی شامل کی جاسکتی ہیں بشرطیکہ سال متعلقہ میں پہلی بار شائع ہوئی ہوں کتابیں بھیجنے کے ساتھ کوئی فیس ضروری نہیں ہے۔

جملہ ضوابط اور فارم داخلہ گلڈ کے مرکزی یا علاقائی دفتر سے حاصل کئے جاسکتے ہیں، فارم بغیر قیمت دیا جائے گا۔ فارم کے بغیر کوئی کتاب وصول نہیں کی جائے گی۔

اردو اور بنگالی دونوں میں پانچ پانچ جج ہوں گے۔ مستقل ججوں کے نام حسب ذیل ہیں:

۱۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق	اردو کے لئے
۲۔ ڈاکٹر محمد شہید اللہ	بنگالی کے لئے
۳۔ جمیل الدین عالی	ممبر سیکریٹری برائے اردو اور بنگالی

(ب) ہر دو زبانوں کے باقی چار ججوں میں سے تین جج گلڈ کے سیکریٹری جنرل نامزد کریں گے اور ایک جج خانوادہ آدم جی کی طرف سے نامزد ہوگا۔

(ج) ہنگامی حالات میں ججوں کے فرائض یا انعام کی تقسیم کے سلسلے میں گلڈ کسی سے مشورہ کئے بغیر کوئی بھی ضروری قدم اٹھا سکتا ہے۔

کتابیں داخل کرنے کی آخری تاریخ ۳۱ جولائی سنہ ۶۱ء ہے

تمکین کاظمی مرحوم کے تین مضامین

۱- انور دہلوی

۲. اُستاد جلیل

۳ - آذربائیجان

تمکین کاظمی مرحوم ہم قلم کے ممتاز معاونین میں سے تھے.
ان کا انتقال ۲۷ رمئی ۱۹۶۱ کو حیدرآباد میں ہوا. مرحوم
عرصے سے علیل چلے آتے تھے لیکن ادارہ ہم قلم سے
ان کی مراسلت اور مضامین کی ترسیل برابر جاری رہی.
اپنے آخری خط مورخہ ۱۴ مارچ ۱۹۶۱ میں انھوں نے
لکھا: "اب صحت یاب ہو گیا ہوں - انشاء اللہ مضامین
لکھ کر بھیجتا رہوں گا" ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال

تمکین کاظمی

انور دہلوی

دلّی جیسی مردم خیز بستی دنیا جہاں میں کوئی نہ ہوگی ایسے ایسے لعل بے بہا اور دُر یکتا اس کان علم اور سمندر ادب سے نکلے جن کی نظیر ناممکن تھی دوسرے معنی میں دہلی ایک ایسی لنکا تھی جہاں کا سب سے چھوٹا بھی باون گز کا تھا،

ان ہی باون گزوں میں سید شجاع الدین عرف امراؤ مرزا متخلص بہ انور بھی تھے جو سید جلال الدین حیدر رضوی المخاطب بہ صلاح الدولہ مرصع رقم خاں بہادر، استاد بہادر شاہ بادشاہ دہلی کے فرزند اور مشہور و مقبول شاعر ظہیر دہلوی کے چھوٹے بھائی تھے، گیارہ برس کی عمر میں عربی فارسی درسیات سے فراغت حاصل کر لی اور بہترین خوشنویس بھی ہوگئے، اپنے والد ہی کے شاگرد تھے، غزل گوئی کا شوق بھی تھا اُستاد ذوق کے شاگرد تھے ذوق کے بعد چند غزلیں غالب کو بھی دکھائیں افسوس ہے کہ چالیس برس کی عمر میں ۱۳۰۲ھ میں دہلی ہی میں وفات پائی۔ اس سے زیادہ حالات کہیں نہیں ملتے۔ لالہ سری رام دہلوی مؤلف خمخانۂ جاوید نے بڑی مشکل سے دیوان فراہم کر کے چھپوایا تو اُستاد ظہیر نے تاریخ کہی ؎

میرے بھائی کا چھپا دیوان ظہیر
باغ انور آج پھر تازہ ہوا
از سر اندوہ ہاتف نے کہا
[illegible]

سائل سائز کا تقریباً دو سو صفحات کا دیوان ہے ڈیڑھ سو صفحات پر غزلیں ہیں، نہایت ہی پُرگو تھے جو غزلے بھی اکثر کہے ہیں مگر عام طور پر پُرگو شاعر یا وہ ہوتے ہیں بخلاف اس کے انور نے بڑی اچھی طبیعت پائی تھی اور غزل خوب کہتے تھے ان کا مختصر دیوان لوگوں کے ضخیم دیوانوں پر بھاری ہے، بدنصیبی سے انھوں نے بہت ہی جلد انتقال کیا اگر اور زندہ رہتے اور مشق جاری رہتی تو دہلی کے صف اوّل کے شعراء میں شمار ہوتے غضب کی طبیعت پائی تھی،

ظہیر دہلوی ان کے بڑے بھائی تھے، اپنی جگہ اُستاد تھے ساری عمر شعر گوئی میں گزار دی تھی مگر انور عمر میں ان سے چھوٹے ہونے کے باوجود غزل گوئی میں بڑے تھے لطف خاص یہ ہے کہ ظہیر اور انور دونوں شاگرد تھے ذوق کے مگر دونوں نے ذوق کے بجائے مومن کا تتبع کیا چنانچہ ظہیر تو بالاعلان کہتے تھے ؎

طرز مومن سے نہ آگاہ تھے جب کہ ظہیر
سچ تو یہ ہے کہ کبھی رنگ غزل نے نہ دیا!

مگر انور ظہیر سے زیادہ مومن کی طرف مائل اور ان سے متاثر تھے، ان کی غزلیں مومن کے رنگ میں اور ان کے شعر مومن کی طرز میں ڈوبے ہوئے ہو

سنیے قیامت کا مضمون کس بے ساختہ پن سے باندھا ہے
قیامت کا شعر ہے ؎

کس ڈھب سے چلے آتے ہیں وہ ہائے قیامت
کہدو کسی گوشے میں سرک جائے قیامت

پہلی نظر اور پہلے آمنے سامنے کی کرامت بالکل مومن
کے رنگ میں بیان کی ہے ؎

نظر ملتے ہی وہ کچھ ہو گیا جو کچھ کہ ہونا تھا!
پشیماں ہو رہا ہے دیدۂ انجام بیں کیا کیا!

"وہ کچھ ہو گیا" کی ترکیب خالص مومن کی ہے،
انور کا دیوان نایاب ہے اور ان کے کلام کو زیادہ
شہرت بھی نصیب نہیں ہوئی مگر ان کا ایک شعر اتنا مشہور
ہوا ہے کہ شاید ہی کسی کا شعر اتنا مشہور ہوا ہو، عموماً
لوگ اس کو مومن کا شعر سمجھتے ہیں مگر بعض حالی کا شعر خیال
کرتے ہیں، غضب کا شعر ہے ؎

نہ میں سمجھا نہ آپ آئے کہیں سے
پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے

گو یہ شعر مومن کے رنگ کا ہے مگر حقیقت یہ ہے
کہ مومن کے دیوان پر بھاری ہے، اسی قسم کے شعر
مومن یا غالب ہی نے کہے ہیں مگر انور نے غضب کیا ہے،
غور کیجئے "کوئی" "کہیں" سے آرہا ہے راستے میں مڈبھیڑ ہو
جاتی ہے اور قبل اس کے کہ اس سے یہ سوال کیا جائے کہ
"کہاں سے آرہے ہو" وہ اپنی چوری چھپانے کے لئے بے
ربطی سے کچھ کا کچھ کہنے لگتا ہے، پیشانی پر پسینے کے قطرے
آجاتے ہیں زبان میں لکنت پیدا ہو جاتی ہے، یہ حال دیکھ
کر کہتے ہیں، پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے، پھر اس کا دل رکھنے
اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ظاہر کرنے کے لئے کہ ہم جانتے
ہیں جہاں سے تشریف آوری ہو رہی ہے کہتے ہیں،
"نہ میں سمجھا نہ آپ آئے کہیں سے" شعر کیا ہے ایک پورا
افسانہ ہے ایک حکایت ہے ایک قصہ ہے لطیف اور نازک

شستہ اور نفیس،
غالب کی زمینوں میں انور نے اکثر غزلیں کہی ہیں
اور بڑی اچھی کہی ہیں سنیئے ؎

میں نہ جاؤں گا عدو کے ہوتے
کوچۂ یار میں جنت ہی سہی
شب فرقت کو بسر کرنا ہے
طول گیسو کی حکایت ہی سہی
کوئی ہنگامہ تو ہو بالیں پر
تو نہیں، شور قیامت ہی سہی

مختصر حال درد و دل یہ ہے
موت اُسے چارہ گر نہیں آتی
نیند کا کام گرچہ آنا ہے
میری آنکھوں میں پر نہیں آتی

یہ مستیوں کا رنگ ہے جوش شباب میں
گویا کہ وہ نہائے ہوئے ہیں شراب میں

غضب کا شعر ہے، گو داغ نے بھی اسی مضمون کو
بڑی وارفتگی سے ادا کیا ہے ؎

اک اُدا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی
اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

مگر داغ نے کافر جوانی کو جوش پر لا کر مستانہ پن کو عو
کر دیا ہے جو ذوق سلیم کو ناگوار گزرتا ہے لیکن انور نے
"نہائے ہوئے ہیں شراب میں" کہہ کر لاکھوں کا فسـ
جوانیوں کو مع جوشش و خروش کے اس ایک
مصرع میں بند کر دیا ہے، مضمون بالکل وہی ہے مگر ایک
نئی تشبیہ نے سر مستیوں کو اُجاگر کر دیا ہے، داغ کا شعر
ہے ؎ نکلی نہ دل کی چور زلف عنبریں نکلی
ادھر لا ہاتھ مٹھی کھول یہ چوری کہیں نکلی

اس مضمون کو انور نے ادا کیا ہے اور حق تو یہ ہے کہ
ن کا حق ادا کیا ہے؎

ادھر لاؤ ذرا دست حنائی
پکڑا دیں چور دل کا ہم یہیں سے

مومن کی زمینوں پر بھی انور نے بڑی اچھی غزلیں
ہیں؎

حشر میں کون مرے حال کا پرساں ہوگا
یاں کچھ انصاف ہوا ہے کہ جو کچھ واں ہوگا
بزم احباب جنوں کا مرے درماں ہوگا
یہ صبح آئیں گے دماغ اور پریشاں ہوگا
ہوں میں ایذا طلب ایذا ہی سے درماں ہوگا
نون بھی زخم پہ چھڑکو گے تو احساں ہوگا
گو کہ ہے آپ گلا کاٹنا اپنا مشکل
کاٹنے سے شب فرقت کے تو آساں ہوگا
تم نہ آؤ گے تو کیا رات بھی کٹنے کی نہیں
کیا نہ پہلو میں کوئی خنجر براں ہوگا

اغیار کی نشست ہے واں یاں شکستہ پا
ہم سے تمھاری بزم میں جایا نہ جائے گا

تہمت کا ظلم قیامت کا ستم کرتے ہیں
وہ خدا سے نہیں ہوتا جو صنم کرتے ہیں

چھوٹی بحروں میں انور نے بڑی رواں دواں
ں کہی ہیں چند شعر نقل کرتا ہوں؎

محبت میں بھی کیا سے کیا ہو گیا
ستم عاشقوں کا وفا ہو گیا
نہ مانوں گا نشہ بادہ تھا کوہکن
کردن کا نشانہ یاں بلا ہو گیا
ستم اک طرف ناز اٹھائے گا کون

شب غم میں کس کس کی ہو روک تھام
جو دم میں گیا دم غنا ہو گیا

لطف آرائی رقیب نہ پوچھ
گل ہوا ہے چراغ محفل کا
مشکلیں یہ پڑیں کہ ہوش نہیں
سہل پڑھتا ہوں لفظ مشکل کا
یار بے درد و چارہ گر نو مشق
کس کو سونپوں معاملہ دل کا
ہم ہی بے خود تھے ورنہ سو سو بار
پردہ اٹھ اٹھ گیا ہے محمل کا
کیا شب وعدہ شاد بیٹھا ہوں
کہ بھروسا ہے جذب کامل کا

میں نے کہا کہ غیر سے پردہ نہیں ہوا
کہنے لگے کہ آپ کو پھر کیا نہیں ہوا
وہ یوں ہنسے عدو سے کہ گویا نہیں ہنسے
یاں ظلم وہ ہوا ہے کہ گویا نہیں ہوا

تماشے پر نفط اب زندگی ہے
کہ ہے آنکھوں میں دم اس نیم جاں کا
کسی کا فریب مریئے اور نہ مریئے
یہ ہے اک لطف عمر جاوداں کا
مسیحائی کرو مرتے ہیں ہم پر
خلاصہ ہے یہ اپنی داستاں کا

ترے کوچے کے بیٹھنے والے
اپنی ہستی مٹائے بیٹھے ہیں
ہم نہیں آپ ہیں خوشی سے کہ وہ

شرم بھی اک طرح کی چوری ہے
وہ بدن کو چرائے بیٹھے ہیں

الفاظ کی اُلٹ پھیر، مصرعوں کی بندش، تخیل کی بلندی، نزاکت اور صرف دائرہ حسن و عشق تک محدود شاعری اور اسی دنیا کو دلچسپ، معنی خیز اور کارآمد بنا لینا سارے انداز مومن کے ہیں، انور کا پورا دیوان مومن کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے چند شعر اور سنیئے ؎

مجھے سر پھوڑنے میں عذر کیا ہے
گران کا ہی سنگِ آستاں ہو
خمارے کا پردہ ہے ذکر نہ
حقیقت میں مجھی سے سرگراں ہو

کہاں کی دل لگی کیسی محبت
مجھے اک لاگ ہے جانِ حزیں سے

جگر ان کا سرا ہے ظالم
تجھ سے جو لو لگائے بیٹھے ہیں

دیکھئے کس غضب کے شعر ہیں ؎

وہاں مستی کے عالم میں بھی اک رنگ مدارا ہے
جھکی جاتی ہیں پلکیں غیر چشم سرگیں کیا کیا
جو سچ پوچھو تو کچھ عاشق سے بڑھ کر تم جفا کش ہو
کہ اتنی نازکی پر غیر کی باتیں سہیں کیا کیا

چند شعر اور تحمل کیجئے ؎

رحم اس سادہ دلی پر کہ مرا زخمِ جگر
غیر سے چارۂ درماں کا طلب گار رہا
میں رہا بھی تو رہا خار کی صورت کہ سدا
تیری نظروں میں کھٹک دل پہ تمہارے بار رہا
کچھ خبر ہوتی تو میں اپنی خبر کیوں رکھتا
یہ بھی اک بے خبری تھی کہ خبردار رہا

تو اور عدو سے گرمیٔ ہنگامہ ہائے ہائے
میں اور یاس سے تری محفل کو دیکھنا

ہر ہر سخن پہ لغزش ہر بات پر ہے لکنت
اور اس پہ ہم کو دعویٰ اظہار مدعا کا

تم اور سوچ سوچ کے کہنا کہ ہاں درست
میں اور چھپا چھپا کے گلا روزگار کا

اشک بیتاب نگہ بیباک و چشم تر خراب
چشم بینا سے اگر دیکھو تو گھر کا گھر خراب

محفل میں تم کو آنکھ چرانی روا نہیں
دل کو خدا نخواستہ میں پوچھتا نہیں

کہاں تک شعر نقل کروں، ہر شعر انتخاب ہے ضرورت ہے کہ اس دیوان کو شائع کیا جائے کیونکہ اب یہ نایاب ہو گیا ہے۔

مکین کاظمی

اُستاد جلیل

یوں تو ہزاروں اُستادانِ فنِ شعر و سخن پیدا ہوئے
استاد ہونے کے باوجود ان کے نام کے ساتھ اُستاد
ست نہ ہو سکا، یہ شرف صرف تین شاعروں کو حاصل ہوا،
تاد ذوق، استاد داغ، استاد جلیل، ذوق، شاہ ظفر
ے استاد بن کر جگ استاد بنے اور داغ حضور نظام کے استاد
ن کر جہاں اُستاد ہوئے، اور جلیل بھی حضور نظام ہی کی
ستادی سے جگ اُستادی کے رُتبے پر فائز ہوئے،

اب تو القاب و خطاب متروک ہو رہے ہیں اور
ام طور پر کسی کے نام کے ساتھ جناب اور صاحب بھی لکھا
کہا نہیں جاتا مگر مجھ جیسے پُرانے لوگ اب بھی استاد ذوق
ستاد داغ اور استاد جلیل ہی کہتے ہیں چنانچہ آج کی
حبت میں اُستاد جلیل سے متعلق کچھ عرض کرتا ہوں،

حافظ جلیل حسن جلیل فرزند تھے حافظ عبدالکریم کے
انک پور میں پیدا ہوئے لکھنو میں تعلیم و تربیت پائی بچپن
ہی سے شعر و سخن سے ذوق تھا بیس سال کی عمر میں امیر
مینائی سے تلمذ حاصل کیا چونکہ نہایت تیز ذہن اور قابل
نوجوان تھے اس لئے امیر نے اپنے پاس رکھ لیا اور اپنی مرتبہ
لغت امیر اللغات کی ترتیب سپرد کر دی، انتخاب الفاظ و
محاورات و ضرب الامثال، تذکیر و تانیث و محل استعمال وغیرہ
سے جلیل کو غیر معمولی واقفیت ہونے لگی اور امیر نے بھی پوری
توجہ سے رموز شاعری سے واقف کرانا شروع کر دیا نتیجہ یہ ہوا
کہ جلد ہی طبیعت براق ہو گئی اور جلیل شاعر بن گئے،...

امیر اللغات کی دو تین ہی جلدیں طبع ہوئی تھیں کہ نواب صاحب
رامپور نے انتقال کیا اور بقیہ جلدیں اُدھوری رہ گئیں،
ان کی تکمیل مشکل تھی اس کے لئے امیر نے کسی مربی کی تلاش
شروع کی اور حضور نظام سے امداد کی درخواست کرنی چاہی
تو اُستاد داغ نے حضور نظام کے کلکتہ سے واپس آتے
وقت بنارس پر مقام کرتے ہی امیر کو بارگاہ نظام میں
باریاب کرا دیا اور امیر نے ایک مسدس اور چند رباعیاں
حضور میں پیش کیں، اعلیٰ حضرت نے کلام پسند فرمایا اور
امیر کو حیدرآباد آنے کے لئے ارشاد فرمایا،

چنانچہ امیر، جلیل کو ساتھ لے کر حیدرآباد پہنچے مگر یہاں
پہنچتے ہی بیمار ہوئے اور چند ہی روز میں انتقال کر گئے
جلیل کو اُستاد داغ نے حیدرآباد میں روک لیا اور مہاراجہ
کشن پرشاد یمین السلطنت کے پاس ملازم رکھا دیا، داغ
کے انتقال کے بعد مہاراجہ بہادر نے بڑی کوشش کی اور
جلیل کو داغ کی جگہ دلوانی چاہی مگر اعلیٰ حضرت نے داغ
کی جگہ تو جلیل کا تقرر نہیں کیا بلکہ داغ کی ایک ہزار تنخواہ

میں سے شاید آدمی تنخواہ جلیل کی کردی گر وہ اعزاز جو داغ
کو ملا تھا نہ مل سکا، البتہ جلیل القدر القاب ضرور سرفراز ہوا
تھا جس کے شکریہ میں جلیل نے ایک رواں دواں قصیدہ
کہہ کر پیش کیا تھا کہ

جلیل القدر کو دیکھو جلیل زار کو دیکھو
لقب جو شاہ سے ملتا ہے چرچا ہو ہی جاتا ہے

یہ قصیدہ اعلیٰحضرت نواب میر محبوب علی خاں کے ملاحظہ
میں پیش کیا گیا تھا اس کے چند شعر سُن لیجئے تاکہ آپ کو
جلیل کی قصیدہ گوئی کا اندازہ بھی ہو سکے: ؎

خدا رکھے جہاں دو گل کھلائے طبع رنگیں نے
گلستاں بوستاں کا رنگ پیدا ہو ہی جاتا ہے
زباں پر طوطیٔ ہندوستاں کو وجد آتا ہے
بیاں پر بلبل شیراز شیدا ہو ہی جاتا ہے
قلق کو: داغ آتش کو جلن جامی کو بیہوشی
صبا کو بیکلی سودا کو سودا ہو ہی جاتا ہے
بجا ہے سامعیں کا مثل قمری نعرہ زن ہونا
کہ اک اک شعر موزوں سرو رعنا ہو ہی جاتا ہے
زمین سخت میں بھی معنیٔ روشن نکلتے ہیں
صدف میں دُر حجر میں لعل پیدا ہو ہی جاتا ہے
بناوٹ کی ضرورت کیا تصنع کی ہے حاجت کیا
طبیعت ہو جو بانکی شعر بانکا ہو ہی جاتا ہے

جلیل نے جس وقت امیر کی شاگردی اختیار کی
ہے اس وقت امیر مینائی خود لکھنوی رنگ کو چھوڑ کر داغ
کا رنگ اختیار کر چکے تھے اور کھلے بندوں ؎

امیر اچھی غزل ہے داغ کی جس کا یہ مصرع ہے
بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں

کہنے لگے تھے۔ جلیل نے بھی یہی داغ والا رنگ اختیار کرلیا
اور اپنی شاعری کو سلاست بیان، سادگی روانی، بے
تکلفی اور خیالات کے سلجھاؤ کی حد تک محدود کرلیا، فلسفہ
اور تصوف کو انھوں نے اپنی شاعری میں جگہ نہیں دی بلکہ
حقیقی حسن پرستی اپنا شعار بنالیا، ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء
تک مسلسل داغ کے ساتھ رہنے داغ کو سننے اور انکی غزلوں
پر غزلیں کہنے سے جلیل میں بھی داغ کا رنگ نکھر گیا اور
وہ داغ سے قریب ہوتے گئے، اس قسم کے شعر اسی قرب
مکانی اور ہم خیالی کی زندہ مثال ہیں ؎

ادا ادا میں ہے قدرت کی دی ہوئی مستی
شراب کی تمھیں حاجت ہے کیا شباب رہے
کچھ اس ادا سے یار نے پوچھا مرا مزاج
کہنا پڑا کہ شکر ہے پروردگار کا
جب میں چلوں تو سایہ بھی میرا نہ ساتھ دے
جب تم چلو زمین چلے آسمان چلے
مار ڈالا مسکرا کر ناز سے
ہاں مری جاں پھر اسی انداز سے

اُستاد جلیل حقیقی شاعر تھے اسی گوشت پوست کے
انسان سے ان کو محبت تھی اسی سی دھری چوٹی پر د
مٹے ہوئے تھے اسی انداز و ادا پر جان دیتے سمجھے ہوئے تھے
عشق ظاہری کی خلش پر فدا تھے، بظاہر یہ بات بہت ہی
معمولی معلوم ہوتی ہے، عورت سے محبت کرنا اور اس کے
عشوہ و ادا کا ذکر کردینا کونسی بڑی بات ہے؟ ٹھیک ہے بالکل
معمولی بات ہے! مگر اس معمولی بات کو ندرت ادا سلاست
بیان، روانی اور بے تکلفی سے صاف ستھرے اور سلجھے ہوئے
طریقے پر ادا کرنا کمال اور انتہائی کمال ہے، یہی اُدب کی
جان اور حقیقی ادب ہے، ورنہ فلسفہ کے اُدق مسائل اور
تصوف کی گتھیاں نظم کر جانا کوئی بات ہی نہیں ہے اگر آپ
اس قسم کی شاعری دیکھنا چاہتے ہوں تو استاد ذوق کا کلام
ملاحظہ فرمائیے یا غالب کے ان اشعار کو ملاحظہ کیجئے جن میں تصوف
و فلسفہ ہے، میر اور درد، مومن اور داغ جلیل اور اثر کو بھی
دیکھئے یہ بے چارے سامنے سامنے کی باتیں نظم کرتے اور معقول

بعض معترضین "چوما چاٹی" کر لیتے ہیں مگر آپ حیران ہونگے کہ
یہی چوما چاٹی ادب کی جان ہے اور حقیقی شاعری یہی ہے،
معترضین کمال یہ کرتے ہیں کہ جن فیلسوف اور صوفی منش شاعروں
کی مدح سرائی کرتے ہیں۔ اور جن کو حقیقی شاعر مانتے ہیں ان
کے ان ہی اشعار پر سر دھنتے ہیں جو چوما چاٹی کے ہیں مثلاً
غالب کے گلدستہ طاق نسیاں والے اشعار کو چھوڑ کر ح

بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں!
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہو گئیں!
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکے تو پھر لہو کیا ہے؟
میں نے یہ جانا کہ گویا وہ بھی میرے دل میں ہے!

جیسے اشعار کو حرز جاں بنائے ہوئے ہیں، سنیئے آج
ایک ایسی راز کی بات عرض کرتا ہوں جس کو سب جانتے ہیں -
مگر بتاتے نہیں وہ یہ کہ دنیا کا ہر شاعر انہیں چوما چاٹی کے
شعروں کی وجہ سے زندہ رہے گا، سعدی کی گلستاں اسی لئے
دنیا میں مقبول ہے کہ اسی میں چوما چاٹی کافی مقدار میں موجود
ہے، شاہ نامہ کی رزمیہ ثقالت اسی وجہ سے - - - -
برداشت کر لی جاتی ہے کہ منیژہ
کی شیریں ادائیاں بھی اس میں ہیں، یونان کے ہومر سے
لے کر عرب کے امرالقیس تک، ایران کے حافظ سے لے کر
مرادآباد کے جگر تک جتنے شعراء کا کلام آپ کو زندہ ملے گا وہ
عاشقانہ ہی ہوگا، دور کیوں جائیے اُردو شعراء ہی کو لے
لیجئے، دکن کے شعراء نے ہزاروں اشعار کے دیوان چھوڑے
ہیں مگر ان میں عاشقانہ جذبات ابتدائی اور چوما چاٹی کے
شعر کم ہیں اس لئے وہ مشہور نہ ہو سکے ؎

سب صنعتیں جہاں کی آزاد ہم کو آئیں
پر جس سے یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

والے شعر ہی زبان زد خاص و عام ہیں ورنہ ؎

ہر کس کہ خیانت کند البتہ بترسد
بے چارہ نوری نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے

اس قسم کے شعر سننے ہی میں نہیں آتے،

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

قسم کے بہتر شعر جن کو لوگوں کے میر کے بہتر نشتر بنا رکھے
ہیں مگر ؎

سودا کی جو بالیں پہ گیا شور قیامت
خدام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

قسم کے شعر عوام کی زبان پر آنے نہیں پاتے،
درد کے کلام میں لوگ کھینچ تان کر فلسفہ بھی نکا
لیتے ہیں اور تصوف بھی مگر درد اور حافظ شیراز دونو
ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں جس طرح خواجہ حا
کی شراب حقیقت اور مجاز کے درمیان جھول رہی ہے
اسی طرح خواجہ میر درد کا تصوف بھی عشق حقیقی اور عش
مجازی کے بیچ میں آ جاتا ہے، اہل ذوق تو ان دونوں
اشعار کو چوما چاٹی ہی سمجھ کر جان دیتے ہیں، اہل دل تو
کی عینک سے دیکھیں تو یہ ان کا اپنا مذاق ہے،
مومن، غالب، اور ذوق ان تینوں ہم عصر شعرا
بیک وقت شاعری کی ہے مومن اور غالب دونوں نے
چاٹی کی ہے، مومن تو اسی کے لئے وقف تھے ان کے
سوا عشق و عاشقی کے اور کوئی بات ہی نظر نہیں آتی،
شروع میں غالب نے "ظہوری و طالب" سے ہم زبانی
نظیری و بیدل اور خسرو کی طرف متوجہ ہوئے تو مومن
اتباع کرنے لگے اور "سادگی ہائے مضامین" کو چھوڑ کر
ہی تو ہے نہ سنگ و خشت" کہنے لگے اور جیسا کہ میں
پہلے عرض کیا ہے غالب کے وہی شعر مقبول ہوئے جو
کے انداز میں کہے ہوئے تھے ورنہ "طرز بیدل" میں ر
کہہ کر غالب، غالب نہ ہو سکے اسداللہ خاں ہی تھے

ذوق کا نام غالب اور مومن کے ساتھ لینا میری
دانست میں تو ظلم ہے شیخ جی مشتاق تھے مگر ان کو عشق
و عاشقی سے سروکار نہ تھا ایسے شعر ضرور کہے ہیں جو سانڈے
کے تیل کا اشتہار بن سکیں ع

مرا عشق کم خرچ بالا نشیں ہے!

پیر مغاں کے پاس وہ دارو ہے جس سے ذوق
نامرد مرد، مردِ جواں مرد بن گیا

یہی وجہ ہے جو آج غالب شعرائے اُردو پر غالب
ہیں اور مومن کی شاعری سے انکار کفر ہے مگر لوگوں نے
ذوق کو بھلا دیا ہے وہ جو محمد حسین آزاد کا پروپیگنڈا تھا
جو ذوق کو آب حیات نے حیات مستعار بخشی تھی ورنہ وہ
ظلمات ہی میں رہتے،

نظام رامپوری ایک بڑے اچھے شاعر تھے بڑا زلیں
غزلیں کہیں کئی دیوان مکمل کئے سبھی قسم کے شعر کہے مگر ان
کا کوئی سنجیدہ شعر مشہور نہ ہو سکا ؎

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیا مسکرا کے ہاتھ
دینا وہ ان کا ساغرِ مئے یاد ہے نظام
منہ پھیر کر اُدھر کو اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ
آج کل آپ سے باہر ہے نظام
کہیں محفل میں نہ بُلوا لیجئے گا

جیسے شعر اب تک زندہ ہیں، اسی طرح مومن
کے مشہور شاگرد اور غالب کے دوست جو بڑے اچھے
نقاد تھے جنھوں نے گلشن بے خار ترتیب دے کر سب
سے پہلے تنقیدی روش اختیار کی ہے اور غالب کا تو یہ
حال تھا کہ

نوشت در دیوان غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نکرد!

یہ مصطفیٰ خاں شیفتہ بڑے شاعر تھے صاحب ذوق
جہاں تھے مگر ان کے پورے دیوان میں سے چند ہی شعر
شہرت دوام پا سکے جن میں سے ایک ؎

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

معاف فرمائیے ایک واقعہ یاد آگیا چونکہ اس کا تعلق استاد
جلیل سے ہے اس لئے عرض کرتا ہوں، کوئی پینتیس سال ہوئے
کہ میں نے اُردو کے کسی شاعر پر کچھ لکھتے ہوئے اپنے ایک مضمون
میں لکھا تھا کہ پوری غزل کسی اُستاد کی بھی مرصع نہیں ہوا
میر جیسے اُستاد کی غزل میں بھی بھرتی کے شعر بہت ملتے ہیں
آج کل اُستاد جلیل کی غزلیں طبع ہوتی رہتی ہیں آپ اٹھا کر
دیکھئے غزل میں دو تین شعر ہی اچھے ہوتے ہیں اور بقیہ
بھرتی کے، جلیل پرستوں کو یہ مضمون بُرا لگا اور ایک صاحب
نے اُستاد کو سُنایا کہ کسی شخص نے یہ اعتراض کیا ہے اُستاد
آخر اُستاد تھے کہنے لگے ذرا وہ رسالہ لا دو تو میں بھی دیکھوں
آخر لکھا کیا ہے چنانچہ رسالہ منگوایا اور پڑھ کر فرمایا بالکل صحیح
لکھا ہے واقعہ یہ ہے کہ پوری غزل کسی کی بھی مرصع یا انتخاب
نہیں ہوتی دو تین شعر بھی اگر کسی شخص کی ہر غزل میں اچھے
نکل آئیں تو اس کی اُستادی کے لئے کافی ہے، بات ختم ہوگئی
پھر لوگوں سے پوچھا کہ یہ تمکین کاظمی کون ہے، ایک میرے ملنے
والے جو اس وقت موجود تھے میرے متعلق کچھ اُلٹا پلٹا بتایا تو
فرمایا ان سے مل کر میرا سلام کہیے کہ کبھی ادھر تشریف لائیں تو
غریب خانہ پر بھی قدم رنجہ کریں، استاد کا اس طرح یاد فرمانا
مجھے بڑا اچھا معلوم ہوا، واقعہ یہ ہے کہ اُستاد جلیل جب امیر مینائی
کے ساتھ تشریف لائے تو اُستاد داغ کے پاس میرے والد
مغفور سے بھی ملاقات ہوئی اور جب وہ حیدرآباد میں مقیم
ہوگئے تو خوب ملاقاتیں رہیں پھر مہاراجہ بہادر کے پاس
ملازم ہوگئے تو اور ملاقاتیں بڑھ گئیں اور خاصی دوستی ہوگئی
چنانچہ اُستاد ترکی، اُستاد ظہیر دہلوی اور اُستاد جلیل اکثر
غریب خانہ پر تشریف لایا کرتے تھے میری عمر اس وقت دس
سال تھی مجھ سے بھی مانوس تھے مگر اس کے بعد والد ماجد

ملازمت کی وجہ سے اضلاع پر رہے اور یہیں بھی حیدرآباد سے
باہر ہی رہا اس لئے اُستاد سے ملاقات نہ ہوسکی، اب جو استاد
کی خدمت میں حاضر ہوا تو مجھے دیکھ کر نواز فرمانے لگے قبل اسکے
کہ وہ اپنے حافظ کو زحمت دیں میں نے اپنا عرف اور والد
کا نام عرض کیا تو بہت خوش ہوئے اور فرمایا آپ نے صحیح لکھا
ہے ہر غزل میں ایک آدھ شعر بھی اچھا نکل آئے تو استادی ہے
ورنہ بعض دفعہ تو غزل کی غزل اکارت جاتی ہے۔

شعر اس وجدانی کیفیت کے اظہار کا نام ہے جو شاعر
متکیف ہونے کے بعد اپنے احساسات وادراکات کو دوسروں
پر ظاہر کرتا ہے اگر یہی بات تصویری پیرایہ میں پیش کی جائے
تو وہ مصوری ہو جاتی ہے ورنہ لفظی پیرایہ میں شاعری کہلاتی
ہے، اسی لئے شاعری اور مصوری دونوں کو ایک ہی درجہ دیا
گیا ہے اور شاعری کو محاکات کہا جاتا ہے، جس کا تخیل جتنا
بلند ہوگا وہ اتنا ہی اچھا شعر کہے گا جس کا اسلوب بیان جتنا
صاف ستھرا ہوگا اس کا شعر اتنا ہی عمدہ اور عام پسند ہوگا، بغیر
احساس، ادراک اور وجدان کے شاعری نہیں ہوسکتی، اور
یہ تینوں اس وقت متاثر ہوتے ہیں جب دل اثر پذیر ہو،
جب تک دل پر کسی چیز کا اثر نہ ہو ان احساسات میں جنبش نہیں
ہوتی اور دل کو حسن سے زیادہ کوئی چیز متاثر نہیں کرسکتی، شاعر
دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ کیفیت بیان کرنے لگتا ہے جو اس پر
گزری، بس اتنی ہی روداد ہے شاعری کی۔ مگر دنیا میں طبیعتیں مختلف
ہیں ہر شاعر اپنی طبیعت یا اپنے ذوق کے مطابق متاثر ہوتا اور
وہی بیان کرتا ہے،

جلیل لاہوتی حسن اور ملکوتی جمال پر فدا نہیں وہ مومن
اور داغ کی طرح اسی گوشت پوست کے حسن پر مٹے ہوئے تھے
ان کو کائنات میں حسن نسوانی ہی نظر آتا تھا، نسیم صبح گاہی، غنچہ و
گل کسی اور کو دوسری طرح متاثر کریں مگر جلیل انھیں بھی پری
اور معشوق ہی سمجھتے تھے۔

پریاں ہیں سب یہ غنچہ و گل اے نسیم صبح
کچھ اونگھتی ہیں کچھ ہیں ابھی خواب ناز میں

اسی طرح موسم گل میں کلیاں کھلتی ہیں تو ان کو چمن حسی
کا مرقع نظر آتا ہے ؎

موسم گل میں حسینوں کا مرقع ہے چمن
جو کلی کھلتی ہے تصویر نظر آتی ہے

آسمان کو دیکھ کر لوگ کائنات کے راز حل کریں مشـ
اور قمر میں جانے کی کوشش کریں جلیل کو اس سے کوئی سر
نہیں وہ فقط یہ دیکھتے ہیں کہ چرخ نے ایک آفتاب ہی
کیا ؎

اے چرخ کتنے خاک سے پیدا ہوئے حسیں
تو ایک آفتاب ہی چمکا کے رہ گیا

چونکہ پرانی روش پر گامزن رہے اس لئے عاشـ
میں بھی کم سنی ہی کی تلاش رہی ؎

فضل خدا سے اب ہے اسے چودھواں برس
پورا ہے چاند چاند کا ٹکڑا نہیں رہا

گلاب کی کلی ان کو صرف اپنے محبوب کی کم سـ
دلاتی ہے ؎

یہ رنگ گلاب کی کلی کا
نقشہ ہے کسی کی کم سنی کا

یہی کم سنی جب منزل شباب پر پہنچ جاتی ہے تو
چیخ اُٹھتے ہیں ؎

ہے تیری جوانی کہ پھٹی پڑتی ہے ظالم
پھر کوئی سنبھالے دل بیتاب کہاں تک

اس پھٹے پڑنے والی جوانی میں جب انداز و ادا
ہو جاتے ہیں تو غضب ہی ہو جاتا ہے ؎

ان شوخ حسینوں پہ جو آتی ہے جوانی
تلوار بنا دیتی ہے اک ایک ادا کو

ان ہی اداؤں کی چھریوں سے تڑپ اُٹھتے ؎

جنھیں کہتے ہیں سب شرمیلی ادائیں
انھیں چھریوں سے تڑپایا گیا ہوں

اور اسی ادا سے قتل بھی ہوتے ہیں حالانکہ نہ تو محبوب
کی نگاہوں میں خنجر ہے اور نہ آنکھوں میں تلوار ؎

ادا اک دیکھنے کی ہے وہ جس سے قتل کرتے ہیں
نہ ہے خنجر نگاہوں میں نہ ہے تلوار آنکھوں میں

محبوب کے سینے کو دیکھ کر جلیل پر کیا گزرتی ہے اس راز
کو فاش نہ کیجئے یہ راز سینہ "در سینہ" ہی رہے تو اچھا ہے ؎

برچھیاں دل پہ لگانا انھیں جب ہوتا ہے
اپنے سینے کو ذرا تان لیا کرتے ہیں

استاد جلیل کے پاس اس قسم کے شعر ہزاروں ہیں
مگر نہ تو مجھ میں ایسے اشعار نقل کرنے کی تاب ہے اور نہ آپ
پڑھ کر تاب لا سکیں گے اس لئے یہ قصہ ختم کرتا ہوں، مگر واقعہ
یہ ہے کہ جلیل نہ صرف آرٹسٹ تھے بلکہ بڑے اچھے نقاد بھی
تھے ان کے ہر شعر سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے ؎

حسینوں کے مرقعے یوں تو نظروں سے بہت گزرے
مگر سو میں کہیں اک آدھ صورت دل نشیں نکلی

جلیل نے یہ معیار بھی مقرر کر دیا ہے کہ "دل نشین"
صورت کیسی ہوتی ہے ؎

چشم و دل جس کے ہوں مشتاق وہ صورت اچھی
جس کی تعریف ہو گھر گھر وہ جمال اچھا ہے

اب تک فقط ایک ہی رنگ کے شعر میں نے سنائے
ہیں اب بلند شعر بھی سنیئے ؎

کسی دن تم نے رکھا تھا حنائی ہاتھ سینے پر
خدا شاہد ہے ٹھنڈک آجتک ہم دل میں پاتے ہیں

اتنی مہلت نہیں ملتی کہ کوئی بات کروں
وہ نظر ملتے ہی بے خود مجھے کر دیتا ہے

عشق میں رنجیں جوانی ہو گئی
زندگانی زندگانی ہو گئی

فغاں میں درد و غم میں اثر نہیں آتا
تم نہیں ہو تو کوئی ادھر نہیں آتا

جاتے ہو خدا حافظ ہاں اتنی گذارش ہے
جب یاد ہم آجائیں ملنے کی دعا کرنا

غنچۂ خاطر خوشی سے کھل گیا
آپ کیا آئے خزاں نہ جل گیا!

چوما چاٹی کے صرف چند شعر نقل کرتا ہوں دیکھئے استاد
کتنا کھیل کھیلتے ہیں ؎

کھینچ کر پہلو میں بوسہ لے لیا
ان کا وعدہ میں نے خود پورا کیا

پا کے ان کو بڑھ گئی ہے اور بھی کچھ آرزو
کل تھے کیا کہنے کو ہم اور آج کیا کہنے کو ہیں

مزے بے تابیوں کے آ رہے ہیں
وہ ہم کو ہم انھیں سمجھا رہے ہیں

تو کہے مجھ سے بگڑ کر تجھے ہم کیا جانیں
میں کہوں تجھ سے لپٹ کر تجھے ہم جانتے ہیں

کتنی ہی دیر رہ کے وہ جانے کا نام لیں
کہتا ہے دل یہی کہ ابھی سے کہاں چلے

آخر میں استاد نے یہ رنگ چھوڑ دیا تھا اور بڑے
نفیس شعر کہنے لگے تھے اس آخری شاعری کا مجموعہ "روح سخن"
کے نام سے مرتب ہے مگر فرزندان جلیل اسے آج چھپواتے ہیں
نہ کل سنا ہے کہ روح سخن کا ایک انتخاب یا کچھ حصہ بمبئی سے
جلیل کے ایک عزیز نے شائع کر دیا ہے مگر وہ بھی دیکھنے
میں نہیں آیا، اب روح سخن اور اسی رنگ کے شعر سنیئے ؎

جدا ہونے پہ دونوں کا یہی معمول ٹھہرا ہے
وہ ہم کو بھول جاتے ہیں ہم ان کو یاد کرتے ہیں

وہ آئے یا نہ آئے غرض اس سے کچھ نہیں
آنکھوں کو پڑ گیا ہے مزہ انتظار کا

جبتک خلش درد تھی کچھ گو نہ مزہ تھا
جب سے مجھے آرام ہے آرام نہیں ہے

تم یہاں سے گئے کیا مری دنیا ہی بدل دی
وہ لطف نہیں، وہ سحر و شام نہیں ہے

نہیں معلوم کس کی جستجو تھی ہیں نہ کچھ سمجھا
تمھاری یاد آئی رات کو اور بار بار آئی

غرور ان کا جو ٹوٹا تو عاجزی سے مری
بجز نیاز کوئی ناز کا جواب نہیں

اظہار حال پر مجھے قدرت نہیں رہی
ان کو یہ وہم ہے کہ محبت نہیں رہی

نگاہیں ملتے ہی اُٹھ جائیں پردے دونوں جانب سے
یہ تب ہوتا ہے جب آنکھ سے دل مل کے ملتا ہے

چمن کی سیر دونوں کو ہے یکساں فرق اتنا ہے
جو ہم آئے یا خزاں آئی جو تم آئے بہار آئی

ہم دور سے کر لیتے تھے پھولوں کا نظارا
کیا جانئے کیوں ہم کو گلستاں سے نکالا

تم یہاں تھے تو محو صورت تھا
اب تصور ہے مشغلہ دل کا

اس کو محو خیال کہتے ہیں
کی نظر جس پہ تم نظر آئے

مدت ہوئی وصال کو اب تک ہے یہ خیال
بیٹھا ہے کوئی گود میں ناز و ادا کے ساتھ

آخری عمر میں اُستاد بس دھیان گیان اور مراقبہ ہی کرتے رہتے تھے ؎

اک ذرا دھیان بٹا اور قیامت آئی
پھر وہی عالم وحشت وہی تنہائی ہے

ہائے پوچھو نہ تصور کے مزے
گود میں تم کو لئے بیٹھے ہیں

بہاریں لٹا دیں جوانی لٹا دی
تمھارے لئے زندگانی لٹا دی

اُستاد جلیل نے پچاس پچپن سال مشق میں جو بات پیدا کی تھی وہ خاص تھی، بچپن سے ان کا مشغلہ ہی شاعری رہا ہے اور مرنے تک شاعری کرتے رہے، انھیں پیٹ پالنے کے لئے بھی شاعری ہی کرنی پڑی ایسی نفیس خدمت کس کو نصیب ہوتی ہے داغ اور جلیل ہی ایسے خوش قسمت یہاں ہوئے ہیں جو شاعری کی روٹی کھاتے رہے اور شاعری ہی نے انھیں عزت و حرمت دے کر معراج کمال پر پہنچایا، یہ لوگ ہی ختم نہیں ہوئے یہ سلسلہ ہی مسدود ہو گیا اب شاعری کی وہ عزت کہاں اور شاعر کو یہ فراغت کہاں نصیب ہو سکتی ہے۔

تمکین کاظمی

آذربایگان

ایران کے شہروں میں سے آذربائجان ہی سب سے زیادہ مشہور رہا ہے کیوں کہ آزادیٔ ایران کے بعد سے سارے جشن اور انقلابی جلسے آذربائجان ہی میں ہوتے رہے اور زیادہ تر مطبوعات ایران جو ایران سے باہر گئیں اسی شہر میں طبع و شائع ہوئیں اور ایران کے اس شہر سے یورپ اور دوسرے ممالک زیادہ واقف ہوئے، برصغیر ہندوستان و پاکستان تو اس نام سے بہت مانوس ہے کیونکہ ایران کے تعلقات کی وجہ سے آذربائجان برصغیر میں مشہور ہی رہا ہے مگر اس کی تاریخ اور نام کی رنگارنگی سے ایرانی ہی زیادہ واقف نہیں ہیں تو ہم کیا واقف ہو سکیں گے، اس لئے آیئے آج اسی خشک موضوع پر بات چیت کریں،

یہ نام دو ہزار سال سے ایران کی جغرافیہ میں اہم اور ہر حادثہ میں لیا جاتا رہا ہے مگر کسی نے اسے ایک طریقے سے نہیں لکھا، آذربایجان، آذربایگان، آذربادگان تین شکلوں سے فارسی کتابوں میں لکھا جاتا رہا —— فردوسی نے اسے آذرآبادکان نظم کیا ہے،

بیکماہ در آذر آبادگان
بودند شاہان و آزادگان[1]

تازیوں نے آذربیجان کہنا شروع کیا، ارمنی کتابوں میں اوربادآقان، آذربایاقان، دونوں ہی لکھے ہوئے ہیں، پہلوی کتابوں میں آتورپاتکان، لکھا ہے،

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان گوناگون ناموں میں صحیح کونسا ہے اور یہ نام کیوں بدلتے گئے؟

استرابون جغرافیہ نگار یونانی کا بیان ہے کہ جب ہخامنشی سلطنت ختم ہوگئی اور اسکندر مقدونی نے ایران کو اپنے قبضۂ اقتدار میں لے لیا تو ایران کے حصے ماد کوچک کے ایک سردار آتورپات نے اپنے علاقے کی حفاظت کی اور اسے یونانیوں سے بچایا اس لئے اس سرزمین کا نام آتورپاتکان ہوگیا، اور آتورپات اس علاقے کا بادشاہ بن گیا۔

استرابون نے اپنی کتاب اشکانیوں کی بادشاہت کے زمانے میں مرتب کی ہے جو ولادت مسیح کے قریب کا زمانہ ہے اس نے لکھا ہے کہ ابھی تک جانشینان آتورپات باقی ہیں اور اسی سلطنت یا ریاست پر قابض ہیں اور ان کی قرابت بادشاہان ارمنستان، اشکانیاں اور حکمرانان سوریا سے ہے،

استرابون کی تحریر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آذربایگان نام اصل میں آتورپاتگان تھا اور سکندر کے زمانے سے اب تک تقریباً تیئس سو سال سے اسی نام سے موسوم ہے

[1] دیکھو فرہنگ سروری،

یہ حصہ ماد یا مادان کہلاتا تھا مگر صرف ماد نہیں
لاتا تھا بلکہ ہمدان اور اس کے نواح کو ماد بزرگ اور
ر بایگان کو ماد کوچک کہتے تھے، چنانچہ ماد کا نشان اب
آذر بایگان میں باقی ہے، دشت بزرگ کو جو حصہ غربی
ر تبریز سے کنار دریاچۂ ارومی تک پھیلا ہوا ہے مغلوں
تاخت کے زمانے تک دشت بامان یا دشت مایان کہتے
تے جس سے مراد دشت مادان تھی کیونکہ ساسانیوں کے
مانے میں بلکہ اوائل اسلام تک بجائے ماد کے ماہ کہتے
تھے چنانچہ آذر بایگان میں "ماما" ہی کہا جاتا تھا چنانچہ
یک قریہ جو آخر دشت میں ہے اب تک مایاں کے نام سے
معروف ہے جو ماد کی آخری یادگار ہے،

مغلوں کے زمانے میں رشید الدین وزیر اور دوسرے
لوگوں نے افسانہ نگاری اور لغت طرازی کی ہے کہ آتشکدہ
کی وجہ سے یہ نام بنا بالکل غلط ہے،

مگر افسوس ہے کہ آذر بائگان کی حکومت جو یونانیوں
اور اشکانیوں کے زمانے میں بھی حکومت ایران سے بالکل
الگ تھی اور مدت تک رہی کوئی یادگار ایسی رکھنے نہ پائی
جو آج ثبوت کے طور پر پیش کی جاسکتی انتہا یہ کہ کوئی سکہ
تک نہ مل سکا،

استرابون کا بیان اس لئے بالکل درست ہے کہ
وہ اشکانیوں کی سلطنت کے زمانے میں زندہ اور آتورپات
سے بہت نزدیک تھا اس نے صاف طور پر لکھا ہے کہ آتور
پات کا خاندان ابھی باقی اور آذر بایگان پر تسلط رکھتا
ہے، استرابون ایک ثقہ مورخ ہے جس کی تاریخ کو اہل فن
عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں،

آتورپات یا آذر باد نام ایران میں بہت مقبول
رہا ہے اور اس نام کے بہت سے آدمی گزرے ہیں، آذر
بایگان یا آتورپاتگان جو اب ایک کلمہ سمجھا جاتا ہے تین
کلموں سے ترکیب پایا ہے،

آتور یا آذر، پات یا پائے، کان یا گان، چونکہ اس
کلمہ کے معنی اور شکل سے بحث ہے اس لئے ان تینوں کلموں
سے الگ الگ بحث کرنی چاہیئے۔

آتور، پرانا فارسی پہلوی زبان کا کلمہ ہے جس کے
معنی آگ کے ہیں، اسی کو آذر بنایا گیا جو آج تک مستعمل ہے،
ایران میں دال ہمیشہ نقطہ دار ہوتی تھی جو ساسانیوں کے
دور اور اوائل اسلام تک جاری رہی اس کے بعد مغلوں
کے زمانے میں دال اور ذال کا فرق کیا جانے لگا اور اس
کے قواعد بنائے گئے، مگر آذر کی ذال بجائے خود باقی رہی
اور دال سے بدل نہ سکی مگر قواعد کی رو سے آذر بایگان کی
ذال کو بے نقطہ لکھنے یا بولنے میں کوئی ممانعت نہ رہی مگر
دہقان آذر بایکان کو اپنی سرزمین کو آذربیجان دال بے
نقطہ ہی سے بولتے ہیں۔

پات، پاییدن سے نکلا ہے جس کے معنی نگہبانی کرنے
کے ہیں، یہ لفظ پہلوی میں پاتن تھا، آتو پاتگان کا پات بھی
اسی سے مشتق ہے، آتورپات کے معنی "آتش نگہدار" کے
ہوتے ہیں اور ورتپات = گل نگہدار کے ہے، مگر پات
کے بارے میں صرف قیاس ہی قیاس ہے، یقین سے نہیں
کہا جا سکتا کہ یہ کس کلمہ سے مشتق ہے اور اس کے کیا معنے
ہیں،

بہر حال پات ایک مدت کے بعد پاذ اور پھر باد بنا
چونکہ لہجۂ ہمدان میں دال یا رے سے بدل جاتی ہے جیسا کہ
مادان اب مایان بن گیا ہے اور مادہ (ضد نر) ابھی تک
آذر بایکانیوں کی زبان پر مایہ ہے اس لئے پانت بھی پائے
بن گیا،

لیکن پائے تین نقطہ سے گھٹ کر ایک نقطہ پر اس لئے
ملکا کر لوگ اس کا تلفظ اسی طرح کرنے لگے،

کان، یہ کلمہ جو بعد کو گان ہوگیا فارسی (ابنا شہروں
اور قصبوں کے ناموں میں بہت آتا ہے چنانچہ رودگان،

گرگان، زنجان، ارزنگان وغیرہ جیسیوں نام ابتک موجود ہیں، اس کے معنی کے متعلق دو احتمال ہیں ایک یہ کہ جگہ اور زمین کے معنی میں دوسرے نسبت کے لحاظ سے جیسے بازارگان دهگان، شایگان وغیرہ،

بہرحال آذر بائیگان کے معنی ہوتے ہیں سرزمین یا شہر آذر باد، مگر صحیح اور قدیم وہی آتور پاتگان ہے جو آذر باذگان، آذر بادگان، آذر پائیگان بن کر اب آذر بائیگان بنا ہے اور چونکہ ایران کے بعض شہروں میں گ کو ج سے بدل دیتے ہیں اس لئے آذر بایجان بن گیا مگر چونکہ اب آذر بایجان معرب سمجھا گیا اس لئے ایرانیوں نے ج کو ناپسند کرکے وہی آذر بائیگان باقی رکھا،

مگر آذر آبادگان بالکل غلط ہے فردوسی نے ضرورت شعری کے لحاظ سے یہ تصرف کیا ہے اس کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔

کاپی رائٹ

حکومت پاکستان نے مشہور ماہر تعلیمات ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی کے زیر صدارت ایک کمیٹی مقرر کی ہے جو کاپی رائٹ کے آرڈیننس کے مسودے پر غور کرے گی۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کا نمائندہ بھی اس میں شریک ہوگا۔

بعض اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ حتمی مسودہ تیار ہوگیا ہے یعنی پاکستان رائٹرز گلڈ اور دیگر جماعتوں سے جن کے نمائندے حکومت کی مقرر کردہ کمیٹی میں شامل ہیں، باقاعدہ مشورہ نہیں لیا گیا۔ اس خبر میں کوئی صداقت نہیں۔

ایک وضاحت

بعض حلقوں میں یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ گزشتہ مارچ میں دلی میں جو انڈو پاکستان کلچرل کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس میں پاکستان رائٹرز گلڈ کا وفد بھی شریک ہوا تھا۔ اصل حقیقت اس سے مختلف ہے۔

اس دعوت میں شرکت کے لئے رائٹرز گلڈ کو وزارت تعلیم کی معرفت دعوت نامہ آیا تھا لیکن گلڈ کی مرکزی مجلس عاملہ نے اپنے اجلاس جنوری میں یہ طے کیا کہ گلڈ اس کانفرنس میں شرکت کا خرچ برداشت نہیں کرسکتا لہٰذا کوئی وفد نہ بھیجے گا۔ اس کے بعد یہ معاملہ گلڈ کی حد تک ختم ہوگیا۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی قیادت میں جس وفد نے شرکت کی اس میں ماہرین تعلیمات، مورخ، مصور، موسیقار اور فلم والے بھی شامل تھے۔ انہی میں ادیب بھی تھے لیکن سب کے سب گلڈ کے ممبر نہ تھے یہ انتخاب اچھا تھا یا برا، بہرحال گلڈ اس کی ذمہ داری سے بری ہے لہٰذا اس سلسلے میں کسی قسم کی نکتہ چینی غیر متعلق ہے

صحت مند اور بشاش رہئے!
ماہ بہ ماہ تکلیف اٹھانے اور کسل مند رہنے کی بجائے
مستورین کا باقاعدہ استعمال شروع کر دیجئے۔
اس سے آپ کے معمولات میں باقاعدگی اور صحت میں
خوشگوار تبدیلی پیدا ہو جائے گی۔
مستورین خواتین کے لئے ایک عمدہ ٹانک اور انکی
عمومی تکالیف کا مؤثر علاج ہے۔
مستورین
نسائی تکالیف کا علاج
اور محافظ صحت

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

اُردو نثر نگاری کے جدید رُجحانات٭

آزادی کے بعد اُردو نثر کی ترقی اور اسالیب کے
ع میں تقریباً سبھی اصناف نے حصہ لیا ہے۔ لیکن اس دور
نثر کا مقدر اگر کسی ایک صنف سے وابستہ رہا ہے تو وہ
نہ ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آزادی کے بعد کا زمانہ
و افسانے میں خاموشی زوال کا دور ہے۔ حالانکہ ایسا
۔ یہ صحیح ہے کہ بعض اچھے افسانہ نگار موت کی آغوش
چلے گئے۔ چند ایک نے ترقی پسندی کا طلسم ٹوٹنے کے بعد
بند کر دیا اور جو لکھتے ہیں ان میں سے بیشتر کی رفتار سست
ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ افسر میرٹھی، اختر انصاری، احمد علی
سکری خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور نے قلم توڑ کر رکھ دیا
رابندر ناتھ اشک ہندی کی طرف نکل گئے ہیں۔ عسلی
حسینی، مجنوں گورکھپوری، حیات اللہ انصاری، عصمت
اور ممتاز مفتی کا پہلا سا زور نہیں رہا۔ لیکن اس سب
جو اُردو افسانے نے اس دور میں کیفیت اور کمیت دونوں
تبار سے ترقی کی ہے اور اُردو کے بعض زندہ جاوید
نے اسی دور میں سامنے آئے ہیں۔ آزادی کے بعد اردو
افسانہ نگاروں نے اپنا ادبی سفر برابر جاری رکھا ہے
کرشن چندر کا نام سرِ فہرست ہے۔ انھوں نے ان چند
میں مسلسل لکھا ہے اور بے تکان لکھا ہے۔ ان کے افسانو
میں رومان کی جو رنگینی اور دلکشی ہے۔ تخیل کی جو شعریت ہے۔
احساس کی جو نرمی اور گھلاوٹ ہے اور زبان کا جو رسیلا اور
شگفتہ انداز ہے، اس نے انہیں آزادی سے پہلے ہی اُردو
کا مقبول ترین افسانہ نگار بنا دیا تھا۔ لیکن غور طلب بات یہ ہے
کہ کیا پچھلے دس برسوں میں انہوں نے اس منصب کو برقرار
رکھا ہے۔ انھوں نے اس زمانے میں جو جی چاہا اور جیسے
چاہا لکھا۔ فنی خلوص کو سیاسی مسلک پر قربان کر دیا اور نت
نئے تجربے کئے۔ اس نے انھیں بجائے فائدہ کے نقصان پہنچایا
ہے لیکن زندگی کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر اب بھی صحتمندانہ
ہے۔ انھوں نے درد محبت سے چور ہو کر "چینی پنکھا" "ایک خوشبو
اُڑی اُڑی سی" اور "پرتو" جیسے پر لطف افسانے لکھے ہیں۔ وہ
زبان کے جادوگر ہیں اور الفاظ کو رومان کی خوشبو میں بسا کر
کچھ اس انداز سے دل کا ساز چھیڑتے ہیں کہ پڑھنے والا موضوع
اور فن کی نزاکتوں کو بھول کر جذبات کی دھندلی چاندنی میں
میں کھو جاتا ہے۔ وہ افسانے میں شاعری کرتے ہیں۔ یہ افسانے
کی کمزوری ہے۔ لیکن جہاں تک نثر نگاری کا تعلق ہے یہ تسلیم
کرنا پڑے گا کہ ایسی خوبصورت، رسیلی، رواں دواں، ہلکی پھلکی،
زمزمہ ریز اور رومان کی خوشبو سے مہکتی ہوئی نثر اردو میں
کرشن چندر سے پہلے کسی نے نہیں لکھی۔

٭ مال انڈو پاکستان کلچرل کانفرنس منعقدہ نئی دہلی کے لئے لکھا گیا تھا اور [illegible]

آزادی کے بعد جن افسانہ نگاروں نے اپنی روایات کو آگے بڑھایا ہے یا جن کے فن پر نکھار آیا ہے، ان میں احمد ندیم قاسمی، غلام عباس، سہیل عظیم آبادی، بلونت سنگھ، رضیہ سجاد ظہیر اور قرۃ العین حیدر اور پریم ناتھ در قابل ذکر ہیں۔ ان افسانہ نگاروں نے الفاظ کی آرائش یا زبان کے چٹخارے پر نظر نہیں رکھی بلکہ اپنے رچے ہوئے شعور کو رہنما بنایا ہے لیکن اس دور میں افسانہ کی ترقی کا زیادہ بوجھ نئے لکھنے والوں کے کندھوں پر رہا ہے۔ اے حمید۔ شوکت صدیقی۔ اشفاق احمد۔ دیویندر اسر۔ جیلانی بانو۔ واجدہ تبسم، م۔م۔ راجندر۔ محسن شمسی۔ رام لعل۔ شیش بترا۔ قدرت اللہ شہاب۔ انور عظیم، خلیل احمد وغیرہ نے اُردو افسانے کو نفسیاتی گہرائی اور نئی زندگی کے نئے امکانات کا درک دیا ہے۔ نئے افسانہ نگاروں نے علاقائی معاشرت کے تہذیبی افسانے بھی لکھے ہیں۔ زندگی کی ٹیڑھ اور سماجی گندگی کو بھی بے نقاب کیا ہے اور مشینی انسان کے سسکتے ہوئے وجود کو بھی موضوع بنایا ہے۔ مگر جدید افسانے کا بنیادی رنگ نارمل اور صحت مند زندگی کے حسن کو براہ راست اور سادہ زبان میں بیان کرنے کا ہے اور اس کی نمائندگی کا شرف راجندر سنگھ بیدی کو حاصل ہے۔ انھوں نے آزادی کے بعد صرف دو افسانے ——"لاجونتی" اور "اپنے دکھ مجھے دے دو" لکھے ہیں۔ ان میں سے دوسرا تو یقیناً اس پایے کا ہے کہ اگر بیدی نے کچھ اور نہ لکھا ہوتا تو بھی اس افسانے کی بدولت اُردو اَدب میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہتا۔ اس میں محبت اور انسانیت کی ایک لازوال تصویر پیش کی گئی ہے اور ایک عام بیوی کے گھریلو پن۔ اس کی دردمندی اور ایثار کو سادہ اور بے لوث زبان میں اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ اُردو میں ایک عظیم کردار — "اندو" کا اضافہ ہو گیا ہے۔

حال ہی میں بیدی کا ایک ناولٹ — "ایک چادر میلی سی" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ افسوس ہے کہ اس کے انجام میں کچھ فلم کا سا انداز پایا جاتا ہے۔ لیکن اس کمزوری سے قطع نظر اس ناولٹ کو اگر بیدی کی فنی شخصیت کا مکمل عکس کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ بیدی کا انداز بیان، اس کی منظرکشی، اور کردار نگاری سب کچھ یہاں پورے عروج پر ملتا ہے۔ اس ناولٹ کا مرکزی کردار بھی ایک گھریلو عورت کا ہے۔ عورت جو کبھی بیٹی ہے۔ کبھی بیوی۔ کبھی ماں اور کبھی بیوہ ہے لیکن اس کے باوصف جو ہمیشہ عورت ہے اور حسن و صداقت کا مرقع۔ بیدی کا فن زندگی کی بصیرت کا فن ہے اور اس ناولٹ میں زندگی پر ان کی حیرت انگیز گرفت کو دیکھ کر بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ پریم چند کے بعد اُردو افسانے کی بہترین روایتیں راجندر سنگھ بیدی کے ساتھ وابستہ ہو گئی ہیں۔

پچھلے برس بیدی کے اس ناولٹ کے علاوہ کرشن چندر، قرۃ العین حیدر اور شوکت صدیقی کے ناول بھی سامنے آئے ہیں۔ شوکت صدیقی نے "خدا کی بستی" میں صنعتی شہروں کی گندگی اور بے راہ روی کی نہایت عمدہ تصویر کھینچی ہے۔ قرۃ العین حیدر اپنے عجیب سے احساس برتری اور بورژوا قسم کی رومانیت کے لئے مشہور رہی ہیں۔ لیکن ان کا ناول — "آگ کا دریا" ایک رچے ہوئے شعور اور سنبھلی ہوئی طبیعت کا پتہ دیتا ہے۔ اس میں STREAM OF CONSCIOUSNESS کے سہارے مشترک کلچر کی عظیم اور رنگین تصویریں پیش کی گئی ہیں۔ کرشن چندر کا ناول "غدار" چند ماہ پہلے شائع ہوا ہے۔ بقول ان کے اس میں انھوں نے دلوں کی کدورت، رعونت اور نفرت کی دیواریں مسمار کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ بیدی نے اپنے چھوٹے سے ناولٹ میں نارمل زندگی کے حسن کی جو جھلک پیدا کر دی ہے وہ دوسرے ناول نگاروں کے ہاں نہیں ملتی۔

جب سے ترقی پسند تحریک کا اثر زائل ہوا ہے۔ اُردو تنقید کا ولولہ بھی دھیما پڑ گیا ہے۔ ہنگامی موضوعات کے ختم ہونے کے بعد جس طرح ہمارا افسانہ آہستہ آہستہ اعتدال

آرہا ہے اسی طرح تنقید بھی اپنے کھوئے ہوئے توازن کو پانے لگی ہے۔ ممتاز حسین، سجاد ظہیر اور سردار جعفری کی رفتار میں ٹھہراؤ آگیا ہے۔ البتہ مجنوں گورکھپوری اور فراق گورکھپوری پھر سے مقبول ہو رہے ہیں۔ سید احتشام حسین کے ہاں بھی مارکسیت کا پہلا سا زور نہیں رہا۔ مارکسی نقطۂ نظر کے علاوہ وہ دوسرے تنقیدی نظریوں کی اہمیت بھی محسوس کرنے لگے ہیں۔ اور خود انھوں نے ایک کتاب "تنقیدی نظریات" پر مرتب کی ہے۔ مضامین کے بجائے اب اپنی توجہ کتابوں پر صرف کرنے لگے ہیں۔ وہ جان بیمز کی کتاب کا ترجمہ "اردو لسانیات کا خاکہ" کے نام سے کر چکے ہیں۔ انہوں نے تعلیم بالغان کے لئے "اردو کی کہانی" اور ہندی والوں کے لئے "ادب اُردو کی تاریخ" بھی لکھی ہے۔

اردو کے نوجوان نقادوں میں ڈاکٹر خورشید الاسلام اور ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے خاص طور سے غور و فکر کی دعوت دی ہے۔ خورشید الاسلام طرزِ نگارش پر دھیان دیتے ہیں اور لطفِ بیان پر نظر رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس اعظمی نثر عاری کے قائل ہیں اور خیال پر الفاظ کی رنگین تہ کے یکسر مخالف۔ ڈاکٹر محمد حسن کے ہاں آل احمد سرور کے طرزِ تحریر کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔ لیکن ان کے پاس نہ وہ شگفتگی ہے نہ لطافت۔ یہ صحیح ہے کہ ان چند برسوں میں جدید ادب کے بارے میں سب سے زیادہ انھیں نے لکھا ہے۔ انھوں نے انشائیہ اور ڈرامے پر بھی زورِ طبیعت صرف کیا ہے لیکن ان کی ادبیت کے جوہر تنقید ہی میں کھلتے ہیں۔

دورِ جدید میں اُردو کے صاحب طرز نقاد آل احمد سرور ہیں۔ سرور کا اسلوب نثر اپنی شگفتگی روانی اور خیال افروزی کے اعتبار سے بے مثل ہے۔ اُن کی تنقید خشک گنجلک یا فلسفیانہ قسم کی چیز نہیں بلکہ تخلیق کا پایہ رکھتی ہے۔ ان کے ہاں خیال اور الفاظ میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ وہ فارسی تراکیب کو بھی برتتے ہیں۔

اشعار سے بھی اپنی نثر کا آئینہ خانہ سجاتے ہیں۔ لیکن کہیں کوئی لفظ گراں نہیں گزرتا اور آمد کا رنگ ہے کہ شروع سے آخر تک چھایا رہتا ہے۔ ان کی کوئی سی تحریر دیکھئے، مربوط، مسلسل اور متوازن ملے گی۔ روانی، گھلاوٹ، شیرینی اور رنگین کے اعتبار سے اُن کے اسلوب سے اُردو میں ایک نئی روایت کا آغاز ہوا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ پچھلے چند برسوں سے وہ بہت کم لکھ رہے ہیں۔ غالباً کم فرصتی کی وجہ سے وہ تنقید کے لئے اتنا وقت نہیں نکال سکتے جتنا اسے پہلے دیا کرتے تھے۔ چنانچہ شاعری کی طرف اُن کا رجحان بڑھ رہا ہے ادھر چند برسوں میں ان کا نثری سرمایہ چند ادارتی نوٹس، تأثرات، تقریروں اور مقدموں پر مشتمل ہے۔ غالباً یہ "مقدمہ بازی" انجمن کے سکرٹری کا مقدر ہو کے رہ گئی ہے۔

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی علم و ادب کے قدیم و جدید سرمائے سے بہرہ مند ہیں۔ فارسی کے عمدہ اشعار پر جان چھڑکتے ہیں اور عرفی و غالب اور شبلی و آزاد سے متاثر ہیں۔ شروع شروع میں وہ "بندشِ الفاظ" پر زیادہ توجہ صرف کرتے تھے لیکن یورپ سے آنے کے بعد جیسے جیسے ان کی حسن کارانہ نثر اپنے آپ میں آئی ہے، اس میں ایک دلنواز قسم کی شوخی بے ساختگی اور بانکپن جھلکنے لگا ہے۔ ان کے طرزِ تحریر کی نمایاں خصوصیات شادابی، رعنائی اور طرحداری ہیں، جن کی تصدیق ان کی مشہور کتاب "میر تقی میر" کے پڑھنے سے ہو جاتی ہے۔

ان دو نقادوں کے علاوہ نثر نگاری کی بہترین روایتوں کی پاسداری اس دور میں بھی اگلے وقتوں کے لوگ کر رہے ہیں یعنی ڈاکٹر عابد حسین۔ عبدالماجد دریا بادی۔ رشید احمد صدیقی اور نیاز فتح پوری۔ خصوصاً نیاز فتح پوری کی رفتار پر تو نوجوانوں کو بھی رشک آتا ہے۔ موجودہ دور تخصیص کے فرد ہوتے ہوئے بھی وہ یک فنی نہیں۔ شاعری۔ افسانہ۔ انشا

تنقید، تحقیق، تاریخ، صحافت کونسا شعبہ ہے، جس میں انھوں نے اپنا نقش نہیں چھوڑا۔ اب بھی "نگار" کا پورا پورا نمبر وہ اکیلے ہی لکھ ڈالتے ہیں اور پھر تحریر کا وہ انداز کہ شبلی وہدی و آزاد کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ان کا طرزِ تحریر ان کے حسن پرست مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ خوبصورت تراکیب، خوش نما جملے، پھڑکا دینے والے اشعار اور الفاظ کے دروبست کا یہ عالم کہ تحریر کڑی کمان کا تیر معلوم ہوتی ہے۔

نثر نگاری کا ذکر کرتے ہوئے اُردو تحقیق کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ افسانے اور تنقید کے مقابلے میں تحقیق نے اس دور میں کہیں زیادہ تیزی سے ترقی کی ہے۔ دورِ جدید کے محققین میں ڈاکٹر زور۔ قاضی عبدالودود سید مسعود حسن رضوی امتیاز علی عرشی۔ مالک رام۔ ڈاکٹر مختار الدین آرزو۔ ڈاکٹر گیان چند جین اور ڈاکٹر وحید قریشی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے مالک رام اور عرشی صاحب نے اپنے اسلوب کی سادگی اور صفائی میں بھی ایک انفرادی شان پیدا کر لی ہے۔ قاضی عبدالودود کا طرزِ تحریر سائنسی ہے۔ اُردو میں علمی نثر کی بہترین مثال اگر کسی نے پیش کی ہے تو وہ قاضی صاحب ہیں۔

آخر میں اُردو کے بعض نوجوان نثر نگاروں کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ان میں ڈاکٹر قمر رئیس۔ نثار احمد فاروقی۔ رشید حسن خان۔ عابد رضا بیدار۔ ریوتی سرن شرما اور احمد جمال پاشا نے پچھلے چند ہی برسوں میں نئے ادب میں اپنی جگہ بنا لی ہے۔ احمد جمال پاشا انشائیہ نگار ہیں لیکن انھوں نے ظرافت میں غور و فکر سے کام لینا نہیں سیکھا اور ان کی تحریر اکثر بے لگام ہو جاتی ہے۔ فکر تونسوی بھی اس دور میں "پیاز کے چھلکوں" سے آگے نہیں بڑھے۔ ریوتی سرن شرما نے ریڈیائی ڈراموں میں نئے تجربے کئے ہیں۔ انھیں فکر و فلسفے کی ہلکی سی چاشنی بھی دی ہے۔ ان کا طرزِ تحریر صاف، سادہ اور مناسب ہے۔ ڈرامہ اور انشائیہ

میں ان نوجوان مصنفین کی کاوشوں کے باوجود ان اصناف بہترین روایات جدید دور میں بالترتیب پروفیسر محمد مجیب اور کنہیا لال کپور اور غلام احمد فرقت سے وابستہ رہتی ہیں نئی پود کے نقادوں میں ڈاکٹر قمر رئیس نے پریم چند پر قا قدر کام کیا ہے۔ ان کی نثر سلیس، شگفتہ اور شاداب ہے۔ رشید حسن خان نے اپنی ساری توجہ زبان اور عروض پر مرکوز کر رکھی ہے۔ موجودہ دور میں زبان و بیان کی راہ روی عام ہے۔ چنانچہ ان حالات میں کسی PURIST کا اُصول و قواعد پر حد سے زیادہ زور دینا فطری بات ہے نثار احمد فاروقی مشرق و مغرب دونوں سے مستفید ہو کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی تحریر میں بلا کی برُش، تیز اور روانی ہے لیکن ان کی حد سے بڑھی ہوئی جذباتیت کہیں کہیں ان کے ہنر کو عیب میں تبدیل کر دیتی ہے۔

لسانیات کا اٹل اصول ہے کہ نئی جغرافیائی، سیا اور تہذیبی حد بندیوں کا زبان پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ اُرد کا تعلق ہند آریائی خاندان سے ہے اور آزادی کے بع ہندی، سنسکرت اور بنگالی سے اس کا رشتہ اور بھی مضبو ہو گیا ہے۔ پچھلے سالوں میں ہندوستان میں اُردو کی کم کتابیں دیوناگری رسم الخط میں شائع ہوئی ہیں لیکن ا نثر نگاری کے جدید اسالیب پر ابھی اس کا کوئی قابلِ ذکر ا نہیں ہوا۔ علمِ زبان کے مشہور ماہر HOCKETT کا بیا ہے کہ نئے حالات سے اثر قبول کرنے کے لئے ALECTS یعنی بولیوں کو دو نسلوں اور زبان کو چار نسلوں کا عرصہ در ہوتا ہے۔ چنانچہ امید کی جا سکتی ہے کہ جیسے جیسے وقت گزرے گا، اردو، فارسی اور عربی کے علاوہ ہندی، بنگالی ا سنسکرت سے بھی استفادہ کرے گی۔ اور اس طرح جدید د کی تاریخی ضرورتوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اپنی حد کو اور بھی وسیع بنائے گی۔ غرض ان حالات میں یہ کہنا نہیں کہ: "پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ"

غلام حسین ذوالفقار

عمرانیات اور ادب

شعر و ادب کا عمرانیات سے کیا علاقہ ہے —؟
اس مسئلہ پر گفت گو کرنے سے پہلے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ عمرانیات کے حدود اربعہ کی ذرا وضاحت کر دی جائے۔ اور اس کی مبادیات پر ایک نظر ڈال لی جائے — پھر ادبیات کے ساتھ اس کے تعلق اور رابطے کا کچھ اندازہ ہو سکے گا —!

عمرانیات یا سوشیالوجی (Sociology) کی تشکیل بحیثیت ایک شعبۂ علم کے جدید دور یعنی انیسویں صدی کے ربع آخر میں ہوئی۔ سوشیالوجی کا لفظ سب سے پہلے آگسٹ کومٹ نے اپنے خطبات (۱۸۳۷ء) میں استعمال کیا۔ جو بعد میں اس کی تصنیف (Positive Philosophy) میں ظہور پذیر ہوا لیکن ایک عرصے تک یہ لفظ عام مستعمل نہ ہو سکا۔ حتیٰ کہ مل نے اس کو اپنی تحریروں میں استعمال کر کے مغربی دنیا میں عام کیا۔ اور انیسویں صدی کے ربع آخر میں یہ اصطلاحی لفظ بین الاقوامی علمی دنیا میں استعمال کیا جانے لگا۔ اسی زمانے میں ہربرٹ سپنسر نے عمرانیات کے مطالعہ اور اصولیات پر ضخیم کتابیں تصنیف کیں — تاہم اس شعبۂ علم کی بنیادیں بہت قدیم ہیں۔ اور اس کے متعلق معلومات کا ذخیرہ بہت وافر مقدار میں موجود ہے۔ آثار قدیمہ کی کھدائی اور قدیم شہروں کی دریافت نے اس مخزن معلومات کو ہزاروں سال پرانی تہذیبوں سے روشناس کر دیا ہے۔ تواریخ و اساطیر اور مذہبی و الہامی صحائف بھی اس مخزن علم میں شامل کئے جا سکتے ہیں۔ معلومات اور دریافت کے اس وافر ذخیرے کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عمرانیات علم کی ایک نئی شاخ ہونے کے باوجود بہت قدیم بھی ہے اس علم کا تعلق انسان اور اس کی اجتماعی زندگی سے ہے۔ وہ اصول و مسلمات جو تمدن کی اساس و بنیاد ہوتے ہیں، اور انسانی اجتماعی اداروں کے بننے بگڑنے اور معاشرے، سماج یا سوسائٹی کے نشو و ارتقا میں مدد دیتے ہیں، اس علم اجتماعیات یا عمرانیات کی ذیل میں آ جاتے ہیں۔

یہ ایک قدرتی امر ہے کہ جب سے انسان اس کائنات ارضی میں جلوہ گر ہوا ہے، عمرانیات کی نشو و نما بھی اسی کی زندگی کے فطری تقاضوں (یعنی بقائے نوع) اور مانند وبود کے طور طریقوں کے ساتھ ساتھ ہوتی رہی ہے — یہ تو ظاہر ہے کہ انسان اپنی انا (Ego) اور خودی (Self) کے باوصف ایک عمرانی ہستی ہے۔ انسان کا مادی ماحول اور تنازع البقا میں اس کی ضروریات اور مقتضیات۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی جبلت اور وجدان اسے اس امر پر مجبور کرتے ہیں کہ وہ اپنی انانیت و انفرادیت اور تنہا نشینی و خلوت پسندی کے باوجود کبھی کبھی اپنے خلوت کدہ

نے نکل کر موجودات عالم کے جلوت کدے میں آئے۔ غاروں کی تنہائی اور کوہ و صحرا کی دشت نوردی کو چھوڑ کر انسانی آبادی کے ہنگاموں میں شریک ہو، محفلوں کی رونق کو بڑھائے۔ زندگی اور زندگی کے لوازمات میں بنی نوع کا رفیق و معاون بنے۔ انہی ضرورتوں، تقاضوں اور جبلتوں کی متابعت میں غاروں، پہاڑوں، جنگلوں، بیابانوں اور صحراؤں میں بکھرے ہوئے انسانوں نے بستیاں بسائیں۔ گھر اور محلے، کوچے اور بازار، قصبے اور شہر بنائے۔ ریاستیں اور مملکتیں تعمیر کیں۔ اور ترقی کرتے کرتے اور تمدن و تہذیب کے مختلف زینے طے کرتے ہوئے بالآخر وہ اس منزل اور اس مقام پر پہنچا، جسے آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں ــــ اور ابھی معلوم نہیں کہ آگے چل کر وہ ارتقا و ترقی کی کون کون سی منزلوں کو طے کرے گا ــــ!

سطور بالا میں مذکور ہوا کہ عمرانیات کی تشکیل بحیثیت ایک شعبۂ علم کے دور جدید میں ہوئی ہے ــــ حیات انسانی کے اتنے وسیع تر موضوع کا ایک شعبۂ علم میں احاطہ کر لینا بظاہر جتنا خوش نما نظر آتا ہے، حقیقت میں اس سے بڑھ کر کٹھن اور دشوار کام ہے۔ اس امر کا احساس خود اس علم کے ماہرین کو بھی ہے۔ بقول پروفیسر بلیک مار و پروفیسر گلن "جب ہم انسانی معاشرے یا سوسائٹی کے علم (سوشیالوجی) کی باقاعدہ تشکیل کی کوشش کرتے ہیں، تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس مقصد کی خاطر جملہ معلومات کا فراہم کرنا، جو اس علم کی اساس و بنیاد ہیں، ازبس دشوار مرحلہ ہے۔ ایسے مفروضات اور کلیات کی مقدار بہت کم ہے، جو عالمگیر حقائق کی بنا پر ثابت شدہ ہوں۔ اور جن کی مدد سے عمرانیات کے واضح اصولوں کی عمارت تعمیر ہو سکے۔ وہ اصول و مسلمات، جو معاشرے اور اس کی محرک قوتوں کے نگراں ہیں، ابھی پوری طرح احاطۂ دانش میں نہیں آئے۔ تاہم عمرانیات کا مقصد معاشرتی اسرار و رموز کی واضح حد بندی اور اس کے اصول مرتب کرنا ہے۔ جس سے معاشرے کے تدریجی ارتقا میں منطقی ربط و تسلسل ظاہر ہو۔ اور ان قوتوں کو آشکار کیا جا سکے، جو معاشرے کی تعمیر کرتی اور اس کو حرکت و عمل میں لاتی ہیں ــــ" (Outlines of Sociology)

اس امر میں تقریباً سب ماہرین عمرانیات متفق الرائے ہیں کہ انسانی معاشرے کے عالم وجود میں آنے کا بنیادی سبب انسان کا طبعی ماحول اور اس کی مادی ضروریات زندگی ہیں ــــ اور اس امر کے تسلیم کر لینے میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔ فرد اپنی ذات میں خواہ کتنا ہی کامل اور خود مکتفی کیوں نہ ہو۔ مادی زندگی کی گوناگوں ضروریات اور نوامیس فطرت کے تقاضے اسے مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ بنی نوع کے اجتماع میں شرکت کرے۔ اور اجتماعی زندگی کے معاملات میں ایک دوسرے پر بھروسہ اور انحصار کرے۔ اس باہمی ربط ضبط اور میل جول کی صورت میں اسے بعض امور میں اپنی منشا و مرضی کے خلاف بھی معاشرے کے اجتماعی اصولوں کی پیروی کرنا پڑتی ہے۔ اپنی انا اور اپنی خودی کو پابستۂ زنجیر کر کے اجتماعی رائے کے تابع اور معاشرتی رسم و آئین کا پابند ہونا پڑتا ہے۔ یہ اجتماعی آئین و ضوابط زمانے کی ضرورتوں اور ماحول کے تقاضوں کے مطابق بنتے اور بنائے جاتے ہیں۔ اور زمانے کے بدلتے ہوئے رجحانات و میلانات کے ساتھ ساتھ ان میں بھی تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ اِلّا اُن حقیقتوں کے، کہ جو ازلی و ابدی ہیں، باقی قدروں کا بدلتے رہنا فطرت کی منشا کے عین مطابق ہے۔ اور جب کبھی یہ جامد و ساکن ہو جائیں، یا ان میں کسی طرح کا خلل واقع ہو جائے، تو معاشرے اور معاشرتی اداروں پر نزاع کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ فرد اور اجتماع سب کی زندگیاں اس صورت حال سے متاثر ہوتی ہیں ــــ بہرکیف معاشرتی رسم و آئین اور ضابطوں و اصولوں کی متابعت کے صلے میں فرد کو اجتماعی جد و جہد اور مشترکہ محنت و کاوش

کے ثمرات سے مستفید ہونے کا موقعہ ملتا ہے۔ اور افراد
کے حُسنِ نیت اور جذبۂ ایثار و مروت سے اجتماعی نظامِ زندگی
میں توانائی پیدا ہوتی ہے۔ گویا فرد اور اجتماع دونوں ایک
دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ کسی ایک کی اہمیت کو
کم کر کے دوسرے کی اہمیت کو بڑھانا بعید از فہم بات ہے
— معاشرہ مختلف النوع افراد کے رضاکارانہ اتحاد و
اشتراک کا عملی نتیجہ ہے۔ قدرت نے انسان کو شعور و احساس
اور عزم و ارادے کے ہتھیاروں سے لیس کیا ہے۔ اور
اسے فکر و ضمیر کی آزادی (Freewill) بھی عطا
کی ہے۔ وہ اگر اپنی اَنا اور خودی کو پابستۂ زنجیر کر کے اجتماعی
رسم و آئین کا پابند ہوتا ہے، تو کسی جبر کے ماتحت نہیں، بلکہ
برضا و رغبت ہوتا ہے۔ اگر اس میں جبر کا شائبہ بھی ہو، تو
یہ امر محکومی سے جا ملتا ہے۔ اور محکومی و بے بسی انسانی فطرت
کے خلاف اور معاشرتی نشو و ارتقا کے لئے زنجیرِ پا بن جاتی
ہے۔ اس لئے فرد اور اجتماع کے بارے میں بھی چند
بنیادی امور کو ذہن میں رکھنا نہایت ضروری ہے۔

سطورِ بالا میں مذکور ہوا کہ قدرت نے انسان کو شعور و
احساس اور عزم و ارادے کے ہتھیاروں سے لیس کیا ہے
قوائے فطرت کے مقابلے میں انسان کے پاس یہی ایسی
قوت اور شاہراہِ حیات میں یہی ایک ایسی زادِ راہ ہے،
جو اس کو کائناتِ فطرت کی تسخیر میں مدد دیتی ہے اور منزلِ
ہستی میں کامیاب و کامران کرتی ہے۔ انسانی شعور و احساس
حیات و کائنات کے جملہ اسرار و رموز منکشف کرنے کے
درپے رہتا ہے۔ کائنات کی حقیقت و ماہیت اور اس میں
اپنے منصب و مقام کی تلاش انسان کو ازل سے بے قرار
کئے ہوئے ہے۔ اس آرزو و جستجو میں اس کا شعور اور عزم
و ارادہ اسے ہر مشکل پر غالب آنے میں مدد دیتا ہے۔ معاشرتی
اداروں اور انسان کی انواع و اقسام کی تعمیروں کے
سوتے شعور و احساس کے سرچشموں سے ہی پھوٹتے ہیں۔

انہی کی مدد سے انسان نے بحر و بر اور فضا و خلاء کی تسخیر
اپنی ہستی اور کائنات کے سربستہ رازوں کو منکشف
کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہوا ہے۔ قدرت کی عطا کردہ یہ صلاحیتیں
نوعِ بشر کا نہایت قیمتی سرمایہ اور انمول ورثہ ہیں۔ ہر چند کہ
ان صلاحیتوں سے کام چیدہ چیدہ افراد ہی لیتے ہیں۔ لیکن
یہ افراد کسی بسم اللہ کے گنبد میں بند ہو کر نہیں بیٹھ جاتے
بلکہ فطرت نے انہیں جو گہرا شعور اور وافر احساس دیا ہوا
ہے، اس کے ماتحت وہ مجبور ہوتے ہیں کہ اپنی ان صلاحیتوں
سے بنی نوع کو فائدہ پہنچائیں — وہ شب و روز غور و فکر
کرتے اور محنت و مشقت سے دو چار ہوتے ہیں، اپنے لئے
نہیں، بلکہ نوعِ انسانی کے لئے — جس میں ان کی اپنی
ذات بھی شامل ہوتی ہے — بقول پروفیسر گڈنگس "معاشرہ
کی نشو و نما اور تعمیر و ترقی باشعور اور ذکی الحس افراد کے
ہاتھوں ہی ہوتی ہے" (Descriptive and Historical Sociology)

غرض، تمدن و تہذیب کا ارتقا اُن افرادِ معاشرہ
کے خلوصِ نیت اور جوشِ عمل کا مرہونِ منت ہے جو اپنے
گہرے اور وافر شعور و احساس کے ساتھ اپنے عہد کے
معاشرے میں خیالِ حسن اور حُسنِ عمل کے رشتوں کو باہم ملاتے
رہتے ہیں — یہاں پہنچ کر انسان کو دو مختلف (بلکہ بعض
حالتوں میں متحارب) جذبوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک
طرف انسان کی اَنانیت (Egoism) ہے۔ جو اس
کو اپنی ہی ذات کے خول میں اسیر رکھتی ہے۔ اور دوسری
طرف جذبۂ ایثار و بے نفسی (Altruism) ہے، جو اس
کو بنی نوعِ انسانی سے وابستہ کئے ہوئے ہے۔ درحقیقت
انہی دو جذبوں کے مناسب ارتباط پر فرد اور جماعت یا
دوسرے لفظوں میں معاشرے کی فلاح و بہبود اور تعمیر و
ترقی کا انحصار ہے۔ فرد اگر سراسر "ایگو" کی پیروی کرتا ہے
تو اس کی اَنانیت اسے خود پسندی و خود سری کی حدود میں پہ

جاتی ہے، جہاں سے آگے احساس کلبیت (Cynicism) پیدا ہو جانا ممکن ہے ـــ اور یہ انجام نہ فرد کے لئے نفع بخش ہے اور نہ معاشرے کے لئے مفید ـــ! اور اگر دوسرا سر جذبۂ ایثار و قربانی کے لئے وقف ہو جاتا ہے، اپنی ایگو یا فطرت کی صحیح نشو و نما بھی نہیں کر سکتا ـــ اور یہ مرحلہ بالآخر معاشرے کے لئے ہی غیر مفید ہے۔ کیونکہ فرد جب تک اپنی ایگو کی صحیح نشو و نما کر کے اپنی ذات میں اعلیٰ صلاحیتیں پیدا نہیں کر لیتا، وہ معاشرے کے لئے بھی زیادہ مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔ گویا فرد کی ذات یا اس کی خودی کی تکمیل معاشرے کی صحت مندانہ نشو و نما اور تکمیل کے لئے ضروری بھی ہے اور اس کو اولیت بھی حاصل ہے۔ کیونکہ معاشرے کی تعمیر بہر نوع افراد ہی کرتے ہیں۔ اور قطرے کو گوہر ہونے تک کچھ مدّت تو بہر صورت گمنام رہنا ہی پڑتا ہے۔ اور جب وہ تکمیل کے مراحل طے کر کے صدف سے باہر نکلتا ہے، تب ہی حسن و عمل کی دنیا میں اس کی قدر و قیمت پڑتی ہے۔ تکمیل خودی کے بعد فرد کا اجتماعی زندگی میں حصّہ لینا فرد اور اجتماع دونوں کے لئے موجب خیر و برکت ہے۔ اس کے بغیر نہ فرد فرد کہلانے کا مستحق ہے، اور نہ معاشرہ صحیح معنوں میں معاشرہ کہلا سکتا ہے۔ دونوں کا اتحاد اور اشتراک ایک دوسرے کے لئے ضروری بھی ہے اور فطری بھی ـــ!

فرد کی خودی اجتماعی بے خودی کے بحر بے پایاں میں ضم ہو کر ایک صحت مند معاشرے کی تعمیر کا باعث بنتی ہے بایں ہمہ فرد اور اجتماع یا جماعت کی بعض خصوصیات اور حد بندیوں کا احترام (فرد اور جماعت) دونوں کے لئے لازمی و ضروری ہے۔ کیونکہ فرد کل کا جزو بن کر بھی اپنی انفرادیت کو کھو نہیں دیتا ـــ وہ اپنی قلمروئے خلوت و تنہائی میں آزاد و خود نگر ہے۔ اس کو شعور، فکر، ضمیر اور ارادے میں آزادی حاصل ہے۔ یہ عطیۂ قدرت ہے، اور انسس کا احترام ہر وہ قانون کرتا ہے، جس کی اساس و بنیاد قانون فطرت کے مطابق ہو۔ البتہ فرد جب قلمروئے اجتماعی میں قدم رکھتا ہے، تو اس کو دوسروں کی آزادیٔ فکر و عمل سے بھی واسطہ پڑتا ہے۔ اور یہیں پہنچ کر در حقیقت اسے اپنی بعض آزادیوں سے رضاکارانہ طور پر دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ کیونکہ افراد کی انفرادی خواہشیں اور جبلتیں اگر آپس میں ٹکرانے لگیں، تو نظام تمدن ایک دن بھی نہیں چل سکتا۔ لیکن آزادیٔ ضمیر پھر بھی سلب نہیں ہو جاتی۔ البتہ اس کو دُوسروں کے جذبات و احساسات کا بھی احترام کرنا پڑتا ہے۔ گویا انفرادی کردار و اخلاق اور اجتماعی کردار و اخلاق دونوں کے لئے ایک دوسرے کا احترام کرنا ازبس ضروری امر ہے۔ کیونکہ یہ دونوں مسئلے در حقیقت ایک ہی تصویر کے دو رُخ اور ایک مقصد کے دو پہلو ہیں۔ ریاست کی فلاح و بہبود اور فرد کی فلاح و بہبود ایسے مسائل ہیں کہ جو ایک دوسرے کے بغیر بالکل غیر حقیقی اور بے معنی ہیں۔ اور ان کو جُدا جُدا کر کے دیکھنا غلط نتائج ہی نہیں، بلکہ تباہ کُن انجام کی طرف لے جاتا ہے۔

غرض ایک مکمل معاشرہ اور مثالی ریاست اسی کو کہیں گے کہ جس میں افرادِ معاشرہ کو اپنی فطری صلاحیتوں کی نشو و نما کے پورے مواقع میسر ہوں۔ اور ان کی آزادیٔ فکر و ضمیر پر غیر فطری اور ناجائز دباؤ نہ ڈالا جائے۔ اور ہر فرد از خود یہ محسوس کرے کہ وہ ایک ایسے کل کا جزو ہے، جو اس کا شریک اور معاون، ہمدرد اور خیر خواہ ہے ـــ اس کے صلے اور معاوضے میں افراد معاشرہ قدرتی طور پر اجتماعی فلاح و بہبود کو اپنے پیش نظر رکھیں گے۔ اور اجتماعی زندگی کو خوب سے خوب تر بنانے میں ریاست اور معاشرے کی بہ دل و جان مدد کریں گے۔ کیوں کہ وہ یہ سمجھیں گے کہ اسی میں اُن کی اپنی فلاح و بہبود کا راز بھی پوشیدہ ہے ـــ گویا فرد اور جماعت کے اس رضاکارانہ تعاون اور اشتراک عمل سے ہی ایک صحت مند معاشرہ ظہور میں آتا ہے۔ بجبر و اکراہ کی حالت میں

معاشرے کی فطری اور صحت مندانہ نشو و نما کا سلسلہ رُک جاتا ہے
اسی لئے تنازع اللبقا کے سلسلے میں نوامیس فطرت کے علاوہ
انسانوں کو بسا اوقات اپنے ہی ابنائے جنس سے مجادلہ و مقاتلہ
کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ جبر و اکراہ اور غلامی و محکومی فطرت انسانی
کے لئے بھی مہلک ہے اور معاشرے کے لئے بھی ضرر رساں
ہے ــــ!

مذکورہ بالا بحث سے نتیجہ یہ نکلا کہ انسانی معاشرے
کے عالم وجود میں آنے کا باعث ہر چند کہ انسان کا مادی ماحول
ہے لیکن اس کی در و بست اور نشو و ارتقا میں محض مادی
قدروں پر انحصار ہی کافی نہیں، بلکہ اس کے لئے روحانی و
اخلاقی قدروں سے مدد لینا بھی از بس ضروری ہے۔ کیوں کہ
معاشرے کی بقا و ترقی میں خارجی کائنات کے اسباب و
علل کے علاوہ انسان کی داخلی کائنات (جو اپنی وسعت و بے
پایانی میں کسی طرح خارج کی دنیا سے کم نہیں) کے اسرار و
رموز کو بھی پورا پورا دخل ہے۔ اس عالم آب و گل میں مادی
ضروریات زندگی کی کفالت کے علاوہ انسان اپنے اور
کائنات کے بارے میں ان اہم حقائق و مسائل پر بھی اکثر
غور و فکر کرنے پر مجبور ہے کہ میں کون ہوں؟ میری ہستی کی
حقیقت و ماہیت کیا ہے؟ اور میری عاقبت و انجام کیا
ہے؟ ــــ اور پھر حسن، خیر، صداقت کی قوتوں کی تلاش
ــــ حقیقتِ مطلق کو جاننے کی آرزو و جستجو ــــ زندہ
پائندہ رہنے اور حیات اَبدی سے ہمکنار ہونے کی خواہش
لگن ــــ، یہ سب باتیں، جو اقدار حیات کا سنگِ بنیاد
ہیں، انسان کو زندگی کی مادی قدروں سے بلند تر ہو کر سوچنے
پر آمادہ کرتی رہتی ہیں۔ اور پھر اس فکری عمل کا عکس
جب مادی قدروں پر پڑتا ہے، تو زندگی میں نکھار پیدا ہوتا
ہے۔ اسی عمل اور ردّ عمل کو دوسرے لفظوں میں علم الاخلاق
کہتے ہیں ــــ اس کے بغیر ایثار و قربانی اور بے نفسی و بے
غرضی کا وہ جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا، جو معاشرتی تکمیل میں
بڑی اہمیت رکھتا ہے (کومٹ۔ ہربرٹ سپنسر اور دوسرے
مفکرین اس جذبے (Altruism) کو معاشرے
کی در و بست اور تکمیل میں بنیادی اہمیت دیتے ہیں !

الغرض مادی اور روحانی اقدارِ حیات کے امتزاج سے ہی
انسانی معاشرہ یا معاشرے وجود میں آتے ہیں۔ اور بتدریج
ان کی نشو و نما ہوتی ہے

معاشرے کے عالم وجود میں آنے کی اس بحث کے بعد
معاشرے کی ہیئت ترکیبی، یعنی اس کے مختلف شعبوں، اداروں
اور پہلوؤں کا سوال، جس کو نظام معاشرہ کہنا چاہیئے، سامنے
آتا ہے ــــ اس نظام معاشرہ اور اس کے نظری و عملی
پہلوؤں کا مطالعہ (طبعی حالات کی روشنی میں) "سائنس آف
سوسائٹی" سوشیالوجی یا عمرانیات کہلاتا ہے ــــ!

عمرانیات کی اس مختصر سی وضاحت کے بعد مناسب
یہ معلوم ہوتا ہے کہ ادب کی حقیقت و ماہیت پر بھی یہاں
ذرا روشنی ڈال دی جائے۔ تاکہ دونوں کے روابط کو سمجھنے
میں آسانی رہے۔

یہ تو مسلم امر ہے کہ ادب دو چیزوں سے ترکیب پاتا ہے۔
۱۔ ہیئت اور ۲۔ موضوع ــــ، ہیئت میں زبان اور
اسالیب بیان آجاتے ہیں۔ اور موضوع میں حیات و کائنات
کے متنوع پہلو سما جاتے ہیں کہ جن سے انسانی زندگی عبارت
ہے۔ اور جن کو صاحب کاشف الحقائق (نواب امداد امام اثر)
نے امور ذہنیہ اور معاملات خارجیہ قرار دیا ہے۔ انہی دو
چیزوں کو ہمارے قدیم اور جدید مشرقی نقادوں نے جسم
(الفاظ) اور روح (معنی) سے تشبیہ دے کر شعر و ادب کو
ایک جیتے جاگتے پیکر کی صورت میں ظاہر کیا ہے۔ گویا یہ دونوں
چیزیں (موضوع اور ہیئت) ایک دوسرے کا جزو لاینفک
ہیں۔ محض تجزیئے کی سہولت کی خاطر انہیں الگ الگ طور پر
بیان کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ شعر و ادب میں یہ دونوں شیر و
شکر کی طرح گھلی ملی ہوتی ہیں۔

جہاں تک زبان کا تعلق ہے ۔ زبان اماعشرتی ربط
اور نشوونما میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے ۔ اجتماعی
لی کا کوئی ادارہ بھی زبان کے بغیر پنپ نہیں سکتا۔ لوگ
اکٹھے ہوتے ہیں تو کسی نہ کسی زبان میں تو انھیں اظہار
کرنا ہی پڑتا ہے ۔ اسی ضرورت کے ماتحت زبانیں بنتی
ی اور پھلتی پھولتی ہیں۔ نئی نئی ضرورتیں ان میں نئے
اضافے کرتی رہتی ہیں۔ گویا قوموں کی اجتماعی زندگی میں
ن کا مسئلہ ایک بہت بڑا عمرانی مسئلہ رہا ہے ـــــ پھر یہ
بان کا ہر لفظ اپنی ایک معنوی تاریخ بھی رکھتا ہے ۔
ام زندگی میں اس کی کچھ قدر و قیمت ([illegible])
مقرر ہے ۔ مرورِ ایام کے ساتھ الفاظ میں تراش خراش
معنوی رد و بدل ہوتا رہتا ہے ـــــ یہ امر بھی مسلم ہے
سانی اظہار و بیان کی سب سے بہترین اور حسین ترین
ت شعر و ادب میں جلوہ گر ہوتی ہے ۔ فن کار (شاعر اور
ب) کی چابک دستی اور صناعی انہی الفاظ کی در و بست
نشست بندی سے زندگی کی نئی نئی تعبیروں اور نئی نئی
میں پیش کرتی رہتی ہے ۔ گویا وہی لفظ، جو اپنی جگہ
دی قدر و قیمت کا حامل ہوتا ہے، وہ جب دوسرے
سے مل کر ایک خاص شکل اختیار کرتا ہے، تو اس سے
نئے مطالب و مفاہیم پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن یہ یاد رہے
ں الفاظ کی عمدہ بندش سے کوئی ادب اعلیٰ ادب نہیں
لہٰذا اس کے لئے فن کار کے خونِ جگر کی بھی ضرورت ہوتی
بقول اقبال ؎

رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود!

ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے
ع فیہ مباحث اب از کار رفتہ ہو چکے ہیں ۔ اور
مسئلہ پر قریب قریب سب اہل الرائے متفق ہو گئے ہیں
ب فنی اسالیب اور اظہار و بیان کے لوازمات کو ملحوظ
رکھتے ہوئے زندگی کی ترجمانی کرتا ہے ۔ اور نہ صرف ترجمانی
کرتا ہے، بلکہ تنقیدِ حیات کرتے ہوئے زندگی کو خوب تر اور
حسین تر روپ میں دیکھنے کی آرزو بھی پیدا کرتا ہے ـــــ
شعر و ادب میں فن کار کی قلبی واردات و کیفیات، اس کے
ماحول اور معاشرے کے جذبات و احساسات، ماضی کے
تجربات، حال کے مشاہدات اور مستقبل کے امکانات،
مطالعہ کائنات اور فلسفۂ حیات، غرض کہ سبھی کچھ بیان ہوتا
ہے ۔ شاعر اور ادیب اپنے اس وسیع تر موضوع میں تخیل
کی رنگ آمیزی کر کے گویا ان مسائل حیات و کائنات کی
بازآفرینی کرتا ہے ۔ اور خوب کو خوب تر صورت میں پیش
کر کے فطرت انسانی کی متابعت کرتا ہے ۔ جو ارتقا کی
منزلیں طے کرتی ہوئی ہمیشہ آگے کی طرف بڑھتی رہتی ہے ۔
اور نت نئے (اور پہلے سے جمیل تر) پیکر تراشتی رہتی ہے ۔
گویا اس طرح فن کار زندگی کی ترجمانی و تنقید ہی نہیں
کرتا، بلکہ زندگی کی تخلیق میں بھی حصہ لیتا ہے اور اس کی
مسرتوں میں اضافہ بھی کرتا ہے ـــــ!

مسرت بخشی ادب کی غایت اولیٰ ہے ـــ اور حظ و
مسرت کا یہ پہلو کوئی ادنیٰ شے نہیں ۔ بلکہ زندگی میں جہاں
صحت، توازن، اعتدال، حسن اور نکھار پیدا ہوتا ہے،
وہیں مسرت کا احساس بھی ابھرتا ہے ۔ مسرت کا یہ جذبہ
ازلی و ابدی ہے ۔ اور اس کا متلاشی ہر انسان ہے، خواہ وہ
سائنس دان ہو، فلسفی ہو یا ادیب ـــ، لہٰذا مسرت بخشی
ادب میں کوئی ایسی شے نہیں کہ اس پر کسی قسم کی کوئی
لے دے کی جائے ۔ البتہ مسرت کی مختلف سطحیں ہو سکتی
ہیں ۔ اعلیٰ سطح بھی اور پست سطح بھی ـــــ اور ادب میں
ان دونوں کو پیش کیا جاتا رہا ہے ۔ لیکن زمانہ گواہ ہے
کہ وہی ادب زندہ و پائندہ رہا، جس میں مسرت کی اعلیٰ
سطح کی جھلک اور حسن و جمال کا آفاقی احساس پیدا ہو سکا۔
سفلی قسم کی مسرت تو ایک عارضی سی شے ہوتی ہے، جو حبابِ

کی مانند سطح آب پر نمودار ہو کر دم بھر میں ہمیشہ کے لئے ہوا میں
تحلیل ہو جاتی ہے۔ آج گزشتہ لکھنؤ کا شعروادب، جو کبھی مسرتوں
کے گہوارے میں جھولتا تھا، کتنا زندہ ہے اور کس قدر باقی رہ
گیا ہے۔ اس امر کو اقدارِ حیات کے پیمانے سے بھی دیکھا
جا سکتا ہے۔ اور اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کون سا ادب
مسرت بخش، حیات افروز اور دائمی قدر و قیمت کا حامل ہے
اور کونسا سطحی اور عارضی ۔۔ جس طرح ہم زندگی میں دوسری
چیزوں کے حسن و قبح کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لئے کچھ
نہ کچھ معیار رکھتے ہیں۔ اسی طرح ادب کے پرکھنے کی بھی ایک
کسوٹی ہے، جس کو ذوقِ سلیم کہتے ہیں۔ اس معیار اور کسوٹی
سے افراد بھی کام لیتے ہیں، اور جماعتیں بھی ۔۔ اور پھر زمانہ،
جو سب سے بڑا نقاد ہے کہ کس چیز میں ابدیت ہے اور کس
میں سطحیت ۔۔!

عمرانیات اور ادبیات کی ان تشریحات کے بعد
اب آیئے ذرا ان کے رابطے پر بھی نگاہ ڈال لیں ۔۔ شعر و
ادب اور ان کی تخلیق کرنے والے فن کاروں کی معاشرتی
حیثیت، ذہنی و جذباتی حالت اور شعوری و تحت الشعوری کیفیت
پر افلاطون و ارسطو سے لے کر سائنس کے دورِ جدید تک بہت
کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے ۔۔ بحث و نظر کے اس طویل
سلسلے سے گزر کر کم از کم یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ شاعر
اور ادیب بھی بہرکیف معاشرے کا جزو لاینفک ہیں ۔ اور
پھر یہ بات بھی مسلّم ہے کہ شاعر اور ادیب وہی لوگ ہو سکتے
ہیں کہ جن کو قدرت نے دیدۂ بینا عطا کیا ہو، اور وہ گہرا شعور
اور وافر احساس رکھتے ہوں ۔۔ جن کی بصیرت قطرے میں
دجلہ کا منظر دیکھ سکے اور جزو میں کل کا جلوہ ۔ اور نہ صرف
خود دیکھ سکے، بلکہ دوسروں کو دکھا بھی سکے۔ یعنی وہ اپنے مافی الضمیر
کے اظہار و ابلاغ پر بھی قدرت رکھتے ہوں۔ گویا شاعر اور ادیب
معاشرے کے عام رکن ہوتے ہوئے بھی اپنے فکر و فن کی بدولت
ایک خاص مرتبہ و مقام رکھتے ہیں۔ معاشرے کے ایک عام
فرد کی حیثیت سے ان کی بھی وہی ذمہ داریاں، ضرورتیں اور
حاجتیں ہوتی ہیں، جو دوسرے افرادِ معاشرہ کی ہوتی ہیں
اور وہ ان سے دوسروں کی طرح ہی عہدہ برآ ہونے کی
بھی حتی الامکان کوشش کرتے ہیں۔ تاہم وہ اپنی تخلیقی
حیثیت میں اس عام سطح سے ذرا بلند تر ہو کر اپنی ذات
اور اپنے ماحول پر نگاہ ڈالتے ہیں۔ اس مقام پر ان کا
وجدان و احساس ان کی رہنمائی کرتا ہے ۔ اور اسی کی
رہنمائی میں وہ زندگی کی ترجمانی بھی کرتے ہیں اور تنقیدِ
حیات کا فنکارانہ فرض بھی انجام دیتے ہیں ۔۔!

جب ہم عمرانیات کا مطالعہ کرتے ہوئے اس نتیجے پر
پہنچتے ہیں کہ معاشرتی تعمیر و ترقی میں ذکی الحس افراد
بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ تو پھر کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ
معاشرتی معماروں کی اس صف میں ہم شاعروں اور
ادیبوں کو جگہ نہ دیں۔ جن کا شعور و احساس گیسوئے حیات
سنوارنے میں کسی دوسرے باشعور اور ذکی الحس معمارِ معاشرہ
سے کم خدمت سرانجام نہیں دیتا۔ بلکہ غور کیا جائے تو ان کی
یہ خدمت کچھ زیادہ ہی وقیع نظر آئے گی۔ اور پھر یہ خدمت
بے لوث بھی ہوتی ہے اور بے لاگ بھی ۔۔!

شاعروں اور ادیبوں کا یہ عمل براہِ راست کم ہوتا ہے
بالواسطہ زیادہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ سیاسی قائد،
معاشرتی مصلح اور مبلغ الاخلاق تو نہیں ہوتے ۔ لیکن ان کا
عمل ان رہنماؤں سے کچھ کم اہمیت بھی نہیں رکھتا۔ ہرچند
کہ وہ اپنے شعر و ادب میں سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی
مسائل و معاملات کو راہ راست پیش نہیں کرتے ۔۔، یہ کام
تو اکابر و علماء ہی کا ہے ۔۔، تاہم وہ ان مسائلِ حیات
سے پہلو تہی بھی نہیں کرتے۔ وہ ان مسائل کو اپنے وجدان
و احساس کا جزو بنا کر اپنے خاص انداز میں پیش کرتے ہیں
جو مؤثر بھی ہوتا ہے اور دل نشین بھی۔ وہ ذہنوں کی بجائے
دلوں کو متاثر کرتے ہیں۔ ادیب اخلاقی وعظ نہیں کہتا ۔۔

تاہم وہ اپنے فن میں خیر و شر کی عمرانی بحث کو بالواسطہ پیش کرتے ہوئے ہمارے حاسۂ اخلاق کو اس طرح اُبھارتا ہے کہ ہمارا احساس خود ہی یہ فیصلہ کر دیتا ہے کہ نیکی کس چیز کا نام ہے اور بدی کس کو کہتے ہیں۔ اس طرح گویا ایک ادیب عملی رہنما اور قائد بنے بغیر بالواسطہ افراد معاشرہ میں احساس ذمہ داری پیدا کرتا ہے۔ اور اس طریق کار کے نتائج بھی ظاہر ہے کہ مؤثر اور کارگر ہوتے ہیں۔ کیوں کہ بات وہی کارگر ہوتی ہے جو بقول سرسید "دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے" (مضامین تہذیب الاخلاق ج ۲ ص ۵۵۲) غرض یہ کہ

> شاعر اور ادیب معاشرے کے عام رکن ہوتے ہوئے بھی بلند تر انسان ہوتے ہیں۔ ان کا وجدان و احساس زندگی کے رازہائے سربستہ کو منکشف کرکے حقیقت مطلق کی جستجو کرتا رہتا ہے۔ ان کی دردمند اور حساس طبیعت انسانی ہمدردی و محبت کے ہمہ گیر نغموں کو عام کرکے افرادِ معاشرہ کے دلوں میں ایثار و قربانی کا جذبہ پیدا کرتی رہتی ہے — وہ وقتی ہیجانات اور تعصبات سے بالاتر رہ کر اپنے فن کی تخلیق کرتے ہیں۔ وہ اجتماعِ انسانی کی ذہنی و روحانی بیماریوں کے ماہر نباض اور ہمدرد معالج ہوتے ہیں —، اس لئے معاشرے میں ان کی اہمیت و افادیت مسلم ہے — !

خلاصۂ بحث یہ کہ شاعر اور ادیب اپنے فن کے ذریعے عمرانیات کے مختلف شعبوں اور اداروں کی تعمیر و ترقی میں باقاعدہ حصہ لیتے ہیں۔ اور ان شعبوں اور اداروں کی کارکردگی کا عکس شعر و ادب میں جھلکتا ہے۔ بقول سر رادھا کرشن "سیاسی عمل کے نتائج و اسباق کا جائزہ آخر الامر مفکر اور ادیب ہی لیتے ہیں۔ ان کی ذات میں معاشرہ اپنے آپ کو پہچانتا اور اپنے اعمال کا محاسبہ کرتا ہے۔ وہ ان معاشرتی قدروں کی حفاظت اور پاسبانی کرتے ہیں، جو درحقیقت معاشرے کی روح رواں اور فکر و عمل کی مظہر ہیں" (Religion & Society) — شاعر ادیب اپنے فن کے ذریعے ان معاشرتی قدروں (جن کا ذکر گزشتہ سطور میں ہوا) اور عمرانی نظریات و معتقدات کا نقش جمہور کے دلوں میں بٹھاتے ہیں۔ وہ اپنے عہد کی ترجمانی کرتے ہوئے "جو ہے" اس کو ظاہر کرتے ہیں "جو نہیں ہے" اس کا تجزیہ، اور "جیسے ہونا چاہیئے" اس کی آرزو و جستجو کرتے ہیں اور دوسروں کو اس کا احساس دلاتے ہیں۔ فن کاروں کا ایک عالمگیر تخیل اور ہمہ گیر عمل ہے۔ اس کے لئے کسی ملک خطے یا ماحول کی تخصیص نہیں۔ البتہ فنی اسالیب اور اظہار ابلاغ کی صورتیں مختلف ہوسکتی ہیں۔ زبان کو اس سلسلے میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ بقول ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ "کسی غیر زبان میں سوچنا تو قدرے آسان ہے، لیکن محسوس کرنا از بس مشکل ہے" (Social function of Poetry) اور ظاہر ہے کہ شعر و ادب کا تعلق سوچنے سے زیادہ محسوس کرنے سے ہے۔ اس لئے یہ معاشرتی زندگی سے بھی زیادہ قریب ہوتا ہے۔

غرض یہ کہ ادب کا عمرانیات سے بڑا گہرا تعلق اور ربط رابطہ ہے۔ اور ہم عمرانیات کی تشکیل کرتے ہوئے ادبیات کو نظرانداز نہیں کرسکتے اور ادبیات کا مطالعہ کرتے ہوئے اس کے عمرانی پہلوؤں سے درگزر نہیں کرسکتے — اور دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں — !

ظہیر فتح پوری

پریم چند کی شخصیت

میانہ قد، چھریرا بدن، کتابی چہرہ، بڑی بڑی مونچھیں، بڑی بڑی آنکھیں، وضع قطع سادہ، اچکن پجامہ اور سفید کرتہ پہنے۔ یہ تھے پریم چند آواز بلند تھی مگر لڑنا جھگڑنا تو درکنار کبھی نامُلائم الفاظ میں کسی نے گفتگو کرتے بھی نہ دیکھا تصنع سے پاک سادہ منش آدمی تھے۔ دوسروں پر اپنی شخصیت کی چھاپ اسی سادگی سے ڈالتے۔ اپنے علم و فضل کا کبھی مظاہرہ نہ کرتے۔ شخصی آزادی کے بڑے قائل تھے کبھی یہ کوشش نہ کرتے کہ اپنی خواہش کو دوسرے کی مرضی پر فوقیت دے دیں چہرے پر سدا ایک معصومیت جھلکتی رہتی۔ سادگی پرست پریم چند نے کبھی سوٹ پہننا پسند نہ کیا۔ کبھی گھر میں آرام و آسائش کی چیزیں جمع نہ کیں ظاہر داری سے اس قدر نفرت رہی کہ اپنے بیوی بچوں سے انتہائی محبت کرنے کے باوجود ان کی یہ خواہش پوری نہ کی کہ ان کے گھر میں فرنیچر ہو۔

مالی لحاظ سے ہمیشہ پریشان رہے مگر روپے پیسے کی طمع کبھی نہ کی بلکہ بیوی سے چھپ چھپ کر ضرورتمند لوگوں کو روپیہ دیدیتے۔ بیوی سے چھپ کر دینے کی وجہ یہ تھی کہ اپنی طبیعت کی نرمی کی وجہ سے بیوی سے ذرا ڈرتے تھے کئی بار ایسے موقعے آئے کہ وہ آرام و آسائش کی زندگی گذار سکتے تھے مگر اسے اس لئے قبول نہ کیا کہ سادگی جو ان کی شخصیت کا سب سے بڑا وصف تھا ختم ہو جائے گی۔ حکومت نے انہیں رائے صاحب کا خطاب دینا چاہا مگر وہ انہیں اس لئے پسند نہ آیا کہ اس طرح وہ کسانوں کی زندگی سے دور ہو جائیں گے جو انہیں بیحد عزیز تھی۔ مہاراجہ الور نے مصاحبت کی پیشکش بڑی امیدوں سے کی۔ پریم چند کو عمدہ تنخواہ، عمدہ گھر اور کار دے رہے تھے مگر وہ درباری زندگی کی پابندیوں کو برداشت کہاں کر سکتے تھے۔ فلم میں گئے تو مجبوراً۔ اگر بہت زیادہ مقروض نہ ہو جاتے تو کبھی ادھر کا رخ نہ کرتے بمبئی کے فلمی ماحول اور شہری طرز زندگی سے وہ چند ماہ میں ہی اکتا گئے۔ گاؤں کی فضا اور کسان کی شخصیت دونوں ان کی زندگی میں اتنا رچ بس گئے

تھے کہ انہیں فلم کی معقول آمدنی پسند نہ آئی۔ ان کی تمنائیں بڑی مح[illegible] تھیں۔ گاؤں میں سادگی سے رہنا اور افسانے و ناول لکھنا۔ مگر اس کے با[illegible] کہ اپنے زمانے میں انہیں تمام مصنفین سے زیادہ معاوضہ ملتا تھا۔ وہ ا[illegible] تحریروں کے بل پر اپنے خاندان کی ضروریات پوری نہ کر سکتے تھے۔ وہ ا[illegible] تحریروں میں بڑی محنت کرتے تھے اور اس کا مناسب معاوضہ چاہتے تھے ہندوستان یورپ نہ تھا اور نتیجتاً انہیں کچھ اور کام کرنا پڑتا تھا۔ کبھی م[illegible] کبھی ایڈیٹری اور کبھی پریس کی منیجری اور ان کی یہ آرزو دل ہی دل میں ر[illegible] جاتی تھی کہ وہ شہر چھوڑ کر دیہات میں جا بسیں۔

پریم چند کے مزاج میں استقلال نہ تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر رنج[illegible] اور خوش ہو جاتے اور پچھلی باتوں کو یوں بھول جاتے جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھ[illegible] محنت اور خدمت کرنے میں انہیں بڑی لذت ملتی۔ وہ سوتیلی ماں ہو یا بی[illegible] یا دوست دوسروں کا کام کرنے میں بڑا مزہ ملتا۔ جب تک گھر میں رہتے لکھتے پڑھتے رہتے یا بیوی کو گھریلو کاموں میں مدد دیتے رہتے۔ محنت [illegible] اس قدر لگاؤ تھا کہ میٹرک کے بعد تمام مطالعہ پرائیویٹ طور پر ہی کیا۔ پڑھتے بھی، پڑھاتے بھی، ٹیوشن بھی کرتے اور گھر کا تمام کام بھی کرتے۔ اپنے فن [illegible] کی نوک پلک سنوارنے میں بڑی جانفشانی دکھلاتے۔ اسی جذبہ نے بڑھتے بڑھتے بعد میں خدمت قوم و ملک کی شکل اختیار کر لی۔ اپنے فن سے وہ ملک کی خدمت کا کام لیتے تھے۔ اپنے دور میں مقصدی ادب کے سب سے بڑے نمائندے تھے۔ ادب کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اوائل بیسویں صدی میں ادب برائے ادب کے رسیا ان کے کس قدر مخالف رہے مگر جب پریم چند کا ۱۹۳۶ء میں انتقال ہوا تو رومانی افسانہ نگاری نے دم توڑ دیا تھا اور اردو کے افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کی قیادت پریم چند ہی کر رہے تھے۔

پریم چند اظہار خیال میں بیباک تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی تمنائیں

محدود تھیں اور بچپن سے انہوں نے زندگی (Mahatma) گاندھی کی طرح دباؤ اور تشدد کے سامنے انہوں نے کبھی سر نہ جھکایا۔ معلمی کے زمانے میں ان کے افسروں کو یہ آرزو ہی رہی کہ پریم چند سر راہ انہیں جھک کر سلام کیا کریں۔ مدوا ڑی اسکول کا پبلک ہیڈ ماسٹری کے زمانہ میں انہوں نے صرف اس لئے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا کہ اسکول کا منیجر یہ چاہتا تھا کہ ان کا انتظامی امور سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اپنی بیٹی کی شادی کے موقعہ پر انہوں نے "کنیا دان" کی رسم ادا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ کہنے لگے۔

"دان بیجان چیز کا ہوتا ہے۔ میں اپنی بیٹی کا دان کیسے کر سکتا ہوں اس سے تو مجھے بڑی محبت ہے۔"

جب لوگوں نے کہا کہ اس رسم کے بغیر ہندو مذہب میں شادی نہیں ہو سکتی تو بہت غصہ ہوئے اور اٹھ کر باہر چلے گئے۔ ان کی بیوی نے یہ رسم ادا کی۔ ہندو مذہب کو من و عن قبول کرنے میں انہیں ہمیشہ پس و پیش رہا ان کے مذہبی خیالات عام ہندوؤں سے مختلف تھے ان کے نظریات کی بنیاد سماجی ارتقا پر تھی ایسی مذہبی رسومات و عقائد جو سماج کے ارتقا میں معاون ثابت نہ ہوں انہیں قابل قبول نہ تھیں۔ ان کی انسان دوستی نے انہیں متعصب ہندوؤں کے خلاف مضمون لکھنے پر مجبور کر دیا۔ ایک دفعہ تو لوگ مارنے کے لئے بھی آئے مگر پریم چند نے ثابت قدمی کا ثبوت دیا

ذکر آ چکا ہے کہ پریم چند اپنی بیوی سے کس قدر ڈرتے تھے۔ ان کا یہ ڈر تمام صنف لطیف کے لئے تھا۔ انہوں نے جب ہوش سنبھالا تو سوتیلی ماں کو اپنے اوپر مسلط پایا۔ باپ کو دیکھا کہ دوسری بیوی سے بہت دبتے ہیں اس لئے شروع شروع میں جو امیدیں باندھی تھیں کہ جب ماں زیادتی کرے گی تو باپ بچائے گا وہ پوری نہ ہوئی اور پریم چند کا پلنگ پہلے گھر کی ڈیوڑھی میں بچھائی گئی اور پھر جب ان کے والد کا تبادلہ ہوا تو انہیں چھوڑ کر وہ نئی جگہ چلے گئے۔ ضروریات زندگی کے لئے خرچ بھیجتے پریم چند کو محبت کہیں سے نہ ملی وہ ماں اور باپ دونوں کے پیار سے محروم رہے۔ عورت کو انہوں نے ایک جابر حکمراں کی حیثیت سے دیکھا چنانچہ ساری زندگی عورت کے محکوم رہے۔ پہلے سوتیلی ماں ان پر حکومت کرتی رہیں اور بعد میں جب گھریلو لڑائیوں کے بعد ان کی بیوی نے اپنی ساس کو شکست دے کر گھر کے انتظامات پر قبضہ کر لیا تو اس کے محکوم ہو گئے۔

ان میں اپنی بات کو منوانے کی سکت نہ تھی۔ چندرہ سال تک وہ اپنی اکلوتی بہن کو اس کے سسرال سے اس لئے نہ بلوا سکے کہ ان کی بہن کا آنا ان کی سوتیلی ماں کو گوارا نہ تھا۔ ان کی پہلی بیوی سے جو دائمی علیحدگی ہوئی اس میں سب سے بڑا ہاتھ اس بات کو تھا کہ پریم چند اپنی سوتیلی ماں کی موجودگی میں اپنی بیوی کو با عزت جگہ نہیں دے سکے تھے۔ وہ تنگ آ کر ہمیشہ کے لئے اپنے میکے چلی گئی۔ دوسری بیوی نے کچھ دن کے صبر کے بعد ہمت اور جرأت سے کام لیا اور گھر کی مالکن بن بیٹھی۔ اب پریم چند نے خود کو شیورانی (دوسری بیوی کا نام تھا) کے سپرد کر دیا۔ زندگی میں جب کبھی وہ دوراہے پر پہنچے یا انہیں کسی اہم معاملہ میں فیصلہ کرنا پڑا تو ان کے قدم اسی سمت مڑ گئے جدھر شیورانی نے اشارہ کیا۔ انہیں ماں کی محبت کی بڑی چاہ تھی اور یہ محبت بھی انہوں نے شیورانی ہی سے پائی۔ وہ بیک وقت بیوی اور ماں دونوں تھیں شاید ماں زیادہ تھیں اور بیوی کم۔ عموماً گفتگو کرتے وقت شیورانی کا لہجہ تحکمانہ رہتا۔ شیورانی نے اپنے شوہر سے متعلق ایک کتاب لکھی ہے "پریم چند گھر میں"۔ یہاں اس کتاب سے ان کی گھریلو زندگی کی کچھ جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں:

"وہ عورت کو مرد سے برتر سمجھتے تھے۔ اگر گرمی میں شام کو وہ چھت پر ہوتے اور میں بھی جا پڑتی تو آپ فوراً دوسری کرسی لے کے پہنچ جاتے۔ اگر کھانا کھانے بیٹھتے تو پانی خود لے لیتے۔ میرے لئے بھی گلاس میں پانی رکھ دیتے۔"

"ان کے پیٹ میں درد تھا اور میں ان کے سرھانے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ بولے رانی میں بھی تمہیں چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا۔ یہاں سب کلفتیں جھیلنے کے لئے تیار ہوں مگر میرا اختیار ہی کیا ہے۔" اس کے بعد..... اس کے بعد..... وہ کہنے لگے۔ "رانی تم اگلے جنم کی ماں ہو۔ اس جنم میں میری دیوی ہو۔" میں نے ان کا منہ بند کر دیا۔ پھر بھی وہ کہنے لگے۔ "تمہیں میری روح و قلب کی طاقت ہو گھبرا مت کیونکہ تم بھی یہاں بیٹھی نہ رہو گی۔"

طبقۂ نسواں کی جو عظمت ان کے دل میں تھی اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ ان دنوں وہ گاندھی جی کے نظریۂ حیات کے پرستاروں میں سے تھے

گاندھی ازم میں طبقہ نسواں کو مردوں پر برتری حاصل ہے۔

پریم چند کے کردار کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے خیالات و افعال میں بڑی حد تک یکسانیت تھی۔ یہ وصف اس حد تک شاید ہی اردو کے اور کسی مصنف کو نصیب ہوا ہو جس حد تک پریم چند میں تھا۔ سماجی لحاظ سے وہ باغی خیالات رکھتے تھے۔ اوائل بیسویں صدی میں بیوہ کے عقد ثانی کی حمایت ہندوؤں میں بہت بری بات سمجھی جاتی تھی اور پریم چند نے نہ صرف یہ کہ اپنے خیالات کی تبلیغ اپنے ناولوں اور افسانوں کے ذریعہ کی بلکہ جب انہیں یقین ہو گیا کہ پہلی بیوی سے ان کی نہیں نبھے گی تو خاندان والوں سے مخالفت مول لیکر انہوں نے ایک بیوہ (شیورانی) سے شادی کر لی۔ جس زمانے میں وہ گاندھی ازم اور سودیشی تحریک سے متاثر تھے۔ انھوں نے بیس سالہ سرکاری ملازمت سے استعفےٰ دے دیا جس پر ان کی خوشحالی کا دار و مدار تھا۔ انھوں نے چرخے بنوا کر مفت تقسیم کئے اور شیورانی کو کانگریس ورکر بنایا۔

ابتدا میں انگریزوں سے بہت متنفر تھے۔ کسی ایسی مجلس میں شرکت کرنا پسند نہ کرتے تھے جس میں انگریز بھی مدعو ہوں۔ بعد میں یہ تعصب قدرے کم ہو گیا تھا۔ شاید اس لئے کہ جذباتیت کی جگہ رفتہ رفتہ تفکر نے لے لی تھی۔

وہ زندگی میں احتیاط کے قائل تھے۔ جوانی میں ایک آدھ بار لغزشیں انہوں نے بھی کیں۔ بس یہی شراب پی لینا یا کسی فتنہ ساماں کو دل دے بیٹھنا مگر فوراً سنبھل جانا ان کی فطرت میں داخل تھا۔ اس احتیاط کی وجہ بھی وہی کم ہمتی معلوم ہوتی ہے جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے غرض اسی احتیاط کی بدولت انھوں نے ہمیشہ عقل کو جنوں پر ترجیح دی اور یہ کبھی نہ کہا کہ

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور   چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

اور عقل کو برتر سمجھنے ہی کی وجہ سے غیر مقصدی ادب کی خوبیوں کو وہ کبھی نہ سمجھ سکے۔ (حالانکہ جسے غیر مقصدی کہا جاتا ہے اس کا بھی ایک مقصد ہوتا ہے) ہمارے انتہا پسند ادیبوں کی طرح اردو غزل کو انہوں نے بھی ایک بیکار صنف شاعری سمجھا اور دیا نرائن نگم صاحب پر ایک مرتبہ اس لئے برہم ہوئے کہ انھوں نے زمانہ "کا آتش نمبر شائع کیا تھا۔ آتش کی شاعری انہیں صرف اس لئے نہ بھا سکی کہ وہ اوائل بیسویں صدی کے مسائل حیات کو سلجھانے میں کسی کام نہ آ رہی تھی۔ بڑا فن کار ہوتے ہوئے بھی فنی اقدار کو سراہنے میں انھوں نے بصیرت کا ثبوت نہ دیا۔ جذبہ اصلاح سے وہ اپنا دامن کبھی نہ چھڑا سکے۔ وہ لوٹ فکشن کے حامی ہیں۔ ان کے اس تعصب کی صرف ایک مثال درج ذیل ہے۔ ۱۹۳۰ء کے اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"دولتمند کو دیکھتے ہی اس کے بلند بانگ دعووں کو میں دوسرے کان سے نکال دیتا ہوں۔ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس شخص نے اس سماجی نظام کی تائید کی ہے جو امیروں کے ہاتھوں غریبوں کی خون آشامی پر قائم ہے"۔

اس جذباتیت اور تعصب کی وجہ یہ ہے کہ اپنی زندگی میں انہیں ہمیشہ تلخیوں اور ناکامیوں سے دوچار رہنا پڑا۔ انہیں ناکامیوں کی وجہ سے وہ ذات خداوندی کے قائل ہیں مگر صفات خداوندی کے کبھی قائل نہ ہوئے اسی لئے وہ ردعمل میں ہمیشہ شدید رہے۔ جب گاندھی جی سے متاثر تھے تو سودیشی تحریک کی حمایت میں ملازمت چھوڑ دی تھی اور جب گاندھی ارون پیکٹ سے مایوس ہوئے تو اس رہبر کو رہزن کہنے میں بالکل نہ جھجکے۔

افسوس سے اطلاع دی جاتی ہے کہ اردو کے مشہور شاعر حرماں خیرآبادی کا ۲۱ رجون ۱۹۶۱ کی شب کو کراچی میں حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ مرحوم ایک زمانے سے اردو کے اچھے پرچوں میں لکھ رہے تھے۔ ایک مجموعہ کلام بھی ان سے یادگار ہے۔

آدم جی کے پارچہ جات
دیرپا ہوتے ہیں
زیرنگرانی
آدم جی انڈسٹریز لمیٹڈ
کراچی

احمد ندیم قاسمی

بہار

اِتنی خوشبو ہے کہ دَم گھُٹتا ہے
اَب کے یُوں ٹوٹ کے آئی ہے بہار
آگ جلتی ہے کہ کھِلتے ہیں چمن
رنگ شعلہ ہے تو نِکہت ہے شرار
روِشوں پر ہے قیامت کا نِکھار
جیسے تپتا ہو جوانی کا بدن
آبلہ بن کے تپکتی ہے کلی
کونپلیں پھُوٹ کے لَو دیتی ہیں
اَب کے گلشن میں ہوا یوں بھی چلی

آدمی نامہ

عرش کی خلوتوں کا ہوں کرسی نشیں
فرش پر ہوں مکیں آدمی نام ہے
دانش و ارتقا ہے مرا مشغلہ
فکرِ تزئینِ ہستی مرا کام ہے

ہے بہار و خزاں پہ تسلط مرا
میں امینِ فتوحاتِ اضداد ہوں
مجھ سے دامن کشاں وقت کی گردشیں
میں حوادث کی بھٹی کا فولاد ہوں

حوریاں دست بستہ مرے سامنے
قدسیاں پر شکستہ مرے سامنے
کہکشاں کی سنہری، سجل زورقیں
سب ہیں لنگر گسستہ مرے سامنے

دوپہر کی تمازت کا انعام ہوں
نیم شب کی خموشی کا پیغام ہوں
میں سحر کی شعاعوں کا الہام ہوں
میں شفق ہوں میں رنگینیِ شام ہوں

میں ہوں تاریخِ عالم کی روحِ رواں
میرے دم سے ہے آرائشِ کل جہاں
یہ فنون، یہ علوم، یہ تہذیب و فن
سب کے سب ہیں مری عظمتوں کے نشاں

خارزاروں کو میں نے زباں بخش دی
ندیوں کو سرودِ شبانہ دیا
وادیوں کو دیئے لالہ و نسترن
جنگلوں کو صبا کا ترانہ دیا

میں نے اہرام ڈھالے کچھ اس شان سے
پتھروں کو زمانے کی ضد کر دیا
میں نے ادوار کے حسنِ سیال کو
سنگ کی گود میں منجمد کر دیا

تختۂ گل کو میں نے صحیفے دیئے
ریت پر مرتسم اسمِ اعظم کیا
چھال پر مہرِ علم و ہنر ثبت کی
کھال پر کاتبِ تحریر قائم کیا

تابکاری شعاعوں کو تاثیر دی
پانیوں کی تہوں کو شکارے دیئے
جسم پیدا کیا عکس و آہنگ میں
رفعتِ آسماں کو غبارے دیئے

چشمکِ خیل یا دار و گیرِ وطن
میل کب لا سکی میرے افکار پر
دم بدم میرا ایمان بڑھتا گیا
زندگی کی جہاں تاب اقدار پر

جہل کی ظلمتیں جب ہویدا ہوئیں
میں کنول فلسفے کے جلاتا رہا
بن کے سقراط ہر مکتبِ شہر میں
زہر پیتا رہا۔ مسکراتا رہا

میری نظروں میں سب آدمی ایک تھے
کوئی بھی امتیازِ اب و جد نہ تھا
میری جہدِ بقا کے دساتیر میں
کوئی ابیض نہ تھا کوئی اسود نہ تھا

تجربہ گاہ تھی یا رصدگاہ تھی
میں گلیلی بھی تھا اور خیام بھی
میں نقیبِ شعور و امینِ خرد
میرے سائے سے ڈرتے تھے اوہام بھی

جب بھی رسمِ غلامی کا چرچا ہوا
میرے آزاد ماتھے پہ بل آ گیا
میں نے سوداگرانِ جفا کیش کو
منڈیوں میں صلیبوں پہ کھنچوا دیا

انبیاء بھی اُٹھے تو مرے فیصل سے
ہر پیمبر مرے دَر سے منسوب تھا
جب بشر کی بزرگی پہ حرف آ گیا
ناصرہ کا مسیحا بھی مصلوب تھا

ق

ارضِ یثرب سے اک سرمدی ضَو اٹھی
دور جس سے شبوں کا اندھیرا ہوا
جھلملا اُٹھے، اقصائے دشت و دمن
ظلمتوں کے اُفق پر سویرا ہوا

مدتوں گرچہ دُنیا رہی تیغ زن
میرے دل میں رہی آشتی کی لگن
صف شکن جنگ بازوں کو ہر دور میں
میں نے دکھلائے تدبیر کے بانکپن

زندگی کی علو بختیوں کے لئے
دیو قامت فصیلوں پہ لڑتا رہا
آدمیت کی تعمیر کے واسطے
میں ہر رذیل سے جنگ کرتا رہا

آج بھی لڑ رہا ہوں کڑی دھوپ میں
زخم کشمیر و لاؤس کھائے ہوئے
آج بھی پھر رہا ہوں اُفق تا اُفق
اپنا غم طشتری میں سجائے ہوئے

عفتِ گُل رخاں جب بھی رسوا ہوئی
میں نے قانونِ تقدیس نو لکھ دیا
حُسن کی تیرہ اَوراق تاریخ پر
اپنے ہاتھوں سے عنوانِ ضَو لکھ دیا

محنتوں کے صلے میں جو فاقے ملے
بوذری، مزدکی میرا ایمان تھا
کشت کاروں پہ جب ظلم ڈھائے گئے
اشتمالِ زمیں میرا فرمان تھا

میں جہادِ مسلسل کا بانکا جواں
آج بھی تازہ دَم جو پیکار ہوں
جس جگہ بھی ہیں تخریب کی ظلمتیں
میں وہیں شمع بردارِ انوار ہوں

میں ہی پرچم اُخوت کا لہراؤں گا
میں جفا و شقاوت کا خوگر نہیں
مجھ کو معلوم ہے یہ وغا کا چلن
آدمی کا ازل سے مقدر نہیں

اب کسی طرح مجھ کو گوارا نہیں
ہر فضا میں بپا شورِ زنجیر ہو
دختروں کے دوپٹے سروں سے گریں
مامتا ماؤں کی زیرِ شمشیر ہو

ظہور حسین شور

خونِ شہیداں

ناچتا سینۂ صحرا پہ جہنم کا جلال
چیرتا دشت و بیاباں کا جگر موت کا ہل
زندہ لاشوں پہ خلاؤں سے برستی ہوئی آگ
موت پھیلائے ہوئے خاک پہ اپنے شہپر
بیڑیاں پاؤں میں زنجیروں میں جکڑے بازو
ٹوٹتا کھا کے طمانچے کوئی معصوم دہن
کوئی بھڑکا ہوا مقنع کوئی جلتا دامن
کوئی منہ پیٹتی مادر، کوئی بے گور پسر
گونجتا وقت کی وادی میں شبِ تار کا ساز
طوقِ آہن کے وہ آنسو، وہ سلاسل کی کراہ
وہ سرِ دار اسیرانِ حرم کا کہرام
کہیں جھلسے ہوئے عارض کہیں سلگے ہوئے ہاتھ
تجھ کو اے سالِ رواں ماتمِ زنداں کا سلام
اے تمدن کے بجھے دیپ جلانے والے
قہقہوں میں مرا کہرام بھی شامل کر لے
دیکھ کس رات سے ہے چاک سحر کا دامن
اے خدایانِ زمیں حشر کا طوفاں ہے قریب
لشکرِ آزادیٔ ملک رسن و دار سہی

زندگی موت کے آہنگ کو دیتی ہوئی تال
اپنے دامن میں چھپائے ہوئے لاشے جنگل
بال شانوں پہ بکھیرے ہوئے حوا کا سہاگ
زندگی اوڑھے ہوئے اپنے لہو کی چادر
بوڑھے باپوں کی جبینوں پہ جوانوں کا لہو
کٹتی شانوں پہ کسی بنتِ حرم کی گردن
عصمتیں خاک پہ سوئی ہوئی بے گور و کفن
کوئی پھٹتا ہوا سینہ، کوئی کچلا ہوا سر
صبح کو دیتی ہوئی کوئی جمیلہ آواز
وہ ڈھلکتی ہوئی شاہی، وہ بھڑکتے سے گناہ
زخم کھا کھا کے وہ گرتے ہوئے مشرق کے امام
ہائے یہ موت کے کشکول میں ہستی کی زکات
زخمِ سوزاں کی دعا خونِ شہیداں کا سلام!!
قہقہے ظلمتِ دوراں پہ لگانے والے
الجزائر کا بھی خوں اپنے سبو میں بھر لے
کب سے خوں چاٹ رہی ہے ترے سورج کی کرن
موت کے نشترِ خونیں سے رگِ جاں ہے قریب!!
آدمی طوق و سلاسل میں گرفتار رہی

انجم اعظمی

تجدید

تو کسی اور کی جاگیر سہی
زندگی کے اسی دورا ہے پر
آج پھر تجھ سے ملاقات ہوئی
ذہن سے گردِ مہ و سال ہٹی
دیکھ کر تجھ کو ہوئی ہیں تازہ
عہدِ ماضی کی روایات کئی
یاد ہو گی وہ ملاقات تجھے
اپنے ارمانوں کی وہ رات تجھے
وصل کی بات پہ شرمائی تھی تو
میرے پہلو میں سمٹ آئی تھی تو
آج اس ایک ملاقات کی یاد
موجِ صہبا کی طرح تند مزاج
تیرے چہرے پہ نمایاں ہوکر
میری آنکھوں میں سمٹ آئی ہے

قمر ہاشمی

رات

یہ کتنی دل کش رات ہے
فطرت کی اک سوغات ہے
ٹیسوں کی کلیاں کھل گئیں
مہکے ہیں غنچے درد کے
شب تاب داغوں کے کنول
مہتاب کو شرما گئے

یادوں کی بھینی خوشبوئیں
پیوست ہیں سانسوں میں جو
اُبھریں فضائے رُوح سے
موجِ صبا میں گھل گئیں

بُت خانۂ تخئیل کے
سارے دریچے کھل گئے
تارے ہیں یا گل فام ہیں
ترشے ہوئے اصنام ہیں
یہ اَبر کے ٹکڑے ہیں یا
پیوند ہیں تنہائی کے
خاموش نغموں کی صدا
میرے لئے مانوس ہے
مہتاب کی سیمیں کرن
احساس کی فانوس ہے
ساری فضا ہے دم بخود
خوابیدہ بھی بیدار بھی
پلکوں کی بوجھل اوٹ پر
نیندوں کا افسوں جلوہ گر

فضا ابن فیضی

ایک پھول اور کھلا

بن کے ہر دور میں پیغامِ بہار آیا ہوں
زندگی کی نئی قدروں کو پکار آیا ہوں
بوجھ سر سے غمِ ہستی کا اُتار آیا ہوں
لے کے میخانے سے الزامِ خمار آیا ہوں

پھر دہ بلّور کے پیمانے میں شعلہ چھلکا
ایک پھول اور کھلا

کون کہتا ہے وہ مستی بھرے ساون گئے بیت
یہ مرا شوخ جنوں، یہ مرے پندار کی جیت
یہ گل و لالہ کے سینے میں سُلگتے ہوئے گیت
زندگی کی ہے امانت یہ قلم کا سنگیت

ہاتھ میں سازِ قلم، دہر میں طوفانِ نوا
ایک پھول اور کھلا

یہ جنوں اور جنوں کی منترنم سی نگاہ
زمزمہ بن گئی ماحول کے ہونٹوں کی کراہ
بن گئے عین ثواب آج تمدن کے گناہ
دی ہے افسانوں کی آغوش نے خوابوں کو پناہ

دیکھ! اسلائے وطن کھولتی ہے بندِ قبا
ایک پھول اور کھلا

سوزِ آفاق چھپائے ہوئے کونین کی رات
پھول بنتا ہوا یہ "شعلۂ تعمیر و ثبات"
یہ ابلتے ہوئے ہر گام پہ مستی کے فرات
میرے ہونٹوں سے ٹپکتا ہوا یہ شہدِ حیات

ہر نفس ہے مرے ماحول کا کوثر میں دُھلا
ایک پھول اور کھلا

کھیل سمجھا ہوں حوادث کی پُر افشانی کو
لے کے آغوش میں آفات کی طغیانی کو
میں نے سیراب کیا کشتِ جہانبانی کو
موجِ شبنم میں بھگویا غمِ ویرانی کو

نظر آئی مجھے شعلوں کی ہتھیلی پہ حنا
ایک پھول اور کھلا

یہ سحر ہے کہ مرے دیدۂ بینا کی کرن
حسن پرتو سے ہیں ذرّوں کی بھی آنکھیں روشن
دُور تک پھیلے ہوئے رنگ و نزاکت کے چمن
کوئے محبوب ہے یا کوچۂ تہذیبِ وطن

دی ہے پھر قیس کو خود ناقۂ لیلیٰ نے صدا
ایک پھول اور کھلا

نذر کی خلعتِ شبنم مجھے انگاروں نے
دیں بہاریں مجھے، کانٹوں کے خریداروں نے
میرے جذبات کی تحسین کی فنکاروں نے
خود مجھے پیار کیا میرے غزل پاروں نے

کھُل کے برسی ہے مرے جوشِ طبیعت کی گھٹا
ایک پھُول اور کھِلا

دل کو اُس چشمِ فسوں گر کے حوالے کر دے
شعلۂ تازہ کو ساغر کے حوالے کر دے
شوقِ پرواز کو شہپر کے حوالے کر دے
وقت کے زخموں کو نشتر کے حوالے کر دے

پھر مہک اُٹھی ہے زخموں کی گُلابی سی فضا
ایک پھُول اور کھِلا

خود سفینے کی طرف دوڑ کے ساحل پہنچا
اَبر، سُوکھے ہوئے کھیتوں کے مقابل پہنچا
قافلہ عصرِ رواں کا، سرِ منزل پہنچا
حُسن خود لے کے مرے عشق کا حاصل پہنچا

اِتنا دِل کش مری آشفتہ نگاہی کا صِلا!
ایک پھُول اور کھِلا

کتنے شعلوں نے کیا ہے مرے تن من میں قیام
کتنے آہو مرے صحرا میں ہوئے محوِ خرام
لالہ و گل نے سُنے ہیں مرے زخموں کے پیام
مجھ کو جھک جھک کے گئے زہرہ و پروین سلام
چاندنی، اوڑھ کے نکلی مرے نغموں کی ردا
ایک پھول اور کھلا

شعر و مستی کے یہ بیدار ارم ہیں میرے
زندگی کے یہ قبا پوش صنم ہیں میرے
یہ سنورتے ہوئے ملت کے حرم ہیں میرے
وہی منزل ہے جہاں نقشِ قدم ہیں میرے
شامِ منزل! ذرا لو اپنے چراغوں کی بڑھا
ایک پھول اور کھلا

یہ ہنر اور یہ افلاسِ ہنر کے چرچے
پھر بھی ہیں عام مرے حسنِ نظر کے چرچے
یہ زباں پر شبِ دوراں کی، سحر کے چرچے
تا بہ کے ہوتے مرے ذوقِ سفر کے چرچے
شکر ہے خود مری منزل نے مجھے ڈھونڈھ لیا
ایک پھول اور کھلا

حرماں خیرآبادی

○

پھول ہیں، رشکِ بیاباں ہی سہی
اپنی درگت کی بہاراں ہی سہی

ہم بھی شاعر ہیں، پریشاں ہی سہی
آپ اس دور میں انساں ہی سہی!

کم نہیں تاجِ شہنشاہ سے ہم،
پاؤں تک خاک میں غلطاں ہی سہی

ہم گراں سنگ ہیں رک جائیں گے
گردشِ وقت سے جولاں ہی سہی

میں مروت سے نہیں ہوں خالی
آپ کا لطف گریزاں ہی سہی

شکر ہے، آنکھ کھلی ہے اب بھی
روحِ ناچیز کی زنداں ہی سہی

دولت بیش بہا ہوں حرماں
ناکسی ذہن سے پُرساں ہی سہی

خلیل الرحمن اعظمی

○

خود چلے آؤ یہاں یا کہ صدا دو ہم کو
ہم گنہگار تمہارے ہیں دعا دو ہم کو

کیا کریں ہم سے نہیں ہوتی یہ دنیاداری
ہم جو دنیا کے نہیں ہیں تو مٹا دو ہم کو

ہم تمہارے ہیں، تمہارے ہی قریب آ بیٹھے
ہوں جو گستاخ تو محفل سے اٹھا دو ہم کو

دامنِ قیس سہی دامنِ یوسف نہ سہی
اب تو یہ چاک ہے جو چاہے سزا دو ہم کو

شمع کو کچھ نہ کہو خود ہی جلا پروانہ
اب اُسی شوخ کے قدموں میں سُلا دو ہم کو

سچ عجب چیز ہے، سچ کہہ کے زباں سُوکھ گئی
اور کیا دو گے مگر زہر پلا دو ہم کو

اپنی ہی راکھ میں یہ آگ نہ کجلا جائے
اب لگائی ہے تو آنچل کی ہَوا دو ہم کو

یہ بھی ہم بھول گئے نام ہمارا کیا تھا
پوچھ کر گردشِ دوراں سے بتا دو ہم کو

یا ہمیں قید کرو محبسِ تنہائی میں
یا اُسی دشمنِ جانی سے ملا دو ہم کو

جن کو آنکھوں سے لگایا تو ہمیں چھوڑ گئے
انھیں چہروں، انھیں خوابوں کا پتا دو ہم کو

وحشت

○

قصۂ شوق کے عنوانِ دلِ آرام کئی
میں نے کس پیار سے رکھے ہیں ترے نام کئی

ٹکٹکی باندھ کے بس دُور سے تکتے رہنا
وصل میں ملتے ہیں اب ہجر کے آلام کئی

عقدۂ جاں کو ہے ابتک ترے ناخن سے اُمید
کس کو معلوم ادُھورے ہیں مرے کام کئی

وادیٔ سنگ سے اَنجان گزرنے والے
ناتراشیدہ رہے جاتے ہیں اَصنام کئی

دلِ زندہ سے ہے یہ گرمیٔ بازارِ حیات
سر سودا زدہ قائم ہے تو الزام کئی

کچھ نہ کچھ کہتی تھی وہ آنکھ دمِ رخصتِ شوق
لے کے اُٹھتا ہوں کسی بزم سے اُدہام کئی

جیسے ہر ایک دریچے میں ترا چہرہ ہو
یوں مرے حال پہ ہنستے ہیں در و بام کئی

شادؔ اب اس کی خموشی کو دُعا دینا ہے
جس نے بھیجے تھے مجھے نامہ و پیغام کئی

رئیس امروہوی

○

یہ شامِ غم ہی نویدِ فروغِ جاں تو نہیں
پسِ غبار۔ کوئی تازہ کارواں تو نہیں

تلاشِ دوست بہانہ پئے جہاں تو نہیں
جنوں خود اپنے لئے ہی رواں دواں تو نہیں

ہوائے تندِ حوادث اُڑا رہی ہے جسے
وہ مشتِ خاک ہی سرمایۂ جہاں تو نہیں

ٹھہر گیا ہے جہاں کارروانِ فکر و شعور
وہ تیرا در تو نہیں تیرا آستاں تو نہیں

جہاں ہے ایک تصوّر۔ مجھے قبول مگر
جہاں پہ کوئی تصور ہی حکمراں تو نہیں

شگافِ سنگ سے اُبھرا ہے لالۂ کہسار
یہ کوہکن کا کوئی زخمِ خونچکاں تو نہیں

تڑپ رہی ہے فضائے بہار میں بجلی
یہ انتقامِ طیورِ تپیدہ جاں تو نہیں

فسردگی کی چمن میں جو اک جھلک ہے رئیسؔ
اسی کا نام خزاں ہے۔ یہی خزاں تو نہیں

رضا ہمدانی

○

ہم لٹ رہے ہیں فصلِ بہاراں کے ساتھ ساتھ
دل بھی ہے چاک جیب و گریباں کے ساتھ ساتھ

موجِ بلا سے بچ کے نکلنا تو سہل تھا ۔۔!
ڈوبے ہیں ہم بھی اس دلِ ناداں کے ساتھ ساتھ

ہم محفلِ حبیب میں ہنس ہنس کے رات بھر ۔۔!
جلتے رہے ہیں شمعِ فروزاں کے ساتھ ساتھ

مارا ہمیں تو اس دلِ ایذا پسند نے ۔۔۔!
ساحل سے دُور ڈوبے ہے طوفاں کے ساتھ ساتھ

پہچانتے ہیں اس فلکِ کج سرشت کو ۔۔۔!
آخر رہے ہیں گردشِ دوراں کے ساتھ ساتھ

آشفتہ خاطری میں دیا ہے ہر اک کا ساتھ ۔۔!
حیراں ہوئے ہیں دیدۂ حیراں کے ساتھ ساتھ

بلقیسِ شوق سے ہے ہمیں رابطہ رضاؔ!
شہرِ سبا میں ہم تھے سلیماں کے ساتھ ساتھ

اثر صہبائی

○

کچھ شورشن کے خواب سے بیدار ہو گئے
دیکھا، ہجومِ فتنہ تو ناچار ہو گئے

دُنیا کا ہوش ہے نہ کچھ اپنا ہی ہوش ہے
آکر ترے حضور میں کچھ ایسے کھو گئے

ہر لمحۂ حیات ہے غرقِ نشاط و نور
تیرے ہی ہو گئے تری محفل میں جو گئے

بے خواب و اشکبار ابھی تک ہے چشمِ شوق
شمعیں بھی گُل ہوئی ہیں، ستارے بھی سو گئے

اُن پر نثار کون و مکاں کی مسرتیں
جو غم تمہارے حُسن سے منسوب ہو گئے

اَصنام جلوہ گر تھے جو تو رُو برُو نہ تھا
تو رُو برُو ہوا، تو وہ رُوپوش ہو گئے

میرا وجود نُور کا اک بحرِ بیکراں!
مجھ میں وہ انجم و مہ و خورشید ہو گئے

○

وہ سلسلے جو ترے حلقۂ اثر میں نہ تھے
بہ اعتبارِ نظر کب مری نظر میں نہ تھے

سنا سکے نہ تمہاری نگاہ میں ورنہ
یہیں تھے ہم بھی کسی عالمِ دگر میں نہ تھے

ہزار شیش محل بے شمار آئینے
وجودِ سنگ میں تھے سینۂ گہر میں نہ تھے

نبھا رہے ہیں کہ ہے رسم ورنہ صحرا میں
جنوں کے خاص مظاہر ہیں کیا جو گھر میں نہ تھے

بجھا دیئے ہیں دلِ دردآشنا نے مجھے
وہ سب قرار کے پہلو کہ چشمِ تر میں نہ تھے

اختر انصاری اکبرآبادی

○

اے مقصدِ حیات ابھی اور مسکرا
اے روحِ کائنات ابھی اور مسکرا
ہر زخم پھول بن گیا ہر داغِ دل چراغ
جانِ تغیرات ابھی اور مسکرا
مجھ سے نظر ملی تو نگاہیں بدل گئیں
اچھی نہیں یہ بات ابھی اور مسکرا
باقی ہے تیرگی کی جھلک بزمِ شوق میں
شمعِ تصورات ابھی اور مسکرا
قیدِ قفس کو توڑ کے قیدِ چمن بھی توڑ
بخشندۂ نجات ابھی اور مسکرا
اب مجھ کو غم نہیں ہے سحر دور ہی سہی
کٹ جائے گی یہ رات ابھی اور مسکرا
اس التفاتِ ناز پہ اختر کو ناز ہے
کچھ اور التفات ابھی اور مسکرا

شفقت کاظمی

○

جو ہو سکے تو کرم کی نگاہ فرماؤ
کسی کی حسرتِ ناکام پر ترس کھاؤ
نہ آئے راس دیارِ طرب کے ہنگامے
پھر آ گیا ہوں مسافر نوازِ صحراؤ
کبھی کبھی کے تصور سے دل نہیں بھرتا
مرے خیال میں آؤ تو بار بار آؤ
مجھے بھی قافلے والو ذرا خبر دینا
کہیں جو منزلِ مقصود کا پتہ پاؤ
مریضِ غم کو بہر حال جان دینا تھی
اب اپنی غفلتِ بے جا پہ تم نہ پچھتاؤ
مرے الم کا ہے یارو اگر تمہیں احساس
دوائے دردِ محبت کہیں سے لے آؤ
بڑا کٹھن ہے غمِ دل کا راستہ شفقت
خیالِ یار کی لہروں سے کھیلتے جاؤ

رشید کامل

○

آسودگیٔ درد کا سایا ہے بہت کچھ
ہم نے تجھے کھویا ہے تو پایا ہے بہت کچھ
سینے میں چراغاں کا سبب پوچھنے والو
دنیا کی نگاہوں سے چھپایا ہے بہت کچھ
چڑھتے ہوئے سورج نے دکھائے ہیں بہت رنگ
ڈھلتے ہوئے سایوں نے سکھایا ہے بہت کچھ
اُس شہرِ طلسمات کی گلیوں سے گزر کر
اک جھونکا بھی آیا ہے تو لایا ہے بہت کچھ
اے ہمسفرو، شکر کرو، راہِ طلب میں
سایا بھی جو اپنا ہو تو سایا ہے بہت کچھ
آنسو ہی نہیں ہم نے بہائے شبِ ہجراں
تا صبح، چراغوں میں جلایا ہے بہت کچھ
مت پوچھئے رُودادِ چمن ہم سے، کہ ہم کو
مسموم فضاؤں نے سُنایا ہے بہت کچھ
یہ بات جدا ہے، کوئی سمجھے کہ نہ سمجھے
ہم نے تو زمانہ کو بتایا ہے بہت کچھ
وہ دن ابھی کچھ دُور نظر آتا ہے کامل
جس دن کے لئے ہم نے گنوایا ہے بہت کچھ

آمنہ ابوالحسن

اندھیرے کا خوف

چچا کے آنے کی بات غلط نہیں تھی اس لئے جب بچوں نے اُودھم مچائی تو میں ناچار چپ ہو رہا۔ چچا کے ساتھ شاہدہ بھی آئی — بغیر آستینوں کا بلاؤز پہنے بال سیمٹ کے اونچی سی پونی ٹیل باندھے گالوں پر گہرا روز لگائے ناخنوں کو جانوروں کی طرح بڑھائے —

سارے بچے اس کے اطراف جمع ہو گئے۔ چچا کے سگار اور موٹی سی دستی چھڑی کو بھول کر وہ سب کے سب نہایت دھیان اور غور سے شاہدہ کا جائزہ لینے لگے پھر ایک کے بعد ایک خبریں پہنچانے لگے۔

"شاہدہ نے صرف برائے نام بلاؤز پہنا ہے۔"

"اس نے گالوں پر لال رنگ لگا رکھا ہے۔"

"ناخن تیر کی طرح نکیلے ہیں۔"

"گھوڑے کی دم بھی بنائی ہوئی ہے۔"

"سب سے عجیب بات چچا اسے شاہدہ کی بجائے شرلی پکار رہے ہیں۔"

پھر — "ہم بھی شرلی ہی پکاریں —؟"

ذرا ادھر کا کر میں نے سارے بچوں کو بمشکل چپ کر دیا "بڑے لوگوں کے بارے میں اس طرح کی بیہودہ باتیں نہیں کیا کرتے۔"

"تو ہم کیا کریں۔ ہم نے غلط تو نہیں کہا —" وہ بسورنے لگے

"لیکن کچھ کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ چپ چاپ دیکھو اور نہ دیکھ سکو تو اپنے اپنے کمروں میں جا کر پڑھو۔ نہیں تو باغ میں کھیلو اور کچھ نہ کر سکو تو ایک دوسرے کو کہانیاں سناؤ۔"

"آپ نے بھی تو ایک دن اس لڑکی کا مذاق اڑایا تھا جو ووٹ مانگنے آئی تھی" بچوں کی یادداشت پر مجھے ہنسی آگئی۔ الیکشن کا زمانہ تھا جب وہ لڑکی کینوسنگ کے لئے آئی تھی اس کے جانے کے بعد بھابی نے کہا تھا۔

"سوچ لو ریاض بری نہیں ہے" اور میں نے ہنس کر کہا تھا۔

"خدا کی شان ہے بھابی۔ اچھی خاصی شکل بگاڑ رکھی ہے کتوں کی طرح ناخن گھوڑے کی دم کی طرح بال۔ عریانیت کا چلتا پھرتا زندہ اشتہار"

بات کی تصدیق کے لئے میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا شاہدہ واقعی ایک تماشہ تھی۔ چچا کو سیاحت کا ابتدا سے شوق تھا خاص کر مغربی ملکوں کی سیاحت جب تک چچی زندہ رہیں شاہدہ ان کے پاس رہی جب وہ انتقال کر گئیں تو چچا اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ اماں نے بہت

کہا کہ ان کے پاس چھوڑ جائیں لیکن چچا کو بھاوج کا اعتبار نہ آیا کون جانے وہ ان کی ساری دولت اپنی اولاد پر خرچ کریں ان کی اکلوتی بیٹی کو پڑھا لکھا کر قابل نہ بنا لیں سو اچھی خاصی خوش خلق شاہدہ مغربی تمدن کا ایک ایسا اشتہار بن کر آئی تھی جو مشرق و مغرب کے درمیان لٹک کر رہ گیا ہو جس میں نہ مغرب کی ڈیسینسی (DECENCY) ہو نہ مشرق کی حیا۔ دونوں تہذیبوں کے اتحاد نے اسے محض ایک نمونہ بنا دیا تھا۔

جب شاہدہ پہلی مرتبہ اپنے بہن بھائیوں اور عزیز واقارب سے ملی تو کچھ اس طرح گھبرائی جیسے جنگلی بھیڑوں کے ریوڑ میں آگئی ہو۔ اماں نے دانتوں تلے انگلی دبائی بھابی نے منہ میں پلو ٹھونس کر ہنسی روکی اور بچے حیران و پریشان شریر آنکھوں سے اسے تکتے رہے۔ شاہدہ نے دو ایک دن تو بچھا دیکھی دسترخوان پر بیٹھنے پھر ہاتھ سے کھانے کی کوشش کی لیکن تیسرے ہی دن سب کے ہنسی ٹھٹھے سے مجبور ہو کر دونوں باپ بیٹی کے لئے ایک میز دو کرسیوں اور چھری کانٹوں کا انتظام کر دیا گیا۔

اب ایسا بھی نہ تھا کہ گھر بھر میں کسی نے انگریزی رہن سہن دیکھا ہی نہ ہو یا انگریزوں کے بارے میں شدبد بھی نہ جانتے ہوں لیکن سرسری ملاقات سے قطع نظر دن رات کی اٹھک بیٹھک میں ان طور طریقوں کو نبھانا مشکل ہو گیا جو ان باپ بیٹی نے اختیار کر رکھے تھے۔ منہ اندھیرے بیڈ ٹی رات کے کھانے کے بعد کافی۔ دن بھر گھر کے حوض میں پیراکی کی مشق اور شام گئے لڑکوں کے ساتھ بیٹ منٹن ——— ڈانس ———

اماں نے تھک کر کہہ دیا۔ مجھ سے یہ سب دیکھا نہیں جاتا بھلا ہو کہ بڑا میں تو بشیر میاں سے کہتی ہوں کہ اپنا انتظام علیحدہ کریں۔ جوان جوان بچے دن رات ننگی ٹانگیں اور کھلا سینہ دیکھیں تو جانے کیا کر بیٹھیں۔

اماں کا خدشہ صحیح تھا محلے کے ایسے لڑکے بھی جو اب تک گھر کی چوکھٹ نہ پھلانگ سکے تھے اب بے دریغ شاہدہ کی دوستی کے بہانے آنے لگے بھری مغرب میں اچھل کود مچانے لگے اونچے اونچے بلند بانگ قہقہے اور بے حیا فقرے نوک جھونک گھر اچھا خاصہ مچھلی بازار بن گیا۔ گھر کے بچوں کو تو اماں نے ذرا دھمکا کر سر مغرب ہی گھر کے کمروں میں قید کرنا شروع کر دیا مگر چچا کے ڈر سے آنے والوں کو نہ روک سکیں اپنے پرائے عزیز رشتے دار سبھی کتوں کی طرح خوشبو لے کر آنے لگے۔ کوشش کے باوجود اس مسئلہ کا حل ممکن نہ تھا یہ بھی پتہ نہ تھا پر چچا مستقل قیام کے لئے آچکے ہیں یا پھر سیاحت کے لئے باہر جائیں گے۔

میں نے اماں کو سمجھایا کہ چند روز وہ اس معاملے میں بالکل چپ رہیں آخر کچھ تو معلوم ہو چچا کا منشا کیا ہے اگر اماں کچھ کہیں گی تو زمانہ یہی کہے گا بھاوج کا ناطہ پورا کیا بھائی زندہ رہتا تو کیا چھوٹے بھائی کو اس طرح گھر نکالا دیتا زمانے کو کسی حال قرار نہیں۔ یوں بھی کہتا ووں بھی۔ عافیت اسی میں تھی کہ چپ رہا جائے سکنے والے کہتے پھر چپ بھی ہو جاتے اپنا قصور مان لیتے کچھ اماں کو اکساتے کچھ چچا اور شاہدہ کو بڑھاوے دیتے غرض کہ عجب دھما چوکڑی مچی ہوئی تھی مشکل تو یہ تھی کہ گھر کا یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر بھابی بھیا کے پاس دہرہ دون چلی گئی تھیں اور اب میں اکیلا تھا۔ سلمٰے کا آنا جانا بالکل بند تھا اصل کوفت مجھے اسی بات کی تھی بھابی کی آڑ میں وہ کبھی کبھار آجایا کرتی اب اس کی گنجائش نہ تھی۔ آدمی کو کھانا نہ ملے تو وہ چڑچڑا ہو جاتا ہے اور اگر اچھی صحبت نہ ملے تو یہ چڑچڑاہٹ مزید بدمزگی اور اکتاہٹ میں بدل جاتی ہے بھوک پیٹ کی ہو یا دماغ کی دیر تک قابل برداشت نہیں ہوتی سو ایک دن میں نے چچا سے کہا ——"اب شاہدہ کی شادی کر دیجئے یہی عمر شادی کے لئے موزوں ہوتی ہے" چچا نے سگار کے

گئیں ۔۔۔ دھوئیں اور عینک کے شیشوں کے پیچھے سے مجھے بغور دیکھا ۔ یہ بات نہیں کہ انھوں نے اس مشورے کو گستاخی پر محمول کیا ہو بلکہ شاید وہ یہ محسوس کرنا چاہتے تھے کہ جس جذبے کے تحت یہ مشورہ دیا جا رہا ہے اس میں کتنی سچائی کتنا خلوص ہے کہیں بھتیجا اس بہانے ان کی دولت ہضم کرنا تو نہیں چاہتا ۔۔۔ اور جب جہاں دیدہ آنکھوں کو اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ اس مشورے میں طمع کی جھلک مطلق نہیں تو دھوئیں کی چادر کے پیچھے ان کی نگاہیں منٹ بھر کے لئے دھندلا گئیں بولے "بیکار ہے ۔ بالکل فضول ۔ بائیس سال کی عمر میں شادی کر کے اماں نے ہماری جو مٹی پلید کی اس کا سبق کچھ کم ہے ۔ جو اب ہم اپنی اولاد کی زندگی خراب کریں ۔"

گھر بسانا مٹی پلید کرنے کے برابر ہے تو واقعی چچا کی مٹی پلید ہوتی تھی لیکن گھر بسانا ایک سماجی ضرورت اور فطری تقاضوں کی تکمیل کا نام ہے تو چچا نے کم عمری میں جتنا سکھ اٹھایا شاذ ہی کسی کے حصے میں آئے ۔۔۔ چچی مجھے ذرا ذرا یاد تھیں سبک سے نقشے کی شرمیلی سجیلی عورت تھیں جب ہم اسکول سے آتے تو عام طور پر چچی کی طرف چلے جاتے ایک گھر کے دو الگ الگ حصوں میں آبا اور چچا مقیم تھے چچی اتنی سگھڑ تھیں کہ ہمیشہ ان کے پاس مرتبانوں میں کچھ نہ کچھ بھرا تیار رہتا کھارا میٹھا اچار چٹنیاں اس کے علاوہ پھل پھلاری تازہ بھی اور خشک بھی پیسے کی افراط تھی یوں ہمارے گھر بھی کوئی کمی نہ تھی لیکن امی چچی کی طرح ہمارا خیال رکھتیں جو کچھ بھی کھانا ہوتا سوائے مقررہ اوقات کے درمیان میں نہ ملتا اس کے برعکس چچی کے پاس جب جاؤ وہ کچھ نہ کچھ ضرور کھلاتیں نہ کھاتے تو اصرار کرتیں ہمیشہ کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتیں جب ہم پوچھتے ۔۔۔ "چچی آپ نوکر رکھ کر بھی اتنی محنت کیوں کیا کرتی ہیں" تو وہ مسکراتیں مدھم سے لہجے میں کہتیں ۔ "تمھارے چچا کھانے پینے کے شوقین ہیں نا ۔ جانے کب آجائیں ۔۔۔" کسی کسالی چارپائیاں رنگ برنگے چکن پوشوں سے ڈھکی قرینے سے سجے تخت سفید چاندنی کے فرش سے آراستہ بے شمار گاؤ تکیے چھوٹی چھوٹی چوکیوں پر خوب منجھے ہوئے پانی سے لبریز مراد آبادی لوٹے اسٹینڈ پر پنکھوں کی قطار صحن ہر دم جھاڑا پونچھا صاف غرض کہ چچی کے گھر جا کر کچھ ایسے سکون کا احساس ہوتا جو بہت کم گھروں میں جانے پر محسوس ہوتا ۔

چچا کے ایک لڑکا بھی تھا جو کم سنی میں کسی وبا میں فوت ہو گیا اور جب شاہدہ چھ برس کی ہوئی تو ایک روز اچانک حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے چچی اس دنیا سے چل بسیں ۔۔۔ چچا پہلے بھی گھومنے پھرنے کے شوقین تھے اب تو اور بھی گھر سے اچٹ گئے چھ برس کی شاہدہ اٹھارہ برس کی دوشیزہ بن کر آئی تو اس کی دنیا ہی بدل چکی تھی وہ اب شاہدہ سے شرلی بن چکی تھی اور چچا کہہ رہے تھے ۔۔۔ "اس کے علاوہ اسے کوئی لڑکا پسند بھی نہیں آیا ریاض ، وہ جب تک باہر تھی اسے بیارمان تھا کہ اپنوں کو دیکھے لیکن جب اپنوں میں آئی تو ہر رات یہی کہا کرتی ہے ۔ یہاں کے نوجوان بالکل وحشی ہوتے ہیں پپا ۔ وہ رنگ برنگی چڑیوں کی طرح عورت کو گھر کے خوشنما پنجرے میں قید رکھنا چاہتے ہیں ۔ میں ہندوستانی لڑکوں سے بیاہ نہیں کروں گی ۔"

دھوئیں کے مرغولوں میں چچا کا چہرہ اتنا سخت اتنا کرخت لگا کہ میں نے بے اختیار آنکھیں پھیر لیں ۔۔۔ اونچی ناک اور پسندیدہ نقشے کے باوقار چچا اس وقت کتنے خوفناک اور اجنبی لگ رہے تھے ۔

"سنا ہے وہ رحمان کے ساتھ گھنٹوں کھیلتی گھنٹوں تیرتی گھنٹوں تفریح کیا کرتی ہے خاصہ لڑکا ہے بات طے ہو جائے شادی پھر ہوتی رہے گی ۔۔۔"

چچا نے ایک لمحہ توقف کیا پھر بولے ۔ "میں نے کہا ضرور تھا لیکن رحمن اسے پسند نہیں مردوں میں عورتوں

ں نزاکت نسائیت اسے نہیں بھاتی اس کا خیال ہے مرد
مضبوط اور اکھڑ ہونا چاہیئے" چچا مسکرائے اور میں بات
ان کی تہاں چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔
خیال تھا شاہدہ کی شادی ہو جائے گی تو مسائل خود
بد حل ہو جائیں گے نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری گھر
ملی بازار سے پھر گھر بن سکے گا لیکن یہ خیال پورا نہ ہو سکا
ر ایک دن ڈبو نے مجھے بتایا ــــ "شرلی کو آپ سے محبت
گئی بھائی جان ــــ"
"ہش ــــ میں نے بوکھلا کر اسے ڈرایا پھر سنبھل کر
ا ــ "بے وقوفی کی باتیں مجھے پسند نہیں ــــ"
ڈبو سسکیاں بھرنے لگا ــــ "شرلی نے خود کہا
ا ــــ"

"کب کہا تھا شرلی نے ــــ؟"
"جب آپ باہر جا رہے تھے ــــ"
"کیا کہا تھا اس نے ــــ؟"
"یہی کہ بھائی جان بہت اچھے ہیں وہ کبھی میرے
ں نہیں آتے مجھ سے باتیں نہیں کرتے ہر وقت باہر
رہا کرتے ہیں پھر بھی مجھے اچھے لگتے ہیں" پھر مجھے گود میں
ٹھا کر بولیں۔
"اگر تم بھی بھائی جان کی طرح مضبوط اور توانا ہو
ہیں خوب پیار کروں"
"چپ ــــ میں نے ڈبو کو بھگا دیا لیکن میرا خیال
ار کے اسی بات کی طرف لوٹ جاتا۔ میں نے تو کبھی
ہدہ کو اس نگاہ سے نہیں دیکھا کبھی سوچا تک نہیں اور
یقت یہ تھی کہ چھپا ہوا خاموش شرم و حیا میں اپنا حسن
نا بار کشش انگیز ہوتا اتنا عریاں کھلا ہوا حسن نہیں
تا۔ شاہدہ کے نیم عریاں لباس اور اس کے جسم کے
ہنہ حصوں نے بھی کشش کا کوئی سامان بہم نہیں پہنچایا
ی بار اگر نظر اٹھی بھی تو بعد میں خود بخود عادی ہو گئی اور

اب تو جیسے اس کے بارے میں سوچ سوچ کر ہی ایک قسم
کی الجھن ہوئی کہ آنکھ ملاتے ہوئے بات کرتے ہوئے۔ اگر
اماں سامنے ہوتیں تو میں اس طرح نکڑا اسمنار ہتا جیسے
چوری کر رہا ہوں ایک نامعلوم سی کوفت جی کو جلاتی رہتی
اس کے برعکس چچا ہمیشہ شکایت کرتے۔
تم نے شرلی کو کچھ بھی نہیں دکھایا وہ ہندوستان
میں پیدا ہوئی لیکن ہندوستان سے ناواقف ہے جو
کچھ اس نے مجھ سے سنا اور کتابوں میں پڑھا ہے اسے
وہ خود اپنی نظروں سے دیکھنا چاہتی ہے تم بڑے بھائی
ہو تم اگر نہ دکھاؤ گے تو کون اسے یہ سب کچھ دکھائیگا لیکن
جانے کیوں میں ان کی یہ شکایت کوشش کے باوجود
رفع نہ کر سکا ایسے میں ڈبو کا انکشاف حیرتناک تھا میں چوکنا
ہو گیا۔

چچا اور شاہدہ اول وقت ہی رات کا کھانا کھا لیا
کرتے تھے اس روز جانے کس طرح میں جلد گھر لوٹ آیا
چچا کھانا ختم کر رہے تھے اور شاہدہ ابھی کھا رہی تھی چچا
کے اصرار پر میں بھی کھانے بیٹھ گیا اس دن کھانا کھاتے
میں ایک دوسرے کو پلیٹیں سرو (SERVE) کرتے
میں شاہدہ کی انگلیاں کئی بار مجھ سے ٹکرائیں دانستہ بھی
لیکن میں ان سے گریز نہ کر سکا دوسرے دن شاہدہ نے
مجھ سے کہا میں اسے رائیڈنگ سکھاؤں۔ رائیڈنگ کی
مشق میں خود بہت سرسری کی تھی اس کے باوجود میں تیار
ہو گیا کسی نوخیز احساس نے ذہنی نفرت کو ذرا سنبھالا دیا
سخت خول ٹوٹ گیا تا ریل کا پانی غیر معمولی میٹھا اور دل
پسند معلوم ہونے لگا میں خود بخود اس جذبے کا قائل ہوتا
چلا گیا میرے سارے استدلال سارے فاصلے ساری
احتیاطیں ختم ہو گئیں جیسے میں ان حالات کو قبول کرنے
کے لئے پہلے سے تیار تھا ــــ
رائیڈنگ کے دوران وہ کئی بار میرے بازوؤں

گھڑی دم لینے کی خاطر کئی بار اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیتی ایسے وقت میں سب کچھ بھول جاتا۔ مشرقی حیا کی شدت اور مغرب کی دلیرانہ پیشکش مجھے صرف ایک ہی احساس رہتا اور وہ طرب کا خوشی کا کسی غیر معمولی لطف وسکون کسی باطنی مسرت کا جیسے زندگی کی منزل اس سے آگے کچھ اور نہیں۔

شاہدہ کے اس رویہ کے باوجود میں نے کبھی موقع سے فائدہ اٹھا کر دراز دستی نہیں کی کوئی ایسی حرکت نہیں کی جو ایک مرد سے متوقع ہوتی ہے لیکن پھر بھی میں اس کی قربت کے لئے کوشاں رہنے لگا بلا یہ جانے بوجھے کہ مجھے اس قسم کی سرشاری کیوں محسوس ہوا کرتی ہے کیوں میں اس وقتی کیفیت سے گریز نہیں کر سکتا۔ رفتہ رفتہ شاہدہ میری زندگی اور میری مصروفیات کا ایک ضروری جزو بنتی گئی نوبت یہاں تک پہنچی کہ اگر کسی دن اس کے ساتھ گھوڑ سواری یا پیراکی نہ کرتا تو ساری مصروفیات کے باوجود مجھے زندگی میں بے کاری یا بیزاری اور کسی شئے کی کمی کا احساس ہوتا۔

میرے اس لطف وکرم نے محلے کے دوسرے بچوں کی دل شکنی ہوئی۔ شاہدہ کی بے التفاتی نے ان کا جوش و خروش اور ان کی آمد کم کر دی زیادہ سے زیادہ وہ سب جمع ہو کر بیٹ منٹن کھیل لیتے یا گراموفون پر سازکے ریکارڈ بجا کر اسٹیپس لیتے۔ جوں ہی میں داخل ہوتا شاہدہ گراموفون بند کر دیتی دوڑ کر میرے پاس چلی آتی پھر ہم حسب دستور شام کی تفریح کے لئے نکل جاتے۔

چچا جس حصے میں رہتے تھے وہ چچی کے انتقال کے بعد بک گیا تھا صحن میں دیوار اٹھ جانے کے بعد ہمارا حصہ بالکل الگ گھر کی حیثیت اختیار کر گیا تھا گو کہ یہ حصہ بھی کافی بڑا اور کشادہ تھا لیکن جلد ہی اماں کو میری مصروفیات اور مشاغل کا علم ہو گیا — وہ بگڑنے لگیں تو میں نے سمجھایا "یہ سب ایک ڈرامہ ہے میں اس بات کی کوشش کر رہا ہوں کہ شرلی پھر شاہدہ بن جائے اپنی اصلیت کی طرف واپس لوٹ آئے چچا بدلنے سے رہے میری صحبت سے متاثر ہو کر شاہدہ مغربی لغویات کو ترک کر دے تو اس کا مستقبل سُدھر سکتا ہے باپ دادا کا نام اُچھلنے سے بچ سکتا ہے۔"

اماں سادہ لوح ٹھہریں — من گئیں — میری دُور اندیشی اور جذبۂ چاہ کو پہچان نہ سکیں احتیاطاً بولیں "پھر بھی مجھے یہ سب کچھ پسند نہیں تمھیں لڑکیوں میں اس طرح دلچسپی نہیں لینا چاہئے۔ مشہور ہے کہ اچھی صحبت دیر میں اور بری جلد اثر کر جاتی ہے۔"

میں اماں کے پاس سے لوٹا تو مجرموں جیسا تھا تھکا مضمحل اور دل شکستہ تھا اس قومی احساس کے باوجود کہ میں نے اماں کو بڑی اچھی طرح فریب دیا ہے میں اس فریب پر خوش نہ رہ سکا مجھے کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نے اماں کو تو نہیں خود اپنے آپ کو فریب دیا ہے اور میں بھی خود کو معاف نہ کر سکوں گا۔

اُنہی دنوں ایک روز سلمےٰ آ نکلی۔ میں جو اُسے بھول چکا ہوا تھا دفعتہً چونک اُٹھا۔ سلمےٰ کا وجود میرے جسم و جان اور میری حیات کے لئے ایک ضروری اور مکمل قسم کا وجود تھا اس کے بغیر دنیا کی تکمیل میرے لئے ممکن نہ تھی اس کے باوجود میں اُسے خواب پریشاں کی طرح بھول گیا بھول نہیں گیا وہ میرے دماغ کے ایک کونے میں ضرور بیٹھی رہی لیکن میرے جسم میری طلب کے آگے مات کھا گئی۔ خود ساختہ تحریک پر جسمانی طلب نے اس طرح اکسایا کہ ذہن اور اس سے متعلقہ ساری حیات ماند پڑ گئیں تھوڑی دیر کے لئے دنیا صرف جسم بن گئی اور باقی سب کچھ دھندلا گیا۔

سلمےٰ حسب دستور آئی اور بیٹھ گئی اسی خوش دلی اور

خوش مزاجی سے ہنستی رہی بولتی رہی ادھر اُدھر کے قصے سناتی رہی گھر میں بوکھلا گیا۔ کہنے لگی۔ "بھابی جب سے گئی ہیں تم کبھی ہماری طرف نہیں آئے۔ پھر خود ہی بولی۔ "سنا ہے تمہارے یہاں مہمان آئے ہوئے ہیں اور وہ بھی بڑے خاص مہمان ——"

خاص مہمان اس نے دنیاوی اصطلاح میں کہا ہوگا لیکن میں لفظ خاص پر چونک پڑا۔ تو کیا سلمٰی کو پتہ چل گیا؟ میرا مجرم دل بے تحاشہ دھڑکنے لگا۔ میں اس سے نظر نہ ملا سکا میرا جی چاہتا تھا وہ زیادہ دیر نہ بیٹھے جلدی سے واپس لوٹ جائے کیونکہ زیادہ بیٹھنے میں یہ خدشہ لاحق تھا کہ وہ میرے احساسات جان نہ لے پڑھ نہ لے

اماں گھر پر نہیں تھیں اور مجھے یہ بھی ڈر تھا کہیں شاہدہ نہ آجائے اس لئے میں نے بڑی ہمت سے کہا —۔ "تم جاؤ سلمٰی مجھے اس وقت باہر جانا ہے اور پھر اُمی کے آجانے کا بھی ڈر ہے کل میں خود تمہارے پاس آؤں گا۔ اتنا کہہ کر میں آپ ہی پریشان ہوگیا وہ ذرا بھی نہ گھبرائی ذرا بھی نہ ٹھٹکی بولی —۔ "اچھی بات ہے فرصت ملے تو آجانا اور ہاں بھابی کو لکھنا کہ وہ جلدی آئیں مجھے بہت یاد آتی ہیں۔"

پتہ نہیں میں نے اسے کیا اُوٹ پٹانگ جواب دیا۔ وہ اسی طرح ہنستی مسکراتی اُٹھی اور بغیر کسی شکوے شکایت کے واپس چلی گئی۔ میرا دل دیر تک ملامت کرتا رہا لیکن اس تڑپن کے باوجود دوسرے دن تو کیا میں کئی دن تک اس کے پاس نہ جا سکا مجھے رہ رہ کے یہ گمان ہونے لگا تھا کہ وہ میری تبدیلی نہ جان لے وہ اس معاملے میں بڑی زود حس بڑی قیافہ شناس تھی اس کی ذکاوت سے مجھے ہمیشہ خطرہ تھا جب جب اس کا خیال آتا میرا جی چاہتا کہ کم از کم اخلاقی طور پر ہی سہی اس سے کئے ہوئے وعدے کے تحت ضرور اس کے پاس جاؤں لیکن پھر گمان غالب آجاتا —— کئی دن اسی طرح گذر گئے۔

پھر ایک روز جب میں شاہدہ کو پڑھا کے کر[illegible] سکا رہا تھا اچانک بھابی کے آنے کی اطلاع ملی میں [illegible] بڑا گیا اماں کو دھوکا دینا آسان تھا لیکن بھابی کو فریب میں رکھنا ناممکن —— میں شاہدہ کو چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اس دن آدھی رات کو شاہدہ چپکے سے [illegible] کمرے میں آئی۔ "میں آپ سے بہت خفا ہوں۔" [illegible] اٹھلائی۔ "آپ لوگوں سے اتنا ڈرتے کیوں ہیں آخر برائی کیا ہے۔ انگلستان میں تو لڑکے اس طرح نہیں کرتے۔ ہندوستانی واقعی بدھو ہوتے ہیں بغیر کہے [illegible] بات نہیں سمجھتے وہ میرے قریب لیٹ گئی۔ میں ہڑبڑا [illegible] اٹھ بیٹھا۔

"شاہدہ۔ شرلی۔" میں نے چیخ کر کہنا چاہا —— یہاں سے چلی جاؤ۔ ابھی۔ اسی وقت ورنہ میں —— میں ——

لیکن میں کچھ بھی نہ کہہ سکا شاہدہ نے بتی بجھا [illegible] اور مجھے دوبارہ کھینچ لیا ——

اس اندھیرے میں دفعتہً مجھے کچھ ایسا محسوس [illegible] جیسے سلمٰی کے جسم سے اس کا مقدس پلو کھینچ لیا گیا ہے [illegible] کی رعونت، عزت اس کا وقار بری طرح روندا جا رہا ہے —— اور میں چیخ مار کر اٹھ بیٹھا۔ میں نے بتی [illegible] میرا سارا جسم کانپ رہا تھا اندھیرا میرا منہ چڑا رہا [illegible] جیسے کہہ رہا ہو —— یہ اجالے کی فتح نہیں محض اندھیر[illegible] کا خوف ہے ..... !!؟

خوف —— !!!

اُٹھ فرید اُستیا

دو دن تک ہم خواجہ فرید کی کافیوں کے نشے میں مدہوش پھرتے رہے۔ دو دن تک ملتان کا ہر ذرّہ خواجہ فرید کی کرنوں سے چمکتا دمکتا رہا۔ دو دن تک ہم اور ملتان کے لوگ اپنے تمام کام چھوڑ کر روہی میں ایک روشنی کے مینار کی طرف بغیر آنکھ جھپکے لگاتار دیکھتے رہے۔

جشنِ فرید کے والنٹیروں کے علاوہ مسعود اشعر، ایڈیٹر امروز ملتان، ریاض انور، رکن بزم ثقافت ملتان، احمد بشیر اور ظہور نظر بھی ہمارے خیر مقدم کے لئے سٹیشن پر موجود تھے ظہور نظر موٹا ہو کر بالکل اپنے بھائی کی طرح ہو گیا ہے۔ یا شاید اس کا بھائی ظہور نظر کی طرح ہو گیا ہے۔ ظہور نظر کا بھائی کراچی میں ہے اور ظہور نظر بہاولپور میں۔ دونوں کالے ربن کی سڑا ہیٹ پہن کر پنجابی بولتے ہیں۔ ایک دن کراچی میں وکٹوریہ روڈ پر میں نے کالے ربن کی سڑا ہیٹ پہنے ہوئے ظہور نظر کو کھڑا ہوا دیکھا۔ میں اس کے سامنے بڑے اسٹائل سے کھڑا ہو گیا تاکہ وہ مجھے پہچان لے اور اپنی عادت کے مطابق مجھ سے گلے ملنے کیلئے آگے بڑھے اس کی بجائے اس نے کہا: "جی نہیں، میں ظہور نظر نہیں ہوں۔ میں ظہور نظر کا بھائی ہوں۔"

میں نے ظہور نظر سے پوچھا:

"تم ظہور نظر ہو یا ظہور نظر کے بھائی ہو؟"

ظہور نظر نے جواب دیا:

"میں ظہور نظر ہوں"

اور مجھے گلے سے لگا لیا۔

مہمانوں کو جلوس کی شکل میں سٹیشن سے باہر لایا گیا۔ اور کاروں کے ذریعے گلڈ ہوٹل میں پہنچایا گیا۔

ملتان کا گلڈ ہوٹل پاکستان رائٹرز گلڈ کا اپنا ہوٹل ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ پاکستان رائٹرز گلڈ نے ہوٹل کی بزنس شروع کر دی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حاجی حمید الدین نے پاکستان رائٹرز گلڈ کی تحریک سے متاثر ہو کر اپنے ہوٹل کو گلڈ سے منسوب کر دیا ہے۔ ملتان کے گرد و غبار میں ادب اور ثقافت کے شرارے پیدا کرنا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اس کارنامے کا ہیرو ایک بڑی دلکش اور غیر معمولی شخصیت ہے۔ اس کا نام مختار مسعود ہے۔ وہ کچھ عرصہ پہلے ملتان کا ڈپٹی کمشنر تھا۔ اس نے ملتان کے آتش فشاں پہاڑ میں دبے ہوئے ادب اور ثقافت کے لاوے کو حرکت میں لانے کے لئے اُسکے دہانے میں آگ لگا دی۔ میں نے مختار کے وقت میں منعقد ہونے والے پنجابی، ملتانی اور اُردو زبان کے مشاعرے اور کلچرل شو دیکھے ہیں۔ ان کا معیار بڑے شہروں کے ادبی اور ثقافتی مظاہروں سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ اُس نے ملتان میں گلڈ کی تحریک کا خیر مقدم کیا۔ اس نے یہاں پاکستان رائٹرز گلڈ کی شاخ قائم کی۔ حاجی حمید الدین نے اپنے ہوٹل کا نام گلڈ ہوٹل رکھ دیا۔ ہوٹل میں گلڈ کا دفتر اور لائبریری قائم کر دی۔ اور اس کی ساری آمدنی گلڈ کے لئے وقف کر دی۔ اور گلڈ ملتان کا ایک تحفہ بن گیا۔

چار چیز است تحفۂ ملتاں
گلڈ گرما گدا و گورستاں

اس طرح گلڈ نے گرد کی جگہ لے کر ملتان سے گرد و غبار کو صاف کر دیا۔

گلڈ ہوٹل عجیب سا نام معلوم ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی ملمع کیا ہوا زیور ہے۔ اور گلڈ ہوٹل باہر سے ملمع کیا ہوا زیور ہی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اندر جا کر یہ ثابت ہوتا ہے

کہ کلاڈ ہوٹل ملتان کا بہترین ہوٹل ہے۔

ہم سب لاؤنج میں جمع ہو گئے۔ وہاں امیر حمزہ شنواری، احمد فراز، فارغ بخاری، سید وقار عظیم، انتظار حسین، ناصر کاظمی، ممتاز حسین، جعفر طاہر، رفعت سلطان اور اقبال گیلانی موجود تھے۔ ہم میں سے اکثر ایک دوسرے کو جانتے تھے اس لئے تعارف کی رسم کی بجائے گلے ملنے کی رسم ادا ہوئی۔ چند ایک ایسے بھی تھے کہ ایک دوسرے کو جانتے تو تھے لیکن پہچانتے نہیں تھے۔ وہاں میں نے تعارف کا فریضہ ادا کیا۔

میں نے ایک کی طرف اشارہ کرکے کہا:

"ابن انشا"

پھر دوسرے کی طرف اشارہ کرکے کہا:

"شہرت بخاری"

ابن انشا نے مجھے ڈانٹ کر بتایا۔

"او بیوقوف، وہ شہرت بخاری نہیں ہے۔ فارغ بخاری ہے"

میں نے ابن انشا کو واپسی ڈاک ڈانٹتے ہوئے کہا:

"او بیوقوف، اگر تو فارغ بخاری کو جانتا تھا تو تو نے مجھے تعارف کی تکلیف کیوں دی؟"

اور چند ایک ایسے بھی تھے جو ایک دوسرے کو نہ جانتے تھے۔ نہ پہچانتے تھے۔ اور خود ہی اپنے آپ کو ایک دوسرے سے تعارف کرانے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس سلسلے میں اس دور کا ایک عظیم تعارف ہوا

ایک موٹے تازے آدمی نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا:

"رفیق خاور"

ایک دبلے پتلے آدمی نے اس کے ساتھ گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا:

"رفیق خاور"

ایک رفیق خاور کوٹ اُدّو کا تحصیلدار تھا جس نے کوٹ اُدّو کو کوٹ اُردو بنا دیا ہے۔ دوسرا رفیق خاور ماہ نو کا ایڈیٹر تھا جو پچھلے دس سال سے ماہ نو کو ماہ کامل بنانے کی کوشش کر رہا ہے

میں نے جعفر طاہر کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن میں نے اس کی شکل دیکھتے ہی اس کو پہچان لیا۔ وہ مختلف علاقوں کے نمائندوں میں کھڑا ہوا کانگو کا نمائندہ معلوم ہوتا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ میں اس کی طرف غور سے دیکھ رہا ہوں تو وہ میری طرف چل پڑا۔ شاید اس نے مجھے گھانا کا نمائندہ سمجھا ہوگا۔

میں نے کہا:

"ہیلو، جعفر طاہر، ہاؤ آر یو؟"

اس نے جواب دیا:

"انگریزی وچ گلاں کرکے توں میرے تے رعب نہ پا۔ میرے نال سدھی طراں گل کر"

میں نے کہا:

"بہت خوشی ہوئی۔ آپ کے مزاج کیسے ہیں؟"

اس نے جواب دیا:

"میں تینوں مار مار کے تیرا ڈُو بنا دیاں گا تے فیر تو ٹر ٹر کریں۔ ہُن میرے نال خواجہ فرید دیاں کافیاں وچ گلاں کر۔"

ہم دیر تک ہنستے رہے۔ اور پنجابی میں باتیں کرتے رہے۔

اس دوران میں ایک شخص دو تین دفعہ میرے سامنے سے گزرا اور پھر ایسی جگہ کھڑا ہو گیا جہاں سے میں اس کو دیکھ سکوں۔ میرا خیال تھا کہ میں نے اس شخص کو کہیں دیکھا ہے لیکن میں اس کو پہچان نہ سکا۔ غالباً وہ شخص مجھے پہچان گیا تھا لیکن میرے ساتھ بات کرنے سے اس لئے ہچکچا رہا تھا کہ میں اسے پہچانوں گا نہیں۔

اتنے میں ایک نوجوان جشن فرید کا بیج لگائے ہوئے میرے پاس آیا اور بولا:

"مجھے آپ کے لئے رابطہ افسر مقرر کیا گیا ہے، آپ کا سامان آپ کے کمرے میں رکھوا دیا گیا ہے، دوپہر کا کھانا تیار ہے۔ تین بجے مندوبین کو جشن فرید کے افتتاحی جلسے میں جانے کے لئے بس آجائے گی۔"

سب مہمانوں کے لئے ایک ایک رابطہ افسر مقرر کیا گیا تھا۔ رابطہ افسر مہمانوں کو ان کے کمروں میں لے گئے۔

ابطہ افسر مجھے کمرہ نمبرہ میں لے آیا۔ کمرے میں بڑا اچھا فرنیچر رکھا تھا اس کے ساتھ باتھ روم ملحق تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل پر جشن ید کا ایک بیج اور کھانے کے کوپنوں کی کتاب پڑی تھی۔

رابطہ افسر نے کہا:

"یہ آپ کا جشن فرید کا بیج ہے۔ اور یہ کھانے کے کوپن میری ضرورت پڑے تو میں ریسپشن روم میں موجود ہوں۔ میرا نام لطیف ہے"

لطیف نے بجلی کی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ بیرا آگیا۔ لطیف نے کوپنوں کی کتاب میں سے لنچ کا کوپن نکال کر بیرے کو دیا اور بولا:

"ان کے لئے ایک لنچ۔ اور اگر ان کو میری ضرورت پڑے تو مجھے ریسپشن روم سے بلاؤ"

لطیف چلا گیا۔

اقبال گیلانی آگیا، اور اندر آتے ہی بولا:

"نہیں۔ نہیں۔ نہیں، بھائی جان، آپ یہاں نہیں ٹھہریں گے۔ آپ میرے ساتھ چلیں گے"

اقبال گیلانی یک تخت شاعر، ادیب، ہیڈ کلرک اور چھ بچوں کا باپ ہے۔ اس طرح وہ صرف پارٹ ٹائم شاعر ہے۔ اور اس کے پاس نظموں اور غزلوں کی صرف چھ بیاضیں ہیں وہ اپنے اشعار بڑے سحر آفرین ترنم سے پڑھتا ہے۔ اور چونکہ اس کے اشعار میں بڑی لطافت اور نزاکت ہوتی ہے، وہ ادبی محفلوں پر چھا جاتا ہے۔ لیکن وہ ادبی محفلوں میں نہیں جا سکتا۔ کیونکہ جس وقت شہر میں ادبی محفلیں منعقد ہوتی ہیں اوریشنل بنک اوف پاکستان میں جمع تفریق کر رہا ہوتا ہے جہاں وہ ہیڈ کلرک ہے۔ اس لئے اس کے اشعار اس کی بیاضوں میں دفن رہتے ہیں۔ وہ صرف اس وقت باہر نکلتے ہیں جب میں ملتان میں آتا ہوں اور اقبال گیلانی کے پاس ٹھہرتا ہوں جب وہ رات کو آٹھ بجے بنک سے واپس آتا ہے تو ادبی محفل منعقد ہوتی ہے۔ جس کا میں ہی صدر ہوتا ہوں، میں ہی سیکرٹری اور میں ہی پبلک۔ مشاعرہ شروع ہوتا ہے جس میں صرف ایک شاعر اقبال گیلانی تشریف لاتا ہے۔ چھ بیاضیں ختم کرنے کے بعد رات کے کھانے کا انٹرول ہوتا ہے۔ اور چھ بیاضیں ختم کرنے کے بعد فجر کی نماز پڑھی جاتی ہے۔ اس لئے اقبال گیلانی ملتان میں میری آمد کا شدت سے انتظار کرتا ہے۔ اس دفعہ وہ بہت مایوس ہوا۔ میں اس کے پاس نہیں ٹھہرا۔

میں نے کہا:

"اقبال میں جشن فرید میں پاکستان رائٹرز گلڈ کا نمائندہ ہوں۔ اس لئے مجھے دوسرے نمائندوں کے ساتھ یہیں ٹھہرنا پڑے گا"

پھر الطاف سرور، مسعود اختر اور شریف بخاری آگئے۔ آتے ہی یک زبان ہوکر بولے:

"چلئے، اُٹھئے، آپ ہمارے ہوتے ہوئے ہوٹل میں ٹھہریں گے؟ ہم مرگئے ہیں کیا؟"

خصوصاً الطاف سرور بہت غصے میں تھا۔ وہ نشتر میڈیکل کالج میں رہتا ہے میں اس کے پاس ٹھہرنا بہت پسند کرتا ہوں میں وہاں گلاب اور چنبیلی کے پھولوں اور گھاس کے مخملیں تختوں کے قدرتی حسن میں گم ہوجاتا ہوں اور اقبال گیلانی کے بیاضوں کے حملوں اور ملتان کی گرمی کی شدت سے بچا رہتا ہوں۔ لیکن میں نے ان سب کو سمجھایا کہ میں جشن فرید پر ایک اہم کام کر رہا ہوں اس لئے میرا اس ماحول میں رہنا ضروری ہے۔

لیکن اقبال گیلانی، الطاف سرور، مسعود اختر اور شریف بخاری جشن فرید پر صرف میرے خیر مقدم کے لئے ہی نہیں آئے تھے، وہ ان تمام برگزیدہ ہستیوں کو خوش آمدید کہنے آئے تھے جو اس موقعہ پر ان کے شہر کی رونق بڑھانے آئے ہیں۔ وہ اس شہر کی پبلک کے نمائندے تھے۔ ان کے دلوں میں جشن فرید کی خوشیاں عید کی خوشیاں بن کر موجزن تھیں۔

وہ اس علاقے کے رجحانات کی بہیلیاں ہیں۔ وہ ادب اور ثقافت کا وہ لاوا ہیں جو ملتان کے آتش فشاں پہاڑ کے دہانے سے پھوٹ کر بہہ نکلا ہے۔

تین بجے کے قریب رابطہ افسر لطیف نے مجھے بتایا کہ بس جشن فرید کے لئے تیار ہے۔

باہر گلڈ ہوٹل کے احاطے میں چار ٹیکسیاں کھڑی تھیں جن کی پیشانیوں پر جشن فرید لکھا ہوا تھا۔ یہ ٹیکسیاں مندوبین کو ریلوے سٹیشن سے گلڈ ہوٹل تک لانے کے لئے استعمال ہوئی تھیں۔ سڑک پر ایک خوبصورت پبلک بس کھڑی تھی جس کے ماتھے پر چوک شہیداں اور خونی برج مٹا کر جشن فرید لکھ دیا گیا تھا۔

بس کے اندر جاکر مجھے قرۃ العین حیدر اور ہاجرہ مسرور بہت یاد آئیں۔ بس میں مغربی پاکستان کے تمام نمائندہ ادیب اور آرٹسٹ بیٹھے تھے، لیکن ان میں خواتین کا نمائندہ کوئی نہیں تھا۔ ایسے اہم موقعوں پر ہماری آرٹسٹ اور ادیب خواتین کا موجود ہونا بہت ضروری ہے، ہماری ادیب اور آرٹسٹ خواتین تعداد میں کچھ زیادہ نہیں۔ قرۃ العین حیدر، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، جمیلہ ہاشمی اور بانو قدسیہ، اس لئے خواتین کے معاملے میں نمائندگی کے سوال کو نظر انداز کر کے ان سب کو اہم ادبی اور ثقافتی اجتماعوں میں مدعو ہونا چاہیئے۔

بس ابن قاسم باغ سٹیڈیم کی طرف چل پڑی، شہر کو جشن فرید کے لئے خاص طور پر سجایا گیا تھا۔ دیواروں پر اس جشن کے بارے میں قد آدم پوسٹر لگے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ بانسوں کے دروازے بنائے گئے تھے جن پر سنہری لفظوں سے سرخ کپڑے کی زمین میں خواجہ فرید کی کافیاں لکھی ہوئی تھیں

ابن قاسم باغ اس پرانے کچی مٹی کے قلعے کا نیا نام ہے جس پر کبھی مول راج کا قبضہ تھا۔ یہ مٹی کا ایک بہت اونچا چوڑا چکلا ٹیلہ ہے جس پر کھڑے ہو کر ملتان کا شہر ایک گہری وادی میں پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ اب اس کو ایک بڑی خوبصورت پارک میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اس میں گھاس کے سرسبز لان، پھولوں کے تختے اور خوبصورت درخت لگے ہوئے ہیں۔ شام کو یہاں بڑی رونق ہو جاتی ہے۔ اس کی ایک طرف ایک بہت وسیع موڈرن اسٹائل کا کرکٹ سٹیڈیم بنا ہوا ہے اس کے وسط میں شیخ کا مزار ہے جہاں شام کو ادبی اور روحانی طبیعتوں کے افراد جمع ہوتے ہیں۔ یہ سیرگاہ ملتان کے لوگوں کے لئے جنت ہے۔

یہاں ابن قاسم باغ کے کرکٹ سٹیڈیم میں جشن فرید منایا جا رہا ہے۔ ملتان کے سب مشاعرے اور ثقافتی پروگرام یہیں ہوتے ہیں۔ تمام سٹیڈیم پر خوبصورت شامیانے چھائے ہوئے ہیں۔ سٹیج پر قیمتی قالین بچھے ہوئے ہیں۔ سٹیج کے سامنے دو قطاریں قیمتی صوفوں کی ہیں۔ ان کے پیچھے سٹیڈیم کی سیڑھیوں تک لکڑی کی فولڈنگ کرسیاں بچھی ہوئی ہیں۔ سٹیج کی ایک طرف عورتوں کے لئے انتظام ہے۔ دوسری طرف مندوبین کے لئے نوار کی کرسیاں بچھی ہوئی ہیں۔ سٹیج کو قنات سے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ قنات پر بجلی کے رنگین قمقمے ٹمٹما ٹمٹما کر جشن فرید کے الفاظ روشن کر رہے ہیں۔

پولیس کا بھرپور انتظام ہے سٹیڈیم سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے سید اختر حسین، وزیر امور کشمیر، اطلاعات و تعمیر نو، جشن فرید کا افتتاح کر رہے ہیں اور اس اجلاس کی صدارت فرما رہے ہیں۔

آج پندرہ اپریل ہے، اس وقت ساڑھے تین بجے ہیں۔

سردار عبدالجبار خاں، صدر بزم ثقافت، ملتان اپنا خطبۂ استقبالیہ پڑھنے کے لئے سٹیج پر آ گئے ہیں۔ لاؤڈ سپیکر گونجنے لگ گئے ہیں:

"صدر گرامی،

میں بزم ثقافت، ملتان اور ملتان کے شہریوں کی طرف سے آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں اور آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جشن فرید کا افتتاح کرنے کے لئے آپ نے ہماری

دعوت کو قبول فرمایا۔۔۔۔۔۔"

استقبالیہ خطبے کے اختتام پر سردار عبدالجبار نے کہا:

"میں ایک بار پھر آپ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہوئے آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ جشن فرید کا افتتاح فرمائیں۔"

سید اختر حسین، وزیر امور کشمیر، اطلاعات و تعمیر نو، نے اپنا صدارتی خطبہ پڑھ کر جشن فرید کا افتتاح کر دیا۔

پھر تالیوں کے درمیان سردار عبدالجبار خاں نے فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں، صدر پاکستان، کا پیغام پڑھا اور اُن کے پانچ ہزار روپے کے عطیے کا اعلان کیا۔ ایک دفعہ اور تالیوں کے درمیان انھوں نے امیر بہاولپور کا پیغام تبریک پڑھ کر سُنایا اور ان کے پانچ ہزار روپے کے عطیے کا اعلان کیا۔ پھر ایک دفعہ اور تالیوں کے درمیان انھوں نے سید اختر حسین وزیر اُمور کشمیر، اطلاعات و تعمیر نو، کے ایک ہزار روپے کے عطیے کا اعلان کیا۔

اس طرح بزم ثقافت ملتان، کو جشن فرید کے سلسلے میں جن اخراجات کا سامنا تھا وہ پورے ہوگئے، اس لئے اس کے صدر نے جشن کے آخری ثقافتی پروگرام محفل موسیقی سے ٹکٹ ہٹا کر اس کو فری کر دیا۔ اور خوب تالیاں بجیں۔

اب پہلا ثقافتی پروگرام ہوگا جس میں خواجہ فرید کی کافیاں گائی جائیں گی۔

میں پریت ہار کی کاپی کھول کر دیکھنے لگا۔ مندوبین کے آنے سے پہلے ان کی کرسیوں پر پریت ہار کی ایک ایک کاپی اور افتتاحی اجلاس میں ہونے والی چھپی ہوئی تقریروں کی کاپیاں رکھ دی گئی تھیں۔ بزم ثقافت ملتان نے خواجہ فرید کی زندگی، ان کی شاعری، اور اُن کے فلسفے پر سیر حاصل مضامین اور ان کی کافیوں کے منظوم ترجمے ایک رسالے کی شکل میں پریت ہار کے نام سے چھاپ دیئے تھے۔ اور اس کی ایک کاپی افتتاحیہ اجلاس کے صدر، سید اختر حسین وزیر امور کشمیر، اطلاعات و تعمیر نو کی خدمت میں نذر کی تھی اور ایک ایک کاپی مندوبین کو پیش کی تھی۔ پریت ہار کے آرٹ پیپر کے سرورق پر خواجہ فرید کے مزار کی تصویر ہے اور اس کا نام خواجہ فرید کی ایک کافی کے اس بند سے لیا گیا:

پیچ ڈو تنڑاں ساں بے تئیں جیساں
سجدل دساں کا فسر تھیساں
گل وچ پائم پریت ہار

(جب تک میں جیتی رہوں گی، پیچ کی طرف سفر کرتی رہی ہوں گی۔ واپس لوٹوں تو کافر ہو جاؤں۔ میں نے گلے میں پریت ہار پہن لی ہے)

پریت ہار بڑا خوب صورت رسالہ ہے۔ اگر کتاب ہوتی تو بہت اچھا ہوتا۔ اس کی حفاظت آسان ہوتی، یہ ذاتی لائبریری میں خواجہ فرید پر ایک پرمانٹ ریکارڈ کی حیثیت سے محفوظ ہو جاتا۔ اب مجھے ہمیشہ فکر رہے گا کہ میرا ملازم اس کو پُرانے اخباروں اور رسالوں میں ملا کر ردّی کے طور پر نہ بیچ ڈالے۔

مندوبین کی کرسیوں کے سامنے سٹیج دو حصوں میں بٹا ہوا نظر آتا ہے۔ دونوں حصوں کے درمیان قنات کا پردہ ہے، قنات کے پردے پر بجلی کے رنگ برنگے قمقموں سے جشن فرید لکھا ہوا ہے۔ سٹیج کے اگلے حصے میں جہاں قالین بچھے ہوئے ہیں پروگرام میں حصہ لینے والے آرٹسٹ بیٹھیں گے۔ اُس کے پچھلے حصے میں جہاں ایک کھُردری سی دری بچھی ہوئی ہے — آرٹسٹ اپنے پروگرام کا انتظار کر رہے ہیں۔ پردے کونے میں ثریا ملتانیکر اپنی ماں کے پاس کھڑی ہے۔ وہ تھک گئی ہوگی۔ اس کی ماں بھی تھک گئی ہوگی۔ وہ وہاں ڈیڑھ گھنٹے سے کھڑی ہیں۔ الغوزہ نواز فیض خاں اپنی مونچھوں پر تاؤ دے رہا ہے۔ اور اپنی پگڑی کے شملے کو درست کر رہا ہے۔ اور اپنی شلوار کے پائنچوں کی نوکوں کو اپنے جوتوں کی ایڑیوں کی طرف سرکا رہا ہے۔ موسیقار نزاکت علی سلامت علی اپنے سروں میں کنگھے کر رہے ہیں اور منہ پر اور گلے پر مالش کر رہے ہیں۔ سب آرٹسٹ کھڑے ہوئے اپنے پروگرام کا انتظار کر رہے ہیں۔ شاید بہتر ہوتا کہ اس طرف ایک قنات لگا کر آرٹسٹوں کو پبلک کی نظروں سے اوجھل رکھا جاتا اور ان کے بیٹھنے کے لئے کرسیوں کا انتظام بھی ہوتا۔ اینا ونسر کی آواز گونجی۔

"پہن تھیں تھیسی شاد دل
مونجھاں کوں نہ کر یاد دل
جھوکاں تھیسن آباد دل
ایہا نیں نہ وہسی ہک منی

(اے فرید اب خوشیوں کو گلے لگا اور غموں کو یاد نہ کر، بستیاں
پھر آباد ہونے والی ہیں ۔ ندی ہمیشہ ایک ہی رُخ نہیں بہتی)

جنابِ صدرات مآب، معزز خواتین وحضرات ، یہ ملتانی اور سرائیکی زبان کے عظیم شاعر حضرت خواجہ فرید کا پیغام ہے ۔ حضرت خواجہ فرید نے اپنی اس کافی میں دنیا کو رجائیت کا پیغام دیا ہے ۔ آؤ ہم آج کی شام خواجہ فرید کی کافیاں گا کر گذاریں ۔ آج شام کا پروگرام اور اس کے بعد رات کا پروگرام خواجہ فرید کی کافیوں کیلئے وقف ہے ۔ ملک کے عظیم فنکار آپ کی خدمت میں خواجہ فرید کی کافیاں پیش کریں گے ۔"

اور مشہور موسیقار نزاکت علی سلامت علی، حسین مغنیہ ثریا ملتانیکر، دلفریب الغوزہ نواز خمیسو خاں، اُستاد امید علی خاں اور دوسرے فنکاروں نے خواجہ فرید کی کافیاں پیش کیں ۔

شام کو پانچ بجے کے قریب جب موسیقار نزاکت علی سلامت علی خواجہ فرید کی ایک کافی پیش کر رہے تھے، جعفر طاہر نے کہا۔

"چلو عرفات میں کافی پئیں ۔"

یہ بڑی اچھی تجویز تھی ۔ چائے کا وقت ہو گیا تھا ۔ ہم عرفات میں بیٹھ کر لاؤڈ اسپیکر سے خواجہ فرید کی کافی بھی سُن سکتے تھے ۔ اور عرفات کی کافی بھی پی سکتے تھے ۔

جعفر طاہر، ممتاز حسین ، ابنِ انشا اور میں کیفے عرفات میں جا کر بیٹھ گئے ۔ جعفر طاہر نے کافی کا اوڈر دے دیا اور نزاکت علی سلامت علی خواجہ فرید کی کافی گاتے رہے ۔

تھوڑی دیر کے بعد انتظار حسین اور ناصر کاظمی بھی عرفات کی طرف آتے دکھائی دیئے ۔

ابنِ انشا نے کہا ۔

"حضرات ، موسیقی کے نزاکت علی سلامت علی گا رہے ہیں ، ادب کے نزاکت علی سلامت علی آ رہے ہیں ۔"

اس پر سب زور زور سے ہنسنے لگے ۔

پھر ممتاز حسین نے کہا ،

"بھئی ، پکا راگ ہمارے پلے تو پڑتا نہیں ۔"

جعفر طاہر نے کہا ،

"پکے رنگ میں لکھی ہوئی تنقید بھی کسی کے پلے نہیں پڑتی ۔"

انتظار حسین نے کہا ،

"پکے راگ ہمیں پسند نہیں ۔ ملتانی کافیاں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں ۔ ہمیں تو اناؤنسر کے اعلانات کا لطف آ رہا ہے ۔ ظالم نے کافی، راگ اور فنکار کے ہر تعارف کو ادبی فن پارے بنا دیا ہے ۔ کون ہے اناؤنسر؟"

جعفر طاہر نے جواب دیا ،

"رفیق خاور جسکانی ، کوٹ ادو کا تحصیلدار ۔ وہ اب اُردو میں پی ایچ ڈی کرنے کی کوشش کر رہا ہے ۔ اُس کے تھیسس کا عنوان ہے : اُردو ادب میں تحصیلداروں کا حصہ ۔ اُس نے اپنے تھیسس کا آغاز اکبر الہ آبادی کے اس شعر سے کیا ہے ؛

کون کہتا ہے کہ فنِ شاعری منحوس ہے
شعر کہتے کہتے میں ڈپٹی کلکٹر ہو گیا

اُس نے اپنے تھیسس میں لکھا ہے کہ سرسید احمد خاں، اکبر الہ آبادی، مہدی آفادی، مولوی ذکاء اللہ اور مولوی نذیر احمد اُردو ادب کے ستون ہیں ۔ ان سب نے اپنی زندگی نائب تحصیلدار سے شروع کی تھی ۔ اور ادب کی خدمت کرتے کرتے ڈپٹی کلکٹر ہو گئے تھے ۔ رفیق خاور جسکانی نے اپنی زندگی نائب تحصیلدار سے نہیں بلکہ تحصیلدار سے شروع کی ہے اس لئے نتیجہ ظاہر ہے ۔"

کافی ختم کر کے ہم اُٹھ کھڑے ہوئے اور اسٹیڈیم کی طرف چل پڑے ۔

راستے میں مجھے ظہور نظر مل گیا ۔ اُس کے ساتھ وہی شخص تھا جسکو میں نے پہچانا نہیں تھا ۔ ظہور نظر مجھے کھینچ کر الگ لے گیا اور اُس شخص کی طرف اشارہ کر کے بولا ،

"تم نے اس کو پہچانا کیوں نہیں ؟"

میں اس شخص کو غور سے دیکھنے لگا ،

"یہ حافظ لدھیانوی ہے ۔"

"ارے حافظ لدھیانوی ! بھئی میں معذرت چاہتا ہوں ۔ میں

[illegible]

ہم نے حافظ لدھیانوی کے ساتھ گرمجوشی کے ساتھ مصافحہ کیا۔ مجھے لدھیانے کا وہ زمانہ یاد آگیا جب آغا شیر احمد خاموش، م حسن لطیفی، ساحر لدھیانوی، حمید اختر، ظہور نظر، احمد ریاض، ابن انشا، حافظ لدھیانوی، اعجاز اکرم، شفیع منصور اور میں نولکھا سینما کے پاس اقبال ہوٹل میں بیٹھ کر بڑے معرکے کی ادبی بحثیں چھیڑ لیا کرتے تھے۔ اور جب امن عالم پر بحث کرتے کرتے ہم اقبال ہوٹل کو پوکنگ بنا دیتے تھے تو ہم اپنے سروں پر علامہ اقبال کا سایہ محسوس کرتے تھے۔ اور جب علامہ اقبال کا سایہ ہماری بحث کی حرارت کو زیادہ شدید کر دیتا تھا تو نولکھا سینما کے لاؤڈ اسپیکر سے ہگل کے گانے کی آواز آتی تھی اور ہم بحث کو بھول کر گانے میں گم ہو جاتے تھے۔ اور چپ چاپ بیٹھے گانا سنتے رہتے تھے۔ اور چائے پیتے رہتے تھے۔ اور ادبی دنیا میں اپنے روشن مستقبل کے خواب دیکھتے رہتے تھے۔

اسٹیڈیم میں واپس آکر ہم اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔
ثریا ملتانیکر خواجہ فرید کی مشہور کافی

وچ روہی دے رہندیاں نازک نازو جٹیاں

گا رہی تھی۔ پریت بہار میں ظہور نظر نے اس کافی کا بہت پیارا ترجمہ کیا ہے:

صحرا میں رہتی ہیں نرمل کومل چنچل دوشیزائیں

نرمل کومل چنچل دوشیزہ ثریا ملتانیکر خواجہ فرید کی کافی گا رہی تھی۔ اُس کی خوبصورت ناک میں نتھ ہے۔ اور وہ اپنے خوبصورت سانولے چہرے پر خوبصورت ناک اور نتھ کے ساتھ روہی کی ایک نازک نازو جٹی معلوم ہوتی تھی۔

جشنِ فرید کا پہلا افتتاحیہ اجلاس کامیابی کے ساتھ ختم ہو گیا۔

دوسرا اجلاس رات کو ساڑھے آٹھ بجے مسٹر قدرت اللہ شہاب کی صدارت میں ہوا۔ یہ اجلاس بھی خواجہ فرید کی کافیوں کے لئے مخصوص تھا۔ اس میں ان تمام فنکاروں نے حصہ لیا جنہوں نے پہلے اجلاس میں لیا تھا۔ ان کے علاوہ صرف دو فنکار اور اسٹیج پر آئے۔ موکشد علی عرف مقصد علی بنگالی نمائندہ اور عوام کا ہر دلعزیز اکتارے کا فن کار سائیں مرنا۔

موکشد علی عرف مقصد علی بنگالی نمائندے نے خواجہ فر[illegible]
یہ غزل سنائی جو اُس نے سفر کے دوران میں لکھی تھی اور جو اتنی لمبی [illegible]
جتنا کراچی سے ملتان کا سفر۔ اس غزل کو بہت پسند کیا گیا۔ اُس [illegible]
نے خواجہ فرید کے مغربی پاکستان کو اور لالن شاہ کے مشرقی پاکستا[illegible]
کو محبت کے پائیدار رشتے میں باندھ دیا۔

عوام کا محبوب اکتارے کا فن کار سائیں مرنا بھی جشنِ فرید [illegible]
حصہ لینے کے لئے آگیا تھا۔ جب سائیں مرنا کا ہڈیوں کا ڈھانچہ [illegible]
چنے میں اکتارہ لیکر اسٹیج پر آیا تو لوگوں نے تالیاں بجا دیں [illegible]
اکتارہ جھنجھنانے لگا تو سائیں مرنا اُس کی دھنوں میں دھنکا گیا [illegible]
کے سُروں میں سُر بن گیا۔ اُس کی موسیقی میں جذب ہو گیا۔ مو[illegible]
زندہ ہو گئی۔ سائیں مرنا مر گیا۔

رفیق خاور جسکانی نے اناؤنسر کے فرائض تانگے کے [illegible]
حادثے کے بعد اُسی خوبی سے ادا کئے۔ جیسے کہ پہلے اجلاس میں [illegible]
شام کو ایک تانگہ جس میں رفیق خاور یہ بر ماہ نو، رفیق خاور جسکا[illegible]
جعفر طاہر اور آذر تونسوی سوار تھے اُلٹ گیا تھا۔ اس کی ظا[illegible]
وجہ تو وہ ڈھلوان تھی جو ابنِ قاسم باغ کے گیٹ کو ملتان کے [illegible]
سے ملاتی ہے۔ ڈھلوان پر گھوڑا پھسل کر گر گیا اور تانگہ اُلٹ گ[illegible]
لیکن مجھے اس کے پیچھے کچھ ماورائی طاقتیں بھی کام کرتی ہوئی [illegible]
ہوتی ہیں۔ میرا خیال ہے اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ قدرت کو [illegible]
نیام میں دو تلواریں دیکھ کر غصّہ آگیا۔ دوسری وجہ زیادہ نا[illegible]
اور زیادہ پر اسرار ہے۔ اس کا تعلق بجلی کی اس مقناطیسی قوت [illegible]
ہے جس نے ایٹم کے جسم کو پھاڑ کر دنیا کو ہیروشیما بنا دیا تھا۔ اب [illegible]
جعفر طاہر کے چہرے کو غور سے دیکھیں۔ جعفر طاہر کا چہرہ انسانی [illegible]
کا نگیٹیو (NEGATIVE) معلوم ہوتا ہے۔ جو پوزیٹیو
(POSITIVE) چارج والی بجلی کو اپنی طرف تباہ کن طاقت [illegible]
کھینچتا ہے۔ اس نے جعفر طاہر کو ایک بڑا شاعر بنا دیا ہے [illegible]
کے نشیمن کو جلانے کیلئے بجلیاں اُس کے حکم کا انتظار کرتی [illegible]
لیکن اس کے دوستوں کو اس سے بڑا نقصان پہنچا ہے۔ [illegible]
کے ساتھ وہ بھی جل جاتے ہیں۔ تانگے میں رفیق خاور امید [illegible]

جکانی جعفر طاہر اور آذر تونسوی سوار تھے۔ بجلیوں نے ٹانگے کو
جعفر طاہر کا نشیمن سمجھا اور ٹوٹ پڑیں۔

اس حادثے کے باوجود رفیق خاور جسکانی نے اناؤنسر
کے فرائض انجام دیئے۔ اُسے اس حادثے میں سب سے زیادہ چوٹیں
آئی تھیں۔ اُس کا جسم بُری طرح درد کر رہا تھا۔ اُس کے زخموں
سے خون بہہ رہا تھا، اور وہ کہہ رہا تھا:

" مالکونس بھیرویں ٹھاٹھ کا پنج آہنگی راگ ہے جس میں
نشاط انگیز الم کی فضا پائی جاتی ہے۔ اس وقت وہ عظیم فنکار
جنہیں ملتان کی سرزمین سے ایک نسبت خاص حاصل ہے
اس راگ کے شبستان میں اپنے فن کی شمعیں جلائیں گے جشنِ فرید
کا یہ وسیع پنڈال ایک سیلابِ رنگ و نور کا حامل ہے۔ مگر اب
اس میں عظمتِ فن اور حسنِ آہنگ کی انوکھی شمعیں فروزاں ہونے
والی ہیں۔ آواز کی سندرتا سے محفل کو جگمگا دینے کا یہ انداز بھلا
نزاکت علی سلامت کے سوا کس کو نصیب ہو سکتا ہے۔ شام
چوراسی کے قریب بہنے والے دریائے بیاس کی کچھ لہریں ملتان کے
قریب بہنے والے دریائے چناب کی گلرنگ موجوں میں آملیں۔ اور
اُن کے اس نادر اتصال سے نزاکت علی سلامت علی کے فن کو
روانی اور بہاؤ نصیب ہوا۔ اب آپ نزاکت علی سلامت علی
سے مالکونس کا الاپ سماعت فرمایئے۔"

یہ بزمِ ثقافت، ملتان کے ارکان کی جانفشانی کی ایک
مثال ہے۔ جسے جشنِ فرید کو ہماری ثقافت کی تاریخ میں ایک بلند
مقام اور مستقل یادگار کی حیثیت دے دی ہے۔

دوسرے اجلاس کے اختتام پر میں نے خاور جسکانی سے کہا:

" اگر آپ اس ٹانگے کے حادثے میں شہید ہو کر ملتان کے
مزاروں میں ایک اور مزار کا اضافہ کر دیتے تو ہم آپ کے کتبے
پر لکھتے: رفیق خاور جسکانی۔ تحصیلدار، شاعر اور ناقد تسر"

آذر تونسوی کوٹ ادو کا زمیندار ہے جس کو رفیق خاور جسکانی
نے مشرف بہ اُردو کیا ہے۔ لیکن اُس کی ساڑھے سات فٹ
لمبائی اور ساڑھے چار فٹ چوڑائی کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے
کہ اُردو مشرف بہ آذر تونسوی ہوتی ہے۔ یہ اُردو کے حق میں اچھا
ہوا۔ صہبا لکھنوی کو دیکھ کر اُردو تپدق کی مریض معلوم ہوتی ہے۔ آذر
تونسوی کو دیکھ کر اردو ملکہ وکٹوریہ لگتی ہے۔ آذر تونسوی کوٹ ادو کا
غزل ہے۔ اس لئے رفیق خاور جسکانی اُس کو اپنے باڈی گارڈ کے طور
استعمال کرتا ہے۔ آذر تونسوی ہمیشہ رفیق خاور جسکانی کے ساتھ رہتا ہے
اور اس کو دھوپ سے بچاتا ہے۔

بس گلڈ ہوٹل جانے کیلئے تیار کھڑی تھی۔ بس کنڈکٹر ریاض ا
آگیا تھا۔ بس ڈرائیور غائب تھا۔ ریاض انور کے کپڑے پسینے سے
شرابور تھے۔ یہ پسینہ جشنِ فرید کے انتظامات سے ٹپکا ہوا گلاب تھا
ریاض انور جشنِ فرید میں شریک ہونے والے ادیبوں اور آرٹسٹوں کی
آمدورفت، آرام و آسائش، کھانے اور رہائش کی فکر میں اپنا کھانا
پینا اور آرام و آسائش بھول گیا تھا۔ احمد صرف پسینے اور پاپ پر گزارا کر رہا
ریاض انور نے احمد فراز کو جو بکھرے ہوئے بالوں کے ساتھ تیزی سے
ہوا بس کی طرف آرہا تھا آگے بڑھ کر سنبھالا اور بس میں داخل ہونے کے
لئے اس کی مدد کی۔ احمد فراز نے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا:

"اختر انصاری اکبر آبادی کہاں ہے؟"

اختر انصاری اکبر آبادی نے جواب دیا:

"حاضر جناب!"

احمد فراز نے مطالبہ کیا:

"اختر انصاری اکبر آبادی! میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم
پروفیسر اختر انصاری کا نام کیوں چرایا ہے؟"

فارغ بخاری نے دونوں میں سمجھوتہ کرانے کے لئے کہا:

"اختر انصاری اکبر آبادی نے پروفیسر اختر انصاری کا نام نہیں
چرایا۔ توارد ہو گیا ہے۔ شاعری میں توارد ہوتا آیا ہے۔ توارد شعروں کے
علاوہ ناموں پر بھی حملہ کرتا ہے۔"

ابنِ انشا نے اطلاع دی:

"حضرت اختر انصاری اکبر آبادی نے عوام کے پرزور اصرار پر اپنا نام
تبدیل کر لیا ہے۔ وہ آئندہ اپنے آپ کو اختر انصاری اکبر آبادی لکھا کریں گے۔"

ریاض انور نے ہماری گفتگو میں خلل ڈالا۔ وہ [illegible]

وہ سالے یہ جھوڑ کر پھر بس ڈرائیور کی تلاش میں نکل گیا نیشنل خاں بس کی کلک سیٹ پر بیٹھ گیا۔

ڈرائیور کے آنے پر بس چل پڑی۔

گولڈ ہوٹل میں آدھی رات کی رانی کا راج تھا۔ خاموشی میں موسیقی ملی ہوئی تھی۔ تاریکی میں ستارے ٹنکے ہوئے تھے۔ لان میں فوارہ موتی بکھیر رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ریگستانی ہوا چل رہی تھی۔ یہ رومانی فضا ادیبوں اور آرٹسٹوں کی نائٹ کلب ہے۔ آج گولڈ ہوٹل میں ادیبوں اور آرٹسٹوں کے سوا کوئی نہیں۔ سب لاؤنج سے کرسیاں نکال کر فوارے کے پاس لان میں بیٹھ گئے۔ اور ادبی ٹیبل ٹاک شروع ہو گئی۔

اب آپ کچھ ادبی خبریں سنیئے۔

سنائیے!

میں نہیں یہ سنائیں گے۔

ہاں، صاحب ارشاد!

معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اشفاق احمد نے اپنی طویل علالت کی بنا پر ادب سے ریٹائر ہونے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ لیکن بانو قدسیہ نے اُس کی درخواست کو رد کر دیا ہے۔ اور اُس کو بیماری کی طویل چھٹی دے دی ہے۔ اور خود اس کی جگہ پر اوفیشیئٹ کر رہی ہے۔ میراجی سکول آف پوئٹری کے پرانے عہدہ دار یوسف ظفر، قیوم نظر اور مختار صدیقی ضعیف العمری کے باعث اپنے عہدوں سے ریٹائر ہو گئے ہیں۔ اب ضیا جالندھری میراجی سکول آف پوئٹری کے پرنسپل مقرر ہوئے ہیں۔ انہوں نے چارج لیتے ہی افسانہ نگار انور کے خلاف سخت ایکشن لینے کا فیصلہ کیا ہے۔ انور نے اپنے ایک افسانے "انتخاب" میں میراجی ازم ... پر بڑے رکیک حملے کئے ہیں۔ ضیا جالندھری نے اپنے سکول میں انور کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا ہے۔ پچھلے دنوں میں ابوالفضل صدیقی اور انتظار حسین میں افسانہ نگاری کا مقابلہ ہوا۔ دونوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ "گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں" انتہائی غلط اور گمراہ کن محاورہ ہے۔ ابوالفضل صدیقی جیت گیا۔ اور اُس کو نشی پریم چند کے مدرسۂ خیال کی بہترین ٹرافی پیش کی گئی۔ خدا نے دنیا میں سب جڑے جڑے پیدا کئے ہیں۔ مثلاً قرۃ العین حیدر، ہاجرہ مسرور۔ یوسف ظفر، قیوم نظر، فیض احمد فیض، ن۔ م۔ راشد، مجید لاہوری، شفیع عقیل جمیل الدین عالی، طفیل احمد جمالی، جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، ابراہیم جلیس، انور۔ دو چیزوں نے ہمارے ادب کو بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ ممتاز شیریں کی ملک سے عدم موجودگی نے اور مسرت جہاں تیموری کی مست الوجودی نے۔ شوکت صدیقی فرسٹ کلاس افسانہ نگاری سے ریٹائر ہو گیا ہے۔ اب اُس نے فرسٹ کلاس ناول نویسی کا آغاز کیا ہے۔ فرسٹ کلاس ناول نویسی میں ہمارے ہاں صرف ایک رائٹر تھا۔ قرۃ العین حیدر۔ اب وہ ہو گئے ہیں۔ اس سے ڈاکٹر احسن فاروقی کو بہت صدمہ پہنچا ہے۔ اُس کا پروموشن رک گیا ہے۔

ادیبوں کی اس ہنگامی نائٹ کلب میں صبح تین بجے تک ایسے ادبی موضوعات اور مسائل پر بحث ہوتی رہی۔ جب تمام ادبی موضوعات اور مسائل ختم ہو گئے تو سب ادیب ایک دوسرے سے بور ہو گئے اور سب اپنے اپنے کمروں کو چلے گئے۔

۱۶ اپریل کی صبح!

آج یہ انکشاف ہوا کہ رفیق خاور، مدیر ماہ نو، ایک بڑا طاقتور مقناطیس ہے۔ صبح سے ہی اُس کے مداح اُس کے دروازے کے سامنے جمع ہونے شروع ہو گئے تھے۔ اُس کا کمرہ میرے کمرے کے ساتھ تھا۔ اُس کے چند مداح میرے کمرے میں گھس آئے۔ اور مجھے رفیق خاور سمجھ کر میرے پاؤں کو بوسے دینے لگے۔ میں نے اپنا پاؤں اُن کے منہ کے پاس کر دیا۔ جب انہوں نے اُس کو چوم لیا تو میں نے کہا میں رفیق خاور نہیں ہوں۔ اُنہوں نے ایسا منہ بنایا جیسے اُنہوں نے کونین مکسچر پی لی ہو۔ اور رفیق خاور کے کمرے میں چلے گئے۔ رفیق خاور، مدیر ماہ نو، کے مداح دور دور سے آئے تھے، بہاولپور سے، بہاول نگر سے، ٹنڈو بہاول خاں سے، پنڈی بہاؤ الدین سے۔ وہ رفیق خاور کے کمرے میں نہ سما سکے۔ وہ بہت سوں کو میرے کمرے میں لے آیا۔ اُنہوں نے رفیق خاور کا ناشتہ اور چائے کی دو پیالیاں پی لیں۔ وہ میرا ناشتہ اور میری دو پیالیاں بھی پی گئے جس ذرہ کے کوپنوں پر آئی ہوئی چائے کے علاوہ رفیق خاور نے اُن کے لئے اپنے خرچ پر بھی چائے منگوائی۔ اُنہوں نے ماہ نو کے معیار کی اور

مدیر ماہ نو کے مضامین کی بے حد تعریف کی۔ اور اُس کو بہاولپور، بہاول نگر، ٹنڈو بہاول خاں اور پنڈی بہاؤالدین میں آنے کی دعوت دی۔ یہ سلسلہ شاید شام تک جاری رہتا اگر میں رفیق خاور اور اُس کے مداحوں کو یاد نہ کراتا کہ نو بجے جشنِ فرید کا تیسرا اجلاس ہونے والا ہے اور ہمیں اُس میں شریک ہونا ہے۔ آخر رفیق خاور سے کے مداح چپے گئے۔

ہمارے رابطہ افسروں نے اندر آکر اطلاع دی کہ بس ابن قاسم باغ کو جانے کے لئے تیار ہے۔

نو بجے جشنِ فرید کا تیسرا اجلاس شروع ہوا۔ یہ ایک مذاکرہ تھا جس کا عنوان تھا۔ ہماری قومی ثقافت میں علاقائی ثقافت کا حصہ۔ اس اجلاس کی صدارت فیض احمد فیض نے کی۔ آدھا پنڈال سامعین سے بھرا ہوا تھا۔ اتوار کی صبح کو مذاکرے میں دلچسپی لینے والوں کی اتنی بڑی تعداد خواجہ فرید کی عقیدت اور جشنِ فرید کی کامیابی کی دلیل تھی۔

مذاکرے کا آغاز سید وقار عظیم نے کیا۔ اس میں فارغ بخاری، جعفر طاہر، سبطِ حسن، امیر حمزہ شنواری، انتظار حسین، رفیق خاور، شاہد احمد دہلوی، ممتاز حسین، ناصر کاظمی اور مقصد علی نے حصہ لیا۔ اور اس میں ذوالفقار علی بخاری، آغا ناصر، احمد بشیر، ظہور نظر، ابن انشا اور انور نے حصہ نہیں لیا۔ آخر میں فیض احمد فیض نے نہایت خوبصورت انداز میں مذاکرے کو وائنڈ اپ کیا۔

اس مذاکرے کا ہیرو جعفر طاہر تھا۔ اُس نے ایک نہایت دلچسپ اور دلکش تقریر کی جس میں اُس نے کچھ بھی نہیں کہا۔ اُس نے اسٹیج پر آتے ہی صدر کے بورژوا انداز کے لباس، سوٹ، بوٹ اور ٹائی پر بھرپور حملہ کر دیا اور پھر بولا:

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو ـــ اس کے بعد اُس نے اپنا کالا بھجنگ چہرہ پبلک کے سامنے کر دیا۔ اور پبلک نے اُس کے سیاہ چہرے سے خالی جگہ کو پُر کر دیا۔ یعنی چونکہ روسیاہ ہے، اس لئے روئے سخن جس کی طرف ہے اُسی کی طرف ہے۔ اور چونکہ روسیاہ ہے اسی لئے میں بھی روسیاہ ہوں۔ یعنی میں بھی بورژوا انداز کے لباس، بوٹ، سوٹ اور ٹائی میں ملبوس ہوں۔ دراصل جعفر طاہر یہ کہنا چاہتا تھا کہ قومی اور علاقائی ثقافت پر تقریر کے لئے ہم کو مغربی طرز کے لباس میں نہیں آنا چاہئے بلکہ ملتان کا فالودہ کھانا چاہئے۔ جعفر طاہر کی تقریر کا عنوان "ہماری قومی ثقافت میں علاقائی ثقافت کا حصہ" نہیں تھا۔ جعفر طاہر کی تقریر کا عنوان "ملتان کا فالودہ" تھا۔

انتظار حسین کی تقریر ایک ہی وقت میں تحریر بھی تھی اور تقریر بھی۔ اس لئے اُس میں دونوں مزے تھے۔ انتظار حسین لاہور کی ایک نمائش سے بہاولپور کی صراحی اور ریفریجریٹر کے استعارے لیکر آیا تھا۔ اُس نے بہاولپور کی صراحی میں علاقائی ثقافت کو اور ریفریجریٹر میں قومی ثقافت کو بند کرنے کی کوشش کی تاکہ ہمارے سرمائے ٹھنڈی جگہ میں رہ کر محفوظ ہو جائیں اور گلنے سڑنے سے بچ جائیں۔ لیکن انتظار حسین ہمارے ادب میں "دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو" کا سمبل ہے۔ اس لئے بہاولپور کی صراحی اور ریفریجریٹر ہماری ثقافتوں کو باہر پھینک کر واپس لاہور کی نمائش کی طرف دوڑ گئے۔

امیر حمزہ شنواری نے اپنی تحریری تقریر میں پبلک سے پوچھا کہ جب ہماری ثقافتی محفلوں میں عورتیں نیم عریاں ڈانس کرتی ہیں۔ اور بن ٹھن کر مردوں کو گا گا کر سناتی ہیں، تو وہ کونسی ثقافت کی نمائندگی کرتی ہیں؟ پھر اُسنے خود ہی جواب دیا وہ سرحد کی ثقافت کی نمائندگی ہرگز نہیں کرتیں۔ سرحد کی ثقافت کی ایک جھلک رحمٰن بابا کی برسی پر دکھائی جائے گی جو اگلے ماہ پشاور میں ہو رہی ہے۔

مقصد علی نے کہا ہم سمجھتا ہے اس جشن فرید میں ہم اردو میں تقریر کرنے کو چاہتے۔ میری امید ہے ہم کوئی گولی کروں گا تو آپ ہمارے کو معافی کریں گا اور مہربانی سے آپ ہم کو ہنستا نہیں۔ مقصود علی گولی کرتا رہا۔ پبلک معافی کرتی رہی۔ پبلک نے مقصد علی کی اردو کو بہت پسند کیا۔ اور تقریر کے اختتام پر خوب تالیاں بجائیں۔

ممتاز حسین نے بڑے تعمیر یکل انداز میں تہذیب اور ثقافت کا فرق بیان کیا۔ اور اس بات پر غور کیا کہ ثقافت پہلے ہوتی ہے یا کہ تہذیب۔ ممتاز حسین نے اس پیچیدہ مسئلے کو اتنی آسانی سے حل کر دیا جتنی آسانی سے انڈے اور مرغی کے مسئلے کو حل کیا جاتا ہے۔

رفیق خاور مدیر ماہ نو نے کہا کہ اب تک جن حضرات نے قومی اور علاقائی ثقافت پر گفتگو کی ہے۔ انہوں نے ان الفاظ کا مفہوم ہی نہیں سمجھا۔ اس کے بعد رفیق خاور پون گھنٹے تک ان الفاظ کا مفہوم بیان کرتا رہا۔

غرضیکہ گیارہ بلند پایہ ادیبوں کی اس ٹیم نے واضح طور پر یہ ثابت کر دیا کہ قومی ثقافت ایک بہت بڑا استوا البیلا دریا ہے جو ملک کے طول و عرض میں سے گزرتا ہوا اور اس کو سیراب کرتا ہوا آفاقیت کے سمندر میں جا ملتا ہے۔ اور علاقائی ثقافت لہراتی ہوئی، بل کھاتی ہوئی، ناچتی ہوئی گاتی ہوئی ندیاں ہیں جو قومی ثقافت کے دریا میں مل کر اس کو بے کراں اور بے پایاں زندگی بخشتی ہیں۔

اب مذاکرے کا صدر، فیض احمد فیض، مذاکرے کو وائنڈ اپ کرنے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ میرے سامنے فیض احمد فیض اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ کھڑا تھا۔ میں اس کی شخصیت سے اور اس کی تقریر سے بے حد متاثر ہوا۔

جشن فرید کا تیسرا اجلاس ختم ہو گیا۔

بس کی طرف جاتے ہوئے میں نے آغا شبیر احمد خاموش کو دیکھا۔ آغا شبیر احمد خاموش ایک معمولی تماشائی کی حیثیت سے پنڈال میں کھڑا تھا۔ مختار مسعود کے وقت میں وہ ایسے ادبی اور ثقافتی ہنگاموں کا انچارج ہوتا تھا۔ اس نے ملتان میں ادب اور ثقافت کی ترقی اور ترویج کے لئے بہت کام کیا ہے۔ وہ ملتان اردو اکادمی کا بانی اور اس کا روح رواں تھا۔ پچھلے دنوں میں ملتان کے جن اردو اور پنجابی شاعروں نے ملک میں دھوم مچا رکھی تھی، وہ ان کا مہتمم تھا۔

لیکن اب ملتان کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کی باگ ڈور ملتان کے نوجوان طبقے کے ہاتھ میں آ گئی ہے۔ اس نوجوان طبقے کا نمائندہ ریاض انور ہے۔ ریاض انور ملتان کا ایک ہونہار شاعر ہے جس کی شہرت ملتان کی سرحدوں کو پیچھے کی طرف دھکیل رہی ہے۔ اس جوشیلے اور پھرتیلے نوجوان نے ملتان کی ادبی سرگرمیوں میں انتہا کی شدت پیدا کر دی ہے۔ اس نوجوان طبقے کا ایک اور اہم کارکن مسعود اشعر ہے۔ مسعود اشعر امروز، ملتان کا ایڈیٹر ہے جو اپنی غیر محدود مصروفیتوں کے باوجود ادب اور ثقافت کے لئے وقت نکال لیتا ہے۔

میں نے آگے بڑھ کر بڑے احترام سے آغا شبیر احمد خاموش کو سلام کیا اور اس کے ساتھ بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور اعجاز اکرم کے بارے میں سوالوں کی بوچھاڑ کر دی:

"اعجاز اکرم کہاں ہے۔
کیا کرتا ہے؟ —
اس کی شاعری کا کیا حال ہے؟ وہ چپ کیوں ہے؟"

اعجاز اکرم آغا شبیر احمد خاموش کا بھائی ہے۔ لیکن میرے سوالوں کا جواب آغا خاموش کی بجائے شاہد اقبال نے دیا۔ شاہد اقبال ڈیرہ غازی خاں کا نوجوان شاعر ہے، وہ آغا خاموش کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے کہا:

"ان سب سوالوں کا جواب صرف ایک لفظ ہی ہے — شطرنج — شطرنج انسان کی ان گنت صدیوں کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر ڈیرہ غازی خاں میں آغا اعجاز اکرم کے کاشانہ میں پناہ گزین ہو گئی ہے۔ آغا اعجاز اکرم اس کی دل و جان سے حفاظت کرتے ہیں۔ اس کی فکر میں ان کے بال سفید ہو گئے ہیں۔ ان کی شاعری شطرنج کی تیمارداری میں مصروف ہے۔"

بس کنڈکٹر ریاض انور آ گیا۔ اور مجھے بس کی طرف لے گیا۔

بس میں فرعون مزاج ایڈیٹروں کا مسئلہ زیر بحث آ گیا

...ے پہلے اس بات پر غور کیا گیا کہ ایک ادبی ایڈیٹر اور ادبی
...ے کا معیار کیا ہوگا۔ ایک ادبی رسالے کے ایڈیٹر کو بہت
...تعلیم اور بہت بلند پایہ اخلاق سے مزین ہونا چاہیے۔" پچھلے
...ں میں چند ایک تاجروں کو رسالوں کی تجارت میں بڑا فائدہ
...ا ہے۔ ان رسالوں میں دیدہ زیب کتابت و طباعت اور
...زیب سرورق کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا لیکن ان کی اتفاقیہ
...یابی نے ان کے دماغ کو متزلزل کر دیا ہے۔ وہ ادب کے
...ن بن گئے ہیں۔ وہ ادیبوں کو اپنے رسالوں میں لکھنے کا حکم
...تے ہیں۔ اگر کسی وجہ سے ان کے حکم کی تعمیل نہیں ہوتی تو ان
...خلاف تادیبی کارروائی کی جاتی ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:

آپ نے افسانہ نہیں بھیجا۔ اچھا کوئی بات نہیں
آپ کے نہ لکھنے سے ادب ڈوب نہیں جائیگا۔
میں نے آپ کو ادیبوں کی فہرست سے نکال دیا
ہے۔ اور آپ پر اپنے رسالے کے دروازے
بند کر دیئے ہیں۔ آپ نے ان دو افسانوں کا
ذکر کیا ہے جو میرے رسالے میں بلا معاوضہ چھپے
ہیں اور جن کو حاصل کرنے کے لئے میں آپ کے
ہاں گیا تھا اور میں نے افسانے لینے کے علاوہ
آپ کی کھانے کی دعوت بھی قبول کر لی تھی مجھے
اپنی غلطی کا احساس ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں
کہ آئندہ کبھی ایسی غلطی نہیں کروں گا۔

یہ ایک ادیب کے تاجر کے خط کا اقتباس ہے جو اس
نے ایک ادیب کو لکھا تھا یہ صرف ایک مثال ہے۔ ملک کے
...ے بڑے ادیبوں کو ایسے خط موصول ہوئے جن میں ادب کے
...اجروں نے ان کے ساتھ بے ادبی کا سلوک کیا ہے ان خطوں
...ے ملک کے ادیب طبقے کی جو بے عزتی اور تذلیل ہوئی ہے اس
کا تقاضہ ہے کہ ملک کے تمام ادیب اس قسم کے ایڈیٹروں کے
خلاف جہاد کا اعلان کر دیں۔ اور ان کو ادب کی قلمرو سے جلا
وطن کر کے ان کاموں پر لگا دیں جس کے لئے وہ پیدا ہوئے ہیں۔

پھر گلڈ ہوٹل آگیا۔

گلڈ ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں ادیبوں نے نقادوں
کے فرائض ادا کرنے شروع کر دیئے۔

"راشد ایران میں بھی اجنبی تھا اور پاکستان میں بھی
اجنبی ہے۔ ایران میں اس کی شاعری اُردو شاعری معلوم
ہوتی ہے۔ اور پاکستان میں اس کی شاعری فارسی شاعری
معلوم ہوتی ہے"!

"ضیا جالندھری میراجی سکول آف پوئٹری کا سب سے
بڑا شاعر ہے۔ کیونکہ اس کی شاعری میں میراجی ازم نہیں ہے"۔

"رفیق خاور ایک ایسی کتاب ہے۔ جس کی اس دُنیا
میں صرف ایک ہی کاپی ہے۔ نزدیک سے دیکھ کر اس کتاب
میں ایک بڑا شاعر، اور ایک بڑا نقاد صاحب دکھائی دیتے
ہیں، لیکن وہ اس کتاب میں بند ہیں، وہ اس کتاب سے باہر
نکل کر پھیلنے کے لئے تڑپ رہے ہیں۔ لیکن رفیق خاور ان کو
باہر نکلنے نہیں دیتا"۔

میں عبدالعزیز خالد کی زندگی کا ایک فلمی واقعہ سناتا
ہوں۔ رات کے دو بجے تھے۔ چودھویں رات کا چاند نکلا ہوا
تھا۔ عبدالعزیز خالد ہوسٹل کی چھت پر گیا۔ اور پورے چاند
کی طرف سنجیدگی سے دیکھتے ہوئے بولا: "میں ماہ کامل کی قسم
کھا کر کہتا ہوں کہ میں پاکستان کا سب سے بڑا شاعر ہوں"۔
پھر وہ عربی، فارسی اور انگریزی کے مطالعے میں غرق ہوگیا۔
اور بحیرۂ عرب، خلیج فارس اور انگلش چینل سے موتی
نکال نکال کر ہمارے سامنے بکھیرنے لگا۔ اب وہ کار چلانے
سے پہلے بسم اللہ پڑھتا ہے کہ اس کے پاکستان کا سب سے
بڑا شاعر بننے سے پہلے کوئی ایکسیڈنٹ نہ ہو جائے"۔

"غلام عباس کا مضمون، 'افسانہ میری نظر میں' بڑا مفید

ثابت ہوا۔ غلام عباس نے اپنے مضمون میں لکھا: "میں افسانہ نگاری کو ادب کی سہل ترین صنف سمجھتا ہوں، جس کے لئے کم سے کم علمیت کی ضرورت ہے۔ میری رائے میں جو شخص بھی خط لکھ سکتا ہو، وہ ذرا سی کاوش سے ایک کامیاب افسانہ نگار بن سکتا ہے۔ اس مضمون نے ہمارے ادب پر بڑا اچھا اثر کیا ہے۔ ڈاک خانوں کے سامنے دریوں پر بیٹھے ہوئے تمام خط لکھنے والے افسانہ نگار بن گئے ہیں اور ہمارے ادب میں گرانقدر اضافہ ہوا ہے۔"

"اگر افسانہ، افسانہ ہونے کے علاوہ زبان بھی ہے اور انشا پردازی بھی ہے۔ تو ابوالفضل صدیقی پاکستان کا سب سے بڑا افسانہ نگار ہے۔ آخر افسانہ ہمارے سامنے لا کر ننگا کیوں کھڑا کر دیا جائے۔ اس کو الفاظ کے مخمل اور کمخواب سے کیوں محروم رکھا جائے۔ اس کو عبارت آرائی اور انشا پردازی سے کیوں نہ سجایا جائے۔ وہ افسانہ نگار جن کے پاس الفاظ کی قلت ہوتی ہے، اپنے افسانوں کو ننگا رکھتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ ان کو ململ کے کپڑے پہنا دیتے ہیں، ان افسانہ نگاروں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ صرف افسانہ کلاسیکی درجہ حاصل نہیں کر سکتا۔ زبان، انشا اور افسانے کا امتزاج کلاسیکی درجہ حاصل کرتا ہے۔"

اس قسم کی کچھ اور پرائیویٹ تنقید ہوئی۔

کھانا ختم ہو گیا۔

شام کو مسعود اشعر، مدیر امروز، ملتان، نے مندوبین کو چائے پر مدعو کیا۔ اس میں سبط حسن، شاہد احمد دہلوی، انتظار حسین، ناصر کاظمی، ابن انشا، رفیق خاور جسکانی، امیر حمزہ شنواری، اختر انصاری اکبرآبادی، احمد بشیر، ظہور نظر، فارغ بخاری، ممتاز حسین، جعفر طاہر، حافظ لدھیانوی، آغا ناصر، رفعت سلطان، تابش الوری اور کچھ مقامی شعرا نے شرکت کی۔ دستور کے مطابق چائے کے بعد مشاعرہ ہوا اور آخر میں ناصر کاظمی نے کہا:

"نثر نگار مزے میں رہتے ہیں کہ مفت میں چائے پیتے ہیں اور مشاعرے کا لطف بھی اٹھاتے ہیں۔ شاعر چائے پی کر فوراً اس کی قیمت ادا کرتے ہیں۔"

رات کو نو بجے محفل موسیقی تھی۔ یہ جشن فرید کا آخری اجلاس تھا۔

اعلان کے مطابق محفل موسیقی میں داخلہ بذریعہ ٹکٹ تھا۔ ایک روپیہ، تین روپے، پانچ روپے۔ یہ ٹکٹ جشن فرید کے بھاری اخراجات کا مقابلہ کرنے کے لئے تھا۔ جشن فرید پر چاروں طرف سے عطیات کی بھرمار ہو گئی۔ فیلڈ مارشل ایوب نے پانچ ہزار روپے عطا فرمائے۔ سید اختر حسین، وزیر امور کشمیر، اطلاعات و تعمیر نو، نے ایک ہزار روپے، امیر بہاولپور نے پانچ ہزار روپے۔ ادارہ تعمیر نو پاکستان نے دس ہزار روپے۔ ڈسٹرکٹ کونسل ملتان، میونسپل کمیٹی ملتان، اور کولونی ٹیکسٹائل ملز نے دو ہزار روپے۔ یونین کونسل، فدا، تحصیل میلسی۔ میاں مختار اے شیخ صاحب، حاجی ریحان الدین صاحب، خان بہادر ہیبت خان ڈاہا، عثمان سلیمان صاحب اور ڈسٹرکٹ کونسل ڈیرہ غازی خان نے ایک ایک ہزار روپے کے عطیات دئے۔ اور انتظامیہ اخراجات کی فکر سے آزاد ہو گئی تو محفل موسیقی سے ٹکٹ ہٹا لیا گیا۔

پنڈال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ لوگ صوفوں، کرسیوں پر، اسٹیڈیم کی سیڑھیوں پر، اسٹیڈیم سے باہر گھاس کے قطعوں پر، ہر جگہ بیٹھے تھے۔ جشن فرید کے دوران میں ملتان کے باشندوں نے عید کی خوشیاں منائی تھیں۔ محفل موسیقی ان خوشیوں کا کلائیمکس تھا۔

وقار عظیم اور شاہد احمد دہلوی نے مجھ پر رحم کھایا اور اپنی کرسیاں جوڑ کر مجھے اپنے درمیان بٹھا لیا۔

ایک دفعہ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ مندوبین کی کرسیوں کے پیچھے سامعین کا ہجوم کھڑا تھا۔ ان میں چند عورتیں بھی تھیں۔

ہیں نے سوچا ان بے چاریوں کو بھی ثریا ملتانیکر کو دیکھنے کیلئے کھڑا رہنا پڑے گا۔

تھوڑی دیر کے بعد میں پھر مڑ کر دیکھا۔ احمد بشیر اور ظہور نظر بڑی تندہی سے سماجی بھلائی کے کام میں مشغول تھے۔ وہ دوڑ کر کوکا کولا کی دکان سے کرسیاں لے آئے۔ ان کو منددبین کے آگے سٹیج کے کنارے بچھا دیا۔ اور پیچھے کھڑی ہوئی خواتین کو لا کر ان پر بٹھا دیا۔ اس نیک کام میں اُن کی اپنی کرسیاں رک گئیں۔ ظہور نظر تو کہیں سے ایک اور کرسی لے آیا۔ احمد بشیر شاہد احمد دہلوی کی کرسی کے بازو پر بیٹھ گیا۔ ان خواتین کی پہلی کرسی پر احمد بشیر کے پاس جو خاتون بیٹھی تھی اس کے چہرہ پر جو نکا دینے والی چاندنی اور دلکشی تھی۔ معلوم نہیں مجھے یہ کیوں خیال پیدا ہو گیا کہ یہ ایکٹرس شمیم آرا ہے۔

سید اختر حسین، وزیر امور کشمیر، اطلاعات و تعمیر نو تشریف لے آئے۔ ان کے ساتھ ملتان ڈویژن کے کمشنر مسٹر لے۔ ڈی قریشی اور دوسرے اعلیٰ سرکاری افسر تھے۔ پہلی قطار کے خالی ریزرو صوفے بھی پُر ہو گئے۔

مائکروفون پر اناؤنسر رفیق خاور جسکانی کی آواز گونجی

ہُن تھیں فریدا شاد ول
مونجھاں کوں نہ کر یاد ول
جھوکاں تھیسن آباد ول
ایہا نیں نہ وہسی ہک منی

معزز خواتین و حضرات اس محفل موسیقی کا آغاز خواجہ فرید کے اس رجائیت کے پیغام کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے الغوزے کی متوالی دھنوں میں کیہاری راگ سماعت فرمائیے کیہاری راگ سستی پنوں کے لافانی رومان کے لئے مخصوص ہے ——— اور اب یہ راگ الغوزے کے البیلے فنکار خمیسو خاں کے لئے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے الغوزہ سندھ اور بلوچستان کا مقبول ساز ہے۔ جیسے وادیٔ مہران کے غیر فانی فنکار خمیسو خاں نے اپنے منفرد انداز سے آشنا کیا ہے اب آپ استاد خمیسو خاں سے کیہاری سماعت فرمائیے۔"

اُستاد خمیسو خاں نے الغوزے بجانے شروع کئے۔ سامعین جھوم جھوم گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ثقافت کا البیلا متوالا دریا اٹکھیلیاں کرتا ہوا بہا چلا جا رہا ہے۔ اور اس میں چھوٹی چھوٹی نرمل کومل چنچل ندیاں آکر مل رہی ہیں۔

وہ خاتون احمد بشیر کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ میں نے اپنے آپ سے کہا: "وہ ضرور شمیم آرا ہے۔ احمد بشیر امریکہ سے فلم کا کورس کر کے آیا ہے۔ وہ سب ایکٹرسوں کو جانتا ہے۔"

میاں غلام محی الدین ستار نواز سٹیج پر آیا میاں غلام محی الدین میاں برکت علی مرحوم کے پوتے ہیں۔ میاں برکت علی مرحوم حضرت خواجہ فرید کے ستار نواز تھے، وہ اپنے فن کے بہت بڑے ماہر تھے۔ ان کی وفات پر ان کی ستار کو ان کے ساتھ ہی دفن کر دیا گیا تھا۔ میاں برکت علی مرحوم کی خاص دُھن نغمۂ داؤدی کہلاتی تھی۔ میاں غلام محی الدین نے ستار پر نغمۂ داؤدی سُنایا۔

اس کے بعد مشہور موسیقار نزاکت علی سلامت علی اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے لئے سٹیج پر آئے۔ انھوں نے بہت دیر تک سامعین کو موسیقی سے مسحور کیا۔ انھوں نے مالکونس کی دھنوں میں انگریزی، بنگالی، پنجابی، سندھی اور بلوچی گانے گائے۔ پبلک عش عش کر اٹھی۔

سائیں مرنا جوگی سٹیج پر اپنے اکتارے کی جھنجھناہٹ میں حلول ہو کر مر گیا تھا۔ پھر جی اُٹھا اور سٹیج پر آ گیا۔ اکتارہ بجاتے بجاتے وہ پھر اس کی جھنجھناہٹ میں گم ہو گیا۔ اور پھر مر گیا۔

اب ثریا ملتانیکر سٹیج پر آئی۔ ثریا ملتانیکر، موسیقی کے زیر و بم کے ساتھ ہیئت بدلتے ہوئے: الی حسینہ۔ کل وہ خواجہ فرید کی کافیوں کی کافر ادا جنی تھی۔ آج جب اس نے سٹیج پر راگ درباری گایا تو اندر کے دربار کی اپسرا بن گئی۔ اور جب اس نے غالب کی غزل: بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

گائی تو وہ سراپا غزل بن گئی۔

احمد بشیر کے پاس بیٹھی ہوئی خاتون نے پھر احمد بشیر کی طرف دیکھا اور اس کے چہرے کی چاندنی شمیم آرا سے بھی زیادہ دلکش ہو گئی۔ میں نے احمد بشیر کے کان میں کہا:

"بشیر، یہ خاتون مجھے کوئی ایکٹرس معلوم ہوتی ہے۔ یہ شمیم آرا تو نہیں؟"

بشیر نے جواب دیا:

"ہاں، یہ ہمیشہ ایکٹرس معلوم ہوتی ہے لیکن یہ شمیم آرا نہیں ہے۔"

"کون ہے یہ خاتون؟ تم اسے جانتے ہو؟"

"ہاں، میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ میری وائف ہے۔"

"او مائی گڈنیس! آئی ایم سو سوری، بشیر۔ آیم سو ایشیمڈ!"

"نوٹ ایٹ آل، لارڈ ہاہا۔ نیور مائنڈ۔"

ان خواتین میں جن کے لئے احمد بشیر اور ظہور نظر نے کرسیاں بچھائی تھیں، احمد بشیر اور ظہور نظر کی بیگمات بھی تھیں۔ غلط فہمی اس لئے پیدا ہوئی کہ احمد بشیر کی فیملی کراچی میں رہتی ہے اور ظہور نظر کی بہاول پور میں۔

محفل موسیقی صبح کے دو بجے تک جاری رہی۔

مجھے خیال آیا کہ میں اس کرسی پر بیٹھا ہوا جشن فرید کے چراغاں میں ایک چراغ کی حیثیت رکھتا ہوں۔ چراغ چراغاں کا جزو ہو کر چراغاں کا لطف نہیں اٹھا سکتا۔ مجھے دور سے چراغاں کا نظارہ کرنا چاہئے۔

میں محفل موسیقی کے اختتام سے کچھ عرصہ پہلے اپنی جگہ سے اٹھ کر سٹیڈیم کے گیٹ پر چلا گیا۔

سٹیڈیم کا گیٹ سٹیڈیم کی سطح سے بہت اونچا ہے۔ میں ایک بلند مقام سے جشن فرید کی روشنیوں کے طوفان کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ سٹیڈیم کا گول منہ ایک آتش فشاں پہاڑ کا دہانہ بن گیا ہے۔ آتش فشاں پہاڑ اپنی پوری قوت سے پھٹ پڑا ہے۔ لاوا دہاڑتا ہوا ملتان کی وادی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ یہ ثقافت کا آتش فشاں پہاڑ ہے۔ یہ ثقافت کا لاوا ہے۔ ادب اور ثقافتی جمود کی پرانی وادی ڈوب جائے گی۔ ادب اور ثقافت کی ایک نئی وادی کی تشکیل ہوگی۔

میں جشن فرید کی تجلیات سے خیرہ سٹیڈیم کے گیٹ پر خاموش کھڑا تھا۔

یکایک مجھے ایک ڈراؤنی عفریتی آواز کا احساس ہوا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کون میرے آرام میں مخل ہو رہا ہے؟"

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

وہ ایک مینار تھا۔ وہ سٹیڈیم کے گیٹ سے کچھ فاصلے پر لوہے کے جنگلے کے درمیان کھڑا جشن فرید کے ہنگاموں کو بڑی حیرت سے تک رہا تھا۔ وہ ایک انگریز جنرل کی یادگار ہے جس کو مول راج نے اپنے دشمنوں کے خلاف مدد کے لئے بلایا تھا۔ اس جنرل کی مدد سے ملتان کے اس مشہور قلعے پر مول راج کا قبضہ مضبوط ہو گیا تھا۔ لیکن اس انگریز جنرل کی طاقت سے ہراساں ہو کر مول راج نے اس کو دھوکے سے مروا دیا تھا۔ بعد میں جب اس قلعے کو انگریزوں نے فتح کر لیا تو انھوں نے اس انگریز جنرل کی موت کے مقام پر ایک مستقل یادگار قائم کرنے کے لئے یہ مینار تعمیر کرایا۔

مینار نے ڈراؤنی عفریتی آواز میں کہا:

"یہ کیا ہو رہا ہے؟ حکومت کے وزیر عوام میں بیٹھے ہوئے اپنے وقار کو خاک میں کیوں ملا رہے ہیں؟ وہ حکومت کیوں نہیں کرتے؟ ملتان ڈویژن کا کمشنر کلب میں جا کر برج اور بیئر سے اپنا دل کیوں نہیں بہلاتا؟ وہ عام لوگوں کی نبضوں پر ہاتھ رکھ کر ان کے دلوں کی دھڑکنیں کیوں سنتا پھر رہا ہے؟ یہ اعلیٰ سرکاری افسر صوفیوں، مجذوبوں اور شاعروں کے مزاروں پر اپنا وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں؟! انھیں ک

ہوگیا ہے ؟ یہ کیا کر رہے ہیں؟"

میں نے جواب دیا :

"ان کے دنوں کو جشن فرید کے چراغاں نے روشن کر دیا ہے۔ یہ اپنے ہاتھوں میں چراغ لے کر انسان کی عظمت کے نشانات ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔"

مینار چپ ہوگیا۔

میں نے مینار کی بلندی کی طرف دیکھا، یہ تو ایک معمولی مینار ہے۔ مینار تو اس سے بھی بلند ہو سکتے ہیں۔ جشن فرید کی یادگار کا مینار اس سے بہت بلند ہوگا۔ میں اس روہی میں خواجہ فرید کی یادگار کا مینار تعمیر کروں گا۔

اس روہی سے کچھ فاصلے پر پاکپتن کے جنگلوں میں ایک اور مینار کھڑا ہے۔ اس کی چوٹی سے پنجابی زبان کے عظیم صوفی شاعر بابا فرید نے دنیا کو اپنا بیداری کا پیغام سنایا تھا:

اُٹھ

فریدا

ستیا

تے

ستے

بھاگ

جگا

اس مینار کی بلندی سے متاثر ہوکر خواجہ فرید کے والد محترم نے اپنے ایک بچے کا نام خواجہ فرید رکھا تھا۔ خواجہ فرید نے پاکپتن کے جنگلوں کی طرف سے آنے والے بیداری کے پیغام کو غور سے سُنا۔

اُٹھ فریدا سُتیا

تے جھاڑو دے مسیت

اور خواجہ فرید بیدار ہوگیا۔ اور ملتانی شاعری زندہ ہوگئی۔ اور دو فرید مل کر ایک فرد بن گئے۔ اور دنیا کا ہر فرد فرید بن گیا۔

میں نے خواجہ فرید کے لئے ایک بہت بلند مینار بلند تعمیر کر دیا ہے۔

روہی میں روشنی کا مینار۔

اس روشنی کے مینار کی شعاعیں خواجہ فرید کے رجائیت کے پیغام کو اس تھکی ہوئی اُکتائی ہوئی دنیا کے تاریک ترین گوشوں میں پہنچاتی رہیں گی۔

پُن تھیں فریدا شاد دل

مونجھاں کوں نہ کر یاد دل

جھوکاں تھیسن آباد دل

ایہا نیں نہ وسی ہک منی

فیس

جناب ایڈیٹر صاحب ماہنامہ "ہم قلم"

میں اگر افسانہ بھیجوں تو کیا آپ شائع کر دیں گے

"رومان" میں میں نے ایک دفعہ افسانہ بھیجا تھا۔ انھوں نے افسانہ کے ساتھ فیس بھی مانگی۔ چند مجبوریوں کی بنا پر میں فیس نہ دے سکا اور میں اپنی دلی خواہش سے محروم رہ گیا۔

آپ لکھیں کہ کیا آپ بھی فیس لیتے ہیں۔

رئیس مرزا

۳ رجون ۱۹۶۱ء — ۲۱-G ایبینا لائینز کراچی

مُصنّفین کی تخلیقی سرگرمیاں

(کتابیں جو حال ہی میں چھپی ہیں یا زیر طبع/ زیر تصنیف ہیں)

عبدالعزیز خالد

سرودِ رفتہ

یونان کی عظیم شاعرہ سیفوا کے نغمات
اُردو نظم کے قالب میں
قیمت چار روپے
ناشر: مطبوعات مشرق ہرمز جی اسٹریٹ کراچی

سلومی

عہد نامۂ جدید کے واقعہ پر مبنی منظوم ڈرامہ
عارف رومی کے اس شعر کی تفسیر سے
چونکہ یکے ہست گشت از شوق او
سر بلشت ذرہ ہا از ذوق او
قیمت ۲ روپے
ناشر: ادارۂ ذہن جدید، نیو کلاتھ مارکیٹ کراچی

غزل الغزلات

عہد نامۂ عتیق کے نغمۂ سلیمان کا منظوم ترجمہ
مع حواشی قیمت ۵٫۰۰
ناشر: میسرز بک لینڈ، پرنٹر پبلشر بک سیلرز
مجری بلڈنگ بندر روڈ کراچی

زنجیرِ رمِ آہو

طویل و مختصر نظموں کا مجموعہ قیمت ۵ روپے
ناشر: مطبوعات مشرق ہرمز جی اسٹریٹ کراچی

دکان شیشہ گر

زرد داغ دل کے بعد منظوم ڈراموں کا نیا
مجموعہ صفحات ۲۱۸ قیمت ۴ روپے

گُل نغمہ

رابندر ناتھ ٹیگور کی گیتانجلی اردو شعر میں
زیر طبع

قمر ہاشمی

چاندنی کے سائے

قومی اور جمالیاتی نظموں کا مجموعہ زیر ترتیب
ناشر: ترکش پبلیکیشنز - کراچی

کتاب تجارت

(تجارتی خط و کتابت کے موضوع پر
معلومات افزا اصلاحی کتاب) زیر طبع
ناشر: سلطان حسین اینڈ سنز بندر روڈ کراچی

یونس احمر

۱- نذر ل (ایک مطالعہ)

۲- مہوا (اور دوسری لوک کہانیاں)
(بنگال کی لوک کہانیوں کا مجموعہ)

۳- صاحب، بی بی، غلام
(بنگالی ناول ـ تلخیص و ترجمہ)
(زیر تصنیف)

عبدالرؤف عروج

۱- اُردو مرثیہ کے پانچ سو سال
(زیر طبع) - قیمت ۹ روپے
ناشر: مکتبہ نیا راہی، کراچی

۲- غالب کا دوسرا دیوان
(غالب پر نئی تحقیقات، غیر معروف اور
غیر مطبوعہ غزلیں) - قیمت ۶ روپے
ناشر: مکتبہ نیا راہی، کراچی

وقار راشدی

یہ ناؤ وندی کی دُنیا

(مشرقی پاکستان سے متعلق تاریخی و ثقافتی
مضامین کا مجموعہ) زیر تصنیف

محمد رحمت اللہ قریشی (مترجم)

تاریخ سیاست سندھ

(چار ہزار سالہ جائزہ)
ناشر: مینارہ بک ڈپو
۱۱۴ تیارہ روڈ، سکھر

(ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر ـــ طفیل احمد جمالی .... طبع انٹرنیشنل پریس - کراچی)

علاقائی سرگرمیاں

(ادارہ مصنفین پاکستان - ذیلی حلقہ - لائل پور)

تنظیم نو کے بعد رائٹرز گلڈ لائلپور سنے اپنی سرگرمیاں تیز تر کر دی ہیں۔ اس سب ریجن کے زیر اہتمام پہلا ادبی اجلاس ۹ - جون ۶۱ء بوقت چھ بجے شام ٹاؤن ہال لائلپور میں منعقد ہوا جس کی صدارت جناب فیض جھنجھانی نے فرمائی۔ جناب خلیق قریشی نے اس اجلاس میں ایک رومانی نظم پیش کی۔ جسے بہت سراہا گیا۔ جناب قمر لدھیانوی نے اپنی غزل پر بھرپور داد حاصل کی۔ سب سے آخر میں جناب ریاض عرفی نے ایک طنزیہ مضمون "تانگے والے" پڑھا۔ یہ مضمون تنقید کے لئے پیش کیا گیا اور حاضرین میں سے اکثر نے دوستانہ ماحول میں بحث میں حصہ لیا۔ ریاض عرفی صاحب نے مزاح پیدا کرنے کے لئے بعض انگریزی الفاظ استعمال کئے تھے اور موضوع زیر بحث زیادہ تر اس نقطہ پر مرکوز رہا کہ جہاں موزوں اردو الفاظ موجود ہوں وہاں خواہ مخواہ انگریزی زبان کے الفاظ استعمال کرنا مناسب نہیں ہے۔ یہ بحث کافی دیر تک جاری رہی اور اخیر میں صاحب صدر نے چند صدارتی جملوں کے ساتھ محفل کا اختتام لیا۔

اس سب ریجن کے زیر اہتمام آئندہ ادبی اجلاس ۳۰ جون ۶۱ء کو منعقد ہوگا۔ پروگرام حسب ذیل ہے۔

صدارت	جناب خلیق قریشی صاحب
مقام	ٹاؤن ہال لائلپور
وقت	چھ بجے شام
غزل	جناب فیض جھنجھانوی
نظم	چوہدری منظور احمد منظور
افسانہ	جناب حیدر شکیب صاحب

گزشتہ اعلان کے مطابق لائلپور سب ریجن نے علیحدہ دفتر کا انتظام کر لیا ہے چیئرمین، بلدیہ لائلپور نے میونسپل لائبریری بلڈنگ واقع عید باغ کے دو کمرے بلا کرایہ گلڈ کو دفتر کے قیام کے لئے دیئے ہیں۔ مورخہ ۱۹ مئی ۶۱ء سے گلڈ کا دفتر اس نئی عمارت میں منتقل کر دیا گیا ہے۔

اطرافِ عالم

ادارہ ادبیات اُردو میں مولوی تمکین کاظمی کی رحلت پر جلسہ تعزیت

اُردو کے مشہور ادیب مولوی سید تمکین کاظمی ۲۷ رمئی ۶۱ء کو حرکت قلب بند ہو جانے سے رحلت فرما گئے۔ مرحوم ہم قسلم کے مستقل قلمی معاونین میں سے تھے۔ ۲ رجون ۶۱ء کو ادارہ ادبیات اُردو کی عمارت "ایوان اُردو" میں پروفیسر مجید صدیقی (نائب صدر ادارہ) کے زیر صدارت ایک جلسہ تعزیب منعقد ہوا۔ سب سے پہلے نواب میر لیٰسین علیخان نے تمکین کاظمی کی شخصیت پر مقالہ پڑھا۔ اس کے بعد جناب وقار خلیل (مدیر ماہنامہ "سب رس") نے مرحوم کی خدمات کے اعتراف میں چند قطعات پیش کئے۔ بعد ازاں قرار داد تعزیت منظور کی گئی جس میں مرحوم کی وفات کو ادب کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان قرار دیا گیا۔

ادارۂ ادبیات اُردو کے صدر کی رحلت

۱۶ رمئی ۶۱ء کو حیدرآباد (دکن) میں ادارۂ ادبیات اُردو کے صدر نواب زین یار جنگ بہادر انتقال کر گئے۔ ۱۸ رمئی کو ادارہ میں جلسہ تعزیب منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر زور معتمد ادارہ نے مرحوم کی شخصیت پر تقریر کی۔

بزم سعدی کا اجلاس

۳۰ راپریل ۶۱ء کو حیدرآباد (دکن) میں بزم سعدی کا ادبی اجلاس، مولوی حبیب الرحمان (معتمد انجمن ترقی اُردو) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ محترمہ بانو طاہرہ نے مفتی ضیا یار جنگ مرحوم کی شاعری اور شخصیت پر پُرمغز مقالہ پڑھا۔ محترمہ بیگم بریگیڈیر علی احمد نے ضیا یار جنگ کے حالات پر ایک معلوماتی مضمون پڑھا۔ ان کے علاوہ جناب تحسین سروری نے "اُردو کے فارسی گو شعراء" کے عنوان سے ایک پُرمغز مقالہ پڑھا۔ آخر میں طرحی فارسی مشاعرہ ہوا جس کے لئے لندن سے اکبر حیدرآبادی، کراچی سے ناصح رضوی، اور پونا سے یعقوب یوسفی نے فارسی غزلیں روانہ کی تھیں۔ حیدرآباد کے شعراء میں ڈاکٹر طاہر مسلم، حامد شبیر، برق موسوی، قمر ساحری، یونس سلیم، حیدر شمسی، بانو طاہرہ سعید، لیٰسین علی خاں، اور شہر آستانی نے اپنا کلام سنایا

حیدرآباد دکن میں یوم فراقِ گورکھپوری اُردو مجلس حیدرآباد کے زیر اہتمام اُردو کے مشہور شاعر اور نقاد پروفیسر فراق گورکھپوری

کے شعری اور ادبی خدمات کے اعتراف میں چار روزہ تقاریب اُردو ہال واقع حمایت نگر میں منعقد ہوئیں۔

۲۰۔ مئی ۱۹۶۱ کو ساڑھے پانچ بجے شام جناب پدما بھوشن ڈاکٹر غلام یزدانی کی صدارت میں افتتاحی اجلاس منعقد ہوا۔ اولاً جناب راجے جانکی پرشاد صاحب صدر اُردو مجلس نے ڈاکٹر یزدانی اور حاضرین جلسہ کا خیر مقدم کرتے ہوئے یوم فراق کی اہمیت واضح کی۔ پنڈت دنشی دھر وویا النکار۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر۔ جناب شاذ تمکنت نے علی الترتیب فراق کی شاعری میں ہندی عنصر، فراق بحیثیت نقاد کا اور فراق کی شاعری پر پُر مغز مقالے سنائے۔

۲۱۔ مئی کو صبح ساڑھے نو بجے جناب پروفیسر ابوظفر عبدالواحد پرنسپل اُردو کالج کی صدارت میں بزم مقالات کی دوسری نشست شروع ہوئی۔ پروفیسر عالم خوندمیری۔ پروفیسر مغنی تبسم۔ جناب سعادت نظیر اور نفیل جعفری صاحب کے مضامین جو علی الترتیب فراق کا عشق، فراق کا شعورِ غم، فراق کا جمالیاتی شعور۔ اور کلام فراق میں غنائی عناصر کے عنوانات پر مشتمل تھے پیش کئے گئے۔ تلگو کے ممتاز شاعر جناب داس رتی صاحب نے فراق کی ایک غزل کا تلگو میں ترجمہ پیش کیا۔ صدارتی تقریر اور معتمد اعزازی کے شکوے کے بعد یہ جلسہ برخاست ہوا۔

۲۲ مئی کو رات کے ساڑھے نو بجے "شب نغمہ" کا رنگا رنگ اور دلچسپ پروگرام شروع ہوا۔ محترمہ عائشہ رشاد نے معتمدی کے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیئے۔ وزیر ریاستی حکومت محترمہ معصومہ بیگم صاحبہ نے اس تقریب کی صدارت کی۔ مقامی مشہور فنکاروں نے سازوں پر فراق اور اس کے عہد کے دیگر شعرا کا کلام پیش کیا۔

۲۴۔ مئی کو ساڑھے نو بجے رات جناب ویدپرکاش دوساج میئر بلدہ حیدرآباد کی صدارت میں طرحی محفل شعر و سخن کا آغاز ہوا۔ فراق کی دو طرحوں "۱۔ اے دردِ ہجر تو ہی بتا کتنی رات ہے" ۲۔ "سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں"۔ میں مقامی ۳۴ شاعروں نے اپنا کلام سنایا۔ پاکستان۔ مدراس۔ اور مہاراشٹرا سے بھی ممتاز شاعروں کی بھیجی ہوئی طرحی غزلیں بھی سنائی گئیں۔ پروفیسر مغنی تبسم لکچرر اُردو سکندرآباد کالج نے معتمد مشاعرہ کے فرائض انجام دیئے۔ میئر بلدہ کی تقریر اور معتمد اعزازی کے شکوے کے بعد چار روزہ یوم فراق کی یہ تقریبات اختتام کو پہنچیں۔

بھارت میں ہندی سنسکرت اور اُردو کتابوں پر انعامات

حکومت اتر پردیش (بھارت) نے ہندی کتابوں پر انعامات تقسیم کرنے کے متعلق اسکیم کو نئی شکل دی ہے جس کے مطابق انعامات دو درجوں میں تقسیم کئے جائیں گے۔ پہلے درجہ میں چھ قسم کی اور دوسرے درجہ میں پانچ قسم کی کتابیں ہوں گی۔ یہ انعامات ہندوستان کے مشہور ادیبوں، سائنسدانوں، سیاست دانوں اور شاعروں وغیرہ کے نام پر رکھے گئے ہیں۔

درجہ اوّل ۔ راجندر انعام (ہندی ادب) موتی لال نہرو انعام (قانون) وغیرہ

درجہ دوم ۔ پریم چند انعام (افسانہ نگاری) بال کرشن شرما نوین انعام (شاعری)، پرشاد انعام (ڈرامہ) وغیرہ

اُردو کے مشہور و معروف ادیبوں کو بھی انعامات تقسیم کئے جائیں گے۔ یہ انعامات غالب انعام، رام پرشاد انعام، بسمل انعام، اور اکبر الٰہ آبادی انعام۔ کے نام سے موسوم کئے جائیں گے۔ غالب انعام ۱۵۰۰ روپیہ، رام پرشاد بسمل انعام اور اکبر الہ آبادی انعام بالترتیب ۱۲۰۰ اور ۸۰۰ روپیہ کے ہوں گے علاوہ ازیں دس انعامات پانچ پانچ سو کے اور ہونگے جو مختلف موضوعات پر لکھی گئی اُردو کتابوں پر دیئے جائیں گے۔

پنجابی میں ٹیگور کی کتابیں

ٹیگور کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر پنجاب پردیش کمیٹی (بھارت) نے اعلان کیا کہ ٹیگور کی بارہ کتابوں کا ترجمہ پنجابی میں کیا جائے گا۔ ترجمہ کا اہتمام پنجابی ساہتیہ اکیڈمی (بھارت) بھائی جودھ سنگھ کی نگرانی میں کرے گی۔ تین کتابوں کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ باقی کتابوں کا ترجمہ بھی اس سال کے آخر تک ہو جائے گا۔

اُردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ

جون ۶۱ء کے آخری ہفتے میں ادبیات اُردو حیدر آباد دکن نے اُردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ ماہ لقا چندا کا دو صد سالہ جشن منانے کا اعلان کیا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا جشن ہوگا جو مختلف ادبی پروگراموں پر مشتمل ہے۔

"آگ کا دریا" پردہ سیمیں پر

اُردو کے ممتاز ترقی پسند ادیب خواجہ احمد عباس نے بمبئی میں ہند و پاک کی مشہور ادیبہ قرۃ العین حیدر کا ناول "آگ کا دریا" فلمانے کا اعلان کیا ہے۔ واضح رہے کہ اس ناول کی کہانی ڈھائی ہزار سالوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ فلم خواجہ احمد عباس کا فلمساز ادارہ "نیا سنسار" ٹیکنی کلر میں پردہ سیمیں کے لئے تیار کرے گا۔ قرۃ العین حیدر کے اس ناول کا ہندی اور انگریزی میں ترجمہ کیا جارہا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ اس فلم کا اسکرین پلے لکھنے کے لئے قرۃ العین حیدر ہی کی خدمات حاصل کی جارہی ہیں۔

اُردو دشمنی

حکومت بھارت نے پارلیمنٹ میں ایک مسودہ قانون پیش کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس کی رُو سے ۶۵ء کے بعد بھی انگریزی دفتری مقاصد کے لے استعمال ہوتی رہے گی۔ بھارت کا موجودہ دستور کے مطابق انگریزی ۲۶ رجنوری ۶۵ء تک بحیثیت دفتری زبان برقرار رہ سکتی ہے۔ اس کی وجہ غالبًا یہ ہے کہ بھارت کے ہندی نہ بولنے والے طبقوں

میں ہندی کے خلاف زبردست نفرت اور بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ خاص طور پر جنوبی بھارت کے باشندے سمجھتے ہیں کہ شمالی ہند والے ان پر زبردستی ہندی کو ٹھونسنا چاہتے ہیں جس کے سبب ان سرکاری ملازمتوں سے محروم ہونا پڑے گا۔

بھارت و پاکستان کے درمیان ثقافتی وفود کا تبادلہ

پچھلے دنوں بمبئی (بھارت) کی مزدور انجمنوں کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان ادبی اجلاس منعقد ہوا۔ اُردو کے ممتاز شاعر جناب رئیس امروہوی نے صدارت کی۔ حکومت مہاراشٹر کے وزیر زراعت مسٹر مدھو سودن ویریال نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ ہند و پاک کے فنکار، شاعر اور ادیب ان دونوں ملکوں کی دوستی اور خیرسگالی کے سلسلے میں بہت بڑا فرض انجام دے سکتے ہیں۔ مسٹر مدھو جو خود مرہٹی زبان کے بہت بڑے شاعر و ادیب ہیں اُردو شعر کی دلکشی اور مقبولیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑے فخریہ انداز میں مہاراشٹر میں اُردو زبان و اُدب کا شاندار مستقبل کا ذکر کیا۔ اور امید ظاہر کی کہ ہند و پاک کے درمیان ثقافتی وفود کے تبادلے کی اہمیت کو روز بروز زیادہ سے زیادہ محسوس کیا جائے گا۔ آخر میں ایک مشاعرہ ہوا جو رئیس امروہوی کی رومانی نظموں اور غزلوں پر اختتام پذیر ہوا۔

پاکستانی ادیب کی کہانی بیرونی فلمساز ادارے میں

ہالی وڈ کا مشہور ایکٹر رابرٹ رین ایک فلم "صاحب" میں ٹائیٹل رول ادا کرے گا۔ یہ فلم اس سال ستمبر سے پاکستان میں بننی شروع ہوگی۔ اس کی کہانی پاکستانی ادیب جلال دین نے لکھی ہے جلال دین برٹ لنکاسٹر کے ہاتھ بھی اپنی ایک کہانی "ہائی کراس" فروخت کر چکا ہے۔ جلال دین کی فلم "صاحب" دنیا کے پچیس ہزار سینماؤں میں چلے گی۔

ناول کی قیمت ایک لاکھ ۵ ہزار پونڈ

انگریزی کے ممتاز ناول نگار میکس کاٹو نے اپنی تازہ ترین ناول "مسٹر بوزر" ہالی وڈ کو ایک لاکھ پانچ ہزار پونڈ میں فروخت کیا ہے۔ کاٹو پچھلے دس برس سے مسلسل ناولیں لکھ رہے ہیں ان کی تقریباً تمام ناولیں برطانیہ یا ہالی وڈ نے فلمانے کے لئے خرید لی ہیں۔

مولانا روم کی تصانیف کا انگریزی میں ترجمہ

لندن میں جان مرے لمیٹڈ نے "اقوال رومی" کا انگریزی ترجمہ شائع کیا ہے۔ یہ ترجمہ انگلستان کے مشہور عربی داں کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر آربری نے کیا ہے

منٹو کا افسانہ انگریزی میں

امریکہ کے ایک ناشر نے مشرق وسطیٰ اور جنوبی مشرقی ایشیا کے مشہور مصنفین کے افسانوں کا ایک مجموعہ ترتیب دیا ہے جس میں مرحوم افسانہ نگار منٹو کے ایک افسانہ کا ترجمہ بھی شامل ہے۔

چینی زبان کی پہلی ادبی تصنیف

اشتراکی چین کے محکمہ آثار قدیمہ کو ایک قبرستان کی کھدائی کے دوران ایک ایسی کتاب ملی ہے جو ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ہے اور تقریباً ۲ ہزار سال پرانی ہے۔ چینی زبان کی یہ پہلی اُدبی تصنیف ہے جو لکڑی اور پتوں پر مشتمل ہے اور جس میں ایک سو سال قبل از مسیح چینیوں کے رسوم، جائیداد، شادی بیاہ وغیرہ کے بارے میں ضابطے اور قاعدے درج ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ کتاب دو ہزار سال تک مسلسل رہی مگر اس کے اوراق ابھی تک اچھی حالت میں ہیں اور اس کی سیاہی اتنی روشن ہے جیسے یہ حال ہی میں چھپی ہو۔

مرکز

گلڈ کی پیشکش

ادارہ مصنفین پاکستان (مرکز) کی ایک خصوصی نشست ۳۰ رجون جمعہ کی شام کو ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی زیر صدارت منعقد ہوئی۔ اس نشست میں گلڈ کی اولین مطبوعہ کتاب "Presenting Pakistani Poetry" پیش کی گئی جس کو جی۔ الانا نے مرتب کیا اور گلڈ نے شائع کیا۔ اس کتاب میں پاکستان کی جملہ زبانوں کی نمائندہ شاعری کا انگریزی میں ترجمہ کیا گیا ہے تاکہ پاکستان کے ادب اور ثقافت کو دوسرے ممالک میں روشناس کرایا جا سکے۔ اس نشست میں شاعروں نے اپنا منتخبہ کلام سنایا اور جی۔ الانا اور دوسرے حضرات نے ان کے انگریزی تراجم سنائے۔ یاد رہے کہ گلڈ نے اپنا اشاعت گھر قائم کر لیا ہے۔ جس کا مقصد نہ صرف پاکستانی ادیبوں کی کاوشوں کو شائع کرنا ہے بلکہ پاکستانی ادب اور ثقافت کو دوسرے ممالک خصوصاً بیرونی ممالک کے سامنے پیش کرنا بھی ہے۔ یہ کتاب اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ اس کے بعد گلڈ اُردو کے منتخب افسانے، سعادت حسن منٹو کے منتخبات اور پنجابی شاعری کے انتخاب کے انگریزی تراجم شائع کرائے گا

حلقہ کراچی

گلڈ کی ادبی نشستیں

۲ رجون ۶۱ء کو ہوٹل ایکسلیر (صدر) کراچی میں ۵ بجے شام ادارہ مصنفین پاکستان (حلقہ کراچی) کی پندرہ روزہ ادبی نشست جناب سلیم احمد کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ پروگرام کے مطابق سب سے پہلے جناب صادق مدہوش نے اپنی غزل تنقید کے لئے پیش کی۔ اس کے بعد جناب ساقی فاروقی نے اپنی تازہ ترین نظم "خون کی لکیر" پڑھی۔ جس پر کافی دیر تک بحث ہوتی رہی۔ آخر میں جناب جمیل جالبی نے اپنا مقالہ "ادیب اور سماجی ذمہ داری" کے عنوان سے پڑھا۔ واضح رہے کہ سابقہ روایتوں کے مطابق اس موقع پر بھی اراکین گلڈ کے علاوہ کراچی کے دیگر ادبا و شعرا موجود تھے۔ ۱۶ رجون ۶۱ء کو ادارہ کا دوسرا پندرہ روز جلسہ منعقد ہوا۔ اس مرتبہ صدارت کے فرائض جناب مجتبیٰ حسین نے انجام دیئے۔ "ہم قلم" کے شمارہ جون میں چھپے ہوئے پروگرام کے مطابق جناب طفیل احمد جمالی سکریٹری ادارہ مصنفین پاکستان (حلقہ کراچی) کو اپنی غزل اور راجہ امین الرحمٰن کو اپنا افسانہ تنقید کے لئے پیش کرنا چاہیئے تھا۔ مگر یہ دونوں حضرات چند مجبوریوں کے سبب ادبی اجلاس میں شریک نہ ہو سکے۔ لہٰذا سحر انصاری اور جناب انجم اعظمی نے (بالترتیب) اپنی نظم "ابن آدم" اور "آہنگ" تنقید کے لئے پیش کی۔ ان دونوں نظموں پر نہایت خوشگوار اور دوستانہ ماحول میں تنقید ہوئی۔

ایک بھارتی ادیب کے اعزاز میں عصرانہ

اتوار ۲۵ رجون ۶۱ء کو بوقت ۵ بجے شام شیزان (وکٹوریہ روڈ) میں مفتی فخر الاسلام

جنرل سکریٹری انیس اردو الہ آباد (بھارت) کے اعزاز میں ایک عصرانہ ترتیب دیا گیا۔ اد
انیس اُردو وہی ادارہ ہے جس کی شائع کی ہوئی کتاب "گل نغمہ" مصنفہ فراق گورکھپوری
کو حال ہی میں مبلغ پانچ ہزار روپے کا انعام دیا گیا ہے۔ مفتی فخرالاسلام صاحب اُتر پردیش
ممتاز رہنماؤں میں شمار کئے جاتے ہیں اور صوبائی اسمبلی میں حزب اختلاف کے قائد رہ چکے ہیں
آج کل انھوں نے اپنی تمام تر ساعی بھارت میں اُردو کی بقا و ترقی کے لئے وقف کر رکھی ہیں
خصوصاً وہ علمی و تاریخی کتب کی اشاعت کے سلسلے میں نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں جو
ان کی شائع کی ہوئی کتابیں پاکستان میں بھی دستیاب ہونے لگیں گی۔ عصرانہ میں مرکزی او
علاقائی مجلس عاملہ کے اراکین کے علاوہ کراچی کے چند ممتاز ادیبوں اور شاعروں نے ...
شرکت کی۔ اس موقع پر سب سے پہلے حلقہ کراچی کے سکریٹری جناب طفیل احمد جمالی نے مفتی فخرال
کا تعارف کرایا۔ اس کے بعد موصوف نے اپنی مختصر تقریر میں ہندوستان میں اُردو کے مستقبل
روشنی ڈالی

حلقہ مغربی پاکستان

بزم ثقافت کی اُدبی سرگرمیاں

پچھلے دنوں ملتان میں ادارہ فکر و فن کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا تھا۔ اس ادارے کی پہ
ادبی نشست میں جناب منصور زاہدی نے اپنا افسانہ اور شبیر حسن اختر نے اپنا مقالہ پڑھا۔ اس
بعد ادارے کے رُکن شعرا نے اپنا تازہ کلام سنایا۔ ادارے کی جانب سے گلڈ ہوٹل میں ایک
عصرانہ بھی دی گئی جس میں سائٹھ مہمانوں نے شرکت کی۔ اس موقع پر ملتان کے ادیبوں صحافیو
پروفیسروں اور وکیلوں کے علاوہ شہر کے دیگر معزز شہری بھی موجود تھے۔

اُردو لٹریری سوسائٹی پشاور کا اجلاس

اردو لٹریری سوسائٹی پشاور کا ایک خاص اجلاس ہوا جس میں گزشتہ انعامی مقابلہ
موصول شدہ غزلیات کو کتابی شکل میں پیش کرنے کے لئے مسودہ کو آخری شکل دیدی گئی
واضح رہے کہ سوسائٹی نے گزشتہ دنوں ایک مصرع طرح دے کر بہترین غزل پر انعام دینے
کا اعلان کیا تھا جس کے جواب میں پاکستان کے طول و عرض سے غزلیات موصول ہوئی تھیں
جنرل سکریٹری جناب راشد انصاری نے اعلان کیا ہے کہ غزلیات کا مجموعہ کو جلد از جلد شائع
کیا جائے گا۔ اس مجموعہ کا نام "جادہ" تجویز کیا گیا ہے۔

سکھر میں یوم حسرت

۱۰ر جون ۶۱ء سکھر کے مشہور ثقافتی مرکز "المہران" میں اعلیٰ پیمانے پر یوم حسرت من
گیا اس تقریب میں سکھر کے اُدیبوں اور شاعروں کے علاوہ پاکستان کے دیگر شہروں سے
بھی چند ممتاز ادبا و شعرا کو مدعو کیا گیا تھا۔ سب سے پہلے روزنامہ "کلیم" کے مدیر جناب شمس
صاحب نے اپنی مختصر تقریر میں یوم حسرت منعقد کرنے کی اہمیت پر روشنی ڈالی اس کے بعد
پاکستان رائٹرز گلڈ سب ریجن سکھر کے سکریٹری جناب آفاق صدیقی نے حسرت موہانی کے

ایک اہم اعلان

ادارہ "ہم قلم" کو ہر ماہ بعض حضرات کی جانب سے پرچہ نہ ملنے کی شکایات موصول ہوتی ہیں۔ ادارہ ایسے تمام حضرات سے درخواست کرتا ہے کہ وہ ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک "ہم قلم" کا انتظار فرمائیں۔ اس تاریخ کے بعد ادارہ "ہم قلم" کو پرچہ نہ ملنے کی اطلاع دیں تاکہ اس سلسلے میں متعلقہ ڈاک خانوں سے مناسب کارروائی کے لئے رجوع کیا جا سکے۔

نئے لکھنے والوں سے

- جواب طلب امور کے لئے ہمیشہ لفافہ کارڈ یا ٹکٹ ارسال فرمائیے۔
- مرسلہ مضامین نظم و نثر کی ایک نقل اپنے پاس ضرور محفوظ رکھئے۔ ناقابل اشاعت چیزیں ضائع کر دی جاتی ہیں۔
- تراجم پر اصل مصنف اور زبان کا نام ضرور لکھئے۔
- تخلیقات ایڈیٹر کی ترتیب کے مطابق اپنے نمبر پر شائع کی جاتی ہیں تخلیقات کی فوری اشاعت پر اصرار نہ فرمائیے۔

—— ادارہ ——

ہم قلم کراچی

جولائی ۱۹۶۱ء

آپ پی۔آئی۔اے سے سفر کرنا پسند کرتے ہیں، کیونکہ

آپ جانتے ہیں کہ ....

پی۔آئی۔اے کی سروس کا معیار اتنا بلند ہوگیا ہے کہ ہر طیارہ اپنے مقررہ وقت پر پرواز کرتا ہے، اور ٹھیک وقت پر آپ کو منزلِ مقصود پر پہنچاتا ہے۔

- ہر پرواز، شبک رو، اور تیز رفتار ہوتی ہے اور اس کے علاوہ آپ کے آرام کے لئے انفرادی توجہ دی جاتی ہے۔
- ہوائی سفر سے روپیہ کی کفایت اور وقت کی کفایت ہوتی ہے۔ اور گرد اور تپش سے چھٹکارا حاصل ہوتا ہے۔
- ہر پرواز پر فرسٹ کلاس، اور ٹورسٹ کلاس نشستیں اور مشروبات کا مکمل انتظام ہے۔

یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے زیادہ لوگ پی۔آئی۔اے سے سفر کرنا پسند کرتے ہیں۔

پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز

تفصیلات اپنے سفری ایجنٹ یا پی آئی اے کے بکنگ آفس سے دریافت فرمائیے [illegible]

[illegible] کراچی۔ ٹیلیفون [illegible]

Printed at The International Press, McLeod, Karachi.

سب کا پسندیدہ

خوش وضع . خوش نما . خوش کیف
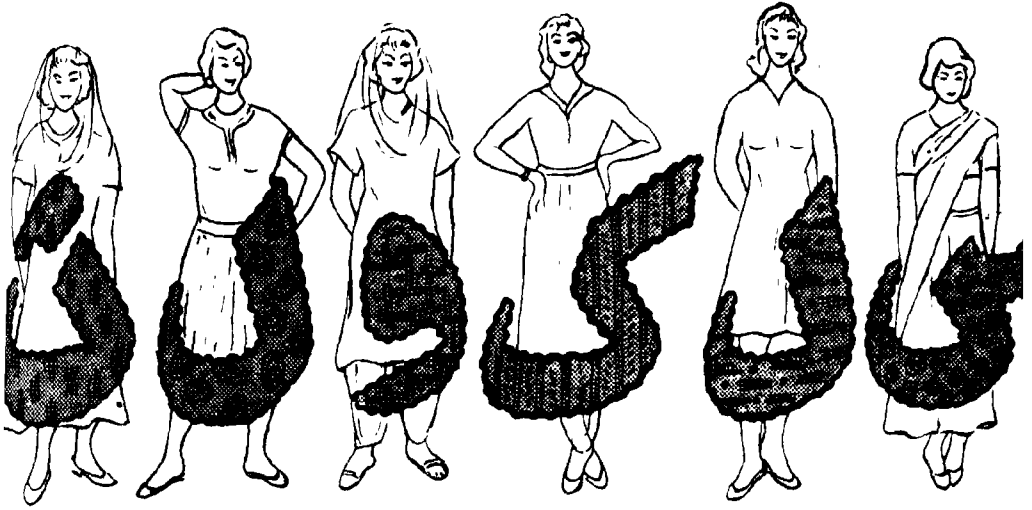
سلک جیسا نفیس پارچہ

آدم جی پارچہ جات

AF 306/1

ہمارا منشور

ہم پاکستان کی جملہ زبانوں کے ادیب خود کو مادر وطن کی ترقی
نظت، بین الاقوامی امن کے آدرش اور انسانیت کی ترقی کیلئے
وقف کرتے ہیں، ہم ان حقوق انسانی پر ایمان رکھتے ہیں۔ جن کی
تشریح اقوام متحدہ کے منشور میں کی گئی ہے: بحیثیت ادیب کے
ہم اپنے خیالات کا اظہار اور ترسیل کی آزادی کے لئے بنیادی
حقوق کے حامی ہیں جس کے بغیر تخلیقی ادب بے مقصد ہوتا ہے
ہیں اپنی ان عظیم روایات پر، جو ہمیں ماضی سے ملی ہیں، پورا فخر
ہے ہم ان کے تحفظ اور ان کو مزید فروغ دینے کا عہد کرتے ہیں
ہم اپنے مقدس فرض سے جو صداقت کی عکاسی، حب وطن کی
ردوں کی نشو و نما، بین الاقوامی اُخوت اور تعاون کے فروغ اور
سانی تعلقات کے قیام سے متعلق ہے، کما حقہ، آگاہ ہیں تا کہ
نسانیت زیادہ سے زیادہ راحت، طمانیت اور وقار کے ساتھ اپنا
جود باقی رکھ سکے۔

ادیب ہونے کی حیثیت سے فرداً فرداً اور اجتماعی طور پر، ہم
ب ایسے خوشحال اور صحت مند معاشرے کی ترقی کے لئے اپنی
ہ داری کو قبول کرتے ہیں جس میں سب کے لئے آزادانہ مساوی
اقع فراہم ہوں، اور جہاں دولت و اقتدار، انسانی قدروں
ر رُوحانی تصورات کے تابع ہوں۔ اسی لئے ہم ترقی کو دُنیا
ں امن اور خوش حالی کے فروغ کا ذریعہ سمجھتے ہیں"

(پاکستان رائٹرز گلڈ کے تاسیسی اجلاس میں
بروز ۳۱ رجنوری ۱۹۵۹ء منظور ہوا)

ماہنامہ

ہم قلم

ادارہ مصنفین پاکستان، حلقہ کراچی

(پاکستان رائٹرز گلڈ کا ترجمان)

جلد — شمارہ ۱۲

اگست سنہ ۱۹۶۱ء

فی پرچہ دس آنے (۶۲ نئے پیسے)
سالانہ چھ روپے

(اراکین ادارۂ مصنفین پاکستان سے ۵ روپے (سالانہ)
(جس میں خاص نمبر بھی شامل ہیں)

بھارت میں ترسیل زر کا پتہ

ایم. برکت اللہ عادل
نمبر ۱۲۰ - چک بازار روڈ کراس، بنگلور ۱

پتہ

۲۰ ہوٹل ایکسلسیر، صدر، کراچی ۳

فون ۲۰/۵۳۰۵۵

فہرست

	اداریہ		۷
مضامین	ارنیسٹ ہیمنگوے	انور عنایت اللہ	۹
	قومی زندگی میں علاقائی کلچر کی اہمیت	ممتاز حسین	۱۳
	جگر کی انفرادیت	محمود علی جامعی	۲۰
نظمیں	سناٹا	مخدوم محی الدین	۲۹
	ائیر ہوسٹس	مصطفےٰ زیدی	۳۰
	سیاح	باقر مہدی	۳۱
	شام، رنگ اور خوف	منیر نیازی	۳۳
	رنگ اور آگ	ساقی فاروقی	۳۴
	روشنی کی تلاش	ریاض انور	۳۵
	پھول چھڑی	ادیب سہیل	۳۳
	چاند	شمیم نسرین	۳۶
	آدمی نامہ	ظہیر کاشمیری	۳۷
غزلیں	سردار جعفری	حمید نسیم	۴۱
	سلیمان اریب	سجاد باقر رضوی	۴۲
	محشر بدایونی	رفیق خاور جسکانی	۴۳
	اطہر نفیس	خورشید احمد جامی	۴۴
سوانح	بیتے ایوانوں کے کھنڈر	حجاب امتیاز علی	۴۵

افسانے	طوفان اور طوفان کے بعد	یونس رمزی	۵۵
	تتلی، گل اور میں	شفیق حسن زیدی	۶۱
	نیلے برقعے کی جالی	بشیر نیاز	۶۶
ثقافتی ورثہ	ایک سندھی نظم (شیخ ایاز)	آفاق صدیقی	۷۰
علاقائی سرگرمیاں	(لاہور)		۷۳
خبرنامہ	اطراف عالم، حلقہ کراچی، مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کی ادبی خبریں		۸۱
ادارتی اعلانات	گلڈ اور اقوام متحدہ		۴
	"ہم قلم" کا گزشتہ سال		۴
	ادیبوں کا اشاعت گھر (اوّلین اردو اور بنگلہ مطبوعات)		۵
	ایں چہ شوریست		۶
	پاکستانی ادب کے ترجموں کے سلسلے میں ایک نیا اور اہم قدم (لٹریری پاکستان)		۶
	ملتان میں ادبی سرگرمیاں		۱۹
	راولپنڈی میں گلڈ کا مذاکرہ		۵۴
	مصنفین کی تخلیقی سرگرمیاں		۷۱
	پاکستانی شاعری انگریزی کے روپ میں		۷۶
	پنجابی سب یجن کی ادبی مجالس		۷۸
	ایک اہم اعلان (پرچہ نہ ملنے کی اطلاع)		۷۸
	حلقہ کراچی کی ادبی نشستیں		۷۹
	حیدرآباد میں تنظیم نو		۸۰
	پاکستانی ادب کے ترجمے (دعوت عام)		۸۵
	ایشیا میں یونیسکو کے سالانہ ثقافتی پروگرام کی جھلکیاں		۸۶
	نیکھک سنگھ پترکا (بنگلہ رسالہ)		۸۸

گلڈ اور اقوامِ متحدہ

جون ۱۹۶۱ء میں اقوامِ متحدہ کے مرکز میں غیر سرکاری اداروں کا ایک عظیم الشان اجلاس منعقد ہوا تھا جس کی ایک نشست میں پاکستان کے معاشی اور ثقافتی حالات پر گفتگو ہوئی۔ اس اجلاس میں کئی ممالک کے غیر سرکاری اداروں نے مندوبین اور مبصرین بھیجے تھے اور امریکی اداروں کے کئی کئی سو مندوبین بھی شامل تھے۔

اس اجلاس میں گلڈ کے ایگزیکٹو سکریٹری جمیل الدین عالی نے مبصر کی حیثیت سے شرکت کی۔ انھوں نے غیر رسمی طور پر مندوبین سے گلڈ کو روشناس کرایا۔

مورخہ ۱۲ر جون ۱۹۶۱ء کو اقوامِ متحدہ نے باقاعدہ طور پر گلڈ کو اپنے غیر سرکاری اداروں میں سندِ شمولیت دے دی ہے۔ حسبِ ضابطہ گلڈ نے اپنا ایک مستقل نمائندہ نیویارک میں مقرر کر دیا ہے جو مسلسل علمی اداروں سے رابطہ قائم رکھے گا۔ واضح رہے کہ یہ نمائندہ غیر تنخواہ دار رضاکار ہے۔

پاکستان رائٹرز گلڈ پورے ملک کے غیر سرکاری اداروں میں پہلا ادارہ ہے جو اقوامِ متحدہ کے مرکز میں باضابطہ طور پر رجسٹر ہوا ہے۔ اس طرح ہمارے تعلقات آہستہ آہستہ پوری دُنیا کے غیر سرکاری اداروں سے قائم اور استوار ہوتے رہیں گے۔ اس موضوع پر ایک معلوماتی مقالہ جمیل الدین عالی کی واپسی کے بعد اگلی اشاعت میں پیش کیا جائے گا۔

"ہم قلم" کا گزشتہ سال

"ہم قلم" نے باقاعدہ ماہنامے کی شکل اگست ۱۹۶۰ء میں اختیار کی تھی۔ اب اسے پورا ایک سال ہو گیا ہے۔ اس دوران میں کل ۱۳۱۰ صفحات شائع ہوئے۔ قلمی معاونین کو اعزازیے کے طور پر کل رقم ۴۳۳۰ روپے ادا کی گئی۔

"ہم قلم" کی اشاعت ایک ہزار سے بڑھ کر دو ہزار تک پہنچ گئی ہے۔ اس میں کسی بھی ادارے کی نئی کتابوں کے اشتہار کا کوئی معاوضہ نہیں لیا جاتا۔

"ہم قلم" میں ہندوستان، پاکستان اور بیرونِ برصغیر کے اُردو ادیبوں اور مصنفین کی تخلیقات اور ترجمے شائع ہوتے ہیں۔

"ہم قلم" کے چار اُدبی انعامات ہیں۔ جن میں سے ہر انعام پانچ سو روپے کا ہے۔ ان انعامات کا اعلان اگلے شمارے میں کیا جائے گا۔

"ہم قلم" اپنی ضخامت کے اعتبار سے اُردو رسائل میں سب سے کم قیمت اور کثیر الاشاعت جریدہ ہے۔

ایں چہ شوریست .....

حکومت مشرقی پاکستان (وزارتِ داخلہ) کے مراسلہ مجریہ ۲۷ جولائی سالانہ میں حکم جاری ہوا ہے کہ گلڈ کی شاخ مشرقی پاکستان، اپنا دفتر واقع بردوان ہاؤس فوراً خالی کر دے۔ واضح رہے کہ بردوان ہاؤس ڈھاکہ ایک وسیع و عریض عمارت ہے جس کے ایک طرف چوکیداروں کے لئے دو کمروں پر مشتمل ایک چھوٹا بلاک بنا ہوا ہے اور بڑی عمارت پر بنگالی اکیڈمی کا قبضہ ہے۔

سال گزشتہ مرکز اور مشرقی پاکستان شاخ کی مسلسل درخواستوں پر صوبائی حکومت نے ڈائرکٹر بنگالی اکیڈمی کی منظوری سے گلڈ کو ازراہ کرم چوکیداروں کے بلاک میں سے ایک حصہ عنایت فرمایا تھا جو اب اس مفروضہ کی بنا پر چھینا جا رہا ہے کہ بنگالی اکیڈمی کو اس کی بھی ضرورت ہے۔

یاد رہے کہ شاخ مشرقی پاکستان میں گلڈ کے اراکین پانچ سو سے اُوپر ہیں اور صوبائی سکرٹری ڈاکٹر قاضی مطاہر حسین پرو۔ وائس چانسلر، ڈھاکہ یونیورسٹی ہیں (موصوف چند ہفتوں سے ڈھاکہ میں نہیں ہیں)

ع کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

جمیل الدین عالی

خط بجائے اداریہ

مبارک ہو کہ اس ماہ سے گلڈ کے سب سے بڑے منصوبے کے نتائج سامنے آنے لگے ہیں
یہ منصوبہ ہے "اشاعت گھر"—

جون کے آخر میں "Presenting Pakistani Poetry" شائع ہو گئی جس میں پاکستان کی جملہ زبانوں کی ۱۰۳ منتخبہ منظومات کا انگریزی ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ ترجمے دو سو چھ صفحات پر مشتمل ہیں۔ اس کتاب نے بین الاقوامی سطح پر ہماری نمائندگی کا آغاز کر دیا ہے۔ لندن کے انگریز اہل زبان نے تو ترجموں کو بہت پسند کیا ہے باقی غیر انگریز اہل زبان کی رائے کا علم آپ کو ہوتا رہے گا۔

جولائی کے اواخر میں اُردو اور بنگلہ کی کتابیں بھی شائع ہو گئیں۔ ظاہر ہے کہ آپ کی اولین کوششوں میں چند خامیاں بھی ہوں گی مگر اہم بات یہ ہے کہ کام شروع ہو گیا۔

آج سے پونے تین سال پہلے جب گلڈ کا منصوبہ سامنے آیا تھا تو بہت سے خواتین و حضرات نے ہماری ناکامی کی حتمی پیشگوئی کر دی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اس پیشگوئی کی بنیاد میں خلوص کی کمی یا عدم تعاون کے جذبات ہی کام نہیں کر رہے تھے بلکہ بہت سے حالات اور معاملات ایسے تھے کہ گلڈ کی تحریک کا ناکام ہو جانا بعید از قیاس نہ تھا۔ مگر گلڈ بن گیا اور کام کرنے لگا۔

لیکن جب گلڈ کا اشاعتی منصوبہ سامنے آیا تو بہت سے حلقوں سے پھر وہی صدا اُٹھی کہ ادیب خود اپنا اشاعت گھر نہیں چلا سکتے۔ یہ بات درون ملک ہی نہیں کہی گئی بلکہ ایک عالمی شہرت کے مالک ناشر یعنی سر اسٹینلے اُن وِن نے کہی۔ آپ مشہور اشاعت گھر ایلن اینڈ اُن وِن کے ڈائرکٹر ہیں۔ ناشرین کی عالمی انجمن کے صدر رہ چکے ہیں اور تمام ممالک کا دَورہ بھی کرتے رہتے ہیں۔ انھوں نے یہ بات مجھ سے کہی اور میں بہت دل شکستہ ہوا تھا۔ لیکن اس کے باوجود میں نے ایمسٹرڈم میں ادیبوں کا اپنا اشاعت گھر بھی تلاش کر ہی لیا جہاں میں نے ادیبوں کا واحد اور بے حد کامیاب اشاعت گھر دیکھا (اور آپ کو فوراً اس کی کیفیت سے اطلاع دی)۔

اب میں نے برما ٹرانسلیشن سوسائٹی بھی دیکھی ہے جو ادیبوں کا اپنا اپنا ادارہ تو نہیں لیکن ایک غیر تجارتی (غیر سرکاری) اشاعتی ادارہ ہے اور نہایت کامیابی سے چل رہا ہے۔

ایمسٹرڈم کا اشاعت گھر دوسری جنگ عظیم کے بعد اٹھائیس ہزار ڈچ گلڈر یعنی تقریباً پچپن ہزار روپے سے شروع ہوا جو انہی ادیبوں نے جمع کیا تھا۔ آج اس کی اپنی عمارت ہے جو کئی لاکھ روپے کی ہے اور کئی لاکھ روپے سالانہ کی کتابیں چھپ کر فروخت ہوتی ہیں جن کا منافع انہی ادیبوں میں تقسیم ہوتا ہے۔

برما ٹرانسلیشن سوسائٹی برما کے عظیم ادیب اور مدبر اونو نے ۱۹۴۷ء میں قائم کی۔ (اونو صاحب برما کے وزیر اعظم بھی ہیں)۔ اسے حکومت سے تین لاکھ روپے گرانٹ کے طور پر اور سات لاکھ روپے قرض ملے۔ کام چار آدمیوں نے شروع کیا۔ آج تمام قرضے ادا ہونے کے بعد اس سوسائٹی کا اثاثہ ڈیڑھ کروڑ روپے کے لگ بھگ ہے اس کے دفاتر اور چھاپے خانوں میں ساڑھے چار سو آدمی کام کرتے ہیں۔ اور سالانہ پچیس تیس لاکھ روپے کا بجٹ بنتا ہے۔ اس کی کتابیں صرف ترجمے ہی نہیں ہیں (ترجمے ابتدا میں کئے گئے تھے) بلکہ جملہ علوم و فنون اور نصابِ تعلیم پر مشتمل ہیں۔ برما ٹرانسلیشن سوسائٹی ایشیا کے علاوہ دنیا بھر کا عظیم ترین غیر سرکاری اشاعتی ادارہ ہے جس کا نفع تجارتی بنیادوں پر افراد کے ہاتھ میں نہیں جاتا بلکہ خود سوسائٹی کے مقاصد پر خرچ ہو جاتا ہے۔

میں نے ان دو اداروں کا ذکر آپ کی عبرت کے لئے نہیں کیا بلکہ گلڈ کے اراکین معاصرین اور قارئین کی خدمت میں دو مثالیں پیش کی ہیں۔ یورپ کی ہر بات سے مرعوب ہو کر جی چھوڑ دینے والوں کے لئے برما ٹرانسلیشن سوسائٹی ایک نمونہ بن سکتی ہے۔ برما ہم جیسا ہی ایک پسماندہ ایشیائی ملک ہے اور ہمارا ہمسایہ بھی ہے۔

یہ ضرور ہے کہ ہر بڑے منصوبے کے لئے مخلص محنتی اور تربیت یافتہ کارکنوں اور مناسب سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے جو کمیاب ہیں مگر وہ کمیاب نہیں رہ سکتے۔ اب آپ کو مزید کارکن تلاش کرنے پڑیں گے۔ سرمائے کی پروانہ کیجئے سرمایہ آکر رہے گا۔ اصل اہمیت کام کرنے والوں کی ہے۔ میرا معاملہ یہ ہے کہ میرا تعلق خاطر تو آپ سے یقیناً باقی رہے گا لیکن ابھی مجھے یقین نہیں کہ اپنی واپسی کے بعد تعلق کار کس حد تک قائم رکھ سکوں گا۔ (میری ذہنی کیفیات بہت عجیب منزلوں سے گزر رہی ہیں) بہرحال میں آپ کے لئے سرمائے اور کارکنوں کی فراہمی کے لئے ضرور کام کروں گا اور اپنی "تعلیم و تربیت" کا ماحصل ایک "پندنامہ" بھی پیش کر دوں گا۔ دنیا دیکھ کر مجھے پتہ چلا کہ خود معذرتی اور انکسار کے باوجود ہم آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اپنی ہمعصر انجمنوں کے مقابلے میں اس تھوڑے سے عرصے میں کسی سے کم کام نہیں کیا ہے۔

جناب۔ گلڈ چل پڑا ہے اور پھیل رہا ہے اور مضبوط ہو رہا ہے۔ اشاعت گھر کے آغاز نے اتنی دور بیٹھے مجھے ایک انتہا مسرت بخش دی ہے۔ آپ آج کے منحنین سے درخواست کیجئے کہ وہ اس منصوبے کی ہمت افزائی کریں۔ دل شکن پیشگوئیاں نہ کرنے سے ان کا نقصان نہ ہوگا اور کام کرنے والوں کی ہمتیں بندھ جائیں گی۔

اپنی داستان پھر کبھی بیان کروں گا۔

انور عنایت اللہ

(ایک مطالعہ)

ارنیسٹ ہمینگوے

جب گیارہ بج گئے اور کوئی نہ آیا تو وہ انشا پرداز کے
طار میں بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ اسے یقین تھا کہ اس کا شکار ضرور
ے گا۔ اس کا بوڑھا نا شر ایک طرف خاموش بیٹھا ہونٹوں پر
کراہٹ لئے سب کچھ بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

اُس دن ناول نگار بے حد جھنجلایا ہوا تھا۔ اسے بار
ان لوگوں پر تاؤ آ رہا تھا جو آئے دن اس کے بارے میں
بنیاد داستانیں گھڑ لیتے۔ اب تو اس کی ذات پر حملے بھی
نے لگے تھے۔

چند لمحوں کے بعد دروازے کا پردہ ہٹا اور میکس ایسٹ
مسکراتا ہوا خوش خوش اندر داخل ہوا۔ وہ کئی ضخیم کتابوں کا
نف تھا اور ایک انشا پرداز کی حیثیت سے امریکہ میں خاصا
ور تھا۔ اسے اندر داخل ہوتے دیکھ کر موٹا تگڑا اصحت مند
ل نگار بھوکے شیر کی طرح آگے بڑھا اور اس کے قریب
کر اس نے اپنی قمیص کے بٹن کھول دیئے اور سینہ تان کر کہا۔
"آنکھیں کھول کر دیکھ لو۔ میرے سینے پر کتنے گھنے سیاہ
ہیں!"

واقعی سینہ پر بے تحاشا بال تھے۔ یہ کہتے ہوئے ناول
نگار اور اُس نے ناشر کی میز پر سے ایسٹ مین ہی کی ایک
کتاب اُٹھائی اور اس کے سر پر دے ماری!

اس طرح ناول نگار ارنیسٹ ہمینگوے نے انشا پرداز
ایسٹ مین کو یقین دلا دیا کہ وہ نہ صرف جواں مرد تھا بلکہ حق کی
خاطر مرنے مارنے کے لئے بھی وہ ہر وقت تیار رہتا تھا۔ کئی دن
ہوئے ایسٹ مین نے کہیں یہ لکھ دیا تھا کہ ہمینگوے بہادری اور
موت سے کشمکش کی من گھڑت کہانیاں تو لکھ لیتا ہے لیکن ان
صفات سے وہ خود محروم ہے "شکار و کارکی داستانیں بھی من
گھڑت ہی ہوتی ہیں۔ اپنے مرعوب کر دینے والے ڈیل ڈول
کے باوجود اس بے چارے کے سینے پر تو بالوں کا نام و نشان
بھی نہیں جو ہم اسے جواں مرد مان لیں!" —— اس تحریر کا یہ نتیجہ
نکلا کہ ایسٹ مین کو دخل در معقولات کی سزا بھگتنی پڑی۔

آج تین جولائی ہے۔ ابھی ابھی اطلاع آئی ہے کہ ۲ جولائی
سنہ ۱۹۶۱ء کو ایک حادثے میں مشہور امریکی ناول نگار ارنیسٹ ہمینگوے
کا انتقال ہو گیا۔ وہ اتوار کی علی الصباح کو بیٹھے ہوئے اپنی بندوق
صاف کر رہے تھے کہ یکایک ان کے سر میں گولی لگ گئی اور وہ
جاں بحق ہو گئے۔ اس سے پہلے بیسیوں بار موت سے مقابلہ کر کے
انھوں نے اُسے شکست دی تھی۔ دو بار ہوائی حادثوں سے
بچ نکلے تھے۔ اسپین کی خانہ جنگی کے دوران میں اور دونوں
بڑی جنگوں میں بھی موت ان کے پاس سے گزر گئی تھی۔ افریقہ
کے خطرناک جنگلوں میں بھٹکتے ہوئے شیروں اور گینڈے سے

ین بھی وہ کئی بار بال بال بچے تھے۔ لیکن جب ایک سکون
امریکہ ہی کے پُرامن ماحول میں، موت دبے پاؤں چپکے
ئی تو وہ اب کے اسے جگہ نہ دے سکے اور چپ چاپ مر

یہ کچھ عجیب سی بات ہے کہ عرصہ ہوا خود ان کے والد ڈاکٹر
نس ہیمنگوے بھی اسی طرح بندوق کی ایک گولی کا نشانہ بن
اک ہوئے تھے۔ باپ بیٹے کی موت میں فرق صرف اتنا ہے
رنیسٹ حادثے کا شکار ہوئے اور کلیرنس نے اپنی طویل
ی سے تنگ آکر خودکشی کرلی تھی۔

جب بھی ارنیسٹ ہیمنگوے کا نام میرے ذہن میں
ہے کئی سوال ذہن میں اُبھرتے ہیں۔ آخر اس فنکار کی ہمہ گیر
لیت کا راز کیا ہے؟ اس کی مقبولیت اس کے اکثر ہم عصر
رں کے لئے اس حد تک قابل رشک کیوں ہے؟ کیا یہ بڑی
ت صحیح نہیں کہ دیگر تمام امریکی ناول نگاروں کے بارے
ہم جتنی معلومات رکھتے ہیں اس سے زیادہ ہم صرف ہیمنگوے
کے متعلق جانتے ہیں۔ ان دیگر تمام امریکی ناول نگاروں میں
فاکنر بھی شامل ہیں جو بلاشبہ امریکہ کے سب سے بڑے
ل نگار ہیں۔ فاکنر (Faulkner) — جنھیں
گوے ہی کی طرح ادب کا نوبل پرائز مل چکا ہے اور جو
ی ساؤنڈ اینڈ دی فیوری" (The Sound & The Fury) اور "ایز آئی لے ڈائینگ" جیسے
ی تصانیف کے مصنف ہیں۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری
ہ آج دنیا بھر میں ہیمنگوے کی تقریباً تحریروں کو جو شہرت
مقبولیت حاصل ہے اس کے مقابلے میں فاکنر کے متذکرہ
دو ناولوں کے نام سے بھی بہت کم لوگ واقف ہیں۔ اس
فاکنر کی ادبی صلاحیتوں سے زیادہ ان کی مشکل پسند طبیعت
رو قت طلب تیکنیک یعنی ان کے پیچیدہ طرز تحریر کو دخل
۔ شاید اسی لئے فاکنر کو ہمیشہ ایک خاص علاقے کا ادیب سمجھا
اور ہیمنگوے کو دنیا بھر میں ہر جگہ انگریزی داں طبقے نے
ہمیشہ ہاتھوں ہاتھ لیا۔

ارنیسٹ ہیمنگوے کی اس ہمہ گیر مقبولیت کا راز ان کی
دلکش تحریروں کے علاوہ اصل میں ان کی عجیب شخصیت میں۔ ان
کی Colourful Personality میں مضمر ہے۔
وہ ۱۸۹۸ء میں امریکہ کی ایک ریاست الی نائے میں پیدا ہوئے۔
بچپن ہی سے طبیعت میں ایک عجیب اضطراب تھا۔ شاید اسی
لئے صرف انیس سال کی عمر میں وہ فوج میں شامل ہوگئے۔ ان
کا سب سے پہلا کھلونا بندوق تھا۔ بچپن ہی سے شکار کا شوق تھا
بڑے ہوئے اور پہلی جنگ عظیم شروع ہوگئی تو وہ اطالوی محاذ
پر گئے۔ کئی خطرناک معرکوں میں حصہ لیا۔ بری طرح سے زخمی
ہوئے (ان کے جسم پر تقریباً ڈھائی سو زخموں کے نشان تھے)۔
شجاعت کے سلسلے میں کئی تمغہ جات حاصل کئے۔ جنگ ختم ہوئی
تو امریکہ لوٹ آئے اور ایک اخبار میں ملازمت کرلی۔ دُنیا
دیکھنے کی ٹھانی تو اخبار کے رپورٹر بن کر پیرس گئے۔ وہاں سے
صحرا نوردی کو جی چاہا تو مشرق وسطیٰ اور افریقہ کو اپنایا۔ اپنی
سیاحت کے دوران میں انھوں نے کہانیاں لکھنی شروع کی
تھیں۔ افسانے لکھے تو گئے لیکن انھیں چھاپتا کون؟ معاوضہ
دینا تو درکنار کوئی انھیں مفت شائع کرنے تک کو راضی نہیں
ہوا۔ اس دور کی لکھی ہوئی بعض کہانیاں مثلاً "بگ ٹو ہیڈیڈ
ریور" (Big Two-Headed River) آگے
چل کر شہ پارے کہلائیں۔ دنیا کی ناقدر شناسی کا عموماً اور
اس زمانے کے ادبی حلقوں کا خصوصاً بڑے طنزیہ انداز میں
ہیمنگوے نے اپنی تصنیف "گرین ہلز آف افریقہ" میں ذکر کیا ہے

اسپین میں ۱۹۳۶ء میں خانہ جنگی شروع ہوگئی تو ہیمنگوے
میڈرڈ چلے گئے۔ فاشزم کا مقابلہ کرنے کے لئے انھوں نے
انٹرنیشنل بریگیڈ یعنی بین الاقوامی فوجی دستہ میں شرکت کی
اور فاشزم کے مقابلے پر ڈٹ گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا
بھر میں ادبی قدریں بدل رہی تھیں۔ شعوری طور پر ادیبوں
اور مفکروں کو اس کا احساس ہوگیا تھا کہ فاشزم کا وجود دنیا کی

تمام رعنائیوں کو، انسانیت کے تمام ترحسن کو، زندگی کی تمام اعلیٰ قدروں کو ہڑپ کرجانے کی فکر میں تھا۔ اس کا منحوس سایہ اٹلی سے ہوتا ہوا اب اسپین پر بھی پڑنے لگا تھا۔ دنیا نے پہلی جنگ عظیم کی ہولناکیوں کو بھلایا نہیں تھا کہ ایک اور خطرناک جنگ کا خطرہ پیدا ہوگیا تھا۔ اسی خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لیے ہیمنگوے اسپین گئے اور مہینوں اسپین کے جنگلوں میں نبرد آزمار ہے۔

یہ ان کی زندگی کا وہ دور تھا جب وہ شعوری طور پر زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں کے اثرات قبول کر رہے تھے۔ شاید زندگی کے ایسے ہی اثرات، کشمکش کے وہ سامان پیدا کر دیتے ہیں جو انفرادی طور پر پہلے حساس ادیب کے ذہن میں وجہ خلش بن جاتے ہیں اور پھر یہی ذہنی اضطراب، یہ خلش شدید ہوکر فن کار کے فن کا موضوع بن جاتی ہے۔ یوں تو ہیمنگوے کی کئی کہانیوں میں اس ذہنی اضطراب کی جھلکیاں ہمیں جا بجا ملتی ہیں لیکن ان کی دو مشہور تصانیف "اے فیر ویل ٹو آرمز" اور ——"فار ہوم دی بیل ٹولز" میں ہمیں جا بجا ان کا فن اسی اضطراب کے ساتھ ساتھ اس ازلی جستجو سے متاثر نظر آتا ہے جو حساس انسان کے ذہن کا ایک اہم جزو ہے۔ اس اُونچے پہاڑ کی دوسری طرف آخر کون سی دنیا آباد ہے؛ موت کا راز کیا ہے؛ زندہ رہنے کے لئے اتنے بہت سے دکھوں کا مقابلہ کیوں کرنا پڑتا ہے؛ کیا ایسی دنیا کی تخلیق نہیں ہوسکتی جہاں غموں اور مصیبتوں کا کوئی دخل نہ ہو؛ —— ان دونوں ناولوں کا پس منظر جنگ ہے۔

"اے فیر ویل ٹو آرمز" جنگ کی تباہ کاریوں کی داستان ہے۔ ایک ایسے دم گھٹتے ہوئے ماحول کی کہانی ہے جس میں یوں تو بے شمار لوگ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں لیکن اس میں دو کردار ایسے بھی ہیں جو اس دم گھٹتے ہوئے ماحول میں بھی، تباہ کن فضا میں بھی انسانیت کے نجات کا پورا یقین رکھتے ہیں اور وہ ایک حسین دنیا کی تخلیق کے خواب دیکھتے ہیں۔ لفٹیننٹ ہینری اور کیتھرین بارکلے یہ بڑے زندہ کردار ہیں۔ ایک بہتر دنیا کی تخلیق کی کوشش میں ناکامی کے باوجود وہ انسان کے مستقبل سے مایوس نظر نہیں آتے۔ زندگی کا یہ رجائی پہلو ہیمنگوے کے ابتدائی دور کے ناولوں کا خاصہ ہے۔

"فار ہوم دی بیل ٹولز" میں ہیمنگوے کا کینوس جنگ کی تباہ کاریاں ہی ہے۔ لیکن یہاں انھوں نے ایک مختلف انداز سے اپنے تخیلات کی ترجمانی کی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کتاب کے آخر میں دکھ درد، مایوسی اور تلخ کامیوں ہی کی فتح ہوتی ہے لیکن یہ بھی تو صحیح ہے کہ ان کھنڈروں ہی سے ہمیشہ ایک نئی اور بہتر نسل اُبھری۔ ایک بہتر زندگی کی ابتدا ہوئی۔ اسے ہمیشہ یقین رہا ہے کہ ہمارے ہی دم گھٹتے ہوئے ماحول میں ایک نیا انسان ضرور پیدا ہوگا۔ ایسا انسان جس کے ہاتھوں دُنیا کی نئی تعمیر لکھی جائے گی۔

ہیمنگوے کی پہلی تصنیف "تھری اسٹوریز اینڈ ٹین پوئمس" تھی جو افسانوں کا مجموعہ ہے۔ یہ ۱۹۲۳ء میں شائع ہو تھا۔ اس کے فوراً بعد یعنی اگلے ہی سال "ان اور ٹائم (In our time) شائع ہوئی اور تازہ ترین تصنیف جسے دنیا بھر میں بڑی شہرت ملی "اولڈ مین اینڈ دی سی" ہے جس پر انھیں ۱۹۵۴ء میں اُدب کا نوبیل پرائز ملا۔ اسی تصنیف پر انھیں امریکہ کا مشہور پولٹزر پرائز بھی مل چکا ہے۔ "اولڈ مین اینڈ دی سی" ایک بوڑھے ماہی گیر کی کہانی ہے جو تنہا سمندر میں اپنی کشتی لے جاتا ہے اور ایک بہت بڑی مچھلی پکڑتا ہے۔ پہلے اسے کے مقابلے پر سمندر کی بھری ہوئی بھوکی موجیں ہی تھیں اب بڑی مچھلی بھی ہے۔ جب کئی دن کی کشمکش کے بعد مچھلی پر قابو پالیتا ہے تو شارک اس مچھلی پر حملہ کر دیتے ہیں اور اسے کھا جاتے ہیں۔ فطرت کی لامحدود وسعتوں کے مقابلے میں ایک بھوکے پیاسے بوڑھے انسان کا نحیف جسم اور اس کی اپنے حق کی حفاظت میں کشمکش کی یہ سیدھی سادی داستان دنیائے ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ فطرت، نحیف جسم کو تو شکست دے دیتی ہے لیکن انسان کی رُوح کو، اس کی قوت عمل کو، قوت ارادی

ـ کون مات دے سکتا ہے۔

جیسا کہ میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں، ہیمنگوے کی
یت میں اس کی تحریروں کے ساتھ ساتھ اس کی اپنی
لیسی شخصیت کا بڑا دخل ہے۔ کئی جنگوں میں شرکت کرنے
ے کے جنگلوں میں شکار کی تلاش میں بھٹکتے رہنے اور مشرق
ی کی صحرا نوردی کے ساتھ ساتھ ہیمنگوے میدان کے
Bull Fighting میں بیسیوں بار خطرناک بھینسوں
ڑ چکے ہیں۔ جب ان کی اچانک موت کی اطلاع اسپین
تو وہاں بھی ان کا اتنا ہی سوگ منایا گیا جتنا کہ امریکہ میں
بیسیوں بار موت ان کے سامنے آئی اور ہمیشہ انھوں
اسے چکمہ دیا۔ ان کی کئی تحریروں میں اسی موت کا ذکر ہے۔
ی کے بارے میں ان کے خیالات اور موت ہی سے انسان
کش پر مبنی ان کی دو بڑی مشہور تصانیف ہیں —— طویل
ر افسانہ "دی اسنوز آف کیلی منجارو" —— اور ناول "دی
ز ہیں اینڈ دی سی"۔

"دی اسنوز آف کیلی منجارو" موت ہی کے گرد گھومتا
جو افریقہ کے ایک ویرانے میں آہستہ آہستہ اپنے بے بس
ر کے گرد اپنا مقناطیسی جال بنتی ہے۔ زخمی ہیرو ایک
یں پڑا موت کا انتظار کر رہا ہے۔ موت کے قدموں کی
ٹ اسے سنائی دے رہی ہے۔ ایسے میں اس کی وہ یادیں
ے بے چین کر دیتی ہیں جن کے سہارے اس نے اپنے لئے
وں کی ایک حسین بستی تیار کی تھی جس میں پیار و محبت کی
انیاں بھی ہیں اور جنگ کی ہولناک تباہ کاریاں بھی۔ اس
ور افسانے کی کامیاب فلم بھی بن چکی ہے۔

آپ کو شاید یہ جان کر حیرت ہو کہ دوسری جنگ عظیم
، جب جرمن مقبوضہ فرانس پر اتحادی فوجوں نے حملہ کیا تو
نگوے ایک اخبار کے جنگی نامہ نگار کی حیثیت سے ان
دن کے ساتھ گئے اور فی لفظ ایک ڈالر یعنی تقریباً پانچ
پے وصول کئے۔ ادبی دنیا کی تاریخ شاہد ہے اتنا زیادہ
معاوضہ کسی دوسرے ادیب کو کبھی نہیں دیا گیا۔ دوسری جنگ
عظیم کے ابتدائی دور میں وہ اپنی چھوٹی سی کشتی میں مہینوں
جرمن آبدوز کشتیوں کی تلاش میں امریکی سمندروں میں ادھر
ادھر پھرتے رہتے تھے۔

بھاری بھرکم جسم، قد تقریباً چھ فٹ، وزن سوا دو سو
پاؤنڈ، برسہا برس کی سیاحت اور گرم علاقوں میں صحرا نوردی
کی وجہ سے سونلائی ہوئی رنگت، گھٹے ہوئے سر جسے دیکھ کر
فوراً اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ کبھی بڑے اچھے باکسر تھے، خشخشی
داڑھی۔ جب تک ہیمنگوے زندہ رہے امریکہ میں پاپا ہیمنگوے
کے نام سے مشہور رہے۔ چار شادیاں کیں۔ پہلی تین بیویوں
سے بچے ہیں۔ ان کی آخری اور چوتھی بیوی بھی ادیبہ ہیں
جنہیں وہ پیار سے مس میری کے نام سے پکارا کرتے۔

ہیمنگوے کا فن ہمیشہ ابہام سے دور رہا۔ صرف سیدھے
سادے مکالموں کی مدد سے اتنا اچھا اور اتنا کامیاب کام کسی
دوسرے امریکی ادیب نے کبھی نہیں لیا جتنا کہ ہیمنگوے نے۔
اگر ایک طرف اس کا طرز تحریر سادہ ہے اور بیان میں نفاست
اور پختگی اور پرکاری ہے تو دوسری طرف اس کے انداز بیان
میں اُبلتے ہوئے چشمے کا جوش و خروش ہے۔ بعض نقادوں کو
یہ شکایت ہے کہ وہ کہیں کہیں عریانی کی حد تک حقیقت پسند
نظر آتے ہیں۔ مثلاً "فار ہوم دی بیل ٹولز" ہی میں۔ "اس
میں کوئی شک نہیں کہ اگر اخلاقیات کے ترازو پر ان حصوں کو
رکھا جائے تو شاید یہ تحریریں قابل اعتراض نظر آئیں لیکن کیا
یہ حقیقت نہیں کہ اخلاقیات کے بہت سے پہلو ہمیشہ اضافی
رہے ہیں جو زمان و مکاں کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں؟"

گو کہ ہیمنگوے کو امریکہ کے بعض دیگر بڑے ادیبوں کے
مقابلے میں مثلاً پرل بک —— کے مقابلے میں نسبتاً کم مقبولیت
حاصل رہی لیکن پھر بھی ان فن کاروں کے برعکس ان کے
فن میں بعض ایسی خصوصیتیں ہیں جنھیں صدیوں سے، ہمیشہ
بنی نوع انسان کی ترقی اور آسودگی کے لئے ضروری سمجھا گیا۔

(باقی ص ۱۹ پر)

ممتاز حسین

قومی زندگی میں علاقائی کلچر کی اہمیت

اپریل ۱۹۶۱ء میں بزم ثقافت ملتان نے جشنِ فرید منایا تھا۔ اس سلسلے میں ان لوگوں نے ایک مجلس مذاکرہ بھی منعقد کیا تھا۔ مذاکرے کا موضوع تھا "قومی زندگی میں علاقائی کلچر کی اہمیت"۔ اس مذاکرے میں متعدد ادیبوں نے حصہ لیا۔ ہم ذیل میں ممتاز حسین صاحب کی تقریر پیش کر رہے ہیں، اس کو انہوں نے ہماری استدعا پر قلمبند کر دیا ہے۔ (ادارہ)

کسی بھی مسئلے کا حل پیش کرنے سے پیشتر اسے مختلف پہلوؤں سے جانچنے کی ضرورت پڑتی ہے اور اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ مسئلے کو صحیح رُخ سے پیش کرنا چاہیئے۔ یہ مسئلہ جس نہج سے کہ آج کے مذاکرے میں رکھا گیا ہے اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری قومی زندگی بغیر کلچر کے اور ہمارے مقامی کلچر بغیر قومیت کے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہماری مملکت کثیر اللسان ہے لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ جہاں تک کہ مغربی پاکستان کا تعلق ہے اس منظر کے باوجود کہ اس علاقے میں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں، اس کی ایک ایسی قومی زبان بھی ہے جو مختلف لسانی قومیتوں کے درمیان لنگوا فرینکا کا کام کرتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس قومی زبان یعنی اُردو اور مغربی پاکستان کے مختلف علاقوں یا لسانی قوموں کی زبانوں میں کیا رشتہ ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ آج کے مذاکرے کا بنیادی سوال یہی ہے

لیکن اس سوال کا جواب صرف لسانی مطالعے سے نہ[illegible] دیا جا سکتا ہے اس کا جواب دینے کے لئے ہمیں کلچر ا[illegible] سیولیزیشن کے مفاہیم کو متعین کرنا اور ان کے فرق کو سم[illegible] بھی ضروری ہے، کیونکہ میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ اس[illegible] سے متعلق بہت کچھ ہمارا ذہنی الجھاوا اس باعث بھی ہے[illegible] نہ تو ہم کلچر اور سیولیزیشن کے سائنسی مفاہیم سے واقف ہیں اور نہ ان کے فرق ہی کو جانتے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ کبھی کبھی کلچر اور سویلیزیشن کو ا[illegible] ہی معنی میں استعمال کیا جاتا ہے لیکن علم الانسان اور سماج[illegible] علم کے ماہرین ان دونوں لفظوں کو اختلاف معنے کے ساتھ استعمال کرتے ہیں، میرا خیال ہے کہ اگر ان کے معنی کے کو اُبھار دیا جائے تو ان کی ماہیت بھی واضح ہو جائے گ[illegible] سویلیزیشن کی ابتدا ایک مخصوص تاریخی دَور سے[illegible] ہے، چنانچہ جہاں تک کہ مختلف سائنسی ذرائع سے معلومات[illegible]

ں میں قدیم ترین سویلیزیشن مصر اور سومیریا کی تصور کی جاتی
ن کا زمانہ تین چار ہزار قبل مسیح کا ہے۔ لیکن اس رُو سے
یہ انسان کچھ سویلزیشن کی ابتدا ہی سے تو نہیں ہے۔ وہ
زمانے سے پہلے ہزار ہا ہزار سال تک بربریت اور وحشت
دور میں بھی رہ چکا ہے جسے سوشیالوجسٹ اور مورخین تاریخ
کے ماقبل زمانہ یا پری ہسٹری کا نام دیتے ہیں۔ کیا اس
ہسٹری یا تاریخ سے ماقبل کے زمانے میں جس کی ابتدا کا
صحیح علم نہیں ہے انسان بغیر کسی کلچر کے رہا ہے؟ اگر آپ
سوچتے ہیں تو یہ آپ کی بھول ہے۔ انسان جس کے دوسرے
سماجی حیوان اور حیوانِ ناطق ہیں اس روئے زمین پر اپنی تاریخ
اس میں کسی بھی دور میں بغیر کلچر کے نہیں رہا ہے۔ کچھ
ن کا تو یہ خیال ہے کہ انسان نے کلچر کو جنم دیا ہے کہ وہ
ین و خود آرا ہی نہیں بلکہ خودگر و خلاق، صناع اور طباع
ہے۔ بہر حال اس مرغی انڈے کی بحث سے خواہ کوئی اور
پہنچے یا نہ پہنچے اس حقیقت کے واضح کرنے میں بڑی مدد
ہے کہ کلچر انسان کا طریق زیست ہے، یہ اس کی فطرت کا
لاینفک ہے۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ صانع عاقل
ناطق ہے۔ اور کلچر اس کی اسی فطرت کا اظہار ہے۔ وہ
اسی فطرت کے باعث، کیوں نہ ہو فطرتی جو ٹھہرا، اس عام
لی فطرت سے ممتاز ہوا جو اپنے ماحول اور اپنی فطرت کو
نے سے قاصر ہے۔ یہ امتیاز صرف انسان ہی کو حاصل ہے
وہ نہ صرف اپنے ماحول کو بدلتا رہا ہے بلکہ اپنی فطرت کو
بدلتا رہا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اپنے ماحول یا خارجی فطرت
سنے اور پھر اس تغیر کے ساتھ اپنی فطرت کے بدلنے کا
ی عمل سیولیزیشن کے دور میں رُونما ہوتا ہے، ور سویلزیشن
پہلے کے دور کے کلچر میں تو اس کا غالب رجحان اپنی فطرت
پنے ماحول سے مطابقت دینے یا وابستۂ فطرت رہنے ہی کا
نہ کہ اس کے جبر سے آزاد ہونے کا۔ لیکن اس فرق کے
باوجود جو کیفیاتی فرق ہے بہر کیف اس سے انکار نہیں کیا
جاسکتا کہ تاریخ سے ماقبل، یا سیولیزیشن سے پہلے کے ادوار
میں وہ کلچر کے بنیادی عناصر سے واقف تھا۔ وہ بولتا، سوچتا،
افسانوی ادب تخلیق کرتا، گاتا، رقص کرتا، نقش و نگار بناتا،
معمولی اوزار، پتھر اور لکڑی کے استعمال کرتا، معمولی قسم کی سنگتراشی
بغیر پل کے کرتا، اپنے تن بدن کو کھال اور چھال سے ڈھانکتا
اپنے جذبات، عادات و اطوار کو رسوم و قیود کے تابع کرتا لیکن
وہ اپنے خیالات اور جذبات کو حروف یا علائم کے ذریعے آنے
والی نسلوں یا دوسری قوموں کو منتقل کرنے کے ہنر سے
ناواقف تھا، یہ چیز انسان نے خالصتاً سیولزیشن کے دور میں
حاصل کی، جس سے علم و ہنر کے پھیلنے، بڑھنے اور محفوظ کرنے
میں مدد ملی۔ لیکن سویلزیشن کا یہ عطیہ جسے ذہنی اوزار کے نام
سے بھی یاد کیا جاتا ہے، یعنی خیالات اور جذبات کو حروف و
علائم کے ذریعے منتقل کرنے کا فن، اس کی عام ذہنی اور نفسی
ترقی کا ایک جزو تھا نہ کہ وہ اس سے الگ تھلگ کوئی ایک
مظہر تھا۔ انسان نے اسی سیولزیشن کے دور میں، ہل، پہیے دار
گاڑی، چاک (گریبان کا نہیں کوزہ گل کا) بادبانی کشتیاں
ایجاد کیں اور اسی دور میں اس نے چوپاؤں اور ہواؤں کی
طاقت کو اسیر کیا اور اسی دور میں اس نے مختلف دھاتوں سے
اوزار، ہتھیار اور ظروف بنانے کا ہنر سیکھا۔ یہ انقلاب جو کسی
معجزے سے کم نہ تھا انسان کی زندگی میں کیوں کر پیدا ہوا؟ اس
کے اسباب پر ابھی خاطر خواہ طریقے سے کوئی روشنی نہیں ڈالی
جاسکی ہے کیونکہ جو معلومات فراہم ہوئی ہیں وہ ناکافی ہیں،
لیکن یہ چیز اپنی جگہ پر مسلّم ہے کہ انسان کی اس فنی اور
تعلقی ترقی میں اس کی شہری زندگی یا مختلف قوموں کے باہم
ملنے جلنے، تبادلۂ خیالات اور تبادلۂ اشیا کے عوامل کو بہت
زیادہ دخل رہا ہے۔ چنانچہ سویلزیشن کے بارے میں نہ صرف
یہی بات صحیح ہے کہ وہ تمام تر شہری زندگی کی پیداوار ہے
جیسا کہ یہ لفظ خود بتاتا ہے بلکہ یہ بھی صحیح ہے کہ اس کا کردار

بین الاقوامی ہوتا ہے، سویلزیشن کسی ایک قوم کی بلا شرکت
غیرے نہیں ہوا کرتی، یہ مختلف قوموں کی اجتماعی کوششوں کا
نتیجہ ہوتی ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فلاں ایجاد فلاں
ملک کی فلاں قوم سے تعلق رکھتی ہے، لیکن اگر آپ اس کی
تاریخ کا پتہ چلانا شروع کریں تو اس کے سلسلے دور دور دراز
تک پھیلے ہوئے نظر آئیں گے۔ چنانچہ پرانی تہذیبوں کے
جہاں کہیں بھی آثار ملے ہیں، ان کے دیکھنے سے تہذیب کا
بین الاقوامی کردار صاف نظر آتا ہے یہ بتانا مشکل ہو جاتا ہے
کہ فلاں چیز پہلے کہاں ایجاد ہوئی۔ اور جدید سویلزیشن کا جو
بین الاقوامی کردار ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ اور کیا
عجب کہ جن خیالات کا ہم اظہار کر رہے ہوں وہ بھی بین الاقوامی
ہوں کہ خیالات بھی مثل اشیاء کے سفر کرتے ہیں۔ ان حالات
میں کبھی کبھی تو یہ سوچنا پڑتا ہے کہ جسے ہم اپنی تہذیب کہتے
ہیں کیا وہ واقعی ہماری اپنی تہذیب ہے؟ لیکن اس سے
آپ مجوب نہ ہوں کہ جو چیز کہ غیر کی ہے وہ ہماری اپنی بھی
ہے۔

مجھے امید ہے کہ میں نے سویلزیشن اور کلچر کا جو یہ فرق
واضح کیا ہے اس سے آپ یہ نتیجہ نہ نکالیں گے کہ سویلزیشن
کلچر سے ایک بالکل علٰحدہ شے ہے، حقیقت یہ نہیں ہے،
سویلزیشن کلچر ہی کی ایک مرتفع شے ہے، نہ کہ اس سے کوئی
علٰحدہ شے ہے، سویلزیشن کے دور سے پہلے ہر قوم قبیلے کا
کلچر مقامی تھا، اپنے فطری ماحول سے وابستہ، علٰحدگی پسند تھا،
لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ بڑا طبعی (original)
بھی تھا سویلزیشن نے اس کی اس کیفیت کو منقلب کر دیا، اس
میں عالمگیری، شعوری اور عقلی عناصر کا اضافہ کیا، اس سے قومی
تعصب کی دیواریں منہدم ہوئیں اور انسانی وحدت کا احساس
پیدا ہوا کہ دنیا کے سارے انسان ایک نفس واحد سے ہیں۔
سویلزیشن کا یہ اثر جہاں کلچر کے اور دوسرے شعبوں میں دیکھا
جا سکتا ہے وہاں کسی بھی قوم کی زبان، ادب، احساس جمال
اور اخلاقیات وغیرہ کی دنیا میں بھی آسانی سے دیکھا جا سکتا
ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ سولزیشن کی یہ دونوں خصوصیات
عالمگیریت (ہر کلچر کو ایک یونیورسل معیار پر لانے کا رجحان)
اور معقولیت (جس کا اظہار ٹکنالوجی، سائنس، حرفت اور
معقولات کے فروغ میں ہوا) کلچر کی انفرادیت اور طبعیت
(Naturalness) کے حق میں مضر رہی ہیں۔
لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انسان نے اس سے کھویا کم اور حاصل
زیادہ کیا ہے۔ آج دنیا رُوسو کے اس فلسفے کو بھولتی جا رہی
ہے کہ آرٹس اور سویلزیشن نے انسان کی فطرت مسخ کر دی
ہے، اور یہ بات روز بروز لوگوں کے دلوں میں زیادہ گھر
کرتی جا رہی ہے کہ سویلزیشن ہی کی برکات سے انسانی
کلچر میں پُر مائیگی، گہرائی اور وسعت پیدا ہوئی ہے،
اس سے انسان کی قوت ہی میں اضافہ نہیں ہوا ہے بلکہ اس
کی نفسیات میں پُر مائیگی اور یونیورسیلٹی بھی پیدا ہوئی ہے۔
انسانیت کی وحدت کا تصور سیولزیشن ہی کا دیا ہوا ہے۔
اور اگر انسان سولزیشن کے اس دور میں بھی درندگی اور
بہیمیت سے کام لے رہا ہے تو اس کی ذمہ داری سیولزیشن
کے اقدار اور اُوزار پر نہیں بلکہ انسان کے اس سماجی نظام
پر عائد ہوتی ہے۔ اگر جبر و استحصال کو طرح طرح کے بہانوں سے
قائم کئے ہوئے ہے ورنہ سیولزیشن نے تو اس کے اسباب
سامنے مہیا کر دیئے ہیں کہ اگر انسان چاہے تو جبر و استحصال
ہی کیا، بلکہ بیگانگی ذات اور انسان نے انسان پر حکومت
کرنے کی جو ریت قائم کی ہے وہ اسے بھی ختم کر سکتا ہے۔۔۔
انسان جو کبریائی صفات کا حامل ہے، اس کا وجود اس لئے
نہیں ہے کہ اس پر انسان یا کوئی بھی طاقت حکومت کرے، بلکہ
اس لئے کہ وہ آزادانہ تعاون سے من حیثیت الکل اپنی کبریائی
کا اظہار کرے، اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ ہر فرد اپنی
تکمیل ذات کو دوسروں کی تکمیل ذات پر مشروط ٹھہرائے، اور

سہاشی کو اس کا ذریعہ تصور کرسے نہ کہ مقصد۔ مقصد تو افراد
کی تکمیل ذات ہے۔ یہاں یہ چیز واضح ہو جاتی ہے کہ جبر و استحصال
تہذیب شکن قوتیں ہیں اور جب بھی ان تہذیب شکن قوتوں
کے ساتھ تہذیب کے کسی بھی عنصر کو خواہ وہ عالمگیریت کا ہو یا
معقولیت کا کسی بھی قوم کے کلچر میں داخل کرنے کی کوشش کی
جاتی ہے تو اس کی شدید مخالفت ہوتی ہے کیونکہ نتیجے میں وہ
ایک دوسرے کی نفی کرتی ہیں۔ اس کی ایک مثال آپ کے
سامنے ہے۔ انگلستان کے "مدعیان تہذیب" نے جب ۱۸۳۲ء
اور ۱۸۴۵ء کے درمیان اپنے یہاں کے ریفارم بل کی انقلابی
لہر میں مغلوب ہندوستان کو بھی "جمہوری اصلاحات سے اقتصادی
استحصال اور اس کی صنعتی زندگی کی تباہی و بربادی کی فضا
میں آشنا کرانا چاہا۔ تو ہندوستانی عوام نے بغیر اس تمیز
کے کہ مغرب کی سویلزیشن اور سرمایہ دارانہ غارت گری یا نو
آبادیاتی استحصال دو مختلف چیزیں ہیں، اپنی سیاسی غلامی کے
خلاف جہاد کرتے وقت مغرب کی روشن خیالی اور جمہوری
اصلاحات کی بھی مخالفت کی، کیوں کہ تہذیب کی قوتیں وسعت
غارتگری میں استحصال کے ذرائع میں بھی تبدیل ہو جایا کرتی ہیں۔
آپ کو یہ سن کر حیرت نہ ہونی چاہیئے کہ جب ان مدعیان تہذیب
نے ہندوستان کو غلام رکھتے ہوئے غلامی کی رسم کو ہندوستان
میں منسوخ کرنا چاہا تو اس کی سب سے پہلے مخالفت مسلمانوں نے
کی۔ اور اس موضوع پر لمبے چوڑے رسالے لکھے گئے کہ غلامی
از روئے شریعت جائز ہے۔ آپ خود ہی غور کیجئے آج مسلمان
اس طرح کیوں نہیں سوچتے ہیں۔ کیا اس کا یہ سبب نہیں ہے
کہ اب ہمارا کلچر پہلے کے مقابلے میں جدید تہذیب کے اثرات
کو زیادہ قبول کر چکا ہے۔ لیکن کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ میرا یہ
مشاہدہ خوش خیالی پر مبنی ہو۔ کیا آج ایسے لوگ نہیں ہیں جو
اپنے پرانے کلچر کے نام پر سویلزیشن کے عالمگیر اور عقلی عناصر
کی مخالفت کرتے رہتے ہیں۔ اور کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اس
مخالفت کے پیچھے ان کا اپنا ذاتی یا طبقاتی مفاد کام کرتا رہتا
ہے لیکن معلوم نہیں ایسا کیوں ہے کہ وہ لوگ جو مغرب کی سائنس
اور معقولات کی شدید مخالفت کرتے ہیں، وہ ہوائی جہاز،
گاڑی یا موٹر پر بیٹھنے سے پرہیز نہیں کرتے ہیں۔ معلوم ایسا
ہوتا ہے کہ انہیں اشیاء سے نہیں بلکہ اس علم سے بیر ہے جو ان
چیزوں کو بناتی ہے۔ تبھی تو ہمارے یہاں ہلکی پھلکی صنعت
اور مصنوعات کی درآمد پر زور ہے اور مشینوں کے بنانے
والے کارخانوں کے قائم کرنے پر زور نہیں دیا جاتا ہے
بہرحال یہ تو ایک جملہ معترضہ ہوا اصل مدعا تو یہ ہے کہ جب
کسی کلچر میں سویلزیشن کے یونیورسل اور عقلی عناصر کو جبر و
استحصال کے ساتھ رائج کیا جاتا ہے خواہ وہ استحصال کھلا ہو
ڈھکا ہوا ہو تو اس کی مخالفت کا ہونا لازمی ہے۔ کیونکہ جبر
استحصال کا عنصر سیولزیشن کی نفی کرتا ہے۔ اس موقع پر ہمیں
نہ بھولنا چاہیئے کہ سویلزیشن کا مقصد کسی پسماندہ کلچر کو ایک بلند
سطح پر لے جانا ہے۔ اس کی تخلیقی قوتوں کو اس کے ماحول کی
پسماندگی اور اس کے روحانی حربوں کی فرسودگی سے نجات
دلانا ہے نہ کہ اسے دبانا یا مٹانا ہے۔ بے شک اس طریق
میں پسماندہ کلچر کے غیر عقلی عناصر اور عصبیتوں کو دبنا پڑتا ہے
اور اس سے عقل و شعور اور جذبات و تعصب کے درمیان ایک
وقت تک تنازعہ کا پایا جانا لازمی ہے لیکن وہ تنازعہ
کشمکش متشدد صورت اختیار نہیں کرتا ہے۔ اگر کلچر کے مقامی
یا قومی فارم کو برقرار رکھا جائے۔ اور وہ کلچر، سویلزیشن کے
اثرات کو بغیر کسی جبر و استحصال کے اندر سے قبول کرے۔ اب
یہ سوچئے کہ کلچر کا مقامی یا قومی فارم کیا معنی رکھتا ہے۔ لباس
کا مقصد تن کو ڈھانکنا اور گرمی سردی سے بچانا ہے، غذا کا
مقصد جسم میں انرجی کا پہنچانا ہے۔ لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ باوجود
اس بات کے کہ لباس اور غذا اور رہن سہن کے طریقوں میں
ایک بین الاقوامی پیٹرن ابھرتا جا رہا ہے ہر قوم ان چیزوں
کے برتنے میں اپنے ملک کے مخصوص مذاق کی بھی تابع ہوتی
ہے جس کو متعین کرنے کے بے شمار اسباب ہیں۔ چنانچہ ان

اور یہ قومی اور بین الاقوامی دونوں ہی معیار ساتھ ساتھ پروان چڑھتا رہتا ہے۔ اور وہ ایک دوسرے کو متاثر بھی کرتے رہتے ہیں لیکن کلچر کے ان خارجی مظاہر اور زبان کے ایسے ایک باطنی مظہر میں بڑا فرق ہے۔ کسی نئے طرز کے کھانا کھاتے وقت صرف کام و دہن ہی کی آزمائش ہوتی ہے۔ کچھ دنوں کے رد و کد کے بعد انسان اس کا عادی ہو جاتا ہے لیکن زبان کا معاملہ اس سے مختلف ہے، کسی بھی کلچرل جماعت کی حسی حقیقت نہ کہ عقلی حقیقت کیا ہے۔ جب آپ اس کا تجزیہ کریں گے تو اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ وہ حسی حقیقت اس کی اپنی زبان ہے، چنانچہ یہی سبب ہے کہ ادراک حقیقت کا حسی اظہار انسان اپنی صرف اسی مادری زبان ہی میں کر سکتا ہے جس کو وہ غیر شعوری طور سے اپنے ماحول سے سیکھتا ہے۔ اور یہ ایک اتنی بڑی حقیقت ہے کہ کوئی بھی ایسا شخص جسے زبان اور ادب کی ماہیت سے کچھ خبر ہے اس خیال کا دعویدار نہیں ہو سکتا ہے کہ کسی بھی جماعت گروہ یا قوم کو اس کی مادری زبان سے محروم کر کے اس کے حلق میں کوئی دوسری زبان ڈال دی جائے۔ اور آپ اس کی توقع نہیں کر سکتے ہیں کہ میں اس خیال کی حمایت کروں گا۔ لیکن اس سلسلے میں چند ایک باتیں قابل غور ہیں جو اتنی ہی زیادہ ٹھوس حقائق کی حامل ہیں۔ تہذیب کے عالمگیری شعوری اور فنی عناصر کی روز افزوں ترقی سے، دنیا جس قدر تیزی سے سکڑتی جا رہی ہے، اور انسان ایک سے زیادہ زبان کے سیکھنے پر مجبور ہوتا جا رہا ہے کہ اس کے رشتے ساری دنیا کے انسانوں کے ساتھ گٹھتے جا رہے ہیں۔ اسی تیزی کے ساتھ انسان چھوٹی چھوٹی لسانی ٹولیوں سے نکل کر بڑے بڑے لسانی گروہوں میں اپنے کو تبدیل کرتا جا رہا ہے۔ لیکن یہ عمل فطری اس وقت رہتا ہے جبکہ لسانی ٹولیاں اپنے اس عمل میں آزاد اور خود مختار ہوں، ورنہ یہ قانون فطرت ہے کہ جس چیز سے انسان کو جبراً محروم رکھا جاتا ہے وہ اسی شئے کی زیادہ آرزو کرتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ تاریخ کو پیچھے لوٹانا ممکن نہیں ہے، اب تو تاریخ نے ہمیں یا ہم نے تاریخ کو جن مسائل سے دو چار کر رکھا ہے۔ انھیں اسی تاریخی ڈھانچے ہی میں حل کرنا ہے۔ اُردو زبان کی پوزیشن مغربی پاکستان میں وہ نہیں ہے جو انگریزی، عربی اور فارسی کی ہے۔ یہ ساری زبانیں غیر ملکی تہذیبی زبانیں ہیں جن کو ہم سیکھ کر ہی بول اور سمجھ سکتے ہیں۔ اور اگر فارسی چھ سو سال کی حاکمیت کے باوجود ہماری قومی زبان نہیں بن سکی تو عربی یا انگریزی بارہ سو سال کی حاکمیت کے بعد بھی ہماری قومی زبان نہیں بن سکتی ہے۔ اسے جس قدر سمجھ لیا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ رہ گیا یہ سوال کہ ہم کوئی نئی زبان مقامی زبانوں کی کھچڑی کر کے بنائیں گے سو وہ بھی ممکن نہیں ہے کہ جو کھچڑی کہ ہم نے چھ سو سال میں پکائی وہی ٹیڑھی پڑ گئی ہے اب ہم کوئی اور کھچڑی کیا پکائیں گے زبان از خود اگتی ہے اور تاریخی اسباب سے متاثر ہو کر غیر شعوری طور سے نئی سے نئی شکل اختیار کرتی جاتی ہے۔

اب ایک آخری صورت یہ ہے کہ اگر اُردو سے ایسا ہی بیر ہے جیسا کہ ایک پرانے آئی سی ایس صاحب نے لاہور میں علاقائی زبانوں کی کانفرنس میں فرمایا ہے کہ اُردو قومی زبان از روئے قانون ہے نہ کہ وہ واقعی ہماری قومی زبان ہے، تو یہ عرض ہے کہ کیوں نہ کسی علاقائی زبان کو اُردو کی جگہ دے دی جائے۔ مگر یہ کیا کہ ہم انتظامی اُمور کے لئے انگریزی کو قائم رکھیں گے۔ اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ اُردو کو اس لئے ہٹانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ انگریزی کی حاکمیت کو تا ابد برقرار رکھا جائے یہ کہاں کی حب الوطنی ہے کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اب ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی اور تدبیر نہ رہ گئی ہو کہ وہ مقامی زبانوں کو اُردو سے ٹکرا کر انگریزی کی حاکمیت کو برقرار رکھنے کی کوشش کریں۔ لیکن افسوس کہ ان کی آواز کو اٹھانے والا اس کانفرنس میں بھی کوئی نہ ملا۔ اُردو ہی کو قومی زبان کی حیثیت سے وہاں بھی مختلف زبانوں کے نمائندوں نے تسلیم کیا۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا اُردو واقعی مغربی پاکستان کی قومی

زبان ہے؛ اور اگر ہے تو کیا اس کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ مقامی
زبانوں کو دبائے، انھیں ان کے اپنے جائز حقوق سے محروم
رکھے؛ آخر الذکر حصے کا جواب میں پہلے ہی دے چکا ہوں۔
اس کے دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اب میں
میں صرف اوّل الذکر حصے کا جواب دینا چاہوں گا۔

اُردو پاکستان کی واحد قومی زبان نہیں ہے بلکہ ایک
ایسی زبان ہے جو صدیوں سے مغربی پاکستان کے علاقہ کے
مختلف لسانی قوموں کے درمیان مختلف ناموں سے لنگوا فرینکا
کا کام دیتی رہی ہے۔ اُردو زبان مغربی پاکستان کے تمام شہروں
میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ دیہاتوں
میں بولی نہیں جاتی ہے تو یہ بتانا بے محل نہ ہوگا کہ اُردو تو
ہندو پاک کے کسی بھی علاقے کے دیہات میں بولی نہیں جاتی
ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مغربی یوپی اور دہلی کے دیہاتوں
میں بھی کھڑی بولی کے افعال استعمال ہوتے ہیں لیکن وہ آپ
صرف افعال ہی تک ہے۔ ورنہ وہ لوگ تو ایک ایسی بھاکا
بولتے ہیں کہ مشکل ہی سے کوئی اُردو داں سمجھ سکتا ہے: "اپی دو
لڈوں میں کھرک جھڑاک ہوگئی" یہ ہے میرٹھ کے ایک دیہات
کی بولی کا نمونہ۔ اور برج، اودھ اور پورب کے دیہاتوں
میں تو مقامی بولیاں ہی بولی جاتی ہیں۔ اُردو شہری زبان ہے
چنانچہ دیہات کی عورتیں اسے آج بھی شہراتی زبان کہتی ہیں۔
یہ تمام تر بازار میں بڑھی اور پروان چڑھی ہے۔ اور شہر کی
زندگی میں اس نے تربیت پائی ہے۔ اور اس کی اس ترقی میں
مختلف علاقوں کی خدمات کو دخل رہا ہے۔ لاہور اُردو کا ویسا
ہی ایک اہم مرکز رہا ہے جیسا لکھنؤ، دلی یا حیدر آباد تھا، اور
اُردو صحافت اور جدید اُردو ادب کی ترویج و اشاعت میں
تو لاہور کی خدمات دلی اور لکھنؤ سے کچھ زیادہ ہی ہیں۔ مغربی
پاکستان میں اُردو قیام پاکستان سے پہلے لاہور ہی کے مرکز
سے بڑھی اور پھیلی ہے۔ اور اب قیام پاکستان کے بعد سابق
صوبہ سندھ کے تمام شہروں میں بھی اُردو بولی اور سمجھی جاتی
ہے۔ اور سابق صوبہ پنجاب اور سرحد کے شہروں میں پشتہا
پشت سے لوگ اپنی پشتو اور پنجابی کے ساتھ اُردو بھی بولتے
چلے آرہے ہیں۔ اگر ان سارے تاریخی شواہد کی روشنی میں
مغربی پاکستان میں اُردو کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو دیکھا جائے
تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اُردو مغربی پاکستان کی قومی زبان ہے
لیکن جس حد تک کہ مغربی پاکستان کی یہ نئی قومیت ابھی نامکمل
ہے اسی حد تک اُردو کی یہ پوزیشن بھی نامکمل ہے۔ اُردو نے
یہ پوزیشن علی الرغم اس حقیقت سے حاصل کی ہے کہ حکومت
کی زبان آج بھی انگریزی ہے۔ اور جس فراخ دلی سے اس
کی ترقی کے لئے قومی حکومتوں کو کوشش کرنی چاہئے تھی وہ
اس سے محروم رہی ہے۔

اب چند ایک لسانی حقائق پر غور کیجئے۔ مغربی پاکستان
کے تین بڑے لسانی علاقے ہیں، پنجابی، پشتو اور سندھی کے۔
یہ تینوں زبانیں اسی ہند آریائی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں
جس سے اُردو کا تعلق ہے۔ ان میں سے پنجابی۔ ہندکو، ملتانی
یا سرائیکی اور سندھی یہ ساری بولیاں اسی ایک شورسینی
پراکرت اپ بھرنش کی بیٹیاں ہیں جس کی ایک بیٹی اُردو۔ یا
مغربی ہندی یا کھڑی بولی ہے۔ اُردو اور پنجابی میں وہی
قربت ہے جو قربت کہ برج بھاشا کو اُردو کے ساتھ حاصل ہے
لیکن یہ سارے رشتے ناطے اور یہ سارے تاریخی اسباب کمزور
رہ جائیں گے۔ اگر اُردو نے مقامی بولیوں سے الفاظ قبول
کرنے اور مقامی لب و لہجہ کی پذیرائی میں سست اور تاخیر
سے کام لیا۔ اب اُردو کی ترقی کا مرکز دلی نہیں بلکہ لاہور اور
کراچی ہے۔ اُردو ایک ترقی پذیر زبان ہے۔ نہ کہ مکمل زبان
ہے۔ اس کی ترقی پذیری اسی میں ہے کہ اس کی ٹکسال ہر سو سال کے
بعد کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔ جو اُردو کہ میر کے زمانہ میں تھی وہ انیسویں
صدی میں نہ رہی اور جو اُردو کہ انیسویں صدی میں تھی اب وہ بیسویں صدی
میں نہ رہی۔ یہ چند ایک باتیں جو براہ راست موضوع سے تعلق نہیں
رکھتیں ہیں اس لئے کہی ہیں کہ اس جھگڑے کے پیچھے کچھ اس بات

کو بھی دخل ہے کہ جو لوگ کہ دلی اور لکھنو کا روڑا بن کر آئے ہیں وہ صرف اپنے ہی لہجے کو اُردو کا لہجہ بتاتے ہیں۔ اور اُردو کے سندھی، پنجابی اور پٹھانی لہجے پر کسمساتے ہیں۔ یہ اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو۔ لیکن یہ میری ساری باتیں بے مغز رہیں گی تاوقتیکہ میں اس کا اعادہ ایک بار پھر نہ کروں کہ اُردو کی مقبولیت اس کا جواز نہیں بن سکتی ہے۔ کہ کسی بھی مقامی زبان کو اس کے کسی بھی جائز اور فطری حق سے محروم رکھا جائے۔ اس کے برعکس اُردو کے لوگوں کو مقامی زبانوں کی ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیئے۔ کہ ان کے مقابلے اور باہمی اثر پذیری ہی سے اُردو اور زیادہ قوی اور زیادہ ہمہ گیر ہوگی۔

بقیہ ارنیسٹ ہیمنگوے

ان ہی خصوصیتوں کے بل بوتے پر ارنیسٹ ہیمنگوے کا فن ہمیشہ زندہ رہے گا۔

ہیمنگوے کی تحریروں کے ترجمے دُنیا کی تقریباً تمام ترقی یافتہ زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے کئی ناولوں کی بہت اچھی فلمیں بن چکی ہیں۔ باسٹھ سال کی عمر میں جب ۲ر جولائی ۱۹۶۱ء کو ان کا اچانک انتقال ہوا تو امریکہ کے علاوہ تمام انگریزی داں علاقوں میں سخت ماتم بچھ گئی۔ اسپین انھیں بہت عزیز تھا۔ وہاں کے دور دراز کے علاقوں میں بالکل اسی طرح آجکل افسوس ظاہر کیا جا رہا ہے جیسے کسی بڑے اسپینش ادیب کا انتقال ہو گیا ہو۔ اپنی زندگی کے آخری چند سال انھوں نے جزیرہ کیوبا میں گذار دیئے تھے۔ آج وہاں بھی لوگ سوگوار ہیں۔ غالباً پاپا ہیمنگوے اس دور کے واحد امریکی ناول نگار ہیں جن کی موت پر روس میں باقاعدہ افسوس ظاہر کیا گیا۔ ریڈیو اسٹیشنوں سے خاص پروگرام نشر کئے گئے اور تمام بڑے اخباروں نے موثر اداریے لکھے۔

ارنیسٹ ہیمنگوے کی فنی عظمت اور ہمہ گیر مقبولیت کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔

ملتان میں ادبی سرگرمیاں

پاکستان رائٹرز گلڈ ملتان سب ریجن نے اگست سے باقاعدہ ادبی نشستوں کا پروگرام طے کیا ہے۔ پہلا جلسہ گلڈ ہاؤس، گلڈ ہوٹل میں، ۳ر اگست کو ہوگا۔ دوسرا ۱۷ر اگست کو۔ یہ جلسے ہر ماہ پہلی اور تیسری جمعرات کو منعقد ہوا کریں گے۔ پروگرام کا اعلان مقامی اخباروں میں ہوا کرے گا شرکت کی صلائے عام ہے۔

گلڈ کی سرگرمیوں میں تیزی پیدا کرنے کے لئے سید وقار عظیم صاحب ریجنل سکرٹری ۲۱ر جولائی کو ملتان تشریف لے گئے تھے۔ گلڈ ہاؤس میں سب ریجن کے اراکین کا ایک جلسہ طلب کیا گیا جس میں صابر دہلوی، کشفی ملتانی، ریاض انور، مقصود زاہدی، حفیظ احسن، تصدق رسول، حفیظ رومانی، نور احمد خاں فریدی، ڈاکٹر مہر عبدالحق، پرواز جالندھری اور شیخ اکرام الحق (سکرٹری سب ریجن) نے شرکت کی۔ ادبی سرگرمیوں کو تیز تر کرنے کے لئے حسب ذیل حضرات پر مشتمل مجلس عاملہ تجویز کی گئی۔

شیخ اکرام الحق (سکرٹری سب ریجن)، جناب تصدق رسول، پرواز جالندھری، ڈاکٹر مہر عبدالحق
ریاض انور۔ منشی عبدالرحمٰن خاں (خازن)۔

منشی عبدالرحمٰن اس جلسے میں موجود نہ تھے لہٰذا طے پایا کہ اگر وہ اپنی مصروفیات کے باعث خازن کی ذمہ داریاں نہ سنبھال سکیں تو سکرٹری سب ریجن یہ فرض بھی سرانجام دیں گے۔

محمود علی خاں جامعی

جگر کی انفرادیت

جگر کا اردو شاعری میں کیا مقام ہے اور اردو غزل کو انھوں نے کون سے نئے موڑ عطا کئے یہ مسئلہ طے کرنا یا اس پر بحث کرنا میرے نزدیک ابھی قبل از وقت ہے۔ ابھی تو ان کو ہمارے درمیان سے اُٹھے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں۔ ابھی تو ہماری تصور کی آنکھوں کے سامنے ان کا دلآویز اور پُرکشش مسکراتا چہرہ اسی طرح پھر رہا ہے جیسے۔
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں۔ یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں
ابھی تو زمانہ نے ان کی شخصیت اور ان کے کلام کے سانحہ اپنا بے رحمانہ عمل شروع نہیں کیا ہے لیکن ایک وقت آئے گا کہ ان کی یاد اور ان کی شخصیت دنیا کی تصور کی آنکھوں سے اوجھل ہو جائے گی۔ صرف اس کے فسانے باقی رہ جائیں گے۔ ان کے کلام کا وہ حصہ جس کی بنیاد ان سے ذاتی گرویدگی یا ان کا دلکش ترنم سمجھی جاتی ہے خود بخود محو ہو چکا ہوگا اور صرف وہ حصہ نبھر کر نکھر کر باقی رہ جائے گا جس نے اردو ادب۔ اردو شاعری یا اردو غزل میں اپنا مقام پیدا کر لیا ہوگا۔ اس وقت ان کے اس کلام کا تقابل ان کے معاصرین اور پیشروؤں کے کلام سے کیا جا سکے گا اور اس وقت یہ ممکن ہوگا۔ . . .
. . . . کہ اردو غزل میں ان کے صحیح مقام کا تعین کیا جا سکے اور یہ طے کیا جا سکے کہ انھوں نے کس کس پہلو سے اردو غزل کا رُخ بدلا اور کس طرح اسے بدلتے ہوئے زمانہ سے ہم آہنگ کر دیا۔

اردو شاعری کا چشمہ بہتا چلا جا رہا تھا۔ اس میں مختلف اوقات میں جگہ جگہ ایسے شگاف پڑ گئے تھے اور ان سے متصل ایسے ایسے نشیب پیدا ہو گئے تھے جس سے دائیں بائیں مختلف سوت بہ نکلے تھے اور اصل چشمہ کا پانی بیکار ضائع ہونے لگا تھا۔ جگر نے نہ صرف ان رخنوں کا انسداد کیا بلکہ جدید مادّی دنیا کی اُبھرتی ہوئی تحریکات سے جو خطرہ شاعری کی تخیلاتی دنیا کو لاحق ہونے والا تھا کس طرح آئندہ کے لئے اس کے سدّباب کے امکانات بھی پیدا کر دیئے۔ یہ سب باتیں بھی اسی وقت طے ہو سکیں گی۔

اس وقت تو ان کے ذاتی خصائل کی ان باتوں کو جو ان کی شاعری پر اثر انداز ہوئیں۔ یا جن سے ان کی شاعری کے سمجھنے میں سہولت ہو سکتی ہے۔ نیز شاعری میں ان کی انفرادیت کے سمجھنے اور اسے اُجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ اس وقت تو صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ اس پس منظر کی تکمیل کر دی جائے جس پر ان کی شاعری کی تصویریں نمایاں ہوئی ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ آگے چل کر اس پس منظر کے نقوش بھرنے والے حضرات یکے بعد دیگرے اُٹھ جائیں اور کوئی باقی نہ رہے۔ جگر کے شاعرانہ خدوخال پیش کر سکے اسی خیال کے ماتحت زیر نظر مضمون میں "شاعری میں جگر کی انفرادیت" پیش کی

جا رہی ہے۔

شاعری کے ذکر سے پہلے یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ جگر صاحب کا شعر گوئی کا کیا طریقہ تھا۔ ان کے شعر کہنے کا بھی وہی عام و مروجہ طریقہ تھا جو اردو شعرا کا عموماً ہوتا ہے۔ جگر صاحب فرمائش پر یا فی البدیہہ شعر نہیں کہہ سکتے تھے . . . . ان کا کہنا تھا کہ جس کا جی چاہے مجھے شاعر سمجھے۔ یا نہ سمجھے۔ چاہے یہ خیال کرے کہ کوئی اور شخص مجھے شعر کہہ کر دے دیتا ہے لیکن اس قسم کے امتحانی اکھاڑے میں کودنے کو میں تیار نہیں ہوں۔ جگر صاحب پر جب کیفیت طاری ہوتی تب ہی شعر کہہ سکتے تھے اور جب موج ہوتی تو ہر وقت فکر شعر میں مست اور دنیا و مافیہا سے کھوئے ہوئے رہتے تھے۔ برابر گنگناتے رہتے اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد لکھتے جاتے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ اسی دھن اور اسی محویت کے عالم میں جگر صاحب بیت الخلا گئے ہیں۔ اب وہاں سے واپس آئے ہیں تو پاجامہ باندھا نہیں ہے بلکہ ایک ہاتھ سے کھلے ہوئے پاجامے کا کمر بند پکڑے ہیں۔ دوسرا ہاتھ طرح طرح کے زاویوں سے ہوا میں گھما رہے ہیں۔ چہرے پر بہت ہی دلآویز قسم کی مسکراہٹ پھوٹی پڑتی ہے۔ گنگناتے جاتے ہیں اور شکرانی حالت میں آہستہ آہستہ پاؤں اٹھاتے چلے آرہے ہیں۔ احباب نے دیکھا تو فقرہ چست کیا "باندھ لائے۔ پائنا میں سے شعر باندھ لائے۔ بھائی اس شعر تھا، تو ضرور ہوگی لیکن ان کی محویت کا یہ عالم ہے کہ اس فقرے کی کچھ خبر نہیں۔ ویسے ہی پاجامہ باندھے بغیر آکر بیٹھ گئے اور لکھنے لگے۔ جب لکھ چکے تو احباب سے مخاطب ہو کر بولے "سنیئے۔ چند شعر ہو گئے ہیں" اور پھر سنانا شروع کر دیئے۔

ویسے جگر صاحب رات گئے جب سب رخصت ہو جانے تھے تو تنہائی میں شعر کہنے کے عادی تھے۔ اس وقت ان کے پاس بہت رواں قلم بہت سی روشنائی اور بہت سے نہایت صاف شفاف کاغذ اور بہت تیز روشنی ہونی چاہیئے۔ کہنے کا طریقہ یہ تھا کہ کاغذ پر پہلے خط طغرا میں نہایت خوش نما بسم اللہ لکھی جاتی۔ اس کے بعد جس بحر میں غزل کہہ رہے ہوں اس کی ردیف پھر جو قافیہ ذہن میں آتا تو قافیہ و ردیف کے ساتھ لکھتے۔ ایک سے زیادہ قافیوں کی فہرست نہ بناتے۔ پھر دو ایک الفاظ اور بڑھاتے مثلاً —— جان بہار آ ہی گیا۔ پھر رفتہ رفتہ الفاظ کا اضافہ ہو کر مصرع پورا ہوتا مثلاً —— جیسے وہ جانِ بہار آ ہی گیا —— ۲۔ میں یہ سمجھا جیسے وہ جانِ بہار آ ہی گیا اس کے بعد مصرع ثانی کا نمبر آتا۔ اس میں وہ اپنا پورا زور صرف کر دیتے۔ یہ ان کی انفرادیت تھی کہ مصرع اولیٰ بڑے بانکپن۔ بڑی ٹیڑھ اور بہت دور سے لگاتے تھے جو نہایت باربط اور واضح ہوتا تھا ان کے پورے کلام میں مشکل سے ایک فی صدی مصرع اولیٰ ایسے ملیں گے جو بھرتی کے معلوم ہوں۔ زیادہ تر ان کے دونوں مصرعے باہم دست و گریباں ہیں۔ ان میں کم از کم ۲۵ فی صدی مصرعے ایسے ضرور نکلیں گے جو ان کی انفرادیت کے حامل ہیں اور جو سننے والے کو چونکا دیتے تھے۔ مثلاً انہوں نے شعر سنانا شروع کیا۔ ۶۔ گلے مل کر وہ رخصت ہو رہے ہیں۔ اب کوئی جلد باز سامع تڑپ کر چیخ پڑے —— "ہائے۔ مصیبت کا زمانہ آرہا ہے" یا "ہائے۔ ہائے۔ قیامت کا زمانہ آرہا ہے" جگر صاحب صرف مسکرا دیئے اور شعر مکمل کیا "محبت کا زمانہ آرہا ہے" اور ان چیخنے والے صاحب کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

ایک شعر مکمل ہونے تک کئی مرتبہ باقاعدہ لکھا جاتا اور کاغذ پر بہت سے نامکمل شعر آدھے۔ تہائی۔ چوتھائی لکھے ہوتے تھے۔ اس طرح ایک کاغذ کے بعد دوسرا شروع ہوتا۔ اس پر بھی پہلے بسم اللہ اسی اہتمام سے لکھی جاتی۔ پھر تمام مصرعے صاف کئے جاتے۔ تب کہیں آگے کہنے کی فکر ہوتی۔ تھوڑی دیر میں سامنے لکھے ہوئے کاغذوں کا اک ڈھیر ہوتا جیسے ریاض کے ۲۔ سامنے ڈھیر ہے ٹوٹے ہوئے پیمانوں کا۔ ان کاغذوں پر لکھے ہوئے اشعار اور مصرعوں کے علاوہ طرح

کے نقش و نگار اور بیل بوٹے بھی ہوتے۔

جگر صاحب کو بیل بوٹے بنانے کا خاص ملکہ ہی نہیں
تھا۔ خالی وقت میں یا فکر کرتے وقت وہ ہمیشہ بو
کتاب۔ اخبار یا رسالہ سامنے آتا اس پر خوش نما بیل
بناتے یا قسم قسم کے خط میں بسم اللہ یا جگر مرادآبادی
ہتے۔ اس سے ان کو فکر میں مدد ملتی۔ سگریٹ کا سہارا وہ
لیتے۔ اکثر سگریٹ جلا کر ایک آدھ کش لے کر رکھ دیتے
سے بھول جاتے حتیٰ کہ وہ رکھے رکھے جل کر ختم ہو جاتا۔
ن کے نقش و نگار کے ردی کاغذ جمع کر کے میری لڑکی
نیں ٹریس کر لیا اور کپڑے پر کاڑھا ہے۔ اکثر ان کے یہ
وٹے سراغ رسانی کا بہترین ذریعہ بھی ثابت ہوئے
ایک مرتبہ ان کا بٹوہ علاؤالدین خالد صاحب کی موٹر
سب معمول رہ گیا۔ بعد میں خالد صاحب کو ملا۔ وہ شروع
علوم نہ کر سکے کہ کس کا ہے۔ کھول کے دیکھا تو اس میں
ٹ نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ پھر تو اور فکر ہوئی مزید
ن لی تو اس میں سے ایک پرزہ نکلا جس پر بیل بوٹے بنے
بس انھوں نے فوراً سمجھ لیا کہ اس کا مالک جگر صاحب
سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا اور بٹوہ جگر صاحب کی خدمت
پہنچا دیا۔

جگر صاحب کی شعر گوئی سے شراب کا بھی بڑا تعلق ہے
اس کے متعلق لوگوں میں بہت سی غلط فہمیاں عام ہیں شراب
زمانے میں اکثر حضرات جگر کو اس لئے شراب پلایا کرتے
ان سے خوب کلام سنا جائے اور بہت سے اصحاب
بعد کے زمانے میں یہ خیال ہو گیا کہ جگر کی شاعری میں شراب
ب کرنے کے بعد وہ مزا نہیں رہا جو پہلے تھا۔ وہ شراب کو
کی شاعری کا محرک سمجھتے تھے لیکن یہ خیال بالکل غلط ہے۔
رے حضرات پر شراب کیا اثر مرتب کرتی ہے اور ان کے
ت کی پرواز میں کس قدر مدد و معاون ہوتی ہے اس کے متعلق
کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن جگر کے متعلق میں پورے وثوق سے

کہہ سکتا ہوں کہ جگر صاحب شراب کے نشے کی ابتدائی حالت میں
بھی کبھی صحیح طور پر اپنا کلام نہ سنا سکے۔ ہمیشہ وہ بے ربط طور پر
مختلف غزلوں کے اشعار پڑھتے تھے اور ان کی وضاحت کرتے
جاتے تھے۔ جب نشہ تیز ہوتا اشعار پڑھنا قطعاً بند ہو جاتا۔
رہا شاعری کرنے کا سوال تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ جگر صاحب
نے شراب پی کر کبھی ایک مصرع بھی موزوں نہیں کیا۔ وہ اسے
شغل شراب کی توہین سمجھتے تھے۔ پوری غزل کہنا تو بڑی بات ہے۔
البتہ بعض غزلیں نشے کے آثار کے زمانے میں ضرور کہی ہیں لیکن
ان کو دیکھنے سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا معیار ان غزلوں
کے مقابلہ میں کتنا پست ہے جو ہوش کے زمانے میں کہی گئی تھیں
مثلاً سنہ ۳۲ء میں انھوں نے بھوپال میں ہوش کے عالم میں
حسب ذیل غزلیں کہی تھیں۔

(۱) جواب بھی نہ تکلیف فرمائیے گا
(۲) عشق میں لاجواب ہیں ہم لوگ
(۳) تڑپ کر دل انھیں تڑپا رہا ہے
(۴) دل کو جب دل سے راہ ہوتی ہے
(۵) غم عاشقی کا صلہ چاہتا ہوں
(۶) حسن معنیٰ کی قسم جلوۂ صورت کی قسم
(۷) نظر ملا کے مرے پاس آ کے لوٹ لیا
(۸) سنتا ہوں کہ ہر حال میں وہ دل کے قریں ہے

صاحب نظر حضرات ان غزلوں کا معیار ملاحظہ کریں اس
کے بعد ان غزلوں کو دیکھیں جو اسی زمانہ میں سیہور میں کہی گئیں

(۱) الٰہی ایک دعا ہے اگر قبول نہ ہو
(۲) دل ترے عشق میں ناشاد بھی ہے شاد بھی ہے

اور ان غزلوں کی پستی اور بلندی کا اندازہ کریں اور
ساتھ ہی میری اس تصدیق کو بھی ذہن میں رکھیں کہ بھوپال کی
غزلیں سب کامل ہوش کے زمانے کی ہیں اور جب وہ سیہور
گئے ہیں اس وقت آثار کا زمانہ تھا۔ ان کے بھوپال کے بہت
سے احباب جو آج پاکستان میں موجود ہیں۔ میرے اس بیان

کی تائید کرسکے۔

اب رہا یہ سوال کہ جگر کی شاعری میں شراب ترک کرنے کے بعد وہ مزا کیوں نہ رہا جو شراب کے زمانے میں تھا تو یہ شاعری کو شاعر کے حالات کی روشنی میں نہ دیکھنے کا نتیجہ تھا۔ یہ سچ ہے کہ جگر کے یہاں آخر میں خالص رومانی عنصر کم اور نظریاتی و نفسیاتی عنصر زیادہ ہو گیا تھا اور یہ ان کی عمر کا صحیح تقاضا تھا۔ جوانی ختم ہونے کے ساتھ انسان میں فطرتاً امنگ اور ولولہ کم ہو جاتا ہے۔ جذبات میں وہ ہیجان باقی نہیں رہتا جو شباب کے زمانے میں ہوتا ہے اور شاعری کا تعلق جذبات ہی سے ہے چنانچہ بڑھاپے میں ولولے اور سرخوشی میں کمی آنا لازمی ہے۔ پھر جگر تو صداقت کلام کے قائل تھے اور کلام کو زندگی کی عین تصویر سمجھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ دل میں کوئی جذبہ نہ ہو اور کاریگری سے اسے خوبصورت الفاظ میں بیان کر دیا جائے اسے میں شعر نہیں کہتا۔ بلکہ جو دل پر جذبہ ہو وہی شعر کی زبان پر آنا چاہیئے...... وہ ان بوڑھے بوڑھے استادوں کا تنہائی میں اکثر مذاق اُڑاتے تھے جن کے بال سفید ہو گئے ہیں۔ ہاتھوں میں رعشہ آگیا ہے گردن ہل رہی ہے مگر بوسے۔ وصل اور جوبن کے اشعار بے محابا پڑھ رہے ہیں اور داد کے ڈونگرے بٹور رہے ہیں۔

ہاں تو بڑھاپے میں "رومانویت" کی کمی ہو جاتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں خیالات میں "تفکر" زیادہ ہو جاتا ہے اور کلام میں پختگی اور گہرائی زیادہ پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی چیز جگر کے "آتش گل" کے کلام میں بھی موجود ہے۔ اب ان کے یہاں تفکر میں جو گہرائی اور خیالات میں جو پختگی پائی جاتی ہے اسے محسوس کرنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں لیکن اس گہرائی اور پختگی کے باوجود اس کے اظہار میں شوخی تو نہیں لیکن رنگینی رہی پائی جاتی ہے جو ان کی "انفرادیت" ہے۔

گویا متوازن رنگینی اور سرخوشی "جگر کی انفرادیت" ہے

اردو زبان اور اس کی پیدائش اور ارتقا اس وقت ہوا جب ہندوستان میں سلطنت مغلیہ زوال پذیر تھی اور زوال پذیر قوم کے اخلاق بالعموم پست ہو جاتے ہیں سطحیت پر اس کی نظر محدود ہو جاتی ہے اور عامیانہ مذاق خواص و عوام میں عام ہو جاتا ہے۔ وہ پستی کے اس غار سے نکلنے کے لئے تنکوں کا سہارا لینے لگتی ہے لیکن وہ سہارا دینے کے بجائے اس کے ڈوبنے کا اور سامان کرتے ہیں۔ وہ اس بھنور سے نکلنے کے لئے جتنے ہاتھ پاؤں مارتی ہے اتنا ہی قعر مذلت کی طرف اور بڑھتی چلی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ اس پر مایوسی۔ اضمحلال۔ افسردگی اور پژمردگی کا تسلط ہو جاتا ہے۔ اور شاعری قوم کی عام حالت کی آئینہ ہوتی ہی ہے لہٰذا ایک زوال پذیر قوم کی شاعری افسردگی اور پژمردگی کی مظہر۔ اردو شاعری کا تمام تر وجود و ارتقا چونکہ اسی دَور کا مرہون منت ہے اس لئے اس پر عامیانہ رنگ۔ سطحیت اور افسردگی کا غالب ہونا ایک یقینی امر تھا۔ اصغر نے سب سے پہلے اُردو شاعری میں نشاط اور شگفتگی کو داخل کیا اور جگر نے اس "لے" کو اور بڑھا کر شگفتگی اور سرخوشی کو شاعری کے اجزائے ترکیبی میں ضروری قرار دے دیا۔ اب اُردو شاعری پر سے مایوسی اور افسردگی کے بادل چھٹ گئے اور ہمارے شعرا پر عام طور پر نشاط و سرخوشی کی کیفیت طاری ہو گئی بے شک ان حالات کے پیدا ہونے کے اور بہت سے اسباب بھی ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ بنیادی وجہ اصغر اور جگر کی رہنمائی ہے جگر کے کلام میں یہ چیز شروع سے موجود تھی اور ان کے ہر دَور کی امتیازی خصوصیت رہی ہے۔ چاہے وہ ان کا پہلا دَور ہو جب داغ کی زبان ان کے یہاں حاوی تھی یا دوسرا دَور ہو جب اصغر کا تصوف ان کے اوپر طاری تھا یا تیسرا دَور (یعنی شعلہ طور کا آخری دَور) جو ان کی شاعری کا بہترین دور تھا چوتھا دَور (یعنی آتش گل کا دَور) جو سلطنت کے خلاف ایک بغاوت تھی اور جس میں غالب اور اقبال کے تفکر کا پرتو نظر آتا ہے

دور جس نے "شاعر" کو بہت بلند کر دیا۔ ممکن ہے بعض حضرات کو میرے اس بیان میں کچھ تضاد محسوس ہو اس لئے ذرا زیادہ واضح کر دینا مناسب ہے۔ "شعلۂ طور" کا آخری دور جگر کی شاعری کا وہ دَور تھا جبکہ ان کی شاعری تمام شاعرانہ لوازم سے آراستہ ہو کر بحیثیت "شاعری" کے عروج کی حالت پر تھی لیکن "آتش گل" کی شاعری نے شاعری میں کوئی اضافہ نہیں کیا بلکہ تفکر کی وجہ سے "شاعر" کا مرتبہ بلند ہو گیا۔ گویا "شعلۂ طور" کا آخری دور شاعری کا بہترین دَور اور "آتش گل" کا دَور شاعر کا دَور تھا۔ غرضکہ کوئی دَور ہو نشاط۔ سرخوشی۔ شگفتگی اور رنگینی سے خالی نہیں تھا جو ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ یہ جگر کی پہلی اور سب سے بڑی انفرادیت تھی۔

دوسری خصوصیت میں وہ اپنے دور کے تقریباً سب غزل گو شعرا مثلاً حسرت۔ فانی۔ اصغر۔ یگانہ۔ فراق کے ساتھ برابر کے شریک ہیں اور وہ ہے ان کا عامیانہ رنگ سے احتراز اور ابتذال سے تنفر۔ اس مختصر مضمون میں ان کے کلام سے دو نمونے پیش کرنا مشکل ہے جس میں انھوں نے مایوسی اور افسردگی کا سدباب کیا اور شگفتگی و سرخوشی کی ایک عام فضا پیدا کر دی یا عامیانہ پن سے ایک عام اجتناب پیدا کر دیا۔ انھوں نے محبوب اور رقیب کو مخاطب کرنے تک کے آداب مقرر کر دیئے ثبوت میں ان کے "شعلۂ طور" اور "آتش گل" کا مکمل کلام پیش کیا جا سکتا ہے۔

یہ دو خصوصیات ان کے کلام میں سرائیت کئے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ جو خوبیاں ان کے کلام سے مخصوص ہیں۔ وہ ارتقائی منازل طے کرنے کے بعد مختلف اَدوار میں رُونما ہوتی رہیں۔ اگر شاعری تیسرے دور میں اپنے عروج پر پہنچی تو تفکر چوتھے دَور میں۔

محبت کے تذکرہ میں عاشق۔ محبوب اور رقیب کا مثلث عام اور لازمی ہے جگر نے ان تینوں کے کیا مدارج مقرر کئے اور اُردو شاعری میں کس طرح ان کا وقار بلند کیا یہ آئندہ چند سطور میں واضح کیا جائے گا۔

ہماری شاعری کے موجودہ یعنی حسرت تا فراق کے دور سے پہلے جرأت اور داغ کی پیروی میں عاشق کا حلیہ بہت بگڑ گیا تھا اس حد تک کہ وہ مضحک معلوم ہونے لگا تھا وہ بہت ہی مظلوم۔ مجبوط الحواس۔ وحشت نورد۔ شہروں میں بھوکا پیاسا گلی گلی کی خاک چھاننے یا محبوب کی گلی کے سو سو چکر کاٹنے والا۔ دربان کی نہ صرف خوشامد کرنیوالا بلکہ جھڑکیاں سہنے والا۔ کاسۂ گدائی ہاتھ میں لئے بوسوں کی بھیک مانگنے والا۔ بے حمیتی کا مجسمہ اور خودداری کی بالکل ضد تھا یا اگر وصل سے شادکام ہوتا تو پھاگ کھیلنے میں بھی اسے کچھ عار نہ تھا۔ پھر تو اگر دو گن کے لیتا تو دس بے گنے ہتھیا لینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ لیکن جگر نے اس ذلیل و خوار۔ پست و مظلوم ہستی کا وقار اتنا بلند کر دیا کہ اب اس میں بلا کی خودداری اور خود اعتمادی پیدا ہو گئی۔ اب وہ محبوب کے سامنے بھی اکڑ کر چل سکتا ہے بلکہ اب تو وہ اپنی کامیابی کے راز کو پا گیا ہے ع۔ لطف کچھ دامن بچا کر ہی گزر جانے میں ہے۔ گنگناتا رہتا ہے۔ اب وہ ناز سے سر بلند کر کے کہہ سکتا ہے۔

عشق کی یہ نمود پیہم کیا
ہو نہیں تم تو ہم پھر کیا

مٹا کر ہمیں آپ پچھتایئے گا
کمی کوئی محسوس فرمایئے گا
ہمیں جب نہ ہونگے تو کیا رنگ محفل
کسے دیکھ کر آپ شرمایئے گا

یا پھر اپنے عشق پر اعتماد کر کے کہتا ہے

بھرم کھو نا کہیں اے دل نہ عشق معتبر ہو کر
گزر جا۔ ہاں گزر جا حسن سے بھی بے خبر ہو کر

عشق کی حدت نکلتے پھر یہ منظر دیکھتے
کاش حسن یار کو ہم حسن بنا کر دیکھتے

اور اب تو اعتماد یہاں تک بڑھ گیا ہے کہ کہنے لگا ہے

کیا حسن نے سمجھا ہے کیا عشق نے جانا ہے
ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانا ہے

اور یہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے

یا وہ تھے خفا ہم سے یا ہم ہیں خفا ان سے
کل ان کا زمانہ تھا آج اپنا زمانہ ہے

عشق کی ہمت افزائی کے لئے اس سے بہتر اور کیا کہا جا سکتا ہے

عشق ہی کے ہاتھوں میں کچھ سکت نہیں رہتی
ورنہ چیز ہی کیا ہے گوشۂ نقاب اُن کا

مجھ ناتوانِ عشق کو سمجھا ہے تم نے کیا
دامن پکڑ لیا تو چھڑایا نہ جائے گا

دیکھئے۔ کیا نفسیاتی حربہ استعمال کیا ہے

وہ اور نازِ عشق گوارا کریں مگر
اِتنے کھنچے ہم ان سے کہ مجبور کر دیا

ترکِ طلب اور اطمینان

دیکھ تو میرا حُسنِ طلب

آخری درجہ بھی ملاحظہ ہو ؎

جنونِ محبت یہاں تک تو پہونچا
کہ ترکِ محبت کیا چاہتا ہوں

وہ آئے ہیں لے دل ترے کہنے کا یقیں ہے
لیکن میں کروں کیا مجھے فرصت ہی نہیں ہے

دیا ہے عشق نے وہ مرتبہ بحمد اللہ
کہ آنکھ تک نہ اُٹھاؤں اگرچہ تو آئے

پہلے محبوب یا تو عشق حقیقی کے زیر اثر اتنا بلند و ارفع ہوتا تھا۔ اس میں اتنی پاکیزگی اور تقدس ہوتا تھا کہ اس تک پہنچنے میں پر پرواز جلتے تھے یا پھر اتنا گرا ہوا۔ بازاری حُسن فروش۔ عصمت باختہ۔ رنگ رلیاں منانے والا۔ عاشق پر ہمیشہ ظلم توڑنے والا۔ اور چپکے چوری سب کچھ کر گذرنے والا ہوتا تھا۔ مجھے یاد ہے عرصہ ہوا اپنی نوجوانی میں ایک رسالے میں میں نے محبوب کی ایک خیالی تصویر دیکھی تھی۔ اسے دیکھ کر محبوب سے ہیبت۔ وحشت اور نفرت ہونے لگتی تھی۔ اوّل تو اس کے اُوپر اور نیچے کے دھڑ الگ الگ تھے۔ کمر تھی ہی نہیں۔ پلکوں اور بھنوؤں کی جگہ تیر و سناں لگے ہوئے تھے۔ ٹھوڑی پر ایک بہت گہرا گڑھا تھا۔ گردن کی جگہ صراحی کا چہرہ رکھا تھا اور جو بنوں کا اُبھار تو اُف توبہ۔ معلوم ہوتا تھا کہ دو مٹکے کسی نے اوندھا دیئے ہیں یا حملہ آور سپاہی مشین گن تانے کھڑے ہیں گویا شباب خود سینے پر چڑھا محبوب کو پچھاڑے دے رہا ہے یہ تو محض خیالی تصویر تھی جس میں محبوب کے تمام اوصاف یک جا جمع کر دیئے گئے تھے۔ لیکن جگرؔ نے محبوب کا جو تخیل پیش کیا اس کے مطابق وہ ہم انسانوں میں کا ایک انسان ہے۔ گوشت پوست کا انسان ہے۔ اس کے پہلو میں بھی ایک دل ہے اور وہ دل بھی محبت سے متأثر ہو سکتا ہے ملاحظہ ہو

ہمیں پہ عشق کی تہمت لگائی جاتی ہے
مگر یہ شرم جو چہرے پہ چھائی جاتی ہے

کچھ مرے چہرے سے کھلے رازِ عشق
کچھ تری نظروں سے عیاں ہو گئے

اِدھر سے بھی ہے سوا کچھ اُدھر کی مجبوری
کہ ہم نے آہ تو کی ان سے آہ بھی نہ ہوئی

اور حالت یہاں تک پہنچ گئی۔

ہم سے پوچھ اے ناصح دل گرفتگی ان کی
ہم نے چھپ کے دیکھا ہے عالمِ پُرآب ان کا

نہ لیتے ہم مگر ان مست انکھڑیوں نے جگر
نظر بچاتے ہوئے ڈبڈبا کے لوٹ لیا

ستم کیا اب تو کرم بھی ہے گوارا مجھ کو
تیری اس اشک بھری چشم ندامت کی قسم

بیساختہ آج ان کے بھی آنسو نکل آئے
دیکھا نہ گیا حال فقیرانہ کسی کا

اب صورت یہ ہو گئی

اتنی سی بات پر ہے اک جنگ زرگری
پہلے ادھر سے بڑھتے ہیں وہ یا ادھر سے ہم

طے منزلیں ہوئی ہیں یوں عشق و آرزو کی
کچھ میں نے جستجو کی۔ کچھ اس نے جستجو کی

اب تو تاثیر غم عشق یہاں تک پہونچی
کہ ادھر ہوش اگر ہے تو ادھر ہوش نہیں

خود بڑھے آتے ہیں وہ میری طرف
کوئی دیکھے تو مری پسپائیاں

انتہا یہ ہے

جذب جنوں نے آج تو گل ہی نیا کھلا دیا
خود وہ گلے لپٹ گئے عشق کا واسطہ دیا

رقیب کو پہلے روسیاہ اور عیار لہذا قابل نفرت
شتنی و گردن زدنی سمجھا جاتا تھا لیکن جگر نے اس کے
کو ضروری قرار دیا۔ وہ اس کی عزت بھی کرتے ہیں۔
ہ وہ بہرحال سگ لیلےٰ ہے۔ چنانچہ اب رقیب ایک
ن ضروری سمجھا جاتا ہے۔

ہ ہزار دشمن جاں سہی مجھے غیر پھر بھی عزیز ہے
جسے خاک پا تری چھو گئی وہ برا بھی ہو تو برا نہیں

اور اس کے مبتلائے مصیبت ہونے پر کڑھتے
ہیں۔

ستم کا عدو مستحق ہو گیا
مرا دل سراپا قلق ہو گیا

مگر دیکھئے اپنی برتری کس طرح ثابت کرتے ہیں

غیر جو تلخ کام ہے اس کے نصیب کی کمی
مجھ کو تو اک مزا ملا ہر غم جاں گداز میں

لیکن جگر کو خود اپنی ہستی پر اتنا اعتماد ہے کہ وہ
عموماً رقیب کے ذکر کو نظر انداز کر دیتے ہیں اسی لئے انکے
کلام میں اس کی مثالیں کم ملتی ہیں۔

یہ جگر کی انفرادیت کے سلسلہ میں تین خصوصیات ہوئیں
یعنی (۱) شگفتگی و سرخوشی (۲) عامیانہ پن سے احتراز اور
(۳) حسن و عشق کا وقار اور مرتبہ بلند کرنا۔

اب ان کی چوتھی خصوصیت یعنی تاریک پہلو کو روشن
کرنا ملاحظہ ہو۔ ....

------ جگر کا خیال تھا کہ دنیا میں ہر حقیقت کے
دو پہلو ہوتے ہیں اور دونوں اپنی جگہ صحیح ہوتے ہیں اب یہ
موقع محل اور دیکھنے والے کی اہلیت اور استعداد کی بات ہے
کہ ان دونوں پہلوؤں میں سے کسے صحیح سمجھ کر قبول کرے اور
کسے رد کر دے۔ کسی کے قبول یا رد سے کسی پہلو کی وقعت پر
کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اگر سفید میں ایک حسن ہے تو سیاہ بھی
اس سے خالی نہیں۔ یہ دیکھنے والے کی نظر کا فرق ہے اگر نیکی
ایک حقیقت ہے تو برائی بھی ایک حقیقت ہے یہ دوسری
بات ہے کہ بعض حالات یا اکثر صورتوں میں وہ مذموم ہو
اور اس لئے قابل رد۔ اسی خیال کے پیش نظر وصل اگر پیارا
ہے تو فراق کیوں رقیب ہو۔ اس سے گریز کیوں کیا جائے
شادمانی سے اگر دلچسپی ہے تو غم سے تنفر کے کیا معنی۔ وفا اگر
دل نشین ہے تو جفا سے دل برداشتہ کیوں۔ روشنی کے
ساتھ تاریکی بھی اتنی ہی مفید اور مقبول ہے جتنی ہر حقیقت
ہو سکتی ہے۔ اسی لئے جگر صاحب نے تاریک پہلو کو روشن
نمایاں اور بلند کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کے وہ
محاسن بیان کئے ہیں جو عام نظروں سے پوشیدہ ہیں ---
ملاحظہ کیجئے

وصل وفراق

کٹ ہی گئی شب غم بڑی راحتوں سے
تری یاد ہوگی ترا دھیان ہوگا

تری صبح عیش ہے کیا بلا ۔ تجھے اے فلک جو ہو حوصلہ
کبھی کرلے آکے مقابلہ ۔ غم ہجر یار کی شام سے

کرلیا دل نے عیش وصل قبول
پھر گیا کچھ شباہت غم کیا

تری امانت غم کا تو حق ادا کرلوں
خدا کرے شب فرقت ابھی دراز رہے

نہیں جو وصل میسر نصیب ہجر تو ہے
ہم اتنے فرق کا اُن سے ملال کیا کرتے

شادمانی وغم

گلے مل کر وہ رخصت ہو رہے ہیں
محبت کا زمانہ آرہا ہے

کئے مجھ پر احساں غم یار نے
ہمیشہ کو نیچی نظر ہو گئی

صورت دکھا کے پھر مجھے بیتاب کردیا
اک لطف آچلا تھا غم انتظار میں

ہائے وہ کیوں کر دل بہلائے
غم بھی جس کو راس نہ آئے

خوب رو لے فراق میں اے دل
کچھ طبیعت بہل ہی جاتی ہے

تسکین مضطرب کا مداوا نہ کیجئے
وعدہ تو کیجئے مگر ایفا نہ کیجئے

شب فرقت بھی جگمگا اُٹھی
اشک غم ہیں کہ ماہ پارے ہیں

وفا وجفا

محبت بقید وفا چاہتا ہوں
بڑا نا سمجھ ہوں میں کیا چاہتا ہوں

ستم یار کی دہائی ہے
نگہہ التفات نے مارا

جگر زندگی لطف سے کٹ رہی ہے
غم آزاریاں ہیں جنوں کاریاں ہیں

پھر کوئی مہرباں نہ ہو جائے
سعی غم رائیگاں نہ ہو جائے

عشاق پا رہے ہیں ہر جرم پر سزائیں
انعام بٹ رہے ہیں مغرور ہیں خطائیں

یہاں تو کام ہے اک نشتر توجہ سے
نگاہ مہر ہے یا نگاہ ناز رہے

بہار وخزاں

پھول وہی چمن وہی فرق نظر نظر کا ہے
عہد بہار میں تھا کیا؟ دور خزاں میں کیا نہیں

گل وخار

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں

کانٹوں کا بھی حق ہے آخر
کون چھڑائے اپنا دامن

غرض جگر کی یہ چار خصوصیات کلام ہیں جو ان کی انفرادیت کی مظہر ہیں۔ ویسے ان کی بہت سی خصوصیات کلام اور بھی ہیں لیکن میری نظر میں وہ ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ صرف ان میں سے دو زیادہ نمایاں ہیں۔ اول۔ ان کی محاکات کے بیان پر پوری قدرت اور دوسری۔ ان کی نفسیاتی اور نظریاتی شاعری لیکن مضمون کی مزید طوالت کے خیال سے انھیں فی الحال نظر انداز کیا جاتا ہے۔

مغربی پاکستان کا تاریخی شہر

ٹھٹھ

ٹھٹھ پاکستان کے نہایت قدیم شہروں میں سے ہے۔ اور کئی زبردست مملکتوں کا دارالخلافہ رہ چکا ہے۔ ایک زمانے میں یہ بہت بڑا تعلیمی، ثقافتی اور تجارتی مرکز تھا جہاں دنیا کے مختلف حصوں سے طالب علم اور تاجر آیا کرتے تھے اب یہ ایک چھوٹا سا شہر اور اپنے ضلع کا صدر مقام ہے۔ لیکن اس کے تاریخی آثار، مقبرے اور مسجدیں، اب بھی سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز ہیں۔

سنّاٹا

کوئی دھڑکن
نہ کوئی چاپ
نہ سنچل
نہ کوئی موج
نہ ہلچل
نہ کسی سانس کی گرمی
نہ بدن
ایسے سنّاٹے میں اک آدھ تو پتّا کھڑکے
کوئی پگھلا ہوا موتی
کوئی آنسو،
کوئی دل
کچھ بھی نہیں
کوئی رُخسار تو چمکے، کوئی بجلی تو گرے

مصطفیٰ زیدی

ائر ہوسٹس

شہر کی روشنیاں کرِ نمکِ آوارہ میں
نہ وہ ہوٹل کے دریچے نہ وہ بجلی کے ستون
نہ وہ اطراف، نہ رفتار کا گمنام سکوں
ہر گھڑی ساعتِ پرواز بنی جاتی ہے

سیکڑوں فیٹ تلے رینگ رہی ہوگی زمیں
کہیں پٹرول کے مرکز، کہیں سڑکوں کا غبار
تار کے آہنی کھمبوں کی طرح راہ گزار
مختلف لوگوں کی آواز بنی جاتی ہے

تیرے لہجے میں ہے ترغیب کی یہ کیفیت
کہ مشینوں کی فضا ساز بنی جاتی ہے
اے مرے دل کے دھڑکنے سے بہ ظاہر غافل
تیری صورت تری غماز بنی جاتی ہے
ہم سفر انجنیں گرم کئے بیٹھے ہیں
تو مرا سب سے بڑا راز بنی جاتی ہے

باقر مہدی

سیّاح

جب کوئی لوٹ کے پردیس سے گھر آتا تھا
میں بڑے شوق سے ملتا تھا کہ وہ
ایسے شہروں کے سنائے مجھے قصے کہ جہاں
خواب ہر صبح حقیقت میں بدل جاتے ہوں
لیکن اکثر یہ ہوا ہے کہ مجھے
راجہ رانی کی کہانی ہی سُنائی جاتی

اور کچھ سال کے بعد
کوئی استاد یہ کہتا مجھ سے
"کیا نئی بات ہے اس دور کے افسانوں میں
ڈھونڈتے پھرتے ہیں دیوانوں کو انسانوں میں
ایسے افسانوں کو سننے کا نہ آئے گا خیال"
میں تو یہ سُن کے ہوا اور نڈھال

ایک بار ایسا ہوا
میرے اسکول سے دُور
نیم کے پیڑ کے نیچے اک شخص
جانے بیٹھا ہوا کیا لکھتا تھا
ایک بھٹکا ہوا پردیسی نظر آتا تھا

میں نے سوچا یہ کہیں خضر نہ ہوں
داستاں ان سے سکندر کی سُنوں
یا وہ افسانے کہ جو
آج تک مجھ کو سُنائے نہ گئے
میں نے خود بڑھ کے کئے چند سوال
"آپ دنیا کی خبر رکھتے ہیں۔
مجھ کو اک راز بتا دیں تو عنایت ہوگی
کون سی راہ نئے ملکوں، جزیروں کی طرف جاتی ہے
جس کی منزل پہ ملے، خواب، خوشی، افسانے
ایسے ویرانے کہاں ہیں جن میں
رقص پریوں کا ہوا کرتا ہے
یا نئے شہر جہاں
خواب ہر روز حقیقت میں بدل جاتے ہیں
آپ تو خضر ہیں اتنا ہی بتا دیں مجھ کو
لوگ کہتے ہیں بھلا اس میں حقیقت کیا ہے
آپ کو موت کی حسرت کیوں ہے؟ —"

خضر نے مجھ سے کہا: ——

"زندگی، موت کے راز
تو سمجھ پائے گا کیا —— !!
تو نے پہچان لیا مجھ کو، تو اتنا سُن لے
مجھ کو جینے کی تمنا ہی لئے پھرتی ہے
پوری دنیا ابھی دیکھی ہے کہاں —— !
جا، تجھے ایک دعا دیتا ہوں
تجھ کو گردش کا ہے شوق
زندگی تیری سفر میں گزرے ——"!

منیر نیازی

شام - خوف اور رنگ

بجلی کڑک کے تیغِ شرر بار سی گری
جیسے گھٹا میں رنگ کی دیوار سی گری
دیکھا نہ جائے گا وہ سماں شام کا منیر
جب بامِ غم سے خوشبو کوئی ہار سی گئی

ادیب سہیل

پھول چھڑی

چھڑا ہوا تھا راگ کدارا
دارا را را دا دِر دارا !
بکھر رہی تھی نور کی دھارا !!
من اپنا جھالوں کے موہن روپ کا رسیا
رِم جھم کے سنسار میں گم تھا
رِم جھم کے سنسار سے جب یہ واپس لوٹا
دیکھا اس نے پریم کی پوجا کو آشا کی تھال میں جو کچھ پھول کھلائے دوار پہ
اس کے اک دیوی اک پھول چھڑی مسحور کھڑی ہے
اس نے کہا — "اے روپ کی رانی راگ دوانی
اس مندر کے دوار پہ تیرے آنے میں کچھ دیر ہوئی ہے !

۱؎ یہ راگ چاندنی رات کا روپ پیش کرتا ہے ۔

ساقی فاروقی

رنگ اور آگ

اب بہت تھک گئے ہو اب سو جاؤ
جاؤ خوابوں کے اُجڑے طاق بجھاؤ
اور اشکوں سے اپنی جان چھڑاؤ

ان گنت یادیں رینگتی ہوئی آئیں
ایک پرچھائیں دوسری پرچھائیں

خوف سے چیخنے لگی تنہائی ——،
میری آوازِ دل بڑھانے آئی

اُس میں گونج اس میں موت کے انداز
یہ کہاں سے ہوئی بری آواز؟

ایک سسکی ہوا میں بہتی ہے
رات سرگوشیوں میں کہتی ہے

ان بکھرتے ہوئے خیالوں کی
اتنی آوارگی نہیں اچھی؛

زود رنج کی آگ سے بدن کو بچاؤ
رنگ سے اپنا پیرہن نہ جلاؤ
اب بہت تھک گئے ہو اب سو جاؤ

ریاض انور

روشنی کی تلاش

محبت ۔ روشنی ۔ گیتوں کی خوشبو
تمہاری جستجو میں پرفشاں ہے
یہ لمحہ، اُجنبی منزل کا راہی
مثالِ موجۂ دریا رواں ہے
لب و گیسو کی بھی اک انتہا ہے
غم دل کی مگر منزل کہاں ہے!

یہ تنہائی یہ سناٹا یہ آنسو
تمناؤں کی شمعوں کی قطاریں
دلوں کے زخم، یادوں کے جنازے
دہکتے پھول، کجلائی بہاریں
خلا میں ڈوبتے ہیں دکھ کے سائے
کوئی اپنا نہیں کس کو پکاریں ــ!

دلِ ویراں کا اک پرتو ہے جس نے
جہاں میں شامِ غم کا نام پایا
کبھی جو درد کی شدت سے چیخے
تو دنیا نے اسے اک گیت سمجھا
انہیں چیخوں میں ڈھالا میں نے تجھ کو
انہیں گیتوں میں تجھ کو میں نے پایا
تھرکتی روشنی کی چند لہریں
بھٹکتی چاندنی میں ایک سایا

شمیم نسرین

چاند

سیہ بادلوں سے نکلتا ہوا ضو فشاں چاند
کتنا حسیں لگ رہا ہے!
نہ جانے تھکا ہارا، بے چارہ کس کی لگن میں
کہاں جا رہا ہے — ؟
مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے دلِ زار بھی
ہمسفر ہو اسی کا — !
کوئی جیسے سرگوشیاں کر رہا ہو
تخیل کا قصرِ حسیں بن رہا ہو
یہی چاند تارے، یہی کہکشاں تھی
مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے
کبھی بزمِ انجم مری رازداں تھی!
یہی چاند تھا، اس کی سیمیں ضیائیں
سموتی تھیں دل میں ہزاروں اُمنگیں
مگر — آج محسوس ہوتا ہے، جیسے
گرانباریٔ زندگی سے
میں تھک سی گئی ہوں — !
یہ آنسو! مگر — میری آنکھوں میں کیسے؟
یہ ممکن نہیں ہے — !
کہ — میں، زندگی کی کشاکش سے یوں ہار جاؤں !!؟
سیہ بدلیوں سے نکلتا ہوا ضو فشاں چاند
کتنا حسیں لگ رہا ہے!؟
جبیں بادلوں کی قبائیں پہن کر —
اُفق سے پرے
ڈوبتا جا رہا ہے!!!

ظہیر کاشمیری

آدمی نامہ

ہمیں افسوس ہے کہ گزشتہ شمارے میں یہ نظم غلط ترتیب سے شائع ہو گئی تھی جس سے اکثر جگہ مطلب خبط ہو گیا یا اُلجھاؤ پیدا ہو گیا ہم جناب ظہیر کاشمیری اور قارئین سے معذرت خواہ ہیں اور نظم صحیح ترتیب سے دوبارہ شائع کرتے ہیں

(۱)

عرش کی خلوتوں کا ہوں کرسی نشیں
فرش پر ہوں مکیں آدمی نام ہے
رامشِ ارتقا ہے مرا مشغلہ
فکرِ تزئینِ ہستی مرا کام ہے

(۲)

حوریاں دست بستہ مرے سامنے
قدسیاں پر شکستہ مرے سامنے
کہکشاں کی سنہری، سجل زورقیں
سب ہیں لنگر گستہ مرے سامنے

(۳)

میرے وجدان کا طائرِ بے صدا
آسماں کی فصیلوں پہ اُڑتا رہا
ہر ستارہ مدارِ فضا چھوڑ کر
میرے عرفان کی سمت مڑتا رہا

(۴)

آفتابوں کے سینے کی دھڑکن ہوں میں
ماہتابوں کے ماتھے کا زیور ہوں میں
گردبادوں کا زنجیرۂ رقص ہوں
بجلیوں کی نگاہوں کا تیور ہوں میں

(۵)

ہے بہار و خزاں پہ تسلط مرا
میں امینِ فتوحاتِ اضداد ہوں
مجھ سے دامن کشاں وقت کی گردشیں
میں حوادث کی بھٹی کا فولاد ہوں

(۶)

دوپہر کی تمازت کا انعام ہوں
نیم شب کی خموشی کا پیغام ہوں
میں سحر کی شعاعوں کا الہام ہوں
میں شفق ہوں میں رنگینیٔ شام ہوں

(۷)

جلوہ گر اس قدر ہوں کہ نایاب ہوں
مستقل اس قدر ہوں کہ سیماب ہوں
نرم اتنا کہ دُرِّ دلِ ناب ہوں
سخت اتنا کہ سبزے کی سنجاب ہوں

(۸)

حسنِ فطرت میں جب میں نے ترمیم کی
پتھروں کو جمالِ صنم مل گیا
جب ضیائے نظر میں نے تقسیم کی
بت کدوں کو چراغِ حرم مل گیا

(۹)
میں اُزل سے ابد کی طرف ہوں رواں
راہ میں بیٹھ جانے کا قائل نہیں
قیصری، بے کلبھی، خودی، بے خودی
سنگِ منزل تو ہیں میری منزل نہیں

(۱۰)
میں بہشت و سقر سے بہت دور ہوں
خیر و شر ہیں فقط اک قرینہ مرا
سلسبیلِ نمو کا شناور ہوں میں
نیک و بد ہیں فقط اک سفینہ مرا

(۱۱)
میں تغیر پہ ایمان رکھتا ہوا
قالبِ این و آں سے گزرتا گیا
پتیاں، پھول، غنچے مرے پیرہن
میں ہر اک پیرہن میں سنورتا گیا

(۱۲)
میں ہوں تاریخِ عالم کی رُوحِ رواں
میرے دم سے ہے آرائشِ کل جہاں
یہ قرائیں، یہ طغرے، یہ تہذیب و فن
سب کے سب ہیں مری عظمتوں کے نشاں

(۱۳)
میں نے اہرام ڈھالے کچھ اس شان سے
پتھروں کو زمانے کی ضد کر دیا
میں نے اُدوار کے حسنِ سیال کو
سنگ کی گود میں منجمد کر دیا

(۱۴)
میرے حسنِ عمل سے چمکتی رہیں
بابل و رُوم کی خوشنما وادیاں
بستیوں میں رہیں ضو فشاں گری
دیومالا کی شب تاب شہزادیاں

(۱۵)
قصرِ شیریں مرے ذوق کا بے ستوں
تختِ جمشید میرا جلالِ نظر
میرے فن کی صباحت کے پیغامبر
تاج کے غرفہ و گنبد و بام و در

(۱۶)
ہیکلوں، خانقاہوں کا خالق ہوں میں
آبناؤں، خلیجوں کا معمار ہوں
کعبہ و بُت کدہ ہیں وراثت مری
میں ہی خاک و خلا کا علمدار ہوں

(۱۷)
خارزاروں کو میں نے زباں بخش دی
ندیوں کو سرودِ شبانہ دیا
وادیوں کو دیئے لالۂ و نسترن
جنگلوں کو صبا کا ترانہ دیا

(۱۸)
تختۂ گل کو میں نے صحیفے دیئے
ریت پر مُرتسم اسمِ اعظم کیا
چھال پر ہر علم و ہنر ثبت کی
کھال پر کارِ تحریر قائم کیا

(۱۹)
تابکاری شعاعوں کو تاثیر دی
پانیوں کی تہوں کو شکارے دیئے
جسم پیدا کیا عکس و آہنگ میں
رفعتِ آسماں کو غبارے دیئے

(۲۰)
جہل کی ظلمتیں جب ہویدا ہوئیں
میں کنول فلسفے کے جلاتا رہا
بن کے سقراط ہر مکتب شہر میں
زہر پیتا رہا ۔ مسکراتا رہا

(۲۱)
تجربہ گاہ تھی یا رصد گاہ تھی
میں گلیلی بھی تھا اور خیام بھی
میں نقیب شعور و امین خرد
میرے طالے سے ڈرتے تھے اوہام بھی

(۲۲)
انبیاء بھی اُٹھے تو مرے خیل سے
ہر پیمبر مرے دور سے منسوب تھا
جب بشر کی بزرگی پہ حرف آ گیا
ناصرہ کا مسیحا بھی مصلوب تھا

ق

ارض یثرب سے اک سرمدی ضو اُٹھی
دُور جس سے شبوں کا اندھیرا ہوا
جھلملا اُٹھے، اقصائے دشت و دمن
ظلمتوں کے اُفق پر سویرا ہوا

(۲۴)
چشمک خیل یا دار و گیر وطن
میل کب لا سکی میرے افکار پر
دم بدم میرا ایمان بڑھتا گیا
زندگی کی جہاں تاب اقدار پر

(۲۵)
میری نظروں میں سب آدمی ایک تھے
کوئی بھی امتیاز اب و جد نہ تھا
میری جہد بقا کے دساتیر میں
کوئی ابیض نہ تھا کوئی اسود نہ تھا

(۲۶)
جب بھی رسم غلامی کا چرچا ہوا
میرے آزاد ماتھے پہ بل آ گیا
میں نے سوداگران جفا کیش کو
منڈیوں میں چلیپا پہ کھنچوا دیا

(۲۷)
عفت گل رخاں جب بھی رسوا ہوئی
میں نے قانون تقدیس تو لکھ دیا
حسن کی تیرہ اوراق تاریخ پر
اپنے ہاتھوں سے عنوان ضو لکھ دیا

(۲۸)
محنتوں کے صلے میں جو فاقے ملے
بُوذری، مزدکی میرا ایمان تھا
کشت کاروں پہ جب ظلم ڈھائے گئے
اشتمال زمیں میرا فرمان تھا

(۲۹)
مدتوں گرچہ دنیا رہی تیغ زن
میرے دل میں رہی آشتی کی لگن
صف شکن جنگ بازوں کو ہر دور میں
میں نے دکھلائے تہذیب کے بانکپن

(۳۰)
زندگی کی علو بختیوں کے لئے
دیوقامت فصیلوں پہ لڑتا رہا
آدمیت کی تعمیر کے واسطے
میں عزازیل سے جنگ کرتا رہا

(۳۱)

آج بھی لڑ رہا ہوں کڑی دھوپ میں
زخمِ کشمیر ولاؤس کھائے ہوئے
آج بھی پھر رہا ہوں اُفق تا اُفق
اپنا غم طشتری میں سجائے ہوئے

(۳۲)

الجزائر کا غم، کوریا کا الم
ناگاساکی کی ویرانیوں کا ستم
ہو رہے ہیں کئی حادثے آج بھی
میرے احساس کی تختیوں پہ رقم

(۳۳)

آج کانگو لہو میں نہایا ہوا
پیشِ بزمِ مِلل محوِ فریاد ہے
آج کیوبا کی ہر وسعتِ خونچکاں
رستخیزِ عساکر سے برباد ہے

(۳۴)

میں جہادِ مسلسل کا بانکا جواں
آج بھی تازہ دم محوِ پیکار ہوں
جس جگہ بھی ہیں تخریب کی ظلمتیں
میں وہیں شمع بردارِ انوار ہوں

۳۵

میں ہی پرچمِ اُخوّت کا لہراؤں گا
میں جفا و شقاوت کا خوگر نہیں
مجھ کو معلوم ہے یہ دُغا کا چلن
آدمی کا ازل سے مقدّر نہیں

(۳۶)

اب کسی طرح مجھ کو گوارا نہیں
ہر فضا میں بپا شورِ زنجیر ہو
دختروں کے دوپٹے سروں سے گریں
مامتا ماؤں کی زیرِ شمشیر ہو

ق

کھیتیوں میں بموں کے دھماکے اُگیں
درسگاہوں میں پیدا اسلحشور ہوں
سیرگاہوں میں توپیں خراماں رہیں
بستیوں میں جواں زندہ درگور ہوں

(۳۸)

اَمن کی عشرتِ مستقل کی قسم
اَمن ہی اک نشاطِ جہانگیر ہے
جس میں آویزشِ مال و دولت نہ ہو
اَب وہ عہدِ نوی زیرِ تعمیر ہے

(۳۹)

پستیوں کی طرف اب نہ آؤں گا میں
ہے خلاؤں میں اب آشیانہ مرا
ایتھری موج میری نسیمِ سحر
مشتری و زُحل ہیں ٹھکانہ مرا

(۴۰)

میری ٹھوکر میں ہیں سب زمان و مکاں
کارِ تسخیرِ فطرت کا آغاز ہے
میں بنگاہِ ازل کی طرف ہوں رواں
میرا جذبِ دروں میرا دمساز ہے

(۴۱)

اَلمدد اے خداوند جانِ بشر
اَلمدد اے مجہدِ قلب و نظر
اَلمدد المدد صورتِ مشتہر
اَلمدد المدد جلوۂ مستتر

سردار جعفری

○

کام اَب کوئی نہ آئے گا، بس اِک دل کے سوا
راستے بند ہیں سب، کوچۂ قاتل کے سوا
باعثِ رشک ہے، تنہا روی رہروِ شوق
ہمسفر کوئی نہیں، دُوریِ منزل کے سوا
ہم نے دنیا کی ہر اک شے سے اُٹھایا دل کو
لیکن اس شوخ کے ہنگامۂ محفل کے سوا
تیغ منصف ہے، جہاں، دار و رسَن ہیں شاہد
بے گنہ کون ہے اس شہر میں قاتل کے سوا
جانے کس رنگ سے آئی ہے گلستاں میں بہار
کوئی نغمہ ہی نہیں شورِ سلاسل کے سوا

دو شعر

شوق کی راہ میں گُل اور کبھی خار ملے
ہم کو ہر رنگ کے ہر طرح کے دلدار ملے
دُھوم تھی شہرِ زلیخا کے شبستانوں کی
کتنے یوسف تھے کہ رُسوا سرِ بازار ملے

حمید نسیم

○

اَے گل اندام بہارِ خنداں
اے دلآرام علاجِ غمِ جاں
نازِ آذر ترے پیکر کے خطوط
خوابِ حافظ ترا رُوئے تاباں
تجھ سے کھلتا ہے ترا رنگِ قبا
نازشِ محفل خوشش پیرہناں
نگہِ ناز سے خوں موجِ شرر
رنگِ لب سے تپشِ شوق جواں
لبِ نازک پہ جھجکتا انکار
موجِ اقرار نظر میں رقصاں
تجھ سے رخشندہ مری شمعِ خیال
تجھ سے تابندہ مری خلوتِ جاں
اے نگارِ چمن آرائے حیات
تجھ سے گل رنگ مری شامِ خزاں
عمر بھر لفظ سجائے لیکن
ان میں یہ حسنِ خد و خال کہاں
تجھ کو دیکھا تو کھلا دل پہ یہ راز
کتنی بے مایہ ہے توفیقِ بیاں

سلیمان اریب

○

رنگِ عارض ترا کچھ اور نکھر آیا تھا
جب مرا غم ترے چہرے پہ اُبھر آیا تھا
ایک ملنے کے لئے تو جو نظر آیا تھا
چاند جیسے مری آنکھوں میں اُتر آیا تھا
حادثہ یہ ہے پلٹ کر بھی نہ دیکھا تو نے
حادثہ یہ نہیں تو مجھ کو نظر آیا تھا
یہ بھی اس دورِ ہوس میں ہے مری جان بہت
رات کا بھولا اگر صبح کو گھر آیا تھا
میں نے پھولوں سے صلیبوں سے محبت کی ہے
عشق میں تیرے یہ الزام بھی سر آیا تھا
تیری محفل میں سبھی صاحبِ اماں تھے مگر
میں ہی تیرے لئے با دیدۂ تر آیا تھا

۱ میں اسے جائز سمجھتا ہوں ۔ ادیب

سجاد باقر رضوی

○

ڈھونڈو جس کو وہ بے نشاں ہے
کہنے کو جہاں میں اک جہاں ہے
ویرانیٔ دل کا ذکر ہی کیا
یہ ایک طویل داستاں ہے
بس شعلۂ خس تھا شعلۂ دل
اب چار طرف دھواں دھواں ہے
کچھ کہہ تو رہی ہے شمع کی لو
سمجھو یہ زبانِ بے زباں ہے
پھر دل کو سکون مل رہا ہے
اے شورشِ درد تو کہاں ہے
اب زہرِ غمِ حیات پی لو
پھر لذتِ عمرِ جاوداں ہے
روٹھے تو منا و پیار کر لو
وہ دولتِ دل کا پاسباں ہے
سینے سے لگا کے اس کو رکھو
وہ مہر و وفا کا رازداں ہے
اب خواب میں اس سے لو لگاؤ
سو جاؤ وہ آج مہرباں ہے
آئینہ میں عکسِ ماہ رخ ہے
یا سینۂ سنگ ضو فشاں ہے
ہنس بول لو بیٹھ کر گھڑی بھر
پھر کوئی کہاں، کوئی کہاں ہے
گم کردہ کارواں تو میں ہوں
گم کردۂ راہ کارواں ہے
دریائے حیات موج زن ہے
باقر تجھے ڈوبنا کہاں ہے

محشر بدایونی

○

ہم اس ایک حلقۂ اختیارِ رہ و روش میں تو مر چلے
کوئی بابِ طوق و گلو کھلے کوئی رسمِ تیشہ و سر چلے

نہ رُکا تھا ایسا کبھی قافلہ کہ پڑے ہیں سوئے حدی سرا
کوئی تیز صوتِ جرس اُٹھے کوئی گرم یادِ سفر چلے

مجھے پوچھنا ہی پڑے گی آج یہ بات موسمِ دہر سے
اگر ایسی کوئی ہوا نہیں تو یہ زخم کیسے اُبھر چلے

نظر اس طرف بھی کہ شاید آج کے بعد وقت کا سیلِ خوں
مرے سر سے ہی نہیں تیرے دشنہ و تیغ سے بھی گزر چلے

رہِ تیشہ زن کا جو قرض ہے بڑی تشنہ سُرخیٔ فرض ہے
کوئی پیرہن کو شفق کئے ہوئے لاکھ خون میں تر چلے

یہ گھڑی بھی آنی تھی عشق پر کہ تمام حسنِ خیال کے
جو نبا قبا سے بہم کئے تھے وہ تار تار بکھر چلے

رفیق خاور جسکانی

○

خرمنِ یاد ہوا شعلہ بجاں سُنتے ہیں
دل کی گلیوں میں اک آہنگِ فغاں سُنتے ہیں
سُرخرو ہوتا ہے کون اب کے سرِ مقتلِ ناز
ایک آوازہ سرِ کوئے بُتاں، سُنتے ہیں
دل ہے یا قافلۂ زیست کی آوازِ جرس
دھڑکنوں سے خبرِ عمرِ رواں، سُنتے ہیں
شورِ آشوبِ زماں ہو کہ صفیرِ غمِ دل
تیرا ہی ذکر سرِ بزمِ جہاں، سُنتے ہیں
کیا ہوئے حسنِ لب و چشم کے اعجاز کہ اب
سرد ہے کارِ مسیحا نفساں، سُنتے ہیں
دل میں تو ایک ہی سناٹا ہے اے یاس ٹھہر
دیدۂ تر سے شبِ غم کا بیاں، سُنتے ہیں
اَب بھی باقی ہے یہاں کوئی تمنّا شاید
ایک آہٹ سرِ ویرانۂ جاں سُنتے ہیں

اظہر نفیس

○

تری نگاہ رہی ہم پہ مہرباں کیا کیا
مگر وہ ہم کہ رہے پھر بھی سرگراں کیا کیا

یہ بے قراریِ ہجراں، یہ اضطرابِ جنوں
ہمیں ملا ہے یہیں سے قرارِ جاں کیا کیا

کسے خبر ہے کہ تعبیرِ نو کی اس ذہن میں
ابھر رہے ہیں محبت کے گلستاں کیا کیا

تری نگاہ! کرم کے سوا کچھ اور نہ تھی
یہ اور بات کہ ہم کو رہے گماں کیا کیا

کچھ ایسا سہل نہ تھا کارِ خود فراموشی
سو ہم بھی کرتے رہے سعیِ رائیگاں کیا کیا

غمِ حیات سے بھاگے ہوؤں کو اے اظہر
ہوا ہے دردِ محبت بلائے جاں کیا کیا

خورشید احمد جامی

○

کہیں گلشن مہک اٹھے۔ کہیں تارے اتر آئے
مری راہوں میں۔ کتنے خوبصورت نامہ بر آئے
ملا کرتا ہوں جن سے دور خوابوں کے جزیرے پر
نہ جانے۔ کب تمہارا نام لے کر وہ سحر آئے
مرے اخلاص نے۔ دیکھا تو زخموں کے جھروکوں میں
بڑے مانوس چہرے غمگساروں کے نظر آئے
لہو تاریکیوں کا اور بہہ جائے تو۔ ممکن ہے
افقِ زارِ تمنا پر نیا سورج ابھر آئے
حسیں وعدے۔ حیات افروز لمحے۔ جھومتی شامیں
کہاں! تنہائیوں کو۔ یاد بچھڑے ہمسفر آئے
سنی ہیں بارہا انجان سی کچھ آہٹیں۔ لیکن
نہ غم کا چاند گہنایا نہ دل کے چارہ گر آئے
ہٹے جب ریشمی پردے تو ایوانِ بہاراں میں
تبسم کی جگہ کچھ کانپتے سائے نظر آئے
نہ دل اپنا نہ غم اپنے نہ کوئی آرزو اپنی
تم آئے بھی تو یہ کس حال میں کس موڑ پر آئے
کھلے کچھ پھول بھی دل میں تو جامی کس تکلف سے
پیامِ شوق بھی آئے تو کتنے مختصر آئے

حجاب امتیاز علی

میرے ایوانوں کے کھنڈر

کیسی اُداس شام ہے!

اب سورج نے دم توڑ دیا ہے، اور اندھیرا کسی درندے کی طرح منہ کھولے میری طرف بڑھتا چلا آرہا ہے۔ شام گہری ہوتی جاتی ہے۔ ساتھ ہی مرا غم ——— کہیں مجھے مالیخولیا نہ ہو جائے۔

ادھر کوئل کوکوکے جا رہی ہے۔ کیا وہ اپنی کوک بند نہیں کر سکتی؟ ——— یہ میں اس لئے پوچھ رہی ہوں کہ مجھے اس کی دلخراش کوکو بچپن کی یادوں یا بالفاظ دیگر ——— لاشعور کے تہہ خانوں سے وابستہ کر کے زندگی کے ان ایوانوں کی سیر پر مجبور کر دیتی ہے جو اب کبھی کے کھنڈر بن چکے۔ کھنڈر ——— ذرا ٹھہر جائیے۔ اس کے نام سے مجھے ایک ویرانی کا احساس ہوتا ہے۔ ویرانی! ہائے!!! ——— اے دل لوٹ چل۔ اب ان کھنڈروں میں کچھ نہیں رہا۔ یہ کل کے ایوان اور آج کے کھنڈر ہیں۔ لوٹ چل دیوانے!

تاڑ ناریل اور کیلے کے لہلہاتے ہوئے ایک وسیع باغ میں مغل طرز تعمیر کی ایک بلند عمارت کھڑی ہے۔ آج یہ کھنڈر ہے۔ مگر کل یہ ایوان تھے۔ یہ میرے بچپن کا گھر ہے' یہ وہ گھر ہے ——— جس نے ساری عمر خوابوں میں ایک ڈیولنے کتے کی طرح مرا تعاقب کیا ہے، یہ وہ کمرے ہیں، جہاں مری شعوری آرزوؤں نے جنم لیا۔ یہ وہ شہ نشین ہیں جنکے سایوں میں مرے لاشعوری اندیشے نشوونما پاتے رہے۔ یہ وہ جھروکے ہیں جن کی تنہائیوں میں میری ابتدائی عمر کے ذہنی دھچکے گھمبیر گھاؤ کی شکل اختیار کرتے رہے۔ یہ وہ پائیں باغ ہے، جس کی پُراسرار رومانی فضاؤں میں مرے دل داغدار کے گل لالہ کھلتے اور مرجھاتے رہے ——— ہاں! یہ وہی مانوس جگہ ہے جہاں میرا بچپن گزرا ——— دریائے گوداوری کا کنارا ——— خلیج بنگالہ کے ساحل ——— ! جہاں مرا بچپن گزرا اور جہاں میرے سارے ذہنی نقص اور کامپلکس پیدا ہوئے!

یہ مرے باپ کی لمبی کرسی ہے جس پر نیم دراز ہو کر وہ برسوں زندگی کو ترچھی نظروں سے دیکھنے کے عادی رہے۔

یہ مری ماں کی لکھنے کی میز ہے جہاں بیٹھ کر انھوں نے اپنی زندگی کی کہانیاں ناولوں کی شکل میں لکھیں۔

یہ مری بہن کی مطالعہ گاہ ہے۔ جن سے مجھے بے پایاں محبت ہے اور جن کے متعلق میں ہمیشہ بھول جاتی ہوں کہ وہ میری سوتیلی بہن ہے۔

یہ ہمارا مہمان خانہ ہے۔ جو سال کے بارہ مہینے میرے باعث قریبی رشتہ داروں کے دم سے آباد رہتا ہے جس کی چھت کے نیچے نفرت کے بیج بوئے جاتے ہیں عشق کی بیلیں

منڈلاتے جڑ بیٹھتی ہیں۔ غم و حرماں کی گھٹائیں اُٹھتی ہیں، بغض و حسد کے طوفان چلتے ہیں اور اُمید و مسرت کی ننھی ننھی شمعیں روشن کی جاتی ہیں۔

اور یہ —— ! یہ میری گڑیوں کا کمرہ ہے۔ جس میں بیسیوں گڑیاں مختلف رشتوں کی رکھی ہوئی ہیں۔ آپس میں ان گڑیوں کے وہی تعلقات ہیں جو میرے اپنے قریبی رشتہ داروں سے ہیں۔ محبت اور نفرت! دونوں شدید۔ دونوں گہری۔ دراصل اس زمانہ کمسنی میں مجھے اس بات کا علم نہ تھا کہ کسی جذبے کی شدت کیا معنی رکھتی ہے! یہ میں نہیں جانتی تھی کہ شدت جذبے کو کھوکھلا کر ڈالتی ہے اور یہ کھوٹ کی نشانی ہے۔

ان میں ایک گڑیا بالکل میری ماں جیسی ہے۔ دلکش خوبصورت اور خوش لباس۔ ایک میری بہن جیسی ہے اور ایک میرے باپ جیسی! جس گڑیا کو میں اپنی بڑی بہن سمجھتی ہوں اس کے متعلق میرا خیال ہے کہ ایک تو وہ گاتی بہت اچھا ہے دوسرے وہ آداب مجلس میں طاق ہے جس کا مجھ میں فقدان ہے۔ جو گڈا باپ ہے اس کے متعلق میرے خیالات ڈانواڈول ہیں۔ کبھی تو میں اس میں دنیا بھر کی خوبیاں دیکھتی ہوں —— کبھی سارے جہاں کی برائیاں۔ اس کشمکش خیال نے مجھے بے حد پریشان کر رکھا ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سی گڑیاں۔ جس میں خالائیں ہیں، ماموں ہیں، جوان ہیں بوڑھے ہیں۔ ان سب کے کردار کے متعلق میں پھر کبھی بتاؤں گی۔ فی الحال تو مجھے یہ کہنا ہے کہ میں نے اپنی ماں کی موت کے بعد قدرت کو مخاطب کر کے ایک سوال کیا تھا کہ حسن کو عشق سے جدا کر کے تجھے کیا ثواب مل گیا! —— یہ سوال آج تک تشنہ جواب ہی رہا اور میں زندگی کی منزلیں طے کرتی رہی۔ آفتاب نکلتے رہے۔ اور چاند ڈوبتے چلے گئے۔

تمہاری موت کے بعد آج پھر میں تمہارے کمرے میں داخل ہو رہی ہوں۔ لو —— میں نے پہلا قدم اندر رکھا ہے۔ سامنے پیانو پر تمہاری ایک بڑی دلربا سی تصویر رکھی ہے۔ دوسری طرف سنگھار میز پر عطر کی ایک شیشی کھلی ہوئی ہے سارے کمرے میں اس کی ہوشربا مہک رقصاں ہے۔

نہیں نہیں —— تم مر نہیں سکتیں۔ کیوں کہ تم محبت ہو۔ اس لئے نہیں کہ پرانے یونانیوں نے محبت کو ایک زندہ جاوید دیوتا کا رُوپ بخشا تھا۔ بلکہ اس لئے کہ تم محبت کرنا جانتی تھیں۔ اس لئے تم مر نہیں سکتیں —— میرے دیوانے دل نے سچ کہا۔ ہائے میرا دل۔ وہ ہمیشہ دیوانہ ہی رہا ہے اسے ہمیشہ اُلٹی باتیں ہی سوجھتی ہیں۔ وہ اب بھی تم کو زندہ سمجھنے پر مصر ہے۔ دراصل یہ میرا بہت پُرانا ذہنی مرض ہے جس کے لئے میں نے اپنا علاج بھی کرایا۔ مگر کلی طور پر شفا نہ پا سکی۔ مثلاً میرا سیامی بلّا عنبر مر گیا۔ لیکن میں اب تک اس کی نیلی آنکھوں میں زندگی کی درخشانی دیکھ رہی ہوں —— وہ میرے لئے آج بھی زندہ ہے جیسے کل تھا۔ انسان مسکرانے کے لئے سچ کو جھوٹ ثابت کرنے کی فکر میں ہوتا ہے۔ میں تلخ حقائق کو بمشکل قبول کرتی ہوں۔ میں نے تمام زندگی خواب کاری کے مزے لوٹنے میں گزار دی —— کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ مستقبل قریب یا بعید میں، انسانی کوششوں کی بدولت بنی نوع انسان پر ایک ایسا مبارک دن ضرور طلوع ہوگا جب انسان کی موت اور شاہراہوں پر گزرنے والے یہ ماتمی جلوس اور یہ جنازے عہد کہن کی بات ہو جائیں گے۔ انسان کو حیات جاوید نہ سہی۔ پر سائنس کی طرف سے صدیوں کی زندگی عطا ہو جائے گی۔ انسان طلوع و غروب کے نظارے صدیوں تک دیکھتا رہے گا۔ اور آخر ایک دن اس سے بھی اُکتا گیا تو کسی اور دنیا میں منتقل ہو جائے گا جہاں موت نہیں ہوگی۔ بلکہ ایک نئی دنیا میں ایک نئی زندگی کا پھر سے آغاز ہوگا ——

لیکن سوال یہ ہے بفرضِ محال اگر ایسا ہو بھی جائے تب بھی میں تمہیں کہاں سے لاسکوں گی! —— میں تو آج کا

انسان ہوں ۔ مجبور ۔ اور بے بس ۔ موت ابھی تک میرے گرد منڈلا رہی ہے ۔ اب تک انسان کی پیاس آبِ حیات کے گھونٹوں سے نا آشنا ہے ۔ ممکن ہے یہ الفاظ میں ختم بھی نہ کر سکوں اور موت کا شاہین مجھ پر حملہ آور ہو جائے ۔!

اس زمانے میں میرے حسن کا معیار اپنی ماں کا دلکش چہرہ تھا ۔ جس پر شگفتگی تھی اور زندگی کے لئے استقبال ۔ آج اتنے سالوں بعد بھی تم مجھے ایک خوبرو لڑکی کے روپ میں یاد آتی ہو ۔ کیونکہ میری آنکھوں نے تم پر بڑھاپے کی خزاں کو مسلط ہوتے نہیں دیکھا ۔ زندگی کا پھول ، حسین بہاروں میں مرجھا گیا تھا ۔ ہاں ۔۔۔ وہ بہاریں تھیں ——— اور میں سوچتی ہوں کہ پھولوں کو بہاروں ہی میں مرجھا جانا چاہیئے ۔ اس لئے نہیں کہ میں قنوطی ہوں ——— بلکہ شاید اس لئے کہ جانے والا اپنے پسماندگوں کی آنکھوں کے آگے اپنے حسن و رعنائی کی کلیاں بکھیرتا چلا جاتا ہے جن کی مہک پائیدار ہوتی ہے اور اس طرح وہ دنیا کے چوراہے پر اپنی یاد اور شخصیت کا وہ دوامی بت نصب کر جاتا ہے جس کے رنگ و روغن کو زمانے کے ظالم ہاتھ بھی اکثر نہیں مٹا سکتے ۔ کیونکہ دلربا یادوں کا یہ بت نہ صرف وقت کی شاہراہ پر ——— بلکہ انسان کے دل پر نصب ہو جاتا ہے !———

آج میرے ہاں مہمانوں کی آمد آمد ہے ۔ ہوائیں صندل کے درختوں اور کیوڑے کے جنگلوں میں سے گزر گزر کر آ رہی ہیں اس لئے معطر ہیں ۔ یہ ایشیائی جون کا ایک حسین و خوشگوار دن ہے ۔ میں آج صبح ہی سے سنگھار میں مصروفِ عمل اور کمتری کی دیمک مری شخصیت کو چاٹ رہی ہے ۔ میری دایہ نے میرے بالوں میں ایک گہرے آسمانی رنگ کا ربن باندھا ہے ۔ لیکن میں اس سے مطمئن نہیں ہوں ۔ میں دل ہی دل میں اپنا مقابلہ اپنی بڑی بہن سے کر رہی ہوں ۔ آنے والے مہمان نہ جانے میرے متعلق کیا رائے قائم کریں ۔ اندیشے میرے ننھے سے دل میں دھڑکنیں پیدا کر رہے ہیں ۔ میری بہن اپنے اعلیٰ اخلاق اور رسیلے گیتوں سے ان سب کو مسحور کر لیں گی ۔ اور میں ——— ! میرے پاس کوئی ایسا جادو نہیں ہے ۔ اس لئے میں انھیں اپنے بیش بہا لباس اور خوش نما سنگھار سے مرعوب کرنے کی کوشش کروں گی ۔

باورچی خانے کی طرف انواع اقسام کے طعاموں کے لذیذ کی اشتہا انگیز خوشبوئیں آ رہی ہیں ۔ لیکن میری بھوک بند ہے ۔ استقبالی کمروں میں باغبان نے شاداب پھولوں کے گلدستے لگائے ہیں ، لیکن میں مرجھائی جا رہی ہوں مجھے اپنے کھوکھلے پن کا احساس مارے ڈال رہا ہے ۔

وہ مہمانوں کی گاڑی صدر دروازے سے آ گئی ۔ ساتھ ہی میرا کمتری خولیا عود کر آیا ۔ میں مارے غیرت کے زمین میں گڑی جا رہی ہوں ۔ گھر کے سب لوگ خیر مقدم کے لئے بڑھ رہے ہیں ۔ میری ماں ۔ میری خالائیں ۔ میری بہن ۔ دایہ میری انگلی پکڑ کر مجھے آگے کو دھکیل رہی ہے لیکن میں پیچھے ہٹ رہی ہوں ۔ میں ان سب کو چھوڑ کر بھاگی بھاگی ایک قد آدم آئینہ کے آگے جا کھڑی ہوئی ہوں ۔ آنسوؤں کے موتی بے اختیار میرے رخساروں پر بکھر گئے ہیں ——— !

ابھی میں بچی ہوں ۔ خدا کی قائل ہوں ۔ جادو پر مرا ایمان ہے ۔ ہر قسم کے واہمہ کو سچ جانتی ہوں ۔ اس لئے اپنے نانا کی جانماز پر دعا مانگنے کھڑی ہو گئی ہوں ۔ اے خدا ۔ اے پیارے خدا ۔ مجھے آج بے حد حسین بنا دے ۔ مجھے داستانوں کی اس شہزادی کا روپ عطا کر جس پر شہزادے عاشق ہوا کرتے تھے ——— تاکہ میں اپنی بہن کے رسیلے نغموں اور اپنی نوجوان خالاؤں کے بیش قیمت لباسوں اور اپنی ماں کے حسن و جمال کا مقابلہ کر سکوں ———

لیکن خدا نے کبھی انسان کی بات سنی ہی نہیں ۔ اگر کبھی سنی تو اس لئے نہیں سنی کہ انسان نے التجا کی تھی ۔ بلکہ اس لئے سنی کہ نظامِ کائنات میں اس واقعہ کی ضرورت تھی ۔ اس لئے میں اپنا خدا آپ بن گئی ۔ میں نے اپنی روح

کو حسین سے حسین تر بنالیا۔ میرے اطراف حسن ہی حسن ہے۔ بہا کے یہ گہرے فیروزے رنگ کے آسمان۔ موجیں مارنے والا نیلگوں سمندر۔ خوبصورت تلیاں۔ حافظ و خیام کی غزلیں۔ عشق پیچاں بیلیں۔ موتیا سے جھکتے ہوئے پائین باغ۔ میلو کا وینس۔ چودھویں کا چاند —— غرض میرے لئے ساری کائنات مائکل انجیلو کی ایک بہت بڑی اور بہت حسین تصویر ہے۔ یہ میری تخلیق ہے یہ میری دنیا ہے۔ میں خالق ہوں۔ میں منصور ہوں۔ میں انا الحق کہتی ہوں۔ مجھے سولی پر چڑھا دو۔ میں بادلوں کے غاروں میں جا چھپوں گی۔ میں چاند کی بڑھیا کی اوٹ میں ہو جاؤں گی۔ میں صبح کے اُجالوں اور شام کے اندھیروں سے بہت دُور نکل جاؤں گی۔ آپ میرا پیچھا نہیں کر سکیں گے۔

اور اب مہمان دروازہ کھول کر اس ایوان میں داخل ہو رہے ہیں جہاں میں دم بخود کھڑی ہوں۔ میں اپنے آپ کو بے حد ناچیز محسوس کر رہی ہوں۔ کائنات بہت بڑی ہے اور میرا وجود بہت چھوٹا ——!

مہمان میرے بالکل قریب پہنچ گئے ہیں۔ ان میں سے ایک نے جھک کر میری پیشانی چومی دوسرے نے مجھے گود میں اُٹھالیا۔

"کتنی پیاری بچی ہے!" کسی کو اپنے متعلق رائے زنی کرتے ہوئے میرے کانوں نے سُنا لیکن میرے دل نے یقین نہ کیا "یہ لوگ مجھے دھوکا دیتے ہیں" میں نے سمجھا

"تم بہت ہی پیاری ہو —— بات کرو ہم سے" یہ کسی نے میرے کان میں کہا۔

لیکن میں پھر بھی چپ رہی۔ کیونکہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ سب فریب ہے۔

"ارے تم چپ کیوں ہو۔ گونگی ہو؟" کسی نے ایک تیز طنزیہ قہقہے کے ساتھ مجھ پر نشتر زنی کی۔

"یہ لڑکی ہے یا بت؟" ایک اور چاہنے والے نے کہا۔

"بہری اور گونگی معلوم ہوتی ہے"

پھر قہقہوں نے کمرہ سر پر اُٹھالیا۔

آخر آگئے نا اپنی جبلت پر! —— میرے دل نے ان پر نفرین کی۔

"میں پھولوں سے باتیں کرتی ہوں۔ میں بلیوں کو اپنا ہم جنس تصور کرتی ہوں۔ تم —— تم انسان ہو انسان —— مجھے کاٹ کھاؤ گے۔ پرے ہو —— اور میں روتی ہوئی انسانیت سے دُور بھاگ گئی —— میں اتنی دور نکل گئی ہوں کہ یہاں نہ صبح کے اُجالے ہیں نہ شام کے دُھندلکے۔

اپنی حیاتِ رفتہ کے واقعات پر غور کرتی ہوں تو سوچتی ہوں زندگی کے ان ڈھلوانوں پر کئی دفعہ دھوپ چمکی۔ کئی دفعہ سائے لرزے۔ میں دھوپوں کا ذکر کروں یا سایوں کا؟ چلئے۔ کسی سمت بھی انگلی اُٹھا کر اشارہ نہیں کرو[ں گی] اُدھوری کہانی سُناؤں گی۔ کیونکہ زندگی کی کہانیوں کے اُدھورے پن میں بھی تکمیل کا ایک پہلو نکل آتا ہے۔

یہ میرے باغ کی دیوار ہے۔ جس کے سائے میں بیر[بہوٹی] مٹی کے گھروندے بنائے ہیں۔ یہ املی کا وہ پرانا پیڑ ہے جس [کے] پتے پتے پر قصہ پارینہ مرقوم ہے۔ اس درخت کے نیچے باغ کی دیوار میں ایک پرانی وضع کا دروازہ لگا ہے۔ یہ مرے باغ کا چور دروازہ ہے —— جسے دیکھ کر میں [نے] اپنے نہاں خانۂ دل میں بھی ایک چور دروازہ لگانے کی ترغیب محسوس کی ہے۔ یہ کھلنے اور بند ہونے والی لکڑی کا دروازہ میرے لئے ایک گنجینۂ اسرار ہے۔ اس سے مجھے جتنی دلچسپی ہے۔ اتنی ہی دہشت اور اتنا ہی خوف بھی ہے اس لئے کہ میں نے اس میں سے ماضی کی کئی ایسی شخصیتیں آتی اور جاتی دیکھی ہیں جن کے قدموں کے نشان مرے حافظے کی زمین پر ہمیشہ کے لئے کندہ ہو گئے۔ جن کا میں جگہ جگہ ذکر کروں گی۔ مثلاً ایک دفعہ میں نے اسی دروازے سے ایک سپیرے کو داخل ہوتے دیکھا۔ اس کے کندھوں پر دو لمبے لمبے سیاہ اژدھے چمٹے ہوئے تھے۔ سپیرے نے ایک

اُبھر کر کہا تھا کہ یہ سانپ دراصل پرانے زمانے کے دو حسین اور معتوب شہزادے ہیں۔ دو ہزار سال گزرنے پر وہ پھر شہزادے بن جائیں گے۔ مگر سوال یہ ہے کہ دو ہزار سال گزرنے پر۔ یہ دنیا کس قسم کی دنیا ہوگی؟ اور اس میں بسنے والے انسان کس رنگ رُوپ کے ہوں گے؟ وہ مذہبی ہوں گے یا منتقی؟۔۔۔۔ زندگی اور محبت کے متعلق ان کے کیا نظریات ہوں گے؟ کیا وہ بھی ہماری طرح زکام میں مبتلا ہوں گے؟ سرطان کا سانپ انھیں بھی ڈسے گا؟ ان کا دل بھی تھکے ماندے مسافر کی طرح چلتے چلتے۔

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے۔

کہہ کر رُک جایا کرے گا؟ —— یا وہ ایک ایسی دنیا ہوگی جس کی دکانیں ستاروں کی گزرگاہوں میں کھلیں گی؟ اور جس کے گالف لنکس چاند کے میدانوں میں ہوں گے؟؟!

کسے معلوم۔ کون جواب دے!

اور وہ شہزادے کس ملک کے شہزادے ہوں گے؟

—— کہیں اس حسین ملک کے تو نہیں جس کا ذکر توریت مقدس میں ایک جگہ آیا ہے:-

"یعقوبؑ قدم اُٹھا کر پوربی لوگوں کے ملک میں پہنچا اور اس نے نظر کی اور کیا دیکھا کہ میدان میں ایک کنواں ہے۔ اور کوئیں کے نزدیک میں چرواہے اور تین گلے بیٹھے ہیں۔ کیونکہ وہ اسی کنوئیں سے گلوں کو پانی پلاتے تھے۔ اور کنوئیں کے منہ پر ایک بڑا پتھر دھرا تھا۔ اور جب گلے وہاں جمع ہوتے، تب وہ اس پتھر کو کنوئیں کے منہ پر سے ڈھلکاتے تھے۔ اور بھیڑوں کو پانی پلا کر اس پتھر کو اس کی جگہ پر رکھ دیتے تھے۔

تب یعقوبؑ نے ان سے کہا کہ میرے بھائیو! تم کہاں کے ہو؟؟؟"

یعنی کس ملک کے؟

کیا ان دو سانپ شہزادوں کا وہی ملک ہوگا؟ —

نہیں نہیں —— مری جبلّت پکار کر کہتی ہے کہ ہرگز نہیں نہ کنواں ہوگا۔ نہ چرواہے! شاید وہ ملک ایسا ملک ہوگا جہاں کا انسان موت کے متعلق یوں حیرانی سے سوچے گا جیسے آج ہم حیاتِ ابدی کے متعلق سوچتے ہیں اور بیماریوں کے متعلق یوں تعجب سے سُنے گا جیسے آج ہم جن و پری کے قصے سنتے ہیں۔ وہاں زندگی ایسی سہانی ہوگی جیسے گرمیوں کی دلربا سہ پہر!

اس دروازے پر املی کا ایک بوڑھا درخت سایہ فگن ہے۔ اس کی گہری سبز چھاؤں میں میں نے اپنے بچپن کے رفیقوں کے ساتھ گرمیوں کی بے شمار دوپہریں گزاری ہیں۔

اسی زمانے میں میں نے صبح کاذب کے وقت ایک منحوس سا خواب دیکھا جس کی یاد برسوں مجھے سہاتی رہی۔ گرمیوں کے دن تھے۔ اور میں موتیا کے پھولوں سے مہکتے ہوئے پائیں باغ میں سو رہی تھی کہ میرے کانوں نے ہتھوڑوں کی آواز سنی۔ پھر میں نے خواب دیکھنا شروع کر دیا —— کہ ایک غمزدہ عورت کی ہڈیوں کو آریوں سے کاٹا جا رہا ہے۔ میری آنکھ کھل گئی۔ خواب کے جزیروں سے حقیقت کی دنیا میں پہنچنے کے باوجود ان بھیانک آوازوں نے میرا پیچھا نہ چھوڑا تھا۔ میں گھبرا کر اٹھی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ باغ کے چور دروازے پر جو املی کا پیڑ سایہ فگن تھا اسے کاٹا جا رہا ہے —— یہ سن کر میں ذم بخود رہ گئی تھی۔ یوں معلوم ہونے لگا جیسے یہ لوگ درخت کو نہیں —— مجھے کاٹ رہے ہیں۔ میں تمام دن سہمی سہمی رہی۔ شدتِ احساس مجھے کچلتا رہا۔ اس دن کے بعد زندگی کے متعلق میرے نظریے بہت کچھ بدل گئے۔ زندگی فانی۔ اور موت یقینی معلوم ہونے لگی۔ دراصل وہ درخت میرے لئے محض درخت نہ تھا۔ ایک شفیق باپ

کا وجود رکھتا تھا۔ اس دنیا میں ہم بہت کم چیزوں کو اس
کی اصلیت میں دیکھتے ہیں۔ ہمارے لئے اکثر چیزیں کسی
اور چیز کی علامت بن جاتی ہیں۔ مثلاً میں نے ایک سفید
ریش بزرگ کو دیکھا کہ وہ ایک لکڑی کے ٹکڑے کی پرستش
کرتے تھے جس پر کسی فرشتے کی تصویر کندہ تھی۔ کیوں۔؟
کیوں کہ وہ ان کے لئے صرف لکڑی پر کندہ فرشتے کی شبیہ
نہ تھی۔۔۔

ابھی میں یہ ساری باتیں سوچ ہی رہی تھی کہ
اچانک سورج نے دم توڑ دیا اور فضا کے گھاٹ اُتر گیا۔
ہائے ہائے اندھیرا دم بہ دم لحظہ بہ لحظہ منہ کھولے درندے کی
طرح میری طرف بڑھا چلا آرہا ہے۔۔۔۔ "نجانے اس کائنات
میں اندھیری راتیں کیوں آتی ہیں" میں نے اپنے دل میں
سوچا ــــ بہت سی باتیں آدمی اپنے دل میں سوچا کرتا ہے۔
چنانچہ میں نے بھی یہ بات اپنے دل میں سوچی۔ اور ایک
ٹھنڈی آہ بھر کر دریچے میں جا کھڑی ہوئی۔ اور اندھیرے کے
سیلاب کو دیکھنے لگی جیوں معلوم ہوتا تھا جیسے ساری کائنات
اور موجودات کائنات کو نگل چکا ہے ـــــ ہائے نہ جانے
اس کائنات میں یہ اندھیری راتیں کہاں سے آجاتی ہیں ـــ"
میں نے دوبارہ سوچا۔ کیا اس لئے کہ ہم چیزوں کی درخشانی
سے محروم رہیں اور ان کے لئے للچائیں؟؟ ـــ لیکن یہ فلسفہ
غلط ہے۔ منطق یہ ہے کہ اندھیرے میں روشنیوں کا خیال
زیادہ آتا ہے۔ شکم سیر آدمی کو خیرمال کا خیال نہیں آتا جو
بھوکا اور مفلس ہے جو اسے دیکھ کر ہی تڑپ اُٹھتا ہے۔ میں
نے سوچا زندگی کے غموں میں مسرت و شادمانی کا فقدان خواہ
انسان کو غم واندوہ سے لطف اندوزی کا عادی بنا دے۔ مگر
حصول مسرت کی تمنا اس بدنصیب کے جسم وجان میں کہیں نہ
کہیں ایک علیحدہ روح ضرور بنائے رہتی ہے۔

صبح شام۔ اندھیرا اُجالا۔ غم و شادمانی۔ یہ ساری چیزیں
ہماری زندگی کی بہنے والی ندی کی لہریں ہیں۔ پانی سے
لہروں کو کوئی جدا نہیں کر سکتا۔ اور اگر کوئی جدا کرنے کی سعی
کرے تو وہ دیوانہ ہے۔ مجنوں ہے۔

ایسے ہی ایک مجنوں کو میں نے دیکھا تھا۔ وہ ایک
فلک شگاف عمارت کے آگے کھڑا اس عمارت کے مالک
کو فحش گالیاں دے رہا تھا اور زور زور سے کہہ رہا تھا۔
"اس نے ہم غریبوں کے حقوق غصب کر کے یہ فلک بوس
عمارت کھڑی کی ہے۔ آج ہی میں کارخانے کے مزدوروں
کا ایک جلسہ کر کے اسٹرائک کا بندوبست کرتا ہوں" اور
وہ غصے کی تلوار ہاتھ میں اُٹھا کر اسٹرائک کرانے چلا گیا۔
نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ مزدوروں کی ایک دن کی مزدوری کٹ
گئی اور دونوں طرف دونوں دلوں میں طبقاتی کدورتیں
اور نفرتیں برسات کی گھٹاؤں کی طرح اُمنڈ آئیں۔

پھر ایک ڈھیلے کرتے اور لمبے بالوں والے انٹلکچول
کو میں نے دیکھا۔ وہ چہرہ سرخ کئے۔ گلے کی رگیں پھلائے
امیروں کو گالیاں دے رہا تھا۔ ان سب کے تختے الٹنے
کی تجویزیں سوچ رہا تھا اور یوں دنیا کو یقین دلا رہا تھا
جیسے اس کی زندگی کا مقصد امیروں کی گردنیں مروڑ کر
غریبوں کی جھولیاں بھرنا ہے۔ پھر اسے کسی اتفاق سے ایک
کارخانے میں بہت بڑی جگہ مل گئی۔ اچانک اس کی زندگی
کا مقصد بدل گیا۔ اس کا زاویہ نگاہ ہٹ گیا۔ اس کا لباس
اس کے خیالات؛ اس کے بال۔ اس کا دل اور اس کا دل
ایک جھٹکے میں بدل گئے ـــ سوال یہ ہے۔ کیا اس قسم کے
پرشور انسان اندھیروں اور اجالوں کو اپنے قابو میں کر سکتے
ہیں؟ کائنات میں اندھیری راتیں آنی بند ہو جاتی ہیں؟
کیا واقعی ان کے دل میں امیروں کے لئے نفرت، اور غریبوں
کے لئے ہمدردی و محبت کے دریا بہہ رہے ہوتے ہیں؟ جس
انسان کے دل میں محبت نہ ہو۔ محض غصہ اور انتقام کی
آگ جل رہی ہو ـــ وہ بھلا کائنات کو نور کی چادر میں
ڈھال سکتا ہے ـــ!! نہیں۔

میں رات کی تاریکی سے ڈر گئی۔ میں لوٹ کر شام کے
دُھندلکے میں جا پہنچی۔ دریچہ کھول کر باہر جھانکا۔ باہر ایشیائی
اگست کی گہرے کاسنی رنگ کی شام جلوہ گر تھی۔ ہواؤں
میں سونف کی کلیوں کی مہکتیں آوارہ تھیں۔ اور ایک خوش
دل ابابیل صندل کے درخت کی پتلی سی ٹہنی پر بیٹھی نہ جانے
کیوں ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔ شہتوت کے پتوں
کی اوٹ میں ایک چیڑا اپنی منگیتر چیترا کے کان میں جھک
کر کچھ کہہ رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا تھوڑی دیر کیلئے انسان
نے زندگی کے سارے دکھوں کو بھلا دیا ہے اور ساری
کائنات اس کے ساتھ راک این رول میں مصروف ہے۔

اتفاق سے میرے دل کی کلی بھی کھل گئی۔ اس گہرے
کاسنی رنگ کی ایشیائی شام میں میں اپنی حویلی کی تیسری منزل
میں عرشۂ چمن پر بیٹھی ایک شعر سوچنے اور آئس کریم کھانے
لگی۔ مجھے زندگی کتنی سہانی معلوم ہو رہی تھی اس گھڑی!
میں ہلکے گلابی رنگ کی بلوریں چھت کے زیر سایہ ایک
منقش صندلی کوچ پر دریائی طوطوں اور سمندری حواصلوں
کے پروں سے بھرے ہوئے گداز کشن کا سہارا لئے شعر
سوچ رہی اور آئس کریم کھا رہی تھی —— عیش و راحت
کے یہ لمحات مجھے قدرت نے کچھ چھپڑ پھاڑ کر مفت عطا نہیں
کئے تھے۔ سالہا سال محنت و مشقت کی دوزخ میں سے گزر
کے یہ جنت میں نے اپنے لئے مہیا کی تھی۔

لیکن —— میری محنت و مشقت سے حاصل کی ہوئی
اس مسرت و عشرت کی فضا کو ایک مکروہ چیخ نے مرتعش کر دیا۔

مجھے بے حد غصہ آیا "یہ کون ہے یہ گستاخ؟"

"نیچے باغ میں ایک ملاقاتی کھڑا ہے اور آپ سے
کوئی ضروری بات کرنا چاہتا ہے" میری خادمہ نے کہا۔

"میں برا مان کر بولی "لیکن تم نے اس سے کہا نہیں
کہ اس وقت میں تیسری منزل کے عرشۂ چمن پر بیٹھی شعر
سوچ رہی اور آئس کریم کھا رہی ہوں؟"

"کہا تھا" خادمہ نے کہا

"پھر؟" میں نے آئس کریم کا ایک چمچہ کھاتے کھاتے
بدمزگی سے پوچھا

"وہ کہتا تھا۔ آئس کریم کھانا اور شعر سوچنا زندگی
کے مقاصد نہیں۔ اس لئے آپ سے ملنا چاہتا ہے"

میں بولی: "مگر میں سمجھتی ہوں کہ انسان کے لئے
آئس کریم کھانا اور شعر سوچنا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا
ہل چلانا اور اناج بونا —— کیونکہ انسان کی زندگی میں فقط
دوزخ ہی نہیں۔ اس میں جنتیں بھی آباد ہیں۔ جو آدمی
جنت کو چھوڑ کر اپنی تعمیر کردہ دوزخ ہی میں رہتا ہے وہ
خدا اور انسانیت دونوں کا دشمن بن جاتا اور پھر دیابن
کر وہ واعظ بن جاتا ہے اور قدرت کی عطا کی ہوئی جنت
میں رہنے والوں پر اپنی گالیوں اور بددعاؤں کے پتھر
برساتا ہے"

خادمہ نے میری طرف خالی خالی نظروں سے دیکھا
بولی: "تو اس سے جا کر میں کیا کہوں؟"

میں اسے سمجھانے لگی: "تم اس سے جا کر کہو کہ میں
زندگی میں دوزخ اور جنت دونوں کی قائل ہوں، محض
دوزخ کی نہیں۔ دیکھو، اس وقت میں دیوان غالب پڑھ
رہی ہوں۔ شام کا رنگ کاسنی ہے۔ اور میں بیحد خوش
ہوں ایسے میں وہ خلل انداز نہ ہو"

میرا جملہ ختم بھی نہ ہوا تھا کہ ایک اور مکروہ چیخ نے
مجھے بے چین کر دیا۔ میں نے اکتا کر پوچھا: "وہ چاہتا
کیا ہے آخر؟"

"آپ سے ملنا چاہتا ہے" خادمہ نے بتایا

میں نے کہا: "تم اس سے جا کر کہہ دو۔ اس وقت
میں اپنی زندگی میں گہری دلچسپی لے رہی ہوں"

اور یہ سب سے بڑا ثواب ہے کہ آدمی اپنی زندگی میں دلچسپی لے۔ یہ لمحے ایک انسان کو مشکل سے میسر آتے ہیں"

"لیکن وہ پھر بھی آپ سے ملنے پر مُصر ہے۔ کہتا ہے کوئی بہت ضروری کام ہے"

میں بادلِ ناخواستہ اپنی جنت سے باہر نکلی۔ وہی احساس ہوا جو ایک ایرکنڈی شنڈ کمرے سے باہر دھوپوں میں نکل کر ہوتا ہے۔ اس وقت مجھے خیال آ رہا تھا کہ انسان انسان کا دشمن ہوتا ہے۔ وہ انسان کو جنت سے نکال کر جہنم میں پھینکتا ہے اور الزام خدا پر دھرتا ہے۔

میں بڑبڑاتی ہوئی نہایت ناخوش نیچے پہنچی۔ صحنِ گلستان کا دروازہ کھول کر باہر نگاہ ڈالی۔ وہاں ایک مضبوط جسم کا جوان آدمی چیتھڑے لگائے ایک بوڑھی اندھی عورت کا ہاتھ تھامے کھڑا تھا۔

"کون ہو تم؟" میں نے پوچھا

"میں چند روپے مانگنے آیا ہوں" ملاقاتی نے اطمینان سے جواب دیا۔

"تم نے اپنے روپے میرے پاس رکھوائے تھے؟" میں نے پوچھا

"نہیں" اس نے بے پروائی سے کہا

"۔ تو میرے روپے مانگنے آئے ہو؟"

"۔ ہاں —— کیونکہ میں فقیر ہوں"

"لیکن میں نے تم کو فقیر نہیں بنایا"

"۔ مجھ پر رحم کرو۔ میں سائل ہوں"

"۔ تم نے اپنی مرضی سے یہ پیشہ اختیار کیا ہے۔ پھر رحم کا کیا سوال؟" میں نے خشکی سے کہا

"میرے ساتھ میری اندھی ماں ہے"

"گویا تم نے اپنی بوڑھی ماں کی نابینائی کو اپنا ذریعہ معاش بنایا ہے؟"

"میں چاہتا ہوں۔ تم میری مدد کرو" فقیر نے اونچی آواز میں کہا

"۔ تم چاہتے ہو کہ میں تمھاری مدد کروں۔ اس لئے تم نے ایک شریف شخص کو اس کی حویلی کے تیسرے عرشے سے ایسی حالت میں نیچے اترنے پر مجبور کیا جب وہ محنت و جفاکشی کے بعد اپنی زندگی میں پوری طرح دلچسپی لے رہا تھا۔ تم نے محض اپنی غرض کے لئے اسے پریشان کیا۔ کیا یہ انصاف ہے"

وہ کرخت لہجہ میں بولا: "ہاں۔ یہی انصاف ہے ورنہ تم تباہ ہو جاؤگی"

"محنتی آدمی کبھی تباہ نہیں ہوتا ——" میرے وثوق سے کہا

"۔ لیکن خدا تمہیں تباہ کرے گا" فقیر نے کہا

میں حیران ہو کر بولی: "کیوں؟"

وہ بولا: "کیونکہ —— آنکھیں کھول کر دیکھو۔ میری ماں ضعیف اور اندھی ہے!" اس نے مجھ پر گویا احسان دھرا

"۔ لیکن تم بھی کان کھول کر سنو۔ اسے میں نے ضعیف یا بیمار نہیں بنایا"۔ میں نے غصے سے کہا۔

"میں فقیر ہوں" وہ چیخا

"تم مجرم ہو ——" میں نے کہا: "جانتے ہو فقیر ہونے کے کیا معنی ہیں؟ سستی۔ کاہلی۔ آرام طلبی۔ بے غیرتی۔ بے شرمی۔ تم زندگی میں صرف جنت کے قائل ہو۔ دوزخ تمھاری بلا جانے۔ تم بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے آرام سے زندگی بسر کرنے کے قائل ہو۔ تم چاہتے ہو کہ محض فقیر ہونے کے صلے میں تمہیں میری کمائی ہوئی دولت کا وہ حصہ ملے جسے میں نے دوزخ کی سختیاں جھیل کر پایا ہے۔ اس طرح تم چور اور بدطینت ہو"

وہ گلا صاف کر کے بولا: "لیکن سائل کو واپس کرنا گناہ ہے؟"

میں خشکی سے بولی: "میرے نزدیک گناہ کا تصور کچھ

اور ہے"

"۔ اس وقت میں کچھ مانگنے آیا ہوں"

"۔ لیکن میں کچھ دینے پر آمادہ نہیں ہوں۔ اور دل بھی کیوں؟ تمھارا خیال ہے کہ یہ اُونچی محلسرائے۔ یہ پھولوں سے مہکتے ہوئے عیش باغ۔ یہ چمن پر سایہ فگن مرشے پیاری چیزیں کسی نے مفت مجھے دے ڈالی ہیں؟ یا تمھاری طرح میں نے دوسروں کی کمائی میں سے خیرات مانگ مانگ کر اکٹھی کی ہیں؟ یا میں نے ڈاکہ ڈال کر حاصل کی ہیں؟ یہ میرے دادا نے۔ میرے پر دادا نے۔ میرے باپ نے میں نے خون پسینہ ایک کیا ہے تو یہ جنت خریدی ہے۔ بے حیا انسان۔ تم صرف عشرت اور مفت کی جنت کے قائل ہو لیکن ہم جہنم سے گزر کر اپنی جنت میں داخل ہوتے ہیں۔ تم دنیا کے لئے لعنت ہو۔ تم خوش ہو کہ تمھاری ماں اندھی ہے۔ تم پھولے نہیں سماتے کہ تمھارا بیٹا اپاہج ہے۔ تم اس بات پر نازاں ہو کہ تم اپنے ہاتھ پاؤں پر نقلی زخم پیدا کر کے امیروں کو دھوکا دے سکتے اور ان کی کمائی کے حصہ دار بنتے ہو۔ دراصل تم پرلے درجے کے شقی القلب اور خود غرض انسان ہو۔ میں نے پھٹ سے دروازہ بند کر دیا۔

لیکن قابل رحم فقیر نے اپنی پوری طاقت سے دروازہ پیٹنا اور چلانا شروع کر دیا:۔" میں تم کو بد دعا دیتا ہوں۔ میں فقیر ہوں۔ میری بد دعا تمھیں تباہ و برباد کر دے گی۔ تم امیر لوگ اپنے سینے میں دل نہیں رکھتے۔"

"۔ لیکن اپنے سر میں دماغ رکھتے ہیں۔ سمجھے؟ بغیر دماغ کے دل کی کوئی حیثیت نہیں۔ تم چاہتے ہو کہ ہم اپنا دماغ مفلوج کر لیں۔ صرف سینے میں دل رکھیں۔ جس میں صرف جذبات ہوتے ہیں منطق نہیں ہوتی۔ اگر اس وقت تم میرے سامنے سے ہٹ نہیں جاؤ گے تو ممکن ہے کہ میں تمھیں روپیہ دینے کی بجائے بڑے زور سے تمھارے منہ پر ایک تھپڑ رسید کر دوں" میں نے دوبارہ دروازہ کھول کر غصے سے کہا

فقیر گستاخی پر اتر آیا:" کل قیامت کے دن خدا تمھیں تھپڑ لگائے گا"

میں نے کہا:" میں آج کے تھپڑ کی قائل ہوں۔ میں آج کا ذکر کر رہی ہوں۔ کل آئے۔ نہ آئے"

فقیر چلانے لگا:" تم گناہ گار ہو"

میں بولی:۔" تم جیسے نکموں نے اپنے سے بہتر حالات میں زندگی بسر کرنے والوں کو ہدف ملامت بنانا اپنا شعار بنالیا ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ اگر خوش حال ہیں تو وہ تمھارے خون کی کشید گی کے ذریعہ اس درجے کو پہنچے ہیں۔ بدبخت انسان! تم لوگ یہ نہیں سوچتے کہ اس قسم کے خیالات محض تمھاری حاسد اور نکمی فطرت کی تخلیق ہیں۔ اصلیت اور حقیقت بالکل جدا ہے۔ تمہیں بنی نوع انسان کی زبوں حالی اور مفلسی کا غم نہیں ــــ غم ہے تو اس بات کا، کہ اس شریف اور محنتی آدمی نے یہ دولت کیوں کمائی؟ تم یہ نہیں چاہتے کہ تم آباد ہو۔ تمھاری تمنا یہ ہے کہ دوسرا برباد ہو جائے۔ اس قسم کے لوگ ہماری معاشرت میں بہت ہیں۔ لیکن کبھی تم لوگوں نے دوسروں کی خوشحالی پر ماتم کرنے کی بجائے اپنے دست و بازو سے کچھ کمانے کی فکر بھی کی؟ تم لوگوں کی ساری توانائی اُونچی عمارات کو ڈھانے کی آرزو میں ختم ہو جاتی ہے۔ تمھارا خیال ہے کہ اس قسم کی تخریب اختیار کر کے تم بنی نوع انسان اور اس کی انسانیت کے معمار کہلاؤ گے احمق آدمی۔ یہ غلط ہے۔ سراسر غلط ہے"

فقیر نے آسمان سر پر اُٹھالیا۔ چلّا چلّا کر بد دعائیں دینے اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

دیکھتے دیکھتے قوم کے کئی رحم دل اور خدمت خلق کے دعوی دار میرے دروازے پر جمع ہو گئے۔

مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح ان کی مختلف غصیلی آوازیں آرہی تھیں:۔

":۔ ان اُونچی محلسراؤں میں کتنے نیچے درجے کے لوگ رہتے ہیں"

" یہ پیسے والے بڑے کنجوس ہوتے ہیں"

" ایک پیسے کی بات تھی"

" غریب کا بھلا ہو جاتا"

":۔ سائل کو واپس کرنا بڑا گناہ ہے"

":۔ ہوں ۔ اُونچی دکان ۔ پھیکے پکوان"

":۔ ان لوگوں کو خدا کا خوف چھو کر نہیں گیا"

سب سے آخر میں ایک پرہیزگار اور انسانوں کے درد مند خادم نے فرمایا ۔ پھر بڑے فخر سے ہاتھ اپنے جیب میں ڈال کر ایک سکہ نکالا ۔ اسے کن انکھیوں سے دیکھ کر جلدی سے واپس جیب میں ڈالا ۔ تیسری جیب سے اکنی نکال کر بے حد پیار سے فقیر کی طرف بڑھائی :۔" لو ۔ روٹی کھاؤ"

فقیر نے ہاتھ بڑھا کر سکہ لیا ۔ پھر غضبناک ہو کر زمین پر پھینک کر بولا :۔" ایک آنہ ! ہوں"

رحم دلی کے دیوتا کو غصہ آ گیا ۔ اس نے بڑھ کر فقیر کو ایک چانٹا رسید کیا اور جُھک کر اپنی اکنی زمین پر سے اُٹھالی ۔ اپنے ڈھیلے ڈھالے کرتے کو سنبھالتا اور اپنے لمبے چکدار بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا ایک اخبار کے دفتر میں چلا گیا تاکہ وہاں بیٹھ کر ایک گلاس مفت شربت پئے اور پھر پیسے والوں کی شقی القلبی پر ایک بسیط مضمون لکھے ۔

اب شام کا رنگ گہرے گلابی رنگ کا ہو گیا تھا ۔ باغ کی شکستہ دیوار کے پاس ایک گُل سوسن شاہ کی ہواؤں میں جھوم رہا تھا ۔ اور کوئل کوکے جا رہی تھی ۔ کوکے جا رہی تھی ، کوکو ۔ کوکو ۔

میں سوچنے لگی یہ کائنات بھی کتنی حسین ہے ! یہ گلابی رنگ کی شامیں ۔ بہار کی قرمزی دوپہریں ۔ راتیں میں دمکتی ہوئی کہکشائیں ! ——— اور

"ہم نے تمہارے اوپر سات آسمان بنائے
ایک انداز کے ساتھ آسمان سے پانی برسایا
پھر اس کو ٹھہرائے رکھا ......
پھر اس کے ذریعے سے ہم نے تمہارے لئے
کھجوروں اور انگوروں کے باغ کھڑے کئے"
(قرآن مجید سورۃ المومنون)

میں پھر سوچنے لگی ہائے ہائے ۔ انسان کو کیسی کیسی جنتیں عطا ہوئی ہیں !! ۔

(باقی باقی)

راولپنڈی میں گلڈ کا مذاکرہ

راولپنڈی سب ترکن نے طویل تعطل کے بعد اپنی ادبی سرگرمیوں کا آغاز کر دیا ہے ۔ چنانچہ جولائی میں پریس کلب میں ایک مذاکرہ منعقد ہوا جس کا موضوع تھا " مزاحیہ ادب اور سماجی اصلاح " صدارت شوکت تھانوی صاحب نے کی ۔

بحث کی حدود متعین کرنے کے لئے ظہیر فتحپوری صاحب نے مقالہ پڑھا جس میں گزشتہ ایک صدی کے ادب کا جائزہ لیا گیا ، اس پر بحث ہوئی جس میں کرم حیدری صاحب ، ڈاکٹر وحید قریشی ، عباس احمد عباسی ، سید محمد جعفری اور جناب صدر نے حصہ لیا ۔

یونس رمزی

طوفان اور طوفان کے بعد——

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
کہ مشرقی پاکستان میں پھر طوفان آگیا۔

"طوفان کی ہلاکت خیزی کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ہوا کی رفتار سو میل تا چالیس میل فی گھنٹہ تھی۔ آمدہ اطلاعات منظر ہیں کہ کافی جانی اور مالی نقصان ہوا" ریڈیو کا ایک نشریہ!

"ریڈیو بدلو ڈارلنگ" خوشبو میں نہائی ہوئی مسز سکندر علی نے مسٹر سکندر علی سے کہا

"نیون سم میوزک!"

"مگر یہ تو ایک نہایت اہم خبر ہے۔ کافی اموات ہوئی ہیں"

"اچھا" مسز سکندر علی نے ناخنوں پر کیوٹکس کی سرخی بھری کرتے ہوئے کہا۔ مرمریں شانوں پر کھلے ہوئے بالوں کو شانہ اور سینٹ سپرے گردن اور کھلے ہوئے گریبان پر کرنے لگیں۔

"آؤ ڈیر کیبرے میں دیر ہو رہی ہے" مسز سکندر علی نے مسٹر سکندر علی کا ہاتھ پکڑ کے اٹھاتے ہوئے کہا اور وہ ریڈیو کو ویسے ہی چھوڑ کر اٹھ گئے لیٹسٹ ماڈل کی ڈاج دوسرے لمحہ ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ سکندر علی نے کار ریڈیو آن کر دیا۔ "نظام مواصلات تقریباً معطل ہو گیا ہے کراچی اور دوسرے ڈھاکہ اور چاٹگام جانے والے طیارے روک دیئے گئے——

چٹگام اور ڈھاکہ کے درمیان ٹیلی فون اور تار برقی کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے"

"نیون سم میوزک ڈارلنگ —— یہ پھر بکواس کیوں لے بیٹھے" —— مسز سکندر علی نے ہاتھ بڑھا کر ریڈیو بدل دیا۔

نائٹ کلب میں سیٹھ جھن جھن والا بڑی اضطرابی کیفیت میں لابی میں ٹہل رہا تھا۔ اور بار بار الاسٹک بو کھینچ رہا تھا جیسے اس کی گردن کسی ڈوری سے کستی جا رہی ہو۔

"سکندر علی بھائی بڑا گجب ہو گیا یار ——"

"کیا غضب ہو گیا؟ سکندر علی نے پائپ جلاتے ہوئے پوچھا۔

"ارے یار تیرے کو پتہ نہیں یہ سالا طوفان ایسٹ پاکستان کا پیچھا ہی نہیں چھوڑتا۔ ہم تو مر گیا۔ پچھلا نقصان ابھی پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ ——

"پھر طوفان ہو گیا —— ارے چھوڑو ان باتوں کو فی الحال رقص اور شراب سے جی بہلاؤ

"تیرے کو مسخری سوجھتا پڑا ہے" اپن تو مر جائے گا۔ سکندر علی بھائی مر جائے گا۔

اچانک سیٹھ جھن جھن والا کا گلا رندھ گیا۔ اور وہ

ے کلب کی عمارت سے نکل کر کار پارکنگ کی طرف بڑھنے

کلب کے وسیع ہال میں فراحی، سمینہ، اور شمزا ——
مشرقی رقص کا آئٹم پیش کر رہی تھیں۔ مسکراہٹوں کی
بھیگی چاندنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی سرخ ہونٹوں
غق لپک لپک کر لوٹ رہی تھی۔ خوبصورت عورتوں کے
ے آنے والی خوشبو بہت دھیرے دھیرے سرگوشی کر رہی
ور اس سرگوشی میں آرکسٹرا کی موسیقی ہم آہنگ ہو کر دل
یٹھی دھڑکن ایک درد، ایک لذت، ایک کسک بن گئی
۔ خوشبو جو چاروں طرف پھیلی تھی۔ بال بکھرائے اس حسین
ی کی طرح جو پی کر بہک جائے۔ جس کے بہکے ہوئے قدم
ن و آسمان کے درمیان خلاء میں پڑ رہے ہوں۔ یہ خوشبو
ی لذت آگیں تھی حسین مخروطی انگلیوں کی خوشبو، پھڑکتے
ے سُرخ نتھنوں کی گرم گرم خوشبو، اُٹھتے گرتے سینوں
وشبو، دل اور دل کے دھڑکن کی خوشبو، حسین پیراہن
شبو۔ آنکھوں کے پیغام کی خوشبو، تارنگہ کی خوشبو،
رٹ اور شراب کی خوشبو اور یہ تمام خوشبوئیں مل کر
، ایسا پل تعمیر کرتی ہیں جو انسانوں کو جنت تک لے جاتا
انسان مر کر زندہ اور زندہ ہو کر پھر مر جاتا ہے۔ کئی
رتا ہے، کئی بار زندہ ہوتا ہے اور کتنی ہی بار مسیحائی
تا ہے۔

لیکن آج کے ٹیبل ٹاک میں مشرقی پاکستان کا طوفان
ل ہو گیا تھا۔

"ڈیم نانسنس —— ایک طوفان کو رو رہی ہو۔ زندگی بذات
طوفان ہے۔ مسز کو اس جی نے بڑے فلسفیانہ انداز میں کہا
شیری کا گلاس ہونٹوں سے لگا لیا

"اور تم کیوں رو رہی ہو ——" مسز سکندر علی نے
شید کو چھیڑتے ہوئے پوچھا۔

"میں اپنے کوک کو روتی ہوں، کیسا ونڈرفل کوک تھا۔
ہفتہ روز ہوا باریسال گیا ہے۔"

"بس اتنی سی بات تھی —— محض ایک ادنیٰ ملازم کے
لئے روتی ہو —— "ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں" مسز
سکندر علی نے کیشونٹ پھانکتے ہوئے کہا

"بھئی کچھ سنا تم لوگوں نے ——" اچانک مسز صفدر
نے سبھوں کو چونکا دیا

"کیا —— !"

"یہی مشرقی پاکستان میں طوفان کے بارے میں"

"سنا ہے۔ سنا ہے —— اب مزید بور کیوں کر
رہی ہو" مسز کو اس جی نے شیری کا گلاس خالی کرتے ہوئے
کہا۔

اور دوسری صبح مسز سکندر علی نے اپنے فوم کشن بیڈ
پر پہلی انگڑائی مکمل کی تھی کہ صفیہ آدھکی اور نئی پوائنے سے
تازہ اخبار کھینچتے ہوئے بولی ۔ "کچھ پڑھا تم نے۔ یہ دیکھو
"نواکھالی کے دو جزیرے دس فٹ اونچی سمندری لہروں
میں غرق ہو گئے۔ تین بڑے جہاز، اور بہت سی کشتیاں
اور لانچ ڈوب گئے؛ جنرل اعظم نے وقت نہایت بے چینی
سے گذارا۔ امداد کے لئے حکومت کی پوری مشینری حرکت
میں آگئی، نو ضلعوں میں قیامت خیز تباہی ——، باریسال
میں نوے فی صد کچے مکانات ملبے کا ڈھیر بن گئے۔"

"بکواس بند کرو صفیہ۔ ورنہ۔ میں تمہاری ناک کاٹ
لوں گی" مسز سکندر علی نے اس سے اخبار چھینتے ہوئے کہا۔
اور اچانک اخبار کا ایک کالم دیکھ کر چہکی ——" اور یہ
نہیں دیکھا تم نے انسان کے بلند عزائم کی داستان۔ امریکہ
۱۹۶۷ تک انسان کو چاند تک پہنچانے میں کامیاب ہو جائے
گا؛ اور یہ دیکھو۔ شاہ حسین اپنی منگیتر کے لئے تخت سے
دست بردار ہونے کو تیار ہے —— محبت شہنشاہوں کی
ہو یا گداؤں کی۔ ہر زمانے میں قربانی کی طلبگار رہی ہے۔
زندہ باد امریکہ۔ زندہ باد شاہ حسین کی محبت ——" اور

صفیہ سوچنے لگی کہ جانے چاند کا سفر اہم ہے یا باریسال کا جزیرہ — جانے شاہ حسین کی محبت امر ہے یا وہ لوگ جن کی زندگی کے چراغ ہوا کے جھونکوں سے گل ہوگئے — ؛ جانے کون امر ہے —'

ہائے بچارا بنگال — مغل شہنشاہوں کا بنگال ۔ سراج الدولہ، ٹیگور، نذرالاسلام، اور جسیم الدین کا بنگال جس کی ہواؤں میں سانولے پیروں میں بند سے ہوئے گھنگھروؤں کی جھنکار ہے —' جہاں کی مینہ گیتوں میں ڈھل کر برستی ہے ۔ جہاں کی فضا میں سات رنگ دھڑکتے ہیں ۔ دفعتاً اسے مسز سکندر علی کی آواز نے چونکا دیا — "صفیہ ڈارلنگ چائے پیو — "

" ہاں تو بنگال میں زبردست طوفان آگیا — " مسز سکندر علی نے سلائس پر جام لگاتے ہوئے پوچھا ۔

تم کس دنیا میں رہتی ہو ۔ اب پوچھ رہی ہو — " صفیہ جل کر بولی

"تو صفو ڈارلنگ ہم کر بھی کیا سکتے ہیں ۔ ہیروں کے بھولتے ہوئے آویزوں کو بالوں سے چھڑاتے ہوئے مسز سکندر علی نے کہا

" ہم ان کی امداد تو کرسکتے ہیں ؛" صفیہ نے گرین ٹی کا جلتا ہوا گھونٹ لیتے ہوئے کہا ۔

" کیا مدد کرنے کو ہم ہی رہ گئے ہیں ۔" آدمی کس کس کی مدد کرے ؛"

مسز سکندر علی نے کورن فلیک پورج میں چمچہ ہلاتے ہوئے کہا

" بڑا غلط نظریہ ہے تمہارا ۔ ابھی کلب کی تعمیر میں تم نے ہزاروں روپے دے ڈالے ۔ لیکن بچارے بنگال کے لئے تمہارے پاس ایک پیسہ نہیں ؛"

" تو یوں کہو روپے اکٹھے کرنے نکلی ہو "

" ہاں ارادہ تو یہی ہے — "

" تو پھر بیس روپے مجھ سے بھی لے لینا ؛"

" شکریہ ۔ فی الحال میں چلوں گی ۔ صفیہ نے اپنا وینٹی بیگ سنبھالا اور چل پڑی ۔

تمام دن وہ ہائی سرکل میں گھومتی رہی ۔ لیکن اسے کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی ۔ اور دن بھر کی تھکی ہاری صفیہ سوچنے لگی 'ہائے بے چارے بنگال کے طوفان زدگان کے لئے کسی کے پاس پیسہ نہیں ہوتا ۔ پنجاب کے سیلاب زدوں کے لئے کسی کے پاس پیسہ نہیں ہوتا ۔ اس لئے کہ ہر بھلائی کے کام پر پیسہ مرجاتا ہے ۔ حالانکہ پیسہ زندگی ہے ۔ اس میں زندگی کی حرارت ہے ۔ پیسے سے پیسے کا وجود ہے ۔ اس لئے کہ پیسہ پیسے کو پیدا کرتا ہے ۔ پیسہ سٹے سے ملتا ہے ۔ پیسہ گھوڑوں پر لگانے سے ملتا ہے ۔ پیسہ تاش کے پتوں سے جنم لیتا ہے — جانے اس کے بچپن کا ساتھی ٹونو کس حال میں ہوگا ۔ بکرم تلے بانسی بجانے والا ٹونو جو اسے چھیڑا کرتا تھا "میم صاحب" "میم صاحب —" اور ننھے ننھے ہاتھوں سے تالیاں بجایا کرتا تھا ۔ اور جب وہ اسے پکڑنے کے لئے دوڑتی تو وہ بانسی سمیت تالاب میں کود جاتا تھا — اور وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگتی یا اللہ اس کی بنسری نہ ٹوٹے — دوپہر کے سناٹے کو اس کی بنسری کی آواز ہی تو جھولا جھلایا کرتی تھی اور چلچلاتی ہوئی دھوپ بانسری کی آواز کی چھاؤں میں چاندنی معلوم ہونے لگتی تھی، تالاب کے کنول جھلملا اٹھتے تھے ۔ اور سر نیہوڑائے، جگالی کرتے ہوئے جانور بھی گردن ہلا کر کھڑے ہوجاتے تھے ۔ وہ بڑی اچھی بانسری بجاتا تھا وہ اس کی بانسری کو چھوکر دیکھنا چاہتی تھی ۔ وہ اکثر سوچتی جانے یہ آواز کہاں سے آتی ہے ؛ اور جب ٹونو اس کے گھر آنے جانے لگا تو بھی اس کی بانسری کو نہ چھوسکی، ایسا کرتے ہوئے اس کا دل دھڑک اٹھتا تھا ۔

" یہ آواز کہاں سے آتی ہے ٹونو ؟ — ایک دن

اس نے اس سے پوچھا تھا۔
"باشی کے ہردے سے.....
"بانسری کا بھی ہردے ہوتا ہے ٹونو ——؟"
"ہاں! ہر بانسی میں راگ دیوی بستی ہے —— اور آواز راگ دیوی کے ہردے سے آتی ہے۔" جانے بوڑھا بھگت دادا کیسا ہوگا جو مردا بجایا کرتا تھا۔ اور اس ترنگ سے بجاتا تھا کہ ڈھولک کی ہر تال میں اس کا انگ انگ ناچ اٹھتا تھا اور اس کی ڈھولک کی ہمک ہمک دل میں گدگدی بن کر سما جاتی تھی۔ اس کی بوڑھی انگلیاں تالاب سے نکالی ہوئی مچھلیوں کی طرح تھرکتی تھیں۔ دن بھر وہ مچھلیوں کے جال بُنا کرتا تھا۔ اور شام کے وقت نوجوانوں کو مردا مردنگ بجانا سکھاتا تھا۔ اس کے مردنگ کی تال سات گاؤں میں مشہور تھی اور لڑکیوں کے سانولے پیروں سے بندھے ہوئے گھنگھرو بھی اس کی شہرت کو پہچانتے تھے، لڑکیوں کی پیشانی پر اکیلے ستارے کی طرح روشن بندی، لب و رخسار کے زاویے اور خم ——، کمر کا لوچ۔ جسم کا نشیب و فراز۔ سانولے لبوں پر ڈھلی ہوئی چاندنی کی سی مسکراہٹ بھگت دادا کے تین تال کو پہچانتی تھی اور اس کے مردنگ کی گُم گُم میں کنواری کنیاؤں کی دھڑکن جاگتی رہتی تھی۔

اور وہ ساون گیت گانے والی لڑکیاں ——
انھوں نے کہاں پناہ لی ہوگی۔ ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے یہ لڑکیاں کتنا سہانا گیت گاتی تھیں، ان کی آواز تو اسی لمحہ بند ہوتی جب تک ساون پھوار سے چولی نہ بھیگ جائے اور بارش کے قطروں کی ترل ترل رول..... ان کے گیت کو اپنی آغوش میں نہ بھینچ لے۔ لیکن اس کے بعد بھی صدائے بازگشت جیسے سنگیت کی کھڑکی دیوار بنی رہتی تھی۔ اور سنجھا بیلا پوجا کی تھالی لئے ہوئے تالاب کے قریب والے مندر میں جانے والی لڑکیاں —— ان کی پوجا کی تھالی کا کیا ہوا ہوگا۔ سنہرا کلس والی مندر تک جانے والی عقید تمند آنکھوں پر کیا گزرا ہوگا۔ ان ماہی گیروں کا کیا حشر ہوا ہوگا جو دریا کنارے رہتے تھے اور ماہی گیروں کے گانے گا گا کر دریا کے عتاب کو لوریاں دیتے رہتے تھے۔ جن گھروں سے صرف ایک شام دھواں اٹھتا تھا جو صرف ایک وقت کا کھا کر تمام دن مچھلیاں پکڑتے تھے۔ بچپن کے اتنے سارے ساتھی نہ جانے کہاں ہوں گے۔ جانے ساون گیت گانے والے کون سے ہونٹوں پر بجلی گری۔ بھگت دا کی مردنگ میں کونسا طوفان سما گیا۔ اور ٹونو کی بانسری دریا میں تو نہیں گر پڑی۔ سانولا سلونا ٹونو جانے کہاں ہوگا۔؟

اس نے اپنا پرس کھولا اور ویلفیر سوسائٹی کی رسیدیں گننے لگی کل پچاس روپے ملے تھے۔ غصہ میں اس کے ہونٹ بھنچ گئے۔ دفعتاً اسے کچھ خیال آیا اور وہ اپنا وینٹی بیگ سنبھالے رضیہ کے یہاں آگئی۔
"مجھے ذرا ٹیلی فون چاہیئے ——"
"تمہارا لہجہ اس قدر درشت کیوں ہے۔؟"
"چُپ رہو رضیہ —— " اور اس نے ٹیلیفون ڈائل کرنا شروع کیا
"ہلو امی تمہیں خوشی ہوگی کہ ہماری ویلفیر سوسائیٹی ایک ورائیٹی پروگرام مرتب کر رہی ہے۔ طوفان زدگان کے سلسلہ میں..... تم ناچوگی نا؟..... صرف پندرہ منٹ..... ہاں صرف پندرہ منٹ..... سو فی صدی انگلش رقص..... ٹپ ٹو..... اینی ڈیم ڈانس۔
"ہلو سوئیٹ جمیلہ۔ پچیس تاریخ کو ایک رقص لاجواب کی ضرورت ہے ہیرا ارنجا سکو تمہیں —— منظور ہے۔! پیسے دو گی ڈیر پیسے دوں گی۔
"مس شعلہ۔ ان دنوں فلموں سے غالباً فارغ ہو۔ اچھا تو پھر ہمارے لئے کتھا کلی ناچ دو۔ اس فن میں ایکسپر

ہو — ؟ کوئی بات نہیں اُلٹا سیدھا جو ہو ناچ دو۔ دنیا میں بے وقوفوں کی کمی نہیں ہے۔ تم حسین ہو یہی بہت کافی ہے۔

"ہلو مہر بانو۔ تمہارا ایک رقص آئٹم چاہیئے۔ بنگال کا کوئی حسین رقص کیا کہا تمہارا بھائی باریسال کے طوفان میں مرگیا — تم نہیں ناچو گی پاگل مت بنو۔ تم ضرور ناچو گی۔ تم رو رہی ہو۔ سسکیوں کو روک لو مہر بانو — بنگال کو تمہارے رقص کی ضرورت ہے۔"

اور دوسرے دن صفیہ نے مسز سکندر علی کے کانوں میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا — "سوشل لیڈر شپ کا یہ نادر موقع ہے دل کھول کر تصویریں اُتروائو۔ اخبارات کو بیان دو۔ اور سات آسمانوں میں پہنچ جاؤ۔

"ونڈرفل ..... ونڈرفل ..... مسز سکندر علی نے شبک ہاتھوں سے تالی بجاتے ہوئے کہا اور صوفہ پر اُچھل اُچھل کر داد دینے لگی۔ مگر ڈارلنگ ایک شرط ہے"۔

"وہ کیا — ؟ مسز سکندر علی نے کس پروف لپ سٹک پر زبان پھیرتے ہوئے سہمے ہوئے لہجہ میں پوچھا۔ اس بچے کی طرح جس کے ہاتھوں سے رنگین کھلونا چھن جانے والا ہو۔

"اس فنڈ میں پانچ ہزار روپے دے دو۔ اخبارات کے رپورٹروں کو کل ہم اپنی سوسائٹی کے دفتر میں بلالیں گے۔

"ارے بس اتنی سی رقم۔ بھئی طوفان زدگان کیلئے تو میں دس ہزار تک دینے کو تیار ہوں۔

"اور ٹکٹیں کتنی بیچو گی — ؟"

"جتنی کہو۔ تم جانتی ہو میں سارے ــــــ میں کس قدر مقبول ہوں

"ہاں اور کیا اسی مقبولیت کو چار چاند لگانے کے لئے تو میں نے تمہیں اتنا نادر موقع آفر کیا ہے۔"

"یو آر سو سوئٹ ڈارلنگ صفیہ۔ اس نے اُسے بازوؤں میں بھینچ لیا۔

اور جب شو کی رات آئی تو ہال تماشبینوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ اور صفیہ سائڈ ڈریسنگ روم میں بیٹھی مائک پر کمنٹری کر رہی تھی"

"مس ایمی آپ کی جانی پہچانی رقاصہ ہیں۔ وہ آپ کی خدمت میں ایک مغربی رقص پیش کریں گی۔ اور دوسرے لمحہ جب ایمی اپنے نیم عریاں لباس میں ہوائین ناچ رہی تھی تو ہال میں تماشبینوں کا ہیجان نقطۂ عروج پر تھا چمکتا ہوا کندن سا بدن گنگناتے گاتے ہوئے جسم کا نشیب و فراز! پلکوں کی چلمن کے پیچھے جلتی ہوئی کافوری شمعوں کی سی آنکھیں۔ خرمن دل جل اُٹھے۔ اور صفیہ نے اس دھوئیں کے پس منظر میں دیکھا بنگال کی جھونپڑیاں جل رہی ہیں۔ طوفان کے زور میں سانولے جسم کانپ رہے ہیں۔ اور بڑھتے ہوئے پانی کے اژدہے نے سینکڑوں انسانوں کو نگل لیا ہے۔ مس ایمی ناچ رہی تھی۔ ہوائین رقص — لوگوں کے دل دھڑک رہے تھے۔ میٹھی میٹھی آگ شریانوں میں جل رہی تھی۔ اور صفیہ سوچ رہی تھی۔ جانے کتنے دلوں میں بنگال کا درد جاگ رہا ہے۔ خدا کرے یہ درد نہ جاگے ورنہ مس ایمی کا نیم عریاں رقص تباہ ہو جائے گا۔ لوگ مس ایمی پر گندے انڈے اُچھال کر باہر نکل جائیں گے۔ یہ کیا مذاق ہے ملک کے ایک گوشہ میں آگ لگی ہے اور ہم نیرو کی طرح بانسری بجا رہے ہیں ہم اپنے روم کو جلنے نہ دیں گے۔ بند کرو یہ رقص۔ یہ کیا بکواس ہے روم کو بچانے کے لئے ہمارے تن من دھن حاضر ہیں — اور مس ایمی کا رقص ختم ہوگیا۔ صفیہ کی آواز مائک پر گونجی —" اب ہم ہیر رانجھا پر مشتمل ایک بیلے پیش کریں گے۔ بیلے میں حصہ لینے والی مس جمیلہ اور مس ڈانیل ہیں — مس جمیلہ اور مس ڈانیل —،

اور پنجاب کے روایتی کسٹوم میں جیلہ اور ڈانسل بیلے پیش کر رہی تھیں۔ کمر کے ہر خم ـــــ آنکھوں کی ہر جنبش، جسم کی ہر حرکت پر ہال میں تالیاں بج رہی تھیں۔ رانجھا کی بانسری پر ہیر ناچ رہی تھی اور بانسری کی آواز سُن کر صفیہ غمزدہ ہو گئی۔ جانے ٹونو کی بانسری زندہ ہے یا مر گئی۔ نہ جانے اس طوفان میں کتنے رانجھے طوفان کی بانسری کا المیہ گیت بن کر ڈھل گئے ـــــ ٹھہرو لوگو ٹھہرو ـــــ اپنی بانسری کو سنبھالے رکھو ہم تمہارے بہت قریب ہیں۔ ہم تمہاری بانسری کی آواز کو مرنے نہیں دیں گے۔

اور بیس منٹ کے وقفہ کے بعد مس شعلہ مشہور فلم ڈانسر الٹے سیدھے پاؤں کتھا کلی ناچ پیش کر رہی تھی۔ درپن میں منہ نہار رہی تھی۔ پلکوں کی اُٹھتی گرتی چلمن سے کنھیا کو رجھا رہی تھی، جھرنے کے درپن میں سولہ سنگار کر رہی تھی۔ پلکوں میں چھوٹی انگلی سے ساون کی رات کے ماتھے سے کاجل پونچھ کر آنکھوں میں لگا رہی تھی ـــــ ماتر بھومی سے سہاگ کا سیندور لے کر مانگ سجا رہی تھی اور کنھیا کے انتظار میں اتھل پاتھل بن کی ہوا کی طرح ڈول رہی تھی۔ پھر کنھیا کی بانسری بجی اور رادھا کی مُسکان کی تحریر نے دھرتی کی رنگین امر کہانی لکھنا شروع کر دی۔

اور دھرتی کی اس امر کہانی کی تحریر پڑھتے پڑھتے صفیہ پھر بنگال میں بھٹک گئی۔ بنگال کے اس مہیب طوفان کی تحریر کہاں ہو گی یہ بھی تو ہماری دھرتی کی امر کہانی کا ایک حصہ ہے جس کی تخلیق میں کتنے ہی گیت گانے والے ہونٹ ساکت ہو گئے۔ کتنے ہی بھگت دادا نے اپنے مردنگ کی آواز سے اس کہانی میں جان ڈالی ہے۔ کتنی ہی غرق ہونے والی کشتیوں نے اس کہانی کو جلا بخشی ہے۔ ہال میں تماشبینوں کی نگاہیں مستحسن انداز میں مس شعلہ کو گھور رہی تھیں اور اس رقص کے پس منظر میں بنگال سِسک رہا تھا۔ سانولے ہونٹوں سے ساون گیت گانے والی لڑکیاں جو طوفان میں تحلیل ہو گئی تھیں۔ سات آسمانوں کی وسعت سے جھانک کر دیکھ رہی تھیں اب اور کون بچا ہے جو ساون گیت گائے ـــــ اس گیت کو بند نہ ہونا چاہیئے۔

اور جب مہربانو نے بنگال کا مشہور ڈانس "ماہی گیروں کا رقص" پیش کیا تو صفیہ نے محسوس کیا جیسے سارے ہال میں طوفان اور سیلاب آ گیا ہے۔ اور اس سیلاب میں مہربانو کی آنکھیں ٹونو کی بنسی اور بھگت دادا کی ڈھولک کو ڈوب کر ٹٹول رہی ہیں۔ اور اپنے ڈوبنے والے بھائی کو تنکوں کا سہارا دے رہی ہیں۔ اور صفیہ نے محسوس کیا کہ ایسی مہربان آنکھیں نجانے کتنے انسانوں کو ڈوبنے سے بچا سکتی ہیں . . . . ، وہ بڑی محنت سے ناچتی رہی۔ ناچتی رہی۔ ناچتی گئی ـــــ کلر ڈلائٹ میں اس کا نازک جسم کانپ رہا تھا۔ گھنگھرو چھناکے سے بج اٹھے تھے۔ اور صفیہ کو محسوس ہو رہا تھا جیسے دور بنگال میں سہانی بھور جاگ اُٹھی ہے ـــــ بھگت دادا نے پھر مردنگ سنبھال لی ہے، ٹونو کی بنسی پھر سے بج اُٹھی ہے۔ اور لڑکیوں نے ساون گیت شروع کر دیا ہے۔

ورائٹی پروگرام ختم ہو گیا۔ اور رات گئے جب صفیہ تھکی ہاری لوٹ رہی تھی تو اس نے سوچا . . . . . . تیس ہزار روپوں سے تیس جھونپڑیاں تو بن سکتی ہیں

شفیق حسن زیدی

تتلی، گُل اور میں

اوس سے بھیگی ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس پر میں پنجوں کے بل کیاری تک گیا اور چپکے سے پھول پر بیٹھی تتلی کو چٹکی میں پکڑ لیا۔ غریب پھڑ پھڑا بھی نہ سکی۔

گُل نے جُھک کر میری چٹکی میں دبی تتلی کو دیکھا اور پھر سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی

"ہائے اللہ۔ بیچاری۔ اسے چھوڑ دیجئے نا!"

"کیوں چھوڑ دیں؟ اتنی محنت سے ہم نے پکڑا اور تم نے اترا کے کہدیا' اسے چھوڑ دیجئے نا'۔" میں نے نقل بناتے ہوئے کہا "بڑی آئیں کہیں سے۔"

تیز تیز قدموں سے وہ آنگن سے گزر کر دالان میں گھس گئی۔ دادی بی تخت پر بیٹھی سروتے سے ڈلی کتر رہی تھیں۔ اُن کے کولھے سے لگ کر بیٹھ گئی۔ میری طرف پیٹھ کر لی۔ تھوڑی دیر ٹکٹکی باندھے میں اُسے دیکھتا رہا لیکن اُسنے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ "بلا سے روٹھ جاؤ ہمارا کیا کر لوگی" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ میری چٹکی میں تتلی دبی تھی۔ بے بس اپنی پتلی پتلی سونڈیں ہلا رہی تھی۔ میں نے خوش ہو کر اُسے گھما پھرا کر دیکھا۔ ایسی خوش رنگ تتلی میں نے آج تک نہیں پکڑی تھی۔ اُس کے پَروں پر دھنک کِھلی تھی جس میں کہیں کہیں سیاہ لہریں تھیں اور سیاہ لہروں میں جگہ جگہ آنکھیں سی بنی تھیں۔ میں نے پیار سے اُسے رُخسار سے لگا لیا۔ پھر فوراً ہی ہٹا لیا۔ اُس کی ہلتی ہوئی سونڈوں نے رُخسار پہ چیونٹیاں سی دوڑا دی تھیں۔ میں نے برآمدے میں دیکھا۔ گُل ویسے ہی بیٹھے کی بیٹھی تھی اور کُھسر پھسر دادی بی سے نہ جانے کیا باتیں بنا رہی تھی۔ مجھے بھی غصّہ آنے لگا۔

ایک سیاہ چمکتا بھونرا آکے پھول پھول منڈلانے لگا۔ کیاری میں گلاب کے پھول تھے اور بیلے کی ادھ کِھلی کلیاں اور ذرا ہٹ کے گُلِ تسبیح کے لمبے پتّوں والے پودے جن پر صبح کی اوس کے موتی تھے۔ میں سہما ہوا گُن گُن کرتے بھونرے کو منڈلاتے دیکھنے لگا۔ (پتہ نہیں کیوں بچپن میں مجھے بھونرے سے بڑا ڈر لگتا تھا) اب گلاب کے پھولوں میں، اب بیلے کی کلیوں میں، اب گُلِ تسبیح کے پتّوں میں پھر اکیا ایک وہ گونجتا ہوا مجھ پر لپکا۔ میں نے پھُرتی سے اپنے کو بچانے کے لئے اُس پر ہاتھ مارا۔ ہاتھ تو بھونرے پر نہیں لگا پر چٹکی کھُل گئی۔ تتلی پَروں کو پھڑپھڑاتی اُڑ کے دُور چلی گئی۔ کچھ دیر حسرت سے کھڑا تتلی کو دیکھتا رہا پھر میں نے اپنی انگلیوں کو دیکھا۔ انگوٹھے اور درمیان کی انگلی پر تتلی کے پَروں کے رنگین غبار کی چھوٹ رہ گئی تھی۔ جسے جھنجھلا کے میں نے مسل ڈالا پھر ہولے ہولے چلتا نیم کے نیچے آگیا۔ کھانچے پر چڑھا گُل کا مُرغا اذان دے رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اُچک کر دیوار پر جا بیٹھا، مجھے بڑا غصّہ آیا، دانت کچکچا کے میں نے ہلا ہلا کر اُسے مُکا دکھایا، اُس پر ذرا اثر نہ ہوا۔ "یہ اپنی مالکہ سے کونسا کم ہے" میں نے سوچا "چڑیل نے اس وقت ایسی فال منہ سے نکالی کہ آئی اَدائی تتلی ہاتھ سے نکل گئی" پھر مجھے ہنسی آگئی۔ اگر گُل مجھے چڑیل کہتا سُن لے تو ابھی سے کہہ کہہ کر پکڑی کرائے کر شام ہو جائے۔

"اے گل" میں نے چلا کر کہا "دیکھو ہم نے تمہارے کہنے سے تتلی چھوڑ دی۔" میں نے اس پر جھوٹا احسان جتایا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ میں نے دونوں ہاتھ اونچے کرکے اسے دکھائے۔ اس نے شرما کر منہ موڑ لیا اور لگی دادی بی سے باتیں بنانے۔

اس بار میں جل گیا۔ "میں بھی اب نہیں بولوں گا۔ سمجھتی کیا ہے اپنے کو چڑیل۔" میں دھیرے دھیرے چلتا دروازے تک آ گیا۔ دیوار سے لگی مالی کی کتیا آنکھیں موندے پڑی تھی۔ میں نے جل کر زور سے لات ماری۔ ٹیاؤں، ٹیاؤں، شور مچاتی وہ دروازے سے باہر نکل گئی۔

"صبح ہو گئی منحوس!۔" امی نے چیخ کر کہا۔ میں بھی جلدی سے دروازے سے باہر آ گیا۔

باہر سڑک سنسان پڑی تھی۔ دھول سے اٹی یہ زخم خوردہ سڑک قصبے کے بالکل کنارے پر تھی۔ اس کے ایک جانب مکانات تھے جو قصبے کی حد بناتے تھے اور دوسری طرف ترکاریوں کے کھیت تھے۔ سارا قصبہ ان ہی کھیتوں کی ترکاریوں پر گزر کرتا تھا۔ صبح سویرے کنجڑے مختلف ترکاریوں سے بھری ٹوکریاں سروں پر اٹھائے بازار کا رخ کرتے اور ان کی عورتیں دن بھر کھرپا لئے کھیتوں کی نرائی کرتیں اور گلے سڑے پتے نوچ نوچ کر باہر پھینکتی رہتیں۔ اور ڈھینکلے لگے مدے کوئیاں سے پانی کھینچ کھینچ کر انہیں سینچتیں۔

سڑک کے کنارے املی کا بڑا اونچا جھبنادری درخت تھا۔ میں ٹہلتا ٹہلتا اس کے نیچے آ کے کھڑا ہو گیا۔ اوپر شاخوں میں کچی کچی املیوں کی ان گنت توسیں لٹک رہی تھیں۔ "اب دیکھوں مجھے کیسے املیاں تڑواتی ہے" میں نے منہ ہی منہ میں جیسے گل سے کہہ کے اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ سارے محلے میں اس پیڑ پر چڑھنے کا ہنر بس مجھے ہی آتا تھا۔ اور لڑکے تو نیچے سے ڈھیلے مار مار کر املیاں گراتے تھے۔ گل کو املیاں بہت پسند تھیں۔ اس کے کہنے سے اکثر میں پیڑ پر چڑھ جاتا۔ وہ نیچے کھڑی اپنی پسندیدہ توسوں کی طرف اشارہ کرتی رہتی اور میں ڈال ڈال اچکتا انہیں توڑ توڑ کے نیچے پھینکتا رہتا۔ وہ صاف کر کے املیوں کو اپنی قمیص کے دامن میں بھرتی رہتی جب میں نیچے اترتا تو میرے ہاتھوں پر کھرونچوں کے نشان ہوتے تھے، قمیص میں جگہ جگہ کھونتے لگے ہوتے اور نیکر پر شاخوں کی رگڑ کی بڑی دھاریاں۔ پھر اتی کے ڈر کے مارے میں پچھلے دروازے سے گھر میں داخل ہو کے سیدھا غسل خانے میں گھس جاتا تھا جہاں گل پہلے ہی دوسری قمیص اور نیکر رکھ دیتی تھی۔

سڑک پر سناٹا تھا، چنگی کی اور سے اپلوں سے لدے دو گدھے آہستہ آہستہ آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ چلتا اپلے والا تھوڑی تھوڑی دیر بعد 'لو اپلو'، 'لو اپلو' کی آوازیں لگا رہا تھا۔

"اب کیا کیا جائے" میں نے سوچا۔ آج کی صبح بڑی اداس نظر آ رہی تھی۔

دفعتہً وکیل صاحب کے گھر کا دروازہ کھلا اور امجد باہر نکل آیا۔ اس کے ہاتھ میں غلیل تھی اور نیکر کی دونوں جیبوں میں غلے بھرے تھے۔ کھیتوں کے بیچوں بیچ جو ڈبر تھی اس کی چکنی مٹی سے ہم نے کئی روز ہوئے یہ غلے بنائے تھے۔

"چلو بھئی آج شکار کھیلیں۔" میں نے امجد کے ہاتھ سے غلیل لے کر کہا

"کہاں چلا جائے؟" امجد نے پوچھا۔

ہاں کہاں چلا جائے۔ میں نے سوچا۔ آج اتوار تھا اور مدرسے کی چھٹی تھی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کے موٹے رول کی ہیبت نے اتوار ہمارے لئے بڑا حسین بنا دیا تھا۔ پر مشکل یہ تھی کہ کمبخت ایک ہی دن میں گذر جاتا تھا، اور پھر وہی رول، وہی اسکول وہی جماعتیں اور وہی ہیڈ ماسٹر صاحب جنکی داڑھی حنا سے لال ہوتی تھی اور جن کا ازار بند گھٹنوں سے بھی نیچے لٹکتا رہتا تھا۔ پنج وقتہ نماز کے ساتھ ساتھ لڑکوں پر رول برسانے کا فریضہ بھی باقاعدگی سے انجام دیتے تھے، مگر ہاتھوں کو ذرا روک روک کے۔ لڑکوں کی کمزور پسلی کا بھی انہیں کافی خیال رہتا تھا۔ گنجے تھے۔ سارے لڑکے انہیں گنجو کہتے تھے لیکن سامنے نہیں۔ ایک روز ماسٹر راما شنکر جو ہمیں حساب پڑھاتے تھے میرے ایک ساتھی نے کہا تھا۔

"ماسٹر صاحب! گنجو کو ان کے ماسٹر صاحب بہت مارتے تھے اب وہ بدلہ لینے کو ہمیں مارتے ہیں۔"

"گجو کون ۔۔ ؟" ماسٹر رام شنکر نے حیرت سے پوچھا۔

"ہوتے کون جی" ایک اور لڑکے نے جواب دیا "ہیڈ ماسٹر صاحب کو لڑکے گجو کہتے ہیں" اور پھر ذرا ٹھہر کے "اور جی آپ کو سب نکٹا کہتے ہیں۔"

ساری جماعت ہنس پڑی۔ دراصل اُن کے چہرے پر ناک نہ ہونے کے برابر تھی۔ کچھ دیر بعد جب ہیڈ ماسٹر صاحب اپنا رُول ہلاتے جماعت کے سامنے سے گذرے تو ساری جماعت بڑے انفعال سے مرغا بنی ہوئی تھی۔ انہوں نے ماسٹر صاحب سے ماجرا پوچھا اور نتیجے میں سارے لڑکوں پر ایک ایک دو دو رُول برسا دیئے۔ اُس کے بعد کئی بار میں نے کوشش کی کہ اسکول سے نام کٹ جاتے لیکن ہر بار ابا جی نے کن پکڑی کرادی۔

"کہاں چلا جائے ۔ ؟" امجد نے پھر پوچھا

"کہاں چلا جائے" میں نے اُس کے الفاظ دہرائے "اچھا آؤ" ہم کھیتوں میں نکل گئے، پھرتے پھرتے تھک گئے پر شکار نہیں ملا۔ جانے کیسا منحوس سارا دن تھا۔ نہ کوئی لمڈور، نہ مینا، نہ جنگلی کبوتر، حد یہ تھی کہ بغیا میں کگر وندوں کی جھاڑیوں میں جو ڈھیر ساری گوریاں دن بھر چوں چوں کرتی پھدکتی رہتی تھیں وہ بھی اُس سمے نہ جانے کونسی اوٹ میں چلی گئی تھیں۔

"اب کیا کیا جائے ۔ ؟" امجد نے دوسرا سوال کیا۔

میں نے سامنے دیکھا۔ کیکر کے درخت کی ایک نیچی سی شاخ پر ایک گلہری بیٹھی ہاتھوں میں نہ جانے کیا پکڑے دانتوں سے کتر رہی تھی۔ میں نے امجد کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔

"امجد وہ گلہری دیکھی ۔ ؟ میں آگے جا کے اسے مارتا ہوں۔ تم یہاں کھڑے رہو لیکن ہلنا مت ۔۔"

میں دھیرے دھیرے آگے بڑھا، غلیل میں غلہ رکھ کے ربر کو پوری طاقت سے کھینچا اور نشانہ باندھ کر جو چھوڑا تو گلہری پھدک سے زمین پر گری اور تڑپنے لگی۔ میں نے امجد کی اور فاتحانہ انداز سے دیکھا اور دوڑ کر گلہری کے پاس پہنچا۔ اُس کے منہ سے خون رس رہا تھا اور وہ دم توڑ رہی تھی۔

"اب اس کا کیا کریں گے۔ گلہری تو حرام ہے۔" امجد نے کہا

"تم بھی نرے بھوندو ہی نکلے یار" میں نے شان جتاتے ہوئے کہا "کچھ پتہ بھی ہے اس کی کھال بڑی قیمتی ہوتی ہے۔ لکھنؤ میں ساری میمیں اس کی کھال کے کوٹ پہنتی ہیں۔ جاڑوں میں ذرا بھی سردی نہیں لگتی۔"

دراصل پچھلے جاڑوں میں مرے چچا آئے تھے، اپنی نئی نویلی بیوی کو بھی ساتھ لائے تھے۔ انہوں نے لکھنؤ میں ایک اینگلو انڈین لڑکی سے شادی کرلی تھی۔ کچھ عرصے سارے کنبے میں خاصا ہنگامہ رہا تھا۔ مجھ سے کہنے لگے "انہیں چچی نہیں آنٹی کہا کرو" تو وہ آنٹی جو کوٹ پہنے تھیں اُس کا کالر کھال کا تھا جس میں دھاریاں سی پڑی تھیں۔ میں نے پوچھا "آنٹی یہ کھال گلہری کی ہے؟" مسکرا کے کہنے لگیں "ہاں ۔۔ پر یہ بڑا کیمتی ہوتا ہے۔" وہ کوشش کرکے اپنا لہجہ بگاڑ بگاڑ کر بات کرتی تھیں۔

آگے آگے میں اور پیچھے پیچھے امجد گلہری کو دُم سے پکڑے کھیتوں کی مینڈوں سے گذرنے لگے۔ کھیتوں میں نرائی کرتی ایک کنجڑن نے سر اُٹھا کر ہماری طرف دیکھا اور اپنی ساتھی سے کہنے لگی

"اری رام بھردی۔ جرا دیکھنا ان بالکوں نے گلہری کی ہتیا کر ڈالی چچ ۔ چچ ۔ چچ" پھر مجھ سے بولی "کیا لابھ ہوا بابو! اسے مار کے تو کو؟" مجھے بڑا غصہ آیا، پر بولا کچھ نہیں۔ امجد نے جواب دیا۔

"پتہ بھی ہے، اس کی کھال بڑی قیمتی ہوتی ہے، ہم اُسے بیچ کے ہوائی بندوق خریدیں گے۔" سورج آگ اُگل رہا تھا، ہمارے جسموں سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ اور چہرے تمتما رہے تھے۔ املی کے نیچے آکر ہم سائے میں بیٹھ گئے۔

"اب کیا کیا جائے ؟" تھوڑی دیر بعد امجد نے پوچھا۔

مجھے سخت بھوک لگی تھی۔ صبح سے کھیل کا ایک دانہ بھی اُڑ کے منہ میں نہیں گیا تھا اور اب سورج عین مین سر کے اوپر تھا، میں نے امجد سے کہا۔

"مجھے لگی ہے بھوک۔ میں اوپر چڑھ کے املیاں توڑ توڑ کر پھینکتا ہوں۔ تم جمع کرو۔ پھر خوب بہت سا نمک مرچ لگا کر

کھائیں گے۔"

درخت پر چڑھا ہی تھا کہ امجد کو اُس کا نوکر بلا کر لے گیا۔ میں ٹنڈروں ٹوں اکیلا رہ گیا۔ ایک موٹی سی شاخ پر پیر لٹکا کے اطمینان سے بیٹھ گیا، اور املیاں توڑ توڑ کے کھانے لگا۔ دانت کھٹے ہو گئے تو جیب میں بھرنے لگا۔ اچانک نیچے جو نگاہ پڑی تو سُن رہ گیا۔ اباجی مری ہوئی گلہری کے پاس کھڑے بڑے غور سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ وہ شاید میری ہی تلاش میں نکلے تھے۔ 'اب اچھی طرح پٹائی ہوگی' میں نے سوچا۔ ایکا ایکی آنکھوں تلے اندھیرا آگیا جس میں جگہ جگہ تارے چمک رہے تھے۔ ہڑبڑا کر جو پتوں میں چھپنا چاہا تو جیب سے غلیل نکل کر اباجی کے عین قدموں میں گری انہوں نے چونک کر اوپر دیکھا اور دانت کچکچا کر زور سے دہاڑے...

"نیچے اُتر مردود۔ صبح سے کہاں واہی تواہی مارا پھر رہا ہے۔ آج تیری شامت آہی گئی۔" سچ تو جیسے سارے جسم میں رعشہ سا آگیا۔ جیسے نس نس میں بجلیاں سی کوندنے لگیں۔ ایک دم یوں لگا جیسے میں درخت سے اُترنا بھول گیا۔ لیکن جبھی نثار چچا جانے کہاں سے ٹپک پڑے۔ مجھے پیڑ سے اُترتے دیکھ کر موقع کی نزاکت بھانپ لی۔ اباجی کو سمجھانے لگے۔ "کیا پاگل ہوئے ہو۔ بچہ ہے۔ سبھی اس عمر میں یہی کرتے ہیں۔ چلو دو ایک بازیاں چوسر کی جم جائیں۔ بہت دن سے نہیں کھیلے۔" اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولے "تم سیدھے گھر جاؤ بیٹا۔ اور دیکھو بری بات پیڑوں پر یوں نہیں چڑھتے ہیں۔ کسی روز ہاتھ پیر توڑ بیٹھو گے۔"

چوسر اباجی کی بڑی نازک رگ تھی۔ اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلنے بیٹھ جاتے تھے تو کئی کئی روز یونہی بیت جاتے۔ گاؤ تکئے سے پھسلتی ہوئی کوڑیاں ساری بساط پر بکھرتی رہتیں۔ پانوں کی گلوریوں سے بھرے ہوئے خاصدان پر خاصدان خالی ہوتے رہتے۔ لکھنوی خمیرے سے بھری ان گنت چلمیں سُلگ سُلگ کر دھواں ہو جاتیں۔ کھانے پینے تک کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ اُتر پردیش کے مسلمان زمیندار کی زندگی ہمیشہ مالگزاری، لگان، چوسر، شطرنج اور شکار میں گذری۔ اس دائرے کے باہر بھی زندگی ہے، انہیں کبھی پتہ نہیں چلا۔ نہ انہوں نے اس کے جاننے کی ضرورت محسوس کی۔

اباجی کو نثار چچا کے ساتھ جاتے دیکھ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب وہ رات گئے ہی لوٹیں گے، میں نے سوچا۔ چلو کھٹی ہوئی گُل دروازے ہی میں مل گئی۔ اس بار میں نے اُسے دیکھ کے مُنہ پھیر لیا۔ مجھے ناراض پا کر وہ ایک دم لپٹ گئی۔ "اچھے شفقّن بھیّا آؤ چلو دکھاؤں میں نے تمہارے لئے کیا رکھا ہے۔" وہ میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگی۔ میں اپنی جگہ جم گیا۔ "میرے بھیّا! اب من بھی جاؤ نا۔" اُس نے میرے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا۔

"مت بات کر مُردار سے۔" امّی دالان سے چلّائیں۔ "صبح کا نکلا اب گھر میں گھسا ہے تو نخوتی چڑھی ہوئی۔ چہرہ لال بھبھوکا۔ جانے کہاں لوؤں میں مارا مارا پھرا ہے۔ صورت تو دیکھ آئینے میں کمبخت چُپشش۔"

"اے دُلہن۔ کیوں گھر میں گھستے ہی نگوڑ مارے کے پیچھے پڑ گئیں۔" دادی بی نے امّی سے سرزنش میں کہا "کھانا تو نکال دو اُسے بھوکا ہو گا بے چارہ۔"

امّی منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی باورچی خانے میں گھس گئیں۔ میں دالان میں تخت پر بیٹھ گیا۔ گُل ابھی تک مجھ سے لپٹی تھی۔ میں نے جھٹک کر اُسے علیحدہ کر دیا۔ وہ روٹھی ہوگئی۔

"لے کر زہر مار۔" امّی نے کھانے کی سینی تخت پر پٹک کر ۔۔۔

"پھر آج دال پالک پکایا ہے۔" میں نے غصّے سے نوالہ مُنہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"نہ۔ میں تو روز تیرے لئے مرغ پلاؤ اور زردہ بناؤں گی۔ کھانا ہے تو سیدھی طرح کھا ورنہ اُٹھ جا۔ مجھ سے زیادہ نخرے نہ بگھارا کر۔"

دانت ایسے کھٹے ہو رہے تھے کہ نوالہ چبانا درکنار دانتوں میں رکھا بھی نہیں جا رہا تھا۔ جلدی سے نگل گیا۔ اور پانی پی کر سینی ایک طرف سرکا دی۔ امّی کو غصّہ آ گیا۔

"قسم ہے۔ اب جو تو کبھی کھائے۔"

میں اُٹھ کر دادی بی کے پاس لیٹ گیا۔ اور اُن کے ہاتھ سے پنکھا لے کے جھلنے لگا۔

گُل مرے پاس آگئی "اب تو مَن جاؤ شفقن بھیّا" اُس نے بڑی لجاجت سے کہا اُس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ مجھے بہت ہی ترس آگیا۔ "آؤ میرے ساتھ" اُسنے ہاتھ پکڑ کر کہا۔

کمرے میں قدم رکھتے ہی میں خوشی سے پاگل ہوگیا۔ اباجی کی میز پہ شیشے کا ایک نازک سا گلاس اوندھا رکھا تھا۔ اور اُس میں وہی تتلی بند تھی جو میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ میں نے گُل کو حیرت سے دیکھا۔ حیرت اس لئے کہ اُسنے تتلی کبھی نہیں پکڑی تھی۔ میری ننھی معصوم بہن پکڑنا کجا۔ تتلی کو گرفتار بھی نہیں دیکھ سکتی تھی اُس کا دِل بڑا نازک تھا۔ میں تتلی پکڑتا تھا تو خفا ہو کر چلی جاتی تھی۔ اور آج اُسنے خود میرے لئے تتلی پکڑی تھی۔

گُل نے مسکرا کر کہا۔ "آپ نے میری وجہ سے تتلی چھوڑ دی تھی نا۔؟ - پھر آپ تو چلے گئے۔ میں جو کیاری کی طرف گئی تو یہ بڑے گلاب پہ بیٹھی تھی۔ میں نے سوچا آپ نے میری وجہ سے اگر تتلی چھوڑ دی تو میں کیوں نا آپ کے لئے اِسے پھر پکڑ لوں۔ آپ کتنا خوش ہوں گے۔ بس میں نے پکڑ لی اور یہاں لاکے بند کر دی۔ پھر جب سے آپ کا انتظار کر رہی تھی۔ آپ لوٹے ہی نہیں۔ اباجی بھی ابھی چیختے ہوئے آپ کو ڈھونڈنے باہر گئے ہیں۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا وہ آپ کو ماریں نا۔ خیر میں گھر میں تو آپ کو کبھی نہیں پٹنے دیتی۔"

اور یہ ٹھیک بھی تھا۔ وہ اباجی کی بڑی دُلاری تھی اور اباجی اُس کا کہا کبھی نہیں ٹالتے تھے۔

میں نے احتیاط سے گلاس اُٹھا کر تتلی کو چٹکی میں پکڑ لیا۔ ایک مبہم سے خوف سے اچانک دل دھڑک اٹھا۔ میں نے چٹکی کھول دی۔ میرا خوف درست ثابت ہوا۔ تتلی ہولے سے میز پر گر پڑی۔ وہ مرچکی تھی۔

"ہائے اللہ۔ مرگئی کیا۔؟ شفقن بھائی؟؟" گُل نے گھبرا کر پوچھا۔ میں نے سر ہلا دیا۔ وہ ایک دم سفید ہوگئی۔ جیسے کسی نے اُس کے چہرے سے دم بھر میں سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ خود مجھے انتہائی غم تھا۔ میں نے اتنی تتلیاں پکڑی تھیں لیکن کبھی کوئی مری نہیں تھی۔ بس تھوڑی دیر پکڑ کر میں اُن کو چھوڑ دیتا تھا۔ میں نے گُل کو دیکھا۔ وہ بیہوش سی ہو رہی تھی۔ میں نے اُسے سنبھالنا چاہا پر سنبھال نہ سکا۔ وہ میز پہ تیورا کے گری۔ اُس کا سر گلاس سے ٹکرایا اور گلاس کھیل کھیل ہوگیا۔ شیشے کی ایک لمبی سی کرچ چھوٹی چھوٹی کرچوں کے ساتھ اُس کے سر میں اتر گئی۔ ساری پیشانی خون میں تر بہ تر ہو گئی۔ میں گھبرا گیا۔ کھینچ کر اُسے آرام کرسی میں ڈال دیا۔

"گُل۔ گُل۔ گُل۔" میں پکارتا رہا۔ وہ نہ بولی "امّی امّی امّی۔" میری آواز برآمدے اور صحن سے گزر کر سڑک پہ نکل گئی۔ پھر میں کرسی پر سر ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

پھر دن ڈھلا شام ہوگئی۔ شام گہری ہو کے رات ہوگئی۔ لیکن گُل کو ہوش نہیں آیا۔ ڈاکٹر نے گھر آکے اُس کے سر کا آپریشن کیا۔ حالانکہ گھر پہ اُس کو وہ سہولتیں میسر نہیں تھیں جو ہسپتال میں تھیں لیکن اس قصبے کے باسیوں کا خیال تھا کہ ہسپتال میں مریض لاوارث جاتے ہیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کے بازوؤں میں انجکشن لگائے گئے۔ پیچھے سے اسکے بند حلق میں دوا ٹپکائی گئی۔ پھر بھی وہ ہوش میں نہ آسکی۔ باہر سارے آسمان پہ تارے کھلے پڑے تھے۔ اندر دالان میں گُل اپنے بستر میں پڑی تھی۔ اباجی اور امّی اُس کی پٹی سے لگے بیٹھے تھے۔ میں دھیرے سے صحن میں رینگ آیا۔ تاروں بھرے آسمان تلے، اوپر منہ اٹھا کر میں نے دُعا مانگی۔

"یا اللہ میاں۔ میری گُل کو اچھا کردے، میں توبہ کرتا ہوں۔ آئندہ کبھی تتلی نہیں پکڑوں گا۔" میں نے کان پکڑ کر کہا۔ مجھے یقین تھا کہ تتلی کے مرنے کی وجہ سے اللہ میاں نے گُل کو سزا دی ہے۔ امّی نے مجھے بعد میں بتایا۔ گُل بیہوشی میں بڑبڑا رہی تھی، 'میں نے تتلی کو جان سے مار دیا، اب میں بھی مر جاؤں گی۔ میں بھی مر جاؤں گی۔'

پھر آدھی رات کو جب ہوائیں تیز ہوگئیں اور تارے اپنی آنکھیں زور زور سے جھپکنے لگے تو باہر کھیتوں سے کتوں کے رونے کی بھیانک آوازیں بلند ہوئیں۔ میں ایک دم سہم گیا۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ میں نے سُنا تھا موت کے فرشتے کو دیکھ کر کتے رویا کرتے ہیں۔ میری نگاہ صحن سے پرے دروازے پر جم کے رہ گئی۔ پھر نہ جانے کیا ہوا اچانک میں نے خود کو رستم ایسا بہادر محسوس کیا۔ میں اٹھ کر دالان کے در میں کھڑا ہوگیا۔ 'دیکھوں میرے ہوتے موت کا فرشتہ کیسے اندر

(باقی صفحہ ۴۹ پر)

بشیر نیاز

نیلے بُرقعے کی جالی

لوگ اسے نیلے برقعے کی جالی سمجھتے رہے مگر میرا خیال تھا — "شفالی" — سگریٹ کا دھواں ہے جو بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھ کر نیلے دریچے سے باہر نکل جاتا ہے۔

وہ بات کا آغاز یوں کرتی ہے جیسے سگریٹ لائٹر جلتا ہے — سگریٹ لائٹر اپنے آس پاس چند ٹوٹے تارے چھوڑ کر شعلہ بن جاتا ہے۔ شعلہ دیر تک جلتا رہتا ہے — شفالی کی باتیں بھی یوں ایک تار ہو کر چلتی ہیں جیسے سگریٹ لائٹر جلتا ہے — وہ سگریٹ لائٹر کتنی ہی حساس ہے — کتنی آگ ہے اس کے اندر۔

اس کی رنگت ایسے ہی گلابی ہوتی ہے جیسے کوئی کافی کے رنگ میں ہونے سے کریم ڈالے تو پیالی کی سطح پر پہلے تو گاڑھے گاڑھے بادل بنتے ہیں بالکل آبی رنگوں والی تصویروں جیسے — لیکن پیالی میں چمچ چلاتے ہی سطح بے داغ ہو جاتی ہے — چاکلیٹی رنگت والی۔ بالکل ایسے ہی — "شفالی" کے فیروزی رگوں والے ہلکے پیلے چہرے میں مسکراہٹ کی لالی گھلتی ہے۔ پہلے خون اس کے گالوں کے دائرے میں کھلتا ہے اور کانوں کی کاغذی لوؤں میں بھی — پھر اس کا روم روم یوں گلابی ہوتا ہے جیسے برتن میں نیل کی پوٹلیا نچوڑ کر کوئی ہاتھ سے پانی جھکول دے۔

تب اس کے بائیں گال پر سیاہ تل بڑا ہی اُبھرا اُبھرا لگتا ہے گلابی رنگت میں کالا تل — ویسی ہی رنگت میں سیاہ تل لئے اگر وہ سڑک پر نکل آئے تو بسوں کی دھن میں بوکھلا بھاگنے والے لوگ ٹھٹک کے رہ جایا کریں وہ ایک تل دیکھ کے لئے — اور پھر کسی اس کے قریب سے بھاگ کر گزرنے شخص کو دیکھ کر کتنا پڑ جائے۔

"سیتا تو یہ کمڑی ہے تم کو نسا سوئمبر جیتنے جا رہے لوگ اسے درو پدی سمجھ کر ہی ملتے تو بات حوصلہ نہ تھی — درو پدی پر لوگوں نے جوا کھیلا تھا۔ کسی نے ذرا بھی تو خودی کا وقار قائم رکھنے کے لئے۔ لیکن شفا کی زندگی تو طوائف کے بوسیدہ قالین جیسی ہے — طوائف کا قالین جس پر کتنے ہی تماش بینوں کی آرزوؤں جوتوں کے نشان بن کر جم گئی ہیں — ان مختلف سائز کے جوتوں کے نشان دیکھ کر کوئی آخر کتنے قدموں کی پہچا کرے۔

طوائف کی چاندنی بچھتے حجرے میں ایک بار تو پان داغوں کی دھول دُھلوا لیتی ہے مگر کشمیری قالین کا داغ ضمیر کی پھانس بن کر اس کے ماتھے کا غبار بن جاتا ہے معطر رومالوں سے عینکوں کے شیشے پونچھنے والے جا

کتنے ایسے لوگ ہیں جو کشمیری قالین کی پیشانی گرد آلود کر کے رات کے اندھیرے میں یوں روپوش ہوئے جیسے بھنور میں کنکر کھو جاتی ہے۔ کنکری گم ہو جاتی ہے لیکن پانی کی نیلی سطح پر لہروں کے لہریئے نہیں چھپا سکتی ان لہریوں میں آ کر تو چاند کا سایہ بھی کرچی کرچی ہو جاتا ہے۔

طوائف کے کمرے میں بچھا قالین دیکھ کر مجھے شفالی یاد آ جاتی ہے، اور میں سوچتا ہوں یہ قالین جانے کس کڑی ڈاڑھی والے کشمیری نے سردیوں کی ٹھنڈی راتوں میں کانگڑی جلا کر بُنا ہو گا۔ اس کے سینے پر بیلیں بناتے ہوئے اُسے اپنی بیٹی کی مینڈیاں یاد آ گئی ہوں گی۔ ہو سکتا ہے اس نے یہ قالین بیٹی کے سونے ہاتھوں کے کنگن خریدنے کے لئے بنا ہو۔ جانے اس کڑی ڈاڑھی والے نے دل میں کتنی پیلے پیلے چہروں والی آرزوئیں لے کر بنا ہو گا۔ لیکن لمبی گھنی بھنوؤں کے نیچے آنکھوں میں شہوت کے چراغ جلا کر اندھیری راتوں میں نکلنے والے اس قالین پر جوتوں کی گرد اور سگریٹوں کی خالی ڈبیاں چھوڑ جاتے ہیں ——

شفالی کو دیکھ کر مجھے جانے ایسا کیوں لگتا ہے جیسے کوئی لڑکی افراتفری میں سیڑھیاں چڑھ رہی ہو —— سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اسے کچھ یاد آ جائے تو وہ یوں رُکے جیسے آگے بڑھی تو مکان کا کنگرہ گر پڑے گا —— آدمی چاہتا ہے وہ سدا مسکراتی رہے مینڈولن کے سُروں کی طرح۔ پر اس کے چہرے پر تو ایک ایسی سہمی سہمی کیفیت چپک گئی ہے گویا اس کے ہاتھ سے چائے کی پیالی گر گئی ہو اور مارے خوف کے وہ چائے کی جلن بھی نہ کہہ سکی ہو۔

پہلے دن مجھے وہ ایک فلم کے سیٹ پر نظر آئی —— بتایا گیا کہ یہ فلم کا مرکزی کردار ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک جملے کے ساتھ دوسرا جملہ شروع کرنے کے درمیان آنکھیں یوں جھپکاتی ہے جیسے موسیقار استھائی اور انترے کے درمیانی وقفے میں سازینے کا ٹکڑا "فِٹ" کرتے ہیں۔ وہی تاثر ویسا ہی درد جیسے گانے والا سانس لینے کے لئے رُک گیا ہو۔ لیکن اس کی پلکوں میں وائلن کے سُر نہیں ہارمونیم کی کھرج کی سُریں ہیں۔

مسکراتے مسکراتے شفالی کا منہ اگر اس قدر چڑ گیا ہے کہ وہ اصلی مسکراہٹ بھی دے تو اصلی نہیں لگتی تو اس میں قصور شفالی کا اپنا نہیں۔ کیونکہ شفالی جس جگہ سے فلم کے سیٹ پر چلی آئی ہے وہاں لوگ عورت سے یوں ملتے ہیں جیسے عورت عورت نہیں لائبریری کی کتاب ہے — چند لوگ اس کے ساتھ بدذوق قاری بن کر ہی پیش آئے ہیں جو کسی دوشیزہ کے گال جیسے کتاب کے ورقوں پر اپنی بدخط تحریروں کی اُبکائی کرنا نہیں بھولتے۔ اگر تھوڑا ڈائنامیٹ مل جائے تو اس میں سے تھوڑا استعمال ان لوگوں پہ کیا جائے جنھیں اس قدر تمیز نہیں کہ کتاب کا صفحہ کسی پیشاب خانے کی دیوار نہیں ہوتا —— دیواریں اور کتابیں خط کشیدہ سطروں پر آنچل نہیں ڈال سکیں مگر شفالی نے اپنی مسکراہٹوں پہ پردہ ڈال لیا ہے —— اس کی بد وضع مسکراہٹ دیکھ کر سوچتا ہوں کوئی بدذوق دودھ کے پیالے میں شراب کے قطرے ٹپکا کر نہیں پیتا مگر شفالی کو دیکھ کر تو یہی لگتا ہے جیسے لوگ عبادت گاہوں میں بیٹھ کر چرس کے دَم لگاتے رہے ہیں یا اُدھ کھلے کنول ہاتھوں میں لئے آتش دانوں پر کیکر کی چھال کا خمیر اُٹھاتے رہے ہیں۔

وہ جب انگلی گھما کے یوں بات کرتی ہے جیسے ہوا میں جملہ لکھنا چاہتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے کسی تماش بین سے نوٹ پکڑ رہی ہے۔ سبز و سرخ نوٹوں کی ساری سرسراہٹ ایک جگہ اکٹھا ہو کر اس کے ہاتھ کی جنبش بن گئی ہے کون کہے۔

"لڑکی تم بات کرتے ہوئے ہوا میں نوٹ کیا پکڑتی ہو کیا تمھارے ہاں ایسا نہیں ہوتا کہ ایک ہلکی سی جھک

الا پھول تو ر[illegible]وڑے میں لگا لیا جائے۔
تمہارے پھولوں کے ہار باسی پنکھڑیاں بنا کر گھورے
پر کیوں پھینک دیئے جاتے ہیں۔
پھول اور چہرے کی عمر تمہارے ہاں صرف ایک ہی
رات کیوں ہوتی ہے۔
تم ہر رات نیا سنگھار کرتی ہو،
نئی شمع جلاتی ہو۔
اور نئے پھول منگاتی ہو۔
کچھ لوگوں نے اس کے ساتھ یوں تعلقات بڑھائے
ہیں جیسے اُگالدانوں میں ڈال کے غٹ غٹ شراب پیتے ہیں۔
کون سمجھائے۔
عقل کے بیریو! چینی کی پیالیوں میں نہیں تھوکتے۔
شفالی تو چینی کی پیالی جیسی پیاری لڑکی ہے۔
کاغذی کناروں والی چینی کی پیالی جیسی۔۔۔ جس کے
سنہری کناروں سے قہوے کا غبار اُٹھے تو غالب کی غزلیں
یاد آجاتی ہیں۔ میں چاہتا ہوں آدمی اس سے صرف اسی
قدر خدمت لے کہ اس کے سامنے بیٹھ کے بے خود ہو جائے۔
اور بس!
لیکن نچلے ذوق کے لوگ سمجھتے ہیں وہ تو شراب کا
مٹکا ہے، اور شراب کی دھاریں جب تک باچھوں سے بہہ کر
قمیص کے دامن کو تر نہ کر دیں پینے کا حق ادا نہیں ہوتا۔ اور
پھر کچھ لوگوں نے اس کی جانب یوں دیکھا ہے جیسے وہ لڑکی
نہیں "ڈسٹ بن" ہے لوگ ترشے ہونٹوں جیسے کناروں
والی چینی کی پیالی میں کتھا لگے کاغذ پھینک کے چلے گئے
ہیں۔ اگر دانوں میں کبھی کسی نے سگریٹ بھی بجھائے ہیں۔
میں نہیں کہہ سکتا کہ کس نے اس اگر بتی کی طرح جلتی لڑکی کو
گوشت کی دکان میں لگا دیا ہے۔
اس دور کے لوگ بھی کتنے غلیظ ہیں۔
آپ نے ان لوگوں کی ناکوں پہ شاید غور نہیں کیا۔

اگر آپ ان لوگوں کی ناکوں پہ ذرا بھی غور کریں تو اس پورے
دور کا المیہ سمجھ میں آجائے۔ چھوٹے چھوٹے دفتروں میں
کام کرنے والے ان لوگوں کی ناکیں ان کے جوتوں ہی کی
طرح بد وضع ہو رہی ہیں۔
میں ان میں سے کتنے ہی لوگوں سے ملا ہوں۔
میں نے ان کی ناکیں بڑے غور سے دیکھی ہیں۔ جو اسی
بری طرح پھیلی ہیں جیسے پرانے جوتے کی "نو" بگڑتی ہے۔
یہ دفتروں کے کلرک، اخباروں کے جرنلسٹ، کمیشن ایجنٹ،
رسالوں کے ہاکر، بسوں کے کنڈکٹر اور خالی بوتلیں بیچنے والے
ان میں سے ہر ایک کی شکلیں مسخ ہو رہی ہیں اور اس کی
وجہ یہ ہے اس دور کا اخلاق بد وضع ہو رہا ہے، یوں لگتا
ہے جیسے بھنبوڑ ڈالنے کے جذبے کو کسی نے ان چہروں پہ
"گم" سے چپکا دیا ہے۔
میرے ذہن میں انہی لوگوں کے سگریٹ کے دھوئیں
سے نسواری ہاتھ، چیک بکوں پر دستخط کرنے والی انگلیاں،
چمکیلے جوتوں میں جکڑے پیر، خوبصورت گھڑیاں بندھی
کلائیاں اور چشمے لگی آنکھیں کلبلا رہی ہیں ان میں
دھونیوں کی گرم بھٹیاں سلگ رہی ہیں۔ جن سے بھاپ
بن بن کر میل کچیل کی بدبو اُٹھ رہی ہے۔ ان لوگوں کے
ذہن پر ملنے کے لئے کون سا سمندر جھاگ لائیں۔ کبھی پانی میں
بھیگے لوہے کی چمک بھی بحال ہو سکی ہے۔ ان لوگوں کو جانے
کس نے مٹی میں گاڑھ دیا تھا۔ نیک خواہشات کی چمک
ان کے چہروں سے یوں اُتر گئی ہے جیسے تام چینی کے
برتنوں میں لوہے کے سیاہ داغ نکل آتے ہیں۔
انھوں نے اپنے چہروں کو خود ہی مضحکہ خیز بنالیا ہے۔
انہی لوگوں نے "شفالی" کو لائبریری کی کتاب بنا لیا
ہے۔ کاش ان میں ذرا بھی بافہم ہو تو طوائف کے جسم سے وہ
ساری تحریریں پڑھ سکتا ہے جو کتابیں پڑھنے والے لائبریری
کی کتابوں پہ لکھنا بھولتے نہیں۔ وہ یوں ہاتھوں ہاتھ چلی

ہے جیسے لوگوں نے اس کا ایک ایک اقتباس پڑھ لیا ہو آپ
کو تجربہ ہو شاید برسات کی بارش میں لائبریری کی پرانی
کتاب سے ایک خاص "فلیور" آتی ہے۔ لیکن جو "فلیور" شفالی
سے آتا ہے وہ بالکل میکرو پول کے سگریٹوں ایسا ہے ــــ
میکرو پول کا سگریٹ جس کی مہک پینے والے کو اتنی نہیں
آتی جتنی اس کا دھواں سونگھنے والے کو ــــ اس کی تو صرف
آرزو ہی کی جائی چاہیئے ــــ لیکن وہ جب سیٹ پر آتی
ہے تو لوگوں کے کانوں میں چاول اُبلنے لگتے ہیں۔ اور
وہ مسکراتی جاتی ہے بڑی ہی غیر قدرتی مسکراہٹ :۔

"مثال دینے والے اسے "جوس" کے گلاس سے بھی
مثال دیتے ہیں۔ جوس کا گلاس جس میں ٹھیلے والے "ایسنس"
ڈال کر سکرین کا ذائقہ چھپانے کے لئے ڈھیر ساری برف
کے ٹکڑے بھر دیتے ہیں۔ گاہک ہرے پیلے رنگوں پہ ٹوٹ
پڑتے ہیں۔ "سکرین" اپنی کھار لے کر گلے میں اُبھرتی ہے
تو احساس ہوتا ہے رنگوں نے ڈس لیا ہے لیکن تب بہت
دیر ہو چکی ہوتی ہے۔

گلابی جاڑوں کی ایک کنکنی سی سہ پہر تھی جب شمالی
بادلوں جیسے بالوں والی لڑکی کو سزا دی گئی

وہ لڑکی نرگس کے پھولوں جیسے سہمے سہمے ایک لڑکے
کی محبت میں مبتلا تھی۔ کبھی محبت کا بھید بھی چھپا ہے۔ ان
کی محبت کی بات بھی کھیت کھیت پھیل گئی ــــ۔ تب ایک
دن بستی کے بوڑھوں نے ابروؤں کی کمانیں کھینچ کر فیصلہ
دیا ــــ

"محبت کرنے والے سنگسار کر دیئے جاتے ہیں۔
کہو کیا کہنا چاہتے ہو"

وہ دونوں یہ بھی نہ کہہ سکے ــــ "محبت پتھروں سے
نہیں ڈرتی"

اُڑتے بادل جیسے بالوں والی لڑکی نے بلتے ہی خاطر
ہونٹوں کو دانتوں سے کاٹ کر دو موٹے موٹے پیازی آنسو گرائے
کہنے والے کہتے ہیں "اپریل کے موسم میں گل مہر پر جو پھول
آتے ہیں اسی لڑکی کے آنسو ہیں۔

شفالی گل مہر ہی کا ایک پھول ہے ــــ لوگ
جسے نیلے برقعے کی جالی سمجھتے ہیں۔

بقیہ "تتلی گل اور میں"

آتا ہے۔ مجال ہے کوئی میری گل کو ہاتھ لگائے۔ میں نے دل ہی دل
میں کہا۔ کتے اب تک باہر رو رہے تھے۔

رات اچانک بے حد تاریک ہو گئی۔ سناٹا بے حد گہرا
ہو گیا۔ ہوا کے تیز جھونکے سے دفعتہً دروازے کی زنجیر کھڑکھڑائی۔
میں چھلانگ مار کے دروازے کے پاس آگیا۔ دل زور زور سے
دھڑکنے لگا۔ میری مڈبھیڑ شاید ملک الموت سے ہونے والی تھی۔ میرے
بازو آپ ہی آپ کس گئے۔ نگاہیں دروازے میں پیوست ہو گئیں۔
کان ملک الموت کے قدموں کی آہٹ لے رہے تھے۔ "دیکھے
میکے باہر نکال دوں گا" میں نے چلا کر کہا۔ پھر کتا ایسی کربناک آواز
میں چیخا۔ جیسے کسی نے اس کا نرخرا چاقو سے کاٹ دیا ہو۔ میں بالکل
تیار ہو گیا۔ میرے سارے بدن پر رونگٹے کھڑے ہو گئے۔
...وہ مرے عقب سے اٹھی۔ میں اچھل کر مڑا۔ امی
گل کی پٹی پر سر رکھے بلک بلک کر رو رہی تھیں۔ ابا جی نے اُن کے
شانے پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ اندر دالان کے ایک گوشے میں چراغ
کا شعلہ بھڑک رہا تھا۔ میں بھاگ کر گل کے پاس واپس آگیا۔

"گل مر گئی۔ گل مر گئی"۔ امی کی رندھیائی ہوئی آواز
سیسہ مرے کانوں میں پگھلا۔ "گل مر گئی۔ گل مر گئی۔" الفاظ ٹوٹ
ٹوٹ کے میرے ہونٹوں سے نکلے۔ ملک الموت مری نگاہ بچا
چپکے سے اپنا کام کر گیا تھا۔ "بزدل کہیں کا ــــ ایک بچے سے
ڈر گیا" میں نے سوچا اور جھک کر اپنی بہن کو باہوں میں لے لیا
جیسے دفعتہً میں بہت بڑا ہو گیا تھا۔

لیکن زمانہ بیت گیا لیکن آج بھی کہیں تتلی نظر آجاتی۔
تو دل گل کو ڈھونڈتا ہے۔

ثقافتی ورثہ

شیخ ایاز
ترجمہ : آفاق صدیقی

○

زندگی کے جال میں
کتنی ہی خوشیاں اچانک آگئیں
خوب ناچیں اور تڑپ کر مرگئیں
پیار کی کیا کیا اُمنگیں نت نئی خوشیوں میں تھیں

اس بھری دُنیا کی ہر شے بے ثبات
موت سے بچ کر رہی ہے کس کی ذات
پھر بھی ہے پیاری ہمیں یہ کائنات

کون کہتا ہے کہ رنجیدہ رہو
ہر گھڑی ہے اک دفینہ
اس میں تم کرتے رہو
اَنمول ہیروں کی تلاش

ہر غبار آلودہ شام اک نیاریے کی جھول ہے
وقت آئے گا کہ جب اس جھول سے
نکلیں گے لاکھوں ستارے
جگمگاتے جاگتے
سونے کے ذرّوں کی طرح

حُسنِ استقلال سے اس وقت تک
لو ہماری مشعلِ اُمید کی
اپنے سب ہمراہیوں کی راہ میں
نو بہ نو ہوتی رہے گی ضوفشاں

مصنّفین کی تخلیقی سرگرمیاں

(کتابیں جو حال ہی میں چھپی ہیں یا زیرِ طبع / زیرِ تصنیف ہیں)

ممتاز حسین

ادب اور شعور

(تنقیدی مضامین کا نیا مجموعہ)

زیرِ طبع

ناشر: اُردو اکیڈمی سندھ۔ کراچی

نواز

ڈوہنگیاں

(پنجابی کہانیاں)

قیمت ۔ ۲/۵۰ روپے

ناشر: الجدید چوک، انارکلی ۔ لاہور

منیر جعفری

رنگِ جنوں

(مجموعہ کلام)

قیمت .... ۲ روپے

ناشر: ادارہ ادبیات نو۔ چوک انارکلی لاہور

احمد ریاض (مرحوم)

موجِ خون

قیمت پانچ روپے

ناشر

مجلس یادگارِ ریاض ۔ کچہری بازار لائل پور

ظہیر فتحپوری

مرزا ہادی رُسوا کے ناولوں کا تنقیدی و تحقیقی مطالعہ

(زیرِ تصنیف)

مولوی محمد اسد اللہ (علیگ)

قاعدہ

(بچوں کے ابتدائی درجوں کے لئے)

ملنے کا پتہ

انیس میڈیکل اینڈ جنرل سٹور

فریر روڈ۔ آرام باغ کراچی

میر باقر علی (مرحوم)

خلیل خاں فاختہ

(داستان)

قیمت: دو روپے

ناشر: ادارہ داستان، مقابل اُردو کالج

آر۔ سی۔ ۲۹/۶ رنچھوڑ لائن کراچی

اقبال متین

اُجلی پرچھائیاں

(افسانوں کا مجموعہ)

قیمت: ۴/۵۰ روپے

ناشر: مکتبۂ صبا حیدرآباد ۔ دکن

محبوب خزاں

اکیلی بستیاں

(مجموعہ کلام)

زیرِ طبع

اختر سلیمی

میسم

(افسانوں کا مجموعہ)

زیرِ طبع

خورشید احسن صدیقی

شبلی بحیثیت اُردو شاعر

(تنقید) (زیرِ طبع)

کرشن چندر

ایک خوشبو اُڑی اُڑی سی

(نئے افسانوں کا مجموعہ)

ناشر: مکتبہ افکار ۔ رابسن روڈ ۔ کراچی

زبیر رضوی

سازو آواز

(مجموعہ کلام) (زیرِ طبع)

ناشر

مکتبۂ صبا ۔ حیدرآباد ۔ دکن

محشر بدایونی

بین باجے

(بچوں کے لئے نظمیں)

قیمت: ۲ روپے

ناشر: بچوں کا کتبہ۔ ۱۳ مدینہ مارکیٹ
گارڈن روڈ۔ کراچی

پروفیسر محمد عبدالغنی نیازی

قرآنی تصوف اور اقبال

قیمت: آٹھ روپے

ناشر: فیروز سنز۔ لاہور

فاضل زیدی

نذر داغ

(زیر طبع)

قیمت: ۵ روپے

ناشر: دارالبلاغ، محمد نگر
اقبال روڈ لاہور

محمد فائق ایم۔ اے

نفسیات

(زیر طبع)

شعبۂ تصنیف و تالیف
اُردو کالج۔ کراچی

انجم اعظمی

نئی تہذیب۔ نیا ادب

تنقید (زیر طبع)

فہمیدہ اختر

اپنے دیس میں

(افسانوں کا مجموعہ)

قیمت: ۵۰/۴ روپے

ناشر: یونیورسٹی بک ایجنسی۔
پشاور

(شیخ) اکرام الحق

شعر العجم فی الہند

ہندو پاکستان کے نامور و مقتدر
فارسی شعراء کا مبسوط تذکرہ

قیمت ۔ ۵۰/۱۲ روپے

ملنے کا پتہ

شعبۂ اشاعت الکرام
نشتر روڈ۔ ملتان

عبدالرؤف عروج

عہد میر

تاریخ و تذکرہ، تحقیق و تنقید

(زیر طبع)

ناشر: آفتاب اکیڈمی۔ اُردو بازار۔ کراچی

رشید جمال

سب کے لئے

(بچوں سے بڑوں تک کیلئے اصلاحی کہانیاں)

قیمت: ۲ روپے

ناشر: تاج کمپنی لمیٹڈ۔ کراچی

نجم عباسی

اگاڑی

انگریزی ناول کا سندھی
ترجمہ

(زیر طبع)

عارف حجازی

اصحاب فیل

(تاریخی ناول)

شاہین کا جہان

(رپورتاژ کا مجموعہ)

زیر طبع

قیمت: ۳ روپے

ناشر: ادبیات پاکستان
ناظم آباد نمبر ۲ کراچی ۱۸

ایف سلطانہ مہر

داغ دل

(رومانی ناول)

قیمت: ۲½ روپے

۱۸۱ پیر کالونی، مارٹن روڈ۔ کراچی

انجم اعظمی

لہو کے چراغ

شعری مجموعہ

قیمت: چار روپے

ناشر: کراچی آرٹ اکیڈمی۔ معرفت
انٹرنیشنل بک ڈپو۔ مشن روڈ۔ کراچی

علاقائی سرگرمیاں

(لاہور)

(پنجابی ذیلی حلقہ کا افتتاح)

۱۱ر جولائی ۱۹۶۱ء کو لاہور میں گلڈ کے پنجابی سب کمیٹی (ذیلی حلقہ) کا افتتاح ہوا اس تقریب کی صدارت صوفی غلام مصطفےٰ تبسم نے کی۔ حلقہ مغربی پاکستان کے سکرٹری سید وقار عظیم نے اپنی افتتاحی تقریر میں گلڈ کی علاقائی زبانوں کے متعلق پالیسی کی وضاحت کی۔ انھوں نے کہا کہ مغربی پاکستان میں اُردو کے متعلق ہمارا موقف، مسلک اور نصب العین یہ ہے کہ قومی زبانوں کا مرتبہ بہت اونچا ہو۔ قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں ہماری قومی زبانیں آہستہ آہستہ وہ مرتبہ حاصل کریں جو ان کے شایان شان ہے جن شعبوں میں قومی زبانوں کو یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوا ہے ہم سب کو اس کا مرتبہ بڑھانے کی کوشش کرنی چاہیئے کیونکہ یہ کوشش حقیقت میں پاکستان کی بنیاد کو مستحکم بنانے اور اس کی وحدت برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے علاقائی زبانوں کو پوری طرح اُبھرنے اور پھولنے پھلنے کا موقع نہیں ملا تھا ان زبانوں میں پاکیزہ اور حیات بخش خیالات کا ایک ایسا خزانہ محفوظ ہے جو منظر عام پر نہیں آیا تھا۔ چنانچہ اب زبانوں میں فکر، خیال اور بیان کے امکانات کو نمایاں کر کے ایک ایسے فکری اور تخیلی اسلوب کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے جو اپنی خصوصیات کے اعتبار سے ہماری قومی انفرادیت کی صحیح تصویر ہو۔ اُنھوں نے مزید کہا کہ پنجابی سب کمیٹی کا قیام علاقائی زبانوں کے فروغ کے سلسلے میں عملی منصوبے کی ایک کڑی ہے۔

پنجابی ذیلی حلقے کے سکرٹری ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے بتایا کہ گلڈ کے زیر اہتمام پنجابی کی دو کتابیں چھپ رہی ہیں ایک سائیں فیروز کا مجموعۂ کلام اور دوسری صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کی تالیف "پنجابی زبان کے صوفی شعراء" علاقائی زبانوں کے کلاسکی اور جدید ادب کے انتخاب کو اردو میں منتقل کیا جا رہا ہے۔ سندھی زبان کے تراجم کا مجموعہ زیر طباعت ہے۔ پشتو ادب کے تراجم کا انتخاب زیر ترتیب ہے۔ اور پنجابی ادب کے تراجم کا ایک ضخیم مجموعہ بھی عنقریب مرتب کیا جائے گا۔ جس طرح اُردو اور بنگالی کی بہترین تصانیف پر آدم جی انعامات کا سلسلہ جاری ہے اسی طرح پنجابی، سندھی، اور پشتو میں، شعر، افسانہ، اور تنقید کی بہترین تصانیف پر انعامات دیئے جائیں گے۔

پنجابی زبان اور ادب کو فروغ دینے کے لئے پندرہ روزہ یا ماہانہ ادبی مجالس منعقد ہوں گی۔ بہترین تنقیدی مقالات کا ایک مجموعہ کتابی صورت میں ہر سال شائع ہوگا۔ پنجابی زبان کے نادر کلاسکی شعراء اور شاہ

بھلے شاہ، اور ہاشم شاہ کی یاد میں خاص تقاریب منعقد ہوں گی۔ اُردو زبان کے شہ پاروں کو پنجابی زبان میں منتقل کیا جائے گا۔

اس سلسلے میں مندرجہ ذیل پیغامات موصول ہوئے۔

گلڈ کے نام پیغامات

قدرت اللہ شہاب سکریٹری جنرل

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ پاکستان رائٹرز گلڈ شاخ مغربی پاکستان نے ایک پنجابی سب ریجن قائم کیا ہے۔ جسے پنجابی کے ممتاز ادیبوں کی حمایت حاصل ہے اور جو ایک نمائندہ ادارے کے طور پر پنجابی زبان وادب کی ترقی کے لئے کام کرے گا۔
پاکستان رائٹرز گلڈ علاقائی زبانوں کے فروغ کے مسئلے سے گہری دلچسپی رکھتا ہے۔ اور انھیں قومی زندگی میں ان کا مقام دلانے کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے گا۔ علاقائی زبانیں قومی زبانوں کی حریف نہیں انھیں ایک دوسرے کے مقابلے میں لانے کی بجائے ایک دوسرے کے قریب لانا ہے۔ اور اس کی ایک صورت بین اللسانی تراجم ہیں جن کا پاکستان رائٹرز گلڈ آغاز کر چکا ہے۔ پنجابی ایک جاندار زبان ہے۔ قوی اُمید ہے کہ گلڈ کے پنجابی سب آفس کے باہمت اراکین اسے اور توانا بنانے کی کوشش کریں گے۔"

جسٹس ایس۔ اے۔ رحمانی

پاکستانی رائٹرز گلڈ کے "پنجابی سب ریجن" کا افتتاح مبارک ہو۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ تقریب پنجابی ادیبوں کے مخصوص مسائل حل کرنے میں مشعل راہ کا کام دے گی اور علاقائی اور قومی زبانوں کے درمیان باہمی تعاون کی راہیں ہموار کرے گی میں آپ کی کامیابی کے لئے دست بدعا ہوں۔

پنجابی سب زبجن کی اُدبی مجالس

پاکستان رائٹرز گلڈ، مغربی پاکستان کے پنجابی سب زبجن نے جس کا افتتاح حال ہی میں ہوا ہے اپنی پندرہ روزہ اُدبی نشستوں کا باقاعدہ آغاز کر دیا ہے۔ یکم اگست ۱۹۶۱ء کی نشست کا پروگرام یہ ہے۔

بزل حق محمود ایم۔اے	مقالہ
جناب عبدالمجید بھٹی	منظوم افسانہ
جناب اسمٰعیل قلندر	اپنا کلام سُنائیں گے

دوسری نشست ۱۶ راگست کو ہوگی جس کے پروگرام کا اعلان اخبارات میں کر دیا جائے گا۔ یوم وارث شاہ کی تیاریاں شروع کر دی گئی ہیں۔
تفصیلات کے لئے سکرٹری سے رجوع فرمائیں۔

دفتر: پرنسز ہوٹل، منٹگری روڈ لاہور (فون ۶۶۲۴۴)
سکریٹری سے خط وکتابت مسلم ٹاؤن لاہور کے پتے پر کریں (فون ۳۸۵۵)
عبدالسلام خورشید
(سکریٹری)

نئے لکھنے والوں سے

- جواب طلب اُمور کے لئے ہمیشہ لفافہ کارڈ یا ٹکٹ ارسال فرمایئے۔
- مرسلہ مضامین نظم و نثر کی ایک نقل اپنے پاس ضرور محفوظ رکھیئے۔ ناقابل اشاعت چیزیں ضائع کر دی جاتی ہیں
- تراجم پر اصل مصنف اور زبان کا نام ضرور رکھیئے۔
- تخلیقات ایڈیٹر کی ترتیب کے مطابق اپنے نمبر پر شائع کی جاتی ہیں تخلیقات کی فوری اشاعت پر اصرار نہ فرمایئے

(ادارہ)

ایک اہم اعلان

ادارہ "ہم قسلم" کو ہر ماہ بعض حضرات کی جانب سے پرچہ نہ ملنے کی شکایات موصول ہوتی ہیں۔ ادارہ ایسے تمام حضرات سے درخواست کرتا ہے کہ وہ ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک "ہم قسلم" کا انتظار فرمائیں تاریخ کے بعد ادارہ "ہم قلم" کو پرچہ نہ ملنے کی اطلاع دیں تاکہ اس سلسلے میں متعلقہ ڈاکخانوں سے مناسب کارروائی کے لئے رجوع کیا جاسکے۔

حیدرآباد میں تنظیم نو

مغربی پاکستان ریجن کے سکرٹری جناب سید وقار عظیم حیدرآباد کے اراکین کی درخواست پر جولائی کے آخری ہفتے میں حیدرآباد تشریف لے گئے تھے۔ اس اہم سب ریجن میں گلڈ کی ادبی سرگرمیوں کی رفتار تیز کرنے کے لئے موصوف نے وہاں سندھی اور اردو کے الگ الگ سب ریجن قائم کرنے کی تجویز منظور کرتے ہوئے اپنی نگرانی میں ان کے انتخابات بھی کرا دیئے دونوں سب ریجنوں کے عہدے داروں کی فہرست درج ذیل ہے:

سندھی

عہدہ	نام	
سکریٹری :	شیخ علی محمد صاحب	مدیر روزنامہ "عبرت"
نائب سکریٹری :	ممتاز مرزا صاحب	
خازن :	مخدوم امیر احمد صاحب	

اراکین مجلس عاملہ

نام	
جناب محمد عثمان ڈیپلائی	ایڈیٹر انسان
" محمد بخش جوہر	ایڈیٹر روزنامہ ہلال پاکستان
" شمشیر الحیدری	رکن سندھی ادبی بورڈ
" محمد خان غنی	پروپرائٹر ہاشم پرنٹنگ پریس

اردو

عہدہ	نام
سکریٹری	جناب ارشد رضا صاحب
نائب سکریٹری	جناب محسن بھوپالی
خازن	" حضور احمد سلیم

اراکین مجلس عاملہ :

جناب کوکب جمیل
" محمد احمد صاحب
" مرزا عابد عباس پرنسپل سٹی کالج
" جناب اختر انصاری اکبرآبادی
" سلطان جمیل
" مظہر عرفانی

یقین ہے کہ نئے عہدے دار جنہیں پرانے عہدے داروں کا کلی تعاون بھی حاصل ہے، جوش و خروش سے کام کریں گے اور حیدرآباد کی ثقافتی زندگی میں ایک نیا ولولہ پیدا ہوگا۔

یہ انتخابات مکمل اتفاق رائے سے ہوئے ہیں جس پر ہم حیدرآباد کے اراکین رائٹرز گلڈ کو مبارکباد دیتے ہیں۔

اطرافِ عالم

کتابوں کی بین الاقوامی نمائش

فرینک فرٹ میں ۱۱ر اکتوبر سے کتابوں کی بین الاقوامی نمائش منعقد ہو رہی ہے۔ اس نمائش میں دنیا کے تقریباً تمام ملکوں کے ممتاز پبلشرز حصہ لیں گے۔ توقع ہے کہ پاکستان کے پبلشرز بھی اپنی منتخب کتابیں نمائش میں پیش کریں گے۔ واضح رہے کہ فرینک فرٹ میں ہر سال دنیا بھر کی کتابوں کی نمائش ہوتی ہے۔ امسال یہ نمائش تقریباً سات روز تک جاری رہے گی۔

اُردو ٹائپ کے حروف لگانے کی خودکار مشین

حال ہی میں لینن گراڈ (روس) کے طباعت کا سامان تیار کرنے والے کارخانے نے اُردو ہندی، عربی، پشتو، فارسی، مرہٹی، بنگالی اور بعض دوسری زبانوں کے ٹائپ کی خودکار مشین تیار کی ہے۔ یہ مشین ، گھنٹے میں ۵۴ ہزار ٹائپ حروف لگا سکتی ہے۔ واضح رہے کہ اس سے قبل حروف لگانے کا کام ہاتھ سے ہوتا تھا۔

یورپی زبانوں کے لئے بھی اس مشین کو کام میں لایا جاسکتا ہے اس کا طریقہ یہ ہے کہ عبارت ٹائپ کرتے وقت حروف ایک کاغذ پر کٹتے جاتے ہیں جن سے بعد میں سیسے کی پلیٹ تیار کی جاتی ہے۔

[ای]شیا اور افریقہ کے بارے [می]ں مطبوعات کا نیا سلسلہ

ناشرین ویڈن فیلڈ اینڈ نکلسن (لندن) نے ایشیا اور افریقہ سے متعلق کتابوں کی اشاعت کا جو نیا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس میں "پاکستان و مسلم ہند کا مطالعہ" نامی کتاب بھی شامل ہے۔ جسے لندن کی مشرقی اور افریقی علوم کی درسگاہ کے شعبۂ تاریخ (مسلم عہد) کے لکچرار مسٹر پی۔ ہارڈی لکھ رہے ہیں امید ہے کہ برطانیہ میں یہ کتابیں انتہائی مفید ثابت ہوں گی۔

[ب]رطانیہ میں اُردو رسالہ کی مقبولیت

لندن میں گزشتہ دو ماہ سے جناب محمود ہاشمی کی ادارت میں ہفت روزہ "مشرق" شائع ہو رہا ہے۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ پہلا پرچہ ۲ ہزار چھپا تھا لیکن چند ہفتوں میں اس کی اشاعت ڈھائی ہزار تک پہنچ گئی۔ اس ہفت روزہ کے اجرا کا مقصد برطانیہ میں مقیم پاکستانیوں کو خبریں پہنچانا ہے۔

[۱۹۶۱]ء کا پلٹزر انعام

حال ہی میں کولمبیا یونیورسٹی نے اعلان کیا ہے کہ ۱۹۶۱ء کا پلٹزر انعام سال کے بہترین امریکی ناول To Kill a Mocking bird کے مصنف ہارپر لی کو دیا جائے گا۔ "پوسٹ ڈسپیچ" کا مالک اور ایڈیٹر جوزف پلٹزر نے اس انعام کی ابتدا کی تھی۔ پلٹزر انعام کا شمار امریکہ کے ادب اور صحافت کے گراں قدر انعامات میں ہوتا ہے

گلڈ کے ایک رکن کی انگریزی کتابیں

جناب اشرف صدیقی ایم۔اے (ڈھاکہ) ایم۔اے (انڈیانا) عظیم پورہ اسٹیٹ ذرہ جو گلڈ کے مشرقی پاکستان ریجن کے رکن ہیں، اطلاع دیتے ہیں کہ ان کی دو انگریزی کتابیں جن کی تصویریں امریکی آرٹسٹوں نے بنائی ہیں حال ہی میں امریکہ کی میکملن کمپنی اور ورلڈ پبلشنگ کمپنی نے شائع کی ہیں۔ امریکہ کے تمام اچھے ادبی پرچوں نے ان پر عمدہ تبصرے کئے ہیں۔

پچھلے دنوں صدر مملکت، فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں امریکہ گئے تو نیو یارک میں یہی کتابیں ناشرین کی طرف سے نذر کی گئیں۔

حلقہ کراچی

گلڈ کی ادبی نشستیں

۱۴ر جولائی ۱۹۶۱ء کو ہوٹل ایکسلسیر (صدر) کراچی میں ۵ بجے شام ادارۂ مصنفین پاکستان (حلقہ کراچی) کی پندرہ روزہ ادبی نشست جناب حامد عزیز مدنی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ پروگرام کے مطابق سید ذوالفقار علی بخاری سے حاضرین نے ان کی زندگی، فن اور شخصیت کے بارے میں مختلف سوالات کئے۔ بخاری صاحب نے نہایت تفصیل سے ان سوالوں کا جواب دیا۔ انھوں نے دوران گفتگو میں بہت سے ایسے واقعات اور تجربات بھی بیان کئے جنھیں اب تک بہت کم لوگ جانتے تھے۔ یہ دلچسپ نشست شام کے آٹھ بجے اختتام پذیر ہوئی۔

اس سلسلے کی دوسری نشست مورخہ ۲۸ر جولائی ۱۹۶۱ء کو مقررہ وقت کے مطابق شام کے ۵ بجے منعقد ہوئی۔ چھپے ہوئے پروگرام کے بجائے بیگم عطیہ فیضی کو زحمت دی گئی کہ وہ اپنی زندگی اور فن پر روشنی ڈالیں موصوفہ نے اپنی تفصیلی گفتگو میں اپنی زندگی اور فن کے تقریباً تمام پہلوؤں کو اُجاگر کیا۔

سکرٹری حلقہ مغربی پاکستان کے اعزاز میں عصرانہ

مورخہ ۲۶ر جولائی ۱۹۶۱ء کو شیزان، صدر میں حلقہ مغربی پاکستان کے سکرٹری پروفیسر سید وقار عظیم کے اعزاز میں ایک عصرانہ منعقد کیا گیا۔ حلقہ کراچی اور مرکزی گلڈ کے مجلس عاملہ کے اراکین نے بھی اس دعوت میں شرکت کی۔ اس موقع پر ایک بھارتی ادیب شاعر جناب محمود ایاز مدیر "سوغات" بھی موجود تھے جن سے حاضرین نے بھارت میں اُردو کے حال اور مستقبل کے بارے میں بہت سے سوالات کئے۔ یہ دلچسپ گفتگو رات کے آٹھ بجے تک جاری رہا۔

رسم الخط کے متعلق امریکی پروفیسر کی رائے

امریکن فرینڈز آف دی مڈل ایسٹ کے مطبوعات اور تحقیقات کے ادارے کے ڈائرکٹر ڈاکٹر رڈ ولف ڈاک ربو جو آج کل ان دنوں پاکستان کے تحقیقاتی دورے پر ہیں اردو کے لئے عربی رسم الخط باقی رکھنے کا مشورہ دیا ہے۔ امریکہ کے اس لسانی محقق اور ممتاز عالم کے نزدیک اُردو کے لئے لاطینی رسم الخط اختیار کرنا غیر دانشمندانہ بات ہوگی۔ موصوف نے کہا۔ . . . . کہ اگر عربی رسم الخط بدلا گیا تو نہ صرف گزشتہ کئی سو سال کا ادبی سرمایہ ضائع ہو جائے گا بلکہ ماضی سے سارے رشتے بھی منقطع ہو جائیں گے۔

حلقہ مغربی پاکستان

ہیمنگوے کی یاد میں ادبی نشست ۱۴ر جولائی ۱۹۶۱ء کو روٹری کلب (سکھر) میں پروفیسر حامد علی خاں کی صدارت میں مشہور امریکی ادیب ارنسٹ ہیمنگوے کی یاد میں ایک ادبی نشست منعقد ہوئی۔ پروگرام کے مطابق سب سے پہلے جناب آفاق صدیقی نے ہیمنگوے کی شخصیت اور فن پر اردو میں ایک مضمون پڑھا۔ اس کے بعد اردو اور سندھی کے مشہور شاعر جناب شیخ ایاز نے سندھی زبان میں اپنا مقالہ پیش کیا۔ آخر میں صدر مجلس جناب حامد علی خاں نے انگریزی میں تقریر کرتے ہوئے ہیمنگوے کے فن، مگی اور ان کی شخصیت پر روشنی ڈالی۔

اراکین گلڈ بھٹ شاہ میں ۲۸ر اور ۲۹ر جولائی ۱۹۶۱ء کو بھٹ شاہ میں سندھ کے مشہور صوفی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی کے ۲۰۹ ویں یوم وفات کی دو روزہ تقریبات منعقد ہوئیں۔ جن میں سال گزشتہ کی طرح اس مرتبہ بھی پاکستان رائٹرز گلڈ کے ایک وفد نے شرکت کی۔ گلڈ کا وفد ان ادیبوں پر مشتمل تھا۔

پنجابی سب ریجن لاہور سے عبدالمجید بھٹی

کراچی سے:

بنگلہ	مقصد علی اور مبذل وغیرہ
گجراتی	غلام مصطفیٰ
اردو	رفیق خاور (انور)

غازی صلاح الدین اور صادق مدہوش

بچوں کیلئے صدر کے اعزازات صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے پاکستان کونسل برائے بہبود اطفال کی تجویز پر طلباً کے لئے تین اعزازات جاری کئے ہیں۔ ان اعزازات میں سے پہلے کا مقصد کسی بچے کی اعلیٰ جرأت، کارکردگی، حوصلہ مندی اور خدمات کا اعتراف کرنا ہے۔ باقی دو اعزازات بہترین مصنف بچے اور بہترین آرٹسٹ بچے کو دئے جائیں گے۔ ۱۶ سال یا اس سے کم عمر بچے ان میں حصہ لے سکتے ہیں۔

یہ اعزازات سب سے پہلے ۲ر اکتوبر ۱۹۶۱ء کو دیئے جائیں گے

واضح رہے کہ اس سلسلے میں جو صوبائی کمیٹیاں بنائی جارہی ہیں ان میں سرکاری کونسل برائے بہبود اطفال، ریڈ کراس سوسائٹی اور کالجوں کے نمائندوں کے علاوہ پاکستان رائٹرز گلڈ کے علاقائی نمائندے بھی شامل کئے جارہے ہیں۔

سرگودھا اکیڈمی کا تنقیدی اجلاس پچھلے دنوں سرگودھا اکیڈمی کے زیر اہتمام ڈاکٹر وزیر آغا کی صدارت میں ایک تنقیدی اجلاس منعقد ہوا۔ پروگرام کے مطابق جناب نسیم بخاری نے ایک افسانہ بعنوان "کلرک کی موت" اور جناب غلام رسول ازہر نے اپنی غزل تنقید کے لئے پیش کی ——— اس موقع پر سرگودھا کے تقریباً تمام ادبا وشعراء موجود تھے۔

گلڈ لائلپور کا تنقیدی اجلاس

پاکستان رائٹرز گلڈ ذیلی پورسب ریجن کا ایک تنقیدی اجلاس ۱۴ر جولائی ۱۹۶۱ء کو چھ بجے شام ٹاؤن ہال لائلپور میں منعقد ہوا، صدارت جناب حیدر شکیب نے فرمائی۔

اس اجلاس میں جناب خلیق قریشی نے منظور احمد منظور کے تازہ مجموعہ کلام "دیدِ بینا" پر ایک مقالہ پڑھا جس پر خوب بحث ہوئی۔ اس کے بعد جناب تنویر جیلانی نے ایک سلجھی ہوئی نظم "شکستِ گمان" پیش کی۔ اس نظم میں پرانے اور مستعمل موضوع کو نئے انداز میں پیش کیا گیا تھا اس پر خوب بحث ہوئی اور نفسِ مضمون کی تعبیر کے سلسلے میں اراکینِ مجلس سے باہم سے اختلاف بھی کیا لیکن بحیثیت مجموعی نظم کو قابلِ داد قرار دیا گیا۔

سال کی بہترین اردو پشتو کتابوں پر انعام

۱۹۶۰ء کے بہترین اردو و پشتو کتابوں کے سلسلے میں اباسین آرٹ سوسائٹی پاکستان نے اپنے فیصلے کا اعلان کر دیا ہے۔ اردو کتب پر پہلا انعام "خوش حال و اقبال" کے مصنف میر عبدالصمد خاں۔ دوسرا انعام "یوسف زئی افغان" مصنفہ اللہ بخش یوسفی اور تیسرا انعام "اپنے دیس میں" کی مصنفہ مس فہمیدہ اختر کو دیا جائے گا۔ پشتو کتب میں سید بہادر شاہ ظفر کی تصنیف "ظفر اللغات" اجمل خٹک کی کتاب "گلگول" اور میجر ایس۔ اے۔ رحمان کی تصنیف تربوز بالترتیب پہلے، دوسرے اور تیسرے انعام کی مستحق قرار دی گئی ہیں۔

یوم اکبر الہ آبادی

جولائی ۱۹۶۱ء کے دوسرے ہفتہ میں بہاولپور میں یوم اکبر الہ آبادی منایا گیا۔ بہاولپور آرٹ کونسل کے زیر اہتمام پریس کلب میں "بزمِ اکبر" کے عنوان سے ایک دلچسپ ادبی محفل منعقد ہوئی۔ جس میں تقریباً ۴۴ منتخب شاعروں، ادیبوں، سرکاری افسروں اور معزز شہریوں نے حصہ لیا۔ اس بزم کی صدارت جناب اسلم عبداللہ معتمد، بنیادی جمہوریت مغربی پاکستان نے کی — واضح رہے کہ پاکستان رائٹرز گلڈ کے رکن جناب مختار مسعود ڈپٹی کمشنر بہاولپور اس موقع پر موجود تھے۔ موصوف نے اپنی تقریر میں اکبر کے فن، شخصیت اور زندگی پر روشنی ڈالی۔ آخر میں ہر شریکِ بزم نے اکبر کے تین تین پسندیدہ اشعار سنائے۔ جناب اویس نے اکبر کی بعض نظموں کے انگریزی ترجمے بھی پیش کئے۔

حلقہ مشرقی پاکستان

"فردوسِ خیال" کا یوم تاسیس

۲۱ر جولائی ۱۹۶۱ء کو برٹش کونسل سنٹر ڈھاکہ میں "فردوسِ خیال" کی تیسری سالگرہ منائی گئی۔ اس موقع پر ناظم ادارہ جناب اعجاز الحق اعجاز نے اپنی مختصر تقریر میں "فردوسِ خیال" کے قیام، اس کے اغراض و مقاصد، اور آئندہ لائحہ عمل پر روشنی ڈالی۔ "فردوسِ خیال" مشرقی پاکستان کا ایک فکری و تخلیقی ادارہ ہے جس کا مقصد فکر و فن اور ثقافت کی ترقی ہے۔

اس تقریب میں ایک مشاعرہ بھی منعقد ہوا جس میں حنیف فوق، صلاح الدین محمد، افسر ماہ پوری، عابد داتا پوری، طیش برنی، احسن عزیز، شاعر صدیقی، رشید الزماں خلش، اختر لکھنوی، حسین فریدی، شہناز پروین اور رضا مشرقی وغیرہ نے شرکت کی۔

پاکستانی ادب کے ترجمے

دعوتِ عام

ہم نے انگلستان، مغربی جرمنی، ہالینڈ، اٹلی، سوئٹزرلینڈ، فرانس اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کے مختلف اداروں سے گلڈ کے لئے روابط پیدا کرلئے ہیں۔ ان ممالک کے ناشرین اور ادیبوں کی انجمنوں نے پاکستانی ادب سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ فی الحال سوائے چند کلاسیکی کتابوں کے وہاں کے پڑھنے والے پاکستانی ادب کے بارے میں کچھ نہیں جانتے جسکی بڑی وجہ یہ تھی کہ خود ہمارے ملک سے کوئی ایسی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ دوسرے یہ کہ ہمارے ادب کے تراجم انگریزی میں موجود نہیں ہیں۔

اب جو ہم نے یہ روابط پیدا کرلئے ہیں یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی بہترین تخلیقات کے ترجموں پر توجہ کریں۔ اور اس کے علاوہ پاکستانی ادب اور ثقافت سے متعلق انگریزی میں لکھی ہوئی طبع زاد کتابوں اور مضامین کو بھی متعلقہ اداروں تک پہنچائیں۔ فی الحال ہم انگریزی زبان پر زور دے رہے ہیں کیونکہ موجودہ انتظامات کے مطابق دوسری یورپی زبانوں کے ناشر ہمارے ارسال کردہ انگریزی ترجموں اور طبع زاد مواد سے اپنی زبانوں میں خود ترجمہ کرالیں گے۔

گلڈ سب مترجمین کو دعوت دیتا ہے کہ وہ مندرجہ ذیل موضوعات پر اپنے انتخابات کا ترجمہ نمونتاً ہمیں بھیجیں۔

۱۔ پاکستانی ثقافت۔ پس منظر اور حال ۲۔ ناول

مترجم کے لئے ضروری ہے کہ پہلے وہ ایک سبق یا باب کا ترجمہ کرکے پورے ناول یا کتاب کے خلاصہ کے ساتھ گلڈ کو بھیجے اور معاوضے کی شرائط بھی لکھ دے اگر وہ قابل قبول ہوئیں تو معاہدہ کرلیا جائے گا۔ واضح رہے کہ بیرونی انجمنوں نے زیادہ تر ناولوں اور ثقافتی موضوعات کی فرمائش کی ہے نظم، افسانہ، اور ڈرامہ ان ممالک میں تجارتی طور پر منفعت بخش سودے نہیں ہیں اس لئے گلڈ خود ان کے تراجم برائے اشاعت مرتب کرے گا۔

واضح رہے کہ اگر اس پروگرام کے سلسلے میں مترجمین اور ادیبوں کا ضروری تعاون حاصل نہ ہوا تو ہم ایک نادر موقع کھو دیں گے۔ ابھی ہمارا تعلق ان ناشرین اور انجمنوں سے تازہ ہے اور ضروری ہے کہ ہم اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔ اس پروگرام میں دیگر فوائد کے علاوہ ادیب اور مترجم کا مالی فائدہ بھی ہے گلڈ اپنی خدمات بلامعاوضہ پیش کرتا ہے اور ڈاک کے اخراجات بھی برداشت کرے گا۔ ناولوں اور ثقافتی کتابوں کے مترجمین کو جزوی پیشگی معاوضہ بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔ ہم چند مترجمین یا ادیبوں کو انتخاب کرنے کی بجائے ایک عام دعوت دے رہے ہیں تاکہ سب کو یکساں مواقع ملیں اگر اس پیشکش کا جواب خاطر خواہ نہ ملا تو پھر ہم از خود انتخاب اور ترجمے کی ذمہ داری سنبھالیں گے۔ ادیبوں اور مترجمین کے لئے گلڈ کا رکن ہونا ضروری نہیں ہے۔

اس سلسلے میں مزید خط و کتابت مرکزی دفتر سے کی جائے۔

ایشیا میں یونیسکو کے سالانہ ثقافتی پروگرام کی جھلکیاں

(اقتباس از یونیسکو رپورٹ)

ماہرین کے وفود جناب ایف. گارڈنر (انگلستان) نے ایشیائی کتب خانوں کا جائزہ مکمل کر لیا ہے۔

جناب بے. تھامیوس (سویڈن) نے سیلون میں کتابوں میں خاکے، تصاویر اور مرقع شائع کرنے کی تکنیک پر تربیتی پروگرام کی ابتدا کر دی ہے۔ اس موضوع پر جناب آر۔ او۔ ہوج گل (متحدہ امریکہ) نے پاکستان میں تربیتی کام کیا۔

فیلوشپ Reading Material کے منصوبے پر متعلقہ حکومتوں کی منظوری سے مندرجہ اصحاب کو فیلوشپ کے لئے منتخب کیا گیا۔

برما: یو۔ ڈو۔۔۔ مارکٹنگ مینجر۔ برما ٹرانسلیشن سوسائٹی۔ رنگون

سیلون: جناب ڈی۔ گناوردین نائب اشاعت انجمن اتحاد الاخبارات۔ کولمبو

ہندوستان: جناب دینا ناتھ ملہوترہ۔ ڈائرکٹر ہند پاکٹ بکس پرائیویٹ لمیٹڈ۔ دہلی

ایران: علی اسائی اردکانی۔ نائب ڈائرکٹر محکمہ اشاعت، محکمہ تعلیم تہران

پاکستان:* جناب جمیل الدین عالی۔ ایگزیکٹو سکریٹری پاکستان رائٹرز گلڈ (مرکز)

بین العلاقائی تعلیمی دورے

مندرجہ ذیل حضرات کو مختصر مدت کے بین العلاقائی تعلیمی گرانٹ دیئے گئے:۔

برما: (۱) اونگ نیٹ۔ مینجر بی۔ ٹی۔ ایس بک شاپ۔ رنگون

(۲) یو نٹ۔ ڈپٹی سیلز مینجر۔ بی۔ ٹی۔ ایس بک شاپ۔ رنگون

سیلون: مسٹر کے۔ جی۔ امرداسا۔ سکریٹری نیشنل بک ٹرسٹ۔ کولمبو

ہندوستان: مسٹر ایس۔ کے۔ تھمبا۔ پروڈکشن آفیسر۔ سدرن لینگویجز بک ٹرسٹ۔ مدراس

پاکستان: مسٹر ایم۔ آئی۔ علی۔ سکریٹری بنگالی اکیڈیمی۔ ڈھاکہ

کتب فروشی کے متعلق مذاکرات

مندرجہ ذیل اداروں کو ۱۹۶۱ء میں کتب فروشی کے متعلق تربیتی نصابوں/مذاکرات کا انتظام کرنے کیلئے مقرر کیا گیا

برما ٹرانسلیشن سوسائٹی۔ رنگون

نیشنل بک ٹرسٹ آف سیلون۔ کولمبو

بک انڈسٹری کونسل آف ساؤتھ انڈیا۔ مدراس

شعبہ مطبوعات۔ وزارت اطلاعات۔ حکومت ہند۔

---

* اس سے پہلے اسی منصوبے کے ماتحت جناب قیوم نظر جنرل سکرٹری حلقہ ارباب ذوق لاہور اور جناب عزیز احمد سکرٹری حلقہ ارباب ذوق کراچی کو یونیسکو فیلوشپ مل چکی ہے۔

پاکستان پبلشرز اینڈ بک سیلرز ایسوسی ایشن۔
پبلشرز سوسائٹی آف ایران

کتب خانوں کی سہولتوں کی توسیع

مندرجہ ذیل اداروں کو سامان اور کتابیں مہیا کی گئیں :۔
دی لائبریری آف برما ٹرانسلیشن سوسائٹی۔ رنگون۔
نیشنل بک ٹرسٹ آف سیلون
ایران میں مرکز تعلیم بالغان کے کتب خانے
ایران میں ہائی اسکولوں کے کتب خانے
کراچی میں تھیوسافیکل سوسائٹی لائبریری کا شعبہ اطفال اور ایسٹ پاکستان سنٹرل لائبریری ڈھاکہ

مصنفین کیلئے انعامات

برمی، سنہالی، ہندی، اُردو، بنگالی، تامل اور فارسی کے بہترین مصنفوں کو جملہ ۲۹ انعامات دینے کے لئے پروجکٹ کے علاقے کی پانچ حکومتوں کے اختیار میں ۴۰۰ ڈالر فی انعام کے حساب سے رقم دی گئی۔

نیشنل بک سنٹر/ٹرسٹ کی امداد

نیشنل بک ٹرسٹ آف سیلون اور نیشنل بک سنٹر آف پاکستان کے استعمال کیلئے مزید سامان حاصل کیا گیا۔

کتابوں کی نمائشیں

۱۹۶۱ء میں کتابوں کی نمائشیں منعقد کرنے کے متعلق مندرجہ ذیل اداروں کے ساتھ معاہدے کئے گئے :۔
برما : سارپے بیک مین انسٹی ٹیوٹ (بی۔ ٹی۔ ایس) رنگون۔
سیلون : نیشنل بک ٹرسٹ۔ کولمبو
ہندوستان : شعبہ نمائش۔ وزارت اطلاعات و نشریات۔ دہلی
ایران : پبلشرز سوسائٹی
پاکستان : پاکستان پبلشرز اینڈ بک سیلرز ایسوسی ایشن

مطبوعات

بین الاقوامی مفاہمت اور آسان سائنسی مضامین پر انگریزی کے دو سلسلوں کے ۱۶ مسودے تیار کئے گئے جن کا ترجمہ ماں پبلشنگ ہاؤس دہلی بعض قومی زبانوں میں کر کے شائع کرے گا۔

مطالعہ اور جائزہ

۶۰۔ ۱۹۵۹ء میں مواد خواندگی کے پروجکٹ کے تحت منعقد شدہ مختلف مذاکرات کی کارروائیوں اور پروجکٹ کے دیگر متعلقہ مواد کی بنیاد پر کتابوں کی اشاعت کو ترقی دینے اور ان کی تقسیم کے مسائل پر ایک سروے مرتب کرنے کے لئے مسٹر این سنکراتنا رائن، ڈائرکٹر ہگن بوتھمس (پرائیویٹ) لمیٹڈ مدراس کو مقرر کیا گیا۔
مسٹر ڈیس۔ کے تھمپا۔ پروڈکشن آفیسر۔ سدرن لینگویجز بک ٹرسٹ نے طباعت کی موجودہ سہولتوں کے متعلق باتصویر مواد خواندگی کی ایک گائڈ بک مرتب کرنے کا فرض قبول کر لیا ہے۔

مندرجہ بالا دونوں مسودے فنی مطبوعات کے سلسلے کا ایک حصہ ہوں گے جن کا منصوبہ پروجکٹ کے تحت مختلف ماہرین کے تعاون سے تیار کیا گیا ہے۔

رسمی نامہ نگار :

مندرجہ ذیل ماہرین اس مرکز کے نامہ نگار مقرر کیے گئے :

برما : یوھیئن گئی۔ سارا پے بیکان انسٹی ٹیوٹ (برما ٹرانسلیشن سوسائٹی)
سیلون : مسٹر کے جی۔ امرداسا۔ سکریٹری نیشنل بک ٹرسٹ
ہندوستان : مسٹر کول بھوشن۔ وزارت تعلیم۔ حکومت ہند
ایران : ڈاکٹر سو چریان۔ وزارت تعلیم۔ حکومت ایران
پاکستان : سکریٹری نیشنل بک سنٹر

اُردو کا کلاسکی سلسلہ

مجلس ترقی اُدب، لاہور نے اس سلسلے میں ذیل کی کتابیں شائع کی ہیں۔ کتابیں ٹائپ میں چھپی ہیں اور سرورق دیدہ زیب ہیں۔

۱۔ ابن الوقت	مصنف	ڈپٹی نذیر احمد دہلوی	مرتبہ : سید سبط حسن	۳/۵۰ روپے
۲۔ قصص ہند	"	مولوی محمد حسین آزاد دہلوی	کارکنان مجلس	۲ روپے
۳۔ وکرم اُروسی	"	کالی داس	ترجمہ : محمد عزیز مرزا لکھنوی مرتبہ : عشرت رحمانی	۱/۷۵ روپے
۴۔ حیات سعدی	"	خواجہ الطاف حسین حالی	" : شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی	۲/۵۰ روپے
۵۔ مسافران لندن	-	-	" : جواد الدولہ عارف جنگ ڈاکٹر سر سید احمد خاں شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی	۳ روپے
۶۔ رسوم ہند	مصنف :	۱۔ ماسٹر پیارے لال آشوب دہلوی ۲۔ کپتان ڈبلیو۔ جے ہالرائیڈ	مرتبہ : کارکنان مجلس	۳/۵۰ روپے

منظور شدہ
جاری کردہ
اور اقراری اصل سرمایہ
۳،۰۰،۰۰،۰۰۰ روپے
اداشدہ سرمایہ ۱،۵۰،۰۰،۰۰۰ روپے
محفوظ رقم
۲،۱۰،۰۰،۰۰۰ روپے
جمع شدہ
۱،۰۸،۰۸،۳۶،۰۰۰ روپے
مورخہ ۳۰-۶-۶۱
مشرقی اور مغربی پاکستان میں
ذیلی شاخیں اور
دنیا بھر میں
بینک کاری کا کاروبار
ہر قسم کی بینک کاری کا کاروبار
دنیا بھر میں مختلف متعلقہ
اداروں کے توسط سے کیا جاتا ہے
بیرونی شاخیں:۔
لندن جدہ ہانگ کانگ
کلکتہ بغداد
نیشنل بینک آف پاکستان
مرکزی دفاتر:۔ کراچی - لاہور - ڈھاکہ
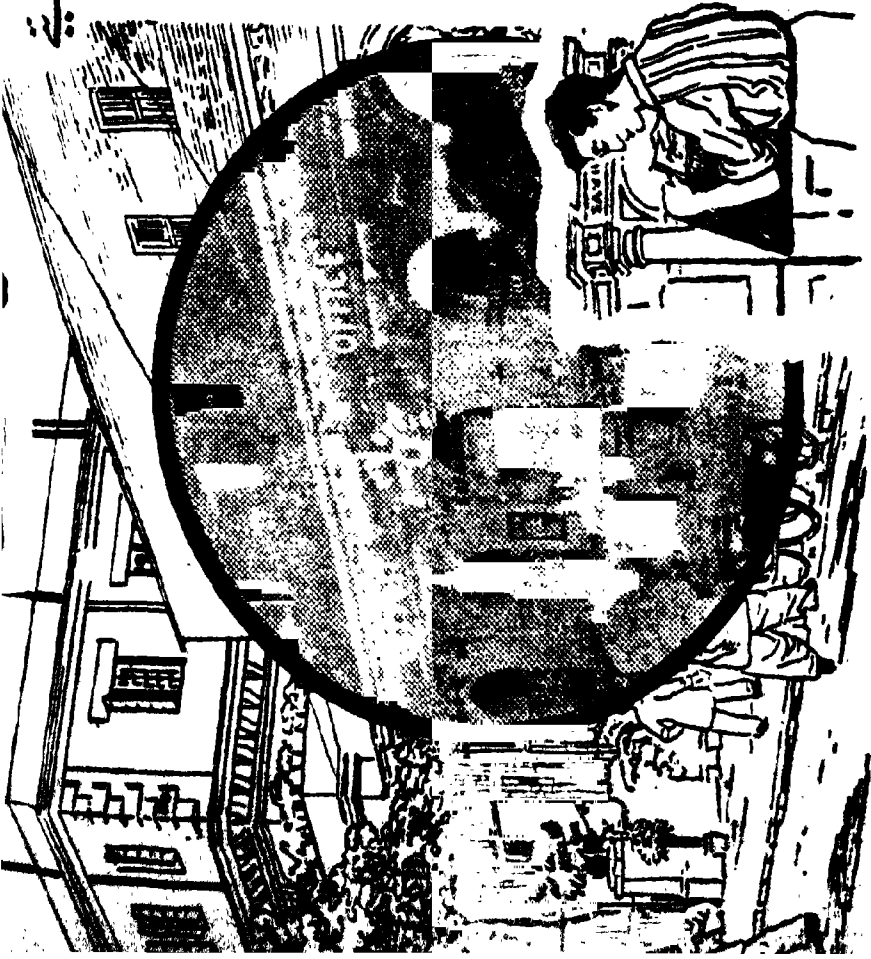
ان سے فائدہ اٹھائیے
روپیہ نکالنے کی سہولت
اب آپ کو ڈاک خانے سے رقم نکلوانے کے لئے اُسی پوسٹ آفس تک
جانا ضروری نہیں جہاں آپ کا حساب ہے۔ آپ اسی علاقے کے
(یعنی ایک ہی صدر ڈاک خانے کے تحت) کسی بھی ڈاک خانے سے
پچاس روپے تک نکلوا سکتے ہیں۔ یہاں آپ کو صرف اپنی
پاس بک دکھانی ہوگی جس پر آپ کی مُصدّقہ تصویر چسپاں ہوگی۔
جمع کرنے کی سہولت
دوسری نئی سہولت جو روپیہ جمع کرانے کے سلسلے میں مہیا کی گئی ہے
وہ یہ کہ ڈاک خانہ اب چیک بھی قبول کرتا ہے۔
دوسرے فوائد
صرف دو روپے سے حساب کھول سکتے ہیں۔
۲½ سے ۴½ فیصدی تک منافع
(تفصیلات کسی ڈاک خانے سے دریافت کریں)
آپ کی بچت کا محافظ
پوسٹ آفس سیونگ بینک

نیا
تبت
پنک
ٹوتھ پیسٹ
اس میں جراثیم کش ہائیڈ میکس شامل ہے۔
TIBET
PINK TOOTHPASTE
with quick-acting HYDEMAX
TIBET
PINK TOOTHPASTE
... جو دانتوں کی حفاظت کیلئے ضروری ہے۔
تبت پنک ٹوتھ پیسٹ کے استعمال سے اب آپ
دانتوں کی خرابی اور مسوڑھوں کی تکلیف سے محفوظ
رہیں گے۔ اس میں زود اثر ہائیڈ میکس شامل ہے
جو جراثیم ختم کرکے دانتوں کو صاف اور صحت مند رکھتا ہے اور
منہ میں ایک خوشگوار مہک پیدا کر دیتا ہے۔
یہ نیا ٹوتھ پیسٹ آج ہی استعمال کرکے دیکھئے!
کوہ نور کیمیکل کمپنی لمیٹڈ ۔ کراچی ۔ ڈھاکہ

دی
مسلم کمرشل بینک
لمیٹڈ
قائم شدہ ۱۹۴۸ء
سرمایہ منظور شدہ ۔ ۳،۰۰،۰۰،۰۰۰ (تین کروڑ)
سرمایہ جمع شدہ ۔ ۱،۵۰،۰۶،۰۰۰ (ایک کروڑ پچاس لاکھ چھ ہزار)
سرمایہ ادا شدہ ۔ ۷۵،۰۳،۰۰۰ (پچھتر لاکھ تین ہزار)
سرمایہ محفوظ ۔ ۳۲۵۰۰۰۰ (بتیس لاکھ پچاس ہزار)
بورڈ آف ڈائرکٹرز
عبدالواحد آدم جی صاحب ۔ چیرمین
غلام فاروق صاحب ۔ وائس چیرمین
عبدالستار احمد صاحب
عبدالغنی حاجی حبیب صاحب
خیرالدین ولی بھائی صاحب
مقبول الٰہی صاحب
ایم۔ مہدی اصفہانی صاحب
گل محمد آدم جی صاحب
ذکریا آدم جی صاحب
شاخیں سارے مشرقی اور مغربی پاکستان میں پھیلی ہوئی ہیں۔
بینک کے ایجنٹس اور آڑھتی دنیا کے ہر بڑے تجارتی شہر میں موجود ہیں
ہیڈ آفس
کراچی
اے۔ میکلین
جنرل منیجر

d at the International Press, Karachi.